اچھی کِتابیں

[illegible]فات
اخلاقی موضوعات اور علم تصوف پر شاہ اسماعیل شہیدؒ کی مشہور کتاب۔ ترجمہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ۔ قیمت ساڑھے دس روپے

[illegible]ن ابن ماجہ
صحاح ستہ کی مشہور کتاب۔ احادیث کا بہترین مجموعہ۔ ترجمہ مستند اور عمدہ
ہدیہ مجلّد صرف بارہ روپے

[illegible]دب المفرد
امیر المومنین فی الحدیث حضرت امام بخاریؒ کی بیش بہا کتاب جس میں ہر دور [illegible]ہر شخص کے کام آنے والی ہدایات پر مشتمل احادیث جمع [illegible]ی ہیں۔ اردو مع عربی۔ کتابت طباعت عمدہ۔ کاغذ [illegible]۔ قیمت مجلّد بارہ روپے۔

[illegible]دۃ المناسک
حج اور احکام حج پر مفصل مدلل کتاب مصنف:۔ استاذ الاساتذہ مولانا [illegible]شید احمد گنگوہیؒ۔ ہدیہ مجلّد آٹھ روپے۔

[illegible]سفۂ دعا
دعا کی حقیقت، ضرورت افادیت اور دنیا بھر کے علماء و مفکرین کے نزدیک اس کی [illegible]ت و عظمت کا مفصّل بیان۔ اپنی نوع کی واحد کتاب۔
قیمت مجلّد چار روپے۔

[illegible]ت خیر الانامؐ
حدیث کی اہمیت و ضرورت پر جامع ازہر کے ایک فاضل کی بہترین کتاب [illegible]ین حدیث کا رد۔ عوام اس کتاب سے فن حدیث کی خاص [illegible]حوں اور ضروری پہلوؤں سے بھی آگاہ ہو سکیں گے۔
قیمت مجلّد چار روپے

[illegible]ت بینات
شیعت کے رد میں ایک وقیع و معروف کتاب۔ برسہا برس گذر گئے مگر اس [illegible]ب کا رد کوئی نہ کر سکا۔ مجلّد ساڑھے چار روپے۔

حقوق الاسلام
اپنے وقت کے زبردست عالم قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی مفید ترین تصنیف جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کی رو سے کس پر کس کا کیا حق ہے اللہ، رسولؐ، صحابہؓ، علماء، والدین، اقرباء، حاکم، شوہر، بیوی، اولاد، پڑوسی غرض ہر ایک کے حقوق کی تفصیل۔ رسالہ سماع و مزامیر بھی شامل کتاب ہے۔ اردو ترجمہ عام فہم۔
قیمت مجلّد دو روپے

خصائل مسلمین
شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے پوتے شاہ محمد اسحاقؒ کی مشہور کتاب مسائل اربعین کا اردو ترجمہ۔ چالیس مروجہ بدعتوں کا رد مستند کتب فقہ کے حوالوں سے۔ مجلد دو روپے۔

سوانح خواجہ معین الدین چشتیؒ
محبوب العارفین حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اثر انگیز سوانح حیات۔ جو اجمیر کی خاک میں استراحت فرما رہے ہیں۔ ساڑھے چار روپے۔

مولانا مودودی سے ملیے
اسعد گیلانی کی مرتب فرمودہ ایک حقیقت افروز کتاب جو مولانا مودودی کی سیرت و کردار اور فکر و بصیرت کے خدوخال کو خود ان کی تحریروں اور دنیا بھر کے علماء و اکابر کے تبصروں کے آئینے میں پیش کرتی ہے۔ بسیط۔ فکر انگیز۔ قیمت مجلّد ساڑھے چھ روپے۔

صحیح معلومات
سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں جن دنوں کی چھٹیاں رائج ہیں ان کے متعلق معلومات کا گلدستہ۔ جن بزرگوں کے نام پر بعض تہوار مسلمانوں نے نکال لئے ہیں ان کے حالات و اقوال سے بچوں اور بڑوں سب کو فائدہ پہنچے گا۔ قیمت صرف ایک روپیہ

الوسیلہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کی مشہور کتاب۔ جس میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ قرآن میں وَابْتَغُوا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ کہکر اللہ نے جس وسیلے کی طرف توجہ دلائی ہے وہ آخر کیا ہے؟ قیمت مجلد نو روپے۔

بلاغ المبین حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ایک بیش بہا کتاب کا اُردو ترجمہ جو بدعت کے رد، سنت کے اثبات اور عقائد صحیحہ کی توضیح میں نہایت اعلیٰ ہے۔ کاغذ رف۔ قیمت مجلد چار روپے۔

نماز یں نماز اور اس کے متعلقات یعنی وضو، جماعت اور صحیح طریقۂ نماز کی تفصیل، ضروری مسائل، ہدایات بچوں اور بڑوں سب کے لئے مفید۔ صرف چھ آنے۔

بزم پیغمبرؐ منتخب احادیثِ رسولؐ کا مجموعہ، مفید ترجمہ و تشریح کے ساتھ۔ سوا روپیہ۔

علمائے سلف و نابینا علماء یہ کتاب علمائے سلف کے علمی ذوق و شوق کا وہ مصفّا آئینہ ہے جسے دیکھ کر دل مسرت اور فخر سے لبریز ہو جاتا ہے تاریخ کی بیسیوں ضخیم کتابوں کا عطر۔ تین روپے۔

فتاویٰ دار العلوم دیوبند مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰنؒ اور مفتی مولانا محمد شفیع صاحب کے ہزاروں فتاویٰ کا خزینہ۔ نئی ترتیب، تزئین، اصلاح اور سلیقے کے ساتھ۔ یہ تازہ ایڈیشن ہر لحاظ سے اعلیٰ۔ آٹھ حصوں میں مکمل، ۲۱ روپے (مجلد ۲۶ روپے)

غنیۃ الطالبین شاہ عبد القادر جیلانیؒ کے مشہور زمانہ جواہر پارے۔ افاضات۔ مواعظ۔ معارف فتوح الغیب بھی شامل کی گئی ہے۔ عربی متن اور اُردو ترجمہ ساتھ ساتھ۔ دو جلد مکمل مجلد چوبیس ۲۴ روپے۔

فتوح الغیب شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے مقالات کا اُردو ترجمہ۔ مجلد ڈھائی روپے۔

رسائل و مسائل مولانا مودودی کے دیئے ہوئے نوع بنوع سوالات کے فکر انگیز جوابات۔ علم و تفقہ کا گنجینہ دو ضخیم جلدوں میں۔ ساڑھے بارہ روپے۔

عمرو بن العاصؓ مشہور مدبر صحابی، فاتح مصر عمرو بن العاصؓ کی دلچسپ اور روح نواز سوانح۔ اس کتاب کو معارف۔ ماہنامہ دار العلوم۔ تجلی۔ ایشیا۔ دعوت۔ الجمعیۃ وغیرہ نے اپنے تبصروں میں سراہا ہے۔ قیمت مجلد دو روپے۔

بہشتی زیور مکمل و مدلل روزمرہ کے تمام مسائل میں شرعی رہنمائی کرنے والی وہ شہرۂ آفاق کتاب جو ہر مسلمان گھر میں رہنی ضروری ہے۔ نفیس ایڈیشن مکمل دو حصے بارہ ۱۲ روپے (مجلد پندرہ روپے)

چند لاجواب رسائل "زندگی" کے سابق مدیر مولانا سید حامد علی کے علم و قلم محتاج تعارف نہیں۔ آپ نے وقت کے تقاضوں کے عین مطابق مفید ترین مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جو چھوٹے چھوٹے رسالوں کی شکل میں چھپتا رہا ہے تاکہ غریب سے غریب آدمی بھی فائدہ اُٹھا سکے۔ اب تک درج ذیل کتابچے چھپ کر آچکے ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ گہرے علمی و عقلی موضوعات کو مصنف کے شستہ و پاکیزہ قلم نے عام فہم اور دل نشین بنا دیا ہے:-

(۱) خدا کا انکار کیوں؟ قیمت ۳۲ پیسے (۲) کیا خدا کی ضرورت نہیں؟ ۳۲ پیسے (۳) ملحدین کے شبہات ۳۲ پیسے (۴) خدا پرستی ملحدین کی نظر میں ۳۲ پیسے (۵) ہندوستان کا دفاع اسلام اور فن حرب کی روشنی میں ۳۵ پیسے۔

(قیمتیں معمولی مگر مضامین بیش بہا)

چار خاص نمبر

ترجمان القرآن کا منصب رسالت نمبر

ساڑھے تین روپے

تجلی کا خلافت نمبر ۔۔۔۔۔۔۔ ایک روپیہ

چراغ راہ کا سالنامہ ۱۹۶۰ء ۔۔۔۔۔۔۔ ڈیڑھ روپیہ

چراغ راہ کا سالنامہ ۱۹۶۱ء ۔۔۔۔۔۔۔ ڈھائی روپے

مکتبہ تجلی دیوبند (یو۔ پی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ تجلی دیوبند

حاجی نمبر

شمارہ نمبر ۱ و ۲
جلد نمبر ۱۵

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے
سالانہ قیمت سات روپے۔ فی پرچہ ۶۲ پیسے

اس پرچہ کی قیمت ڈیڑھ روپیہ

غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۱۸ شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر
پوسٹل آرڈر پر کچھ نہ لکھئے بالکل سادہ رکھئے

ضروری

اگر اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ اگر آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا (وی پی سات روپے باسٹھ ۶۲ نئے پیسے کا ہوگا) منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

پاکستانی حضرات:- ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیجکر رسید منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتہ ہمیں بھیجدیں رسالہ جاری ہوجائیگا۔

فہرست مضامین مطابق ماہ مارچ و اپریل ۱۹۶۲ء

تحت رجسٹریشن ایکٹ

نام ——— تجلی (ماہنامہ)
مقام اشاعت ——— اسلامیہ بازار دیوبند
پرنٹر پبلشر اڈیٹر ——— عامر عثمانی۔ محلہ ابوالمعالی دیوبند
وطنیت ——— ہندستانی
ملکیت ——— عامر عثمانی
تصدیق کنندہ ——— عامر عثمانی

میں تصدیق کرتا ہوں کہ یہ معلومات میرے بہترین علم کے مطابق بالکل درست ہیں۔ عامر عثمانی

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ
دفتر تجلی۔ دیوبند ضلع سہارنپور (یوپی)

مدیر
عامر عثمانی
فاضل دیوبند

پاکستانی حضرات:- نیچے لکھے ہوئے پتہ پر منی آرڈر بھیجکر وہ رسید ہمیں بھیجدیں جو منی آرڈر کرتے وقت ڈاک خانہ سے ملتی ہے۔

مکتبہ عثمانیہ۔ مینا بازار ۲۲۸۰
پیر الٰہی بخش کالونی کراچی ۵

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند سے چھپوا کر اپنے دفتر تجلی دیوبند سے شائع کیا۔

آغازِ سخن

ایک کہانی، ایک حادثہ!

یہ کہاوت جتنی پرانی ہے اتنی ہی درست بھی ہے کہ

"انسان خطاؤ نسیان سے مرکب ہے"

کون ہے جس کے بارے میں دعویٰ کیا جاسکے کہ اسکی پوری فردِ عمل خطاؤ نسیان کی چھاپ سے خالی ہے۔ آدمی سے خطا ہو اور بہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بڑے سے بڑے عالم، شیخ یا دانشور سے فکر و عمل کی چوک ہو جانا اس کی عظمت کے منافی نہیں ہوا کرتا۔

ہاں آدمی کے کردار و سیرت کی جانچ اس وقت ہوتی ہے جب اسے اس کی خطا سے آگاہ کیا جائے۔ اس وقت جو بھی ردِ عمل اس کی طرف سے ظاہر ہوگا اسکے آئینے میں بالغ نظر حضرات اس کے باطن کے خفی گوشے دیکھ سکینگے اور فیصلہ کیا جاسکے گا کہ اس کے ضمیر، اس کی صداقت پسندی اور اس کے نفس کا کیا حال ہے۔

ابھی دسمبر ۶۲ء کے آخری عشرے میں یہ حادثہ پیش آچکا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی جناب مولانا مہدی حسن صاحب نے کسی مستفتی کے پیش کردہ استفتاء پر بعض عبارتوں کو کفر و ضلالت کا گنجینہ قرار دیا مگر ان کی قسمت سے یہ عبارتیں نکلیں جناب مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی۔ پھر تو وہی آزمائش کی نازک گھڑی آپہنچی جو آدمی کے جسم سے اوپر کی کیچلی اتار دیتی ہے اور وہ آئینے کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔

واقعہ مع تفصیل کے اخبارات میں آچکا ہے اور ہند و پاک کے جریدوں میں اس پر متعدد ریمارک بھی ہوئے ہیں۔ خاص طور پر مدیر فاران کراچی نے بہت بسط سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ تمام قارئینِ تجلی بھی اس داستانِ عبرت سے آگاہ ہی ہوں، لہٰذا ہم استفتاء اور فتویٰ دونوں نقل کرکے اس پر کچھ عرض کرینگے عرض کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اب تک کسی بھی محاکمہ کرنے والے نے بے لاگ انصاف کا حق ادا نہیں کیا۔ ایک اٹھتا ہے وہ مہتمم صاحب کو واحد مجرم قرار دے ڈالتا ہے۔ دوسرا اٹھتا ہے وہ سراسر خاطی مفتی صاحب کو باور کراتا ہے۔ بعض لطیف اور قابل لحاظ گوشے بھی کسی کی توجہ حاصل نہیں کرپائے، حالانکہ ہمارے نزدیک اس قضیے کا عبرت انگیز پہلو یہ نہیں کہ دو بڑی ہستیوں میں سے ایک نے یا دونوں نے کوئی غلطی کی۔ غلطی تو آدمیت کا زیور ہے غلطی سے مبرّا ہونے کے دعویداروں کو اپنا شجرۂ نسب فرشتوں سے جوڑ دینا چاہیئے۔ عبرت انگیز یہ پہلو ہے کہ غلطی کے انکشاف کے بعد متعلقہ حضرات کا کیا ردِ عمل رہا اور یہ ردِ عمل کردار و سیرت کے کن مخفی گوشوں کی نشاندہی کرتا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ جن حضرات نے اس قضیۂ نامرضیہ سے متعلق ساری تحریریں پڑھ لی ہوں گی انھیں بھی ان صفحات میں کچھ نئی باتیں اور منفرد زاویے مل جائینگے و باللہ

یہ ہم بتا دیں کہ اتنی تاخیر سے کس لئے یہ داستان تجلی میں دی جارہی ہے جبکہ تجلی کی پچھلی تاریخ اس سکوت و تساہل سے مطابقت نہیں رکھتی۔ بات یہ ہے جب یہ حادثہ فاجعہ پیش آیا تو ہمیں رنج و حزن کے جذبات نے اپنے

گھیرے میں لے لیا۔ بظاہر بغلیں بھی بجائی جا سکتی تھیں، لیکن رسوائی کسی مہتمم کی ہو یا مفتی کی وہ ہماری ہی تو رسوائی ہے ہماری عزّت و ذِلت کا مدار ہمارے بزرگوں پہ ہے۔ دونوں ہی معظم حضرات ہمارے بزرگ تھے۔ راہنما تھے۔ قوم کی ناک اور ملت کے مقتدا تھے۔ ان کی لغزشوں اور بے احتیاطیوں پر ھی کے چراغ جلانا خود اپنی قبر پر چراغاں کرنے کے سوا کیا تھا۔ بھاگے بھاگے حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب کی خدمت میں پہنچے اور راہنمائی چاہی کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں بار بار کی حاضری میں کیا کیا باتیں ہوئیں یہ کہانی تو طویل ہے بس حاصل سمجھ لیجئے کہ فی الوقت سکوت کو اولیٰ قرار دیا گیا۔ "انتظار کرو اور دیکھو" کا موقف اس وقت اس لئے بھی بہتر تھا کہ بعض اکابر کی ملاقاتیں حضرت مفتی صاحب سے جاری تھیں اور نہیں معلوم تھا کہ —— یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین! دوسری طرف مہتمم صاحب علیل تھے اور ان سے گفتگو کا حاصل بھی یہی نکلا کہ فوری طور پر کچھ لکھنا قبل از وقت ہوگا۔ اس ڈرامائی ساعت میں اس صورت حال نے اور بھی ڈرامائیت پیدا کردی تھی کہ باوجود بعض بزرگوں کی تفہیم کے حضرت مفتی صاحب رجوع پر آمادہ نہیں ہو رہے تھے اور ان کی سنگین استقامت سے عاجز آکر ذیلی علماء ایک نیا فتویٰ مرتب کرنے کی زمین ہموار کر رہے تھے جس کے ذریعہ حضرت مہتمم صاحب کے دامن سے کفر و زندقہ کی اُس سیاہی کو دھویا جاتے جو حضرت مفتی صاحب کی لگائی ہوئی تھی۔

ہم کان دبا کر بیٹھ گئے اور فروری کا تجلی اس کہانی سے خالی رہا۔ لیکن اعلان اسمیں بھی آہی گیا تھا وہ بھی استاذِ مکرم مولانا محمد ابراہیم صاحب کی اس اجازت کے بعد ہی آیا تھا کہ اب آپ لکھ سکتے ہیں۔

پھر جو کچھ اب لکھا جا رہا ہے یہ بھی اذن کے بعد ہی ہے خود مہتمم صاحب دام ظلہ سے کافی طویل گفتگو کرنے اور ایما لے لینے کے بعد ہی قلم پکڑا گیا ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ قلم پکڑنے کے بعد ہم ذوات و شخصیات کی نیازمندیوں سے بالاتر ہو کر صرف وہی لکھنے کے عادی ہیں جس پر ہمارا ضمیر اور ایمان و دیانت صاد کر دیں۔ حق و صداقت ہر شے سے بلند ہیں۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ۔

اب آپ استفتاء ملاحظہ فرمائیں جو ضلع بھاگلپور سے دارالعلوم ہی کے ایک فاضل جناب انیس الرحمٰن قاسمی نے دارالافتاء کو بھیجا تھا۔

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ اگر کوئی عالم دین فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا کی تشریح اور اس سے درج ذیل نتائج اخذ کرتے ہوئے اس طرح لکھے:۔

اقتباس[۱]:۔ "یہ دعویٰ تخیل یا وجدانِ محض کی حد سے گذر کر ایک شرعی دعویٰ کی حیثیت میں آجاتا ہے کہ مریم صدیقہؓ کے سامنے جس شبیہ مبارک اور بشر سوی نے نمایاں ہو کر پھونک ماردی وہ شبیہ محمدیؐ تھی۔

اس ثابت شدہ دعویٰ سے بین طریق پر خود بخود کھل جاتا ہے کہ حضرت مریم رضی اللہ عنہا اس شبیہ مبارک کے سامنے بمنزلہ زوجہ کے تھیں جب کہ اس کے تصرف سے حاملہ ہوئیں"

اقتباس[۲]:۔ "پس حضرت مسیحؑ کی ابنیت کے دعویدار ایک حد تک ہم بھی ہیں مگر ابن اللہ مان کر نہیں بلکہ ابن احمد کہہ کر خواہ وہ ابنیت تمثالی ہی ہو"

اقتباس[۳]:۔ "حضورؐ تو بنی اسمٰعیل میں پیدا ہو کر کل انبیاء کے خاتم قرار پائے اور عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں پیدا ہو کر اسرائیلی انبیاء کے خاتم کہے گئے جس سے ختم نبوت کے منصب میں ایک گونہ مشابہت پیدا ہو گئی اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِأَبِيهِ"

اقتباس[۴]:۔ بہر حال اگر خاتمیت میں حضرت مسیح علیہ السلام کو

حضورؐ سے کامل مناسبت دی گئی تھی تو اخلاقِ خاتمیت اور مقاماتِ خاتمیت میں بھی مخصوص مشابہت و مناسبت دی گئی جس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسوی کی بارگاہِ محمدی سے خَلقاً و خُلقاً رتبتاً و مقاماً ایسی ہی مناسبت ہے جیسی کہ ایک چیز کے دو شریکوں میں یا باپ و بیٹوں میں ہونی چاہئے۔"

براہِ کرم مندرجہ بالا اقتباسات کے متعلق قرآن و حدیث کی روشنی میں دیکھتے ہوئے اس کی صحت و عدم صحت کو ظاہر کر کے بتائیں کہ ایسا "شرعی دعویٰ" کرنیوالا اہلسنت والجماعت کے نزدیک کیا ہے؟

المستفتی

الجواب :-

جو اقتباسات سوال میں نقل کئے ہیں ان کا قائل قرآنِ عزیز کی آیات میں تحریف کر رہا ہے، بلکہ در پردہ قرآنی آیات کی تکذیب اور ان کا انکار کر رہا ہے۔ جملہ مفسرینؒ نے تفاسیر میں تصریح کی کہ وہ جبرئیل علیہ السلام تھے جو مریم علیہا السلام کی طرف بھیجے گئے وہ شبیہِ محمدی نہ تھی۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ السلام اور صحابۂ کرامؓ نے کبھی یہ نہ سمجھا بلکہ "مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل اٰدم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون) کلمۃ القاھا الی مریم وروح منہ" فارسلنا الیھا روحنا فتمثل لھا بشرا سویا (الی قولہ تعالیٰ) فقال انما انا رسول ربک لاھب لک غلاماً زکیاً" قال ربک ھو علی ھین ولنجعلہ آیۃ للناس الی آخر الآیات" ماکان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین" کے قائل تھے اور اس پر اجماع امت ہے کہ وہ فرشتہ تھا جو حضرت مریم کو خوش خبری سنانے آیا تھا۔ شخص مذکور ملحد و بے دین ہے، عیسائیت و قادیانیت کی روح اس کے جسم میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ وہ اس ضمن میں عیسائیت کے عقیدے عیسیٰ ابن اللہ کو صحیح و ثابت کرنا چاہتا ہے جس کی تردید علی رؤس الاشہاد قرآن عزیز نے کی ہے۔ نیز لا تطرونی کما اطرت النصاری عیسیٰ بن مریم الحدیث۔ بانگِ دہل شخص مذکور کی تردید کرتی ہے۔ الحاصل یہ اقتباسات قرآن و احادیث اور جملہ مفسرین اور اجماع امت کے خلاف ہیں۔ مسلمانوں کو ہرگز اس طرف کان نہ لگانا چاہئے، بلکہ ایسے عقیدے والے کا بائیکاٹ کرنا چاہئے جب تک کہ توبہ نہ کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

سید مہدی حسن مفتی دارالعلوم دیوبند

یہ استفتاء اور جواب روز نامہ دعوت (دہلی) میں شائع ہوا اور ساتھ ہی یہ زلزلہ افگن راز بھی اسی میں بے نقاب کیا گیا کہ استفتاء کے اقتباسات حضرت مہتمم صاحب کی کتاب "اسلام اور مغربی تہذیب" کے ہیں۔

ویسے ہمارے لئے تو یہ راز راز نہ تھا" کیونکہ یہی استفتاء چند ماہ قبل قاسمی صاحب نے ہمیں بھی بھیجا تھا اور اسمیں مہتمم صاحب کے نام کی پردہ داری نہیں کی گئی تھی۔ تجلّی میں کسی سوال و جواب کی فوری اشاعت تو یوں بھی آسان نہیں ہوتی پھر اس استفتاء کے بارے میں ہم نے خیال کیا کہ خود حضرت مہتمم صاحب سے گفتگو کر لینے کے بعد جواب لکھیں۔ مگر ان دنوں موصوف زیادہ تر سفر میں رہے اور جن دنوں دیوبند قیام رہا راقم الحروف باہر چلا گیا۔ اس طرح یہ معاملہ ٹلتا رہا اور ٹلنا بھی فی الحقیقت ایک تقدیری امر تھا۔ تقدیر سازہی نے جب یہ طے فرما دیا ہو کہ مفتی مہدی حسن صاحب کا قلم مہتمم صاحب کی تکفیر کرے اور اولو الالباب کے لئے عبرت کا سامان فراہم ہو تو ہمارے قلم سے فوری جواب کیونکر نکل جاتا۔

قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ مشہور کہاوت ہے کہ دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔

ابھی زیادہ مدّت نہیں گذری کہ ذمہ دارانہ تحقیق کے بغیر فتویٰ دینے کی خراب عادت نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو وادیِ کفر تک پہنچایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ آئندہ ایسے عاجلانہ فتوے نہ صادر کئے جائیں لیکن عبرت پذیری کم ہی لوگوں کے حصّے میں آتی ہے، اپنی عظیم ذمہ داریوں کا پورا احساس کئے بغیر حضرت مفتی صاحب آج بھی بے احتیاطی پر قائم ہیں۔ ایک اسی فتوے کا معاملہ

نہیں۔ اور بھی کتنے ہی فتوے وقتاً فوقتاً ان کے قلم سے ایسے نکلتے رہتے ہیں جو نہ نکلنے چاہئیں، لیکن ان کی زد چونکہ کسی ایسے خطرناک نشانے پر نہیں پڑتی جو ان کی راتوں کی نیندیں حرام کردے اس لئے بات بڑھتی نہیں۔

بہرحال استفتاء اور فتویٰ آپ نے پڑھ لیا۔ اب وہ وضاحتی بیان ملاحظہ فرمائیے جو حضرت مہتمم صاحب کی طرف سے اس ہنگامہ خیز حادثہ کے بعد دفتر اہتمام کے انچارج مولوی عبدالحق صاحب نے اخبارات میں شائع کرایا ہے۔

وضاحتی بیان

اخبار دعوت دہلی مورخہ ۲۲ر دسمبر ۶۲ء میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے بارے میں غلط فہمی پیدا کرنے والا ایک استفتاء اور فتویٰ شائع ہوا ہے جس کو دیکھ کر ملک کے مختلف حصوں سے استفسارات آنے شروع ہو گئے۔ سوالات چونکہ باختلاف عبارات یکساں تھے اس لئے اس فتوے سے پیدا شدہ غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے درج ذیل جوابات تحریر فرمائے ہیں:۔

(۱) کیا واقعی آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے تھے اور کیا آپ کی ان عبارات کا مطلب بھی یہی ہے جو مستفتی نے آپکی کتاب "اسلام اور مغربی تہذیب" سے پیش کی ہیں۔

جواب:۔ حاشا ثم حاشا نہ میرا یہ عقیدہ ہے اور نہ میری کسی عبارت کا یہ مفہوم یا اس سے میری مراد ہے، اس مسئلے میں میرا عقیدہ وہی ہے جو تمام اہل سنت والجماعۃ کا متفقہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بلا باپ کے محض مریم صدیقہ کے بطن سے پیدا ہوئے اور وہ ابن اللہ نہ تھے، ابن مریم تھے۔ نیز ان کے تولد کے بارے میں بھی اپنا وہی عقیدہ ہے جو قرآن حکیم کی روشنی میں تمام اہل سنت والجماعۃ کا متفقہ عقیدہ چلا آرہا ہے کہ مریم پاک کے سامنے حضرت

جبرئیل علیہ السلام ایک بشر سوی (کامل الخلقۃ) کی صورت میں نمایاں ہوئے۔ ان کے گریبان میں پھونک ماری اور وہ حاملہ ہو گئیں۔

بطور استنباط ایک علمی لطیفے کے طور پر اس کتاب میں جو کچھ عرض کیا ہے وہ یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام مریم صدیقہ کے سامنے ظاہر ہوتے وقت صورت محمدی میں تھے اور بشر سوی اور کامل الخلقت ہیئت شبیہہ محمدی تھی اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شبیہہ محمدیؐ سے ایک تمثالی ابنیت کی نسبت ہو گئی اور ان کے معجزات و کرامات میں جز زیادہ تر صورت سازی، صورت نمائی، صورت آرائی اور صورت زیبائی کی شان پائی جاتی ہے، یہ اسی صورت محمدیؐ کے آثار ہیں جس کی تمثالی نسبت سے مسیح علیہ السلام اپنے بدء خلقت میں مستفید ہوئے۔ ظاہر ہے کہ مریم صدیقہ کے سامنے نہ حضور علیہ السلام جلوہ گر ہوئے نہ آپ کی ذات وہاں موجود تھی۔ موجود تھے تو صرف جبرئیل علیہ السلام جن پر حسب استنباط مذکورہ تشبیہہ محمدی چھائی ہوئی تھی تو نہ یہاں کسی واقعی یا حقیقی ابنیت کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ ابوت کا۔ صرف ایک تمثالی اور شباہتی ابنیت سامنے آتی ہے جو نسبت یا انتساب کا درجہ رکھتی ہے نہ کہ نسب کا۔ پس اس پر کچھ شرعی قرائن اور کچھ متقدم علماء کے کلام سے استشہاد کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بے باپ کے پیدا ہونے کے عقیدے پر اس تمثالی ابنیت سے جبکہ وہ بدرجۂ استنباط بھی ہو نہ کہ بدرجۂ عقیدہ کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ وہ عقیدہ اپنی جگہ جو واجب الاعتقاد ہے یہ علمی لطیفہ اپنی جگہ ہے جس کا نہ ماننا ضروری ہے نہ ترک ضروری۔

مسئلہ میں پیچیدگی بظاہر اس سے پیدا ہوئی ہے کہ میں نے شیخ عبدالغنی نابلسی کے کلام کو (جو اہل سنت کے موقف سے کچھ ہٹا ہوا تھا) اس موقف سے قریب کرنے اور باہمی تطبیق دینے کی سعی کی تاکہ ان کا کلام مخالف اہل سنت والجماعۃ نہ رہے۔ اس میں تعبیری دقت اور نزاکت پیدا ہوئی، مگر یہ کوئی جرم کی بات نہ ہو کہ کسی شرح سے ... [illegible]

اسے سلف کے موقف سے ہٹنے نہ دیا جائے ورنہ اس تمثالی ابنیت کے نکتے اور اس کی عرض کردہ تفسیر نیز اس کی تعبیر میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے اور نہ ہی یہ نکتہ کسی نص کے خلاف ہے بلکہ اسکی تائیدیں اور بھی محققین کے کلاموں میں ملتی ہیں تاہم پھر بھی یہ کوئی اصرار کے قابل بات نہیں اس کا رد اور قبول میرے نزدیک دونوں برابر ہیں۔

سوال :- (۲) کیا آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین نہیں مانتے یا بیک وقت دو خاتم مانتے ہیں جو عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی کتاب میں خاتم تسلیم کر رہے ہیں۔

جواب :- معاذ اللہ یہ دو خاتموں کا عنوان آپ کی اس تحریر سے پیشتر کبھی حاشیۂ خیال میں بھی نہیں گذرا چہ جائیکہ اس غلط تخیل کو کتاب کا موضوع بنا کر پیش کیا جاتا۔ اس کتاب کی کسی عبارت کا نہ یہ مفہوم ہے اور نہ میری مراد ہے نہ عقیدہ عیسیٰ علیہ السلام کو اسرائیلی سلسلہ کے پیغمبروں کا خاتم کہا گیا ہے اس سے نہ تو حضورؐ کے خاتم النبیین ہونے پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے نہ دو متوازی خاتم ثابت ہوتے ہیں۔

حقیقی معنی میں خاتم الانبیاء صرف حضورؐ کی ذات اقدس ہے۔ آپ زمانی خاتم بھی ہیں۔ منصب و مقام کے لحاظ سے بھی خاتم ہیں اور ذات کے لحاظ سے بھی خاتم ہیں۔ اس لئے خاتم النبیین کے لفظ کا جب اطلاق کیا جائیگا تو صرف آپ ہی کی ذات مراد ہوگی جیسا کہ میں نے اپنے ایک رسالہ خاتم النبیین میں اس کو کافی مدلل اور مبرہن طریقہ پر واضح کیا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام اگر اسرائیلی سلسلے کے خاتم ہیں تو نہ وہ اصطلاحی ختم نبوت ہے کہ ان پر خاتم النبیین کا اطلاق صحیح ہو اور نہ اس سے حضورؐ کی ختم نبوت پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے کہ دو متوازی خاتموں کا سوال کھڑا کیا جائے۔

بہرحال قرآن کریم نے جب ہر قوم اور ہر امت کے لئے ہادی، نذیر اور رسول تسلیم کئے ہیں اور قوموں کی ابتدا بھی ہوتی ہے اور انتہا بھی جس سے ان اقوام میں نبوتوں کا آغاز بھی ہوا ہے اور اختتام بھی۔ اسی طرح ان میں رسولوں کے سلسلے میں سب سے آخری پیغمبر کو اس سلسلے کا خاتم کہدیا جائے تو اس سے حقیقی خاتم النبیینؐ کے منصب خاتمیت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ ان کو خاتم کہنا ایک اضافی اور نسبتی بات ہوگی اور حضورؐ کو خاتم کہنا ایک حقیقی اور منصبی بات ہوگی جس سے معاذ اللہ نہ ختم نبوت کے انکار کا شاخسانہ کھڑا ہو سکتا ہے اور نہ دو متوازی خاتموں کا عنوان ہی پیدا کیا جا سکتا ہے

(مولانا) محمد عبد الحق صاحب انچارج دفتر اہتمام
دار العلوم دیوبند یکم شعبان ۱۳۸۲ھ

ٹھیک اسی وقت وہ فتویٰ بھی پریس میں آگیا جس کے بارے میں ہم بتا چکے ہیں کہ مفتی مہدی حسن کے رجوع سے مایوس ہو کر علمائے کرام اس کی تسوید کی فکر میں تھے۔ اس فتوے کے مرتب نائب مفتی مولانا جمیل الرحمان صاحب ہیں اور اس پر مفتی محمود احمد صاحب اور دار العلوم کے تمام بڑے استادوں کے دستخط ثبت کرائے گئے ہیں۔ اس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ مہتمم صاحب کی جن عبارتوں پر اعتراض کیا جا رہا ہے وہ اعتراض سے بالاتر ہیں۔

اظہار رائے ہم بعد میں کریں گے۔ ابھی آپ شاندار رجوع بھی ملاحظہ فرمالیں جو اسی جوار بھاٹے کے دور میں مفتی مہدی حسن صاحب کی طرف سے شائع ہوا اور اس کے اثر سے سمندر کا خروش بظاہر مائل بہ سکون ہوگیا۔

لطف یہ ہے کہ رجوع پر آمادگی ظاہر کئے بغیر حضرت مفتی صاحب اُنھی دنوں اپنے وطن چلے گئے تھے اور وہاں سے حضرت مہتمم صاحب کو جو خط لکھا تھا اس میں بھی کم و بیش یہ الفاظ ضرور موجود تھے کہ رجوع مصلحت کے خلاف معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سے ذاتیات و شخصیات متاثر ہوتی ہیں۔

اس کے بعد خدا ہی بہتر جانتا ہے کیا پیش آیا اور کس نے مفتی صاحب کے قلب میں رجوع کا خیال ڈال دیا کہ چند ہی روز بعد الجمعیۃ (بابت ۱۱ رجنوری ۱۹۶۳ء) میں مندرجہ ذیل اطلاع خود مفتی صاحب کی طرف سے شائع ہوتی ہے۔

نقل مطابق اصل

ملاحظہ ہو :-

اطلاع عام

جمادی الاول ۵/۸۲ھ کو مولوی انیس الرحمٰن قاسمی ساکن ضلع بھاگلپور نے بغیر ذکر نام کتاب کے چند اقتباسات پیش کرتے ہوئے سوال کیا تھا کہ یہ چار اقتباسات اہل سنت والجماعت کے مسلک کے مطابق ہیں یا نہیں قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کا جواب دیا جائے۔ سائل کی ایمانداری اور دیانت کا تقاضا تو یہ تھا کہ جس کتاب کے اقتباسات پیش کئے گئے صاحب کتاب سے خود براہ راست مراد و مقصود کو متعین کرا لیتے کہ ان عبارتوں کا کیا مطلب ہے۔ اہل سنت کے مسلک اور ظاہر قرآن و حدیث کے مخالف تو نہیں ہے لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ کتاب و مصنف دونوں کا نام چھپا کر سوال کی صورت میں اقتباس پیش کئے گئے۔ اقتباسات اپنی ظاہری صورت و عبارت کے لحاظ سے ظاہر آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ اور مسلک اہل سنت کے خلاف معلوم ہوتے ہیں ۲۰ ۵/۸۲ھ کو اس کا جواب لکھا گیا اور روانہ ہو گیا۔ اس جواب کے پہنچنے کے بعد بھی سائل کے ذمہ ضروری تھا کہ صاحب کتاب سے دیانت داری کے ساتھ مقصود و مراد کی وضاحت کرا لیتے لیکن یہ صورت بھی نہ ہوئی بلکہ ہنگامہ اور فتنہ برپا کرنے کے لئے سوال و جواب کو اخبار دعوت دہلی مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۶۲ء میں شائع کرا دیا۔ جواب کے لکھنے کے وقت تک مجھے کتاب کے نام اور صاحب تالیف ہی کا علم نہ تھا کہ یہ اقتباس کتاب "اسلام اور مغربی تہذیب" کے ہیں جو کہ حکیم الاسلام حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم کی تصنیف ہے۔ اخبار دعوت دیکھنے کے بعد علم ہوا اور کتاب مطالعہ کیا۔ جواب صرف قاسمی مکتب خیال کے مولوی انیس الرحمٰن صاحب کے اعتماد پر لکھا گیا تھا۔ اخبار دعوت کی اشاعت کے بعد علم ہوا کہ مقصود حقانیت نہ تھی عوام مسلمانوں کو پریشان کرنا اور کسی قلبی مضمر شے کا بخار نکالنا تھا ورنہ اشاعت نہ کی جاتی اور مؤلف مدظلہ سے تحقیق کی جاتی۔ اب جبکہ حضرت مہتمم صاحب مدظلہم نے اپنے وضاحتی بیان میں اقتباسات کے متعلق توضیح و تشریح فرمادی اور مقصود کو ظاہر فرما دیا جو اخبار الجمعیۃ مورخہ ۲ شعبان میں شائع ہو چکا ہے اس کی روشنی میں جواب کا حکم ان اقتباسات کتاب اور صاحب کتاب پر عائد نہیں ہوتا۔ اس بیان کی روشنی میں میں اپنے جواب سے رجوع کرتا ہوں کہ یہ جواب اس وضاحت بیان کے بعد کالعدم ہے اطلاع عوام کے لئے یہ تحریر لکھ دی تاکہ فتنہ اور ہنگامہ پیدا نہ ہو۔ اسلامی جماعت کے ارکان کے ایمان و دیانت کا مقتضیٰ یہ نہیں ہے جو اس قسم کے سوال میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اس سے کئی سال قبل بھی گمنام اقتباس نقل کرکے جواب حاصل کیا گیا تھا۔ سائل کی ایمانداری یہ چاہتی ہے کہ اپنے آپ کو اور کتاب و مؤلف کو ظاہر کر دے کہ میں کون ہوں اور کیوں سوال کر رہا ہوں اور کتاب کا نام کیا ہے تاکہ اس کے سیاق و سباق کو دیکھا جائے تاکہ مقصود واضح ہو۔ الحاصل جواب سے میں نے رجوع کر لیا ہے۔ وضاحت کے بعد جواب کا وہ حکم اقتباسات پر عائد نہیں ہے۔ والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ۔

سید مہدی حسن (صدر مفتی دارالعلوم دیوبند)

یہ ہوا اس ڈرامے کا ڈراپ سین اور اب ہم اس کے مالہٗ وما علیہ پر اپنے خیالات ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔

سب سے پہلے غور طلب یہ ہے کہ مہتمم صاحب کی جن عبارتوں پر مفتی صاحب نے اندھیرے میں فتویٰ لگایا ہے ان کی حقیقت کیا ہے کیا؟ کیا وہ واقعی ایسی ہیں کہ ان پر بے دھڑک کفر و الحاد کا فتویٰ لگا دینا چاہئے یا مفتی صاحب نے حدود عدل سے تجاوز کیا ہے؟

ہماری قطعی رائے یہ ہے کہ مہتمم صاحب کا پیش کردہ اگرچہ کسی اعتبار سے لائق گرفت ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ اسے شد و مد کے ساتھ کفر و الحاد کا گنجینہ قرار دے دیا جائے اور ایسی شدید رائے ظاہر کی جائے جیسی مفتی صاحب نے کی ہے۔ مہتمم صاحب نے اپنے وضاحتی بیان میں جو کچھ کہا ہے اس کے بغیر بھی خود ان اقتباسات ہی سے جن پر فتویٰ دیا گیا ہے [illegible]

تمثال و تشبیہ بیان کی جا رہی ہے اور یہ بھی کہ باپ اللہ کو نہیں بلکہ ایک انسان کو بنایا جا رہا ہے جو اگرچہ سب سے بڑا پیغمبر ہے مگر بہرنوع بشر ہی ہے اور کسی بیٹے کا باپ بننے کی صلاحیت اس میں موجود ہے۔ بڑی سے بڑی بات جو ان اقتباسات کے بارے میں کہی جا سکتی تھی یہ تھی کہ ان کا مصنف خیالات کی تاریک وادیوں میں بھٹک گیا ہے اور اندیشہ ہے کہ بہت سے قارئین کو بھی بھٹکا دے گا۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ ایسے نکات قابلِ رد ہیں، گمراہ کن ہیں، جرم و گناہ ہیں۔

الفاظ کچھ بھی ہوتے اور کتنا ہی غصہ مفتی صاحب ظاہر فرماتے، لیکن مسلمان پر کفر و الحاد کا فتویٰ آخری فتویٰ ہے۔ عدالت کسی قتل کے ملزم کو پھانسی کی سزا اسی وقت دیتی ہے جب ثبوت و شہادت شبہ سے بالاتر ہو اور کوئی گنجائش بری کرنے کی باقی نہ رہ جائے۔ ذرا سی بھی خامی رہ جانے پر وہ نسبتاً ہلکی سزا پر اکتفا کرتی ہے کیونکہ پھانسی کی سزا تو آخری سزا ہے جسے وثوق و یقین ہی کی حالت میں نافذ کیا جا سکتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح مفتی صاحب کو توازن، تعادل اور حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیئے تھا۔

ویسے ہمیں یقین ہے کہ فتوے کے پیچھے دین کی محبت اور کفر و الحاد کی نفرت ہی کارفرما ہے مفتی صاحب نے سمجھا کہ ہو نہ ہو یہ عبارتیں کسی سڑے ہوئے بدعتی یا قادیانی کی ہوں گی۔ کج فکر اور شیطان زدہ لوگ آج جیسی جیسی فتنہ سامانیاں کر رہے ہیں ان کا تقاضا تو یہی ہے کہ باطل و فاسد عادی اور موہوم نکات کی سختی سے تردید و توبیخ کی جائے۔ مفتی صاحب کا جوش اور غصہ خالص نفسانیت کا پیدا کردہ نہیں بلکہ اصلاً وہ جذبۂ حق پرستی ہی سے جڑا ہوا تھا مگر صرف جذبہ اور جوش ہی دنیا میں سب کچھ نہیں اس کے ساتھ بردباری تفکر، توازن اور دوراندیشی بھی ہونی چاہیئے۔ مفتی صاحب نے اگر مستفتی سے صاحب اقتباس اور کتاب وغیرہ کا حال دریافت کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا جب بھی ٹھنڈے دل و دماغ سے اقتباسات کے ایک ایک لفظ پر غور کرنا اور یہ دیکھنا ضروری تھا کہ جرم کس درجے کا ہے۔ جرم چوری بھی ہے اور قتل بھی لیکن ظاہر ہے کہ جو حاکم جوش میں آکر چور کو پھانسی کا فیصلہ سنا دے گا وہ ظالم و خاطی ہی سمجھا جائیگا۔ سزا جرم کے مطابق ہونی چاہیئے۔ کفر کا فتویٰ بے دریغ صادر کر دینا حالانکہ اقتباسات میں کفر صریح موجود نہیں بے احتیاطی کا شاہکار ہے۔ گمراہ کن باتوں پر جوش میں آجانا بجا لیکن دین کی محبت کے ساتھ باطن کے چھپے ہوئے چور بھی شریک کار ہو جائیں تو خیر سے زیادہ شر کو فروغ ملے گا۔ حضرت مفتی صاحب بظاہر بڑی مؤثر شخصیت کے مالک ہیں انھیں دیکھ کر جنیدؒ و شبلیؒ کا دھوکا کھایا جا سکتا ہے لیکن سچ مچ کی بزرگی شکل و صورت اور لباس و وضع کا جزوِ لازم نہیں ہے۔ ہم آگے ان گوشوں کی نشاندہی کریں گے جن سے یہ اندازہ کیا جا سکے گا کہ ممدوح کے اخلاقِ عالیہ کن منازل میں ہیں۔

اولاً ہمیں مہتمم صاحب کی خدمت میں عرض کرنا ہے کہ جناب کا زیرِ بحث لطیفہ بلاشبہ کفر و الحاد نہیں ہے مگر ایسا بے ضرر اور پاکیزہ بھی نہیں ہے کہ اس کی مغالطہ انگیزی کا اتنا ہنگامہ خیز مظاہرہ سامنے آجانے کے بعد بھی آپ اسکی اباحت پر اصرار کئے جائیں۔

علمی پہلو سے اس پر یہ اعتراض ہے کہ آپ اپنے اعتراف ہی کے مطابق بیان تو فقط ایک لطیفہ کر رہے ہیں مگر بیچ میں لے آئے ہیں شریعت کو اور بات کہی ہے اس انداز میں کہ لطیفے اور عقیدے کے مابین کوئی واضح امتیاز باقی نہیں رہ گیا ہے۔

مفسرینِ سلف کی عظمت اپنی جگہ مسلّم لیکن کیا آپ اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ ان کی ضخیم تفسیروں میں لعل و یاقوت کے ساتھ کوڑا کباڑ بھی ہے اور علوم و معارف کے پہلو بہ پہلو خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں ان کی سخن سنجیوں کو میزانِ تنقید میں تولے بغیر سینے سے لگا لینا کم سے کم آپ جیسے علم و فضل والے کے شایانِ شان نہیں ہے آپ کی روشن فکری سے امت بے غبار اجالوں کی امید رکھتی ہے۔

مفسرین کی طرح صوفیا بھی قصورِ فکر سے بالاتر نہیں ہیں۔ شیخ عبدالغنی نابلسی اگر ایک شوشہ چھوڑ گئے ہیں تو کیا ضروری ہے کہ آپ جیسا معقولیت پسند اسے سلیقے میں ڈھالنے کی سعی فرمائے۔

آپ کے لطیفے کی بنیاد اس پر ہے کہ حضرت جبرئیلؑ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں آئے تھے۔ ہم عرض کرتے ہیں یہ بنیاد ہی مضبوط نہیں۔ درجۂ یقین تک پہنچانے والی کوئی دلیل اس پر نہیں پائی جاتی۔ پھر مان لیں کہ ایسا ہوا ہی تھا تو جناب کو معلوم ہے کہ ہمارے حضورؐ کی خدمت میں جبرئیلؑ دِحیہ کلبیؓ کی شکل میں متعدد بار آئے ہیں۔ یہ تشکل اگر لطائف کے اخذ و استنباط کے لئے موزوں ہو سکتا ہے تو کیا اسلاف میں سے کسی مستند عالم و شیخ نے ایسا ہی کوئی نکتہ دِحیہ کلبیؓ اور حضورؐ کی نسبت کے بارے میں بھی پیدا کیا ہے؟ کیا کوئی کہہ سکا ہے کہ چونکہ جبرئیلؑ دحیہ کلبیؓ کی شکل میں آئے اس لئے دحیہ کلبیؓ حضورؐ کے تمثیلی استاد ہیں' یا ان کے بشری وجود کو ملکوتیت سے کوئی تمثیلی رابطہ ہے؟

ہمارے علم کی حد تک کسی نے یہ نکتہ نہیں پیدا کیا پھر حضرت عیسٰیؑ کے سلسلے میں اس کی کیسے گنجائش نکل سکتی ہے؟ علاوہ ازیں یہ عجیب بات ہے کہ جبرئیلؑ حضورؐ کی شکل میں آئے تو اس جزوقتی تشکل کو تو آپ نے حضورؐ کے لئے تمثالی والدیت کے لئے کافی سمجھ لیا لیکن جو جبرئیلؑ پھونک مار رہے تھے' انھیں والد قرار نہیں دیا' حالانکہ منطق تو یہ کہتی ہے کہ تمثالی والدیت جبرئیلؑ میں نسبتاً زیادہ پائی جا رہی ہے۔ مثال کے طور پر زید کو لیجئے جس نے بکر کا بھیس بدل کر طلحہ کے گولی مار دی۔ تو کیا یہ کہنا مضحکہ خیز نہ ہوگا کہ تمثالی قاتل بکر ہے اور زید تو قاتل ہی نہیں ہے کیونکہ اس نے بکر کا میک اپ کر رکھا تھا۔ ظاہر ہے اگر آپ کسی حیثیت اور درجے کا قاتل بکر کو بھی قرار دینے لگیں گے تو یہ بہرحال ضروری ہوگا کہ اصل قاتل زید ہی کو مانیں۔

آپ کا نکتہ یہ بتاتا ہے کہ جبرئیلؑ کے پھونک مارنے کے عمل کو آپ بمنزلۂ مباشرت قرار دے رہے ہیں۔ چنانچہ اپنی کتاب میں آپ نے صراحۃً یہ الفاظ لکھے بھی ہیں کہ پھونک گویا بمنزلۂ نطفہ کے ہے۔ ہم نہیں جانتے حضرت مریمؑ جیسی عفیفہ کے سلسلے میں جس کی پاکدامنی پر قرآن گواہی دے رہا ہے اس طرح کے الفاظ استعمال کرنا آپ کے دل نے کیسے گوارا کر لیا' حالانکہ وجدان اس پر تلملا اٹھتا ہے۔ مانا کہ آپ تشبیہ و تمثیل کی کر رہے ہیں مگر الفاظ کی ظاہر شکل بھی اپنا ایک اثر رکھتی ہے۔ ہر شخص بہت آسانی سے بتا دیتا ہے کہ میں فلاں ماں باپ کا بیٹا ہوں لیکن یہ وہ کبھی نہ کہے گا کہ میں فلاں مرد و زن کی صحبت کا نتیجہ ہوں۔ حالانکہ معنوی فرق دونوں باتوں میں قطعاً نہیں' لیکن الفاظ بدلے ہوئے ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ آنجناب کے نکتے کا ہے کہ اگرچہ زور فقط تمثیل و تشبیہ پر ہے مگر الفاظ جنسیت کا رنگ و بو لئے ہوئے ہیں جو حضرت مریمؑ جیسی عفیفہ کے ذکر و بیان میں ذوقِ سلیم پر نہایت گراں گذرتے ہیں۔

علاوہ ازیں جبرئیلؑ کا حضورؐ کی شکل میں آنا تو ولادتِ عیسٰیؑ کے ساتھ اسی طرح کوئی ربط نہیں رکھتا جس طرح جبرئیلؑ کا دِحیہ کلبیؓ کی شکل میں آنا ملکوتیت یا معلّمی سے کوئی ربط نہیں رکھتا مگر پھونک مارنا بہرحال ربط رکھتا ہے لہٰذا اول درجے کا تمثالی باپ جبرئیلؑ کو قرار دیجئے پھر کہیں حضورؐ تک نوبت پہنچے گی۔ بلکہ شاید پہنچے ہی گی نہیں' کیونکہ ایک بچے کے دو باپ تو شاید کوئی بھی پسند نہ کرے گا۔

یہ بات بھی نظر انداز نہ فرمائیے کہ قرآن نے بشرِ سوی کے الفاظ فرمائے ہیں یعنی حضرت جبرائیلؑ ایک ایسے بشر کی شکل میں آئے جو جسمانی عیوب سے پاک تھا۔ زیادہ سے زیادہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی تفسیر کے مطابق یوں کہہ لیجئے کہ جوان و خوبرو انسان کی شکل میں آئے۔ اگر فرض کر لیں کہ وہ شکل محمدیؐ ہی تھی تب بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسے غیر معمولی اہمیت دیکر نکات کی راہ ہموار کرنا درست نہیں ہے کیونکہ کچھ بھی اہمیت ہوتی تو قرآن خود بتا دیتا کہ جبرئیلؑ محمدؐ کی شکل میں آئے۔ نہ بتانا دلالت کرتا ہے کہ تشخص بے ضرورت ہے۔ اگر تمثالی ابنیت عند اللہ بھی

کوئی چیز ہوتی تو اس کی طرف لطیف اشارہ کرنے کیلئے قرآن بجائے بنتِ موسیٰ کے حضور ﷺ کا نام لے دیتا۔ آخر کیوں ایسے نکتے نکالے جائیں جو خدائے تعالیٰ کی حکمت و بلاغت سے متصادم ہوں اور ثمرہ تحصیل حاصل کے سوا کچھ نہ ملے۔ ہماری ناقص رائے میں جن بزرگوں نے حضور ﷺ کی تعظیم و تفضیل میں کمزور روایات پر اعتماد کیا ہے اور سورج کو روشن ثابت کرنے کے لئے خیالی بلند پروازیوں سے کام لیا ہے انھوں نے دین کو فائدے سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ مولانا جامی کی شواھد النبوت اس کی نمایاں مثال ہے۔ کسی پڑھے لکھے نوجوان کو اسے پڑھوا دیجئے علمائے سلف کی بصیرت اور روایات کی تقدیس سے اس کا اعتماد اٹھ جائے گا۔ ہمارا یہ دور تو خاص طور پر اس کا متقاضی ہے کہ روایت پرستی اور نکتہ سنجی میں ویسی ہی احتیاط ملحوظ رکھی جائے جیسی وبا کے زمانے میں بعض حلال و طیب غذاؤں اور پھلوں کے استعمال میں رکھی جاتی ہے۔

یہ علمی و منطقی رُخ ہوا۔ اثرات و نتائج کے اعتبار سے دیکھئے تب بھی اس نکتے کا فائدہ نقصان سے کم ہے۔ اس نکتے سے حضور ﷺ کی عظمت وہی لوگ مانیں گے جو پہلے ہی سے انھیں عظیم مان رہے ہیں، لیکن گمراہی ان سادہ لوحوں کے حصے میں آئے گی جو قرآن کی صریح و محکم اطلاع پر نہایت سادگی اور اطمینان کے ساتھ حضرت عیسیٰ کو بغیر باپ کا مولود سمجھ رہے تھے۔ ان کی سادگی اور اطمینان میں اس لطیفے سے جونک لگ سکتی ہے۔ گویا فائدے کی شکل تو تحصیل حاصل کے سوا کچھ نہیں مگر نقصان کی شکل میں ذہنی فساد بالکل نقد ہے۔

صاحب فاران نے بجا طور پر اشارہ کیا ہے کہ نکتہ سنجی کا یہ اسلوب قادیانیوں، بدعتیوں اور مشرکوں تک کے لئے کمک فراہم کرتا ہے۔ قادیانیوں نے بھی تو ظلی اور بروزی نبوت کے نکتے نکال کر کفر و زندقہ کا آئینہ خانہ تعمیر کیا۔ تمثالی والدیت اور تشبیہی ابنیت اگر کوئی شے ہے تو نبوت کے ظلی اور بروزی اور ذیلی ہونے میں کیا استحالہ باقی رہ جاتا ہے۔

حاصل یہ کہ یہ نکتہ کسی طرح اس لائق نہیں ہے کہ حضرت مہتمم جیسا معقولیت پسند اور فہیم و ذکی عالم اس پر جمے۔ ہم بہ ادب مشورہ پیش کرتے ہیں کہ کتاب کے اگلے ایڈیشن سے اسے خارج کر دیا جائے۔ انشاء اللہ ثم انشاء اللہ یہ مشورہ ضرور قبول کیا جائے گا۔ وللہ عاقبۃ الامور۔

اب ذرا مفتی صاحب کے احوال پر نظر کی جائے۔ فتویٰ انھوں نے جو کچھ دیا اس کے شرعاً غلط ہونے کا تو ابھی ہم ایضاح کر چکے۔ مزید خامی اس کی یہ ہے کہ زبان فتوے کی استعمال نہیں کی گئی۔ کفر صریح پر تو غیر معمولی غیظ و غضب سمجھ میں آتا ہے مگر محض تخمینے سے کسی عبارت کی طرف بدترین ملحدانہ مقاصد منسوب کر کے شعلے اگلنا فہم سے بالاتر ہے۔ مغلوب الغضبی اور منصب افتاء میں کوئی ربط نہیں۔ مفتی کو ایک جج کی طرح جذبات سے بلند ہو کر شریعت کے احکام بیان کرنے چاہئیں۔ اسے اٹکل اور اندازے کے سہارے آگ برسانا زیب نہیں دیتا۔

خیر فتویٰ تو جیسا تھا تھا۔ کمال رجوع میں کیا گیا ہے ایک بھونڈی سی کہاوت ہے کہ "کمہار پر تو بس نہ چلا گدھے کے کان اینٹھ دیئے"۔ اس کی بہترین مثال یہ رجوع ہے کھلی بات ہے کہ رجوع صرف اور صرف اس لئے کیا گیا ہے کہ بدقسمتی سے نشانہ وہ مہتمم صاحب بن گئے جن کے زیر اہتمام چلنے والی درسگاہ میں مفتی صاحب برسر روزگار ہیں۔ اسکے سوا کوئی معقول بنیاد رجوع کی موجود نہیں کیونکہ مہتمم صاحب نے اپنی توضیحات میں اپنے نکتے کو جوں کا توں رکھا ہے اور اسی خیال پر زور دیا ہے جو مفتی صاحب کی دانست میں سرے سے کفر و الحاد تھا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ اقتباسات میں کوئی ابہام رہا ہو جو توضیح کے بعد دور ہو گیا ہو۔ اقتباسات صراحتہً بتا رہے تھے کہ حضرت عیسیٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین دعویٰ حقیقی ابنیت و والدیت کا نہیں کیا گیا ہے

بلکہ بات تمثیل و تشبیہ کی ہے۔ توضیح میں مہتمم صاحب نے اسی کو کھول کر بیان کر دیا۔ پھر کیا گنجائش تھی کہ مفتی صاحب کا مزعومہ کفر و الحاد اسلام سے بدل جاتا۔ ادنیٰ ریب کے بغیر واضح ہے کہ رجوع کا تعلق جذبۂ حق پرستی سے قطعاً نہیں۔ تاہم اتنے بڑے صاحب منصب سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ جو قصور سرزد ہو چکا ہے اس کی لیپا پوتی میں وہ دانشوروں جیسی ہنرمندی کا ثبوت دیں گے اور اپنی کمزوری پر خوبصورت سا غلاف چڑھا سکیں گے مگر واحسرتا کہ رجوع اتنا بے نمائش فرمایا جس پر معمولی علم و عقل کے لوگ بھی مطمئن نہ ہو سکیں گے اور موصوف کی دیانت و تقویٰ کے بارے میں بہت بری رائے قائم کی جائے گی۔

لطیفہ دیکھئے کہ رجوع میں سائل کی دیانت کا ماتم فرما رہے ہیں۔ پھر یہ بھی درس دیا جا رہا ہے کہ وہ بجائے مفتی صاحب سے پوچھنے کے خود صاحب کتاب سے مقصود معین کراتا۔ کوئی پوچھے یہ فرائض فتویٰ پوچھنے والوں ہی کے ذمے ہیں تو حضرت مفتی صاحب کس بات کی تنخواہ پا رہے ہیں؟

مزید لطیفہ یہ کہ مفتی صاحب کی فہمائش کے مطابق ان کا گرماگرم فتویٰ مل جانے کے بعد بھی سائل کے لئے ضروری تھا کہ صاحب کتاب سے دیانتداری کے ساتھ مقصود و مراد کی وضاحت طلب کرتا۔

کیسی مضحکہ خیز باتیں ہیں جو اتنا بڑا مفتی کر گذرا ہے کھلی بات ہے کہ ان نصیحتوں کے کوئی معنی اس وقت تو متصور ہو سکتے تھے جب مہتمم صاحب کی وضاحت کردہ مراد اقتباسات والی مراد سے مختلف ہوتی لیکن جب بداہتہً ایسا نہیں ہے تو آخر کونسی وہ مخفی مراد ہے جسے مفتی صاحب کا فتویٰ پا لینے کے بعد بھی سائل مہتمم صاحب سے پوچھنے کی زحمت اٹھاتا۔

اور سائل بیچارا تو مفتی صاحب کے خیال میں سارے جہت فراہم کرنے کا ذمہ دار تھا مگر خود موصوف کا فریضہ اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا کہ استفتاء پڑھیں اور فتویٰ دے ڈالیں حالانکہ آپ خود کہہ چکے ہیں کہ پہلے کہا بھی چکے ہیں لہٰذا اس کا اجمالی ... موجود ہے۔

حد یہ ہے کہ جس لاپروائی اور جلد بازی کا ارتکاب خود موصوف سے ہوا ہے اس کا بارِ گناہ وہ خواہ مخواہ سائل کے سر ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ عمل ایسے لوگوں کا نہیں ہو سکتا جن کا ضمیر زندہ، دل بیدار اور روح عدل و دیانت کی گرویدہ ہو۔

اور سنئیے۔ سائل دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں۔ انھوں نے کبھی نہیں کہا کہ میں جماعت اسلامی کا ممبر ہوں۔ بس یہ قصور تو ان کا ہے کہ مفتی صاحب کا کارنامہ جماعت اسلامی کے اخبار دعوت میں چھپنے بھیج دیا۔ اسی سے مفتی صاحب نے یہ فیصلہ فرما دیا کہ وہ جماعت اسلامی کے رکن ہیں۔ جماعت اسلامی سے موصوف کی کد کوئی راز نہیں۔ وہ بڑے شوق سے یہ فتویٰ دیا کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی والوں کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ خیر چلئے جماعت اسلامی والوں کے لئے تو جنت کے سب دروازے بند سہی لیکن سوال تو یہ ہے کہ کیا اخلاقی اصول بھی جماعت اسلامی والوں کے لئے کسی نئے قرآن و حدیث سے اخذ کئے جانے چاہئیں؟ اگر نہیں تو پھر اسے بے ایمانی کون کہے گا کہ ایک شخص مصنف کا نام بتائے بغیر کچھ اقتباسات من و عن پیش کر دیتا ہے اور اتنی تفصیل سے پیش کرتا ہے کہ مصنف کی مراد پورے طور پر واضح ہو جائے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ سائل کو اس کی مردم شناسی کی داد ملنی چاہیئے تھی۔ سائل نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس وقت جو بزرگ دار العلوم کی مسندِ افتاء کے صدر نشین ہیں وہ چہرے دیکھ کر فتوے دینے والوں میں ہیں۔ اور یہ بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ ایک بار ٹھوکر کھا چکنے کے بعد بھی ان کی جلد بازی رنگ لا کر رہے گی۔ وہی ہوا مفتی صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور لگا دی ڈائنامیٹ کے فلیتے میں آگ۔ اب اپنی غفلت اور جلد بازی کا تپہا غریب سائل پر نکال رہے ہیں۔ کوئی انصاف کرے کہ جس عدالت میں ملزم کا حسب نسب اور چہرہ مہرہ دیکھ کر فیصلے دیئے جاتے ہوں وہاں کسی ملزم کو برقعہ پہنا کر لے جانے والا بے ایمان کہلائے گا یا قابل رحم؟ سائل جانتا تھا کہ مہتمم صاحب کا نام اگر اس نے لکھ دیا تو مفتی صاحب فتویٰ دینے کے عوض قصیدۂ مدحیہ لکھ بھیجیں گے

القصہ "رجوع" قارئین کے سامنے ہے۔ اس کا بین السطور قطعی طور پر اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ چونکہ عبارتیں مہتمم صاحب کی نکلیں اس لئے سجدۂ سہو کر لیا گیا۔ معاملہ کسی اور کا ہوتا تو مفتی صاحب کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی۔ کاش موصوف مولانا اشرف علیؒ جیسے بزرگوں کی روش اختیار کرتے کہ جب بھی اپنے کسی قصور سے مطلع ہوتے بلا تکلف اعلان فرما دیا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ انانیت کے اینچ پینچ، مشیخت کی ادائیں اور مصنوعی وقار کی ملمع سازی ان میں نہ تھی۔ مفتی صاحب کو بس اتنا ہی اعلان کر دینا تھا کہ بھائیو! مجھ سے بھول ہوئی۔ میں نے سمجھا تھا کہ یہ باتیں کوئی ایسا ویسا آدمی کر رہا ہے۔ مگر یہ تو حضرت مہتمم صاحب کی نکلیں، لہٰذا فتویٰ جھوٹا اور رجوع برحق۔ اس پر کچھ لوگ یہ تو کہہ سکتے تھے کہ مفتی صاحب نے بزدلی دکھائی۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ان کے جذبۂ عدل کا ورق بالکل کورا ہے۔ بزدلی کا الزام اتنا بھیانک نہیں کہ زہد و تقویٰ کی بالکل ہی نفی کر دے۔ بلکہ اس پر ترس بھی کھایا جا سکتا تھا، لیکن بحالتِ موجودہ یہ الزام بھی قائم اور ترس کی بھی کوئی گنجائش نہیں کہ اپنے قصور کو دوسروں کے سر منڈھنے والے ظالموں پر کسی کو رحم نہیں آتا

آئیے کچھ ذکرِ جمیل اس اضطراری فتوے کا بھی ہو جائے جو بڑے مفتی صاحب کے رجوع سے قبل اکابر اساتذہ نے اپنے دستخطوں سے مزین کر کے نکالا ہے۔ اسے نقل ہم اسلئے نہیں کرتے کہ جگہ برباد ہو گی۔ اس کے مرتب نائب مفتی جناب جمیل الرحمٰن صاحب ہیں جو بڑے سنجیدہ اور فہیم بزرگ ہیں۔ ان سے ہماری خاصی رسم و راہ ہے اور وقت بے وقت ہم ان سے بعض مسائل میں بھی رہنمائی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر ہم برملا یہ کہہ دیں کہ اس فتوے کی ترتیب میں انھوں نے مکھی پر مکھی مارنے کے سوا کچھ نہیں کیا ہے تو اسے شاید طوطا چشمی اور محسن کشی جیسے خطابات کا مستحق قرار دیا جائے گا بلکہ نمک حرامی بھی کہا جا سکتا ہے اگر چائے کا نمک حلال و حرام کے دائرے میں آ سکتا ہو۔

لیکن اپنے اس قلم کے ہاتھوں ہم بھی مجبور ہیں جو اٹھتا ہے تو ناموں اور چہروں کا لحاظ کئے بغیر عدل و صداقت ہی کے خطِ استوا پر گردش کرتا ہے۔

ہمارے کرم فرما نائب مفتی صاحب اس اعتبار سے بلا شبہ داد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے امتثالِ امر میں چول سے چول خوب بٹھائی ہے، لیکن اتنی چوک ان سے بہر حال ہوئی کہ بس ایک ہی رُخ پر ڈھل گئے۔ حالانکہ فتویٰ کفر کی بجا تردید کرتے ہوئے وہ سچی بات بھی ادب کے ساتھ لکھ سکتے تھے کہ ایسے نکات و لطائف خطرناک ضرور ہیں انھیں طاقِ نسیاں ہی پر رکھا جائے تو دین و ملّت کے حق میں بہتر ہو گا۔

تعجب اس پر ہوتا ہے کہ انچارج صاحب کے بقول اکابر اساتذہ نے دستخط پورے فکر و غور کے بعد کئے ہیں مگر یہ سامنے کی بات انھیں بھی محسوس نہ ہو سکی کہ مہتمم صاحب کے اقتباسات کو قطعاً بے غبار اور بے خطر بتلانے کی صورت میں اس فتوے کی حیثیت ڈرامے سے زیادہ کچھ نہ ہو گی۔ لوگ اب اتنے سادہ لوح نہیں رہے کہ سچائی اور ناٹک میں امتیاز نہ کر سکیں۔ پھر قہر یہ ہے کہ سائل کو مطعون کرنے کی جو روش بڑے مفتی صاحب نے اختیار فرمائی تھی وہی بلفرقِ مراتب اس "اجماعی" فتوے میں بھی موجود ہے۔ گویا دنیا کو یہ یقین کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے کہ بے لاگ انصاف کرنے والا دار العلوم کے احاطے میں اب کوئی باقی نہیں۔

نورٌ علیٰ نور یہ ہے کہ انچارج صاحب نے اپنے نوٹ میں یہ الفاظ بھی رقم کئے ہیں:۔

> "ہمیں امید ہے کہ متعلقہ حلقوں کی غلط فہمی اس فتوے کی اشاعت کے بعد دور ہو جائے گی"
>
> (الجمعیۃ ۲۱ جنوری ۱۹۶۳ء)

گویا جن بڑے مفتی صاحب نے غیر محتاط اور عاجلانہ فتویٰ دیکر غلط فہمیوں کی تخم ریزی کی ہے ان سے تو علمائے کرام کو کوئی تعرض نہیں۔ ان کی ستم ظریفی کی طرف اشارہ بھی اس اضطراری فتوے میں نہیں پایا جاتا مگر روئے سخن ہے اُن غریب عوام کی طرف جو ستم ظریفی کا شکار ہو گئے ہیں

یہ ایسا ہی ہے جیسے ججوں کی ایک ٹیم قاتل کو تو نظر انداز کر دے مگر مقتولوں کو اپنی مسیحائی کا قائل کرنے کیلئے قبرستان میں وعظ فرمائے۔

قابلِ ذکر ایک اور شوشہ بھی ہے جو اگرچہ غیر متعلق سا ہے مگر ہمارے سیرت و کردار کا ایک گوشہ اس سے بھی روشنی میں آتا ہے۔ وہ یہ کہ اس شاندار اجتماعی فتوے کا نوٹ لکھ کر محترم انچارج صاحب نے اپنے نام نامی کے ساتھ "مولنا" بھی رقم فرمایا ہے۔ بظاہر تو یہ بریکیٹ (خطوطِ وحدانی) میں ہے جس سے دیکھنے والا یہ قیاس کرے گا کہ یہ لفظ اخبار والوں نے اپنے طور پر بڑھا دیا ہے مگر پوست کندہ حقیقت اسکے سوا کچھ نہیں کہ اس کی نوعیت "بقلم خود" ہی کی ہے۔

فرض کیجئے آپ بغیر ثبوت کے یہ ماننے کو تیار نہ ہوں کہ عامر عثمانی صحیح کہتا ہے پھر بھی یہ تو آپ کو ماننا ہی پڑے گا کہ اس کی ذمہ داری لازماً علماء ہی پر ہے۔ الجمعیۃ علماء کا آرگن ہے۔ اس کے دفتر میں یا دارالعلوم کی چار دیواری میں جس نے بھی اس لفظ کا اضافہ کیا اسے جاہل نہیں کہا جا سکتا تو کیا یہ انتہائی رنج کی بات نہیں ہے کہ خود مولنا حضرات ہی ہر کہ و مہ کے لئے لفظ مولانا لکھ کر اس بھاری بھرکم القاب کی مٹی پلید کریں اور رہی سہی وقعت بھی اسکی ختم ہو جائے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ لفظ "مولوی" تو اصطلاحاً ایک ایسا لفظ ہے جسے عربی مدارس کے کسی بھی سند یافتہ شخص کے لئے بولا جا سکتا ہے چاہے اس کی علمی استعداد کیسی ہی گئی گذری کیوں نہ ہو لیکن مولانا کا یہ معاملہ نہیں اس کا تعلق کسی شخص کی اُن دینی و علمی خدمات سے ہے جو منظر عام پر آکر متعارف ہو چکی ہوں۔ محترم انچارج جناب محمد عبد الحق صاحب ممکن ہے اپنے بطن میں علم و دانش کا پورا خزانہ رکھتے ہوں لیکن اس خزانے کے لعل و گہر جب تک باہر نہ آجائیں انھیں مولنا لکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر شخص محض اپنی ذاتی معلومات کی بناء پر جسے چاہے مولانا لکھ دیا کرے اور کوئی وقار اس معزز خطاب کا باقی نہ رہ جائے۔ بظاہر یہ چھوٹی سی بات ہے لیکن کسی فرد یا گروہ کے منہاجِ فکر اور مزاج و کردار کا اندازہ کرنے کے لئے ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں سرچ لائٹ کا کام دیتی ہیں۔

یہ تمام کہانی قارئین کو جو بھی تأثر دے ہمارے نزدیک اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ علماء کے فتاویٰ کا وقار بُری طرح مجروح ہوا ہے۔ ایک اتنی بڑی دینی درسگاہ سے بار بار ایسے غلط فتوے نکلتے رہنا یہ معنی رکھتا ہے کہ آئندہ ہمارے کسی بھی فتوے پر بھروسہ نہ کیا جائے اور ہم جب کسی حقیقی مرتد پر بھی ارتداد کا فتویٰ لگائیں تو لوگ حقارت سے ہنس کر کہیں۔ ان مسخروں کے فتووں کا کیا اعتبار۔ یہ وہی تو ہیں جو اپنے شیخ مولانا نانوتوی اور اپنے مہتمم مولنا محمد طیب پر غلط طور پر کفر و الحاد کے فتوے لگا چکے ہیں۔ یا حسرتا کہ دنیوی اقتدار ختم ہونے کے بعد علماء کے پاس فقط یہی ایک سرمایہ تو باقی رہ گیا تھا جسے فتویٰ کہتے ہیں اب اس میں بھی گھن لگتا جا رہا ہے اور ہم بدنصیب اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے تابوت میں کیلیں ٹھونکنے کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

اس آخری بات پر ہم اپنی زبان بند کرتے ہیں کہ اظہار خیال میں ہمارے قلم سے اگر کوئی غلط بات نکلی ہو تو حضرت مہتمم صاحب اور حضرت مفتی صاحب۔ دونوں بزرگوں کے لئے تجلی کے صفحات حاضر ہیں وہ اپنے قلم گوہر رقم سے ہماری اصلاح بلکہ گوشمالی تک کر سکتے ہیں۔ نیز نائب مفتی صاحب یا انچارج صاحب کچھ لکھنا چاہیں تب بھی ہمیں اشاعت میں تامل نہ ہوگا۔

(عامر عثمانی)

چند ادبی کتابیں

اُردوئے معلّٰی — غالب کے شہرۂ آفاق خطوط جن کے مطالعہ سے لوگ آج بھی اُردو لکھنا سیکھتے ہیں۔ دل آویز۔ تیکھے، رواں، ذہانت کے مظہر حُسنِ اتفاق سے مطبع مجتبائی کے چھاپے ہوئے کچھ نسخے فراہم ہو گئے ہیں۔ شائقین جلد فائدہ اُٹھائیں۔ ہر دو حصہ مکمل پانچ روپے (مجلّد چھ روپے)

آزادی کا ادب — کمیونزم کی جارحانہ تحریک ادب کو کس طرح اپنا نقاب بناتی ہے
مرتبہ گوپال متل۔ تین روپے

غبارِ خاطر — مولانا ابو الکلام آزاد کے مشہور قلم پارے۔ چھ روپے

کلیاتِ اقبال — ڈاکٹر اقبال کے کلام کا انتخاب۔ پانچ روپے۔

ارمغانِ حجاز — ڈاکٹر اقبال کا اُردو اور فارسی کلام۔ ساڑھے تین روپے

شاہنامۂ اسلام (جدید) — مدیر تجلی جناب عامر عثمانی کا شعری کارنامہ۔ وصالِ پیغمبرؐ اور اس کے بعد کیا ہوا کیسے ہوا؟ مجلّد تین روپے۔

مضامینِ رشید — مشہور مزاح نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی کے دلچسپ مضامین کا مجموعہ۔ ساڑھے پانچ روپے

گُلفشنی — مجموعۂ کلام جناب مخمور سعیدی دو روپے

جانے پہچانے اور وہ جنھیں کوئی نہیں جانتا
معروف و غیر معروف شعراء کے مختصر حالات اور نمونۂ شعر
مرتبہ انور صابری۔ چار روپے

نبضِ دوراں — مشہور شاعر جناب انور صابری کا مجموعۂ کلام۔ ساڑھے تین روپے۔

آتشِ گل — جگر مرادآبادی کا وہ مجموعۂ کلام جس پر بھارت سرکار نے ہزاروں کا انعام دیا۔ پانچ روپے۔

کلیاتِ جگر — جگر صاحب کے منتشر کلام کا شیرازہ چھ روپے

نقشِ حکمت — مزاح نگار شاعر احمق پھپھوندوی کا مجموعۂ کلام۔ تین روپے۔

سوانح مولانا حسین احمد مدنیؒ — مشہور شاعر جناب انور صابری صاحب کی منظوم پیش کش۔ مولانا مدنیؒ کے حالات، ان کا شعور اور ضروری کوائف شعر کی زبان میں بیان کیے گئے ہیں قیمتِ مجلد ڈیڑھ روپیہ۔

بیانِ غالب شرح دیوانِ غالب — قیمت مجلّد پونے سات روپے

شرح بالِ جبریل — قیمت مجلّد ۹ روپے۔

شرح بانگِ درا — قیمت مجلّد ۹ روپے۔

مکتبہ تجلّی۔ دیوبند (یو۔پی)

مستقل عنوان

تجلّی کی ڈاک

سرکارِ رسالت کے والدین

سوال :- از حبیب احمد - لاہور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین مومن تھے یا کافر اور کافر تھے تو کیا ان کے ساتھ بھی اللہ کا وہی معاملہ ہوگا جو دوسرے کفّار کے ساتھ ہے یعنی دائمی جہنم ؟ یہ سوال میرے لئے بڑی اُلجھن کا باعث بنا ہوا ہے - اس سلسلے کی بعض بحثیں نظر سے گذریں مگر تشفّی نہیں ہوئی - ایک مولوی صاحب نے بتایا ہے کہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ حضورؐ اپنی والدہ کی قبر پر تشریف لے گئے اور دعا کرنے پر ان کی والدہ زندہ ہوئیں پھر آپ پر ایمان لائیں -

اگر ایسی کوئی صحیح حدیث ہے تب تو کم سے کم والدہ کی حد تک تشویش ختم ہو جاتی ہے مگر والد کی بات پھر بھی معلق رہی - بڑی مہربانی ہوگی اگر اپنے خاص سیر حاصل انداز میں اس مسئلے پر روشنی ڈالیں گے - میری طرح اور بہت سے لوگ اِس بارے میں رہنمائی کے طالب ہیں -

الجواب :-

جی تو نہیں چاہتا تھا کہ اس سوال کو قابلِ اعتناء سمجھا جائے - آخر یہ ذہنی عیاشی نہیں تو اور کیا ہے کہ جن مسائل کا کوئی ادنیٰ تعلق بھی ہماری دینی و دنیاوی ضروریات سے نہیں ان میں سر کھپایا جائے - معلوم ہوتا ہے پاکستان کے اکثر علماء کو دنیا کے تمام کاموں سے فرصت ہو گئی ہے اور صرف یہی مشغلہ باقی رہ گیا ہے کہ لایعنی اور لاحاصل مباحث کو ہوا دیتے رہیں - یہ آثار بہت بُرے ہیں - صاف نظر آ رہا ہے کہ اس کا انجام دین و ملت کے حق میں نہایت ہولناک ہوگا -

جی نہ چاہنے کے باوجود جواب اس لئے دیا جا رہا ہے کہ شاید ہمارے جواب سے کچھ لوگوں کو سبق حاصل ہو اور وہ لاحاصل بحثوں میں دلچسپی لینے سے باز آ جائیں -

صاف صاف سُن لیجئے کہ جس مسئلے کا آپ نے ذکر فرمایا اس میں ہم بالکل کورے ہیں اور یہ کورا پن ہمیں اس درجہ مرغوب ہے کہ اگر کوئی زبردستی بھی ہمارے کانوں میں اس موضوع کے حقائق و دقائق ڈالنے کی سعی کرے گا تو ہم کانوں میں انگلیاں دے لیں گے - استغفر اللہ کیا تعلق ہے ہمارا اس بحث سے کہ حضورؐ کے والدین کافر تھے یا مومن - وہ کچھ بھی رہے ہوں اللہ بہتر جانتا ہے اور اسی کو ان کے بارے میں فیصلہ کرنا ہے - یہ آپ کا بھی ایمان ہے اور ہمارا بھی کہ اللہ کے فیصلے سرتاسر منصفانہ ہوتے ہیں پھر کس چیز کا غم اور کیسی تشویش ؟

رہی حدیث کی بات - تو اگر واقعۃً کسی صحیح حدیث میں کوئی وضاحت آ گئی ہوتی تو دو ٹوک فیصلہ دینے میں کوئی دشواری نہ ہوتی لیکن اس سلسلے کی تقریباً تمام ہی روایات ہماری نظر میں ہیں - ان میں کوئی بھی ایسی نہیں جسے صحیح تو کجا حسن ہی مانا جا سکے - مثلاً یہی حدیث جس کا مضمون آپ نے درج سوال کیا ہے گہری نظر رکھنے والے محققین کے نزدیک موضوع ہے - اس کا متن یہ ہے جسے خطیب نے حضرت عائشہؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے -

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرجت لقبر	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اپنی والدہ کی قبر پر گیا

أمّي فسألت الله ان يحييها فاحياها فآمنت بي ثم ردّها الله تعالى

سو اللہ سے التماس کیا کہ میری والدہ کو زندہ کر دیجئے۔ اللہ نے انھیں زندہ کر دیا اور مجھ پر ایمان لائیں اور پھر اللہ نے انھیں پہلی حالت پر لوٹا دیا۔

اسے محدّث ابن الجوزیؒ نے اپنی کتاب الموضوعات میں ذکر کیا ہے اور قاضی شوکانی نے بھی الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعۃ میں لیا ہے۔ اس کی سند میں بعض راوی تو ضعیف ہیں اور ایک راوی محمد بن زیاد النقّاش کذّاب و وضّاع ہے۔

دشواری یہ آ پڑی کہ حافظ جلال الدین سیوطیؒ نے ابن الجوزیؒ کے تعقب میں ایک کتاب تصنیف فرمائی ہے جس کا نام اللآلی المصنوعۃ ہے۔ حافظ سیوطیؒ بہت بڑے عالم تھے، لیکن حضورؐ کی محبت اور حدیث کی عقیدت میں وہ حقِ تحقیق ادا کرنے کے عوض جگہ جگہ تسامح اور ڈھیل کا طرزِ عمل اختیار کر گئے ہیں۔ متعدد مقامات پر انھوں نے ابن الجوزیؒ کا رد بہت کمزور کیا ہے اور انھی مقامات میں سے ایک یہ مقام بھی ہے۔ اس روایت کو انھوں نے نہیں مانا، بلکہ خاصی مفصل بحث کے بعد صرف ضعیف قرار دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ مناقب و فضائل کے باب میں آنکھیں بند کر کے ضعیف روایات قبول کرنے میں پیش پیش رہے ہیں انھوں نے اسے بھی قبول کر لیا اور ابن الجوزیؒ متشدد مشہور کر دیئے گئے۔ حالانکہ جذبات سے بلند ہو کر تحقیق کی جائے تو ابن الجوزیؒ کا تشدد بہت کم جگہوں پر ثابت ہے اور جہاں ثابت ہے وہاں بھی اس کی بنیاد دینی مصالح پر ہے۔

حاصل یہ ہے کہ راوی نقّاش کو حافظ سیوطیؒ نے رعایت دے کر روایت کو وضع کے خانے سے نکال دیا، لیکن یہ محققانہ فیصلہ نہیں تھا۔ حافظ ذہبیؒ نے جو فنِ رجال میں صفِ اوّل کے امام سمجھے گئے ہیں اپنی المیزان میں محمد بن مسعر کے ترجمے کے تحت نقّاش کو جھوٹا یا اختراع کرنے والا ثابت کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس روایت کے ایک راوی محمد بن یحییٰ الزہری بھی حافظ ابن حجر کی تصریحات کے مطابق بالکل ناقابلِ اعتماد ہیں (لسان المیزان میں ان کا کچّا چٹھا موجود ہے)

اس اعتبار سے اس روایت کا موضوع ہونا ہی اقرب ہے۔ تاہم حافظ سیوطیؒ ہی کی بات درست فرض کر لی جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ ضعیف کہی جا سکتی ہے۔ صحیح یا حسن ہونے کا تو سوال ہی نہیں۔

اسی طرح اس موضوع کی بعض اور روایات ہیں جو یا تو من گھڑت ہیں یا حد درجہ ضعیف و منکر۔ ان میں صرف والدہ ہی کا نہیں، والد کا بھی ذکر ہے۔ بعض میں تو ابو طالبؓ اور حضورؐ کے ایک رضاعی بھائی کا بھی تذکرہ ہے۔

پھر کیا ہم ان روایات کو ساقط الاعتبار قرار دے کر یہ یقین کر لیں کہ حضورؐ کے والدین کافر ہی تھے مومن نہیں؟

ہرگز نہیں۔ ہمیں نہ آپ کو کسی کو بھی یہ حق نہیں کہ اس باب میں کوئی قطعی فیصلہ دے اور خواہ مخواہ آخرت کی ذمہ داری مول لے۔ مذکورہ بالا تصریحات کا مقصود صرف یہ تنبیہ ہے کہ معتقدات کی بنیاد مضبوط احادیث پر رکھنی چاہیئے یہ مناسب نہیں کہ جو روایات ہماری خواہش اور پسند کی تائید کرنے والی ہوں انھیں بلا تحقیق قبول کر لیا جائے۔

دراصل کمزور فہم کے لوگ شعوری یا نیم شعوری طور پر یہ خیال رکھتے ہیں کہ حضورؐ کے والدین کا کافر ہونا حضورؐ کی شان میں قدح اور جرح کا موجب ہے، لہٰذا کمزور روایات کے سہارے انھیں مومن ثابت کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ایسا خیال کرنا ہی سرے سے غلط ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو دیکھئے جو ہماری ملت کے سردار اور ایک جلیل القدر پیغمبر ہیں ان کے والد کافر تھے۔ اسی طرح حضرت نوحؑ کے بیٹے کافر تھے۔ تو کیا باپ یا بیٹے کا کفر ان عظیم الشان پیغمبروں کے حق میں طعن و نقصان کا موجب ہوا؟

ظاہر ہے کہ نہیں اور ہرگز نہیں۔ غالباً اسی حقیقت کو نمایاں کرنے کے لئے اللہ نے اپنے ان دونوں پیغمبروں کے کافر باپ اور بیٹے کا تذکرہ قرآن میں ثبت و دوام کر دیا لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ پھر اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کیا وجہ طعن ہو سکتی ہے کہ ان کے والدین کا ایمان ثابت نہ ہو سکے۔ وہ فرض کر لو کافر بھی تھے تو ہوا کریں اللہ اپنی مصالح تکوینی کو بہتر سمجھتا ہے ہم چون و چرا کرنے والے کون؟

ویسے عاجز کی رائے اس مسئلے میں اور ہے۔ وہ یہ کہ حضورؐ کے والدین مصطلحہ اسلام سے قبل گذر گئے۔ تنہا اسلام ہی کا واجب القبول ہونا اور کسی اور کتابی یا غیر کتابی دین کے قبول کرنے سے کفر لازم آنا ظاہر ہے ظہور اسلام کے بعد ہی متصور ہو سکتا ہے۔ ظہور اسلام سے قبل کے لئے تو اللہ کا یہ ارشاد ہمارے لئے مشعل راہ ہے:-

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (البقرۃ ۶۲)	بیشک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لایا اور اچھے عمل کئے تو انکا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور نہیں ان کیلئے کوئی خوف اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

گویا اپنے اپنے زمانوں میں جو لوگ آسمانی مذاہب پر ڈھنگ سے ایمان لائے یا آسمانی مذاہب کی تحریف کے بعد جن لوگوں نے جذبۂ حق پرستی کے تحت تمام مذاہب کے اچھے اچھے اصول وعقائد اختیار کرلئے (ان ہی کا نام صابئین ہے) ان کو اللہ تعالیٰ کفار کے نہیں بلکہ مومنین کے زمرے میں شامل فرما رہے ہیں۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ حضورؐ کے والدین جس زمانے میں تھے وہ ایسا زمانہ تھا کہ تمام سابق دینوں کو ان کے پیروؤں نے بدل ڈالا تھا۔ آسمانی کتابوں میں تحریف کردی گئی تھی اور یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ کوئی شخص کسی خالص اور بے آمیز دین تک رسائی حاصل کرسکے۔ اس وقت مصطلحہ اسلام کا تو کوئی سوال تھا ہی نہیں کہ اس کو نہ ماننا کفر کہلاتا، لہٰذا حضورؐ کے والدین عبداللہ اور آمنہ کے بارے میں کیسے دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کافر ہی تھے۔ جب ظہور اسلام سے قبل یہودیت، نصرانیت اور صابئیت بھی ایمان باللہ اور عمل نیک کے ساتھ اسلام ہی قرار دی گئی ہے یعنی موجب مغفرت تو کیوں ہم یہ مان لیں کہ حضورؐ کے والدین ایمان باللہ سے خالی تھے۔ استطاعت سے زیادہ انسان مکلف ہی نہیں ہے۔ استطاعت اس وقت اس کی نہیں تھی کہ کسی غیر محرف آسمانی دین تک ان کی رسائی ہوجاتی۔ بحالت مجبوری اگر یہ باقاعدہ کوئی دین اختیار نہیں کرسکے اور ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کا وہ مصفّا تصور انھیں نصیب نہیں ہوسکا جو اصلاً یہودیت ونصرانیت میں موجود تھا اور اسلام نے آکر اسے نکھارا ہے تو کفر کا فیصلہ ان کے حق میں کیسے کیا جاسکتا ہے۔

حاصل یہ کہ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کو کافر قرار دینے کی معقول وجوہ موجود نہیں ہیں۔ لیکن اگر کسی بے فکرے کو ان کے کفر ہی پر اصرار ہو تو ہمیں گھبرا کر ضعیف وموضوع روایات کا سہارا لینے اور نیازمندانہ معذرت کی راہ اختیار کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ والدین کا کفر اولاد کی ذاتی جلالت وفضیلت میں کچھ بھی کمی نہیں کرتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

غلطی ہائے مضامین مت پوچھ

سوال ۲:- از شکیل صدیقی۔ کراچی۔

سیر الصحابہ مشہور کتاب ہے دار المصنفین (اعظم گڑھ) کے رکن مولانا شاہ معین الدین ندوی کی مرتب کی ہوئی۔ اسکی ساتویں جلد میں اس واقعہ کو پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی۔

حضرت حجر بن عدی رضی اللہ عنہ ایک صحابی گذرے ہیں وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے طرف داروں میں تھے اور حضرت امیر معاویہؓ کے سخت دشمن تھے انھیں برا بھلا بھی کہتے تھے مگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی دست برداری کے بعد وہ خاموش ہوگئے لیکن امیر معاویہؓ نے جب زیاد کو عراق کا گورنر بنایا تو وہ زیاد کی تندخوئی اور بداخلاقی کی وجہ سے اس کے مخالف ہوگئے" یہاں تک کہ ایک بار زیاد کوفہ کی جامع مسجد میں تقریر کر رہا تھا اور نماز کا وقت آخر ہو رہا تھا تو اس پر حضرت حجر اور ان کے ساتھیوں نے زیاد کو متنبہ کرنے کیلئے اس پر کنکریاں پھینکیں۔ زیاد نے امیر معاویہؓ کو حجرؓ کی اور دوسرے چند لوگوں کی بڑھا چڑھا کر اور نمک مرچ لگا کر شکایتیں بھیجیں! امیر معاویہ کے حکم سے حضرت حجر اور دوسرے گیارہ آدمی بیڑیاں پہنا کر دار الخلافہ لے جائے گئے جن میں سے چھ آدمی تو چھوڑ دیے گئے اور چھ آدمی

ؔ شکایت اس انداز پر کی کہ یہ لوگ عنقریب بغاوت پیدا کریں گے کہ جس میں پیوند نہ لگ سکے گا۔

جن میں حضرت حجر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے قتل کردیئے گئے۔
حضرت حجر نے شہادت سے قبل دو رکعت نماز پڑھی اور وصیت کی کہ میری بیڑیاں نہ اُتارنا خون نہ دھونا کہ میں اسی حالت میں معاویہؓ سے پل صراط پر ملوں گا۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے حضرت حجر کی شہادت کی خبر کو سُنا تو بہت متاثر ہوئے اور رونے لگے خاص طور سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بڑا صدمہ تھا۔ چنانچہ جب امیر معاویہؓ حج کرنے کے بعد مدینہ منورہ گئے تو حضرت عائشہؓ نے اُن سے کہا کہ تم کو حجر اور اُن کے ساتھیوں کو قتل کرنے میں خدا کا خوف نہیں معلوم ہوا۔

امیر معاویہؓ نے جواب دیا کہ اُن کو اُن لوگوں نے قتل کیا جنھوں نے اُن کے خلاف شہادت دی۔ علامہ ابن عبدالبر حضرت حجر کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

کان من فضلاء الصحابہ وصغر سنہ من کبارھم

یعنی حجر فضلائے صحابہؓ میں تھے اور اپنی صغیر سنی کے باوجود بڑوں میں شمار ہوتے تھے۔

کیا یہ واقعات صحیح ہیں؟ اگر صحیح ہیں تو اُن کی آپ کیا تاویل فرماتے ہیں۔ اگر غلط ہیں تو اُن کے لئے کیا دلائل ہیں؟ براہ کرم تجلی میں اس کا جواب دیجئے۔

الجواب:۔

ہمارے سامنے اس وقت "سیر الصحابہؓ" نہیں ہے لہٰذا نقل فرمودہ واقعے کے سیاق و سباق کو دیکھے بغیر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ فاضل مصنف نے اسے کس مقصد سے درج کتاب کیا ہے۔ اگر ان کا مقصد خدانخواستہ قارئین کو یہ تأثر دینا ہے کہ حضرت معاویہؓ انتہائی بے رحم، جابر اور سفاک تھے تو اس سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔

بات اہم ہوتی تو ہم کوشش کر کے سیر الصحابہؓ حاصل کرتے لیکن ہماری نگاہ میں کسی ایسی روایت کو شمہ برابر اہمیت حاصل نہیں ہے جس سے حضرت معاویہؓ جیسے جلیل القدر صحابی کے اس مرتبہ و مقام پر حرف آتا ہو جو قوی ترین روایات سے ثابت ہو چکا ہے اور اکابر اہل سنت کے عقائد میں شامل ہے

ارباب بصیرت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ دونوں کے بارے میں معاندین نے ایسی ایسی واہی روایات گھڑی ہیں کہ الامان والحفیظ۔ بدقسمتی سے ان میں کی بعض روایات اہل سنت میں بھی بار پا گئیں اور زود اعتباری کی رَو میں ان کو درست مان لیا گیا حالانکہ وہ یا تو سرے سے من گھڑت تھیں یا ان میں صحیح کے ساتھ غلط کی آمیزش تھی یا ان سے متعلق بعض ایسی تفصیلات حذف ہو گئی تھیں کہ اگر وہ حذف نہ ہوتیں تو مقصود و منشاء کچھ اور ہی نکلتا۔

حاصل یہ کہ حضرت معاویہؓ بڑے حلیم، بڑے عادل اور نرم خو تھے۔ انھوں نے کبھی کسی کو موت کے گھاٹ نہیں اُتارا جب تک کہ شرعاً قتل کا جواز پیدا نہیں ہو گیا۔ حافظ ابن کثیر البدایۃ والنھایۃ میں لکھتے ہیں:۔

"بنی عباس کے دورِ اقتدار میں جب حال یہ تھا کہ لوگ اہلِ اقتدار کی چاپلوسی کے طور پر بنو امیہ کے محاسن کو قبائح اور ہنر کو عیب بنا کر پیش کرتے تھے ایک مرتبہ کچھ طالبینِ علم امام الائمہ سلیمان بن مہران الاعمش کے حضور جمع ہوئے اور حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی معدلت گستری کا تذکرہ کرنے لگے۔ اس پر امام نے فرمایا۔ "جب عمر و ابن عبدالعزیز کے عدل کی تم اس قدر تعریف کرتے ہو تو اگر معاویہؓ کا زمانہ پالیتے تو ان کے بارے میں کیا کچھ نہ کہتے"۔ طلباء نے کہا — "کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان کی بردباری کی تعریف کرتے؟" — امام نے فرمایا — "نہیں بخدا ان کے عدل کی تعریف کرتے"۔ اور یہی امام اعمش حضرت مجاہد کا قول نقل کرتے ہیں کہ — "اگر تم معاویہؓ کا زمانہ پاتے تو یقیناً یہی کہتے کہ معاویہؓ ہدایت یافتہ ہیں"۔

اور یونس بن عبید العبدی نے قتادہ بن دعامۃ السدوسی سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا:۔

"اگر تم لوگ معاویہؓ کے اعمال و افعال سے دوچار ہوتے تو تم میں سے اکثر کہہ اُٹھتے کہ ھٰذا المھدی (یہ ہدایت یافتہ ہیں)۔ (فی التعلیق المنتقم صفحہ ۲۲۲،۲۲۳)

اور یہ بھی سن لیجئے کہ جن راویوں کے نام لئے گئے ہیں وہ معمولی لوگ نہیں تھے۔ اعمش تو مشہور امام ہیں۔ یونس بن عبید کے بارے میں ہشام بن حسان کی تصدیق یہ ہے کہ

"میں نے یونس کو خالصۃً اللہ کے لئے طلب علم کرنے والوں میں ممتاز و منفرد پایا۔"

قتادۃ بن دعامۃ کے بارے میں سعید بن المسیب جیسے امام وقت کا یہ قول ملتا ہے کہ:۔

"ہمارے پاس قتادہ سے زیادہ احفظ کوئی عراقی نہیں آیا۔"

ابو اسحاق السبیعی کے بارے میں روایت ہے کہ انھوں نے معاویہؓ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اے لوگو اگر تم معاویہؓ کو یا ان کے عہدِ حکومت کو پاتے تو یقیناً یہی کہتے کہ معاویہ ہدایت یافتہ ہیں" (حوالۂ مذکورہ)

یہ تصدیقی روایات نہ بھی ہوتیں تو وہ معتبر روایات ہی حضرت معاویہؓ کی تحسین میں بہت کافی تھیں جن میں ان کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا منقول ہے کہ اے اللہ معاویہؓ کو ہادی و مہدی بنا۔ (ترمذی، مسند احمد وغیرہ)

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ازالۃ الخفاء میں فرماتے ہیں:۔

باید دانست کہ معاویہ بن ابی سفیانؓ رضی اللہ عنہ یکے از اصحاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بود وصاحبِ فضیلتِ جلیلہ در زمرۂ صحابہ رضوان اللہ علیہم زینہار در حق او سوءِ ظن نہ کنی و در ورطۂ سب او نا فتی تا مرتکب حرام نہ شوی۔	جاننا چاہئے کہ معاویہ بن ابی سفیانؓ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے تھے اور جماعت صحابہؓ میں بہت بڑی فضیلت کے مالک تھے ہرگز ان کے حق میں بدگمانی مت کرنا اور انھیں برا کہنے کے چکر میں مت پڑنا تاکہ مرتکب حرام نہ ہو جاؤ۔

+ + + +

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ رقم فرماتے ہیں:۔

و در احادیث نبویہ باسناد ثقات آمدہ کہ حضرت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام در حق معاویہ دعا کردہ اللّٰھم علمہ الکتاب والحساب وقہ العذاب وجائے دیگر در دعا فرمودہ اند اللّٰھم اجعلہ ھادیاً مھدیاً و دعائے آنحضرت صلعم مقبول۔	احادیث نبویہ میں معتبر اسناد سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ کے حق میں یہ دعا فرمائی تھی کہ اے اللہ اسے کتاب (قرآن) اور حساب کا علم دے اور عذاب سے بچا۔ اور ایک اور موقعہ پر حضورؐ نے ان کے لئے دعا فرمائی کہ اے اللہ اسے ہادی مہدی بنا۔ اور رسول اللہ صلعم کی دعا بلا شبہ مقبول ہے۔

+ + + + +

+ + + + +

(مکتوب نمبر ۲۵۱ بنام خواجہ محمد اشرف۔ دفتر اول)

اسی مکتوب میں حضرت مجدد شارح مواقف کی ایک غلطی پر تنبیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

قد صح انہ کان اماماً عادلاً فی حقوق اللہ سبحانہ وفی حقوق المسلمین	یہ بات یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ معاویہؓ امام عادل تھے اللہ اور مسلمانوں کے حقوق پورے کرنے میں۔

اسی خط میں مزید رقم فرماتے ہیں جس کا بہ نگاہ اختصار صرف ترجمہ پیش خدمت ہے:۔

"امام مالکؒ جو تابعی ہیں اور اپنے وقت میں مدینے کے سب سے بڑے عالم تھے ان کا فتویٰ یہ ہے کہ جو شخص معاویہؓ یا ان کے ساتھی عمرو بن العاصؓ کو گالی دے اسکو قتل کر دینا واجب ہے۔ نیز امام مالکؒ نے حضرت معاویہؓ کے گالی دینے والے کو ایسا ہی بدترین مجرم سمجھا ہے جیسا کہ ابوبکرؓ یا عمرؓ کے گالی دینے والے کو۔"

مکتوب ۵۸ دفتر اوّل صفحہ ۷۷ میں فرماتے ہیں:۔

"عبداللہ ابن المبارکؒ سے کسی نے پوچھا کہ معاویہ اور عمر ابن عبدالعزیز میں کون افضل ہے؟ جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں حضرت معاویہؓ جس گھوڑے پر سوار ہوئے اس کی ناک میں پہنچی ہوئی گرد بھی عمر ابن عبدالعزیز سے کئی درجہ بہتر ہے۔"

وہ جنگ جو حضرت معاویہؓ نے علیؓ سے کی اور جس کے تعلق سے معاویہ کو نہ جانے کیا کیا کہا جاتا ہے اس کے بارے میں بھی حضرت مجدد الف ثانی ہی مکتوب ۲۵۱ میں فرماتے ہیں:۔

"امام غزالیؒ نے صراحت کی ہے کہ معاویہؓ کی وہ لڑائی خلافت کے لئے نہیں تھی بلکہ قصاص عثمانؓ کی خاطر تھی اور شیخ

ابن حجرؒ نے بھی اسے اہل سنت کے عقائد میں شمار کیا ہے۔"

اکابر کے یہ چند ارشادات بطور نمونہ نقل کئے گئے۔ ان سے حضرت معاویہؓ کے بارے میں جو بنیادی رائے بنتی ہے وہی ہر صحیح العقیدہ مسلمان کے لئے دانتوں سے پکڑنے کے قابل ہے۔ اب سیر الصحابہ ہو یا کوئی بھی کتاب اس کی صرف ان روایات پہ بھروسہ کیا جاسکتا ہے جو اس بنیادی رائے پر خطِ تنسیخ کھینچنے والی نہ ہوں۔ ایسی ہر روایت یا تو بالکلیہ من گھڑت ہے جو معاویہؓ کو بجائے عادل اور ہادی و مہدی ہونے کے ظالم و فاسق باور کرائے یا اس میں کچھ الٹ پلٹ ہے۔ یا کوئی خاص جزو حذف کر دیا گیا ہے۔ ہم سیر الصحابہ کے فاضل مصنف کی دیانت سے بدگمان نہیں ہیں، لیکن جو تأثر ان کی منقولہ روایت سے ملتا ہے اگر اسکی بیخ کنی انھوں نے اپنی کتاب میں نہیں کی یا کوئی مناسب توجیہہ پیش کئے بغیر انھوں نے یہ روایت کتاب میں ٹانک دی ہے تو اللہ کے یہاں انھیں اپنا جواب سوچ رکھنا چاہئے۔ جو اونچے درجے کے اہل سنت معاویہؓ کو علیؓ کے مقابلہ میں خطائے اجتہادی کا مرتکب مانتے ہیں وہ بھی یہ ہرگز نہیں کہتے کہ حکومت و سیادت کے دوسرے معاملات میں بھی معاویہؓ ظالم و عاصی تھے۔ حتیٰ کہ امام ابن الہمام نے فتح القدیر میں خاص طور پر تنبیہ کر دی ہے کہ صاحب ہدایہ نے جو معاویہ کو سلطان جائر کہا تو اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت علیؓ سے جنگ کے معاملے میں وہ جائر تھے نہ کہ اپنے حاکمانہ فیصلوں کے معاملوں میں۔ معاویہؓ کا عدل، حلم، رواداری، تدبر اور حسن انتظام تو ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا اس طرح کی روایات کے بارے میں جیسی آپ نے سیر الصحابہ سے نقل کی ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ادھوری اور مبہم ہے۔ اگر معاویہؓ نے حضرت حجرؓ یا کسی بھی شخص کو قتل کرایا ہوگا تو لازماً اس سزا کے لئے مسل میں کافی شافی وجوہ موجود ہوں گے۔ جن افعال کے لئے قانون نے سزائے موت ہی مقرر کی ہو ان کا ارتکاب کوئی صحابی یا تابعی یا شیخ جو بھی کرے گا موت کی سزا پائے گا اور سزا دینے والا اس لئے ملعون نہیں قرار پائے گا کہ جرم کے مرتکبین ذاتی حیثیت میں بلند مرتبہ یا زاہد و عابد تھے۔

یہ ہو سکتا ہے اور آئے دن ہوتا ہے کہ جھوٹی شہادتوں اور احوال و کوائف کی اتفاقی ترتیب سے ایک ایسا شخص مجرم ثابت ہو جاتا ہے جو فی الحقیقت مجرم نہیں ہوتا لیکن قاضی یا حاکم عالم الغیب تو ہیں نہیں وہ تو ظاہر پہ ہی فیصلہ دے سکتے ہیں اور ظاہر پر ہی فیصلہ دینے کا انسان مکلف ہے۔

اللہ تعالیٰ صحابہؓ کے بارے میں سوءِ ظن سے ہم سب کو بچائے معاویہؓ یا کسی بھی صحابی کے ساتھ اللہ تعالیٰ آخرت میں جو بھی معاملہ کرے وہ مالک و مختار ہے مگر ہمیں اپنے قلوب کو صحابیت کی عظمت و تقدیس سے معمور رکھنا چاہئے کہ یہی رسالتؐ کی تعظیم و تقدیس کا زینہ ہے۔ صحابیت کا احترام کم ہوا تو سمجھو رسالتؐ کا احترام بھی کم ہوا ونعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

خطائے اجتہادی

سوال ۳:— از محمد — لکھنؤ

کیا اکثر فقہی اور کلامی مسائل کی طرح قیام میلاد کے بارے میں یہ گنجائش ہے کہ اسے اجتہادی اختلاف کی حیثیت دی جائے اور اسے جائز اور ناجائز ماننے والے ایک دوسرے کے عمل کو خطائے اجتہادی پر محمول کر کے رواداری اختیار کریں؟

میں نے حضرت مولانا کفایت اللہ دہلوی مرحوم سے سنا تھا کہ رسول اللہ صلعم کی تشریف آوری کے خیال سے قیام کو ضروری سمجھنا جہالت اور ضلالت ہے۔ یعنی اگر تشریف آوری کا عقیدہ نہ ہو تو جہالت اور ضلالت نہیں ہے۔

بعض علماء وحدت الوجود کی رو سے صریح مشرکانہ افعال کی تاویل کر کے تکفیر سے اجتناب کرتے ہیں۔

اکثر لوگ میلاد میں رسمی طور پر قیام کرتے ہیں۔ شاید ہی کوئی جاہل تشریف آوری کا عقیدہ رکھتا ہو۔ قیام کی اصل کچھ ہی ہو لیکن اب اس کی حیثیت ایک رسم کی ہے ـــــ سوٹ میں جو نکٹائی باندھی جاتی ہے وہ اصلاً صلیب کی شبیہ ہے۔ جب اہل یورپ نے مسیحیت کو قبول کیا تو صلیب کے نشان یعنی ٹائی کو اپنے لباس کا جزو بنا لیا۔ لیکن اب اس کی یہ حیثیت نہیں ہے، حضرت مسیحؑ اور ان کے دین کے دشمن یہودی بھی سوٹ میں ٹائی استعمال کرتے ہیں۔ علماء اسلام بھی اسے ناجائز نہیں کہتے

اسی طرح مرورِ زمانہ سے قیام کی حیثیت بدل گئی۔

الجواب :۔

پہلی بات تو یہ سمجھ لیجئے کہ مسئلہ تنہا ایک قیام کا نہیں ہے بدعتوں کے ایک زرخیز خاندان کا ہے۔ ایک ایسے طرزِ فکر کا ہے جو قدم قدم پر قرآن و سنت والے اسلام سے ٹکراتا اور نوع بہ نوع طبع زاد افکار و اعمال کے اہرام تعمیر کرتا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جو لوگ میلاد اور قیام کے شیدائی ہیں ان کے معتقدات و معمولات کی فہرست اور بھی بے شمار بدعتوں سے بھری پڑی ہے۔ قبروں کے عرس، نذر و نیاز کے جھمیلے، غیر اللہ سے غائبانہ طلب و دعا، تیجہ و چہلم، صحنک، چراغاں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر معمولی سے معمولی بزرگ تک کیلئے مبالغہ آمیز عقائد و دعاوی۔ ایسا نہیں ہے کہ اسلام کے شجرِ طیبہ میں فقط ایک قیام کی کونپل پھوٹ آئی ہو اور ہم اس کے بارے میں رواداری کا طرزِ عمل اختیار کر لیں تو باہمی نزاع و تفرقہ اتحاد و موافقت میں بدل جائے۔ یہاں تو ڈالی ڈالی بدعت و ایجاد کے پھولوں اور پھلوں سے لدی پھندی ہے۔ گام گام پر احداث فی الدین کے لات و عزیٰ نصب ہیں، عبادات کے کسی شعبے میں قرآن و سنت پر قناعت نہیں بلکہ اضافوں اور ملمع کاریوں کا شوق نس نس میں سمایا ہوا ہے۔ پھر کیا حاصل ہوگا اگر ایک قیام ہی کے سلسلے میں ہم رواداری کا رویہ اختیار کر لیں ؟

دوسری بات یہ سمجھ لیجئے کہ جو مثالیں آپ نے پیش فرمائیں ان میں اور قیام جیسی بدعات میں جوہری فرق ہے۔ وحدۃ الوجود کا مسئلہ لیجئے۔ ظاہر ہے وہ خالص ایک نظریاتی اور تخیلی مسئلہ ہے جس کا عمل سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا دقیق و غامض ہونا بھی آپ کو معلوم ہے۔ لہٰذا ہر دقیق و غامض مسئلہ کی طرح اس میں بھی مختلف تاویلات و توجیہات کی گنجائش قدرتاً موجود ہے۔ نیز وحدۃ الوجود کا عقیدہ خواص سے متعلق ہے عوام اسکی وجہ سے کسی گمراہی کا شکار نہیں ہوتے جب کہ قیام جیسی محسوس و مشاہد بدعتیں عامۃ المسلمین کے تصورِ توحید کو شرک اور افراط و غلو کی غلاظت سے ملوث کرتی ہیں اور دوسری قوموں کو ان بدعتوں کا نظارہ اسلام کی خالص و محکم توحید کے بارے میں ایسے غلط اور فاسد تصورات عطا کرتا ہے جن کو اسلام سے زیادہ شرک و زندقہ سے ربط ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جن جن زمانوں میں مصنوعی صوفیوں، کج فہم عابدوں اور ہوا پرست زندیقوں نے وحدۃ الوجود کے دقیق نظریئے کو احکامِ شرعیہ کی تنسیخ اور فرائض و واجبات کی تحریف کے لئے استعمال کرنا شروع کیا فوراً علمائے حق ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور شدت سے اس نظریئے کی مخالفت کی۔ گویا وحدۃ الوجود کے بارے میں بھی حسنِ تاویل اور رواداری کی گنجائش اس وقت تک ہے جب تک یہ خواص کے حلقوں میں فقط ایک نظری و خیالی لطیفہ بنا رہے۔ اگر یہ اپنے محدود دائرے سے نکل کر شرعی احکام اور دینی عقائد پر اثر انداز ہونا شروع کر دے تو رواداری و درگذر کو بالائے طاق رکھ کر اس کا شد و مد سے رد کیا جائے گا۔

نکٹائی لگانا بلا کراہت جائز ہے یا نہیں یہ الگ بحث ہے۔ مان لیجئے وہ جائز ہی ہے لیکن یہ بالکل سامنے کی بات نظر انداز نہ کیجئے کہ اس کے استعمال کا تعلق دینی تصورات سے بالکل نہیں بلکہ فیشن اور آرائش سے ہے۔ بدعت مصطلحہ کا سوال دینی اُمور میں اُٹھتا ہے نہ کہ خالص دنیاوی امور میں دنیاوی اُمور کا معاملہ تو یہ ہے کہ یا تو وہ مباح ہوں گے یا گناہ قرار پائیں گے۔ بدعت و سنت کے رُخ سے ان پہ کلام نہیں ہوگا۔ فرض کیجئے زید نکٹائی کے جواز کا قائل نہیں ہے تو وہ یہ نہیں کہے گا کہ نکٹائی بدعت ہے اس لئے اسے حرام ہونا چاہئے بلکہ وہ یہ کہے گا کہ حدیث میں تشبہ بالکفار پر وعید آئی ہے۔ لہٰذا نکٹائی لگانا معصیت میں داخل ہے۔

اس کے برخلاف میلاد ایک دینی نوع کی تقریب ہے اور اس میں سلام پڑھتے ہوئے قیام کرنا خواہ بھیڑ اچال کے طور پہ ہو یا کسی عقیدے کے تحت، بہرحال ایک ایسا عمل ہے جو صریحاً دینی تصورات سے مربوط ہے۔ اس پر بدعت اور احداث فی الدین کا اطلاق کیا جائے گا اور اگر اس کے پیچھے حضورؐ کی تشریف آوری کا تصور موجود ہو تو شرک کے اطلاق میں کوئی چیز مانع نہ ہوگی۔

ٹکٹائی کے بارے میں یہ بھی ملحوظ رکھئیے کہ اصلاً چاہے وہ صلیب ہی کا نشان ہو لیکن صلیب سے اس کی مشابہت خفی ہے جلی نہیں۔ اس کے علاوہ عام طور پر لوگ جانتے بھی نہیں کہ یہ صلیب کا نشان ہے نہ ہی اس کا صلیبی نشان ہونا اتنا ظاہر و باہر ہے کہ ہر کوہ مہ بلا ادنیٰ تامل اس کا ادراک کر سکے۔ جنھوں نے یہ بات کہیں پڑھی یا سنی نہ ہو کہ ٹائی کا استعمال عیسائیوں نے صلیبی نشان کے طور پر شروع کیا تھا ان کو تصور تک نہیں آسکتا کہ یہ سوٹ بوٹ میں ملبوس لوگوں کی ٹائیاں عیسائیوں کے ایک خاص مذہبی عقیدے سے تعلق رکھتی ہیں۔

اس کے برخلاف "قیام" — چاہے وہ محض رسم ہی بن چکا ہو — اپنی ذہنی بنیاد کے اعتبار سے ایسے بدیہی شرک پر استوار ہے کہ جاہل سے جاہل اور غبی سے غبی انسان کو بھی اس بنیاد کے ادراک میں کسی خارجی تعلیم و تفہیم کی احتیاج نہ ہوگی۔ بچے تک جانتے ہیں کہ قیام کرنا کسی محترم ہستی کی تشریف آوری پر ہوتا ہے۔ آپ یا خود قیام کرنے والے کتنا ہی کہیں کہ قیام تو فقط ایک رسم ہے اس کا تعلق کسی عقیدے سے نہیں لیکن محض کہہ دینے کی کیا وقعت ہوگی جب کہ عمل بداہتہً اسکی تردید کر رہا ہو۔ ایک شخص کنوے سے ڈول کھینچ رہا ہو تو دیکھنے والا قدرتاً اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ اسے پانی کی ضرورت ہے۔ ایک شخص کسی کو گالیاں دے رہا ہو تو سننے والا آپ سے آپ یقین کرے گا کہ یہ شخص غصے میں ہے۔ ٹھیک اسی طرح محفلِ میلاد میں شریک ہونے والا ایک نابالغ بچہ بھی جب یہ دیکھے گا کہ سلام پڑھنے کے لئے سب لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں تو آپ سے آپ بغیر کسی خارجی تشریح و تفہیم کے یہی تصور کرے گا کہ پیغمبر صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ خصوصاً جب سلام میں عموماً تخاطب ہی کا پیرایہ استعمال ہوتا ہے اور اس طرح کے صریح فقرے دہرائے جاتے ہیں کہ:۔

جنابِ سرورِ کون و مکاں تشریف لے آئے

تو کوئی وجہ نہیں کہ حضورؐ کی تشریف آوری کا تصور ایک شعوری عقیدہ بن کر کچے دل و دماغ میں پیوست نہ ہو جائے۔ عملی مشاہدہ انسان پر — خصوصاً کچے ذہنوں پر جو اثر کرتا ہے وہ اقوال کے بڑے بڑے دفاتر بھی نہیں کر سکتے۔ ایک ایسے شخص کی مثال سامنے رکھئیے جو بچپن سے نئی تہذیب کے آغوش میں پلا ہے اس نے آنکھیں کھولنے کے بعد اپنے ارد گرد مردوں اور عورتوں کو بے حجابا ملتے جلتے دیکھا ہے۔ اس کی ماں اور بہنیں کھلے بازو اور نیم برہنہ سینے کے ملبوسات پہنتی رہی ہیں۔ کیا شرم و حیا کے بارے میں اس کے احساسات وہ ہو سکتے ہیں جو قدیم ماحول میں پلے ہوئے کسی شخص کے ہوا کرتے ہیں — ظاہر ہے کہ نہیں اور ہرگز نہیں کیونکہ مشاہدات نے اس کے ذہن کو ایک خاص سانچے میں ڈھالدیا ہے۔ اس کے فکری زاویوں کو ایک مخصوص شکل دی ہے۔ اسی طرح جو بچے — یا کچی عقل والے بالغ حضرات میلاد والے قیام کا مشاہدہ کرتے رہیں گے ناممکن ہے کہ اسلام کے مطلوبہ تصورِ توحید تک ان کے ذہن کی رسائی ہو سکے اور شرک فی الصفات کا گرد و غبار ان کے دماغ کے سوراخوں میں داخل نہ ہو۔ قیام کو بقول آپ کے ایک سرسری نوع کی رسم ہی مان لیں تب بھی اس سے مفاہمت کر لینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم چور دروازے سے داخل ہونے والے غیر مرئی شرک کو اسلام کی توحیدِ خالص پر غبار اڑانے اور شب خون مارنے کی کھلی چھٹی دے رہے ہیں۔ توبہ توبہ۔ طاقت کے زور سے ہم بدعت و شرک کا قلع قمع نہ کر سکیں تو کیا زبان و قلم پر بھی قفل چڑھا لیں تاکہ از روئے حدیث ہمارا شمار ان لوگوں میں ہو جن کے دلوں میں باطل سے نفرت اور اسلام سے محبت کی رمق بھی باقی نہیں۔

تیسری بات یہ سمجھ لیجئے کہ بدعت و سنت کی بحث میں رواداری سیر چشمی اور درگذر کا سبق آپ اہلِ بدعت کو دیں تو اس میں کچھ معقولیت ہوگی۔ ہمیں یہ سبق دینا تو اُلٹی گنگا بہانے کے مرادف ہے آخر کیا آپ کو یہ صورت حال معلوم نہیں کہ جارح، متشدد اور شمشیر برہنہ تو اہلِ بدعت بنے ہوئے ہیں نہ کہ ہم۔ ماضی قریب کی تاریخ کے اوراق الٹیے تو آپ دیکھیں گے کہ جس دینِ قبوری کا ایک شعبہ یہ قیام ہے اس کے اکابر نے علمی متانت اور احساسِ ذمہ داری کو بالائے طاق رکھ کر بڑے بڑے علماء و اتقیاء کو صرف اس جرم میں بلا تکلف کافر و بے دین قرار دیدیا ہے کہ انھوں نے قرآن و سنت

کی روشنی میں بعض افکار واعمال کو بدعت ٹھیرایا تھا۔ فقط علمائے دیوبند ہی نہیں۔ بریلوی مکتب فکر کے سوا غیر منقسم ہندوستان کا کونسا مکتب فکر بچا ہے کہ جس کے اکابر کو اہل بدعت نے بہانگ دہل کافر قرار نہیں دیا۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ تک فرمادیا کہ جو انھیں کافر نہ ملنے وہ بھی کافر۔ نام بنام کفر وضلالت کے فتوے لگانا، تمدنی وملی روابط منقطع کرنا، ننگا اشتعال پھیلانا، موقع میسر آنے پر دست درازی اور ہاتھا پائی سے بھی نہ چوکنا ارباب بدعت کا معلوم ومعروف رویہ رہا ہے اور اس امت کے اصاغر واخلاف آج تک اسی روش پر قائم ہیں۔ قیام سے لیکر دین مُردہ پرستی کے ہر آئیٹم تک اتنا تشددان بدعت کے متوالوں میں ہے کہ جو ان کی تمام خرافات وہفوات پر آمنا وصدقنا نہ کہے وہ وہابی۔ گمراہ۔ بے دین آپ کسی محفل میلاد میں شرکت کیجئے اور ذرا قیام میں ان کا ساتھ نہ دیجئے پھر معلوم ہوگا کہ آپ کی کیا گت بنتی ہے اگر قیام فقط ایک رسم ہی ہے تو اس کے کیا معنی کہ اس رسم سے احتراز کرنے والا ایک دم ملعون ومطعون قرار پائے۔

اور ذرا علمائے دیوبند میں سے کسی کا نام لیجئے جس نے بدعتی علماء کے نام لے لے کر کفر کے فتوے جھاڑے ہوں۔ علمائے دیوبند کا تو صرف یہ گناہ رہا ہے کہ جن اُمور کو قرآن وسنت کی روشنی میں انھوں بدعت یا شرک سمجھا ان کے بارے میں علمی متانت اور دردمندی کے ساتھ فریضۂ ابلاغ ادا کردیا۔ پنجے جھاڑ کر کسی کے پیچھے نہیں پڑے۔ بائیکاٹ کسی کا نہیں کیا۔ تب آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ جارحین ومفسدین کے عوض رواداری کا سبق ہم ستم رسیدوں کو پڑھایا جائے۔ اللہ گواہ ہے ہم تو آج بھی سرتاسر رواداری ہیں۔ ہم قیام ہی نہیں قیام جیسی چند اور بدعتوں پر بھی رواداری برت سکتے ہیں اگر اہل بدعت افتراق کی روش ترک کرنے پر آمادہ ہوں، لیکن ان کا حال تو اُن لوگوں جیسا ہے جن کے بارے میں اللہ نے اپنے پیغمبرؐ کو متنبہ کیا تھا کہ یہ تھوڑی سی رواداری سے ماننے والے نہیں ہیں۔ بلکہ یہ تو اسی وقت راضی ہوسکتے ہیں جب تم پوری طرح ان کی ملت کا اتباع کرنے لگو۔ تو ظاہر ہے کہ ہم رواداری کے چکر میں اپنی عاقبت تو داؤ پر لگانے سے رہے۔ یہ ہرزہ سرا جب وسیع النظری، رواداری اور "بقائے باہم" کے معنی ہی نہیں جانتے تو ہم کیوں قیام یا کسی بھی بدعت وضلالت کے بارے میں ڈہن وتساہل کا رویہ اختیار کرکے اُس ثواب سے بھی جائیں جس کی ہمیں حق تعالیٰ سے امید ہے۔

رہی خطائے اجتہادی کی بات تو محترم بھائی یہ آپ نے دانش مندانہ بات نہیں کہی۔ عام آدمیوں کی بات اور ہے، لیکن آپ تو ماشاء اللہ فاضل دیوبند ہیں۔ کیا آپ سے بھی یہ حقیقت پوشیدہ ہے کہ اجتہاد کسے کہتے ہیں اور اجتہادی آراء کا اطلاق کس نوع کی آراء پر ہوتا ہے۔ ایک طرف آپ "قیام" کو فقط ایک رسم بھی قرار دے رہے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی خواہش کرتے ہیں کہ اسے ایک اجتہادی مسئلہ مانا جائے۔ رسم اور اجتہاد میں تو معنوی تضاد ہے۔ کسی بھی اجتہادی رائے کے پیچھے کچھ علمی وفنی مصادر ومبانی ہوا کرتے ہیں مگر رسمیں وہ کہلاتی ہیں جن کی صورت گری کسی فکری اصل اور کسی علمی بنیاد پر نہ ہو بلکہ وہ صرف ذہنی ترنگ یا ذوق نقالی یا جذباتی رَد کا شاخسانہ ہوں۔ آپ خود بھی فرما ہی رہے ہیں کہ قیام کے پیچھے اب کوئی شعوری عقیدہ کوئی علمی نظریہ اور کوئی منطقی استدلال موجود نہیں ہے، بلکہ وہ ایک مجہول المراد رسم بنکر رہ گیا ہے۔ تو پھر یہ مطالبہ کیا معنی رکھتا ہے کہ اسے ایک اجتہادی عمل تصور کرکے فریق ثانی کو چھوٹ دی جائے۔ اجتہاد کا نام آتے ہی یہ سوال آپ سے آپ کھڑا ہوجاتا ہے کہ اس اجتہاد کا مبنیٰ کیا ہے؟ مبنیٰ اگر کوئی اس نوع کا پیش کردیا جائے جسے اہل علم نے قابل لحاظ مانا ہو تب تو یہ مطالبہ بجا ہوسکتا ہے کہ قیام کو خطائے اجتہادی گمان کرکے صبر جمیل کی راہ اختیار کی جائے، لیکن بوگس بنیادوں پر محض خواہشات اور ذاتی رجحان طبع کے زور سے نکالے ہوئے عقائد واعمال بھی اگر "اجتہادی مسائل" کہلانے کے مستحق ہوجائیں گے تو سمجھیے کہ علم وفن کا خانہ خراب ہوا۔ کہاں اجتہاد جیسی پاکیزہ شئے اور کہاں ذہنی بے راہ روی کے سانچے میں ڈھلے ہوئے سادہ شیطانی

پھر یہ بھی آپ نے خود فرمایا کہ قیام جس شریعت قیوری کا آئینہ ہے اس کے متوالے تو اکثر مقلد ہیں اور خود کو زور شور سے حنفی کہتے ہیں۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھیں بیٹھے بٹھائے اجتہاد کا حق آخر کہاں سے پہنچ گیا؟۔ اجتہاد کی بات اسوقت کہی جاسکتی تھی جب کہ حنفی مجتہدین میں سے کسی مجتہد نے قیام کے استحسان کا قول کیا ہو۔ آپ عالم ہیں خوب جانتے ہیں کہ ماہرین فن نے فقہاء کے سات طبقے گنوائے ہیں۔ ان میں سے کسی بھی طبقے کا کوئی حنفی مجتہد و فقیہ بتائیے جس نے "قیام" کا شوشہ نکالا ہو ہمارے علم کی حد تک تو صرف ساتویں ہی طبقے کے بعض فقہاء نے اس کا قول کیا ہے، لیکن اس ساتویں طبقے کا جو حال ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے علامہ ابن عابدین کا یہ فرمودہ ہر صاحبِ علم کو کافی ہے کہ اس طبقے کے فقہاء کھرے کھوٹے کی تمیز نہیں رکھتے یہ اندھیرے میں تیر تکے چلاتے ہیں اور دائیں بائیں تک کا شعور انھیں نہیں۔ جو ان کے پیچھے چلے گا سراسر خسارے میں رہے گا۔ (رسم المفتی)

اگر آنجناب کی نظر میں کوئی معروف و مستند حنفی مجتہد ایسا ہو جس نے قیام کے استحسان یا صرف اباحت ہی کا قول کیا ہو تو ہمیں ضرور اس کے نام سے آگاہ فرمائیں۔ پھر آپ کا یہ مطالبہ معقول ہوگا کہ قیام کو بجائے بدعت کے خطائے اجتہادی کے خانے میں رکھدیا جائے۔ لیکن اگر مجتہدین سلف میں سے کوئی اس اجتہاد کا حامل نہیں، بلکہ غیر ثقہ ہی قسم کے اربابِ جبہ و دستار نے اس اجتہاد کو جنم دیا ہے تو ہمارے ہی نہیں خود ان کی نظر میں بھی یہ اجتہاد کارلابعنی سے زیادہ کچھ نہیں کیوں کہ وہ تو بہ اعترافِ خود مقلد ہیں اور غیر مقلد کا لفظ ان کے یہاں گالی ہے تعجب ہے کہ فاضل دیوبند ہو کر آپ ایک ایسی شے کو اجتہادی کہہ رہے ہیں جو ذہنی اُپج کے سوا کچھ نہیں اور جسے اہلیتِ اجتہاد سے عاری جامد قسم کے مقلدین نے اختراع کیا ہے۔

یہاں تک لکھا جا چکا تھا کہ "انوار الاسلام" میں آپ کا ایک خط نظر سے گذرا۔ اس کا بھی لبِ لباب یہی ہے جو آپ کے زیرِ جواب خط کا ہے۔ زائد بات صرف اتنی ہے کہ اس میں آپ نے اجتہادی مسائل میں رواداری کے لئے متعدد مثالیں پیش فرمائی ہیں۔ اے برادر! جتنی بھی مثالیں آپ نے دیں وہ سب ایسے ہی مسائل کی ہیں جن کا اجتہادی ہونا معروف و مسلم ہے۔ چاروں ائمہ کا اختلاف ہو یا بعد کے مجتہدین فقہاء کا اس کے متعلق تو ہمارا آپ کا متفقہ عقیدہ ہے کہ رواداری برتی جائے اور ہر امام و مجتہد کو اپنی اپنی حیثیت میں برحق مانا جائے۔ لیکن اس نکتہ کو آپ برابر نظر انداز کئے جارہے ہیں کہ "قیام" کا سرچشمہ وہ پاکیزہ اجتہاد نہیں ہے جس کے معاملہ میں رواداری کا درس مولانا مدنیؒ یا مفتی شفیع، یا مولانا اشرف علیؒ یا سلف صالحین دیتے رہے ہیں، بلکہ اس کا سرچشمہ تو غیر اسلامی تصورات کا مارا ہوا وہ فاسد ذہن ہے جس کے شریانوں میں شوقِ ایجاد اور بدعت و اختراع کا سودا سما گیا ہے۔ اگر ہر کہہ و مہ کی اُپج اور طباعی کو اجتہاد مان کر رواداری کا جامہ پہن لیا گیا تو پھر نہ اہل قرآن کو گمراہ قرار دینا ممکن رہے گا نہ قادیانیوں کو۔ نہ خارجی بے دین سمجھے جائیں گے نہ ناصبی۔ نہ شیعت سے مناز عت روا رہے گی نہ بہائیت سے۔

آپ کے دونوں ہی خطوں سے نہایت اچھا رجحان ظاہر ہوتا ہے کہ حرب عقائد کی آگ فرو کی جائے اور متبارز فرقے ایک دوسرے کے قریب ہوں۔ لیکن شیطان کا لطیف و خفی کید اس میں یہ ہے کہ بدعت و شرک کی نفرت آپ کے قلب و ذہن سے نکلی جارہی ہے۔ رواداری و مفاہمت بڑے خوبصورت جذبے ہیں لیکن جب توحید و شرک اور سنت و بدعت تک میں ان جذبوں کو دخیل کیا گیا تو سمجھئے کہ ایمان میں اندر ہی اندر گھن لگنا شروع ہو گیا۔ مسلمان شرک و بدعت میں گرفتار ہوں اور ایک موہوم اتحاد کی خاطر تمام علمائے حق رواداری و درگذر کی چادر اوڑھ لیں تو مستقبل کی تاریخ اصلاح بانجھ ہو کر رہ جائے گی اور کبھی کوئی ابن تیمیہ، کوئی اسماعیل شہید پیدا نہیں ہوگا۔ ہم بدعت کو بدعت، باطل کو باطل، شرک کو شرک کہنے سے کبھی باز آنے والے نہیں ہیں۔ ہاں یہ ہمارا شیوہ نہیں کہ نام لے لے کر کفر کے فتوے بکثرت استعمال کریں، لنگر لنگوٹ کسیں۔ یہ سلفِ وطیرے اہلِ بدعت

کے ہیں۔ رواداری کا سبق دینا ہو تو انھیں دیجئے۔ وہ اگر غنڈہ گردی اور عناد و تعصب سے باز آجائیں تو ہم علمی متانت اور دینی حدود سے تجاوز کرنے والے ہرگز نہیں ہیں۔ واللہ المستعان۔

ایک روایت (حضرت موسیٰؑ کا چپت)

سوال: — از مولوی عبد الحنان — کیمل پور۔

(۱) مشکوٰۃ شریف باب بدء الخلق وذکر الانبیاء میں متفق علیہ حدیث ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسےٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام کے پاس حضرت عزرائیل علیہ السلام بغرض قبض جاں تشریف لائے تو آپ نے ایک تھپڑ رسید کی جس سے اُن کی آنکھ نکلی۔ رب کے پاس شکایت لیکر گئے تو اللہ جل مجدہٗ نے آنکھ بحال کردی۔ اوکما قال صلی اللہ علیہ وسلم۔

ا— کیا موسیٰؑ کو ملک الموت کی پہچان نہ تھی؟ اور اگر تھی تو راضی بقضا نہ تھے؟ اگر تھے تو کیوں ایسا کیا؟

ب— حضرت موسیٰؑ کا تھپڑ نوری فرشتہ پر اثر انداز ہوگیا، وہ اس سے متأثر ہوئے؟

ج— رواۃ اس حدیث کے تمام ثقہ ہیں۔ یا کوئی اُن میں سے زیر بحث لایا گیا بھی ہے؟

نوٹ:— حدیث کا متفق علیہ ہونا غالباً تسلی کے لئے کافی ہے معروض بھرف زید تسلی وتشفی کے لئے ہے۔ امید کہ کسی قریبی اشاعت میں مع تفصیل شائع کیا جائے۔

الجواب:—

اگر یہ روایت خلافِ عقل ہوتی یا کسی نص کے خلاف نظر آتی تب تو ہم یقیناً اس کے راویوں کی تحقیق وتنقید کی طوالت میں پڑتے لیکن ہمیں اس کو صحیح مان لینے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ جو سوالات آپ نے اٹھائے ہیں ان کے جوابات حسب ذیل ہیں۔

(الف) ملک الموت حضرت موسیٰؑ کے پاس انسانی شکل میں آئے تھے۔ ہر صاحب علم جانتا ہے اور خود قرآن میں تصریح ہے کہ بعض برگزیدہ بندوں اور بندیوں کے پاس فرشتے انسانی شکل میں آتے رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ نبی ضرور تھے لیکن عالم الغیب نہیں تھے۔ وہ پہچان نہیں سکے کہ یہ انسانی شکل میں فرشتۂ اجل آیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ بدبخت انسانوں نے ہر پیغمبر کی نوع بہ نوع مخالفت کی ہے اور تمسخر واستہزاء میں کسر نہیں چھوڑی ہے۔ جب ایک شخص جو بظاہر انسان ہے حضرت موسیٰؑ کو موت کی پیش کش کرتا ہے تو کیا استحالہ ہے اس میں کہ حضرت موسیٰؑ نے اسے تمسخر سمجھا ہو۔ ملک الموت نے ان سے یہ نہیں کہا تھا کہ میں عزرائیل ہوں اور کہتا بھی تو موسےٰ اسے بھی ٹھٹول پر محمول کر سکتے تھے کیونکہ اس وقت تک اللہ نے بذریعہ وحی آپ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ ہم ملک الموت کو تمہارے پاس بھیج رہے ہیں جب موسیٰ کو یہ گمان ہوا کہ ان سے استہزاء کیا جا رہا ہے تو طیش میں آکر ہاتھ چھوڑ بیٹھے۔ ہاتھ اتفاق سے بھرپور پڑا اور ملک الموت کی ایک آنکھ پھوٹ گئی۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ آج بھی کوئی طاقتور آدمی کسی کے مُنھ پر کس کے ہاتھ رسید کردے تو آنکھ پھوٹ سکتی ہے۔

انبیاءؑ کا بعض حالتوں میں فرشتوں کو نہ پہچان سکنا عقلاً بھی ناممکن نہیں اور قرآن میں بھی حضرت لوطؑ اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے بارے میں تصریح ہے کہ وہ انسانی شکل میں آنے والے فرشتے کو نہ پہچان سکے تھے۔

(ب) نوری فرشتے نے جب خاکی مخلوق بشر کی ہیئت وشکل اختیار کی تو بشریت کے کچھ نہ کچھ اوصاف وخواص بھی اس میں ضرور آگئے ہوں گے۔ کتنے ہی ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ جن سانپ یا کسی اور شکل میں متشکل ہوا اور اسے انسانوں نے مار ڈالا نتیجتاً جن ہی ہلاک ہوا۔ لہٰذا یہ معارضہ درست نہیں کہ نوری فرشتہ چپت کھا کر مجروح کیونکر ہوگیا۔

(ج) رواۃ کے بارے میں کچھ کہنا اسی لئے یہاں ضروری نہیں کہ روایت کو صحیح تسلیم کرلینے میں عقل مانع نہیں۔

رہی یہ بدگمانی کہ حضرت موسیٰ کو زندگی بہت پیاری تھی اور راضی بقضاء نہ تھے تو اس کی تردید خود روایت میں موجود ہے آپ روایت دیکھئے کیا اس میں یہ موجود نہیں ہے کہ اللہ نے عزرائیل کی آنکھ ٹھیک کرنے کے بعد انھیں پھر موسیٰ کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ اگر تم بہت سی زندگی چاہتے ہو تو اپنا ہاتھ

بیل کی پشت پر رکھدو۔ جتنے بال تمہارے ہاتھ کے نیچے آجائینگے اتنے ہی برس تم زندہ رکھے جاؤ گے۔ اس پر موسیٰؑ نے پوچھا تھا کہ پھر اتنے دنوں زندہ رہنے کے بعد کیا ہوگا؟ عزرائیل نے جواب دیا تھا پھر وہی موت ہے۔ اس پر موسیٰؑ نے کہا تھا تو مجھے ابھی موت قبول ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ زندگی کی محبت کا سوال اٹھانا درست نہیں۔

سوالات کی حد تک تو فریضۂ جواب ادا ہوگیا لیکن یہ جواب اُس ذہنی اضطراب اور تشکیک کا ازالہ نہیں کرسکتا، جو اس نوع کی روایتوں سے آج کے زمانے میں عام طور پر پیدا ہونا ہی چاہتے۔ واضح بات ہے کہ یہ زیرِ گفتگو روایت اپنے مزاج، اپنے مطالب اور اپنے خد و خال کے اعتبار سے اسرائیلی نوع کی ہے اور ہماری پیش کردہ توجیہات سے بظاہر سائل کی زبان بند ہو ہی جائے تب بھی ذہنی طمانیت اسے حاصل ہونی مشکل ہے کیونکہ بخاری و مسلم اور مشکوٰۃ جیسی متداول و معتبر کتابوں میں اس کی موجودگی اور مدرسوں میں اس کی تعلیم و تعلم کا مشغلہ کسی احادیث کا حامل نظر نہیں آتا۔

پھر اس الجھن کا حل کیا ہو؟

اس کا جواب بظاہر ایک ہی ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح قرآن میں محکم و متشابہ دونوں طرح کی آیات ہیں اور متشابہات کا منشاء ہمارے ایمانوں کی آزمائش ہے اسی طرح احادیث میں بھی بہت سی روایات متشابہات کے قبیل سے ہیں جنکا مفاد شاید ہمارے ایمانوں کی آزمائش ہی ہوگا۔ فرق قرآن اور حدیث میں یہ ہے کہ قرآن سے تو ایک حرف بھی خارج نہیں کیا جاسکتا، لیکن احادیث کے مجموعوں پر اس پہلو سے غور و فکر ممکن ہے کہ کون کون سی روایات ان میں ایسی محفوظ ہوگئی ہیں جو فنی اعتبار سے اگرچہ لائقِ رد نہ ہوں، لیکن دین و ملت کے وسیع تر مفادات اور عصری تقاضوں کے پیشِ نظر انھیں کم سے کم ان مجموعوں سے الگ کردیا جائے جو نصابوں میں شامل ہیں اور جن کے درس و تدریس کا شغل جاری ہے۔ احکام و عقائد کی صحیح روایتوں کو تو خارج کرنیکا کوئی سوال ہی نہیں، ہاں ایسی روایتوں کا اخراج زیرِ غور آسکتا ہے جن کے اخراج سے دین میں کوئی کمی اور حرج واقع نہ ہو۔ مثلاً یہی روایت ہے جس پر گفتگو ہورہی ہے۔ اسے اگر نصابی کتابوں سے جدا کردیا جائے تو کوئی نقصان واقع نہ ہوگا، حالانکہ اس کا موجود رہنا ایک مستقل امتحان ہے۔

لیکن یہ کام ہمارے کرنے کا نہیں بلکہ علماء کی ایسی جماعت کے کرنے کا ہے جسے عامۃ المسلمین کا پورا اعتماد حاصل ہو اور جس کے افراد آپس میں لڑنے کی بجائے ایک ٹیم کی حیثیت رکھتے ہوں۔ ہماری سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ علماء میں حد درجہ افتراق و مخالفت ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے فرقوں میں بٹ کر ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے اور پگڑیاں اچھالنے میں سرگرم ہیں۔ انھیں لایعنی حربِ عقائد اور نفسا نفسی ہی سے فرصت نہیں۔ لہٰذا ہمیں اور آپ کو ہر مصیبت، ہر فتنے اور ہر نقص و خامی پر صبر ہی کرنا ہوگا۔ والی اللہ ترجع الامور۔

قادیانیت کا مسئلہ

سوال:۔ از عبدالغفار۔ میانوالی۔

ایک امام مسجد کا عقیدہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کافر نہیں ہے، کیونکہ اُس نے کئی جگہ اپنے آپ کو اُمتی کہا ہے اور کئی تصانیف میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین تسلیم کیا ہے۔ اگر جہاں کہیں اس نے اپنے آپ کو نبی بھی کہا ہے تو ہم اُس کے اس کلام کی تاویل کریں گے جیسا کہ فقہاء کرام کا قول ہے کہ اگر ننانوے وجوہ کفر کی ہوں اور ایک وجہ اسلام کی۔ تو اُن وجوہ کی تاویل کرنی چاہئے۔ کیا ایسے شخص کی بیعت اور اُس کے پیچھے نماز ادا کرنی درست ہے؟ ایسا عالم جو مرزا مذکور کو کافر نہ کہے بلکہ تاویل کرے کیا وہ مسلمان ہے یا کہ نہ؟

الجواب:۔

فقہاء کے جس قول کا آپ نے ذکر فرمایا پہلے اس کا مطلب سمجھ لیجئے پھر بات صاف ہوجائے گی۔ فقہاء کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان سے کوئی ایسا فعل یا قول سرزد ہو جو صریح

طور پر کافرانہ نہ ہو بلکہ گنجائش تاویل کی رکھتا ہو۔ تو اگرچہ
غالب قرینہ اس کے کافرانہ ہونے کا موجود ہو لیکن ہم برملا
فیصلۂ کفر صادر نہیں کریں گے بلکہ حسن ظن سے کام لیں گے اور
تاویل کی جو گنجائش پائی جا رہی ہے اسے نظر انداز نہیں کرینگے
یہ اس صورت میں ہے جب کہ یہ شخص یا تو مر چکا ہو
یا زندہ ہی ہو مگر کسی مانع کی وجہ سے اس سے تصریح حاصل کرنا
ممکن نہ ہو۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی صورت نہیں ہے تو
اس سے تصریح طلب کی جائے گی اور جیسی یہ تصریح کریگا
ویسا ہی فیصلہ دیا جائے گا۔ اگر اس نے وہی تاویل کی جسکی
گنجائش پائی جا رہی تھی تو اسے مسلمان تسلیم کرتے رہیں گے
لیکن اگر وہ کافرانہ تصریح کرتا ہے تو بلا تکلف کافر قرار
دیں گے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کیا کچھ کہہ اور کر گئے ہیں یہ
شاید آپ کے امام مسجد کو معلوم ہی نہیں۔ اگر صرف اتنی سی
بات ہوتی کہ انھوں نے کبھی اتفاق سے اپنے آپ کو نبی
لکھ دیا ہوتا اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو
خاتم النبیین تسلیم کر کے قبر میں جا سوئے ہوتے تب تو کسی درجے
میں تاویل ممکن تھی، لیکن انھوں نے اپنے ہزاروں اوراق
کی کتابوں میں جو جو گل کھلائے ہیں ان میں سے چند کا بھی نظارہ
آپ کے امام مسجد صاحب فرما لیتے تو امید نہیں تھی کہ ایسی کچی بات
فرماتے۔ ایک دعوۂ نبوت ہی نہیں، اس اللہ کے بندے نے
تو جلیل القدر انبیاءؑ کے خلاف وہ وہ دریدہ دہنی کی ہے
کہ الامان والحفیظ۔ ہمارے سامنے ان کی پچاسوں تحریریں
ایسی ہیں کہ ان میں سے فقط ایک دو ہی زندقہ و الحاد کا فیصلہ
دینے کے لئے کافی ہیں، لیکن "عیاں را چہ بیان" کے خیال
سے ہم تجلی کے قیمتی صفحات اور اپنا وقت برباد کرنا نہیں چاہتے
ان امام مسجد کو چاہیئے کہ یا تو مرزا غلام احمد آنجہانی کی چند
کتابیں ملاحظہ فرمائیں یا پھر کسی معروف و مستند عالم سے
رجوع کریں۔ بڑے بڑے علمائے حق پاگل نہیں تھے جو قادیانیت
کے کفر و زندقہ ہونے کا نہ صرف فتویٰ دیتے رہے ہیں بلکہ اسکی
تردید و استیصال پر اپنی انتہائی کوششیں صرف کرتے
رہے ہیں۔

ویسے آپ کے بعض الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ ان امام
مسجد صاحب نے کچھ قادیانی لٹریچر پڑھا بھی ہے۔ غالباً یہ وہی
ہوگا جو قادیانی حضرات ناواقفوں کو مبتلائے فریب کرنے
کے لئے آئے دن چھاپتے رہتے ہیں۔ اسے پڑھ کر ظاہر ہے وہ
لوگ فریب میں آ ہی جائیں گے جو ذہنی اعتبار سے نابالغ اور علمی
اعتبار سے تہی دامن ہوں۔

لیکن اگر یہ امام صاحب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ میں نے براہ راست
مرزا غلام احمد کی کتابیں پڑھی ہیں اور اس کے باوجود مجھے ان
میں کفر و زندقہ نظر نہیں آیا تو اس کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا
کہ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس کی قوتِ شامہ ماؤف
ہو چکی ہو اور وہ بڑے سے بڑے بیت الخلاء میں بھی پہنچ کر فضا
خوشگوار ہی محسوس کرے۔ ایسے شخص کو بدبو اور خوشبو کا احساس
دلانے کی کوشش ایسی ہی ہوگی جیسے آپ کسی نابینا کو آئینہ دکھا کر
یہ باور کرانا چاہیں کہ تیرے منھ پر سیاہی ملی ہوئی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ آپ کے امام صاحب اگر بھول پن میں مرزا
سے حسن ظن رکھتے ہیں تو نمازیوں کو ان کے بھول پن کا علاج کرنا
چاہیئے۔ اور اگر جانتے بوجھتے رواداری کا وعظ پلا رہے ہیں تو خدا
نمازیوں پر رحم کرے۔ ہم میں ہمت نہیں کہ ان کے پیچھے پڑھی
ہوئی نمازوں کا بیمہ کر سکیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

وہی دیرینہ بیماری

سوال ۳:- (ایضاً)

ہمارے شہر میں ایک خطیب اور مدرس ہے جو کہ احمد رضا
خاں کو ولی اللہ اور مجدد وقت مانتا ہے۔ تمام انبیاءِ کرام کو حاضر و
ناظر جانتا ہے اور یہی تبلیغ کرتا ہے اور دلیل یہ دیتا ہے کہ نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ صرف زمین و آسمان کا عالم الغیب جانتے
ہیں اور آپ زمین و آسمان کے ذرہ ذرہ سے واقف ہیں،
جیساکہ ہاتھ کی ہتھیلی آپ کے سامنے ہے ایسے ہی تمام زمین و
آسمان آپ کی نگاہ میں ہے۔ اور جل شانہٗ تو تمام جہانوں کے
عالم الغیب ہیں۔ کیونکہ زمین و آسمان کے علاوہ اور بھی کئی

بتائیں اس لحاظ سے نبی اکرم صلعم کا علم اللہ پاک کے علم کے مساوی یعنی (کلّی)، نہیں ہے بلکہ جزوی ہے اور جو یہ عقیدہ نہ مانے وہ اس کے نزدیک کافر ہے۔ کیا ایسے پیر و مرشد کی بیعت اور اُس کے پیچھے نماز پڑھنی جائز ہے یا نہ؟ قرآن و احادیث اور فقہ حنفی میں ایسا پیر و امام مسلمان، مومن ہے یا کافر و مشرک؟

الجواب:۔

اگر آپ تجلّی پہلے سے دیکھتے ہوتے تو یہ سوال ہم سے نہ کرتے۔ مولوی احمد رضا خاں صاحب علیہ ما علیہ اور کسی معنی میں مجدد رہے ہوں یا نہ رہے ہوں لیکن اس معنی میں مجدد ضرور تھے کہ انھوں نے ایک ایسا فرقہ پیدا کیا جو بدعت کے بغیر لقمہ نہیں توڑتا، جو احداث فی الدین کے بغیر کھانا نہیں ہضم کر پاتا، جس کا محبوب ترین مشغلہ یہ ہے کہ نئے نئے عقائد گھڑے، نئے نئے شوشے نکالے، ضروریاتِ دین کو طاقِ نسیان پر رکھ کر اُن فروعی ایجادوں کو عین دین قرار دے جن کا تصور تک صحابہؓ، تابعین اور ائمہؒ و مجتہدین کو نہ گذرا ہو۔

ذرا آپ سوچیئے۔۔ آپ کیا کوئی بھی ہوشمند سوچے وہ لوگ شیطان کے مخبر نہیں تو اور کیا ہیں جو دین میں نئے نئے عقیدے گھڑیں اور پھر اپنی اس شرارت پر شرمانے کے عوض گز بھر کی زبان سے اُن لوگوں کو کافر و بے دین قرار دیں جو ان کی اس بدعت کاری و جدّت طرازی پر آمنّا وصدقنا نہ پکار اٹھیں۔

جن عقائد پر کفر و ایمان کا مدار ہے انھیں قرآن اور بخاری و مسلم میں کھول کر تکرار و اصرار کے ساتھ بیان کر دیا گیا اب کوئی بتاؤ کہ انبیاءؑ کو حاضر و ناظر ماننے کا حکم کہاں دیا گیا۔ حکم تو کجا۔ آیاتِ الٰہی اور احادیثِ صحیحہ تو ایسے عقیدے کو شرک قرار دیتی ہیں۔ مگر ہمارے دور کا کمال یہی ہے کہ ننگے ناچو اور لباس پہننے والوں کو بے شرم قرار دو۔ شرک کے ڈنکے بجاؤ اور توحید پرستوں کو کافر کہو۔ نئی نئی باتیں گھڑو اور قرآن و سنت سے مضبوط تعلق رکھنے والوں کو بے دین بتاؤ۔ بے شک۔

مولوی احمد رضا خاں صاحب مجدد تھے، لیکن ایسی تجدید سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ تجدید۔۔ جسے دین میں معظم مانا گیا ہے۔۔ نام ہے سنتوں کو زندہ اور دین کو قائم کرنے کی جدو جہد کا۔ یہ تجدید نہیں تجدد ہے کہ نئی نئی باتیں گھڑو۔ سانس سانس پر مومنین کو کافر بناؤ۔ انبیاء و اولیاء کی عقیدت میں خدا سے بغاوت کر بیٹھو۔

فقہ حنفی ہی نہیں، تمام ائمہ کی فقہ ایسے شخص کو کافر قرار دیتی ہے جو اللہ کے سوا کسی کو عالم الغیب مانے۔ البتہ رضاخانی حضرات چونکہ تاویل کے ساتھ ایسا مانتے ہیں اسلئے انھیں کافر کہنا مشکل ہے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیطان نے انھیں ایسے وہم میں ڈالدیا ہے جس کا علاج لقمان کے پاس بھی نہیں۔

درود تاج

سوال نمبر ۹:۔ از حاجی محمد ابراہیم۔ دیول گھاٹ۔

درود تاج کی حقیقت کیا ہے اور اس کی ابتداء کب اور کہاں سے ہوئی۔ دینی تعلیم میں تو درود ابراہیمی کا ذکر ہے اور یہی نمازوں میں پڑھا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ درود تاج آنحضرت صلعم ہی کی شان میں واقع ہے۔ درود مذکور میں چند الفاظ سے آگے ہی دافع البلاءِ والوباءِ والقحطِ والمرض والالم تحریر ہے۔ اگر عربی الفاظ کا تعلق آنحضرت صلعم کی ذات بابرکات سے ہے تو کیا عقیدۂ توحید میں اس کی گنجائش ہے؟ ظاہر ہے کہ ان کلمات سے اور ان معنوں میں توحید کی نفی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں کیا ان کلمات کا ورد "شرک فی التصرف" پر مبنی متصور نہ ہوگا؟۔۔۔ ایک عرصہ سے ہمارے مکانوں میں درود تاج کی تلاوت کی جاتی ہے اور عوام تلاوتِ قرآن سے زیادہ اسے اہمیت دیتے ہیں۔ نیز طباعت میں علیحدہ مخصوص انتظام کیا جاتا ہے۔

الجواب نمبر ۹:۔

ہمیں نہیں معلوم کہ درود تاج کب اور کس نے تصنیف کیا۔

ویسے تو ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مفہوم میں دافع البلاء وغیرہ کہا جا سکتا ہے کہ آپؐ کی ذات والاصفات بڑی برکت والی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے فیض توسّل سے خاص رحم وکرم فرما سکتا ہے۔ لیکن یہ بال سے باریک معاملہ ہے۔ فاعلِ حقیقی اور صاحبِ وسیلہ کی جداگانہ حیثیتوں کو ٹھیک ٹھیک ملحوظ رکھنا اور حدود سے تجاوز نہ کرنا ایسے ہی دل ودماغ کیلئے ممکن ہے جس میں توحید کا صحیح تصور رچ بس گیا ہو۔ چند صدیوں سے توحید پر جیسا کچھ غبار اُڑایا جا رہا ہے اور ہمارے زمانے میں جس قدر غلو انبیاء واولیاء کی شان میں رائج ومقبول ہو گیا ہے اسکے ہوتے ہوئے یہ یقین کرنا سخت دشوار ہے کہ درود تاج کا ورد کرنے والے حضرات کے دل ودماغ شائبۂ شرک سے بچے رہتے ہوں گے۔ آج تو قدم قدم پر شرک وبدعت اُبلے پڑتے ہیں۔ توحید دھواں دھواں ہے۔ سنت معاذ اللہ کم قیمت اور بدعات مقبول ومرغوب ہیں۔ آپنے درست کہا کہ لوگ تلاوتِ قرآن سے زیادہ درود تاج کے ورد کو اہمیت دیتے ہیں۔ ایک درود تاج ہی کی بات نہیں، بے شمار بدعتیں ہیں جنھیں شدومد سے اختیار کر لیا گیا ہے اور سنن وواجبات سے تساہل برتا جا رہا ہے۔ ایسے حالات میں ہم اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ جن لوگوں کو اپنی عاقبت عزیز ہو وہ کوشش کرکے قرآن وسنت ہی کے دائرے میں محدود رہیں اور منصوص وماثور اوراد ووظائف کی موجودگی میں ایسے وظائف نہ اختیار کریں جو موہم اور خطرناک ہوں۔ اس درود تاج میں ایک فقرہ نور من نور اللہ بھی خطرناک ہے۔ تعلیمات اسلامیہ کا ایک ماہر مزاج داں وحقیقت توحید کا ادراک وشعور رکھنے والا تو اس فقرے کو بھی صحیح محمل پر اُتار سکتا ہے، مگر جس نئی نسل کو غلو کیش اور کج فہم علماء ومشائخ نے صاف صاف یہ تعلیم دی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ کی بشریت تو محض برائے نام ہے وہ حقیقتاً مٹی سے نہیں بلکہ اللہ کے نور سے بنے ہیں وہ نسل ظاہر ہے کہ مذکورہ فقرے کو ہرگز صحیح محمل پر نہیں اُتار سکتی۔ بلکہ شعوری یا نیم شعوری طور پر شرک ہی سے پینگیں بڑھائے گی۔

اللہ تعالیٰ ہر مومن کو شرک کی پرچھائیں تک سے بچائے۔ آمین۔

حدیث افتراق امت

سوال ۱۰ :- از مولوی ریحان الدین۔ مدراس۔

ایک کتاب میں حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کے رسالے التفرقۃ بین الاسلام والزندقہ کے حوالے سے یہ حدیث مطالعہ میں آئی۔ ستفترق امتی سبعا وسبعین فرقۃ کلھم فی الجنۃ الا الزنادقۃ۔ براہ کرم آگاہ فرمائیے کہ یہ حدیث کونسے مجموعۂ حدیث میں آئی ہے اور کس درجے کی ہے۔ نیز زندیق کی تعریف بھی فرمائیں۔ جواب کے لئے لفافہ بھیج رہا ہوں مگر تجلی میں بھی جواب شائع فرمائیں تو نفع عام کا باعث ہوگا۔

الجواب ۱۰ :-

مختصر جواب خط سے بھیج چکا ہوں تفصیلاً اب سُنئے:-

ارباب تحقیق جانتے ہیں کہ حجۃ الاسلام حضرت امام غزالیؒ طاب اللہ سراہ بہت بڑے عالم، شیخ اور امام وقت ہونے کے باوجود علم الحدیث میں درجۂ امامت نہیں رکھتے تھے ان کی کتابوں میں ضعیف، منکر، موضوع سب طرح کی روایات پائی جاتی ہیں اور ہمارا خیال یہ ہے کہ آپ کی نقل کردہ روایت بھی ساقط الاعتبار ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ زنادقہ کے علاوہ باقی ۷۷ فرقے سب کے سب جنتی ہیں۔ حالانکہ معتبر کتابوں میں روایت یوں آتی ہے:-

تفترق امتی علی ثلث وسبعین فرقۃ کلھم فی النار الا ملۃ واحدۃ (ترمذی، مسند احمد، ابوداؤد)	میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی یہ سب ایک کے سوا جہنمی ہوں گے۔

\+ + + + + +

یہ روایت بھی اگرچہ بہت زیادہ قوی نہیں لیکن ایسی بھی نہیں کہ بہ آسانی رد کی جا سکے۔ پھر امام غزالیؒ والی روایت تو کسی مستند کتاب میں ملی ہی نہیں لہٰذا اسے کوئی بھی درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

زندیق اور ملحد اصطلاح میں ایسے لوگوں کو کہتے ہیں جو دعویٰ تو اسلام ہی کا کرتے ہوں اور قرآن وحدیث کے منکر نہ ہوں، لیکن آیات ونصوص کے ایسے من گھڑت معنی نکالتے

ہوں جو مستند مفسرین و شارحین کے برعکس ہوں اور جن اصولِ دین پر جمہورِ امت متفق ہو چکے ہوں انھیں جھٹلاتے ہوں یا ان میں تشکیک کی راہ نکالتے ہوں۔ ان کی بہت نمایاں مثال آج کل کے منکرین حدیث ہیں جو ماشاء اللہ اہلِ قرآن کہلاتے ہیں اور قادیانی بھی اسی کے مثل ہیں۔ مجمع البحار جلد اول میں لکھا ہے کہ زندیق اصلاً مجوسیوں کو کہا گیا تھا پھر اس لفظ کا استعمال ملحدوں، سبائیوں اور شیعوں کیلئے بھی ہونے لگا (ص ۷۹)
رد المحتار کے باب المرتدین میں بھی زندیق کی مذکورہ تعریف موجود ہے۔

کتابیہ عورت سے نکاح

سوال ۱۱:۔ از محمد علی طاہر۔ کیمپ بلدری (بربھنی)
ایک اہلِ کتاب خاتون ہے وہ ایک مسلمان صاحب سے عقد کرنا چاہتی ہے۔ مسلمان صاحب بھی کوشاں ہیں کہ عقد ہو جائے۔ مسلمان صاحب کے دوست احباب نے اصرار کیا ہے کہ پہلے اس خاتون کو اسلام میں داخل کرو بعد میں عقد کرو۔ خاتون پہلے اسلام میں داخل ہونا نہیں چاہتی اور عقد کے لئے رضامند ہے۔ کیا اس طرح عقد ہو جائے تو یہ عقد جائز ہو گا؟ سنا گیا ہے کہ اہلِ کتاب سے عقد جائز ہے۔ اس مسئلے پر ہم تفہیم چاہتے ہیں۔ ایک صاحب نے سوال کیا ہے کہ جب اہلِ کتاب سے عقد ہو سکتا ہے جب کہ اہلِ کتاب خاتون اسلام میں داخل نہیں ہے تو دوسری قوم کی خاتون سے بھی عقد جائز ہونا چاہیئے کیونکہ وہ بھی اسلام میں داخل نہیں ہے ایسی صورت میں ممانعت کیوں ہے؟ براہِ کرم آپ "تجلی کی ڈاک" کے ذریعے تفہیم فرمائیں تو عوام کو اس سے فائدہ ہو گا کیونکہ آج کل ایسی صورت حال پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

الجواب ۱۱:۔
سب سے پہلے تو ہم اس بات پر اظہارِ افسوس کریں گے کہ آپ حضرات قرآن کے مطالعہ کا التزام نہیں کرتے، ورنہ یہ الفاظ کبھی نہ لکھتے کہ:۔
"سنا گیا ہے اہل کتاب سے عقد جائز ہے۔"

جس چیز کی اجازت قرآن میں صراحۃً آئی ہے اس کے بارے میں "سنا گیا ہے" کے الفاظ صاف بتا رہے کہ آپ قرآن کا معہ ترجمہ مطالعہ جاری نہیں رکھتے۔
سوال کا جواب یہ ہے کہ کتابیہ عورت سے عقد کرنے کے لئے اس کا مسلمان کر لینا ضروری نہیں ہے۔ یہ ضروری ہوتا تو کتابیہ ہی کی کیا شرط تھی۔ کوئی بھی مشرک عورت مسلمان ہو جائے تو اس سے نکاح درست ہو جائے گا لہٰذا اللہ تعالیٰ کا اہلِ کتاب عورتوں سے نکاح کی اجازت دینا معنی ہی یہ رکھتا ہے کہ ان کا اسلام لانا جوازِ نکاح کیلئے شرط نہیں ہے۔ کسی دنیاوی مصلحت سے دوست احباب پہلے مسلمان بنا لینے کا مشورہ دیں تو الگ بات ہے۔ لیکن شرعاً یہ ضروری نہیں ہے۔
ایک بات یہ سمجھ لینے کی ہے کہ اصولاً تو یہود و نصاریٰ مشرک ہی ہیں کیونکہ وہ اللہ کے لئے بیٹے کے قائل ہیں، لیکن اس عقیدے کے باوجود اللہ تعالیٰ ان کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دیتا ہے اور ان کے ذبیحے کو حلال قرار دیتا ہے۔ کسی مترجم قرآن میں سورۃ المائدۃ کا پہلا رکوع ملاحظہ کر لیجئے۔ اس کے برخلاف جو مشرکین کسی آسمانی کتاب کے قائل نہیں ان کی عورتوں سے نکاح حرام قرار دیتا ہے (دیکھئے سورۃ البقرۃ کا رکوع ۲۷)۔
اب رہا کسی صاحب کا یہ سوال کرنا کہ جب کتابی عورتوں سے باوجود ان کے کافر و مشرک ہونے کے نکاح درست ہے تو دوسری کافر و مشرک عورتوں سے کیوں درست نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمان کا کام اللہ کے حکم پر سرِ تسلیم خم کرنا ہے نہ کہ چون و چرا کرنا۔ قرآن ہی میں صراحتاً دونوں باتیں آگئیں کہ کتابیہ سے نکاح جائز اور غیر کتابیہ سے نکاح حرام تو سرتابی و ریب کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ ویسے فرق تو صاف ظاہر ہے کہ اہل کتاب خواہ کتنے ہی غلط عقائد کا شکار ہو گئے ہوں لیکن ذہنی تعلق ان کا اصلاً آسمانی ہی مذاہب سے ہے اور ملحدانہ آزادی و بے قیدی ان کے عقائد میں داخل نہیں ہے۔ اس کے برخلاف جو مشرکین کسی آسمانی

کتاب کے پیرو نہیں وہ تو کلّی طور پر ہوائے نفس کے تابع اور اپنے احبار و رہبان کے بندے ہیں۔ انھوں نے سارا ہی دین دل سے گھڑا ہے اور کوئی بعید رشتہ بھی ان کا آسمانی مذاہب سے نہیں۔ پس اوّل الذکر سے کچھ نہ کچھ رابطہ ـــــ خواہ وہ کتنا ہی خفی اور کمزور ہو مسلمان کو ہو سکتا ہے مگر ثانی الذکر سے قطعاً نہیں، یہ ایک قیاسی حکمت ہے۔ اگر اس پر کوئی مطمئن نہ ہو تب بھی قرآنی فیصلے اپنی ہی جگہ رہیں گے اور مسلمان کو ان پر یقین رکھنا واجب ہے ورنہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

جواب تو پورا ہو الیکن یہ تنبیہہ یہاں ضروری ہے، کہ آج کل کے زمانے میں اہلِ کتاب کا مسئلہ بڑا نازک ہو گیا ہے۔ مادہ پرستی و بے دینی کے ہمہ گیر غلبے نے یہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ بہت سے یہود و نصاریٰ فقط نام کے یہود و نصاریٰ رہ گئے ہیں اور ذہنی طور پر انھوں نے اپنا رشتہ مذہب سے کاٹ کر سراسر ملحدانہ خیالات کو اپنا لیا ہے۔ ایسے لوگوں کا حکم اہلِ کتاب کا نہیں ہے، بلکہ ان مشرکین کا ہے جن کی عورتوں سے نکاح جائز نہیں۔ یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ جس کتابیہ سے نکاح کیا جا رہا ہے وہ واقعتہً بھی اپنے دین کی معتقد ہے یا بس نسلاً ہی اس سے منسوب ہے، اور ذہنی طور پر سراسر ملحد ہو چکی ہے۔ اگر دوسری صورت ہو تو نکاح جائز نہ ہوگا ہاں پہلی صورت میں یقیناً جائز ہوگا۔

حسین بن منصور حلّاج

سوال ۱۱:۔ (ایضاً)

ابوریحان بیرونی اپنی کتاب "الآثار الباقیہ" (جو منصور کے قریب تر زمانے کی تصنیف ہے) میں لکھتا ہے کہ۔ منصور شعبدہ باز، مکّار، اور نہ صرف مدعی نبوت، بلکہ مدعی اُلوہیت تھا۔ ایک اور خاص بات کہ بیرونی نے وہ مراسلت بھی کتاب مندرجہ بالا میں درج کر دی ہے جو منصور حلّاج نے اپنے مریدوں کے درمیان کی تھی اُس مراسلت میں منصور کی شان یہ ہوتی تھی کہ منصور اپنے آپ کو ازلی، ابدی اور خداؤں کا خدا لکھتا تھا اور اُسکے مرید اُسے "انّک الباری القدیم المنیر المنصور فی کل زمان" کے الفاظ سے یاد کرتے تھے اور اُسے علّام الغیوب کہتے تھے۔

یہ تحقیق نیاز فتحپوری کی ہے۔ نیاز نے جواب استفسارات میں لکھا ہے۔ آپ نے بھی کئی مرتبہ تجلی کی ڈاک میں منصور کی نسبت جواب ارشاد فرماتے ہیں مگر آپ نے اُس کو ولی تسلیم کیا ہے۔ براہِ کرم بیرونی کی کتاب کا حوالہ اور نیاز کی تحقیق صحیح ہے یا کیا؟ معلوم فرمائیں تو مجھ جیسے بہت سے لوگوں کو فائدہ ہوگا۔ نام نہاد صوفیوں کے یہاں منصور تو بہت بڑے رتبہ کا آدمی ہے۔

الجواب:۔

جہاں تک نیاز فتحپوری کا تعلق ہے کون باخبر نہیں جانتا کہ دین اور اہلِ دین سے تلعّب اور تمسخر ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ لہذا کسی دینی مسئلے یا مذہبی شخصیت کے بارے میں ان کی تحقیق و تصنیف کا حوالہ دینا تو فضول سی بات ہے۔ خصوصاً جب وہ البیرونی جیسے لوگوں کا سہارا لیکر خامہ فرسائی کریں تو بات اور بھی لایعنی ہو جاتی ہے۔

بدعت و شرک کے بارے میں میرا جو موقف و مشرب ہے، قارئین تجلی پر واشگاف ہے۔ رعایت کا کوئی خانہ میرے یہاں ان محرمات رکیکہ کے لئے نہیں پایا جاتا۔ لیکن منصور کے بارے میں میں بدنیانی تبرا کو اس لئے نہیں پسند کرتا کہ ان کی شخصیت مختلف فیہ ہے۔

جہاں تک اس نوع کی باطل باتوں کا تعلق ہے جن کا ذکر آپ نے البیرونی کی کتاب کے حوالے سے کیا تو ظاہر ہے کہ ان کو باطل و فاسد قرار دینے میں تأمل کا کوئی سوال ہی نہیں، لیکن کیا آپ نہیں دیکھتے کہ روایات کی دنیا میں کیسی کیسی افترا پردازیاں اور کذب آرائیاں نہیں ہوتیں۔ بڑی سے بڑی شخصیت کے بارے میں آپ کو کچھ لوگوں کی ایسی آرا مل جائیں گی کہ الامان والحفیظ اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ منصور کے بارے میں بھی بہت کچھ دروغ بافیاں ہوئی ہیں۔ اس سمجھنے کے لئے قرینہ یہ ہے کہ اگر واقعتہً متذکرہ نوع کی روایتیں پایۂ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہوتیں تو ہرگز ممکن نہیں تھا کہ بڑے بڑے اہل اللہ منصور کے بارے میں حسنِ ظن کی روش اختیار کرتے۔ یہ خیال آپ کا غلط ہے کہ منصور کو صرف نام نہاد صوفیاء کے یہاں درجہ کمال ہے۔ انھیں معتقد یا محترم سمجھنے والوں میں ایسے بڑے بڑے مشائخ گذرے ہیں جنھیں

سوادِ اعظم امام نہیں بلکہ حقیقی مرشد و شیخ مانتا ہے مثلاً شاہ عبد القادر جیلانیؒ ۔ محی الدین ابن عربیؒ ۔ شیخ فرید الدین عطارؒ ۔ مولانا رومیؒ ۔ شیخ عبد الوہاب شعرانیؒ ۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ وغیرہ

شیخ محی الدین ابن عربیؒ صوفیاء میں تو رئیس الطائفہ کہلاتے ہی ہیں لیکن علمائے ظاہر میں بھی ان کی عظمت تسلیم کرنے والوں کی کمی نہیں ۔ ایک طرف اگر حافظ ذہبیؒ ان پر جرح کرتے ہیں تو دوسری طرف حافظ ابن حجرؒ تعدیل پر زور دیتے ہیں ۔ لسان المیزان (جلد ۵) میں متعدد صفحات موجود ہیں جن میں ابن الندیم، ابن الابار، زکی منذری، ابن النجار اور ابن نقطہ وغیرہ کی توصیف و منقبت ابن عربیؒ کے حق میں نقل کی گئی ہے

علامہ شعرانی اپنی طبقات کبریٰ جلد اول صفحہ ۱۶۰ پر لکھتے ہیں :-

اجمع المحققون من اهل الله عز وجل على جلالته في سائر العلوم كما يشهد لذلك كتبه وما انكر من انكر عليه الا لدقة كلامه لا غير وانكروا على من يطالع كلامه من غير سلوك طريق الرياضة وقد ترجمه الشيخ صفي الدين ابن ابي المنصور وغيره بالولاية الكبرى والصلاح والعرفان والعلم ۔	صاحب تحقیق اہل اللہ نے ابن عربیؒ کے تمام علوم میں جلالتِ شان پر اتفاق کیا ہے جیسا کہ ان کی کتابیں اس کی گواہ ہیں اور جس کسی نے بھی ابن عربیؒ کو ہدفِ ملامت بنایا ہے ان کے کلام کے دقیق و غامض ہونے کی بناء پر بنایا ہے ۔ اسی لئے صوفیاء نے ان لوگوں کو ملامت کی ہے جو ابن عربیؒ کے کلام کا مطالعہ سلوک و ریاضت پر آگاہی حاصل کئے بغیر کرتے ہیں ۔ شیخ صفی الدین ابن ابی المنصور وغیرہ نے ابن عربی کو ولایت کبریٰ اور صلاح و عرفان اور علم سے متصف ٹھیرا ہے ۔

+ + + +

+ + + +

پھر شیخ عز الدین بن عبد السلام کے متعلق — جو بہت پائے کے شافعی عالم گذرے ہیں، لکھتے ہیں :-

وكان الشيخ عز الدين بن عبد السلام شيخ الاسلام بمصر يحط عليه كثيراً فلما صحب الشيخ ابا الحسن الشاذلي رضي الله عنه وعرف احوال القوم يترجمه بالولاية والعرفان والقطبية ۔	اور شیخ عز الدین شیخ الاسلام مصر ابن عربی پر بہت معترض رہا کرتے تھے لیکن جب شیخ ابو الحسن شاذلیؒ سے فیض صحبت اٹھایا اور جماعت صوفیاء کے احوال و اسرار سے آگاہی حاصل ہوئی تو ابن عربیؒ کو ولایت و عرفان اور قطبیت سے متصف کرنے لگے ۔

اگر ابن عربیؒ جیسا شیخ طریقت منصور کے اقوال کو زندقہ و الحاد کی بجائے اچھے محمل پر اُتارتا اور حسن ظن کی رعایت دیتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم جیسے لوگ جنھیں تصوف کی ابجد بھی نہیں آتی خواہ مخواہ تبرا بازی پر اُتر آئیں اور خطرۂ آخرت مول لیں ۔

دھوکہ بعض لوگوں کو اس صورتِ حال سے ہوا ہے کہ ابن تیمیہؒ اور مجدد الف ثانیؒ جیسے اکابر نے ابن عربی یا منصور کے بعض اقوال پر سخت نکیر کی ہے ۔ لیکن اس نکیر کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان حضرات کے نزدیک ابن عربی یا منصور واقعتہً بے دین و زندیق تھے بلکہ یہ تھی کہ ان صوفیاء کے اقوال کو متصوفین و زنادقہ نے سطحی اور گمراہ کن مفاہیم میں لیکر عملی و اعتقادی فتنے برپا کرنے شروع کر دیئے تھے ۔ تو اس سلسلے میں ہم بھی اقوالِ منصور کا رد ہی درست سمجھتے ہیں ۔ یعنی جو وحشتناک اقوال ان کی طرف منسوب ہیں انھیں بظاہر ہم بھی گمراہ کن اور لائقِ نکیر ہی قرار دیں گے ۔ البتہ چونکہ بڑے بڑے شیوخ اور اہلِ علم ان اقوال کو مستحق تاویل سمجھتے رہے ہیں اس لئے کچھ ضروری نہیں کہ براہ راست منصور کی بے دینی و زندیقی کے ڈھول پیٹے جائیں جب کہ وہ دنیا سے جا چکے اور ان کے اقوال و اعمال سے کوئی آفت ہمارے زمانے میں برپا نہیں ہے ۔

خلاصہ یہ سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی آپ سے پوچھے انا الحق کا نعرہ لگانا یا کوئی اور ایسی بات کہنا جو تعلیمات شریعت سے ہٹی ہوئی ہو کیسا ہے ؟ تو بلا تکلف کہدیجئے حرام ہے ۔ لیکن اگر کوئی یہ پوچھے کہ منصور کیا تھا تو جواب دیجئے کہ واللہ اعلم بالصواب ۔ اس پر اگر اصرار کیا جائے کہ منصور نے یہ کہا اور یہ کیا لہٰذا فیصلہ صادر کیجئے تو جواب میں کہدیجئے کہ ہم نہیں جانتے یہ روایات کہاں تک درست ہیں ۔ اگر منصور بے دین تھا تو اللہ اسے جہنم میں پہنچادیگا

اور اگر بے دین نہیں تھا بلکہ مغلوب الحال تھا تو ہم کیوں اسے بے دین قرار دے کر خواہ مخواہ کی ذمہ داری اپنے سر لیں۔ والی اللہ تصیر الامور۔

خطباتِ جمعہ

سوال ۱۲ب — از حکیم محمد ظہیر الدین۔ ضلع بارہ بنکی۔

جمعہ کے دن عموماً جو خطبہ پڑھا جاتا ہے آخر میں خلفائے راشدین اور آلِ مطہرین کے نام نامی بھی پڑھے جاتے ہیں کوئی شک نہیں کہ سرورِ عالم ؐ کے نام مبارک کے ساتھ متذکرہ بالا حضرات کا نام آنا اور ان سے صحیح محبت اور عقیدت رکھنا جزو ایمان ہے لیکن الجھن دو باتوں میں ہے اول یہ کہ حسنین ؓ کو سید الشہداء کا خطاب۔ دوسرے ان کو معصومین کہنا۔ جہاں تک علم ناقص سمجھ سکا یہی کہ سید الشہداء کے خطاب سے اللہ کے رسول ؐ نے اپنے چچا حضرت امیر حمزہ ؓ کو جس وقت وہ شہید ہوئے نوازا تھا۔ اور یہ بھی طے شدہ ہے کہ اللہ کے رسول ؐ نے جس کے لئے جو کچھ ارشاد فرما دیا یقیناً اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں وہ اس کا مستحق ہوگا حسنین ؓ کی شہادت حضور ؐ کے دنیا سے تشریف لیجانے کے بعد ہوئی تو پھر یہ خطاب کس نے دیا اور اس کی حقیقت کیا ہے۔ اسی طرح سے معصومین کہنا جب کہ یہ امر مسلم ہے کہ اللہ جل شانہ نے انبیاء مرسلین ہی کے لئے یہ چیز مخصوص کر دی تھی تو پھر ان کے علاوہ بھی کیا ہم کسی کو معصوم کہہ سکتے ہیں؟ اگر کہہ سکتے ہیں تو پھر انھیں دونوں حضرات کے لئے کیوں یہ خصوصیت ہے، جبکہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ افضل الخلق بعد الانبیاء ہیں ان کو معصوم کیوں نہیں کہا جاتا اور اگر کسی کو نہیں کہہ سکتے تو پھر اس قسم کی جادتوں کو خطبہ جیسی چیز سے علیحدہ کرنے کی توجہ حضرات علمائے کرام نے کیوں نہیں فرمائی؟

جناب والا سے امید ہے کہ اس کا جواب مدلل تشفی بخش ذریعے سے پرچہ تجلی میں تحریر فرما کر ہم جیسے کم فہم اور کم علم لوگوں کو مطمئن فرمائیں گے۔ فقط۔

الجواب ۱۲ب:—

جہاں تک سید الشہداء کے لقب کا تعلق ہے یہ علماء کے نزدیک حضرت حمزہ ؓ کے سوا بھی دوسروں کے لئے جائز ہے کیونکہ اس کا تعلق کیفیت سے ہے اور بہ اعتبارِ کیفیت کم سے کم حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت تو ایسی ضرور ہے کہ انھیں سید الشہداء کہا جا سکے۔

اور جہاں تک معصومیت کا تعلق ہے تو ہمیں نہیں معلوم حضرات حسنین ؓ کو معصوم کن خطبوں میں کہا گیا ہے۔ ایسا قول صرف شیعوں کا ہو سکتا ہے سنیوں کے نزدیک تو سوائے انبیاء ؑ کے کوئی معصوم نہیں۔ ہماری یادداشت نہیں بتاتی کہ کسی خطبے میں ایسا پڑھا یا سنا ہو۔ اگر واقعتاً ایسا کوئی خطبہ ہے تو اس کا پڑھنا حرام ہے۔

خطبات جمعہ عموماً متفق علیہ عقائد پر مشتمل ہیں البتہ انکی صورتگری اور ترتیب میں شیعی تصورات کی رعایت ضرور پائی جاتی ہے۔ سیدۃ النساء حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی منقبت اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی توصیف سر آنکھوں پر لیکن امہات المومنین میں سے حضرت عائشہ ؓ تک کا ذکر مبارک شایانِ شان انداز میں نہ آنا ذہن کے ایک خاص رُخ کا پتہ دیتا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مظہر العجائب والغرائب کے الفاظ صریح طور پر شیعی آئیڈیا لوجی کی پرچھائیاں ہیں۔ ہو سکتا ہے طریقت و تصوف کے جہانِ لاہوتی میں ان کے لئے بنیادیں موجود ہوں مگر خطبہ سننے والے عوام لاہوت و ناسوت کے اسرار و رموز سے واقف نہیں ہوتے ان کے ذہنوں پر تو یہ الفاظ حضرت علی ؓ کے بارے میں اسی افراط و غلو کا غبار چھوڑتے ہیں جس کی کاشت روافض و شیعہ یوم اول سے کرتے آئے ہیں۔

لیکن خود سنی جب شیعی افکار و خیالات سے کسی نہ کسی درجے میں متأثر ہو چکے تو کس کی مجال ہے ... ہوئی روش میں تبدیلی لا سکے۔ یہ تو اسی وقت ہوگا جب اللہ کسی امام مہدی کو مبعوث فرمائے گا۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

بندگانِ دین کی تصویریں

سوال ۱۳ — از سید نور العنایت۔ ناگپور۔

رسالہ ..... کے غوث نمبر میں تصویر حضرت غوث پاک ؒ

دیگر بزرگانِ دین شائع ہوئی ہیں، یہ قلمی تصویریں معلوم ہوتی ہیں۔ بزرگانِ دین کی تصویریں یا شبیہ شائع کرنا مذہب اسلام میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ بلکہ جب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہ ہندوستان یا مغربی ممالک کے رسالوں میں شائع ہوئی اسلامی دنیا سے سخت احتجاج کیا گیا۔

مذہبی نقطۂ نظر سے بالخصوص بزرگانِ دین کی قلمی تصاویر یا شبیہ کا شائع کرنا کس حد تک جائز ہے۔ براہِ کرم روشنی ڈالی جائے؟

کیمرہ کی ایجاد کے بعد سے نی زمانہ تصاویر لینا یا شائع کرنا زیادہ معیوب نہیں سمجھا جاتا اس لئے کہ اس زمانہ کے جس قدر بھی بزرگ یا کٹر مولوی ہیں اُن کی تصاویر تو کسی نہ کسی طرح لی گئی ہوں گی غالباً آپ بھی اس سے مبرّا نہیں ہوں گے یہاں صرف سوال بزرگانِ دین سے متعلق ہے جن کو گذرے ہوئے پانچ یا چھ سو سال کا زمانہ ہو چکا ہے اور اِن بزرگانِ دین کا ہر مسلمان کے نزدیک انتہائی احترام ہے۔ لہٰذا اس بارے میں روشنی ڈالی جائے تو مناسب ہوگا۔

الجواب[۱۳] :-

دینِ قبوری کا نام تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ اسی کا دوسرا نام دینِ مردہ پرستی بھی ہے۔ اس کے خاص خاص آئیٹم یہ ہیں قبروں پر عُرس۔ مُردہ بزرگوں سے دعا و التجا۔ انبیاء و اولیاء کی شان میں مشرکانہ نوع کا غلو۔ ایسی عبادتیں جن کا تصور بھی صحابہؓ اور تابعین اور ائمہ و فقہاء کو نہ گذرا ہو۔ یہ دین دراصل شریعتِ اسلامیہ کے بالمقابل ایک نیا دین ہے جس کا نام تو اسلام ہی ہے مگر اس کا خمیر شرک و بدعت سے اُٹھا ہے اس کے شیدائیوں کو سب سے زیادہ محبوب یہ بات ہے کہ جس طرح یہود، نصاریٰ اور اہلِ ہنود اپنے بزرگوں کو خدائی مسند پر بٹھاتے اور اُلوہی اوصاف سے متصف کرتے ہیں اسی طرح ہم بھی کریں۔ اسی شوقِ فراواں کے مظاہر یہ سجی بنی قبریں یہ سر افراز درگاہیں، یہ نذر و نیاز کے جھمیلے اور یہ مرحوم بزرگوں کی تصویریں ہیں۔ بلا سے اسلام نے تصویر بنانے کو ملعون قرار دیا ہو لیکن جن کے ذہنوں پر دینِ قبوری مسلط ہے وہ اپنا ایک طبع زاد اسلام رکھتے ہیں۔ ان کا ذاتی ایک فلسفہ ہے، انھوں نے آیاتِ الٰہی اور ارشادِ پیغمبر کے عوض اپنے افکار و اعمال کی بنیاد اور مصدر و منبع اپنے مزاج و مذاق اور ذوق و طبیعت کو بنایا ہے۔ ان کا خاصہ یہ ہے کہ محکمات کو طاق پر رکھتے اور متشابہات کو سینے سے لگاتے ہیں۔ توحیدِ صافی کو دور سے سلام کرتے اور بدعت و شرک کے فتنۂ گلفام سے پینگیں بڑھاتے ہیں۔

کون ہے جو ان کو ان کی خوش فعلیوں سے روک سکے۔ جو روکنے کی سعی کرتا ہے اسے یہ کھٹ سے وہابی۔ بے دین۔ کافر اور جو جی چاہے بنا دیتے ہیں۔ عوام بیچارے کیا جانیں علم و تفقہ کیا ہے۔ انھیں جہاں یہ سبق پڑھایا گیا کہ بزرگوں کی شفاعت سے بلا غل و غش جنت ملے گی اور سارے دلدّر نذر و نیاز اور عرس فاتحہ سے دور ہو جائیں گے بس وہ سچ مچ ان لوگوں کو بے دین سمجھنے لگے جو توحید کی دہائی دے کر انھیں عذابِ آخرت سے ڈرا رہے ہیں۔

ویسے بھی بدعتوں کے نئے نئے ہنگاموں اور جشنوں میں جو لطف ہے وہ خشک عبادتوں میں کہاں۔ عیسائیوں سے پوچھئے کتنا مزا اس عقیدے میں ہے کہ پیٹ بھر کر مزے کئے جاؤ اور گاہے ماہے پوپ کی خدمت میں اپنا اعمال نامہ پیش کر دو بس ہو گئی نجات۔ اسی نوع کا ذہن دینِ قبوری بھی پیدا کرتا ہے۔ شریعت کس کی، سنت کہاں کی۔ کھیج اُڑاؤ اور مرحوم بزرگوں کی شان میں ذہنی و عملی شاعری کہتے جاؤ سارے گناہ معاف اور حسابِ آخرت سے کُلّی فراغت۔

حاصل یہ ہے بھائی کہ بزرگانِ دین کی شبیہیں بنانا قرآن اور حدیث والے اسلام میں تو اتنی کھلی بُرائی ہے کہ کسی بھی امام اور مجتہد نے کبھی اس کے جواز کا تصور تک نہیں کیا لیکن اہلِ بدعت کے ایجاد کردہ اسلام میں سب روا ہے۔ وہ برابر من مانی کرتے رہیں گے اور ہم جیسے مولویانِ خشک ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔

سنی علماء کی فریب خوردگی

سوال ۱۴۱:۔ از محمد یامین کراچی۔

میں مدت سے تجلی دیکھتا ہوں۔ صحابہؓ کے بارے میں آپ کی روش میری سمجھ میں نہیں آئی۔ دار المصنفین اعظم گڑھ کی کتابوں کو تو آپ بھی یقیناً معتبر مانتے ہوں گے۔ ان میں سے بعض کا مطالعہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ ایسے نہیں تھے جیسے آپ بتاتے ہیں، بلکہ ان کے کارنامے افسوسناک ہیں۔ مثلاً معاویہ اور عمرو بن العاص کا جو حال شاہ معین الدین احمد صاحب نے مہاجرین حصہ دوئم میں نہایت معتبر تاریخی کتابوں کے حوالوں سے لکھا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ ان میں للہیت نہیں تھی، بلکہ خالی اقتدار اور جاہ کی خاطر انھوں نے خونریزی تک سے گریز نہیں کیا۔ آپ ہو سکے تو یہ کتاب ملاحظہ فرمائیں اور جواب دیں۔

الجواب ۱۴۱:۔

عربی کی ایک اصطلاح ہے حاطب اللیل اس کا مطلب وہ شخص ہے جو اندھیرے میں لکڑیاں چن رہا ہو۔ اس کا استعمال ایسے لوگوں کے لئے ہوتا ہے جو اخذ و نقل میں نقد و نظر اور فراست و بصیرت سے کام نہیں لیتے بلکہ آنکھیں بند کر کے سب رطب و یابس قبول کر لیتے ہیں۔

دار المصنفین اعظم گڑھ بے شک ایک معیاری ادارہ ہے اور اس کے اراکین کی دینی و ملی خدمات بڑی قیمتی ہیں جس نے ملت کو سیرۃ النبیؐ جیسی بیش بہا کتاب دی ہو اس کی عظمت میں کیا شک ہو سکتا ہے لیکن یہ کہنے کے لئے ہم معافی چاہیں گے کہ صحابہؓ کے تذکرہ و تعارف میں اس کی جو کتابیں ہماری نظر سے گذری ہیں ان میں گہری بصیرت کے عوض سطحی نقل کا انداز جا بجا پایا جاتا ہے۔ ابھی مہاجرین (حصہ دوئم) ہی آپ کے مشتبہ سے مطالعہ کی تو حضرت عمرو بن العاصؓ کا تذکرہ پڑھ کر دل خون ہو گیا کہ اللہ جب سنی علماء کا یہ حال ہے تو شیعوں کی فریاد کیا کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ صحابیت کے دامن مقدس کو داغدار کرنے اور عامۃ المسلمین کے دماغوں میں زہر بھرنے میں خود سنی علماء کی کوتاہ نظری اور سہل انگاری کا اتنا بڑا حصہ ہے کہ اس کے بارگراں سے پہاڑوں کے سینے شق ہو سکتے ہیں۔

تجلی میں متعدد بار ہم اس دل گداز حقیقت پر آنسو بہا چکے ہیں کہ سبائی و شیعی پروپیگنڈے نے کتنے ہی سنی علماء و صلحاء تک کو اسیر دام کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔ آج پھر اسی کو دہرائیں گے کہ جب حافظ سیوطی اور محدث حاکم جیسے اسلاف موضوع و واہی روایات کے فریب میں آ گئے تو بعد کے علماء کو کیا کہیں۔ عوام تو عوام خواص تک مرعوب ہو کر رہ جاتے ہیں جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایک مصنف طبری، یعقوبی، اخبار الطوال، طبقات ابن سعد، مستدرک اور اسد الغابہ وغیرہا کے حوالے دیتا چلا جا رہا ہے اور اس مرعوبیت میں یہ احساس انھیں نہیں ہو پاتا کہ صحابہ کرام کے مناہج فکر اور مزاج و سیرت کے بارے میں جو تاثر و تصور ان کتابوں سے اخذ کی ہوئی روایات دے رہی ہیں وہ اُس تاثر و تصور سے کس درجہ مختلف ہے جو قرآن کی محکم آیات اور احادیثِ صحیحہ کے مجموعوں نے عطا کیا تھا۔

اندازہ فرمائیے۔ مہاجرین حصہ دوئم کی تصریح کے مطابق حضرت عمرو بن العاصؓ خالص ایک دنیا پرست، جاہ پسند اور حریص آدمی کی طرح حضرت معاویہؓ سے سودے بازی کرتے ہیں اور جب یہ سودا طے پا جاتا ہے تو حضرت معاویہؓ کو مشورہ دیتے ہیں کہ:۔

> "پہلے عمائد شام کے دلوں میں یہ بٹھا دو کہ عثمانؓ کی شہادت میں علیؓ کا ہاتھ تھا پھر ان کو ان کی مخالفت پر آمادہ کرو" (صفحہ ۱۴۳)

پھر آگے بتایا گیا ہے کہ:۔

> "جب عمروؓ بن العاص کو یقین ہو گیا کہ اب شامی زیادہ دنوں تک میدان میں نہیں ٹھہر سکتے تو یہ تدبیر کی کہ نیزوں پر قرآن اٹھوا دئیے کہ کتاب اللہ سے جو فیصلہ ہو جائے اس پر ہم راضی ہیں۔" (صفحہ ۱۴۴)

پھر تحکیم کے باب میں وہی لغو و موضوع واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ ابو موسیٰ نے تو قرارداد کے مطابق علیؓ و معاویہؓ دونوں کی معزولی کا فیصلہ سنا دیا مگر حضرت عمرو نے بدمعاملگی اور

عہد شکنی سے کام لیکر صرف علیؓ کو معزول کیا اور معاویہؓ کو باقی رکھا ــــ اس کے بعد فرمایا گیا ہے :-

"اس فیصلے کے بعد عمرو بن العاص کو مصر لینے کی فکر دامن گیر ہوئی کیونکہ اسی کیلئے انھوں نے سب کچھ کیا تھا۔" صـ۱۲۷

بتائیے ایک معروف سنّی عالم کے قلم سے جب حضرت معاویہؓ اور حضرت عمروؓ بن العاص جیسے جلیل القدر صحابیوں کا ایسا گھٹیا کردار سامنے آئے تو صحابیت کیلئے کس عظمت و احترام کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد تو آپ ہزار رضی اللہ عنہ کی رٹ لگاتے رہئیے اور لاکھ بار کہے جائیے کہ ہم صحابیت کے مقامِ رفیع کو تہہ دل سے مانتے ہیں لیکن کس کا دل اسے قبول کرے گا اور کون ذرا اعتبار زداری یہ سوچے بغیر رہ سکے گا کہ صحابہؓ بھی آج کل ہی کے دنیا دار اور غرض پرست لیڈروں جیسے تھے جو ذاتی مفاد اور حرص و آز کی رو میں بلا تکلف ہر بری سے بری حرکت کر سکتے تھے اور فریب و دغا میں بھی خوب پیش پیش رہتے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اگر فتح مکہ سے قبل اسلام لانے والے صحابہؓ کا بھی یہی حال رہا ہو تو پھر نوچ دو قرآن کی آیتوں کو اور پھاڑ دو بخاری و مسلم کے وہ اوراق جو صحابۂ کرامؓ کی اس سے بالکل مختلف تصویر پیش کرتے ہیں۔ حد ہے "مہاجرین" کے فاضل مؤلف اول تو مومنانہ بصیرت کے بغیر واہی روایات قبول کرتے چلے گئے۔ پھر انھیں اپنے الفاظ میں ایسے تکلیف دہ انداز سے ثبتِ قرطاس کیا ہے کہ ایک فاسق جنگ باز اور ایک جلیل القدر صحابیِ رسولؐ کی تصویروں میں کوئی فرق ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ متذکرہ عبارتیں رقم کرنے والے بزرگ کے قلب و دماغ میں صحابیت کیلئے حسن ظن کی کوئی رمق بھی موجود رہی ہوگی۔ خدا کی قسم وہ کتابیں آگ میں جھونک دینے کے قابل ہیں جو ہم سے ہماری محبوب ترین متاع ــــ احترامِ صحابیت چھیننے کا اقدام کریں اور ہمیں یہ یقین دلائیں کہ ختمی مرتبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضِ صحبت اور فیضانِ نظر ضائع گیا۔

خلاصۂ جواب یہ ہے کہ طبری اور یعقوبی اور مسعودی اور طبقات ابن سعد اور فتوح البلدان اور تاریخ الخلفاء اور مستدرک اور اخبار الطوال وغیرہا کے ناموں سے کبھی مرعوب مت ہوجیئے یہ کتابیں سچ اور جھوٹ، نور اور ظلمت ہدایت اور ضلالت کا ملغوبہ ہیں۔ ان سب میں کذاب و مفتری دشمنانِ دین اور صحابہؓ سے عناد رکھنے والے حمقاء و مفسدین کی بے شمار روایات نے بار پالیا ہے۔ انہیں صرف وہ روایات سچی ہیں جو قرآن اور احادیث صحیحہ کے عطا فرمودہ تصورات سے مطابقت رکھتی ہیں اور وہ یکسر باطل و فاسد ہیں جو عالی مرتبہ اصحاب رسولؐ کے بارے میں سوءِ ظن کی راہ دکھاتی ہیں۔ سیوطی، دینوری، خضری، دار قطنی، حاکم، ابو عساکر، ابن سعد کوئی بھی ہو ان کی ہر وہ رائے اور حکایت تلووں سے رگڑ دینے کے قابل ہے جس سے سید الانبیاءؐ کے رفیع الشان صحابہؓ دنیاداروں اور غرض پرستوں کی صف میں نظر آنے لگیں۔ اللھم احفظنا۔

یزید کی محبوبہ

سوال ۱۵ :- از شمشاد علی - بستی۔

ایک اشتہار نظر سے گذرا جو درج ذیل ہے :-

" قاتلِ حسینؓ اپنے دور کا نہایت ہی عیاش حکمراں تھا اس کے عشرت کدہ میں ہر رات ایک نئی لڑکی لائی جاتی تھی، جسے یزید کے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لئے صبح ہوتے ہی قتل کر دیا جاتا تھا۔ لیکن یزید کی بدقسمتی کہ اس کی خوابگاہ میں ایک ایسی لڑکی بھی پہنچ گئی جو اہلِ بیت کی عاشق اور یزید کے خون کی پیاسی تھی۔ چنانچہ اسی کے ہاتھوں یزید کا خاتمہ ہوا۔" (از شوکت علی فہمی)

اس کے بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے ؟

الجواب ۱۵ :-

جن لوگوں نے حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی تک کے بارے میں یہ روایت گھڑ دی کہ انھوں نے بیت المال سے روپیہ اڑایا اور اس سے جوان

لڑکیاں خریدکر عین مدینے میں راگ رنگ کی محفلیں سجاتے رہے انھیں یزید کے بارے میں جو چاہے گھڑنے سے کون روک سکتا تھا۔ اب یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ دجالوں اور شیطانوں کا پھیلایا ہوا یہ زہر کتنے ہی علمائے سلف پر بھی اثر کرگیا اور انھوں نے اپنی کتابوں میں واہی و بیہودہ روایات ثبت کرکے بعد کے کوتاہ بیں اور آزاد منش لوگوں کو یہ موقعہ دیا کہ تاریخ کے نام پردہ جتنے چاہیں بازاری قسم کے ناول اور افسانے تیار کرتے رہیں۔

ہررات ایک نئی لڑکی تو کم ہے۔ اگر کوئی افسانہ نگار چاہے تو ہررات ایک درجن لڑکیاں بھی یزید کی خوابگاہ میں دکھلا سکتا ہے۔ کوئی اس سے نہیں پوچھ سکے گا کہ تمھارے منھ میں کتنے دانت ہیں؟ — ہاں حیاتِ دنیاوی کے بعد ایسا وقت ضرور آنے والا ہے جب قلم اور زبان سب کا حساب ہوگا۔ اس وقت چٹخارہ پسند افسانہ طرازوں کو معلوم ہوگا کہ اندھادھند قلم چلانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

ہمارا مشورہ ہے کہ آپ ایسے کسی اخبار یا رسالے کو ہاتھ نہ لگائیے جس میں اس طرح کے واہی اشتہارات شائع ہوتے ہوں۔ یہ مشورہ قبول نہیں تو پھر ہم آپ کی الجھنوں کا علاج نہ کرسکیں گے۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ لایعنی اور فاسد لٹریچر پڑھنے سے آدمی کا دماغ سنڈاس میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

کارِ زمانہ

سوال ۱۶:۔ از ضیاء الحق۔ احمد پور شرقیہ۔

لاہور سے ایک ہفت روزہ اخبار "ترجمان اسلام" شائع ہوتا ہے۔ جس کے نگرانِ اعلیٰ حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلماء اسلام پاکستان ہیں۔ اس اخبار میں عموماً مولانا مودودی صاحب کے عقائد و نظریات پر تنقیدی مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ ۱۴ر دسمبر ۱۹۶۲ء کے شمارے میں جناب والا کو بھی ہدفِ طعن بنایا گیا ہے۔ ملاحظہ کے لئے شمارہ مذکور ارسال کیا جارہا ہے۔ صفحہ ۱۰ و ۱۱ قابل مطالعہ ہے۔ جس میں آنجناب کو مودودی صاحب کا کٹر امتی کہا گیا ہے۔ مولانا مودودی و جماعت اسلامی کے اراکین کو گمراہ کہا جاتا ہے۔ یہ تمام الزامات کس حد تک درست ہیں؟ جواب بذریعہ تجلی عنایت فرمائیں۔

الجواب ۱۶:۔

جب ہم دوسروں پر تنقید کرتے ہیں تو دوسرے کیوں نہ ہم پر تنقید کریں گے۔ میدان میں جو اترے گا وہ خود بھی حملہ کرے گا اور دوسروں کے بھی وار سہے گا۔ ترجمان اسلام کا مبیّنہ شمارہ تو ہمیں ملا نہیں لیکن مل ہی جاتا تو ضروری نہیں تھا کہ ہم نوٹس لے ہی لیتے۔ آئے دن طرح طرح کے طنز و طعن ہم پر تنقید کے نام سے کئے جاتے ہیں۔ کوئی شرعی قسم کی گالیاں دیتا ہے کوئی تضحیک و تمسخر کی مشق کرتا ہے۔ کوئی فقط منھ چڑانے اور انگوٹھا دکھانے پر ہی قناعت کرلیتا ہے۔ دنیا اسی کا نام ہے۔ ہم اگر ہر مبارز سے دو دو ہاتھ کرنے لگیں تو عمرِ نوح بھی کفایت نہ کرسکے گی۔ لہٰذا خیریت اسی میں ہے کہ صبرِ جمیل کیا جائے۔ ہر شخص اپنی فردِ عمل تیار کررہا ہے لطف قیامت کے دن آئے گا۔ وہاں نہ افترا پردازیاں کام آئیں گی نہ پھبتیاں۔ جس نے جو کچھ کیا ہوگا بھگتے گا۔

آپ نے معلوم نہیں کن الزامات کے بارے میں دریافت کیا ہے کہ وہ کس حد تک درست ہیں۔ جہاں تک مودودی صاحب کے کٹر امتی ہونے والی بات کا تعلق ہے اسے الزام نہیں ادا کہیں گے۔ اور جہاں تک مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے گمراہ ہونے کا تعلق ہے اسے بھی الزام نہیں بلکہ نعرۂ مستانہ کہا جائے گا۔ پھر بتائیے ہم کس بات کا جواب دیں۔ بازار میں قلم روشنائی اور کاغذ کی کمی نہیں۔ جس کا جی چاہے یہ چیزیں چند پیسوں میں خرید کر لا سکتا ہے اور پھر پونے چودہ سو برسوں کے سارے ہی علماء و فضلاء کو "گمراہ" "نالائق" اور بے دین لکھدے تو میں یا آپ اسے پھانسی پر نہیں چڑھا سکتے۔

آپ نے سنا ہوگا مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ ابوبکر و عمر کو غاصب و گمراہ کہتا ہے تو پھر عامر عثمانی یا مولانا مودودی کس نرالی مٹی سے بنے ہیں کہ انھیں گمراہ و بددین کہنے والے

منہ میں کیڑے پڑجائیں!

رفع یدین

سوال ۱۴:- (ایضاً)

میرا اپنے ایک دوست سے اختلاف ہے۔ وہ کہتا ہے نماز میں رفع یدین نہ کرنے کے ثبوت میں ایک حدیث بھی معتبر اور صحیح نہیں ہے۔ جو شخص رفع یدین نہیں کرتا وہ سنتِ نبوی و سنتِ صحابہؓ کے خلاف کرتا ہے۔ اور میں یہ کہتا ہوں کہ رفع یدین کرنا یا نہ کرنا دونوں صورتیں عین سنت ہیں۔ اور اس کا کہنا ہے کہ ایک صحیح حدیث اپنے ثبوت میں پیش کردو ایک ہزار روپیہ انعام دوں گا۔ براہ کرم عدم رفع یدین کے ثبوت میں صحیح حدیث تحریر فرمادیں؟

الجواب ۱۴:-

فقہی فروعات کے سلسلے میں "انعام" کی باتیں اور بھی لوگ وقتاً فوقتاً کرتے رہے ہیں، لیکن ظاہر ہے یہ سنجیدگی نہیں چھچھورا پن ہے اور ثقہ اہل علم نے کبھی اس چیلنج بازی کو پسند نہیں فرمایا۔

ہمیں رفع یدین اور آمین بالجہر اور فاتحہ خلف الامام جیسے فروعی مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں ان مسائل کا اختلاف سنت و بدعت کا اختلاف نہیں اجتہادی اختلاف ہے اور ہر مقلد پر لازم ہے کہ فقہی مسائل میں اپنے مجتہدین و ائمہ کی تقلید کرے۔ چاروں امام برحق ہیں اور جس شخص نے جس امام کو زیادہ معتمد سمجھ لیا اسی کی پیروی کرنا اس پر لازم ہے اور یہ بھی لازم ہے کہ دوسرے ائمہ اور ان کے پیروؤں کو حقارت و نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھے، بلکہ اپنے اپنے اعتبار سے انھیں بھی اسی طرح راہ ہدایت پر تصور کرے جس طرح خود کو تصور کرتا ہے۔

ہم اگر ان فروعی بحثوں میں دلچسپی بھی لیں تو گفتگو کسی قطعی فیصلے پر نہیں پہنچ سکتی، بلکہ جواب الجواب اور تعقبات کا ایک لامتناہی سلسلہ چھڑ جائے گا۔ پچھلے فقہاء کے مابین انہیں سے ہر مسئلہ پر اتنی مفصل بحثیں ہوئی ہیں کہ انھیں جمع کر دیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہوں گی۔ یہی آپ کا رفع یدین والا مسئلہ ایسا ہے کہ ہم قلم چلانے پر اتریں تو تجلی کے کم سے کم بیس صفحات بے تکان لکھ سکتے ہیں۔ مگر سوائے اس کے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا کہ اکثر و بیشتر قارئین کبیدہ خاطر ہوں اور بات وہیں کی ہیں رہے جہاں اب ہے۔

خوب سمجھ لیجئے۔ عوام پر جو تقلید کو واجب قرار دیا گیا ہے اس کا مفاد یہی ہے کہ وہ بھانت بھانت کے علماء کا تختۂ مشق ہونے سے بچے رہیں۔ اگر تقلید کا دامن چھوڑ دیا جائے تو عوام کا دین کھلونا بنکر رہ جائے۔

اس تمہید کے بعد ہم آپ کے چیلنج باز دوست کو قائل کرنے اور ایک ہزار کا ہوائی انعام حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ آپ کے اطمینان کی خاطر تھوڑی سی روشنی حنفی مسلک پر ڈالتے ہیں۔

صحیح مسلم میں حدیث وارد ہوئی ہے۔ جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں:-

خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال مالی اراکم رافعی ایدیکم کانھا اذناب خیل شمس اسکنوا فی الصلوٰۃ (باب الامر بالسکون فی الصلوٰۃ)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف آنکلے اور فرمایا تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ اس طرح اپنے ہاتھ اٹھاتے ہو گویا کہ وہ بے چین گھوڑوں کی دمیں ہیں۔ نماز میں سکون اختیار کیا کرو۔

ہمیں معلوم ہے کہ امام بخاری نے اپنے رسالے رفع یدین میں اس کی تاویل یہ کی ہے کہ صحابہؓ اس وقت سلام پھیرنے کے وقت ہاتھ اٹھا رہے تھے اسی پر حضورؐ نے نکیر کی۔ پھر امام نووی نے بھی اپنی شرح مسلم میں یہی ارشاد فرمایا لیکن ان دونوں بزرگوں کی یہ بات قرینِ قیاس نہیں ہے۔ اس سے قطع نظر کہ ان بزرگوں کو دو مختلف روایتوں کے ایک ہونے کا دھوکا ہوا ہے درایتاً نگاہ کیجئے کہ کیا حضورؐ مذکورہ ارشاد صرف یہ بات دیکھ کر فرما سکتے تھے کہ صحابہؓ سلام کرتے وقت ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ جناب گھوڑوں کی دموں سے تشبیہ دینا تقاضا کرتا ہے کہ ہاتھ اٹھانے کا فعل بار بار کیا جارہا ہو۔ فقط سلام پھیرتے ہوئے ایسا کرنا تو اس تشبیہ سے مطابقت رکھتا ہے نہ وہ سکون کے منافی ہے حضور

سکون کا حکم دیتے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ نماز پڑھ رہے تھے حضورؐ کا ادھر سے گذر ہوا تو انھوں نے دیکھا کہ وہ رکوع اور سجود میں جاتے آتے بار بار رفع یدین کیا جا رہا ہے اسپر آپ نے مذکورہ ارشاد صادر فرمایا۔

یوں بھی سوچئے کہ جب نمازی سلام کے وقت دائیں بائیں چہرے پھیرتے ہیں تو یوں نہیں کہا جاتا کہ انھوں نے نماز میں دائیں بائیں دیکھا، بلکہ اس فعل کو تکمیل نماز کے بعد کا فعل قرار دیا جاتا ہے۔ پس صحابہؓ اگر سلام پھیرتے وقت رفع یدین کر رہے ہوتے تو حضورؐ یوں نہ کہتے کہ "نماز میں سکون اختیار کرو"۔ یہ فقرہ بتا رہا ہے کہ حضورؐ نے کسی ایسے ہی فعل پر اسے صادر فرمایا تھا جو نماز کے اندر کیا جا رہا تھا اور بار بار کیا جا رہا تھا۔ بار بار کرنا ہی سکون کے بھی منافی ہے اور بدکے ہوئے گھوڑوں کی تشبیہ بھی اسی سے جوڑ کھاتی ہے۔

علاوہ ازیں اسکنوا فی الصلوٰۃ ایک اصول اور بنیادی قاعدہ حضورؐ نے بیان فرما دیا جس کا تقاضا ہے کہ جس حد تک گنجائش نکلے ہم قلت حرکت اور سکون ہی کو نماز میں ترجیح دیں۔ گنجائش کا معاملہ یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ اور تکبیرات عیدین کے وقت تو رفع یدین قطعی طور پر ثابت ہے۔ اسی طرح رکوع و سجود بھی بلا اختلاف ثابت ہیں لہٰذا ان کے بارے میں حرکت و جنبش ہی کو اختیار کرنا لازم ہوگا، مگر دوران صلوٰۃ میں رکوع و سجود کے وقت ہاتھ اٹھانا اور نہ اٹھانا دونوں باتیں مضبوط روایتوں سے ثابت ہیں۔ لہٰذا امام ابو حنیفہؒ نے حضورؐ کے بیان فرمودہ قاعدے کی تعمیل میں قلت حرکت والے عمل کو پسند فرمایا یعنی ہاتھ نہ اٹھانا اور مشہور روایت کے مطابق یہی امام مالکؒ کا بھی مسلک ہے۔ ابن رشد مالکی نے بدایۃ المجتہد میں کہا ہے:-

انّ مالکاً ترك الرفع لموافقة عمل اهل المدينة۔	امام مالکؒ نے اہل مدینہ کے طرز عمل سے مطابقت کرنے کی خاطر رفع یدین ترک کر دیا تھا۔

سفیان ثوری اور جملہ اہل کوفہ بھی رفع یدین کے تارکین میں ہیں۔

ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے علقمہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا:-

الا أصلّي بكم صلوٰة رسول الله صلى الله عليه وسلم۔	کیا میں تمھارے ساتھ ٹھیک اس نماز نہ پڑھوں جس طرح حضورؐ پڑھا کرتے تھے۔

پھر ابن مسعودؓ نے نماز پڑھی اور سوائے تکبیر تحریمہ کے اور کسی موقع پر رفع یدین نہیں کیا۔ ترمذی نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے اور ابن حزم صحیح گردانتے ہیں۔ طحاوی نے اسی روایت کو بطور روایت قولی بھی بیان کیا ہے یعنی عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف شروع کی تکبیر کے وقت ہاتھ اٹھاتے تھے اس کے بعد ساری نماز میں اس کا اعادہ نہیں کرتے تھے۔

طحاوی اور ابن ابی شیبہ اور بیہقی سند صحیح کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ مجاہد نے بیان کیا:-

صليت خلف ابن عمر فلم يكن يرفع يديه الا في التكبيرة الاولى من الصلوٰة۔	میں نے عبداللہ ابن عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی۔ پس وہ سوائے تکبیر اولیٰ کے کسی موقع پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔

ہمیں معلوم ہے کہ ان آثار و روایات پر رفع یدین کے قائلین کی طرف سے بہت کچھ کلام کیا گیا ہے مگر یہ بھی معلوم ہے کہ علمائے احناف نے انھیں عمدہ جوابات دیئے ہیں صورت مسئلہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ رفع یدین یقیناً حضورؐ نے کیا تھا لیکن پھر یہ منسوخ ہو گیا۔ آخر کیا اور متعدد چیزیں منسوخ نہیں ہوئیں۔ نماز میں ابتداءً تو کلام بھی جائز تھا، اشارہ بھی ہوتی تھی۔ مگر امت کے لئے کسی بھی عبادت کی کامل اور بہترین شکل وہی ہے جو حضورؐ سے آخری دور میں ثابت ہے۔ عبداللہ ابن عمرؓ کے بارے میں رفع یدین کی روایات بھی ملتی ہیں تو اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب تک انھیں رفع یدین کے منسوخ ہونے کے دلائل پر اطمینان نہیں ہو گیا اس پر عمل کرتے رہے پھر مزید شواہد سے اطمینان حاصل ہو گیا تو ترک فرما دیا۔ اب اگر امام بخاریؒ یا کسی اور کے

نزدیک نسخ ثابت نہیں تو اسے یہی چاہئے کہ رفع یدین کیا کرے۔ لیکن جن علماء کی نگاہ میں نسخ کے دلائل قابل اعتماد ہیں ان کے رفع یدین نہ کرنے کو حقارت کی نظر سے دیکھنا اور سنتِ نبوی اور سنتِ صحابہؓ کے خلاف بتلانا چھوٹے ظرف کے جھگڑالو لوگوں کا کام تو ہو سکتا ہے بڑے ظرف کے بردبار علماء کا کام نہیں ہو سکتا۔

یہ ہم نے آپ کے اور دیگر حنفی قارئین کے اطمینان کی خاطر قلیل سا مواد پیش کر دیا۔ ہمیں خوب معلوم ہے کہ آپ کے دوست اور ان جیسا مزاج رکھنے والے دیگر حضرات اس میں طرح طرح سے کیڑے ڈالیں گے اور ممکن ہو سکا تو کہیں تعقب بھی چھپوا دیں گے، لیکن ہمیں مناظرہ کرنا نہیں ہے جو لوگ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے جلیل القدر اصحاب کے تفقہ سے مطمئن نہ ہوں وہ جو چاہے کرتے رہیں ہم زبردستی انھیں حنفی بنانے کے درپے نہ ہوں گے۔

ضبط تولید

سوال ۱۸:۔ از محمد قاسم خان۔ ضلع نظام آباد۔ دکن

ایک عورت جس کے تین بچے ہیں اور وہ اسوقت بھی حاملہ ہے صحت کے اعتبار سے نہایت کمزور ہے۔ ڈاکٹر کا مشورہ ہے کہ اس موجودہ زچگی کے بعد مانع حمل آپریشن کرا لیا جائے ورنہ عورت کی جان کو خطرہ لاحق ہو جائیگا۔ دوسری صورت ڈاکٹر نے یہ بتلائی کہ اگر عورت کی کمزوری کے پیش نظر اس کا آپریشن نہ کرایا جائے تو کم از کم مرد یعنی اس عورت کا شوہر اپنا خود آپریشن کرالے تاکہ آئندہ استقرارِ حمل کی گنجائش ہی نہ رہے۔

پس قرآن و سنت کی روشنی میں جواب دیں کہ ان دونوں صورتوں میں کونسی صورت جائز ہو سکتی ہے؟

الجواب ۱۸:۔

ایسی صورت میں اولیٰ طریقہ تو یہ ہے کہ بجائے آپریشن کے مانع حمل دوائیں استعمال کی جائیں کیونکہ کسے معلوم ہے کچھ دنوں بعد بیوی اچھی ہو ہی جائے اور استقرار حمل میں خطرۂ جان باقی نہ رہے۔ لیکن اگر اس کی کوئی توقع نہ ہو یا قابل اطمینان دوائیں مہیا نہ ہو سکیں تو آپریشن عورت ہی کا جائز ہو سکتا ہے نہ کہ مرد کا۔ مرد کا آپریشن شرعاً اور عقلاً دونوں اعتبار سے نامعقول ہے۔

شرعاً یوں کہ برتھ کنٹرول عام حالات میں حلال چیز نہیں ہے اگر مجبوری ہی آپڑے تو یہ اسی طرح جائز ہوگا جیسے حالتِ اضطرار میں شراب و خنزیر جائز ہو جاتے ہیں۔ اب یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ خنزیر کا گوشت صرف مضطر کے لئے جائز ہوتا ہے نہ یہ کہ مضطر تو ہو زید اور گوشت کھالے بکر۔ پیش فرمودہ صورت میں خطرہ عورت کو درپیش ہے نہ کہ مرد کو لہذا آپریشن کا جواز بھی اسی کے لئے ہو سکے گا نہ کہ مرد کے لئے۔ علاوہ ازیں مرد کے لئے اسلام نے ایک سے زائد بیویوں کا جواز رکھا ہے۔ یہ اسی لئے تو ہے کہ جب حالات تقاضا کریں تو مسلمان اس جواز سے فائدہ اٹھائے کوئی وجہ نہیں کہ متذکرہ شکل میں مرد دوسری شادی نہ کرلے۔ اگر مالی پوزیشن اس کی اجازت نہیں دیتی یا کسی اور وجہ سے دوسری عورت نکاح کے لئے مہیا نہیں ہو سکتی تو پھر آپریشن بیوی ہی کا مباح ہوگا۔

عقلاً یوں کہ کون جانتا ہے موجودہ بیوی کب تک زندہ رہے گی۔ فرض کیجئے مرد تو آج آپریشن کرا بیٹھے اور کل کلاں کو بیوی دنیا سے سدھار جائے تو اب مرد کی کیا پوزیشن بنے گی۔ ظاہر ہے اسے نئی شادی کی ضرورت ہوگی۔ ناواقفیت کے عالم میں کسی نے اسے اپنی بیٹی دے بھی دی تو سوائے اس کے کیا نتیجہ ہوگا کہ اب کبھی اولاد پیدا نہ ہو اور تناسل و توالد کا وہ بنیادی مقصد جو وظیفۂ زوجیت کی جان ہے ہمیشہ کے لئے فوت ہو جائے نئی بیوی کے لئے یہ محرومی کس ذہنی اذیت اور اضطراب و حزن کا سبب بن سکتی ہے اسے ہر وہ شخص جانتا ہے کہ جس کے سر میں گودا ہے۔ بعید نہیں یہ چیز انتہائی خراب نتائج تک لے جائے۔

بے تہہ باتیں

سوال ۱۹:۔ از سجاد نازلی۔ نندیال۔

ہمارے یہاں ایک بزرگ ہیں جو مہدویہ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو حنفی المذہب بھی بتاتے ہیں۔ موصوف

کو لوگ ایک عالم تصور کرتے ہیں اور وہ اکثر شرعی مسائل کے سلسلے میں فتوی بھی دیتے رہتے ہیں۔ کل یعنی ۱۳ اگست محفل میلاد میں انھوں نے اپنی تقریر میں حضورؐ کے نام پر میلاد اور قصائد وغیرہ کا پڑھنا جائز قرار دیا۔ اس سلسلے میں ان کا طرز استدلال یہ ہے کہ حضور اکرمؐ خود بلالؓ کو حکم دیتے ہیں کہ دوشنبہ کے دن روزہ رکھا کرو کیونکہ یہ میری پیدائش کا دن ہے، لہذا حضور پرنور خود تاریخ تعین کو جائز ٹھیراتے ہیں تو ہم آج کے دن رسول صلعم کے نام پر محفل میلاد کیوں نہ منعقد کریں دوسری دلیل انھوں نے یہ پیش کی کہ شاہ رفیع الدینؒ دہلوی نے کہا کہ آپ کے والد بزرگوار شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ نے اپنے فتووں میں یہ لکھا ہے کہ شاہ صاحب کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم دہلویؒ ربیع الاول کی بارھویں تاریخ کو محفل میلاد مقرر کر کے اس کے بعد کھانا پکا کر کھلاتے۔ ایک دفعہ شاہ صاحب کے یہاں پکوانے کیلئے کچھ میسر نہ ہوا تو محفل میلاد کے بعد انھوں نے بھنے ہوئے چنے تقسیم کئے۔ رات کو انھوں نے خواب میں دیکھا کہ جو خوان میں نے تقسیم کی تھی وہ جنت کے میووں میں تبدیل ہو گئی۔

الجواب :۔

چلئے مان لیجئے کہ حضورؐ نے حضرت بلالؓ کو اپنی پیدائش کے دن روزہ رکھنے کا حکم دیا تھا لیکن ان بزرگ سے پوچھئے کہ روزے کے پیٹ میں سے میلاد کیونکر نکل آیا۔ اگر اس بات میں کوئی معقولیت ہے کہ جس دن روزے کا حکم دیا جائے اس دن میلاد کرنا ثواب کا کام ہے تو پھر رمضان میں تیس دن میلاد کرنا ضرور ثواب کا کام ہوگا۔ پھر کیوں نہیں یہ بزرگوار سارے رمضان میلاد مناتے۔

اصل میں میلادی حضرات کا مقصد دین کی پیروی نہیں بلکہ اپنی خواہشات کے پیچھے چلنا ہے ورنہ جب انکے استدلال کے مطابق حضورؐ نے اپنی ولادت کے دن روزہ رکھنے کا حکم دیا تھا تو انھیں چاہئے کہ روزہ رکھیں اور رکھوائیں۔ یہ خوب دینداری ہے کہ جس عبادت کا حضورؐ نے صاف صاف حکم دیا اس پر تو عمل نہیں۔ نہ خود روزہ رکھیں نہ دوسروں کو ترغیب دیں۔ میلاد کے جتنے پوسٹر چھپتے ہیں انھیں دیکھ لیجئے کہ روزے کا تو ذکر تک نہیں ملے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقصود حکم رسولؐ کی پیروی نہیں، بلکہ اپنی خواہشات کی پیروی ہے۔ آپ ان سے دریافت کیجئے کہ اگر حضورؐ کی پیدائش کے دن ہر سال میلاد کرنا ثواب کا کام ہوتا تو کیوں حضورؐ نے بلالؓ کو فقط روزہ رکھنے کا حکم دیا اور میلاد کی ترغیب نہیں دی ہر سال تو کیا ایک بار بھی یہ نہیں فرمایا کہ میلاد کی محفل سجالو۔ نہ حضورؐ نے خود حضرت ابراہیمؑ حضرت عیسیٰؑ یا حضرت موسیٰؑ کسی بھی پیغمبر کے لئے میلاد کی بزم منعقد کی۔ تو معلوم ہوا کہ اس میں ثواب نہیں تھا ورنہ حضورؐ سے بڑھ کر ثواب کا کام کرنے والا اور اس کی تعلیم دینے والا کون ہو سکتا ہے۔

رہی حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ کے قول وفعل کی بات۔ تو بھائی وہ نہ نبی تھے نہ صحابی، نہ امام فقہ تھے نہ شارع انھوں نے جو کچھ کیا ان کے ساتھ گیا مسلمان کا کام اللہ اور رسولؐ کے احکام پر چلنا اور اُن مجتہدین کی پیروی کرنا ہے جنھیں دنیا نے فقہ کا امام تسلیم کیا ہے۔ یوں ہر ہر بزرگ کے قول وفعل کو حجت بنانے لگ گئے تو دین کا ستیاناس ہو جائیگا کیونکہ بزرگ لوگ باوجود قابل احترام ہونے کے معصوم نہیں ہوتے اور ان سے کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی مسئلے میں سوجھ بوجھ کی غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ ان کے جن افکار واعمال کی تائید قرآن وحدیث اور ائمہ وفقہاء کے اقوال سے مل جائے وہ لائق پیروی ہیں مگر جن کی تائید نہ ملے ان کی پیروی نہیں ہو گی۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان میں ایک زمانے تک متعدد بدعتیں پائی جاتی رہی ہیں جن کی اصلاح رفتہ رفتہ ہوئی ہے۔ چنانچہ ابتداءً خود شاہ ولی اللہؒ کے خیالات وعقائد وہ نہیں تھے جو بعد میں نکھرے۔ ان کی الانتباہ فی سلاسل اولیاء میں طوافِ قبر تک کی تلقین موجود ہے لیکن پھر وہی ہیں جو اصلاحِ عقائد کے بعد خود اس طرح کی چیزوں کو شدومد سے برا اور حرام کہتے ہیں۔ ان کے رسائل اور

کتابیں موجود ہیں دیکھ لی جائیں۔ حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ بھی تو اسی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے بزرگوار کو شاہ عبدالرحیمؒ کا میلاد تو یاد رہا مگر شاہ اسمٰعیلؒ کی تقویۃ الایمان یاد نہیں آئی حالانکہ تقویۃ الایمان میں ہر بات قرآنی آیات اور احادیث صحیحہ کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

مختصر یہ کہ ان بزرگوار سے کہئے حضورؐ کے یوم ولادت کو روزہ رکھا کریں اور دوسروں کو بھی اتنے ہی زور شور سے اس کی تعلیم دیں جتنے زور شور سے میلاد کا سبق پڑھاتے ہیں۔ بلکہ یہ شرط رکھ دینی چاہیئے کہ میلاد میں وہی شریک ہوگا جس نے اس دن روزہ بھی رکھا ہو۔ اگر ایسا کر لیا گیا تو ہمیں یقین ہے کہ میلاد کی محفلیں سونی ہوجائیں گی کیونکہ جس طرح کے لوگ آج کل میلاد کی محفلوں کو رونق بخشتے ہیں وہ ایسی کڑی اور خشک قید کو مشکل ہی سے برداشت کر سکتے ہیں۔ اللہ ہر ایک کو پیرویِ دین کی توفیق دے اور بدعتوں سے بچائے۔

پوتے کی وراثت

سوال[۲۰]:- (ایضاً)

دادا کی وراثت سے پوتے کی محرومی جب کہ پوتے کا باپ اپنے باپ کے سامنے انتقال کر جائے کیوں ہے؟ — میں شریعت کے مسائل میں ریب نہیں رکھتا ہوں پھر بھی معلومات کے لئے آپ سے یہ سوال کر رہا ہوں۔

الجواب[۲۰]:-

اس مسئلہ پر تجلی میں متعدد بار لکھا جا چکا ہے۔ اگر تجلی کی ڈاک کتابی شکل میں چھپ گئی ہوتی تو ہم اسے دیکھ لینے کا مشورہ دیتے لیکن نہیں چھپی تو مختصر جواب پیش خدمت ہے۔

یہ آپ کا سوال — جسے بگڑے ہوئے ذہن کے لوگوں نے خواہ مخواہ عوام میں پھیلا دیا ہے ایسا ہی ہے جیسے آپ یوں پوچھیں کہ دولت مند مرنے والے کی دولت سے غریب ہمسایوں کو کیوں ورثہ نہیں ملتا؟

حصہ کیسے ملے جب کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں خود ہی وارثوں کی تفصیل اور تقسیم کا طریقہ بتا دیا ہے۔ اللہ نے بتایا ہے کہ کسی شخص کی زندگی میں اس کا مال ترکہ نہیں بنتا نہ ایسا کوئی فرد اس کے مال میں اپنے حصّے کا دعویدار ہو سکتا ہے جسے اسکی موت کے بعد وراثت ملنی ہے حتیٰ کہ بیٹا بھی باپ کے جیتے جی اس کے مال میں حصّے دار نہیں۔

دوسرا اصول اللہ نے یہ بتایا ہے کہ ترکے میں حصّہ دار وہی لوگ بنیں گے جو ترکہ چھوڑنے والے کی موت کے وقت زندہ ہیں۔ یہ نہیں ہوگا کہ جو زندہ نہیں ہیں، بلکہ پہلے مر چکے انھیں بھی حصہ دار قرار دیا جائے۔

اب ان دونوں اصولوں کے پیش نظر سوچیئے کہ پوتوں کو ترکہ پہنچنے کی کیا صورت باقی رہ جاتی ہے۔ فرض کیجئے تذکرہ زید کا ہے زید کا بیٹا بکر زید کی زندگی ہی میں انتقال کر گیا تو پہلے اصول کے مطابق اس کا کوئی حصّہ اپنے باپ زید کے مال میں نہیں تھا۔ اب کچھ دنوں بعد زید انتقال کرتا ہے تو بکر کے بچوں کو ترکہ میں حصہ کس قاعدے سے ملے۔ قرآن و حدیث میں تو پوتوں کا حصّہ آیا نہیں جب کہ دوسرے قریبی حقدار موجود ہوں۔ انھیں اگر حصّہ دلایا جائے تو لازماً یہ فرض کرنا پڑے گا کہ ان کا باپ بکر جو زید کی زندگی ہی میں مر چکا وہ باوجود مرحوم ہونے کے زید کی وراثت میں حق رکھتا ہے اور اسی حق کو اس کے بیٹوں کی طرف منتقل کیا جا رہا ہے۔ یہ دوسرے اصول کی خلاف ورزی ہوگی۔

اللہ کے متعین کردہ اصولوں کو توڑنے سے جو گوناگوں خرابیاں عملاً پیدا ہوتی ہیں ان کا ذکر یہاں باعث طوالت ہوگا۔ آپ صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ پوتوں کی وراثت کا مسئلہ ان فتنوں میں سے ایک فتنہ ہے جو مغرب زدہ لوگوں کے اٹھائے ہوئے ہیں اور اس کی آڑ میں وہی علماء کی مخالفت و تحقیر کا ذہن کام کر رہا ہے۔ جو لوگ ذرا بھی طبع سلیم رکھتے ہیں ان کے لئے تو یہی بات کافی ہے کہ پورے چودہ سو برسوں کے تمام علماء و فقہاء جس معاملہ میں کلیتہً متفق ہیں اس کے خلاف ہنگامہ و شورش برپا کرنا سوائے شریروں کے کسی کا کام نہیں ہو سکتا۔ آپ کو شاید معلوم نہیں پوتے کی وراثت کا مسئلہ مغرب زدہ مدعیان اسلام کا ایک خاص حربہ ہے جو وہ بالواسطہ قرآن و سنت کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔

رسول اللہؐ کی دو حیثیتیں

سوال ۲۱:- از عبدالرحیم - احمد آباد۔

دو حدیثوں میں مجھے تضاد نظر آیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ دونوں حدیثیں صحیح ہوں تو ان میں قطعاً کوئی تضاد نہیں ہو سکتا۔ میری اپنی کج فہمی، کوتاہ بینی اور بے علمی ہے۔ حضرت مولانا مودودی مدظلہٗ نے اپنی کتاب تفہیمات حصہ اول میں کسی جگہ یہ حدیث رقم فرمائی (ابھی اس وقت میرے پاس تفہیمات نہیں ہے) کہ حضورؐ نے اپنی زبانِ مبارک کی طرف اشارہ فرماکر ارشاد فرمایا کہ "لکھو خدا کی قسم اس سے (زبان سے) جو نکلتا ہے حق ہی نکلتا ہے" اور دوسری وہ حدیثیں میری نظر سے گذریں جن میں آپؐ کے یہ ارشادات کہ "میں تمھیں جو باتیں دین کے متعلق کہوں اس کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جو باتیں دنیاوی اُمور کے متعلق کہوں اس میں تم آزاد ہو چاہو مانو یا نہ مانو" سوال یہ ہے کہ وہ "دنیاوی اُمور" کیا ہیں حالانکہ پہلی حدیث میں ایسا کوئی استثنا نہیں معلوم ہوتا۔ قرآنِ کریم میں اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے کہ "رسولؐ تمھیں جو کچھ دیں اُسے لیلو اور جس سے منع کرے اس کو چھوڑ دو" (حشر رکوع ۱) دوسری جگہ باری تعالےٰ عزّ اسمہٗ فرماتا ہے کہ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (النجم رکوع ۱) آپؐ جو کچھ ارشاد فرماتے وہ وحی کی بناء پر فرماتے ہیں.... ....ایک اور جگہ دیکھئے خالقِ کائنات فرما رہا ہے کہ "جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے بغیر فیصلہ کرتے وہی لوگ کافر ہیں، فاسق ہیں، ظالم ہیں۔ اب یہ تو اظہر من الشمس ہے کہ اللہ تعالےٰ کے احکام ہم تک بلا واسطہ نہیں آئے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آئے اور ہم یہ بھی ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام صرف وہی نہیں ہیں جو "کتاب" میں ہیں بلکہ سنت پر بھی ہمارا ایمان ہے اور ہر عمل کئے بغیر ہم نہ دنیوی زندگی خوش حال بنا سکتے ہیں نہ آخرت میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ پھر فیصلے سے مراد صرف وہ فیصلے ہی نہیں جو عدالت میں ہوتے ہیں، بلکہ بقول مولانا مودودی مدظلہٗ ہر وہ فیصلہ جو ہر آدمی کو ہر موقع پر کرنا چاہئے۔ دیکھئے "خطبات دوم" یہاں کوئی اشارہ نہیں۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آپؐ کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک حیثیت بشر کی اور اس حیثیت میں آپؐ نے جو بھی فرمایا وہ ہمارے لئے حجت نہیں دوسری حیثیت رسولؐ کی، اس حیثیت میں آپؐ کا ہر قول و فعل قیامت تک ہمارے لئے حجت ہے۔ بے شک آپؐ بشر تھے اس سے کسی صحیح العقیدہ مسلمان کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس انسان کا بشر ہونا جو بیک وقت رسول بھی ہو۔ قدم قدم پر جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی مل رہی ہو۔ اگر بمقتضائے بشریت اُس سے کوئی معمولی بھی غلطی ہو جائے تو فوراً بذریعہ وحی اس کی اصلاح کردی جائے، اس بات کو مستلزم نہیں کہ ہم اسکی بعض باتوں کو اپنے لئے حجت مانیں اور بعض کے ماننے یا نہ ماننے میں آزاد بھی ہوں۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جگہ یہ بھی تصریح فرمائی کہ میں فلاں فلاں بات رسولؐ کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں اور فلاں بات بشر ہونے کی حالت میں کہہ رہا ہوں امید ہے کہ آنجناب ناچیز کے اشکالات رفع کرنے کی کوشش کیجئے

الجواب ۲۱:-

دونوں روایتیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں اور ان میں کوئی تضاد نہیں۔ تابیر نخلہ والی حدیث بہت مشہور ہے۔ عرب میں لوگ مذکر و مؤنث کھجوروں کا پیوند لگایا کرتے تھے جس سے پیداوار پر اچھا اثر پڑتا تھا۔ حضورؐ نے اسے سنا تو کچھ اس طرح کی رائے ظاہر فرمائی جیسے یہ فعل عبث ہو۔ اس پر آپؐ کے فرمانبردار صحابہؓ اس سال ایسا کرنے سے باز رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پیداوار اتنی اچھی نہیں ہوئی جتنی پیوند لگانے کی صورت میں ہوتی تھی اس کا علم حضورؐ کو ہوا تو آپؐ نے فرمایا کہ اپنے دنیاوی معاملات میں تم لوگ خود بہتر سوچ سمجھ سکتے ہو۔ میں تو ایک بشر ہوں۔ جب تمھیں دین کے بارے میں کوئی بات بتلاؤں تو اسے مان لو کیونکہ دینی باتیں بحیثیت رسول کے بتائی جاتی ہیں جن میں نقص و خطا کا احتمال نہیں لیکن جب دنیاوی معاملات میں کوئی مشورہ دوں تو تمھیں اختیار ہے کہ اسے مانو یا نہ مانو۔

اب آپ کے دل میں جو یہ سوال پیدا ہو رہا ہے کہ دینی اُمور کیا ہیں اور دنیاوی کیا۔ تو اسے ہر صاحب فہم بآسانی

حال دریافت کرسکتا ہے۔ آخر خدا کو بھی عقل سے پہچانا ہے آنکھ سے نہیں دیکھا۔ یہی کھجوروں والی بات لے لیجئے۔ کیا صاف ظاہر نہیں ہے کہ یہ ایک دنیاوی معاملہ تھا جس کا تعلق فنِ زراعت سے ہے۔ اسی طرح دیگر تمام معاملات میں عقل و قیاس سے بلا ریب معلوم ہوجاتا ہے کہ کس کا تعلق دین سے ہے اور کس کا دنیا سے۔

جنگ میں کس جگہ ڈیرہ ڈالا جائے۔ کہاں کمین گاہ بنائی جائے، کس حد تک آگے بڑھا جائے اور کس موقع پر پیچھے ہٹا جائے یہ سب باتیں ظاہر ہے کہ دنیاوی ہیں اور فنِ حرب سے تعلق رکھتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ جنگِ بدر میں حضورؐ نے ایک مقام پر فروکش ہونے کا ارادہ ظاہر فرمایا اس پر صحابہؓ نے پوچھا کہ یہ ارادہ حضورؐ از روئے وحی فرما رہے ہیں یا صرف اپنی رائے سے؟ حضورؐ نے جواب دیا کہ نہیں اس کا تعلق وحی سے نہیں ہے، اس پر صحابہؓ نے اس جگہ پر ڈیرہ ڈالنے کے نقصان اور ایک اور جگہ ٹھیرنے کی منفعت بیان کی اور اسے آپ نے قبول فرمالیا

اسی طرح دوسرے غزوات میں بھی متعدد بار ہوا ہے کہ حضورؐ نے اپنی رائے سے ایک خیال قائم کیا لیکن فنِ حرب کے ماہر صحابہؓ نے اس کے خلاف رائے ظاہر کی تو آپ نے اسے قبول فرمالیا۔

اب یہ جو آپ کہتے ہیں کہ فلاں حدیث اور فلاں آیت میں تو ایسا کوئی استثناء نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی مسئلہ کے تمام پہلو اور قیود و شرائط ایک ہی وقت میں بیان نہیں کردیئے جاتے بلکہ اس سے تعلق دی ہوئی مختلف ہدایات کو یکجا کر کے کوئی فیصلہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً آپ متعدد حدیثیں اس نوع کی دیکھتے ہیں کہ جس میں دیانت نہیں اس میں ایمان نہیں۔ یا جس کا پڑوسی ایک شخص سے مامون نہیں وہ ہرگز ہرگز مومن نہیں۔ یا جس نے چغلخوری کی وہ جنت کی بو بھی نہ سونگھ سکے گا وغیرذلک۔ تو ان روایات میں کسی طرح کا استثناء موجود نہیں ہے مگر اس کے باوجود دوسرے نصوص و ہدایات کی روشنی میں یہ طے پاجاتا ہے کہ بددیانت اور ہمسایہ آزار اور چغلخور کافر نہیں ہوجاتا۔

خود قرآن میں اس کی سیکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً شروع قرآن ہی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ - اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ الآیہ - یعنی جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے چاہے تم اے پیغمبر انھیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ۔

تو اس آیت میں کسی طرح کا استثناء نہیں، لیکن ظاہر ہے کہ دیگر آیات و احادیث کی روشنی میں استثناء ضرور کرنا پڑیگا ورنہ بات نعوذ باللہ واقعات اور عقل و منطق ہر لحاظ سے غلط ہوجائے گی۔ کارِ رسالت ہی عبث ٹھیرے گا اگر انذار و تنذیر سے کافروں کا ایمان لانا محال قرار پائے اور واقعات بھی آپ کے سامنے ہیں کہ ہزاروں کافر انذار و تنذیر سے ایمان لائے۔

آپ نے سورۂ حشر کی جس آیت کا ذکر کیا اس میں تو کسی استثناء کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا جو کچھ رسول تمھیں دے اسے لے لو اور جس سے روکے اسے چھوڑ دو۔ یہاں لفظ رسول استعمال کیا گیا جس سے صاف ظاہر ہے کہ ہدایت ایسے ہی اُمور کے بارے میں ہے جن کا تعلق حیثیت رسالت سے ہے اور رسول کی حیثیت میں جو بھی حضورؐ فرمائیں گے بلا ریب اس کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہوگا۔ دنیاوی اُمور میں آپ کا کوئی مشورہ دینا بحیثیت رسول نہیں تھا بلکہ بحیثیت محمدؐ تھا۔ بحیثیت بشر تھا۔ یہ وہی حیثیت تھی جس میں آپ سے سہو و نسیان کا بھی صدور ہوا ہے اور یہ وہی حیثیت تھی جو آپ کو اور تمام انبیاء علیہم السلام کو مقامِ اُلوہیت سے جدا کر کے دکھاتی ہے۔

سورۂ نجم کی آیت وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی میں بھی کسی استثناء کی ضرورت نہیں موقع محل دیکھیئے کہاں یہ بات کہی گئی۔ کفار الزام دیتے ہیں کہ معاذ اللہ محمدؐ بہک گئے ہیں جو اپنے آباؤ اجداد کے دین کو غلط قرار دیکر ایک نیا دین پیش کر رہے ہیں سیکڑوں بتوں کی بجائے فقط ایک خدا کی عبادت سکھا رہے ہیں۔ اس پر باری تعالیٰ فرماتا ہے کہ عقل کے دشمنو! مَا ضَلَّ

صَاحِبُکُمْ وَمَا غَویٰ۔ تمہارا ساتھی (محمدؐ) نہ تو بہکا ہے نہ بے راہ چلا ہے وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس کا تعلق اس نبی کی اپنی خواہش نفس سے بالکل نہیں بلکہ وہ تو ایسا حکم ہے جو ہماری طرف سے بھیجا گیا ہے۔

بتائیے کیا صاف معلوم نہیں ہوتا کہ خالصتہً وحی کے مطابق کلام کرنے کی بات دینی تعلیمات کے بارے میں فرمائی گئی ہے اور دینی تعلیم ہی کے متعلق یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ وہ کسی خواہش نفسانی کی پیداوار نہیں، بلکہ اللہ کی نازل فرمودہ ہے۔ اگلی آیت نے اسے اور بھی واضح و مؤکد کر دیا۔ عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی ذُوْ مِرَّۃٍ (اسے سکھلایا ہے شدید قوتوں والے زور آور نے) اب ظاہر ہے کہ حضرت جبریلؑ نے وہی ہدایاتِ ربانی تو حضورؐ تک پہنچائی تھیں جن کا نام دین ہے۔ اس سے بلا ادنیٰ ریب کے معلوم ہو گیا کہ وما ینطق کی آیت اُن تعلیمات سے متعلق ہے جو حضورؐ بحیثیت رسول پیش فرماتے تھے۔

علاوہ ازیں جو آراء اور مشورے وحی سے ہٹکر آپؐ نے صادر فرمائے ہیں ان کا جوڑ بھی ہوائے نفس سے نہیں۔ ہوائے نفس کا تعلق گھٹیا جذبوں سے ہوا کرتا ہے۔ ایک شخص اگر فکر و فہم میں اجتہادی غلطی کرتا ہے یا اولیٰ کی بجائے غیر اولیٰ شئے کو منتخب کر لیتا ہے تو اسے زیادہ سے زیادہ وصفِ بشریت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے نہ کہ ہوائے نفس کی پیروی سے۔

گویا کسی استثناء کے بغیر بھی ہر دو آیات کسی روایتِ صحیحہ سے نہیں ٹکراتیں۔ لیکن استثناء کسی موقع پر ضروری ہی ہو تو یہ سمجھنا درست نہ ہو گا کہ یہ لفظاً بھی ٹھیک اسی جگہ پایا جانا چاہیئے جہاں کوئی قول کیا گیا ہے۔

آگے جو کچھ آپ نے فرمایا اس میں بھی مجھے کوئی بات الجھن والی نظر نہیں آتی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ۔ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ فیصلے کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ فاسق ہیں۔ ظالم ہیں۔ اس سے آخر یہی تو معلوم ہوتا ہے کہ جن معاملات میں اللہ تعالیٰ نے کوئی فیصلہ صادر فرما دیا ان میں اس فیصلے کے خلاف کوئی فیصلہ دینا کفر و فسق ہے۔ یہ خدائی فیصلہ خواہ براہِ راست قرآن سے معلوم ہوا ہو یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل و ارشاد سے۔ اس کے آگے تمام امت کا سر تسلیم خم ہے۔ اور جیسا کہ مولانا مودودی کے حوالے سے آپ نے فرمایا یہ فیصلہ خواہ عدالتوں کے دائرۂ عمل کا ہو یا ہماری نجی اور منزلی زندگی سے متعلق ہو ہر حال میں وہی روش اختیار کرنی ہو گی جو اللہ اور رسولؐ نے معین فرما دی۔

لیکن مولانا مودودی نے حضورؐ کی جن دو حیثیتوں کا تذکرہ کیا ہے اس میں اور اس عقیدے میں کوئی منافات نہیں۔ سیرتِ نبویؐ اور غزوات کا مطالعہ آپ فرماتے تو کبھی یہ بات نہ پوچھتے کہ:-

> "کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جگہ یہ بھی تصریح فرمائی کہ میں فلاں فلاں بات رسول کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں اور فلاں بات بشر ہونیکی حالت میں۔"

یہی تابیر نخلہ والی روایت یا جنگِ بدر والا واقعہ کیا واضح جواب مہیا نہیں کرتا۔ جب خود حضورؐ ہی کی زبان مبارک سے اطلاع مل گئی کہ بعض دنیاوی اُمور میں آپکی آراء کا تعلق وحی سے نہ تھا بلکہ جس طرح دوسرے لوگ فکر و فہم سے کوئی رائے قائم کرتے ہیں اسی طرح آپ نے بھی ایک رائے قائم کی تھی تو پھر الجھن اور سرگشتگی کی کیا وجہ باقی رہ جاتی ہے۔

خوب سمجھ لیجئے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتوں میں امتیاز کی بات صرف مولانا مودودی ہی نہیں کہتے بلکہ اس پر تو تمام ائمۂ سلف کا اتفاق ہے۔ چنانچہ آپ کو بھی معلوم ہو گا کہ طبِ نبوی حدیث کا ایک مستقل باب ہے۔ لیکن کسی مستند عالم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ جس مرض میں کسی دوا کا مشورہ یا استعمال حضورؐ سے ثابت ہوا ہو اس مرض میں اسی دوا کا استعمال ہر امتی پر واجب ہوا۔ اور جو اس کے علاوہ کوئی دوا

نہایت نفیس عکسی قرآن اور حمائلیں

آرڈر میں صرف وہ نمبر لکھ دینا کافی ہے جو ہر ایک کے ساتھ درج ہے

قرآن • ترجمہ :- شیخ الہندؒ • تفسیر :- علامہ شبیر احمد عثمانیؒ
یہ مقبول ترین مترجم قرآن کچھ دنوں سے نایاب تھا الحمد للہ اب کچھ نسخے مہیا ہوئے ہیں۔ نفیس ایڈیشن۔ مجلد ۵ ۲ روپے (اس کا نمونہ نہیں بھیج سکیں گے)

قرآن دو ترجمے والا نمبر ۶۸
• (۱) مولانا شاہ رفیع الدینؒ۔
• (۲) مولانا اشرف علیؒ۔
حاشیے پر مستند تفاسیر کا خلاصہ۔ آغاز میں انبیاءؑ وصحابہؓ کے احوالِ مقدسہ، سورتوں کے خواص، غزوات کے تذکار اور اسی نوع کی دیگر مفید چیزیں اردو میں دی گئی ہیں۔ لکھائی چھپائی نفیس۔ کاغذ اعلیٰ آرٹ پیپر دبیز، زمین سبز۔ ہدیہ مجلد ریگزین چودہ روپے۔ مجلد چرمی ساڑھے سترہ روپے۔ یہی قرآن نسبتاً ہلکے کاغذ پر (اس کا نمبر ۶۶ ہے) ہدیہ مجلد ریگزین تیرہ روپے مجلد چرمی ساڑھے سولہ روپے۔ یہی قرآن کچھ اور ہلکے کاغذ پر (اس کا نمبر ۶۷ ہے) زمین حنائی مجلد ریگزین بارہ روپے۔ مجلد چرمی ساڑھے پندرہ روپے۔

قرآن ایک ترجمہ والا نمبر ۶۴
• ترجمہ :- مولانا اشرف علیؒ
• حاشیہ پر مختصر بیان القرآن
سائز تجلی سے کچھ بڑا۔ کاغذ ولایتی سفید۔ آغاز قرآن میں بہت سی مفید چیزیں۔ مثلاً سورتوں کے خواص، ان ناموں کی تفصیل جو قرآن میں آئے، ان مقامات کا نقشہ جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ مجلد ریگزین کا ہدیہ بارہ روپے۔ مجلد چرمی ساڑھے پندرہ روپے۔

قرآن بلا ترجمہ نمبر ۳/B
کاغذ آرٹ پیپر ولایتی۔ کتابت طباعت بے نظیر۔ ہر سطر کے بعد لائن۔ حروف کشادہ۔ تجلی سائز۔ کمزور نگاہ والوں کیلئے بہت عمدہ۔ مجلد ریگزین ہدیہ آٹھ روپے۔ چرمی ساڑھے گیارہ روپے

حمائل مترجم نمبر ۸
• ترجمہ :- شاہ عبد القادر محدث دہلویؒ
کاغذ آرٹ۔ زمین رنگین۔ سائز تجلی سے نصف۔ مجلد کمبج ہدیہ دس روپے۔ مجلد پلاسٹک کور گیارہ روپے۔

حمائل مترجم نمبر ۳۵
• ترجمہ :- مولانا فتح محمد صاحب • حاشیے پر مختصر تفسیر۔ زمین سبز۔ کاغذ ولایتی۔ سائز تجلی سے نصف۔ مجلد پلاسٹک کور۔ گیارہ روپے۔

حمائل مترجم
• ترجمہ :- شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ۔
• تفسیر :- مولانا شبیر احمد عثمانیؒ۔
زمین حنائی۔ سائز $\frac{30 \times 20}{16}$ سے کچھ بڑا۔ غیر مجلد بارہ روپے مجلد ریگزین ساڑھے تیرہ روپے (اس کا نمونہ نہیں بھیج سکیں گے)

حمائل بلا ترجمہ نمبر ۲۳
کاغذ سفید مضبوط۔ سائز تجلی سے نصف۔ حروف کافی روشن۔ ہر سطر کے بعد لائن۔ مجلد کمبج ہدیہ پانچ روپے۔

حمائل نمبر ۱۳
بالکل ۲۳ جیسی بس فرق یہ ہے کہ ہر سطر کے بعد لائن نہیں ہے۔ مجلد پلاسٹک پانچ روپے

حمائل نمبر ۲۶ بلا ترجمہ
پاکٹ سائز۔ کاغذ باریک اور چکنا دبائبل پیپر۔ سفر کیلئے خاص تحفہ۔ جلد پلاسٹک کور۔ ہدیہ مجلد چار روپے۔

حمائل نمبر ۲۴ بلا ترجمہ
بہت ہی مختصر سائز۔ حافظوں کے مطلب کی۔ کاغذ عمدہ۔ جلد پلاسٹک کور۔ ہدیہ دو روپے۔

نمونے مفت طلب فرما سکتے ہیں

مستقل عنوان

شمس نوید عثمانی

کیا ہم مسلمان ہیں ؟

"ماں ـــــ یا ـــــ خدا ؟"

کیا قیامت کا سوال تھا حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے !ـــ

ذرا دیر ہوئی تھی کہ وہ صدیق اکبرؓ کے نقش قدم پر چل کر مکے کے دور قہر و ستم کا ایک خطرناک ترین فیصلہ کئے ہوئے والہانہ جذب و جنوں کے عالم میں افتاں خیزاں گذرتے ہوئے دیکھے گئے تھے ـــ ابھی ابھی انھوں نے خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ فقر و جلال پر بیتابانہ دستک دی تھی ـــ ابھی ابھی انھوں نے پتھر کے دیوتاؤں کی طرف سے نفرت سے مُنہ پھیر کر اپنے حقیقی پروردگار و خالق کے قدموں پر اپنے وجود کو ایک سجدۂ تمام بنا کر گرا دیا تھا ـــ اور ابھی ابھی جب کہ ان کا نوخیز ایمان چند گھنٹوں کی عمر طے کر سکا تھا حق و صداقت کے قانون نے ان کو قربانی کے لئے پکارتے ہوئے پوچھا تھا :-

"ماں ـــ یا ـــ خدا ؟ ـــ سوچ لو ان دونوں میں سے کون زیادہ پیارا ہے ؟ ـــ کس کو لیتے ہو اور کس کو چھوڑتے ہو ؟ ـــ"

پھر ـــ

ماں کوئی ایسی ویسی ماں نہیں تھی ۔ اس نے سعدؓ کو جس خون دل و جگر سے پالا تھا وہی خون ایک بے پناہ پیار اور اتھاہ جذبۂ فرزندی بن کر سعدؓ کی رگ رگ میں ان کے نوجوان خون کی گردش بن کر رہ گیا تھا ۔ زندگی کے مکمل انیس (۱۹) سال اسی ماں کی قدر و منزلت کی قسم کھاتے ہوئے بسر ہوئے تھے بچپن سے لیکر اوائل شباب کی ان جذبات انگیز منزلوں تک انھوں نے خدا سے پہلے ماں ہی کو ـــ صرف ماں ہی کو دل و روح کی آخری گہرائیوں سے چاہا تھا ـــ

لیکن ـــ آج ان کی زندگی کے چند لمحاتِ ایمانی نجانے کیا شے بن گئے تھے کہ چند پلوں نے انیس (۱۹) سالہ زندگی کی ساری بنیادیں ہلا ڈالی تھیں ۔ شاید اس لئے کہ انیس (۱۹) سال تک وہ صرف اس عورت کو جانتے تھے جس نے ان کو اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا ۔ لیکن آج زندگی کے ان چند انقلاب آفریں ساعتوں نے ان کو اس وحدہٗ لا شریک خالق تک پہنچا دیا تھا جس کی عظیم ترین قدرت کے نادیدہ ہاتھوں نے رحم مادر کی تاریک تنہائیوں میں باپ کے ایک قطرۂ ناپاک سے انسان جیسی مقدس مخلوق ڈھال کر دکھائی ۔ وہ آج اس اتھاہ چاہ کے چشمۂ آب حیواں کو پا چکے تھے جس کے آگے ماں کی ساری ممتا شبنم کی ایک حقیر بوند سے بھی زیادہ حقیر و بے مایہ ہے ۔

"سعدؓ ! ـــ ہائے ہائے سعدؓ ! ـــ" سعدؓ نے دیکھا کہ ان کی کافرہ ماں خون دل میں نہائی ہوئی سینہ پیٹ رہی اور سر کے بال نوچے ڈالتی ہے ۔ چیخ رہی، بلک رہی اور چلا رہی ہے "سعد ! ـــ ہائے سعد ! ـــ تو بے دین ہو گیا ! میں بھی ۔ ۔ ۔ دیکھتی ہوں ۔ ۔ ۔ کہ ۔ ۔ ۔ تو ۔ ۔ ۔ کیسے جاتا ہے محمد کے پاس ! ـــ مجھ پر بھی کھانا پانی حرام ہے اگر تو نے اس کے نئے دین کو نہ چھوڑا ! ـــ ہاں ـــ دیکھتی ہوں تو کیسے جاتا ہے وہاں ! ـــ جائے گا تو تجھے اپنی دکھیارن ماں کی لاش کو روندتے ہوئے جانا ہو گا ـــ جان دیدوں گی مگر تجھے یوں بے دین نہ ہونے دوں گی ـــ"

یہ منظر دیکھ کر سعدؓ ابن وقاص کا دل ہل جانا چاہئے تھا — لیکن دل اس طرح ہلا کہ ایمان ویقین کے پاؤں کچھ اور جم گئے! قربانی کی خوں چکاں چوٹ کھا کر ان کے سینے سے خون کا سرخ سرخ فوارہ پھوٹا اور ایمان کے نوخیز پودے کو کچھ اور تر و تازہ کر گیا۔ وہ سر جھکائے سب کچھ سنتے رہے — سر اٹھایا تو آنکھیں غیرتِ توحید سے سرخ گلنار آنکھیں ماں مامتا کے وجود کو چیرتی ہوئیں سیدھی اپنے خدا تک چلی گئیں — ان آنکھوں میں آج ایک نئی — بالکل انوکھی "نظر" تھی جس کو نہ ماں جان سکی اور جو نہ ماں کو پہچان سکی! — ایک نظر — سراپا نور — نور ہی کی جویا — ظلمت سے متنفر — تاریکیوں سے گریزاں — خواہ یہ تاریکی ایک چاہنے والی ماں کا دلدوز روپ دھار کر کیوں نہ آکھڑی ہوا!

یہ نظر اٹھی تو ایمان کی روحانی دھڑکنوں سے گوشت پوست کا شیش محل تھرتھرا اٹھا — سعدؓ کی جذبات سے بوجھل آواز یوں سنائی دے رہی تھی —

"ماں! — تو اس بیٹے کو تو خوب پہچانتی ہے جس کو تو نے جنا ہے اور اتنے بڑے خالق کو ذرا نہیں پہچانتی جس نے تجھے بھی پیدا کیا اور مجھے بھی!! — میری نادان ماں! — دیکھ تو سہی! میں نے کیسا پیارا فیصلہ کیا ہے جو مجھے تجھ سے بھی زیادہ پیارا ہے — آہ تو نہیں جانتی کہ وہ انسان جس کا نام محمدؐ ہے اس کو دیکھ کر دل کیوں پکار اٹھتا ہے کہ آپ پر میری ماں نثار — میرا باپ قربان اور میری جان بھی!"

تین دن تک خون اور ایمان کے درمیان جنگ برپا رہی — مامتا اور بندگی کے دو جذبے پوری قوت سے ٹکراتے رہے — تین دن تک سعدؓ کی ماں بے آب ودانہ پڑی ہوئی سعدؓ کو پکارتی رہی — بھوک پیاس کے جبڑوں میں پستی ہوئی مامتا کی جگر خراش پکار رہ رہ کر ڈوبتی ابھرتی رہی، لیکن — ہر بار سعدؓ کے ہونٹوں سے خونِ حیات میں بھیگی ہوئی اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی یہی صدائے بازگشت بلند ہوتی رہی کہ "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں — اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ خدا کے بندے اور پیغمبر ہیں"

کیا ہوگا وہ آدمی جس کا دل کچھ اس طرح دھڑکا کہ اپنے خون کے دھاروں کا رخ پلٹ کر رکھ دیا — وہ اس نئے رخ پر چلا تو پیچھے ہٹنا تو کیا پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا کیسا فلک بوس تھا یہ جذبۂ صداقت کہ اس کو خدائے کائنات نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس سینے پر وحی بنا کر اتارا — قرآن کی آیتیں عرش کی بلندیوں سے چلیں تاکہ فرشِ زمین پر اتر کر خون اور ایمان کے جہاد میں سردھڑ کی بازی لگا دینے والے سعدؓ کی پشت پناہی کریں۔

"وَاِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا! — اگر وہ دونوں (ماں باپ) یہ کوشش کریں کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرائے جس کا تجھ کو کوئی علم نہیں، تو مت مان ان کا کہا!"

سعدؓ کے جذبۂ حق کی پذیرائی میں یہ اسی قرآن پاک کی آواز تھی جس نے انسان کو خدا کے شکر کے متوازی شکرِ والدین پر ابھارا ہے۔

سعدؓ کے پائے ثبات کو لڑکھڑانے میں مامتا ناکام ہوئی تو بے رحمی آگے بڑھی۔ اپنائیت کے بعد بیگانگی نے وار کیا۔ آنسوؤں کی بارش رکی تو پتھراؤ شروع ہو گئے — کانٹے برسے — شعلوں کی بوچھار ہوئی۔ لیکن جوان سعدؓ کا جذبۂ حق جوان ہی رہا — نہیں! — اس پر تو جیسے کچھ اور شباب آگیا — اس کے حوصلے اور ولولے کچھ اور امنڈ پڑے — خود کو بچانے کے بجائے تیر و نشتر کی زد پر اس نے صرف سینہ ہی نہیں کھول دیا، بلکہ اس نے تو اس وقت بھی آستینیں چڑھا لی تھیں جب مکے کی قہرمانیت پوری بستی میں حق پسندوں کے گریبان چاک کر رہی تھی۔ ہاں جس وقت اللہ والے محض آنسو پی رہے تھے کفر کا خون پی لینے کے لئے سعدؓ کے نوجوان خون میں شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ جب پہاڑ کی ایک خاموش گھاٹی میں چھپے ہوئے خدا کے چند بندے اپنے خدا کو یاد کر رہے تھے — جب کافروں کی ایک خرمست ٹولی ادھر آنکلی اور کفر نے اسلام کی جاں بازی پر جرمِ ضعیفی کا دھوکا کھا کر

حق وصداقت پر قہقہہ لگایا تو یہ سعدؓ ابن ابی وقاص ہی تو تھے جنھوں نے بے تحاشا آگے بڑھ کر ایک ہڈی کے بھرپور وار سے کفر کی سرکوبی کا پہلا تاریخی آغاز کیا تھا۔

ظلم وستم کی آتشیں باڑھ کچھ اور تیز ہوئی —— جب تک صرف جان خطرے میں تھی خدا کے بندے جان کی بازی لگاتے ہوئے حق کا پیغام بلند کرتے رہے —لیکن جوں ہی جان سے بھی پیارا ایمان خطرے میں پڑا تو یہ لوگ اس آخری قربانی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے جس کا چھوٹا سا نام ترک وطن اور ہجرت فی سبیل اللہ ہے۔ جنت خداوندی کے یہ ارضی شہری —— دنیا بھر کو پردیس اور محض حسن رہگذر قرار دینے والے اٹھے اور گھر بار سے دامن جھاڑ کر خانہ ویرانی کی سمت چل نکلے —— مکہ چھوڑا اور مدینے کی دور افتادہ بستی میں خانہ بدوشی کا پڑاؤ ڈالا — خطرہ اب بھی قائم تھا — خطرہ تھا کہ ایمان کے ملکی دشمن اس قربانی کو دیکھ کر چین سے نہ بیٹھیں گے اس لئے قریش کی نقل وحرکت کی تفتیش کے لئے مجاہدوں کا ایک سرفروش رسالہ روانہ کیا گیا تو خدا کا یہ بندۂ بے باک بھی پروانہ دار ساتھ ہولیا —— وہ تو ہر لمحہ اس لمحے کے لئے بیتاب تھا، جہاں وہ حق کو باطل سے ٹکرا ڈالے۔ خدا کے قدموں کو چھولینے والا سنر بچپن تھا کہ خدا کی گلی میں کٹ کر گر پڑے —— یہ رسالہ ساحل سمندر تک ریگستان کی خاک چھانتا چلا گیا تو وہاں قریشیوں کی ایک ٹولی دور سے دکھائی دی۔ سعدؓ کے لئے یہ منظر صرف دیکھنے کی چیز نہ تھا۔ رگ وپے میں دوڑنے والا خون جذبۂ جہاد بن کر اس کے ہاتھوں تک آپہنچا اور جس دور افتادہ دشمن خدا کی ٹولی پر لوگوں کی نظر مرکوز تھی اس پر سعدؓ کے ترکش توحید کے تیر نے اپنا پہلا نشانہ لگا کر دم لیا! — اسلام کی کمان کا یہ وہ پہلا تیر تھا جس نے باطل کے سینے میں پیوست ہو کر جہاد فی سبیل اللہ کے معنی سمجھائے۔

یہ مہم سعدؓ کے جذبۂ قتل وجہاد کے لئے تیر نیم کش ثابت ہوئی — اس لئے وہ جیسے ہی اس مہم سے تشنہ کام نہ پلٹے تو ایک اس سے بھی بڑی مہم پر بیتابانہ روانہ ہوگئے — ان کے سینے میں شہادت [illegible] ایک [illegible] نے ان کو [illegible] کے گوشۂ عافیت میں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا —— وہ تو رہ رہ کر بیتاب ہو کر اٹھتے — اٹھتے اور ان فداکاروں کے دوش بدوش وجد کرتے ہوئے نکلتے جو اللہ والوں کو ہر خطرے سے بچانے کیلئے ہر خطرے کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ اس بار اس خطرکوش مہم کی منزل مقصود مکہ اور طائف کا وہ درمیانی نخلستان تھا جہاں کفروشرک کے بدترین زہری ناگ فضا میں زہرناک پھنکاریں چھوڑ رہے تھے موت اور ہلاکت کے عفریتی بن میں داخل ہونے سے پہلے سرخیل مہم حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ان خانہ بدوشانِ حق کیطرف رُخ کر کے بھرپور سوال کیا:—

"کون آگے جانا چاہتا ہے اور کون پلٹ جانے کا خواہاں ہے؟ — آگے وہی آئے جس کو شہادت اپنی جان عزیز سے زیادہ پیاری ہو"

مختلف چہروں سے جذبۂ شہادت کی چمک نمایاں ہوئی — سعدؓ کا چہرہ سب کے درمیان میں بے پناہ تمتماہٹ کے لحاظ سے اپنا جواب آپ تھا۔ جیسے تمام مجاہدوں کا گرم گرم خون اس ایک چہرے میں سمٹ کر شعلۂ جوالا بن گیا ہو — ان کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک ابل آئی جو ایک بہترین آرزو کی روحانی انگڑائی سے انسان کے وجود میں آتشِ سیال دوڑا دیتی ہے — ان کے دل کی ولولہ خیز دھڑکنیں جنبش لب تک آئیں اور ایک زبردست نعرۂ تکبیر میں ڈھل کر زمین سے آسمان تک گرجتی چلی گئیں "ہاں — اے سرخیل مہم! ہمیں شہادت جان سے بھی زیادہ پیاری ہے — خدا کی قسم! اسی مرنے کی آرزو میں جیتے ہیں ہم دیوانے! — آپ ہمیں خطرات کا احساس دلا کر ڈرا رہے ہیں کہ اس جذبۂ جنون کی آگ کو بھڑکائے دے رہے ہیں — بڑھیے! — کہ ہمارا خون ہماری رگ وپے سے چھوٹ نکلنے کے لئے بیتاب ہے!"

سعدؓ کا جوش جہاد آج اس آخری حد پر جا پہنچا تھا جہاں مرجانے یا مار ڈالنے کے سوا کوئی تیسری راہ ممکن ہی نہیں رہتی۔ لیکن جس مجاہد سے خدا کو بڑے بڑے کام لینا باقی تھے بھلا وہ کسی ایسی ویسی گلی میں کیسے کام آجاتا! — حسن اتفاق یہ ہوا کہ جب یہ چھوٹا سا دستہ وادیٔ خوف وخطر کی طرف بڑھتا چلا تو ان کا اور ان کے ساتھی عتبہؓ بن غزوان کا اونٹ راہ

جنگ گرم ہو گیا ــــ اور اس شہادت کے متوالے کا اپنے دوست سے ایسا ساتھ چھوٹا کہ پھر مدینہ میں ہی ان سے ان کی ملاقات ہو سکی!

جب بدر کا پہلا وہ تاریخی رن پڑا جہاں اللہ والوں کی ننگی گردنیں ننگی آبدار تلواروں سے لپٹ لپٹ کر یہ بتانے چلیں کہ حق و صداقت کی راہ میں موت زندگی سے کہیں زیادہ لذیذ شے ہو جاتی ہے تو جیسے سعدؓ کے اندر تیرہ سال سے سویا ہوا شیر نر جاگ اٹھا ــ جب پہلی بار نہتے اسلام کے روبرو کفر و شرک کے اسلحہ خانے کھڑے تھے ــ جب پتھروں اور ستاروں کے بےحس پجاریوں کا غول انسانی طاقت ــــ سرمائے کی طاقت ــــ ہتھیاروں کی طاقت ــــ وحشت و خونخواری کی طاقت کو یکجا کئے ہوئے ان مٹھی بھر انسانوں کو پیس ڈالنے کی قسم کھاتا ہوا مرگ ناگہاں کی طرح ٹوٹا پڑتا تھا تو سعدؓ نے اسلامی صفوں کے بھوکے پیاسے چہروں اور پھٹے پرانے چیتھڑوں کے درمیان سے جست کی اور کفر کے پتھریلے سینے پر اس ایک نعرۂ تکبیر سے خراشیں ڈالدیں ــ "سن لو اے دیوانو! کہ اللہ سب سے بڑا ہے!" ــــ وہ جذبۂ بیتاب جو گذشتہ تیرہ سال سے ان کے لہو میں ڈوبا رہا اور جاں نثار آنکھوں ہی آنکھوں میں تیر رہا تھا آج اُمنڈ کر انکے بیتاب ہاتھوں کی راہ سے تلوار کے دستے پر آ پہنچا تو انسان نے جیسے جہاد کی شکل اختیار کر لی ــ وہ بڑھے تو کفر کی آہنی صفوں کو چیرتے چلے گئے، فولاد کی دیواریں کاغذ کی طرح پھاڑ ڈالیں اور کفر کی بھری فوج میں گھس کر اس کے ایک تاج زرنگار پہ نفرت سے ٹھوکر مار دی ــ خدا کے آگے سرکشی کی جرأت کرنے والا ایک مکروہ ترین سر کٹ کر گرا ــــ یہ سعید بن العاص کا سر تھا ــ یہ سر گردن سے اُتار کر سعدؓ اس مقتول سردار کفر کی ذوالکتیفہ نامی وہ مشہور تلوار چھین کر اسلامی صفوں میں پلٹ کر آئے جس کو اس کافر نے اسلام کی نفرت میں زہر میں بجھا بجھا کر بڑے حوصلوں سے سان پر چڑھایا تھا ــــ وہ یہ تلوار لئے ہوئے چلے تو راستے میں ان کے اپنے مسلم حقیقی بھائی حضرت عمیرؓ کی خون میں نہائی ہوئی لاش نے ان کا استقبال کیا۔

لیکن سعدؓ یہ منظر دیکھ کر بھی ایمانی سرمستی سے وجد کرتے ہوئے چلتے رہے، نہ رکے نہ لرزے ــ وہ والہانہ انداز میں بڑھتے ہوئے خدا کے رسولؐ کی خدمت میں پہنچے اور کہا "میں یہ تلوار لینا چاہتا ہوں جس کو میں نے بڑے چاؤ سے لوٹا ــ اور جس کو چلانے کی حسرت ابھی میرے دل میں موجزن ہے"

اور جب رسولؐ خدا نے ابھی تک مال غنیمت کے باب میں کوئی خدائی حکم موجود نہ ہونے کی بناء پر سعدؓ کی فرمائش پوری کرنے سے انکار کر دیا ــــ جب سعدؓ کا جذبۂ جہاد و قتال مایوسی کی چوٹ کھا کر پلٹا تو ایک بار پھر سعدؓ کا خدا سعدؓ کے پیچھے پیچھے پکارتا ہوا آیا ــــ قرآن تلواروں کی چھاؤں میں نازل ہوا اور مال غنیمت کے احکام عرش سے فرش پہ سعدؓ کی دل جوئی کے لئے اُترتے چلے آئے ــ خدا کے رسولؐ نے سعدؓ کو فوراً بلا کر ان کی محبوب تلوار عطا فرما دی۔

جنگِ اُحد کی بساط جب کفر کے دوسرے حملے سے نہیں ــــ بلکہ درحقیقت خود کچھ مسلمانوں کی کوہ افگن چوک سے اسلام کے خلاف اُلٹ گئی اور میدان کارزار اچھا خاصا میدانِ حشر بن گیا ــــ جب خدا کو پہچاننے والی تابناک نظریں تھوڑی دیر کو اس طرح ماؤف و معطل ہوتیں کہ انسان تک کو پہچاننا دوبھر ہو گیا ــــ جب حق پسندوں کی تلواروں سے حق پسندوں کی کتنی ہی گردنیں کٹ گئیں ــــ ہاں اس وقت اگر طلحہؓ جیسا مجاہد آفتابِ رسالتؐ کے لئے سینہ سپر ہو کر باطل کیشوں کے تیر پہ تیر کھا رہا تھا تو سعدؓ ابن وقاص جیسا نبرد آزمائے حق محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی جان گرامی کو اپنی گھائل جان کی آڑ میں لئے ہوئے محمدؐ کے دشمنوں پر اس بےجگری سے ترکش خالی کر رہا تھا جیسے بتا رہا ہو کہ "میری پشت پر تم جس "محمدؐ" کو دیکھ رہے ہو وہ تنہا نہیں خود خدا بھی اس کے ساتھ ہے ــ یہی کمک پر ہے ــ پھر کون ہے جو مجھے اس وقت شکست دے سکے؟"

حملوں کی باڑھ جوں جوں تیز سے تیز تر ہو رہی تھی سعدؓ کا ترکش خالی ہو رہا تھا ــــ لیکن جیسے جیسے ترکش خالی ہو رہا تھا سعدؓ کے جذب و جنوں کے تیور کچھ اور زلزلہ انگیز ہوتے

جا رہے تھے — اور ان کا یہ یقین ٹھاٹیں مارتا ہوا بڑھ رہا تھا کہ تیر ختم ہو سکتے ہیں اور ختم ہو جائیں گے لیکن میرے خدا کی غیبی طاقت کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔

اس فضا میں جب کفر کی سات سو فولادی زرہوں کا سیاہ بادل — تین ہزار اونٹوں کا اُمنڈتا چڑھتا ہوا جھنڈ — دو سو گھوڑوں کی آندھیاں اُڑاتی ہوئیں ہولناک ٹاپیں — اور پانچ ہزار خونخواروں کا کف اُڑاتا اور خون تھوکتا ہوا وحشی غول ایک ذات محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پر تول کر ٹوٹا پڑتا تھا — جب ایک ہزار حق پسند مجاہدوں کی روح رواں — خدا کا آخری پیغمبرؐ اپنے ایک ہزار دست و بازو مجاہدوں سے بچھڑ کر اس طوفانی چڑھائی کے نشانے پر کھڑا تھا اس وقت سعدؓ کی خطرناک تیر اندازی قادر اندازی کے وہ جوہر دکھا رہی تھی کہ کافروں کی زبانیں تیر کھا کھا کر کتوں کی طرح باہر لٹکی پڑتی تھیں — اکیلے خدا کی بیکراں طاقت پر بھر پور بھروسہ کرنے والے انسان کامل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہونٹوں سے سعدؓ کو داد پر داد مل رہی تھی:—

"یا سعد ارم — فداک ابی وامی!! — اے سعد! تیر مار! — میرے ماں باپ تجھ پر نثار!" یہ حضورؐ کی آواز تھی! — یہ سعدؓ کی للہیت کن بلندیوں کو سر کر رہی تھی کہ خدا کا رسولؐ اس طرح پکار اُٹھا! — اور یہ پکار سُن کر سعدؓ کو محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے پورے وجود میں ساری کائنات کی طاقت اُبل اُبل کر سمٹ آئی ہے — خون کے ایک ایک قطرے سے جذبات کے سیکڑوں جوالا مکھی پھٹ پڑنے کے لئے بیتاب تھے۔ سعدؓ نے اس آواز پر ترکش میں ہاتھ ڈالا تو اس کا آخری تیر — بے پھل کا شکستہ تیر ہاتھ آیا۔ — سعدؓ کی ساری زندگی گرما کر اسی ایک تیر میں جذب ہو گئی اور یہ تیر کچھ اس طرح چلایا کہ پانچ ہزار خونخوار سورماؤں کے ہجوم میں آگے بڑھنے والا دشمن تیر کھا کر اس طرح بوکھلایا کہ برہنہ ہو کر زمین پر ڈھیر ہو گیا — موت اور ہلاکت کے منجدھار میں مجاہد حق کی یہ قادر اندازی دیکھ کر حضورؐ اس قدر مسکرائے — اس قدر مسکرائے کہ آبدار دانتوں کے گہر ہائے شاہوار دکھائی دینے لگے۔

ہائے مولا! — کیسا تھا وہ تیرا بندہ — تیرا پیارا رسولؐ جس کا پُر یقین تبسّم خطرہ و خوف کی گھٹا ٹوپ اندھیاری میں چاند سورج کو شرمائے دیتا تھا! — اور — کیسے تھے ہیر وہ ایمان لانے والے جو اس کے تبسّم کی روشنی میں اپنی زندگی کے ایک عظیم جنوں سے موت کے لشکر کو بدحواس کئے ڈالتے تھے! — ہاں جن کو خدا کے سوا کسی کا بھی تو ڈر نہ تھا!! —

سعدؓ ابن ابی وقاص کی جاں نثاریاں یوں ہی جہاد سے جہاد تک گرجتی کڑکتی بڑھتی ہی رہیں — بدر و اُحد کے محاذوں سے نکلے تو فتح مکہ تک یہ بجلی چمکتی چلی گئی — فتح مکہ سے آگے بڑھے تو غزوۂ حُنین میں تیروں کی ہولناک آندھی پر عقابی نظریں جمائے ہوئے وہ اس وقت بھی پہاڑ کی طرح ڈٹے ہوئے تھے جب ہزاروں کوہ افگن قدم یکبارگی اُکھڑتے چلے گئے تھے غزوۂ حُنین سے اُبھرے تو غزوۂ طائف میں گھن گرج بن کر لپکے، اور وہاں سے پلٹے تو دیکھا گیا کہ تبوک کی راہ پُرخار — شعلوں کی سڑک پر پاؤں میں چھالے ہی چھالے ڈالے ہوئے اسطرح بڑھ رہے ہیں جیسے کوئی فرشِ لالہ و گل پر نازک خرامی کے مزے لوٹ رہا ہو! —

لیکن ۲۳ سال تک آبلہ پائی اور جاں نثاری کے ہفت خواں سر کرنے کے بعد بھی ان کو یہی محسوس ہوا کرتا جیسے ابھی تو وہ کچھ چلے ہی نہیں! — کیسی ہوتی ہو گی رضائے الٰہی کی وہ روحانی پیاس جس نے بندوں کے خون کو اس طرح سیماب بنا دیا تھا کہ جب تک جسم میں لہو کی ایک چھینٹ بھی باقی رہی ان کے دلوں کو قرار نہ آیا! —

سنہ ۱۰ھ میں — حجۃ الوداع میں شرکت سے محروم ہو سینہ فگار جب سعدؓ مکۂ مکرمہ میں بستر علالت کی شکن بنے پڑے تھے — جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس آ کر ان کی بالیں پر تشریف لا کر ان کا حال پوچھا تو تشنۂ فرض بندگی سعدؓ کے ہونٹوں سے بیماری کے دُکھ درد کی کوئی کراہ نکلنے کے بجائے کسی اور ہی حسرت کے آنسوؤں سے آنکھیں چھلک گئیں —

"زندگی شاید ختم ہوا چاہتی ہے اے خدا کے رسولؐ! — اور آپ کے سعدؓ کا قرض ابھی تک جوں کا توں باقی ہے — خدارا اجازت دیجئے کہ وہ بیکس بندہ جو اب جان سے جہاد نہیں کر سکتا اپنے مال ہی سے جہاد کا حوصلہ نکالے۔"

"کیا چاہتے ہو — اے سعدؓ!" حضورؐ ایک لطیف ترین مسرت کے ساتھ کچھ اور قریب آگئے اور اس انسان پر اپنی مقناطیسی نگاہیں جمادیں جس کی آنکھوں میں اس کا دل کھنچ کر آگیا تھا۔

"حضور! — میری کوئی اولاد نرینہ نہیں — تو پھر میں کیوں نہ دو تہائی مال و دولت راہ مولا میں لٹاتا چلوں۔"

"نہیں نہیں اے سعدؓ!" حد سے بڑھی ہوئی جاں نثاری کو حضورؐ نے شفقت و حکمت سے تھپکی دیتے ہوئے روکا۔ لیکن اس دلاسے کے بعد بھی سب کچھ لٹا دینے کا جذبۂ سرشار سرد و مطمئن نہ ہوا — بچوں کی طرح گڑگڑانے لگے بیمار سعدؓ "اچھا۔ اے خدا کے رسولؐ! — بس آدھا مال لٹانے دیجئے — صرف آدھا!!"

"نہیں" حضورؐ کے الفاظ میں سعدؓ کے درد بندگی کی اشک آلود اور تبسم آمیز پذیرائی تھی" دیکھو سعد! اپنے پسماندگان کو مفلس و لاچار چھوڑ جانے سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ تم انھیں مالامال چھوڑ کر خدا کے پاس جاؤ تاکہ وہ دردر کی بھیک مانگتے نہ پھریں — اچھا اچھا! — جاؤ ایک تہائی مال اپنے مولا کی راہ میں لٹا دو تم! — مت سوچو کہ بیوی بچوں کا خیال رکھنے سے تم رضائے الٰہی کا کوئی حصہ کھو بیٹھو گے — جانتے ہو؟ — بیوی کے منہ میں جانے والا ہر نوالہ تمھارے لئے ایک حسین توشۂ آخرت ہے۔"

یوں سعدؓ کے دلِ بیقرار کو دولت کی طرف سے سکون ملا تو وطن کی قربانی کا مسئلہ جاگ اٹھا۔ وہ مکے میں بیمار پڑے تھے — وہی مکہ — ہاں وہی پیارا وطن جس کو وہ ایک بار اور ہمیشہ کے لئے ادائے مشیت پر نثار کر چکے تھے۔ یہ سوچکر وطن عزیز کی سہانی فضائیں ان کو پردیس سے زیادہ ڈسنے اور کاٹ کھانے کو دوڑنے لگیں — بیماری بڑھ رہی تھی اور یہ امید دم توڑ رہی تھی کہ شاید وہ ایک بار پھر اسی مدینے میں جاکر جینے اور مرنے کی دلی حسرت دل ہی میں لے جائیں گے جو ان کا جسمانی نہیں روحانی وطن بن چکا تھا۔

ضبط کے بند اس وقت پارہ پارہ ہی ہوگئے جب اس عالم میں حضورؐ ان کی عیادت کیلئے تشریف لائے۔ حضورؐ کو دیکھنا تھا کہ شدتِ ضبط سے ان کی گھٹی ہوئی چیخ نکل گئی اور وہ تکیے میں منھ دے کر سسکیاں لینے لگے "اب ... اب کیا ہوگا اے خدا کے رسولؐ! کیا اسی سرزمین کی مٹی لکھی ہے جسکو خدا اور رسولؐ کی محبت میں قربان کرکے میں کیسا کیسا خوش ہوا کرتا تھا"

یہ ہچکیوں اور سسکیوں میں اُلجھتے، کانپتے اور ٹوٹتے ہوئے الفاظ سُن کر حضورؐ کا دل بھر آیا اور آپ نے سچ مچ بیتاب ہوکر اپنا مقدس ترین ہاتھ سعدؓ کے پھڑپھڑاتے ہوئے سینے پر رکھ کر بے اختیار خدا کو پکارا —

"میرے اللہ! سعد کو شفا دے — میرے اللہ! سعد کو شفا دے — میرے اللہ! سعد کو شفا دے!!"

سعدؓ کو محسوس ہوا جیسے اس مقدس ہاتھ کے لمس سے رحمتِ خداوندی کا ٹھنڈا ٹھنڈا امرت ان کی نیم جاں دھڑکنوں پر شبنم افشانی کر رہا ہے — دل و جگر میں دعائیہ ہوک سے ٹھنڈک سی پڑتی چلی گئی اور پھر حضورؐ کی اس بشارت نے تو جیسے ان کے سہمے ہوئے دل کو پھر سے شیر کر دیا "نہیں اے سعدؓ! — تم اس وقت تک نہ مروگے جب تک تم سے ایک قوم کو نقصان اور دوسری قوم کو نفع نہ پہنچ لے۔"

اس وقت سعدؓ کچھ نہ سمجھے تھے کہ اس بشارت کی تفسیر کیا ہے؟ — لیکن عراق اور قادسیہ کی فوج کشی کی کمان انکو عطا ہوئی اور عرب نے عجم کو شکست فاش دی تو ان کو پتہ چلا کہ حضورؐ نے کیا اشارہ فرمایا تھا۔

عراق کی وہی عظیم مہم جہاں حضرت ابوعبیدؓہ جیسے مجاہد کام آچکے تھے — جہاں مثنیٰ شیبانی کے آٹھ ہزار جیالوں کو فتح و کامرانی کا کچھ سراغ نہ ملا تھا — سوال تھا کون اس محاذِ خوف و خطر پر جست لگانے کا اہل ہوسکتا ہے آخر حضرت عمرؓ بن خطاب کی بارگاہِ خلافت میں امت کے

بڑے بڑے دل و دماغ اسی سوال کی اُدھیڑبن میں گم تھے کہ، اچانک حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی ولولہ انگیز آواز نے فکر میں ڈوبے ہوئے سروں کو چونکا دیا۔

"پالیا! — پالیا!! — میں نے پالیا!!!"

"کون؟ — کس کو پالیا آخر؟" ایک ساتھ کئی زبانوں پہ یہ حیرت بھرا سوال آگیا "کون ہے وہ جاں باز جو اس کوہ گراں کو اٹھا لینے کی صلابت رکھتا ہے؟" —

"سعدؓ ابن ابی وقاص!" حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف چلائے اور حسن انتخاب پر فخر و مسرت کی ایک تسلی چمک سے ان کی آنکھوں میں نور کے دیئے جل اُٹھے — یکایک سننے والوں کے سینے میں ولولہ و خروش کا تلاطم سا اُٹھ کھڑا ہوا اور نعرۂ تکبیر کی فلک شگاف گونج میں کتنی ہی زبانوں پر تائید مچل اُٹھی "بے شک! — تم نے سچ پالیا عبدالرحمٰن! — سعدؓ کے شانوں میں واقعی اتنا کس بل ہے کہ وہ اس پہاڑ سی ذمہ داری سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہو سکتا ہے!" —

یوں اس مجاہد کی مجاہدانہ سپہ سالاری کا شاندار دور شروع ہوا — تیس ہزار مجاہدوں کے ٹڈی دل پر کڑی نظریں جمائے ہوتے یہ بندۂ حق آگاہ چلا تو اس کے عجز بندگی سے مس ہو کر جنگ کی یہ پتھریلی وادی پانی پانی ہو گئی ٹھیک اس وقت جب عرق النساء کا ہڈی توڑ دینے والا درد ان کی جان کو نچوڑے ڈالتا تھا وہ فوجوں کی صفیں درست کر رہے تھے — جنگ کے خطرناک نقشوں پر جھکے ہوئے خونِ دل و جگر سے جہاد کے ایک عظیم ترین خاکے میں رنگ بھر رہے تھے۔ جسم کا درد روح کی کسک میں دب کر گم ہو چکا تھا — رسولؐ خدا کی امت کا درد عرق النساء کے درد پر چھایا ہوا تھا — نہیں! وہ صرف مسلمانوں ہی کے لئے دلِ دردمند لئے ہوئے نہیں تھا — اس کو تو خدا کے سارے کنبے۔ ساری انسانیت کا غم ستا رہا تھا۔ وہ گردنیں کاٹنے سے پہلے بیتاب تھا کہ انسانوں کی جیتی جاگتی گردنوں کو اس سنگِ آستاں پر جھکا ڈالے جس کے سوا کوئی آستان انسان کی سجدہ ریزی کے لائق ہی نہیں ہے — اس نے بار بار یہ کوشش کی کہ حق و باطل کی جنگ کا فیصلہ تلواروں کے بجائے دل کی دھڑکنیں کر سکیں — بار بار اس نے تبلیغی وفد ایرانی حکومت کے پاس روانہ کئے — وہ بار بار پکار اُٹھا کہ "اے لوگو! خدا کی قسم ہم تمہارے ملک کے بھوکے نہیں — خود تمہارے لئے آسمانی جنت کی کنجیاں لیکر تمہارے پاس آنے کیلئے بیتاب ہیں"

لیکن جب صدائے حق نے پتھریلے دلوں پر اثر نہ کیا اور اس ایمانی سوز کے جواب میں رستم کی یہ حیوانی چنگھاڑ سنائی دی کہ "کل تمہاری فوجوں کو تہ و بالا کر ڈالوں گا" — تو درد انسانیت سے سلگتے ہوئے سعدؓ میں غیرتِ توحید کا ولولہ جاگ اٹھا اور نعرۂ تکبیر کے فلک شگاف جوش کے ساتھ سعدؓ نے جنگ کی للکار قبول کرتے ہوئے مجاہدوں سے کہا۔

"اے اسلام کے جیالو! — اُٹھ کھڑے ہو اور حق کے دشمنوں پر ہوش اور جوش کی حجت تمام کر دو" —

جہاد کا سیلاب تیز و تند لئے ہوئے سعدؓ کچھ اس طرح بڑھے کہ ایرانی سلطنت خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی۔ قادسیہ کا سقوط ہوا۔ بابل قدموں پر گرا — کوثیٰ کی وہ تاریخی بستی ختم ہوئی جہاں نمرود نے کبھی ابراہیم علیہ السلام کو سلاسل میں جکڑنے کی جسارت کی تھی — مدائن کی طرف رُخ کیا اور ایرانیوں نے دجلہ کے پُل اُڑا دیئے تو سعدؓ مجاہدانہ للکار اُٹھے "کود پڑو دریا میں اے خدا کے جاں بازو! — کود پڑو" یہ کہا اور سمندر میں گھوڑے دوڑاتے ہوئے اس طرح آگے بڑھے کہ ایرانی سپاہی سراسیمہ حیرت کے عالم میں چیخ اُٹھے "دیوہا آمدند — دیوہا آمدند! — جن آگئے! — جنات آگئے!" لیکن وہی انسان جس کی کمان میں گرجتے چمکتے مجاہدوں پر دیو اور جنوں کا شبہ ہوتا تھا — ہائے وہ کتنا بڑا انسان تھا! — ٹھیک اس وقت جب اس کے ہاتھوں میں پہاڑوں کی صلابت نظر آرہی تھی اس کی آنکھوں میں خداشناسی کے عرفان اور عبرت کے سلیقہ نے سوز و گداز بھرے آنسوؤں سے چراغاں کر دیا تھا۔ شکست خوردہ مدائن کی سجدہ ریز بستی کو خاموش و دم بخود دیکھ کر اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی

زور بازو پر گھمنڈ کرنے کی مہلت نہ دی اس کی خدا شناسی نے! — یہ قرآنی آیات ان کے لبوں پر آگئیں "کس قدر باغ، چشمے، کھیتیاں اور گوناگوں نفیس وعمدہ محلات چھوڑ کر دا گلی قومیں، چل دیں جن میں وہ خوش باش زندگی بسر کرتی تھیں اور ہم نے ان چیزوں کا مالک دوسری قوموں کو بنا دیا۔"

دنیا صرف یہ منظر دیکھ رہی تھی کہ سعدؓ کی تلوار کسریٰ کے سنہرے محلات اور تاج و تخت پر کوندتی لہراتی خلافتِ اسلامیہ کے نقشے میں نت نئے شہروں کا اضافہ کر رہی ہے — دولت کا سیلاب عجم سے عرب کی طرف رواں دواں ہے — لیکن سعدؓ خود اپنے اندر جھانک کر یہ منظر دیکھ رہے تھے کہ جوں جوں جہاد کے فرائض کا بوجھ ہلکا ہوتا جا رہا ہے ان کا وجود فقر و استغناء کی ایک نرالی تڑپ میں ڈھلتا جا رہا ہے — دولت کے خزانے ان کے قدموں میں ڈھیر ہو رہے ہیں — محلات اور قلعوں کے آہنی دروازے ان کے سامنے کھل رہے ہیں — اقتدار و شکوہ کے پرچم انکی شخصیت پر لہرا رہے ہیں، لیکن ان تمام فاتحانہ کارناموں کیساتھ ساتھ خدا کا خوف اور آخرت کی دردبھری یاد ان کی پوری زندگی کو دنیا سے دُور — بہت دور تیزی سے کھینچے لئے جا رہی ہے — یہی تھا وہ سوزِ دروں جس نے شمشیر و سناں سے بھی بڑا کام کیا — ہتھیاروں نے صرف عجم کی زمین جیتی تھی، اور اس سوز نے آتش پرستوں کے سینوں میں توحید کی آگ کوٹ کوٹ کر بھر دی۔ زمین فتح ہوجانے کے بعد دلوں کی دنیا پر فتح پائی سعدؓ نے — ہتھیاروں کی گھن گرج دیکھکر عجمی سپاہ نے ہتھیار ڈالے تھے اور سعدؓ کے مومنانہ سوز و گداز کو دیکھ کر ان لوگوں نے خدائے واحد کے قدموں پر بیتابانہ سر ڈالدیئے — بڑے بڑے سردار حق کی شہادت دیتے ہوئے اسلام کی طرف والہانہ جوش سے بڑھے — دیلم کی چار ہزار کی سپاہ نے یکایک ایک ساتھ اسلام کی عظمت کے سامنے سر جھکا دیا۔

سعدؓ کی روح میں دولتِ دنیا سے بے پروائی اور دولتِ دل کی بڑھتی ہوئی تڑپ اس طرح بڑھی کہ ان کے رگ و پے سے پھوٹ نکلی — ماحول میں سرایت کر گئی۔ آنکھوں سے نظر آنے لگی۔ دنیا نے ایک دن یہ حیرت ناک منظر بھی دیکھ لیا کہ امیرالمومنین حضرت عمرؓ کا ایک فرستادہ کوفہ میں داخل ہوا اور سعدؓ کے قصر کی بیرونی ڈیوڑھی کو آگ لگا کر چلا گیا۔ اور سعدؓ — وہی سعدؓ اطاعت و عجز کے ساتھ ٹھنڈے دل اور کھلی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھتے رہے جنھوں نے ایرانی سلطنت کی بساط اُلٹی تھی اور جنھوں نے اس کوفہ کو آباد کر کے قصر کے آگے یہ ڈیوڑھی محض اس لئے تعمیر کی تھی کہ بازار کے شور و غل سے محفوظ و مامون رہ سکیں — لیکن جس کو امیرالمومنینؓ نے محض اس دُور اندیشانہ مصلحت سے نذرِ آتش کرا دینا ضروری سمجھا کہ کہیں یہ ڈیوڑھی حاکم اور محکوم قوم کے درمیان انصاف و عدل کی راہ میں حائل نہ ہوجائے۔ حق و انصاف کی ہر ہلکی سے ہلکی بعید سے بعید مصلحت سعدؓ کو اپنی فاتحانہ، مجاہدانہ جدوجہد کی پوری عمر سے بھی زیادہ پیاری تھی — انھوں نے خندہ پیشانی سے اس مصلحت کو سینے سے لگا لیا اور ذاتی عزت و جاہ کے ہر جائز سے جائز مطالبہ سے کنارہ کش ہوگئے — یہی نہیں ہوا بلکہ یہ بھی ہوا کہ کوفہ کے کچھ ذاتی مخالفوں نے محض بربنائے اختلاف بارگاہ خلافت میں حضرت سعدؓ کے خلاف یہ شکایت بھیجی کہ "وہ نماز ٹھیک طریقہ سے نہیں پڑھاتے!" — سعدؓ نے اس شکایت کو کمال صبر و تحمل سے سُنا۔ بارگاہ خلافت سے اس شکایت کی چھان بین کے لئے حضرت محمدؓ بن مسلمہ کوفہ میں آئے اور گھر گھر مسجد مسجد اس شکایت کے ذیل میں عوام کے بیانات قلمبند کرتے رہے۔ سعدؓ نے عدل و انصاف کی اس تمام کارروائی کو بھی خدا کے ایک بندۂ عاجز کی شان سے دیکھا اور سُنا — پھر بارگاہ خلافت کے صرف ایک اشارے پر انھوں نے ان تمام علاقوں کی حکمرانی سے دست برداری دیدی جن کو انھوں نے خون دل و جگر سے جیتا اور آباد کیا تھا — وہی مجاہد جو اپنے حیرت ناک عزم و عمل کے ساتھ سپاہ سالاری اور حکمرانی کی بلندیوں تک پہنچا تھا جب خدا نے چاہا کہ وہ ان بلندیوں کو قربان کر دے۔ تو دنیا نے دیکھا کہ اس نے اپنی پوری زندگی اسلام کے قدموں پہ ڈالدی اور سلطنت و حکومت کے

تخت سے اُٹھ کر فقر و غنا کے گوشے میں سمٹ گیا۔ انکی زندگی میں جہادِ نفس کی یہ بے پناہ عظمت وہ شے تھی جسکو حضرت عمرؓ ابن خطاب نے اس وقت خراجِ عقیدت پیش کیا جب دغاباز کے گھاؤ کھائے ہوئے بسترِ شہادت پر لہو میں نہائے ہوئے لیٹے تھے۔ انھوں نے اعلان فرمایا کہ "میں نے سعدؓ کو ہرگز کسی بددیانتی کے شاخسانے میں معطل نہیں کیا تھا۔" یہ کہا اور خلافت کے لائق صحابہؓ کی فہرست میں حضرت سعدؓ ابن ابی وقاص کا نام نامی شامل کر کے دنیا کو بتایا کہ یہ ہستی صرف کوفہ کی حکمرانی ہی نہیں، بلکہ پوری خلافتِ اسلامیہ پر راج کرنے کے قابل تھی۔

لیکن حضرت سعدؓ نے جب زمانے کے یہ تیور دیکھے کہ اسلام کے ہر افق سے خطرناک فتنوں کی طغیانی سر اُٹھا رہی ہے اور خطرہ ہے کہ مسلمانوں کا خون ان اختلافات کی بھینٹ نہ چڑھ جائے تو وہ تاج و تخت کی پیش کش سے دامن بچا کر فقر و غنا کی تنہائیوں میں سمٹتے چلے گئے ــــ سمٹتے چلے گئے یہاں تک کہ خود ان کے صاحب زادے پکار اُٹھے

"اباجان! ــــ یہ کیا ہو رہا ہے آپ کو! ــــ آپ جنگل میں اونٹ چرائیں اور ــــ لوگ تاج و تخت کیلئے قسمت آزمائیں!"

"خاموش!" جوش کے ساتھ حضرت سعدؓ نے بیٹے کے سینے پر ہاتھ مارا "میں نے خدا کے رسولؐ سے سُنا ہے کہ خدا مستغنی اور پرہیزگار بندے کو پیار کرتا ہے"ــــ ــــ پھر کسی نے چھیڑا تو خلوت گزینی کے راز پر سے یوں نقاب اٹھایا کہ "میں نے رسولؐ خدا سے سُنا ہے کہ عنقریب میرے بعد ایک فتنہ برپا ہوگا جس میں سونے والا بیٹھنے والے سے، بیٹھنے والا کھڑے ہونیوالے سے اور کھڑا ہونیوالا چلنے والے سے اچھا ہوگا۔"

اس طرح وہ تلوار جس نے عرب و عجم کی خونریز لڑائیوں میں کفر و شرک کے سر قلم کئے تھے خونِ مومن کے تصور سے لرزہ بر اندام ہو کر ہمیشہ کے لئے نیام میں چلی گئی اور وہ عظیم مجاہد جس کی ستر سال سے زیادہ طویل زندگی کا ہر سانس جنگ و جہاد کے معرکہ زاروں میں بیتا تھا آخر دنیا کے دار الامتحان سے کامیابی کے ساتھ دُور نکل کر قبر کی راہ سے گذرتا ہوا اپنے خالق و پروردگار سے اس طرح جا ملا کہ اسکے جسم پر جنگِ بدر کا وہ بوسیدہ اونی کپڑا کفن کی شکل میں لپٹا ہوا تھا جو اللہ کے رسولؐ نے تبرک کے طور پر ان کو عطا کیا تھا ــــ ان کے وہ ہاتھ رحمتِ خداوندی کے لئے پھیلے ہوئے تھے جنھوں نے دولتِ دنیا کے خزانوں کو جیتے جی لٹا دیا تھا اور ان کے دل میں خدا اور خدا کے رسولؐ کے سوا کسی کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔

ہم سے تاریخ کہتی ہے کہ یہ جہاد و ایثار کی داستانیں تمھاری ہیں ــــ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ اب یہ داستانیں لکھنا تو کیا ان کو پڑھنا بھی ہمیں نہیں آتا ــــ پڑھ کر سوچنا اور تڑپنا بھی یاد نہیں رہا ہم کو! ــــ اپنے مستقبل کی تاریکی میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے ہم خود اپنے ماضی کی اس روشنی سے دُور سے دُور تر ہوتے جا رہے ہیں ــــ بجھے ہوئے دل، بے نور آنکھیں اور چکرائے ہوئے دماغ لئے ہوئے آخر ہم کدھر بہتے چلے جا رہے ہیں؟ ــــ تاریکیوں کے طوفانی تھپیڑے حملہ کرتے ہوئے چیختے ہیں "کیا تم مسلمان ہو؟" ــــ دنیا ہماری تباہی پر قہقہہ لگا کر پوچھتی ہے "کیا یہ مسلمان ہیں؟" ــــ لیکن وائے بر حالِ ما! ــــ کہ ہم خود اب بھی یہ سوچنے کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ "کیا ہم مسلمان ہیں؟" ــــ

اہم کتابیں

کتاب	قیمت
موطا امام مالکؒ اردو مع عربی مجلد	۱۲/-
بخاری شریف اردو مکمل در سہ جلد مجلد	۲۴/-
حجۃ اللہ البالغہ اردو مع عربی مکمل "	۲۰/-
حصن حصین " " " "	۸/-
بستان المحدثین " " "	۵/-
مشکوٰۃ شریف " " "	۱۶/-
ترمذی شریف " " "	۱۶/-
بلوغ المرام اردو مع عربی " "	۸/-
ریاض الصالحین اردو مع عربی " "	۲۰/-
تفسیر آیت کریمہ (امام ابن تیمیہ) غیر مجلد	۳/۵۰
تزکیۂ نفس (مولانا امین احسن)	۴/۵۰
سوانح خواجہ معین الدین چشتی	۴/۵۰
فتنۂ انکار حدیث کا منظر و پس منظر مکمل در سہ حصہ	۱۳/۵۰
مفتاح اللغات	۱۰/-
عظیم لغات القرآن مکمل در چھ جلد مجلد	۳۶/۵۰
لغات الحدیث چھ جلدیں	۷۶/-
جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات مکمل	۱۹/-
قرآن اور تعمیر سیرت	۶/۵۰
فہم قرآن	۳/۲۵
قرآن اور تصوف	۳/-
حضرت ابو بکرؓ ... کے سرکاری خطوط مجلد	۵/-
" عمرؓ کے سرکاری خطوط مجلد	۱۲/-
اخلاق اور فلسفہ اخلاق	۷/۵۰
امام غزالیؒ کا فلسفۂ مذہب و اخلاق	۱۰/-
العلم و العلماء	۵/۵۰
وحی الٰہی	۴/-
مسند امام اعظمؒ اردو مع عربی	۸/-
کتاب التوحید (عبدالوہاب نجدی)	۳/-
ضبط ولادت	۱/۵۰

کتاب	قیمت
کتاب الآثار اردو مع عربی	۸/-
ترجمان السنۃ مکمل مجلد	۳۶/۵۰
تذکرہ اولیائے ہند و پاکستان	۳/۵۰
اسلام کا نظام حکومت	۷/-
" عفت و عصمت	۵/-
" زرعی نظام	۵/-
" اقتصادی نظام	۷/-
تبلیغ دین (امام غزالیؒ)	۴/۵۰
تذکرہ امام غزالیؒ	۲/۲۵
مکاتیب زنداں	۲/-
مسلمانوں کا راستہ (مولانا آزادؒ)	-/۳۷
شہادت حسینؓ (")	۱/۲۵
اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ	۱/۷۵
اسلامی معاشیات	۱۲/-
مقالات احسانی	۶/۵۰
تدوین حدیث	۶/۵۰
النبی الخاتمؐ	۳/۲۵
سوانح ابوذر غفاریؓ	۲/-
صراط مستقیم (شاہ اسمٰعیل شہیدؒ)	۲/۵۰
خدا کا انعام	۱/۲۵
تعلیمات (مولانا عبید اللہ سندھیؒ)	۱/۷۵
بھارت کے تہوار	-/۶۲
تحقیق مذاہب	۲/-

ہندی سکھانے والی کتابیں

کتاب	قیمت
ہندی اردو ماسٹر	۳۰/-
اردو ہندی ماسٹر	۵۰/-
ہندی اردو لغت	۳/۵۰
اردو ہندی لغت	۳/۵۰
ہندی دفتری مراسلات	۲/-

مکتبہ تجلی - دیوبند (یو-پی)

تصانیف مولانا مودودی

کتاب	قیمت
رسائل و مسائل ہر دو حصہ	۱۲/۵۰
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۵۰
تفہیمات حصہ اول	۵/۵۰
" حصہ دوم	۶/۵۰
پردہ	۳/۵۰
حدیث اور قرآن	۱/-
منصب رسالت نمبر	۳/۵۰
تنقیحات	۳/-
مسئلۂ قومیت	۱/۷۵
اسلامی قانون	-/۶۲
سرمایہ داری اور اشتراکیت	-/۷۵
سلامتی کا راستہ	-/۳۱
مسلم خواتین سے اسلام کے مطالبات	-/۲۵
اسلام کا نظام حیات	-/۵۰
جماعت اسلامی کی دعوت	-/۲۵
نشان راہ	-/۳۷
حقیقت ایمان	-/۵۰
اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	-/۳۱
حقیقت اسلام	-/۴۰
حقیقت صوم و صلوٰۃ	-/۶۰
شہادت حق	-/۳۱
میلاد النبیؐ	-/۱۳
ایک اہم استفتاء	-/۱۶
قرآن فہمی کے بنیادی اصول	-/۱۹
جبر و قدر	-/۱۵
اسلام کا نظریۂ سیاسی	-/۱۴
تفسیر سورۂ نور مجلد	۴/-

تقتلك الفئة الباغية

(۲)

اس روایت کے بعض طرق پر ہم نے جو جرح کی ہے اس کے باوجود اسے صحیح تسلیم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بخاری اور مسلم نے بھی اسے اپنی صحیحین میں لیا ہے اور ان بلند پایہ محدثین کے راوی ایسے نہیں ہیں کہ ان کا غیر ثقہ ثابت کرنا آسان ہو۔ حاصل تحقیق یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کی صحت شبہ سے بالاتر ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی یقینی معلوم ہوتا ہے کہ "باغی گروہ" سے مراد قاتلین عثمانؓ ہیں نہ کہ گروہِ معاویہؓ۔ بخاری نے جس متن کے ساتھ اس روایت کو بیان کیا ہے وہ بہت ہی صراحت کے ساتھ یہ بتاتا ہے کہ فئتہ باغیہ گروہِ معاویہؓ کو نہیں کہا گیا

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بخاری نے دو مقام پر اس روایت کو بیان کیا ہے۔ اولاً کتاب الصلوٰۃ میں باب کا عنوان ہے :-

التعاون فی بناء المسجد

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ مسجد نبوی کی تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ایک ایک اینٹ اٹھا کر لا رہے تھے اور عمار بن یاسرؓ دو دو اینٹیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمارؓ کو دیکھا تو ان کے جسم سے گرد و غبار جھاڑتے ہوئے فرمایا :-

ویح عمار تقتلہ الفئة الباغیة یدعوھم الی الجنة ویدعونہ الی النار (بخاری جلد اول)	مصیبت ہے عمار کی۔ اسے باغی ٹولی قتل کرے گی۔ حال یہ ہوگا کہ عمار تو اس ٹولی کو جنت کی طرف بلا رہے ہوں گے مگر یہ لوگ انھیں دوزخ کی دعوت دے رہے ہوں گے

آگے امام بخاریؒ نے ٹھیک اسی روایت کو کتاب الجہاد میں لیا ہے۔ باب ہے مسح الغبار عن الراس فی سبیل اللہ فرق بس اتنا سا ہے کہ یہاں الی الجنة کی بجائے الی اللہ کے الفاظ ہیں (لیکن ایک نسخے کے مطابق یہاں بھی الی الجنة ہی ہے)

ویسے تو اس وقت ہمارے سامنے فتح الباری، فیض الباری اور عمدۃ القاری تینوں ہی شروح کھلی ہوئی ہیں لیکن ان کا تفصیلی کلام نقل کرنے کے عوض بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس خلاصے پر ہی اکتفا کریں جو ان جلیل القدر شارحین کی آراء کا نچوڑ ہے اور عقل و نقل کی کسوٹی پر صد فی صد کھرا اترتا ہے۔ وباللہ التوفیق

اہل علم سے پوشیدہ نہیں کہ بخاری کی روایت میں وارد شدہ الفاظ یدعوھم الی الجنة ویدعونہ الی النار قرآن سے مستفاد ہیں۔ مثلاً سورۃ بقرہ رکوع ۲۷ میں ہے :-

أُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ إِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا إِلَى الْجَنَّةِ - یا سورہ مومن کے پانچویں رکوع میں ہے :-

يٰقَوْمِ مَا لِيْٓ أَدْعُوْكُمْ إِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ إِلَى النَّارِ - اسی طرح جہاں جہاں بھی قرآن میں دعوت الی النار دینے والوں کا ذکر آیا ہے اس کا مصداق بلاریب کفار و مشرکین ہی ہیں یا منافقین و زنادقہ۔ ایسے قرآن میں کسی مسلمان فرد یا جماعت کے بارے میں ہرگز ہرگز یہ عنوان اختیار نہیں کیا گیا ہے۔

پھر یہ بھی ہمت العقیدہ مسلمان کو علم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کردار و اخلاق کے معاملے میں سراپا قرآن تھے ناممکن ہے کہ آپ قرآنی اخلاق کی ڈگر سے ایک قدم بھی ہٹے ہوں چنانچہ احادیث کے ضخیم مجموعے سب کے سامنے ہیں نہیں دکھایا جا سکتا کہ رؤف و رحیم پیغمبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کسی بھی موقع پر اہلِ ایمان کے لئے گفتگو کا کوئی ایسا پیرا یہ اور اسلوب اختیار کیا ہو جس کا صریح و واضح تعلق کفار و زنادقہ سے ہو۔

اس صورت میں کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ اپنی پیشین گوئی میں مسلمانوں کی اُس جماعت کو داعی الی النار کے نام سے یاد کریں گے جس میں نہ صرف معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ شامل تھے بلکہ عشرہ مبشرہ میں کے دو رفیع الشان فرد حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بھی شامل تھے جنھیں جنگ جمل میں شہید کر دیا گیا اور ان کے علاوہ اور بہتیرے صحابہؓ اس جماعت کے ساتھ تھے۔

گفتگو ان لوگوں سے نہیں جو واہی روایات اور شیعی پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر حضرت معاویہؓ کے احترام سے اپنے دل و دماغ کو خالی کر چکے ہیں۔ گفتگو ان سے ہے جو اہل سنت والجماعت کا عقیدہ اور صحابیت کے مقامِ بلند کا احساس رکھتے ہیں۔ انھیں غور کرنا چاہئے کہ جس معاویہؓ کو حضورؐ نے کتابت وحی کے شرفِ عظیم سے نوازا، جس معاویہؓ کیلئے ہادی و مہدی ہونے کی دعا فرمائی اور جس معاویہؓ پر عمر فاروقؓ جیسے بالغ نظر خلیفہ نے زندگی بھر پورا اعتماد کیا اس کے بارے میں ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم ایسا عنوان کیونکر اختیار فرما سکتے تھے جس کا رُخ کفار و ملحدین کی طرف ہو۔

اہل علم جانتے ہیں کہ حضورؐ نے حضرت حسنؓ کے بارے میں فرمایا تھا

"میرا یہ سید بیٹا مسلمانوں کی دو جماعتوں میں صلح کرائیگا۔"

اس پیشین گوئی کا مصداق حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ ہی کی جماعتیں تھیں یہ بھی ہر باخبر کو معلوم ہے۔ تو کیا اسمیں ایک حرف بھی ایسا ہے جس سے معلوم ہو کہ ان دونوں جماعتوں میں ایک جماعت حضورؐ کے نزدیک گمراہوں اور زندیقوں کی جماعت ہوگی العیاذ باللہ۔ صاف طور پر موجود ہے کہ حضورؐ نے دونوں ہی جماعتوں کو ایک ہی سطح پر رکھا اور اشارۃً و کنایۃً بھی کسی ایک جماعت کی تضلیل و تفسیق نہیں فرمائی۔ لہذا ممکن ہی نہیں معلوم ہوتا کہ کسی بھی موقع پر آپؐ گروہ معاویہ کے لئے داعی الی النار ہونے کا عنوان اختیار فرمائیں۔ اس کے برخلاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ روئے سخن مفسدین و شیاطین کی اُسی جماعت کی طرف ہے جس نے حضرت عثمانؓ کو شہید کیا اور پھر مسلمانوں کو باہم لڑا دینے میں کامیاب ہوئی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت عثمانؓ کے دور میں جب مختلف صوبوں میں فتنۂ دشمنی نے جنم لیا تھا تو صحابہؓ کے مشورے پر حضرت عثمانؓ نے مختلف اشخاص کو تحقیق و اصلاح کی غرض سے مختلف صوبوں میں بھیجا تھا۔ چنانچہ حضرت عمار بن یاسرؓ مصر بھیجے گئے تھے اور مصر ہی سبائی سازش کا گڑھ بھی تھا، لہذا جنت اور دوزخ کی طرف دعوت کی بات اگر کہیں صادق آتی ہے تو اس مقام پر صادق آتی ہے یہ سبائی گروہ بلاشبہ فساق و زنادقہ کا گروہ تھا۔ بظاہر اس میں مسلمان ہی مسلمان نظر آتے تھے لیکن ان کی زمام سبائی لیڈروں کے دستِ فتنہ طراز میں تھی اور ان کی روش بلاشبہ زندقہ و کفر کی روش تھی اسی کے بارے میں حضورؐ کا یہ فرمانا بالکل درست ہو سکتا تھا کہ عمار بن یاسرؓ تو اسے صراطِ مستقیم اور جنت کی دعوت دینے گئے تھے، لیکن یہ بدبخت انھیں دوزخ کی طرف بلا رہا تھا۔

بخاری کا عنوانِ باب

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ امام بخاریؒ نے مقام اول پر باب کا جو عنوان دیا ہے اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ خود امام بخاریؒ کے نزدیک بھی زیرِ عنوان حدیث میں تقابل دو مسلمان جماعتوں کا نہیں بلکہ شرک اور اسلام، گمراہی اور ہدایت کا ہے۔ ابھی میں نے کتاب الصلوٰۃ سے عنوان کا صرف ایک ٹکڑا نقل کیا تھا۔ پورا عنوان یوں ہے:-

باب التعاون فی بناء المسجد وقول اللہ عز وجل مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسَاجِدَ اللَّهِ الآیۃ

سورۂ توبہ کی اس آیت میں ظاہر ہے کہ مشرکین کا تذکرہ ہے

اس سے اگلی آیت میں مومنین کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ الآیۃ۔

تو کیونکر قرین قیاس ہو سکتا ہے کہ متذکرہ عنوان کے تحت بیان کی جانے والی روایت میں تقابل علیؓ و معاویہؓ کے گروہوں کا ہو جب کہ گروہِ معاویہؓ کو سوائے شیعوں اور رفض گزیدہ سنیوں کے کوئی بھی ہوشمند مشرکین و زنادقہ کا گروہ نہیں کہہ سکتا۔

درایت کا ایک اور پہلو

سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ حضرت معاویہؓ کا موقف تو طلبِ قصاص کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ وہ نہ تو حضرت علیؓ کے بالمقابل مدعی خلافت تھے۔ نہ کوئی اور دعوت وہ ایسی دے رہے تھے جس پر دعوت الی النار کا اطلاق ممکن ہو۔ پھر کیا یہ تصور کرنا ممکن ہے کہ قصاص کا عین قرآنی مطالبہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک دعوت الی النار قرار پایا ہو۔ نعوذ باللہ من ذلک ۔۔ حضرت معاویہؓ کا موقف قطعی طور پر بے غبار تھا۔ زیادہ سے زیادہ بس یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت علیؓ بھی اپنے اعتبار سے قطعاً حق پر تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر یوں کہہ لیجئے کہ حضرت علیؓ حق سے زیادہ قریب تھے۔ الحمد للہ۔ ہمیں یہ مان لینے میں کوئی تکلیف نہیں کہ چوتھے خلیفۂ راشد سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ حق سے زیادہ قریب ہوں جب کہ حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں ان کا ذاتی فضل و شرف بھی اسی کا مقتضی ہے کہ ان کی ذات والاصفات حق و صداقت سے موصوف اور ہدایت و نورانیت سے وابستہ ہو، لیکن یہ کہنا کسی طرح حق و صداقت اور دین و دانش کے مطابق نہیں نظر آتا کہ معاویہؓ ان کے مقابلہ میں باطل پر تھے۔ حاشا ثم حاشا۔ حق معاویہؓ کے ساتھ بھی تھا۔ موقف ان کا بھی شریعت کے عین مطابق تھا۔ ان کا حضرت علیؓ کے مقابلے میں حق سے کچھ دور ہونا صرف اور صرف ایسا ہی مفہوم رکھتا ہے جیسے ایک ہی راہ کے دو مسافر کچھ فاصلے سے آگے پیچھے جا رہے ہوں۔ اگلا مسافر ظاہر ہے پچھلے کے مقابلے میں منزل سے کچھ قریب ہوگا اور پچھلا کچھ بعید مگر یہ نہیں کہا جا سکے گا کہ اگلا تو صراطِ مستقیم پر جا رہا ہے اور پچھلا راہ گمراہی پر۔

شارحین بخاری

بات تو بفضلہ تعالیٰ مکمل ہو گئی اور جن لوگوں کے قلوب پر اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کے معاملے میں مہر نہیں لگا دی ہے انہیں یقیناً مطمئن ہو جانا چاہئے کہ حضرت معاویہؓ کے گروہ پر باغی گروہ کا اطلاق کرنے میں صاحب ہدایہ اور صاحبِ فتح القدیر جیسے بزرگوں سے یا تو تسامح ہوا ہے یا پھر انہوں نے باغی کو صرف لغوی معنی میں لیکر ایک چلتی ہوئی سی بات کہہ دی ہے۔

تاہم مختصر سا تذکرہ شارحین بخاری کے خیالات کا بھی ہو جائے تو بے جا نہیں۔

احساس حافظ ابن حجرؒ کو بھی ہوا ہے کہ جو گروہ حضرت معاویہؓ اور دیگر صحابہؓ پر مشتمل ہو اس پر داعی الی النار کا لقب چسپاں نہیں ہو سکتا، لیکن انہوں نے اس کی تاویل کر دی ہے۔ تاویل اگر درست مان لی جائے تب بھی اس سے وہی ثابت ہوتا ہے جو ہمارا مسلک ہے یعنی حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کا مجتہد ہونا۔ مجتہد خطا بھی کر جائے تو اس کے لئے ایک ثواب متحقق ہے۔ لہٰذا مقابلہ حق و باطل کا نہیں رہا بلکہ ایسا ہی رہا جیسے مجتہدین ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں اور ہر ایک صراطِ حق ہی کا راہی شمار ہوتا ہے۔ لیکن خود ابن حجرؒ ہی کی شرح میں ایک ایسی چیز موجود ہے کہ اس کو بنیاد بنا کر تاویل کے چکر سے بچا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اسی مقام پر بیان کیا ہے کہ مہلبؒ اور ان کی پیروی میں ابن بطال نے یہ بات کہی ہے کہ حدیث مذکورہ میں تذکرہ حضرت عمارؓ اور خوارج کا ہے نہ کہ گروہِ معاویہؓ کا کیونکہ کسی صحابی یا تابعی کے بارے میں اس طرح کی بات صحیح نہیں ہو سکتی۔ یہ بیان کر کے ابن حجر بایں طور اس قول کی تردید کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ خوارج سے تو قتل عمار کے بعد لڑے ہیں لہٰذا خوارج پر حدیث کا اطلاق کیسے ہو سکتا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ تاریخ و روایت میں ابن حجر کی امامت

بے شک خوارج پر چڑھائی تحکیم کے بعد ہی ہوئی اور عمارؓ تحکیم سے پہلے شہادت پاچکے ہیں، لیکن یہ کیوں نہیں ہوسکتا کہ جن مصریوں کی طرف حضرت عمارؓ بھیجے گئے تھے انھی میں سے اکثر لوگ بعد میں خوارج کے ساتھ ہوگئے ہوں۔ ان کے مزاج کی انتہاپسندی تو اسی سے ظاہر ہے کہ ظالموں نے قتلِ عثمانؓ سے کم کسی بات پر قناعت نہیں کی۔ لہٰذا ایسے لوگوں سے کچھ بعید نہیں کہ بعد میں یہ خوارج کے کیمپ میں پہنچ گئے ہوں۔ خوارج کا طرۂ امتیاز انتہا پسندی ہی تو ہے۔ اس صورت میں خوارج بھی حدیث کا مصداق بن سکتے ہیں اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ان کا قلع قمع تحکیم کے بعد کیا گیا۔ فافہم وتدبّر!

ابن حجرؒ نے یہ نکتہ بھی نکالا ہے کہ حدیثِ بخاری میں جنت و جہنم کی دعوت والا ٹکڑہ مُدرَج ہے یعنی اسے کسی اور نے بخاری کی روایت میں بڑھادیا ہے ورنہ خود امام بخاریؒ کے نزدیک اس روایت کے راوی اول حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہ اعتراف ثابت ہے کہ یہ ٹکڑا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سُنا۔

ہم کہتے ہیں کہ اس نکتۂ خفی کا کوئی فائدہ نہیں جبکہ ابن حجرؒ پوری روایت کو جوں کا توں صحیح مان کر تاویل میں کوشاں ہیں۔ فیض الباری کی تشریح کے مطابق یہ زیادۃ اس امام بخاری والے طریق میں مدرج ثابت بھی ہو تو بعض اور طرقِ صحیحہ میں ثابت ہے۔ ویسے خود فیض الباری میں جو کچھ بطورِ شرح کہا گیا ہے وہ ایک دوسرے سے متصادم اور متضاد ہے لیکن یہ خامی حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کی نہیں ہوسکتی بلکہ املا کرنے والوں کی ہے۔ انھوں نے سبق کی تقریر کو اس طرح ضبط کیا ہے کہ سلسلۂ بیان کی متعدد کڑیاں غائب ہوگئی ہیں اور مختلف توجیہات میں منطقی ربط و توافق نہیں رہا ہے۔ پھر بھی یہ مجموعی طور پر ہمارے موقف کے خلاف نہیں بلکہ جس کا جی چاہے دیکھ لے صاحبِ فیض الباری گروہ معاویہؓ کے بارے میں قطعیت کے ساتھ وہی تصور دینا چاہتے ہیں جس پر ہم جمے ہوئے ہیں اور کہیں سے بھی یہ نہیں جھلکتا کہ وہ مرعوب ہیں ...

موصوف معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کی عظمت و عدالت سے پوری طرح مطمئن ہے۔

علامہ عینیؒ کے یہاں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ملی۔ وہ ابن حجرؒ ہی والی تاویل پیش کرتے ہوئے خود ہی اس میں خامی بھی نکال دیتے ہیں اور پھر خود ہی اپنے جواب کے بارے میں یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ یہ فقط اقناعی جواب ہے یعنی "برائے بیت"۔ کمال ان کے یہاں یہ ہے کہ وہ اسی مقام پر ایک ایسی روایت کی بھی تصحیح فرماتے ہیں جس میں یہ صراحت کردی گئی ہے کہ جن لوگوں کو حضورؐ نے داعی الی النار قرار دیا وہ اہلِ شام ہیں۔ پھر اس کے بعد قرآنی آیت سے یہ بھی سمجھانا چاہتے ہیں کہ معاویہؓ اور ان کے ساتھی صحابہؓ کے بارے میں ایسی بات ہرگز نہیں کہی جاسکتی۔ گویا ذہنی طور پر علامہ عینیؒ بھی کسی غیرمبہم اور اطمینان بخش فیصلے تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ عقیدہ یہی ظاہر فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مصداق گروہِ معاویہؓ نہیں ہوگا اور ہوگا تو اس کی تاویل کی جائیگی لیکن روایات کے دروبست میں اس عقیدے کے اطمینان بخش اثبات کا اہتمام نہیں کرسکے ہیں۔ عفااللہ عنہ ورحمہٗ۔

سوچنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ روایت کثیر صحابہؓ سے مروی ہے۔ اگر باغی گروہ کا مصداق وہ بھی گروہِ معاویہؓ ہی کو سمجھتے تو ان کا بالاتفاق حضرت علیؓ کی طرف سے معاویہؓ کا مقابلہ کرنا یقینی ہوجاتا کیونکہ صحابہؓ سے اس گراوٹ کی توقع نہیں ہوسکتی کہ وہ کسی جماعت کو باغی بھی سمجھیں اور امام برحق کے ساتھ مل کر اس کا مقابلہ بھی نہ کریں۔ مقابلہ تو درکنار بہت سے صحابہؓ معاویہؓ کے کیمپ میں چلے گئے اور امامِ برحق کیخلاف تلوار اٹھائی۔

پھر کیا خود حضرت علیؓ اور دیگر اہل بیت نے معاویہؓ کو باغی کی حیثیت دی تھی؟ واقعات گواہ ہیں ایسا بالکل نہیں ہوا۔ قولاً بھی یہی ثابت ہے کہ باہمی نزاع کو انھوں نے فکر و اجتہاد کا اختلاف سمجھا اور تحکیم قبول کرلینے سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں گروہِ معاویہ گروہِ بُغاۃ نہیں تھا۔

باغیوں کے بارے میں کب کوئی حکومت ثالثی کی تجویز قبول کرتی ہے۔ قبول کرنا تو درکنار وہ اسے سُننا بھی برداشت نہیں کر سکتی۔

بعد میں حضرت حسینؓ کا معاویہؓ کے حق میں دستبردار ہو جانا بجائے خود دلیل ہے معاویہؓ کے باغی نہ قرار پانے کی۔ کیا اہل بیت اور سبطِ رسول کے مدح گذار یہ کہنا پسند کر لیں گے کہ حضرت حسن نے اُس شخص کے حق میں دست برداری دی جو باغی تھا۔ گمراہ تھا۔ ظالم و ستمگر تھا۔ ایسا کہنے کے بعد حضرت حسنؓ کو حق ناشناسی، بزدلی اور غفلت شعاری کے الزامات لیجانا کیسے ممکن ہو سکتا ہے و نعوذ باللہ من ذٰلک۔ نہ حضرت حسنؓ کی اس صلح جوئی کو اس توصیف کا مصداق قرار دیا جا سکتا ہے جو اللہ کے رسولؐ نے صریح الفاظ میں کی تھی کہ میرا یہ سید بیٹا مسلمانوں کی دو جماعتوں میں صلح کرائے گا۔ اس ارشادِ رسولؐ کو علمائے خلف و سلف حضرت حسنؓ کی تعریف ہی کے رُخ پر لیتے ہیں لیکن یہ تعریف مذمت میں بدل جاتی ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ جماعت باغی تھی جسے حکومت سپرد کر کے حضرت حسنؓ نے اپنے ناناؐ کی پیشین گوئی پر عمل کی مہر لگا دی۔ معاویہؓ سے ان کا بیعت کرنا صریح برہان ہے اس صداقت کا کہ خود حضرت علیؓ کا عالی مقام بیٹا بھی اپنے باپ سے لڑنے والے معاویہؓ کو باغی کی حیثیت نہیں دیتا تھا اور نزاع کی حیثیت اس کے نزدیک اجتہادی اختلاف سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ اس سے بھی بڑھ کر معاویہؓ کے حق میں حکومت سے دست برداری تو بدیہی ثبوت اس بات کا بھی ہے کہ حضرت حسنؓ کی نگاہ میں بنو امیہ ہی کی حکومت و سیادت اس وقت ملک و ملت کے حق میں زیادہ بہتر تھی اور وہ مشیتِ ایزدی سے اس بارے میں جنگ کرنا نہیں چاہتے تھے کہ کیوں اس نے بنو ہاشم کے مقابلے میں بنو امیہ کو جہانبانی و حکمرانی کی صلاحیتوں سے زیادہ نوازا اور کیوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکومتی عہدے اکثر و بیشتر بنو امیہ ہی کو دیئے۔ تکوینی مصالح پر ناک بھوں چڑھانا اور ضد کرنا کسی سلیم الطبع کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ صلاحیتیں باری تعالیٰ کے خزانے سے ملتی ہیں خالقِ کائنات خود ہی بہتر سمجھ سکتا ہے کہ کسے کیا دے اور کیا نہ دے۔ حضرت علیؓ کو ایسے ایسے شرف دیئے جن کی ہوا بھی معاویہؓ کو نہیں لگی۔ لیکن معاویہؓ کو بعض ایسی صلاحیتیں عطا فرمائیں جن میں حضرت علیؓ ان کی برابری نہیں کر سکتے۔ حضرت علیؓ جنت کے درجۂ عالیہ میں جائیں اور معاویہؓ کو اس سے نیچے کا درجہ عطا ہو تو کس کافر کی مجال ہے جو اس فیصلۂ خداوندی پر چوں بھی کر سکے لیکن ظاہر میں تو ہم علم غیب سے محروم لوگ یہی کہہ سکتے ہیں کہ معاویہؓ نے اسلامی مملکت کو زیر و زبر کرنے والے فتنوں کا استیصال کر کے پوری امت کو زیر بار احسان کیا ہے اور سبائی استیلاء سے امت کو بچالے جانا ان کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جسے ملوکیت و بادشاہت کے طعنوں سے بے وزن نہیں کیا جا سکتا۔ ھذا ما عندی والعلم عند اللہ۔

طاقت کا بے پناہ خزانہ

جی ہاں۔ ماڈرن ریسرچ خاص پروٹینی اجزاء طاقت بخش جڑی بوٹیوں، نباتات جن میں وٹامن ہوتے ہیں تازہ پھلوں کے رس، مشک عنبر اور زعفران سے سائنٹفک طریقوں سے تیار کیا گیا ماء اللحم خاص خون صالح پیدا کرتا ہے۔ اسکے استعمال سے طاقت اور جوانی عرصے تک برقرار رہتی ہے اور جسم فولاد کی مانند مضبوط ہو جاتا ہے۔

(ہر جگہ ایجنسیاں قائم کی جارہی ہیں)

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

مایوسوں کیلئے بشارت

مفید، مجرب، قابل اعتماد علاج

تجربہ ہماری صداقت کی گواہی دے گا

اگر آپ تو علاج و معالجہ کے بعد ہمت ہار کر مایوسی انتشار کی زندگی گذار رہے ہیں۔ وقت کے تقاضے یا غیر محتاط زندگی کے باعث جسم کی طاقتیں زائل ہو رہی ہیں تو مندرجہ ذیل دوائیں استعمال کر کے اپنی زندگی کو خوشگوار بنائیے

معجون نشاط زندگی۔ مکمل کورس .... دس روپے

محبوبی۔ تنو گولیاں .... دس روپے

رفیقی۔ ایک شیشی ڈھائی تولہ ...... پانچ روپے

انیس نسواں۔ مکمل کورس .... دس روپے

نیز جملہ امراض کا علاج ہمارے یہاں ہوتا ہے

حکیم ابو سعید عبید اللہ اسلام مجرد دواخانہ دربھنگہ

ضلع دربھنگہ صوبہ بہار

Just 2 Tablets

سُعالین

سعالین کی صرف دو ٹکیاں گلے کی خراش کو دور کرنے اور تسکین پہنچانے کے لیے کافی ہیں۔ یہ سانس کی نالیوں کو صاف کرتی ہیں۔ کھانسی، زکام اور گلے کی خرابیوں کو دور کرتی ہیں اور خراش کو پیدا ہونے سے روکتی ہیں۔

سُعالین

آپ کے سانس کو بھی خوش گوار بناتی ہے

ہمدرد

دہلی ، کانپور ، پٹنہ

مدیر تجلی کا مکتوب گرامی

یہ عنوان پڑھ کر آپ ضرور چونکیں گے لیکن چونکنے کی ضرورت اس لئے نہیں کہ یہ عنوان خود ادارۂ تجلی کا نہیں ہے بلکہ اسے ماہنامہ "زندگی" سے نقل کیا جارہا ہے۔ عنوان کے ساتھ پورا مکتوب بھی نقل ہے۔ نقل کی وجہ یہ ہے کہ محترم مدیر زندگی نے اپنے نجی خط میں بھی اسے تجلی میں شائع کر دینے پر اصرار کیا تھا اور اس نوٹ میں بھی یہ اصرار موجود ہے جو موصوف نے مکتوب کے خاتمے پر سپرد قلم فرمایا ہے۔

صورتِ حال یوں ہے کہ کچھ دنوں سے ہمارے اور مدیر زندگی کے مابین گوٹے ٹھپے کی زکوٰۃ کے ایک جزئیے پر مذاکرہ چل رہا تھا۔ اس کے سلسلہ میں انھوں نے جنوری ۶۳ء کے زندگی میں ایک مفصل مضمون شائع فرمایا تو ہمیں مناسب معلوم ہوا کہ اس پر تجلی میں گفتگو کرنے کے عوض زندگی ہی میں اپنے خیالات بصورت مکتوب شائع کرا دیں۔ چنانچہ وہ عریضہ ارسال کیا گیا جو انھوں نے اپنے نوٹ کے ساتھ مارچ ۶۳ء کے زندگی میں چھاپ دیا ہے۔ تجلی میں اس مکتوب کی اشاعت ہمیں اس لئے موزوں معلوم نہیں ہوتی تھی کہ جب مدیر زندگی کا پورا مضمون قارئین تجلی کے سامنے نہیں تو اس سے متعلق خط میں انھیں پوری دلچسپی کیسے آسکے گی۔ چنانچہ ہم نے موصوف کو خط میں لکھا تھا کہ ہمارے خط کو تجلی میں چھپوانے کے عوض آپ خود ہی ایک ایسی تحریر اشاعت کے لئے بھیج دیں جس سے وہ مقصد پورا ہو جائے جس کی خاطر آپ ہمارے خط کو تجلی میں چھپوانا چاہتے ہیں لیکن موصوف نے اس گذارش کو لائق پذیرائی نہیں سمجھا بلکہ اس نوٹ میں بھی اپنے مطالبے کو باقی رکھا جو ابھی آپ ہمارے خط کے متصل بعد ملاحظہ فرمائیں گے لہٰذا ہم اپنا اخلاقی فریضہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے مطالبے کی تعمیل کریں جبکہ ہمارا خط زندگی میں شائع کر کے انھوں نے حسن اخلاق کا ثبوت دیا ہے۔

یہ ہمیں احساس ہے کہ مدیر زندگی کے جس مضمون پر یہ خط لکھا گیا تھا اسے پڑھے بغیر قارئین بحث کا پورا لطف اٹھا سکیں گے لیکن یہ بھی خوش گمانی ہے کہ تجلی کے خوش مذاق اور فہیم قارئین اپنے فہم و ذکاء سے اس خلا کو پُر کر لیں گے جو بحالتِ موجودہ پایا جا رہا ہے ـــــ تاہم بعض قارئین کے لئے اس خط سے دلچسپی لینا غیر ممکن بھی ہو تو بہر حال اخلاقی فریضے کی ادائیگی کے لئے ہم چند صفحات سیاہ کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔

خط کے آخر میں مدیر زندگی نے جو نوٹ ارقام فرمایا ہے اس پر بھی ہم کچھ عرض کریں گے۔ اس طرح فی الحال یہ مذاکرہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔

عامر عثمانی

مکتوب مدیر تجلی ـــ بنام ـــــ مدیر زندگی ـــــ مطبوعہ زندگی۔ مارچ ۶۳ء۔

اخی فی الدین [illegible] مسنونہ۔

ابھی جنوری ۱۹۶۳ء کے "زندگی" میں "زکوٰۃ کا ایک جزئیہ" کے زیر عنوان جو کچھ آپ نے سپرد قلم فرمایا ہے اس پر مطول بحث تو مقصود نہیں لیکن چند دوستانہ معروضات ضرور پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اگر یہ بھی قارئین زندگی کے سامنے آجائیں تو زیر بحث مسئلہ کا فیصلہ وہ علیٰ وجہ البصیرت کرسکیں گے دماالتوفیق الا باللہ

اولاً چند شکوے بھی آپ سے کروں گا۔ شکوہ تعلق کا ثبوت ہے۔ یہ فیصلہ خود آپ پر اور قارئین پر چھوڑ تا کہ شکوے بجا ہیں یا بے جا۔ بے جا ٹھیرے تو مجھے اپنے دوست سے معافی طلب کرنے میں بھی عار نہ ہوگا۔

پہلی بات تو یہ ہے — جو بجائے خود شکوہ نہیں — کہ میں نے زیر بحث مسئلہ میں جو کچھ تجلّی نومبر ۶۲ء میں لکھا تھا اس سے یہ خطرہ محسوس کرنا کہ کسی کو آپ کے مسلک و موقف کے بارے میں غلط فہمی ہوجائے گی غیر ضروری ذکاوتِ حس کا ثمرہ معلوم ہوتا ہے ورنہ کس ہوشمند کے دماغ میں یہ تصور بھی آسکتا ہے کہ عروج صاحب یا کوئی بھی عالم نصاب کی قید اٹھا کر سونے چاندی کی قلیل سے قلیل مقدار پر بھی زکوٰۃ لازم کردے گا۔

تاہم آپ کا اندیشہ معقول بھی ہو تو شکوے کا پہلو یہ ہے کہ اس کو دفع کرنے کا انداز آپ نے ایسا اختیار کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عامر نے قصداً ایسے نامکمل فقرے نقل کئے جو غلط فہمی پیدا کرنے کے موجب ہوں۔ حاشا ثم حاشا میرے دوست ارادۃً ایسی گھٹیا حرکت تو میں دشمن کے ساتھ بھی نہیں کرسکتا۔ چہ جائیکہ اپنے مخلص دوست کیساتھ۔ علمی مباحث میں ایسی عیاری متعصب اور بددیانت ہی لوگ کرسکتے ہیں میں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ اگر آپ سچ مچ یہی سمجھتے ہیں کہ رائے زنی کے دوران جو عبارتیں میں نے آپ کی نقل کی تھیں ان میں قابل اعتراض قصر و اختصار ہے تو اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ غیر ضروری طوالت سے بچنے کے لئے ہر ناقد و مبصر کو جزوی اقتباس پر ہی قناعت کرنی پڑتی ہے اور آپ کی تحریر چونکہ تازہ تھی اس لئے قدرتاً میں یہی تصور رکھتا تھا کہ جسے اس بحث سے دلچسپی ہوگی وہ بآسانی "زندگی" بھی دیکھ سکے گا۔ پھر بھی اگر میری کوتاہ فہمی سے کہیں اقتباس قصیر رہ ہی گیا ہو تو اسے میری نیت کا نہیں سمجھ کا فتور خیال کرتے ہوئے دل کے آئینے کو غبارِ کدورت سے صاف کرلیں۔

دوسرا پہلو شکایت کا یہ ہے کہ آپ کا تازہ مضمون بحیثیت مجموعی بھی اس دوستانہ اسپرٹ اور خندہ جبینی کا احساس نہیں پیدا کرتا جس کی مجھے آپ سے توقع تھی اور جو علمی مباحث میں ہر بے لوث اور فراخدل عالم کا طرۂ امتیاز ہونا چاہیئے۔ ہلکی ہلکی شکر رنجی اور میٹھے میٹھے خدش کی جھلکیاں صرف بین السطور ہی میں نہیں آپ کے بعض الفاظ میں بھی ملتی ہیں حالانکہ فدوی نے تجلّی میں جو انداز گفتگو اختیار کیا تھا اس کا صحت مند ردعمل یہ نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ آپ اپنے اور میرے قلم پاروں کو ایک بار پھر ذرا ٹھنڈے دل سے پڑھ کر دیکھیں انشاء اللہ اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ میرے اور آپ کے طرز تحریر میں مطابقت نہیں رہی ہے۔ میں یکسر غیر جذباتی انداز میں خالص علمی مذاکرے کا جویا تھا مگر آپ نے اپنے اسلوب میں جذبات کی چاشنی بھی شامل فرمادی۔

تیسرا پہلو شکایت کا یہ ہے کہ اپنے مضمون کی پہلی قسط میں بھی آپ نے ایک دو جگہ تجہیل و تحمیق کا انداز اختیار کیا تھا اور اس دوسری قسط میں بھی یہ پیرایہ موجود ہے۔ مثلاً آپ لکھتے ہیں:۔

"فاضل مدیر (یعنی عامر عثمانی) نے تردید کرتے ہوئے احتیاط کی جو مثالیں دی ہیں انھیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔"

یا مثلاً آپ کے الفاظ ہیں:۔

"میں موصوف کی (عامر عثمانی کی) یہ عبارت پڑھ کر ششدر رہ گیا اور فقہ حنفی سے واقف ہر شخص حیران رہ جائیگا اگر موصوف نے الفقہ علی مذاہب الاربعۃ کے علاوہ دوسری کتابیں نہیں پڑھی تھیں تو کم سے کم فتح القدیر کی وہ عبارت ان کی نظر

سے ضرور گذری ہوگی جو میں نے اپنے مضمون میں نقل کی تھی ــ صفحہ ۱۲ سطر ۱۳ تا ۱۶ ـ

یہ باتیں ظاہر ہے یہی مفہوم رکھتی ہیں کہ عامر عثمانی فقہ میں کورا ہے اور قلت علم کے باعث ایسی بے تہ باتیں کہتا ہے جن پر اہل علم کو حیران و ششدر رہ جانے کے بغیر چارہ نہیں۔ میرے دوست! اصلاً تو یہ درست ہے کہ عامر عثمانی کا سرمایۂ علم کچھ بھی نہیں۔ لیکن خود آپ کے حسن تعلق اور اخلاق کریمانہ کا یہ تقاضا ضرور ہونا چاہیئے تھا کہ اس کی ہانڈی چوراہے پر نہ پھوڑیں۔ وہ اور آپ حریف نہیں دوست ہیں۔ ایک ہی فقہ کے پیرو اور ایک ہی آئیڈیالوجی کے حامل ہیں۔ آپ دونوں کو ایک دوسرے کی خامیوں اور کوتاہیوں پر اس حد تک نگاہ شفقت ضرور ڈالنی چاہیئے جس حد تک علم، تفقہ اور عدل و دیانت کے تقاضے مجروح نہ ہوتے ہوں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ عامر عثمانی کی رائے سے متفق نہ ہونے کی صورت میں آپ استعجاب کا وہ اسلوب اختیار کریں جو کوئی مغرور عالم ایک عامی کی باتوں پر اختیار کرتا ہے۔

دوستانہ شکوہ سنجی کا باب تو تمام ہوا۔ اب میں یہ بتا دینا بھی مناسب خیال کرتا ہوں کہ آپ کے تحیّر اور قدرے غیر دوستانہ رویے کے عقب میں میرے نزدیک کیا چیز کارفرما ہے۔ میرا خیال ہے آپ کے تفقہ کا قدم درجہ اوّل کے مجتہدین کے فکری مدارک و مناہج تک پہنچنا پسند نہیں کرتا بلکہ پانچویں یا چوتھے طبقے پر جاکر رُک گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی آپ کو کلی یقین ہے کہ عامر عثمانی چھٹے اور ساتویں طبقے کے فقہاء سے بھی آشنا نہیں، نہ ہدایہ اور شرح وقایہ جیسی متداول نصابی کتب پر ہی اس کی نظر ہے اسی لئے وہ اگر کوئی ایسی نکتہ سنجی کرتا ہے جو بالکل سامنے کے فقہی متون و شروح سے ہٹی ہوئی ہو تو آپ قدرتاً اسے بے علمی و بے خبری پر محمول کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں متحیر بھی ہوتے ہیں اور چیں بجبیں بھی حالانکہ میرے دوست عامر عثمانی نے جب سے دینی موضوعات کی وراثت و تفکیر کو اپنا مقصد حیات بنایا ہے وہ اپنے جہل کو علم سے اور بے بصری تفقہ سے بدلنے میں دن رات کوشاں ہے۔ آپ فتح القدیر اور شامی وغیرہ کی بات کرتے ہیں حالانکہ ان کے عالی قدر جامعین و مؤلفین صرف اصحاب ترجیح و تخریج ہیں اس ناکارہ نے تو مجتہدین فی المذہب اور ان سے متصل طبقہ ثالث کے فقہاء کے دراسات پر بھی اپنی بینائی اور قوت فہم کا بہت سا سرمایہ صرف کیا ہے اور برابر کرتا رہتا ہے۔ بجا کہ وہ مقلد ہے لیکن تقلید کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہدایہ اور شامی و عالمگیری تک محدود رہ کر سرخسیؒ، بزدویؒ، حلوانیؒ، کرخیؒ اور طحاویؒ جیسے متقدمین کے اصولی افاضات سے اپنے ذہن کو جلا نہ دی جائے۔ وہ تو اس سے ایک قدم بڑھ کر ابو یوسف، امام محمد، زفر اور ابوحنیفہ رحمہم اللہ کے دسترخوانوں سے بھی براہ راست ریزہ چینی کو منصب تقلید کے معارض نہیں سمجھتا۔

میرا گمان ہے کہ موجودہ بحث میں آنجناب نے ائمہ احناف کی ان باریک بینیوں اور دقیقہ سنجیوں کو ملحوظ نہیں رکھا ہے جو انھوں نے مناط کی تنقیح و تحقیق اور وصف و علت کی تعیین اور تخریج میں کی ہیں اور اسی دقت نظر نے انھیں دوسرے مکاتب و مذاہب کے مقابلے میں ممتاز کیا ہے میں اور آپ دونوں نے فقہ کے متداول کتابوں میں وہ مخصوص جزئیہ ڈھونڈا جس پر گفتگو ہو رہی ہے مگر وہ نہیں ملا تو ہمیں رائے قائم کرنے میں ابن الہمام اور ابن عابدین ہی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیئے تھا بلکہ احناف کی معروف ژرف نگاہی کے ساتھ ائمہ اصول اور فقہائے متقدمین کے دراسات سے بھی بقدر فہم فائدہ اُٹھانا چاہیئے تھا۔ آپ کا مسلک و مشرب کچھ بھی ہو لیکن بندہ تو اپنی بے بضاعتی کے باوجود اس جمود و تساہل کو کفران نعمت تصور کرتا ہے کہ جن معاملات میں ہمیں فکر و تدبر کی اجازت ہے ان میں بھی ہم اللہ کی دی ہوئی عقل و بصیرت کو ان فقہائے مابعد کا تابع مہمل بنادیں جو حق تک پہنچنے کا صرف ایک ذریعہ ہیں خود مطاع و متقاد نہیں ہیں۔

اس تمہید کے بعد بندہ عرض کرتا ہے کہ یہ جو آپ جابجا

میں احتیاط کو واجب قرار دینے کی بات بار بار کہے جا رہے ہیں یہ ادھوری ہے علمائے اصول نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ عند تعارض المعارضة و انعدام الترجیح یجب الاخذ بالاحتیاط گویا احتیاط پر عمل کا وجوب اس وقت ہے جب متقابل دلیلوں میں برابر کی ٹکر ہو اور کسی ایک جانب کو ترجیح دینے کے لئے معقول وجہ ہاتھ نہ آئے۔ چنانچہ اس بار خود آپ نے بھی بایں الفاظ اس کا ذکر کیا ہے کہ:-

"کسی چیز کے بارے میں کوئی حتمی و یقینی فیصلہ دشوار ہو"۔۔۔۔

گو کہ آپ نے جس پیرائے میں یہ بات کہی ہے وہ بھی ایک لطیف تسامح سے خالی نہیں۔ فیصلہ دشوار ہونے کو آپ نے احتیاط کی وضع اور تعریف میں داخل کر دیا حالانکہ اصول فقہ میں اس کا ذکر ایک شرط کی حیثیت سے ہے۔ یعنی احتیاط پر عمل اس وقت واجب ہے جب دلائل متضارب ہوں اور کسی جانب کا تعین دشوار ہو جائے۔ شرطِ شئے خود شئے سے جداگانہ ہوا کرتی ہے مگر آپ تسامحاً شرط ہی کو عین شئے قرار دے رہے ہیں۔ دوسرے "حتمی و یقینی" کے الفاظ بھی مبالغے سے خالی نہیں۔ جزم و یقین تو نصوص سے حاصل ہوا کرتا ہے۔ ذیلی قوانین کی بنیاد ظنِ غالب پر ہے اور ظنِ غالب ہی کا دوسرا نام ترجیح ہے۔ احتیاط پر عمل ہرگز واجب نہیں ہوتا اگر مسئلہ کی ایک جانب معین کرنے کے لئے ظنِ غالب میسر آجائے۔

مگر ان باریکیوں سے قطع نظر کر لیجئے تب بھی یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ عمل بالاحتیاط کے لزوم کی جو تین مثالیں آپ نے فیصلہ دشوار ہونے کے ذیل میں پیش کی ہیں وہ میرے کسی دعوے کی تردید نہیں کرتیں نہ خود آپ کے دعوے کے مؤید ہیں۔ میں نے اپنے مضمون میں یہ کہا تھا کہ احتیاط پر عمل واجب ہونے کا فقہی اصول اتنا غیر محدود نہیں ہے کہ قانونی بحث میں بھی کارآمد ہو سکے۔ اس معروضے کو یا تو آپ نے پوری طرح سمجھا نہیں یا سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ اس سے بلا ریب یہ واضح ہے کہ بعض حدود و قیود کے ساتھ میں بھی احتیاط پر عمل کرنے کو واجب تسلیم کرتا ہوں لیکن بلا قید ہمیشہ احتیاط پر عمل واجب ہونا درست نہیں۔ اب آپ جو مثالیں پیش فرما رہے ہیں ان میں عمل بالاحتیاط کا لزوم اس شرط کے پائے جانے کی وجہ سے ہے جسے میں اوپر فقہاء کے الفاظ میں بیان کر آیا ہوں۔ یعنی دلیل ترجیح کا معدوم ہونا' حالانکہ امثلہ آپ کو ایسی پیش کرنی چاہیئے تھیں جن میں دلیل ترجیح پائے جانے کے باوجود احتیاط پر عمل واجب ہو رہا ہو۔

ذرا غور کیجئے۔ ایک زیور میں ایک تولہ سونا ہے اور دو تولہ کھوٹ۔ اب احتیاط کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس ایک تولہ سونے کو سونا ہی مانا جائے لیکن چونکہ کھوٹ کا غالب ہونا دلیلِ ترجیح ہے اس لئے شرعی قانون احتیاط کو نظر انداز کر کے فیصلہ دیتا ہے کہ یہ زیور سونے کا نہیں ہے اور اسکے مغلوب سونے کو زکوٰۃ کا پابند نہیں کیا جائے گا۔ لیکن ایک صورت وہ ہے جسے آپ نے مثال میں پیش کیا۔ یعنی سونا اور کھوٹ بالکل برابر برابر ہوں تو اس وقت کوئی قانونی دلیل ترجیح کی نہیں پائی جاتی اس لئے احتیاط پر عمل واجب ہوگا اور زیور کو سونے کا شمار کیا جائے گا۔ اسی طرح آپ کی پیش فرمودہ دوسری امثلہ میں مجرد احتیاط فیصلے کی بنیاد نہیں ہے، بلکہ وجہ ترجیح معدوم ہونے کی بناء پر وجوب احتیاط کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ تعجب ہے آپ ان لطیف فروق کو نہیں محسوس فرماتے حالانکہ فقہ تو تمام تر اسی دقتِ نظر کا ثمرہ ہے ورنہ جہاں صریح نصوص موجود ہوں وہاں تفقہ کی کیا ضرورت پیش آئے گی۔ ذرا سوچیئے تو قرآن نے حکم دیا:- وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ احتیاط کا کھلا تقاضا یہ تھا کہ جب اللہ سر کے مسح کا حکم دے رہا ہے تو وضو میں پورے ہی سر کا مسح کیا جائے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ احناف اس احتیاط کو واجب نہیں مانتے، بلکہ دلائل ترجیح مل جانے کے باعث محض چوتھائی سر کے مسح کو ضروری قرار دیتے ہیں حالانکہ قرآن نے ربع یا نصف سر کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے واضح ہوا کہ معتد بہ وجہ ترجیح مل جانے کے بعد احتیاط پر عمل واجب نہیں ہوتا، بلکہ ایک واضح قانون طے پا جاتا ہے۔ طول کے خوف سے مزید مثالیں نہیں دیتا ورنہ آپ جانتے ہیں ایسی مثالوں کی کمی نہیں۔ ایک دلچسپ تخالف آپ کے رشحات میں اور بھی ہے۔ آپ نے فرمایا:-

"میں تو یہ جانتا ہوں کہ عبادات میں احتیاط کا لفظ دو موقعوں پر استعمال کیا جاتا ہے ایک یہ کہ کسی چیز کے بارے میں کوئی حتمی و یقینی فیصلہ دشوار ہو"

اور دوسرا یہ کہ :-

"اختلاف فقہاء سے بچکر عمل کرنا بہتر سمجھا جائے"......

پہلے "موقع" پر تو ابھی میں نے گفتگو کی۔ دوسرے موقع کے بارے میں عرض ہے کہ "بہتر" اور "واجب" میں بہت فرق ہے یہ تو آپ نے خود ہی اپنے دعوے کی تردید کر دی۔ آپ دعویٰ یہ کر رہے ہیں کہ عبادات میں احتیاط پر عمل بلا قید واجب ہے۔ پھر اختلاف فقہاء سے بچ کر عمل کرنے کو احتیاط بھی مان رہے ہیں تب تو یہ عمل واجب ہونا چاہئے تھا نہ کہ صرف بہتر۔ وقت ظہر کی جو مثال آپ نے پیش فرمائی ہے اس کا بھی یہی معاملہ ہے۔ آپ نے کہا:-

"امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک فئ زوال کے سوا دو مثل تک ظہر کا وقت ہے اور دیگر ائمہ کے نزدیک ایک مثل تک۔ علماء فرماتے ہیں کہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ایک مثل کے اندر ظہر کی نماز ادا کر لی جائے۔" (ص ۲۹ سطر ۲)

بجا لیکن کیا ائمہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ احتیاط واجب ہے؟ بحر الرائق اور شامی وغیرہ میں تو وجوب کا فیصلہ نہیں دیا گیا۔ خود آنجناب بھی واجب کی بجائے "بہتر" فرما رہے ہیں۔ تو صریحاً یہ دعویٰ ٹوٹ گیا کہ احتیاط پر ہر حال میں عمل واجب ہے

اور میں کہتا ہوں کہ اگر ایک مثل کے اندر ظہر پڑھ لینے کا وجوب مان بھی لیں تو اس کی بناء اس اصول پر نہیں ہوگی کہ مطلقاً احتیاط پر عمل واجب ہے، بلکہ اس پر ہوگی کہ دلائل کے ٹکراؤ نے اسباب ترجیح غائب کر دیئے ہیں۔ ٹکراؤ کی تفصیل یہ ہے کہ ایک طرف تو کتب مشہورہ میں امام صاحبؒ کا مذہب دو مثل کا پایا جاتا ہے مگر دوسری طرف ایک مثل کی بھی روایت ان کی طرف منسوب ہے، اور اس روایت کو قیاسی تقویت یوں پہنچی ہے کہ ان کے خصوصی تلامذہ قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ دونوں اسی روایت کے مطابق رائے رکھتے ہیں اور زیلعیؒ نے جو فقہائے احناف میں خاصے ممتاز ہیں اسی کا قول کیا ہے۔

لہٰذا آراء کے اس تصادم کے باعث جو فقہاء ترجیح سے عاجز ہوں وہ بشوق کہہ سکتے ہیں کہ یہاں احتیاط پر عمل واجب ہے۔

ایک اور بات دیکھئے ـــــ وضو میں پورے سر کا مسح آیتِ قرآنی کے پیش نظر تو احتیاط میں داخل تھا ہی اختلافِ ائمہ سے بچنے کے لئے بھی احوط ہے۔ مالکیہ اور حنابلہ پورے ہی سر کے مسح کو واجب قرار دیتے ہیں پھر آخر کیوں احناف اس دوہری احتیاط کو بھی واجب نہیں مانتے جب کہ آپ مجرد احتیاط کو ہر حال میں واجب قرار دے رہے ہیں۔ میرے پاس تو اس کا صاف سا جواب موجود ہے ہی کہ دلائل ترجیح مل جانے کے بعد قانون بنانے میں احتیاط کا لحاظ نہیں ہوا کرتا مگر آنجناب کے پاس کیا جواب ہے جبکہ آپ احتیاط کو ہر حال میں واجب العمل ماننے پر مصر ہیں۔

میری دی ہوئی احتیاط کی مثالوں پر آپ کو حیرت ہوئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ زیادہ گہرے جانا پسند نہیں کرتے۔ شاید اسی لئے آپ نے یہ بھی فرمایا کہ:-

"یہ بات پہلی دفعہ معلوم ہوئی..." صفحہ ۳۸ سطر ۱

مکرم دوست! ذرا یکسو ہو کر سوچئے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اعضائے وضو کو تین بار سے زائد دھونا احتیاط کے دائرے میں نہیں آتا۔ خصوصاً گھنی داڑھی والے چہرے اور خاک آلود پیروں کو دھونے میں تو صریحاً احتیاط یہی کہلائے گی کہ گنتی کا لحاظ کئے بغیر انھیں اتنی بار دھویا جائے کہ اچھی طرح دھل جانے پر طبیعت مطمئن ہو جائے لیکن جب سنت سے تعیین و ترجیح کی مضبوط وجہ فقہاء کو مل گئی تو انھوں نے اس احتیاط کو واجب تو کیا مستحسن بھی نہیں مانا بلکہ کراہت کے خانے میں رکھ دیا (گو کہ عاجز کو کراہت کے اطلاق میں بھی کلام ہے مگر یہ جداگانہ بحث ہے۔)

اور آگے بڑھئے۔ مجھے تعجب اس پر ہوا ہے کہ جب آپ نے اپنے پچھلے مضمون میں فتح القدیر اور در مختار کی وہ عبارتیں خود ہی نقل فرما دی تھیں جن میں کھوٹے سکوں کے ...

ذدسرے موجود سونے میں ضم کرنے کی تصریح ہے اور اس کے وجود آپ کے مضمون کا تعقب کرتے ہوئے میں نے یہ دعویٰ کیا کہ گوٹے ٹھپے کی مغلوب چاندی سونے کو دوسرے قلیل از نصاب سونے چاندی میں ضم کرنے کا اشارہ تک مسالک حنفیہ میں نہیں ... تو آپ کو قدرتاً یہ سمجھ لینا چاہئے تھا کہ میں ایک مخصوص ترین صورت کی بات کر رہا ہوں اور اس سمجھنے کے لئے میری تفصیلی گفتگو بھی راہ نما تھی جس میں نے بتایا تھا کہ کھوٹے سکوں میں پائے جانے والے چاندی سونے یا ظروف اور کتابوں پر بصورت نقش پائے جانے والے سونے چاندی میں اور ایک غریب گھرانے کے تھوڑے سے گوٹے ٹھپے میں پائے جانیوالے سونے چاندی میں لطیف فرق ہے۔ مگر افسوس آپنے ان نزاکتوں کو نظر انداز کرکے ایک سطحی نظر میری معروضات پر ڈالی اور حقارت آمیز تحیّر کا اظہار کرتے ہوئے پھر سے فتح القدیر اور درمختار کی وہی پہلی عبارتیں نقل کردیں۔ یہاں تک کہ یہ سمجھتے ہوئے، الفاظ بھی آپ بلا تکلف لکھ گئے:۔

"نیتوں کا حال تو خدا جانتا ہے، لیکن حیرت ضرور ہوتی ہے" صفحہ ۴۳ سطر ۱۹

اس طرزِ عمل سے مصرح ہوتا ہے کہ آپ اس تعمق، ژرف نگاہی اور امعان کو نظر انداز کررہے ہیں جو فقہائے مجتہدین فقہ کی درایت وتفکیر میں اختیار کرتے تھے۔ خصوصاً امام اعظمؒ اور ان کے تلامذہ کا تو طرۂ امتیاز ہی دقیقہ سنجی اور باریک بینی رہا ہے۔ پھر اس کی طرف بھی آپ کی توجہ مبذول نہیں ہوئی کہ فقہ کے اصول ومصادر میں ایک عظیم اصل ومصدر استحسان بھی ہے۔ میں اپنی تحریروں میں مکتبی مباحث اور درسی اصطلاحات سے عموماً پرہیز کرتا ہوں کیونکہ انھیں ہضم کرنا اکثر قارئین کے لئے دشوار ہے۔ اسی لئے تجلی والے رشحات میں استحسان کا ذکر نہیں چھیڑا لیکن اب جبکہ آنجناب میری معروضات سے مطمئن نہیں ہوسکے ہیں مجبوراً اس رُخ سے بھی کچھ کہنے کی اجازت چاہوں گا۔

آپنے پہلے ظروف اور کتابوں کے نقش ونگار کو بطور نظیر پیش کیا تھا اور اب بہشتی زیور سے دو نظیریں نقل کی ہیں۔

اس کے بعد آپ ماہر کے اس طرزِ عمل کو "عجیب وغریب" (صفحہ ۴۴) قرار دیتے ہیں کہ وہ زیرِ بحث جزئیے میں ان نظائر کے خلاف فیصلہ دے رہا ہے۔ آپ کی یہ روش بداہتاً اس حقیقت کی طرف مشیر ہے کہ قانون شریعت کے ایک اہم بالشان سرچشمے استحسان کو آپ مستحضر نہیں رکھ سکے ہیں ورنہ استحسان تو نام ہی اس کا ہے کہ قیاس جلی کو چھوڑ کر قیاس خفی یا مصالح مرسلہ کے تحت کسی مسئلے کے حکم کو اس کے نظائر سے کاٹ دینا۔ اصول فقہ کی تمام کتابوں میں اس طرح کی عبارتیں موجود ہیں:۔۔۔ العدول فی مسئلۃ عن مثل ما حکم بہ فی نظائرھا۔۔۔ یا ۔۔۔ قطع المسئلۃ عن نظائرھا بما ھو اقویٰ ۔۔۔ یا ۔۔۔ العدول عن قیاس الیٰ قیاس اقویٰ ۔۔۔ یا ۔۔۔ الاستحسان ترک القیاس والاخذ بما ھو اوفق للناس۔ علمائے احناف کے یہاں امام کرخیؒ کی تعریف زیادہ مقبول ہے جو یہی تو ہے کہ کسی خاص مسئلے میں اس کے امثال ونظائر کے مطابق فیصلہ نہ کرنا بلکہ کسی سبب قوی کی بناء پر خواہ وہ صورتاً کتنا ہی خفی اور مکنون ہو امثال ونظائر سے مختلف حکم لگانا۔ اگر یہ سب آپکو مستحضر ہوتا تو ماہر کی اس حرکت کو "عجیب وغریب" نہ قرار دیتے کہ وہ ایک مسئلے میں اس کی نظیروں کے خلاف حکم لگا رہا ہے۔

آپ کو یاد ہونا چاہئے کہ امام مالکؒ استحسان کو علم کے دس درجوں میں سے نو درجوں کے مساوی قرار دیتے ہیں اور ہمارے امام عالی مقام تو اس باب میں نمایاں امتیاز کے مالک ہیں ہی۔ حتیٰ کہ ان کے جو شاگرد قیاسی مسائل میں ان سے برملا اختلاف کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے وہ بھی اس مسئلے میں اختلاف سے دست کش ہوجاتے تھے جس کے بارے میں امام صاحبؒ فرمادیں کہ یہ میں استحساناً کہہ رہا ہوں۔

پھر یہ بھی آپ جیسے صاحب بصیرت کو معلوم ہوگا کہ استحسان معاذ اللہ کوئی خلاف دین چیز نہیں ہے جیسا کہ امام شافعیؒ اور بعض دیگر علماء نے تسامحاً ایسا سمجھ لیا ہے بلکہ وہ تو ایک قوی اور مقدس اصل ہے جو قرآن وسنت ہی سے مستفاد

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ) وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (الحج) خیر دینکم الیسر (الحدیث) يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا (الحدیث) یہ استحسان ہی تو ہے کہ بلی اور چھوٹے شکاری پرندے کا جھوٹا ناپاک نہیں ہوتا حالانکہ اصولاً یہ درندے ہیں اور قیاس جلی ان کے جھوٹے کو ناپاک قرار دینے کے حق میں ہے۔ یہ استحسان ہی تو ہے کہ دو روٹیاں قرض لینے کے بعد آپ انھیں ایسی دو روٹیوں سے ادا کر دیں جو وزن میں کچھ زائد ہوں اور ربوٰ لازم نہ آئے حالانکہ قیاس جلی اس معاملہ کو ربوٰ کے خانے میں رکھتا ہے۔ یہ استحسان ہی تو ہے کہ بیع سلم جائز مان لی گئی اور صناعوں کو ساتی دیکر ایسی چیز کا سودا مباح قرار پایا جس کا ابھی وجود ہی نہیں حالانکہ قیاس جلی اسے بیع فاسد گرداننے کا متقاضی ہے۔ یہ استحسان ہی تو ہے کہ بھولے سے کھا لینے پر روزہ نہیں ٹوٹتا حالانکہ قیاس جلی ٹوٹنے کا طالب ہے۔ یہ استحسان ہی تو ہے کہ حوض اور کنوئیں ناپاک ہونے کے بعد پانی کی ایک جزوی مقدار نکال دینے سے پاک ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ قیاس چاہتا ہے کہ وہ ہرگز پاک نہ ہوں۔ یہ استحسان ہی تو ہے کہ کبوتروں کی بیٹ براز کے عام حکم سے جدا حکم رکھتی ہے حالانکہ قیاس اس امتیاز کا مؤید نہیں۔

تو میرے محترم اس غریب گھرانے کے حق میں ہم استحسان کا برتاؤ کیوں نہیں کر سکتے جس کے پاس نصاب سے کم زیور ہے۔ اور تھوڑا سا سچا گوٹہ۔ زکوٰۃ مالی مسئلہ ہے۔ لہٰذا غربت و امارت کے فرق کو اس کے گوناگوں معاملات میں ملحوظ رکھنا ہی ہوگا۔ عاجز اپنے تجلی والے مضمون میں کھول کر بتا چکا ہے کہ برتنوں یا کتابوں یا کھوٹے سکوں میں پائے جانے والے سونے چاندی کے مقابلے میں سچے گوٹے کی حیثیت کیوں جداگانہ ہے اور یہ کہ جو "نقدیت" سونے اور چاندی میں مناطِ حکم مانی گئی ہے وہ بھی اس میں اتنی کمزور ہے کہ اسے اگر عملاً "نقد" بنایا جائے تو قیمتِ خرید کا نصف بھی وصول نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں کونسا شرعی مانع ہے کہ ہم استحسان سے کام نہ لیں اور اس خاص جزئیے کے حکم کو اس عمومیت سے کاٹ نہ دیں۔

بعض فقہاء استصلاح (مصالح مرسلہ کی بنا پر فیصلے دینے) اور استحسان کو دو جداگانہ مصادر کی حیثیت سے ذکر کرتے ہیں لیکن میں جہاں تک سمجھا ہوں یہ ایک ہی سرچشمے کے دو سوتے اور ایک ہی عمارت کے دو دروازے ہیں۔ ہر حالت میں زیر بحث جزئیے کو اس زاویۂ نظر سے دیکھنا جس سے میں دیکھ رہا ہوں استحسان و استصلاح دونوں سے ہم آہنگ ہے۔ استصلاح کیلئے علمائے اصول نے جو حدود و شرائط مقرر کئے ہیں ان پر میں اپنے مقدور بھر نظر ڈال چکا ہوں مجھے تو کوئی قید و شرط ایسی نظر نہیں آئی جس کی رو سے اس جزئیے میں استصلاح سے فائدہ اٹھانا مردود قرار پائے۔ اگر یہ میری کوتاہ نظری ہے تو آپ بلا تکلف اس پر رد و قدح کر سکتے ہیں۔

اور غلط فہمی نہ رہے کہ ان نکتہ سنجیوں کا مقصود اپنے مجتہد ہونے کا ادعا ہرگز نہیں ہے۔ اگر فقہائے عظام اس خاص جزئیے میں کوئی فیصلہ دے گئے ہوتے تو اور بات تھی لیکن جب مجھے اور آپ کو ایسا کوئی فیصلہ نہیں ملا تو کیوں نہ ہم اپنے ائمہ جلیل کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دقّت نظر اور عرق ریزی سے کام لیں اور کس لئے سخت گیر و متشدد بن جائیں۔ مان لیجئے آپ اس باریک بینی سے متفق نہیں تو آپ کو حق ہے کہ اپنے فیصلے پر جمے رہیں اور اسی کے مطابق فتویٰ دیا کریں لیکن یہ آپ کو حق نہیں کہ آپ ان لوگوں کا سا رویّہ اختیار کریں جنہوں نے ائمۂ کرام کو تعریفاً نہیں بلکہ طنزاً اہل الرائے کہہ کہہ کر مطعون کیا تھا اور آج بھی کرتے ہیں۔

تفصیلات سے پرہیز کرتے ہوئے یہ چند صفحات کا عریضہ پیش کر دیا ہے زندگی میں شائع فرما دیں اور آپ کو اختیار ہے کہ تردید یا تائید میں جو چاہیں لکھیں۔ بس اتنا ملحوظ رہنا چاہیے کہ طیش اور خفگی کا نہ ہو۔ دقیق علمی مباحث ٹھنڈے دل و دماغ کے متقاضی ہیں۔

خدا کرے آنجناب بہ ہمہ وجوہ خیریت سے ہوں۔

فقط۔ والسلام

آپ کا مخلص عامر عثمانی

نوٹ (مدیر زندگی)

قارئین زندگی واقف ہیں کہ گوشے کی زکوٰۃ کے مسئلے پہ زندگی ماہ جنوری ۱۹۶۳ء میں اپنی دوسری تحریر کو ختم کرتے ہوئے اس بحث کو میں نے درج ذیل جملے لکھ کر بند کر دیا تھا۔

"جہاں تک افہام و تفہیم کا تعلق ہے میرے نزدیک بات واضح ہو چکی اس لئے اب راقم الحروف اپنی طرف سے یہ بات ختم کرتا ہے۔"

اس دوسری تحریر کے بارے میں برادر محترم مولانا عامر عثمانی نے تجلی کے بجائے زندگی کے صفحات میں کچھ ارشاد فرمانا مناسب سمجھا۔ چنانچہ موصوف کا مکتوب گرامی جوں کا توں شائع کر دیا گیا ہے۔ میں زیر بحث مسئلے میں اپنا موقف واضح کر چکا ہوں اس لئے اس مکتوب کے جواب میں کوئی مضمون نہیں لکھنا ہے۔ اس کی ضرورت اب یوں بھی ختم ہو گئی ہے کہ اس مکتوب میں موصوف نے تسلیم فرما لیا ہے کہ زیر بحث مسئلے میں راقم جو کچھ کہہ رہا ہے قواعد فقہ حنفی کے قیاس کا تقاضا وہی ہے۔ راقم نے اپنی دو تحریروں میں یہی بات تو ثابت کی ہے اور کیا کیا ہے ــــ موصوف نے اب جو اصول استحسان کا سہارا لیکر اپنے موقف کو صحیح قرار دیا ہے تو میں اس کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ البتہ ایک بات تو برادر موصوف کی خدمت میں یہ عرض کرنی ہے کہ آپ نے میرے مضمون کا جواب تجلی میں شائع کیا تھا اس لئے میرے بارے میں اور نفس مضمون کے بارے میں غلط فہمیاں قارئین تجلی کو ہوئی ہوں گی اس لئے اپنے اس مکتوب کو جوں کا توں تجلی میں بھی شائع فرما دیں۔ کیونکہ تجلی کے بہت سے قارئین نے میرا مضمون نہیں پڑھا ہوگا اور وہ غلط فہمیوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ آپ کی ایک ضمنی بات پر چند لفظ اور عرض کرنا چاہتا ہوں ــــ آپ نے زیر بحث مسئلے کے ذیل میں اپنے فقہی مطالعہ کی وسعت کا جو اظہار فرمایا ہے اور تقلیدی جمود کی جو نفی کی ہے وہ اپنی جگہ صحیح ہو گی لیکن پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ کے مسئلے میں موجودہ دور کے دو علماء اور موجودہ دور کی ایک کتاب فتاویٰ کی شہادتیں پیش کرتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا ہے:۔

"ہم نہیں جانتے کہ ان شہادتوں کے بعد ہم مقلدین کے لئے نزاع و اختلاف کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے ــ لیکن اگر آپ تقلید کو پسند نہ کریں تب بھی ہم جتنا کچھ عرض کر آئے ہیں وہ آزاد بحث کی سطح پر ہمارے موقف کی تائید کے لئے کافی ہے۔" تجلی ۱۹۶۲ء ص۔

بڑے ادب سے عرض ہے کہ مکتوب گرامی کی بلند پروازی اور اس عبارت میں حقیر کو کوئی مناسبت نظر نہ آئی۔ بہرحال اتنا عرض کرنا شاید نامناسب نہ ہو کہ یہ بات راقم الحروف کی افتاد مزاج سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتی کہ کہیں وہ ابن الہمام اور ابن عابدین کو بھی ہیچ سمجھے اور کہیں موجودہ دور کے عالموں کو یہ درجہ دے دے کہ کسی مسئلے میں ان کے فتوے کے بعد نزاع و اختلاف کی گنجائش بھی باقی نہ رہے۔

آخر میں ایک بات قارئین زندگی کی خدمت میں عرض کرنی ہے۔ میں نے جنوری ۱۹۶۳ء میں "زکوٰۃ کا ایک جزئیہ" کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس کی شق ۳ میں "احتیاط" کے سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسے ایک بار پھر پڑھ لیں اور اس کے بعد دیکھیں کہ میں نے وہاں کیا بات کہی ہے، کس ذیل میں کہی ہے اور موصوف اس کے جواب میں کیا کچھ ارشاد فرما رہے ہیں۔ نیز وہ یہ بھی تلاش کریں کہ میں نے کس جگہ یہ دعویٰ کیا ہے کہ "عبادات میں احتیاط پر عمل کرنا بلا قید واجب ہے"۔ دعویٰ ہی نہیں کیا بلکہ میں اس کو ماننے پر مصر بھی ہوں۔ میں نے خود تلاش کیا لیکن مجھے اپنا یہ دعویٰ کہیں نہ ملا۔ برادر موصوف نے میری طرف جو بات منسوب کی ہے اس پر میں اظہار حیرت کر سکتا، لیکن اب یہ بھی نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اس کو اپنی تحمیق و تجہیل پر محمول فرماتے ہیں۔ (سید احمد قادری)

تجلی

جن لوگوں نے اس بحث کو تجلی میں دیکھا ہے انھیں معلوم ہے کہ عامر عثمانی فقہ حنفی سے ہٹ کر کچھ ثابت کرنے کے در پے

نہ تھا بلکہ جس جزئیے میں گفتگو ہے وہ چونکہ کتب فقہ میں نہ اسے مل سکا نہ مدیر زندگی کو۔ اس لئے ان دونوں کو اس کی تخریج کی ضرورت پیش آئی کہ اس جزئیے کا فیصلہ کیا ہونا چاہئے۔ عامر عثمانی اپنے ناقص علم و فہم کے تحت جس نتیجے پر پہنچا مدیر زندگی کا نتیجۂ فکر اس سے مختلف تھا لہٰذا بات آگے بڑھی اور وہ دونوں اپنے اپنے طور پر یہ واضح کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ فقہ حنفی کی رو سے اس جزئیے کا حکم کیا ہونا چاہئے گویا یہ دونوں نتیجے اور فیصلے میں ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود فقہ حنفی کے اصول و قواعد کو مصدر و مبنیٰ بنانے اور انھی پر اپنے فکر و قیاس کی عمارت اٹھانے میں شروع سے متفق تھے۔ لہٰذا مدیر زندگی کا اب یہ فرمانا عجیب سا معلوم ہوتا ہے کہ:۔

"اس مکتوب میں موصوف نے یہ تسلیم فرمالیا ہے کہ زیر بحث مسئلہ میں راقم جو کچھ کہہ رہا ہے قواعد فقہ حنفی کے قیاس کا تقاضا وہی ہے۔ راقم نے اپنی دو تحریروں میں یہی بات تو ثابت کی ہے اور کیا کیا ہے"۔

یہ ارشاد تو اس وقت موزوں ہوتا جب کہ عامر عثمانی نے ابتداء میں فقہ حنفی کو اساس و مبنیٰ ماننے سے انحراف کیا ہوتا اور اب پہلی بار اس مکتوب میں اس انحراف سے رجوع کرتے ہوئے فقہ حنفی کی قیادت تسلیم کی ہوتی۔ لیکن جب کہ عامر عثمانی ہمیشہ ہی سے فقہ حنفی کا مقلد ہے اور اس بحث کے کسی بھی مرحلے میں اس نے یہ نہیں کہا کہ وہ فقہ حنفی کے اصول و قواعد کی پروا نہیں کرتا تو یہ کہنا عجیب ہی سا ہے کہ "اس مکتوب میں موصوف نے یہ تسلیم کرلیا ہے"۔

علاوہ ازیں ذرا سی گذارش ہم اس طنز کے بارے میں بھی ضروری خیال کرتے ہیں جو مدیر زندگی نے بایں طور فرمایا ہے کہ ایک طرف تو عامر عثمانی ابن الہمامؒ اور ابن عابدینؒ کو بھی ہیچ سمجھتا تھا اور دوسری طرف موجودہ دور کے عالموں کو یہ درجہ دیتا ہے کہ کسی مسئلہ میں ان کے فتوے کے بعد نزاع و اختلاف کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔

یہ طنز مدیر زندگی کے شایانِ شان نہیں۔ ایسا طنز اس شخص کو زیب دیتا تھا جو مختلف مسائل کے لطیف و نازک فروق کو سمجھنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو۔ جس صورتِ حال کو مدیر زندگی طنز و تحیّر کی بنیاد قرار دے رہے ہیں اس میں فی الحقیقت ایسی کوئی بنیاد موجود نہیں، کیونکہ ہمارے دونوں رویوں کا تعلق دو جداگانہ مسئلوں سے ہے نہ کہ ایک مسئلے سے۔ ایک مسئلہ تو یہی تھا جس پر یہ مذاکرہ ہوا ہے اس کے بارے میں علمائے احناف کا کوئی واضح فتویٰ نہ ہمیں ملا نہ مدیر زندگی کو اسلئے قیاس و استنباط کی راہ اختیار کرنی پڑی۔ قیاس و استنباط کے دوران اگر ہم ابن الہمام اور ابن عابدین پر انحصار کرنے کے عوض ان سے اونچے درجے کے ائمہ سے استفاضہ کریں اور طبقاتِ عُلیا کے فقہاء کی آراء کو اپنا مستدل بنائیں تو یہ کہنا ہرگز بجا نہ ہوگا کہ ہم نے موجودہ دور کے علمائے احناف سے انحراف کیا ہے نہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ابن الہمام اور ابن عابدین کو ہیچ سمجھا ہے۔

دوسرا مسئلہ فنڈ کی زکوٰۃ کا تھا۔ اس کے بارے میں علمائے احناف کے فتوے چونکہ میسر آگئے اس لئے پہلے مسئلے میں اختیار کی ہوئی روش کو چھوڑ کر ہم نے تقلید کی روش اختیار کرلی تو آخر کیا تضاد یا کیا "نامناسبت" پائی گئی ان دونوں روشوں میں۔ طنز پردازی کا طعن تو جب درست ہوتا جب کہ پہلے مسئلے میں ابن الہمام یا کسی اور حنفی عالم کا واضح فتویٰ موجود ہوتا اور ہم اسے ناقابلِ لحاظ قرار دیتے ہوئے اپنے اجتہاد کا مظاہرہ کرتے۔ مگر جب ایک مسئلے میں صریح فتویٰ نہیں مل رہا ہے تو تقلید کا تقاضا اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ ائمۂ احناف کے طرزِ فکر تک پہنچا جائے اور اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق استخراج و استنباط سے کام لیا جائے۔

ویسے ہم کسی اور کو اس کا پابند نہیں بناتے کہ وہ حنفی علماء کے فتوے کو لازماً حجت مانے اور اپنی اختلافی آراء سے دست بردار ہوجائے۔

آخری گذارش ہم "دیر زندگی" کے نوٹ کے آخری حصے پر کرتے ہیں۔

وہ قارئین کو یہ تلاش کرنے کی دعوت دے رہے ہیں کہ:۔

"میں نے کسی جگہ یہ دعویٰ کیا ہے کہ "عبادت میں احتیاط پر عمل کرنا بلا قید واجب ہے۔"

جن حضرات نے پورے مذاکرے کا مطالعہ نہیں کیا ہے وہ موصوف کے ان الفاظ سے یقیناً یہی گمان کریں گے کہ عبادات میں احتیاط پر عمل کرنے کی بات موصوف نے بعض قیود و شرائط کے ساتھ کہی ہوگی مگر عامر عثمانی نے ان قیود و شرائط کو نظر انداز کر کے غلط طور پر ان کی طرف اس دعوے کی نسبت کر دی کہ "عبادت میں احتیاط پر عمل بلا قید واجب ہے"

یا للعجب۔ یہ کیسا لطیفہ ہے جو مدیر زندگی نے پیدا کیا ہے۔ سب سے پہلا مضمون انھوں نے اس مذاکرے کا ستمبر ۶۲ء کے زندگی میں شائع فرمایا تھا۔ اس میں صفحہ ۵ سطر ۱۹ و ۲۰ میں ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اور وہ (عامر عثمانی) بعض جلیل القدر فقہائے احناف کے اس قول سے واقف ہوں گے کہ عبادت میں احتیاط واجب ہے۔"

اس فقرے پر انھوں نے پیرا ختم کر دیا تھا اور دوسری بات شروع کر دی تھی۔ جس کا جی چاہے اٹھا کر دیکھ لے اس سے قبل یا بعد انھوں نے صراحتہً تو کیا اشارۃً بھی کوئی بات ایسی نہیں کہی جس سے پتا چلے کہ عبادات میں احتیاط پر عمل واجب ہونے کے لئے ان کی نگاہ میں کوئی قید و شرط بھی ہوا کرتی ہے۔

پھر جب تجلی میں ہم نے جوابی مضمون شائع کیا تو اس پر تعقب انھوں نے جنوری ۶۳ء کے زندگی میں سپرد قلم فرمایا۔ اس میں بھی انھوں نے عبادات میں احتیاط پر عمل واجب ہونے کے فقہی قاعدے کو نہ صرف دہرایا بلکہ اس پر خاصا زور دیا اور مثالیں بھی پیش کیں۔ لیکن کسی قید و شرط کا قطعی ذکر نہیں کیا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

"واجب بہر حال ایک قانونی لفظ ہے اور جب وہ (فقہاء) عبادات میں احتیاط کو واجب قرار دیتے ہیں تو یہ ٹھیٹ قانونی مسئلہ بن جاتا ہے۔" (ص ۳۰)

اس سے قبل یا بعد انھوں نے کنایۃً بھی کسی شرط و قید کا ذکر نہیں کیا۔ لہٰذا یا للعجب کے سوا اور کیا کہا جائیگا جب کہ اب وہ اپنے نوٹ میں قارئین کو یہ تلاش کرنے کی دعوت دے رہے ہیں کہ میں نے عبادات میں احتیاط پر بلا قید عمل کرنے کو واجب کہاں کہا ہے۔ نہ صرف قارئین کو دعوت دی بلکہ یہاں تک فرما دیا کہ:۔

"میں نے خود تلاش کیا لیکن مجھے اپنا یہ دعویٰ کہیں نہ ملا۔"

غور کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے "بلا قید" کے الفاظ کو اپنی حیرانی کا مبنیٰ بنایا ہے۔ یعنی وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں نے "بلا قید" کے الفاظ تو کہیں نہیں لکھے۔

تو عرض یہ ہے کہ ان الفاظ کی نسبت تو خود ہم نے بھی ان کی طرف کہیں نہیں کی۔ اسی متذکرہ مکتوب میں ہم یہ جو لکھا:

"آپ دعویٰ یہ کر رہے ہیں کہ عبادات میں احتیاط پر عمل بلا قید واجب ہے۔"

تو ہر صاحب فہم دیکھ اور سمجھ سکتا ہے کہ ہم نے ان کے الفاظ نقل نہیں کئے ہیں بلکہ ان کا دعویٰ اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ الفاظ نقل کرنے کی صورت میں ہم قاعدے کے مطابق ان کے شروع و آخر میں واوین (کامے) لگاتے لیکن ایسا نہیں کیا گیا تو صاف معلوم ہوا کہ ان کے الفاظ جوں کے توں نقل نہیں کئے گئے ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ ان کے دعوے میں اپنی طرف سے "بلا قید" کا لفظ بڑھا کر ہم نے زیادتی کی ہے یا نہیں تو کسی بھی ہوشمند کو اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ جب کوئی دعویٰ مطلق صورت میں بلا قید و شرط پیش کیا جائے گا تو اس کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ فلاں دعوہ بلا قید اور غیر مشروط طور پر پیش کیا گیا ہے۔ محض اس بنیاد پر کہ ان کے دعوے کی نوعیت و کیفیت کو ہم نے "بلا قید" کے الفاظ سے مصرح کر دیا ہے ان کا یہ احتجاج کرنا کہ میں نے تو ایسا دعویٰ کہیں نہیں کیا لطیفہ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے پھر لطیفہ کی دلچسپی اس صورت حال نے اور بڑھا دی کہ موصوف ۴

۴ اظہار حیرت نہ کرتے ہوئے بھی اظہار حیرت کر گئے۔ سیاق اس پر شاہد ہے کہ تحیّر ہمارے دوست کی عادت ہے لہٰذا آئندہ ہم کبھی ان کے اظہار حیرت کو تحسین و تجہیل پر محمول نہیں کریں گے۔

فنڈ کی زکوٰۃ

ہم نے اگست ۶۲ء کے تجلّی میں پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ کے مسئلہ پر اظہار خیال کیا تھا اس کے بعد دسمبر ۶۲ء کے شمارے میں مدیر "زندگی" مولانا سید احمد عروج قادری صاحب کا ایک گرامی نامہ مع جواب اسی موضوع پر شائع کیا گیا تھا۔

فاضل مدیر نے فروری ۶۳ء کے زندگی میں اس کا تعقب فرمایا ہے۔ اتفاق کی بات ہے زکوٰۃ ہی کے ایک اور جزئیے کے سلسلے میں ہمارے اور ان کے مابین مذاکرے کا سلسلہ چل رہا ہے۔ انھوں نے اس کی بابت جنوری ۶۳ء کے زندگی میں مفصلاً اپنے خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔ اس پر ہم نے اپنا جواب ان سے اجازت لیکر زندگی ہی کو بھیجدیا ہے اور وہ غالباً مارچ کے زندگی میں شائع ہو جائے گا۔

اب فنڈ کی زکوٰۃ کے مسئلے پر ہم جواب الجواب کا سلسلہ چلانے کے عوض وہ مختصر راستہ اختیار کرتے ہیں جس کے بعد مزید بحث کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ یہ تو ہم بارہا جتلا ہی چکے ہیں کہ ہم فقہی مسائل میں فقہ حنفی کے مقلد ہیں۔ جس فقہی مسئلے میں ہمیں مستند علمائے احناف کا کوئی فیصلہ مل جاتے اس میں اپنے اجتہاد سے کام لینا ہمارا منصب نہیں کیونکہ اجتہاد بڑی چیز ہے اس کی اہلیت ہم اپنے میں نہیں پاتے۔ ضروری نہیں کہ مدیر زندگی یا اور کوئی صاحب ہماری طرح مقلد ہوں اور جن فتاویٰ کو ہم ابھی نقل کرنے والے ہیں انھیں وہ بھی حجت تسلیم کرلیں۔ اس بارے میں ہر شخص اپنی رائے کا مختار ہے۔

پہلا فتویٰ مدرسہ دارالعلوم دیوبند کے سابق مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ یہ مع استفتاء فتاویٰ دارالعلوم میں موجود ہے (جلد سوم و چہارم صفحہ ۹ تا ۱۱۔ تازہ مبوب ایڈیشن)

پراوڈنٹ فنڈ کے روپیہ وصول ہونے سے پہلے زکوٰۃ نہیں

استفتاء:۔ بعض ملازمت ہائے انگلشیہ میں ایک طرز پراوڈنٹ فنڈ کا جاری ہے۔ پراوڈنٹ فنڈ یہ ہے کہ تنخواہ ملازم میں سے ایک مقدار ہر ماہ میں کٹتی رہتی ہے اور وہ روپیہ رقم جمع ہوکر بوقت علیحدگی خود ملازم یا درصورت فوت ملازم اس کے ورثہ کو ملتا ہے۔ اس سوال میں خالص بریلی کالج فنڈ کی بحث ہے جس کے قواعد میں ابتداءً یہ تھا کہ اگر ملازم چاہے تو پانچ فی صدی اپنی تنخواہ میں سے پراوڈنٹ فنڈ میں جمع کرتا رہے۔ لیکن جب کہ ملازمین نے اس قاعدہ پر اعتراض کرکے پوری تنخواہ ماہانہ لینی چاہی تو کمیٹی منتظمہ کالج نے قاعدہ مذکورہ کے بجائے اجبار کردیا جس سے ہر ملازم کی تنخواہ میں سے ماہانہ رقم وضع ہونے لگی اور اختیار نہیں رہا کبھی وہ حالت ملازمت بجز بصورت علیحدگی یا فوت ہونے کے رقم مجرا کردہ لے سکے۔ یہ رقم مجرا شدہ وقتاً فوقتاً الٰہ آباد بینک میں ہر ملازم کے نام کے آگے تعداد رقم مجرا شدہ ششماہی اور سالانہ لکھی جانے لگی اور اس پر منافع دوسرے خانے میں لکھا جانے لگا اور تیسرے خانے میں رقم مجرا شدہ کے برابر رقم اور لکھی جانے لگی۔ کمیٹی منتظمہ مالک گورنمنٹ کا عطیہ خاص اپنی

طرف سے یہ رقم ملازم کالج کے لئے بھی ادا ہے۔ یعنی وقت علیحدگی ملازم کے مجموعہ تینوں رقم کے ملنے کا قاعدہ ہوا۔ لیکن رقم مجرا شدہ از تنخواہ کے ملنے کا وقت علیحدگی ہر حال میں وعدہ تھا اور ہے پر اپنی رقم عطیہ کے ملنے کو کمیٹی نے اس بات کے ساتھ مشروط کیا کہ وقت علیحدگی ملازم کے اول کمیٹی کیطرف سے رزیلوشن تجویز ہو گئے" آیا اس ملازم کو رقم عطیہ ملے یا نہیں۔ حکم ہونے پر رقم مذکور عطیہ ملازم کو دی جاوے گی، ورنہ نہیں۔ یہ طریقہ پنشن کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے جو بوقت پیری یا علیحدگی ملازم کو امداد دے سکے اور ساتھ میں ایک نوع دباؤ یا لالچ دلانے کی صورت بھی ہے اور ترغیب پروفیسران اور معلمانِ کالج کے لئے وفاداری گورنمنٹ کی کہ ان کا روپیہ جزو تنخواہ جو جمع ہو کر زائد رقوم ہو کر ہزاروں تک ہو کر کمیٹی کے اختیار و قبضہ میں رہتا ہے اگر وہ وفادار نہ بنیں تو ان رقوم سے ہاتھ اٹھائیں۔

بالجملہ ۱۶ اگست ۱۹۱۵ء کو ایک پروفیسر کو رقم مبلغ ایک ہزار سات سو چوّن (۱۷۵۴) روپے چودہ آنے ایک پائی مجموعہ ہر سہ مدات مذکورہ یعنی رقم مجرا شدہ از تنخواہ مبلغ چھ سو نوّے (۶۹۰) روپے و رقم سود یا منافع مذکورہ تعدادی دو سو اٹھاسی روپے دس آنے آٹھ پائی و رقم عطیہ از جانب کمیٹی مساوی رقم اول تعدادی چھ سو نوّے روپے کا بحمدہٖ تعالیٰ عطا ہوا۔ اور روپیہ پروفیسر کے ہاتھ میں آگیا۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا اس رقم پر بعد حولانِ حول زکوٰۃ اس کے ذمہ لازم و واجب ہوگی یا سر دست زکوٰۃ سنین ماضیہ کی واجب ہے؟

فتویٰ :۔

ہر سہ رقم وصول ہو جانے کے بعد حولان حول ہونے کے بعد زکوٰۃ دینا واجب ہوگا سنین ماضیہ کی زکوٰۃ کسی رقم کی بھی لازم نہ ہوگی۔ رقم منافع و رقم عطیہ پر عدم وجوب زکوٰۃ ظاہر ہے کہ ابھی ملکِ[1] مزکی ہی میں نہیں آئی اور رقم مجرا شدہ کا بھی یہی حکم ہے۔ کیونکہ ضمان مصادرہ موجود ہے اور اجبار اس کی دلیل ہے اور معرضِ سقوط میں ہونا اس کا مستبعد نہیں۔ والاصل فیہ حدیث علیؓ لا زکوٰۃ فی مال الضمار (در مختار) قولہ حدیث علیؓ کذا عزاہ فی الھدایۃ الی علیؓ ولیس بمعروف وانما ذکرہ سبط ابن الجوزی فی اٰثار الصاف عن عثمانؓ وابن عمرؓ کذا فی شرح النقایۃ لملا علی قاریؒ (شافی) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ کتبہ عزیز الرحمٰن عفی عنہ۔

دوسرا فتویٰ امداد الفتاویٰ جلد دوم مطبوعہ کراچی کے آخر میں بطور ضمیمہ طبع ہوا ہے۔ یہ پورا کا پورا نقل ہے۔

فصل در تنقیح وجوب یا عدم وجوب زکوٰۃ بر پراویڈنٹ فنڈ بنا بر داخل بودنش در دَین قوی یا ضعیف۔

سوال :۔

امداد الفتاویٰ تتمہ رابعہ صفحہ ۵۵ اور تتمہ خامسہ صفحہ ۱۰۳ میں پراویڈنٹ فنڈ کے متعلق دو فتوے متعارض ہیں، اسکی تحقیق کی غرض سے روایات کا تتبع کیا گیا تو حسب ذیل تحقیق ثابت ہوئی۔ اب ان سب میں کس کو راجح سمجھا جاوے وہ تحقیق یہ ہے :۔

(اس کے بعد دو صفحات میں فقہ حنفی کی مشہور کتب المبسوط اور بحر الرائق وغیرہ سے فقہی آراء اور اصول و قواعد نقل کئے گئے ہیں جنھیں بخوف طوالت حذف کرتے ہوئے ہم ان کے تحت سپرد قلم کیا ہوا اردو مضمون نقل کئے دیتے ہیں)

فرمایا گیا :۔

"عبارات مذکورہ بالا سے ثابت ہوا کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دیون[2] کی تین قسمیں ہیں۔ قوی۔ متوسط۔ ضعیف دَینِ قوی وہ ہے جو مال تجارت یا سونے چاندی کے بدلے کسی کے ذمہ عائد ہوا ہو اور متوسط وہ دَین ہے جو مال ہی کے بدلے میں عائد ہوا ہو مگر وہ مالِ تجارت یا نقد سونا چاندی نہ ہو، بلکہ گھر کا سامان وغیرہ ہو اور ضعیف وہ دَین ہے جو کسی مال کے بدلے میں بذمہ مدیون عائد نہیں ہوا۔ جیسے دَین مہر وغیرہ۔

---

[1] یعنی زکوٰۃ دہندہ کی ملک میں نہیں آئی۔

[2] قرضہ جات ۱۲

دَینِ قوی پر قبضہ ہونے سے پہلے بھی زکوٰۃ ہر سال واجب ہوتی رہتی ہے مگر ادا کرنا اس وقت ضروری ہوتا ہے جب چالیس درہم یا اس کی مقدار روپیہ وصول ہو جائے اس سے پہلے ادا کرنا واجب نہیں ہوتا۔ لیکن جب زکوٰۃ ادا کی جائے گی، تو تمام سنین ماضیہ کا حساب کر کے ادا کی جائے گی اور دَین ضعیف پر قبضہ ہونے کے بعد جب تک سال بھر نہ گذر جائے اس وقت تک زکوٰۃ واجب ہی نہیں ہوتی۔ اور دَین متوسط میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس پر دَین قوی کی طرح زکوٰۃ ایام ماضیہ کی بھی واجب ہوگی مگر ادا کرنا محض چالیس درہم کی وصولیابی پر لازم نہیں ہوگا، بلکہ پورا نصاب یعنی دو سو درہم یا ساڑھے باون تولے چاندی جب وصول ہو اُس وقت ادا کرنا لازم ہوگا۔ مگر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ بھی ادا کرنا ہوگی۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ دَین متوسط بھی دَین ضعیف کے حکم میں ہے، اس پر بھی زکوٰۃ ایام ماضیہ کی واجب نہیں ہے، بلکہ دَین وصول ہونے کے بعد جب سال بھر اس پر گذر جائے تب زکوٰۃ واجب ہوگی اور صاحب بدائع نے اسی آخری روایت کو اصح قرار دیا ہے۔

لہٰذا خلاصہ امام اعظمؒ کے مذہب کا یہ ہوا کہ (۱) جو دَین کسی مالِ تجارت یا سونے چاندی کے عوض میں کسی شخص کے ذمہ واجب ہوا ہے (جس کو دَینِ قوی کہا جاتا ہے) اس پر تو ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب ہے مگر ادائیگی اس وقت لازم ہوگی جب بقدر چالیس درہم کے وصول ہو جائے۔ اور (۲) جو ایسے مال کے عوض میں نہ ہو۔ خواہ بالکل کسی چیز کا معاوضہ ہی نہ ہو جیسے حصہ میراث و وصیت یا معاوضہ تو ہو مگر مال کا معاوضہ نہ ہو جیسے دَین مہر (اس کو اصطلاح میں دین ضعیف کہتے ہیں) اس میں ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں، بلکہ قبضہ ہونے کے بعد جب سال بھر گذر جائے اس وقت زکوٰۃ لازم ہوگی۔ (۳) یا معاوضہ مال بھی ہو مگر مال تجارت کا معاوضہ نہ ہو جیسے گھریلو سامان کا معاوضہ (جس کو دَین متوسط کہا جاتا ہے) اس صورت میں بھی اصح الروایتین کے مطابق امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک زکوٰۃ ایام ماضیہ کی واجب نہیں ہے۔ بلکہ وصول ہونے کے بعد جب اس پر سال بھر گذر جائے اس وقت زکوٰۃ واجب ہوگی اور ادائیگی زکوٰۃ لازم ہونے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر اس شخص کے پاس علاوہ اس رقم کے اور بھی کچھ نصاب سونے چاندی کا موجود ہے تو جتنی رقم وصول ہوگی وہ اصل نصاب میں شامل ہو کر اس کے ساتھ اس کی بھی زکوٰۃ لازم ہوگی اور اگر اس رقم کے علاوہ اور کوئی رقم یا سونا چاندی اس کے پاس نہیں تو جب دو سو درہم یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی کے اندازکی رقم وصول ہو جائے اور اس پر سال گذر جائے اُس وقت زکوٰۃ واجب ہوگی۔

اس کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ میں جو روپیہ جمع اور بذمہ گورنمنٹ یا کارخانہ وغیرہ قرض ہے وہ ان تین قسموں میں سے کس قسم میں داخل ہے۔

سو یہ تو ظاہر ہے کہ وہ دَین قوی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ معاوضہ کسی مال تجارت کا نہیں بلکہ خدمت کا معاوضہ ہے، جیسا کہ بحر الرائق کی عبارت ان لم تکونا للتجارۃ لا تجب مالم یحل الحول سے بوضاحت وصراحت ثابت ہے کہ غلام یا مکان تجارت کے لئے نہ ہو تو اس کی خدمت و اجرت کو مال تجارت قرار نہیں دیا۔ تو خدمت حُر کو بدرجۂ اولیٰ مال تجارت نہیں کہہ سکتے۔

اب دو احتمال باقی ہیں کہ اگر خدمت کو مال قرار دیا جائے تو دین متوسط میں داخل ہے اور اگر مال ہی قرار نہ دیں تو دَین ضعیف میں داخل ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ سے دونوں احتمالوں پر دونوں روایتیں منقول ہیں جن میں سے حسب تصریح منحۃ الخالق بحوالہ محیط ان دونوں میں ظاہر الروایۃ یہ ہے کہ مال قرار دیکر دَین متوسط میں شامل کیا جائے اور ایک تیسری روایت مبسوط میں ہے کہ اس میں تفصیل کی جائے کہ اُجرت و خدمت نہ علی الاطلاق مال ہے نہ غیر مال، بلکہ اگر عبد تجارت کی خدمت یا دارِ تجارت کی اُجرت ہے تو مال ورنہ غیر مال پہلی صورت دَینِ قوی میں داخل ہے اور دوسری دَین ضعیف میں اور اسی تیسری روایت کو مبسوط نے اصح قرار دیا ہے۔

مگر یہ سب گفتگو اور روایات کا اختلاف عبد کی خدمت کے بارہ میں ہے جو من وجہ مال ہے حُر کی خدمت حسب تصریح فقہاء مال نہیں ہے۔ اس لئے یہ اختلاف روایت بھی صورت زیر بحث میں مؤثر معلوم نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دَین قوی میں داخل ہونے کی صرف ایک صورت ہے کہ عبد تجارت کی خدمت یا دارِ تجارت یا ارضِ تجارت کا معاوضہ ہو اُس کے سوا کوئی دین اجرت دَین قوی میں باتفاق داخل نہیں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کا روپیہ جو ملازم کی تنخواہ سے وضع کیا گیا یا بطور انعام گورنمنٹ کی طرف سے جمع کیا گیا ہے وہ اس میں قطعاً شامل نہیں اس لئے اس میں صرف دو ہی احتمال ہو سکتے ہیں کہ دَین متوسط ہو یا دَین ضعیف اور دَین متوسط میں بھی اس کا داخل ہونا اس لئے مشکل ہے کہ دو روایتیں جو بحوالہ محیط منحۃ الخالق میں لکھی ہیں وہ دونوں عبد کی خدمت کے متعلق ہیں حُر کی خدمت کا وہاں ذکر نہیں اور ظاہر ہے کہ حُر کی خدمت کو عبد کی خدمت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ حسب تصریحات فقہاء خدمت عبد فی الجملہ مال ہے اور خدمتِ حُر مال نہیں ہے۔ اس لئے ظاہر یہی ہے کہ دَین دَینِ ضعیف میں داخل ہے۔ اور اگر اس کو دَین متوسط بھی تسلیم کیا جائے تب بھی اصح روایت کے مطابق امام اعظم ابو حنیفہ رح کے نزدیک دین متوسط بھی بحکم دَین ضعیف ہے۔ اس پر بھی ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ کما صرح بہ فی البدائع

الغرض پراویڈنٹ فنڈ کا روپیہ دَین قوی میں تو داخل نہیں ہو سکتا اور دَین متوسط میں داخل کرنا بھی اس وقت کسی روایت پر منطبق نہیں ہے۔ جب تک کہ حُر کی خدمت کو مال قرار دینے کی تصریح نہ ملے اور بالفرض اس میں داخل بھی لیا جائے تو حکم اس کا بھی اصح روایت پر دَینِ ضعیف کی طرح یہی ہے کہ اس پر ایام ماضیہ زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

تنبیہ[*]:- روایاتِ فقہیہ کو دیکھنے اور غور کرنے سے حقیر کو یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس فنڈ کی رقم پر ایام ماضیہ زکوٰۃ واجب نہیں۔ احتیاطاً دوسرے علماء سے بھی تحقیق کر لینا مناسب ہے۔ نیز حضرات صاحبین رحمہم اللہ کے نزدیک چونکہ دیون میں قوی۔ متوسط۔ ضعیف کی کوئی تفصیل نہیں ہے، بلکہ ہر قسم کے دَین پر زکوٰۃ ایام ماضیہ کی واجب ہے اسلئے کوئی احتیاط اور تقویٰ پر عمل کرے اور ایام ماضیہ کی زکوٰۃ بھی ادا کرے تو بہتر ہے اور شاید اسی اختلافات سے بچنے کے لئے ہمارے بلاد میں عام طور پر مہر باندھنے کے وقت بجائے روپے کے اسّی ہزار ٹکے دو دینار سُرخ کہا جاتا ہے جو کہ قیمت ہے ڈھائی ہزار روپے کی۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم۔

السائل الاحقر محمد شفیع عفا اللہ عنہ، خادم دار العلوم

دیوبند ۱۲ صفر ۶۲ھ

الجواب:-

آپ صاحبوں کی تحقیق صحیح ہے۔ لہذا میں بھی اسی کو اختیار کرتا ہوں اور اس کے خلاف سے رجوع کرتا ہوں۔

اشرف علی ۱۳ صفر ۱۳۶۲ھ

[*] یہ تنبیہ بحکم حضرت سیدی حکیم الامت اضافہ کی گئی ہے ۱۲ محمد شفیع۔

عامر عثمانی

مُدیرِ تجلی کے نام

بہ عنوان جنوری ۱۹۶۳ء کے فاران میں چھپے ہوئے ایک سات صفحات کے مکتوب کا ہے جس کے لکھنے والے ہیں شعبۂ تاریخ، اُردو کالج کراچی کے جناب سید عین الحق صاحب ایم اے موضوع ہے وہی علیؓ و معاویہؓ اور حسینؓ و یزید۔

ابھی کچھ دن ہوئے پٹنہ کالج کے لکچرار جناب عبد الغنی صاحب کے ارشادات پر تجلی میں گفتگو کی گئی تھی۔ سید عین الحق صاحب نے اسی کے سلسلے میں خامہ فرسائی کی ہے۔

ابتداءً تو موصوف کے یہ کلمات خاصے حوصلہ افزا ہیں۔ فرمایا:-

"میں ایک عرصے سے آپ کے مؤقر جریدے "تجلی" کا مطالعہ کرتا رہا ہوں اور اس بات کا معترف ہوں کہ فی الحقیقت یہ تاریکیوں میں ایک جلتا ہوا چراغ ہے۔ خصوصاً شرک و بدعت کے ردو ابطال میں اس نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ بہت ہی قابلِ قدر ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے مزید خدمات کا موقع عطا فرمائے اور آپ کے زورِ قلم کو اور زیادہ کرے۔"

لیکن اس مدح کے بعد جو قدح عاجز کے علم و فہم کی مضمون میں کی ہے وہ دیدنی ہے۔ دیدنی عاجز کے اعتبار سے ہیں۔ ہم جیسے اصاغر کی مدح کیا اور مذمت کیا۔ دیدنی اُن اکابر کے تعلق سے ہے جنھوں نے ملّتِ اسلامیہ کی ڈولتی ہوئی کشتی ہلاکتوں کے منجدھار سے نکال کر فتح و ظفر اور عروج و مرانی کے ساحل پر لگا یا تھا۔ جنھوں نے اسلام کی زمام منافقین اور فتنہ کے ہاتھوں میں جانے سے روکا تھا۔ جنھوں نے ملّتِ مسلمہ کی پشت پناہی اس وقت کی تھی جب شیطان کی ذریت اس ملت کو پہلی ہی صدی میں دفن کر دینے کا منصوبہ تیار کر چکی تھی اور جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو کامل بربادی کی ظلمت سے نکال کر زندگی، عروج، ارتقاء اور کشور کشائی کی روشنی میں لا کھڑا کیا تھا۔

سید عین الحق صاحب سے ہمیں کوئی گلہ نہیں۔ رفض و سبائیت کے ہمہ گیر اور مسلسل پروپیگنڈے نے جو زہر فضا میں گھول دیا ہے اس سے ایک انگریزی تعلیم یافتہ کا متأثر ہو نا کیا مستبعد ہے جبکہ اس حمام میں اچھے اچھے علماء و فضلاء بھی ننگے ہیں۔ اگر کوئی ایسی عدالت ہوتی جہاں کذب و افتراء اور شور و غوغا کی بنیاد پر نہیں، بلکہ حقائق و واقعات اور قرآن و سنت کی بنیاد پر بے لاگ فیصلے دیئے جاتے تو عاجز سید صاحب کی ایک ایک سطر کا جواب قرآن، احادیثِ صحیحہ اور عقل و منطق کے منہاج پر دیکر معاملہ عدالت کے سپرد کر دیتا، لیکن مکر و فن، تلبیس و تدلیس اور کذب و افتراء کی اس دنیا میں ایسی عدالت کہاں ہے جو صدیوں کے [illegible] دروغ بے نہایت کے ڈھیر سے صداقت کے شفاف موتی برآمد کر سکے اور ان کی اساس پر سچے فیصلے دے سکے اس لئے اس فکری نزاع کا فیصلہ فردوی آخرت ہی کی اُس عدالت پر انحصار رکھتا ہے جہاں اخبار الطوال، ابن اثیر، تاریخ الخلفاء، مروج الذہب، طبقات ابن سعد اور الامامۃ والسیاسۃ جیسی بے تہ کتابوں کی جمع کردہ خرافات پر نہیں بلکہ اعلیٰ درجے کے حقائق اور قرآن و سنت کی تعلیمات کی اساس پر عادلانہ فیصلے دیئے

جائیں گے۔ اسی دن یہ بات طے ہو گئی تھی کہ یا حق پر وہ لوگ تھے جنھوں نے نسلی بنیادوں پر چند افراد کی مفرط محبت میں گرفتار ہو کر بے شمار بندگانِ حق کے عدیم النظیر کارناموں پر سیاہی پھیرنے کی کوشش کی یا وہ لوگ تھے جو اسلام کے چالاک دشمنوں اور کم عقل دوستوں کے غلیظ و نجس پروپیگنڈے کا منھ نوچ کر اُمت کے بہترین محسنوں اور ملت کے بے مثال خدمتگزاروں کے حقیقی خدوخال نکھارنے کے متمنی رہے۔

قارئین چونکیں گے کہ یہ آج عامر عثمانی کو کیا ہو گیا ہے جو دلیل کا جواب دلیل سے دینے کی روش ترک کر کے بات قیامت پر ٹال رہا ہے۔ فدوی عرض کرے گا کہ معاملہ ٹال مٹول کا نہیں بلکہ مجبوری کا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو طویل خط فاران میں چھپا ہے اس کے جواب کا محل بھی فاران ہی کے صفحات ہو سکتے تھے۔ تجلی میں اتنی وسعت کہاں کہ سات صفحوں کا مکتوب نقل کر کے اس کا جواب دیا جائے اور بغیر مکتوب نقل کئے جواب میں مزا نہیں۔ ایسے حضرات خال خال ہی ہوں گے جن کے پاس فاران اور تجلی دونوں پہنچتے ہوں، لہٰذا قارئین تجلی کی غالب تعداد کے لئے یہ طولانی گفتگو بدمزگی کا سبب بن جائے گی۔

مکتوب میں اگر کچھ ٹھوس اور اصولی باتیں کہی گئیں ہوتیں تب بھی یہ ممکن تھا کہ انھیں چن کر تجلی میں گفتگو کر لی جاتی، لیکن پورا خط بناء الفاس علی الفاس کا ایسا مجموعہ ہے جسے کج بحثی اور قلم درازی کے ایک شاندار نمونے کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا

شکایت ہمیں اپنے مخلص دوست ماہر صاحب سے ہے۔ انھوں نے اپنے فاران میں جب ایک کھلی چٹھی ہمارے نام شائع کی تھی تو ان کا صحافتی فریضہ تھا کہ ہمارے جواب کے لئے بھی فاران کے صفحات کھلے رکھتے، لیکن قارئین کو یہ سنکر حیرت ہو گی کہ وہ اس معروف صحافتی اخلاق کے لئے تیار نہیں ہوئے اور ایسا رویہ ہمارے ساتھ اختیار کیا جو علمی دیانت کے منافی ہے۔ عاجز نے انھیں عریضہ بھیجا تھا کہ آپ اگر شائع کرنے پر آمادہ ہوں تو میں جواب لکھ بھیجوں۔ لیکن انھوں نے ادائے معصومی کے ساتھ انکار فرما دیا۔ ادائے معصومی سے مراد یہ کہ انھوں نے کچھ اس طرح کی بات رقم فرمائی ——" آپ اپنے موقف سے ہٹنے پر آمادہ نظر نہیں آتے لہٰذا جو کچھ آپ لکھیں گے مجھے اس پر تنقیدی حواشی چڑھانے ہوں گے، پس کیا فائدہ اس اشاعت سے!"

فدوی نے جواباً عرض کیا کہ برادرم! آپ دو چار نہیں سو پچاس حواشی چڑھا دیں عاجز کو کوئی شکوہ نہیں ہو گا مگر اشاعت پر تو تیار ہو جئے۔ جواب میں انھوں نے پھر وہی بات دہرائی یعنی حواشی مجھے ضرور چڑھانے ہوں گے اور جب چڑھانے ہوں گے تو چھاپنے سے فائدہ!

اب بتائیے اس کے بعد میرے لئے جواب لکھنے کی کیا گنجائش باقی رہ گئی! لطف یہ ہے کہ عاجز نے تو کچھ عرصہ ہوا انکا ایک ایسا خط ان کی خواہش پر تجلی میں بلا تکلف شائع کر دیا تھا جس میں میرے موقف کی تردید کی گئی تھی وہ صحافتی اخلاق کی نہ سہی "عوض معاوضہ" ہی کے معروف قاعدے کی پاسداری کر لیتے تب بھی میرا جواب شائع کیا جا سکتا تھا، لیکن اس معاملہ میں وہ ٹھیک وہی "خسرو" ثابت ہوئے جن کے بارے میں شاعر نے کہا ہے کہ —— رموز مملکت خویش خسرواں دانند!

کوئی مضائقہ نہیں۔ انسان میں خوبیوں کے ساتھ کچھ کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔ وہ بے شمار خوبیوں کے مالک ہیں، ذہین و فطین ہیں، خوش مذاق اور ہوشمند ہیں، لیکن طبیعت کی اس افتاد سے وہ دامن نہیں چھڑا سکتے کہ جس بات پر جم گئے بس جم گئے۔ جس بات کو جس طرح انھوں نے ذہن نشین کر لیا اب وہ پتھر کی لکیر ہے کوئی کچھ کہے جاتے وہ نہیں سنیں گے اور سنیں گے تو ایک کان سنکر دوسرے کان سے اڑا دیں گے۔ ماضی قریب میں ناظرین دیکھ ہی چکے کہ اس بدیہی واقعے کو بھی انھوں نے تسلیم نہیں کیا کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے اسم گرامی کے ساتھ "امام" کا لفظ شیعوں کا نکالا ہوا ہے، حالانکہ یہ اتنا ہی ظاہر و باہر معاملہ ہے جیسے مئی جون کی دوپہر کا سورج!

ازراہِ محبت وہ اپنے خطوط میں فدوی کو نصائح سے بھی مشرف فرماتے ہیں۔ ان کا بہت بہت شکریہ۔ ان کے حسن نیت اور اخلاص میں مجھے کبھی شک نہیں ہوا اور یہ بھی بعید نہیں کہ محمود احمد عباسی صاحب کے خیالات کی تائید و حمایت میں مجھ سے کہیں کہیں خطا بھی ہوئی ہو لیکن یا ایں ہمہ یہ کہنے

کی بھی حمایت کریں گا کہ بے شمار دیگر انسانوں کی طرح پُرخلوص دوست بھی رفض و تشیع کی گرد سے اپنے ذہن کو نہیں بچا سکے ہیں اور یہ گرد اس طرح ان کے جزوِ بدن ہو گئی ہے کہ اسے وہ گوشت پوست ہی کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔

اگر یہ بات نہ ہوتی تو سید عین الحق صاحب کے مکتوب پر بھی ان کے کچھ نہ کچھ حواشی ضرور ملتے کیونکہ اس مکتوب میں جو تصورات پیش کئے گئے ہیں وہ خالصتہً اُسی شیعی اندازِ نظر کے ترجمان ہیں جس کی تائید کوئی بھی محتاط اور مستند سنی عالم نہیں کرتا۔ پیش کرنے کا انداز بھی صریحاً ایسا ہے کہ اگر ماہر صاحب کی حبِّ علیؓ ان کے تحت الشعور میں بغضِ معاویہؓ کی تخم ریزی نہ کر چکی ہوتی تو بغیر کسی گہرے فکر و تدبر کے ان کا ذہنِ رسا فوراً سید صاحب کے فکر کی کمزوریاں چیک کر لیتا اور اپنی عادت کے مطابق وہ ان کا نوٹس لئے بغیر نہ رہتے۔

ماہر صاحب کم سے کم اتنا تو دیکھ ہی سکتے تھے کہ سید صاحب کے پورے مکتوب میں نہ قرآنی محکمات کا کہیں تذکرہ ہے نہ بخاری و مسلم کی روایات کا۔ نہ وہ کسی فقیہ و مجتہد سے استشہاد کرتے ہیں نہ مستند مآخذ سے۔ ہاں ذکر ہے تو طبری، مروج الذہب، تاریخ الخلفاء اور الامامۃ والسیاسۃ جیسی فتنہ انگیز کتابوں کا جن کا صحیح مصرف یہ ہے کہ شاہراہِ عام پر ڈھیر کر کے ان میں آگ لگا دی جائے۔ طبری نے خام مواد جمع کیا تھا جس میں سونے چاندی کے ساتھ تانبے، پیتل اور کوڑے کرکٹ کے بھی ڈھیر تھے شیعی پروپیگنڈہ اپنا کام نہ کر گیا ہوتا تو اہلِ نظر اس ضخیم کتاب سے فقط کھرے سکے چن کر کھوٹے سکوں کو دریا برد کر سکتے تھے مگر رفض و سبائیت کی آندھیوں نے آنکھوں میں ایسا گرد و غبار بھر دیا کہ کھرے اور کھوٹے کی تمیز ہی اٹھ گئی۔

[illegible]

آنکی خطاؤں سے دنیا کو پہنچے گا۔ لوگ زہر کا پیالہ تو آسانی سے نہیں پیتے لیکن اگر یہ زہر خوش رنگ شربت میں حل کر دیا جائے تو گلاسوں کو ہونٹوں تک پہنچنے میں دیر نہیں لگتی۔

حافظ سیوطیؒ نے بسیار نویسی اور روایت پرستی کی رو میں یہ غور کئے بغیر تمام رطب و یابس اپنی کتابوں میں بھر لئے کہ کونسی روایت اپنے مضمرات و ثمرات کے اعتبار سے قرآن اور حدیثِ صحیح کے حق میں چیلنج ثابت ہوتی ہے اور کس روایت کو رد کر دینا ہر قیمت پر ضروری ہے۔ کانٹے میں پھنسنے والا ہر شکار مچھلی ہی نہیں ہوتا بارہا سانپ بھی لٹکے چلے آتے ہیں۔ اب اس شکاری کو آپ کیا کہیں گے جو مچھلی اور سانپ میں تمیز کئے بغیر اپنی پٹاری بھرتا چلا جائے۔ حد ہے کہ یہ بزرگ ایسی بھی روایتیں اپنی تصانیف میں بلا تکلف درج کر دینے کے عادی ہیں جن کے بعض راویوں کے متعلق خود انھی کا یہ ریمارک ان کی دوسری تحریر میں موجود ہے کہ یہ راوی کذاب و وضاع ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ ہونے کی وضعی روایت بھی انھیں بزرگ نے اپنی الخصائص الکبریٰ میں ٹانکی ہے حالانکہ اس کی سند کو خود یہی ناقابلِ اعتماد بھی بتاتے ہیں۔ ان کے مزاج و مذاق کا اندازہ ان کی تاریخ الخلفاء، الخصائص الکبریٰ اور اللآلی المصنوعہ جیسی کتابوں سے ہر روشن فکر اور ذی بصیرت عالم کر چکا ہے کہ انھیں زیادہ سے زیادہ دھن ہر روایت کو معتبر ثابت کرنے کی رہی ہے اور اپنے علم و فہم کی پوری صلاحیتوں کو فقط اسناد کی کنج کاوی پر مرکوز کر کے وہ اس فکر سے بالکل بے نیاز ہو گئے ہیں کہ فہم و درایت کا تقاضا کیا ہے اور صحابہؓ کی سیرت و کردار کو کسی روایت کے مطالب و عواقب کتنے غلط رنگ میں پیش کرتے ہیں۔

ہمارے دوست ماہر صاحب حضرت علی و حسین رضی اللہ عنہما کے حق میں تو بڑے ذکی الحس واقع ہوئے ہیں، لیکن حضرت معاویہؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ جیسے اکابر کے لئے ان کے خانۂ عقیدت میں فقط رسمی لوح پر "رضی اللہ عنہ" کے سوا کچھ نہیں۔ رسمی اس لئے کہ اگر یہ الفاظ ان کے دل سے نکلے ہوتے تو معاویہؓ کے کردار و سیرت کی

جو جولانیاں سید صاحب نے اپنی ناواقفیت اور فریب خوردگی کے باعث اپنے مکتوب میں پیش کی ہیں ان پر ضرور دوچونکئے کہ کیا ایسے دنیا پرست اور خود غرض لوگوں سے بھی اللہ راضی ہو سکتا ہے! حد ہے کہ جس معاویہ کی بے نظیر صلاحیتوں نے مسلمانوں کی زوال پذیر اور فساد گرفتہ مملکت کو ہولناک فتنوں کی زد سے نکال کر ضبط و استحکام بخشا' امن و سکینت دی' اس لائق بنایا کہ اسلام کی فتوحات کا جو قدم سبائیوں کی پیہم ریشہ دوانیوں سے انتشار و بد نظمی کی دلدل میں پھنس گیا تھا وہ آگے بڑھے اور قاتلین عثمانؓ کی ذریات تک کو تحت الثریٰ میں پہنچائے چھوڑا اسی معاویہؓ کے بارے میں سید صاحب تضحیک کے انداز میں کہتے ہیں کہ معاویہ کینی بات آخر ہیں کیا اور یہ صریح بے خبری پر مبنی سوال اٹھاتے ہیں کہ معاویہ نے اپنے دورِ حکومت میں قاتلین عثمانؓ کو سزائیں کیوں نہ دیں اور مجرموں کے لئے عدالتیں کیوں قائم کیں۔

مگر ماہر صاحب کا نکتہ سنج اور جزرس دماغ ان بے مغز باتوں پر کوئی کروٹ نہیں لیتا۔ انھیں معاویہؓ کی تخفیف و تحقیر ذرا بری نہیں لگتی یہ طرزِ عمل منھ سے بول رہا ہے کہ ماہر صاحب کے نزدیک بھی وہ لغو و باطل الزامات درست ہی ہیں جو خیالی جنت میں بسنے والے معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں پر لگاتے چلے آ رہے ہیں۔

اور لطیفہ دیکھئے - وہی ذہن جو معاویہ کو دنیا پرست باور کرانے کے لئے یہ سوال اٹھاتا ہے کہ اگر وہ مطالبۂ قصاص میں مخلص تھے تو کیوں انھوں نے اپنے دورِ اقتدار میں مجرموں کو تہہ تیغ نہیں کیا؟ —— موقعہ پڑنے پر اسی ذہن کی نشتر گاہ سے یہ شوشہ بھی نشر کیا جاتا ہے کہ معاویہؓ سفاک تھے ظالم تھے انھوں نے بیشمار لوگوں کو ذبح کیا' قید میں ڈالا ان کی سفاکی قابل نفریں ہے!

گویا چت بھی یاروں کی اور پٹ بھی۔ کون ایسے لوگوں کو یہ صاف سی حقیقت باور کرائے کہ قاتلین عثمانؓ اور ان کی فساد پرور ذریت ہی کا قلع قمع کرنا تو حضرت معاویہؓ کا وہ کارنامہ تھا جسے ظالمانہ خوں ریزی اور جبر و ظلم کے

عنوانات دے دیئے گئے ہیں۔ قرآن فتنے کو قتل سے زیادہ بدتر ٹھیراتا ہے۔ معاویہؓ کا قصور صرف اتنا ہی تو تھا کہ انھوں نے ملک و ملت کی بہی خواہی میں آیت قرآنی کو رہنما بنا کر ان تمام افراد کی گوشمالی و سرکوبی کر ڈالی جو فتنہ و انتشار کے بانی مبانی تھے۔ گھر میں بیٹھ کر جس کا جو جی چاہے خیالی نقشہ بناتا رہے۔ تخیل اور عمل کی دنیاؤں میں بڑا فرق ہے۔ معاویہؓ میدانِ عمل کے مرد تھے' خواب دیکھنے اور تمنائیں کرنے کی بجائے وہ کنواں کھود کر پانی نکالنے کے قائل تھے۔ ان کا عزم و حوصلہ اور تدبر اگر کارفرمائی نہ کرتا تو امت مسلمہ کی تاریخ نہ جانے کتنی بھیانک ہوتی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی امت دوسری ہی صدی ہجری میں منھ کے بل آ رہتی۔ کیسی خلافت علیٰ منہاج النبوت اور کہاں کا اسلام۔ وہ بانس ہی نہ رہتا جس کی بانسری آج تک بج رہی ہے۔ امیر معاویہؓ نے عین وقت پر سینہ سپر ہو کر اللہ کی مدد سے سبائیت کے اس دیو کو زمین میں گاڑ دیا جس کے پھیلائے ہوئے دامِ ہمرنگ زمین میں کتنے ہی نیک دل اور باصفا مومنین تک پھنستے جا رہے تھے اور جس نے دن کی روشنی میں خلیفۂ ثالث کو بیدردی سے مار ڈالا تھا۔ معاویہؓ اگر بالمقابل نہ ڈٹ گئے ہوتے تو سبائیت کا راستہ صاف تھا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی حق پرستی اپنی جگہ مسلّم' لیکن جن قاتلوں نے انھیں تختِ خلافت پر بٹھایا تھا کیا کسی معاملہ فہم اور سمجھدار آدمی کو ان کے بارے میں یہ حسن ظن ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بنائے ہوئے خلیفہ کو شاہِ شطرنج سے زیادہ بھی کوئی حیثیت دینے پر تیار رہتے؟ کبھی نہیں۔ وہ تو حضرت علیؓ کو آگے رکھ ہی اس لئے رہے تھے کہ ان کی عظیم شخصیت سے فائدہ اٹھا کر اُن تمام رکاوٹوں کو بھی دور کر لیں جو مکمل سبائی تسلط کی راہ میں حائل تھیں۔ حضرت علیؓ جیسا حق پسند اور عابد و زاہد صحابی ظاہر ہے شاہِ شطرنج بنے رہنے کی گھٹیا پوزیشن کو برداشت نہیں کر سکتا تھا وہ سبائیوں کی اسلام دشمن سرگرمیوں کا ساتھ دے سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انھیں مسندِ خلافت پر بٹھانے والا دغاباز

گروہ ہی اسی طرح قتل کروا ڈالتا جس طرح خلیفۂ ثالث کو قتل کر چکا تھا اور پھر سبائیت انا و لا غیری کا نقارہ بجاتی وہ تو اسلام کو ایک زندہ جاوید مذہب بننا تھا اور ملتِ مسلمہ کے لئے اجل مقدر نہیں تھی اس لئے مشیت ایزدی نے معاویہؓ کو میدان میں اتارا اور ان کی بالغ نظری نے منافقین و زنادقہ کے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔

الحاصل ہمارے دوست ماہر صاحب بھی اپنے تمام تر اخلاص کے باوجود اس بحث میں غالباً لاشعوری طور پر ایک سمت جھکے ہوئے ہیں ورنہ حضرت علیؓ کو برسرِ حق اور حضرت معاویہؓ کو مجتہدِ خاطی ماننے کے باوجود وہ سید صاحب کے خط پر اختلافی نوٹ ضرور لکھتے مگر ان کا تو حال یہ ہے کہ فقط ایک جگہ آدھی سطر کا نوٹ لکھا ہے مگر اس کا بھی مقصود سید صاحب کی کسی خطا پر گرفت نہیں۔ سید صاحب نے رقم فرمایا تھا کہ ابوبکرؓ کی بیعت حضرت علیؓ نے نہیں کی۔ اس پر ماہر صاحب نوٹ دیتے ہیں:۔

"یعنی فوراً بیعت نہیں کی قدرے تاخیر سے کی۔"

"یعنی" کے شگوفے پر غور کیجئے۔ گویا سید صاحب کی ایک صریح غلط بیانی ماہر صاحب نے چیک بھی کی تو اس طرح کہ جیسے خود سید صاحب ہی اپنے بیان کی توضیح فرما رہے ہوں۔ ایسے ہی کسی موقعہ پر یہ کہاوت چلی ہوگی کہ گھٹنا پیٹ ہی کے رُخ گرتا ہے۔ ماہر صاحب اگر اپنی معروف ناقدانہ دیانت سے کام لیتے تو انکا نوٹ کم سے کم یہ تو ہونا ہی چاہئے تھا کہ سید صاحب کا یہ ارشاد غلط ہے۔ صحیح یوں ہے کہ حضرت علیؓ نے قدرے تاخیر سے بیعت کر لی تھی۔ لیکن اس نوٹ سے چونکہ سید صاحب کی ثقاہت و صداقت پر حرف آتا تھا اس لئے "یعنی" کا پیرایہ اختیار کیا گیا جس کا منشا ظاہر ہے کہ سید صاحب کے دامن کو دھبوں سے بچانے جانا ہے۔ اسی کا نام ہے مدعی سست گواہ چست!

لیکن ماز پھر بھی ہو [illegible] کرہی رہا کہ سید صاحب کا مبلغ علم اس موضوع پر فقط وہی کتابیں ہیں جس

تاریخ کو توڑ مروڑ کر رفض و تشیع کے قالب میں ڈھالا گیا ہے، ورنہ اہلِ سنت کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرنے والی کتابیں ان کے مطالعہ سے گذری ہوتیں تو یہ بات وہ کبھی نہ کہتے کہ حضرت علیؓ نے حضرت صدیقؓ کی بیعت نہیں کی تھی۔

خط کا جواب مقصود نہیں مگر چند باتیں اور بھی ہم ایسی بتانا چاہتے ہیں جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ محترم دوست ماہر صاحب نے سید صاحب کا خط پڑھتے ہوئے اپنے دماغ کے سوراخ کس طرح بند کر لئے تھے۔

سید صاحب کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ سے بیعت نہ کرنے اور قصاص کا مطالبہ پیش فرمانے والا سوائے معاویہؓ کے کوئی نہ تھا۔ لیکن ماہر صاحب بھی یقیناً جانتے ہونگے کہ انصار و مہاجرین کی ایک پوری جماعت تھی جس نے بیعت سے انکار کر دیا تھا اور قصاص کے مطالبے میں معاویہؓ سے پیچھے نہ تھی۔

سید صاحب حضرت زبیرؓ و طلحہؓ کی بیعت کو دلیل میں پیش کرتے ہیں، لیکن ماہر صاحب کو معلوم ہوگا کہ جن کتابوں کی کاسہ معلومات کے بل پر معاویہؓ کی تذلیل کی جاتی ہے، انھی میں تو یہ بھی موجود ہے کہ طلحہؓ و زبیرؓ سے بیعت تلوار کی نوک پر لی گئی تھی۔

سید صاحب حضرت سعدؓ کا نام بھی بیعت کرنے والوں میں لیتے ہیں، لیکن ماہر صاحب کو علم ہونا چاہئے تھا کہ یہ غلط بیانی ہے۔

سید صاحب اپنی طباعی کے زور سے یہ دور کی کوڑی لاتے ہیں کہ لڑائی میں پہل اور اقدام کرنے کا الزام حضرت علیؓ پر درست نہیں، بلکہ معاویہؓ تو اپنی معزولی کا حکم پہنچنے سے قبل ہی جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ لیکن ماہر صاحب کے کان پر اس بے جان نکتہ سنجی سے جوں تک نہیں رینگی حالانکہ جانتے ہیں یہ محل افسانہ غلط در غلط ہے۔ اولاً تو محض تیاری کو اقدام نہیں کہتے۔ اقدام کرنے والا وہ ہے جو لشکر کو لے کر بڑھتا

تیتاً عثمانی افسروں کو بیک بینی و دو گوش معزول کرنے کا آرڈر تو حضرت علیؓ نے تخت خلافت پر آتے ہی صادر کیا تھا۔ کیا تُک ہو سکتا ہے اُس بے تہ دُھمے کا جو سید صاحبؒ پرواز خیال کے تحت فرمایا ہے۔ تیاری تو دُور کی بات ہے۔ حضرت علیؓ سے لڑنے کا خیال بھی پیدا ہونا اس لئے خارج از بحث ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت اور حکم عزل کے درمیان کوئی قابل لحاظ مدت حائل نہیں۔ رہا حکم عزل کے بعد معاویہؓ کا کسی قسم کی تیاری کرنا تو اس کے لئے تاریخی ثبوت درکار ہے۔ پھر یہ ثبوت مل ہی جائے تو دفاع کی تیاری کو حملہ اور اقدام آج تک سوائے نادانوں کے کس نے کہا ہے؟

سید صاحب فرماتے ہیں کہ قرآن میں حضرت معاویہؓ کی عظمت سے متعلق کوئی اشارہ نہیں حالانکہ بعض اجل صحابہؓ کی تعریف میں اشارے موجود ہیں۔ لیکن ماہر صاحب اُن سلامتی پسند لوگوں میں ہیں جو فضول قسم کی نکتہ سنجیوں کو وزن نہیں دیتے انھیں معلوم ہوگا کہ حضرت عائشہؓ کی صحیح ترین روایت کے مطابق قرآن میں یا تو حضرت عائشہؓ کی افک سے براءت نازل ہوئی ہے یا ثانی اثنین میں حضرت ابوبکرؓ کی طرف اشارہ۔ اس کے علاوہ کسی صحابی کے بارے میں شخصی تعریف کے طور پر کچھ نازل نہیں ہوا۔

پھر سید صاحب کا منشاء تو صراحۃً یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کی منقبت پر تو ضرور ہی قرآن میں اشارے موجود ہیں۔ یہ منشاء نہ ہو تو حضرت معاویہؓ کے لئے اشارہ نہ پائے جانے کا ذکر مہمل ہو جاتا ہے ــــ تو کیا ماہر صاحب بھی اُن طبعزاد نکتوں کو درست سمجھتے ہیں جو یار لوگوں نے حضرت علیؓ کی توصیف میں قرآن سے نکالے ہیں؟

سید صاحب معاویہؓ کی تقلیل کے طور پر فرماتے ہیں کہ ان کی تعریف میں تو بس ایک ہی حدیث پائی جاتی ہے کہ حضورؐ نے ان کے لئے ہادی و مہدی ہونے کی دعا کی لیکن ماہر صاحب یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ ایک ہی حدیث روایات کے پورے دفتر پر بھاری ہے۔ دعائے رسولؐ کی اجابت میں اگر انھیں شک نہیں ہے تو اس جامع دعا کے بعد معاویہ پر لگائے ہوئے ان الزامات کی کیا حقیقت باقی رہ جاتی ہے جن کو درست ماننے سے دعائے رسولؐ کا محروم قبولیت ہونا لازم آتا ہے۔

سید صاحب عزل معاویہ کے جواز میں حضرت عثمانؓ کی نظیر پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے بہتیرے عاملوں کو معزول کیا لیکن ماہر جیسا فہیم انسان اس منطق کی صریح خامی نہ تاڑ سکا۔ کہاں پچھلی خلافتوں کا معتمد علیہ بیس سالہ عامل معاویہ اور کہاں وہ عثمانی عاملین جن میں سے بعض کے نصب و عزل پر تو ایک برسات بھی نہیں گذری تھی۔ پھر حضرت عثمانؓ نے ہر عامل کو اس کے زیر نگرانی علاقے کے باشندوں کی شکایت و احتجاج پر الگ کیا تھا۔ شام کی کس جماعت نے حضرت معاویہؓ کو معزول کرنے کی درخواست کی تھی کہ حضرت علیؓ کے لئے عمل عثمان نظیر بن سکے۔ حضرت علیؓ نے تو صرف اپنے تدبر کے بل پر حکم عزل جاری کر دیا تھا اور کوئی شک نہیں کہ اس تدبر کے پیچھے حسن نیت ہی کارفرما تھا لیکن مستقبل نے ثابت کیا کہ تدبر ہار گیا، سیاست ناکام ہو گئی۔

مختصر یہ ہے کہ ماہر صاحب کو اپنے اندروں کا جائزہ لیکر دیکھنا چاہیے کہ اس خاص موضوع پر ان کا جذبۂ حق پرستی کس کونے میں جا سویا ہے۔ کیا وہ اس حسن ظن میں مبتلا ہیں کہ صرف سادات سے رشتۂ عقیدت جوڑ لینے کے بعد احترام صحابیت کا حق ادا ہو جاتا ہے اور آخرت میں حضرت معاویہؓ اور بے شمار دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تنقیص و تخفیف مسئول نہ ہوگی۔ اگر ایسا سمجھا ہے تو بہت غلط سمجھا ہے اور ایسا نہیں سمجھا تو عام عثمانی سے اختلاف رکھنے کے باوجود انھیں رفض و شیعیت کی تائید نہیں کرنی چاہیے۔ ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر تاریخ الخلفاء اور مروج الذہب جیسی مہلک کتابیں دفن کر کے صرف قرآن اور بخاری و مسلم کی روشنی میں پہلی صدی ہجری کی تاریخ مرتب کی جائے تو اگرچہ یہ افسانے کی طرح مربوط و منضبط نہ ہوگی مگر یہ یقیناً اس سے ثابت ہو جائیگا کہ صحابہؓ و تابعین کے معاشرے اور تمدن و سیاست کا جو ناپاک، وحشیانہ اور نفرت انگیز نقشہ جھوٹی روایات کے ذریعہ مومنین کے اذہان پر مرتسم کر دیا گیا ہے وہ اکثر غلط

ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت اتنی کمزور نہیں تھی کہ پہلی ہی صدی ہجری میں اہلِ ایمان کے سیرت و کردار چنگیز و ہلاکو جیسی بربریت اور بے ایمانوں جیسی عیاری و سیاہ کاری کا منظر پیش کرنے لگیں۔ خدا جہنم کا مزا چکھائے ان لوگوں کو جنھوں نے پہلی صدی ہجری میں بھی یہ دکھا دیا کہ مسلمانوں ہی نے مدینے کی ایک ہزار کنواریوں کی عصمت لوٹی اور وہ وہ سفاکیاں کیں کہ ہٹلر اور اسٹالن بھی اس سے آگے گرد ہیں۔ یہ حافظ سیوطیؒ جو بہت بڑے عالم اور محدث کہلاتے ہیں انھیں بھی تو یہ ہوش نہ آیا کہ واقعۂ حرّہ کی مردود و ناپاک روایتوں پر بھروسہ کر لینے کے معنوی نتائج کیا نکلتے ہیں۔ لکھتے چلے جاتے ہیں جو بھی پچھلوں نے لکھ دیا ہے۔

واویلا۔ ثم واویلا!

چین اور روس کی زندہ تصویریں

عثمان بطور — چین میں مسلمانوں پر کیا گذری؟ ایک کہانی ایک تاریخ - سوا روپیہ -

اور یانگسی بہتا رہا — ناول کے پیرائے میں چین کی ایک عبرت انگیز داستان - ایک روپیہ -

آزادی کی طرف — ایک روسی افسر کی آپ بیتی جو بھاگ کر امریکہ میں پناہ گزیں ہوا - نہایت دلچسپ اور عبرتناک - تین روپے -

پتھر کے دیوتا — چھ آپ بیتیاں - جاذبِ توجہ - حیرت ناک - ایک روپیہ -

ادب میں ترقی پسندی — کمیونزم ادب و صحافت کی آڑ میں کیا کھیل کھیلتا ہے - قیمت ایک روپیہ

چین کے مسلمان — کروڑوں مسلمان کیا ہوئے؟ انھیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا؟ کمیونزم کی آدم خوری کا دستاویزی تذکرہ - صرف ۲۵ پیسے

کمیونزم اور کسان — کمیونزم کو ایشیائی نقطۂ نظر سے سمجھنے سمجھانے کی کامیاب کوشش جو شمار ... دستاویزی حوالوں سے مزین ہے - ڈھائی روپے -

سوویٹ نظام کی چھ کنجیاں — پچھتے عقلی و نقلی دلائل پر مشتمل ایک سنجیدہ اور معیاری کتاب جو دلچسپ بھی ہے اور حقیقت افروز بھی - صفحات ۳۲۴ قیمت صرف ایک روپیہ -

آزادی کا ادب — بعض منتخب مقالوں، افسانوں اور منظومات کا مجموعہ جنھیں نیک تعمیری مقاصد کے تحت چھاپا گیا ہے - مجلد تین روپے -

لینن — انقلاب روس کے بانی لینن کی مستند سوانح - بے لاگ اور غیر جانبدارانہ - ایک روپیہ -

پانچ معلوماتی کتابیں

(۱) اقتصادی تعاون (۲) ہمارے دور کا انقلاب (۳) اقتصادی سامراج (۴) غیر جانبداری کا نظریہ (۵) موجودہ سماج میں طبقاتی نظام -

(ہر ایک کی قیمت ۲۵ پیسے)

فارسی تعلیم کا ایک عمدہ نصاب

جس کے ذریعہ آپ بغیر معلم کے بھی خود ہی اپنے بچوں کو فارسی سکھلا سکتے ہیں

- اصولِ فارسی مکمل ہر دو حصہ .... سوا روپیہ
- معین فارسی .... ۴۴ پیسے
- دو درس فارسی .... ۵۰ پیسے
- نصائح فارسی .... ۱۲ پیسے
- ترجمان فارسی .... ایک روپیہ

(مکمل نصاب کی مجموعی قیمت تین روپے پچاس پیسے)

تین کتابوں کا روح نواز سٹ

ان میں سے ہر کتاب عام فہم بھی ہے اور مستند بھی مقبولِ عام ہونے کے باعث کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں

- رسولِ عربیؐ .... ایک روپیہ بارہ پیسے
- خلافتِ راشدہ (حصہ اول) .... ایک روپیہ
- خلافتِ راشدہ (حصہ دوم) .... ایک روپیہ

تینوں کی مجموعی قیمت تین روپے

مکتبہ تجلی دیوبند (یو-پی)

ملا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

نومبر ۱۹۶۸ء کے تجلی میں آپ پڑھ ہی چکے ہیں کہ رضوان آباد کے میلاد میں فدوی کے ایک زندہ جاوید خواب پر بجلے شیخ پھندے کی جان چند لمحے کے لئے بڑی ضیق میں پڑ گئی تھی اور اسی ڈرامائی ہڑبونگ سے فائدہ اٹھا کر خاکسار وہاں سے سرک بھی آیا تھا۔ اب آگے سنئے۔

ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتا بس اسٹینڈ پہنچا۔ ظاہر ہے رضوان آباد جیسے خستہ حال قصبے کے کوچہ و بازار اس وقت سنسان تھے ورنہ داڑھی سمیت دوڑ لگانے کی جرأت میرے فرشتے بھی نہ کر سکتے۔ بس اسٹینڈ پر اتنا گمبھیر سناٹا تھا کہ الّو بولنے کی اصطلاح بھی استعمال نہیں ہو سکتی۔ صرف دو گدھے نظر آئے جو پاس پاس کھڑے نہایت بردباری کے ساتھ نہ جانے کن مسائل پر غور کر رہے تھے۔ میں چونکا۔ گدھوں پر نہیں بلکہ اپنے گدھے پن پر۔ بھلا بس ہر روز راتوں کو کہاں چلتی ہے اور رضوان آباد جیسے بدحال قصبے کا بس اسٹینڈ کسی قبرستان سے بہتر نظارہ کیا پیش کر سکتا تھا۔

خیر بھاگم بھاگ اسٹیشن پہنچا۔ بکنگ کلرک نے بتایا کہ دیوبند کے لئے گاڑی تین بجے سے پہلے نہیں ملے گی۔ اس وقت صرف سوا بارہ بجے تھے۔ ٹین کی چھت والے تھرڈ کلاس ویٹنگ روم میں گرد سے اٹے لیمپ کی مردہ سی روشنی ایک پُر اسرار سی سوگوار فضا پیدا کر رہی تھی۔ معدودے چند چھوٹے موٹے مسافر ادھر ادھر لڑھک رہے تھے میری نظر دو مولوی صاحبان پر جا کر ٹک گئی جو ایک کونے میں چادر بچھائے تشریف فرما تھے

مولوی ہی کہئے جبکہ دونوں کے روئے مبارک پر داڑھی اور سر پر پٹکے تھے یہ الگ بات ہے کہ بعد کے اندازے کے مطابق وہ مولوی سے آگے کی ایک چیز ثابت ہوئے۔ ایک ان میں کے اتنے موٹے اور چھوٹے تھے کہ شاید طول اور عرض برابر ہی ہوگا اور دوسرے ان کا شاندار جواب یعنی لمبے اور پتلے میں بہر حال اپنی ملت کو پا کر نہایت خوش ہوا جیسا کہ حق ہے خوش ہونے کا اور لمبے ڈگ بھرتا ان کے سروں پر جا پہنچا "السلام علیکم" ــــ میں نے عین کو نہایت صحیح مخرج سے نکالتے ہوئے پر تپاک سلام کیا۔ ان دونوں نے جواب نہیں دیا بلکہ صرف اول الذکر نے زبان کھولی۔ "وعلیکم السلام"۔

میں سمجھ رہا تھا اب وہ اخلاقاً یہ بھی کہیں گے کہ آئیے تشریف رکھئے، مگر وہ تو اس انداز میں گھور رہے تھے جیسے میں ان کے سامنے زمین شق کر کے برآمد ہوا ہوں۔

میں نے یونہی پوچھا:-

"کہئے جناب دیوبند کی گاڑی کتنے بجے ملے گی؟"

"دیوبند!" موٹے والے صاحب بڑے استکراہ سے بڑبڑائے۔

پتلے والے صاحب بولے ــــ "استغفر اللہ یہ ہمیں اسٹیشن ماسٹر سمجھا ہے آپ نے۔ جائیے ٹکٹ بابو سے پوچھئے"

میں سمجھ گیا۔ دونوں بزرگ بریلی یا بدایوں سے کہیں کے نہیں ہو سکتے تھے۔ اب میں نے گردن ڈھلکا کر نہایت بیکسی سے کہا۔ "ٹکٹ بابو سے تو پوچھ دیکھا۔ وہ تو معلوم ہوتا ہے ڈھنگ سے کچھ بتاتا ہی نہیں ۔۔۔"

"ہائیں" وہ چونکے - ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر تقریباً ایک ساتھ بولے --- "تو ... تو آپ کیا وہابی نہیں ہیں؟"

"زبان سنبھال کے ..." میں بگڑ گیا - "وہابی ہوں گے آپ --"

"پھر دیوبند کیوں جا رہے ہیں ؟"

"وہابیوں کا ستیاناس کرنے - میں نے خواجہ اجمیری کے روضے پر قسم کھائی ہے کہ جب تک ایک درجن وہابیوں کا خون جوتی میں بھر کر نہیں پی لوں گا گھر نہیں لوٹوں گا --- آپ دونوں اگر وہابی ہیں تو بتا کر دیکھئے میں یہیں سے بسم اللہ کرتا ہوں"۔

"ارے ارے ... وہابی مردود یہاں کون ہے - بیٹھیے بیٹھیے" ان کی آواز میں خوف جھلک رہا تھا - میں بیٹھ گیا -

پھر تھوڑی ہی دیر بعد ہمارے آگے ناشتے دان کھلا جس میں پراٹھے کباب اور بھنے ہوئے کوفتے جلوہ فرما تھے - تھوڑے سے ہی منٹوں میں صاف ہو گئے -

کھانے کے دوران میں پتہ چلا کہ وہ سعادت گنج جا رہے ہیں جہاں انھیں دو زبردست پیروں کے ایک کرامتی مقابلے کے انتظامات کرنے ہیں - موٹے والے صاحب کا نام تھا صوفی نزاکت علی اور لمبے والے صاحب کا خواجہ اسد تبریزی میں نے سوال کیا -

"یہ کرامتی مقابلہ خاکسار کے لئے نئی چیز ہے - بھلا کیا ہوتا ہے اس میں ؟"

خواجہ اسد بولے :-

"آپ بھی چلئے نا بڑا لطف آئے گا - ہمارے پیر صاحب سر کے بل کھڑے ہو کر سالم بکرا کھائیں گے اور فیض پور والے پیر صاحب ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر پلاؤ کی پوری دیگ تناول کریں گے - ٹکٹ صرف ساڑھے چھ آنے "

"یہ تو کچھ بڑی کرامتیں نہ ہوئیں - میرے دادا پیر تو اونٹ مسلّم ہضم کر جاتے تھے اور شرط یہ تھی کہ ڈکار نہیں لیں گے -"

"جی ہاں ایک سے ایک پڑا ہے" نزاکت علی نے پُر اہمیت انداز میں فرمایا " ہمارے نانا پیر کے شیخ ہوا میں اُڑتے تھے اور کمال یہ کہ کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا "

"اُڑنا تو خیر معمولی بات ہے" میں نے ٹوکا " میری بیوی کے نانا پیر ٹانگے چباتے تھے - ایک مرتبہ کسی بدنصیب نے انھیں خریت ملا کر مٹی کا تیل پلا دیا تھا بس پھر جو انگارے چباتے ہیں تو مزا آ گیا - آنکھ ناک سے شعلے نکلے کہ جس نے بھی نظر بھر کر دیکھا بھسم ہو گیا - ایک دن بچارے خود بھی بھسم ہو گئے "

"خود بھی ہو گئے ؟" دونوں بزرگ چونکے -

"جی ہاں مجبوری ہے" میں نے تسلی دی " مگر آگ نے بھنو نہیں جلایا " وہ تو آگرے کی ایک سدا سہاگن نے جلا جلا کر خاک کر دیا مدت سے عشق چل رہا تھا "

"اوہ" وہ گویا مطمئن ہو گئے " اللہ صاحب بڑوں کی بڑی باتیں ہیں - غوث اعظم کا فیض ہوا چاہیئے پھر تو بندہ مولا میں جا ملتا ہے من تو شدم تو من شدی "

یہ بات بھی آپ نے سولہ آنے کہی " میں جھوم اُٹھا " آپ کی دعا سے غلام کو بھی حضرت غوث اعظم سے بیعت کا فخر حاصل ہے - میرے دادا پیر اپنے کندھوں پر چڑھا کر لے گئے تھے ناچیز کو میں اس وقت چار سال کا تھا "

"ارے ... تو اتنی چھوٹی سی عمر میں بیعت کی تھی ؟" صوفی نزاکت نے تحیّر سے کہا -

"کیوں نہیں مگر اس کا فیض یہ ہوا کہ میں نے تین دن میں قرآن حفظ کر لیا تھا پھر ایک دن میں بھلا دیا "

"یہ تو بہت بُرا کیا - قرآن کو یاد کر کے بھلا دینا سنا ہے بڑا گناہ ہے "

"مجبوری تھی صوفی صاحب" میں نے طویل سانس لیکر کہا " میں ابھی پانچ سال کا بھی نہیں تھا کہ کلیر شریف کے عرس میں پونا کی ایک زائرہ سے آنکھ لڑ گئی تھی بس پھر اسم اعظم کے سوا سب کچھ بھول گیا "

دونوں ہنسے ، مگر اس ہنسی میں بڑی معصومیت تھی استہزا نہیں تھا -

"پھر کیا ہوا ؟" صوفی نزاکت نے پُر شوق لہجے میں پوچھا

"بڑا اکھیلا ہوا - دادا پیر مجھے گود میں چڑھا کر حجرے میں لیجایا کرتے تھے اور میری طرف سے آنکھ مارا کرتے تھے -

مگر کچھ دنوں بعد مجھے اکیلا چھوڑ کر وہ پٹنہ چلے گئے۔ میں نے ساتھ چلنے کی ضد کی تو کہنے لگے کہ بیٹا! میں تیری ہی طرف سے جا رہا ہوں۔"

اسی طرح کی حقیقت افروز باتوں میں ایک گھنٹہ گذر گیا۔ سعادت گنج کے لئے گاڑی دو بجے ملنی تھی۔ پونے دو پر وہ سامان سمیٹ کر اٹھ گئے۔

"مگر صاحب آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں" — خواجہ اسد بولے۔

"خاکسار کو بدیع الزمان نقشبندی کہتے ہیں، گلبدن تخلص ہے۔"

"ارے تو آپ شاعر بھی ہیں۔ واہ صاحب پہلے سے بتاتے تو کچھ سن ہی لیتے۔"

"چلئے پھر سہی۔ میں ذرا دیوبندی دہریوں کا بیڑا غرق کر لوں پھر دیکھئے گا ہر محفل میں گلبدن ہی کی قوالیاں گونجا کریں گی۔"

"کیوں نہیں۔ آپ ماشاء اللہ بہت گہرے معلوم ہوتے ہیں۔"

"ذرہ نوازی ہے آپ کی۔۔۔"

ان کی رخصت کے بعد اب میرے لئے مکھیاں مارنے کے سوا کوئی کام نہ تھا لیکن مکھیاں بھی رات میں کہاں دستیاب ہوتی ہیں۔ سوچا کچھ دیر کمر سیدھی کر لوں۔ نظر ایک دوہری بینچ پر گئی۔ دوہری کا مطلب یہ کہ چوبی تکیے کے دونوں رخ پر نشست گاہ بنائی گئی تھی۔ میں اپنا کمبل تان اسی پر لمبا ہو گیا۔ کمبل کی موجودگی میری سلامتی ہوش و حواس کا ضامن سمجھئے۔ میلاد سے جس طرح بھاگنا پڑا ہے وہ بڑی نازک ساعتیں تھیں، لیکن جاڑے کے سفر میں اپنا کمبل میں جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ اس وقت کمبل نہ ہوتا تو مارے سردی کے قلفی جم گئی ہوتی۔

ایک بڑا فائدہ کمبل کا یہ بھی محسوس ہوا کہ سر منہ سب ڈھک گئے۔ اندیشہ برابر لگا ہوا تھا کہ میلادی بیٹھے کہیں مزاج پرسی کا منصوبہ بنا کر ادھر ہی نہ آ نکلیں۔ گو غالب گمان یہی تھا کہ اب تک وہ جلیبیاں کھا کر بستروں میں جا گھسے ہوں گے۔

تاہم امکانات کو تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے کمبل تان لینے کے بعد اطمینان نصیب ہوا تھا کہ اگر جان کے لاگو آ بھی گئے تو سوتے ہوئے مسافروں کے کمبل اور لحاف اٹھا اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکیں گے۔

ابھی لیٹے ہوئے دیر نہیں گذری تھی کہ دفعتاً کانوں کو قدموں کی دھمک محسوس ہوئی۔ کوئی باہر سے ویٹنگ روم کے احاطے میں آ رہا تھا۔ یہ اکیلا بھی نہیں تھا کیونکہ جوتوں کی کھٹ پٹ کم سے کم دو آدمیوں کا اندازہ دے رہی تھی۔ آواز قریب ہوتی گئی۔ رخ میری ہی سمت تھا۔

پھر صاف محسوس ہوا کہ دو آدمی میری ہی بینچ کی دوسری جانب نشست پر تشریف فرما ہوئے ہیں۔ کچھ ایسا بھی احساس ہوا جیسے انھوں نے بیٹھتے بیٹھتے جھک کر میرے لفافے کا جائزہ لیا ہو۔ میں نے اسی لمحے خراٹے لینے شروع کر دیئے۔ یقین یہی ہو چلا تھا کہ دشمن کے سپاہی آ دھمکے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بھورے قصائی یا نبی بخش حلوائی جیسے جغادری میلادیوں کو سنک چڑھ گئی ہو اور یہی سٹے کر کے وہ یہاں پہنچے ہوں کہ دیابی مردنہ اسٹیشن سے کے جا جانے گا کہاں لاؤ اسے کما ہی لو۔

میں نے اندر ہی اندر اپنے بازوؤں کی مچھلیاں ٹٹولیں، واقعہ یہ ہے کہ پہلے میرے اندر بڑی جان تھی۔ ہاتھی سے ٹکرا جانے کی ہمت رکھتا تھا مگر جب سے تجلی کی ملازمت گلے پڑی ہے روز بروز انحطاط ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ملازمت غلامی ہی ہے چاہے شرائط کتنی ہی شاندار کیوں نہ ہوں پھر مدیر تجلی جیسا خون آشام جس کا آقا ہو وہ تو زندہ ہی رہ جائے تو سمجھئے بڑا سخت جان ہے۔

تصور کی لوح پر بھورے قصائی کا لمبا تڑنگا جسم ابھرا پھر ایک اور پہلوان قسم کے بزرگ نظروں میں پھر گئے جو میلاد کے اسٹیج پر نظر آئے تھے۔ فرض کرو یہی دونوں آ پہنچے ہوں تو سمجھ لو بیارے مل آ گیا تمہارا یوم الحساب۔

دفعتاً ایک، بھاری مگر دبی دبی آواز کانوں میں پڑی۔
"تعجب ہے وہ مردود کہاں چلا گیا"

"میں خود حیران ہوں" کسی نے جواب دیا "تین بجے سے پہلے تو کوئی گاڑی بھی نہیں جاتی۔"

"نہ خیر گاڑی تو جاتی ہے۔ ممکن ہے وہ دو والی سے دہلی کے رُخ چل دیا ہو۔"

"اوہ ... ہاں یہ واقعی ہم لوگوں سے چوک ہوئی۔ دو والی ضرور دیکھنی چاہیے تھی۔"

"اور کیا ... مگر اب بھی ترکیب ہو سکتی ہے۔ دو والی گاڑی جہاں کراس کرے گی وہ یقیناً اس سے اتر کر دوسری گاڑی میں بیٹھ لے گا۔ یہ دوسری یہاں تین بجے پہنچے گی اس کی تلاشی لینی چاہیے۔"

"بہت مشکل ہے۔ چند ہی منٹ تو گاڑی ٹھہرتی ہے ہم کیسے سارے ڈبے دیکھ لیں گے پھر وہ مردود تو کہیں کونے انترے میں چھپا بیٹھا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے ___" آواز پل بھر کو رُک گئی۔ شاید غور کیا جا رہا تھا۔ پھر پہلے سے زیادہ سرگوشی کے انداز میں اُبھری ___ "کیوں نہ کوئی ایسی ترکیب کی جائے کہ گاڑی کم سے کم آدھ گھنٹہ یہیں کھڑی رہے۔ میرا خیال ہے اسٹیشن ماسٹر راضی ہو جائے گا۔"

"راضی ہو جائے گا!" دوسرے صاحب چونکے۔

"اُمید تو یہی ہے۔ دس بیس خرچ ہی ہو جائیں تو کیا حرج ہے۔ اس خبیث کو اچھی طرح مزا چکھانا ہے۔"

"تو چلو اسٹیشن ماسٹر سے بھی مل لیں ___ مگر یار وہ خبیث گاڑی میں ہوا بھی تو سب کے سامنے ہم اس کا کیا بگاڑ سکیں گے"

"یہ ملنے پر دیکھا جائے گا۔ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بھی تو نہیں بیٹھا جا سکتا۔"

وہ کھٹ پٹ کرتے اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کی طرف چل دیے۔ یہ تو ان کے طرزِ گفتگو ہی سے ظاہر تھا کہ وہ قصائی اور حلوائی قسم کی کوئی چیز نہیں ہو سکتے، لیکن یہ پھر بھی یقین نہیں کیا جا سکتا تھا کہ میں اپنے ہاتھ پیر سالم بچا کر لے جا سکوں گا۔ ان کے بدن پلے ہوئے اور پشتیں چوڑی چکلی تھیں چہرے اور سینے اس لیے نہیں دیکھ سکا کہ جب کمبل کا گوشہ اُٹھا کر نگاہ دوڑائی تھی تو وہ سمتِ مقابل میں جا رہے تھے روشنی کم ہونے کے باعث داڑھیوں کا سائز بھی نہ معلوم ہو سکا۔ ویسے اندازہ یہی تھا کہ داڑھیاں ضرور ہوں گی۔ کیونکہ لباس ایسا ہی تھا جس میں صوفیت اور مولویت دونوں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ سروں پر پٹکے بھی نظر آ رہے تھے۔

مجھے کیا کرنا چاہیے؟ یہ سوال جنگلی کبوتر کی طرح کھوپڑی کی وسعتوں میں پھڑپھڑانے لگا۔ تین والی ٹرین پر اُن کی نظر بچا کر سوار ہو جانا آسان نہیں تھا۔ پھر سوار ہی ہو جاؤ تو جو اسکیم انھوں نے بنائی تھی وہ بہرحال دو دو ہاتھ پر مجبور کرنے والی تھی۔ مجھے سو فیصدی یقین تھا کہ دس دس کے دو تین نوٹ انجن کے طاقت ور پہیوں میں مطلوبہ مدت کے لیے ضرور بریک لگا دیں گے۔ نوٹ بے جان کاغذ کے بے چھپے ہوئے ٹکڑے آج کل کیا نہیں کر سکتے۔

پھر کیا راہ اختیار کی جائے؟ ___ میں نے خود سے پوچھا۔ ساتھ ہی نبض کی رفتار اور دل کی دھڑکن بھی دیکھی۔ ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ یادداشت کے خانے میں کچھ پرانی یادیں بھی کلبلائیں۔ ہائے کیا دور تھا دو دو کو کاندھوں پر اُٹھایا ہے اور میلوں دوڑے چلے جا رہے ہیں گھوڑے کی دُم پکڑ لی ہے تو دو قدم آگے نہیں بڑھنے دیا ہے کلیر شریف کے عرسوں میں نہ نانِ عاشقانِ اولیاء کے سلسلے میں کیا کیا جھمیلے نہیں ہوئے۔ چار چار گز مقابلے پر آئے مگر کون پروا کرتا ہے۔ سر سے سر ٹکرا دیے گھونسے حلقوں میں اُتار دیے۔ لوہے اور کانچ میں فرق نظر نہیں آتا تھا۔

مگر پھر شادی ہوئی۔ غمِ روزگار آیا۔ افسوس پڑی دولے کھٹر گئے۔ اب انجام کار یہ حال ہے کہ جو بچے ولادت پا چکے انھیں پال پوس کر بڑا کرنے کی فکر ہے اور جو آئندہ ولادت پائیں گے ان کے بارے میں یہ غم کھائے جاتا ہے کہ باپ کسی معرکے میں کام آ گیا تو ان یتیموں کے سر پہ کون ہاتھ رکھے گا۔

خیالات کی دنیا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ کچھ بھی ہو جائے آج ریلوے پلیٹ فارم پر ایک مار دھاڑ سے بھرپور فلم ضرور اسٹیج ہوگی۔ حال اپنا کتنا ہی پتلا ہو چکا ہو مگر فقط دو نفر سے ڈر کر منہ چھپانا سخت ذلت انگیز تھا۔ وہ بہرام ڈاکو تو ہو نہیں سکتے کہ پستول اٹھا کر ٹھائیں ٹھائیں گولیاں چلا دیں گے۔ بہت ہوا ان کے پاس چھرا ہوگا۔ مگر پلیٹ فارم یا ریل میں چھرے بازی کی جرأت کرنا آسان نہیں ہو سکتا۔ چلو کر ہی لو تو آج سے پہلے بھی تو کئی چھرے بازوں سے سابقہ پیش آچکا ہے۔ استاد غنیمت سے سیکھے ہوئے داؤ پیچ کبھی ضائع نہیں گئے۔

معاً خیال آیا کہ کیوں نہ گاڑی کی آمد سے پہلے ہی ان سے نمٹ لیا جائے جو ہونا ہے ہو جائے۔ تقدیر میں شہادت ہی لکھی ہے تو دس بیس منٹ پہلے کیا اور بعد کیا۔ پرانی یادوں نے طبیعت کو گرما دیا تھا۔

اتنے میں وہ پھر نظر آئے۔ ان کا رُخ میری ہی طرف تھا۔ ابھی تک میں کمبل کے گوشے ہی سے جھانک رہا تھا۔ وہ خراماں خراماں پہلی ہی جگہ آبیٹھے۔

"اب دیکھنا ہے دغاباز بچ کر کہاں جاتا ہے۔" ایک غرایا۔

"مگر یار ہو سکتا ہے ہمارا خیال غلط ہی ہو۔ وہ ڈو والی سے نہ گیا ہو۔" دوسرا بولا۔

"جو کچھ بھی ہو خیال آرائی کے سوا فی الحال کیا کیا جا سکتا ہے۔ یہ کیا کم غنیمت ہے کہ دس روپے میں کام ہو گیا۔"

"ہاں اس کی تو مجھے بھی امید نہ تھی — آؤ چائے پئیں۔ ابھی گاڑی کی گھنٹی نہیں ہوئی ہے۔"

"کیا شک ہیں دل کو تو سکون نہیں ہے۔ چلو خیر۔" یہ جب وہ چائے پینے گئے تو میں نے اٹھ کر کمبل تہہ کیا اور آنے والے ہنگامے کے لئے تیار ہو بیٹھا۔ اب سردی نہیں لگ رہی تھی خون جوش مار رہا تھا۔ چائے پی کر جب وہ لوٹ آئے تو میں اچانک ان کے سامنے پہنچا اور دونوں ہاتھ سینے پر لپیٹ کر عرض کیا۔

"لیجئے جناب بندہ حاضر ہے۔ آپ جو کرنا چاہتے ہوں کر گذریں۔"

میرا خیال تھا کہ وہ میری صورت دیکھ کر بے تحاشا پل پڑیں گے۔ مگر وہ تو مبہوت سے ہو کر پلکیں جھپکانے لگے۔

"آخر میں کہتا ہوں جو کچھ ہوا اس میں میرا کیا قصور تھا؟" میں نے کہا۔

"قصور کیسا؟ آپ کون ہیں؟" ایک بھپکا۔

"میں کون ہوں؟" میں حیرت زدہ رہ گیا "یہ آپ پوچھ رہے ہیں۔"

"جی ہاں۔ ہم لوگ آپ کو نہیں جانتے۔"

"کمال ہے — پھر یہ اتنی دیر سے آپ کس کے پھیر میں ہیں؟"

"اوہ —" ایک نے بنچ کی اس نشست پر نظر ڈالی جو میرے اٹھنے سے خالی ہوئی تھی۔ "تو آپ جاگ رہے تھے۔ معاف کیجئے وہ معاملہ آپ سے متعلق نہیں تھا۔"

"نہ ہوگا، مگر اتنی دیر جو مجھے ڈرایا دھمکایا گیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہوگا۔"

"ڈرانے سے کیا مطلب صاحب ہم تو آپکو جانتے بھی نہیں۔"

"تو ... تو پھر کون ہے جسے آپ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں؟"

"وہ ہمارے روپے لیکر بھاگ گیا ہے آپ آرام کیجئے ہم خود نمٹ لیں گے۔"

ہت تیرے کی۔ کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ مجھ سے بڑا احمق دنیا میں کون ہوگا جو اتنا بھی نہ سوچ سکا کہ اس شدومد سے تلاش کسی اور ہی کی ہو سکتی ہے میری نہیں۔ آدمی جب ستون کے سائے کو چور سمجھ بیٹھتا ہے تو پھر ہاتھ پیر سب صاف نظر آنے لگتے ہیں۔ میں دھپ سے ان کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"آپ کی تعریف؟" ایک نے پوچھا۔

"خاکسار کو بقاء اللہ بقائی کہتے ہیں — اور آپ؟"

"میں تو آرش علی ہوں اور یہ شہادت علی۔ آپ سن ہی چکے ہیں کہ ہمیں سخت پریشانی در پیش ہے۔"

"اللہ رحم کرے گا۔ ذرا بتلائیے تو کیا قصہ ہے کون گم ہو گیا ہے ۔۔۔ میں شاید آپ کے کچھ کام آسکوں ۔"

"اجی صاحب قصہ کیا ہوتا۔ ہمیں یتیم خانے کا مہتمم ہوں بڑی مشکل سے ہزار بارہ سو چندہ اکٹھا کیا تھا وہی خبیث لے کر بھاگا۔"

"تم اسی کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔ ہم تینوں ساتھ تھے۔ جمع اس کے پاس رکھوادی تھی۔ ابھی شام ہی سے وہ غائب ہوا ہے۔"

"کہاں ہے یتیم خانہ؟"

"ممتاز پور۔ ضلع نو پرگنہ ۔۔۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"دیوبند۔ میں خود بھی یتیم خانے کا منیجر ہوں۔ گاڑی بس آنے ہی والی ہے۔"

"جی ہاں ہمارا خیال ہے وہ اسی گاڑی میں ہوگا۔ چلیئے پلیٹ فارم پہ چلتے ہیں۔"

لیکن اسی لمحے کچھ فاصلے پر ایک شخص ادھر ہی آتا نظر آیا۔ ہماری نظریں اس سمت اٹھ گئیں۔

"ارے ۔۔۔ یہ تو رفیق ہے" وہ دونوں ایک ساتھ بڑبڑائے۔ پھر اس طرح اٹھے جیسے آنے والے کو دبوچ لیں گے۔ مگر آنے والا قریب پہنچ گیا تھا۔ یہ ایک دبلا پتلا مسکین سا شخص تھا جس کی مسکینی اس کے رنگ سے جوڑ نہیں کھا رہی تھی اتنا سرخ سفید کہ داڑھی صاف کر کے کوٹ پتلون پہن لے تو ناممکن ہے کہ اسے ہندوستانی کہا جا سکے۔ داڑھی بھی برائے نام ہی تھی گنے چنے چند بال۔

"واہ مولوی جی واہ" اس نے قریب آتے ہی شکایت کے لہجے میں کہا "آپ یہاں بیٹھے ہیں اور میں دنیا بھر میں ٹکریں مارتا پھر رہا ہوں۔"

"ارے تو تم کہاں غتربود ہو گئے تھے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے ۔۔۔"

"صاحب جان بچ گئی۔ میں پہلے صوفی بدرالحسن کے یہاں دبک گیا تھا ۔۔۔"

"جان کے بچے رقم بھی بچ گئی؟" وارث علی نے تیزی سے قطع کلام کیا۔

"ہاں جی بچ گئی مگر بڑی مشکل سے۔ سو روپے صوفی بدرالحسن کو دینے پڑے۔"

"سو روپے! کیا بکتا ہے" وارث علی دہاڑے "جلدی بتا کیا قصہ ہے؟"

"صاحب میں آپ کے پاس سے اٹھ کر ذرا حلوائی کی دکان تک گیا تھا کہ وہی چودھری مل گیا جس سے گاؤں میں بیس روپے چندہ ملا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا کہ تم لوگ چار سو بیس ہو۔ ممتاز پور میں کوئی یتیم خانہ نہیں ہے دھوکہ دے کر پیسہ بٹورتے پھرتے ہو۔"

"ابے تو تو نے کیا جواب دیا۔ جلدی بتا" شہاد علی غرائے۔

"جواب تو بہت دیا صاحب مگر وہ نہیں مانا معلوم ہوتا ہے اپنے ہی یہاں کے کسی واقف کار نے اسے اصلی بات بتادی تھی ۔۔۔"

"خیر خیر پھر کیا ہوا؟"

"میں موقع پا کر بھاگ پڑا۔ سچ کہتا ہوں صاحب بھاگتے بھاگتے کلیجہ منہ کو آگیا ہے۔ بڑی مشکل سے چکر کاٹ کر صوفی بدرالحسن جی کے یہاں پہنچا مگر وہ خبیث ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں بھی آپہنچے۔ صوفی جی نے پہلے تو انھیں بیٹھک میں بٹھایا۔ پھر اندر آکر مجھ سے سو روپے مانگے۔ میں نے کہا جی میں کیسے امانت میں خیانت کر سکتا ہوں تو کہنے لگے کہ پھر تو میں تمھیں چودھری کے حوالے کئے دیتا ہوں وہ چار لٹھ بند دوں کو لیے باہر بیٹھا ہے۔ اب بتائیے جی میں ایسے میں کیا کرتا ۔۔۔"

"ابے گدھے کے بچے دس بیس میں کام چلا لیتا ۔۔۔" وارث علی چیخے۔

"چاہا تھا صاحب۔ دس روپے دینے چاہے تھے مگر صوفی جی نے کہا سو سے کوڑی کم نہیں پھر یہ بھی کہا تھا کہ یہ چودھری بڑا ظالم ہے۔ کئی قتل کر چکا ہے زندہ نہیں چھوڑیگا۔"

"بکری کی اولاد قتل کوئی مذاق ہے" وارث علی کا

پارہ بہت اونچا پہنچ گیا۔

"مولوی جی نسل سے میں نہیں گھبراتا۔ مرنا تو برحق ہے مگر وہ مارتے تو بعد میں پہلے ساری جیب خالی کرا لیتے۔ اسی لئے میں نے سوچا کہ تُو دیکر سالے بچالوں۔"

"بس چرچر مت کر۔ لا نکال باقی سب۔"

"آپ زیادتی کر رہے ہیں مولانا" میں نے وارث علی سے کہا "یہ بیچارہ خفگی کا نہیں داد کا مستحق ہے۔"

وہ شاید بھول ہی گئے تھے کہ پاس میں بھی موجود ہوں اب چونکے اور گھگیا کے بولے:۔

"اوہ۔۔۔ ارے آپ۔۔۔ ہاں ہاں ٹھیک ہے۔"

"کیا ٹھیک ہے" میں نے مسکرا کر کہا "گھبرائیے نہیں فدوی بھی آپ ہی کا ہم پیشہ ہے۔ آپ یتیم خانہ چلاتے ہیں بندے نے بیوہ آشرم کھول رکھا ہے۔ شادی طلاق سب کا معقول انتظام۔ مشورے کا کوئی پیسہ نہیں جواب کے لئے ایک روپے کے ٹکٹ آنا لازمی ہیں۔"

چھوٹے بڑے نوٹوں کی گڈی اور بہت سی ریزگاری محرم نے اندر کی جیبوں سے نکال کر وارث علی کے حوالے کی۔ اتنے میں گاڑی کا دور سے آنے والا شور کانوں میں پڑا اور میں علیک سلیک کر کے ان سے رخصت ہوا۔ جی تو نہیں چاہ رہا تھا کہ ایسے دلچسپ لوگوں سے جدا ہوا جائے مگر نیند کی موجوں میں لہراتا ہوا دماغ مجبور کر رہا تھا کہ گاڑی میں بیٹھو اور جلدی سے گھر پہنچ کر لمبی تان لو۔

راستہ اونگھنے میں کٹا۔ میں سوچ رہا تھا انسان بھی کیسا عجیب جانور ہے خود ہی کچھ مفروضات قائم کرتا ہے اور خود ہی ان پر خیالات کی عمارت اٹھاتا چلا جاتا ہے۔ یہی مسخرہ پن ہے جس نے بے شمار سچائیوں کو دفن کر دیا اور ان گنت جھوٹ، اوہام، مفروضے حقائق بن گئے۔

گھر منھ اندھیرے پہنچا۔ ملائن کا موڈ بہت خراب تھا۔

"آپ بھی حد کرتے ہیں۔ کہاں چلے گئے تھے۔"

"شامتِ اعمال ــــ صوفی بل من مزید گرفتار کر کے لے گئے تھے۔"

"بس رہنے دیجئے ــ بھیا اس قدر بگڑ رہے تھے کہ اللہ کی پناہ۔"

"انھیں سوائے بگڑنے کے اور آتا ہی کیا ہے۔ تم نے کہا نہیں کہ وہ عاقل بالغ مرد آزاد ہے جہاں چاہے اپنی مرضی سے جا سکتا ہے ــــ بڑے آئے بگڑنے والے۔"

"جواب یہی خود آپ کہتے رہئے گا۔ میرا خیال ہے وہ فجر پڑھ کر ادھر ہی آئیں گے۔"

"مارے گئے ــــ ارے تو تم غسلخانے میں میرا پلنگ ڈالدو۔ مارے نیند کے دماغ پھٹا جا رہا ہے۔ کہدینا آیا ہی نہیں۔"

"میں کہاں تک آپ کے لئے جھوٹ بولے جاؤں، رات بھی جھوٹ ہی بول کر ان کا غصہ ٹھنڈا کیا تھا۔"

"بے حساب جنت میں جاؤ گی، کیا کہا تھا؟"

"ہٹائیے۔ میں کہاں تک آپ کے لئے اپنا اعمالنامہ سیاہ کئے جاؤں۔"

"سیاہ ارے پاگل ہوئی ہو۔ یوں کہو بلاشقت جنت کے جملہ حقوق محفوظ کر رہی ہو۔ شوہر کے لئے ایثار کا گولڈن چانس کم ہی خوش نصیب بیویوں کو میسر آتا ہے۔ ہاں بتاؤ کیا کہا تھا تاکہ میں بھی اسی کی کاپی کر سکوں، ورنہ میرا جواب تم سے مختلف رہا تو وہ تمہارے ہٹلر مارکہ بھائی وہ لکچر پلائیں گے تمھیں سچ اور جھوٹ کے فلسفے پر کہ کچھ دن تک سر پکڑے پکڑے پھرو گی۔"

"میں نے کہدیا تھا کہ دلی سے ماموں چھتو آئے تھے انھیں اپنی نواسی کے جہیز کے لئے کچھ کپڑا وغیرہ خریدنا تھا۔ آپ کو اصرار کر کے ساتھ لے گئے۔ وہ خود بازار کا کچھ تجربہ نہیں رکھتے اور انھیں کسی نے بتایا تھا کہ آپ اسکے ماہر ہیں۔"

"پھر تمہارے بھیا نے کیا کہا؟"

"وہی جو ہمیشہ کہتے ہیں۔ وہ گدھا کیا خریدیگا۔ وہ اپنا اور دوسروں کا وقت برباد کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔"

"گڈ ــــ اس کا مطلب ہے انھیں تمہاری بات پر یقین

آگیا ہے“

”آ ہی گیا ہوگا ورنہ غصہ ٹھنڈا نہ ہو جاتا — میرا خیال ہے وہ منھ پھیر کر مسکرائے بھی تھے —“

”ستیاناس پھر تو سمجھ لو انھیں ایک فیصدی بھی یقین نہیں آیا — میں خوب سمجھتا ہوں ان کی نفسیات کو۔“

”نہ آیا ہوگا - میں بہرحال آئندہ کے لئے طے کر چکی ہوں کہ جھوٹ نہیں بولوں گی۔“

”غلطی پر ہو - شوہروں کی خاطر سعادتمند بیویاں ہاتھیوں سے لڑ گئی ہیں - آگ میں کود پڑی ہیں تھیں فقط زبان ہلانے میں بھی عار ہے - یاد رکھو جہنم کے سب سے نچلے طبق میں جاؤ گی - میں کتنی بار تمھیں اطلاع دے چکا ہوں کہ میرے سلسلے میں جتنا بھی جھوٹ تم بولو گی اس کا عذاب فرشتے میرے کھاتے میں درج کر رہے ہیں تمھیں کیا غم ہے۔“

”اچھا بس چلئے جلدی سے سو رہئے اینڈھن والی کوٹھری میں پلنگ پڑا ہے اس پر بستر لگائے دیتی ہوں۔“

”نہیں - وہ تمھارے سراغرساں بھائی صاحب اس میں ضرور جھانکیں گے۔“

”تو غسل خانے میں پلنگ کہاں سماتا ہے۔“

”پھر کیا بیت الخلاء میں سوؤں — جاؤ غسلخانے ہی میں چھوٹا کھٹولا ڈال دو گٹھری بن کے سو رہوں گا۔ بارہ بجے سے پہلے ہرگز مت اٹھانا۔“

”مجھے کیا ضرورت پڑی ہے، مگر بھیا سے بعید نہیں کہ وہ غسل خانے میں بھی جھانکیں۔“

”مت جھانکنے دینا - سمجھا دینا کہ دوسروں کے غسلخانوں میں جھانکنا شریفوں کا کام نہیں۔“

”آپ ہی جو لکھ کر رکھ جائیے“ ملائن چٹکی لینے والے تبسم کے ساتھ بولیں ”میں پرچہ انھیں دیدوں گی۔“

”پرچے کے ساتھ لوہے کی چھنکنی بھی دینا میرے سر کی چار چھانکیں کھجائیں گی تو بالکل قندھاری انار کا مزا آجائے گا۔“

”چلئے آپ سوئیے - میں غسل خانے کی کنڈی چڑھا کر تالا ڈالدوں گی پھر جھانکنے کا اندیشہ نہیں رہے گا۔“

”ویری نائس - یہ کہی تم نے بہت دنوں میں ایک سمجھداری کی بات - میں سمجھ رہا تھا تم ذہنی اعتبار سے بنجر ہو چکی ہو - آئی ایم سوری۔“

”لیکن ہو سکتا ہے تالا انھیں بدگمانی میں مبتلا کر دے — اس سے پہلے کبھی غسلخانے میں تالا نہیں پڑا۔“

”نہ پڑا ہو میں اندر سے زنجیر چڑھا لوں گا — بس ختم کر دو یہ بحث - میری کھوپڑی اس وقت دو کے پہاڑے کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی۔“

کھٹولا تو کھٹولا ہے - نیند تو بقول شخصے سولی پر بھی آتی ہے میں گھٹنے پیٹ میں دیکر عالم بالا میں پہنچ گیا - یہ شاید معدے پر گھٹنوں کے دباؤ ہی کا نتیجہ تھا کہ رنگ برنگے خوابوں کا دفتر کھل گیا - ایسے خواب جن کا کوئی سر پیر نہ تھا۔ مثلاً ایک ہاتھی بھاگا جا رہا ہے میں نے اس کی دم پکڑ لی - اس نے زور لگایا میں نے بھی زور لگایا - خاصی دیر دوگاز ہی کے بعد وہ بھاگ نکلا مگر اس کی دم میرے ہاتھ میں رہ گئی - یا مثلاً صوفی تمکین کھڑے ہیں اور اچانک پھولنے شروع ہوگئے بالکل ایسے جیسے فٹ بال میں پھونک بھری جاتی ہے - پھولتے گئے پھولتے گئے یہاں تک کہ دھماکے کے ساتھ پھٹ گئے - پھر ان کا ہر پرچہ ہوائی جہاز بنکر فضا میں اڑنے لگا - لوگ شور مچا رہے ہیں کہ چین کے جہاز آگئے مگر ایک لیڈر تقریر کر رہا ہے کہ یہ امریکہ نے بھیجے ہیں -

شکر ہے بارہ بجے تک مزے سے سویا -

”کہئے جناب کیا وہ آئے تھے؟“ میں نے ملائن سے پوچھا - ان کا چہرہ اس وقت غیر معمولی طور پر کھلا ہوا تھا - کہنے لگیں :-

”جی ہاں آئے تھے اور دیکھ بھی گئے کہ آپ مقفل سو رہے ہیں۔“

”ہائیں دیکھ کیسے گئے؟“

”اب کیا بتاؤں - گھر میں داخل ہوتے ہی غسلخانے کی سمت اس طرح نظریں ڈالیں جیسے قفل ہی دیکھنے کا ارادہ

کر [illegible] بھون۔ آپ [illegible] پھر مسکرا کے مسکرا کر

سر پا یا [illegible] بولے ۔۔۔ اچھا تو مزا آگیا! میں دم بخود تھی۔ [illegible] تھی کہ اب بچی مانگیں گے یا بھی سے کہیں گے کہ قفل کھولو۔ مگر خدا جانے کیا بات تھی کہ بجائے قیامت برپا کرنے کے مسکراتے ہوئے باورچی خانے میں چلے آئے اور بڑے خوشگوار موڈ میں فرمایا ۔۔۔ لا بھئی نسیمہ ذرا اچھی سی چائے پلا دے ۔۔۔ آپ جانتے ہیں اچنبھے کی بات تھی۔ میرے خوشی کے مارے ہاتھ پیر پھول گئے۔ ایسی عقل خراب ہوئی کہ پتی دودھ میں جھونک دی۔ انڈا بجائے فرائی پان کے چائے کی دیگچی میں توڑ دیا۔ یہ دیکھ کر ان کے ماتھے پر شکنیں آگئیں سرد لہجے میں بولے۔ پاگل ہوئی ہے کیا؟ مجھے اپنے اوپر ایسا غصہ آیا کہ کیا بتاؤں۔۔۔۔

"نیک بخت میں پوری کہانی پھر سنوں گا ابھی تو خلاصہ مطلب بتاؤ ۔۔۔"

"خلاصہ تو یہی ہے کہ آج بھیا بالکل بدلے ہوئے تھے۔"

"کیا تم نے دیکھا تھا سورج آج کدھر سے نکلا؟ ۔۔۔ اگر پتھر میں بھی جونک لگ گئی ہے تو سورج یقیناً آج مغرب سے نکلا ہوگا۔"

"اجی خیر یہ تو آپ کی ناشکری ہے۔ بھیا پتھر ہوتے تو آج کوٹھی سے آپ کا تعلق باقی نہ رہ گیا ہوتا۔"

"وہ تو موم ہیں۔ شہید ہیں اور کچھ تعریف چاہتی ہو؟"

"کیوں نہ چاہوں جلئے منہ دھو لیجئے اصلی خوشخبری تو ابھی میں نے سنائی ہی نہیں۔"

"ارے تو سنا ڈالو نیک کام میں کیا تاخیر۔"

"منہ دھو کر اطمینان سے بیٹھئے پھر سناؤں گی۔"

میں منہ دھو کر [illegible] بیٹھ گیا۔

"اب فرمائیے بندہ سراپا گوش ہے۔"

"آج سے آپ کو دفتر کی پابندی سے نجات مل گئی۔"

انھوں نے چائے کی پیالی میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا ۔۔۔ میں چونک گیا۔

"نجات مل گئی ۔۔۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تنخواہ سے بھی نجات مل گئی ہو۔"

"پھر وہی بدگمانی۔ آپ تو جلاد سمجھتے ہیں بھیا کو۔"

"چلو اپنے خیالات واپس لیتا ہوں یہ تو کہو کیا معاملہ تھا؟"

"بھیا پہلے تو آپ کو برا بھلا کہنے لگے۔ بتا رہے تھے کہ دفتر کا جو بھی کام آپ کو دیا گیا اس کا بیڑا غرق ہو گیا ۔۔۔ ہائے اللہ آپ بھی تو غضب کرتے ہیں ۔۔۔"

"کیوں کیا غضب ہوا؟"

"وہ کہہ رہے تھے کہ خریداروں کے رجسٹر میں کسی سادہ صفحے پر آپ نے لیلیٰ مجنوں کی کہانی لکھنی شروع کی تھی۔۔۔"

"کیوں نہ کرتا ۔۔۔ میں اس تاریخی کہانی کو نئے زاویئے سے لکھنا چاہتا ہوں۔ اب موڈ تو اپنے بس کا نہیں جب بھی آجائے۔ کتنے ہی ادیبوں نے اپنے خون میں انگلی ڈبو کر جیل کی دیواروں پر کہانیاں لکھی ہیں ۔۔۔ خیر تم آگے کہو۔"

"آپ کے متعدد کارنامے گنوا کر انھوں نے کہا کہہ دینا اس سے اب دفتر آنے کی ضرورت نہیں۔"

"یہ الفاظ ذو معنی ہیں۔ کیا تم نے پوچھا تھا کہ دفتر سے ان کی کیا مراد ہے؟"

"میری ہمت تو نہیں پڑی مگر بے فکر رہئیے دفتر کے مفہوم میں تنخواہ شامل نہیں ہو سکتی۔"

"تمہارے منہ میں گھی شکر۔ میرا خیال ہے اب تمہارے بھیا مسلمان ہوتے جا رہے ہیں۔"

"ناشکری کی حد کرتے ہیں آپ۔ دو لفظ شکر کے تو نکالے نہیں گئے مضحکہ اڑانے لگے۔"

"خدا کی بندی یہ مضحکہ نہیں ہے حقیقت ہے۔ ایک ہم جیسے بندۂ آزاد کو دفتری پابندیوں میں جکڑ دینا اسلام کی رحیمانہ اسپرٹ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اب ایڈیٹر صاحب کو خیال آیا ہوگا کہ میں دنیا کو تو اسلام سکھو کر رہا ہوں مگر خود کفر میں مبتلا ہوں۔ بس اسی لئے شفقت کی ہر رگ پھڑک گئی۔"

ظہر کے بعد میں دفتر نہیں بلکہ ایڈیٹر صاحب کے گھر پہنچا

ایڈیٹرائن نے حسب عادت بڑی شفقت سے چائے مع لوازمات سامنے رکھدی اور کہنے لگیں:۔
"کہاں غائب رہنے لگے ہو لڑکے۔ کئی کئی دن پتا نہیں چلتا۔"
"جی ہاں جی نہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ۔"
"اچھا اچھا ۔۔۔ میں جانتی ہوں تو اونڈھے سیدھے بہانے گھڑے گا۔ بڑا نٹ کھٹ ہے۔"
اتنے میں ایڈیٹر صاحب بھی آگئے۔ میرے ہاتھ میں پیالی تھر تھر کانپ گئی۔ تعظیم کے لئے کھڑا ہو رہا تھا کہ چائے دانی اُلٹ گئی۔
"س ۔ ۔ ۔ ۔ سلام علیکم" میرے منہ سے نکلا۔
"تو آپ یہاں تشریف فرما ہیں" وہ خشک لہجے میں بولے ۔۔۔ "بیٹھ جاؤ۔"
میں بیٹھ گیا۔ یہ سمجھ میں بالکل نہیں آرہا تھا کہ انگلیوں میں تھمی ہوئی پیالی کو ہونٹوں سے لگاؤں یا ٹرے میں رکھ دوں۔
"چائے پیو" انھوں نے تحکمانہ آواز میں کہا۔ پیالی میرے ہونٹوں سے جا لگی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے عامل کے حکم پر معمول متحرک ہو۔
"نسیمہ نے تمھیں بتا دیا ہوگا کہ اب میرے دفتر کو تمھاری ضرورت نہیں رہی۔"
"جی ۔۔۔ جی ہاں۔ اللہ آپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب ۔ ۔ ۔ ۔ اررر ہپ ۔ ۔ ۔ ۔ میرا مطلب تھا کہ آپ کی بڑی مہربانی ہے۔ میں آزادی کی صورت میں کہیں بہتر خدمات انجام دے سکوں گا۔"
"بکتے ہو۔ مجھے تمھاری خدمات کی کوئی ضرورت نہیں ۔۔۔ کروگے تم خدمت شیطان کہیں کے۔"
"اے ہے یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں" ایڈیٹرائن نے للک کر کہا اور ساتھ ہی ان کا ہاتھ بڑی محبت سے میرے سر پر پہنچ گیا۔
"تم نہیں سمجھوگی ۔۔۔ اس نے پریشان کر دیا ہے۔"
"بہت کیا پریشان۔ آپ تو دراصل ہر ایک کو اپنا جیسا دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ اچھی بات نہیں اللہ نے سب طرح کے آدمی بنائے ہیں۔"
"تم نے اس کا دماغ اور خراب کیا ہے۔"
"اللہ اللہ کیجئے۔ تو جو اس کا دماغ خراب ہو۔ آخر آپ کو یہ کیا ستاتا ہے۔"
"بس بس ختم کرو" ایڈیٹر صاحب جھنجلا گئے۔
"لیجئے ختم کردیا۔ مگر اس سے خدمت تو آپ لیتے ہی رہیں گے۔"
"تم نے غلط سمجھا ۔۔۔ جس لغویت کو یہ خدمت کہتا ہے اس کا تعلق میری ذات سے نہیں۔ وہ تجلی سے متعلق ہے اور اس کی تنخواہ اسے بہر حال تجلی سے ملتی رہے گی۔"
میری جان میں جان آئی۔ ایڈیٹرائن بھی خوش ہوگئیں اتنے میں موصوف کسی کام کمرے میں چلے گئے تو ایڈیٹرائن نے بڑے پیار سے کہا:۔
"تو ان کی باتوں کا خیال نہ کیا کر۔ یہ ظاہر میں تو ایسے رہتے ہیں مگر دل میں بہن کی ایسی چاہت ہے کہ کیا کسی کو بیٹی کی ہوگی۔ جہاں ایک دو دن گذرے بس کہنے لگے کہ ارے بھئی کوئی چیز نسیمہ کے یہاں نہیں بھجوائی۔ سنگترے چل گئے ہیں وہی بھجوا دو۔ قلمی آم اچھے آرہے ہیں۔ لکھنؤ کا خربوزہ آرہا ہے۔ بریانی ہی بنالو۔ غرض خود تو کھانے پینے سے کچھ دلچسپی نہیں، مگر نسیمہ کے لئے برابر فکر لگی رہتی ہے۔"
"جی ہاں۔ لیکن وہ مجھ سے خوش نہیں ہیں۔" میں نے رودینے کے انداز میں کہا۔
"پگلا ہے تو۔ ارے تجھ سے بھی خوش ہیں۔ بس ذرا تیری بعض حرکتوں پر بھڑک جاتے ہیں ورنہ محبت تیری بھی بہت ہے۔ ابھی تین ہی دن ہوئے کہہ رہے تھے کہ اس گدھے کا اچکن پرانا ہوگیا ہے کوئی مناسب سا کپڑا منگا کر نسیمہ کو بھجوا دو سلوا دے گی۔ میں نے کہا میں براہ راست اسی کو جو دیدوں گی درزی کے دے آئے گا۔ کہنے لگے کہ ہرگز نہیں۔

اسے یہی معلوم ہونا چاہئے کہ نسیمہ نے خریدا ہے۔"

اب موصوف پھر ادھر ہی آگئے اور دفعتاً فرمایا:۔

"دیکھو میاں - یہ جو میرے ہمسائے رشید صاحب ہیں ان کی نواسی سلامت پور کے ایک گاؤں میں بیاہی جا رہی ہے - اگلے ہفتے تمھیں وہاں شریک ہونا ہے۔"

"بہت بہتر ــــ لیکن مجھے وہ لوگ کیا جانیں۔"

"فریضہ میرا ہے کیونکہ رشید صاحب میرے ہی ہمسائے ہیں - مگر میں نے ان کی خوشنودی حاصل کر لی ہے کہ تمھیں اپنی جگہ بھیج دوں تو انھیں شکایت نہ ہوگی۔"

"جیسا حکم ہو ــــ مگر - - - دیکھئے - - - - وہ میں سکنڈ کلاس سے کم میں سفر نہیں کرتا - - -"

"تمھارے لئے تو ہوائی جہاز بھی مہیا ہو سکتا ہے بشرطیکہ ہزاروں فٹ اونچائی سے چھلانگ لگانے کی مشق بہم پہنچالو ــــ گدھے کہیں کے۔"

"گدھے ہوائی جہاز میں الاؤ نہیں ہیں - آپ رشید صاحب سے فقط سکنڈ کلاس کا ریلوے کرایہ دلوادیں۔"

"تمھیں اپنے کرائے سے جانا آنا ہوگا خواہ فرسٹ میں جاؤ۔"

"مارے گئے ــــ دیکھئے میرے پاس - - -"

"ہاں ہاں" ایڈیٹرائن نے بات کاٹی "یہ اپنے ہی کرائے سے چلا جائے گا آپ بے فکر دفتر جائیے۔"

وہ چلے گئے تو ایڈیٹرائن بولیں:۔

"ارے کیوں پریشان ہوتا ہے - ابھی کل ہی تو وہ کہہ رہے تھے کہ بیس روپے نسیمہ کو دے آؤ ملا کو میری جگہ شادی میں جانا ہے۔"

"سچ - - - تو یہ منافقت برتی جا رہی ہے مجھ سے - - - خیر میرا کیا ہے اللہ خود حساب لے لے گا۔"

پھر جناب شادی میں شریک ہونا ہی تھا اور ملاقات کرنا رضوان آباد کے اسٹیشن والی تیم خانہ پارٹی سے ایک نئے رنگ میں آئندہ بیان ہوگا بشرطیکہ باقی رہ گئی زندگی اور عافیت۔

(ملا زندہ صحبت باقی)

یونس دہلوی

چینی مسلمانوں کی عید

آج جب کہ دنیا کے ہر حصے میں کروڑوں مسلمان عید مبارک کی خوشیوں میں مصروف ہوں گے، اُن مظلوموں کا دھیان بھی ہمیں رہنا چاہئے جن پر دنیا کی بدترین عید کیا، دنیا کی ہر خوشی ہی حرام کر رکھی ہے۔

آج شاید ہم تصور بھی نہ کر سکیں کہ اس دنیا میں ایسے کروڑوں مسلمان بھی موجود ہیں، جن پر جبر کا پہرہ ہے کہ وہ عید نہیں منا سکتے چین میں چونکہ ہر تہوار منانے کے لئے سرکاری راشن کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے وہی تہوار منائے جا سکتے ہیں، جو سرکاری طور پر تہواروں کی فہرست میں شامل ہوں

ان "سرکاری" تہواروں پر شکر، گوشت اور چاول کا مزید راشن وغیرہ مل سکتا ہے، جہاں تک کپڑے کا تعلق ہے، تین گز فی کس سالانہ سے زیادہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ عید کے موقع پر چین کے مظلوم مسلمان بھی کسی طرح کی عید کی خوشیاں منا سکیں گے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ چین کی چھٹیوں اور تہواروں کی سرکاری فہرست میں عید کیا کسی بھی مسلم تہوار کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ حتیٰ کہ سنکیانگ اور کیانسو کے علاقوں کی مقامی چھٹیوں اور تہواروں کی فہرست میں بھی عید کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ حالانکہ ان علاقوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔

چینی حکومت کا ایک شیطانی فعل یہ ہے کہ اس نے نماز باجماعت کو چار برس پہلے قانوناً اس بہانے سے ممنوع قرار دیا تھا کہ یہاں سے بغاوت پھیلنے کا اندیشہ ہوتا ہے سنکیانگ کے دارالحکومت، شنگھائی کے پیش امام جناب عبدالترین واحسن کو گمشدگی میں محض اسی جرم میں "لاپتہ" کر دیا گیا تھا کہ انہوں نے ایک نماز عید کی رہنمائی کی تھی۔ اس سے بھی بڑا ستم یہ ہے کہ چین میں باقاعدہ شائع شدہ قانون کے مطابق کسی طرح کا ذہنی روزہ رکھنا یا اس کی تلقین کرنا جرم قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ چینی حکمرانوں نے خود جو حالات پیدا کر رکھے ہیں انہیں مستقل روزوں سے بہتر نہیں کہا جا سکتا، فرق صرف یہ ہے کہ ہم نے روزے رکھے تھے تو آج عید کا جشن منا رہے ہیں، لیکن چینی مسلمانوں کی عید نہ جانے کب ہوگی۔

اسی جبر و ستم کا پردہ تار تار کرتے ہوئے پچھلے مہینے یہ خبر آئی تھی کہ سنکیانگ کے صوبے میں زبردست بغاوت ہو گئی ہے حالات اس قدر خراب ہو گئے تھے کہ خود چینی اخباروں کے کہنے کے مطابق فوج کو مداخلت کرنا پڑی تھی بعض مبصروں کا کہنا ہے کہ چینیوں نے جو جنگ بندی کی تھی اس میں بھی اس بغاوت ہی کا دخل تھا۔

بہرحال اس خبر سے یہ ثابت ہو گیا کہ تمام تر جبر کے بعد چینی حکمران اپنے شیطانی ارادوں میں رتی بھر کامیاب نہیں ہو سکے چین میں اکثریتی ہن نسل کے لوگوں کے علاوہ تبتی اور مذہبی اقلیتوں کی بھی خاصی آبادی ہے۔ ان سے مسلمانوں کی آبادی کبھی سالمے تین کروڑ سے اوپر ہی بتائی جاتی تھی۔ اب چینی حکمرانوں کا کہنا ہے کہ چین میں مسلمان تقریباً ایک کروڑ کے لگ بھگ ہوں گے۔ گویا زبان کی معمولی سی جنبش کے ساتھ ہی انہوں نے ڈھائی کروڑ سے زیادہ انسانوں کو لاپتہ کر دیا ہے۔ بہرحال یہ ایک الگ سوال ہے کہ ان ڈھائی کروڑ مظلوم انسانوں کا کیا حشر ہوا۔

دیکھنا یہ ہے کہ جو ایک کروڑ مسلمان چینی حکمرانوں کے اپنے دعوے کے مطابق چین میں موجود ہیں، وہ کس حال میں ہیں۔ ان مسلمانوں کی تقریباً ساٹھ فیصدی آبادی "ہوئی" گروہ سے تعلق رکھتی ہے یعنی ایسے مسلمان جو چینی ہی بولتے ہیں۔ دوسرا حصہ تقریباً ۳۰ فیصد "ایغور" نسل کے لوگوں کا ہے۔ ہوئی لوگ چین کے مختلف حصوں میں آباد ہیں لیکن "ایغور" عوام سنکیانگ ہی میں بستے ہیں۔

چینی حکمرانوں نے طاقت سنبھالتے ہی اقلیتوں کے مذہب، تمدن اور نسلی ورثے کو ختم کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ پہلا کام یہ کیا گیا کہ ان علاقوں میں ہن نسل کے تربیت یافتہ سیاسی کارکنوں کی آبادکاری کی گئی۔ دوسری جانب ترغیب اور جبر دونوں طریقوں سے کام لیتے ہوئے اقلیتوں کو ان کے خاص علاقوں سے نکال کر دوسرے علاقوں میں بھیجا گیا۔ ہن نسل کے آبادکاروں اور مقامی لوگوں کے درمیان مسلسل جھگڑوں کی خبروں کو خود چینی حکمران بھی چھپا نہیں سکے۔

چین کے ایک سرکاری رسالے "قومیتوں کے اتحاد" نے اپریل، مئی اور اکتوبر ۱۹۶۲ء کی اشاعتوں میں اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا کہ مذہبی توہمات سے اقلیتوں کے دماغ صاف کرنے کی مہم امید کے مطابق کامیاب نہیں ہوئی۔ یہ بھی محسوس کیا گیا کہ وہ اپنے مدرسوں کی بجائے چینی اسکولوں کو پسند نہیں کرتے۔ سنکیانگ میں عربی رسم الخط کو ختم کرنے کے اقدامات کی بھی زبردست مخالفت ہوتی رہی ہے۔ اسی شیطانی مہم کو کامیاب بنانے کے لئے سنکیانگ اور کیانسو کے علاقوں میں مسجدوں کے مذہبی استعمال پر پابندی لگا دی گئی۔ مذہبی تعلیم پہلے ہی منع تھی، اب عام عربی تعلیم کو بھی ختم کر دیا گیا۔

صورت حال یہاں تک خراب ہوئی کہ لندن کے مشہور رسالے "فار ایسٹرن اکنامک ریویو" کو لکھنا پڑا کہ دنیا میں کہیں بھی کسی اقلیت کا اس قدر بُرا حال نہیں ہوا جتنا کہ چین میں مسلمانوں کا ہوا ہے۔ اس رسالے نے لکھا کہ چین میں مسلمانوں کے مذہبی نشانات مٹانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی، بلکہ اس منصوبے کے تحت کام ہو رہا ہے کہ وہاں پر مسلمان عوام بطور نسل ختم ہو جائیں۔

۱۹۵۶ء ہی میں ۱۲ مئی کے شمارہ میں پیپلز ڈیلی نے خبر دی تھی کہ ماؤ تسے تنگ کے پیدائشی صوبے ہونان ہی میں مسلمان لیڈروں نے ایک زبردست عوامی بغاوت کی رہنمائی کی۔ اس جرم میں بیسیوں حریت پسندوں پر مقدمے چلائے گئے، اور انہیں موت اور طویل المیعاد قید کی سزائیں دی گئیں۔ چینی اخباروں ہی کی خبروں کے مطابق سنکیانگ میں پچھلے پانچ برسوں میں کم از کم سات بار بغاوت ہو چکی ہے۔

اسی ظلم و ستم کا ایک ثبوت وہ چینی ترکستانی مہاجر بھی ہیں جو سری نگر میں آج بھی موجود ہیں۔ موجودہ بغاوت کی بنیادی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سنکیانگ کی مسلم اکثریت ایک حقیر سی اقلیت میں بدل جائے۔

یہ وقت ہی بتا سکے گا کہ تاریخ کے اس بدترین ظلم و جبر کے خلاف [illegible] اور بےکس عوام کی آزادی پسند جد و جہد کا آخری نتیجہ کیا ہو گا۔

ایک مکتوب

جناب ایڈیٹر صاحب ماہنامہ "تجلّی" ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

بجواب مضمون مندرجہ تجلّی ماہ جنوری ۶۳ء عرض ہے کہ:۔

میں نے تجلّی ماہ جنوری ۶۳ء کا وہ پرچہ دیکھا جس میں "تجلّی کی ڈاک" کے عنوان کے تحت میرے بارے میں جناب والا نے خامہ فرسائی فرمائی ہے۔ یہ پرچہ بھی میں نے اُس وقت پڑھا جب کہ ایک صاحب نے مجھے اطلاع دی کہ تجلّی میں آپ کے بارے میں ایک مضمون چھپا ہے۔

مجھے یہ مضمون دیکھ کر رنج بھی ہوا اور حیرت بھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کو حقیقتِ حال کا علم ہو جائے تو مجھ سے زیادہ رنج اور افسوس آپ کو ہوگا۔ یہ کس قدر افسوسناک بات ہے کہ لوگ بغض وعناد کی وجہ سے ذاتی اور خانگی مخاصمت کا انتقام لینے کے لئے اپنی پہلی تدبیروں میں ناکام ہو کر ایک دینی رسالے کے ذمہ دار ایڈیٹر کو اور اُس کے وقیع ومعیاری پرچے کو آلہ کار بنا لیں۔ جو پرچہ اعلاءِ کلمۃ الحق اور اشاعتِ دینِ برحق کے مقدس مقصد کو لیکر نکلا ہو اُس کو تشنیع وتعریض کا اور انتقام لینے کا آرگن بنا لیا جائے۔

آپ نے تجلّی ماہ جنوری ۶۳ء میں تجلّی کی ڈاک کے عنوان کے تحت تحریر فرمایا ہے کہ ضلع کریم نگر (آندھرا پردیش) کے کسی یعقوب علی صاحب نے مجھے ماہ نومبر ۶۲ء کا تجلّی بتلایا تو اس کو پڑھ کر میں نے آپ کو "لونڈا" کہا العیاذ باللہ۔ میں اس وقت صرف اسی جزو کے جواب پر اکتفا کرتا ہوں کیونکہ آپ کا سارا مضمون اسی یقین اور تأثر کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ میں نے آپ کو "لونڈا" کہا۔ اِسی جھوٹی اور غلط رپورٹ سے متأثر ہو کر بلا تحقیق آپ نے سات صفحے سیاہ کر ڈالے۔ خیر۔

برادرِ محترم! مجھ پر یہ الزام غلط اور بے بنیاد ہے۔ رسالہ مندرجہ مضمون زیرِ جواب کے پڑھنے سے قبل میں نے آپکا کوئی پرچہ یا کوئی مضمون پچھلے دو تین برسوں میں پڑھا ہی نہیں اور نہ ماہ نومبر ۶۲ء کا تجلّی کسی نے مجھے بتلایا۔ یہ بالکل بناوٹی بات ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں، اسلئے بہتر یہ ہے کہ آپ اپنے مراسلہ نگار یعقوب علی صاحب کریم نگر کو لکھیں کہ کریم نگر کے امیرِ جماعت اسلامی اور وہ "اہلِ خیر" جو کے یہاں کریم نگر میں درسِ تفسیر ہوتا ہے اور جن کی طرف جناب نے اپنے مضمون میں اشارہ بھی فرمایا ہے۔ اِن دونوں کے سامنے میری موجودگی میں یعقوب علی صاحب ثبوت پیش کریں کہ اُنکا بیان مبنی بر صداقت ہے۔ اُمید ہے کہ میری یہ تجویز آپ پسند فرمائیں گے اور اس کو روبہ عمل لانے کی ممکنہ سعی فرمائینگے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سارا واقعہ فرضی ہے اور یہ یعقوب علی بھی فرضی ہیں۔ نہ تو کسی یعقوب علی نے نہ کسی اور نے مجھے ماہ نومبر کا یا کسی اور مہینہ کا تجلّی بتلایا نہ اس کے بارے میں مجھ سے کسی قسم کی گفتگو ہوئی نہ میں نے آپ کو "لونڈا" کہا نہ کچھ اور کہا۔ آپ کو میں یقین دلاتا ہوں کہ نومبر کا وہ پرچہ میں نے اب بھی نہیں دیکھا جس کو بنیاد بنا کر یہ ہنگامہ برپا کیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ساری داستان من گھڑت ہے میں آپ کو خدانخواستہ "لونڈا" کیوں کہتا جب کہ مجھے آپ کے بارے میں کچھ معلومات ہی نہیں۔ نہ مجھے آپ کی عمر شریف کا

انداذہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ عمر میں مجھ سے بڑے ہوں۔
علم و فضل میں تو آپ کی بڑائی ظاہر ہی ہے کہ بقول مراسلہ نگار
میں صرف میٹرک کامیاب اور آپ فاضل دیوبند۔ میں مدرّس
اور آپ مدیر۔

اصل بات یہ ہے کہ کریم نگر میں کچھ حضرات ہیں جن کو فتنہ و
فساد بہت پسند ہے۔ سال ڈیڑھ سال سے یہاں ایک گونہ سکون
ہے۔ انتشار پسند طبیعتوں کو سکون نہیں بھاتا اس لئے ان
مفسدوں نے یہ ترکیب نکالی کہ کمترین کو ہدف بناکر اور آپکو
اُکساکر ایک انتشار پیدا کریں۔ چنانچہ آپ نے ان کے منشاء
کی تکمیل بھی کردی کہ میرے علاوہ جماعت تبلیغی اور جمعیۃ العلماء کو
چھیڑ بھی دیا ہے اور مفسدین آپ سے یہی کام لینا چاہتے تھے۔
یہی وہ فتنہ پرداز ہیں جو میرے بارے میں سررشتہ تعلیمات
کے اعلیٰ حکام کے پاس وقفہ وقفہ سے گمنام درخواستیں بھیجتے
رہتے ہیں کہ حبیب الرحمن جماعت کا سرگرم رکن ہے۔ جب
اس ترکیب سے کام نہیں چلا اور اُن کو اپنے مقصد میں ناکامی
ہوئی اُن لوگوں نے آپ کا سہارا لے کر جھوٹی رپورٹیں کر کے
آپ کو متأثر کر کے میرے خلاف مضامین شائع کرانے کی مہم
شروع کی ہے۔ میرے بارے میں تو سررشتہ تعلیمات کے
اعلیٰ حکام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ میں جماعت
اسلامی کا سرگرم رکن ہوں اور آپ کو باور کرایا جارہا ہے کہ
جماعت اسلامی کی مخالفت میرا مستقل شغل ہے۔ مقصد یہ ہے
کہ جس طرح بھی مجھے نقصان پہنچ سکتا ہے پہنچایا جائے۔ آپکے
مضمون کے دیگر اجزاء کی تفصیل میں میں جانا نہیں چاہتا کہ
یہ سب بہت وقت طلب باتیں ہیں۔

میرا فرض تھا کہ حقیقت حال سے آپ کو باخبر کردوں
میں نے اپنا فرض پورا کردیا۔ اب آپ ہی خود فرمائیں کہ
آپکے مضمون سے میری جو توہین و تشہیر ہوئی ہے اُسکی تلافی
کیونکر ممکن ہے۔ آپکی مدیرانہ فراخ حوصلگی اور عالی ظرفی سے
مجھے توقع ہے کہ آپ میرا یہ جواب بعینہٖ آئندہ اشاعت میں شائع
فرمادیں گے۔ والسلام۔ خاکسار سید حبیب الرحمن مدرس
گلی پیڈ پرائمری اسکول۔ ضلع کریم نگر (آندھرا پردیش)

جواب:-

جناب مکرم سلام مسنون۔

یہ سیدھی سی بات تو آنجناب بھی جانتے ہی ہوں گے
کہ مفتی یا مجیب کا کام یہ تحقیق کرنا نہیں ہوتا کہ مستفتی یا سائل
نے جو واقعات پیش کئے ہیں وہ حقیقتاً بھی واقعات ہیں
یا نہیں۔ پھر جو شخص ہر ماہ اپنے جریدے میں گوناگوں سوالات
کے جوابات دیتا ہو اس کے لئے ممکن بھی کب ہے کہ مختلف
دور دراز مقامات سے آنے والے سوالات کو عدالتی نوع
کی تحقیق کے میزان میں تول سکے۔ وہ تو بس اتنا ہی کر سکتا ہے
کہ سوال میں جو تفصیلات درج ہیں ان پر اپنی رائے ظاہر
کردے۔

لیکن آپ کے معاملے میں اگر سائل نے غلط بیانی کی ہے
تو یہ افسوسناک ہے اور اس گناہ کے لئے یقیناً اسے خدا کے
یہاں جواب دہی کرنی ہوگی۔ میں تو صرف اتنا ہی کہہ سکتا
ہوں کہ نفس واقعہ غلط ہونے کی صورت میں میرا تمام ریمارک
کالعدم ہوجاتا ہے اور اس سے آپ کو اثر قبول نہیں کرنا
چاہیئے۔ رہی توہین و تشہیر کی بات۔ تو اسی کی تلافی کے لئے
آپ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے گرامی نامہ جوں کا توں
شائع کردیا گیا ہے۔ اب اس سلسلہ میں مزید بحث بیکار ہے

اور یہ جو آپ کو اندیشہ ہے کہ میں خدانخواستہ آپکو جھوٹا
سمجھوں گا، تو اسے دل سے نکال دیجئے۔ مجھے آپ سے کیا عناد
ہوسکتا ہے کہ بات کا اعتبار نہ کروں۔ جھوٹا کون ہے اور
سچا کون، یہ تو اللہ خوب جانتا ہے اور وہی حساب کرلیگا
میرے لئے آپ بھی محترم ہیں اور تمام وہ لوگ بھی جن کے
صادق یا کاذب ہونے کا مجھے کوئی علم نہیں۔ فقط والسلام

عامر عثمانی

[illegible] ذہانت کی [illegible] نہیں بات کہنے کا سلیقہ بھی [illegible] عطا فرمایا ہے ان اوصاف کا آدمی مسند [illegible] جلوہ افروز ہوگا تو ظاہر ہے کہ جچ جائے گا۔ عباسی صاحب کی [illegible] لغزشوں کا جغرافیہ بیان کرنے میں موصوف نے بڑی [illegible] طباعی اور ساتھ ساتھ خوش طبعی کا بھی مظاہرہ فرمایا ہے [illegible] اس میں آیا کہ لب و لہجہ تبسم کی کھنک لئے ہوئے ہے [illegible] اس سے ہوئی کہ عنوان یہ رکھا گیا ہے۔

"ناصبیت تحقیق کے بھیس میں"

یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی بریلوی یہ عنوان داغے

"وہابیت دیوبندیت کے بھیس میں"

ایسے عنوان بالعموم یہ پتہ دیتے ہیں کہ ذہن کا کوئی نہ کوئی گوشہ تاریک ضرور ہے تنقید کو صرف غالب حد تک علمی بھی ہیں اسی لئے کہنا پڑا کہ پورے طور پر علمی یہ اسی وقت کہلاتی جب عباسی صاحب کی غلطیاں چھانٹنے والا ناقد قارئین کی صراطِ مستقیم ہی پر لے چلتا لیکن ہمارا تاثر یہ ہے کہ عباسی صاحب کو ناصبی ٹھہرانے والا خود بھی صراطِ مستقیم کی طرف نہیں جا رہا۔

شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ عباسی صاحب اگر مولانا نعمانی کے دعوے کے مطابق ناصبیت پر مائل ہیں تو خود مولانا منزلِ رفض و تشیع کی طرف گامزن ہیں انھوں نے عباسی صاحب کی غلطیاں چھانٹیں لیکن ان غلطیوں کی جگہ دوسری غلطیاں رکھ دیں یہ بجا ہے کہ نقد اکثر مقامات پر جاندار ہے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ناقد صحیح نقاطِ نظر کی ترجمانی کرنے میں نہ صرف ناکام ہیں بلکہ ایک فاسد اندازِ فکر کو صحیح و برحق اندازِ فکر سمجھے بیٹھے ہیں اُنھوں نے عباسی صاحب کا رد تو کیا مگر خود بھی ایسی روایات پر تکیہ کر بیٹھے جو دریا برد کر دینے کے لائق تھیں یزید کی مدح میں لوگوں کو بڑا مزا آتا ہے اور کتنے ہی کاریگروں نے تو اس بیچارے کی قبر پر لات مارنے کے شوق میں تاریخ کے نام پر ناول لکھ ڈالے ہیں کاش مولانا نعمانی جیسا صاحب نظر ناصبیت کے رد میں ساتھ اس شیعیت کا بھی رد کرتا جو "یزید" کی آڑ لیکر روافض نے پھیلائی ہے ناصبیت اگر دس ڈگری کی نجاست ہے تو شیعیت ساڑھے دس ڈگری کی خبر لاتی ہے۔ ناصبیت اگر غلاظت ہے تو شیعیت بھی حلوۂ تر نہیں ہے۔ یہ شیعیت

[illegible] ہے کہ [illegible] مقالات پر عباسی صاحب [illegible] قلم کیا گیا ہے بڑی بدنصیبی ہے ملت کی کہ جس کذب و افتراء کو پہلی اور دوسری صدی ہجری کے منافقین و زنادقہ نے اسلام کے انہدام اور ملت مسلمہ کی بربادی کے لئے ہر طرف پھیلایا تھا اسے ابن جریر مسعودی، سیوطی اور اسی نوع کے دیگر روایت پرستوں نے کتابوں میں محفوظ کر دیا اور رفض و سبائیت کے خمیر سے پیدا شدہ سانپ بچھوں کو فریب خوردہ لوگ مرغ و ماہی سمجھ کر نوش جان کر گئے۔ اس کا حاصل ہوئے اس کے کیا ہوتا کہ یزید کی بوٹیاں نوچنے کو خدمتِ دین کہا جائے اور امیر معاویہ کی تخفیف و تحقیر کو عقیدت اہل بیت کا نام دیا جائے۔

مولانا نعمانی کی خدمت میں ہم ادب سے گذارش کریں گے کہ ناصبیت کے ساتھ و شیعیت کی بھی خبر لیں اور اپنے بہترین علم و فہم کے ذریعہ تاریخ کی ایسی توجیہ پیش فرمائیں جس سے صحابیت کا ناموس محفوظ رہ جائے۔ یہ یزید کی قبر میں بہر کیڑے ڈالے جانا اور بیٹے کی آڑ لیکر باپ کی رسوائی کا سامان مہیا کرنا اچھا کام نہیں ہے معاویہ امت کے محسن ہیں ان کا شکریہ ادا کرنے کی توفیق نہیں تو کم سے کم اتنا گراہوا تو مت قرار دو کہ طبیعتیں نفرت کھائیں۔ [illegible] سید الابرار سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح تڑپ [illegible] جس بندۂ خدا کو ہم نے ہادی و مہدی ہونے کی دعا دی تھی آج ہماری امت فاسق و بدنہاد قرار دے رہی ہے! اے روح محمدؐ فریاد!

• "بینات" کا سالانہ چندہ چھ روپے اور ایک پرچے کی قیمت ۷۰ پیسے ہے۔ پتہ یہ ہے:-
شعبۂ تصنیف مدرسہ عربیہ اسلامیہ۔ نیو ٹاؤن۔ کراچی ۵
(عامر عثمانی)

کھرے کھوٹے

تبصرے کیلئے کتاب کے دو نسخے آنے ضروری ہیں

مولانا مودودی سے ملئے

از :- اسعد گیلانی ——

ناول سائز —— صفحات ۴۴۱ —— قیمت مجلد مع گرد پوش چھ روپے پچاس نئے پیسے۔

ناشر :- آزاد بک ڈپو ۔ سرگودھا ۔ پاکستان۔

بھارت میں مکتبہ الحسنات رام پور یوپی سے منگا سکتے ہیں

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی دامت برکاتہم اس دور فتن کی ایک صالح ترین شخصیت ہیں جونکہ عمل کی انقلاب آفرینی کے لحاظ سے ابھی خاصی ایک انجمن —— ایک تحریک اور ایک عہد کا درجہ رکھتے ہیں۔ مقام شکر ہے کہ اسعد گیلانی جیسے ستھرے اور سلجھے قلمکار نے موصوف کی شخصیت کا ایک بھرپور تعارف کرانے کے لئے ایسی ضخیم اور مرتب ومنظم کاوش پیش کی۔ کتاب کا پورا نام ہے " مولانا مودودی سے ملئے —— ان کے پاس آپ کے لئے ایک اہم پیغام ہے " ——

جس طرح کتاب کا نام دو پہلو رکھتا ہے اسی طرح کتاب دو حصوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ پہلا حصہ مولانا مودودی کی شخصیت کا تعارف کراتا ہے زندگی اور اس کے اتار —— سنوار اور پھیلاؤ کی ارتقائی کہانی سناتا ہے دوسرا حصہ مولانا کی تصانیف اور خطوط اور تقاریر و ملفوظات کے سہارے مولانا کے فکری پیغام کو نشر کرتا ہے شخصیت کے تعارف والے حصے میں مختلف علماء اور فضلاء کے تاثرات کو مولانا کے بارے میں شامل کر کے مرتب نے تعارف کو شرح صدر تک پہنچانے کی اچھی کوشش کی ہے

ابتدا میں نعیم صدیقی صاحب کا دیباچہ اور مرتب کے قلم سے حرف اول ہے جو اس وسیع وگرامی شخصیت کی تصویر کشی کے مقصد و اسلوب سے متعارف کراتا ہے۔

مجموعی طور پر کتاب بہت مفید اور دلکش ہے وزنی اور ٹھوس ہے۔ دلچسپ اور رواں دواں ہے پڑھنے کی قیمتی چیز ہے لیکن چند گوشے جو قابل غور اور محل نظر دکھائی دئے ان کی طرف سرسرا سا اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے ——

کتاب کے پہلے حصے یعنی " مولانا مودودی سے ملئے " کے ذیل میں سب سے پہلے صفحہ ۴ پر مولانا مودودی کے بارے میں وہ کاگئی وہ رائے کھٹکتی ہے جسکو بے دریغ مولانا ابوالکلام آزاد کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ حالانکہ زیادہ دن نہیں ہوئے کہ پاکستانی اخبارات ورسائل میں مولانا آزاد کی طرف منسوب کردہ " یہ رائے " جرح وتعدیل کے مرحلے سے گزر چکی ہے اور مدلل طور پر اس کو " فرضی اور خود ساختہ " ثابت کرنے کی کاروائی عمل میں آچکی ہے ایسی مشکوک ومشتبہ رائے کا استعمال کتاب کی ثقاہت کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔

دیباچہ میں نعیم صاحب نے مولانا کی شخصیت کے تعارف کی راہ کی جو نازک ولطیف دشواریاں گنائی ہیں اور مرتب نے حرف اول میں خود بھی اسی آہنگ میں اس قسم کی باتیں دہرائی ہیں معاف کیا جائے اس سے کافی حد تک شخصیت سرائی کی بو آتی ہے! کوئی شک نہیں کہ مولانا مودودی کا مکمل تعارف کرانا ایک دشوار کام کی جو جہتی دشواریاں اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے لیکن یہا

اظہار جس زبان میں کیا گیا ہے اس میں مبالغہ آرائی، غلوکیشی اور مرعوبیت کی حد تک بڑھی ہوئی عقیدت کے تیور کچھ چھپے نہیں !۔ اسلئے کہ جس ہستی نے خود ہی شخصیت پرستی کے بتوں پر کاری وار کر کے حق پرستی اور اصول پسندی کی روشن راہ دکھائی ہے اسی کی شخصیت بیان کرتے ہوئے اگر شخصیت پرستی میں، شخصیت سرائی ہی کا ترشح ہونے لگے تو یہ غالبًا ایک زیاں سے کم نہیں۔ مثلاً صفحہ ۴۰ پر یہ جملہ کہ "حتیٰ کہ ان کے نادان حریف بھی تنہائیوں میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ آدمی بس وہ ایک ہے جو نہ کبھی بکا، نہ جھکا" ۔۔۔ بجا کہ مولانا مودودی کی یہی شان ہے لیکن یہ "بس" کے لفظ سے اس شان کردار کو صرف ان تک محدود کرنے کا انداز چہ معنے دارد ؟۔

مولانا کی تصانیف کا جہاں تعارف کرایا گیا ہے وہاں اگر تشہیری نقطۂ نظر کے بجائے تنقیدی انداز اختیار کیا جاتا تو زیادہ زیب دیتا۔ اس طرح جس عظیم ہستی کی خوبیوں کا ذکر جمیل چھڑا وہاں قابل تنقید پہلوؤں کے اشاروں سے اعتدال کی چاشنی آجاتی۔ مثلاً "تجدید و احیائے دین" میں شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں مولانا کے قلم سے تصوف کی بابت "چنیا بیگم" جیسا لفظ نکل گیا تھا اور تنقید میں شدت آگئی تھی۔ اس کی شدت کو مولانا موصوف نے خود تشریح و توضیح کر کے دور فرما دیا تھا۔ اس طرح کے گوشوں کی طرف اشارہ کر دیا جاتا تو کتاب کی بے لاگ نوعیت کو چار چاند لگ جاتے۔

مولانا کی شخصیت پر جو علماء و فضلاء کے خیالات دیئے گئے ہیں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں سے لئے گئے ہیں کوئی شک نہیں کہ یہ سب بیانات حقیقی ہیں جیسا کہ ہم خود مولانا عامر عثمانی مدیر تجلی والے ٹکڑے کو دیکھکر گواہی دے سکتے ہیں، تاہم حوالوں کی کمی ایسے مقام پر تاریخی فروگذاشت سے کم نہیں محسوس ہوتی۔

ان چند دوستانہ مشوروں کے بعد ایک بار پھر جی چاہتا ہے کہ اسعد گیلانی کی اس عرق ریز کاوش کو خلوص کے ساتھ سراہا جائے۔ خدا ان کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے ایک کرنے کا مشکل کام کر دکھایا اور موجودہ دور ہی نہیں آئندہ زمانے تک کے لئے روشنی کا ایک مینار اور افادیت کا ایک سنگ میل

تعمیر کردیا۔ (شمس نوید عثمانی)

اسلامی معاشرہ

از :- محمد یوسف صاحب اصلاحی ۔۔۔ ناول سائز ۔۔۔ صفحات ۲۰۰ ۔۔۔ قیمت :- ایکروپیہ پچاس نئے پیسے۔

ناشر :- مکتبہ الحسنات رام پور۔ یوپی۔

اس کتاب میں مصنف نے یہ بتانے کی شگفتہ و موثر کوشش کی ہے کہ اسلامی معاشرہ کن عقائد و نظریات کی اصولی بنیادوں پر تعمیر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے اور ایک بار ہو چکا ہے۔ اس بات کو ذہن نشین کرانے کے لئے کتاب و سنت کی تعلیمات کا تعارف کرایا گیا ہے اور جا بجا اسلاف کے عملی واقعات پیش کر کے ان تعلیمات کی جیتی جاگتی تصویر دکھادی ہے۔ کتاب میں خواتین کو خطاب کیا گیا ہے لیکن درحقیقت اس کے مخاطب مرد و زن یکساں طور پر ہیں۔ زبان ہلکی پھلکی استعمال کی گئی ہے جس میں رس بھی ہے اور رچاؤ بھی۔

صفحہ دس پر کہا گیا ہے کہ " تمام اعمال کا سرچشمہ ذہن و دماغ ہیں" یہاں ذہن و دماغ کے بجائے "قلب و ذہن" کے الفاظ اسلامی نقطہ نظر کے زیادہ قریب پڑتے۔ ذہن و دماغ کے بجائے حضور نے قلب کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس کے بناؤ اور بگاڑ سے پوری زندگی متاثر ہوتی ہے۔

صفحہ ۱۳ پر اور اسی طرح آگے آیات کے ترجمہ میں حضور کے لئے "تو" کے بجائے "آپ" کا لفظ ترجمہ میں استعمال کیا گیا ہے اور یا تو بات اسی کی متقاضی ہے، اسلئے کہ اردو میں "تو" کی ضمیر میں "آپ" والا احترام کہاں۔ لیکن جہاں خدائے عز و جل حضور کے لئے "تو" کی ضمیر استعمال کرتا ہے وہاں عبد و معبود کے درمیان یہ انداز "آپ" کے مقابلہ میں زیادہ فطری لگتا ہے۔ صفحہ ۱۴ پر لکھا ہے کہ " ایک غیر مسلم خاتون ایک مسلم مرد کے گھر کی زینت نہیں بن سکتی" ۔۔۔ حالانکہ اہل کتاب غیر مسلم خاتون سے نکاح کی اجازت اسلام دیتا ہے !۔۔۔ یہاں سہو ہو گیا ہے غالبًا مصنف کو بعض جگہ کتابت کی غلطیاں ملیں مثلاً صفحہ ۲۴ پر "جس شخص نے بھی کسی ال

تم میرے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کیا جائے" میں "جائے" کا لفظ غلط آگیا ہے۔ بہرحال مجموعی طور پر کتاب بہت پاکیزہ۔ ایمان افروز اور فکر انگیز ہے۔ اور اس قابل ہے کہ صنف ناٹک میں اسلامی روشنی پیدا کرنے کے لئے مسلم گھرانوں میں اس سے استفادہ کیا جائے کتاب و سنت کے اقتباسات اور واقعات کے انتخاب میں کافی ذوق و تلاش کا ثبوت دیا گیا ہے اور ہر جگہ انتخاب میں حسن و گداز ملتا ہے
(شمس نوید)

ابن مبارک رح

از :۔ محمد یوسف صاحب اصلاحی ۔۔۔۔

ناول سائز۔ صفحہ ۴۷۔ قیمت ۵۰ نئے پیسے۔
ناشر:۔ مکتبہ الحسنات رام پور۔ یو پی۔

علم حدیث کے مشہور امام، علم و عمل کی ایک نمایندہ شخصیت حضرت ابن مبارکؒ اسلامی تاریخ کا ایک تابناک عنوان ہیں۔ اصلاحی صاحب نے ان کے حالات زندگی کو اس کتابچہ میں بچوں کے لئے آسان و دلنشین زبان میں ترتیب دیا ہے۔ انداز ایسا پیارا ہے کہ کہانی دل میں اترتی جاتی ہے مثلاً اختتام کتاب پر یہ ٹکڑا امزا دے گیا کہ "رمضان کا مبارک مہینہ تھا کہ ابن مبارکؒ ایمان و عمل کا تحفہ لئے ہوئے اپنے رب کے حضور پہنچے...... مگر یہ ایک نرالا ہی سورج تھا غروب ہوا تو اس کی روشنی کچھ اور پھیل گئی" کتاب مفید اور قابل مطالعہ ہے۔ (شمس نوید)

فارقلیط

از :۔ میاں محمد سعید صاحب ۔۔ ناول سائز ۔ صفحات ۴۲ ۔۔ قیمت درج نہیں۔ ناشر۔ اکیڈمک ریسرچ سوسائٹی آف اسلام کراچی۔ پاکستان میں مسیحی مشنری سرگرمیوں نے جو خطرناک فتنے کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اس کی مدافعت کے سلسلہ میں خدا کے نیک دل بندے حسب توفیق علم اور قدم سے اسلام کے لئے کام کر رہے ہیں یہ کتاب بھی اسی مدافعانہ مہم کی ایک کڑی معلوم ہوتی ہے اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ آج جو نام نہاد عیسائیت اسلام کی جڑ اکھاڑنے کے لئے سرزمین پاکستان میں صف آرا ہے خود اس کے اپنے تحریف شدہ صحائف اور مذہبی کتابوں میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بشارتیں آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ اس ذیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال اور اناجیل میں "فارقلیط" کے لفظ کی تشریح و تحقیق کرکے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ نام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر کس طرح موبمو منطبق ہوتا ہے ۔۔ ساتھ ہی ساتھ دیگر مذاہب عالم کے حوالوں سے "رسول موعود" کی نشاندہی کے تاریخی گوشے ابھار کر حضور کی بعثت کی عالمگیر بشارتوں کو بے نقاب کیا گیا ہے ۔۔ کتاب قابل استفادہ ہے ۔۔ بطور خاص پاکستان میں مسیحی فتنہ کے خلاف بدرقہ و تریاق کے طور پر استعمال کرنے کی چیز ہے۔ خدا مرتب و ناشرین کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ کتاب میں کتابت و زبان و ادب کی کئی ایک اغلاط سرسری مطالعہ میں بھی نظر آئیں۔ جنکو آئندہ کے ایڈیشن میں دور کر لینا چاہیئے۔ مثلاً :۔
صفحہ ۳ پر سنگم کے بجائے "سنگھم" ۔۔ صفحہ ۶ پر "کٹے ہوئے کی بجائے " کٹتے ہوئی" ۔۔ صفحہ ۷ پر "دامے درمے سخنے قدمے میں ہمزہ کا استعمال کتابت کی غلطی معلوم ہوتا ہے ۔۔ نیز صفحہ ۹ پر پانچویں سطر میں "انشاءاللہ" کی جگہ "انشاء اللہ" یا صفحہ ۵ پر "پردے پڑے ہوئے" کے بجائے "پردے کھنچے ہوئے" ۔۔ یا صفحہ ۶ پر "زیب طاق نسیاں" کے بجائے "زیب و زینت طاق نسیاں" ۔۔ یا صفحہ ۲۰ پر "باہم غور و فکر" کی جگہ "باہم غور و فکر کے" ۔۔ یا صفحہ ۲۰ پر "درپیش ہو جائے" کی بجائے "درپیش آجائے" وغیرہ زبان و ادب اور محاورے کی غلطیاں موجود ہیں۔ (شمس نوید)

ہفت روزہ طلوع بمبئی کا "بین الاقوامی سیاست نمبر"

ایڈیٹر اصغر علی عابدی۔ صفحات ۲۷۲
قیمت پچاس نئے پیسے ۔۔ سالانہ چندہ ۔ بارہ روپے۔
ملنے کا پتہ :۔ دفتر ہفت روزہ طلوع ... مولانا آزاد روڈ ۔۔ بمبئی نمبر ۱۱۔

اُردو صحافت میں اصغر علی عابدی صاحب کا نام کافی حد تک جانا پہچانا ہے۔ موصوف عرصہ تک دعوت دہلی کی ادارت کے فرائض بحسن و خوبی انجام دے چکے ہیں۔ اور اب بمبئی سے ہفت روزہ بجلی کو خاص جدت اور رکھ رکھاؤ سے چلا رہے ہیں اس وقت بجلی کا "بین الاقوامی سیاست نمبر" نکال کر انھوں نے اُردو جرائد کے ذخیرے میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ نمبر کا نام جیسا بھاری بھرکم ہے موصوف نے ویسا ہی وزنی اور مخصوص مواد جمع کرنے میں خاصی وقیع کامیابی حاصل کی ہے۔ بھرتی کی کوئی بھی چیز حصۂ نثر میں نہیں ملتی۔ تمام مقالات اونچی سطح کے ہیں اور ان تقریباً پونے تین سو صفحات میں بین الاقوامی دنیا کے چوٹی کے مسائل سے دور رس واقفیت بہم پہنچاتے ہیں خاص طور پر مدبر قوم کا اداریہ — موتمر عالم اسلامی — ہندوستانی خارجہ پالیسی — ہندوستانی جمہوریت کا مستقبل — افریقہ میں اسلام کی راہیں — اور موجودہ عالمی سیاست کے خدوخال بہت بے لاگ اور معنی خیز و فکر انگیز تبصرے میں بین الاقوامی مسائل و حالات پر — حصۂ نظم اس وقیع حصۂ نثر کے مقابلہ میں بس ذائقہ بدلنے کے طور پر آ نکلا اور سرسری نظر آتا ہے۔ اس میں کچھ نظمیں ترقی پسندانہ ڈھب کی بھی ہیں جن کا کمال ہی یہ شمار ہوتا ہے کہ کوئی واضح مطلب و مقصد سمجھ میں نہ آنے پائے! — مثلاً قاضی ز۔ الاسلام کی "نوح قہار" کا انطباق نہ جانے حقیقی زندگی کے کس کردار پر کیا جا سکتا ہے؟۔

یہ نوح قہار ایک طرف تو کہتی ہے کہ :۔

کچلتا ہوں میں ایسے قانون کو — جو غارت گر عدل و انصاف ہو

دوسری طرف :۔

مجھے جان بربادی کا دیوتا — تباہی کا جھنکار تا اژدہا

دونوں انتہاؤں کے درمیان کسی حقیقی کردار میں چول بٹھانا ہر آئینہ جوئے شیر لانا ہے! کاش اس قسم کی "مجہول" چیزیں اس بیش قیمت نمبر میں بار نہ پاتیں — بہر حال اس کا اصل حصہ نثر میں ہے جو بہت خوب ہے۔ اور اس بین الاقوامیت کے عہد میں ہر مطالعہ کے شائق کو دعوت مطالعہ دیتا ہے۔

(شمس نوید)

راہِ عشق

از:- نواب زادہ ڈاکٹر مولانا ارشد حسین خاں سنبھلی — ناول سائز — صفحات ۲۵۲ — قیمت ستو روپیہ۔
ناشر :- مکتبہ خورشید۔ میاں سرائے۔ سنبھل۔ یوپی۔

یہ کتاب مصنف کا سفرنامۂ حج ہے ابتدا میں حج کے فضائل کا بیان ہے پھر سفرِ حج کی تیاریوں کا ذکر ہے پھر اس سفر کی مختلف منزلوں کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس مقدس سفر کے آداب و احکام سے آگاہ کیا گیا ہے مختلف مقامات مقدسہ کی تاریخی تفصیلات شامل کر کے اس کتاب کو حج کے لئے اچھا خاصا ایک دلچسپ و مفید گائیڈ بنا دیا گیا ہے۔ مصنف کی یہ کاوش مجموعی طور پر اس قابل ہے کہ حج کے لئے روانہ ہونے والے زائرین اس کو اپنے ساتھ رکھیں اور اس سے قدم قدم پر فائدہ اٹھائیں۔ لیکن کہیں کہیں بعض باتیں محل نظر بھی محسوس ہوئیں۔
مثلاً ٹائٹل پیج پر علامہ اقبال کا یہ شعر کہ :۔

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

ٹائٹل پر خانہ کعبہ اور روضۂ رسولؐ دونوں کی تصویریں ہیں — معلوم نہیں کہ اس "ادب گاہ" کا اطلاق ان میں سے کسی ایک پر کیا گیا ہے یا دونوں پر؟ — عموماً اس کا استعمال روضۂ رسولؐ کے لئے دیکھنے میں آیا ہے — بہر حال اس کا رخ سخن خواہ کعبہ کی طرف ہو خواہ گنبد خضرا کی طرف — بہر صورت ان کو عرش سے نازک تر ادب گاہ قرار دینا اس شاعرانہ تقابل میں عرش اعظم کی عظمت کو ان فرشی ادب گاہوں کے آگے ہلکا کرنے کے ہم معنی کہ عرش جسکو خدائے کائنات نے اپنے تخت خاص کی تمثیل دی ہے غیرت توحید کے جذبہ سے کوئی ایسی معمولی شے تو نہیں کہ اس کی عظمت و سربلندی کی طرف سے شاعرانہ بےخودی کے حسین سے عالم میں آنکھیں بند کر لی جائیں — کعبۂ مکرمہ ہو یا روضۂ اقدس دونوں کی عظمت کا سنگ بنیاد خدائے واحد کی عظمت کے احترام پر رکھا ہوا ہے اور جہاں عظمت توحید پر ذرا سی بھی آنچ آ جانے وہاں خود ان ارضی ادب گاہوں کی بنیاد ہل جاتی ہے۔
صفحہ ۱۵۵ پر مدینۂ منورہ کو مکۂ مکرمہ سے افضل دکھایا گیا

کوشش کی گئی ہے۔ اور اس سلسلہ میں ان روایات کو پیش کیا گیا ہے جن میں حضورؐ نے ہجرت کے سلسلہ میں مکہ چھوڑ کر مدینہ آنے کی ترغیب دی ہے قطع نظر اس کے کہ یہ روایات صحاح کے براہ راست حوالوں سے محروم ہیں، ان کا یہ استعمال برمحل نہیں۔ علاوہ ازیں مکہ اور مدینہ کی عظمت کو ایک دوسرے کے تقابل میں پیش کرنا ایسا ہے جیسا توحید اور رسالت کے درمیان خدا نخواستہ چشمک دکھائی جائے! — دونوں مقامات اپنی اپنی جگہ فضیلت کے حامل ہیں اور بنیادی طور پر ایک حقیقت کے دو افسانے اور ایک سچائی کے دو مظہر ہیں۔ پھر ان میں تقابل کیسا؟ — مقدس عاشقانہ جذبات جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں امنڈتے ہیں تو ان میں توازن اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب حضورؐ کے مقصد حیات پیغام توحید کا بھرپور احترام قائم رکھا جائے — خدا خدا کی جگہ رہے اور رسول رسول کی جگہ۔ مکہ مکہ کی جگہ رہے اور مدینہ مدینہ کے اصل مقام پر — یہ تفصیلی گفتگو کچھ اسلئے کرنا پڑی کہ بدعت اور غلو آمیز نام نہاد حُبِ رسولؐ کے پردے میں اسلام کے سنگ بنیاد توحید کی حقیقت اس دور پرفتن میں سخت خطرے میں پڑ گئی ہے۔

ان چند تنقیدی گوشوں کو چھوڑ کر کتاب ایمان افروز معلومات اور جذبات سے پُر ہے۔ اور سفر حج کے سلسلے میں بڑے کام کی چیز — خدا مصنف اور ناشرین کو جزائے خیر دے —

(شمس نوید)

جلیل المناسک المعروف بہ رہبر حج

مرتبہ مولانا ابو الخلیل عبد الجلیل خاں صاحب۔ صفحات ۹۶ (آٹھ نئے پیسے کے ٹکٹ بھیج کر منگا سکتے ہیں) پتہ:- حاجی عبد المالک سوت والے یا ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب۔ اجیانی۔ ضلع بدایوں۔

کتاب کے سرورق پر لکھا ہے کہ "بفضلہ تعالیٰ سنت نبوی کے مطابق طریقہ حج کی طرف رہنمائی کرنے والا صحیح اور مختصر رسالہ" بہر حال یہ رسالہ ایسا ہی ہے۔ سفر حج کے سلسلے میں جتنی معلومات کی ضرورت ہے وہ سب اس میں موجود ہیں جن مقامات پر جن دعاؤں کی فضیلت آئی ہے وہ اس میں شامل ہیں۔ جن مقامات کی جو اہمیت ہے وہ کتاب و سنت کی روشنی میں بیان کر دی گئی۔ حاجیوں کے لئے بہترین رفیق سفر اور مفید و معاون ہے یہ چھوٹا سا رسالہ۔ ایسی بابرکت چیز کو رفاہ عام کے طور پر محض ڈاک خرچ پر تقسیم کرنا مزید اجر و برکت کی ضمانت ہے خدا بیش از بیش انعامات سے نوازے۔ (شمس نوید)

نصیحۃ المسلمین

از حضرت مولانا خرم علی صاحب رحمۃ۔ صفحات ۴۸ ناول سائز — بلا قیمت فی سبیل اللہ — ملنے کا پتہ:- ابو المجاہد اثری۔ معرفت ڈاکٹر محمد اسحٰق صاحب پوسٹ اوجیانی۔ ضلع بدایوں۔

قرآن پاک میں جس گناہ کے بارے میں صاف صاف لکھا ہوا ہے کہ یہ گناہ ناقابل معافی ہے۔ جسکو خدا ہرگز نظر انداز نہ کرے گا۔ اس کا نام ہے شرک — لیکن اس قدر ہولناک جرم و گناہ کے بارے میں آج مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد آخری سہل انگاری کے ساتھ سوچتی ہے اور قبور و مزارات — طاق و محراب کے سائے میں ٹھیک اسی جرم یا اس کے ساتھ چلتے جلتے ہنر اور اعمال سے مزے میں کھیل رہی ہے! — کون سمجھائے! یہ لوگ جو مزاروں اور قبروں کے سلسلے میں انتہائی حساس ہوتے ہیں۔ بلکہ ذکی الحس۔ ذراسی بات "خلاف عقیدہ" سننا اور مشتعل ہو جانا لازمی ہے۔ ان ہی میں نجانے "غیرت توحید" کی حس کہاں ماری گئی — غضب خدا کا! — انسان کی پیشانی کو غیر اللہ کے آگے — مٹی کے ڈھیروں کے آگے سجدے میں پڑا دیکھکر بھی تو ان کی توحید کی رگِ حمیت نہیں پھڑکتی — خدا واحد کے بندوں کو مُردوں کی دنیا میں در در کا بھکاری بنا دیکھ کر بھی ان کی غیرت بندگی کو جوش نہیں آتا — اسی دردناک حقیقت کو سامنے رکھکر مندرجہ بالا رسالے میں ایک مرحوم بزرگ نے ۱۲۳۳ھ میں مسلمانوں کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ شکر کا مقام ہے کہ بدایوں کی شرک و بدعت زدہ آبادیوں میں خدا نے دین کے سچے پجاری ایسے لوگ بھی پیدا کئے ہیں جو توحید و رسالت کی حقیقی لگن کے ساتھ شرک و بدعت سے برسر پیکار ہیں۔ انھوں نے یہ چھوٹا سا رسالہ مفت تقسیم کے لئے چھاپ کر ہم سب پر بڑا احسان

گیا ہے — خدا ان کی مساعی کو بار آور فرمائے - کہیں کہیں کتابت یا زبان کی غلطیاں ملیں، کاش یہ بھی نہ ہوتیں - اچھی بات کے راستے میں ہلکے سے ہلکا سنگ راہ بھی اچھا نہیں لگتا - مثلاً صفحہ ۳ پر "پناہ چاہی" کے بجائے "پناہ چاہا" — صفحہ ۷ پر "زندہ سلامت ہیں" کے بجائے "زندہ لبسلامت ہیں" — یا اسی صفحہ پر "بہت دنوں میں" کی جگہ "بہت دن میں" قابل اصلاح ہیں۔

الجامعۃ الاسلامیہ کا ایک تعارفی خاکہ

از:۔ ہلال عثمانی۔ صفحات ۲۴۔ (قیمت درج نہیں)

ناشر:۔ کتب خانہ محمودیہ۔ دیوبند۔ یوپی۔

مدینہ منورہ کی عظیم و نوخیز یونیورسٹی "الجامعۃ الاسلامیہ" کا نام کس نے نہ سنا ہوگا؟ مولوی ہلال عثمانی دارالعلوم دیوبند کی طرف سے منتخب ہوکر اس درسگاہ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ انھوں نے زیر نظر کتابچہ میں اس مبارک ادارے کا تعارف کرایا ہے اور ماشاء اللہ خوب ہے یہ تعارف۔

اس کتاب میں خوبیٔ فکر و نظر، قوت مشاہدہ اور حسن تحریر کی اچھی جھلکیاں ملتی ہیں اور بہت اختصار کے ساتھ ہلال صاحب نے بہت کچھ بتا دیا ہے ادارے کے بارے میں — اس ادارے کی عالمگیر اسلامی اہمیت کے پیش نظر پڑھنے اور سمجھنے کی چیز ہے خصوصاً ان لوگوں کے لئے جو اپنے بچوں کو اس درسگاہ کا طالب علم بنانے کا خواب دیکھتے ہوں۔ (شمس نوید)

سوانح خواجہ معین الدین چشتیؒ

از:۔ وحید احمد مسعود

— صفحات ۳۲۰ — مجلد مع گرد پوش۔ قیمت ۸ روپے

ناشر:۔ سلمان اکیڈمی۔ حق نشان۔ ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی ۵

سلسلۂ چشتیہ کے سرخیل حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ تصوف کے ان اعاظم رجال میں سے ہیں جنکو ہند و پاک کا بچہ بچہ جانتا ہے لیکن بہت کم لوگ ہوں گے جو آنحضرتؒ سے علی وجہ البصیرت عقیدت رکھتے ہوں۔ ان کی زندگی کے عظیم حالات سے باخبر ہوں اور ان کے سوانح حیات کی روشنی میں ان کی شخصیت کی عظمت کو پرکھنے، سمجھنے اور محسوس کرنے کے قابل ہوئے ہوں۔ مرتب کتاب نے یہ ایک کرنے کا کام کیا ہے اور "خواجہ غریب نواز" کی عقیدت کا زبانی دم بھرنے والوں کو موقع دیا ہے کہ ان کی زندگی کا مطالعہ کر کے علمی عقیدت اور اتباع کردار کا ثبوت دیں۔ بزرگوں سے عقیدت کا مطلب ہی یہ ہے کہ ان کی تعلیمات اور ان کے اسوہ و کردار کو دل سے پیارا کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ جن حقائق اور جن اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے وہ لوگ زندہ رہے اور جان دی ان کے نام لیوا ٹھیک ان اصول و حقائق کو اپنی زندگی میں جذب کرنے کی کماحقہ کوشش کریں۔ ورنہ محض نذر و نیاز کے نان و نمک اور شیر و شکر سے ان کی پاک روحوں کو اپنانے کی فرسودہ اور بے جان ریت خود بزرگوں اور ان کے پیغام کو بازیچۂ طفلاں بنانے کی ایک بدترین حرکت کے سوا اور کیا ہے؟ — اس قسم کی کھوکھلی عقیدت کے پیچھے شرک و بدعت کا ایک مخصوص خود غرضانہ ذہن ہوتا ہے جو اس احمقانہ دھوکے میں مبتلا ہوتا ہے کہ اپنے غیر اسلامی کردار سے خدا کو ناخوش کرنے کے باوجود ان اللہ والوں کو محض ایصال ثواب کے دسترخوان سے پرچایا جا سکتا اور اپنے خالص دنیاوی دھندوں کو چلانے کے لئے معاذ اللہ ان سے بھی امداد حاصل کی جا سکتی ہے۔

مرتب موصوف نے بڑی کاوش سے خواجہ صاحبؒ کے حالات زندگی اپنی حد تک قابل اعتماد ذرائع سے بہم پہنچائے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ پھر بھی ان معلومات کے ماخذ کی نیم تاریخی نوعیت ان سوانح کو تاریخی وثوق کے درجہ تک نہ پہنچا سکی۔ تاہم یہ کاوش اپنی جگہ قابل داد ہے اس کے علاوہ مرتب کی ذہنی روشنی اور اسلامی ذہنیت کا اظہار بھی اس بات سے ہوتا ہے کہ انھوں نے تصوف میں شریعت کے اتباع کے اصول کو بڑی حد تک ملحوظ رکھنے کی کوشش کی ہے اوہام پرستانہ انداز اختیار نہیں کیا بلکہ ٹھوس حقیقت پسندی کا اسلوب برتنے کی کوشش کی ہے۔

خواجہ صاحبؒ کے حالات زندگی اردو دیباچہ و پیش لفظ

کے علاوہ اس کتاب میں تصوف پر ایک بنیادی گفتگو کی گئی ہے جس میں کتاب و سنت کی روشنی میں تصوف کا دفاع کیا گیا ہے لیکن شریعت و طریقت کو ساتھ ساتھ لیکر چلنے کی اس تمام کوشش کے باوجود اس کتاب میں ایسے کئی مقامات آتے ہیں جہاں طریقت اور شریعت میں اختلاف نظر آنے لگتا ہے اس قسم کا سب سے خطرناک موڑ وہ ہے جہاں "ہمہ اوست" کے نظریئے کو اسلامیانے کی کوشش کی گئی ہے چنانچہ کلمۂ طیبہ کا یہ ترجمہ کہ "سوائے اللہ کے نہ کوئی معبود ہے نہ کوئی مقصود ہے اور نہ کوئی موجود ہے۔ (صفحہ ۹۳)" کتاب و سنت کے طالب علم کو چونکا دینے اور جھنجوڑ دینے والا ترجمہ ہے!۔ سوچئے! کتنی سیدھی بات ہے کہ جب خدا کے سوا کوئی موجود ہی نہیں ہے تو پھر خدا کس سے یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ جھوٹے خداؤں کی نفی کر کے خدائے واحد کا اقرار کرو!۔

حیرت ہے کہ مرتب ایک طرف یہ کہہ رہے ہیں کہ :۔

> "بہرحال کوئی وحدت الوجود کی تشریح اس طرح کرے کہ قطرہ دریا میں مل جاتا ہے — کوئی کہے کہ لوہا آگ میں آگ کی خاصیت اختیار کر لیتا ہے کوئی خیال کرے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہو کوئی کہے کہ آفتاب کی روشنی میں چراغ جلتا ہو یا کوئی ان سب کے درمیان فیصلہ کر کے راہ اوسط نکالے۔ لیکن یہ سب منطقی، علمی اور کنارے پر کی باتیں ہیں۔ کیونکہ وجدانی کیفیتیں حدود عقل سے ماورا ہوتی ہیں اور حقیقت کا پتہ نہیں چل سکتا تا نہ چشی۔ وجدان یا مذاق سلیم کا تعلق عالم غیب سے ہے۔ اس کی تفسیر تحریر و تقریر سے ناممکن ہے اس کی حقیقت وہی سمجھ سکتا ہے جو اس کیفیت میں مبتلا ہو مگر ہر شخص کا مشاہدہ و عرفان جدا ہوتا ہے۔" (صفحہ ۲۹۳)

لیکن اس کے باوجود اسلام کے بنیادی کلمہ کا ترجمہ پھر بھی ٹھیک اسی "ہمہ اوست" کے آہنگ میں بیان کر دیا کہ "خدا کے سوا کوئی موجود نہیں!" — جس بات کو خود مرتب سمجھتے ہیں کہ لوگ عقل سے سمجھ ہی نہیں سکتے اسی بات کو سمجھانے کی کوشش کرنے کی کوئی تک سمجھ میں نہیں آتی۔ معقولات کی بات تو چھوڑ دیئے، کیفیات وجدانی بھی وہی معتبر ہیں جنکو کتاب و سنت اور شریعت کی کھلی سند حاصل ہو۔ ورنہ منصور کے "انا الحق" میں کیفیات کی صداقت کے باوجود اس کے خلاف قانون شریعت کا حرکت میں آنا کیا حق رکھتا ہے؟۔ تصوف پر گفتگو کرتے ہوئے یہ نکتہ نجانے کیوں نظرانداز ہو جاتا ہے کہ یہ سمجھنے کی باتیں کہنے کے لئے نہیں ہوتیں۔

صفحہ ۱۷۲ پر خواجہ صاحب کی شادی خانہ آبادی کا تذکرہ کرتے ہوئے خواجہ صاحب کی جو گفتگو نقل کی گئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خانگی فرائض سے روحانی کیف و سرور اور باطنی جلا میں فرق آگیا تھا۔ خود مرتب نے اس سے یہ استدراک کیا کہ :۔

> "حضرت والا کے یہ الفاظ کہ اب بال بچوں کے قصوں میں پڑنے کے بعد حالت بدل گئی صاف بتا رہے ہیں کہ یہ نفس نفیس خانگی فرائض و ضروریات خود ادا کیا کرتے تھے اور اس سے روحانی اشغال میں جو رخنہ پڑتا تھا وہ ناگوار تھا۔ مگر ناجائز نہیں تھا۔ اور یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ خانگی افکار روحانی کی ترقی کے بھی باعث تھے۔ (صفحہ ۱۷۲)

یوں بھی کہا جا سکتا ہے"! یا یوں کہئے کہ "یوں ہی کہا جانا چاہیئے"! کیا مرتب کے سامنے احادیث کا وہ ٹکڑا نہیں جس میں بتایا گیا ہے کہ کچھ صحابہ ایک بار حضورؐ کی عبادتوں کا جائزہ لینے کے لئے آئے اور آپ کی خانگی زندگی کی دلچسپی کو دیکھکر سوچ میں پڑ گئے کہ کیا یہ بھی عبادات میں داخل ہیں؟ — پھر حضورؐ کا ارشاد کہ میرا طریقہ یہی ہے اور جو میرے طریقے سے ہٹا وہ مجھ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا اگر طریقت عین شریعت ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ سنت رسول کے اتباع سے باطنی طہارت و بلندی میں رخنہ پڑ سکے! اس طرح کی ذہنی باتیں کرنا احترام شریعت کے مفاد میں کیسے ہو سکتا ہے بھلا! یقیناً خواجہ صاحبؒ نے گھریلو مشاغل کا تذکرہ اس مفہوم میں ہرگز نہ کیا ہو گا کہ وہ سلوک و طریقت کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

"سماع" پر اظہار خیال کرتے ہوئے مرتب لکھتے ہیں

خطرناک ٹھوکر کھائی ہے۔ حضرت بریدہؓ کی روایت کو نقل کر کے بتایا گیا ہے کہ کسی کنیز نے حضورؐ کے سامنے دف بجا کر گانے کی نذر پوری کی تھی اسلئے ثابت ہوا کہ گانا جائز ہے اور عورتوں سے راگ سننا درست ہے۔ مرتب نے شاید اپنے اس استدلال کی وحشت ناکی کو خود بھی محسوس کیا اسلئے فوراً یہ بریکٹ لگایا کہ "بشرطیکہ فتنہ کا خوف نہ ہو"

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا صحابۂ کرام نے بھی اس واقعہ سے اس حدیث کی روشنی میں یہی نتیجہ نکالا تھا کہ عورتوں سے راگ سننا درست ہے؟ — اگر نکالا تھا تو پھر صحابہ کی محفلوں میں" اس سنت" سے پرہیز کیوں کیا گیا — وہی صحابہ جو مرتب سے کہیں بہتر مزاج رسول کو سمجھتے تھے اور اسوۂ رسول کی نقل کرنے میں اسقدر دل وجان سے منہمک رہتے تھے کہ اگر کسی جگہ حضورؐ مسکراتے تھے تو یہ لوگ بھی خواہ مخواہ اس مقام پر مسکرانا نہ بھولے اور جہاں آپ پر گریہ طاری ہوا تھا وہاں آنسو بہانے میں نہ چوکے۔ کس قدر المناک ہے یہ ذہنی افتاد کہ شریعت کے مجموعی ڈھانچے کو یکسر نظرانداز کر کے کسی ایک جزوی واقعہ کو احکام اخذ کرنے کی اساس بنا لیا جائے اور ذرا یہ نہ سوچا جائے کہ اس پرفتن زمانے کی آب وہوا میں یہ خطرناک روش کیا رنگ لائیگی" بشرطیکہ فتنہ کا خوف نہ ہو" والا ٹکڑا لکھتے ہوئے بھی مرتب نے یہ نہ سوچا کہ یہ طرز استدلال کیا کیا فتنہ سامانیاں چھپائے ہوئے ہے — یہ گفتگو چھیڑنا بھی ایک فتنہ اٹھانے سے کم نہیں — آج جبکہ گلی گلی کوچہ کوچہ نغمے گونج رہے ہیں علی الاطلاق یہ کہنا کہ عورتوں سے راگ سننا درست ہے درحقیقت ان تمام خرافات اور فتنہ سامانیوں کو سند قبول عطا کر دینا ہے اس حدیث میں یہ الفاظ بھی مرتب کو نہ چونکا سکے کہ حضورؐ نے کنیز سے فرمایا کہ" اگر تو نے نذر مانی تھی تو گا اور نذر پوری کر ورنہ نہیں"— "یہ ورنہ نہیں" کا معنی خیز ٹکڑا کتنی آسانی سے نظرانداز کر دیا ہے مرتب نے؟ — پھر کنیز نے گاتا گاتے گاتے جب حضرت عمرؓ کو دیکھکر گانا روک دیا اور دف چھپا دیا تو حضورؐ کا یہ ریمارک بھی مرتب کو نہ جھنجھوڑ سکا کہ" اے عمر تم سے شیطان ڈرتا ہے"— کیا اس ریمارک کو پڑھکر بھی مرتب نے یہ محسوس نہ کیا کہ حضورؐ نے" نذر" کے طور پر جس راگ کی بشرط اجازت دی تھی اس ریمارک کے ذریعے اس میں چھپے ہوئے ممکن فتنوں کے اندیشوں کی طرف اشارہ بھی فرمادیا تھا — لیکن مرتب ٹھیک فتنوں سے بھرے ہوئے ماحول کے بیچ میں بیٹھکر" عورتوں سے راگ سننے کی اباحت" ارشاد فرما رہے ہیں اور ذرا انہیں سوچتے کہ کس قسم کے راگ کی اجازت دی گئی — کیوں دی گئی — کس طرح دی گئی اور پھر کس طرح اس کی نزاکتوں کی طرف اشارہ کیا گیا — اور پھر صحابہ کرام نے اس کا کیا مفہوم سمجھا اور کہیں نہ نسوانی موسیقی کو اذن عام اور قبول عام عطا کیا!! — حیرت ہے کہ مرتب نے امام ابوحنیفہؒ پر بھی خواہ مخواہ راگ سننے کی کھلی تہمت دھردی! — جس بیہودگی کی ہاؤ ہو اور رنگ رلیوں سے امام اعظمؒ سخت پریشان رہتے تھے۔ اس کو امام اعظم کے راگ سننے پر محمول کر کے مرتب نے بڑی بھاری جسارت سے کام لیا ہے! —

ان چند خطرناک گوشوں کو نظرانداز کر دیا جائے تو یہ کتاب ہر لحاظ سے پڑھنے اور فائدہ اٹھانے کی چیز ہے اور خواتینؒ کے متعلق وافر مواد بہت اچھی ترتیب کے ساتھ پیش کرتی ہے—

(شمس نوید)

پندرہ روزہ الحسنات رامپور کا نماز نمبر

مرتبہ:— ابوسلیم محمد عبدالحئی صاحب — کتابی سائز صفحات ۲۰۰ قیمت نماز نمبر ایک روپیہ۔

ملنے کا پتہ:— مکتبہ الحسنات۔ رام پور۔ یوپی۔

غالباً گذشتہ سولہ سال سے رسالہ الحسنات رامپور بڑی عمر کے مسلمان بچوں اور بچیوں کے لئے ایک خاص قسم کا دینی اور اصلاحی لٹریچر پیش کر رہا ہے۔ اپنی سالگرہ کے موقع پر اچھوتے اور مفید نمبر نکالنے کی روایت بھی لئے ہوئے ہے چنانچہ اس نے اس سال اپنی سترھویں سالگرہ پر پھر ایک خاص نمبر نکالا ہے جو "نماز نمبر" ہے۔ موضوع کے اس انتخاب سے ہی ظاہر ہے کہ ادارہ الحسنات محض" نمبر برائے نمبر" نکالنے کا قائل نہیں بلکہ کچھ کام کرنا چاہتا ہے۔ نماز جو اساس دین کا درجہ رکھتی ہے شاید کم ہی رسالوں کے کسی نمبر کا عنوان بن سکی ہے — الحسنات

نے منتخب کر کے ایک پاکیزہ نگاہی کا مبارک ثبوت دیا ہے۔ پھر مضامین بھی جچے تلے ہیں اور مضمون نگاری بھی چیدہ چیدہ — اس خصوصیت نے اس خاص نمبر کو واقعی خاص نمبر بنا دیا ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ مرتب نظم کے حصے میں ایسی چیزیں پیش نہ کر سکے جن کی زبان اور اسلوب میں لڑکوں اور لڑکیوں کے "لڑکپن" کی رعایت ملحوظ رہی ہو — نظموں کے خیالات اور الفاظ دونوں میں اچھا خاصا ادق پن پایا جاتا ہے — کاش مسلمان بچے اور خواتین زیادہ سے زیادہ اس نمبر کی افادیت سے لطف اندوز اور بہرہ یاب ہو سکیں۔ (شمس نوید)

ماہنامہ ہادی (ہندی) رامپور

ایڈیٹر:- محمد عبدالحئی — ادر — مائل خیرآبادی۔ صفحات ۴۴۔ قیمت تیس نئے پیسے سالانہ چندہ :— ساڑھے تین روپے۔

ملنے کا پتہ :— مکتبہ الحسنات رام پور۔ یوپی۔

مسلمانوں کی نئی پود جس نظام تعلیم کی آغوش میں پل رہی ہے وہ بڑی تیزی سے اس نسل کو مادری زبان اردو سے دور سے دور تر کئے جا رہی ہے اور اس کی جگہ اردو کے گھرانوں میں ہندی پڑھنے اور سیکھنے والے معصوموں کی اکثریت روز افزوں ہے اسلئے سچ مچ اس کی بڑی ہی سخت ضرورت تھی کہ بچوں کے لئے دینی اور اصلاحی رسائل چلانے والے ادارے بچوں کے لئے کوئی ہندی کا مذہبی پرچہ نکالیں تاکہ زبان جائے تو دین دھرم تو ہاتھ سے نہ جاتا رہے — شکر کی بات ہے کہ ادارہ الحسنات نے اس کی طرف توجہ کی اور "ہادی" کا اجرا کیا۔ پرچہ ابھی بالکل نیا ہے لیکن مرتبین کی پختگی نے اسکو بڑی حد تک "خامیوں" سے بچایا ہے۔ مضامین کا رکھ رکھاؤ اور ترتیب کی نشست برجستہ دلکش ہے پھر لطف یہ ہے کہ پرچہ میں ہندی رسم الخط میں ایسی زبان رکھی گئی ہے جو سمجھنے میں ہندی اور پڑھنے میں بڑی حد تک اردو ہے اسلئے لسانی اعتبار سے بھی پرچہ مفید رہیگا۔ خاص ضرورت اس کی ہے کہ ادارۂ ہادی ان زہریلے خیالات کے لئے تریاقی مواد پیش کرے جو موجودہ درسگاہوں کے مشرکانہ نصاب تعلیم کی راہ سے خود مسلمانوں کے روح و دل میں چپکے چپکے گھر کر رہا ہے غالباً اس کی طرف ابھی اس رسالے میں براہ راست توجہ نہیں کی گئی۔ منفی انداز سے بھی دین کی باتیں کی جائیں اور مثبت ڈھنگ سے بھی۔ جب ہی کام مکمل ہوگا۔ (شمس نوید)

پندرہ روزہ "برادری" لکھنؤ کا سالگرہ نمبر

اوسط اخباری سائز کے صفحات :- ۴۴ - قیمت سالگرہ نمبر ۳۷ نئے پیسے۔ سالانہ عام چندہ ہے۔

ملنے کا پتہ :- دفتر پندرہ روزہ "برادری" سعادت گنج۔ لکھنؤ نمبر ۳

یہ ایک معمولی پندرہ روزہ کا "خاص" نمبر اس لحاظ سے قابل مطالعہ ہے کہ ان قلیل صفحات میں سلیقہ سے نت نئے مضامین جمع کئے گئے ہیں نمبر چونکہ ماہ صیام میں نکلا ہے اسلئے کچھ چیزیں رمضان المبارک اور قرآن پاک سے بھی متعلق دی گئی ہیں جو "برمحل" ہیں "لیکن قرآن غیر مسلموں کی نظر میں" کے زیر عنوان جو مضمون چھپا ہے اس میں غیر مسلموں کی "رائے" تب ہی مزا دیتی جب ان کے باقاعدے حوالے دئیے جاتے! سنجیدہ مواد کے ساتھ ساتھ دو مزاحیہ فیچر بھی شامل ہیں۔ شوکت تھانوی کا والا پیس خوب ہے لیکن "کعبہ سے بتخانہ تک" والے ٹکڑے میں مزاح کو کچھ اور نکھارنے اور سنوارنے کی ضرورت ہے — خاص طور پر اسلئے کہ یہ رسالہ کا مستقل عنوان معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر سید محمود صاحب کے وقیع مضمون کا عنوان "ہماری تہذیب کے نقش پا" دیکھکر بے اختیار دل چاہتا ہے کہ "نقش پا" کی جگہ "نقوش پا" لکھدیا جائے! — مجموعی طور سے نمبر ماشاءاللہ خوب ہے — اور ادارے کے حسن مذاق اور حسن نظر کا آئینہ دار۔ (شمس نوید)

صنعت اکسیر

از :- حکیم محمد حسن صاحب۔ صفحات :- ۱۰۴ — قیمت :- ۳ روپیہ۔ شائع کردہ۔ اشرف اکیڈمی پوسٹ نمبر ۱۰۱۔ لائل پور۔ پاکستان۔

یہ کتاب کشتہ سازی کے مختلف نسخوں پر مشتمل ہے — ہم ذاتی طور پر اس فن کے متعلق کوئی رائے قائم کرسکنے کی پوزیشن میں نہیں۔ اسلئے ان نسخوں کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔

ہاں" حرف اول" کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوا کہ حکیم محمد حسن صاحب نے کشتہ سازی کے قدیم ویدک اور یونانی فن کو موجودہ سائنس کے کیمیاوی تجزیوں کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کی ایک نئی کوشش کی ہے۔ "حرف اول" میں کہا گیا ہے کہ :—

"کشتہ سازی کا بنیادی تصور وہی ہے جسے سائنس داں آج بیسوی صدی میں ایٹم تھیوری کی صورت میں حاصل کر پائے ہیں..... کہ ٹھوس مادے کا ایسا چھوٹا جزو جسے کسی ظاہری اوزار سے مزید تقسیم نہ کیا جا سکے اسے نباتات اور آگ کے ذریعہ پیدا ہونے والی برقی قوت (ELECTRON.POWER) سے مزید تحلیل کیا جا سکتا ہے" (صفحہ ۲)

اسی پیش لفظ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان نسخوں میں سے بہت سے نسخے اشرف اکیڈمی کے کارپردازوں کے مجرب نسخے ہیں پھر آگے چل کر پڑھنے والوں سے درخواست کی گئی ہے کہ جو لوگ کسی نسخہ کو تجربہ میں لائیں اس کے نتائج سے ناظم اشرف اکیڈمی کو مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں "تصدیق و تکذیب" کے تحت ان کے اسمائے گرامی کے حوالوں سے ان نتائج کو شائع کیا جا سکے یہ سطور پڑھکر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرتب نے پہلے سے مجرب نسخوں کی اس کتاب میں ان کے ساتھ ساتھ نشان لگا دیا ہوتا تو بہت اچھا ہوتا۔ آئندہ وہ نسخوں کے ساتھ ان کے مجرب نتائج کو شامل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن اس وقت سابقہ نتائج کی نشان دہی نہیں کر سکے۔ یہ ایک بنیادی چوک ہوئی ہے۔ بہرحال یہ کتاب اس لحاظ سے خوش آئند ہے کہ طب قدیم کے دبے ہوئے خزانوں کو کھوج نکالنے کی سمت میں اس طرح ایک تحقیقی قدم اٹھ جاتا ہے اور ان مغرب زدہ ہومیوپیتھک پرستوں کو یہ سوچنے کا موقع ملتا ہے کہ قدیم اسلامی یونانی طب اپنے بنیادی تصورات کے لحاظ سے کتنی گہرائیاں اور دور رس امکانات لئے ہوئے ہے —— (شمس نوید)

دق اور سل اور اس کا علاج

مؤلفہ :- ڈاکٹر سلیم الدین احمد صدیقی۔ ایم۔ اے۔ علیگ (ہومیوپیتھ) کتابی سائز۔ صفحات ۱۲۸۔ قیمت :- تین روپے —— شائع کردہ :- قمر ہومیو چیمبر۔ آرام باغ روڈ۔ کراچی نمبر ۱۔

اس کتاب میں ہومیوپیتھک نقطۂ نظر سے دق و سل جیسے عالمگیر مرض اور اس کے علاج پر روشنی ڈالی گئی ہے ڈاکٹر سلیم الدین صاحب مؤلف کتاب نے بتایا ہے کہ انہوں نے ۲۵ سال تک ہومیوپیتھی طریق علاج کو اپنا کر دق اور سل جیسے موذی امراض کی حقیقت کو جس حد تک سمجھا ہے اور ان کے معالجاتی تجربات نے ان کو جو کچھ معلومات دی ہیں ان کو اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ نیز اس کتاب کی اشاعت کا مقصد "نوع انسانی کی خدمت" ظاہر کیا گیا ہے خدا ان کے اس جذبہ کو بار آور کرے۔ کاش اس جذبہ کی رعایت سے کتاب کی قیمت بھی بقدر ضرورت ہوتی ؟ ہم کو طب پر تو کوئی دستگاہ نہیں —— لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلف نے دق اور سل کا گہرا اور بنیادی مطالعہ کیا ہے کتاب کی ترتیب میں بڑی جامعیت اور ہمہ گیری پائی جاتی ہے۔ پہلے ان امراض کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ پھر ان کے علاج کی تدابیر پر گفتگو کی گئی ہے آخر میں انگریزی اصطلاحات و الفاظ کے ترجمہ کا حصہ شامل ہے اس طرح یہ پیش کش ہر جہت سے "مکمل" نظر آتی ہے افلاس اور روگ کی ماری دنیا میں اگر ہومیوپیتھک علاج دق اور سل جیسے امراض میں کام دینے لگے تو اس کی کم قیمت دوائیں عوام کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوں گی۔ کاش یہ کتاب اپنی عملی افادیت پیدا کر سکے۔ (شمس نوید)

بہار چندن

از :- چندن بھارتی۔ صفحات ۵۶ قیمت درج نہیں۔ کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت پاکیزہ۔ ملنے کا پتہ :- چندن کمپنی۔ ٹونک۔ راجستھان۔

کتاب کے مقدمہ نگار سید حامد علی صاحب نے ایک طرف "چاربیت" نامی صنف سخن کا بڑا اچھا تاریخی جائزہ لیا ہے تو دوسری طرف شاعر موصوف سیٹھ اتم چند چندن کا دل نشیں تعارف کرایا ہے کہ وہ پنجاب کے نوجوان غزل گو شاعر ہیں اور انہوں نے ٹونک کے مخصوص لوک گیت "چاربیت" پر طبع آزمائی کر کے اس صنف سخن کو ترقی یافتہ خطوط پر آگے

بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ مختصر سا مجموعۂ کلام مقدمہ نگار کی اس اچھی تلی رائے کی تائید کرتا ہے۔ ابتدا میں ایک "حمد" لکھا ہے اس کو پڑھکر خوشی ہوتی ہے کہ چنچل صاحب صرف ایک پاکیزہ گو شاعر ہی نہیں بلکہ توحید پسند انسان بھی ہیں:۔

یہ سر ہے میرا اور ترا سنگ آستاں
تیرے ہی در پہ پاتے ہیں شاہ و گدا اماں
دامن کو تیرے چھوڑ کر جاؤں میں اب کہاں
تیرے سوا نہیں ہے مرا رشتہ کسی کے ساتھ

توحید خالص کا یہ پرسوز نغمہ ایک غیر مسلم کے لبوں پر گونجتا ہوا سنکر بے اختیار "آہ سرد" نکل گئی کہ یہ انسان کاش اس انسان کامل صلی اللہ علیہ وسلم سے کما حقہٗ آگاہ ہو سکتا جس نے شرک و صنم پرستی کی ماری دنیا میں توحید خالص کی گمشدہ آواز رہتی دنیا تک کے لئے اس طرح بلند کی کہ:۔

"میں نے اپنا رخ یکسو ہو کر اس ہستی کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں۔ بیشک میری پوجا میری قربانی میری زندگی اور میری موت اس اللہ کے لئے ہے جو پالن ہار ہے تمام دنیاؤں کا" (قرآن)

یہ شاعر جس نے اتنی اچھی حمد کہی ہے اگر دنیا کے آخری پیغمبر توحید حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے واقف ہوتا تو کون جانتا ہے کہ اس کے قلم سے کیسی درد بھری نعت نکلتی!۔۔۔ نیز صفحہ ۴۲ پر شاعر موصوف نے حضرت شاہ سلیمان تونسوی کی عقیدت میں جو اشعار منقبت لکھے ہیں ان میں بھی توحید خالص سے میل نہ کھاتا ہوا یہ مصرعہ بار نہ پاتا کہ۔

تمہارے در پہ ہوتی ہے ہر اک کی آرزو پوری

بعد سے کلام میں سادگی، خلوص، جذبہ کی لطیف کارفرمائی ملتی ہے اور توقع ہوتی ہے کہ اگر شاعر نے مشق سخن جاری رکھی تو وہ بہت جلد اپنی انفرادیت تسلیم کرا لیں گے۔ کہیں کہیں اشعار الفاظ اور وزن کے لحاظ سے محل نظر اور نظر ثانی کے مستحق ہیں مثلاً صفحہ ۲۸ پر یہ مصرعہ "بادل کی طرح برستا ہوں" بے وزن نہیں۔ یا صفحہ [illegible] "نظر نواز نظارے دکھائے جاتے ہیں" میں "نظارہ دکھانا" محاورت سے غلط کر لیا جاتا [illegible] سے دکھانا نہیں جاتا

مشق و تمرین سے ایسی خفیف خامیاں جلد ختم ہو جائیں گی۔
آخر میں کچھ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

کس طرح چین پائیں اس گلشن جہاں میں
کیا ہم خوشی منائیں اس گلشن جہاں میں
کیا خاک دل لگائیں اس گلشن جہاں میں
اپنا تو ہے بسیرا اس میں مسافرانہ

بے اختیار حدیث رسول کے یہ الفاظ یاد آتے ہیں: "کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل" (رہ دنیا میں کچھ اس طرح گویا کہ تو ایک پردیسی ہے یا کوئی راہگیر!)"

چھپا لے میرے عیبوں کو کہ تو ستار ہے یا رب
خطاؤں پر عطا فرما کہ تو غفار ہے یا رب
میں اک مجبور بندہ اور تو مختار ہے یا رب
تری رحمت کے آگے کیا حقیقت ہے خطاؤں کی

کیسا سوز، کیسا عجز اور کتنا خلوص کا رچاؤ ہے ان اشعار میں! یہ تمیز کرنا ممکن نہیں کہ یہ اشعار کسی "غیر مسلم" کے ہیں!۔۔۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ!۔۔۔ اور زور قلم جنبش دل کے ساتھ ساتھ!۔۔۔ (شمس نوید)

فکر و نظر

از:۔ حبیب الرحمٰن صاحب ندوی۔ کتابی سائز۔ صفحات ۲۴۴۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔
ملنے کا پتہ:۔ شعبۂ تصنیف و اشاعت دار السلام۔ اعظم گڑھ۔

یہ کتاب مصنف موصوف کے ۱۲ مختلف النوع مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں علمی، دینی، تحقیقی، تاریخی اور تعلیمی قدر کے رنگا رنگ عنوانات شامل ہیں۔ پیش لفظ میں مصنف نے کہا ہے کہ:۔

"مضامین کے بارے میں صرف یہی کہنا ہے کہ جب ملک و ملت کے کسی اہم واقعے سے متاثر ہوا اور حالات نے میرے دل و دماغ کو جھنجھوڑا تو میں نے قلم اٹھایا اور بلا کسی عبارت آرائی کے اپنے خیالات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا ہے

بالکل یہی بات محسوس ہوتی ہے ان مضامین کو پڑھ کر — خیالات میں سلجھاؤ ہے — جذبات میں سنجیدہ ٹھیراؤ — اسلوب میں سادگی ہے تکلف نہیں۔ اظہار خیال میں ستھراپن ہے گنجلک موشگافیاں نہیں — ہاں کاغذ کی زبوں حالی اور طباعت کے بگاڑ نے بہت کچھ لطف مطالعہ پر تاخت و تاراج کی ہے —

"کائینات کا محسن اعظم" خوب مضمون ہے لیکن نجانے کیوں سیرت کی کتابوں میں لوگ حوالوں کی کمی چھوڑ دیتے ہیں! — اس جگہ بھی یہ کمی ملی۔ مستشرقین کے یہ خیالات حضور کے متعلق نقل کئے گئے ہیں ان کے ماخذ کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ حالانکہ جب حضور کے "غیروں کی رائے" نقل کی جائے تو اس کی تاریخی واقعیت کو حوالوں کے ذریعہ ثابت کرنا شرط اولین ہے۔ مضامین یوں تو سب ہی اپنی جگہ قابل تعریف ہیں لیکن "مسئلہ تعدد ازدواج" — "اسلام — میری نظر میں" — "محدثین اسلام کے شاندار کارنامے" بطور خاص پڑھنے کی چیز ہیں۔ (شمس نوید)

الفرقان بین اولیاء الرحمٰن واولیاء الشیطٰن

از:۔ حضرت علامہ ابن تیمیہؒ۔ ترجمہ از:۔ مولانا راغب رحمانی صاحب۔ بڑا کتابی سائز۔ صفحات ۱۲۰۔ قیمت مجلد چار روپے۔

ناشران:۔ ولی محمد اینڈ سنز۔ مل اسٹریٹ آؤٹ رام روڈ۔ پاکستان چوک کراچی۔

یہ بات جتنی مشہور ہے اتنی ہی سچی بھی ہے کہ "دلی را دلی می شناسد" — یہی وجہ ہے کہ عام انسانوں نے اولیاء اللہ کی پہچان نہ ہونے کی بناء پر بڑی بڑی گمراہ کن ٹھوکریں کھائی ہیں حالانکہ شریعت مطہرہ نے اصلی اور نقلی اولیاء اللہ کی شناخت کے لئے واضح نشانیاں اور کھلی علامات کی کسوٹی دی ہے۔ حضرت علامہ ابن تیمیہ جیسے جبل علم وآگہی نے اپنی اس مشہور کتاب میں اس کسوٹی کو پیش کیا ہے۔ مقام مسرت ہے کہ یہ علمی خزانہ اردو میں منتقل ہوگیا۔ جبہ ودستار میں چھپے ہوئے شیطانوں کا نقاب تار تار کر دینے میں یہ کتاب بے حد مفید اور کارگر ہے ترجمے میں ترجمے کی بیشتر خوبیاں موجود ہیں۔ البتہ ذیلی اشاروں اور فٹ نوٹ برائے نام ہیں۔ کاش آئندہ ایڈیشن میں یہ تشنگی بھی دور کردی جائے۔ کاغذ اور کتابت وطباعت بھی اچھی ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ کا اسم گرامی تنہا اس کتاب کے مطالعہ کی دعوت دینے کے لئے کافی ہے۔ (شمس نوید)

سرچشمۂ قرآن

● تالیف :— ابو الفدا محمد عبد القادر

● ناشر :۔ محمد عبد اللہ زاہد مبلغ اسلام۔ دینداراکجن۔ آصف نگر۔ حیدرآباد دکن ● ملنے کا پتہ :۔ حیدر اینڈ سنز تاجر کتب چار کمان۔ حیدرآباد دکن۔

● صفحات ۳۴۸ لکھائی چھپائی غنیمت۔ کاغذ سفید۔ قیمت دو روپے چار آنے۔

یہ کتاب ایک عیسائی مستشرق ڈاکٹر ٹسڈل کے اس لغو ولا طائل افتراء کا جواب ہے کہ قرآن خود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تصنیف اور پچھلی الہامی کتابوں سے ماخوذ ہے۔ چاند پر گرد اڑانے کی طفلانہ کوشش ان مستشرق صاحب کا کوئی نیا کارنامہ نہیں۔ فکر وعمل کے ہر محاذ پر اسلام کے ہاتھوں ذلت انگیز شکستیں کھانے کے بعد یہود ونصاریٰ کے علماء نے اس طرح کے اوچھے حربے بارہا استعمال کئے ہیں اور اب تو افتراء پردازی کا شیطانی فن ایک مہذب ومنضبط فن بن گیا ہے جسے یہود ونصاریٰ بڑے تواتر اور انہماک کے ساتھ کام میں لا رہے ہیں۔

"سرچشمۂ قرآن" کو ہم نے بڑے ذوق وشوق کے ساتھ شروع کیا تھا اور ایک چوتھائی کتاب پڑھنے تک یہ ذوق وشوق قائم رہا۔ ابو الفداء صاحب نے جس متین انداز میں جواب کی تمہید اٹھائی ہے وہ واقعتہً قابل داد ہے اور تمہید ہی کے ذیل میں انھوں نے فن حدیث پر جو گفتگو کی ہے وہ بھی ان کے علم وفہم کے بارے میں بڑی اچھی رائے دیتی ہے۔ اسلوب محققانہ اور لب ولہجہ خالص علمی اور جذبات سے معرا۔ لیکن آگے چل کر ہم اپنا ذوق وشوق کی سابقہ کیفیت قائم نہ رہ سکی۔ پھر جوں جوں آگے بڑھے طبیعت

منقبض ہوتی گئی اور انجام کار کوفت اور بیزاری کے عالم میں یہ کتاب ختم ہوئی۔

موصوف نے فن حدیث پر ابتداءً جو محققانہ انداز کی گفتگو کی ہے اس کی حقیقت آرائش سخن کے سوا کچھ باقی نہیں رہ جاتی۔ جب اگلے ابواب مطالعہ میں آتے ہیں۔ مان لیا کہ تفاسیر میں واہی روایات بہت ہیں لیکن ان کی آڑ میں تمام ہی ذخیرۂ روایات کو مردود قرار دینا اور بخاری و مسلم تک کو کسی شمار میں نہ لانا ٹھیک وہی ذہن ہے جس نے آج کل "انکار حدیث" کا عنوان اختیار کیا ہے۔ فاضل مجیب کا دین کے بارے میں وہی رویہ نظر آتا ہے جو اہل قرآن کا ہے انھیں نہ احادیث صحیحہ کی پروا ہے نہ اجماع امت کی۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ انھوں نے پورے قرآن کو ٹھ صحفے کی طرح پڑھا ہو۔ متجددین کا حال یہی ہے کہ قرآن کو اول سے آخر تک دیکھنے کی توفیق انھیں کبھی نہیں ہوتی۔ بس جب اپنی کسی طبعزاد رائے کے لئے دلیل کی ضرورت ہوئی قرآن سے کوئی ایسی آیت ڈھونڈ لی جو کھینچ تان کر ان کے کام آسکتی ہو۔

ابو الفداء صاحب بظاہر ٹسڈل کا رد کر رہے ہیں لیکن فی الاصل وہ خود مادیت اور مغرب زدگی کا ہدف ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن کے ساتھ تفسیر بالرائے کا وہی کھیل انھوں نے کھیلا ہے جو مغرب زدہ مجتہدین کا طرۂ امتیاز ہے۔

نمونے کے لئے صرف ایک مثال کافی ہوگی۔

قرآن کے کسی نیک نیت اور ہوشمند قاری کے لئے اس حقیقت میں شک کی گنجایش نہیں کہ آسمان سات ہیں اور یہ آسمانِ دنیا جو ہماری نگاہوں کے سامنے ہے فقط حدِ نظر نہیں بلکہ ایک محسوس و مرئی وجود ہے لیکن مغرب زدہ مومنوں پر یہ خبط سوار ہوچکا ہے کہ نہ تو آسمانی کی قرآنی گنتی تسلیم کرو نہ آنکھوں سے نظر آنے والے آسمان کو آسمان مانو اسی خبط کے جراثیم ابو الفداء صاحب نے بھی درآمد کر لئے ہیں وہ ٹھیک "اہل قرآن" کے انداز میں بڑی قطعیت کے ساتھ فرماتے ہیں

"سبع کے لفظ کے معنے سمجھنے سے ڈاکٹر ٹسڈل کو یہ غلط فہمی ہوئی۔ عرب سبع (سات) سبعین (۷۰) کے اعداد کو کثرت کے موقعہ پر استعمال کرتے ہیں (لسان العرب ابن اثیر) اور لغت میں ہے کہ السماء کل شیئ اعلاہ (مفردات راغب) جو ہر ایک چیز کے اوپر ہو وہ اس کا آسمان ہے۔" (ص ۱۳۲)

اسے غفلت یا پھر ڈھٹائی کے سوا کیا کہیں گے کہ سبع سمٰوٰت سے مرادِ سات آسمان سمجھنے کو وہ اس طرح ڈاکٹر ٹسڈل کی غلط فہمی قرار دے رہے ہیں گویا علمائے اسلام تو ایسا سمجھتے ہی نہیں حالانکہ خلف و سلف میں غالباً کوئی مستند مفسر ایسا نہیں جس نے سبع سمٰوٰت کا مطلب سات آسمان کے سوا کچھ اور سمجھا ہو اور یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ جو مسلمان خالی الذہن ہو کر خلوص کے ساتھ پورے قرآن کا مطالعہ کرے وہ ایسی لغو و لایعنی تاویل کا تصور تک کر سکے جو مغرب زدہ جہال کی ہمنوائی میں ابو الفداء صاحب پیش فرما رہے ہیں۔ استدلال بھی ٹھیک ویسا ہی ہے جیسا شاگردان مغرب اختیار کرتے ہیں یعنی تمام متعلقہ تفصیلات کو چھوڑ کر صرف ایک مفید مطلب حوالہ نقل کر دینا اور کم علموں کو یہ باور کرانا کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہی سلف سے بھی ثابت ہے۔

کوئی پوچھے کہ اگر سات اور ستر کے الفاظ محاورۂ عرب میں کثرت کے لئے رائج ہیں تو کیا اس سے یہ لازم آگیا کہ اب کبھی یہ الفاظ اعدادِ معینہ کے لئے بولے ہی نہ جا سکیں گے۔ عربی ہی میں نہیں اردو میں بھی بعض اعداد کثرت کے لئے رائج ہیں مثلاً کہا جاتا ہے۔

"زید ہزار بار بھی ایسا مطالبہ کرے تو ہم نہ مانیں گے۔"

یہاں ہزار کا عدد فقط کثرت کے لئے استعمال ہوا مقصود عددِ معین نہیں ہے لیکن اس محاورے سے یہ تو لازم نہیں آیا کہ ہزار کا لفظ جب بھی بولا جائیگا بس کثرت ہی مراد ہوگی۔ زید کہتا ہے کہ عمر پر میرے ایک ہزار روپے قرض ہیں تو کون احمق کہہ سکتا ہے کہ ہزار سے مراد عدد معین نہیں ہے اسی طرح سبع اور سبعین کے لفظ ہیں کہ بے شک عربی میں انھیں کثرت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے لیکن عددِ معین کے لئے بھی بلا ریب استعمال کیا جاتا ہے اس کا مدار قرائن اور سیاق و سباق پر ہے کہ مقصود استعمال کیا ہے چنانچہ قرآن اٹھا کر دیکھئے آسمانوں کے لئے سبع (سات) کا عدد نو دس جگہ تو صراحۃً بیان ہوا ہے کا سیاق و سباق

سے قطعی طور پر معلوم ہو گا کہ مراد آسمانوں کی کثرت کا بیان نہیں بلکہ عددِ معیّن سے مطلع کرنا مقصود ہے۔

ایک مثال حدیث کی ملاحظہ ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الولاء لمن اعتق وان اشترطوا مائۃ شرط (بخاری و مسلم)	ولاء اسی کے لئے ثابت ہو گا جس نے کوئی غلام آزاد کیا خواہ (سابقہ) مالکین سو شرطیں کیوں نہ لگائیں۔

یہاں مضمونِ حدیث کی تشریح کا محل نہیں۔ دکھانا صرف یہ ہے کہ حضورؐ نے مائۃ (سو) کا عدد بطور کثرت کے بولا ہے مقصود عددِ معیّن نہیں۔ لیکن کیا اس کا یہ مطلب بھی ہو گا کہ اب لفظ مائۃ جب بھی بولا جائے گا کثرت ہی مقصود ہو گی معیّنہ عدد نہیں!۔

ابو الفداء صاحب آگے فرماتے ہیں

"قرآن کریم میں ہے کہ آسمان کوئی ٹھوس چیز نہیں بلکہ دھواں ہے ثم استوی الی السماء وھی دخان (الم: ۱۱)

متوجہ ہوا آسمانوں کی طرف اور وہ دھواں ہے۔ اس میں ستارے و سیارے ہیں۔ سبع سمٰوات سے کئی آسمان مراد ہیں وہ سب سیارے جو ہم کو اوپر نظر آتے ہیں ہماری زمین کے لحاظ سے ہمارا آسمان ہیں۔" (ص۳۴۲)

یہاں خود رائی حق پوشی کے حدود میں داخل ہو گئی ہے کیونکہ ابو الفداء صاحب نے اگر پورا قرآن نہ بھی پڑھا ہو تو بہر حال وہ آیات ضرور پڑھی ہوں گی جن میں کہ یہ ایک آیت نقل فرمائی ہے ایسی صورت میں وَھِیَ دُخَانٌ کا یہ ترجمہ کرنا کہ

"وہ دھواں ہے"

صریح غیر ذمہ داری ہے کیونکہ اس آیت میں آسمان کی موجودہ شکل و ہئیت کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ ذکر آغازِ آفرینش کا ہے اور اللہ تعالیٰ یہ بیان فرما رہے ہیں کہ سات آسمان تخلیق کرنے سے قبل آسمان کی اصل دھواں تھی اور اسی دھویں سے اللہ نے سات آسمان بنا دیئے۔ اگلی پچھلی آیات سمیت ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"(اے پیغمبر) کافروں سے کہو کہ کیا تم اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے دو دن میں زمین بنا دی اور برابر ٹھیراتے ہو اس کے دوسروں کو۔ وہ تو پروردگار ہے تمام کائنات کا۔ اور اسی نے رکھے زمین میں بھاری پہاڑ اوپر سے اور برکت رکھی اس میں اور ٹھیرائیں اس میں خوراکیں اس کی چار دن میں۔ جواب پورا ہوا سائلین کے لئے۔ پھر (زمین اور اس کی ضروریات تخلیق کرنے کے بعد) وہ خدا متوجہ ہوا آسمان کی طرف اور وہ اس وقت دھواں تھا پس کہا اس سے اور زمین سے کہ آؤ تم دونوں خوشی سے یا بادلِ ناخواستہ۔ وہ دونوں بولے ہم آئے خوشی سے۔ پھر بنا دیئے (اس دھوئیں سے) سات آسمان دو دن میں اور یہ آسمان میں اس کا حکم اتارا اور رونق بخشی ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے اور محفوظ کر دیا۔" (حٰم السجدۃ)

کیا ان آیات کو پڑھ کر کسی ذمہ دار آدمی کے لئے اس کے سوا کچھ سمجھنا اور سمجھانا ممکن ہے کہ ابتداءً باری تعالیٰ نے بطور ایک دھواں جیسی چیز تخلیق فرمائی پھر اس سے آسمان بنائے تو انہیں مستقلاً دھواں قرار دینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یوں کہے کہ چونکہ اللہ نے پھر کو پانی سے زندگی بخشی ہے لہٰذا کوئی بھی شے ٹھوس نہیں!

کیا قرآن میں آسمانوں کے بارے میں سبعا شدادا (سات مضبوط ٹھوس) کے الفاظ نہیں آئے (النباء) کیا "شداد" ایسی شے کی صفت آسکتی ہے جو دھویں اور غبار کی طرح لطیف اور قابلِ نفوذ ہو۔

لطیفہ یہ بھی ہے کہ ایک طرف تو موصوف موجودہ آسمان کو دھواں باور کرا رہے ہیں دوسری طرف اس کے وجود ہی سے انکار ہے اور دعویٰ کر رہے ہیں کہ آسمان تو بس سیاروں کو کہا گیا ہے کوئی پوچھے کہ سیاروں کو دھواں تو سائنس بھی نہیں کہتی بلکہ انہیں ٹھوس وجود مانتی ہے اور یہاں تک تحقیق ہے کہ ان میں سے بعض [illegible]

معدنیات بھی پائی جاتی ہیں۔

مذکورہ آیات پر توجہ کیجئے جو ترجمے کی شکل میں نقل ہوئیں کیا تنہا یہی یہ یقین دلانے کے لئے کافی نہیں ہیں کہ ستاروں کی حقیقت — خواہ وہ ثوابت ہوں یا سیار ہے — ان چراغوں کی ہے جن سے آسمانِ دنیا کو زینت دی گئی ہے نہ یہ کہ وہ بجائے خود آسمان ہیں۔ کسی شے کو زینت دینے والا ساز و سامان ظاہر ہے کہ اس شے سے جدا وجود رکھتا ہے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے آراستہ کرنے کی بات قرآن میں دیگر آیات میں بھی کہی گئی ہے پھر سوائے خود مستوں کے کون یہ کوشش کر سکتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح آسمان کو محض ایک فرضی و اعتباری شے قرار دیدے اور اس طرح سائنس کے اس انداز ے کی تصدیق کر دے کہ آسمان فقط " حدِ نظر " کا نام ہے۔

یہ ہم نے فاضل مجیب کے فکری منہاج کا فقط ایک نمونہ پیش کیا پوری کتاب میں اس طرح کی چیزیں وافر مقدار میں موجود ہیں۔ وہ نہ معجزات میں یقین رکھتے ہیں نہ ملائکہ میں۔ ملائکہ ان کے نزدیک وئی مستقل مخلوق نہیں بلکہ بعض قوتوں اور صلاحیتوں کے لئے کنایہ ہے آدمؑ و حواؑ ان کے نزدیک معین ہستیوں کے نام نہیں بلکہ نوعِ انسانی سے استعارہ ہے جنت دوزخ کی قرآنی تفصیلات کے سلسلے میں ان کا حاصلِ تحقیق یہ ہے کہ یہ فقط مجاز و تمثیل ہیں اور ان کا تعلق فقط انسان کے قلب اور سرور سے ہے۔ غرض معتقدات کے باب میں ابو الفداء صاحب کا موقف ٹھیک متجددین جیسا ہے اور احادیث کے بارے میں بھی ان کی تکنیک وہی ہے جو منکرِ حدیث نے اپنائی ہے یعنی اپنے مفید مطلب روایات کو تو بطور استدلال پیش کر دیا اور ان کے علاوہ تمام روایات کو بلا تنقید محض مردود باور کرانا۔

حاصلِ تبصرہ یہ ہے کہ " سرچشمہ قرآن " ہمارے نزدیک ڈاکٹر فنڈل کی خرافات سے زیادہ گمراہ کن ہے۔ فنڈل سے تو صرف وہی لوگ اثر پذیر ہو سکتے ہیں جو پہلے ہی مغرب کے مرعوب و تجدد کے ہدف ہیں لیکن اس جوابی کتاب سے عامۃ المسلمین بھی اندھیروں میں بھٹک سکتے ہیں۔ کاش ابو الفداء صاحب پہلے خود اپنے معتقدات و افکار کی اصلاح کر لیتے اور رنگِ مغرب سے بچتے ہوئے اسباق کو ایک طرف رکھ کر سعادت مندوں کی طرح پورے قرآن کا مطالعہ فرماتے تو ڈاکٹر فنڈل کی خرافات کا رد ان کے دین و دنیا دونوں میں سرخرو کرتا لیکن بحالتِ موجودہ ان کی محنت اکارت ہی نظر آتی ہے خدا کرے ہمارا یہ تند و تلخ تبصرہ ان کے لئے مہمیز بن جائے اور وہ اپنے مفروضات کو بالائے طاق رکھ کر پورے قرآن کا مطالعہ فرمائیں۔ (عامر عثمانی)

قول طیب

مولانا الیاس برنی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ نے بہترین انعامات سے نوازے انھیں قادیانیت کے رد میں لاجواب کام کرنے والے دیدہ ور کی حیثیت سے تو ہند و پاک کا ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا تھا لیکن اُس حیثیت کو بہت کم لوگ جانتے ہوں گے جسے ان کے ایک پُر جوش متوسل جناب محمد عبد العلیم الیاسی چشتی نے اپنی تالیف " قول طیب " میں نمایاں کیا ہے یعنی پیر و مرشد کی حیثیت۔ مؤلف نے اپنے مقدمۂ کتاب میں ان کے کمالاتِ باطنی اور اوصافِ عالیہ پر بہت ڈوب کر روشنی ڈالی ہے انداز وہی ہے جو اہلِ طریقت میں بالعموم رائج ہے مثلاً

" رویا میں بشارت ہوئی کہ اس ناچیز کو حضرت سے اخوت کی نسبت بطفیل نبی کریم صلعم حاصل ہے " ص۳۰

کچھ آگے

" یہ سب حضرت سیدنا غوث اعظم کی ذرہ نوازیوں کا صدقہ ہے۔ ھذا من فضل ربی " ص۳۱

مولانا برنی کے ملفوظات فاضل مؤلف نے اس طرح جمع کئے ہیں کہ جو باتیں موصوف سے سنتے انھیں حافظے کی مدد سے کبھی دوسرے تیسرے دن اور کبھی دو تین ماہ بعد بھی درج قرطاس کر لیتے۔ کچھ تحریروں کے اقتباسات بھی جزوِ کتاب ہیں۔

فاضل مرتب نے تبصرہ نگار کو بذریعہ مکتوب آگاہ کیا ہے کہ " قول طیب " کو بفضلہ تعالیٰ غیر معمولی طور پر پسند کیا جا رہا ہے اور ارباب نقل نے اس پر شاندار اچھے تبصرے کئے ہیں۔ تبصرہ نگار نے بڑے شوق سے اسے پڑھا۔ بلاشبہ علم و معارف کے قیمتی موتی اس میں بکھرے ہوئے ہیں اور حاصلِ مطالعہ یہ نکلتا ہے کہ مولانا برنیؒ واقعۃً صاحبِ باطن تھے۔ صاحبِ بصیرت تھے

[illegible]موافقت کے سالک تھے۔

ویسے موصوف اگر زندہ ہوتے تو اس کتاب پر ہم طویل تبصرہ [illegible]تے۔ اس کے بعض مندرجات سے ہمیں سخت اختلاف ہے لیکن [illegible] نہیں تو ہم اتنی ہی اشارت پر اکتفا کرتے ہیں کہ قیمتی جواہر کے اس گنجینۂ معانی کا مطالعہ صرف ان لوگوں کو مفید ہو سکتا ہے جو ایک [illegible]رف قرآن و سنت کا علم رکھتے ہوں دوسری طرف ان میں نقد و نظر کی اہلیت بھی ہو اور عقیدت کا غلو ان کی بصیرت پر غلاف نہ چڑھا سکے۔

صفحات ۵۰۴۔ لکھائی چھپائی غیر معیاری۔ کاغذ سفید۔ قیمت چار روپے

ملنے کا پتہ :- عبدالحلیم۔ مکان ۱۳۸۰۔ روبرو مسجد پیر پاشا۔ بیرون دروازہ دبیر پورہ۔ حیدر آباد دکن (عامر عثمانی)

تفسیر بیان القرآن

حکیم الامت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر القرآن کئی بار چھپ چکی ہے اور اب اس کی اشاعت کا سلسلہ ادارۂ تفسیر (دیوبند) نے شروع کیا ہے سلسلہ سے مراد یہ ہے کہ بیک وقت پوری تفسیر چھاپنے کے عوض جزو جزو ماہانہ قسطوں میں چھاپا جا رہا ہے کم و بیش سوا پارے کی تفسیر پر مشتمل ایک جزو کا ہدیہ تین روپے۔

جو لوگ ایک روپیہ فیس ممبری داخل کر کے ممبر بن جائیں گے ان سے ڈاک خرچ نہیں لیا جائے گا۔

حضرت حکیم الامتؒ نے اس کا جو ایڈیشن اپنی زندگی میں بہ سہولت نظر کیا تھا وہ اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے امتیازی سمجھا گیا ہے اور ادارۂ تفسیر اسی ایڈیشن کو فوٹو آفسیٹ سے چھاپ رہا ہے چھپائی اور کاغذ وغیرہ سب بہتر ہیں۔

اس تفسیر کے حسن و قبح کو تبصرے کی میزان میں تولنا ہم جیسے بے بضاعتوں کا منصب نہیں۔ مولانا اشرف علی صاحبؒ سیتہ حقیقی پر اللہ کی آیات میں سے ایک آیت تھے اور ان کے علم و قلم نے جو خدمات دین و ملت کی انجام دی ہیں وہ انمول ہیں خطا و سہو سے کون پاک ہے حکیم الامت بھی اس خاصۂ بشریت سے بالا تر نہیں ہو سکتے لیکن اپنی خطا پر مطلع ہو جانے کے بعد کمال بے نفسی کے ساتھ وہ رجوع کا اعلان کر دیا کرتے تھے اسکی نظیریں بہت کم ملتی ہیں۔

ان کی تفسیر بعض اعتبار سے منفرد ہے بین السطور ترجمہ دینے کے بعد تفسیری نکات ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں پھر ذیلی حواشی میں علوم عربیہ کی متعلقہ شقوں کے اعتبار سے ایضاح فرمایا گیا ہے نحو، لغت اور علم کلام کی توضیحات فارسی میں ہیں۔ بقیہ حواشی مسائل السلوک سے مزین ہیں جن کا متن عربی ہے مگر ساتھ ہی اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے عام حضرات کے لئے تو ترجمہ و تفسیر ہی کافی ہوں گے مگر خواص، حتیٰ کہ اساتذہ تک کے لئے ذیلی حواشی اور مسائل السلوک بڑی قیمتی متاع ہیں۔

متعلقہ معلومات دریافت کرنے کا پتہ :- ادارۂ تفسیر دیوبند

(عامر عثمانی)

ماہنامہ بینات

یہ ماہنامہ کراچی سے مولانا عبدالرشید نعمانی کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا ہے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ ابھی چند ہی اشاعتیں سامنے آئی ہیں مگر اس نے اپنے معیار کا لوہا منوانا شروع کر دیا ہے مولانا موصوف بڑے پائے کے عالم ہیں علم کے ساتھ قلم بھی بڑا اچھا پایا ہے۔ ان کی تحریروں میں مواد خوب ہوتا ہے اور ان کا قلب صافی اسلام کی محبت سے معمور ہے۔

رسالے کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے انھوں نے دیگر اہل علم و قلم کا بھی تعاون حاصل کیا ہے جس سے رسالے کی شان بڑھ گئی ہے اللہ تعالیٰ اس غنچۂ نوشگفتہ کو پھول بنائے اور تشنگان علم کے مشام معطر ہوں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اس میں فاضل مدیر نے محمود احمد عباسی کی مشہور کتاب "خلافت معاویہؓ و یزید" پر بھی نقد کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے جس کی قسط ہر شمارے میں آتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ وہ پوری کتاب مرتب کر رہے ہیں۔ ہم ہر قسط بڑی دلچسپی سے پڑھتے ہیں اور کوئی تکلف نہیں یہ کہنے میں نہیں کہ مذکورہ کتاب پر یہ پہلی تنقید ہے جسے غالب اعتبار سے علمی تنقید کہا جا سکتا ہے ورنہ اس سے قبل تو جتنی تنقیدیں کی گئیں۔ ان کی حیثیت منہ چڑانے سے زیادہ نہیں رہی۔ موصوف [illegible] اور

مشہور ترین تفسیر ضخیم تفسیروں کا خلاصہ و عطر ہے۔
اسکی مسلمہ اہمیت کے پیشِ نظر عربی نہ جاننے والوں کے لئے اس کا
اُردو ترجمہ و تفسیر اور مشکلات کا حل سلیس و شگفتہ اُردو میں پیش کیا جا رہا ہے۔

خصوصیات

(۱) اصل عربی متن مع اعراب (۲) متن کے نیچے عام فہم اُردو ترجمہ (۳) ترجمے کے بعد متعدد تفاسیر مثلاً تفسیر کبیر، کشاف، روح البیان، ابن کثیر، تفسیر مظہری، بیان القرآن وغیرہ کے منتخبہ مضامین (۴) علوم قرآنی سے متعلق دورِ حاضر کی تحقیق (۵) علمی لطائف و قرآنی نکات (۶) شانِ نزول، ربطِ آیات، بلاغت اور اسلوبِ قرآن پر بلیغ تبصرہ (۷) صحیح عقائد و مسالک کی ترجمانی۔

پروگرام

تفسیر جلالین کا ایک پارہ ضخیم ہونے کے باعث قسط وار ہر دو ماہ بعد پیش کیا جاسکے گا ایک پارے کا ہدیہ مبلغ دو روپے اور اخراجات ڈاک چودہ آنے ہیں۔ لیکن جو حضرات مبلغ ایک روپیہ فیس ممبری کے لئے روانہ فرما کر پوری تفسیر کے مستقل ممبر بن جائیں گے اُن کی خدمت میں صرف دو روپے میں ایک پارہ (یا ایک جزو) پیش کیا جائے گا۔ تمام اخراجات ادارہ کے ذمہ ہوں گے۔
جس نے کتابی شکل میں مکمل کر لیا ایک نام پر طلب فرمائیں گے تو اُن کی خدمت میں رعایتی وی پی آدھ سیر کی روانہ ہوگی۔ لہٰذا آج ہی اس پروگرام میں شرکت کے لئے فیس ممبری منی آرڈر سے ارسال فرمائیے۔
نوٹ:- (۱) کوئی صاحب ... [illegible] (۲) ممبری کے لئے کسی تجارت یا عہدہ کا ... [illegible]

ادارہ تھانوی

ماہنامہ تجلّی دیوبند

ایڈیٹر۔ عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

62 N. P.

نہایت نفیس عکسی قرآن اور حمائلیں

آرڈر میں صرف وہ نمبر لکھدینا کافی ہے جو ہر ایک کے ساتھ درج ہے

قرآن • ترجمہ: شیخ الہندؒ • تفسیر: علامہ شبیر احمد عثمانی
یہ مقبول ترین مترجم قرآن کچھ دنوں سے نایاب تھا الحمد للہ اب کچھ نسخے مہیا ہوئے ہیں۔ نفیس ایڈیشن مجلد ۲۵ روپے (اس کا نمونہ نہیں بھیج سکیں گے)

قرآن دو ترجمے والا نمبر ۶۸ • (۱) مولانا شاہ رفیع الدینؒ • (۲) مولانا اشرف علیؒ
حاشیے پر مستند تفاسیر کا خلاصہ۔ آغاز میں انبیاءؑ و صحابہؓ کے احوالِ مقدسہ، سورتوں کے خواص، غزوات کے تذکار اور اسی نوع کی دیگر مفید چیزیں اردو میں دی گئی ہیں۔ لکھائی چھپائی نفیس۔ کاغذ اعلیٰ آرٹ پیپر دبیز، زمین سبز۔ ہدیہ مجلد ریگزین چودہ روپے۔ مجلد چرمی ساڑھے تیرہ روپے۔ یہی قرآن نسبتاً ہلکے کاغذ پر (اس کا نمبر ۶۶ ہے) ہدیہ مجلد ریگزین تیرہ روپے مجلد چرمی ساڑھے سولہ روپے۔ یہی قرآن کچھ اور ہلکے کاغذ پر (اس کا نمبر ۶۷ ہے) زمین حنائی مجلد ریگزین بارہ روپے مجلد چرمی ساڑھے پندرہ روپے۔

قرآن ایک ترجمہ والا نمبر ۶۴ • ترجمہ: مولانا اشرف علیؒ • حاشیہ پر مختصر بیان القرآن
سائز تجلی سے کچھ بڑا۔ کاغذ ولایتی سفید۔ آغازِ قرآن میں بہت سی مفید چیزیں مثلاً سورتوں کے خواص، ان نامیوں کی تفصیل جو قرآن میں آئے، ان مقامات کا نقشہ جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ مجلد ریگزین کا ہدیہ بارہ روپے۔ مجلد چرمی ساڑھے پندرہ روپے۔

قرآن بلا ترجمہ نمبر B/۳ کاغذ آرٹ پیپر ولایتی۔ کتابت طباعت بے نظیر۔ ہر سطر کے بعد لائن، حروف کشادہ۔ تجلی سائز۔ کمزور نگاہ والوں کیلئے بہت

عمدہ۔ مجلد ریگزین ہدیہ آٹھ روپے۔ چرمی ساڑھے گیارہ روپے

حمائل مترجم نمبر ۸۰ • ترجمہ: شاہ عبد القادر محدث دہلویؒ۔ کاغذ آرٹ۔ زمین رنگین۔ سائز تجلی سے نصف۔ مجلد کرمچ ہدیہ دس روپے۔ مجلد پلاسٹک کور گیارہ روپے۔

حمائل مترجم نمبر ۳۵ • ترجمہ: مولانا فتح محمد صاحب۔ حاشیے پر مختصر تفسیر۔ زمین سبز۔ کاغذ ولایتی۔ سائز تجلی سے نصف۔ مجلد پلاسٹک کور۔ ہدیہ گیارہ روپے۔

حمائل مترجم • ترجمہ: شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ • تفسیر: مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
زمین حنائی۔ سائز $\frac{20\times30}{16}$ سے کچھ بڑا۔ غیر مجلد بارہ روپے۔ مجلد ریگزین ساڑھے تیرہ روپے (اس کا نمونہ نہیں بھیج سکیں گے)

حمائل بلا ترجمہ نمبر ۲۳ کاغذ سفید مضبوط۔ سائز تجلی سے نصف۔ حروف کافی روشن۔ ہر سطر کے بعد لائن۔ مجلد کرمچ ہدیہ پانچ روپے۔

حمائل نمبر ۱۳ بالکل ۲۳ جیسی بس فرق یہ ہے کہ ہر سطر کے بعد لائن نہیں ہے۔ مجلد پلاسٹک پانچ روپے۔

حمائل نمبر ۲۶ بلا ترجمہ پاکٹ سائز۔ کاغذ باریک اور چکنا (بائیبل پیپر) سفر کے لئے خاص تحفہ۔ جلد پلاسٹک کور۔ ہدیہ مجلد چار روپے۔

حمائل نمبر ۲۴ بلا ترجمہ بہت ہی مختصر سائز۔ حافظوں کے مطلب کی۔ کاغذ عمدہ۔ جلد پلاسٹک کور۔ ہدیہ دو روپے۔

نمونے مفت طلب فرما سکتے ہیں

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یوپی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ **تجلی** دیوبند

شمارہ نمبر ۳

جلد نمبر ۱۲

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

سالانہ قیمت سات روپے - فی پرچہ ۶۲ پیسے

غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۸ اشلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پوسٹل آرڈر پر کچھ نہ لکھیے بالکل سادہ رکھیے

اشد ضروری

اگر اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ

اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ اگر آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا (وی پی سات روپے باسٹھ پیسے کا ہوگا) منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

پاکستانی حضرات :- ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیجکر رسید منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتہ ہمیں بھیج دیں سالہ جاری ہو جائے گا۔

فہرست مضامین مطابق ماہ مئی ۱۹۶۳ء

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

دفتر تجلی۔ دیوبند۔ ضلع سہارنپور (یو، پی)

مدیر

عامر عثمانی

فاضل دیوبند

پاکستانی حضرات :- نیچے لکھے ہوئے پتہ پر منی آرڈر بھیجکر وہ رسید ہمیں بھیجدیں جو منی آرڈر کرتے وقت ڈاک خانہ سے ملتی ہے۔

مکتبہ عثمانیہ - مینا بازار ۸۰ ۲۲

پیر الٰہی بخش کالونی - کراچی (پاکستان)

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے "نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند" سے چھپوا کر اپنے دفتر تجلی دیوبند سے شائع کیا۔

آغازِ سخن

غلافِ کعبہ کا قضیہ

اس سال غلافِ کعبہ پاکستان میں تیار کیا گیا اور اسکی بڑے پیمانے پر نمائش ہوئی۔ جو لوگ صحافتی مطالعے سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ پڑھ ہی چکے ہوں گے کہ یہ نمائش کس قدر دھوم دھام سے ہوئی۔ غلاف کے لئے اسپیشل ٹرینیں چلائی گئیں اور عامۃ المسلمین نے بڑے شد و مد سے اپنے اُس شوق و ذوق کا مظاہرہ کیا جو اسلام کے مرکزِ ایمانی "بیت اللہ" کے لئے ان کے قلب و روح میں گہری جڑیں رکھتا ہے۔

لیکن اتفاق سے اس غلافِ کعبہ کو تیار کرانے کی سربراہی کا شرف مشیتِ ایزدی نے ایک ایسی شخصیت سے منسوب کر دیا تھا جو دنیا کے ہر مصلح اور داعیِ حق کی طرح مسلسل مخالفت اور طنز و طعن کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ اس کا نتیجہ لازماً یہ ہونا ہی چاہیئے تھا کہ چاروں طرف سے شور اُٹھے' یلغار ہو' داؤ پیچ ذہنوں میں رچے ہوئے تعصب اور دلوں میں اُترے ہوئے عناد و حسد نے کمانیں کھینچ لیں' تیر برسنے لگے۔ وہ شور اٹھا کہ کان پڑی آواز سنائی دینی مشکل ہو گئی۔

لینا پکڑنا مارنا دوڑنا۔ یقین کیجئے کہ یہی انداز اُن اداریوں' مراسلوں اور مقالوں کا رہا ہے جو گذشتہ ماہ خودرو گھاس کی طرح اُگتے چلے گئے ہیں۔ کیا منکرینِ حدیث کیا حامیانِ حدیث کیا قادیانی کیا بریلوی کیا دیوبندی کیا رکابیہ غنہ جسے دیکھو غلافِ کعبہ کی زیارت کے ملک گیر غلغلے پر حزن و درد' طعن و تبرا اور الزام و افترا کا ایک خوان سجائے لئے چلا آرہا ہے۔ اخلاص و للّٰہیت کا دعوے ہر زبان پر ہے' بدعت سے نفرت اور توحید سے عشق کا نعرہ وہ زور شور سے لگایا جا رہا ہے کہ جیسے غیرتِ حق سے لبریز سینے پھٹ جائیں گے اور دل و جگر سوز و درد سے پارہ پارہ ہو جائیں گے' اسلوب جدا جدا مگر اس نوحے میں سب مشترک کہ غلافِ کعبہ کی نمائش اور زیارت کا یہ سارا ہنگامہ مولانا مودودی نے اپنی ذات اور جماعت اسلامی کو مقبول بنانے کے لئے بطور ایک سیاسی چال کے برپا کیا ہے۔

خیر۔ پاکستانی علماء اور صحافی جو کچھ بھی کریں ہمیں اس سے کیا' لیکن شیطان شیطان کب کہلائے گا اگر وہ غلاظت کو کرید کرید کر دُور تک نہ پھیلا دے۔ خیر سے بعض ہندوستانی جریدے بھی نچلے نہیں بیٹھے اور اسی موضوع پر شذرے اور مراسلے چل کھڑے ہوئے۔ جسے دیکھئے اس کے الفاظ و انداز سے یہی ہویدا ہے کہ اس سے بڑھ کر اسلام کا درد رکھنے والا' اس سے بڑا حامیِ دین' اس سے زیادہ فہیم و حساس' اس سے فراواں حمیتِ ایمانی کا سرمایہ دار اور اس سے فزوں تر صاحبِ زہد و تقویٰ کوئی نہیں۔

ایک بزرگ' جو مدتوں سے صداقت کے علمبردار ہیں حیرت کی شدت سے دم بخود ہیں۔ اسی عالمِ حیرت میں وہ غلافِ کعبہ کی اس وقتی نمائش کو "تحریک" کا نام بھی دے رہے ہیں اور اسی سے طبعِ رواں کی تسکین نہیں ہوتی تو "ناپاک" کا لفظ بھی ان کے قلمِ تقویٰ رقم نے اُگل ہی دیا ہے۔ ساتھ ساتھ اس ہنگامے پر "سیاست" کا بھی الزام ہے اور جب سیاست نامراد کا نام

آیا تو پھر اسے "کمبخت" کہنا بھی ضروری ہی تھا! — حتیٰ کہ اخلاص للہیت کی بلندی سے انھوں نے بڑے سوز و درد کے ساتھ یہ ماتم بھی فرما ہی دیا ہے کہ ہائے سیاست! اس ظالم نے اخلاص کو دین سے کس طرح جدا کر دیا ہے۔

ایک اور محترم — جو خاصے تقوی چکاں قلم کے مالک ہیں اپنے شذرے میں اطلاع دیتے ہیں کہ غلاف کی نمائش کی تفصیلات پڑھ کر ان کے تو ہوش ہی اُڑ گئے۔ یا للعجب مولانا مودودی اور غلافِ کعبہ کی نمائش و زیارت کا اہتمام ایجادِ شہ ان محترم کے نزدیک ایسا ہی ہے جیسے آدمی کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ اف ہم تو یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یا حسرتا مولانا مودودی نے دین کو سیاست کے اس کوچے میں پہنچا دیا جہاں قتل و رہزنی کے سوا کچھ بھی نہیں!

یہ محترم بڑے شدّ و مد اور قطعیت کے ساتھ فیصلہ دیتے ہیں کہ غلاف کعبہ کے اس ہنگامۂ زیارت اور جماعت اسلامی کے سارے لٹریچر میں کوئی جوڑ نہیں تضادِ مبین ہے۔ منافات و تباین ہے۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ مولانا مودودی نے فقط سیاسی استحصال اور عزّ و جاہ کے حصول کی خاطر اپنے تمام اصول و نظریات سے انحراف کرتے ہوئے غلاف کعبہ کو آڑ بنایا ہے۔ گویا مولانا مودودی کی بدنیتی

تین ضروری باتیں

۱۔ پچھلے خاص نمبر میں بائنڈنگ والوں کے سہو سے تھوڑے سے پرچے ایسے سپرد ڈاک ہو گئے ہیں جن کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے صفحات پورے ہونگے۔ اب تک جو لوگ دفتر کو اطلاع دیتے رہے ہیں کہ ہمارے پرچے میں فلاں فلاں صفحات کم ہیں انھیں فوراً وہ صفحات بھیج دیئے گئے ہیں۔ اگر اب بھی کسی کا پرچہ ناقص رہ گیا ہو تو وہ خط لکھکر صفحات منگا سکتا ہے۔ اگر مطلوبہ صفحات دفتر میں نہ ہوئے تو کامل پرچہ بھیج دیا جائیگا اور یہ زحمت نہیں دی جائے گی کہ ناقص پرچہ دفتر کو واپس کرو۔ ہمیں دلی رنج ہے کہ کچھ لوگوں کو اس سہو سے کوفت اٹھانی پڑی۔

۲۔ جن ایجنٹوں کے پاس پچھلے کوئی سے بھی مہینوں کے کچھ پرچے فاضل پڑے ہوئے ہوں وہ دفتر تجلّی کو واپس فرما دیں ان کے بدلے انھیں آگے کو تازہ پرچے ملتے رہیں گے۔

۳۔ خریدار حضرات دفتری مراسلت میں اپنا نمبر خریداری ضرور لکھا کریں یہ نمبر ان کے پتے کی چِٹ پر درج ہوتا ہے اسے حافظے یا کاغذ پر نوٹ کر لیں اور خط میں حوالہ دیا کریں۔ اس کے بغیر تعمیل میں تاخیر اور دشواری پیش آسکتی ہے۔ فقط والسلام۔

منیجر تجلّی

مفاد پرستی، بے اصولی اور دنیا طلبی کے جس حزم و یقین پر پاکستانی علماء و صلحاء متوجہ کناں ہیں ہمارے بعض دلیسی داعیانِ حق بھی اس میں برابر کے شریک ہو گئے ہیں۔ انداز حسب معمول وہی ہے کہ دامن نچوڑ دوں تو فرشتے وضو کریں ۔۔۔ پھر بھلا ہم جیسے کوتاہ بین، کم سواد اور طفل مکتب کی کیا مجال کہ دین کے ان مستند در مندوں اور حق کے ان بے تیغ بکف مجاہدوں کی رائے کے خلاف دم مار سکے۔ سُنا یہ تھا کہ نیتوں کا جاننے والا اللہ ہے مگر دیکھ یہ رہے ہیں کہ اللہ سے پہلے ہمارے بعض اوتاد و اقطاب نیتوں کو تاڑ لیتے ہیں۔ سُنا یہ تھا کہ دشمن کے دشمن کی مخالفت خود دشمن کی حمایت بن جاتی ہے۔

...... مگر دیکھ یہ رہے ہیں کہ مسلح عسکرِ باطل کے بالمقابل جو گروہ سینہ تانے کھڑا ہوا ہے وہی ہمارے باطل دشمن علماء و اتقیاء کی نظر میں سب سے زیادہ خار بن کر کھٹک رہا ہے حالانکہ ان علماء و اتقیاء کی مخلصانہ آرزو یہ ہے کہ باطل مات کھا جائے اور حق کا بول بالا ہو۔ واہ رے شیطان تیری چالیں

ہم مولانا مودودی کے کسی مخالف کو بددیانت نہیں کہتے۔ نہ ہمارا یہ خیال ہے کہ موصوف کے خلاف جو زبان کھلے گی وہ لازماً قصور ہی کی مرتکب ہوگی۔ موصوف انسان ہیں خطاء و نسیان کا مرکب۔ شیطان کا داؤ ان پر بھی چل سکتا ہے اور فکر یا عمل کی غلطی ان سے بھی صادر ہو سکتی ہے لیکن جو طرزِ استدلال اور اسلوب تنقید ان کی نیت کو متہم کرنے اور ان کے جذبے کو فاسد قرار دینے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے وہ ایسا ہی ہے کہ اور تو کون کس شمار میں ہے انبیاء علیہم السلام تک اس کی زد سے بچ کر نہیں جا سکتے۔

اوّل تو ہم کہتے ہیں کہ دین کی راہ سے عوامی مقبولیت اور جمہوری اعتماد حاصل کرنے کو جرم و گناہ قرار دینا ہی دراصل وہ فاسد طرزِ فکر ہے جو مغرب کے بازی گروں نے ہمارے ذہنوں میں ٹھونسا ہے۔ مغرب کی کوشش اس کے سوا کیا رہی ہے کہ جو ملتِ مسلمہ اس کی سب سے بڑی حریف ہے اس کی قوت و شوکت کے اصل سرچشمے کو خشک کر دے۔ ہماری قوت کا سرچشمہ وہی دین تو تھا جو سیاست کو شجرِ ممنوعہ قرار دینے کے عوض اپنی لونڈی قرار دیتا تھا اور سیاست و روحانیت کے درمیان دیوار کھڑی کرنے کے بجائے سیاست کی ناک میں نکیل ڈال کر

گھوڑے کی طرح ہنکاتا تھا۔ مغرب نے دین اور سیاست کو دو ایسے متوازی خطوط کی حیثیت دی جنھیں ہمیشہ الگ ہی الگ چلنا چاہئے اور خود ساختہ تصوف کے رہبانی تصورات نے مغرب کے اس فنکارانہ پروپیگنڈے کو خوب سہارا دیا۔ ثمرہ یہ نکلا کہ مسلمانوں نے دین و سیاست کی جدائی کو ایک امر مسلّم کے طور پر قبول کر لیا اور شدہ شدہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ جو لوگ علمی طور پر دین و سیاست کی جدائی کے اس باطل تصور کو غلط کہنے پر مجبور رہیں وہ بھی تحت الشعوری طور پر اسی کی زلفِ دوتا کے اسیر ہیں۔ دیکھ لیجئے مولانا عبدالماجد دریا بادی جیسے روشن فکر غیر دقیانوسی اور علامہ قسم کے بزرگ بھی اپنی تحریروں میں آپ کو "سیاست" پر اسی طرح نفریں کرتے نظر آئیں گے جیسے یہ لفظ اپنی اصل اور وضع ہی کے اعتبار سے نجس العین ہو۔ شراب و خنزیر کی طرح ناپاک ہو ۔۔ یہی مغرب بھی چاہتا تھا۔ اس کی خواہش پوری ہوئی اور اسلام کے پیروں تلے سے اقتدار و شوکت کی زمین اس طرح نکل گئی کہ اب خیر سے جہاں جہاں مسلمان حکمراں ہیں وہاں بھی حکومت عملاً کفر و زندقہ ہی کی ہے۔ دار الکفر میں نہیں خود "دار الاسلاموں" میں اسلام کا ایک ایک جوڑ توڑ دیا گیا ہے۔ اس بیچارے کے لئے کہیں امان نہیں۔ یہ نتیجہ ہے دین اور سیاست کے مابین دیوار کھڑی کرنے کا۔ دیوار چاہے تصوف کی ہو یا مغربی افکار کی۔ اس دیوار کو کوئی چاہے روحانیت کا مقدس نام دے لے یا زہد و اتقا کا پاکیزہ لقب۔ نتیجے میں کوئی فرق واقع نہ ہوگا۔ گویا ہمارے نزدیک یہ طعنہ ہی فسادِ ذہن کی علامت ہے کہ فلاں شخص یا گروہ نے فلاں دینی کام مقبولیت اور سیاسی منفعت حاصل کرنے کے لئے کیا۔ اے بزرگو اگر کیا بھی تو کیا گناہ کیا۔ ثابت اگر یہ ہو جائے کہ ساری تگ و دو ذاتی مقاصد اور دنیاوی مفادات حاصل کرنے کے لئے کی جا رہی ہے تب تو بے شک طعن بجا لیکن اگر کچھ لوگ دین ہی کے غلبہ و اقتدار کی خاطر اپنے کو مقبول بنانا چاہتے ہیں اور انتخابی سیاست کے سوا حاضر الوقت دنیا میں کوئی پُرامن اور آئینی راستہ منصبِ اقتدار تک پہنچنے کا نہیں رہ گیا ہے تو

کیا عیب و گناہ ہے اس میں کہ کوئی جائز کام جمہور کی ہمدردی اور تعاون حاصل کرنے ہی کے مقصد سے انجام دے لیا جائے۔ کیا تالیف قلب دین ہی کا ایک جزئیہ نہیں کیا دین کو غالب مقتدر کرنے کے لئے خود خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر مال غنیمت کی تقسیم تالیفِ قلب کی بنیاد پر نہیں کی تھی؟ کیا ایک موقع پر حضورؐ نے کسی ایسے شخص کو جو مستحق قتل تھا یہ کہہ کر زندہ نہیں چھوڑ دیا تھا کہ لوگ کہیں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں؟ کیا حضورؐ نے بے شمار ایسے ظالموں کو جنھیں فنا کے گھاٹ اُتار دینا کسی طرح بھی عدل کے خلاف نہ ہوتا صرف اس لئے معاف نہیں کر دیا تھا کہ اس طرح اسلام کے حق میں حسن ظن اور مسلمانوں کے بارے میں خوش گمانی فروغ پائے گی!

جو لوگ سر سے پیر تک خلوص و للّٰہیت کی تصویر بن کر درد بھرے لہجے میں فریاد کرتے ہیں کہ فلاں شخص دین کو سیاست کے لئے استعمال کر رہا ہے اور فلاں جماعت خود کو مقبول بنانے کے لئے فلاں شغل اختیار رکئے ہوئے ہے کیا وہ بتائیں گے کہ ان کے ملکوتی اندازِ فکر سے معاذ اللہ خود اسوۂ رسول کیسے بچکر جاتا ہے؟ اپنے خود ساختہ معیار تنقید کو پیغمبرؐ پر بھی استعمال کرو اور اس ذہنی رہبانیت کا طلسم ہرگز مت ٹوٹنے دو جس نے نعرۂ تکبیر والے دین کو مزاروں، قبوں اور درگاہوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ جس نے شیطان کی ذریت کو کھلی چھٹی دی ہے کہ تمھارے ارد گرد کفر و زندقہ اور عیاشی و فحاشی کی ساری غلاظتوں کو اس طرح فضا میں رچا بسا دے کہ سانس کے ساتھ وہ تمھارے رگ و پے میں سماتی رہیں اور تم اپنے ہی امراضِ تشنیع کے چکر میں اس درجہ سرگرداں رہو کہ اقتدارِ باطل کے لئے کسی چیلنج کا سوال ہی پیدا نہ ہو سکے

خدا جانے جماعت اسلامی کے لٹریچر میں یہ بات کس مقام پر آئی ہے کہ غلافِ کعبہ تیار کرانے کی سعادت اگر کسی شخص کے حصے میں آجائے تو وہ اس سعادت کو عامۃ المسلمین کی توجہ اور عقیدت حاصل کرنے کے لئے کام میں نہ لائے۔ اگرچہ اصلاً یہ الزام بالکل خلافِ واقعہ ہے اور سوائے سوئے ظن کے کوئی دلیل اس کے حق میں نہیں کہ غلاف کعبہ کی نمائش مولانا مودودی نے سیاسی انتفاع کے جذبے سے کی ہے۔ تخمین اور بدگمانیوں کے تیر چلائے جاؤ تو کون تمھاری پرواز خیال کے پر کتر سکتا ہے لیکن الزامات خیال آرائیوں سے ثابت نہیں ہوا کرتے تاہم چند لمحے کے لئے مانے لیتے ہیں کہ نمائش و زیارت کا ہنگامہ سیاسی انتفاع ہی کے مقصد سے تھا لیکن ثابت تو کرو کہ دینِ خانقاہی کے سوا کونسے دین نے یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ ایک شخص یا گروہ اگر اقامتِ دین کی تحریک کو مقبول بنانے اور عامۃ المسلمین کی توجہات حاصل کرنے کے لئے کوئی جائز قسم کا ہنگامہ برپا کرنے کا موقع پا ملے ہے تو اس سے فائدہ نہ اٹھائے۔ ٹھیک ہے کہ مولانا مودودی نے فقط اور فقط عوامی التفات حاصل کرنے کے لئے اس ہنگامے کے تانے بانے پھیلائے مگر عوام کو غلافِ کعبہ کی زیارت کرانا نہ گناہ ہے نہ بدعت پھر کیوں اس کے ذریعے سیاسی منفعت حاصل نہ کی جائے۔ شیطانی سیاست کے علم بردار ہزار چالیں چلتے رہیں تو کچھ نہیں لیکن دینی سیاست کے داعی اگر ایک امرِ مباح کو چال کے طور پر استعمال کر لیں تو ادھر سے اُدھر تک زہد و تقویٰ کے کان کھڑے ہوتے چلے جائیں اور سجدوں سے منور پیشانیوں میں شکنیں پڑ جائیں یہ کہاں کا دین ہے کس قرآن اور حدیث سے مستنبط ہے۔ کلمے کی تبلیغ اور چلّوں کی ترویج کرنے والوں کو اپنے کام سے کام رکھنا چاہئے۔ جدید ہتھیاروں سے مسلح عسکرِ باطل سے لڑنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا وہ نظریات کی مسندِ راحت پر بیٹھ کر سمجھے ہوئے ہیں۔ اعتراض اعتراض اعتراض — کوئی بڑھ کر یہ تو بتاتا نہیں کہ دیکھو راہِ حق میں یوں جان دیتے ہیں، یوں طوق و سلاسل کو گلے لگاتے ہیں یوں شاطرِ باطل کے مہرے پیٹتے ہیں۔ بس اپنوں کی مخالفت ہے۔ اس محاذ کو زک پہنچانے کی فکر ہے جو ذریاتِ شیطانی کے بالمقابل سب سے بڑا منظم محاذ ہے۔ آنکھوں میں آنسو بھر لانا اور زہد و تقویٰ سے لبریز وعظ کہہ دینا بہت آسان ہے لیکن ایک دیو پیکر عفریت کو میدانِ عمل میں [illegible]

تیشۂ فرہاد لیکر چٹانیں توڑنے میں عمریں کھپا دینا بہت مشکل۔

بہرکیف اصولی بات تو ہم عرض کر چکے۔ اب رہا غلافِ کعبہ کی نمائش کے ہنگامے کا بدعت ہونا تو اگرچہ اہلحدیث دوستوں کے تقریباً سبھی مضامین اس موضوع پر ہم نے پڑھ لئے ہیں اور کم و بیش چودہ سال سے ہم خود بھی بدعات ہی کے تعاقب میں لگے ہوئے ہیں لیکن سچی بات ہے اپنی سمجھ میں تو نہیں آیا کہ یہ مبارک ہنگامہ بدعت کیسے ہوگیا بدعت کہتے ہیں کسی ایسے جدید فعل کو جو حصولِ ثواب کی نیت سے کیا جائے حالانکہ اس کا موجبِ ثواب ہونا دین کے معتبر مآخذ سے ثابت نہ ہو۔ علاوہ ازیں دوام والتزام بھی بدعت کی صورت گری میں تکمیلی عنصر کا درجہ رکھتا ہے ہم نہیں جانتے کہ مرفوع القلم لوگوں کے علاوہ کن لوگوں نے حصولِ ثواب کی نیت سے غلافِ کعبہ کی زیارت کی ہوگی اور دوام والتزام کا تو کوئی سوال ہی نہیں کہ غلافِ کعبہ ہر سال پاکستان میں نہیں بنتا ہے۔

آخر کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ہم لوگ تو فٹ پاتھ کے دوا فروش کی ڈگڈگی پر بھی دوڑے چلے جاتے ہیں اور گھنٹوں بھیڑ جمی رہتی ہے۔ ہر نئی چیز کی طرف بچوں جیسے رفعِ استعجاب کے ساتھ جھپٹ کر پہنچنا ہمارا طرۂ امتیاز ہے۔ تو غلافِ کعبہ کے دیدار کی خاطر کیوں نہ دوڑے جاتے جب کہ وہ "ہر روز عید نیست" کے مصداق تھا بھی دیکھنے ہی کے قابل۔ بنیاد دونوں کی رفعِ استعجاب کے شوق پر ہے ہاں فرق اتنا ہے کہ بندر کا تماشا دیکھنے یا تاج محل کا دیدار کرنے کی تہہ میں مذہبی تصورات نہیں ہوتے اس کے برخلاف غلافِ کعبہ کے دیدار کی تہہ میں مذہبی تصورات کی کارفرمائی یقیناً تھی اس کے پیچھے وہی روح پھڑپھڑا رہی تھی جسے فنا کے گھاٹ اتار دینے کی کوشش شیطان مسلسل کر رہا ہے مگر وہ فنا ہونے میں نہیں آتی۔

اب اگر ہمارے اہلحدیث دوست کہتے ہیں کہ مذہبی تصورات ہی کے تعلق سے تو ہم نے بدعت کا حکم لگایا ہے تو ہم جواب دیں گے کہ تفقہ سے کام لیجئے۔ ایک شخص اطلاع دیتا ہے کہ فلاں پہاڑ کے پتھروں پر کلمۂ طیبہ کندہ نظر آیا ہے۔ ہم سوپچاس آدمی اسے دیکھنے بڑے شوق سے دوڑے چلے جاتے ہیں تو حالانکہ اس شوق کی تہہ میں مذہبی جذبہ ضرور موجود ہے لیکن کیا اِس سفر کو بدعت کہیں گے؟

ہرگز نہیں بدعتِ مصطلحہ کا اس سے کیا تعلق۔ غلافِ کعبہ کی زیارت بھی اصلاً اسی کے مثل ہے بس فرق اتنا ہے کہ مذکورہ قسم کی روایتیں تو عموماً غلط نکلتی ہیں اس لئے ان پر اعتبار کرکے دوڑ لگانے والوں کو سادہ لوح کہا جاتا ہے لیکن غلافِ کعبہ روایت نہیں واقعہ ہے۔ تو ہم نہیں ٹھوس شے ہے۔ اسے دیکھنے کے لئے سفر کرنا اور نسبتِ گرامی کے تحت اسے شریف کہنا، اسے تقدیس کی نگاہوں سے دیکھنا، اسے موقع میسر آنے پر آنکھوں سے لگا لینا ہرگز بدعت نہیں۔

رہا ان ذیلی مفاسد پر شور مچانا جو اس ہنگامے سے منسوب کئے جا رہے ہیں تو اول تو ان کی حیثیت افواہ کی ہے کم سے کم مبالغہ تو ضرور ہی کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اسی شمارے میں ہم دو بیان نقل کر رہے ہیں جن سے اندازہ ہو جائے گا کہ مخالفت کرنے والوں نے کیسا بات کا بتنگڑ بنایا ہے۔

دوسرے ساری ہی افواہوں اور خبروں کو درست ہی مان لیا جائے تو ان کی مجموعی حیثیت اور مقدار اس سے زیادہ نہیں ہے جیسے لمبے چوڑے حوض میں چند کبوتروں کی بینٹ۔ پھر ان کا بھی الزام اُس فردِ واحد کے سر نہیں جاتا جس کی مخالفت سرافراز بزرگوں کا محبوب مشغلہ ہے، بلکہ اُس پوری کمیٹی کے سر جاتا ہے جس میں دیوبندی، بریلوی، شیعہ سبھی مکاتبِ فکر کے علاوہ لاہور کارپوریشن اور بنیادی جمہوریتوں وغیرہ کے نمائندے بھی مساوی حیثیت سے شامل تھے اور جس کی رپورٹ اسی شمارے میں آپ پڑھ سکتے ہیں۔

اور سنئے "صدق جدید" میں "غلافِ کعبہ کی شرعی حیثیت" کے عنوان سے تین پاکستانی علماء کا مشترکہ بیان چھپا ہے جس کی نزاکت مآبیوں کا حال دیدنی ہے۔ فرمایا گیا۔

"اس سلسلے میں مختلف مقامات پر خاص طور پر جو
مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کی گئی ہے وہ ہماری نگاہ
میں انتہائی شرمناک ہے۔ ایک مسلمان عورت کی عزت
آبرو بیت اللہ کی عزت و آبرو سے کچھ کم نہیں۔"

اللہ اکبر۔ بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ الفاظ ادا کرنے والے دینی حمیت و غیرت سے چوٹی سے ایڑی تک لبریز ہیں۔ لیکن تجزیہ کرکے دیکھئے تو صابن کے بلبلوں کی طرح ایک ایک لفظ تحلیل ہوتا چلا جائے گا۔

پہلی بے احتیاطی تو اس بیان میں یہ ہے کہ ایک قاری اس سے یہ بھی مطلب نکال سکتا ہے کہ شاید غلافِ کعبہ کے ہنگامے میں کچھ مسلمان عورتوں کی عصمت بھی مسلمانوں ہی نے دن دہاڑے لوٹ لی ہے۔ العیاذ باللہ۔ واقعات کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ہوا صرف اس قدر ہے جس سے کئی گنا زیادہ مملکتِ خداداد کے شہروں میں کوچہ و بازار تک میں ہر روز دیکھا جا سکتا ہے۔ کچھ عورتوں کے برقعے افراتفری میں ادھر ادھر ہو گئے یا حد سے حد کسی بدکار نے جان بوجھ کر نسوانی اجسام کو چھو لیا یا کوئی اور ناموزوں حرکت ہوئی تو غیرت مند علماء سے کوئی پوچھے کہ اگر فقط انھی مناظر سے آپ کو بیت اللہ کی عزت و آبرو شدومد سے یاد آگئی ہے تو یہ کیا بات ہے کہ لائسنس یافتہ طوائفوں کے اس بازار میں آپ کی ایک بھی لاش نظر نہیں آتی جہاں فاطمہ اور مریم اور خدیجہ نام رکھنے والی حوا زادیاں دن کی روشنی میں عصمتیں لٹا رہی ہیں۔ لاش تو درکنار ہم نے نہیں سنا کہ مسلمان عورت کی عزت و آبرو کو بیت اللہ کی عزت و حرمت سے تشبیہ دینے والا کوئی پاکستانی عالم اس سلسلے میں جیل ہی کا منھ دیکھ آیا ہو حالانکہ ان کے مزعومہ بیت اللہ دن رات بیچ چوک میں علانیہ بے عزت ہو رہے ہیں۔ حلق سے ہر گیت گا دینا آسان ہے مگر قلب و روح کی گہرائیوں سے کوئی نغمہ نکالو تو جانیں۔ یہ کلب، یہ تھیٹر، یہ سینما اور ثقافت و کلچر کو فروغ دینے والی تہذیب تمہاری ناک کے نیچے دھڑلے سے عورت کو ننگا نچا رہی ہے۔ یہ عورت کیا حوا کی بیٹی نہیں ہے؟ کیا مسلمان نہیں؟ پھر کیوں ایسا نہیں ہوا کہ تم نے "بیت اللہ" کی حرمت و عزت پر جان کی بازی لگا دی ہو،

حالانکہ جس شدت سے تم غلافِ کعبہ کے ہنگامے میں پیش آنے والے چند جزئی اور معمولی حوادث پر فریاد کناں ہو اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایسی فضا میں تو تم زندہ بھی نہیں رہ سکتے جہاں ننگی عورتوں کا گوشت باقاعدہ قانون کی نگرانی میں بکتا ہو اور ایک یہودی، پارسی، عیسائی بھی چند ٹکے دے کر تمہارے مزعومہ "بیت اللہ" کی عصمت و حرمت پر شہوانیت سے بھرپور قہقہے لگا سکتا ہو۔ واہ غیرت مندو۔ خوب ہے تمہاری دینی حمیت اور خوب ہے یہ تشبیہ کہ مسلمان عورت کی عزت و آبرو بیت اللہ کی عزت و آبرو سے کم نہیں۔ ہم تو بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ سچے مسلمان کے لئے کافر عورت کی عصمت و آبرو بھی اتنی ہی معزز شے ہے کہ اس کو بدکاروں کے جبر سے بچانے کے لئے وہ جان بھی دیدے تو شہید کہلائے گا، لیکن تم جو ایک خاص شخص اور جماعت کو ملزم ٹھیرانے کے لئے چھوٹی موٹی سے بڑھ کر باغیرت اور متقی ہونے کا مظاہرہ کر رہے ہو عصمت کی قدر و قیمت سے یکسر غافل ہو گئے ہو ورنہ کیسے تمھیں اپنے بستروں پر نیند آگئی جب کہ تمھاری مملکتِ خداداد میں طوائفوں کے باضابطہ بازار موجود ہیں اور ایک ایک بالا خانے پر تمھارے مزعومہ "بیت اللہ" کا نیلام ہو رہا ہے۔

یہ تو ایک رُخ ہوا۔ دوسرا رُخ یہ ہے کہ اگر حج کی بھیڑ بھاڑ میں کچھ جیبیں کٹ جائیں، کوئی پیروں سے کچلا جائے، کسی کا مال و اسباب چوری ہو جائے تو کیا ان حوادث کا الزام خود حج کو دوگے؟

اگر نہیں تو پھر ان معدودے چند نامناسب و خلافِ شرع حرکات و حوادث کا سارا الزام جشنِ زیارت پر کیوں ڈالے دے رہے ہو۔ جو لوگ مزاروں پر جھکتے ہیں، پیروں فقیروں کے ہاتھ پیر چومتے ہیں، زائرائوں سے آنکھیں لڑاتے ہیں وہ اگر غلاف کے ہنگامۂ نمائش میں شریک ہوں گے تو ان سے اپنی عادات کے مطابق بعض حرکتوں کا صدور قدرتی ہوگا۔

کچھ بزرگوں کو یہ غم ہلکان کئے دے رہا ہے کہ بعض حکام کالانعام نے غلاف والی ریل کو ریل شریف اور غلاف کو

غلافِ شریف کہہ کر بدعت کے جھنڈے گاڑ دیئے حالانکہ یہی بزرگ بار بار اپنے ملنے جلنے والوں سے یہ کہتے سنائی دیں گے کہ کہیئے قبلہ مزاج شریف کیسا ہے؟

کچھ موحدین اس بات پر چراغ پا ہیں کہ لوگوں نے غلافِ کعبہ کے ٹکڑوں کو چوما۔ آنکھوں سے لگایا۔ گذارش یہ ہے کہ آپ کیا حجرِ اسود کو نہیں چومتے۔ آپ کیا بچوں کو بوسہ نہیں دیتے۔ بوسہ جذباتِ عبودیت کی نہیں محبت اور دلی لگاؤ کی نمود ہے۔ قبروں کو یا انسانی قدموں کو بوسہ دینا تو اس لئے ناجائز ہے کہ اس سے رکوع و سجود کی شکل وکیفیت پیدا ہوتی ہے۔ پھر اس میں بھی استثناء ہے۔ ایک بیٹا ماں یا باپ کے پیر دبا رہا ہے یکایک اس پر محبت اور والدین کی احسان شناسی کا جذبہ طاری ہوتا ہے اور وہ فرطِ تعلق میں بیساختہ ان کے پیر چوم لیتا ہے۔ ان پر رخسار ملنے لگتا ہے۔ اسے بدعت و معصیت کون نادان کہے گا۔ ثابت ہوا کہ بوسہ بجائے خود ممنوع نہیں ہے یہ محل اور سیاق و سباق کے فرق سے جائز اور حرام ہوتا ہے تو بتاؤ اس کپڑے کو چومنا، آنکھوں سے لگانا، دل میں بسانا کیوں بدعت ہوا، جسے کسی پیر فقیر، ولی پیغمبر سے نہیں اللہ کے گھر سے نسبت ہے۔ وہ اللہ کا گھر جہاں پیشانیاں رگڑنا، طواف کرنا اور سراپا سجدہ بن جانا سعادتِ کبریٰ ہے۔

یہ بھی فرمایا گیا کہ جو کپڑا ابھی کعبے تک پہنچا ہی نہیں وہ غلافِ کعبہ کہلانے کا مستحق نہیں ہے اور اس کی تعظیم و تکریم فساد کے ہم معنی ہے۔ خوب ہے یہ شانِ اجتہاد۔ اللہ کے بندو یہ منطق تو اس وقت مفید ہوتی جب زیارت کرنے والوں کا یہ خیال ہوتا کہ اس کپڑے کے دیدار یا لمس سے ہمیں کچھ روحانی یا جسمانی فوائد حاصل ہوں گے۔ اس وقت بے شک یہ بات معقول تھی کہ جب بیت اللہ سے یہ غلاف مس ہی نہیں ہوا تو اس میں خیر و برکت کے باطنی اثرات کیسے آسکتے ہیں مگر زیارت کرنے والوں نے ایسے کسی عقیدہ و امید کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان کی روش فقط اُس محبت کی نمود تھی جو انھیں بیت اللہ سے ہے۔ محبت کے اظہار کا طریقہ اگر شریعت سے متصادم نہ ہو تو پھر اسے منطق کی ترازو میں تولنا بے دانشی ہو گا ہم نے تو پچھلوں سے یہی سنا ہے کہ مجنوں کو لیلیٰ کا کتا بھی عزیز تھا۔ جذبے، عقلی استدلال کی پیداوار نہیں ہوا کرتے محبوب کی ذات سے کسی شے کی فقط نسبت ہی بڑی کارگر شے ہے۔ غلافِ کعبہ بے ریب طور پر کعبے ہی کے لئے تیار کیا گیا۔ اسے ہر حال میں کعبہ ہی سے ہم آغوش ہونا ہے الّا یہ کہ اچانک قیامت ہی آجائے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ نذریں اور قسمیں صرف الفاظ ہی تو ہوتے ہیں مگر ان کا وجوب ہو جاتا ہے۔ ایجاب و قبول فقط الفاظ ہی تو ہیں جو ایک مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے لئے مباح کر دیتے ہیں۔ پھر یہ کیوں ضروری ہے کہ جو غلاف قطعی طور پر کعبہ ہی کے لئے بنا ہے اس کے ساتھ مسلمان کا جذبۂ محبت اس وقت تک وابستہ نہ ہو جبتک وہ حرم تک نہ پہنچ جائے۔ بڑا تاریک ہو گا وہ دَور جب مسلمان کی دینی بے حسی اس انتہا تک پہنچ جائے گی کہ اسکے سامنے ایک ایسا کپڑا آئے جسے اللہ کے گھر کی زینت بننا ہو اور پھر بھی اس کے قلب و ذہن کے کسی گوشے میں عقیدت کی رقت، سوز و گداز اور احساسِ تقدیس انگڑائی نہ لے۔

مولانا مودودی نے غلافِ کعبہ کی تاریخی و شرعی حیثیت پر ایک مقالہ سپردِ قلم کیا تھا جسے ہم اسی شمارے میں نقل کر رہے ہیں۔ اس پر ہفت روزہ "المنبر" نے کچھ لکھا ہے۔ گو کہ ابھی ایک ہی قسط آئی ہے لیکن یہی قسط یہ درس دینے کے لئے کافی ہے کہ اونچے درجے کے نکوکار اور اخلاص کیش علماء بھی ذہنی جانبداری اور عصبیت کی رَو میں بہہ کر کس طرح ژرف نگاہی اور بصیرت و تفقہ کا خون بہانے لگتے ہیں۔ اعتراض کیا گیا کہ اگر وہ غلاف کعبہ بھی شعائر اللہ میں داخل ہے جو ابھی تک کعبہ کی زینت نہیں بنا تو وہ غلاف تو لازماً اجلال و احترام کا مستحق ٹھیرے گا جو کعبے کی زینت بن چکا ہے پھر کیوں نہیں غلافِ کعبہ کے ان ٹکڑوں کے لئے بھی نمائش و زیارت کا ہنگامہ برپا کیا جاتا جو بیت اللہ پر چڑھے ہوئے غلافوں کے پہلے سے پاکستان میں موجود ہیں۔

یہ اعتراض کرنے والے نیک دل بزرگ ذرا ازادِ رہ بلکہ سوچیں تو اسی اعتراض میں اس سارے احتجاج کا بھرپور جواب موجود ملیگا جو غلاف کی نمائش وزیارت کے ہنگامے کو بدعت قرار دینے کی شکل میں فقیہانِ خجستہ گام نے برپا کیا ہے کیا یہ اعتراض برملا اس اعتراف کے مرادف نہیں ہے کہ مولانا مودودی کے نزدیک غلافِ کعبہ بجائے خود ایسی چیز نہیں جس کے لئے نمائش وزیارت کے بڑے بڑے جشن اور ہنگامے برپا کئے جائیں اسی لئے انھوں نے پاکستان میں موجود غلافِ کعبہ کے ٹکڑوں کی نمائش کا ارادہ کبھی نہیں کیا۔

پھر جو یہ پاکستان میں تیار شدہ غلاف کیساتھ خصوصی معاملہ کیا گیا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ اس کا منطقی ربط اور اساسی تعلق دوسری خصوصیات سے ہے۔ یہ خصوصیات ہر آنکھ والے پر ظاہر ہیں۔ اول یہ کہ حرمین کے اربابِ حکومت کی طرف سے کسی بھی ملک کو غلافِ کعبہ تیار کرنے کا اذن ملنا ایک ایسی امتیازی شے ہے جس پر اس ملک کے مسلمان بجا طور پر فخر و مسرت کا احساس کر سکتے ہیں۔ دوئم یہ کہ یہ غلاف اپنی ساخت کے اعتبار سے بھی غیر معمولی ہے۔ بازار سے عام قسم کے کپڑے خرید کر انھیں یونہی جوڑ نہیں دیا گیا ہے بلکہ اسکا دھاگہ تک خاص طور پر باہر سے درآمد کیا گیا پھر پارچہ بافی کی ایک خاص تکنک کے ذریعے اس کو نہایت ہنرمندی سے بُنا گیا۔ سوئم یہ کہ اس جیسے طول و عرض کا کوئی لباس کبھی عامۃ المسلمین کی نظر سے نہیں گذرا وہ اس لباسِ کعبہ کو دیکھنے کے لئے شوق سے معمور ہو جائیں تو یہ بالکل قدرتی بات ہے۔

ان خصوصیات کی موجودگی میں یہ سمجھنا آخر کیا مشکل ہے کہ جشنِ دیدار کا بنیادی تعلق اس کپڑے کے شعار ہونے سے نہیں بلکہ خارجی اوصاف اور مخصوص خصوصیات سے ہے۔ اس کے دیدار کو لوگ اس جذبے سے نہیں دوڑے جس جذبے سے قبروں پر دوڑے جاتے ہیں بلکہ انکی نقل و حرکت اور تگاپو کے پیچھے کم و بیش وہی ذہن کارفرما تھا جو لوگوں کو تاج محل اور قصر الحمراء اور شاہجہانی مسجد وغیرہ کی طرف دوڑا کر لے جاتا ہے۔ تو کیا دین یا دنیا کے کسی قانون میں یہ بھی کوئی جرم ہے کہ جس قابلِ دید شے کے دیدار میں لوگوں کے لئے دلچسپی کا سامان موجود ہو اور جمہور اس کے دیدار کا شوقِ فراواں لئے پھرتے ہوں اس کا بڑے پیمانے پر دیدار کرانے کے انتظام میں ایک شخص شرکت کرے مولانا مودودی کی حیثیت اس انتظام میں شریک ہی کی ہے واحد ذمہ دار کی نہیں، تاہم واحد ذمہ دار ہی قرار دے لیجئے تو کیا گناہ ہے اس میں کہ انھوں نے مسلمان بھائیوں کے ایک جائز شوق کو پورا کر دیا۔

اب رہا دیدار کے وقت مسلمانوں کی طرف سے جذبۂ تعظیم و تکریم کا مظاہرہ، تو یہ بھی اعتراض والی بات نہیں سوچئے ایک مسلمان تاج محل یا قطب کی لاٹ دیکھنے جائیگا تو اس کے ذہن میں رومان کے تانے بانے پھیلیں گے، آرٹ انگڑائیاں لے گا، تاریخ جھلکیاں دکھائے گی اور اگر کوئی ممتاز قسم کی تاریخی مسجد دیکھنے جائے گا تو دوسرے تمام تصورات کے ساتھ اس کے ذہن میں مذہبی حسیات بھی ضرور سر اُبھاریں گی۔ پھر جب وہ اس میں قدم رکھے گا تو شعوری اور تحت الشعوری دونوں اعتبار سے اس کے احترام و تکریم کا وہ داعیہ بھی اس کے اندر ضرور ہو گا جو تاج محل کے فرش پر چلتے یا قطب مینار کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔

اب کیا آپ یہ کہیں گے کہ چونکہ مساجد شعائر اللہ میں سے ہیں اور شعاری حیثیت سے ہر نئی اور پرانی، بڑی اور چھوٹی مسجد یکساں ہے لہٰذا ایک ممتاز بناوٹ کی تاریخی مسجد کو خاص طور پر دیکھنے جانا اور گہری دلچسپی سے دیر تک دیکھنا بدعت ہے، یہ تخصیص کیسے جائز ہو سکتی ہے جبکہ اس شخص کے اپنے شہر میں متعدد مسجدیں ہیں اور ان کے شوقِ دید میں اس نے کبھی اس سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کیا؟

اگر کہیں گے تو خطا معاف بڑی شاندار حماقت کا

نمونہ پیش فرمائیں گے اور اگر نہیں کہیں گے تو پھر یہ اعتراض کیا وزن رکھتا ہے کہ پچھلے غلافِ کعبہ کے جو ٹکڑے پاکستان میں پہلے سے موجود ہیں وہ اور زمزم یا قربانی کے اونٹ وغیرہ سب شعائر اللہ ہی میں داخل ہیں لہٰذا جب ان کی نمائش و زیارت کا خصوصی ہنگامہ برپا نہیں کیا جاتا تو اس پاکستان میں تیار شدہ غلاف کے لئے یہ خصوصیت کیوں؟

دنیا میں لاکھوں مسجدیں ہیں اور کیا شک ہے کہ شعائر اللہ ہونے کی حیثیت سے سب یکساں ہیں۔ تعظیم و حرمت کے شرعی قواعد کسی ایک کے لئے بھی جداگانہ نہیں ہیں لیکن انسان کا جذبۂ شوق اسے صرف ان مساجد کے دیدار پر اُکساتا اور دوڑاتا ہے جن میں کوئی تعمیری یا تاریخی خصوصیت ہو، کشش کے وجوہ موجود ہوں۔ واضح بات ہے کہ ان مساجد کو دیکھنے جانا بدعت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اسی طرح ایک ایسے غلاف کعبہ کو خصوصیت سے دیکھنے جانا بدعت سے کوئی رابطہ نہیں رکھتا جس میں وجوہِ کشش موجود ہوں۔ جو کسی ملک کے لئے افتخار کا موجب ہو، جسے خاص اہتمام اور ہنرمندی کے ساتھ تیار کیا گیا ہو۔ ان خصوصیات کی بنا پر جب شائقینِ دیدار جمع ہوں گے تو قدرتاً اس کی تعظیم و تکریم بھی اسی طرح کریں گے جس طرح مسلمان سیاح مسجد کی کرتا ہے اور جس طرح کسی بھی شعار کی تکریم ہر مسلمان کو کرنی چاہئے۔ یہ جو اعتراض مدیر المنبر نے کیا ہے کہ زمزم اور بیت اللہ کی جانب بھیجی جانیوالی قربانیاں اور ہدی کے اونٹوں کی گردنوں میں پڑے ہوئے جوتوں کے ہار وغیرہ بھی تو شعائر اللہ ہیں کیا مولانا مودودی ان کیلئے بھی احترام و استقبال کی یہ ہنگامہ آرائی جائز قرار دیں گے۔ تو یہ اعتراض صاف طور پر تفکر کی نارسائی کا مظہر ہے۔ مولانا مودودی نے کب کہا کہ غلاف کی نمائش کا یہ بڑا ہنگامہ اس لئے برپا کیا گیا کہ غلاف شعائر اللہ میں سے ہے۔ بات سمجھئے پھر زبانِ اعتراض دراز کیجئے۔ ہنگامہ تو اس لئے برپا ہوا کہ اس غلاف سے وہ گوناگوں خصوصیات وابستہ تھیں جن کا ہم نے ذکر کیا اور ان خصوصیات کی بنا پر عوام کا شوق و ذوق سے اس کا دیدار کرنا اس عقیدے سے نہیں تھا کہ شعائر اللہ کا دیدار اسی طرح کرنا چاہئے۔ وہ تو ایک نئی، غیر معمولی، پُر کشش چیز دیکھنے گئے تھے ــــ ٹھیک اس طرح گئے تھے جیسے حکومت اگر کوئی نئی مشین ایجاد کرے اور اعلان کر دے کہ اس کی عام نمائش کی جا رہی ہے تو اس ملک کے بہت باشندے شوقِ فراواں اور احساسِ فخر و مسرت سلئے اسے دیکھنے دوڑے جائیں گے۔ لہٰذا غلافِ کعبہ کے لئے اجتماع و اژدہام اس لئے نہیں تھا کہ یہ شعائر اللہ میں سے ہے ہاں دیدار کے وقت تکریم و تعظیم کی جو نمود مختلف پیرایوں میں ہوئی وہ بلاشبہ اسی لئے تھی کہ یہ غلاف بیت اللہ کی نسبت سے معظم ہو گیا ہے۔ یہ نمود زمزم اور بیت اللہ سے نامزد قربانیوں وغیرہ کے باب میں بھی یقیناً ہوتی ہے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ ایک دنیادار مسلمان بھی سو روپے لیکر زمزم میں نہیں تھوک سکتا، لیکن اسی کو دس پیسے دیدیجئے کسی بھی کنوے میں غلاظت ڈالدے گا۔ کوئی مسلمان حج والی قربانیوں کو گالیاں دیکر نہیں ہنکا سکتا حالانکہ وہ بیلوں اور گھوڑوں کو مغلظات دے کر ہنکاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ احترام کے قانونی تقاضے تمام شعائر کے بارے میں پورے کئے جاتے ہیں۔ رہا چومنا، آنکھوں سے لگانا، دُور دُور سے دیدار کرنے آنا تو جیسا کہ ہم عرض کر چکے ان افعال کی بنیاد عقیدے پر نہیں اُس شوق پر ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر نادر و ممتاز چیزوں کے لئے رکھا ہے اور جس کے نتیجے میں ہر ملک ملک میں عجائب خانے اور چڑیا گھر بنے ہیں۔ یہیں سے اس معارضے کا جواب بھی مل گیا کہ رسالت و خلافت کے دَور میں غلاف کی زیارت و نمائش کا خصوصی اہتمام کیوں نہیں کیا جاتا تھا! کیوں کیا جاتا جب کہ یہ اہتمام عقائد کی فہرست میں شامل ہی نہیں ہے۔ رہا وہ قدرتی جذبہ جس کی وجہ سے پاکستانی غلاف نمائش کی چیز بن گیا تو وہ رسالت و خلافت کے عہد میں اُبھرتا کیوں جب کہ آپ خود ہی معترف ہیں کہ یمنی چادریں یا بعض دوسری قسم کے کپڑے بازار سے خرید کر غلاف کے طور پر استعمال کر لئے جاتے تھے۔ بھلا ان کو خصوصیت سے دیکھنے اور دور سے چلکر آنے کا جذبہ اُس دور کے عوام میں کہاں سے اور کیوں آتا؟

ہماری بات کچھ زیادہ دقیق نہیں پھر بھی ایک مثال سے مزید توضاحت کرتے ہیں۔ فرض کیجئے زید پہلی بار دہلی کی جامع مسجد دیکھنے جاتا ہے ظاہر ہے کہ وہ اس کے شاندار در وبام دل کش مینار، تیکھے نقش و نگار اور پرشکوہ تعمیری زاویوں کو خاصی محویت کے ساتھ دیر تک دیکھے گا۔ لیکن جب وہ کسی معمول ساخت کی چھوٹی سی مسجد میں پہنچے گا تو فقط نماز پڑھ کر نکل آئیگا یہاں کوئی شے اس کے ذوقِ تماشا کو بیدار کرنے والی نہ ہوگی۔

تو کیا آپ یوں کہیں گے کہ ایک مسجد کو دیر تک شوق سے دیکھنا اور دوسری کو یوں ہی نظر انداز کر دینا بدعت ہے؟ یا یوں کہیں گے کہ زید نے ایک مسجد کا احترام زیادہ کیا ایک کا کم؟

ہمارا خیال ہے دونوں میں سے ایک بھی بات درست نہیں۔ نہ تو یہ بدعت ہے کہ ایک قابلِ دید شے کو خاص توجہ سے دیکھا جائے نہ یہ احترام کی کمی بیشی کہلائے گی۔ احترام کے ضابطے تو تمام مساجد کے لئے یکساں ہیں۔ مسجد کے فرش پر تھوکنا یا جوتے پہنکر چلنا یا وہاں گالی گلوج کرنا، یا لڑنا بھڑنا، غل غپاڑہ برپا کرنا یا گانا بجانا یقیناً ممنوع ہے خواہ دہلی کی شاندار جامع مسجد ہو یا محلے کی چھوٹی سی معمولی سی مسجد۔ اسی طرح کسی بھی دینی شعار کی توہین کرنا، اسکے ادب کو نظر انداز کر دینا، اسے بہ نگاہِ حقارت دیکھنا حرام ہے چاہے وہ پاکستان کا تیار کردہ غلافِ کعبہ ہو یا زمزم کا ایک پیالہ یا بیت اللہ سے منسوب قربانی کا جانور۔ البتہ ضابطے اور قانون سے ہٹ کر جو اعمال و افعال کسی فطری میلان اور طبعی داعیے کے مظہر ہوتے ہیں وہ تمام شعائر اللہ کے بارے میں اسی طرح یکساں اور ہم مقدار نہیں ہو سکتے جس طرح دو مسجدوں کی مذکورہ مثال میں شوقِ نظارہ یکساں نہیں پایا گیا۔ اس نکتے کو ذہن نشین فرمالیجئے تو یہ معارضہ آپ سے آپ ختم ہو جائے گا کہ زمزم اور دیگر شعائر اللہ کا احترام جب اس شدومد سے نہیں کیا جاتا تو پاکستانی غلافِ کعبہ کے احترام میں یہ ملک گیر ہنگامہ آرائی کیوں جائز ٹھیری۔ یہ دراصل احترام کی کمی بیشی کا معاملہ نہیں ہے یہ اُس فطری شوق کی نمود کا معاملہ ہے جس کا تعلق عقیدے اور قانون سے نہیں اُن خارجی خصوصیات و صفات سے ہے جو شوق کو اُبھارتی ہیں۔ شدومد اور ہنگامہ آرائی نفسِ احترام سے جداگانہ شے ہے۔ اسے احترام و تکریم کے حساب میں جمع کر کے یہ اعتراض کرنا کہ پاکستانی غلافِ کعبہ کا احترام دوسرے شعائر اللہ سے زیادہ کیوں کیا گیا کوتاہ فہمی کا پیدا کردہ مغالطہ ہے اور یہ احتجاج فرمانا کہ رسالت و خلافت کے زمانے میں غلافِ کعبہ کی نمائش و زیارت کا ایسا پُرجوش ہنگامہ نہیں پایا جاتا تھا تو اب کیوں اسے وجود میں لایا گیا ایسا ہی ہے جیسے یوں کہا جائے کہ دہلی کی جامع مسجد اس ذوق شوق سے کیوں دیکھی گئی جب کہ محلے کی مسجد کا دیدار اس ذوق و شوق سے نہیں کیا گیا۔

ایک اور مطالبہ یہ کیا گیا کہ غلافِ کعبہ کو شہر شہر زیارت کے لئے پھرانا اور پھر اس کام کو دینی حیثیت دینا قرآن و سنت اور خلافت راشدہ کے تعامل سے ثابت کرو۔

جواب یہ ہے کہ دینی حیثیت سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کیا مولانا مودودی نے یہ کہا ہے کہ غلاف کا دیکھنا دکھانا عبادت ہے۔ اس سے تزکیۂ نفس ہوگا۔ ثواب ملے گا؟ اگر کہا ہے تو حوالہ دیجئے اور نہیں کہا ہے تو دینی حیثیت کا مفہوم واضح کیجئے۔ آپ کو معلوم ہوگا اللہ کے رسول ؐ نے فرمایا ہے کہ وہ تبسم بھی صدقہ ہے جو تم اس لئے اپنے ہونٹوں پر لاتے ہو کہ اس سے تمہارا مسلمان بھائی خوش ہو۔ وہ لقمہ بھی موجبِ اجر ہے جو تم محنت مشقت کر کے حلال رزق سے بیوی کے منھ میں ڈالتے ہو۔ اس وسیع مفہوم کے اعتبار سے تو بلا شبہ یہ کام بھی دینی ہی ہے کہ عامۃ المسلمین اگر کسی خاص غلاف کعبہ کی زیارت کا ذوق و شوق رکھتے ہیں تو ان کی جائز خواہش کا احترام کرتے ہوئے زیارت کا انتظام کر دیا جائے۔ فقط ایک مسلمان کی دلداری میں ذرا سا تبسم صدقہ ہو سکتا ہے تو لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے جائز شوق کی آسودگی کا سامان بہم پہنچانا کیوں صدقہ نہ ہوگا۔ نیتوں کی ذمہ داری خود عمل کرنے والوں پر ہے۔

شریعت ظاہر پر فتویٰ دیگی اور قرائن کو کام میں لائے گی۔ قرینہ یہی ہے کہ جو شخص برسوں سے دعوتِ حق کے کام میں کھپا ہوا ہے وہ ریا کار نہیں ہوگا اور اگر کسی کام کو وہ فقط عوامی التفات حاصل کرنے کے لئے کر رہا ہے تب بھی اس کی تہہ میں ذاتی مفاد پرستی کا جذبہ نہیں، بلکہ حق کو مقبول و مقتدر بنانے کی نیت کار فرما ہوگی۔

کہا گیا کہ جب غلاف کعبہ کے ساتھ یہ معاملہ کیا گیا تو کیا اُس پاکستانی سنگ مرمر کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کیا جائے گا جسے سعودی حکومت نے بیت اللہ کے اردگرد لگانا منظور کرلیا ہے؟

جواب یہ ہے کہ یہ سوال خود ہی سائل کو تنبیہ کر رہا ہے کہ اپنے قصورِ فہم کو سمجھو۔ واقعی اگر پاکستانی غلاف کی نمائش اس عقیدے کے تحت کی کرائی جاتی کہ جو شے بیت اللہ سے منسوب ہوجائے اسے دیکھنا دکھانا عبادت ہے۔ کارِ ثواب ہے۔ تب تو بدعت و سنت کی بحث اُٹھانا اور مآخذِ شریعت سے دلیل مانگنا بجا ہوتا، لیکن جب ایسے عقیدے کا دُور دُور پتا نہیں تو پھر شور و شیون کیا معنی؟ بیت اللہ کے اردگرد لگائے جانے والے پاکستانی پتھر چونکہ ایسی ندرت اور خصوصیت نہیں رکھتے جو پاکستانی عوام کے ذوقِ تماشا کو شد و مد سے اُبھار سکے لہٰذا انکی نمائش و زیارت کا ملک گیر ہنگامہ برپا نہیں ہوگا یہ قطعی دلیل ہے اس بات کی کہ ہنگامۂ غلاف کی علت فقط وہ نسبت نہیں تھی جو ایک کپڑے کو بیت اللہ سے حاصل ہوگئی تھی ورنہ یہ نسبت تو متذکرہ پتھروں کو بھی حاصل ہے اور پچھلے غلافوں کے ان ٹکڑوں کو تو بدرجۂ اولیٰ حاصل ہے جو پاکستان میں موجود بتائے گئے ہیں پھر بھی ان کے لئے کسی جشنِ تماشا کا برپا نہ ہونا قطعی دلیل ہے اس بات کی کہ ایک مخصوص غلاف کے لئے ایسے غیر معمولی ہنگامۂ اژدہام کی علت وہ گوناگوں خصوصیات ہی ہیں جن کا ذکر ہم نے کیا۔ تب کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایک حسین و جمیل یا نادر و بیش قیمت یا کوئی اور مرئی و غیر مرئی خصوصیت رکھنے والی شے کو شوق سے دیکھنا بھی اسی وقت جائز ہے جب کہ دورِ رسالت

اور عہدِ خلافت سے اس کی نظیر و دلیل ڈھونڈ لائی جائے؟

اس بحث میں تکرار کے ساتھ اِس تاریخی واقعے کو بھی بطور معارضہ پیش کیا جا رہا ہے کہ حضرت عمرؓ نے وہ درخت کٹوا دیا تھا جس کے نیچے بیعتِ رضوان واقع ہوئی تھی۔

ہمارے نزدیک اس واقعے سے معترضین کی تقویت نہیں ہوتی بلکہ اُلٹا ضعف ثابت ہوتا ہے۔ کیا یہ تاریخی واقعہ اس کا گواہ نہیں کہ ایک معمولی درخت سے بھی اگر کسی اہم تاریخی واقعے کی نسبت ہوجائے تو دلوں اور ذہنوں کا اس کی طرف خصوصیت سے منعطف ہوجانا ایک فطری میلان ہے۔ اس میلان کا اظہار فقط ہم جیسوں کی طرف سے نہیں خود صحابہؓ کی طرف سے ہوا تھا۔ پھر نہیں ثابت کیا جا سکتا کہ حضرت عمرؓ نے اس میلان کو بجائے خود گناہ قرار دیا ہو۔ اگر یہ گناہ ہوتا تو حضرت عمرؓ ضرور مرتکبین کو سزائیں دیتے مگر آپ نے کسی کو بھی اس فعل پر سزا نہیں دی کہ وہ کیوں مذکورہ درخت کی طرف خصوصی التفات کا مرتکب ہوا ہے۔ ہاں آپ نے درخت کٹوا ضرور دیا تاکہ یہ التفات رفتہ رفتہ بدعت و شرک کے حدود میں داخل نہ ہوجائے۔ لاریب حضرت عمرؓ کا فعل حکمت و بصیرت سے لبریز تھا۔ لیکن یہ اس سے کہاں ثابت ہوا کہ مستقبل کے ممکنہ خطرات کی بناء پر وہ ابتدائی التفات اور دلچسپی بھی گناہ تھی جس کا ظہور درخت کے بارے میں ہونے لگا تھا۔

پاکستان کا بنایا ہوا غلافِ کعبہ کوئی درخت جیسی چیز نہیں ہے جو مستقلاً ایک جگہ قائم رہے اور اندیشہ کیا جائے کہ زیارت و نمائش کی ہمہمی رسم مستقل بن جائے گی اور بڑھتے بڑھتے نہ جانے کہاں تک نوبت پہنچے گی۔ وہ اس سال پاکستان میں بنا ہے اگلے سال نہ جانے کہاں بنے۔ پھر وہ بن کر پاکستان کے کسی گوشے میں قائم و دائم نہیں خیر سے حجاز جا چکا۔ تب یہ وسوسے اور خدشے کیا معنی رکھتے ہیں کہ مولانا مودودی شرک و بدعت کا دروازہ کھول رہے ہیں۔

ایک اور نکتہ بھی اس سلسلے میں سمجھنے کا ہے۔ بیعت والا درخت صورۃً ایک معمولی درخت تھا اور اس کے نیچے

لہٰذا ہم بیعت منعقد ہونے کی خصوصیت فقط ایک تاریخی خصوصیت تھی جس کی کوئی نمود محسوس شکل میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اس کی طرف خصوصیت سے سفر کرنا اور اسکی زیارت و دیدار کو اہمیت دینا صاف یہ معنی رکھتا تھا کہ معاملہ اُس فطری جذبے کا نہیں جو آدمی کو محسوس خصوصیات رکھنے والی اشیا کے دیدار پر اُبھارتا ہے بلکہ عقیدے کا ہے۔ توہم پرستی کا ہے لہٰذا کیوں نہ فسادِ عقائد کا دروازہ بند کیا جائے اور کیوں توہمات کو نشوونما کا موقع دیا جائے۔

لیکن زیرِ بحث غلاف کعبہ کی زیارت میں کسی توہم کی شمولیت نہیں اس کی خصوصیات تو محسوس و مشاہد ہیں اور یہ کسی درخت، کسی قبر، کسی درگاہ کی طرح اشیاءِ غیر منقولہ میں شامل نہیں ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی کو خدا زندہ رکھے وہ بھلا اس غنیمت موقعے پر اپنے تأثراتِ عالیہ سے عوام کالانعام کو نوازے بغیر کیوں رہتے۔ ان کے نامۂ گرامی (مطبوعہ المنبر) کے چند فقرے پڑھنے کے قابل ہیں:-

> "مجھے بہت پہلے سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ جماعت اسلامی اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک عظیم فتنہ بننے والی ہے میرے بعض احباب کو میرے اس اندازے سے کچھ اختلاف تھا لیکن غلاف کعبہ کی آڑ میں اس جماعت نے بدعت اور اہلِ بدعت کی حمایت میں جو تحریک چلائی ہے اس کو دیکھ کر شاید ہی اب کوئی سوجھ بوجھ رکھنے والا آدمی میرے اس اندازے کو غلط قرار دے سکے۔"

اپنی رائے کو واحد رائے منوانے کی وہی تکنیک اس عبارت میں استعمال کی گئی ہے جو ایک پہنچے ہوئے درویش نے استعمال کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ لوگو دیکھو میں ابھی کرامت کے ذریعہ شیرِ ببر بننے والا ہوں مگر جو لوگ اپنے والدین کی جائز اولاد نہیں ہیں وہ اس کرامت کے مشاہدے سے محروم رہیں گے اس کے بعد اس نے منتر جنتر پڑھ کر دفعتاً کہا کہ لو میں شیر بن گیا اور تماشائی بیچارے پکار اُٹھے کہ ہاں بھئی آپ شیر بن گئے۔ ہر ایک یہی سوچ رہا تھا کہ اگر میں نے کرامت کی تصدیق نہ کی تو حرامی کہلاؤں گا۔

مولانا اصلاحی نے بھی یہی ڈپلومیسی اختیار کر کے قارئین کو اس اندیشے میں مبتلا کر دیا ہے کہ اگر ہم نے مولانا کے ارشاد پر آمنا وصدقنا نہ کہا تو سوجھ بوجھ سے محروم قرار پائیں گے۔

لیکن انھیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ ہم جیسے بے غیرت بھی اس دنیا میں ابھی موجود ہیں جو بیوقوف کہلانے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے۔ ہماری حماقت ہمیں مجبور کر رہی ہے کہ ہم اس تحریر کے آئینہ میں مولانا اصلاحی کے ذہن کا وہ تاریک گوشہ دیکھیں جہاں زعم، سوءِ ظن اور خود پرستی کی پریاں ریشمی جال پھیلائے ہوئے ہیں خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے وہ علام الغیوب کی مسند پر بیٹھ کر فیصلہ دیتے ہیں کہ مولانا مودودی اور ان کی جماعت اسلامی نے غلاف کی نمائش کا ہنگامہ بدعت اور اہل بدعت کی حمایت کی نیت سے اُٹھایا ہے اور غلاف کو تو فقط آڑ بنایا گیا ہے۔ پھر یہ ہنگامہ کوئی وقتی حادثہ بھی نہیں بلکہ مستقل "تحریک" ہے جس کا واحد منشاء بدعت کو رواج دینا اور اہلِ بدعت کی حمایت کرنا ہے۔ اللہ اکبر۔

اگر محترم مولانا کو اتفاق سے کسی عدالت کا جج بنا دیا جائے تو کیا کہیئے کہ کیسے شاندار نتائج برآمد ہوں۔ کم سے کم لمبی چوڑی مسلوں اور وکلاء کی بحثوں کے جھنجھٹ سے تو نجات مل ہی جائے گی کیونکہ فاضل جج الہام والقاء کی نورانی عینک لگا کر ملزم کی طرف نگاہِ غلط انداز ڈالیں گے تو اس کے پورے باطن کا ایک ایک گوشہ کھلی کتاب کی طرح ان کے سامنے آجائے گا پھر نہایت وثوق سے وہ اس کی نیت، ارادے مافی الضمیر اور دلی مدعا کی تشخیص فرما کر ایسے مقدس فیصلے صادر فرمادیں گے کہ عقل ومنطق اور دلیل وشہادت کی کسی عدالت میں انھیں چیلنج نہیں دیا جاسکے گا۔

راقم الحروف کہتا ہے کہ جماعت اسلامی فتنہ ہو یا نہ ہو مگر ایسے لوگ ضرور فتنہ ہیں جو اپنے پیٹ کی آنتیں تک نہیں گن سکتے مگر دوسروں کی نیت اور عزائم کو چشم زدن میں

کھوٹ نکالتے ہیں جنھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کے اپنے سر پر
کتنے بال ہیں مگر خوش فہمی کی شان یہ ہے کہ جو کچھ ہم کہدیں اور
جو فیصلہ ہمارے علم و فہم کو درست معلوم ہو وہ خدائی فیصلے
کی طرح اٹل ہے اور اس پر صاد نہ کرنا فقط احمقوں اور
جاہلوں کا شیوہ ہو سکتا ہے۔

کاش جماعت اسلامی کو فتنۂ عظیم قرار دینے والے
مولانا اصلاحی بتلاتے کہ جماعت سے انقطاع کے بعد خود
انھوں نے کونسی راہِ عمل نکالی ہے جو فتنے سے مامون اور
تقوے کے نور سے منور ہو۔ خود وہ کونسی خدمت اصلاحِ
حال کی انجام دیتے رہے ہیں۔ یہ دھوم مچاتا اور حشر اٹھاتا
لشکرِ باطل جو طوفانی بادلوں کی طرح اسلام کی ایک ایک
پہنائی پر چھاتا چلا جا رہا ہے فقط "حلقۂ تدبر قرآن" سے
یا ایک ماہنامے میں چند مضامین لکھدینے سے یا جماعت اسلامی
کو گردن زدنی قرار دیدینے سے تو پسپا نہیں ہو سکتا۔ جماعت
اسلامی بد گہر ہے تو آپ کچھ کر کے دکھلائیے۔ کر نہیں سکتے تو
زبان ہی سے ارشاد فرمائیے کہ دین و اخلاق کی گرتی ہوئی دیواروں
کو سہارا دینے کی عملی صورت کیا ہو۔ یہ تو کوئی کارنامہ نہ ہوا
کہ لوگوں سے اپنے اندازوں اور فیصلوں کا لوہا منواتے رہیئے
اور یہ بتا کر نہ دیجئے کہ جماعت اسلامی کو غرقِ دریا کر دینے
کے بعد آپ قوم و ملت کو کس راہ پر چلانا چاہتے ہیں۔

قارئین شاید طول سے اکتا گئے ہوں لیکن اتنا
ہمیں اور کہنا ہے کہ یہ ساری این و آں تو اس تقدیر پر تھی
کہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی ہی کو نمائشِ غلاف
کے ملک گیر ہنگامے کا تمام تر ذمہ دار قرار دے لیا جائے
لیکن واقعہ یوں ہے کہ ایسا باور کرانا پروپیگنڈے ہی کی
تکنک ہے ورنہ سچائی کچھ اور ہے۔ سچائی یہ ہے کہ مولانا موصوف
اگر دامن کش ہو کر بیٹھ جاتے تو بھی یہ نمائش ہوتی اور اسکی
سربراہی یا تو اربابِ اقتدار کرتے جس کے نتیجے میں نام نہاد
ثقافت و کلچر کے نہ جانے کتنے مظاہرے علماء کی کمزوریوں
پر قہقہے لگاتے نظر آتے یا پھر وہ لوگ کرتے جن کا اوڑھنا
بچھونا شرک و بدعت ہے اور اس کے نتیجے میں شریعت قبوری
کے وہ وہ شاندار مظاہر سامنے آتے کہ توحید کے متوالوں کو
مارے حیرت کے سر پیٹنے کا بھی ہوش نہ رہتا۔ مولانا مودودی
نے اس نمائش میں حصہ لے کر ممکنہ مفاسد کا بہت کچھ سدباب
کیا ہے اور معدودے چند مفاسد اگر پھر بھی سامنے آ ہی گئے
ہیں تو ان پر اھون البلیتین کے نقطۂ نظر سے صبر و شکر کرنا
چاہیئے۔ بیٹھے بٹھائے باہمی جدل و آویزش کا ایک نیا موضوع
کھڑا کر دینا اور باطل قوتوں کو تمسخر کا موقع دینا اسلام دوستی
نہیں فریب نفس ہے۔ یہ آئے دن بات کے بتنگڑ بنا کر حق
پسندوں کا آپس میں الجھتے رہنا ان مغرب زدہ تجدد پسندوں کی
کمر تھپکنا ہے جو اقتدار کی راہ سے پورے معاشرے کو شیطانی
اعمال و افکار میں رنگ دینا چاہتے ہیں۔ آپس میں لڑتے
ہی رہو گے تو یاد رکھو مچھر اور مکھی کی طرح مسلے جاؤ گے پھر تمہاری
قبروں پر فاتحہ پڑھنے والا بھی شاید ہی کوئی مل سکے۔ کیسے تعجب کی
بات ہے کہ مولانا اصلاحی جیسا آدمی مدیر المنبر کی پیٹھ ٹھونکتے
ہوئے یہ مشورہ دے رہا ہے کہ اس مسئلہ پر مسلسل لکھنے کی ضرورت ہے
یعنی اگر کچھ دینی پرچوں کو معاشرے کے ہر آن بڑھتے ہوئے فساد،
تعفن اور زوال پر قلم چلانے کی توفیق کسی درجے میں نصیب ہو بھی
گئی تھی تو اسے اب طاقِ نسیاں پر رکھدیا جائے اور توجہات
صرف کی جائیں غلاف والے ہنگامی مسئلے کی مسلسل لایعنی تحلیل
پر۔ واہ رے دانش مندو۔

آزمائش

آدمی عزیمت کی کوئی بھی راہ اختیار کرے اللہ اسے
آزماتا ضرور ہے۔ ہم نے اپنے ضعف و بے مائگی کے باوجود تجلی
کے آغاز ہی سے یہ عزم کیا تھا کہ صرف وہ لکھیں گے جسے ہمارے
علم و فہم حق کہیں گے چاہے اس کی زد میں کوئی بھی آئے۔ یہ
عزم اس دورِ سیاست میں کھیل نہیں تھا۔ مشیت نے کئی بار ہمیں
ابتلاء میں ڈالا لیکن الحمد للہ کہ اس ابتلاء سے کامیاب ہو کر نکلنے
کی بھی توفیق اسی نے عطا فرمائی۔ صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ دینی

علمی بحثوں میں حق و صداقت کا ساتھ دیتے ہوئے ہمیں اپنے اکابر و اجداد تک کا سامنا کرنا پڑا بلکہ یہ بھی ہوا کہ خود اپنے مفادات اور نیک نامی کو نشانے پر رکھ کر ہمیں صاف گوئی کا عزم نبھانا پڑا ہے۔ یزیدی ہم کہلائے۔ مودودیا ہمارا نام رکھا گیا خارجی و ناصبی کے القاب سے ہمیں نوازا گیا کتنے ہی خریداروں نے تجلی کی خریداری ترک کر دی۔ غیظ و تبرا کے بھرتے لکھے۔ دھمکیاں دیں۔ مگر ہزار ہزار شکر ہے اُس رحیم و کریم کا جس نے ہمیں اپنے عزم پر صبر و ثبات کی توفیق عطا فرمائی۔ ولہٗ الحمد۔

اور آج پھر ہم نے ایک امتحان ہی سے گذر کر پیشِ نظر اداریہ سپردِ قلم کیا ہے۔ خطوں کا ایک ڈھیر تھا جو پچھلے ماہ سے برابر اونچا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ان میں عموماً یہی فرمائش اور اصرار کیا گیا تھا کہ مولانا مودودی کی بدعت نوازی پر شدید گرفت کی جائے۔ بدعت دشمنی کے محاذ پر تجلی جو کچھ کام کر رہا ہے اس کے پیشِ نظر ان تمام مکتوب نگاروں کو یقین تھا کہ تجلی اپنی عادت کے مطابق غلاف کعبہ والی پاکستانی بدعت پر شد و مد اور تفصیل کے ساتھ نکیر کرے گا۔ پھر جب گذشتہ خاص نمبر میں اس موضوع پر کچھ نہیں آیا تو حیرت اور طعن کے خطوط آنے شروع ہوئے کہ تم جو بدعت کے سائے تک سے بدکتے ہو اپنے ممدوح مولانا مودودی کے معاملہ میں کان دبا کر کیوں بیٹھ رہے درا صل ہند و پاک کے جریدوں نے اس باب میں غل غپاڑا ہی اس زور شور سے مچایا ہے کہ عوام تو عوام بہت سے خواص تک مولانا مودودی کے مجرم ہونے کو دینی اعتبار سے امرِ مسلّم تصور کر بیٹھے ہیں ایسے عالم میں ہمارے لئے یہ بات آزمائش سے کم نہیں تھی کہ شائقینِ تجلی کے یقین اور خواہش کے برخلاف وہ رائے ظاہر کر گذریں جسے ہمارے علم و فہم نے حق سمجھا ہے۔ ہر جریدہ اپنے قارئین کو من چاہی غذائیں دینے کی کوشش کرتا ہے، لیکن ہم آئے دن ان کی خدمت میں کڑوی گولیاں پیش کرتے ہیں۔ اس سے کاروباری مفاد بھی متأثر ہوتا ہے۔ بدنامی و نفرت بھی حصے میں آتی ہے۔ طعن و طنز کے تحفے بھی ملتے ہیں۔

مگر تجلی کا ہر قاری سن لے کہ اگر اسے فقط من چاہے مضامین پڑھنے ہیں تو وہ آج ہی سے تجلی سے قطع تعلق کر کے کسی اور جریدے سے لو لگا لے۔ تجلی میں صرف وہ ملے گا جسے عامر عثمانی حق سمجھے گا۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ عامر عثمانی کے علم و فہم خطا کھا جائیں اور وہ کسی ناحق بات کو حق سمجھ بیٹھے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ جو کچھ اس نے دیانتاً حق سمجھا ہے اس کے اظہار میں کسی کی شخصیت یا کوئی دنیاوی مفاد آڑے آ جائے۔ اپنے پاس دستوے دیگر صرف یہی تو سرمایہ ہے کہ جب حساب کے دن خدا پوچھے گا کہ بتا کیا لایا تو گناہوں اور بے توفیقیوں سے بھری ہوئی فردِ عمل پیش کر کے عرض کریں گے کہ اے علّام الغیوب! تمام گناہ ہی گناہ ہیں۔ سیاہی ہی سیاہی ہے لیکن ایک بھلائی بھی ہے جو آپ ہی نے عطا فرمائی تھی۔ خدا پوچھے گا ہم سب کچھ جانتے ہیں لیکن اس عدالت میں اتمامِ حجت بھی ضروری ہے۔ —— خود اپنی زبان سے بتا کونسی بھلائی تیرے تار تار دامن میں ہے۔ اس وقت ہم کہیں گے کہ ارحم الراحمین۔ تو نے غلام کو سوچنے سمجھنے اور لکھنے کی جتنی تاب و تواں عطا فرمائی تھی اس کا ایک ایک حبہ وہ حق و صداقت ہی کی راہ میں لٹا کر آیا ہے۔ تو جانتا ہے کہ دنیا کے کسی خوف، کسی عصبیت، کسی مفاد نے غلام کو اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے سے باز نہیں رکھا اور تعریف یا ملامت کی پرواہ کئے بغیر اس نے اپنے دل و دماغ کا ایک ایک قطرۂ لہو حق و صداقت کے کشت زار میں نچوڑ دیا ہے۔ اب تو مالک و مختار ہے کہ اس ایک کام کو قبول فرما کر سارے گناہوں کو قلزمِ رحمت میں ڈبو دے یا رد کر کے جہنم میں ڈال دے۔

یہ ہے وہ خواب جسے عامر عثمانی برسوں سے دیکھ رہا ہے اور انشاء اللہ آخری سانس تک دیکھے گا۔ کیسے ممکن ہے کہ وہ دنیا کی ملامت سے ڈر کر یا داد و تحسین کے خوشگوار فریب میں آ کر اس خواب کو چور چور کر دے حالانکہ زندگی کا چراغ ہر آن آندھیوں کی زد پر ہے اور گذرنے والا ہر سانس قبر کو قریب لا رہا ہے۔ اللّٰھم لا عیش الا عیش الآخرۃ۔

عامر عثمانی　　۱۲ اپریل ۱۹۶۳ء

فتاویٰ دار العلوم

مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ اور مولانا مفتی محمد شفیع کے فتاویٰ کا مجموعہ۔ "فتاویٰ دار العلوم" کے نام سے بارہا چھپا ہے لیکن اس کی ترتیب وتبویب اور کتابت و طباعت ناقص ہی رہی۔ اب ایک نیا ایڈیشن عمدہ ترتیب وتبویب اور کتابت و طباعت کے معیاری انتظام کے ساتھ چھاپا گیا ہے یہ عوام وخواص سب کے لئے خاصے کی چیز ہے آٹھ حصوں کا یہ ضخیم مجموعہ ہزاروں فتاویٰ پر مشتمل ہے جو ہماری روزمرہ کی زندگی میں قدم قدم پر کام آنے والے ہیں۔ مکمل قیمت ۲۱ روپے۔
اگر مجلد چاہیں گے تو ہر دو حصہ کی ایک جلد — یعنی آٹھ حصوں کی چار جلدیں پانچ روپے میں تیار ہوں گی۔ گویا مجلد کی قیمت ۲۶ روپے ہو جائے گی۔ مجلد بذریعہ ریل طلب کیا جائے تو اخراجات میں کفایت رہے گی۔

تحفة الاحباء فی احکام تحریم النساء

مردوں کے لئے کون کونسی عورتیں حلال ہیں اور کونسی حرام۔ اس موضوع پر ایک جامع، مستند اور سیر حاصل رسالہ۔ سات آنے

آیات بیّنات

تالیف:- نواب محسن الملک سید محمد مہدی علی خاں صاحبؒ۔
اہل تشیع کے بطلان عقائد میں وہ معرکۃ الآرا اور مشہور کتاب، جس کا صحیح جواب آج تک شیعہ حضرات نہ دے سکے جس میں خود شیعہ مذہب کی کتب اور ان کے علماء کے حوالوں سے صحابہؓ کے فضائل اور خلافت راشدہ کو ثابت کیا گیا ہے اور شیعہ مذہب کی حقیقت ظاہر کی گئی ہے۔ ساڑھے چار روپے

المنجد

دنیا کی مشہور ترین عربی ڈکشنری اردو میں اس میں بے شمار تصاویر۔ ڈیڑھ ہزار سے زائد صفحات۔ مجلد ستائیس روپے۔

بہشتی زیور مدلل مکمل

کون پڑھا لکھا آدمی ہے جس نے مولانا اشرف علیؒ کی اس بیش بہا اور مقبول ترین کتاب کا نام نہ سنا ہوگا۔ ہر مسلمان گھر کیلئے ایک مفتی۔ عورتوں کا مشیر، مردوں کے لئے مستقل رہنما۔ اسکا عمدہ اور صاف ستھرا ایڈیشن ہم سے طلب فرمائیے۔
دو جلدوں میں مکمل۔
بارہ روپے (مجلد پندرہ روپے)

غنیۃ الطالبین مع فتوح الغیب

شیخ المشائخ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کے مشہور زمانہ جواہر پارے — اردو ترجمے کے ساتھ عربی متن بھی شامل ہے۔ دو ضخیم جلدوں میں مکمل
چوبیس روپے

تفسیر سورۂ بقرہ

ڈھائی پاروں پر پھیلی ہوئی اس عظیم سورت کی مستند تفسیر مولانا اشرف علیؒ کے خامۂ خاص سے — واضح رہے کہ یوں تو پورے قرآن کی تفسیر "بیان القرآن" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ لیکن یہ سورۂ بقر کی تفسیر پر مشتمل جلد اول اس نایاب ایڈیشن کی دستیاب ہوئی ہے جو مجتبائی پریس نے تصحیح اور طباعت وکتابت کے اعلیٰ انتظام کے ساتھ چھاپا تھا۔ ہدیہ مجلد چھ روپے۔
اس کے علاوہ کچھ نسخے جلد چہارم کے بھی دستیاب ہوئے ہیں جو سورۂ توبہ اور سورۂ اعراف کی تفسیر کے جامع ہیں۔ یہ جلد بھی مجلد چھ روپے کی ہے۔
شائقین فوری توجہ فرمائیں۔

نمازیں

نماز اور اس کے متعلقات یعنی وضو، جماعت اور صحیح طریقۂ نماز کی تفصیل۔ ضروری مسائل۔ ہدایات بچوں اور بڑوں سب کے لئے مفید۔ چھ آنے۔

بزم پیغمبر

منتخب احادیث رسولؐ کا مجموعہ مفید ترجمہ و تشریح کے ساتھ۔ سوا روپیہ

مناسکِ حج

حج کے متعلق امام ابن تیمیہؒ کے محققانہ افاضات۔ مجلد تین روپے

عمرو بن العاص رضؓ

اس صحابی رسولؐ، فاتح مصر، تلوار کے دھنی اور طبلہ پایہ مدبر کی داستان حیات جسے خود اللہ کے رسولؐ نے مدبر اسلام کے خطاب سے نوازا۔ بے حد دلچسپ اثر انگیز اور مستند۔
رعایتی قیمت مجلد دو روپے

(شمس نوید عثمانی)

کیا ہم مسلمان ہیں؟

باپ سے آگے اگر بیٹا نکل جائے تو یہ خدا کی دین نہیں تو اور کیا ہے؟

وہ رات جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایمان کے لئے جان اور وطن دونوں کو بے جھجک داؤں پر لگایا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نورانی قدموں سے لپٹ کر ساری دنیا اور تمام ماضی کو نثار کیا تھا تو اسی رات کی صبح کو مکّہ نے یہ سنا کہ ان کے والد بوڑھے قحافہ حضرت علیؓ کو دیکھ کر تیوری چڑھاتے ہوئے یہ الفاظ ادا کر رہے ہیں:-

"ان قریشی لونڈوں نے میرے بچے کا بھی ناس کر کے رکھدیا!"

لیکن آٹھ سال بعد ——— دنیا نے دیکھا کہ ضعف پیری سے لڑکھڑاتے ہوئے یہی قحافہ ٹھیک اسی سمت میں اور ٹھیک ان ہی شفاف قدموں کو چھو لینے کی تڑپ میں اپنے بیٹے ابوبکرؓ کا سہارا لئے ہوئے کشاں کشاں چلے جا رہے ہیں کہ جس سمت میں کبھی ایک قدم چلنا ان کی نظر میں سعادت و کامرانی نہیں معاذاللہ خسران و نامرادی کے ہم معنی تھا۔

کتنا روشن ضمیر تھا وہ "بیٹا" جس نے سچائی کو اسوقت دیکھ لیا اور دیدۂ و دل میں اُتار لیا تھا جب ایک سفید ریش جہاں دیدہ بوڑھے باپ کی نظر میں وہی "عظیم سچائی" محض بچوں کے ایک احمقانہ کھیل سے زیادہ کچھ نہ تھی! - فریب دیدۂ و دل سے خدا کی پناہ! کتنی سچی ہے یہ بات کہ یہ خدا ہی ہے جو انسان کو جب چاہے اور جہاں چاہے سیدھا راستہ دکھا دے اور اگر کسی بدنصیب نے اس کے در سے زندگی کی یہ عظیم ترین بھیک نہیں مانگی تو اس کی آنکھوں کی کیا مجال ہے کہ حقیقت کو دیکھ کر پہچان سکیں اور دل کی دھڑکنوں میں کیا یارا ہے کہ اس پراسرار ہستی کو محسوس کر سکیں جو نظروں سے جتنی دور ہے دل اور رگِ جاں سے اتنی ہی قریب تر ہے۔ خود قحافہ حق کی آواز پر اس وقت نہ بڑھ سکے جب ان کی آنکھوں میں بوڑھی بینائی کی ایک آدھی کرن اور ان کی ٹانگوں میں قدم اُٹھانے کی تھوڑی بہت طاقت موجود تھی۔ سچائی اسوقت بھی ان کی آنکھوں کے سامنے جلوہ گر تھی لیکن اسے دیکھکر ان آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ خدا کی پکار اس وقت بھی ان کے کانوں کے پردوں تک آپہنچی تھی لیکن اس کو سنتے ہی وہ مُنہ پھیر کر چل دیتے تھے لیکن جب قادر مطلق کی نظر کرم اپنے بندے کے حالِ پریشاں کی طرف اٹھی تو وہی بندہ اپنے معبود کی طرف والہانہ انداز میں گرتا پڑتا ہوا اس وقت آگے بڑھا جب اس کی آنکھوں میں بینائی کی رمق بھی باقی نہ رہی تھی اور ضعف پیری سے تھرتھراتی ہوئی ٹانگوں کو خود اپنے جسم کا بوجھ اُٹھا کر چلنا دوبھر ہو چکا تھا!

یہ رقت انگیز منظر خدا کے رسولؐ نے دیکھا کہ فتح مکہ کے بعد مکہ کا یہ معمر آدمی اپنے انمول لختِ جگر حضرت ابوبکرؓ کے شانوں پر جھولتا ہوا ٹھوکریں کھاتا، ہانپتا کانپتا ہوا دنیا بھر کو چھوڑ کر آخرت کی دھن میں کشاں کشاں چلا آرہا ہے۔ آج اس کی نظر میں وہ ساری عمر دراز ایک بدترین حماقت کا شاہکار تھی جو اسلام سے محرومی کے عالم میں بیتی تھی آج تو قبر کے کنارے پر پہنچکر اس نے ایک ایسی سچائی کو

پالیا تھا جس کے چند شب و روز اپنی قیمت اور لذت کے
اعتبار سے اس کی پوری عمر پر بھاری تھے۔

حضور ؐ نے اس درد بھری خوشی کا جذبات انگیز منظر
دیکھا اور پھر اپنے رفیقِ جلیل حضرت ابو بکرؓ کی آنکھوں میں باپ
کے اس حسین و جمیل انقلابِ زندگی پر پاکیزہ آنسوؤں کی نمی ملاحظہ
کی اور فرمایا:-

"تم نے غضب کیا کہ ان کو اس قدر تکلیف میں ڈالا!
میں خود ان کی خدمت میں چلا آتا!"

کتنا عظیم تھا وہ واقعہ کہ جس کے خیر مقام میں آخری
اولوالعزم رسول ؐ کے پاک ہونٹوں سے یہ الفاظ نکل رہے
تھے! ـــ کتنا شاندار تھا وہ "بیٹا" جو اپنے باپ کا ہاتھ
پکڑے ہوئے اس کو اپنے شانوں کا سہارا دیتا ہوا دوزخ
کی ہولناک آگ سے دور خدا کی جنت کی طرف لیکر چلا تو بارگاہِ
رسالت ؐ میں اس کی اتنی شاندار پذیرائی ہوئی!-

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرطِ مسرت
میں اٹھ کھڑے ہوئے ـــ دنیائے حقیقت کے اس نووارد
کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور پھر بوڑھے قحافہ کے سینے پر جب پیغمبرؐ
کے ہاتھوں کی پُرشوق تھپکی سے روح و دل کی گہرائیوں
میں سوئی ہوئی زندگی جاگ اٹھی تو حضرت قحافہؓ نے زندگی
میں پہلی بار محسوس کیا کہ آنکھیں جاتی رہنے کے باوجود اگر کسی
کے دل کی آنکھ کھل جاتی ہے تو کیا نظر آتا ہے۔ کسے خبر ہے کہ
اس وقت ان کو کیا نظر آیا؟ ـــ دنیا نے تو صرف اتنا دیکھا
اور سُنا کہ آٹھ سال پہلے اسلام کو بچوں کا حقیر کھیل سمجھ کر
کڑکنے برسنے والا بوڑھا مکّی بے اختیار بے تحاشا چیخ اٹھا:-

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تو بس اللہ ہی ہے ـــ اور
میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ؐ اُس کے بندے بھی ہیں اور رسول ؐ
بھی!ـــ"

ہاں ـــ یہ خدا کی بارگاہ ہے جہاں اس کے در کے
سوالی جب عرفانِ حق کی خالی جھولی لے کر ایک عاجز ترین
بھکاری کے عجز کے ساتھ دامن پسارتے اور ہاتھ پھیلاتے
ہیں تو بوڑھی سے بوڑھی زندگی پر آناً فاناً حقیقت و صداقت
کا شباب آجاتا ہے۔ یہ ہے وہ "بھیک" جو خدا کے سوا کوئی بھی نہیں
دے سکتا ـــ اور ہاں یہی ہے وہ "بھیک" کہ جس کسی کو یہ مل
سکی تو ہفت اقلیم کے شاہی خزانے بھی اس کے "افلاس" کے
داغ نہیں دھو سکتے۔ پھر کون ہے جس کو اس کی ضرورت نہیں؟
لیکن کتنے ہیں جو اس کے در کے سوالیوں کی صف میں کھڑے
ہو کر خود اُسی کو بھیک میں مانگ رہے ہوں؟

ابھی اسلام رسول ؐ خدا کے ہونٹوں تک ہی آیا تھا کہ
ابو بکرؓ کا سینہ کھلا اور اس نور کو اپنے اندر جذب کر کے خدا کے
سوا ہر شے کے لئے بند ہو گیا اور ابھی اسلام صرف اُنتالیس ۳۹
سینوں کی آڑ میں خون اور سیاہی، کفر و شرک اور درندگی و وحشت
کے خوگر انسانوں کی طرف ایک خاموش دعوتِ حیات کی صورت
میں آگے بڑھ رہا تھا کہ ابو بکرؓ کو محسوس ہوا حق کی آواز کو
سینے کے اندر ہی اندر ضبط کرتے کرتے ان کا سینہ شدتِ ضبط سے
پھٹ جانے کے قریب ہے۔ جھوٹ چھپانے ہی کے قابل ہے اور
حق ظاہر ہو جانے ہی کے لائق ہے۔ یہ بات سوائے ایک حق
پسند کے کوئی نہیں جانتا کہ جس حق کو اٹھانے سے پہاڑوں نے انکار
کر دیا تھا اس حق کو اٹھانے والے انسان کو اس حقیقت کا طوفان
سینے کے اندر دبانے سے کیسی تکلیف ہوتی ہوگی! جب خطرات
کی ڈراؤنی پرچھائیاں در و دیوار پر ناچتی ہوئیں حق پسندوں کو
گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ جب "خدائے واحد" کا نام زبان
پر لانا ایسا تھا جیسے کوئی کعبہ میں رکھے ہوئے تین سو ساٹھ
پتھر کے بتوں سے سر ٹکرا کر پاش پاش ہو جانے کے لئے تیار ہو گیا
اس وقت یہ ایک معبود کا بے لوث پجاری بارگاہِ رسالت ؐ میں
یہ التجا کر رہا تھا:-

"اجازت دیجئے کہ ایک بار کھل کر وہ بات زبان سے
کہدوں جو میرے دل میں ہے۔ یہ خدا سے مایوس اور پتھروں سے
آس لگانے والے نادان لوگ! ـــ جی چاہتا ہے کہ ان کے سامنے
اپنا سینہ چیر کر رکھدوں! ـــ..."

رسولِ خدا کی نگاہوں سے موج در موج اُبلتا ہوا
جذبۂ حق ابو بکرؓ کے سینے میں آنکھوں کی راہ سے اُتر کر جیسے ایک

زبردست طوفان بن چکا تھا۔ حضورؐ نے کمال پذیرائی کے ساتھ اس بندۂ مومن کی طرف دیکھا اور اجازت عطا فرمادی گئی — اجازت عطا فرما دی گئی کہ جس امانت کو اٹھانے کے تصور سے یہ اونچے اونچے سر افلاک پہاڑ لرز اٹھے تھے تم اس امانت کو اٹھا کر اینٹ پتھر کی اونچی نیچی دنیا میں جا سکتے ہو اور دنیا کو بتا سکتے ہو کہ وہ خدا ہے جو اس کی کائنات میں انسان کو اپنی زندگی سے بھی پیارا ہو جاتا ہے۔

عجز و عرفان کی دو آتشہ کیفیت میں حضرت ابوبکرؓ کیسے وقار اور کس متانت کے ساتھ خدا کا نام لیکر میدانِ عمل میں تشریف لا رہے تھے! یہ جان پر کھیل جانے کی تمنا قبول ہو گئی تھی کہ دنیا بھر کے شاہی خزانوں کی کنجیاں کسی سائل کی جھولی میں ڈال دی گئی تھیں۔ اعلانِ حق جو تلوار کی دھار سے زیادہ خطرناک راستہ ہے وہ اس شمشیر آبدار پر کس خوشی اور کس کیف کے ساتھ وجد کرتے ہوئے چلے تھے۔

اعلانِ حق کے جواب میں نہ پھول برسے نہ واہ واہ ہوئی۔ وہی ہوا جو سدا سے اس جگ میں ہوتا آیا ہے۔ اسی اداۓ بندگی پر تو ہمیشہ دنیا خفا ہوتی آئی ہے اور سرفروشوں کو فقط ایک آن دیکھے خدا کے سہارے جینا پڑا ہے۔ ابوبکرؓ کو یہی خوشی مطلوب تھی۔ اسی لئے جب چاروں طرف سے نفرت، سنگدلی، درندگی اور سفاکی کی وحشیانہ یلغار ہوئی — جب خدا کی مخلوق نے خدا کا نام سن کر غیظ و غضب کے عالم میں داعیٔ حق کی ایک ایک ہڈی پر آہنی ہتھوڑے برسانے شروع کئے تو چوٹ پر چوٹ کھاتے ہوئے بندۂ مومن کی نظر سوئے فلک اٹھی اور خوں چکاں زخموں کی گود میں اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی! یقیناً اس عظیم ترین خوشی کا راز صرف یہی احساس تھا کہ اس وقت ان زخموں کو وہ آنکھ دیکھ رہی ہے جس کو نہ نیند پکڑ سکتی ہے نہ اونگھ — جس کو صرف ایک بار اپنی طرف اٹھتا ہوا دیکھنے کیلئے انسان ہزار بار آگ اور خون کی بھٹیوں میں گر جانے کے لئے سر کے بل چل کر بھی جائے تو سودا سستا ہے۔ گھائل ابوبکرؓ کی سمت خدا کی نظر اٹھی اور دکھ درد کے سارے احساسات نے بے ہوشی کی آغوش میں دم توڑ دیا — کتنے دردناک ستم ہوتے تھے کہ خود

ظالموں کے دل ہل گئے! کفر پر خود کفر نے ملامت کی او
کو زخموں سے چور چور حالت میں اٹھا کر ان کے گھر پہنچا
لیکن جیسے ہی ہوش و حواس پلٹے پھر وہی آوازِ حق ان
سے ابل کر ہونٹوں تک آنے لگی جس کو بیہوشی میں ڈوبے
انسان کے آخری سانس تک سنا گیا تھا۔ اب اس آوا
مخاطب غیر نہیں اپنے تھے — وہ ماں اور باپ تھے
خون جگر کے احسانات میں اپنے بال بال کو بندھا ہوا پاکر
بے قرار تھے کہ ان احسانات کا کچھ صلہ پیش کر سکیں — در
ڈوبی ہوئی آواز — زخموں کی کسک اور خون دل و جـ
نہائی ہوئی یہ پکار بھلا رائیگاں کیسے جاتی! باپ کے قدم
جنبش نہ ہوئی لیکن دل ضرور ہل گیا اور ماں کا تو پورا وجود
ہوکر اپنے بیٹے کے ساتھ ہو گیا — صبح ہوئی تو ابوبکرؓ
مسرت میں ڈوبے ہوئے اپنی والدۂ ماجدہ کو ساتھ لئے
بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور جس ماں نے ان
تھا اس کو اس کے خالق و پروردگار کے قدموں تک

ہماری رگوں میں دوڑتا ہوا خون بھی گواہ ہے کہ ا
کے قطرے قطرے پر باپ کے پسینے اور ماں کی ممتا کی گہر
ایک انمٹ احسان کے نقش دوام کی طرح ثبت ہے۔
میں سے کتنے احسان شناس ہیں ایسے مومن جو جذبۂ
پذیرائی لے کر حیات دنیا کے ان دو عظیم محسنوں کو عذا
بچانے اور باغ فردوس تک پہنچانے کے لئے بے قرار ہو
جن کو دنیا والدین کے قیمتی نام سے یاد کرتی آئی ہے —
نظروں سے اوجھل ہے لیکن ماں باپ؟ ان کے احسا
طرف سے آنکھیں بند کرنے کا جواز کیا ہے آخر؟ — کاش
"مسلمان" ہوتے تو احسان کی پذیرائی کا یہ پہلو ہمیں ا
شکر گذاری سے بڑھکر معبود کے آگے تصویر شکر بن جا
بلند مقام تک کھینچ لاتا — شکر جو ریاضتوں اور مجاہد
بغیر انسان کو کمال تقویٰ کی سربلندیوں تک لے جا سکتا
"شکر" جس کے جذب و جنوں میں خدا کے رسولؐ کی
ہوتی تھی کہ جائے نماز پر وہ مقدس پاؤں سوج جا
سینے میں گھٹی ہوئی ہوک کی آواز اس طرح سننے والوں کو

ہوتی تھی کہ کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا۔ ایک معصوم رسول ؐ کا اگر جذبۂ شکر سے یہ حال ہوتا تھا تو ان لوگوں کا کیا حال ہونا چاہئیے جن پر مسلسل خدائی احسانات کی بارش ہو رہی ہے اور مسلسل غفلت کی سرد مہریوں نے ان کے فرض بندگی کے احساسات کو پتھرا کر رکھدیا ہے — ایمان آنکھوں سے نظر نہیں آسکتا لیکن اسکے آثار نظر آیا کرتے ہیں — تو کیا تشکر والدین کی یہ ایمانی علامت بھی کہیں سے کہیں تک ہماری زندگی میں دیکھی جا سکتی ہے ؟ —

غلاف کعبہ کی زیارت میں کسی بدعت کی اجازت نہیں دی گئی

ٹرینوں میں سفر کرنے والے کارکنوں کا بیان

غلاف کعبہ والی اسپیشل ٹرینوں میں جو کارکن زیارت کا انتظام کرنے کے لئے لاہور سے کراچی گئے تھے انھوں نے واپس آکر اپنے دستخطوں سے حسب ذیل بیان اشاعت کے لئے دیا ہے ان کے نام بیان کے آخر میں دیئے گئے ہیں۔

مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۶۳ء کو ہم لوگ غلاف کعبہ کی دو اسپیشل ٹرینیں لے کر لاہور اسٹیشن سے روانہ ہوئے پہلی ٹرین لاہور، راولپنڈی، ملتان خانیوال سے کراچی پہنچی۔ اور دوسری ٹرین لاہور، پشاور، کوئٹہ ہوتی ہوئی کراچی پہنچی ہم بارہ بارہ ریلوے اسکاؤٹس کے افراد اور تین تین سول ڈیفنس کے افراد ان پارٹیوں میں شریک تھے اور ہمارے ساتھ تین تین کارکن جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے تھے۔

(۱) روانگی سے قبل ہم لوگوں کو جو ہدایات دی گئی تھیں وہ یہ تھیں (الف) زائرین کو اللہ اکبر اور کلمہ طیبہ کے ذکر کی تلقین کی جائے اور کوشش کی جائے کہ لوگ اللہ کے ذکر میں مشغول ہو جائیں کہ کوئی دوسری آواز بلند نہ ہو (ب) نماز اوقات پر با جماعت ادا کی جائیں (ج) زائرین کو ہر طرح کی مشرکانہ باتوں سے روکا جائے اور تلقین کی جائے کہ وہ غلاف کو دیکھکر اللہ کا ذکر کریں۔ اور دعا مانگیں کہ ہم جس گھر کا غلاف دیکھ رہے ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں خود اس گھر کی زیارت نصیب فرمائے۔ اللہ سے توبہ کریں اور اپنے گناہوں کی معافی کے لئے درخواست کریں (د) عورتوں اور مردوں کے لئے الگ الگ انتظامات کئے جائیں اور حتی الامکان انھیں خلط ملط ہونے سے روکا جائے زیارت اس طرح تنظیم سے کرائی جائے کہ حتی الامکان حادثات رونما ہونے پائیں۔

(۲) ہماری دونوں پارٹیوں نے جن کے شرکاء اس بیان پر دستخط کر رہے ہیں اپنی حد استطاعت تک ان ہدایات کی پوری طرح تعمیل کی ہے۔ مجموعی طور پر ہم نے پشاور کوئٹہ سائڈ کی گاڑی کو ۳۳ مقامات پر ٹھہرانا تھا لیکن پبلک کے اصرار پر مزید ۹۸ مقامات پر ٹھہرائی گئی خانیوال ملتان حیدرآباد کی گاڑی کو ۲۳ مقامات پر ٹھہرنا پڑا۔ لیکن ہم کو ۶۷ مقامات پر ٹھہرنا پڑا۔

(۳) مجموعی طور پر پشاور سائڈ کی ٹرین سے ۲، لاکھ ۳۶ ہزار افراد نے زیارت کی خانیوال ملتان حیدرآباد کی ٹرین پر ۵۰ لاکھ افراد نے زیارت کی۔ اس طرح مغربی پاکستان میں ایک کروڑ ۲۲ لاکھ ۳۶ ہزار افراد نے زیارت غلاف کعبہ سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کیا۔ بعض مقامات پر دو دو، تین تین لاکھ زائرین تھے اور یہ اجتماعات ہمارے اندازے بلکہ ہمارے تصور سے بھی زیادہ تھے اور اتنے بڑے مجمعوں کو کنٹرول کرنا ہمارے بس میں نہ تھا۔ نہ مقامی پولیس اور رضا کاروں کے بس میں تھا لیکن اس کے باوجود یہ غلاف کعبہ کا احترام اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کی

رت تھی کہ زیادہ سے زیادہ ممکن نظم کے ساتھ لوگوں نے زیارت کی۔ ہر جگہ لوگ اللہ کا ذکر کرتے رہے اور کلمہ اور درود شریف کا ورد کرتے رہے بہت ہی کم ایسا اتفاق ہوا کہ ہمارے روکنے اور تلقین کرنے کے باوجود بعض افراد نے کوئی ایسا کام کیا ہو جسے شرعًا درست نہیں کہا جاسکتا

(۴) ہم نے ہر جگہ عورتوں اور مردوں کے الگ الگ انتظامات کئے تھے اور ان کے مجمعے الگ الگ رہے اگر کسی جگہ ہماری تمام کوششوں کے باوجود عورتوں اور مردوں کے مجمعے تھوڑے سے بہت خلط ملط ہوئے تو یہ مجموں کی کثرت کا نتیجہ تھا نہ کہ کسی کے تساہل کا۔

جہاں ہم نے دیکھا کہ عورتیں اور مرد خلط ملط تھے وہاں ہم نے زیارت بند کرادی۔

(۵) اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا فضل ہے کہ اتنے بڑے مجموں میں کہیں کسی کی جیب نہیں کٹی۔ کوئی غنڈہ گردی کا واقعہ پیش نہیں آیا۔ لوگوں پر بحیثیت مجموعی ایسا خوفِ خدا اور ادب و احترام طاری رہا کہ اس سے پہلے کبھی ہماری آنکھوں نے مسلمانوں کے بڑے بڑے مجموں میں نہیں دیکھا۔ ہم نے اس سفر سے بہت گہرا تاثر لیا ہے۔ مسلمانوں میں ایسی دینی روح پائی جاتی ہے جس سے ہمارے اپنے ایمان تازہ ہو گئے ہیں افسوس ہے کہ بعض مقامات پر مجموں کی بے انتہا کثرت کے باعث لوگوں کے زخمی ہونے اور ایک آدھ جگہ پر اموات ہونے کے حادثات پیش آئے جس کا ہمیں دلی افسوس ہے لیکن یہ کسی کی غفلت اور تساہل کا نتیجہ نہ تھے بلکہ بے پناہ اژدہام کے نتیجہ تھے اور ایسے بڑے بڑے مجموں میں ایسے واقعات کا پیش آجانا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔

(۶) لوگوں کو اس بات سے منع کیا گیا کہ وہ غلاف پر پیسے پھینکیں۔ لیکن بہت سے مقامات پر لوگ زرِ عقیدت کی بناء پر از خود ایسا کرتے رہے ہم دوران سفر پوری رقم کا حساب کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ پشاور کی ٹرین سے مبلغ سولہ سو اناسی روپے دس آنے تین پائی۔ اور ملتان ٹرین سے مبلغ تین ہزار سات سو روپے تین آنے۔ کل پانچ ہزار تین سو اناسی روپے سوا تیرہ آنے جمع ہوئے۔ یہ رقم ہم نے لاہور پہنچ کر ان مصارف کے سلسلے میں جماعت اسلامی کے بیت المال کو دیدی ہے جو ان دونوں اسپیشل ٹرینوں کے انتظامات کے سلسلے میں کرنے پڑے۔

اسمائے کارکنان

مرزا ممتاز بیگ۔ محمد عمر۔ محمد خالد اختر۔ نذیر احمد۔ محمد ساجد۔ شوکت علی قاسمی۔ امان اللہ راٹھور۔ محمد اشرف۔ سید ظہیر الحسن۔ عبدالحمید بھٹی۔ محمد سعید۔ ذوالفقار علی۔ محمد جان۔ غلام قادر۔ جاوید احمد بٹ۔ محمد صدیق۔ رحمت الٰہی۔ اللہ دین رفیق۔ معراج دین۔ بشیر احمد۔ محمد ارشاد۔ نذر محمد۔ محمد زبیر۔ چودھری عبدالحمید الفت۔ منظر حسین۔ بشیر حسین۔ محمد الیاس مفتی۔

تجلّی کی ڈاک

اسلام اور غلامی

سوال:- نام ندارد - خریداری نمبر ۶۲۵۸ - لاڑکانہ (پاک)

گزشتہ رات ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے اسلامی مساوات پر باتیں ہو رہی تھیں ایک شخص نے غلامی کے مسئلے کو چھیڑا اور سوال کیا کہ دین اسلام نے سود کو حرام ٹھیرایا شراب کے پینے کو بھی منع کیا۔ کمسن بیٹیوں کو زمین میں زندہ گاڑنے سے بھی روکا اور بہت سی خرابیوں کو دور کیا۔ لیکن مسلمانوں کو انسانی ذات کی خرید و فروخت اور بیوپار کرنے سے کیوں منع نہیں کیا؟ اور انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح بیچنا اور خریدنا کیوں جائز رکھا؟

اسلام تو آیا ہی اس واسطے تھا کہ اللہ کے بندوں کو غیر کی غلامی سے آزاد کرائے اور اُسے اپنا پیدائشی حقِ آزادی دلوائے نہ کہ اُسے اور زیادہ بندھنوں میں جکڑے۔ کہتے ہیں اسلام نے مساوات قائم کرنے کا حکم دیا ہے، لیکن ایسا ہوتا کہاں ہے۔

انسان پیدائشی آزاد ہے پھر اس کو کسی حیلے یا زبردستی سے اُس کی مرضی کے خلاف اپنا غلام بنا کر رکھنا اُس کے جذبات سے کھیلنا اُس سے طرح طرح کی خدمات لینا، اُس کی کمائی پہ بسر اوقات کرنا پھر اُسے دوسری جگہ بیچنا، اُس کا بیوپار کرنا، فائدہ اُٹھانا اسلام نے کیوں جائز رکھا؟

حاضرین میں سے بعض تو خاموش رہے اور بعض نے اپنے خیال اور سمجھ کے مطابق جوابات دیئے لیکن کوئی بھی سوال کرنے والے کو ایسا جواب نہ دے سکا جس سے اُس کی تسلی ہو جاتی۔

اس قسم کے سوالات آئے دن غیر اسلام والے بھی کرتے رہتے ہیں لیکن اس کا پورا منھ توڑ جواب آج تک نظر سے نہیں گزرا۔

الجواب:-

سائنس آج اتنی ترقی کر چکی ہے کہ ریلوے انجن کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ گئی پھر بھی آپ اس کے کل پرزوں کے بارے میں صرف ایسے ہی لوگوں کو اظہارِ خیال کا اہل قرار دے سکتے ہیں جو اس کی ساخت، اس کی سائنس، اس کے میکنزم سے واقف ہوں۔ ایک عام آدمی اگر انجن پر نظر ڈال کر کہنے لگے کہ اس کا فلاں پرزہ ٹھیک نہیں کیونکہ وہ بے تُکا حد تک لمبا ہے اور فلاں پرزہ نہایت غیر موزوں ہے کیونکہ اس میں دندانے نظر آتے ہیں تو آپ ہنس دیں گے اور آپ کی رائے یقیناً یہی ہوگی کہ یہ شخص یا تو احمق ہے یا مسخرہ۔

جب ایک معمولی سی ایجاد کا یہ حال ہے تو ظاہر ہے کہ ریڈیو، ٹیلی ویژن، راکٹ اور برقی دماغ جیسی ترقی یافتہ ایجادوں کے بارے میں تو اور بھی ضروری ہوگا کہ اظہارِ رائے کا حق صرف اُن لوگوں کو ہو جو ماہرِ فن ہوں۔ سائنس داں ہوں، تجربہ کار ہوں۔

اسی طرح دنیا کے ہر علم و فن کا معاملہ ہے یہاں تک کہ مٹی کے برتن بنانے، کھیتی باڑی کرنے اور جوتا گانٹھنے کے معمولی فنون میں بھی گفتگو اور محاکمے کا حق صرف انہی لوگوں کو پہنچتا ہے جنھوں نے ان فنون کو سیکھا ہو اور کسی حد تک تجربات کے مراحل سے بھی گذر سکے ہوں۔

جب دنیاوی علوم و فنون کا یہ معاملہ ہے تو علم دین اور آئین شریعت کا معاملہ تو ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر ہونا چاہئے۔ ایک شخص اگر قرآن و رسالت پر ایمان رکھنے کے باوجود اسلام کے کسی قانون کے متعلق بدگمانی یا شک میں مبتلا ہے تو اس کا فرض ہے کہ بدگمانی کا اظہار کرنے یا ذہنی طور پر اس پر جمنے سے قبل یہ معلوم کرنے کی جد و جہد کرے کہ اس قانون کی صحیح نوعیت ہے کیا۔ یہ کن مصالح کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔ اس کے قیود و شرائط کیا ہیں۔ اس کے منافع اور مضرات میں کیا نسبت ہے؟

لیکن ہمارے زمانے میں یہ بات عام ہو گئی ہے کہ ادنیٰ سی زحمتِ تحقیق اٹھائے بغیر لوگ بڑے بڑے مسائل پر بے محابا زبان کھولتے ہیں اور جو جی چاہے کہتے چلے جاتے ہیں۔ خصوصاً مذہب کے بارے میں تو امان بالکل اٹھ گئی ہے۔ جسے دیکھو مغربی فنکاروں کی دسیسہ کاری کا شکار ہو کر برملا اُن دینی قوانین پر نہ صرف اظہارِ خیال کرتا چلا جاتا ہے بلکہ قطعی فیصلے دیتا چلا جاتا ہے جن کے بارے میں اس کی واقفیت صفر سے زیادہ نہیں۔ تعلیم پائی مغربی نوع کی درسگاہوں میں۔ تربیت ملی ایسے ماحول میں جہاں سوائے مادہ پرستی اور دنیا سازی کے کچھ نہ تھا۔ ذہن کا سانچا تیار ہوا اسلام دشمن پروپیگنڈے کے اینٹ گارے سے اور اب وہ گفتگو کر رہا ہے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی قباحت پر، سود کے جواز پر، یتیم پوتے کی وراثت پر۔ ناچ گانے کی افادیت پر۔

خصوصاً جب وہ مسلمان ہی ہیں یعنی اسلام کو اللہ کا نازل فرمودہ دین سمجھتے ہیں اور رسالت پر ان کا ایمان ہے تو اور بھی زیادہ یہ کاہش ان کے اندر پیدا ہونی چاہئے تھی کہ جس قانون کو ان کی سطحی نظر مکروہ سمجھ رہی ہے وہ آخر اللہ اور اسکے رسول ؐ نے کس لئے جزوِ شریعت بنایا ہے۔

مگر زمانے کی ہوا اور عام روش کے مطابق انھوں نے تحقیق اور عرق ریزی کی زحمت اٹھائے بغیر آپس میں نہ صرف تبادلۂ خیال شروع کر دیا بلکہ ایسے نتائج تک بھی پہنچ گئے جنھیں ہلکے سے ہلکے لفظوں میں طفلانہ کہا جا سکتا ہے۔

دراصل جن بعض مسائل کو اسلام کی حریف قوموں نے اسلام کے خلاف حربے کے طور پر استعمال کیا ہے ان میں یہ غلامی کا مسئلہ بھی ہے۔ اگر غلط تعلیم اور فاسد تربیت نے مسلمانوں کے اندر جہالت و ضلالت کی تخم ریزی نہ کر دی ہوتی تو وہ اسلام کے قانونِ غلامی پر شرمسار ہونے کے عوض فخر سے گردن اونچی کر کے کہہ سکتے تھے کہ ہاں جن مخصوص حالات میں اسلام نے غلامی کا قانون نافذ کیا ہے ان حالات میں دنیا کا کوئی بہتر سے بہتر قانون بھی اس سے بڑھ کر انسانیت دوستی، اصلاح اور عدل کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔ لیکن اذہان و قلوب جب مرعوب و متحیر ہو چکے ہوں اور مغربی ملمع کاریوں کی چمک دمک نے نظروں کو خیرہ کر دیا ہو تو باطل کا ہر پروپیگنڈہ کامیاب ہونا ہی چاہئے۔ قصور غیروں کا نہیں اپنوں ہی کا ہے۔ غیر تو غیر ہی ہیں کمزوری ہماری ہے کہ آسانی سے دشمنوں کا نرم چارہ بن جاتے ہیں۔

یہ تمہید سوال سے غیر متعلق نہیں ــــ تعلق بالکل ظاہر ہے کہ محترم سائل اور ان کے دوستوں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ اسلام کے قانونِ غلامی پر نفرت اور کراہت سے لبریز رائے ظاہر کرنے سے پہلے وہ یہ زحمتِ تحقیق اٹھا لیں کہ یہ قانون اصل میں ہے کیا۔ یہ کن حالات میں کن قیود و شرائط کے ساتھ نافذ ہوتا ہے۔ اس میں کن مصالح کو شریعت نے ملحوظ رکھا ہے اور اس کی جو قباحت انھیں محسوس ہو رہی ہے وہ محاسن و مصالح کے تناسب کی رو سے کیا درجہ رکھتی ہے

دوستو! پہلے تو اس پر غور کرو کہ اسلام کا قانونِ غلامی کوئی عام قانون نہیں ہے۔ بلکہ خاص الخاص قانون ہے جو مخصوص شرائط کے ساتھ مخصوص حالات میں روبہ کار آتا ہے کیا تم نہیں دیکھتے کہ دنیا کے ہر دستور میں ایک باب ہنگامی حالات کا بھی ضرور ہوا کرتا ہے۔ اس باب میں جو قوانین ہوتے ہیں وہ خاص نوعیت رکھتے ہیں۔ بہت سے ان میں ایسے ہوتے ہیں کہ آزادی اور جمہوریت کے [illegible]

حالات میں ہرگز گوارا نہیں کرسکتے کیونکہ یہ فرد کی آزادی کو محدود کرتے اور حکمراں طبقے کو غیر معمولی اختیارات عطا کرتے ہیں، لیکن ہنگامی حالات میں انھیں بخوشی گوارا کیا جاتا ہے کیونکہ جب مسئلہ دشمن سے جنگ اور ملک و قوم کے تحفظ کا درپیش ہو تو مخصوص قوانین کا سہارا لینا ناگزیر ہو جایا کرتا ہے۔

اس لحاظ سے اگر اسلام بھی ہنگامی حالات کے لئے اپنے عام قوانین سے جدا کچھ قوانین رکھتا ہے تو اس میں اعتراض کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے۔

دوسرے مرحلے میں اس پر غور کرو کہ قانون کا معاملہ کچھ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ قانون کا حال یہ ہے کہ دیوانی یا فوجداری کا ایک معمولی سا معاملہ آپڑتا ہے تو ہم میں کا قابل سے قابل آدمی بھی دوڑا دوڑا وکیل اور ایڈوکیٹ کی خدمت میں جاتا ہے اور پھر عدالت میں وکلا قانون کی گتھیوں پر ایسی طولانی اور پیچیدہ گفتگوئیں کرتے ہیں کہ ہمارے پلے کچھ بھی نہیں پڑتا۔

یہ حال جب معمولی قوانین کا ہے تو اُن قوانین کا کیا حال ہوگا جو بہت خاص اور صبر آزما حالات کے لئے بنائے جائیں۔ جنگ بجائے خود ایک فن اور نہایت طویل الذیل مسئلہ ہے۔ کب کس طرح کی جنگ پیش آجائے اور ملک و قوم کو کس نوع کے حالات سے گذرنا پڑے یہ سمجھنا ہر کہ ومہ کے بس کا روگ نہیں۔ پھر جنگ کے اثرات سیاست، معیشت، منزلی زندگی، تجارت و صنعت، تعلیم، اخلاق اور دیگر شعبہ ہائے زندگی پر کیا کیا پڑیں گے اس کا ادراک و شعور تو اور بھی کار دارد ہے۔ ان گوناگوں اور پیچ در پیچ نزاکتوں کو بہت ہی خاص صلاحیتوں کے لوگ سمجھ سکتے ہیں اور وہی اس کے اہل ہیں کہ ملک و قوم کو ان نزاکتوں سے بخیر و خوبی نکال لے جانے کے لئے خاص خاص قاعدے اور قانون بنائیں۔ اب ظاہر ہے کہ ان کے وضع کردہ قوانین پر کوئی اناڑی آدمی نہایت سطحی طریقے پر داد نکتہ رسی کرنے لگے تو اس کی جرح و قدح کا کیا وزن ہوسکتا ہے۔ جو قوانین نہایت دُور رس اور دقیق ثمرات و مضمرات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اونچے درجے کے ارباب دانش وضع کریں ان پر چند ظاہری اور قریبی نتائج کے اعتبار سے جرح و قدح کرنا ایسا ہی ہے جیسے چند پودے جھلس جانے پر کوئی شخص یوں کہے کہ سورج بنانے والے کو سورج کی گرمی اور تمازت کچھ کم رکھنی چاہیئے تھی۔ اتنی زیادہ حرارت رکھ کر اس نے غلطی کی۔

تیسرے مرحلے میں یہ غور کرو کہ قوانین کا جوہری تعلق اُن اقدار سے ہوا کرتا ہے جن کی حفاظت قانون سازوں کو مطلوب ہے۔ ایک حکومت اگر اخلاقی قدروں کے مقابلے میں مادی قدروں کو زیادہ اہمیت دیتی ہے تو اس کے قوانین بھی اسی ذہنی بنیاد پر بنیں گے، لیکن جو حکومت اخلاقی اقدار کو بڑھ چڑھ کر اہمیت دیتی ہے وہ ہر قانون میں اخلاقی افادیت کو مقدم رکھے گی چاہے مادی اعتبار سے نقصان ہی پہنچ جائے۔

پھر اخلاق کا مفہوم بھی جدا جدا ہے۔ ایک قوم کے یہاں یہ بات بھی تقاضائے اخلاق ہے کہ مہمان میزبان عورت کا بوسہ لیں اور کلب گھر میں کوئی مہذب عورت ناچ کی درخواست کرے تو مرد اسے قبول کرے مگر دوسری قوم کے یہاں اجنبی عورت سے ملنا جلنا اور اس کے جسم کو ہاتھ لگانا تک بداخلاقی میں داخل ہے لہٰذا یہ ذہنی فرق لازماً قانون میں بھی کارفرما ہوکر رہے گا۔ تم دیکھتے ہی ہو کہ اسلام زنا پر کتنی سخت سزا متعین کرتا ہے جب کہ دوسروں کے یہاں زنا سرے سے کوئی جرم ہی نہیں۔

چوتھے مرحلے میں یہ غور کرو کہ کیا کسی خاص الخاص قانون کو بُرا قرار دینے کے لئے صرف اتنی سی بات کافی ہوسکتی ہے کہ فلسفۂ قانون سے ناواقف اور متعلقہ مسائل کی نزاکتوں سے بے خبر ایک آدمی سطحی سے مطالعہ میں کسی قباحت و مضرت کا احساس کرے اور اسی کی بنیاد پر قطعی فیصلہ دیدے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ ایسا گمان کرنا پرلے سرے کی نادانی ہوگی۔ دنیا میں کونسی چیز ہے جس میں حسن کے ساتھ ساتھ نفع

نقصان کا کوئی بھی کوئی پہلو موجود نہ ہو۔ صحیح فیصلہ دینے کے لئے ضروری ہے کہ گہرے فکر و تامل کے ساتھ تمام اچھے اور برے پہلوؤں کو مستحضر رکھا جائے پھر اچھائی اور برائی کا تناسب قائم کیا جائے۔ اس کے بعد ہی جزو غالب کے اعتبار سے فیصلہ دیا جائے گا کہ وہ شے اچھی ہے یا بری۔ تم دیکھتے ہو کہ شراب و قمار کو اللہ نے حرام کیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی مصرح فرما دیا ہے کہ ان میں بظاہر کچھ منافع بھی ہیں۔ اس سے یہی سبق دینا مطلوب ہے کہ کسی شے کے محض ظاہری و قریبی پہلوؤں پر فیصلے مت دینے لگو بلکہ غلبے کو دیکھو۔ غلبہ اگر محاسن کا ہو تو وہ شے اچھی قرار پائے گی اور معاملہ اس کے برعکس ہو تو شراب اور قمار کی طرح اسے ممنوع ٹھیرائیں گے۔

یہ اصول آپ سے آپ فیصلہ کر دیتا ہے کہ کسی قانون کے صحیح یا غلط ہونے پر گفتگو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو قانون کے تمام مضمرات سے باخبر اور متعلقہ مسائل سے واقف ہونے کے علاوہ منافع اور مضرات میں تناسب قائم کرنے کی بھی اہلیت رکھتے ہوں۔ یہ بات انتہائی نامعقول ہوگی کہ میں یا تم قانون کی گہرائیوں میں اترے بغیر فقط اپنے سرسری مطالعے اور بے اساس تدبر کی بنیاد پر فیصلہ دینے بیٹھ جائیں حالانکہ ہمیں ان حالات کی گوناگوں پیچیدگیوں کا کوئی ادراک نہ ہو جن کے لئے کوئی قانون وضع کیا گیا ہے۔

یہ چار فکری مرحلے ہیں جن سے گذرنے کے بعد تم خود ہی محسوس کر لوگے کہ "غلامی" جیسے خاص الخاص مسئلہ پر اظہار رائے کرنے کے لئے محض سطحی مطالعہ اور چلتا ہوا انداز تعبیر کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ ہمارے لئے بہت دشوار ہے کہ ان محدود صفحات میں سیر حاصل بحث کر سکیں تاہم ایک مثال سے کچھ سمجھانے کی سعی کرتے ہیں۔

فرض کرو مسلمانوں اور کافروں میں جنگ ہو رہی ہے نتائج گوناگوں نکل سکتے ہیں۔ مان لو دو ہزار مسلمان کافروں نے گرفتار کر لئے اور تین ہزار کافر مسلمانوں کی قید میں آئے۔ اب تم تو ناواقفیت کے باعث یہ تصور رکھتے ہو کہ یہ تین ہزار قیدی فوراً غلام بن گئے اور جس سپاہی یا افسر کا جی چاہے ان میں سے مردوں کو من مانی خدمات پر لگائے اور عورتوں کو کنیز بنا کر جو چاہے کرتا رہے۔ لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے یہ کاری گری تو نام نہاد مہذب اقوام ہی کو زیب دیتی ہے کہ زبانی تو بہت شریف بنو لیکن عمل یہ ہو کہ جب بھی حریف پر قابو چلے ہر فوجی بلا تامل زناکاری کا اونچے سے اونچا ریکارڈ قائم کرتا چلا جائے اور ذرہ برابر ذمہ داری قبول کئے بغیر جی بھر کے داد عیش دے۔ مسلمانوں کے ہاتھ آئے ہوئے قیدی دوسرے مال غنیمت کی طرح ایک امانت ہوتے ہیں جنہیں قوت حاکمہ کے باقاعدہ فیصلوں کے بغیر سپاہیوں کے لئے کوئی بھی من مانا تصرف جائز نہیں ہوتا۔ یہ تین ہزار قیدی جن کی ہم نے مثال دی انسانی رحم و رعایت کے تمام اوصاف کے ساتھ امانت رکھے جائیں گے اور حکومت پوری طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے گی کہ ان کا کیا کیا جائے۔

مان لو تبادلہ کا معاملہ طے ہو جاتا ہے تو قیدیوں کا تبادلہ کر لیا جائے گا اور کمال یہ ہے کہ اس صورت میں ان عورتوں کے شیشۂ عصمت پر بال بھی نہیں آئے گا جنہیں کنیز بنانے کے عوض تبادلے کی خاطر قید رکھا گیا ہے۔ تبادلہ اگر برابر سے ہوا ہے تو اب ایک ہزار قیدی مسلمانوں کے پاس بچتے ہیں ان کے بارے میں بھی اسلام کا یہ فیصلہ نہیں کہ انھیں لازماً لونڈی غلام بنا لو۔ وہ اجازت دیتا ہے کہ فدیہ (مالی معاوضہ) لیکر چھوڑ دو۔ یہ بھی اجازت دیتا ہے کہ اگر ان سے ملک و ملت کو شدید نقصان کا خطرہ ہو یا ان کے ذاتی جرائم ثابت ہوں تو قتل کر دو۔

لیکن اسلامی قانون کوئی معین حکم اس لئے نہیں دیتا کہ احوال کے اختلاف سے مصالح مختلف ہو سکتے ہیں۔ جیسے مصالح ہوں ان ہی کے مطابق حکمت عمل کی اجازت ہے۔ فرض کرو ان سے کوئی خاص خطرہ نہیں، لہٰذا انھیں لونڈی غلام بنائے بغیر محض قیدی کی حیثیت سے بھی رکھا جا سکتا ہے تاکہ آئندہ اگر دشمن کچھ اور مسلمانوں کو گرفتار کرلے تو تبادلے کی گنجائش باقی رہے۔

لیکن فرض کرو جنگ ختم ہو جاتی ہے مسلمان جیت جاتے ہیں۔ اب وہ قیدیوں کا کیا کریں؟ یونہی آزاد کر دیئے ہیں تو اس میں متعدد قباحتیں ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی قوم میں واپس ہو کر پھر سے جنگ کی آگ بھڑکائیں۔ یا زمانہ اسیری میں جو معلومات انہیں مسلمانوں کے بارے میں حاصل ہوئی ہیں وہ اپنی قوم تک پہنچا دیں اور اس طرح کئی ایسی باتیں دشمن کے ہاتھ لگ جائیں جو فوجی راز کی حیثیت رکھتی ہوں۔ اپنی قوم میں جانے کے بجائے وہ مسلمانوں ہی کے ملک میں رہیں تب بھی اندیشہ ہے کہ سازش کا جال پھیلائیں، انتقامی ریشہ دوانیاں کریں۔ کفر و زندقہ کو اشاعت دیں۔

علاوہ ازیں معاشی مسئلہ ہے۔ وہ آخر کس طرح گذارا کریں گے۔ عورتوں کا معاملہ اس سے بھی زیادہ مشکل ہے، ان میں سے نہ جانے کتنی تو بیوہ ہو چکی ہیں۔ نہ جانے کتنی کنواری ہیں۔ نہ جانے کتنی ایسی ہیں جن کے شوہر اگرچہ جنگ میں مرے نہیں مگر قیدی بن کر ان کے ساتھ بھی نہیں آئے۔ اب ان عورتوں کو اگر حکومتِ مسلمہ یونہی آزاد کر دیتی ہے تو ظاہر بات ہے کہ معاشرے میں اخلاقی انارکی اور بدکاری کا راستہ کھل جائے گا۔ ان میں سے بہت سی خود ہی طوائف بن جائیں گی، بہت سی بالجبر ہوس کا نشانہ بنالی جائیں گی اور ایسی ہر صورت میں ان کا کوئی حق کسی پر نہ ہوگا نہ ان کی اولادیں کسی سے منسوب ہو سکیں گی۔ کسی کے پاس چشمِ عبرت ہو تو ماضی قریب کی دو "مہذب" جنگوں کے حالات ملاحظہ کرے۔ خیر سے اکیلے جاپان میں ساڑھے لاکھ ایسے بچوں کا شمار کیا گیا تھا جن کا کوئی باپ نہ تھا۔

لیکن اسلام اس فحاشی کو برداشت نہیں کر سکتا اسکے نزدیک بدکاری بدترین جرم ہے اور معاشرے کو فحشکاری سے پاک رکھنا اہم ترین مقصد۔ لہذا ایسے حالات میں جبکہ جہاد میں ہاتھ آئے ہوئے قیدی مرد و زن کا مسئلہ اخلاق کی اہم تر قدروں کو خطرے میں ڈالے بغیر حل نہ ہو سکتا ہو وہ ایک نہایت معتدل اور منصفانہ راہ طے کرتا ہے جسے ناسمجھ لوگ تو غلامی جیسے الفاظ سے مطعون کر کے کیسا ہی گھناؤنا قرار دیتے رہیں مگر فی الحقیقت اس سے بہتر اور مبنی بر انصاف راہ ان حالات میں کوئی نہیں۔

نام نہاد مہذب اقوام کا طریقہ تو یہ ہے کہ اس طرح کے حالات میں قیدیوں کے کیمپ بنا دیتے ہیں اور بظاہر تو حکومت ان کے اخراجات برداشت کرتی ہے مگر عملاً یہ ہوتا ہے کہ ان کے اجسام ہر کہ و مہ کی چراگاہ بن جاتے ہیں، اور ایسے بچوں کی تعداد روز افزوں ہوتی چلی جاتی ہے جنکا دنیا کی نظر میں کوئی باپ نہیں ہوتا۔

مگر اسلام ان گھناؤنی ریاکاریوں کا تحمل نہیں کر سکتا وہ حکومتِ مسلمہ کو آمڈر دیتا ہے کہ جب قیدیوں کا مسئلہ کسی اور طرح حل نہ ہو رہا ہو تو انہیں ہر راہ چلتے کا چارہ بنا دینے کے عوض مختلف افراد کے سپرد کر دو تاکہ افراتفری بھی نہ پھیلے۔ لاوارث بچے بھی کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتے نہ پھریں۔ یہ ظلم بھی نہ ہو کہ فاتح قوم کے جس فرد کا جی چاہے قیدی مردوں کو ٹھوکر مار کر بیگار میں لگا دے اور عورتوں کو بلا کوئی ذمہ داری قبول کئے عیش کا ذریعہ بنا لے۔

مغرب زدگی کی رو میں بہت سے پڑھے لکھے مسلمان تک اس پرناک بھوں چڑھاتے ہیں کہ لونڈیوں سے بلا نکاح صحبت جائز رکھی گئی ہے۔ بلکہ بعض کاریگروں نے تو قرآن و حدیث کو بری طرح توڑ مروڑ کر یہ بھی ثابت کرنا چاہا ہے کہ لونڈیوں سے صحبت کا جواز مولویوں نے نکال لیا ہے ورنہ اللہ اور رسولؐ اسے جائز قرار نہیں دیتے۔ لیکن یہ محض مغرب زدگی ہے اور کچھ نہیں۔ احمقوں کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جس اللہ کے حکم سے ایک مرد و زن صرف زبانی قول و قرار سے میاں بیوی بن جاتے ہیں اور مباشرت حلال ہو جاتی ہے اسی کے حکم سے ایک لونڈی حلال کیوں نہیں ہو سکتی۔ صحبت بیوی سے ہو یا داشتہ سے، عمل ایک ہی ہے، لیکن پہلی صورت میں وہ فقط اسی لئے تو حلال ہے کہ اللہ نے اس کو حلال رکھا اور دوسری صورت میں اسی لئے تو حرام ہے کہ اللہ نے حرمت کا فیصلہ فرمایا ہے۔ پھر لونڈی سے صحبت کرنے میں وہ کونسی قباحت داخل ہو گئی جس پر مغرب کے نازک مزاجوں کا کلیجہ

ـ کہ اس کا ... خود خالق کائنات نے تجویز کردیا ہے
ذرا سوچیے - کیا یہ صورت بہتر ہوتی کہ جہاد میں ہاتھ
آنے والی عورتیں ذمہ تو ڈال دی جائیں مردوں کے تاکہ ان کی
دیکھ بھال کریں اور مباشرت کو حرام قرار دیدیا جائے تاکہ چوری
چھپے زنا ہوا کرے اور پیدا ہونے والی نسل حرامی کہلائے
یا یہ صورت بہتر ہے کہ مردوں کے لئے ان سے مباشرت جائز
ہو اور اس کے بدلے ان پر ان عورتوں کے اور ان سے
پیدا ہونے والی اولاد کے حقوق بھی لازم ہوجائیں - معاشرہ
میں یہ بچے یتیم ولاوارث نہ پھریں اور عورتوں کے بارے
میں سوائے آقا کے کسی کو دست درازی کی مجال نہ ہو -

یہ تو تھی لونڈی غلام بنانے کی صورت، لیکن اہل علم
جانتے ہیں کہ اس صورت کو اسلام نے محض ایک ہنگامی صورت
حال کا علاج تصور کیا ہے نہ کہ مستقل پسندیدہ فعل - چنانچہ
ترغیب اور قانون دونوں کے ذریعے ایسی بہت راہیں کھولی
گئیں کہ جب جہاد منقطع ہوجائے تو غلامی بھی کم سے کم تر ہوتی
چلی جائے - مختلف خطاؤں کے کفارے میں غلام آزاد کرنا
تجویز کیا گیا - مکاتبت کا قانون رکھا کہ غلام مرد کچھ کمائی
کر کے خود کو آزاد کرالیں - مدبّر بنانے کی تلقین کی گئی کہ جس
میں آقا کی موت کے بعد غلام خود بخود آزاد ہوجاتا ہے -
عورتوں کے معاملہ میں اس سے زیادہ رعایت کیا
ہوگی کہ جس لونڈی کے مالک سے بچہ پیدا ہوجائے وہ فروخت
نہیں کی جاسکتی نہ کسی کو تحفہ دی جاسکتی ہے - پھر آقا کی
موت کے بعد وہ خود بخود آزاد بھی ہوجائے گی -
علاوہ ازیں اسلامی قانون نے غلاموں کے ساتھ
جس سلوک کی تعلیم دی ہے وہ سلوک تو ایسا ہے کہ ہم اپنے
آزادوں سے بھی اس سے بدتر ہی سلوک کرتے ہیں، یہی
وجہ ہے کہ جب مسلمان مسلمان تھے تو ان کے غلام آزادی کی
خواہش رکھنے کی بجائے اس کے تصور تک سے کانپتے تھے
اور جب بھی ایسا موقع آتا تھا کہ آزادی اور غلامی کا
اختیار ان کے ہاتھ میں دے دیا جائے تو غلامی ہی کو
بشوق اختیار کرتے تھے - یہاں گنجائش نہیں کہ ہم مزید تفصیل
میں جائیں بس مشورہ ہی دیں گے کہ مسلمانوں کے غلاموں
کی تاریخ اٹھا کر دیکھی جائے معلوم ہوجائے گا کہ یہ غلامی
کیسی مبارک تھی اور مسلمانوں کے غلام عیش و راحت اور
عزت و منزلت کی کن کن بلندیوں تک پہنچے ہیں -
رہا یہ کہنا کہ اب اسلامی تعلیمات پر عمل کون کرتا ہے
یا کسی خاص زمانے میں مسلمانوں نے اپنے غلاموں سے اچھا
سلوک نہیں کیا تو اس سے اسلام پر کیا اعتراض وارد
ہوتا ہے - آج ہر طرف رشوت کی گرم بازاری ہے - بدیانتی
اور بدعنوانیاں عام ہیں تو کیا اس کا الزام قانون کو دوگے؟
یہ کہنا کہ اسلام کے دور میں مساوات پر عمل کہاں
ہوتا ہے تو اول تو یہ قول ہی خلاف واقعہ ہے - قرنِ اولیٰ
میں جب اسلامی آئین پر شایانِ شان عمل کیا گیا تھا
مساوات اور حسن سلوک کے ایسے ایسے بے شمار واقعات
ملتے ہیں کہ غلاموں کی قسمت پر آج کے آزادوں کو رشک
آتا ہے - غلاموں کے ساتھ جب مسلمانوں نے اسلامی ہدایات
کے مطابق سلوک کیا ہے تو بدسے بدتر دشمنوں تک کو حرفِ
شکایت زبان پر لانے کی جرأت نہیں ہوئی ہے -
دوسرے اس قول کو اگر اس معنی میں مطابقِ واقعہ
ہی مان لیا جائے کہ قرنِ اولیٰ کے بعد غلاموں کے ساتھ
مسلمانوں کا طرزِ عمل بدل گیا اور رفتہ رفتہ اس جنگی قانون
کو غلط مقاصد کی تحصیل کا ذریعہ بنالیا گیا تو ہم عرض
کریں گے کہ اس میں قانون کا کیا قصور - ایک اسی قانون
کے معاملہ میں نہیں اسلام کے دیگر قوانین کے باب میں
بھی مسلمان بہت کچھ بدلتے چلے گئے ہیں مگر یہ ایسا ہی ہے
جیسے آج رشوت، بدکاری، سیاہ بازاری وغیرہ عام ہیں تو
کیا اس عملی فساد کے باعث خود قوانین کو ناقص و فاسد
کہا جائے گا - اگر بدترین قسم کی بلیک مارکیٹ عام ہوتی
ہے تو کیا آپ یوں کہہ سکیں گے کہ خرید و فروخت ہی کو
جرم قرار دیدیا جائے کیونکہ اسی جائز قانون کا سہارا لیکر
بلیک مارکٹنگ کا راستہ کھولا گیا ہے - اگر ایسا نہیں

کہہ سکیں گے — اور ہرگز نہیں کہہ سکیں گے تو یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ کچھ لوگوں نے قانونِ غلامی سے ناجائز فائدہ اٹھایا اس لئے اس قانون ہی کو سرے سے مسترد کر دیا جائے معاملہ اگر انسانی قانون کا ہوتا تو انسانوں کو اس کے استرداد کا بھی حق تھا مگر یہ تو معاملہ اللہ کے قانون کا ہے اور اس کی کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ مسلمان اور کفار کے درمیان اب کبھی جہاد نہ ہوگا لہٰذا کس کو استحقاق ہے کہ اللہ کے فیصلوں کو مسترد کر سکے۔

خوب سمجھ لیجئے کہ اللہ کے دین میں بے خوفی و خود رائی اختیار کرنا اور حساب آخرت کے خوف سے بے نیاز ہو کر اُن قوانین پر ناک بھوں چڑھانا جنھیں اللہ اور اس کے رسولؐ نے صریح و محکم طور پر جزوِ شریعت بنا دیا ہے انتہائی خطرناک بات ہے جس کے نتیجے میں آخرت کا انتہائی ہولناک محاسبہ پیش آ سکتا ہے۔

محترم معترض نے اسلام کے قانون غلامی کو جس اندازِ تعبیر سے بھیانک اور مکروہ شکل میں پیش کیا ہے اس میں ان کا کچھ زیادہ قصور نہیں یہ زمانہ ہی لفاظی اور سخن سازی کا ہے۔

کون نہیں دیکھتا کہ ناچ رنگ، عریانی و فحاشی، سود، قمار اور مغربی تہذیب و تمدن کی تمام ہی غلاظتیں کو طاہر و پاکیزہ ثابت کرنے کے لئے لفظوں کے کیسے ہیر پھیر چل گئے ہیں۔ ثقافتی سرگرمیاں۔ تہذیبی ارتقاء، آزادی و جمہوریت، کلچرل ترقی وغیر ذلک اور اسلامی اقدار و تصورات کی تضحیک و تحقیر کے لئے رجعت پسندی دقیانوسیت، ملائیت، تنگ نظری، جہالت، قدامت پرستی اور وحشی پن جیسی اصطلاحات کی کمی نہیں۔ حقائق کچھ بھی ہوں مگر آج کی دنیا محض اسالیب، فقط پیرایۂ بیان اور صرف الفاظ کی ہیرا پھیری سے زمین و آسمان میں فرق نکالا جاتا ہے۔ مسائل اس دنیا سے مسموع نہ ہو سکے تو عجب کیا ہو گئے تو کوئی حیرت نہیں۔

ہم ان سے عرض کریں گے کہ بے شک آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے لیکن کیا آپ نہیں دیکھتے کہ چور کو جیل میں ڈالنا اور قاتل کو پھانسی چڑھانا عین انصاف قرار دیا جاتا ہے اب اگر ایک شخص زبان درازی پر ہی آئے تو وہ جیلوں کے دروازوں اور پھانسیوں کے تختوں کے قریب کھڑا ہو کر اسی طرح کی کئی تقریریں جھاڑ سکتا ہے جیسی محترم معترض نے کی ہے۔

اسلام بے شک انسان کو حق انسانیت دلانے اور جینے کا ڈھنگ سکھانے آیا تھا، لیکن جو لوگ امن و انسانیت کا یہ پیغام قبول کرنے کے عوض مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے چڑھ آئے ہوں اور آبرو ریزی سے لیکر قتل و غارت تک ہر ظلم و تشدد مسلمانوں کے لئے روا رکھا ہو کیا ان کے بارے میں مسلمانوں کو اتنا سا بھی حق نہیں کہ اگر ان میں سے کچھ بھی دورانِ جہاد میں قابو پالیں تو ان پر انھیں حاکمانہ اقتدار اور تصرف حاصل ہو جائے حالانکہ اس اقتدار کے بدلے وہ کچھ ذمہ داریاں بھی اپنے سر لے رہے ہیں اور کسی قسم کے غیر انسانی اور ظالمانہ سلوک کا حق انھیں نہیں دیا گیا ہے۔ ان کے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ پیٹ بھر کھائیں اور لونڈی غلام بھوکے رہیں۔ یہ بھی جائز نہیں کہ وہ لونڈی غلاموں سے انکی متوسط قوت اور معتدل سکت سے بڑھ کر مشقت لیں۔ اگر محترم معترض صاحب پیدائشی حق آزادی کا مطلب یہ سمجھے ہیں کہ کسی بھی حال میں انسانی آزادی پر کچھ پابندیاں عائد کرنا درست نہیں تو قانون شکنوں کو سزائیں دینا اور قاتلوں کو دار پر لٹکانا بھی یقیناً ظلم قرار پائے گا۔ دنیا کی بہترین سے بہترین حکومت بھی فقط ان لوگوں کو آزادی دیتی ہے جو قانون کا احترام کریں۔ فساد نہ پھیلاتے ہوں کہ رہیں اور ملک و قوم کے اہم ترین مفادات کے لئے خطرہ بنیں، لیکن جو لوگ اس کے برعکس ہوں انھیں جیل میں جکڑنا اور جرائم کے مطابق سزائیں دینا تو مسلمہ طور پر عدل قرار پاتا ہے حالانکہ یہ بھی وہ آزادی ہی ہے یہاں [illegible] نہیں رہتی جس کا [illegible] غلامی کی صورت میں بھی احترام

(۵) اگر آزادی کا استحقاق بھی بعض شرائط کا پابند ہے یہ ادا کچھ کرنا پھرے مگر اسے پیدائشی آزادی سے نوازا گیا ہے۔

درس عبرت کے طور پر ہم بعض ایسے مغربی اہل علم کے بیانات پر جواب ختم کرتے ہیں جنھوں نے کچھ دیر کے لئے مذہب کو بالائے طاق رکھ کر غلامی کے مسئلے پر تدبر کیا اور پھر اپنے خیالات کو تحریری شکل میں پیش کر دیا۔

اسٹاڈی آف سوشیالوجی میں صفحہ ۲۵۳ پر ہربرٹ سپنسر کہتے ہیں:۔

"یہ تسلیم کر لینا بالکل ممکن ہے کہ جب ایک فریق نے تسلط واقتدار کے باوجود اپنے دشمنوں کو ہضم کرنے کے بجائے اپنا غلام بنا لیا ہے تو اُن کو زندہ چھوڑ دینا ہی ترقی کی طرف ایک قدم ہے۔ غلامی خواہ کتنی ہی بُری ہو تاہم وہ اضافی طور پر اچھی ہے اور بعض حالات میں ہنگامی طور پر وہی سب سے زیادہ قابلِ عمل ثابت ہوتی ہے۔"

سلیوری ان دی رومن امپائر کے مقدمے میں صفحہ ۱۵ پر لارڈ ایکٹن رقم طراز ہیں:۔

"بعض اوقات حالات ہی ایسے رونما ہوتے ہیں کہ اُن کے پیش نظر یہ کہنا نامناسب نہیں ہوتا کہ غلامی بذاتِ خود آزادی کی منزل کا ایک مرحلہ ہے۔"

"رومن امپائر میں غلامی" نامی کتاب میں مسٹر آر۔ ایچ بارو نے غلامی کے مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اسکے دیباچے میں لکھا گیا ہے:۔

"غلامی ایک ایسا لفظ ہے جو سنتے ہی کانوں کو برا لگتا ہے اس لفظ کے کان میں پڑتے ہی گراں بار زنجیروں کی جھنکار کوڑوں کی چٹاخ پٹاخ اور مظلوم غلاموں کی چیخ پکار کا تصور قائم ہو جاتا ہے۔ غلامی کو عموماً اس کے بُرے پہلوؤں کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ لیکن اگر تحقیق کی جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ غلام خواہ کچھ زیادہ مقدس اور پارسا نہ ہوتا ہم اُس کو بھی تہذیب کی ترقی میں کسی حد تک ضرور دخل ہوتا ہے۔ ہم غلامی کے رواج کا خاتمہ کر سکتے ہیں لیکن ہم کو نہ چاہئے کہ عہد گذشتہ کے رواج غلامی کو قطعی طور پر بُرا کہیں اور اس کو بالکل ہی مذموم قرار دیں۔"

ہربرٹ اسپینسر نے اپنی کتاب "اصولِ معاشیات" میں صفائی کے ساتھ تسلیم کیا ہے کہ:۔

"غلامی کے بغیر ریاست کا مرحلہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔"

"مذہب و اخلاق کی انسائیکلوپیڈیا" کی گیارھویں جلد میں مسٹر البرٹ۔ این گلیرٹسن غلامی کے مسئلہ پر نقد و بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اگر غلامی کو اس نظر سے دیکھا جائے کہ وہ قتل کر دینے کا عوض اور بدل ہے تو صرف یہی ایک حیثیت اس بات کی دلیل ہے کہ غلامی اخلاقی ترقی کی طرف ایک پیش قدمی ہے۔"

(یہ اقتباسات اَلرِّقُّ فِی الْاِسْلَامِ (اسلام میں غلامی کی حقیقت) سے لئے گئے)۔

ذبیحے کا مسئلہ

سوال ۲:۔ از سید اسمٰعیل۔ حیدرآباد۔

ذبیحہ جانور سے متعلق آئے دن نئے نئے خیالات کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہر جانور پر خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو۔ بسم اللہ اللہ اکبر کے ذریعے ذبح کیا تو حلال ہو جاتا ہے۔ مثلاً مندر میں دیوی دیوتا کے کے سامنے کا یا کسی پیر یا ولی کے مزار کے سامنے کا یا چوری کا ہو حلال کرنے والا مسلم ہو یا غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، اُس کا ذبیحہ اللہ اکبر کی وجہ سے حلال ہو جاتا ہے۔

براہِ کرم احکامِ الٰہیہ و شریعتِ محمدیؐ کے لحاظ سے کونسا ذبیحہ اور کس کے ہاتھ کا حلال و حرام ہو جاتا ہے؟ بصراحت بیان فرمایا جائے تو مناسب ہوگا۔

الجواب :-

جن خیالات کا آپ نے ذکر فرمایا وہ یا تو کسی جاہل مطلق کے ہو سکتے ہیں یا پھر ایسے عالم کے جس کی عقل ماری گئی ہو۔

معمولی علم و عقل کا مسلمان بھی جانتا ہے کہ کسی عمل کے اسلامی حیثیت سے مستحسن ہونے کی دو شرطیں ہیں ایک یہ کہ وہ صورۃً بھی اسلامی ہدایات کے مطابق ہو دوسری یہ کہ اس کے عقب میں حق پرستی کا جذبہ کام کر رہا ہو۔ ان میں سے ایک شرط بھی غائب ہو گئی تو عمل بیکار رہا۔ کم سے کم اخروی حیثیت سے اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو گی۔

کسی ذبیحے کے حلال ہونے کی شرط جو یہ رکھی گئی کہ اسے اللہ اکبر کہہ کر ذبح کیا جائے تو اس کا منشاء صرف یہ ہے کہ جو نیت اور جذبہ اس قربانی کے پیچھے کام کر رہا ہے وہ لفظوں میں بھی ظاہر ہو جائے۔ اب اگر کوئی شخص نیت تو یہ رکھتا ہے کہ جو جانور وہ ذبح کر رہا ہے اس کی قربانی سے اسے اللہ کے سوا کسی اور پیر، مرشد، دیوی دیوتا وغیرہ کی خوشنودی حاصل ہو جائے تو فقط زبان سے اللہ اکبر کہہ دینا نہ صرف بے معنی ہو گا بلکہ منافقت قرار پائے گا اور ثواب کے بدلے عذاب ملیگا۔

اس کے برخلاف اگر نیت تو اللہ ہی کے لئے ذبح کرنے کی ہو مگر مقامِ ذبح کسی دیوی دیوتا کا استھان یا کسی ولی کا مزار ہو تب بھی اس ذبیحے کو حلال نہیں کہیں گے چاہے ذبح کرنیوالے نے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے اللہ اکبر کا نعرہ مارا ہو۔ یہاں نیت ٹھیک ہے مگر عمل کی صورت اسلامی ہدایات کے خلاف ہے لہٰذا نیت کی بجائے صورت کا اعتبار ہو گا۔

خوب سمجھ لیجئے مشرکین کا ذبیحہ تو کسی طرح جائز نہیں چاہے انھوں نے اللہ ہی کے نام پر ذبح کیا ہو۔ اہل کتاب کافروں کا ذبیحہ جائز ہے لیکن اس میں تین شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ ذبح کا طریقہ اسلامی ہدایات کے خلاف نہ ہو، جیسے کہ آج کل بلادِ مغرب میں مشینوں وغیرہ سے جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ یہ ذبیحے حلال نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ ثبوت طور پر یہ معلوم ہونا چاہئے کہ جانور اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح نہیں کیا جا رہا۔ تیسرے یہ کہ اہل کتاب واقعی اپنے مذہب پر قائم ہوں۔ یہ نہیں کہ جیسے آجکل بہت سے عیسائی اور یہودی بس نسل و قوم کے اعتبار سے نام کی حد تک اہل کتاب رہ گئے ہیں ورنہ مذہب سے انکا عقیدہ اُٹھ چکا ہے اور دہریت و الحاد پر مائل ہو چکے ہیں۔ ان کا بھی ذبیحہ جائز نہیں ہے چاہے ذبح کرتے وقت وہ اللہ اکبر کی پوری تسبیح ہی کیوں نہ پڑھ ڈالیں۔

بعض محققین نے تو یہ بھی قید لگائی ہے کہ جو یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کو اور جو نصرانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں وہ بھی مشرکین ہی کے زمرے میں شامل ہیں، ان کا ذبیحہ حلال نہیں ہو سکتا۔

تاہم چونکہ قرآن و حدیث میں اس کی صراحت نہیں ہے اس لئے آخری رعایت یہی دی جا سکتی ہے کہ اگر یہ لوگ اپنے بگڑے ہوئے دین پر ہی قائم ہوں تب بھی ان کا ذبیحہ حلال مان لیا جائے، لیکن اگر ملحد ہو چکے ہیں تو فقط نام کے عیسائی یا یہودی ہونے سے ذبیحہ حلال نہیں ہو گا۔

یہ ہیں احکام قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق۔ جو لوگ ان سے مختلف باتیں ہانکتے ہیں ان کی پیروی نہ کیجائے یہ زمانہ تو خصوصیت سے اس احتیاط کا متقاضی ہے کہ بہت معتبر علماء سے مسئلے پوچھے جائیں۔ ہر لمبی داڑھی اور صوفیانہ لباس والے کو عالم نہ مان لیا جائے۔ آج کل ذہنی کجروی اور فکری گمراہی بہت عام ہے۔ الھم احفظنا۔

زکوٰۃ اور دنیاوی ادارے

سوال ۳:- از ابو الکاظم محمد حنیف قاسمی۔ مالیگاؤں۔

ہمارے یہاں شہر میں ایک ادارہ ہے جو تقریباً آج سے چھ سال قبل چند نوجوانوں کی کاوش سے قائم ہوا ہے اسکے قیام کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ شہر کے جو طلبہ بلا تفریق قوم و ملت پرائمری یا سرکاری یا کسی انگریزی اسکول میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور غربت و افلاس کی وجہ سے ان کے والدین تعلیم کے اخراجات کے خود کفیل نہیں بن سکتے ان کی امداد کرتا ہے اور تقریباً تمام ضروریات و اخراجات برداشت کرتا ہے لیکن بایں ہمہ اس ادارہ نے آمدنی اور فراہمی مال کا

ذریعہ اختیار کیا ہے وہ بظاہر نامناسب اور شرعی تقاضے کے بالکل خلاف ہے۔ مثال کے طور پر سنگیت پروگرام ڈانس کی محفلیں، کشتی اور قوالی کا مقابلہ وغیرہ، ان پروگراموں سے جو آمدنی آتی ہے اس کو تعلیم اور طلبہ پر صرف کرتے ہیں۔

کیا ایسے ادارے مسلمانوں کی زکوٰۃ، صدقات، عطایا اور چرم قربانی وغیرہ کے مستحق ہیں؟ اور کیا ایسے اداروں کی زکوٰۃ، عطایا صدقۃ الفطر وغیرہ سے امداد کرنے والوں کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟ اپنی گذشتہ روایت کو باقی رکھتے ہوئے ہر سال کی طرح اس سال بھی انعامی مقابلہ کی کارروائیاں بہت پہلے شروع ہیں جس میں ریڈیو، سائیکل، سلائی مشین وغیرہ بطور انعام رکھی گئی ہیں امید کہ آپ تفصیل کے ساتھ اس مسئلے کی شرعی حیثیت پر کلام فرمائینگے

الجواب:-

پہلی بات تو یہی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ صدقاتِ واجبہ — زکوٰۃ اور فطرہ وغیرہ — حنفی مسلک کی رو سے کسی مدرسے کو دیدینے سے ادا نہیں ہوتے، چاہے وہ خالص دینی ہی تعلیم کا مدرسہ کیوں نہ ہو۔ یہ ادائگی اسی صورت میں شرعی جواز حاصل کر سکتی ہے جب کہ پوری طرح یہ اطمینان حاصل ہو جائے کہ صدقے کی رقم ضرورت مند طلباء کی ذاتی ضروریات پر صرف ہوگی۔ اس معاملہ میں ضروریات کا دائرہ اس حد تک وسیع نہیں ہے کہ استادوں کی تنخواہ یا کمروں کی تعمیر وغیرہ میں بھی مالِ زکوٰۃ کا صرف کرنا جائز سمجھ لیا جائے۔ انتظامی سلسلہ میں جو بھی اخراجات ہونگے وہ اگرچہ بالواسطہ مقصدِ تعلیم ہی کے مقدمات ولوازمات ہیں اور ان کا فائدہ طلباء ہی کو پہنچےگا لیکن انھیں زکوٰۃ کا مصرف نہیں مانا گیا۔

جب صورتِ مسئلہ یہ ہو تو کسی ایسی درس گاہ کو مالِ زکوٰۃ دیدینا کیسے درست ہو سکتا ہے جس کے بارے میں نہ تو یہ طے ہو کہ وہاں خالصتہً دینی ہی تعلیم دی جائے گی نہ اس کی کوئی قید ہو کہ رقم کو طلباء کی ذاتی ہی ضروریات پر خرچ کیا جائے گا۔

دوسری بات یہ سمجھ لینے کی ہے کہ گانا بجانا غیر اسلامی اُمور میں سے ہے۔ جو لوگ اس کی پروا نہیں کرتے کہ اچھے مقاصد حاصل کرنے کے لئے وسائل بھی پاک اور حلال ہونے چاہئیں وہ اگر قرآنی تعلیم کا مدرسہ بھی کھولیں تو یہ کام دینی نہیں ہوگا دنیاوی ہوگا۔ جس ادارے کا آپ نے ذکر کیا وہ قطعی دنیاوی نوعیت کا ہے۔ اسے اس سے کوئی بحث نہیں ہے کہ اسکولوں میں کس قسم کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ اس کی بلا سے وہاں شرک و زندقہ اور خدا فراموشی ہی کا زہر کیوں نہ پلایا جا رہا ہو مگر وہ تو صرف اس دنیاوی مقصد سے کہ قوم کے بچے پڑھ لکھ کر دو پیسے کمانے کے قابل ہو جائیں اور جہالت کا الزام ان پر نہ آئے غریب لڑکوں کی مالی مدد کر رہا ہے۔ اس خدمت کا کوئی بنیادی تعلق دین سے نہیں۔ اس طرح کی قومی خدمات تو تمام مشرک و کافر اقوام بھی کرتی ہیں اور ہم سے بڑھ چڑھ کر کرتی ہیں۔ اس کی اساس فقط مادہ پرستی اور دنیاداری پر ہے۔ یہ اساس جوہری اعتبار سے اسلامی طرزِ فکر کی حریف اور خدا پرستی کی دشمن ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسی لئے اس ادارے کو ذرائع کے حلال و حرام ہونے سے کوئی بحث نہیں وہ بلا تکلف گانے بجانے اور ناچ رنگ سے روپیہ کمانے میں کوشاں ہے۔ اس واضح صورتِ حال کے باوجود اگر کوئی مسلمان مالِ زکوٰۃ اور چرمِ قربانی اسے دیتا ہے تو سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ یا تو وہ عقل سے عاری ہے یا جہالت کا شکار ہے۔

ہم سمجھتے ہیں یہ ادارہ خود بھی اس کا مدعی نہ ہوگا کہ وہ رضائے الٰہی کی خاطر جد و جہد کر رہا ہے پھر بھلا ان لوگوں کی ناسمجھی میں کیا شک ہو سکتا ہے جو اپنا مالِ زکوٰۃ اسکے حوالے کر دیں۔ زکوٰۃ ایک عبادت ہے۔ اس کے مصارف شریعت نے معین فرما دیئے ہیں۔ اس نوع کے ادارے تو کسی طرح بھی زکوٰۃ کے اہل نہیں۔ جو انھیں زکوٰۃ دیکر یہ سمجھےگا کہ ذمہ داری سے بری ہو گیا وہ اس نادان شخص کے مانند ہوگا جس نے اپنا مال کنویں میں پھینک دیا اور یہ اُمید باندھ کر بیٹھا کہ کنویں سے اس کا مال نفع لیکر برآمد ہوگا۔

لیکن اگر اس ادارے کی طرف سے زکوٰۃ اور چرمِ قربانی کے لئے اپیلیں شائع ہوتی ہیں تو اس کی قباحت دوہری ہو گئی۔ ایک تو یہ کہ اس نے آمدنی کے حرام ذرائع اختیار کئے ہیں دوسرے یہ کہ ایک خالصۃً دنیاوی کام کو دینی کام باور کرانا چاہا یہ بڑی جسارت اور گمراہی کی بات ہے۔

جواب کا خلاصہ یہ کہ اس طرح کے اداروں کو صدقاتِ واجبہ ادا کرنا صدقات کو ضائع کر دینا ہے۔ بلکہ شاید عذابِ مزید کا باعث ہو کیونکہ غیر اسلامی ذرائع سے دولت کمانیوالوں کی مدد کرنا بجائے خود مستقل گناہ ہے چہ جائیکہ زکوٰۃ کے پاکیزہ مال سے مدد کی جائے۔

فاران کا توحید نمبر سیکڑوں صفحات کا یہ نمبر ماضی قریب میں بڑی شہرت پا چکا ہے۔ اب پھر شائع کیا گیا ہے۔ بدعت و زندقہ کے رد اور سنت کے اثبات میں بے نظیر چیز ہے۔ چوٹی کے علماء کے مضامین سے مزین ہے۔ ساڑھے چار روپے (مجلد چھ روپے) شائقین فوراً طلب کریں ورنہ پھر پہلے کی طرح ختم ہو جائے گا اور فرمائشیں بیکار کرنی پڑیں گی۔

باندیوں کا مسئلہ (الدُّرُّ الثمین) جہاد میں ہاتھ آئی ہوئی عورتوں کو باندی بنا کر رکھنے کی دینی و علمی حیثیت۔ کتاب میں مصنف کا ایک خط اور مولانا ابو الکلام آزادؒ کا جواب بھی شامل ہے۔ ڈیڑھ روپیہ

فارابی معلم ثانی حکیم ابو النصر فارابیؒ کے علم و فضل اُن کی سوانح اور کمالات، تجدید فلسفہ و منطق کے مفصل و مکمل حالات۔ قیمت پونے دو روپے۔

محمد رسول اللہ ﷺ مشہور مصری مصنف توفیق الحکیم کی کتاب کا عمدہ اُردو ترجمہ۔ مکالمے کے انداز میں لکھی ہوئی حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ بے حد دلچسپ اور پُر کیف۔ قیمت پانچ روپے۔

ابو بکر صدیقؓ مصنفہ:۔ محمد حسین ہیکل۔ ترجمہ:۔ شیخ محمد احمد پانی پتی۔
قیمت پانچ روپے

عمر فاروق اعظمؓ مصنفہ:۔ محمد حسین ہیکل۔ ترجمہ:۔ حبیب اشعر۔ نو روپے

خالد سیف اللہؓ اسلام کے عظیم مجاہد حضرت خالد بن ولیدؓ کی سوانح۔ سوا دو روپے۔

امام احمد بن حنبلؒ مصنفہ:۔ استاد ابو زہرہ۔ ترجمہ:۔ عمر فاروق ایم۔ اے
قیمت نو روپے

اشرف الجواب مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طرف سے بعض سوالوں کے اہم جواب۔
مکمل دو حصے ساڑھے چار روپے۔

القاموس الجدید ایک رفیع الشان اُردو عربی ڈکشنری بیشمار اُردو الفاظ کے عربی مترادفات کے علاوہ اس میں ضرب الامثال محاورات اور زبان کے نئے تغیرات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ضروری مقامات پر تصاویر کے ذریعہ مفہوم کو واضح کیا گیا ہے۔ مفید، بیش قیمت اور علیل العقد عربی سیکھنے والوں کے لئے خاص تحفہ ہے۔ قیمت سات روپے

حیات انورؒ فخر المحدثین مولانا انور شاہ صاحبؒ کا مفصل تذکرہ۔ آپ کے علمی کمالات کا نقشِ جمیل
قیمت چار روپے

منہاج العابدین (اُردو) امام غزالیؒ کی سب سے آخری تصنیف جو آپ کی پوری زندگی کی تعلیمات کا خلاصہ اور تصوف کا نچوڑ ہے۔ مجلد آٹھ روپے

التشبہ فی الاسلام غیر اقوام کی مشابہت کو اسلام کس نظر سے دیکھتا ہے۔ مکمل ساڑھے چار روپے

آئینۂ نماز صرف نماز ہی کے نہیں بلکہ پانچوں ارکانِ اسلام کی تفصیل مع مسائل ضروریہ۔
قیمت ڈیڑھ روپیہ

مکتبہ تجلی دیوبند (یو۔پی)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

(ماخوذ از ایشیا لاہور)

غلافِ کعبہ

اس کی تاریخ اور شرعی حیثیت کے متعلق شبہات کا ازالہ

اس سال ایک مدت دراز کے بعد پاکستان کو غلاف کعبہ تیار کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے اس سے پہلے ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۷ء) میں ایک مرتبہ اس ملک سے غلاف بنوا کر بھیجا گیا تھا اور ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۲ء تک ہندو پاکستان کے لوگوں کو اس خدمت کا شرف حاصل ہوتا رہا۔
اس کے بعد اب یہ تیسرا موقع ہے کہ اس ملک کے لوگ یہ سعادت حاصل کر رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس پر مسلمانانِ پاکستان میں عام جوشِ مسرت پایا جاتا ہے۔

شرعی حیثیت

قرآن مجید سے ثابت ہے کہ خانہ کعبہ وہ عمارت ہے جواب سے چار ہزار پہلے اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے ملکر تعمیر کی تھی اور یہ بات بھی قرآن میں بصراحت ارشاد ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسکو اپنا گھر قرار دیا اور ہمیشہ کے لئے قبلۂ اہل توحید بنادیا یہ امور تو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہیں اسلئے ان پر کسی بحث و گفتگو کی حاجت نہیں۔ البتہ یہ بات عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ اس پر غلاف چڑھانے کی شرعی حیثیت کیا ہے اور اس میں کیا حکمت ملحوظ رکھی گئی ہے بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ کوئی بدعت ہے جو بعد کے کسی زمانے میں شروع ہوئی ہے یہ خیالات بھی بعض ذہنوں میں پائے جاتے ہیں کہ اس عمارت پر غلاف چڑھانا بے جا اسراف ہے کیوں نہ اتنا روپیہ غریب انسانوں کی تن پوشی پر صرف کیا جائے۔ یہ شبہات بھی بعض حلقوں کی طرف سے ظاہر کئے گئے ہیں کہ اس غلاف کے احترام اور اس کی روانگی کے اہتمام اور اس کی نمائش اور زیارت میں شرک کا شائبہ ہے یہ غلط فہمیاں چونکہ واقفیت کی کمی کے باعث لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں اس لئے سب سے پہلے ہم ان کو رفع کرینگے۔

یہ بدعت نہیں

کسی فعل کے متعلق جب معتبر و مستند ذرائع سے ثابت ہو جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کیا ہے۔ یا وہ آپؐ کے سامنے ہوا ہے اور آپؐ نے اس سے منع نہیں فرمایا ہے، تو اس کے بارے میں یہ گمان کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ بدعت ہے کعبہ کے متعلق یہ بات احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ فتح مکہ سے پہلے جبکہ یہ گھر کفار قریش کی تولیت میں تھا۔ اس پر غلاف چڑھا ہوا تھا۔ اور فتح مکہ کے بعد جب وہ حضورؐ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تولیت میں آیا تو نہ صرف یہ کہ آپؐ نے اسے باقی رکھا۔ بلکہ غلاف چڑھانے کے طریقے پر خود عمل کیا۔ اور غلاف چڑھانے کے اس فعل کا ذکر تعظیم و تکریم کے ساتھ فرمایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ!

"رمضان کے روزے فرض ہونے سے پہلے مسلمان یوم عاشورؔ (۱۰ محرم) کا روزہ رکھا کرتے تھے اور یہ وہ دن تھا جب خانۂ کعبہ پر غلاف چڑھایا جاتا تھا" (بخاری کتاب الحج)

اور حضرت عبداللہ بن مسعود ہجرت سے پہلے کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"میں خانۂ کعبہ کے پردوں میں چھپا ہوا تھا کہ تین آدمی آئے ایک قبیلۂ ثقیف کا تھا اور دو اس کے قریشی داماد تھے تینوں بڑے موٹے تازے تھے مگر عقل و فہم سے عاری۔ انہوں نے آپس میں کچھ باتیں کیں۔ پھر ایک نے کہا۔ تمہارا

کیا خیال ہے یہ باتیں جو ہم نے کی ہیں کیا اللہ تعالیٰ نے اُن کو سُن لیا ہے؟ دوسرے نے کہا میرا خیال ہے کہ جب ہم زور سے بات کرتے ہیں تو اللہ اس کو سُن لیتا ہے اور جب آہستہ بولتے ہیں تو وہ اسے نہیں سُنتا۔ تیسرے نے کہا۔ اگر وہ کچھ سنتا ہے تو پھر ساری باتیں سُنتا ہے۔"

(مسند احمد مرویات ابن مسعودؓ)

یہ دونوں روایات ظاہر کرتی ہیں کہ فتح مکہ سے پہلے اہل عرب خانۂ کعبہ پر غلاف چڑھایا کرتے تھے۔ اس کے بعد حضرت انس بن مالک کی حسب ذیل روایت ثابت کرتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ فتح کر لیا تو آپؐ نے زمانۂ جاہلیت کے اس طریقے کو برقرار رکھا۔ حالانکہ جاہلیت کی جتنی یادگاریں اسلام کے خلاف تھیں اُن کو آپؐ نے بلا تاخیر مٹا دیا تھا۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے اور آپؐ سر پر خود پہنے ہوئے تھے۔ جب آپؐ نے خود اتارا تو ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ ابن خطل کعبہ کے پردوں سے لپٹا کھڑا ہے حضورؐ نے فرمایا اسے قتل کردو"

(بخاری۔ کتاب المغازی ابوداؤد۔ کتاب الجہاد نسائی۔ کتاب الحج)

اس روایت کی تائید حضرت سعد بن ابی وقاص کی یہ روایت کرتی ہے جو ان کے صاحبزادے حضرت مصعب بن سعد نے نقل کی ہے۔

"جب فتح مکہ کا دن آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں کو امان دی۔ مگر چار مردوں اور دو عورتوں کے متعلق فرمایا کہ ان کو قتل کردو۔ خواہ وہ کعبہ کے پردوں ہی سے چمٹے ہوئے ہوں" (نسائی۔ کتاب تحریم الدم)

ان روایتوں کے باوجود یہ شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ شاید عین فتح کے موقع پر حضورؐ نے غلاف نہ اُتروایا ہو اور بعد میں اسکو اُتروا دیا ہو۔ لیکن ایک دوسری روایت اس شبہ کو رفع کردیتی ہے اس میں حضرت عروہ بن زبیر فتح مکہ کا قصہ بیان کرتے ہوئے ذکر کرتے ہیں کہ اس روز حضرت سعد بن عبادہ نے ابوسفیان کو مخاطب کرکے کہا۔ الیوم یوم الملحمۃ الیوم تستحل الکعبۃ (آج قتل و خون کا دن ہے۔ آج کعبہ حلال کردیا جائے گا) اس بات کی شکایت ابوسفیان نے جاکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا۔

"سعد نے غلط کہا۔ بلکہ آج تو وہ دن ہے جس میں اللہ تعالےٰ کعبہ کی عظمت قائم فرمائے گا۔ اور وہ دن ہے جب کعبہ پر غلاف چڑھایا جائے گا" (بخاری۔ کتاب المغازی۔ غزوۃ الفتح)

آخری فقرے کی تشریح کرتے ہوئے علامہ ابن حجر فتح الباری میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"اس ارشاد سے حضورؐ کا مطلب یہ تھا کہ ہم کعبہ پر غلاف چڑھائیں گے اور ایسا ہی ہوا"

اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے بلکہ حضورؐ کا یہ ارشاد اس حقیقت پر بھی دلالت کرتا ہے کہ کعبہ پر غلاف چڑھانا اس کے تعظیم کے مقتضیات میں سے ہے اسی بناء پر علماء امت اس کے جواز پر متفق ہیں علامہ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

"کعبہ کے لئے وہ تعظیم ہے جو دوسری مساجد کیلئے نہیں ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ کعبہ کو حریر و دیبا سے ڈھانکنا جائز ہے مگر مساجد پر اس طرح کے پردے ڈالنے کے جواز میں اختلاف ہے کعبے کو دیبا کے غلاف سے ڈھانکنے کے جواز پر اجماع ہے"

(فتح الباری۔ کتاب الحج۔ باب کسوۃ الکعبہ)

اور یہی بات علامہ بدرالدین عینی بھی ایک حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

"اس میں غلاف کعبہ کے مشروع ہونیکی دلیل پائی جاتی ہے" (عمدۃ القاری۔ کتاب الحج۔ باب کسوۃ الکعبہ)

اسراف بے جا کا شبہ

رہا یہ شبہ کہ اس میں بے جا اسراف ہے کیوں نہ یہی کپڑا غریبوں کی تن پوشی پر صرف کیا جائے تو اس کا جواب ہمیں اس واقعہ میں مل جاتا ہے جو بخاری۔ ابن ماجہ اور طبرانی نے نقل کیا ہے۔ واقعہ

پوچھے کہ ایک صاحب ابو وائل۔ خانۂ کعبہ کے کلید بردار شیبہ کے پاس کچھ روپے لے کر پہنچے اور اس مقدس گھر کے لئے ہدیہ کے طور پر پیش کئے۔ شیبہ نے پوچھا۔ کیا یہ تم تجارت سے دے رہے ہو۔؟

انہوں نے جواب دیا کہ یہ ایک اور شخص کا ہدیہ ہے جو اس نے میرے سپرد کیا تھا۔ میرا اپنا مال ہوتا تو میں ہدیہ نہ کرتا۔ اس پر شیبہ نے کہا جہاں تم بیٹھے ہو اسی جگہ (یعنی خانۂ کعبہ کے اندر) ایک دفعہ حضرت عمرؓ بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے کہا میں کعبہ کے خزانے میں رتی بھر سونا اور چاندی بھی نہ رہنے دوں گا۔ سب کچھ فقراء مسلمین میں تقسیم کردوں گا۔ میں نے کہا آپ کے دونوں پیشرووں (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ) نے تو ایسا نہیں کیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے یہ سُنکر کہا کہ وہ تو یقیناً راست رو لوگ تھے میں انہی کے نقش قدم پر چلوں گا۔

اسی سے ملتی جلتی ایک اور روایت عبدالرزاق نے حسن بصری سے نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ کعبہ کے خزانے کو راہِ خدا میں خرچ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے حضرت اُبی بن کعب کے سامنے انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا تو انہوں نے کہا آپ کو یہ کام کرنے کا حق نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا یہ کیوں! انہوں نے جواب دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام ہدیوں اور نذر کے اموال کو جُوں کا تُوں رہنے دیا تھا جو زمانۂ جاہلیت سے کعبہ کے خزانے میں چلے آرہے تھے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ اگر سونے چاندی کے وہ ظروف تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی رہنے دیئے جو خانۂ کعبہ کے لئے زمانۂ جاہلیت میں ہدیۃً دیئے گئے تھے۔ تو غلافِ کعبہ پر جو مال خرچ ہوتا ہے وہ اسراف کی تعریف میں کیسے آسکتا ہے حضورؐ کے اس فعل ہی کی وجہ سے علماء اسلام میں کبھی خانہ کعبہ کو ریشمی غلاف پہنانے کے جواز پر اختلاف نہیں ہوا۔ صحابہ وتابعین کے زمانے سے ریشمی غلاف پہنانے کا یہ عمل چلا آرہا ہے۔ اور اس مسئلے میں کسی کی اختلافی رائے منقول نہیں ہوئی۔

شرک کا شبہ

اس کے بعد یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ کعبے پر غلاف چڑھانا تو درست، مگر کیا وہ غلاف جو کعبے کے لئے تیار کیا گیا ہو۔ اس کا بھی مستحق ہے کہ اس کا احترام کیا جائے اس کی زیارت اور مشایعت کی جائے اور اسے بڑے اہتمام کے ساتھ روانہ کیا جائے؟

کیا ان افعال میں شرک نہیں پایا جاتا؟ یہ غلاف آخر ایک کپڑا ہی تو ہے محض اس بنا پر کہ یہ کعبے پر چڑھانے کے لئے تیار کیا گیا ہے اُس کی تعظیم وتکریم کیسے جائز ہوگئی!

اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے پہلے اس امر پر غور کرنا چاہئیے کہ خانۂ کعبہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ پتھروں کی بنی ہوئی ایک عمارت ہے معاذ اللہ وہ نہ خود خدا ہے نہ خداوندِ عالم اس میں رہتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسے تمام دنیا کے اہل توحید کا قبلہ بنادیا جسکی طرف رُخ کرکے ہر مومن قیام وقعود اور رکوع وسجود کرتا ہے دوسرے مقامات پر تو کعبہ سامنے نہیں ہوتا۔ لیکن مسجد حرام میں تو سب کی آنکھوں کے سامنے وہ موجود ہوتا ہے اور مسجد کے اندر ہر طرف سے لوگ اسی کی طرف رُخ کرکے ارکانِ نماز ادا کرتے ہیں جن میں رکوع بھی شامل ہے اور سجدہ بھی۔ پھر حج اور عمرے میں اس عمارت کے گرد طواف کیا جاتا ہے، اور ہر طواف کی ابتدا حجرِ اسود کو چوم کرکی جاتی ہے جو ظاہر ہے کہ ایک پتھر کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کیا ان میں سے کسی فعل کو بھی شرک کہا جاسکتا ہے۔

کعبے کی مرکزیت

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شرک کی جڑ کاٹنے کے لئے جو طریقہ اختیار فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ اظہار عبودیت کی جو جو صورتیں دنیا میں پائی جاتی ہیں اور انسانی فطرت پرستش کی جن جن شکلوں کا تقاضہ کرتی ہے ان سب کو ہر دوسری جگہ ممنوع ٹھیرادیا اور صرف ایک خانۂ کعبہ کو اپنا گھر قرار دیکر حکم دے دیا کہ ان سب صورتوں سے یہاں ہمارے حضور بندگی بجالاؤ۔ اپنے معبود کے سامنے

رکوع و سجود کرنا چاہتے ہو تو اس گھر کی طرف رخ کر کے جھکو، اور کسی دوسری چیز کے آگے نہ جھکو طواف کرنا چاہتے ہو تو یہ ہمارا گھر ہے، اس کا طواف کرو۔ کسی اور چیز کا طواف نہ کرو آستانہ بوسی کرنا چاہتے ہو تو حجر اسود ہمارا سنگ آستاں ہے اسے چومو اور کسی دوسرے آستانے کو نہ چومو۔ معبود کی چوکھٹ سے چمٹ کر دعائیں کرنا چاہتے ہو تو ملتزم ہماری چوکھٹ ہے اس سے لپٹو اور گڑگڑا کر دعائیں مانگو۔ تیرتھ یاترا کرنا چاہتے ہو تو یہ تمہارے لئے تیرتھ ہے اس کی زیارت کے لئے دنیا بھر سے کھچ کھچ کر آؤ۔ اور ہر دوسرے تیرتھ کی یاترا چھوڑ دو اپنے معبود کی بارگاہ پر چادریں چڑھانا چاہتے ہو تو یہ ہماری بارگاہ ہے چادر چڑھانے کا جو جذبہ تمہارے دل میں ہے یہاں چادر چڑھا کر اس کی تسکین کرو اور پھر کسی دوسری جگہ چادریں چڑھاتے نہ پھرو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا میں ایک گھر کو اپنی طرف نسبت خاص دیکر پرستش کی ان ساری شکلوں کو جو مشرکین اپنے بناوٹی معبودوں کے لئے اختیار کرتے تھے ہر آستانے پر حرام کر دیا اور اہل توحید کو حکم دیا کہ وہ ساری شکلیں ہمارے اس آستانے پر برتی جائیں اور بس اسی جگہ کے لئے مختص ہیں یوں خانۂ کعبہ کا حکم ہر دوسرے مقام سے مختلف ہو گیا ہے جو کچھ دوسری جگہ شرک ہے۔ وہ یہاں توحید ہے۔

ایسا ہی معاملہ ان اشیاء کا ہے جو اللہ تعالیٰ کی خاطر خانۂ کعبہ میں پیش کرنے کے لئے لے جائی جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو شعائر اللہ (خدا پرستی کی نشانیاں) قرار دیا ہے اور ان کے احترام کا حکم دیا ہے۔

> اے لوگو جو ایمان لاتے ہو، اللہ کے شعائر کو حلال نہ کر لو۔ اور نہ ماہ حرام کو، اور نہ ہدی کو اور نہ ان جانوروں کو جو ہدی کے گلے میں لٹکائے جاتے ہیں اور نہ بیت الحرام کے قصد سے سفر کرنے والوں کو (المائدہ۔ ۲) اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لئے شعائر اللہ میں سے قرار دیا ہے اور جو شخص شعائر اللہ کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ کی نشانی ہے (الحج ۳۲)

شعائر اللہ کی حیثیت

دیکھئے ماہ حرام کیا ہے؟ مہینوں میں سے ایک مہینہ ہی تو ہے مگر کعبے کی نسبت نے اسے شعائر اللہ میں داخل کر دیا۔ ہدی کے اونٹ آخر جانوروں سوا اور کیا ہیں، مگر چونکہ وہ کعبے کی طرف نذر کے طور پر لیجائے جاتے ہیں اسلئے وہ بھی شعائر اللہ میں شمار ہو گئے۔ اہل عرب قدیم زمانے میں ان اونٹوں کے گلے میں جوتوں کے ہار لٹکا دیتے تھے تاکہ دور سے ہی دیکھکر ہر شخص معلوم کر لے کہ یہ ہدی کے اونٹ ہیں یہ ہار بھی شعائر اللہ بن گئے کیونکہ انہیں اللہ کے گھر سے نسبت نصیب ہو گئی اب ان شعائر کی تعظیم و تکریم ان اشیاء کی تعظیم و تکریم نہیں بلکہ اس نسبت کی تعظیم و تکریم ہے جو انھیں اللہ کے گھر سے حاصل ہو چکی ہے ان کی تعظیم کو اللہ تعالیٰ اس بات کی علامت قرار دے رہا ہے کہ جو شخص ایسا کرتا ہے اس کے دل میں تقویٰ ہے اس کے بعد یہ سمجھنے میں کیا مشکل ہے کہ جو کپڑا کعبے پر غلاف چڑھانے کے لئے تیار کیا جاتا ہے اس کا احترام بھی ایک کپڑے کا احترام نہیں بلکہ اس نسبت کا احترام ہے جو اسے کعبے کے ساتھ حاصل ہو گئی ہے اسے دیکھنے کے لئے جو شخص بھی آتا ہے اسے اللہ کے گھر کی محبت کھینچکر لاتی ہے نہ کہ ایک کپڑے کو دیکھنے کی خواہش۔ اسے بیت اللہ کی طرف بھیجنے کے لئے جو مشایعت کی جاتی ہے وہ اس شوق کا ایک مظہر ہے جو مسلمان خود بیت اللہ کی زیارت کے لئے اپنے دلوں میں پاتے ہیں۔ اس حد تک جو کچھ کیا جائے وہ تو شرک کی تعریف میں نہیں آتا۔ البتہ اس سے تجاوز کر کے اگر کوئی شخص غلاف کو چومے[1] اور اس کا طواف کرے اور

[1] ہمیں اس ایک آئیٹم میں اختلاف ہے کسی شے کو ازراہ عقیدت و محبت چوم لینا ہمارے نزدیک ایسا فعل نہیں ہے جس پر بدعت یا معصیت کا اطلاق ہو سکے اسے بدعت اسی صورت میں قرار دیا جا سکتا ہے کہ اسے معمول بنا لیا جائے یا کم سے کم ضوابط احترام میں شامل کیا جائے کچھ لوگ اذان کے وقت انگوٹھے چومتے ہیں یہ یقیناً بدعت ہے کیونکہ اس کا تعلق کسی وقتی جذبے سے نہیں رہا [illegible]

ہیں سے چمٹ کر روئیں، مانگیں اور اس کی طرف رخ کر کے رکوع و سجود کرنے لگے تو یہ بلاشبہ شرک ہوگا۔ کیونکہ یہ سب امور صرف اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں غلاف کے کپڑے کو اللہ نے ایسا کوئی مقام نہیں دیا ہے۔

غلاف کعبہ کی تاریخ

اب ہم مختصراً یہ بیان کریں گے کہ کعبہ پر غلاف چڑھانے کی ابتدا کب ہوئی اور اس وقت سے آج تک اس کی تاریخ کیا رہی ہے۔ اس تاریخ کے مآخذ حسب ذیل ہیں۔

(۱) فتح الباری شرح صحیح بخاری، علامہ ابن حجر (۲) سیرۃ ابن ہشام (۳) اخبار مکہ، محمد بن عبداللہ ازرقی (۴) شفاء الغرام تقی الدین الفاسی (۵) الاعلام قطب الدین الحنفی (۶) تاریخ الکعبہ، عبداللہ باسلامہ (۷) مرآۃ الحرمین، ابراہیم رفعت پاشا۔

فتح مکہ سے پہلے

غلاف کے بارے میں زمانۂ قدیم کی تاریخ کا کوئی مرتب اور معتبر ریکارڈ موجود نہیں ہے لیکن اس زمانے کی جو روایات علماء اسلام تک پہنچی ہیں ان میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کعبے پر غلاف چڑھایا تھا اس کے بعد صدیوں تک تاریخ خاموش ہے پھر یہ ذکر ملتا ہے کہ عدنان نے یہ خدمت انجام دی۔ اس کے بعد پھر کئی صدی تک کی تاریخ غائب ہے تیسرا شخص جس کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس نے سرخ رنگ کی دھاری دار یمنی کپڑے (الوصائل) کا مکمل غلاف کعبے پر چڑھایا وہ یمن کا ایک بادشاہ اسعد تھا جس کا زمانہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دو سو برس پہلے گزرا ہے۔

غلاف کعبہ کی مسلسل تاریخ ہم کو اس وقت سے ملتی ہے جب خانہ کعبہ کا انتظام قبیلۂ قریش کے ہاتھوں میں آیا۔ اس قبیلے کی روایات زمانہ اسلام تک محفوظ رہی ہیں، اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے اس نے انتظام سنبھالا، اس کے مختلف خاندان ہر سال باری باری سے کعبہ پر غلاف چڑھایا کرتے تھے۔ پھر بنی مخزوم کے ایک سردار ابوربیعہ نے یہ طے کیا کہ ایک سال غلاف وہ چڑھایا کرے گا۔ اور ایک سال کا غلاف قریش کا کوئی خاندان اپنی طرف سے چڑھائے۔

اس کے علاوہ زمانہ جاہلیت میں دستور تھا کہ عرب کے مختلف قبیلے اور قبائلی سردار جب زیارت کے لئے آتے تھے تو کعبے پر لٹکانے کے لئے طرح طرح کے پردے لاتے تھے جتنے لٹکائے جا سکتے تھے اتنے لٹکا دیئے جاتے اور باقی کعبے کے خزانے میں رکھ دیئے جاتے تھے جب کوئی پردہ بوسیدہ ہو جاتا تو اس کی جگہ دوسرا پردہ لٹکا دیا جاتا تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن کا واقعہ ہے کہ حضورؐ کی دادی کے ایک صاحبزادے (غالباً حضرت عباس بن عبدالمطلب) گم ہو گئے تھے۔ انہوں نے نذر مانی کہ اگر بچہ مل گیا تو وہ کعبہ پر ریشمی غلاف چڑھائیں گی جب وہ مل گئے تو انہوں نے اپنی نذر پوری کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) عقیدے سے ہے عقیدے کے لئے شرعی دلیل چاہیئے دلیل موجود نہیں تو اسے بدعت ہی قرار دیں گے لیکن کسی محبوب یا محترم شے کو فرط شوق میں بے ساختہ چوم لینا بدعت و معصیت نہیں ہو سکتا جب تک شریعت سے یہ بوسہ ممنوع قرار نہ پائے والدین بچوں کو چومتے ہیں شوہر بیوی کا بوسہ لیتا ہے یہ فعل عقیدے پر مبنی نہیں ہوتا اس کا تعلق تو طبعی داعیے سے ہے جو محل اور موقع کے فرق سے حلال بھی ہوتا ہے اور حرام بھی۔ اسے طواف اور رکوع و سجود جیسے خالص تعبدی افعال کی صف میں رکھ کر علی الاطلاق بدعت و شرک کا حکم لگا دینا ہماری نظر میں زیادتی ہے۔ ہمیں اگر غلاف کعبہ کا کوئی ٹکڑا مل جائے تو ضرور آنکھوں سے لگائیں گے اور شاید چوم بھی لیں۔ ہاں اس فعل کا تعلق عقیدے سے نہیں ہوگا اُس جذبۂ شوق سے ہوگا جو بحیثیت مسلمان ہم اپنے اندر پاتے ہیں ہمیں یقین ہے کہ غلاف کے چومنے کو شرک کے زمرے میں مولانا مودودی نے اس کی غالباً اور روز ہئیت و تفصیل کے پیش نظر شامل کیا ہے یعنی عام بات یہی ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی اس طرح کے افعال کو رواج مستقل بنا لیتے ہیں بیشک غلاف کے چومنے کو رواج بنا لینا اور بار بار اس حرکت کو دہرانا بدعت ہوگا۔ فقط اتنی سی بات بدعت نہیں ہو سکتی کہ ایک جذباتی آدمی پہلی بار غلاف کعبہ کو نظروں کے سامنے پائے اور فرط جذبات میں بوسہ دے بیٹھے۔ اس حرکت سے روکنا بھی درست کیونکہ دوسرے لوگ اگر بھیڑ چال چل نکلے تو یہ بوس و کنار مستقل رسم بن جائیگا اور ایسی رسم کا بدعت ہونا سراسر حق۔ لیکن ایک فقیہ پر یہ بات مخفی نہیں کہ جو افعال کسی مفسدے کا اندیشہ اپنے اندر رکھتے ہوں وہ بجائے خود ناجائز

اور سفید رنگ کا ریشمی غلاف کعبے پر چڑھایا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کعبے پر ریشم کا غلاف چڑھایا گیا۔

حضورؐ کی نبوت سے پانچ سال پہلے جب قریش نے کعبہ کی از سر نو تعمیر کی تو پورے قبیلے نے بڑے اہتمام سے کعبہ پر غلاف چڑھایا۔

ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے کہ قبیلۂ بنی سُلَیم کے ایک صاحب اپنی ماں کے ساتھ زیارت کعبہ کے لئے گئے ہوئے تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں انہوں نے کعبے پر مختلف قسم کی اور مختلف رنگوں کی چادریں لٹکی ہوئی دیکھی تھیں۔

فتح مکہ کے موقع پر حضورؐ کا یہ اعلان کہ فلاں فلاں شخص اگر کعبے کے پردوں سے بھی لٹکے ہوئے ہوں تو انھیں قتل کر دیا جائے اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ اس وقت کعبے پر پردے لٹکے ہوئے تھے۔

فتح مکہ کے بعد جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، فتح مکہ کے موقع پر حضورؐ نے اعلان فرمایا تھا کہ آج وہ دن ہے جب اللہ کعبہ کی عظمت قائم فرمائے گا اور اب ہم اس پر غلاف چڑھائیں گے۔ اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک عورت غلاف کعبہ کو خوشبو دینے کے لئے بخور جلا رہی تھی۔ اتفاقاً کپڑا آگ پکڑ گیا اور پورا غلاف جل گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے زمانہ جاہلیت کا لبادہ کعبے پر سے خود اتار دیا اور پھر زمانہ اسلام میں پہلی مرتبہ مسلمانوں نے اللہ کے گھر پر غلاف چڑھایا۔ یہ روایت علامہ ابن حجر نے فتح الباری میں حضرت سعید بن المُسَیّب سے نقل کی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اپنے اپنے زمانہ میں کعبے پر یمنی کپڑے کا غلاف چڑھاتے تھے۔ پھر جب مصر فتح ہو گیا۔ تو حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ قباطی (مصری کپڑے) کا غلاف بنوانے لگے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انھوں نے اپنے عہد خلافت میں غلاف چڑھایا ہے یا نہیں۔ اس بارے میں روایات خاموش ہیں ممکن ہے کہ خانہ جنگی نے آنجناب کو اس خدمت کا موقع نہ دیا ہو۔

قدیم زمانہ سے یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ جب حج کے بعد سب حاجی رخصت ہو جاتے تھے تو ۱۰ محرم کو کعبے پر غلاف چڑھایا جاتا تھا۔ اسی طریقے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں بھی عمل ہوتا رہا۔ امیر معاویہؓ نے اپنے عہد میں یوم عاشوراء پر غلاف چڑھانے کے علاوہ ایک اور غلاف عید الفطر کے موقع پر بھی چڑھانا شروع کر دیا۔

یہ بات بھی روایات سے معلوم ہوتی ہے کہ زمانۂ اسلام میں سب سے پہلے امیر معاویہؓ نے ریشمی غلاف بنوایا تھا، پھر یزید اور حضرت عبد اللہ بن زبیر نے اپنے اپنے زمانہ میں اس کی تقلید کی اور عبد الملک بن مروان کے عہد سے یہی طریقہ مستقل بن گیا جو آج تک جاری ہے اس عمل کی ابتدا جس وقت ہوئی تھی اس وقت بکثرت صحابہ و تابعین اور جلیل القدر فقہاء موجود تھے۔ کسی نے ریشمی غلاف پر اعتراض نہیں کیا اسی وجہ سے بعد کے علماء بھی اس کے جواز پر متفق رہے۔

زمانہ اسلام سے پہلے مختلف لوگ کعبے پر چڑھانے کے لئے چادریں لایا کرتے تھے اسلامی دور میں غلاف چڑھانا حکومت کی ذمہ داری قرار پا گیا۔ عبد الرزاق کی روایت کے مطابق ایک مرتبہ لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کیا ہم کعبے پر غلاف چڑھائیں؟

انھوں نے فرمایا اب تمہیں اس کی ضرورت نہیں رہی ہے حکام نے تمہاری طرف سے اس خدمت کو سنبھال لیا ہے۔ ایک روایت میں حضرت عائشہ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں کہ کسوۃ البیت علی الامراء "بیت اللہ کا غلاف حکام کے ذمہ ہے"۔

عباسی خلافت کے بعد عباسی خلافت کے زوال تک غلاف کی تیاری مرکزی حکومت کے انتظام میں ہوتی رہی۔ پھر جب کوئی مرکزی حکومت باقی نہ رہی تو مختلف علاقوں کے سلاطین اپنی طرف سے غلاف بنوا کر بھیجتے رہے اور بسا اوقات بیک وقت کئی کئی غلاف بھی چڑھائے گئے

اس سلسلہ میں ایک [illegible] ہندوستان سے بھی (۱۲۶۶ھ میں) غلاف بنوا کر بھیجا گیا تھا اور چونکہ اس زمانہ میں اسلامی حکومت ان علاقوں تک محدود تھی جو اب پاکستان میں شامل ہیں اسلئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ غلاف پاکستان سے بنکر گیا تھا۔

۸۵۰ھ میں مصر کے فرمانروا الملک الصالح اسماعیل بن ناصر نے غلاف کعبہ تیار کرانا اپنے ذمہ لے لیا اور اس غرض کے لئے تین گاؤں وقف کر دئے اس وقت سے موجودہ زمانے تک مصر ہی سے غلاف بن کر آتا رہا ہے۔ مصر پر ترکی سلاطین کا قبضہ ہو جانے کے بعد سلطان سلیمان اعظم نے ملک الصالح کے اس وقف میں سات گاؤں کا اور اضافہ کر دیا اور اس عظیم وقف کی آمدنی سے ہر سال کعبہ کا غلاف، اور ہر پانچویں سال حجرہ نبوی کے پردے اور منبر نبوی کا غلاف مصر سے بن کر آنے لگا۔ اس کے علاوہ خانہ کعبہ کے اندر کے پردے بھی وقتاً فوقتاً اسی وقف سے بنا کر بھیجے جاتے تھے اس زمانہ میں اس وقف کی آمدنی ۷۳۶ ۳۶۶ درہم تھی جسے موجودہ زمانے کے مصری سکے کے لحاظ سے ۵۰ ہزار اور ایک لاکھ درہم مصری پاؤنڈ کے درمیان سمجھنا چاہیے مگر جب پچھلی صدی کے آغاز میں مصر کے وائسرائے محمد علی پاشا نے ترکی سلطنت سے بغاوت کر کے خود مختاری اختیار کر لی تو اس نے یہ وقف منسوخ کر دیا۔ اور صرف غلاف کعبہ حکومت مصر کے خرچ پر بنوا کر بھیجنا شروع کیا۔ کعبے کے اندرونی پردے اور حجرۂ نبوی کے پردے آج تک مصر سے نہیں بھیجے گئے آج جو پردے وہاں پڑے ہوتے ہیں وہ سب سلطان عبد العزیز (۱۸۳۰ء تا ۱۸۷۶ء) کے زمانے کے ہیں اور بہت بوسیدہ ہو چکے ہیں۔ کعبے کا جو غلاف اب مصر سے بن کر آتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ دس بارہ ہزار مصری پاؤنڈ کا ہوتا ہے۔

غلاف کے رنگ

پہلے غلاف مختلف رنگوں کے ہوا کرتے تھے مامون الرشید نے سفید رنگ کا غلاف چڑھایا تھا محمود غزنوی کے غلاف کا رنگ زرد تھا مصر کے فاطمی خلفاء سفید رنگ کے غلاف بھیجتے تھے خلیفہ ناصر عباسی (۵۷۵ھ۔ ۶۲۲ھ) نے ابتدا میں سبز غلاف بنوایا تھا پھر سیاہ ریشم کا بنوا کر بھیجا۔ اس کے بعد سے سیاہ غلاف ہی بنوایا جاتا رہا اور آج تک یہی طریقہ جاری ہے

غلاف کعبہ کے چاروں طرف زری کے کام کی پٹی بنانے اور اس پر کعبہ کے متعلق قرآن مجید کی آیات لکھوانے کا سلسلہ سب سے پہلے ۷۶۱ھ میں مصر کے سلطان الحسن نے شروع کیا تھا۔ اس کے بعد سے یہ پٹی لگانے کا طریقہ آج تک چل رہا ہے اس پٹی پر حسب ذیل آیات لکھی جاتی ہیں۔

ایک طرف اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ فِیْہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰھِیْمَ ۝ وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا ؕ وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ۝

(آل عمران۔ ۹۶-۹۷)

دوسری طرف جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّھْرَ الْحَرَامَ وَالْھَدْیَ وَالْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِکَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝

(المائدہ ۹۷)

تیسری طرف وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝

(البقرہ۔ ۱۲۷)

چوتھی جانب اس فرمانروا کا نام لکھا جاتا ہے جس نے غلاف بنوایا ہو۔

غلاف کعبہ اور دوسرے ممالک

موجودہ صدی کے آغاز تک غلاف کعبہ دنیا کے سیاسی حالات سے غیر متاثر [illegible]

لڑائیاں ہوتی تھیں۔ سلطنتوں کے تعلقات بنتے اور بگڑتے تھے مگر کعبہ کے لئے جہاں سے غلاف آیا کرتا تھا وہیں سے آتا رہا لیکن اس صدی کے آغاز میں دنیا کے سیاسی حالات اس پر بھی اثر انداز ہونے لگے جنگ عظیم اوّل میں جب ترکی سلطنت جرمنی کے ساتھ شریک جنگ ہو گئی تو اسے اندیشہ ہوا کہ انگریز مصر سے غلاف کے آنے میں مانع ہوں گے اس لئے اس نے استنبول سے ایک نہایت شاندار غلاف بنوا کر حجاز ریلوے کے ذریعہ سے مدینہ بھیجدیا۔ مگر چونکہ مصر سے عین وقت پر غلاف پہنچ گیا تھا اسلئے وہ ترکی غلاف مدینہ طیبہ میں محفوظ کر دیا گیا ۱۹۲۳ء میں شریف حسین اور حکومت مصر کے تعلقات خراب ہو گئے اور مصری حکومت نے عین حج کے موقع پر جدہ پہنچے ہوئے غلاف کو واپس منگوا لیا۔ خوش قسمتی سے اس وقت وہ ترکی غلاف کام آ گیا جو جنگ کے زمانہ میں ترکی حکومت نے مدینۂ طیبہ میں بھیج رکھا تھا پھر ۱۹۲۵ء میں سلطان ابن سعود اور شریف حسین کی لڑائی کے زمانے میں مصر سے غلاف نہ آیا اور ابن سعود نے عراق کا بنا ہوا ایک غلاف چڑھا دیا جو شریف حسین نے احتیاطاً بنوا کر رکھ چھوڑا تھا۔ ۱۹۲۷ء میں ٹھیک یکم ذی الحجہ کو حکومت مصر نے غلاف بھیجنے سے انکار کر دیا اور ابن سعود کو فوراً مکہ ہی میں ایک غلاف بنوانا پڑا۔ پھر ۱۹۲۸ء میں بھی مصری غلاف نہ آیا اور امرتسر سے مولانا داؤد غزنوی اور مولانا اسمٰعیل غزنوی کے اہتمام میں غلاف بنوا کر بھیجا گیا۔ ان تجربات کی بنا پر اسی زمانہ میں مکہ معظمہ کے اندر ایک دار الکسوۃ قائم کر دیا گیا تھا تاکہ مصر سے آئے دن غلاف نہ آنے کی مصیبت کا مستقل علاج کر دیا جائے۔ اس کارخانے میں مولانا اسمٰعیل غزنوی مرحوم کی مدد سے ہندوستان کے بہت سے کاریگر فراہم کئے گئے تھے کچھ مدت تک وہیں غلاف تیار کیا جاتا رہا پھر سعودی حکومت اور مصر کے تعلقات درست ہو گئے اور وہاں سے غلاف کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا اب پچھلے سال وہی قصہ پھر پیش آیا اور سیاسی تعلقات کی خرابی نے مصری غلاف کی آمد کا سلسلہ منقطع کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا

ہے کہ ایک مدت دراز کے بعد اس سال پاکستان کی سرزمین پر غلاف کا کپڑا تیار ہو رہا ہے پورے غلاف کے لئے ایک ہزار گز کپڑا درکار ہوتا ہے پاکستان سے صرف یہ کپڑا ہی تیار کر بھیجا جا رہا ہے زری کے کام کی پٹی مکہ معظمہ کے دار الکسوۃ میں تیار کی جائے گی۔

چین اور روس کی زندہ تصویریں

کمیونزم اور کسان کمیونزم کو ایشیائی نقطۂ نظر سے سمجھنے سمجھانے کی کامیاب کوشش جو بیشمار دستاویزی حوالوں سے مزین ہے۔ قیمت ڈھائی روپے۔

عالمی سیاست میں جمہوریت مصنف:- لیسٹر بی پیرسن کنیڈا کے سابق وزیر خارجہ اور اتحادی سبھا کے سابق صدر مسٹر لیسٹر بی پیرسن کے چھ عالمانہ مقالوں کا مجموعہ ــــ بین الاقوامی سیاست میں جمہوریت کے کردار اور جمہوری اصولوں کی کارفرمائی کے امکانات کا سیر حاصل تجزیہ۔

موجودہ بین الاقوامی سیاست کے پُرپیچ رجحانات کو سمجھنے کے لئے اس مختصر سی کتاب کا مطالعہ ازحد مفید ہے۔ ضخامت ۱۱۸ صفحات۔ قیمت صرف آٹھ آنے۔

آزادی کی نئی وسعتیں مصنف:- ارون ڈی کنہم۔ آزادی کے تصور میں جو نئی رنگ آمیزیاں ہوتی ہیں ان کی معلومات افروز کہانی، کرسچین سائنس مانیٹر کے ایڈیٹر ارون ڈی کنہم کی زبانی۔ جمہوری سماج کے جدید تر رجحانات کا ولولہ انگیز تجزیہ۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات قیمت صرف آٹھ آنے

اُنیس سو چوراسی مصنف:- جارج آرویل۔ مترجم:- سید سہیل واسطی۔ مشہور ہندوستانی نژاد مغربی مصنف جارج آرویل کا وہ شہرہ آفاق ناول جس نے یورپ میں تہلکہ ڈال دیا تھا۔ اردو کا یہ خوبصورت ایڈیشن آرٹ پیپر کی آٹھ تصویروں سے مزین ہے۔ ضخامت ۳۴۴ صفحات ۔ ڈھائی روپے۔

ظلمتِ نیمروز مصنف:- آرتھر کوئسلر۔ مترجم:- گوپال متل۔ سابق کمیونسٹ دانشور آرتھر کوئسلر کا بلند پایہ نظریاتی ناول جس کا ترجمہ اُردو کے صاحبِ طرز ادیب جناب گوپال متل نے کیا ہے۔ ایک ایسے ملک کی کہانی جو آدرش وادی انقلابیوں کے ہاتھ میں پڑ کر جنت بنتے بنتے جہنم بن گیا۔ ضخامت ۲۹۶ صفحات قیمت سوا روپیہ

عثمان بطور چین میں مسلمانوں پر کیا گذری؟ ایک کہانی ایک تاریخ۔ سوا روپیہ۔

اوریانگسی بہتا رہا ناول کے پیرائے میں چین کی ایک عبرت انگیز داستان۔ ایک روپیہ۔

آزادی کی طرف ایک روسی افسر کی آپ بیتی جو بھاگ کر امریکہ میں پناہ گزیں ہوا۔ نہایت دلچسپ اور عبرتناک۔ تین روپے۔

پتھر کے دیوتا چھ آپ بیتیاں۔ جاذبِ توجہ حیرتناک ایک روپیہ

ادب میں ترقی پسندی کمیونزم ادب وصحافت کی آڑ میں کیا کھیل کھیلتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ

چین کے مسلمان کروڑوں مسلمان کیا ہوئے؟ انھیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا؟ کمیونزم کی آدم خوری کا دستاویزی تذکرہ۔ صرف چار آنے۔

سوویٹ نظام کی چھ کنجیاں جچے تلے عقلی ونفسی دلائل پر مشتمل ایک سنجیدہ اور معیاری کتاب جو دلچسپ بھی ہے اور حقیقت افروز بھی۔ صفحات ۳۲۴ صرف ایک روپیہ

آزادی کا ادب بعض منتخب مقالوں، افسانوں اور منظومات کا مجموعہ جنھیں نیک تعمیری مقاصد کے تحت چھاپا گیا ہے۔ مجلد تین روپے

سوویت روس کی حقیقت ۱۲ حصے - دو روپے

لینن:- انقلاب روس کے بانی لینن کی مستند سوانح۔ بے لاگ وغیر جانبدارانہ۔ ایک روپیہ

{ مکتبہ تجلی - دیوبند یوپی }

(۱) اقتصادی مضمون (۲) ہمارے دور کا انقلاب (۳) اقتصادی سامراج (۴) اگر جاگیرداری کا خاتمہ (۵) موجودہ سماج میں طبقاتی نظام - ہر ایک کی قیمت ۲۵ پیسے -

ہے کوئی جو عبرت پکڑے

مولانا مودودی کا ایک مطبوعہ خط

غلاف کعبہ سے متعلق آغاز سخن کتابت کے مرحلے سے گذر چکا تھا کہ ایک ایسی چیز سامنے آئی جو اگر پہلے آجاتی تو شاید ہمیں اتنی تفصیل میں نہ جانا پڑتا۔ وہ چیز مولانا مودودی کا ایک خط ہے جو ایشیا (لاہور) میں شائع ہوا ہے جناب ماہر القادری نے مولانا موصوف کو مکتوب لکھا تھا مطبوعہ خط اسی کا جواب ہے ماہر صاحب کا خط اسلئے شائع نہیں کیا گیا کہ خود جواب اس کے مضمون سے آگاہ کر دیتا ہے۔
اسے پڑھنے کے بعد وہ کف در دہن اور آتش زیر پا حضرات اپنے موقف پر توجہ فرمائیں جو غیر مصدقہ اخباری خبریں اور غیر ثقہ ناقدوں کی تحریریں پڑھکر خواہ مخواہ آپے سے باہر ہو گئے ہیں۔ مزاجوں میں انانیت ہو، قلب و ذہن تعصبات سے مسموم ہوں اور روح کی گہرائی میں خشیت و تقویٰ کی جڑیں نہ پہنچی ہوں تو آدمی دوسروں کو متہم کرنے میں ایسی ہی جلد بازیوں کا شکار ہو جایا کرتا ہے۔ (عامر عثمانی)

محترمی و مکرمی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

غلاف کعبہ کے معاملہ میں مجھ پر اور جماعت اسلامی پر جو اعتراضات کئے جا رہے ہیں ان پر تفصیلی بحث آئندہ ترجمان القرآن میں کر رہا ہوں۔ اچھا تو یہ ہوتا کہ آپ پوری بحث دیکھ لیتے۔ لیکن اگر آپکو جلدی ہے تو میں مختصراً چند اشارات کئے دیتا ہوں۔

پہلی اور بنیادی غلطی

سب سے پہلی بنیادی غلطی جس پر اعتراضات کی عمارت قائم ہوئی ہے یہ ہے کہ میرے متعلق فرض کر لیا گیا ہے کہ میں نے خود ابتدا کر کے اس غلاف کی نمائش کا انتظام کیا اور جلوس کا پروگرام بنایا اور ٹرینوں پر اس کی نمائش کی اسکیم بنائی۔ حالانکہ اصل واقعہ یہ نہیں ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ہم غلاف کی تیاری کے انتظامات بالکل مخفی طور پر کر رہے تھے۔ اتفاقاً اخبارات کو اس کا پتہ لگ گیا اور ہمارے علم و اطلاع کے بغیر انھوں نے اس معاملہ کو اچھال دیا۔ عوام کو جب اس کی خبر ملی تو ان کے اندر غلاف سے دلچسپی اور اس کے دیکھنے کا شوق ایک ایسے طوفان کی طرح خود بخود اٹھنا شروع ہو گیا جس کی ہمیں ہرگز توقع نہ تھی اس صورت حال کو دیکھکر میں نے یہ محسوس کیا کہ اس طوفان کو روک دینا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ اس فیکٹری کا پتہ عوام کو اخبارات کے ذریعہ معلوم ہو چکا تھا جہاں غلاف بن رہا تھا۔ لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ اس پر ٹوٹنے شروع ہو گئے۔ لوگ ہمارے روکنے کے باوجود کسی نہ کسی طرح فیکٹری سے غلاف کے تھان حاصل کر کر کے لے جا رہے تھے اور نہ صرف لاہور میں جگہ جگہ زیارتیں ہونے لگیں بلکہ آئے دن ہمارے پاس اطلاعات آرہی تھیں کہ آج غلاف فلاں شہر میں پہنچ گیا اور وہاں اس کا جلوس نکلا۔ یا ہزارہا آدمیوں نے اس کی زیارت کی ہمارے لئے کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہم غلاف کے تھانوں کو خفیہ طور پر فیکٹری سے نکال کر چپکے سے کراچی پہنچا دیتے۔
ان حالات میں ہم نے بہتر یہ رائے قائم کی کہ عوام کی اس فطری دلچسپی کو جو ہمارے یا کسی کے بھڑکانے سے نہیں

بھڑک رہے بلکہ خود ... [illegible] ... سے روکنے اور صحیح رُخ پر ڈال دینے کی کوشش ناگزیر ہے اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو یہ دلچسپی ایسا راستہ اختیار کریگی جو شرعی اعتبار سے بہت زیادہ قابلِ اعتراض ہوگا۔ اس بنا پر ہم نے لاہور میں معززین شہر کی ایک کمیٹی بنائی تاکہ منظم طریقہ سے لوگوں کو غلاف دکھانے اور پھر باقاعدہ جلوس کی شکل میں اسے روانہ کرنے کا انتظام کرے اس کے ساتھ ہم نے بیرونی شہروں کے لئے بھی اسپیشل ٹرینوں کا انتظام کردیا تاکہ بے قاعدہ طریقے سے غلاف کے تھانوں کا باہر جانے کا سلسلہ بند ہو۔ لاہور کی کمیٹی نے چار دن عورتوں کے لئے اور تین دن مردوں کے لئے نمائش کی خاطر مقرر کئے۔ اور اس بات کا اہتمام کیا کہ عورتوں کی نمائش میں صرف تعلیم یافتہ خواتین اور مردوں کی نمائش میں منتخب مرد کارکن انتظامات کریں اور لوگوں کو مشرکانہ افعال سے روک کر ذکر اللہ اور درود شریف کی تلقین کریں۔ اسی طرح جو اسپیشل ٹرینیں باہر بھیجی گئیں ان کے ساتھ بھی چند کارکن بھیجے گئے اور انھیں یہ ہدایت کی گئی کہ ہر اسٹیشن پر پہنچتے ہی اللہ اکبر اور کلمہ طیبہ کا ورد لاؤڈ اسپیکر پر شروع کردیں تاکہ لوگ آپ سے آپ ذکر الٰہی کی طرف راغب ہوجائیں نیز عورتوں اور مردوں کو غلاف دکھانے کے انتظامات بالکل الگ کریں۔ مجمعوں کو خلط ملط نہ ہونے دیں اور لوگوں کو غلاف کی حقیقت بتاکر ایسے افعال سے روکتے رہیں جو مشرکانہ ہوں۔ پھر لاہور میں جلوس کا جو پروگرام بنایا گیا اس میں بھی یہ انتظام کیا گیا کہ اللہ کے ذکر کی اس طرح بھرمار کی جائے کہ دوسرا نعرہ بلند ہونے کی نوبت نہ آنے پائے۔ نیز بار بار یہ اعلان کیا گیا کہ عورتیں جلوس میں شامل نہ ہوں۔

اس سے آپ کے سامنے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ یہ کوئی ایسا پروگرام نہ تھا جو لوگوں میں دینی جذبہ بیدار کرنے کی خاطر ہم نے خود شروع کیا ہو بلکہ دراصل یہ پروگرام ہم نے اس وقت بنایا۔ جب لوگوں میں ایک جذبہ خود بخود بھڑک اٹھا تھا۔ اور اس پروگرام کو بنانے کی اصل غرض یہ تھی کہ اس جذبے کے سیلاب کو منکرات کی طرف جانے اور ذکر اللہ کی طرف موڑنے کے لئے جو کچھ کیا جاسکتا ہے، کیا جائے۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو یہ بہت زیادہ مکروہ راستہ اختیار کرلیتا اور کسی کے روکے نہ رُکتا۔

اب میں مختصراً آپکو یہ بھی بتاتا ہوں کہ اصل واقعات کیا پیش آئے ہیں۔ اور بعض مذہبی طبقے انھیں کس شکل میں پیش کر رہے ہیں۔

لاہور کا جلوس میں نے خود دیکھا ہے اور آخر وقت تک اس میں شریک رہا ہوں۔ ہوائی اڈے تک پہنچتے پہنچتے اس میں ۶-۷ لاکھ آدمی شامل ہوچکے تھے اور آٹھ میل لمبا راستہ تھا۔ اس پورے جلوس کے راستے میں تمام سینماؤں اور دکانوں پر سے عورتوں کی فحش تصویریں ہٹادی گئی تھیں یا چھپا دی گئی تھیں۔ ریڈیو پر گانے کی آوازیں بند کردی گئی تھیں۔ پورا جلوس لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر کے ذکر میں مشغول تھا۔ بعض گروہوں نے دوسرے نعرے بلند کرنیکی انتہائی کوششیں کیں۔ مگر دو چار مرتبہ ان کی پکار پر یہ نعرے لگ جاتے اور پھر سارا مجمع کلمہ طیبہ کے ورد میں لگ جاتا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ لوگ اس وقت کلمۂ طیبہ کے سوا کچھ اور قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اتنے بڑے ہجوم میں ایک جیب نہیں کٹی۔ غنڈہ گردی کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ عورتیں ہمارے منع کرنے کے باوجود آئیں۔ مگر کوئی ادنیٰ سا واقعہ بھی عورتوں کو چھیڑنے کا پیش نہیں آیا۔ حد یہ ہے کہ پورے شہر پر اس روز نیکی کا اتنا غلبہ تھا کہ بعض لوگوں کی جوتیاں مال روڈ پر جلوس میں چھوٹ گئیں تھیں اور انہوں نے کئی گھنٹہ کے بعد ہوائی اڈے سے واپس آکر اپنی جوتیاں مال روڈ پر جوں کی توں پڑی پائیں۔ اتنی بڑی بھیڑ میں اگر کہیں کوئی مشرکانہ یا مبتدعانہ بات ہوگئی تو وہ ہمارے مولوی صاحبان کی گرفت میں آگئی۔ حالانکہ جہاں لاکھوں آدمی شریک ہوں وہاں چند آدمیوں کو کوئی مشرکانہ بات کرنے سے کیسے روکا جاسکتا ہے۔ چلتے ہوتے مجمع میں اگر کچھ لوگ لپک کر غلاف کو چوم بیٹھے، یا چند لوگوں نے قابلِ اعتراض نعرے لگا دیئے

تو کیا صرف اس وجہ سے اس خیر عظیم پر پانی پھیر دیا جائیگا جو اس روز اتنے بڑے پیمانہ پر لاہور میں رونما ہوئی؟ یہ تو مکھی کا سا حال ہے کہ ساری پاک چیزوں کو چھوڑ کر وہ صرف گندگی ہی تلاش کرتی ہے اور کہیں ذرا سی چھینٹ بھی نظر آجائے تو اسی پر جا بیٹھتی ہے۔

بدعات کا فسانہ جو اسپیشل ٹرینیں باہر بھیجی گئی تھیں ان کی مفصل رپورٹ میں نے بھی لی ہے اور صرف جماعت ہی کے کارکنوں سے نہیں بلکہ سول ڈیفنس اور ریلوے اسکاؤٹس کے ان لوگوں سے بھی لی ہے جو ٹرینوں کے ساتھ گئے تھے ان سب کا بیان ہے کہ جگہ جگہ ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمی غلاف کو دیکھنے کے لئے جمع ہوئے تھے ہر جگہ ذکر الٰہی ہی غالب رہا اور بہت کم دوسرے نعرے لگ سکے۔ ہر جگہ عورتوں اور مردوں کے مجمعے الگ رہے۔ اور بہت کم مقامات پر حادثات پیش آئے۔ جن کی وجہ کسی کی غفلت نہ تھی بلکہ اژدہام کی شدت تھی۔ عورتیں کثرت سے آئیں۔ مگر شاذ و نادر ہی کہیں یہ واقعہ پیش آیا کہ کسی نے ان کو چھیڑا ہو۔ اتنے بڑے مجمعوں میں کسی کی جیب کٹنے کا کوئی واقعہ سننے میں نہیں آیا۔

عوام کو بڑے پیمانہ پر نیکی اور بھلائی کی تلقین کی گئی اور انہیں غلاف کی زیارت کے حدود سمجھائے گئے۔ عموماً لوگوں نے ان حدود کا لحاظ رکھا اور زیادہ تر لوگ یہی دعائیں مانگتے دیکھے گئے کہ خدایا جس گھر کا غلاف تو نے دکھایا ہے اس گھر کی زیارت کی توفیق بھی عطا فرما۔ اب اگر ان ہزاروں لاکھوں آدمیوں میں سے کوئی شخص غلاف کو یا ٹرین کو چوم بیٹھا، یا کسی نے ٹرین کے انجن کو انجن شریف کہہ دیا، یا کارکنوں کے منع کرنے کے باوجود لوگوں نے غلاف کی ٹرین پر پیسے پھینک دیئے، یا ہجوم کی کثرت کے باعث کہیں عورتوں اور مردوں کو خلط ملط ہونے سے نہ روکا جاسکا [illegible] چند باتیں جلسے "دین داروں" سے اعتراض کئے جانے کے قابل ہیں تو ساری خیر کو نظر انداز کر دیا

جو اس کام میں غالب پائی جاتی تھی۔

پھر ان حضرات نے کیڑے چننے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ جہاں کیڑے نہ تھے وہاں اپنی طرف سے کیڑے ڈالنے میں بھی تامل نہ فرمایا۔ مثلاً لاہور میں ہمارے علم و اجازت کے بغیر قصور پورے کے لوگوں نے (جن کے محلے میں غلاف تیار کرنے والی فیکٹری قائم تھی) بطور خود غلاف کا جلوس نکال ڈالا اور اسے لیکر شاہی مسجد پہنچے جہاں انتظامیہ کمیٹی کی طرف سے غلاف کی نمائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس جلوس کے متعلق بڑے بڑے دین دار حضرات نے الزام لگایا ہے کہ اس کے آگے بینڈ بج رہا تھا اور مزید الزام یہ بھی لگا دیا کہ اس جلوس نے غلاف کو لے جا کر حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر چڑھایا حالانکہ یہ دونوں باتیں قطعی جھوٹ ہیں واقعہ صرف یہ ہے کہ جب جلوس راستے سے گزر رہا تھا تو اتفاق سے ایک برات بھی آگئی جس کے ساتھ بینڈ تھا۔ جلوس صرف اس بازار سے گزرا جس میں حضرت ہجویریؒ کا مزار واقع ہے اور اس جلوس کی ذمہ داری سے ہمارا کوئی تعلق نہ تھا بلکہ یہ ہمارے منع کرنے کے باوجود نکلا تھا اور ہم اسلئے روک نہ سکتے تھے کہ جس محلے میں فیکٹری واقع تھی ان سے غلاف کو بچانا کسی طرح ممکن نہ تھا۔

بہتان و افتراء ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ ان حضرات کو سارا غم صرف اس غلاف کا ہے جو لاہور میں تیار ہوا ہے کراچی کے غلاف کی کراچی میں بھی نمائش ہوئی اور وہ ٹرین پر بھی گیا۔ مگر اس کا کوئی ماتم ان کے حلقوں میں نہ سنا گیا بلکہ جو باتیں اس غلاف کے ساتھ ہوئیں ان کی بھی ساری ذمہ داری مجھ پر اور جماعت اسلامی پر ڈال دی گئی[1]۔

---

[1] یہ بات مجھ سے خلیل حامدی صاحب نے بیان کی تھی مگر ابھی ابھی یعقوب انصاری صاحب (جنھوں نے غلاف تیار کیا تھا) میرے پاس آئے اور میں نے ان سے یہ معاملہ دریافت کیا، کیونکہ وہ خود اس جلوس میں موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ اس واقعہ کی سرے سے کوئی اصلیت ہی نہیں۔

یہ باتیں تو خیر ان معاملات سے متعلق ہیں جو ظاہر میں نظر آتی تھیں۔ لیکن ہمارے ان دینداروں کی نگاہ تو ماشاء اللہ باطن تک جا پہنچی ہے انھیں یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ میں نے غلاف کعبہ کی نمائش کا سارا اہتمام صرف اس نیت سے کیا تھا کہ میری شہرت ہو اور اس کا سیاسی فائدہ اٹھاؤں اور اس کے ذریعہ سے آئندہ انتخابات میں کامیابی حاصل کروں اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ میری یہ نیت ان پر کیسے منکشف ہوئی۔ اگر انھیں علیم بذات الصدور ہونیکا دعویٰ ہے تو یہ اس شرک و بدعت سے اشد چیز ہے جس پر وہ گرفت کر رہے ہیں۔ اور اگر انہوں نے میری طرف یہ نیت قیاس و گمان کی بنا پر منسوب کی ہے تو شاید انھیں قرآن وحدیث میں صرف شرک و بدعت ہی کی برائی ملی ہوگی۔ بہتان و افترا کے متعلق احکام آن کی نگاہ سے نہ گذرے ہوں گے۔

آخری بات قابل ذکر یہ ہے کہ میرے پیش نظر غلاف کعبہ کی زیارت اور اس کے جلوس کو کوئی مستقل رسم بنانا ہرگز نہیں ہے۔ جو کچھ کیا گیا وہ مجبوراً ان حالات کی بنا پر بضرورت کیا گیا جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے آئندہ اگر پاکستان میں میرے ذریعہ سے غلاف بننے کی نوبت آئی تو میں اسے حتی الامکان خاموشی کے ساتھ بنوانے کی کوشش کروں گا لیکن آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو کام تنہا مجھے نہیں کرنا بلکہ بہت سے کاریگروں سے کروانا ہو گا اس کا مخفی رہنا بہت مشکل ہے۔

(خاکسار ابو الاعلیٰ)

از:- ملا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

یہ ٹھیک ہے کہ ایڈیٹر تجلی دارالعلوم کے سند یافتہ ہیں اور کتابوں کو اُلٹتے پلٹتے علوم ظاہری میں تھوڑی سی شدھ بدھ ہو گئی ہے لیکن علوم روحانی اور فنون طریقت کا معاملہ اور ہے ان میں وہ عاجز کے سامنے طفل مکتب بھی نہیں۔

آپ " اپنے منہ میاں مٹھو " کی پھبتی چست نہ کیجئے۔ طریقت و روحانیت کے علوم میں اپنی مہارت تامہ کی بات میں خود نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ تو خود پیر رحمۃ اللہ علیہ کی کہی ہوئی ہے اور میرے بہت سے پیر بھائی چار و ناچار میری صلاحیتوں کا لوہا مانتے ہیں۔ قصہ در اصل یہ ہے کہ پیر رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کرنے کے بعد مجھ پر بارش کی طرح غیبی علوم و فنون کی بوچھار ہوئی ہے اور دوسری اور تیسری صدی ہجری تک کے متعدد مشائخ نے عالم رویا میں تشریف لا کر مجھے بیعتِ خاصہ سے نوازا ہے۔ ایک مرتبہ تو خود پیر رحمۃ اللہ علیہ حیران رہ گئے۔ نہایت تعجب سے فرمایا:-

" اے لڑکے! تو تو چھپا رستم نکلا۔ آیا تھا ہمارا اتباع کرنے مگر پھلانگ گیا ہم سے بھی آگے۔"

ایک مرتبہ فرمایا:-

" خانہ خراب! راہ سلوک میں اتنی تیز رفتاری تو نے کہاں سے سیکھی؟"

فدوی نے جواب دیا:-

" آپ کی دعا سے غلام کے سر پر پاک پنجتن کا سایہ ہے۔ ہر سجدہ عرش کی چھت پر ہوتا ہے۔"

" عرش کی چھت " وہ بگڑ کر بولے تھے " اے لڑکے عرش کوئی مکان ہے جو تو چھت کی بات کرتا ہے۔"

" جی ... جی در اصل عرش کے بالائی حصے کو میں نے چھت کہا ہے۔ خواجہ منطیق رحمۃ اللہ علیہ نے عالم رویا میں ارشاد کیا تھا کہ عرش کا کچھ حصہ نشیب میں ہے اور کچھ اونچائی پر۔"

" سخت تعجب ہے ہم پر تو ایسا منکشف ہوا نہیں۔"

" نہ ہوا ہوگا ـــــ میں بہرحال اونچا جا پہنچا ہوں "

میں نے در اصل صحیح بات پیر رحمۃ اللہ علیہ کو نہیں بتائی تھی۔ بتاتا تو شاید پٹ جاتا وہ اکثر معاملات میں صحیح العقیدہ ہونے کے باوجود بعض امور میں وہابیت کا شکار تھے۔ مثلاً انھیں فلموں سے روحانیت کشید کرنے میں یقین نہیں تھا۔ نہ وہ زنانِ عاشقانِ اولیاء سے پینگیں بڑھانے کو تزکیہ نفس کا وسیلہ ماننے کو تیار تھے۔ وہ اُن بزرگوں سے بھی خوش گمان نہیں تھے جنھوں نے خوش رو لڑکوں سے عشق کر کے سلوک کی منازل طے کی ہیں۔ ایسی صورت میں اگر میں انھیں یہ تہہ کی بات بتا دیتا کہ فدوی کے ارتقائے روحانی کا بڑا ذریعہ فلم بینی پر مبنی ہے تو وہ غضبناک ہو کر چانٹا مار دیتے۔ اس لئے گول کر گیا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ فلم دیکھ دیکھ کر میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ فلم کالی ٹوپی لال رومال ـــ بغداد کا چور ـــ حاتم طائی کی بیٹی ـــ بصرے کی حور ـــ سخی لٹیرا ـــ فلمی ... وغیرہ وغیرہ میں مسلسل میں نے یہ دیکھا کہ جب ظالم سماج ہیرو اور ہیروئن کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتا ہے تو وہ تنہائی میں ایک دردانگیز گانا گا کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور پھر وہ

ہم تنوں میں بہشت میں نظر آتے ہیں۔ وہاں نہ ظالم سماج ہے نہ کوئی رقیب۔ دونوں باہوں میں باہیں ڈال کر ٹھاٹ سے گاتے پھرتے ہیں اور حوریں ان کے لئے بڑا شاندار جشنِ رقص و سرود منعقد کرتی ہیں۔

میں نے سوچا کہ جب یہ خاکی مخلوق روحانی اڑان میں اتنی طاق ہوسکتی ہے تو میں کونسا ناری ہوں جو اڑ نہیں سکتا۔ صوفی مسکین کو خوشامد درامد کرکے ہیروئن کا پارٹ دیا اور درگاہ ہی کے ایک کمرے میں مشق شروع کر دی۔ وہ بڑی مشکل سے راضی ہوئے تھے۔ پہلے تو کہنے لگے :۔

"عرس کا انتظار کرو۔ خدا نے چاہا تو وحیدن بائی اس مرتبہ ضرور آئے گی اسے ہیروئن بنا لینا۔"

"عرس میں تو ابھی بہت دن پڑے ہیں صوفی جی! پھر وحیدن بائی کو صوفی بربر اور خواجہ سرفراز کب فارغ چھوڑتے ہیں جو میرے ساتھ جھک مار سکے گی — نہیں یار تم ہی تھوڑی سی تکلیف کر لو کیا ہرج ہے۔"

"ہرج تو کچھ نہیں مگر ہمارا خیال ہے کہ سنیما والے کوئی چار سو بیس کرتے ہیں ورنہ آنکھیں بند کرتے ہی کوئی جنت میں کیسے پہنچ سکتا ہے۔"

"چار سو بیس کیا معنی۔ آخر تم کیا اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے کہ سب کچھ سامنے ہوتا ہے —— آؤ ذرا کوشش کرکے دیکھیں۔ کیا تعجب کامیاب ہو ہی جائیں۔"

آخر بمشکل تمام وہ تیار ہو ہی گئے تھے۔

لیکن ابتداً ہمیں ناکامی ہوئی۔ آنکھیں بند کرکے میں نے بہت زور لگایا مگر تصور کے افق پر کوئی نظارہ طلوع نہیں ہوا۔ البتہ صوفی مسکین ضرور کہنے لگے کہ یار مجھے تو کچھ نظر آیا ہے۔

"کیا نظر آیا ہے؟" میں نے بیتابی سے پوچھا۔

"کچھ ایسا جیسے ہنڈی کی روشنی پھیلی ہوتی ہو اور بہت دور ایک عالی شان عمارت اونچی ہوتی چلی جا رہی ہو۔"

"مار لیا کام" میں نے خوش ہو کر کہا "اب تو نہیں کہو گے کہ سنیما والے چار سو بیس کرتے ہیں۔"

پھر میں نے آنکھیں بند کرکے مزید زور لگایا لیکن نہ روشنی نظر آئی نہ عمارت۔ مشکل یہ تھی کہ روح میں جو لطافت اور مستی کسی سچ مچ کی ہیروئن کے تصور سے پیدا ہو سکتی تھی اس میں صوفی مسکین کے لمبے تڑنگے جسم کا تصور حائل تھا۔ جہاں میں نے طبیعت پر زور دیکر رومانی کیفیات ابھارنی چاہیں صوفی صاحب کا قدِ بالا کسی دیو کی طرح کھوپڑی کے افق پر لٹکا ہوا نظر آیا۔

"یار صوفی صاحب —— برا نہ مانو ریاضت کی تکمیل کے لئے اگر آپ جوڑا بھی بدل لیں تو کیا مضائقہ ہے۔"

"جوڑا یعنی کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"ہیروئن کی جگہ تو آپ نے لے ہی لی مگر میک اپ کے بغیر ریاضت میں حقیقت کا رنگ پیدا نہیں ہو سکتا — ذرا سوچئے۔"

"ارے تو ہم کیا عورتوں کا لباس پہنیں؟" وہ برا سا منہ بنا کر بولے۔

"وہ تو پہننا ہی ہوگا — دیکھ لیجئے روشنی اور عمارت تو آپ کو نظر آ ہی گئی۔ اگر آپ میک اپ کئے ہوتے تو کیا تعجب کہ یہی عمارت جنت میں تبدیل ہو جاتی۔"

انھوں نے کچھ دیر سوچا۔ پھر کہنے لگے :۔

"یار شرم آتی ہے۔ کسی نے دیکھ لیا تو ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

"مجال ہے کوئی دیکھ لے —— چھدن اور بھولو کو شہر بھیجکر پھاٹک بند کر لیں گے۔"

"لیکن زنانہ لباس کہاں ہے؟"

"وہ میں لے آؤں گا۔"

مرحلہ اگرچہ دشوار تھا کیونکہ اپنی ملازمن کا لباس تو ان کے حق میں گڑیا کا لباس ثابت ہوتا۔ لیکن مولوی قطب الدین کی محترم اہلیہ میری نظر میں تھیں جن کا نام لیکر میری خلیا ساس بچوں کو ڈرایا کرتی ہیں۔ ان کے کپڑے جس فیکٹری میں ڈھلتے جاتے تھے اس کا منیجر اپنا مرید تھا۔ پھر ایک جوڑا مستعار لینے میں کیا دشواری ہو سکتی تھی۔

نہ پوچھئے اس جوڑے میں صوفی مسکین کیا کیا جچے ہیں۔ داڑھی تو ان کے ہے ہی نہیں۔ انعان سنو کی سعی میں گھر سے

اُڑا لا یا تھا۔ چار چار آنے کی دو چوٹیاں بازار سے خریدی تھیں۔ لپ اسٹک بھی لے لی تھی۔ شروع میں تو صوفی جی نے بڑے نخرے دکھلائے۔ دوہرے ہو ہو گئے مگر جیتے جاگتے جنت کی سیر کا تصور اتنا دل کش تھا کہ وہ صاف انکار کی راہ اختیار نہیں کر سکے۔

اب جو میں نے انھیں آنکھوں میں بسا کر پپوٹے بھینچے ہیں تو واقعی دنیا ہی بدل گئی۔ انشراحِ قلب اور ذہنی کشود کے عجیب و غریب مرحلے ایسے نہیں ہیں کہ الفاظ میں انکا خاکہ کھینچا جا سکے۔ بس ایک سرمدی کیف تھا۔ ایک لا متناہی پھیلاؤ ۔۔ ایک نورانی خلا جس میں اپنا کثیف جسم شیشے کی طرح مصفّا ہو کر بے نکان اُڑا چلا جا رہا تھا اور افق کے اُس پار رنگین لہریے اس طرح سرسرا رہے تھے جیسے اب حوریں چھما چھم کرتی سامنے آئیں اور اب کسی پیکرِ جمیل نے رقص کرتے ہوئے یہ نغمہ چھیڑا ۔۔ بھرکی حور ناچے آگے حضور کے!

دفعتاً روح کو جھٹکا سا لگا اور دل کا ورق اس طرح کورا ہو گیا جیسے چلتی فلم میں بجلی فیل ہو گئی ہو۔ صوفی مسکین اپنی بھاری اور کھردری آواز میں کہہ رہے تھے :۔

"یار اب کی تو ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا"

"ظالم غور سے دیکھو ہم اُڑ رہے ہیں"

"دیکھیں کیسے آنکھیں تو بند ہیں۔"

"ستیاناس۔ ارے زور سے پپوٹے بھینچو۔ مراقبے کے انداز میں مؤدب بیٹھ جاؤ"

"م مگر۔۔ فلم میں تو ہیروئن کبھی مؤدب نہیں بیٹھتی وہ تو بس لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتی ہے"

"یہ سب حالات پر منحصر ہے۔ تم ذرا آواز تو باریک بناؤ۔ اتنی موٹی آواز کسی ہیروئن کی کیسے ہو سکتی ہے"

"اماں تو کیا بالکل ہی عورت بن جائیں" وہ جھلائے

"بالکل عورت تو تمھارے فرشتے بھی نہیں بن سکتے، مگر یار کم از کم اداکاری تو ذرا ڈھنگ سے کرو ۔۔ فی الحال بولنے کی ضرورت نہیں سانس روک کر گردن جھکا لو"

"جھکالی۔۔۔"

چند لمحے خاموشی رہی پھر وہ ہڑبڑا کے بولے :۔

"ارے دا سانس ہم کب تک روکیں گے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی"

"چلو سانس لیتے رہو مگر بولو تو مت۔ ابھی بہت کچھ نظر آئے گا"

پھر میں نے بڑی محنت سے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ ایک سچ مچ کی ہیروئن دو گز کے فاصلے پر بیٹھی ہے اور ظالم سماج ہمیں ملنے نہیں دیتا۔ اس یقین کا جاگزیں ہونا تھا کہ پھر قلب و روح پر وہی سرمدی کیفیت طاری ہونی شروع ہوئی اور عالم ناسوت کی طرف ایک رومانوی سفر شروع ہو گیا۔

یہ ریاضت ہم دونوں نے کافی کی ہے۔ ہر آٹھویں دسویں روز سلسلہ جوڑ لیا جاتا اور روحانی ارتقاء کی رفتار تسلی بخش طریقے پر آگے بڑھتی رہی۔ صوفی مسکین کو بھی اب بہت کچھ نظر آتا تھا۔ گو اپنے بھاری بدن کی وجہ سے وہ میرے ساتھ نہیں اُڑ پاتے تھے۔ کبھی کبھی تو میرا بھی سفر کھوٹا کرتے۔ مثلاً آغاز سفر ہی میں میری ٹانگ مضبوط پکڑ لی ہے تو ظاہر ہے انھیں لٹکا کر میری رفتار حسب معمول نہیں ہو سکتی تھی۔

آخر کار ایک حادثہ پیش آیا اور روحانی ارتقاء کا یہ ترقی پذیر سلسلہ منقطع ہو گیا۔ دراصل چھدن اور بھولو کو ۔۔ جو درگاہ کے خدام میں سے تھے شبہ ہو گیا تھا کہ یہ آئے دن انھیں شہر کیوں بھیجا جاتا ہے۔ بار بار ہمیں معقول بہانے کہاں ہاتھ آتے کئی مرتبہ تو ایسے ہی کمزور بہانوں کا سہارا لینا پڑا تھا کہ شبہ ہوا ہو پر ہو۔ ایکدن وہ دونوں مسکوٹ کر کے دیوار پھلانگ آئے۔ ہمارا ریاض جاری تھا اور صوفی مسکین آج بڑے بھلے زار لباس میں تھے یہ مولوی قطب الدین کی محترم اہلیہ کا شادی کا جوڑا تھا۔ شاید پہلی ہی بار فیکٹری پہنچا تھا۔ مزید میک اپ بھی جو اسی کی مناسبت سے بڑا شاندار کیا تھا۔ ان کم بختوں نے درزوں سے جھانک کر جو دیکھا تو اکدم غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے

ادھر ادھر صوفی مسکین کو ڈھونڈتے پھرے۔۔ وہ بھلا کہاں ملتے۔ اس پر وہ گدھے آس پاس کے لوگوں کو جمع کر لائے اور ایسے دردناک لہجے میں تقریباً بیس مرتبہ یہ بات دہرائی کہ صاحب غضب ہو گیا۔ ملّا سکی نے درگاہ نجس کر دی خدا جانے کس بائی کو گھیر کر کمرے میں بند کر رکھا ہے۔

کئی آوازیں آئیں ــــ "پولیس کو بلاؤ"

کئی جواں مرد چیخے " ارے دروازہ تو کھلواؤ مار ڈالیں گے بدمعاش کو۔"

دروازے پر دوہتھڑ پڑ رہے تھے اور کھولو کھولو کا طوفان مچ رہا تھا۔ لیکن یہ سارا طوفان بتاشے کی طرح بیٹھ گیا جب اندر کی زنجیر کھولتے ہوئے صوفی مسکین گلا پھاڑ کر چیخے۔

"کون ڈاکو گھس آئے ہیں۔ کیسا شور مچا رکھا ہے۔"

لوگ ہق دق رہ گئے۔ چھدن اور بھولو کے چہرے تو زرد پڑ گئے کیونکہ صوفی مسکین اس وقت اپنے اصلی روپ میں تھے۔ ظاہر ہے پتہ کھڑکنے کے ساتھ ہی میں نے جوڑا اُتروا دیا تھا اور پیٹھوں سے چوٹیاں بھی جدا کر لی تھیں۔ بس ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک کی سرخی ضرور باقی رہ گئی تھی تو اسے دیکھنے والوں نے پان کی سرخی ہی سمجھا ہو گا۔

جب چڑھ دوڑنے والوں نے چھدن اور بھولو کے منہ میں گھو دیا تو وہ ہکلا ہکلا کے کہنے لگے۔

"صاحب قسم اولاد کی ہم نے اپنی آنکھوں سے ماجرا دیکھا تھا۔ کمرے میں فقط ملّا صاحب اور کسی عورت کے سوا کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔"

"کیا بکتے ہو۔ دماغ خراب ہوا ہے۔" صوفی جی دہاڑے

"جی ہاں جی نہیں ..... " وہ گھبرا اٹھے۔

"ٹھہریئے صوفی صاحب ــ" میں آگے بڑھ آیا "ان بیچاروں کا کیا قصور ہے۔ صاحبان!" میں نے مجمع کو مخاطب کیا "جھوٹ فی الحقیقت یہ دونوں بھی نہیں بولتے مگر قصور ان کا یہ ہے کہ انھوں نے ہم اہل دل کی خلوت میں جھانکا اور بدگمانی کو دل میں جگہ دی۔ ہم دونوں نہ جانے کہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ ہماری خلوتوں میں نہ جانے کون کون اوپر سے آتا جاتا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کبھی آپ تانک جھانک کریں تو لیک نہیں کئی کئی پریاں اور حوریں حاضر باش نظر آئیں لیکن ان کا تعلق اس ناپاک دنیا سے نہیں ہو گا۔ بے شک کچھ دیر پہلے ہم دونوں کو ایک خاص پیغام پہنچانے کے لئے بغداد شریف کے قطب حضرت مستانے رحمۃ اللہ علیہ نے ایک آسمانی خادمہ کو یہاں بھیجا تھا لیکن اب آپ اندر تشریف لا کر دیکھ سکتے ہیں کہ یہاں چڑیا کا بچہ بھی نہیں۔"

لوگ بجائے تکّا بوٹی کرنے کے عقیدتوں کا خمار آنکھوں میں لئے سلام کر کر کے دفع ہوتے اور فی الوقت چھدن اور بھولو نے بھی سرک ہی جانے میں عافیت سمجھی۔ اب صوفی مسکین غرغرائے۔

" یار بڑی خیریت ہو گئی ـــــ مگر یہ تم نے تقریر کیا جھاڑ دی؟"

" آگے کے لئے گھر نکالا ہے صوفی صاحب! اب اگر یہ لوگ ہمارے تمہارے ساتھ سچ مچ کی ہیروئن بھی دیکھیں گے تو اف نہیں کر سکیں گے۔"

"نا بابا آج سے کان پکڑے ــ یہ تو اتفاق سے سب جاہل لٹھ تھے کوئی پڑھا لکھا آمرتا تو تم جانو آجکل کے پڑھے لکھوں کے عقیدے بہت خراب ہیں وہ کبھی بھی اس آسانی سے جان نہ چھوڑتے۔"

"بچے ہیں آپ صوفی صاحب ـــــ پڑھے لکھوں کیلئے اپنے پاس نسخے اور ہیں۔ آپ کسی ایڈووکیٹ کو پکڑ لائیے نہ قائل کر دوں تو مونچھیں مونڈ دیجیے گا۔"

" پھر بھی یار یہ سلسلہ اب نہیں چلے گا۔ ہم کوشش کریں گے کہ دو سچ مچ کی ہیروئنیں ہمارے ہاتھ لگ جائیں پھر ہم تم الگ الگ اپنا اپنا مراقبہ کیا کریں گے۔"

اس طرح یہ ندیدہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں نے بے کیفی سے تنگ آکر صوفی حسن علی کی خدمت میں حاضری دی اور عرض کیا کہ غلام کو حالتِ قبض سے نکالیے۔ انھوں نے تفصیل پوچھی تو میں نے مجملاً اتنا بتایا کہ لاہوت و ناسوت سے

گویا گر جنت تک تو پہنچ گیا ہوں مگر وہاں مرد ہی مرد ہیں۔ کوئی
عورت ذات نہیں ملی کہ روح کو سہارا ملتا۔ بغیر عورت ذات
کے جنت بھی ویران ہی نظر آتی ہے۔"
"پروا مت کرو" انھوں نے حوصلہ افزائی کی۔ "ابھی
تین برزخ باقی ہیں۔ جب انھیں طے کرکے تمھاری روح حسن
حقیقی سے نیا خلعتِ وجود حاصل کرلے گی تو تمھارا جوڑا تمھاری
کوکھ سے جنم لے گا۔"
"باپ رے ـــ میں سمجھا نہیں پیرومرشد"
"سمجھو گے بھی نہیں ـــ شیخ سے آگے نکل جانے والے
مرید ٹھوکریں ہی کھاتے ہیں۔ ان کا نور بصیرت شیخ کی مٹھی
میں بند رہتا ہے۔"
"حق فرمایا حضرت والا ـــ مگر یہ کوکھ سے جنم لینے والی
بات ذرا کھل کر فرمائیے۔"
"راستہ ناپو۔ اسرار و رموز کھل کر بیان نہیں ہوتے۔"
خلاصہ مطلب یہ کہ ایڈیٹر تجلی کو طریقت کی ہوا بھی
نہیں لگی اسی لئے وہ وقتاً فوقتاً ایسے سوالات میرے سر
مارتے رہتے ہیں جن کا جواب ان کے علم ظاہری کی دسترس
سے باہر ہوتا ہے۔ آپ کئی بار دیکھ ہی چکے ہیں کہ خاص خاص
سوالات انھوں نے میرے سپرد کئے اور فدوی نے تجلی میں
ان کا وہ شاندار جواب پیش کردیا کہ کتنے ہی خوش نصیب تو
فقط انھیں ہی پڑھکر صوفی بن گئے۔
اب کی بھی یہی ہوا ہے۔ صبح کا سہانا وقت تھا مگر
چڑیاں نہیں چہچہا رہی تھیں اسی لئے فدوی نے ابھی لحاف
سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ اتنے میں ایڈیٹر صاحب کی جانی
پہچانی کھنکار سنائی دی اور چڑیوں کے چہچہانے کا انتظار
کئے بغیر مجھے لحاف چھوڑ دینا پڑا۔ وہ باورچی خانے میں اپنی
بہن سے تند لہجے میں پوچھ رہے تھے۔
"وہ کہاں ہے؟"
"وہ ـــ وہ شاید مسجد میں ہوں گے۔" ملانی کی
آواز خاصی ملتجی تھی۔ اس بلندی میں ایک پیغام تھا۔ یہ
دراصل میرے لئے الارم تھا۔ میں کوٹھری والی کھڑکی کھول کر
چپکے سے باہر نکل گیا اور مسجد میں پہنچکر منھ دھویا پھر گھر میں اس
شان سے داخل ہوا کہ زبان پر جہری اور سری دونوں قسم
کے ذکر تھے اور چہرہ خشوع و خضوع کے نور سے دمک رہا تھا۔
ایسے مواقع کے لئے میں تسبیح بھی ہمیشہ جیب میں رکھتا ہوں۔ یہ
اس وقت میرے ہاتھ میں لٹک رہی تھی اور اس کے دانوں پر
کھٹا کھٹ میری انگلیاں چل رہی تھیں۔
"کہاں سے آرہے ہو؟" ایڈیٹر صاحب کاٹ کھانے
کے انداز میں غرائے۔
میں نے جواب دیئے بغیر تسبیح والا ہاتھ آگے کو بڑھا دیا۔
منشا یہ سمجھانا تھا کہ وظیفہ بیچ میں ہے زبان کھولنے کی گنجائش
نہیں ہے۔ ان کے چہرے پر وہی جھلاہٹ نمودار ہوئی جو
وہابیوں کے چہرۂ نامسعود پر اہل اللہ کے نظارے سے نمودار
ہوتی ہے۔ شاید وہ تسبیح چھین کر چانٹا مارنے کا ارادہ کررہے
تھے۔ گھبرا کر میں نے مخلوط ذکر کو خالص جہری میں تبدیل
کردیا۔ ظاہر ہے زبان سے درود یا استغفار ہی نکلنا چاہئیے تھا
لیکن دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ جل تو جلال تو کا وظیفہ بیساختہ
حلق سے ابل پڑا ہے۔ گردن کو انگلیوں میں دبوچکر میں بڑبڑایا۔
"حول ولا قوت ـــ لاحول ولا ـــ"
"کہاں سے آرہے ہو؟" انھوں نے پھر اپنا سوال خشک
لہجے میں دہرایا۔
"قبرستان سے۔ نماز فجر کے بعد پیر رحمۃ اللہ علیہ کے
مزار پر فاتحہ پڑھنا میرا دائمی معمول ہے۔"
"لیکن تمھارے پیر تو کانپور میں دفن ہیں؟"
"ہوا کریں۔ یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی کہ
اہل اللہ دفن کہیں بھی ہوں مگر وہ موجود ہر جگہ ہوا کرتے ہیں۔"
"تو پھر قبرستان کی کیا ضرورت ہے" وہ پاٹ دار
آواز میں بولے "گھر بیٹھ کر بھی فاتحہ پڑھ سکتے ہو۔"
"یہ بھی آپ نہیں سمجھیں گے۔ پیر رحمۃ اللہ علیہ روزانہ
صبح دم جنگل بانس والی درگاہ میں ناشتہ کرنے ـــ ا ـــ
مذاکرہ کرنے تشریف لاتے ہیں وہاں خواجہ بیاد علی اور صوفی
مرجان جیسے اکابر اہل اللہ دفن ہیں۔"

"میں تمھیں کسی دن زندہ دفن کردوں گا اور پھر تمہاری روح اُونٹ کی طرح بلبلاتی پھرے گی۔ گدھے کہیں کے۔"
تھوڑی دیر بعد ایک لفافہ میرے حوالے کرتے ہوئے فرما رہے تھے:۔

"اس میں کچھ سوالات ہیں ان کا جواب تمھیں لکھنا ہے۔"

"میں آج کل بہت مصروف ہوں جناب۔"

"ڈنڈے بجانے کے سوا تمھیں کیا مصروفیت ہوسکتی ہے" وہ سرد لہجے میں بولے "لو پکڑو ـــ جواب میں حماقتیں مت پھیلانا۔"

"پھر تو آپ خود ہی لکھ لیجئے۔ نیم کے درخت سے انگور پیدا نہیں ہوسکتے۔"

"بکواس مت کرو۔ یہ توقع تو مجھے خود بھی نہیں کہ تمھارے قلم سے کبھی کوئی ذمہ دارانہ تحریر نکل سکے گی۔ تاہم ابتذال اور چھچھورے پن سے اجتناب کیا کرو۔ مزاح اور پھکڑ پن میں بڑا فرق ہے۔"

"یہ آپ کو کیا معلوم" میں نے انھیں نرم دیکھ کر کہا "مزاح علم و منطق کے کانٹے میں نہیں تُلتا اسے سمجھنے کے لئے فطری صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔۔۔۔ دیکھئے خفگی کی بات نہیں میرا مطلب ہے کہ صلاحیتیں تو ہر طرح کی آپ میں بھی ہیں مگر یہ سنگین قسم کی سنجیدگی یہ وجاہت یہ ٹھٹھرا ہوا انداز فکر۔۔۔۔"

"چپ ہو جاؤ ـــ تم چاہتے ہو میں بھی تمھاری طرح گدھا بن جاؤں۔ خوب سمجھ لو یہ سوال و جواب اسی بار چھپنے ہیں۔"

"آپ یہ تو خیال فرمائیے کہ تازہ تجلّی میں مَیں نے رضوان آباد کے اسٹیشن والی یتیم خانہ پارٹی کا ذکر خیر کرنے کا وعدہ کیا ہے۔"

"کیا ہوگا۔ تمھارے وعدوں کی حقیقت سب جانتے ہیں۔"

"لیکن جناب تجلّی کی ڈاک تو آپ کا عنوان ہے مجھے کیوں کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔"

"سمجھنے کی کوشش کرو ـــ بعض سوالات [illegible] کرنے کے بھی نہیں ہوتے مگر ان کا جواب بھی دینا میرے بس سے باہر ہوتا ہے ـــ دراصل ان کا جواب دینے کے لئے حماقت کی وافر مقدار درکار ہے۔"

"پھر آپ مجھے کیوں آرڈر دیتے ہیں کہ حماقتیں پھیلاؤں"

"تمھاری حماقتیں بسا اوقات ابتذال کے دائرے داخل ہو جاتی ہیں حالانکہ حماقت پھیلانا بڑا باریک فن ہے حماقت سلیقے سے پھیلائی جائے تو اس پر بجائے غصّے کے پیار آسکتا ہے۔"

فدوی اور ملّائن دونوں دنگ تھے کہ آج یہ قبلہ و کعبہ کس موڈ میں ہیں۔ کہاں وہ بات بات پر انگارے اگلنے کی عادت۔ کہاں یہ ٹھنڈی ٹھنڈی چہکاریں۔ ملّائن نے ناشتے کی ٹرے سامنے رکھدی اور آج زندگی میں شاید پہلا یا دوسرا موقع تھا کہ ہم تینوں نے ساتھ اکل و شرب کیا۔

وہ چلے گئے تو میں نے ڈرتے ڈرتے لفافہ کھول کر خط نکالا جو دو ورق پر مشتمل تھا۔ ڈر اس لئے رہا تھا کہ خدا معلوم سوالات کس نوع کے ہوں۔ کیا ضروری ہے کہ ہر سوال کا جواب مجھ سے بن ہی آئے۔ وہی ہوا۔ سوالات ایسے نکلے کہ طبیعت صاف ہوگئی۔ ملّائن بڑی دلچسپی سے منتظر تھیں کہ میں پڑھ چکوں تو جلدی وہ پڑھیں۔ میری نظریں خط پر جمی ہوئی تھیں کہ وہ بیتابی سے بولیں:۔

"آپ تو شاید سو گئے۔ ذرا جلدی سے پڑھ لیجئے۔"

"پڑھ لیا ـــ مگر تم نہ پڑھو ورنہ سر پیٹ لوگی۔"

"مذاق مت کیجئے لائیے مجھے دیجئے۔"

"مذاق نہیں نیک بخت۔ یہ خالص روحانی معاملات ہیں تمھارے فرشتے بھی ان کی تہہ کو نہیں پہنچ سکیں گے۔"

"خیر آپ دیجئے تو۔"

"لو پڑھ کر بتاؤ کیا جواب دینا چاہئے۔"

پڑھنے کے دوران ان کا چہرہ دیدنی تھا۔ اقلیدس

کے تنے تنے زاویے بنے اور بگڑے۔ غصہ، ملال، تحیر، بیزاری
سبھی کچھ ابھرتا ڈوبتا نظر آرہا تھا۔ ایک طویل سانس لے کر وہ
منمنائیں ۔

"حیرت ہے بھیا نے اس استفسار کو لائق اعتنا کیسے
سمجھ لیا میں تو اسے چولھے میں رکھ دیتی۔"

"اب رکھ دو۔ میری جان چھوٹ جائے گی۔"

"ہائے اللہ اب تو بھیا مار ہی ڈالیں گے ۔"

"پرواہ مت کرو۔ میں فوراً سراغ لگا کر انھیں حوالۂ
پولیس کر دوں گا۔"

"آپ خود جو جلا دیجئے ۔"

"میں تمھیں بیوہ نہیں دیکھ سکتا ۔ تمھیں تو وہ شاید فقط
گلا گھونٹ کر آرام سے قبر میں سلا دیں، مگر مجھے تو توپ کی دم سے
باندھ کر سڑکوں پر گھسیٹے پھریں گے ۔۔ نہیں خط ضائع کرنے کا
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"پھر تو جواب لکھیے۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہی لکھ
سکتے ہیں کہ شریعت میں ایسی لن ترانیوں کی کوئی قیمت نہیں
مگر کون آپ کی بات مانے گا۔ اللہ والوں کے مکاشفات کے
آگے شریعت بیچاری کو کون پوچھتا ہے۔"

"یہی تو آفت ہے۔ تمھارے بھائی صاحب نے بھی شاید
اسی لئے میرے سر یہ بلا ڈالی ہے کہ انھوں نے اگر قرآن و
حدیث سے جواب دیا تو اللہ والوں کی ذرّیت کے کانوں پر
جوں تک نہیں رینگے گی۔"

"اور کیا۔ آپ اپنے علم تصوف کے جوہر دکھائیے ۔ یہ
صوفیوں سے ربط ضبط آخر کب کام آئے گا۔"

"اچھا جی۔ اب تم بھی مسکا لگاؤ گی۔ پروا نہیں، میں
بھی حضرت کشاف علی کی خدمت میں جاتا ہوں۔ وہ اگر اچھے
موڈ میں ہوئے تو ایسا جواب دیں گے کہ تم اور تمھارے بھیا
عش عش کرتے پھریں گے۔"

"ضرور جائیے۔ مگر کھانے کے وقت آجائیے گا مجھے بہن
سلمٰی کے گھر جانا ہے۔"

"کیوں وہاں کیا لڈو بٹ رہے ہیں؟"

"بمبئی سے خورشید آئی ہے۔"

"خورشید کون؟"

"ارے وہی خالو شمس الزماں کے چچا انیس الدین کے
پھوپازاد بھائی کی لڑکی ۔"

"معاذاللہ ۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ میرے سامنے رشتوں
کی انسائیکلوپیڈیا کھول کر مت بیٹھا کرو۔ کیوں نہیں کہتیں کہ
میاں رئیس احمد کی لڑکی خرّد۔"

"اوہو آپ کو ابھی تک یاد ہے یہ نام۔ میں سمجھی تھی بھول
گئے ہوں گے۔"

"غلط سمجھی تھیں مجھے اپنی تاریخ پیدائش تک یاد ہے۔
ویسے خرّد جیسی لڑکیوں کو آسانی سے بھلایا بھی نہیں جا سکتا۔"

"کیوں؟" ملائن مجھے مشتبہ نظروں سے گھورتے ہوئے
بولیں ۔

"بس یونہی۔ تمھیں یاد ہوگا کہ جب پہلی ہی بار وہ ہمارے
یہاں آئی تھی تو مجھ سے بڑی میٹھی میٹھی باتیں کی تھیں ۔ لیکن
جب تک وہ باتیں کرتی رہی میں اس کے لمبے لمبے ناخونوں کو
دیکھتا رہا تھا۔ یاد ہیں نا اس کے ناخون؟"

"یاد تو ہیں مگر آپ اتنی جزرسی کے ساتھ اس کا مطالعہ
کیوں کرتے رہے تھے۔" ان کی آواز میں شک کا شعلہ کانپ
رہا تھا۔

"آگئیں اپنی سطح پر ۔ نیک بخت نہ پوچھو ناخون ہی
کیوں خاص طور پر میری آنکھوں میں سما گئے تھے ۔ بمبئی کے
ایک ہوٹل میں میں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ نظارہ دیکھا
تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کے خوش پوش بزرگ اپنی گرل فرینڈ
کے ساتھ ناؤ نوش میں مشغول تھے کہ اتنے میں ایک عورت داخل
ہوئی جو خیر سے ان کی بیوی تھی۔ وہ بڑے فیشن ایبل لباس
میں تھی اور اس کے ناخون ۔ خدا کی پناہ ۔ پہلے تو میاں
بیوی میں تو تو میں میں ہوئی پھر گرل فرینڈ بھی بیچ میں بولی تو
دونوں عورتیں ایک دوسری سے لپٹ پڑیں۔ ایک ہنگامہ
کھڑا ہو گیا۔ معاملہ عورتوں کا تھا اس لئے بیچ بچاؤ کرنے
کی بھی کسی مرد میں جرأت نہ ہوئی۔ دفعتاً گرل فرینڈ کی نہایت

دردناک چیخ سے ہوٹل کی فضا جھنجھنا اٹھی اور لوگ یہ دیکھ کر کانپ گئے کہ اس کی ایک آنکھ دوسری عورت کے لمبے ناخنوں نے باہر نکال لی ہے! ــــ میں کبھی وہ ہولناک نظارہ نہ بھول سکوں گا ــــ"

"جانے کب کب کی باتیں آپ نے یاد کر رکھی ہیں ــــ"

"بہت عاجز ہوں میں اپنے حافظے سے ــ جو بات گھس جاتی ہے نکلتی ہی نہیں ــــ خیر اب میں چلا۔"

حضرت کشاف علی کے کیا کہنے ــ مگر اس سے پہلے کہ بات آگے چلے ناظرین باتمکین وہ استفسار ملاحظہ فرمالیں جس کے سلسلے میں یہ سارا چرخہ چل رہا ہے مستفسر پاکستان کے ایک ملتانی بزرگ ہیں ــ انھوں نے اپنے ایڈیٹر تجلی کو خطاب کرتے ہوئے ذیل کا والا نامہ ارسال فرمایا ہے ــ

السلام علیکم!

مندرجہ ذیل تین واقعے قطب زماں حضرت شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری کے نام سے مشہور شخصیت حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی ناظم اعلیٰ جمعیت علماء اسلام و ممبر صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان نے روزنامہ "امروز لاہور" کے "شیخ التفسیر نمبر" میں شائع کرائے ہیں جن کی شرعی حیثیت مطلوب ہے؟

واقعہ نمبر (۱) ایک بار حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک شخص مر گیا میں نے کشفی حالت میں دیکھا کہ وہ ایمان سے خالی ہے ــ چنانچہ میں نے اس کے بھائی کو بلا کر اپنا فرض پورا کیا اور اسے بتا دیا کہ تمھارے بھائی کا یہ حشر ہوا ہے لہذا مودودیت سے توبہ کر لو ــ

واقعہ نمبر (۲) :ــ "مناظر اسلام" میں حضرت مولانا لال حسین اختر راوی ہیں کہ وہ آگرہ سے جماعت اسلامی میں اسلام آباد پٹھان کوٹ جانا چاہتے تھے راستے میں لاہور وہ اپنے استاد مکرم حضرت شیخ التفسیر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سوال کیا کہ حضرت آپ کا جماعت اسلامی کے متعلق کیا خیال ہے؟ حضرت نے فرمایا بھائی لوگ تو مودودی صاحب کی تعریف کرتے ہیں مگر میں جب اس کی طرف روحانی توجہ کرتا ہوں تو وہ مجھے مسخ نظر آتا ہے ــ

واقعہ نمبر (۳) :ــ اس ضمن میں ایک اور واقعہ بھی خالی از فائدہ نہ ہوگا ــ ہندوستان کے ایک بہت بڑے عالم دین جو تمام ممالک اسلامیہ کی معمر ہستی ہیں اور بیک وقت اس زمانے کے دو اقطاب زماں کے خلیفہ مجاز ہیں لاہور آئے ہوئے تھے وہ حضرت احمد علی سے ملنے کے لئے مسجد شیرانوالہ تشریف لائے تو آپ انھیں اپنے حجرے میں لے گئے آپ نے اندر لے جا کر ان سے کہا کہ اہل اللہ کے طریق سے ذرا میرے سامنے توجہ کر کے مودودی صاحب کی ایمانی کیفیت کا جائزہ لیجئے ــ چنانچہ جب انھوں نے حضرت قطب زماں مولانا احمد علی صاحب کے حکم کے مطابق مودودی صاحب کے قلب کی طرف متوجہ ہو کر دیکھا اور ایمانی حالت کا اندازہ کیا تو انھیں اس امر کا مشاہدہ ہو گیا کہ مودودی صاحب سرے سے ایمان سے خالی ہیں ــ چنانچہ انھوں نے اسی دن سے مودودی صاحب سے راہ و رسم تک بند کر دینے کا عہد کیا ــ اس طرح ایک اور شخص کو بھی حضرت نے مودودی صاحب کا مشاہدہ کرا دیا تھا ــ فقط والسلام ــ

اس استفسار کا شایانِ شان جواب حاصل کرنے کی فکر میں عاجز گردن لٹکائے چلا جا رہا تھا کہ مولوی صدرالدین مل گئے ــ

"کہاں بھاگے جا رہے ہو ملّا ــــ تم تو یار عید کا چاند ہو گئے ــ"

"بہت پریشان ہوں مولنا ــ اس وقت جلدی ہے اجازت چاہوں گا ــ"

"ہرگز نہیں ــ ہم تو تمھیں ڈھونڈ ہی رہے تھے ــ"

"خیریت؟"

"آؤ ادھر ہوٹل میں بیٹھیں اطمینان سے باتیں ہوں گی ــ"

چند لمحے بعد ہم ہوٹل کے ایک الگ سے گوشے میں گلاب جامن اور سموسوں کے ساتھ چائے کا شغل کر رہے تھے ــ

"دیکھو ندمت" دفعتاً انھوں نے بڑی لگاوٹ
کے ساتھ فرمایا۔
"آج ایک کام تم سے آپڑا ہے انکار مت کرنا۔ معاملہ
قوم وملّت کے مفاد کا ہے ہمارا ذاتی نہیں۔"
"قوم وملّت کس چڑیا کا نام ہے قبلہ یہ غلام کے
فرشتوں کو بھی خبر نہیں تاہم آپ حکم صادر کیجئے۔"
"حکم نہیں ملّا صاحب التماس ۔ ۔ ۔ ۔ یہ لیجئے نا
گرم سموسہ بڑا خستہ ہے — دراصل آپ کے گہرے تعلقات
حضرت شیخ برہان الدین سے ہیں اور قوم وملّت کے مفاد
میں ہمیں ان ہی سے ایک کام آپڑا ہے۔"
"پھر قوم وملّت — یہ الفاظ میری سمجھ سے بالا
ہیں جناب آپ معاملہ کی بات کہیئے۔"
"معاملہ ۔ ۔ ۔ ۔ دراصل وہ تو آپ کو معلوم ہے
ناکہ مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی وفات کے بعد اب جمعیۃ العلماء
کی صدارت کا انتخاب ہو رہا ہے بڑا نازک معاملہ ہے
تمام بالغ نظر بزرگوں کا متفقہ فیصلہ تو یہ تھا کہ مولانا فخرالدین
صاحب کو صدر رکھا جائے۔ آپ جانتے ہی ہیں وہ حضرت
مولانا مدنی کے جانشین ہیں اصح الکتاب بعد کتاب اللہ
بخاری کا درس دیتے ہیں۔ صاحب باطن ہیں۔ بجد
بزرگ ہیں۔ ہر اعتبار سے وہی صدارت کے مستحق ہیں،
لیکن بعض شر پسندوں نے مفتی عتیق الرحمٰن کا نام کھڑا
کر دیا ہے۔ اب بتایئے کہاں مولانا فخرالدین جیسا مردِ
جلیل اور کہاں مفتی عتیق الرحمان —"
"بے شک" میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے
کہا "آپ مولانا فخرالدین ہی کو صدر بنایئے مفتی صاحب
کو ووٹ کون دے گا۔"
"یہی تو مصیبت ہے ملّا صاحب قوم اندھی ہے
وہ حضرت شیخ الحدیث کی اہمیت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔
[illegible] آپ مفتی صاحب کے متعلق کفر کا فتویٰ
نکلوا دیجئے۔
[illegible] آپ جانتے ہیں کہ ایسا ہی فتویٰ

ہمارے شیخ الحدیث کے بارے میں بھی مخالف پارٹی نکلوا
سکتی ہے۔ اب مودودی وغیرہ کا معاملہ تو ہے نہیں کہ عوام
ہماری ہی سنیں ان کی نہ سنیں ۔ ۔ ۔ ۔"
"ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ یہ واقعی دشواری ہے ۔ ۔ ۔ ۔ مگر
ایک اور ترکیب سمجھ میں آتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ آپ پوسٹروں میں
دونوں کے فوٹو شائع کریں اور عنوان دیں — "داڑھیاں
ملاحظہ ہوں" — ظاہر ہے حضرت شیخ الحدیث کی مقدس
داڑھی کے آگے مفتی صاحب کا چراغ گل ہو جائیگا ۔ ۔ ۔"
"یہ پہلو پوسٹروں میں نہ سہی مگر خصوصی صحبتوں میں
ہم لوگ نمایاں کر چکے ہیں مگر آپ تو جانتے ہی ہیں مودودیت
بری طرح پھیل گئی ہے۔ اکثر عوام یہ صاف سی بات ماننے کو
تیار نہیں ہیں کہ جس کی داڑھی بڑی ہے وہی بزرگ بھی
بڑا ہے۔"
"واہی ہیں سسرے — مگر غلام اس سلسلے میں کیا
کر سکتا ہے۔"
"بہت کچھ کر سکتا ہے۔ یہ ملاحظہ کیجئے۔"
انھوں نے جرمی بستے سے کچھ کاغذات نکال کر میرے
سامنے رکھ دیئے۔ یہ غالباً متعدد پوسٹروں کے مسودے تھے
ان میں سے ایک کی طرف انھوں نے خاص طور سے اشارہ
کیا۔ اسے پڑھ کر اپنی طبیعت صاف ہو گئی۔
اس میں پہلے تو ملک وقوم کا مفصل تذکرہ تھا پھر
جمعیۃ کے مقدس کارنامے اور عظیم خدمات کا بیان۔ پھر حضرت
مولانا فخرالدین کے اوصافِ حمیدہ پر کئی سطریں صرف کی
گئی تھیں۔ پھر وہ خاص حصہ تھا جسے آپ صاحب تحریر
ہی کے الفاظ میں سنئے:۔
"۔ ۔ ۔ ۔ تو صاحبان صدارت کے لئے اگرچہ مفتی
عتیق الرحمان کا نام آرہا ہے اور بے شک وہ بھی بظاہر
بڑے دانش مند اور صاحب خیر بزرگ ہیں لیکن
اہل البصیرت علماء کی توجہ ایک خاص واقعے کی طرف
منعطف ہو گئی ہے جو یہ ہے کہ جمعیت کے ایک صاحب نسبت
بزرگ خواجہ نفیس الدین خانقاہ نو میں تشریف لے گئے تو

جانتے رہے ہیں کہ اس خانقاہ کے سجادے حضرت زبدۃ الاولیاً قدوۃ الاتقیاء ابدال زمانہ شیخ سرتاج علی نقشبندی کس پائے کے بزرگ ہیں۔ خواجہ نفیس الدین نے شیخ سے عرض کیا کہ روحانی طریقے پر بھی تو جائزہ لیجئے کہ شیخ الحدیث مولانا فخر الدین اور مفتی عتیق الرحمٰن میں کون جمعیت کی صدارت کے لئے زیادہ موزوں رہے گا۔ اس پر شیخ نے مراقبہ فرمایا اور سولہ منٹ چھ سکنڈ کے بعد مکاشفہ بیان فرمایا کہ بھائی مفتی عتیق الرحمان بظاہر تو واقعی نہایت نیک اور فہیم انسان نظر آتے ہیں لیکن بارگاہ ربانی میں ان کا ایمان مقبول نظر نہیں آتا۔ فرشتے میکائیل نے عزرائیل سے بالکل صاف لفظوں میں یہ بات کہی ہے کہ مفتی عتیق الرحمان کی روح پر کالے دیو کا سایہ ہے جس کی وجہ سے ان کے کسی بھی عمل خیر کو نورانیت میسر نہیں ہے۔ اس کے برخلاف شیخ الحدیث کا چرچا قدسیوں میں بڑی عظمت کے ساتھ ہے۔ انکی معیت کا [illegible] تو حوروں میں بھی بہت پایا جاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

اس عبارت کے بعد شیخ سرتاج علی کی تصدیق بھی بہ ایں الفاظ ثبت تھی :-

> "فقیر ہرگز ہرگز کسی کی تنقیص پسند نہیں کرتا لیکن یہ معاملہ چونکہ قوم و ملت کی فلاح کا ہے اس لئے میاں نفیس الدین کے اصرار پر مجبور ہو کر کشف کی طرف توجہ مرکوز کی اور جو کچھ منکشف ہوا بہ نگاہ رفاہ عام نشر کر دیا۔ وباللہ التوفیق وھو المستعان"

اس کے بعد دو تین اور بزرگوں کے ایسے ہی انکشافات درج مضمون تھے جن کا لب لباب یہ تھا کہ مفتی عتیق الرحمان کو صدر بنانا مناسب نہیں کیونکہ ان کے قلب و روح مسخ ہو چکے ہیں اور کراماً کاتبین نے ان کے اعمالِ خیر کو اعمالنامے میں درج ہی کرنا چھوڑ دیا ہے کیونکہ کیا فائدہ اندراج سے جب ان اعمال میں نورانیت ہی نہیں۔

آخر میں شیخ برہان الدین کا بھی اسی کوالیٹی کا مکاشفہ درج تھا مگر اس کے آگے تصدیقی الفاظ نہیں تھے۔

"یہ کیا بات ہے؟" میں نے مولانا برہان الدین سے سوال کیا

"اسی کے سلسلے میں تو آپ کو زحمت دینا چاہتا ہوں آپ جانتے ہی ہیں کہ شیخ برہان الدین کا بھی کافی اثر ہے جمعیت کے بہت سے افراد ان کے مرید ہیں۔ ان کی تصدیق ہو جائے تو پوسٹر مکمل ہو جائے گا۔"

"تو کرا لیجئے تصدیق۔ جب مکاشفہ انھیں بھی ہو گیا ہے تو تصدیق میں کیا عذر ہوگا۔"

مولانا نے مجھے بڑی شفیق نظروں سے گھورا، پھر مسکرائے پھر ایک گلاب جامن پیش کرتے ہوئے بولے :-

"آپ سے کیا پردہ ــ شیخ صاحب اگر توجہ دیں تو یہ مکاشفہ انھیں ضرور ہوگا لیکن ابھی انھوں نے توجہ نہیں دی ہے۔ آپ اگر دیگر اہل اللہ کے مندرجہ مکاشفات دکھلا کر ان کی تصدیق لے لیں تو کام مکمل ہو جائے گا۔"

"یعنی آپ کا مطلب یہ ہے کہ مراقبہ کرنے کی صورت میں جو کچھ شیخ صاحب پر منکشف ہوتا اسے آپ نے پہلے ہی طے کر دیا ہے؟" میں نے تحیر سے کہا :-

"پھر کیا حرج ہے۔ ارے یار بات تو بہر حال ایک ہی بزرگ کے مکاشفے سے محقق ہو گئی۔ اب اگر شیخ برہان الدین بھی تائید کر دیں تو کیا قیامت ہو جائے گی ــ بات سمجھا کرو۔ ملک و ملت کی فلاح کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

"ہوں.... مگر جناب ہمارے شیخ برہان الدین تو کشف و کرامت کے آدمی نہیں ہیں۔"

"نہ ہوں۔ بزرگ تو ہیں انھیں تم سمجھا سکتے ہو کہ... ... ارے یار تم تو خود عقلمند ہو ــ صرفہ بھی کچھ ہو جائے تو ڈر نہیں ــ لو یہ رکھو ــ"

دس دس کے دو نوٹ انھوں نے بڑھائے ــ مجھے پل بھر کو جھجک ضرور ہوئی لیکن پھر یہ سوچ کر قبول کر لئے کہ مال قوم کا ہے۔ قوم اپنی ہے "ہم قوم کے ہیں، قوم جمعیت کی ہے۔ جمعیت کا بیڑا بغیر شیخ الحدیث کی صدارت کے پار نہیں ہو سکتا۔ صدارت کی باگ ڈور اگر مفتی عتیق الرحمان کے ہاتھ میں چلی گئی تو کالے دیو کا سایہ ساری قوم کے چہرے سیاہ کر دے گا اور سیاہ چہروں پر سفید داڑھیاں دیکھ کر ہی نسل

کے لیے تحفہ ہو جائیں گے۔ یہ سارا طوفان اگر عاجز کے میں پے قبول کر لینے سے رُک سکتا ہے تو انھیں قبول کرنا بھی قوم و ملت ہی کی زرّیں خدمت کہلائے گی۔

پھر پوسٹر چھپ گیا۔ شیخ برہان الدین کا مکاشفہ بھی اس میں مع تصدیق موجود تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ جب شیخ برہان الدین اس پوسٹر کو دیکھ کر خود بھی ہق دق رہ گئے تو مولوی صدر الدین میرے پیچھے عصا لیکر دوڑے اور نہایت تند لہجے میں فرمایا:۔

"خبیث وہ بیس روپے لوٹاؤ ورنہ سر توڑ دوں گا۔"

"فدوی کا سر عصا پروف ہے مولانا۔ مار کر دیکھئے آپکو عصا دوسرا خریدنا پڑے گا۔"

"تم نے مردود ہمیں دھوکا دیا۔ شیخ برہان اب ہر ایک سے کہتا ہے کہ مجھے ایسا کوئی مکاشفہ نہیں ہوا نہ میں نے تصدیق کی۔"

"کہنے دیجئے۔ پوسٹر ہزاروں کی نظر سے گذر چکا ہے۔ شیخ برہان الدین کس کس سے تردید کرتے پھریں گے۔"

"پھر بھی تمھیں ان کی طرف سے جھوٹ میٹ تصدیق نہیں کرنی چاہئے تھی۔"

"جھوٹ کیسا مولانا۔ جب آپ خود ہی کہہ چکے ہیں کہ شیخ صاحب اگر مراقبہ کرتے تو نتیجہ وہی نکلتا جو دوسرے بزرگوں کے مکاشفات کا نکلا ہے پھر جھوٹ چہ معنی دارد —— اب تو یقیناً شیخ الحدیث صدر بن ہی جائیں گے۔"

"تمھارا سر بن جائیں گے تمھیں نہیں معلوم مفتی عتیق الرحمن کے حامی کتنے چالاک ہیں۔ وہ داڑھی کی تقدیس اور درس حدیث کی عظمت سے لوگوں کا دل پھیر کر یہ اُچھالتے پھر رہے ہیں کہ دنیاوی اُمور میں مفتی صاحب ایسے ہیں اور ویسے ہیں ڈبل پیسے ہیں —— اُنھ لعنت بھیجو جائیں گے سب جہنم میں، چلو تم تو چلتے چلو اذآج کا بل تمھارے ذمے رہے گا۔"

"ناپ رے۔ نہیں مولانا آج تو اگر جیب میں پیسے ہوتے تو میں ضرور ضرور خرید لاتا کیونکہ صدارت سے حضرت شیخ الحدیث کی محرومی مجھ سے نہیں دیکھی جائے گی۔"

"محرومی تو خیر نا ممکن ہے۔ ہم نے ایسا انتظام کر لیا ہے کہ تسمہ ضرور لگا رہیگا۔ تم یار ہمیشہ ہم سے کھاتے پیتے ہو مگر خود کبھی کچھ نہیں کھلاتے۔"

"کھلاؤں گا مولانا گلے گلے کھلاؤں گا ذرا وہ مبارک ساعت آنے دیجئے جب گل بہار میمے کا پہلا انعام فقط ایک خوش نصیب کے حصے میں آئے گا۔ ذرا بتائیے تو اگر اشارہ یہ ہو کہ جان جائے مگر یہ نہ جائے تو صدارت رکھیں گے یا ذرا آرت؟"

"خواہ مخواہ دماغ چاٹتے ہو۔ جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ کاہیں کی صدارت کیسے فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔"

"مان لیجے جمعیۃ العلماء کی صدارت؟"

"کیوں مان لیں —— بھاگ جاؤ تم سوائے بھیجا کھانے کے اور کسی کام کے نہیں۔"

میں بھاگ گیا۔ حضرت کشاف علی کی حویلی دور نہیں تھی۔ آج وہاں خاصی ریل پیل نظر آئی۔ گاندھی کیپ والے کتنے ہی کھدر پوش حاضر مجلس تھے۔ مولوی ذوالفقار بھلا۔ دیکی نندن۔ صوفی بدر الزماں۔ بقول شخصے مقامی کانگریس کے اپنے جگر گوشے حضرت کشاف علی کی بارگاہ میں بیٹھے تھے۔ چلتے پانی کا دور ابھی ابھی ختم ہوا تھا۔ سب کے چہرے نہایت شگفتہ تھے۔

"کیوں بھئی کیا ماجرا ہے؟" میں نے میاں رضا حسین سے پرائیویٹلی پوچھا جو یہاں کے خادم خاص ہیں۔

"میاں کو کشف ہوا ہے۔ ساری رات مصلے پر کاٹی ہے۔"

"کیسا کشف؟"

"وہ جو بسنت پور کے حلقے میں الیکشن ہو رہا ہے کل یہ لوگ اسی کے سلسلے میں آئے تھے۔ وہاں کانگریس کے مقابلے میں ایک مسلم لیگی کھڑا ہوا ہے۔ اکثر مسلمان اسی کو ووٹ دینے کی سوچ رہے ہیں۔"

"مسلم لیگی ......؟" جذ...

"اور کیا جیب کا تاگ... مسلم لیگی ہے۔"

ماہنامہ تجلی دیوبند

"[illegible] یہ سب لوگ آئے تھے کہ بسنت پور کے [illegible] میں میاں کا بہت چرچا ہے۔ اگر میاں نے کوئی اچھا [illegible] کر دیا تو مسلمان بھائی مسلم لیگی بدماش کے پھندے میں [illegible] جائیں گے۔"

"پھر؟ — کچھ کشف کیا؟"

"کیوں نہیں کیا۔ رات بھر مصلے پر سجدے میں پڑے رہے ہیں تین سو تیرہ روپے سوا گیارہ آنے کی تو نیاز گئی ہے۔"

"اللہ اکبر — پھر کیا پتا چلا؟"

"یہی کہ مسلم لیگیا ظاہر میں مومن باطن میں کافر ہے۔ کانگریس پالٹی کو اوپر والوں میں بڑی مرغوبیت حاصل ہے۔"

"مرغوبیت —"

"پتہ نہیں میاں نے ایسا ہی کوئی لفظ کہا تھا۔ یہ بھی کہا تھا کہ بڑے پیر صاحب اور غوث اعظم دستگیر آجکل کانگریس ہی کے ٹکٹ کو ٹکٹ مان رہے ہیں۔ ایک سو نوا بدال کانگریسی وزیروں کی مدد کے لئے اللہ پاک نے مقرر فرمائے ہیں۔"

"فقط ایک سو نو —" میں نے حیرت ظاہر کی "باقی وزیروں کا کیا ہوگا؟"

"باقی کا انتظام شاید مجذوبوں کے سپرد ہے — ہمیں ٹھیک یاد نہیں رہا آپ لالہ دیکی نندن سے پوچھئے وہ سارے کشف کا اشتہار لکھ رہے ہیں۔ پوری خبر بسنت پور کے اخبار "حق کی پکار" میں چھپے گی —"

کافی دیر بعد صوفی کشاف علی کی خدمت میں باریابی کا موقع مل سکا۔ دست مبارک کو بوسہ دینے کے بعد میں نے خط ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پڑھا اور مسکرا کر کہنے لگے

"یہ تو بالکل حق ہے۔ کیا پوچھنا چاہتے ہو —"

"[illegible] کی حیثیت؟"

"[illegible] مولوی سے پوچھنی تھی" وہ برا سا [illegible] ہم [illegible] بتا سکتے ہیں۔"

"وہی [illegible] — [illegible] مسلمان آدمی

[illegible]

"ارے ظاہر کی کیا حقیقت ہے۔ سب کچھ تو باطن ہے۔ حیرت کرو گے کہ ہمارے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال ظاہر میں خدا کے منکر ہیں مگر عالم باطن میں جب ان کی حقیقت و مقام کا جائزہ لیا گیا تو منکشف ہوا کہ کفار و ملحدین کی فہرست میں ان کا نام ہی نہیں ہے۔ اکابر اہل [illegible] ان کے اعمالِ حسنہ میں نورانیت ملاحظہ کر رہے ہیں —"

"مگر حضرت — کفار کے اعمال تو سنا ہے حبط ہو جاتے ہیں۔"

"بے شک ہو جاتے ہیں مگر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شخص ایمان لا کر رہے گا۔"

"یہ شخص — یعنی پنڈت جواہر لال؟" میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"اور کون — ارے حیران کیوں ہو۔ ہم تو فرعون کی مغفرت سے بھی ناامید نہیں۔ آخر قرآن ہی میں تو ہے کہ وہ آخر وقت میں خدا کا قائل ہو گیا تھا —"

"جی ہاں جی ہاں۔ شاید اسی لئے صوفی گنجان ایک دفعہ کہہ رہے تھے کہ ہم نے خود فرعون کو جنت میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ فاروقی غصے میں آکر ان سے لڑ پڑا تھا۔"

"خبردار صوفیا سے سرکشی نہیں کیا کرتے۔ صوفی گنجان بھی اونچے درجے کے اولیاء ہیں۔ ان کے کشفوں کو تو ہمارے شیخ حضرت خواجہ عبد القادر جیلانی رضوان اللہ علیہم بھی سند مانتے ہیں۔۔۔"

"علیہم ---؟!"

"ہاں ہاں۔ تم کیا جانو وہ ایک میں ہزار ہیں اور ہزار میں ایک — جاؤ اب ہم سوئیں گے رات بھر مصلے پر رہے ہیں۔"

لوٹ کر گھر آیا تو ملا جی نے بڑے [illegible] شوق انداز میں پوچھا۔

"کہئے کیا کر آئے؟"

اپنے شوہر نامدار کو جنت میں داخل کرا آیا تمھیں دوزخ میں بھیجوں گا۔"

"کیا بات جھلائے ہوئے آئے ہیں؟"

"پھر کیا خوشی سے ناچوں۔ فرعون جنت میں بھی چلا گیا اور ہم یہاں جھک مار رہے ہیں۔"

"اچھا بھئی میں کچھ نہیں پوچھتی ——"

"کیا کہا بھائی! یعنی طلاق دینا چاہتی ہو ——"

"توبہ میری —— آپ تو زبان کو لگام ہی نہیں دیتے۔"

"ٹھیک ہے۔ میری ناک میں سوراخ کر کے رسّی ڈالدو اور بھیا سے کہو اسے پکڑ کے ٹک ٹک کرتے پھرا کریں ——

—— معاذ اللہ ایسا استفسار میرے سر مارا ہے کہ سر دیواروں سے ٹکرایا کروں مگر جواب سمجھ میں نہ آئے۔"

"سیدھا سادا جواب لکھ دیجئے۔ مولانا اشرف علیؒ نے تو بہشتی زیور میں یہی لکھا ہے کہ کشف و الہام حجت نہیں ہوتے آپ بھی انھی کا حوالہ دیدیجئے۔"

"یہ حوالہ تمھارے بھیا بھی دے سکتے تھے —— پھر میرے گلے میں پھندا کیوں ڈالا؟"

"اب ہر کیوں کا جواب تو میرے پاس نہیں ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی ہوں کہ آپ کے سر میں تیل ڈالدوں شاید دماغ کچھ چل نکلے۔"

"ہاں ہاں تم تو چاہتی ہی ہو کہ میرا دماغ چل جائے اور تم کسی پالتو کتے کی طرح میری گردن میں پٹا ڈال کر سہیلیوں کو دکھلاؤ کہ یہ ہیں میرے شوہر جنھیں میں اولاد کی طرح پال رہی ہوں"

"خدا آپ کو ہدایت دے یہ کس کس کا تیہا مجھ پر اتار رہے ہیں۔ نہیں جواب بن آتا تو واپس کر دیجئے بھیا کو خط۔ جلنے بھنے سے کیا فائدہ۔"

"میں مولانا مودودی کی طرح تمھارے بھیا کو بھی حضرت کشف علی سے جہنم میں بھجوا دوں گا۔ حضرت کسی لاہوری یا نیز اروی سے کم نہیں ہیں —— تم مجھے زیادہ پریشان مت کیا کرو ورنہ تمھارے لئے بھی ایسا کشف کرا دوں گا کہ ایک ہزار برس تک ... اور جنت کے بیچوں بیچ لٹکی رہو گی۔ رونا چاہو گی مگر منہ سے ...

غلاف کعبہ کمیٹی کی کارگزاری کی رپورٹ

مولانا کوثر نیازی کنوینر کمیٹی نے حسب ذیل بیان ایک پریس کانفرنس منعقدہ ۲ اپریل میں دیا

۲۶ جنوری کو رمضان المبارک سے صرف ایکدن پہلے
منصورہ، لاہور میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے غلاف
کعبہ کی تیاری کا افتتاح فرمایا تھا اس موقع پر لاہور کے
ممتاز شہریوں کی ایک نمائندہ کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جس
میں بریلوی، دیوبندی، اہلحدیث اور شیعہ مکاتیب فکر کے
علاوہ لاہور کارپوریشن، بنیادی جمہوریتوں، تجار، طلبہ اور ہیڈ
ماسٹرز ایسوسی ایشن کے نمائندے بھی شامل تھے کمیٹی کی
تشکیل کا مقصد یہ تھا کہ غلاف کعبہ کی زیارت اور شایان
شان روانگی کے سلسلے میں اہل وطن کے دلوں میں جو
بے پناہ جذبہ پایا جاتا ہے وہ غلط راستہ اختیار نہ کرنے
پائے اور حدود شرعیہ کے اندر رہتے ہوئے تنظیم کے ساتھ
اس کام کو انجام دیا جائے۔

کمیٹی کے اجلاس

کمیٹی نے اپنے فرائض منصبی
کو انجام دینے کے لئے سات اجلاس بلائے جن میں کمیٹی
کے ارکان کے علاوہ دوسرے اہل الرائے اصحاب کو
بھی شمولیت کی زحمت دی جاتی رہی۔ خدا کا شکر ہے کہ کمیٹی
کامل اتفاق رائے کے ساتھ فیصلے کرتی رہی اور اس کے
ارکان نے اس کی بجاآوری میں شبانہ روز محنت سے
کام کیا۔ ابتدا ہی میں یہ طے کر لیا گیا تھا کہ زیارت اور جلوس
سے متعلق امور میں حدود الٰہیہ کی کامل پابندی کی جائے گی۔
اور لوگوں میں یہ جذبہ پیدا کیا جائیگا کہ وہ جس گھر کے غلاف کی
اتنی عقیدت اور محبت کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس گھر کی زیارت
کریں۔ یہ فیصلہ بھی ابتدا ہی میں کر لیا تھا کہ عورتوں کو الگ
مردوں کو الگ زیارت کرائی جائیگی اور مخلوط اجتماعات
کی اجازت نہیں دی جائیگی۔

حضوری باغ میں نمائش

کمیٹی نے اسی پروگرام
کے تحت حضوری باغ میں سات دن غلاف کعبہ کی نمائش
کی پہلے چار دن عورتوں کے لئے مخصوص تھے اور بعد کے
تین دن مردوں کے لئے۔ کمیٹی نے خواتین کے دنوں میں
زیادہ سے زیادہ پردے کا انتظام کیا حضوری باغ کے
دونوں دروازوں پر پولیس اور اسکاؤٹس متعین تھے۔
جو کسی مرد کو اندر داخل نہیں ہونے دیتے تھے بادشاہی
مسجد کے مین گیٹ کی سیڑھیوں پر بھی پولیس موجود رہتی تھی تاکہ
مسجد دیکھنے والوں میں سے کوئی شخص حضوری باغ میں نہ
آنے پائے عورتوں کو نظم و ضبط کی تلقین کرنے اور خلاف
شریعت حرکات سے روکنے کے لئے کمیٹی کی طرف سے
تعلیم یافتہ کارکن خواتین کی ڈیوٹیاں لگائی گئی تھی بادشاہی
مسجد کی وضو گاہوں تک قناتیں لگادی گئی تھیں تاکہ وہاں
سے کھڑے ہو کر حضوری باغ میں نہ جھانکا جا سکے غرضیکہ کمیٹی
کی طرف سے مخلوط اجتماع کو روکنے کی ہر ممکن تدبیر کی گئی
اور ہمارا دعوٰی ہے کہ خواتین کے لئے اس نمائش میں پردے کا
جو اہتمام کیا گیا تھا وہ ہمارے پابند شریعت گھرانوں سے بھی کہیں
بڑھ کر تھا۔

جلسہ عام اور جلوس نمائش کے بعد کمیٹی کی طرف سے

غلاف کعبہ کے تقدس و احترام کے موضوع پر موچی دروازہ کے تاریخی باغ میں جلسہ عام منعقد کیا گیا اور یہ جلسہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں بریلوی دیوبندی اور شیعہ سنی علمائے کرام نے اتحاد اسلامی کا دل خوش کن مظاہرہ کیا اور اس طرح ثابت کر دیا کہ وہ اپنے باہمی فروعی اختلافات کے باوجود ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو سکتے ہیں۔

دوسرے دن غلاف کعبہ کا تاریخی جلوس نکلا کمیٹی نے پہلے ہی سے اپیل کر دی تھی کہ خواتین اس جلوس میں شریک نہ ہوں جلوس کا یہ پہلو بھی لاہور کی تاریخ میں منفرد حیثیت رکھتا ہے کہ اس میں تلاوت کلام پاک کلمہ طیبہ اور تکبیروں کے علاوہ کوئی نعرہ تک نہیں لگایا گیا راستے میں کھڑے ہوئے لوگوں نے کوئی نعرہ لگایا بھی تو لوگوں نے اس پر کان نہیں دھرا۔ حضوری باغ سے لیکر ہوائی اڈہ تک جیب تراشی یا غنڈہ گردی کا کوئی مظاہرہ نہیں ہوا حد یہ ہے کہ اس سارے راستے میں لاکھوں انسانوں کا مجمع تھا مگر احتراماً لوگوں نے سگریٹ تک نہیں پیا جلوس کے راستے سے تمام عریاں اور نیم عریاں تصاویر ہٹادی گئیں ریڈیو پر گانے بند کر دئے گئے اور لاہور کی فضائیں کلمہ طیبہ کے ورد سے گونج اٹھیں۔

حدود شریعت

میں اس موقع پر کمیٹی کی طرف سے یہ وضاحت کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس سے پہلے اہالیان قصور پورہ نے اپنی طرف سے ایک جلوس نکالا تھا جس کے لئے کمیٹی نے کوئی اجازت نہیں دی تھی اس جلوس کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ اس نے غلاف کعبہ کو لیجا کر حضرت داتا گنج بخش ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر چڑھایا یہ واقعہ بالکل غلط ہے یہ جلوس داتا دربار کے راستے سے ضرور گذرا تھا مگر مزار پر غلاف ہرگز نہیں چڑھایا گیا۔ اس جلوس کے آگے باجا بجا لیکن جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے اس جلوس سے یا بعض دوسری زیارتوں سے جنکا لوگوں نے اپنے طور پر بلا اجازت انتظام کیا کمیٹی کا کوئی تعلق نہ تھا اور ہمیں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے فخر ہے کہ ہم نے اپنی طرف سے کسی خلاف شریعت حرکت کی اجازت نہیں دی

مصارف کا انتظام

اس موقعہ پر غلاف کعبہ کمیٹی کی طرف سے اس بات کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ کمیٹی نے اپنے اخراجات کے لئے کوئی چندہ نہیں کیا۔ اگر چندہ جمع کیا جاتا تو بلا مبالغہ غلاف کعبہ کی وجہ سے لاکھوں روپے جمع کئے جا سکتے تھے مگر کمیٹی نے جملہ اخراجات کو اپنے اراکین پر تقسیم کر دیا۔ اور اس نے اللہ کے فضل و کرم سے ایک نہایت مستحسن نظیر قائم کی اب بھی کمیٹی کے ذمہ بعض بل واجب الادا ہیں لیکن ہمارا ارادہ ہے کہ ان کی رقم بھی ہم حسب سابق اراکین پر ڈالدیں گے۔ اور اس کے لئے دوسرے لوگوں کو تکلیف نہیں دیں گے۔ کمیٹی یہ بھی اعلان کرتی ہے کہ اس نے غلاف کعبہ کے لئے کوئی نذرانہ جمع نہیں کیا نہ ہی نذرانوں کی حوصلہ افزائی کی۔

شکریہ

میں آخر میں کمیٹی کی طرف سے لاہور کے زندہ دل شہریوں اور اخبارات کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے کمیٹی کے جملہ پروگراموں کو کامیاب بنانے میں پورا حصہ لیا۔ کمیٹی خاص طور پر لاہور کے نیک دل ڈپٹی کمشنر میاں محمد شفیع۔ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس جناب محمد یوسف خاں اور کرنل سٹی مجسٹریٹ چودھری غلام محمد۔ ڈی۔ ایس۔ پی سٹی۔ شیخ ابرار احمد۔ وائس چیرمین لاہور کارپوریشن چودھری محمد حسین۔ ایس۔ ایچ۔ او بٹی چودھری بشیر احمد اور سول ڈیفنس او نیبر .... کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے پرخلوص تعاون اور عمدہ انتظامات نے قدم قدم پر ہمارا ساتھ دیا۔ ہم سٹی مسلم لیگ ہائی سکول سید مٹھا بازار کے ہیڈ ماسٹر محمد عمر خاں نسیمل کے بھی شکر گزار ہیں جن کے اسٹاف اور اسکاؤٹس نے غلاف کی نمائش کے دوران نہایت قیمتی خدمات انجام دیں۔

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنے ناچیز بندوں سے اتنا بڑا کام لیا دعا کیجئے کہ وہ آئندہ بھی اسی ذوق و شوق

کے ساتھ ہمیں اپنے دین برحق کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرماتے۔

نوٹ:- اس پریس کانفرنس میں ڈپٹی کمشنر لاہور میاں محمد شفیع کے علاوہ مفتی محمد حسین نعیمی مہتمم جامعہ نعیمیہ حاجی محمد اسحاق حنیف ناظم نشر و اشاعت جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان، مولانا محمد بخش مسلم خطیب مسلم مسجد لاہور، چودھری محمد امین کونسلر لاہور محمد عمر خاں بسمل صدر ہیڈ ماسٹرز ایسوسی ایشن، محمد یعقوب انصاری غلاف ساز لاہور اور دیگر ہر طبقہ و خیال کے نمائندہ اصحاب موجود تھے۔

DURR-E-NAJAF

DARULFAIZ RAHMANI DEOBAND

انجن کی فولادی آنکھ سے خارج ہونے والی تیز برقی روشنی ہی ٹرین کو اندھیری راتوں میں بے تکلف سفر کے قابل بناتی ہے۔ اسی طرح آپ کی روشن اور صحت مند آنکھیں دن اور رات کے ہر حصہ میں آپ کی رہنمائی کرتی ہیں۔

قدیم اطبّاء

کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مرض کو جڑ سے اکھیڑ کر صحت کی بنیادیں مضبوط کرتے تھے۔

دُرِ نجف بھی ایک قدیم ہی نسخے سے تیار کیا جاتا ہے۔ بینائی کے جوہر کو فطری اعتدال پر قائم رکھنے میں اپنی نظیر آپ ہے۔ مرض اور صحت دونوں حالتوں میں یکساں مفید۔

آخر عمر تک نگاہ قائم رکھنے کیلئے ہزاروں لوگ دُرِ نجف استعمال کرتے ہیں۔

ماہنامہ

تجلی

دیوبند

62 N. P.

ایڈیٹر۔ عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ **تجلی** دیوبند

شمارہ نمبر ۴

جلد نمبر ۱۵

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

سالانہ قیمت سات روپے۔ فی پرچہ ۶۲ پیسے

غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۸ اشلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پوسٹل آرڈر پر کچھ نہ لکھئے بالکل سادہ رکھئے

اشد ضرورت

اگر اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ

اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ اگر آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا (وی پی سات روپے باسٹھ پیسے کا ہوگا) منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

● پاکستانی حضرات ●

ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیج کر رسید منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتہ ہمیں بھیجدیں رسالہ جاری ہو جائے گا۔

فہرست مضامین مطابق ماہ جون ۱۹۶۳ء

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

دفتر تجلی۔ دیوبند ضلع سہارنپور (یو پی)

پاکستانی حضرات:۔ نیچے لکھے ہوئے پتہ پر منی آرڈر کر کے وہ رسید ہمیں بھیج دیں جو منی آرڈر کرتے وقت ڈاک خانہ سے ملتی ہے۔

مکتبہ عثمانیہ۔ مینا بازار ۲۲۸۰
پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی (پاکستان)

مدیر
عامر عثمانی
فاضل دیوبند

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے "نیشنل پرنٹنگ پریس" دیوبند سے چھپوا کر اپنے دفتر تجلی دیوبند سے شائع کیا

آغازِ سخن

ایک خبر کہ جو کینسر بن سکتا ہے

کہنے کو بہت مختصر سی خبر ہے کہ مسلمانوں کے پرسنل لا میں مفید تبدیلیاں لانے کے لئے حکومت ایک کمیٹی مقرر کرنے والی ہے۔

لیکن آزادی ملنے کے بعد ہمارے خیال میں اس سے زیادہ ہولناک اور فتنہ انگیز خبر کوئی شائع نہیں ہوئی۔ اس ملک میں بڑے پیمانے پر قتل و غارت کے بازار گرم ہوئے ہیں۔ تعصب اور بربریت کا ننگا ناچ ناچا گیا ہے۔ بہت کچھ وہ ہوتا رہا ہے جس کی تاریک پرچھائیوں سے ہمارے سیکولر دستور کا چہرہ دھواں دھواں ہے ـــ لیکن یہ سب فی الحقیقت اتنا سخت اور ہلاکت انگیز نہیں تھا جتنا یہ نیا تعہد و عزم کہ حکومت کسی خود ساختہ کمیٹی کے ذریعے مسلمانوں کے پرسنل لا میں تبدیلیاں لائے۔ پرسنل لا ہمارے دین کا ایک مقدس جزو ہے اور ہمارا دین ہمارے نزدیک کائنات کی وہ سب سے معظم اور برتر شے ہے جس میں تراش خراش کی اجازت کسی بھی فرد یا گروہ کو نہیں دی جا سکتی۔ چہ جائیکہ وہ فرد یا گروہ اس پر سرے سے ایمان ہی نہ رکھتا ہو۔

اُردو کا، گائے کی قربانی کا، سرکاری ملازمتوں کا اور جان و مال کے غصب و نہب کا معاملہ جداگانہ نوعیت کا تھا اسے ہم نے انگیز کیا اور اب بھی کریں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ جو بھی ظلم و تعصب ہمارے ساتھ روا رکھا جا رہا ہے وہ سب کا سب حکمراں گروہ کی بے ضمیری، کم نگاہی اور غلط روی کا آوردہ ہے خود دستور میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے، لیکن یہ حکمراں گروہ اگر ہمارے پرسنل لا میں ادنیٰ سا بھی تغیر کر کے اسے دستور و قانون کی شکل دیدیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے اسے اپنی شہ رگ سے کھیلنے کی اجازت دیدی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم سے زیادہ بے غیرت اور ذلیل قوم دنیا میں کوئی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دین کی جو عصمت و آبرو ہمیں اپنی ماؤں اور بہنوں کی عزت و حرمت سے زیادہ عزیز ہے اس پر دشمنانِ دین کی دست درازی کا لرزہ خیز منظر ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے اور زندہ رہیں گے۔

یقین کیجئے آزادی کے دور میں جتنی کچھ زیادتیاں ہم پر ہوئی ہیں وہ سب مل کر بھی اس ایک ظلم و طغیان کی ہم پلہ نہیں ہو سکتیں کہ ہماری غیر مسلم حکومت ہمارے دین میں دخل اندازی کرے اور اصلاح کے خوبصورت نام سے ہمارے پرسنل لا کا ایک شوشہ بھی بدلے۔

اوّل تو یہ بنیادی مفروضہ ہی قطعاً غلط اور مفسدانہ ہے کہ مسلم پرسنل میں کسی نوع کی اصلاح طلب خرابیاں جو دیں آگئی ہیں۔ جن لوگوں کا اپنا پرسنل لا چند بے اساس غیر منطقی اور خود کاشتہ رسوم و تصورات سے زیادہ کوئی گہرائی نہیں رکھتا ہو وہ کس منہ سے ایک ایسے پرسنل لا کی نزاکتوں کو سمجھنے اور اس کے حسن و قبح کا سراغ لگانے کے مدعی ہو سکتے ہیں جو عقل اور نقل کے تمام منطقی تقاضوں کا امین ہے جس کی جڑیں انسان کے ناقص اور محدود دماغ میں نہیں، اللہ اور رسولؐ کے

محکم ارشادات میں ہیں اور جن کے پیچھے پونے چودہ سو سالوں کی عملی تاریخ ہے۔

لیکن اگر فرض ہی کر لیا جائے کہ مسلمانوں کی اپنی کج روی سے اس پرسنل لا میں کچھ نقائص پیدا ہو ہی گئے ہیں ——— تو سیکولرازم کی مدعی حکومت کے لئے واحد راہِ انصاف یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے مستند علماء کو بلاکر ان نقائص کی طرف توجہ دلائے اور حکم نہیں بلکہ مشورہ دے کہ انھیں دُور کرنے کی کوشش کی جائے مسلمانوں کا پرسنل لا چند خود ساختہ رسوم کا نام نہیں ہے وہ ان کے دین کا لازمی حصہ اور عقائد کا جزوِ لاینفک ہے۔ طاقت ہی کو اگر سب کچھ نہیں مان لیا گیا ہے تو حکومت کو سوچنا چاہئیے کہ یہ ٹیکسوں یا منصوبوں یا مشینوں کا معاملہ نہیں ہے کہ چند حاکم حضرات مل جل کر جو فیصلہ کر دیں بس وہی واجب القبول ہو جائے۔ یہ ایک ایسے دین کا معاملہ ہے جس کی ابجد سے بھی وہ واقف نہیں حالانکہ محض واقفیت سے بھی اس باب میں کوئی کام نہیں چلتا۔ یہاں تو اصل چیز ہے ایمان۔ اعتراف بندگی۔ جذبۂ اطاعت، کوئی اگر تمام اسلامی علوم کو گھول کر پی لے اور قرآن و حدیث کا سب سے بڑا ماہر بن جائے تب بھی اسلام اپنے مسائل کے فیصلے میں اسے پرکاہ کی برابر بھی اہمیت نہیں دیتا اگر وہ اسلام کو بطورِ عقیدے کے ماننے والا نہیں ہے۔ پھر بھلا یہ ظلم صریح کے سوا کیا ہوگا کہ، جہالتِ کاملہ اور کفر و اعراض دونوں کی موجودگی کے باوصف حکومت مسلمانوں کے پرسنل پر طبع آزمائی کے جوہر دکھائے۔

یہاں حکومت کی طرف سے کہا جا سکتا ہے کہ تبدیلیاں وزیراعظم یا صدرِ مملکت نہیں لائیں گے، بلکہ وہ کمیٹی لائے گی جو اسلامی علوم کے ماہرین پر مشتمل ہوگی اور اس کے تمام یا اکثر ممبر مسلمان ہی ہوں گے۔

جواباً عرض ہے کہ اول تو یہ اختیار ہی حکومت کو آخر کہاں سے مل گیا کہ سیکولر دستور کے زیر سایہ وہ مسلمانوں کے اس پرسنل لا میں ٹانگ اڑائے جو کسی بھی سماجی یا سیاسی دائرے میں حکومت کے منصوبوں اور پالیسیوں سے متصادم نہیں ہوتا جو سراسر پُر امن اور نجی قسم کا ایک مجموعۂ عقائد ہے۔ جو ملک کے کسی بھی گروہ اور طبقے کے لئے دردسری کا موجب نہیں ہے۔

دوسرے جن مسلمانوں کو وہ اسلامی علوم کا ماہر سمجھتی ہے یا سمجھنے کا مظاہرہ کرتی ہے ان کا علوم اسلامی سے جاہل اور دینی عقائد میں فیصلے دینے کی صلاحیت سے یکسر عاری ہونا دو اور دو چار کی طرح مسلم ہے۔ یہ ظاہر ہے وہی ہوں گے جو حکومت کی آنکھوں کا تارا اور تختِ اقتدار کے پایہ بردار بنے ہوئے ہیں جنھیں دوسرے ملکوں میں اسلامی ثقافت کی نمائندگی کے لئے بھیجا جاتا ہے اور جن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ حکومت کی پالیسیوں اور خواہشوں کی پابجائی کر کے پیٹ کی خیر مناتے رہیں۔ یہی اگر کمیٹی میں شامل ہوں گے تو یہ محض ایک تمسخر ایک طنز اور ایک تماشا ہوگا جو پوری مسلمان امت کو احمق بنانے کی بھونڈی کوشش سے زیادہ کوئی قدر و قیمت نہیں رکھے گا۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ تم پہلے ہی سے بدگمانی کیوں کرتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ حکومت یہ کمیٹی دار العلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور اور ندوۃ العلماء لکھنؤ جیسے معروف و مستند اداروں کے جانے پہچانے اکابر و افاضل سے ترتیب دے۔

ہم کہیں گے اس حسن ظن کے لئے احمقانہ زود اعتمادی کی اتنی وافر مقدار چاہئیے جتنی ہمیں میسر نہیں ہے۔ حکومت کے نزدیک اگر مسلمانوں کے پرسنل لا کی اصلاح واقعی کوئی سنجیدہ اور مبنی بر خلوص قضیہ ہوتی تو ایسے انقلاب انگیز اقدام کیلئے کمیٹی بنانے کا فیصلہ صرف اتنی سی بات پر نہ کر دیا جاتا کہ بقول پنڈت ہرو کچھ ذمہ دار مسلمانوں نے حکومت سے اس کا مطالبہ کر دیا ہے۔

کتنے معصوم ہیں ہمارے وزیر اعظم۔ انھیں یہ بھی خبر نہیں کہ ہر علم و فن کے معاملہ میں اسی علم و فن کے ماہرین ذمہ دار کہلاتے ہیں نہ یہ کہ آپ سائنس کے مسائل میں شعر و ادب کے پروفیسروں کو اور انجینیرنگ کے مسائل میں ڈاکٹر حکیموں کو ذمہ دار مان لیں۔ یہ بالکل طے ہے کہ سیکولر حکومت سے ایک مذہبی معاملے میں دخل اندازی کا مطالبہ مذہب کا کوئی تیسرے درجے کا ذمہ دار بھی نہیں کر سکتا۔ پنڈت جی کو یہ نہ بھولنا چاہئیے کہ مسلمانوں کے پرسنل کا تعلق ان کے مذہب سے ہے اور ان کے مذہبی معاملات کے بارے میں ذمہ دار لوگ وہی سمجھے جا سکتے ہیں جنھوں نے ہندستان کی

کسی معروف درسگاہ سے علوم مذہبی میں مہارت حاصل کی ہو اور امتِ مسلمہ انھیں دینی معاملات میں فتوے اور فیصلے دینے کا اہل سمجھتی ہو۔ یہ کیا کہ چند ایسے مسلمانوں نے جو فقط نسل اور نام کے اعتبار سے مسلمان ہیں ایک مطالبہ کیا اور حکومت انتہائی سعادت مندی کے ساتھ ثبوتِ نیازمندی دینے کو تیار ہوگئی ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ انتہائی شر انگیز اور جاہلانہ مطالبہ علوم اسلامیہ کا کوئی امام اور استاد تو کیا مبتدی اور شاگرد بھی نہیں کر سکتا۔ یہ بالیقین ایسے ہی لوگوں کا کیا ہوا ہے جو غیر اسلامی تصورات سے مغلوب اور نفاق کی راہ کے مسافر ہیں۔ انھیں پرسنل لا کی بحث میں ذمہ دار مسلمان قرار دینا ایسا ہی ہے جیسے ایک رکشا چلانے والا حکومت سے یوں کہے کہ فلاں جگہ جو آپ نے فولاد سازی کا کارخانہ قائم کیا ہے اسے اکھیڑ کر فلاں مقام پر لگا دیجئے اور حکومت ہاتھ جوڑ کر جواب دے کہ اچھا بھئی تم ذمہ دار آدمی ہو لہذا ہم تمھاری مطلوبہ اکھاڑ پچھاڑ کے مطالبے پر غور کرنے کے لئے کمیٹی بنا لیتے ہیں۔

ہنگامی حالات کا قانون ہمارے گلے میں چاہے پھانسی لگا دے مگر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ کمیٹی بنانے کے جواز پر کچھ ذمہ دار مسلمانوں کے مطالبہ کا حوالہ دینا حقیقت سے زیادہ ڈرامے کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہت ممکن ہے کچھ سرپھرے، تجدد پسند اور دنیا پرست مسلمان عہدیداروں نے کسی استادِ ازل کے پڑھائے سکھائے سے یا اپنے ہی نفس کی وسیسہ کاری سے یہ مطالبہ کر ہی دیا ہو لیکن کیا یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ جو حکومت فسادات، زبان، ملازمت اور مسلمانوں کے دیگر اہم ترین فوری معاملات و مسائل پر کمیٹی بنانے اور تحقیق کرانے کے مطالبے کو پرِ کاہ کی برابر بھی اہمیت نہ دیتی ہو۔ حالانکہ ان مطالبوں کے پیش کرنے میں مسلمانوں نے اپنے پھیپھڑوں کا پورا زور اور زبان و قلم کی ساری توانائی سرکارِ عالیہ کے قدموں میں ڈھیر کر دی ہو وہ حکومت یکایک اتنی عادل اتنی حساس اتنی سعادتمند اور اتنی مخلص بن گئی کہ جہاں دو چار مسلمانوں نے پرسنل لا میں اصلاح کا مطالبہ کیا اور اس کا بین کمیٹی بنانے کی تجویز پاس کئے بغیر حرام ہو گیا۔ تعجب ہے۔ اُن بیس لاکھ سے زائد دستخطوں پر تو ہمارے وزیرِ اعظم یا کسی بھی خداوندِ نعمت کو ایک لمحۂ فرصتِ نگاہِ غلط انداز ڈالنے کے لئے بھی نہیں ملتا جو اردو زبان کے سلسلے میں پیشِ بارگاہ کئے گئے تھے لیکن مسلم پرسنل لا کی اصلاح کے مبینہ مطالبے پر اتنی سرعت سے نگاہِ التفات ڈالی گئی جیسے بھوکا کھانے پر ٹوٹتا ہے یا جیسے مدت کی پیاسی زمین بارش کی پہلی پھوار کو حلق میں اُتارتی ہے۔

پنڈت جی نے جمعیۃ العلماء دہلی کے وفد کو اطمینان دلایا ہے کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں اور متعلقہ حضرات سے استصواب کئے بغیر اور مسلم نقطۂ نظر سے بالاتر ہو کر کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا جائے گا جو مسلمانوں کیلئے ناقابلِ قبول ہو بہت بہت شکریہ! ـــ لیکن اس خوبصورت اجمال کی مکروہ تفصیل یہی تو ہے کہ کمیٹی ضرور بنے گی اور سرکاری لوگ اسلامی پرسنل لا کا آپریشن لازماً کریں گے۔ البتہ اُن مذہبی رہنماؤں سے ـــ جن کے سوا دینی مسائل میں بحث و نظر کسی کا منصب ہی نہیں ہے صرف استصواب کر لیا جائے گا۔ یہ صاف طور پر اس ادعا کے ہم معنی ہے کہ اب ہماری سیکولر حکومت کو یہ حق بھی حاصل ہو گیا ہے کہ وہ خالص مذہبی امور میں امامت و اقتدار کا عَلم اٹھائے اور یہ فیصلہ دے کہ دین کے بارے میں، کون ذمہ دار ہے اور کون غیر ذمہ دار۔ بظاہر تو بڑی خوشنما تسلی ہے کہ مذہبی رہنماؤں سے استصواب کر لیا جائے گا لیکن فی الاصل یہ علمائے اسلام کو عین اسلام ہی کے معاملے میں ثانوی درجہ دیدینا ہے اور ایسے لوگوں کی عزت افزائی کرنی ہے جو اُمورِ دنیا میں چاہے ارسطو اور بقراط ہوں لیکن اُمورِ اسلامی میں ان کی جگہ جوتوں کی صف میں بھی نہیں۔

قانون داں حضرات بتائیں کہ کیا کسی مقدمے کا فیصلہ یوں بھی ہوا کرتا ہے کہ چند حاکم قسم کے لوگ مل جل کر ایک رائے قائم کریں اور پھر مجمع لگا لگا کر لوگوں سے پوچھتے پھریں کہ ہماری رائے آپ کی نظر میں صحیح ہے یا نہیں؟

یا مقدمات کو فیصل کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ معاملات ایک عدالت کے آگے رکھے جائیں اور عدالت اپنی قانونی مہارت کے ذریعہ ان کے عادلانہ فیصلے دے؟

اگر پہلا طریقہ غلط اور دوسرا صحیح ہے تو یہ کیا بات ہے کہ اسلامی پرسنل لا پر گفتگو کرنے کے اصل حقدار تو گھر بیٹھکر استصواب کا انتظار کیا کریں اور بنیادی غور و فکر (؟) وہ کمیٹی کرے جس کی مہارت فن کا اس کے سوا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اہلِ اقتدار نے اس کا انتخاب کر لیا ہے۔

برادرانِ اسلام اور ہماری حکومت دونوں کو یہ بات خوب سمجھ لینی چاہیئے کہ سوال ابھی ان نتائج کا نہیں ہے جو مجوزہ کمیٹی کے غور و تفحص کے بعد سامنے آئیں گے۔ یعنی احتجاج اس لئے نہیں کیا جا رہا ہے کہ مجوزہ کمیٹی جو بھی تغیرات تجویز کرے گی وہ لازماً اسلام کے خلاف ہی ہوں گے یا ہماری حکومت مسلمانوں کی رائے عامہ کے خلاف کوئی قانون لا دے گی۔ ابھی تو سوال یہ ہے کہ سیکولر حکومت کو یہ حق اور اختیار آخر کہاں سے حاصل ہوا کہ وہ چند نامعلوم مسلمانوں کے زیر زمین مطالبے پر معروف علماء و فضلاء کی رائے معلوم کئے بغیر کمیٹی کی تجویز پاس کر دے۔ کمیٹی بننا اور ایسے لوگوں کی بننا جن کے ذمے دار ہونے کا فیصلہ خود حکومت ہی صادر فرمائے بجائے خود ایک ایسا نادرست اور غیر اصولی اقدام ہے کہ دیگر ثمرات و مضمرات سے یکسر قطع نظر کر کے بھی اسے بلا جبر و اکراہ قبول نہیں کیا جا سکتا۔

زیادہ سے زیادہ حسن ظن یہی تو ممکن ہے کہ کمیٹی خلاف اسلام فیصلے نہیں کرے گی یا کرے گی تو انھیں علمائے اسلام کے ناپسند کرنے پر ردّی کر دیا جائے گا۔ لیکن یہ حسن ظن بھی کمیٹی کے لئے بنیادِ جواز مہیا نہیں کرتا۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی یوں کہنے لگے کہ فلاں وزیر صاحب چونکہ نہایت انصاف پسند اور معقول آدمی ہیں لہٰذا انھیں مقدمات فیصل کرنے کا بھی مجاز سمجھ لیا جائے کون ہوشمند ہے جو اس غیر اصولی بات کو مان لے گا کہ فصلِ مقدمات کا جو حق عدالتوں کو ملا ہوا ہے وہ کسی وزیر یا گورنر یا سرکاری گروہ کو بھی اس حسن ظن کی بناء پر مل جائے کہ وہ انصاف ہی کرے گا ظلم نہیں کرے گا۔

پنڈت نہرو ذہین اور تعلیم یافتہ آدمی ہیں۔ اور بھی بہت سے اوصاف ان میں ہیں لیکن انھیں بھی یہ حق کوئی نہیں دے سکتا کہ جج کے اختیارات ہاتھ میں لیکر کسی ادنیٰ ہی سے مقدمے کا فیصلہ کر سکیں۔ پھر بتلایئے یہ بات کیونکر معقول اور منصفانہ کہی جا سکتی ہے کہ وہ اسلامی پرسنل لا جو خالصۃً فقہی نوع کی چیز ہے اور قانون شریعت سے اس کا نہ صرف جوہری بلکہ کھلا عملی تعلق بھی ہے سرکاری کمیٹیوں کا تختۂ مشق بنے۔ شرعی و فقہی مسائل میں بحث و نظر، فصل و افتاء اور اجتہاد و تفقہ کا حق سوائے معروف و مستند علمائے اسلام کے اور بھی کسی کے لئے تسلیم کر لینا عدل و معقولیت کا مضحکہ اُڑانا ہے۔ مان لیا کہ ذہین و ذکی اور انصاف پسند دوسرے لوگ بھی ہو سکتے ہیں لیکن انھیں ہر فن مولا نہیں مانا جا سکتا۔ مٹی کے چند برتن گھڑنے کے لئے بھی کمہار کی شاگردی درکار ہے۔ آپ بڑے سے بڑے ریاضی داں، فلسفی، ادیب اور پروفیسر کو کمہار کے چاک پر بٹھا دیجئے۔ ڈھنگ کی ایک ہانڈی بھی بنا کر نہیں دے سکتا۔ ٹھیک اسی طرح وہ لوگ قانونِ شریعت کی راہوں پر دو قدم نہیں چل سکتے جنھوں نے علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے اس کی خاص مہارت حاصل نہ کی ہو۔

پھر ایک اور بات بھی ملحوظ رہے۔ پنڈت نہرو مخلص ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے سچے ہی دل سے کہا ہو گا کہ علمائے اسلام کی رضامندی کے بغیر کوئی قانون اس سلسلے میں نہیں بنایا جائے گا۔

لیکن پنڈت نہرو کا اخلاص اور شیریں بیانیاں ہمارے کس کام کی۔ وہ ہمارے دوسرے مطالبات اور شکایات کے بارے میں بھی نہایت شیریں سخن اور شفیق ہیں لیکن نتیجہ اسکے سوا کچھ نہیں کہ جو پرنالا جہاں گر رہا تھا وہیں گر رہا ہے۔ حد ہے کہ جس اُردو کی مدح میں ان کی زبان تر ہے اور اس کی حمایت میں وہ بڑی بڑی شاندار تقاریر فرما چکے ہیں وہ بھی ان کی نظروں کے سامنے کُھنڈی چھری سے ذبح ہو رہی ہے مگر وہ زبانی جمع خرچ سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اُردو کی جو فقط ایک یونیورسٹی ـــــ عثمانیہ یونیورسٹی پورے ملک میں موجود تھی

وہ بھی انھی کے زیر سایہ شدھی کی بھینٹ چڑھ گئی مگر ان کے کانوں پر شاید جوں بھی نہیں رینگی۔

طول ضرور ہوگا لیکن ایک تازہ خبر ضرور ملاحظہ فرمالیجئے جو ایک پنتھ دو کاج کے مصداق ہے:-

خبر ہے کہ "لکھنؤ میں نو تعمیر مردہ عجائب گھر کا افتتاح پنڈت نہرو نے فرمایا۔ یہاں اب تک نوادرات کے نام اور تفصیلات اُردو، انگریزی، ہندی تینوں زبانوں میں تھیں لیکن اب ثقافتی و سائنسی اُمور کے ڈائرکٹر شری محمد ظہیر نے مژدہ سنایا ہے کہ انگریزی تحریروں کا ترجمہ ہندی میں کرایا جارہا ہے ___ جی ہاں فقط ہندی میں اُردو میں نہیں۔ اس پر کسی نے سوال کیا کہ کیا اُردو میں بھی ترجمہ کرایا جائے گا؟ شری محمد ظہیر نے جواب دیا کہ "اب ہندی تو سب ہی جانتے ہیں۔"

خبر معمولی سی ہے لیکن یہ بتانے کے لئے بالکل کافی ہے کہ پنڈت نہرو اپنے تمام اوصاف حمیدہ کے باوجود سیاست پر ضمیر کو اور قومی مفادات پر اخلاق کو ترجیح دینے والوں میں نہیں ہیں۔ ان سے اس راجپوتی شان کی توقع رکھنا کہ جان جائے مگر بات نہ جائے احمقوں ہی کو زیب دے سکتا ہے۔

خصوصاً پرسنل لا جیسے مذہبی معاملے میں تو یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ ان کے ملحد دل و دماغ زیادہ دُور تک کسی وعدے اور یقین دہانی کی پاسداری کرسکیں گے۔ آج وہ ہزار کہیں کہ مجوزہ کمیٹی علمائے اسلام کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اُٹھائیگی لیکن کل جب یہ کمیٹی اسی معروف ذہنیت کا عملی ثبوت دینے لگے گی جس کی مار سے مسلمانوں کا بدن داغ داغ ہورہا ہے تو ڈھونڈنے والے ڈھونڈتے ہی پھریں گے کہ کہاں ہیں پنڈت نہرو کی یقین دہانیاں اور کدھر ہے وہ سنگ مرمر کی دیوار جس سے ہم سر پھوڑیں۔ پنڈت نہرو شاید بھول ہی جائیں گے کہ میں نے کیا کہا تھا اور نہ بھی بھولیں تو ایک خوبصورت سی تقریر کردینا ان کے لئے کیا مشکل ہے۔

دوسرا درس عبرت جو اس خبر میں موجود ہے وہ بھی موضوع سے خارج نہیں۔ شری محمد ظہیر ہی قسم کے حضرات تو ہیں جنھیں حکومت "ذمہ دار مسلمان" سمجھتی ہے۔ انھوں نے جو جواب سائل کو عطا فرمایا ہے کیا وہ بے ضمیری اور فقدانِ حیا کا منھ بولتا ثبوت نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے وزیر موصوف کے اہل و عیال ہندی خوانی کا شرف حاصل کرچکے ہوں لیکن اپنا پیٹ بھر جانے پر ساری دنیا کو شکم سیر سمجھ لینا حساس اور باکردار لوگوں کا کام نہیں ہوا کرتا۔ ان کا جواب سفید جھوٹ کا شاہکار ہے اور سفید جھوٹ منظر عام پر بے جھجک وہی شخص بول سکتا ہے جس نے ضمیر، اخلاقی حس اور حیا کو خود غرضی و مفاد پرستی کی لحد میں اُتار دیا ہو۔ کوئی بڑے سے بڑا خان بہادر اور وفادارِ سرکار زیادہ سے زیادہ یہ مبالغہ کرسکتا ہے کہ اب ہندی خوانوں کی تعداد اردو خوانوں سے بڑھ گئی ہے۔ لیکن شری محمد ظہیر کا جواب تو یہ اطمینان دلا رہا ہے کہ ملک کے سارے ہی پڑھے لکھے لوگ ہندی پڑھ چکے اور اُردو کا استعمال یکسر غیر ضروری ہوگیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ذرا اندازہ لگائیے اس سطح کے لوگ اگر علوم اسلامیہ سے بہرہ ور بھی ہوں تو کسی سرکاری کمیٹی کا ممبر بن کر وہ خداوندانِ نعمت کے اشاروں پر ناچنے کے سوا کیا کرسکتے ہیں۔ اجتہاد و تفقہ تو زندہ و صحت مند ضمیر اور اخلاقی توانائی سے اس طرح مربوط ہے جیسے جسم سے روح۔ جس کے کاندھوں پر اپنے ضمیر کی لاش اور زبان پر اپنے اخلاق کی فاتحہ ہو اسے تو اسلام قانونِ شریعت کی مجلسِ اجتہاد و افتاء میں کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہیں دیتا چہ جائیکہ اس کی کسی رائے کو لائق اعتناء قرار دے کر علماء و اساتذہ کی توہین کی جائے۔

ایک شری محمد ظہیر ہی کی بات نہیں۔ یہ تو کانِ نمک والا معاملہ ہے کہ ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد۔ اونچے عہدوں پر جتنے بھی مسلمان بیٹھے ہیں ان میں شاید ہی کوئی اللہ کا بندہ ہو جس کے دلِ زندہ کی کوئی دھڑکن امت مسلمہ کی سماعت تک پہنچ رہی ہو ورنہ سینے خالی اور اخلاقی حس معطل ہے۔ دنیا اور اس کی لذتیں ہی زندگی کا نچوڑ رہ گئی ہیں اور ہمیں ننانوے فی صدی یقین ہے کہ پرسنل لا میں ٹانگ اڑانے کا مطالبہ بھی اسی طائفے

کے کسی فرد یا افراد کی طرف سے پیش کیا گیا ہوگا۔ کاش یہ نفہ سوچے کہ ایک دن مرنا بھی ہے۔ اس خدا کو حساب بھی دینا ہے جس سے کوئی بات چھپا کر نہیں رکھی جا سکتی۔ یہ وقت ہے کہ یہ طائفہ امتِ مسلمہ کے اس اضطراب و حزن کا احساس کرے جو اس نئے فتنے نے پیدا کر دیا ہے۔ احساس کا ثبوت اسی طرح مل سکے گا کہ وہ بھی عامۃ المسلمین کے احتجاج کا ہمنوا ہو اور حکومت کو اس مجوزہ اقدام سے باز آجانے کا مشورہ دے۔ اگر آج اس رخنے کو انگیز کر لیا گیا جو سرکاری کمیٹی کے ترتیب پاتے ہی دینی تحفظ کے قلعہ میں پیدا ہو جائے گا تو کل یہ رخنہ پورے پھاٹک کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔

سوالات میں اختصار ملحوظ رکھیئے

تجلّی کی ڈاک

کٹی پھٹی اور نا صاف تحریریں ردّی کر دی جاتی ہیں

حضرت بلالؓ اور اذان

سوال :- از سید عبداللہ محمدی - حیدر آباد دکن

ایک بزرگ اکثر و بیشتر حسب ذیل روایت بیان کرتے ہیں اس میں کہاں تک صداقت ہے مطلع فرمائیں۔

حضورؐ کے دور میں بعض صحابہؓ نے آپس میں یہ مشورہ کیا کہ حضرت بلالؓ کو اذان کے الفاظ صحیح طور پر ادا کرنے کی قدرت حاصل نہیں ہے۔ اس لئے ان کو بغیر استمزاج حضور اذان دینے سے منع کر دیا۔ جس کی وجہ سے حضرت بلالؓ کو بے حد صدمہ ہوا۔ اب فجر کی نماز کے لئے حسب معمول صحابہؓ کرام جمع ہوئے لیکن سپیدی ظاہر ہی نہیں ہوتی۔ آخر کار حضورؐ بھی تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ بلالؓ کہاں ہیں۔ صحابہؓ کرام نے عرض کیا کہ حضور ہم نے باہمی مشورے سے بلالؓ کو اذان دینے سے منع کر دیا ہے۔ تب آپؐ خفا ہوئے اور حکم دیا کہ فوری بلالؓ کو بلایا جائے۔ لوگ مختلف مقامات پر تلاش کر کے ان کو ڈھونڈ پائے۔ مگر جب ان سے چلنے کے لئے کہا گیا تو انھوں نے انکار فرمادیا۔ صحابہ کرامؓ نے آکر حضورؐ کو اطلاع دی کہ وہ ایک مقام پر زار و قطار رو رہے ہیں اور سجدہ ریز ہیں اور کہتے ہیں کہ اب یہ صورت حضورؐ کو دکھانے کے قابل نہیں ہی بعد از سماعت واقعات حضورؐ نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ بلالؓ سے جاکر کہو کہ محمدؐ تمھیں بلاتے ہیں۔ تب بلالؓ تشریف لائے۔ حضورؐ نے حکم دیا کہ اذان کہو۔ لہذا بلالؓ نے اذان کہی۔ تب فوری سپیدۂ سحر نمودار ہوا اور پھر آفتاب ۱/۲ نیزے سے زیادہ بلند ہوگیا۔ یہ دیکھ کر حضورؐ نے فرمایا کہ قسم ہے خدا کی اگر بلالؓ اذان نہیں دیتے تو قیامت تک صبح نہ ہوتی۔

کتب کا نام یا حوالہ یا راوی کا نام وہ بیان ہی نہیں کیا کرتے اس لئے کہ اکثریت اُن کے الفاظ کو وحی تصور کرتی ہے۔

الجواب :-

اس سوال کا پس منظر یہ ہے کہ حیدر آباد کے ایک محلے میں جہاں حبشی مسلمان آباد ہیں کوئی صاحب وعظ فرمایا کرتے ہیں اور حضرت بلالؓ کی توصیف کے لئے متذکرہ روایت بارہا بیان کر چکے ہیں۔ ان پر چونکہ لوگوں کو اعتماد ہے اس لئے کوئی یہ بھی نہیں پوچھتا کہ یہ روایت کس کتاب میں آئی ہے۔ سب سمجھتے ہیں کہ حضرت بیان کر رہے ہیں تو صحیح ہی ہوگی۔

جواب یہ ہے کہ اس روایت کی کوئی اصل نہیں۔ بڑے رنج کی بات ہے کہ جس جلیل القدر صحابی سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی توصیف کے لئے مستند حالات کتابوں میں موجود ہوں اس کی ذات والا کو بے سند اور نا قابل اعتبار روایات کا تختۂ مشق بنایا جائے۔

واعظ صاحب کو عقل سے کام لیکر سوچنا چاہئے تھا کہ یہ روایت کس قدر غلط مطالب پر مشتمل ہے۔ بہت بڑی اور موٹی سی قباحت تو اس میں یہی ہے کہ صحابہؓ کے کردار کی بڑی خراب تصویر سامنے آتی ہے۔ کیا صحابہؓ ایسے ہی تھے کہ اپنے محبوب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر فرمودہ مؤذن کو نہایت خود رائی سے معزول کر دیں اور ذرا نہ جھجکیں کہ یہ جسارت کس قدر مجرمانہ ہے۔ حاشا ثم حاشا صحابہؓ کا تو یہ حال تھا کہ سرکار رسالتؐ کے اشارے پر سر کٹا دینے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ چشم و ابرو کا ادنیٰ سا اشارہ ہوا اور صحابہؓ دل و جان سے آمنّا و صدقنا کی عملی تصویر بن گئے۔ ان کے بارے میں یہ تصور تک سخت گستاخی ہے کہ رسالتمآبؐ کے مامور کردہ مؤذن سیدنا بلالؓ کو اپنی رائے سے معزول کر دیں گے۔

دوسری قباحت یہ ہے کہ اس سے سیدنا بلالؓ کی جانب ایک ایسی خامی کی نسبت ہوتی ہے جس کا کوئی ثبوت کتب معتبرہ سے نہیں ملتا۔ یعنی اذان کے الفاظ کو صحیح طور پر ادا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہونا۔ حدیث کی سب سے معتبر کتاب بخاری اُٹھا کر دیکھئے تو کتاب الآذان میں سب سے پہلی ہی روایت آپ کو بتائے گی کہ جب آذان کی ابتدا ہوئی تو حضورؐ نے بلالؓ ہی کو آذان دینے کا حکم دیا تھا۔ یا بلال قُم فنادِ بالصلوٰۃ۔ اس سے خود بخود معلوم ہوگیا کہ آذان دینے کے لئے الفاظ کو صحت کے ساتھ ادا کرنے کی استعداد حضرت بلالؓ میں یقیناً موجود ہوگی اور آپ کی آواز کا سوز و درد اور بلندی تو معلوم و معروف ہے ہی۔ اگر بلالؓ میں الفاظ کو صحیح طور پر ادا کرنے کی قوت بھی نہ تھی تو کہنا پڑے گا کہ نعوذ باللہ اللہ کے رسولؐ نے ایک اہم بالشان کام موزوں آدمی کے سپرد نہیں کیا۔ ایسا کہنے کی جسارت جس بہادر میں ہو وہ اپنی عاقبت کی خیر منائے ہم تو یہی سمجھتے ہیں اور یہی تاریخی حقائق سے بھی ثابت ہے کہ حضورؐ بے حد مردم شناس تھے اور اشارۂ وحی کے بغیر بھی اہم کاموں کے لئے نہایت موزوں افراد کو منتخب کیا کرتے تھے۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وازواجہم اجمعین۔

تیسری قباحت یہ ہے کہ اس میں کارخانۂ قدرت کے نظام کو ایک بندے کے فعل و عمل پر معلق کر دیا گیا ہے حالانکہ یہ کارخانہ صحابہؓ تو کیا انبیاء علیہم السلام کی ذوات پر بھی معلق نہیں ہے۔ اہل کفر نے کتنے ہی انبیاء کو قتل کر ڈالا، مارا پیٹا، اذیتیں دیں یہاں تک کہ کائنات کی سب سے معظم ہستی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر پر اوجھڑی ڈالی گئی، آپؐ پر پتھر برسائے گئے اور اللہ کا یہ محبوب لہولہان ہوگیا مگر نہ زمین پھٹی نہ آسمان شق ہوا نہ ستارے ٹوٹے نہ چاند اور سورج نے اپنی رفتار بدلی۔ پھر اللہ کا رسولؐ یہ بات کیسے کہہ سکتا تھا کہ اگر بلالؓ آذان نہیں دیتے تو قیامت تک صبح ہی نمودار نہ ہوتی۔ افسوس ہے کہ لوگ بڑی بے تکلفی سے ایک قول حضورؐ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور نہیں کانپتے کہ بغیر تحقیق کے ایسا کرنا کتنا خطرناک ہے۔

ذکرِ آذان کا آیا ہے تو اس باب میں بھی کچھ معلومات پیش کر دیں۔ آذان کا آغاز مدینے میں پہلے ہی ہجری سال میں ہوا ہے۔ اس سے قبل نماز بغیر آذان کے ہوا کرتی تھی۔ حضورؐ نے صحابہؓ کو بلا کر مشاورت فرمائی کہ کوئی طریقہ ایسا وضع کیا جائے جس سے سب لوگ وقتِ معیّنہ پر آکر ساتھ نماز پڑھا کریں۔ اس پر صحابہؓ نے اپنے اپنے فہم کے مطابق رائے دی لیکن حضرت عمرؓ کی رائے حضورؐ نے اور سب اصحابؓ نے پسند کی جو اذان دینے کے حق میں تھی۔ فوراً ہی حضورؐ نے بلالؓ کو حکم دیا اور پہلی اذان انھوں نے ہی پڑھی۔ پھر مستقلاً وہی مؤذن رہا کئے۔

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ اذان کی تجویز حضرت عبداللہ بن زید نے ایک خواب کی روشنی میں پیش کی تھی بعض روایات میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا تھا لیکن بخاری کی روایت سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ کسی کے خواب کی روشنی میں طے نہیں ہوا بلکہ فقط غور و فکر سے لوگوں نے رائے پیش کی اور اذان کی رائے پیش کرنے والے حضرت عمرؓ ہی تھے۔ واللہ اعلم بالصواب

محدث عبدالرزاق نے اپنے مصنّف میں اور ابوداؤد نے اپنے مراسیل میں یہ بھی روایت ذکر کی ہے کہ اذان کے لئے اللہ کے رسولؐ پر وحی بھی نازل ہوئی تھی۔ بعض کمزور روایات میں بتایا گیا ہے کہ اذان کی تعلیم حضورؐ کو شبِ معراج میں دی گئی۔ مخفی حقیقت جو کچھ بھی رہی ہو ظاہری واقعہ فقط یہ ہے کہ سب سے پہلی اذان حضورؐ کے حکم پر سیدنا بلالؓ نے دی ہے اور پھر حضورؐ کی رحلت تک اس خدمت پر وہی مامور رہے انھیں اس خدمت سے ہٹانے کی جرأت صحابہؓ کیسے کر سکتے تھے جب کہ وہ حضورؐ کی شان میں ادنیٰ گستاخی بھی قتل ہو جانے سے زیادہ بھاری سمجھتے تھے۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین

تحذیر الناس کی ایک عبارت

سوال ۶:۔ از محمد عبداللہ خان نظامی۔ کیکڑی۔

براہ کرم تجلی کی آئندہ اشاعت میں تحذیر الناس کی

مندرجہ ذیل عبارت کا مفہوم عام فہم طریقہ سے مثال دیکر سمجھائیں کیونکہ بریلوی حضرات اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ "انبیاءؑ اپنی امت سے ممتاز ہوتے ہیں تو علوم ہی میں ممتاز ہوتے ہیں باقی رہا عمل اس میں بسا اوقات بظاہر امتی مساوی ہو جاتے ہیں۔" (تحذیر الناس صفحہ ۵)

الجواب :-

اعتراض کرنے والوں کی بھلی چلائی۔ اعتراض کبھی ازراہِ خلوص ہوتا ہے کبھی ازراہِ عناد و تعصب۔ عناد و تعصب کا معاملہ یہ ہے کہ عقلِ سلیم پر پردے پڑ جاتے ہیں اور دماغ کند ہو جاتا ہے۔ بریلوی حضرات کا بھی دیوبندی علماء کے باب میں یہی حال ہوا۔ انھیں علمائے دیوبند کی ایسی ایسی عبارتیں بھی لائق اعتراض نظر آتی ہیں جن میں سمجھداروں کے لئے کوئی غبار نہیں اور بعض عبارتوں میں وہ اپنی طرف سے ایسے معانی ڈالتے ہیں جن کا تصور تک لکھنے والوں کو نہ ہو۔ یہ حرکت بہت عام ہے اور افسوس ہے کہ کوئی بھی مکتبِ فکر اس شیطانی دسیسہ کاری کا نشانہ بنے بغیر نہیں رہا ہے۔

مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی جس عبارت کا مفہوم آپ سمجھنا چاہ رہے ہیں وہ بالکل صاف ہے۔ ہر ہوشمند جانتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جو تمام مخلوق سے افضل و برتر مانا جاتا ہے وہ اس لئے نہیں مانا جاتا کہ ہر نبی نے امت کے ہر فرد سے زیادہ نمازیں پڑھی ہیں، زیادہ روزے رکھے ہیں، زیادہ حج کئے ہیں اور زیادہ خیرات دی ہے، بلکہ اس لئے مانا جاتا ہے کہ انھیں اللہ نے نبوت کے شرف سے نوازا ہے اور نبی پر چونکہ وحی بھیجی جاتی ہے اسلئے اس کا علم ہر دوسرے شخص کے مقابلہ میں زیادہ یقینی بھی ہوتا ہے اور بیش قیمت بھی۔ نظر نہ آنے والی غیبی حقیقتیں، مثلاً جنت، دوزخ، ملائکہ، میزان، عرش و کرسی وغیرہ سوائے وحی کے کسی ذریعے سے منکشف ہونے والی چیزیں نہیں لہٰذا دنیا کا بڑے سے بڑا عالم بھی ان کے معاملہ میں جاہل رہتا اگر انبیاء علیہم السلام وحی کے ذریعہ حاصل شدہ علم الیقین سے ان کی اطلاع نہ دیتے اور ان کی کچھ تفصیلات نہ بتاتے۔

یہی وہ بے غبار حقیقت ہے جسے تحذیر الناس کی محولہ بالا عبارات میں بیان کیا گیا ہے۔ رہا عمل کا معاملہ تو کون نہیں جانتا کہ اسلاف میں کتنے ہی ایسے عابد حضرات گذرے ہیں جنھوں نے دن رات عبادتیں کی ہیں بے شمار روزے رکھے ہیں۔ کچھ نے تو عمر بھر کیلئے ہر دوسرے دن روزہ رکھنے کو معمول بنا لیا تھا۔ اس طرح یہ بات عین ممکن ہو جاتی ہے کہ ایک امتی کی نفل نمازوں کی تعداد یا روزوں کی مقدار یا صدقہ و خیرات کی مقدار ظاہری گنتی کے اعتبار سے کسی بھی نبی حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ جائے مثلاً حضورؐ نے زندگی بھر میں دس ہزار رکعات نفل پڑھی ہوں تو ایک امتی کی نفلی رکعات بارہ ہزار بن جائیں۔ یا حضورؐ کے صدقہ کردہ مال کی قیمت دو لاکھ دینار بنتی ہو تو ایک دولت مند امتی نے چار لاکھ دینار صدقہ کر دیئے ہوں یہ نہ واقعات کے خلاف ہے نہ عقلاً اس میں کوئی استحالہ یا استبعاد ہے۔ پھر کیا ہم عبادتوں کی گنتی اور مقدار بڑھ جانے کی وجہ سے اس امتی کو پیغمبر سے افضل مان لیں گے؟ نعوذ باللہ من ذلک۔ اسی مغالطے سے بچانے کے لئے مولانا قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے متذکرہ عبارت لکھی ہے۔ جن کے دماغ کے سوراخ بند نہیں ہیں ان کے لئے اس عبارت میں سوائے صداقت و واقعیت کے کچھ بھی نہیں۔ ہم کہتے ہیں تاریخ کو چھوڑئیے۔ فرض کیجئے آج ایک شخص کتب حدیث سے یہ تخمینہ کرتا ہے کہ حضورؐ نے زندگی بھر میں کتنی نفل نمازیں پڑھی ہوں گی اور کتنا صدقہ دیا ہوگا۔ اس کے بعد وہ شب و روز نوافل میں لگ جاتا ہے اور اپنی نوافل کی گنتی حضورؐ کی تعداد سے بڑھا دیتا ہے۔ نیز صدقہ بھی ان سے زیادہ کر ڈالتا ہے تو بریلوی بھی یہ نہ کہہ سکیں گے کہ چونکہ وہ عبادت میں گنتی کے حضورؐ سے بڑھ گیا لہٰذا مرتبے میں بھی افضل ہو گیا۔ جب بریلوی بھی ایسا نہ کہہ سکیں گے تو بس اسی مغالطے کو مولانا قاسمؒ صاف کر رہے ہیں کہ افضلیت اور امتیاز کا تعلق عبادتوں کی گنتی اور تعداد سے نہیں ہے بلکہ علوم سے ہے۔

انبیاء کے علوم وحی کا ثمرہ ہوتے ہیں لہٰذا کوئی امتی کتنی ہی کثیر عبادتیں کرلے وہ انبیاء کے امتیازی درجے تک نہیں پہنچ سکتا یہ امکان محض مفروضہ بھی نہیں۔ جیساکہ ہم اجمالاً کہہ آئے ہیں امت میں بہت سے عبّاد وزہاد ایسے گذرے ہیں جنھوں نے نفلی نمازوں اور نفلی روزوں کا اتنا زبردست ریکارڈ قائم کیاہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صوم وصلوٰۃ کی گنتی اس سے کم رہ جاتی ہے۔ علاوہ ازیں آج بھی ایک ۱۶ سال کا بالغ مسلمان یہ ارادہ کرے کہ روزانہ سَو نوافل پڑھاکرے گا اور پھر ستّر سال تک۔ اس ارادے کو نبھاتا رہے تو یقیناً اس کی رکعات شمار کے اعتبار سے حضورؐ کی عمر بھر کی رکعاتِ نماز سے بڑھ جائیں گی۔ اسی طرح ایک کروڑ پتی مسلمان دس کروڑ روپیہ خدا کی راہ میں صَرف کردے تو حضورؐ کے صدقہ کردہ مال کی مقدار وقیمت سے آگے نکل جائے گا۔ لیکن مولانا قاسمؒ بتاتے ہیں کہ اس سے یہ مغالطہ ہرگز نہ پیدا ہونا چاہئے کہ وہ مرتبے میں بھی حضورؐ سے یا کسی بھی نبی سے بڑھ گیا۔ بڑھے گا کیسے انبیاءؑ کی برتری عبادات کی گنتی اور مقدار پر منحصر ہے ہی نہیں وہ تو علوم وحی پر منحصر ہے اور علوم وحی کسبی نہیں ہوتے لہٰذا نبوت کے خاتمے اور وحی کے انقطاع کے بعد اب کسی کے لئے گنجائش نہیں رہ گئی ہے کہ عبادات کی کثرت کے ذریعے انبیاء کے مرتبے تک پہنچ جائے۔ یہ کتنی صاف کتنی بے غبار کتنی متفق علیہ اور ستھری بات ہے جو تحذیر الناس کی متذکرہ عبارت میں پیش کی گئی ہے، لیکن تعصب اور کند ذہنی کا برا ہو کہ بریلوی حضرات کو اس میں انبیاء کی توہین نظر آتی ہے۔ اسے کہتے ہیں برعکس نہند نام زنگی کافور۔ عبارت تو انبیاء کے مقام بلند کو غیر انبیاء کی دسترس سے باہر دکھانے کے لئے لکھی گئی اور غایت اس کی انبیاء کی توصیف ومنقبت کے سوا کچھ بھی نہیں مگر تعصب کی عینک سے وہ متعصب لوگوں کو انبیاء کی تنقیص وتحقیر پر مشتمل نظر آرہی ہے۔ اس کورنگاہی کا کیا علاج۔ اگر کوئی بھینگا ہوجائے تو کوئی کہاں تک کس کس چیز کے بارے میں یہ بتاتا رہے گا کہ بھائی یہ ڈیڑھ نہیں ایک ہے!

ہم کہتے ہیں کیا بے شمار صحابہؓ ایسے نہیں ہیں جن سے کہیں زیادہ نفل نمازیں بعد کے مشائخ وعبّاد نے پڑھی ہیں؟ ہیں اور ضرور ہیں لیکن پھر بھی ہمارا اور آپ کا متفقہ عقیدہ یہ ہے کہ امتیاز وافضلیت میں صحابہؓ ہی بڑھے ہوئے رہے۔ تو اس سے بھی معلوم ہوا کہ امتیاز وفضیلت کا مدار عبادتوں کی گنتی اور مقدار پر نہیں۔ ظاہری عمل میں بھلے کوئی غیر صحابی کسی صحابی کے مساوی ہوجائے یا بڑھ جائے مرتبے میں نہیں بڑھ سکتا۔ پھر بھلا انبیاء سے بڑھنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے بس اسی مسلّمہ حقیقت کو مولانا قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے جو ریب وغبار سے بالاتر ہے۔ اللہ بریلویوں کو توفیق دے کہ تعصب اور بدگمانیوں کو دل سے نکالکر علمائے دیوبند کی عبارات پڑھیں۔ دل میں پہلے ہی غبار اور کجی ہو تو حدیث اور قرآن تک میں قاری کو بے شمار لائق اعتراض چیزیں مل جاتی ہیں حالانکہ ہر باہوش جانتا ہے کہ نقص قرآن وحدیث میں نہیں بلکہ معترض کے اپنے قلب ودماغ میں ہوتا ہے۔ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

مولانا آزادؒ کی تفسیر القرآن

سوال:- از عبدالمجید حیرت (پاکستان)

مارچ ۶۳ء کے رسالہ جامعہ میں "ہندوستانی قومیت اور مسلمان" کے تحت صفحہ ۱۸ پر جناب آل احمد سرور نے لکھا ہے:-

> "مولانا آزادؒ نے سب سے بڑی خدمت یہ کی کہ اپنی تفسیر القرآن کے ذریعے اسلام کی حقیقی تعلیم پر روشنی ڈالی اور اپنی زندگی کے ذریعے یہ ثابت کردیا کہ قومی زندگی میں دل وجان سے شرکت ہی اقلیتوں کے لئے صحیح راہِ عمل ہے۔ ان کی یاد کافی نہیں ان کے نقشِ قدم پر چلنا ضروری ہے۔"

اس رائے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

الجواب:-

اسلام کی حقیقی تعلیمات پر جناب آل احمد سرور کو کس حد تک عبور ہے یہ تو ہمیں علم نہیں، لیکن اس موقع پر ایک

کہانی ضرور یاد آتی ہے کہ ایک ایسے دیہاتی نے جو پہلے کبھی کسی شہری نمائش میں شریک نہیں ہوا تھا سنا کہ پاس والے شہر میں نمائش لگ رہی ہے۔ وہ بڑے شوق سے نیا جوڑا بدل کر نئی چادر کاندھے پر ڈال کر نمائش جا پہنچا۔ یہاں کسی کاریگر نے اس کی چادر اُڑالی جس سے اُسے بڑا صدمہ ہوا۔ جب وہ ملول و محزون گھر لوٹا تو کسی نے پوچھا کہو بھئی نمائش کیسی رہی؟ وہ جھلا کر بولا ارے کہاں کی نمائش یہ تو بدمعاشوں نے میری چادر ہتھیانے کے لئے ڈھونگ رچایا تھا۔

کوئی بتائے کہ اس دیہاتی کے طرزِ فکر اور جناب آل احمد سرور کے اندازِ نظر میں کیا جوہری فرق ہے اگر وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات اور مولانا آزادؒ کی تفسیر القرآن کا لب لباب فقط یہ ہے کہ اقلیتیں قومی زندگی میں دل و جان سے شرکت کیا کریں اور بس!

آدمی ہر آئینے میں اپنے ہی میلانات اور آرزوؤں کے شیش محل دیکھنے کا عادی ہے وہ ہر دلیل کو اپنی خواہشات کے سانچے میں ڈھال لینا چاہتا ہے۔ اس کی بہت نمایاں مثال ماضی قریب کے اس پُر شور دور میں ملتی ہے جب ہندوستان تقسیم نہیں ہوا تھا اور مسلم لیگ و کانگریس کے علمائے کرام اپنے اپنے موقف کی حمایت میں قرآن و حدیث کے موتی لٹا رہے تھے۔ دونوں کیمپوں کا موقف ایک دوسرے سے پوری طرح متصادم تھا پھر بھی ہر ایک کو قرآن اور حدیث میں اپنے ہی موقف کے زرّیں دلائل مُنھ سے بولتے نظر آ رہے تھے حالانکہ حقیقت اس کے سوا کچھ بھی نہ تھی کہ ہر فریق کی اپنی تمنائیں اور خواہشیں دلائل کی صورت گری کر رہی تھیں ورنہ اللہ اور اس کے رسول نے تو صرف بنیادی اصول و عقائد بیان کئے ہیں۔ اقدام و عمل کی سمتیں بتائی ہیں۔ ان اقدار کو واضح کیا ہے جو خدا پرستی کی راہ میں قیامت تک کے لئے مشعلِ راہ اور سنگِ میل کا کام دے سکیں۔ سیاسی دائروں میں اقلیت کو کیا روش اختیار کرنی چاہیئے اور اکثریت کو کس راہ پر چلنا چاہیئے یا زندگی کے دوسرے شعبوں میں کون

کیا کرے، اس کی تفصیلات سے اسلام کو بحث نہیں وہ صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ سیاست ہو یا تجارت و صنعت سائنس ہو یا فلسفہ، ہر علم و فن اور ہر شعبۂ حیات میں انسان جو بھی قدم بڑھائے وہ اسلام کے اساسی اصول و عقائد اور غیر متبدل اقدار و احکام کو روندے بغیر بڑھائے۔ اگر ان اصول و اقدار کا تحفظ ایک مشترک قومی زندگی میں ہوتا ہو تو بھی اس کا حکم ہے کہ مشترک قومی زندگی کو اختیار کرو اور اگر یہ تحفظ کسی اور طرزِ زندگی میں منحصر ہو تو وہ حکم دیتا ہے کہ اسے اختیار کرو۔ قوم، ملک، کاروبار، امورِ مملکت، معیشت، سائنس ہر چیز اسلام کی نظر میں اس کے اپنے اقدار و نظریات کے تابع ہے اور ہر شئے کو وہ اپنے ہی منہاجِ فکر کی میزان میں تولتا ہے۔ اس کے ایوانِ بلند کا سب سے پہلا پتھر وہ لافانی اور غیر متبدل نظریہ ہے جسے کم سے کم الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ "آخرت کو دنیا پر ترجیح دینا"۔ پوری عمارت اسی بنیاد پر اُٹھتی ہے اور اس عمارت کے ایک ایک پتھر کی نسوں میں اسلام اسی بنیادی نظریے کو ٹھیک اسی طرح گردش کرتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے جس طرح لہو پورے جسم میں گردش کرتا ہے۔ اب اگر کوئی بڑا انجینئر ایک نہایت شاندار عمارت بنالے جس کے در و بام تاج محل کو شرمانے والے ہوں اور جس کی چمک دمک دیکھنے والوں کو محوِ حیرت بنادے، لیکن اس کے شریانوں میں مذکورہ نظریہ کا گرم لہو موجود نہ ہو تو یہ عمارت مصر کا اہرام تو ہو سکتی ہے، اسلام کا "بیت اللہ" نہیں۔

مولانا آزادؒ زبردست صلاحیتوں کے مالک تھے اس میں کس کافر کو کلام ہو سکتا ہے۔ ان کا علم، ان کا تبحر، ان کی ذکاوت، ان کا خطیبانہ ہمہمہ، ان کی فکری تب و تاب، ان کا حافظہ، ان کی قوت استدلال، ان کا ملکۂ تحریر ــ یہ سب اوصافِ حمیدہ وہ تھے جن سے قادرِ مطلق نے انھیں فیاضی سے نوازا تھا ان کی دوسری تحریروں اور خطبوں کی طرح ان کی تفسیر القرآن بھی ان بیش بہا اوصاف کی نقش کاریوں کا دل آویز مظہر ہے اور اگر اسلام فقط ایک آرٹ، ایک فن،

ایک سائنس، ایک علمی نظریہ، ایک فلسفہ ہوتا تو بلا تکلف کہا جا سکتا تھا کہ مولانا آزادؒ کی تفسیر نے اسلام کی قابلِ رشک خدمت انجام دی ہے مگر جو لوگ اسلام کی روح، دین کی اصل اور مذہب کی بنیادی اقدار سے آشنا ہیں وہ کبھی اس نکتے کو نہیں سمجھ سکیں گے کہ فقط علم و تحقیق کے جواہر لٹانا، صرف طباعی و جودت کے موتی رولنا، محض تعقل و تفکر کی اونچی فضاؤں میں اُڑنا اور خالی زبان و قلم کے جھنڈے گاڑنا اسلام کی کوئی خدمت نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا گہرا ربط للّٰہیت، تقویٰ اور عملی خدا پرستی سے نہ ہو۔ وہ خدا پرستی جو ہر دوسری "پرستی" کو مسترد کر کے صرف اپنے تقاضے منواتی ہے اور لعل و یاقوت سے تراشے ہوئے ایک لاکھ الفاظ کے مقابلہ میں خاک پر کئے گئے ایک سجدے اور راہِ حق میں پڑے ہوئے ایک آبلے کو زیادہ قیمتی قرار دیتی ہے۔

جہاں تک راہِ عمل کا تعلق ہے ہمیں اس سے کوئی اختلاف نہیں کہ ہندوستان کے تمام ہی باشندوں کو مل جل کر اپنے وطن کی خدمات انجام دینی چاہئیں اور مولانا آزادؒ کی تفسیر یا ان کے اسوے نے اگر یہی تعلیم دی ہے تو بچشم ماروشن دلِ ما شاد۔ لیکن یہ کہنا کہ یہی تعلیم اسلام کی حقیقی تعلیم ہے اور اسی کی بنیاد پر مولانا آزادؒ کی تفسیر کو "سب سے بڑی خدمت" قرار دینا ایک خاص نوع کے سیاسی اندازِ فکر کی بازگشت کے سوا کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔

افسوس ہمیں مارچ کا "جامعہ" نہیں مل سکا ورنہ آلِ احمد سرور صاحب کا مقالہ پڑھ کر ہی صحیح طور پر پتہ چل سکتا تھا کہ وہ اقلیتوں کو ان کی کس غفلت پر تنبیہ کرنا چاہتے ہیں اور اقدام و عمل کی کن خامیوں کی نشاندہی فرما رہے ہیں جہاں تک واقعات کا تعلق ہے تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستانی مسلمانوں نے قومی زندگی میں شرکت سے شمّہ برابر بھی گریز نہیں کیا۔ وہ نظری اعتبار سے بھی اتحاد و اشتراک کے علمبردار ہیں اور جہاں تک ممکن ہوا ہے عملاً بھی اس راہ میں آگے بڑھے ہیں، لیکن اسکو کیا کیجئے کہ خود اکثریت گوناگوں بدگمانیوں، بے اعتمادیوں اور غلط اندیشیوں کی بنا پر انھیں دوش بدوش آگے بڑھنے اور ملک و قوم کی خدمت میں سرگرمیاں دکھلانے سے روک رہی ہے ایسی صورت میں مولانا آزادؒ کی تفسیر القرآن اور ان کے اسوۂ حسنہ کا حوالہ دیکر اقلیتوں کو جھنجوڑنا اور سرزنش دینا ایسا ہی ہے جیسے اُونٹ کے پیر میں زنجیر ڈال کر ستون سے باندھ دو اور پھر اس پر کوڑے برساؤ کہ آگے کیوں نہیں چلتا۔ ہندوستان کا مسلمان قومی زندگی میں دل و جان سے شرکت کیلئے ہر وقت آمادہ ہے اور مولانا آزادؒ کی تفسیر اور اُسوے کا مطالعہ کئے بغیر بھی وہ اسلام سے اس حد تک آشنا ضرور ہے کہ آئین و دستور کی مکمل وفاداری کے ساتھ ملک و قوم کی تعمیر و ترقی اور تہذیب و اصلاح اپنا انسانی فریضہ سمجھے۔ کوئی ناصح مشفق اگر اسے جھنجوڑنا چاہتا ہے تو اسے کھل کر بتانا چاہئے کہ قومی زندگی کی شرکت سے اس کی کیا مراد ہے اور مسلمان اگر اس میدان میں پیچھے ہیں تو اس میں ان کے اپنے قصد و اختیار کا کہاں تک دخل ہے۔ ہم تو فقط اتنا ہی جانتے ہیں کہ مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کا مدار نہ کسی شاندار تفسیر پر ہے نہ کسی قومی لیڈر کے اتباع پر۔ وہ قرآن کے سیدھے سادے ترجمے سے بھی عروج وارتقاء کی راہیں پا سکتے ہیں بشرطیکہ زبانی جمع خرچ پر عملی تب و تاب کو ترجیح دیں اور اس بھولے ہوئے سبق کو پھر سے یاد کرلیں کہ وہ شہداء علی الناس بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ وہ تابع نہیں متبوع ہیں، وہ مقتدی نہیں امام ہیں۔ وہ زمانے کی رَو پر بہنے نہیں آئے زمانے کو اپنے ساتھ بہانے آئے ہیں۔ یہ سبق آج کے حالات میں بظاہر تو مضحکہ خیز سا ہے، قوم پرستانہ فلسفے کے ائمہ اس پر ہنس دیں گے لیکن کندہ کر سکتے ہو تو یہ پیش گوئی کسی پتھر پر کندہ کر دو کہ مسلمان جب بھی عروج حاصل کرے گا اسی فراموش کردہ سبق کو تازہ کر کے حاصل کرے گا ورنہ ٹھوکریں کھائیگا اور غلامی کرتا رہیگا۔ غلامی چاہے جسمانی ہو یا ذہنی بڑی ذلیل شے ہے۔ ذہنی تو جسمانی سے بھی بدتر ہے۔ ہاں آقائیت کی مسند پر اگر آقائے حقیقی خالقِ کائنات جلوہ افروز ہو تو یہ وہ غلامی ہے جو غلاموں کے لئے دنیا بھر کی بادشاہت سے زیادہ لائقِ افتخار ہے اور اس کے بعد پھر کسی غلامی کا خطرہ نہیں۔ ۱۲

غیر مقلدین کے پیچھے احناف کی جماعت

سوال:۔ از شاہ لطف الرحمٰن۔ دکھین چاترا (بنگال)
تفصیل سے بتایا جائے کہ غیر مقلد (اہل حدیث) امام کے پیچھے احناف کی نماز ہونے نہ ہونے کا کیا مسئلہ ہے؟

الجواب:۔
یہ سوال ایک طویل سوالنامے سے اخذ کیا گیا ہے جو ایک خاص مقام کے واقعات پر مشتمل تھا۔ تلخیص واقعات کی یہ ہے کہ ایک مقام پر اہل حدیث اور احناف کے درمیان سخت اختلاف تھا سائل نے جو حنفی ہیں کوشش کر کے اس اختلاف کو دبایا اور اس طریقے کو رواج دیا کہ ہر دو فریق ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھ لیا کریں۔ اس سے فتنہ کافی کم ہوا اور سالہا سال تک اتحاد و موانست کی فضا قائم رہی، لیکن اب دفعتاً پھر فتنہ شروع ہو گیا ہے اور سائل کی تصریح کے مطابق اس کے بانی ہیں حنفی حضرات۔ وہ زور شور سے پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ اہل حدیث امام کے پیچھے احناف کی نماز نہیں ہوتی اور اس پروپیگنڈے کی تائید و تقویت میں فتاویٰ دار العلوم کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔

ہمیں ہمیشہ ہی اس طرح کے سوالات سے کوفت ہوتی ہے کوفت کا تعلق سائل سے نہیں بلکہ اُن افراد و اشخاص کے کارناموں سے ہے جو شیطان کے بہکاتے میں آکر فروعی مسائل پر خانہ جنگی کو ہوا دیتے اور امن و طمانیت کی فضا میں آگ لگاتے ہیں۔

لیکن کوفت کے باوجود ضرورت مجبور کرتی ہے کہ کچھ نہ کچھ کہیں۔ متذکرہ مسئلہ میں ہمارا موقف و مسلک تو تجلی میں بارہا آ چکا ہے، لیکن حنفی سورماؤں نے چونکہ فتاویٰ دار العلوم کا بھی حوالہ دیا ہے اس لئے اس رُخ سے کچھ کہنا موزوں ہوگا۔

فتاویٰ دار العلوم جدید ایڈیشن حصہ اول و دوم ص۱۱۱ پر ایک سوال و جواب درج ہے جو من و عن نقل کیا جاتا ہے:۔

سوال:۔ غیر مقلد کے پیچھے مقلد مقتدی کی نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟
جواب:۔ غیر مقلد امام اگر رعایت اس امر کی کرتا ہے کہ وہ امر نماز میں نہ کرے جس سے مقلد حنفی کی نماز فاسد یا مکروہ ہو اور وہ متعصب نہ ہو تو اقتدا اس کی درست ہے۔ کتب حنفیہ میں اسکی تفصیل درج ہے۔"

اب یہ دیکھنا چاہئے کہ "متعصب" سے مفتی صاحب کی مراد کیا ہے؟ تو اسی فتاویٰ دار العلوم کے مختلف فتاویٰ سے پتا چلتا ہے کہ متعصب اہل حدیث وہ ہے جو امام ابو حنیفہؒ کی تحقیر کرتا ہو، جو یہ دعویٰ کرتا ہو کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے کی وجہ سے کسی حنفی کی نماز نہیں ہوتی، جو یہ کہتا ہو کہ آمین بالجہر نہ کرنے والے گناہگار ہیں وغیر ذلک۔

ایسے متعصب غیر مقلد کے پیچھے نماز پڑھنا بے شک غلط ہے اس سے پرہیز کرنا چاہئے لیکن جس میں یہ تعصب نہ ہو اس کے پیچھے نماز بلاشبہ درست ہے بشرطیکہ دوران نماز میں وہ کسی ایسے فعل کا مرتکب نہ ہو جو احناف کے نزدیک نماز کو فاسد یا مکروہ کرنے والا ہو۔ ہم نے اہل حدیث کی مساجد میں بارہا نماز پڑھی ہے ہمیں تو کوئی فعل ایسا نظر آیا نہیں۔ نہ سائل نے اپنے بیان کردہ واقعات میں کوئی اشارہ اس طرف کیا ہے کہ احناف امام کے فلاں فعل پر معترض ہیں۔

اسی جلد کے صفحہ ۱۴۳ پر ایک سوال جواب ہے۔ اس میں تو یہاں تک صراحت ہے کہ جو غیر مقلد امام ابو حنیفہؒ کو بُرا کہتا ہے اسکے پیچھے بھی نماز ہو جاتی ہے صرف کراہت آ جاتی ہے۔

فتاویٰ دار العلوم کے بعد ذرا مولانا اشرف علیؒ کے ارشاد پر بھی نظر ڈال لیجئے جو دیوبندی جماعت میں صفِ اول کے لوگوں میں ہیں۔

امداد الفتاویٰ جلد اول میں اس مسئلے سے متعلق کئی صفحات ہیں ان میں سوال ۲۹۵ (جو عربی میں ہے) کے جواب میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے عربی ہی میں تفصیلی جواب عنایت فرمایا ہے جو یہ ہے:۔

> "بسم اللہ اور حمد و صلوٰۃ کے بعد بندہ کہتا ہے کہ میرے نزدیک اس مسئلہ میں یہ تفصیل ہے کہ غیر مقلدین کی دو قسمیں ہیں۔ جو غیر مقلد، مقلدین کے ساتھ فقط اجتہادی جزئیات میں اختلاف رکھتے ہیں ان کی امامت میں احناف کا نماز پڑھنا اسی طرح جائز و درست ہے جس طرح شوافع کے پیچھے۔ اگر غیر مقلد امام نماز کے اختلافی

جزئیات میں عملاً مقتدیوں کی رعایت کرتا ہے تو
اس جواز پر سب علماء کا اتفاق ہے اور اگر رعایت
نہیں کرتا تب اس کے جواز میں علماء کے درمیان
اختلاف ہے اور جمہور علماء کا فتویٰ جواز ہی کا ہے
دوسری قسم غیر مقلدین کی وہ ہے جو مقلدین
سے بعض اجماعی مسائل میں اختلاف رکھتی ہے۔
مثلاً بیک وقت چار سے زائد نکاح کا جائز ہونا
اور متعہ کا مباح ہونا اور اسلاف کو برا بھلا کہنا
وامثال ذلک۔ اس قسم کا حکم اہل بدعت کا ہے کہ
رضا و رغبت سے ان کی اقتداء میں نماز پڑھنا
مکروہ تحریمی ہے اور بادلِ ناخواستہ اضطراراً
نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی۔
اور اگر صحیح طور پر منکشف نہ ہو کہ مذکورہ قسم
کے اجماعی مسائل میں غیر مقلد امام کا مسلک کیا ہے
تو اولیٰ یہ ہے کہ اس کی اقتداء کرلی جائے تاکہ فتنہ
پیدا نہ ہو پھر بطور احتیاط کے نماز لوٹالے۔ ہاں اگر
اقتداء میں فتنہ ہو تو دین کو خلط ملط سے بچانے کے
لئے اقتداء سے رک جائے۔"

یہ ہے مولانا اشرف علیؒ کا موقف و مسلک۔ اس سے
وہی بات ثابت ہوئی جو وقتاً فوقتاً ہم کہتے رہے ہیں۔ یعنی
آمین بالجہر، فاتحہ خلف الامام، رفع یدین وغیرہ کا اختلاف
فروعی اختلاف ہے جس کی بنیاد پر اتنی تفریق ہرگز نہیں ہونی
چاہیئے کہ ایک فریق دوسرے فریق کے پیچھے نماز تک نہ پڑھے۔
اہل علم جانتے ہیں کہ اس طرح کے اختلافات کی بنیاد بدعت پسندی
اور ذہنی بے راہ روی پر نہیں بلکہ صحابہ رضوان اللہ علیہم کے
اسوۂ و عمل پر ہے۔ محققین نے جگہ جگہ اس حقیقت کو واضح کیا
ہے کہ یہ اختلافات صحابہؓ کے مابین بھی موجود تھے اور ان کے
پیچھے تعمیل سنت ہی کا قصد و عزم کار فرما تھا اور ہے۔ شاہ ولی اللہ
رحمۃ اللہ علیہ نے الانصاف فی بیان سبب الاختلاف
میں اس باب میں بڑی اچھی گفتگو کی ہے اور علمائے سلف کی
قابل تقلید روش کو منقح کیا ہے۔ ان فروعی مسائل میں ایکدوسرے
پر طنز و طعن کرنا، لڑنا بھڑنا جہالت و تعصب کا کرشمہ ہے۔ خواہ
اہل حدیث ہوں یا احناف، جو بھی ان جزئی اختلافات کو حق و
باطل کے رخ سے لیتا ہے اور فریق ثانی کو گمراہ قرار دیتا ہے
وہ متشدد اور متعصب ہے۔
مولانا عبد الحئیؒ نے بھی اپنے فتاویٰ میں (مجموعۃ الفتاویٰ
جلد اول) اس پر مفصل تقریر کی ہے اور حاصل اس تقریر کا
یہی ہے جو متذکرہ معروضات سے واضح ہوا۔
پھر نہیں سمجھ میں آتا کہ احناف کس بنیاد پر وہ تفرقہ پھیلاتے
ہیں جس کا سوال میں ذکر ہے۔ یا تو یہ معلوم ہو کہ غیر مقلد امام اس معنی
میں بدعتی ہے جو مولانا اشرف علیؒ کے فتویٰ میں بیان ہوئے تب
تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا بحث طلب ہوگا، لیکن اگر یہ معلوم نہیں
تو پھر فتنہ پردازی سے کہیں بہتر ہے کہ باہمی اتحاد و رواداری
کی فضا قائم رکھی جائے۔ والفتنۃ اشد من القتل۔

مختلف

سوال: — از محمد جلیل خاں۔ ضلع غازی پور

(۱) ماہ جنوری ۶۳ء کے تجلی میں قربانی کے سلسلے میں ایک ال
کا جواب دیتے ہوئے آپنے فرمایا تھا کہ "مسلم معاشرے کی ابتری نے
ذبح کے نظام میں ایسی خرابیاں پیدا کر دی ہیں جنھیں خود اسلام
بھی پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتا" براہ کرم ان خرابیوں کی تفصیل
سے بتانے کی زحمت گوارا فرمائیں۔

(۲) آج کل ہمارے ضلع میں دیوبندی اور بریلوی کا جھگڑا
بڑے زوروں سے چل رہا ہے۔ اس سلسلہ میں بریلوی حضرات بار بار
مولانا اسمٰعیل کی کتاب "تقویۃ الایمان" کے اس ٹکڑے کا حوالہ
دیتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ نماز میں رسول اللہ صلعم کے تصور سے نماز
مکروہ ہوجاتی ہے اور گدھے اور گھوڑے کے تصور آنے سے نماز
میں کوئی قباحت نہیں ہوتی۔ براہ کرم تفصیل سے بتائیے کہ کس سیاق
و سباق میں یہ بات آئی ہے اور کہاں تک حقیقت کو توڑ مروڑا گیا ہے

(۳) حضرت نیاز فتح پوری نے سالنامہ نگار ۶۳ء میں ایک خط
میں کفر و اسلام کے عنوان کے تحت ——— مسلمانوں کے اس
عقیدے کا کہ "جو مسلمان نہیں اسے آخرت میں نجات نہیں مل سکتی۔"

مذاق اُڑاتے ہوئے کہا ہے کہ ایک بوڑھی عورت جو ذات کی تیلن تھی اپنی ساری عمر انتہائی تکلیف میں گذارتی رہی اور جس نے کبھی کسی کو ستایا نہیں، بلکہ خود ستائی گئی اور جانور کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی، کیا صرف اس وجہ سے وہ جنت سے محروم رہے گی کہ اس کا عقیدہ مذہب اسلام پر نہ تھا؟ آپ کی ناقدانہ رائے اس سلسلے میں کیا ہے؟

الجواب :-

(۱) ان خرابیوں کا نظارہ، ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو کسی مذبح کی سیر کر آئے۔ گندگی، سنگدلی، بدزبانی اور خدا فراموشی قصائیوں میں عام ہو چکی ہے۔ وہ عموماً ایسے خراب جانور کاٹتے ہیں جنھیں ہلکے سے ہلکے الفاظ میں "بیمار" کہا جا سکتا ہے۔ کتنے ہی جانور وہ ایسے ذبح کرتے ہیں جو اپنے پیروں سے چل کر مذبح تک نہیں جا سکتے۔ انھیں زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی فکر ہوتی ہے یہ فکر بالکل نہیں ہوتی کہ روگی اور سسکتے ہوئے جانوروں کا گوشت کھانے والوں کی صحت پر کیا اثر ڈالے گا وغیر ذلک۔

(۲) یہ جھگڑے خیر سے ہمارا قومی نشان بن چکے ہیں۔ بریلوی امت کو سوائے اس کے دنیا میں کوئی فکر نہیں کہ دیوبندیوں اور اہل حدیثوں کو جہنمی ثابت کرتے رہو۔ ان کی چھوت اوروں کو بھی لگ گئی۔ جہاں دیکھو یہی جھگڑا، جدھر دیکھو یہی فساد قعرِ مذلت میں گرنے اور رفتہ رفتہ خوار و زبوں ہونے والی قوموں کے یہی رنگ ڈھنگ ہوتے ہیں۔

جس اعتراض کا آپ نے ذکر کیا اس کے جوابات دسیوں بار دیئے جا چکے ہیں۔ مولانا منظور نعمانی نے تو مستقل رسالہ تصنیف کیا "معاندین اہل بدعت اور اسمٰعیل شہیدؒ" اسے پڑھنے کے بعد کوئی بھی انصاف پسند اور غیر متعصب یہ مانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حضرت شہیدؒ نے جو کچھ جس سیاق و سباق میں کہا بالکل درست کہا، لیکن جن لوگوں کا مقصد ہی اعتراض کئے جانا ہو اور جہالت و کند ذہنی نے ان کی آنکھوں پر پٹیاں چڑھا دی ہوں وہ کبھی زبان بند نہیں کر سکیں گے۔

(۳) نیاز فتح پوری کی بھلی چلائی۔ انھوں نے چشم بددور دین کی کس کس تعلیم کا مذاق نہیں اُڑایا اور اہل دین پر کیا کیا پھبتیاں نہیں کسیں۔ وہ در اصل نسلاً تو مسلمان ہیں لیکن دماغی اعتبار سے ایک ایسی چیز ہیں جو نہ ہندو ہوتی ہے نہ مسلمان نہ عیسائی ہوتی ہے نہ یہودی۔ حتیٰ کہ وہ ڈھنگ سے کمیونسٹ بھی نہیں ہوتی۔ ان کا کام وقتاً فوقتاً یہی رہا ہے کہ شوشے چھوڑتے رہیں اور مغرب زدہ جہلاء سے داد وصول کرتے رہیں۔ ہم ان کے ترشحاتِ عالیہ کو اس کا مستحق نہیں سمجھتے کہ سنجیدگی سے ان پر التفات کریں۔ اب ویسے بھی وہ پاکستان جا کر اُن تجدد پیشہ اربابِ اقتدار کی انگوٹھی کا نگینہ بن گئے ہیں جن کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ جتنا کفر و زندقہ لا سکو اسلام کے نام پہ لاؤ اور امت مسلمہ کے مزاج کو ٹھیک امریکہ اور یورپ کے سانچے میں ڈھال دو۔ نیاز صاحب وہاں بہت فٹ رہیں گے۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

مولانا مودودی اور صوفی نذیر احمد کشمیری

سوال :- از محمد اسعد اسرائیلی سنبھل

صوفی نذیر احمد کشمیری اپنے بعض مضامین کی وجہ سے جماعتِ اسلامی کے مؤید کی حیثیت سے متعارف ہیں لیکن حال ہی میں ان کی ایک کتاب نظر سے گذری جس میں انھوں نے بالکل ہی دوسرا موقف اختیار فرمایا ہے۔ طویل اقتباسات پیش خدمت ہیں از راہ کرم ان پر مبسوط گفتگو فرمائیں؟

الجواب :-

یہ سوالنامہ ۱۲ صفحات پر مشتمل تھا۔ اگر صوفی نذیر احمد صاحب کشمیری واقعتہً کوئی ایسی شخصیت ہوتے جن کی مخالفت مولانا مودودی کے دینی کاز کو نقصان پہنچا سکتی تو ہم ۱۲ کیا پچاس صفحات سے بھی نہ گھبراتے۔ لیکن ہمیں شمہ برابر بھی اندیشہ نہیں ہے کہ ان کی متذکرہ کتاب جنگل میں مور کے ناچ سے زیادہ کوئی قدر و قیمت رکھتی ہو گی اسی لئے تجلّی کے صفحات برباد نہیں کر سکتے

محترم صوفی صاحب کے مضامین تو بہت چھپتے رہتے ہیں لیکن ہمیں اپنی کوربذوقی کا اعتراف ہے کہ ان مضامین کو پڑھنے کی توفیق اور ہمت ہمیں بہت کم ہوئی ہے۔ ان کا انداز تحریر کچھ عجیب ہے اور خیالات اکثر و بیشتر اتنے بلند ہو جاتے ہیں کہ ہم جیسے

چھوٹے عقیدہ والے ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ ایسی صورت میں اچھا یہی ہے کہ انھیں کہنے دیجئے دل کھول کر جو چاہے۔ نوٹس لینا لاحاصل ہوگا۔ ویسے ہم اگر نوٹس لینا بھی چاہیں تو یہ ہمارے بس سے باہر ہوگا کیونکہ ان کی تحریروں کا سامنا کرنے کیلئے دماغ کی ایک ایسی مخصوص ساخت درکار ہے جو ہمیں نصیب نہیں۔ وہ اکثر و بیشتر کچھ ایسا لکھتے ہیں کہ اگر آپ چند تولے تیل سر میں ڈال کر ان کی تحریر گرامی پڑھ ڈالیں تو مالش کے بغیر یہ خشک ہو جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتابیہ عورت سے نکاح

سوال: — از محمد رفیع الحسن انصاری۔ بمبئی ۱۲

بابتہ ماہ مارچ و اپریل سنہ ۶۳ء پیش نظر ہے۔ سوال نمبر ۱ "کتابیہ عورت سے نکاح" کے جواب میں آنجناب کی تنبیہ یا شرط الجھنوں کا باعث ہو سکتی ہے۔ لہذا التماس ہے کہ ضروری وضاحت تجلی کی کسی قریبی اشاعت میں شائع فرما کر ممنون فرمائیں

(۱) کتابیہ عورت سے نکاح شرعاً جائز ہے۔ مگر ساتھ ہی آپ کی یہ تنبیہ بھی درج ہے کہ فی زمانہ عالمگیر بے دینی اور مادہ پرستی کے پیش نظر قبل از قبل یہ اطمینان کر لینا ضروری ہے کہ "آیا کتابیہ عورت صرف نسلاً کتابیہ ہے یا اعتقاداً بھی ہے"۔ کیا ایسی کوئی شرط یا تنبیہ خصوصاً اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان مردوں اور عورتوں کے لئے بھی ضروری قرار پائیں گی جبکہ موجودہ زمانے کے حالات کا رخ ہی بے دینی اور مادہ پرستی کی طرف ہے۔ اگر نہیں تو براہ کرم دلائل سے مطمئن فرمائیں۔

الجواب: —

میں ٹھیک طور پر آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا، جو کچھ سمجھا ہے اس کے مطابق جواب یہ ہے کہ شریعت کے احکام اعلیٰ تعلیم یافتاؤں اور ادنیٰ تعلیم یافتاؤں کے لئے جدا جدا نہیں ہیں۔ کتابیہ عورتوں کا واقعی "کتابیہ" ہونا اور از روئے عقائد دہریہ نہ ہونا جواز نکاح کی شرط ہے۔ یہ شرط سب مسلمانوں کے لئے یکساں ہے۔

سوال کے اختتام پر آپ دلائل کس چیز کے طلب کر رہے ہیں یہ بھی میں نہ سمجھ سکا۔ حالات کا رخ کوئی بھی ہو اور دہریت و الحاد کتنا بھی پھیل چکا ہو لیکن اشخاص و افراد کے معاملات میں ان کی اپنی مخصوص حالت کا اعتبار ہوگا۔ یہ غلط خیال ہے کہ چونکہ بے دینی و مادہ پرستی زوروں پر ہے لہذا یہود و نصاریٰ کی تمام عورتیں اپنے مذہب سے قلب و ذہن کا رشتہ کاٹ چکی ہیں۔ ہرگز نہیں۔ عملی حالت پر مت جائیے عریانی و فحاشی، جنسی بے راہ روی اور مادہ پرستانہ زندگی اگرچہ یہود و نصاریٰ میں وبا کی طرح پھیل چکی ہے لیکن ایمان و عقیدہ عمل سے جداگانہ ایک چیز ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ خود مسلمانوں میں کتنے بے شمار افراد ہیں جن کے اعمال و مشاغل میں اسلام کی کوئی چھاپ نظر نہیں آتی سر سے پاؤں تک دنیا پرستی کی تصویر اور عصر نو کے فاسد و کاسد تصورات سے آلودہ۔ لیکن جب تک ان کی طرف سے صریحاً عقیدہ کفر ظاہر نہ ہو، جب تک وہ اللہ اور اس کے آخری رسول ﷺ کی غلامی کا انکار نہ کریں جب تک وہ بنیادی عقائد اسلام اور ضروریاتِ دین سے ذہنی انحراف کا ثبوت نہ دیں انھیں مسلمان ہی مانا جائے گا۔ ان سے سلوک مسلمانوں ہی جیسا ہوگا اور مرنے پر ان کی نماز جنازہ سوائے بعض اہل حدیث کے ہر مسلمان پڑھے گا۔

اسی طرح کتابیہ عورتوں کا حال ہے۔ وہ عملاً چاہے کچھ بھی بن چکی ہوں لیکن جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ ان کے ذہن نے اپنے دینی عقائد کے خانے میں جھاڑو دے کر الحاد و دہریت کے خیالات سجا لئے ہیں اس وقت تک انھیں کتابیہ ہی مانا جائے گا اور شرعاً ان سے نکاح جائز ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ دیگر مفاسد و قبائح کی بناء پر ایسے نکاح قابل اجتناب سمجھے جائیں۔

ذبیحہ

سوال: — (ایضاً)

یہود و نصاریٰ کا ذبیحہ کھانا شرعاً حلال ہے۔ یہود تو رسم ذبیحہ کی پابندی سختی سے کرتے ہیں مگر نصاریٰ ذبیحہ سے بے نیاز ہو چکے ہیں جانور کو یا تو جھٹکہ یا مشین سے ہلاک کیا جاتا ہے۔

اور اگر کوئی پرندہ یا مرغی ہو تو گردن مروڑ کر ہلاک کرتے ہیں اور پھر گوشت استعمال میں لایا جاتا ہے۔ کیا نصاریٰ کا ان طریقوں سے ہلاک کردہ جانور یا پرندہ کا گوشت کھانا حلال ہوگا یا حرام

الجواب:۔
اگر جانور ہلاک کرنے میں شرعی ہدایات سے ہٹکر کوئی طریقہ اختیار کیا گیا تو خواہ اس کا اختیار کرنے والا مسلمان ہی ہو اور خواہ اس پر ایک لاکھ بار "اللہ اکبر" پڑھ دیا جائے وہ حرام ہی رہے گا۔
یہ سوال کہ کس کا ذبیحہ جائز ہے اور کس کا نہیں اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب طریق ذبح خلاف شرع نہ ہو۔ گردن مروڑ کر یا جھٹکے کا کوئی طریقہ استعمال کرکے یا مشین کے ذریعہ ہلاک کرکے جو گوشت مہیا ہوا وہ تو ہر حال میں حرام ہی ہے چاہے یہ حرکت یہود و نصاریٰ کی ہو یا مسلمانوں کی۔

(۱) جُنبی کا ذبیحہ (۲) عذاب قبر (۳) سنن فجر

سوال:۔ از عبد القادر۔ کونادرم (کھمم)
(۱) کیا جُنبی ذبح کرسکتا ہے اور کیا نابینا بھی؟
(۲) یہاں ایک صاحب ہیں اُن کا کہنا ہے کہ عذاب قبر کے بارے میں مجھے قرآن وحدیث میں اُس کا ذکر نہیں ملا میرا خیال ہے کہ حدیث سے عذاب قبر ثابت ہے۔ براہ کرم قرآن وحدیث سے عذابِ قبر کا ذکر کیجئے۔
(۳) جب فجر کی جماعت کھڑی ہو جائے تب جماعت میں شریک ہو جائے یا سنت ادا کرے اگر جماعت میں شریک ہوجانے کی صورت میں بعد فرض اُسی وقت سنت ادا کرسکتا ہے یا نہیں مطلع فرمائیں؟

الجواب:۔
(۱) ذبح کرنے والا خواہ جُنبی ہو (جس پر غسل واجب ہے) یا نابینا اس کا ذبیحہ حلال ہوگا اگر عمل ذبح شرعی قاعدے کے مطابق واقع ہوا ہو۔
(۲) کچھ لوگ بات تو فقط ہوائے نفس کے تحت کرتے ہیں مگر نمائش کرتے ہیں اس بات کی کہ انھوں نے کافی تحقیق کی ہے۔ جن صاحب کا آپنے ذکر کیا انھوں نے اگر حدیث دیکھی ہوتی تو ایسی خلاف واقعہ بات کبھی نہ کہتے۔ حدیث کی مشہور و متداول کتاب مشکوٰۃ جو حدیث کی دوسری وقیع کتابوں کا عطر ہے ملاحظہ فرمائیے۔ شروع ہی میں پانچواں باب ہے اثبات عذاب القبر۔ اس میں تین فصلوں میں ۱۵ حدیثیں عذاب قبر کے اثبات میں موجود ہیں۔ اور کیا چاہئے؟
(۳) حنفی مسلک یہ ہے کہ جماعت ہاتھ سے جانے کا اندیشہ نہ ہو تو فجر کی سنتیں ادا کرے خواہ ایک رکعت جماعت کی نکلجائے اگر اتنی دیر میں آیا ہے کہ سنتیں پڑھنے سے جماعت نکل جائیگی تو یوں ہی شریک جماعت ہو جائے اور سنتیں طلوعِ خورشید کے بعد قضا کرے۔ چونکہ فجر کے فرضوں کے بعد کوئی نماز نہیں ہے اور طلوع شمس کے وقت نماز ممنوع ہے ان دونوں وجوہ سے احناف اسے پسند نہیں کرتے کہ فرضِ فجر کے فوراً بعد سنتوں کی قضا کی جائے۔

خلیفۂ بلا فصل

سوال:۔ از اللہ بخش۔ سرگودھا۔
تفسیر ابن کثیر اُردو حصہ دوم کے صفحہ ۳۰ پر زیر آیت أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ۔ تفسیری روایات لکھتے ہوئے ایک حوالہ خلیفہ بلا فصل رضی اللہ عنہ کا بھی لکھا ہے (۱) کیا اس سے مراد حضرت علیؓ نہیں (۲) کیا ابن کثیرؒ کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت علیؓ خلیفہ بلا فصل تھے (۳) یا یہ کتابت یا ترجمہ میں سہو ہو گیا ہے؟

الجواب:۔
آپ کو مغالطہ اس لئے ہو رہا ہے کہ "خلیفۂ بلا فصل" کی اصطلاح شیعہ حضرات نے حضرت علیؓ کے لئے وضع کر رکھی ہے، لیکن مطمئن رہئے کہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ شیعہ نہیں تھے۔ انھوں نے خلیفۂ بلا فصل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لئے لکھا ہے اور اس لئے لکھا ہے کہ شیعوں کے فاسد اور خلافِ واقعہ نظریئے کا رد ہو۔ اسے تعریض کہتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ختمی مرتبت سرور انس وجن صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر ہی ہوئے ہیں اور خود حضرت

علیؓ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ حضرت علیؓ تک تو خلافت کی نوبت چوتھے نمبر پر پہنچی ہے مگر شیطان زندہ باد کہ اس نے مسلمانوں ہی میں سے ایک گروہ ایسا کھڑا کردیا جو پہلے تینوں خلفاء کو غاصب و ظالم قرار دے کر فقط حضرت علیؓ ہی کو مستحق خلافت خیال کرتا ہے اور چاند پر گرد اڑانے والوں کی طرح اس خبط میں مبتلا ہے کہ حضرت علیؓ ہی خلیفہ بلا فصل تھے۔

بہرحال یہاں یہ مسئلہ زیر بحث نہیں۔ کہنا صرف اسی قدر ہے کہ ابن کثیر نے خلیفہ بلا فصل حضرت ابوبکرؓ کو لکھا ہے اور مقصود اس سے شیعی تخیل کی تردید ہے۔ جس کتاب میں حضرت علیؓ کو خلیفہ بلا فصل لکھا ہو اسے چولھے میں رکھ دیجئے ورنہ اندیشہ ہے کہ رفض و تشیع کے خطرناک جراثیم آپ میں بھی گھس جائیں گے۔ ونعوذ باللہ من ذلک۔

دکانوں کی پگڑی

سوال:۔ از عبدالکریم ہاشم بھائی۔ احمد آباد (گجرات)

زید صاحب نصاب ہے، خوش حال و مالدار ہے، آمدنی بھی کافی ہے، تجارت کا روبار بھی اچھا خاصا چل رہا ہے۔ اس نے کچھ زمین خرید کر کئی دکانیں نئی بنائی ہیں وہ خالی دکانیں اس شرط پر دینا چاہتا ہے کہ جو شخص مجھے فی دکان پانچ ہزار روپے پگڑی اور کرایہ ماہانہ سو روپے دیگا اسے دکان کرایہ پر دوں گا۔ زید کا ایسا معاملہ کرنا شرعاً کیسا ہے کیا خالی دکان کی پگڑی کی رقم بغیر کسی معاوضے کے لینا سود سمجھا جائے گا؟

نوٹ:۔ پگڑی اس لئے دی جاتی ہے کہ دکانوں کا ملنا مشکل ہے، دکانیں کم اور لینے والے زیادہ ہیں، کرایہ کم ہو تو پگڑی زیادہ ملتی ہے اور کرایہ زیادہ ہو تو پگڑی کم ملتی ہے۔

الجواب:۔

مکانوں اور دکانوں وغیرہ پر پگڑی لینے کا رواج اب اتنا عام ہو چکا ہے کہ کسی بھی بڑے شہر میں اس کے بغیر معاملہ آگے نہیں چلتا۔ شرعی اعتبار سے پگڑی کی رقم نہ سود کے دائرے میں آتی ہے نہ رشوت کے۔ قمار سے بھی اسے مشابہت نہیں۔

پھر اسے کیا کہیں؟

تو عاجز کا خیال اس کے بارے میں یہ ہے کہ بجائے خود تو یہ رقم مال حرام کی صف میں نہیں آتی، لیکن اپنی جڑ بنیاد کے لحاظ سے یہ خالی از فساد نہیں ہے۔ دراصل نظام باطل کا جو شجر خبیث پوری دنیا پر سایہ افگن ہے اس کے تمام ہی برگ و بار اپنے خمیر میں نجاست و عفونت کا عنصر ضرور رکھتے ہیں۔ یہ پگڑی بھی اسی شجر کی ایک شاخ ہے۔ جس نظام میں سود کے بغیر قرض نہ مل سکے وہاں پگڑی کے بغیر مکان ہی کیوں ملنے لگا۔

ضرورت ہے کہ کوئی اور عالم اس مسئلہ پر روشنی ڈالے ہم خود کو کسی اٹل اور اطمینان بخش فیصلے تک پہنچنے کا اہل نہیں پاتے۔

کرایہ در کرایہ

سوال:۔ (ایضاً)

ایک شخص کی دکان میں تین ہزار روپے کا مال و سامان ہے تو یہ کرایہ دار اپنی دوکان مع مال سامان کے گڈول Goodwill کے ساتھ کسی دوسرے کرایہ دار کو بغیر دکان مالک کی رضامندی کے پانچ ہزار روپے میں دے دیتا ہے تو یہ معاملہ شرعاً کیسا ہے؟ مال سے زائد کی لی ہوئی رقم سود سمجھی جائے گی؟

الجواب:۔

مال سے زائد لی ہوئی رقم سود نہیں ہوتی۔ یہ تو ایسا ہی نفع ہے جیسا جائز تجارت میں کمایا جاتا ہے۔ البتہ ناجائز یہ بات ہے کہ جو دوکان مالک سے خود اپنے لئے کرائے پر لی گئی تھی اسے دوسرے کو کرایہ پر دیدیا۔ یہ کرایہ پر دینا کسی نفع کے بغیر ہوتا تب بھی اسی طرح ناجائز ہوتا جس طرح مسئولہ صورت میں — اخلاق و دیانت کا واضح تقاضا یہ ہے کہ کرایہ پر لی ہوئی دکان یا مکان کے ساتھ وہ روش اختیار نہ کی جائے جو اصل مالک ہی کو زیب دیتی ہے۔

ہلدی کا مسئلہ

سوال :- (ایضاً)

ہمارے گجرات میں سوکھی ہلدی بکتی ہے جو رنگ میں پیلی (زرد) ہوتی ہے جو ترکاری میں دیگر مسالوں کے ساتھ استعمال ہوتی ہے ثابت بھی ہوتی ہے اور پسی ہوئی بھی ہوتی ہے۔ اس کے متعلق سنا گیا ہے کہ اس میں زردی لانے کے لئے اس کو زمین سے نکال کر کچھ عرصہ تک گوبر میں دبا کر رکھا جاتا ہے تو ایسی ہلدی کو استعمال میں لانا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب :-

یہ بات سنی ہم نے بھی ہے۔ نہ صرف سنی ہے بلکہ تحقیق سے اس کا درست ہونا بھی غالب حد تک ثابت ہوا ہے۔

لیکن اس سے ہلدی کے استعمال میں کوئی حرمت و کراہت پیدا نہیں ہوتی۔ گوبر ہو یا کوئی بھی غلاظت۔ اس کے حرام و نجس ہونے کا مدار دو چیزوں پر ہے۔ ایک اس کے اجزاء ترکیبی، دوسرے ان اجزاء کی کیمیادی ترکیب و ترتیب۔ اگر یہ دونوں چیزیں اپنی طبعی و فطری شکل میں موجود رہیں تو نجاست نجاست رہے گی ورنہ نہیں۔ ہلدی کے ساتھ جو عمل رنگ لانے کی خاطر کیا جاتا ہے اس کے نتیجے میں گوبر کے بعض کیمیادی اثرات تو ضرور ہلدی میں آجاتے ہیں لیکن یہ ایسا ہی ہے جیسے اناج اور ترکاریوں میں کھاد کے کیمیاوی اثرات آجاتے ہیں۔ اس سے اناج اور ترکاریاں حرام نہیں ہوتیں تو ہلدی کا بھی یہی حکم سمجھئے۔

پھر ہلدی کچی کھانے کی چیز نہیں۔ اس کی رہی سہی قباحت پکنے کے عمل میں ختم ہو جاتی ہے۔

زندگی کا بیمہ اور اس کی زکوٰۃ

سوال :- از احمد حسین۔ ضلع گیا۔

زندگی کا بیمہ کرانا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہیں تو اس کی کیا وجہ ہے؟ بیمہ کا روپیہ وصول ہونے سے پہلے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں۔ تشریح فرمائیے؟

الجواب :-

زندگی کا بیمہ قمار کی ایک نمایاں قسم ہے۔ قمار بھی وہ جس میں انسانی سوجھ بوجھ، فکر و تدبر اور مشق و تمرین کا برائے نام بھی دخل نہیں۔ جو بھی دلائل اسے جائز قرار دینے والوں نے آج تک پیش فرمائے ہیں ان سب پر علماء نقد کر چکے ہیں اور نقد کا ماحصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ جواز کی کوئی بھی دلیل وزن اور جان نہیں رکھتی۔ بیمہ اس کے سوا آخر ہے کیا کہ محض اتفاق اور تقدیر پہ ٹھیک جواریوں کی ذہنیت کے ساتھ داؤ لگا دیا جائے۔

المختصر بیمے کے جواز کی کوئی دلیل ہمیں اپیل نہیں کرتی جبکہ حرمت کے لئے یہی بنیاد کافی شافی ہے کہ اس کاروبار میں نفع اور نقصان کا تعلق انسان کی ذاتی جدوجہد اور فکر و تعمق سے نہیں بلکہ مستقبل کے مخفی اور نامعلوم حوادث سے ہے۔

داڑھی کی مقدار کا مسئلہ

سوال :- از محمد صدیق۔ کراچی۔

آج کافی عرصے کے بعد ایک تکلیف دینے کے لئے قلم اٹھا رہا ہوں خدا کرے آپ اس مسئلے کے لئے فرصت نکال سکیں۔ ماہ اپریل کا زندگی یقیناً آپ نے دیکھا ہوگا "داڑھی کا مسئلہ" میں خاص طور سے اسی پر آپ کی توجہ مبذول کرا رہا ہوں۔

کیا کیا جائے آپ نے اپنی تحریر کا مرید بنا لیا ہے۔ جب تک آپ کی رائے سامنے نہیں آتی دل کو تشفی نہیں ہوتی۔ آپ چونکہ ایک مخصوص پیرائے کے مالک ہیں آپ کی تحریر انتہائی شگفتہ اور دلنشین ہوتی ہے اس لئے آپ کو تکلیف دی جا رہی۔ سید قاری صاحب نے ۱۹ صفحات کا طویل ترین مضمون لکھ تو دیا ہے احادیث کے حوالجات بھی مضمون کی اہمیت بڑھا رہے ہیں مگر میں اس میں بھی کچھ تشنگی محسوس کر رہا ہوں۔ اوّل تو ان کی بنیاد تاریخ پر ہے۔ دوئم ایک نیا انکشاف کہ داڑھی مخنث قسم کے لوگ کٹوایا کرتے تھے۔ بڑا ہی تعجب ہوا کہ یہ مخنث وہ بھی داڑھی والے کس ملک کی پیداوار ہیں۔

ازراہِ کرم مولانا مودودی صاحب نے اور مدیر زندگی نے اس مسئلہ پر جو کچھ فرمایا ہے ان سب کو سامنے رکھتے ہوئے بذریعہ

تجلی جواب عنایت فرمادیں۔

الجواب :-

جی ہاں۔ اپریل ۱۹۶۳ء کے "زندگی" میں "داڑھی کی مقدار کا مسئلہ" میں پڑھ چکا ہوں اور اس سے قبل مولانا مودودی کے ارشادات بھی اس موضوع پر زیر مطالعہ آتے رہے ہیں۔ میری جو رائے اس مسئلہ میں تھی اسے ایک سے زائد بار تجلی میں ظاہر کر چکا ہوں اور اب بھی اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ یہ رائے وہی ہے جس پر مولانا مودودی قائم ہیں۔ مدیر زندگی نے اس رائے پر بسط کے ساتھ جو نقد کیا ہے وہ میرے نزدیک محققانہ نہیں بلکہ مقلدانہ ہے جس میں شے کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کے عوض مکتبی نوع کی روایت پرستی اور سطح پسندی کا غلبہ ہے۔

روایت پرستی ایک خاص حد تک نہ صرف پسندیدہ ہے بلکہ ضروری بھی ہے اور سطح پسندی کا بھی ان مسائل میں ایک مقام ہے جن کا تعلق عقل سے نہیں فقط نقل سے ہو۔ لیکن اضافی اور زمانی نوع کے مسائل میں تقلید جامد کا رُخ اختیار کرنا اور فقہی روایات کے ظاہر پر جم جانا ایک مقدس رجحان ہونے کے باوجود محققانہ طریق نہیں کہلا سکتا۔

مدیر زندگی نے اس باب میں تقریباً اٹھارہ صفحات رقم فرمائے ہیں۔ ان کے شایانِ شان جائزے کے لئے ظاہر ہے اس سے زیادہ ہی صفحات درکار ہوں گے۔ اتنی گنجائش یہاں کہاں۔ ہم مجبوراً یہاں ایجاز و اختصار ہی کی راہ اختیار کریں گے۔

مدیر زندگی میں یہ عادت ہے کہ وہ دورانِ بحث میں اظہار حیرت ضرور کرتے ہیں۔ اس بحث میں بھی ان کی یہ عادت نہیں گئی۔ پہلے تو انھوں نے مولانا مودودی کی ایک توضیح کے بارے میں لکھا :-

"میں مولانا کی یہ توضیح پڑھ کر حیران رہ گیا۔"

پھر اس سے بھی دس قدم آگے بڑھ کر ایک اور توضیح کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا :-

"اس نمبر کی عبارت پڑھ کر بھی اصول فقہ کا طالب علم حیران رہ جاتا ہے۔"

گویا مولانا مودودی کی "توضیح" اتنی بے تکی، غیر علمی اور اصول فقہ سے متصادم ہے کہ مدیر زندگی کی دانست میں اصولِ فقہ کا کوئی بھی طالب علم اس کے بے تکے پن پر حیران ہونے کے علاوہ کچھ نہیں کرے گا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ مدیر زندگی کے نزدیک مولانا مودودی کی زیر بحث توضیح علم و تفقہ کے افلاس کی اتنی بھونڈی اور نمایاں مثال ہے کہ خود مدیر زندگی بھی اس پر متحیر ہو جانے میں قطعی طور پر حق بجانب ہیں اور اصولِ فقہ کا ہر ایک طالب علم بھی اسی طرح حق بجانب ہوگا جس طرح ایک صحت مند معدہ مکھی ہضم کرنے سے انکار کر دینے میں حق بجانب ہوتا ہے۔

علمی مباحث میں دوسرے فریق کے کسی قول کو حیرتناک کہنا در اصل ایک خوبصورت گالی ہے جس کی عادت اونچے درجے کے علماء و ائمہ میں کبھی نہیں پائی گئی حالانکہ آپ دیکھ سکتے ہیں وہ ہزاروں مسائل میں ایک دوسرے سے بالکل متضاد و متضارب رائے رکھتے ہیں، لیکن تحیّر ظاہر کر کے ایک دوسرے کی تحمیق و تجہیل کا وطیرہ انھوں نے اختیار نہیں کیا۔ مدیر زندگی کو بھی یہ عادت ترک کرنی چاہیئے۔ خصوصاً مولانا مودودی جیسے اصحاب کے مقابلے میں کہ جن کی علمی و فکری عظمت کا وہ خود بھی احترام و اعتراف کرتے ہیں۔

زیادہ تفصیل میں جائے بغیر اسی روایت کو لیجئے جسے خود مدیر زندگی نے بنیادی حیثیت دی ہے :-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مونچھیں کاٹو اور داڑھیاں لمبی کرو (اور اس طرح) مجوس کی مخالفت کرو۔"

موصوف کی نگاہ میں یہی حدیث حکم کا منشاء بھی صاف طور پر بیان کر رہی ہے۔ یعنی مجوسیوں کی مخالفت۔ موصوف بتلاتے ہیں کہ حضورؐ کے زمانے میں جزیرۃ العرب کے سب باشندے داڑھی رکھتے تھے۔ اچانک فارس کے مجوسیوں نے داڑھی چھوٹی کرنی شروع کی۔ اس پر حضورؐ نے مسلمانوں کو مذکورہ حکم دیا۔

اب ذرا سوچئے کیا اس سے یہ تین باتیں معلوم نہیں ہوئیں

اور شتے ہوتے چہرے پر لگا دیجئے تو تمسخر کی کیفیت پیدا ہوگی اسی طرح یک مشت داڑھی بعض چہروں پر بے شک بڑی زیب موزوں اور متناسب معلوم ہوتی ہے لیکن بعض چہروں پر مضحکہ خیز بن جاتی ہے۔ تمسخر کو اس باب میں کوئی اہمیت ہی حاصل ہوتی تب تو یہ گفتگو ہم نہ کرتے، لیکن خود مدیر زندگی نے بعض سلف کے تتبع میں تمسخر کی اہمیت تسلیم کی ہے۔ لہٰذا تناسب کی منطق کو بھی لازماً قبول کرنا ہوگا۔ یک مشت داڑھی کی مقدار ایسی نہیں ہے جو ہر چہرے کے لئے موزوں و متناسب مان لی جائے اسی تناسب کا اجمالی ذکر مولانا مودودی نے فرمایا تھا مگر مدیر زندگی اس ذکر پر خود بھی حیران ہوئے اور اصولِ فقہ کے تمام طلباء کو بھی حیران کر چھوڑا۔ مزید ارشاد ہوا کہ:-

"یہ ہے وہ اصل اشتباہ جس کی وجہ سے مقدارِ لحیہ کے مسئلے میں فعلِ رسول ﷺ کی شرعی حیثیت مولانا مدظلہ (مولانا مودودی) کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔"

حالانکہ اس مقام پر مولانا مودودی کی کوتاہ نگاہی کے اثبات میں جو گفتگو انھوں نے کی ہے وہ خود کوتاہ نگاہی کی مظہر ہے۔ وہ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ داڑھی کو بے حد بڑھانا قربت و عبادت کے زمرے کی چیز ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اعفاءِ لحیہ کو عبادت قرار دینا ایسا ہی ہے جیسے سپاہی کے فوجی لباس (یونیفارم) کو جنگی ہتھیاروں کی فہرست میں شامل کرنا۔

اور دیکھئے۔ مدیر زندگی مولانا مودودی کا رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"اعفاءِ لحیہ کے حکم کی یہ تعبیر کہ حضور ﷺ نے صرف یہ ہدایت فرمائی ہے کہ داڑھی رکھی جائے۔ اس حکم کو بہت ہلکا کر دیتی ہے۔ احادیث میں اس کے لئے جو الفاظ آئے ہیں ان میں کا کوئی لفظ اس تعبیر کا ساتھ نہیں دیتا، بلکہ تمام الفاظ سے حضور ﷺ کی یہ ہدایت نکلتی ہے کہ داڑھی بڑھائی جائے۔ لمبی کی جائے اور مجوس کی مخالفت کی جائے۔"

اس کے بعد ممدوح نے لغوی تصریحات پیش کی ہیں۔ ہم کہتے ہیں وہ کتاب پرستی میں تفقہ کے تقاضے پامال کر گئے۔

ٹھیک ہے کہ حضور ﷺ کی جن حدیثوں کا ذکر ہو رہا ہے ان میں داڑھی کو خوب بڑھانے اور لمبا کرنے ہی کا حکم پایا جاتا ہے لیکن ان میں اس حکم کی وجہ بھی تو موجود ہے کہ مجوسیوں کی مخالفت کرو اس وجہ کو خود موصوف بھی علت و وجہ قرار دیتے ہیں۔ نیز یہ بھی بیان فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے یہ حکم داڑھی منڈانے کے مقابلے میں نہیں دیا تھا، بلکہ مجوسیوں نے داڑھیاں کچھ کم کرنی شروع کر دی تھیں اس پر حکم صادر ہوا تھا۔

تو ان کا ذہن اس بات کی طرف کیوں نہ گیا کہ ترشی ہوئی داڑھیوں کی نمایاں مخالفت تو بے شک خوب لمبی اور بڑھی ہوئی داڑھیوں ہی سے ہو سکتی تھی لیکن کلین شیو کئے ہوئے صفاچٹ چہروں کی مخالفت کے لئے ایسی داڑھیاں بھی بہت کافی ہیں جو یک مشت سے کم ہوں۔ وجہ تو مخالفتِ کفار ہی ہے۔ کفار نے جب دنیا بھر میں داڑھی مونڈنے کی روش اختیار کر لی تو پھر بھی اعفاءِ لحیہ کے زمانی و اضافی حکم پر جمے رہنا اور یک مشت یا اس سے زائد داڑھی کو معیارِ مخالفت بنانا کس نوع کی معقولیت ہوگی! قطعی بات ہے کہ داڑھی رکھنا اور اتنی رکھنا کہ سچ مچ داڑھی کہلا سکے شعارِ اسلام ہے لازم و ضروری ہے۔ لیکن اعفاء و ارخاء اضافی چیز ہے۔ کفار کی عام روش اور چہروں کی مناسبت دونوں چیزیں اس کی حد بندی میں دخیل ہوں گی۔

پھر جب ہمارے اردگرد ہی ایک قوم کثیر تعداد میں ایسی پیدا ہو جائے جس کی داڑھیاں اعفاء و ارخاء کی آخری حدیں چھو رہی ہوں اور یہ قوم اپنے شعار پر قائم بھی ہو تو مسلمانوں کا داڑھیوں کو مکمل رخصت دیدینا اور طول و عرض میں سے کچھ بھی نہ کاٹنا چاہے آگے اور بڑھنے کی رفتار کتنی ہی زیادہ ہو ایسا فعل ہوگا جو کفار کی مخالفت کی بجائے موافقت کا مظہر قرار پائے گا۔ مخالفت تو یک مشت سے کم میں اور اصلاح شدہ داڑھیوں میں بھی صریحاً پائی جاتی ہے کیونکہ کفار و مشرکین کا سوادِ اعظم داڑھی سے بالکلیہ فارغ ہے ہاں موافقت سکھوں اور یہودیوں سے ہو گئی۔ پس معقول بات یہ ہے کہ داڑھیوں کو مکمل چھٹی بھی نہ دی جائے اور اتنا کاٹا

بھی نہ جانے کہ وہ داڑھی کا جیبی ایڈیشن بن جاہیں۔ چہرہ چھوٹا ہے تو یک مشت ہی خوب رہے گی۔ چہرہ شستا ہوا اور بدن لاغر ہے تو یک مشت سے تمسخر پیدا ہوگا۔

مدیر زندگی نے یہ بھی ذکر فرمایا ہے کہ خلفائے راشدین کی داڑھیاں ایسی ہی تھیں کہ ان پر وافر اور عظیم و کثیر کا اطلاق ہو سکے۔

ہم کہتے ہیں ہونی ہی چاہئیں تھی۔ موصوف نے خود یہی بیان فرمایا ہے کہ اس زمانے میں جزیرۃ العرب میں کافر و مسلم سب داڑھی رکھتے تھے اور داڑھی منڈوانے کا بالکل رواج نہ تھا۔ پھر مجوسیوں کو داڑھیاں کم کرلنے کی سوجھی تو اس کی مخالفت اور مسلمانوں کی امتیازی شان قائم رکھنے کے لئے یہی صورت انسب تھی کہ مسلمان خوب داڑھیاں بڑھائیں یہودیوں کو جزیرۃ العرب سے نکال ہی دیا گیا تھا اور سکھوں کا کوئی وجود ہی نہیں تھا لہذا وافر و کثیر داڑھی میں کسی بھی کافر و مشرک قوم کی مشابہت پیدا نہیں ہوتی تھی۔ گویا مثبت اور منفی دونوں اعتبار سے اس وقت داڑھی کا اعفاء و ارخاء معقول تھا۔

لیکن زمانہ بدلا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ پوری دنیا پر مغربی تہذیب چھا گئی۔ اس تہذیب نے داڑھی منڈانے کو لازمۂ حیات قرار دے دیا اور اب پوری دنیا میں مادہ پرست تہذیب کے تمام متوالے اور کفار و ملحدین کے تمام گروہ داڑھی مونڈنے میں مشترک ہیں۔ اس وقت ان کی روش کی مخالفت اور مسلمانوں کا صوری امتیاز یک مشت اور مفصل داڑھیوں کا محتاج نہیں۔ یک مشت سے کچھ کم داڑھیاں بھی ڈنکے کی چوٹ اس مخالفت کا بھرپور مظہر کہی جا سکتی ہیں اور یہ مخالفت کفار ہی جب مدیر زندگی کے نزدیک بھی داڑھی کے حکم اعفاء کی علت و غایت ہے تو کیا حاصل یہ ثابت کرنے سے کہ خلفائے راشدین کی داڑھیاں وافر اور کثیر و عظیم تھیں۔

پھر سکھوں کے درمیان رہنے والے مسلمانوں کو تو ضرور ہی داڑھیوں میں ایسی اصلاح کرنی چاہئے کہ سکھوں سے مشابہت نہ پیدا ہونے پائے۔ آخر تشبہ بالکفار بھی تو حضور ؐ ہی نے ممنوع قرار دیا ہے سکھ حضور ؐ اور صحابہ ؓ کے ارد گرد نہیں تھے۔ یہودی بھی ملک بدر کر دیئے گئے تھے، لہذا اعفائے لحیہ سے تشبہ بالکفار پیدا نہیں ہوتا تھا اور دنیائے کفر و شرک میں داڑھی منڈوانا بھی لازمۂ تہذیب نہیں بنا تھا بلکہ کافرین و مشرکین چھوٹی داڑھیاں رکھتے تھے لہذا ان کی بھرپور مخالفت بھی اعفائے لحیہ ہی میں تھی اب دونوں باتوں میں تبدیلی ہوئی۔ ایک طرف سکھ قوم وجود پذیر ہوئی جو بالوں کے اعفاء و ارخاء میں سب کو مات دیتی ہے دوسری طرف داڑھی منڈانا عالمی رواج کی حیثیت اختیار کر گیا لہذا داڑھی کے سلسلے میں کفار و مشرکین کے طریق کی مخالفت کرنے کے ساتھ تشبہ بالکفار والی حدیث کی رعایت اسی طرح ہو سکتی ہے کہ داڑھیوں کے کامل اعفاء و ارخاء سے ہاتھ اٹھا لیا جائے اور چہروں کے تناسب سے ایسی ہی داڑھیاں رکھی جائیں جو سکھوں اور یہودیوں کی لامحدود داڑھیوں سے ممتاز ہوں۔ ہر شخص کے لئے ہر حال میں یکمشت داڑھی کو کم سے کم قرار دینا سعادتمندی ضرور ہے مگر حقیقت پسندی نہیں۔

مدیر زندگی نے اپنے مضمون کے آخر میں ایک مغالطہ بھی پیدا کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں :-

"پھر ہم اور آپ اب کس اصول کے تحت یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ گالوں سے لگی ہوئی یا اک ذرا سی مختصر داڑھی بھی مسنون داڑھی ہے"

اس سے قارئین قدرتاً یہ خیال فرمائیں گے کہ مولنا مودودی اُن برائے بیت داڑھیوں کو بھی مسنون ہی کہتے اور سمجھتے ہیں جو فی الحقیقت داڑھی کم اور داڑھی کا مذاق زیادہ ہوتی ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ مولانا مودودی پر صریح افترا ہے ان کا ایسا قول کبھی ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ جو قول خود مدیر زندگی نے اس کے ثبوت میں مولانا مودودی کا پیش کیا ہے وہ یہ ہے :-

"مجمل حکم دینے پر اکتفا کرنا اور تعین سے اجتناب کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت اس معاملے میں لوگوں کو آزادی دینا چاہتی ہے کہ وہ اعفاء لحیہ و قص شارب

اوّل یہ کہ داڑھی کو بہت زیادہ اور مونچھوں کو بہت کم کرنا بجائے خود شریعت کا کوئی مستقل حکم نہ تھا یہ ایک مشرک قوم کی مخالفت کے طور پر صادر کیا گیا۔ دوئم یہ کہ اسکا تعلق زمانۂ خاص سے ہے یعنی جب ایک مشرک قوم نے داڑھی کم کرنے کی حرکت شروع کی۔ گویا حکم اپنی اصل کے اعتبار سے اضافی بھی ہوا اور زمانی بھی۔

سوئم یہ کہ اس حکم سے قبل خود حضورؐ اور صحابہؓ داڑھیوں کا کچھ نہ کچھ حصّہ ضرور کاٹتے رہے ہوں گے ورنہ یہ حکم صادر نہ کیا جاتا۔ یا کیا ہی جاتا تو انداز کچھ ایسا ہوتا کہ تم لوگ مجوسیوں کی تقلید مت کرنا بلکہ اپنی روش پر قائم رہنا۔

ارخاءِ لحیہ (خوب داڑھی بڑھانا) اور جزِّ شوارب (مونچھیں کٹوانا) کی اگر وہی کیفیت وکمیت حضورؐ اور صحابہؓ میں معمولاً موجود ہوتی جسے آج اکثر فقہاء اسی حدیث کی بنیاد پر شدومد سے ضروری قرار دے رہے ہیں تو اس کا کوئی موقع نہیں تھا کہ جب مجوس داڑھی کم کرنے کی حرکت شروع کریں اس وقت حضورؐ ایسا حکم صادر فرمائیں ایک کیفیت وکمیت پہلے سے موجود ہو تو کسی خاص وجہ سے اس پر ثابت قدم رہنے کا حکم تو صادر کیا جا سکتا ہے، لیکن اسے شروع کرنے کا حکم صادر نہیں کیا جا سکتا۔ مدیر زندگی ہی کی توضیح کے مطابق مجوس کی مخالفت اس حکم کی علت ہے۔ علت ماننے کا مطلب ہی یہ ہے کہ جب یہ علت موجود نہیں تھی اسوقت یہ فعل بھی موجود نہیں تھا۔

تو ثابت ہوا کہ داڑھی رکھنا اور مونچھیں کٹوانا تو بیشک حضورؐ اور صحابہؓ کا معمول تھا لیکن وہ اعفاء وارخاء (داڑھی کو کثیر کرنا) جس کا حکم مجوسیوں کی مخالفت کے طور پر بعد میں دیا گیا نہیں پایا جاتا تھا۔ نہ پائے جانے کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ صرف اتنی ہی داڑھی شعارِ اسلامی ہے جس پر ڈھنگ سے داڑھی کا اطلاق ہو سکے اور وہ اعفاء وارخاء (بے حد داڑھی بڑھانا) جسے بعد کے فقہاء بحیثیت شعار کے لازم وواجب قرار دینا چاہتے ہیں، ایک اضافی وزمانی شے ہے۔ اگر اعفاء ارخاء کو بھی دینی شعار مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مجوسیوں کی ریش تراشی سے قبل حضورؐ اور صحابہؓ دینی شعار کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ ونعوذ باللہ من ذلک۔

ایک اور نکتہ قابلِ التفات ہے۔

مدیر زندگی نے توضیح کی ہے کہ حضورؐ کا متذکرہ حکم مجوسیوں کی ریش تراشی کے مقابلہ میں تھا۔ یعنی داڑھی منڈانے کے مقابلے میں نہیں، بلکہ صرف کم کرنے کے مقابلے میں۔

واقعی ایسی صورت میں تو اعفاء وارخاء ہی کا حکم انسب تھا کیونکہ مجوسیوں کی تھوڑی تھوڑی ترشی ہوئی داڑھیوں کے مقابلے میں ایسی ہی داڑھیاں امتیازی شان رکھ سکتی تھیں جو خوب خوب لمبی اور گھنی ہوں۔ اگر انھیں تھوڑا بہت کٹوا دیا جاتا تو مجوسیوں کی نمایاں مخالفت نہ ہو سکتی۔

مگر آج ہم جس دنیا میں رہ رہے ہیں وہاں تو کلین شیو کا رواج ہے۔ داڑھیوں پر کئی کئی دفعہ استرہ پھیرنا لازمۂ تہذیب ہے۔ ہندو، عیسائی، کمیونسٹ سب داڑھی منڈتے ہیں مسلمانوں کے لئے اپنی امتیازی شان قائم رکھنے اور داڑھی کے معاملہ میں کفار کی مخالفت کرنے کے لئے اعفاء وارخاء کی بالکل ضرورت نہیں۔ یک مشت یا اس سے کچھ کم بھی داڑھی صریح طور پر خالفوا المشرکین کے فرمانِ نبویؐ کو بخوبی پورا کرتی ہے۔

ذرا ترتیب بدل کر بات کو پھر سے سمجھنے کی کوشش کیجئے مدیر زندگی بتاتے ہیں کہ جزیرۃ العرب اور پڑوسی ممالک کے تمام باشندوں میں داڑھی رکھنے کا رواج تھا۔ اسی رواج کے مطابق حضورؐ اور صحابہؓ بھی داڑھی رکھے ہوئے تھے۔ دفعتاً فارس کے مجوسیوں میں داڑھی کم کرنے کا رجحان ظاہر ہوا۔ اس پر اللہ کے رسولؐ نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

"مونچھیں کاٹو اور داڑھیاں بڑھاؤ (اور اس طرح) مجوسیوں کی مخالفت کرو"

مدیر زندگی خود ہی معترف بھی ہیں کہ:۔

"اس حدیث سے وہ وجہ معلوم ہوگئی جس کی بنا پر
اعفاءِ لحیہ کا حکم دیا گیا۔"

تو بداہتہً معلوم ہوگیا کہ جس اعفاءِ لحیہ کو شدومد سے لازم ثابت قرار دینے کی کوشش کی جارہی ہے وہ ہنگامی اور اضافی نوعیت کا تھا۔ بجائے خود اس کی حیثیت شعارِ دینی کی نہ تھی اگر اصلاً وہ شعار ہوتا تو مجوسیوں کی مبینہ ریش تراشی سے قبل بھی موجود و ثابت ہونا چاہئے تھا لیکن جب مدیر زندگی کے اعتراف کے مطابق ہی اس حکم کی وجہ مجوسیوں کی ایک حرکت تھی تو وجہ کے معرضِ وجود میں آنے سے قبل اسے معدوم ماننا پڑے گا۔ اگر موصوف کہتے ہیں کہ اعفاء و ارخاء پہلے ہی سے حضورؐ اور صحابہؓ کی داڑھیوں میں موجود اور ان حضرات کا معمول تھا تو اس کی وجہ مجوسیوں کے فعل کو قرار دینا مہمل ہوگا۔ جو فعل بعد میں صادر ہوا ہے وہ کسی ایسے عمل کی وجہ کیسے مانا جا سکتا ہے جو اس وجہ کے معرضِ وجود میں آنے سے قبل موجود و معمول ہو۔ کہنا پڑے گا کہ اعفاء و ارخاء ایک شئیِ زائد ہے اور شعار صرف داڑھی ہے۔ اتنی داڑھی جس پر غیر مشتبہ اور صریح حد تک داڑھی کا اطلاق ہو سکے۔

مدیر زندگی خود ہی بتاتے ہیں کہ مجوسیوں نے داڑھی مونڈنا نہیں بلکہ کم کرنا شروع کیا تھا اور حکمِ رسولؐ کی وجہ "مجوس" کی مخالفت ہے تو غور کرنا چاہئے کہ ہمارے زمانے میں جبکہ داڑھیاں بالکل صاف کر دینا کفار کا شعار ہے کیا مخالفت کا تقاضا نفسِ داڑھی ہی پورا نہیں کر دیتی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مجوسیوں کی تھوڑی سی کم کی ہوئی داڑھی میں اور حضورؐ و صحابہؓ کی خوب بڑھی ہوئی داڑھیوں میں تخالف کی جو نسبت تھی اس سے کہیں بڑھ کر نسبتِ تخالف منڈی ہوئی داڑھیوں میں اور ایسی داڑھیوں میں ہے جو تھوڑی سی کٹی ہوئی ہونے کے باوجود داڑھیاں کہلائی جا سکتی ہوں۔ داڑھی مونچھوں کے متذکرہ حکم کی علت و وجہ ہی جب مدیر زندگی کے اپنے تفقہ اور تسلیم کے مطابق مخالفتِ کفار ٹھہری تو ہمارے زمانے میں یکمشت سے کچھ کم داڑھیاں بھی بھرپور طریقے پر اس مخالفت کی مظہر ہیں۔ پھر کیوں اس اعفاء و ارخاء کو آج بھی لازم قرار دیا جا رہا ہے جو مجوسیوں کی تھوڑی سی ترشی ہوئی داڑھیوں کے مقابلے میں تھا نہ کہ یکسر منڈی ہوئی داڑھیوں کے مقابلے میں۔

لطف یہ ہے کہ مدیر زندگی دوران بحث میں ان فقہاء کا بھی تذکرہ تائید و تحسین کے پیرا ئے میں کرتے ہیں جن کا خیال یہ رہا ہے کہ داڑھی کے طول و عرض میں سے کچھ بھی کٹوانا مکروہ ہے خوب ہے یہ یک رُخا تفقہ کہ مجوسی تو موصوف کو یاد رہے مگر وہ سکھ یاد نہ آئے جو لاکھوں کی تعداد میں اردگرد موجود ہیں اور جن کے یہاں داڑھی کا ایک بال بھی نہیں کاٹا جاتا۔ نہ وہ یہودی یاد آئے جن میں آج بھی غیر معمولی طویل و عریض داڑھیوں کا رواج ہے۔ داڑھی کے طول و عرض میں سے کچھ بھی کاٹنا مکروہ ٹھہرے تو یہ کفار کی مخالفت کا ایسا غلو ہوگا جس سے کچھ اور کفار کی مشابہت پیدا ہو جائے گی۔ ہوشمند جانتے ہیں کہ اسلام کو خصوصیت بہ کسی خاص قسم کے کفار سے نہیں بلکہ سکھوں اور یہودیوں کی مخالفت بھی شعارِ دینی میں اسی طرح ضروری ہے جس طرح ہنود و نصاریٰ وغیرہ کی مخالفت۔ امام نوویؒ نے اگر قاضی عیاض کی یہ بات رد کر دی ہے کہ داڑھی بہت بڑھا دینا بھی مکروہ ہے تو اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ امام نوویؒ کے زمانے میں سکھوں کا وجود نہیں تھا اور یہودیوں کی داڑھیاں بھی انھوں نے نہ دیکھی ہونگی اگر ان میں سے ایک چیز بھی ان کے سامنے ہوتی تو یہ فیصلہ نہ دیتے کہ داڑھی کو ہر حال میں علیٰ حالہٖ رخصت دیتے رکھنا مسنون ہے

بعض اسلاف نے داڑھی کو اتنا بڑھانے سے روکا ہے جو آدمی کو مضحکہ خیز بنا دے۔ مدیر زندگی نے اس رائے کا تذکرہ کرکے ریمارک دیا ہے کہ :-

"ظاہر ہے کہ طول و عرض ایک مشت سے بڑھ کر ہی سبب تمسخر بن سکتا ہے نہ کہ ایک مشت کی صورت میں"

یہ ریمارک مشاہدے اور تجربے کی کمی پر مبنی ہے۔ مدیر زندگی ایک بہت پستہ قد اور دھان پان آدمی کو تصور میں لائیں جس کے چہرے پر یک مشت داڑھی ہو اور پھر ایمانداری سے فیصلہ دیں کہ کیا یہ یک مشت اس کے حق میں مضحکہ خیز نہیں؟

جس طرح ایک چوڑے چکلے چہرے پر لگا ہوا ٹیڑھے بڑے شیشوں کا چشمہ مضحکہ خیز نہیں معلوم ہوتا لیکن اسی کو لمبوترے

کا معیار یک مشت اور اس سے بھی بڑی داڑھیاں نہیں ہوسکتیں۔ یک مشت سے آپ ایک انگل کم بھی کرلیں تو لاکھوں میں پہچانے جائیں گے اور مخالفتِ کفار کا تقاضا بدرجۂ اتم پورا ہوگا۔

احوالِ زمانہ کے تغیر سے احکام میں تغیر کی ایک دلچسپ مثال ہم مشہور حنفی عالم ابن عابدینؒ کے رسائل سے پیش کرتے ہیں ٹھیکے یا کرائے پر لی ہوئی زمین کا عشر (زکوٰۃ) امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مالک کے ذمہ ہے، لیکن علامہ ابن عابدین کے دور میں زرعی نظام بہت کچھ بدل چکا تھا اور حکومت کے لگائے ہوئے ٹیکسوں نے پیداوار سے حاصل ہونے والے منافع کے تناسب پر بہت بڑا اثر ڈالا تھا لہٰذا ابن عابدین کہتے ہیں کہ بحالاتِ موجودہ کوئی بھی ایسا عالم جس میں عقل موجود ہو مالک کے ذمے عشر کا فتویٰ کیسے دے گا۔ امام ابوحنیفہؒ اگر آج ہوتے تو وہ بھی ہرگز ایسا فتویٰ نہ دیتے۔

دیکھا آپ نے۔ ابن عابدین جانتے اور مانتے ہیں کہ امام صاحبؒ کے نزدیک عشر مالک کے ذمے ہے لیکن احوالِ زمانہ بدل گئے تو اب وہ یہاں تک کہہ گذرنے میں دریغ نہیں کرتے کہ اب ایسا فتویٰ احمق ہی دے سکتا ہے دانشمند نہیں۔

تو داڑھی کے معاملے میں یہ کہنا کیوں غلط ہوگا کہ احوالِ زمانہ کی عظیم تبدیلی کے بعد بے نہایت اعفاءِ لحیہ اور یک مشت کی قید پر اصرار و تکرار کارِ ہوشمنداں نہیں۔ یہ تو درست ہے کہ داڑھی شعارِ اسلام ہے لہٰذا اگر پوری دنیا داڑھی رکھنے پر اُتر آئے تب بھی اس کی مخالفت میں مسلمان داڑھیوں کا صفایا نہیں کریں گے لیکن وہ بے نہایت اعفاء اب ضروری نہیں جو مجوس کی ریش تراشی کے مقابلے میں اختیار کیا گیا تھا۔ داڑھی کا ڈھلاؤ منڈوانے کی طرف نہ ہونا چاہئے بس عرفاً اتنا ہی کافی ہے۔ اعفاء کا رجحان پایا گیا اور داڑھی شرعی قانون کی مار سے نکل گئی۔

رہی تقوے اور شربِ مسلک کی بات۔ تو این چیزے دیگر است۔ مولانا مودودی خود بفضلہٖ تعالیٰ خوب مفصل داڑھی رکھتے ہیں۔ خطیب، واعظ، مدرس، استاد اور مفتی و مرشد کے لئے اچھی بڑی داڑھیاں ہی موزوں ہیں تاکہ رعب ٹپکے اور وجاہت قائم رہے۔ دل میں سنتِ نبوی کی پیروی کا خیال ہوگا تو ثواب بھی ضرور ملے گا۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ لمبی داڑھی بُری بات ہے۔ بحث صرف قانونِ شرعی کی ہے اور قانون کی حد تک انشاء اللہ ثم انشاء اللہ وہی بات درست ہے جو مولانا مودودی اس باب میں کہتے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ پچھلے یک مشت کے قائل فقہاء نے غلط رائے قائم کی۔ ان کی رائے احوالِ زمانہ کے مطابق درست تھی، لیکن احوالِ زمانہ ہی بدل جائیں تو کوئی کیا کرے۔ بندوق کی نال۔ بے شک سخت ہونی چاہئے، لیکن کمان میں لچک نہ ہوگی تو اسے ایندھن کہیں گے داڑھی کا غیر مشروط اعفاء و ارخاء "ضروریاتِ دین" اور عقائدِ اساسیہ میں شامل نہیں ہے اس لئے اس کے معاملے میں بِتھر یا جمود اور تشدد "استقامت علی الحق" نہیں تنگ نظری و تعصب کہلائے گا۔ داڑھی خود ہم بھی مفصل ہی رکھتے ہیں اور مدیر زندگی بھی۔ لیکن ہمیں اس کی داد اس طرح وصول نہ کرنی چاہئے کہ جو ہم سے ذرا چھوٹی داڑھی رکھے اسے عاصی و آثم قرار دینے لگیں۔ گناہ کی سرحد وہاں سے شروع ہوتی ہے جب داڑھی میں اور کسی پارک کی مشین سے ہموار کی ہوئی گھانس میں فرق دشوار ہو جائے۔ ایسی برائے بیت داڑھیاں یقیناً قابلِ نکیر ہیں کیونکہ ان کی حیثیت پاکستانی برقعوں جیسی ہے جنھیں وہاں کی عورتیں اب بطور اچکن استعمال کرتی ہیں اور خصوصیت ان کی یہ ہے کہ بدن ڈھک جاتا ہے مگر چہرہ نہیں ڈھکتا!

شراب کے ٹھیکیدار کا کھانا

سوال معراز صلاح الدین۔ نیپال۔

عرض یہ ہے کہ میرا ایک دوست شراب کا ٹھیکدار ہے مسلمان ہے۔ وہ مجھ کو کھانے کی دعوت دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ بھائی شراب نہ پیو اس لئے کہ اللہ نے حرام بتلایا ہے۔ مگر میرے یہاں کھانا تو کھاؤ اس لئے کہ غلہ اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے اور اسی کی چیز ہے لہٰذا تم اللہ کی نعمت سے کیوں انکار کرتے ہو مجھ سے ہی غصہ ہے تو کھانے سے کیسا غصہ اور نفرت۔ یہ بات بھی صحیح معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ غلہ یا جتنی چیزیں ہیں جس کو اللہ نے کھانے کا حکم دیا ہے اس چیز کو کھانے سے کیوں انکار کیا

جاوے غلّہ ان کی چیز تو ہے نہیں۔ آپ سے استدعا ہے کہ بتلائیں کہ ان کے یہاں کھانا کھایا جاوے کہ نہیں۔ جائز ہے کہ نہیں؟

الجواب :-

آپ روزانہ نمازِ وتر میں اللہ سے اقرار کرتے ہیں کہ "نخلع و نترک من یفجرک" یعنی ہم ہر اس شخص سے بے تعلق اور منقطع ہوتے ہیں جو آپ کا نافرمان ہو) شراب کی شدید حرمت کسی مسلمان سے مخفی نہیں۔ اس کا پینا پلانا اور بیچنا خریدنا تو در کنار اس کے کاروبار اور استعمال میں کسی بھی قسم کی شرکت کرنا حرام ہے حتیٰ کہ شراب یا شراب سازی کے ساز و سامان کو مزدوری کے طور پر ڈھونا بھی حرام ہے۔ اسکے باوجود اگر کوئی مسلمان شراب کی ٹھیکیداری کرتا ہے تو کیا شک ہے کہ وہ کھلے بندوں خدا کا نافرمان ہے۔ ایسا نافرمان جسے اپنی نافرمانی پر کوئی حیا بھی نہیں۔ ایسے شخص کے دسترخوان پر دادِ طعام دینے کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ جو اقرار اور عہد روزانہ وتروں میں کیا جارہا ہے اس کا کوئی شعور کوئی احساس اور ذرا سا بھی پاس لحاظ عہد کرنے والے کو نہیں ہے ظاہر ہے کہ ترکِ تعلق دعوتیں کھا کر نہیں کیا جاتا۔ طعام کی شرکت تو دوستی اور ربط و ضبط کی دلیل ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ شراب کی ٹھیکے داری سے کمایا ہوا روپیہ سرتا سر نجس اور مالِ حرام ہے۔ پیدا تو ہر چیز اللہ ہی کرتا ہے اور شراب، خنزیر اور جوے کے ساز و سامان بھی سب اللہ ہی کے تخلیق کردہ ہیں لیکن جس طرح انھیں حرام فرمایا گیا اسی طرح اُس غذا کو حرام فرمایا گیا جو حرام ذرائع سے حاصل کی گئی ہو۔ ہر نجاست ظاہری نہیں ہوتی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن میں مشرکین کو نجس فرمایا گیا حالانکہ مشرک جسمانی صفائی کے اعتبار سے فائق بھی ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں لیکن مشرک کی نجاستِ معنوی ان سے کبھی جدا نہیں ہوتی۔ اسی طرح خنزیر کو آپ صابن اور مشک و عنبر سے غسل دیدیں تب بھی اس کی معنوی نجاست پاکیزگی میں نہیں بدلے گی۔ سود سے حاصل کیا ہوا روپیہ بھی اپنی ظاہری شکل میں ویسا ہی ہوتا ہے جیسا حلال ذرائع سے کمایا ہوا روپیہ مگر اس کی نجاست و حرمت مسلّم ہے اسی طرح شراب کے ٹھیکے سے کمائی ہوئی دولت سے جو غلّہ اور غذا خریدی گئی وہ بجائے خود نعمتِ خداوندی ہونے کے باوجود ذریعۂ حصول کی نجاست کے سبب حرام قرار پائے گی۔

اگر آپ کے دوست یہ کہیں کہ جو کھانا میں آپ کو کھلا رہا ہوں وہ شراب کے کاروبار سے کمائے ہوئے پیسے کا نہیں ہے، بلکہ فلاں حلال ذریعۂ آمدنی کا ہے تو بے شک یہ طعام حرام نہیں رہے گا۔ بشرطیکہ ان کے قول کی صداقت قرائن سے ثابت ہو، لیکن وہ خرابی پھر بھی اپنی جگہ رہے گی جس کا ہم نے ابتدائً ذکر کیا یعنی دعائے قنوت والے عہد سے غدّاری اور خدا کے نافرمان بندے سے پینگیں بڑھانے کا گناہ۔ نافرمانی اگر معمولی قسم کی ہو یا ڈھکی چھپی ہو تو معذرت کی راہ نکل سکتی ہے۔ لیکن شراب جیسی خبیث چیز کی کھلم کھلا ٹھیکے داری بڑی سخت قسم کی نافرمانی ہے اس کے مرتکب سے دوستانہ ربط و ضبط رکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ بد سے بدتر گناہ کے لئے بھی آپ کے قلب میں نفرت و کراہت کا احساس نہیں ہے اور قدرتی نتیجہ اس کا یہ نکلے گا کہ خود شراب کی قباحت و شناعت کا احساس آپ کے اندر کمزور پڑتا چلا جائے گا۔ آپ اتفاق سے کسی غلاظت گاہ سے گذر جائیں تو تعفن سے آپ کا دماغ پھٹنے لگے گا اور عین ممکن ہے کہ قے ہو جائے، لیکن روز روز اس غلاظت گاہ سے گذریں تو آپ کی قوتِ شامہ اس سے مفاہمت کرلے گی اور پھر کوئی شدید استکراہ آپ کے اندر باقی نہیں رہے گا۔ یہی معاملہ اخلاق کی دنیا کا ہے۔ شراب فروش یا سود خوار سے دوستانہ مراسم رکھنے والے کے اندر ناممکن ہے کہ شراب اور سود کے بارے میں وہ مطلوبہ نفرت و استکراہ باقی رہ جائے جو مسلمان کے شایانِ شان اور خدا و رسولؐ کا منشاء ہے۔

آج کل رواداری، فراخ دلی اور وسیع النظری وغیرہ کے خوشنما الفاظ ایسے چل گئے ہیں کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی ان کے دامِ فریب میں گرفتار ہو کر یہ تمیز نہیں کرپاتے کہ کن اُمور میں رواداری مستحسن ہے اور کن اُمور میں رواداری خود کشی کے ہم معنی ہے۔ اسلام فسق و فجور اور گناہ و طغیان کے معاملے میں رواداری کا قائل نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ معاشرہ اخلاقی رذائل سے پاک و صاف رہے۔ اس کے لئے اس نے جہاں بہترین مثبت

کی جو صورت اپنے مذاق اور صورتوں کے تناسب کے لحاظ سے مناسب سمجھیں اختیار کریں۔"

کیا اس عبارت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ برائے بیت اور خورد بینی قسم کی داڑھیاں بھی مولانا مودودی کے نزدیک مسنون ہیں؟
حیرت در حیرت ہے کہ مدیر زندگی نے یہ نتیجہ کیسے اخذ کیا۔ مولانا مودودی صاف تسلیم کر رہے ہیں کہ شریعت نے اعفائے لحیہ (داڑھی بڑھانے) کا حکم دیا۔ اس حکم کو مجمل کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حکم اعفاء میں کوئی شک ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حکم میں مقدار اور سائز کا ٹھیک ٹھیک تعین نہیں کیا گیا۔ اعفاء کو بہر حال وہ حکم شرعی تسلیم کرتے ہیں اور مذاق وصورت کے مطابق سائز اور مقدار میں جو اذن واختیار وہ مباح سمجھ رہے ہیں وہ بھی صریح الفاظ میں اعفائے لحیہ کے ساتھ مشروط ہے۔ خط کشیدہ عبارت پر غور کر لیا جائے۔ داڑھی اگر اتنی کاٹ دی جائے کہ وہ اعفاء سے دور اور منڈوانے سے قریب ہو جائے تو اسکی اجازت مولانا مودودی کی عبارت سے نہیں نکلتی چہ جائے کہ مسنونیت نکالی جائے۔ گالوں سے لگی ہوئی مختصر داڑھیوں کے مسنون ہونیکا استنباط مولانا مودودی نے ہرگز نہیں کیا۔ سو مرتبہ حیرت ہے کہ مدیر زندگی اپنے مضمون کے آغاز میں اس موضوع پر مولانا مودودی کی صفائی اور دفاع کرنے کے بعد بھی اختتام پر ان کے ذمے ایک اتہام ثبت کر جاتے ہیں۔ مانا کہ مضمون کے اس حصے کا تعلق براہ راست مولانا مودودی سے نہیں بلکہ ملک غلام علی صاحب سے ہے، لیکن مدیر زندگی کا پورا مضمون قاری کے ذہن کی جو فضا بناتا ہے اس میں یہ اتہام مولانا مودودی ہی کے سر جاتا ہے۔ یا کم سے کم عام قسم کے قارئین ایسا ہی تصور کریں گے۔

ہم بلا خوف تردید کہتے ہیں کہ ایسی داڑھیوں کو جو منڈوانے سے قریب ہوں اور اعفاء سے بعید مولانا مودودی ہرگز مسنون تو کیا مباح بھی نہیں کہتے۔ اگر کوئی یہ بات ثابت کر دے کہ انھوں نے ایسا کہا ہے تو ہم بلا پس وپیش کہیں گے کہ انھوں نے غلط کہا کیونکہ داڑھی کا شعار اسلام ہونا قطعی طور پر مسلم ہے اور اعفاء کی کیفیت داڑھی میں ضرور ہونی چاہیئے ورنہ شعار پورا نہ ہوگا۔ نھی منی خورد بینی داڑھیاں منڈوانے ہی کے حکم میں داخل ہیں۔ حتیٰ کہ فرنچ کٹ بھی منڈوانے سے الگ کوئی چیز نہیں۔

جی تو چاہتا تھا کہ مدیر زندگی نے اس باب میں کتب حلیث، شرح حدیث اور اقوال فقہاء و محدثین کی جو مکتبی گفتگو کی ہے اس کا مبسوط جائزہ لیں اور واضح کریں کہ حدیث اور فقہ کا سارا فن حافظ ابن حجرؒ، امام نوویؒ، علامہ عینیؒ، طبریؒ اور ابن الہمامؒ کے صرف اُن چند اقوال پر ختم نہیں ہو جاتا جنھیں مدیر زندگی نے منتخب کر کے پیش فرما دیا ہے۔ ان اکابر نے اور بھی بہت کچھ کہا ہے اور ان کے علاوہ بھی بڑے بڑے محققین سلف میں ہو گذرے ہیں جن کی کاوشوں سے فائدہ اٹھائے بغیر زیر بحث مسئلہ کا آخری فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ تمام متعلقہ مواد کا غیر جانبدارانہ جائزہ لینے کے بعد ہمیں تو وہی نتیجہ معتدل اور لائق اطمینان نظر آیا جس پر مولانا مودودی پہنچے ہیں یعنی داڑھی کی کم سے کم مقدار یک مشت (بقدر قبضہ) مقرر کرنا فقہاء کا استنباط ہے ثابت بالنص نہیں ہے۔ اجتہاد ہے اللہ اور رسولؐ کا براہ راست فرمودہ نہیں ہے۔

لیکن بخوف طوالت قرار واقعی جائزہ لینا اور مکتبی بحث چلانا دشوار ہے۔ پھر بھی بقدر گنجائش کچھ ضرور کہیں گے۔
امام ابن الہمام فقہائے احناف میں بے شک نہایت جلیل ومحترم فقیہ گذرے ہیں لیکن جب کوئی اضافی وزمانی نوع کا مسئلہ در پیش ہو تو ابن الہمام یا کسی بھی فقیہ سلف کی رائے کو اپنے زمانے کے احوال وکوائف کی میزان میں تولے بغیر قبول کرنا معقول نہ ہوگا۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ احناف ہی کے بعض جلیل القدر ائمہ مثلاً زیلعی اور عینی وغیرہ نے بطور اصول فرمایا ہے کہ الاحکام تتبدل بتبدل الازمنۃ (زمانی تغیرات کے ساتھ احکام میں بھی تغیر واقع ہوتا ہے دشرح کنز الدقائق)
کیا آپ نہیں دیکھتے کہ فقیہ الامۃ حضرت عائشہؓ نے فرمایا تھا۔

لو ادرک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما	اگر رسول اللہ کے عہد میں عورتوں کے یہ ڈھنگ ہوتے جو اب ہوگئے ہیں

احدثـه النساء لمنعهن من المساجد كما منع نساء بني اسرائيل (ابوداؤد)

تو ضرور آپ انھیں مسجدوں میں آنے سے اسی طرح روک دیتے جس طرح بنی اسرائیل کی عورتیں روک دی گئی تھیں۔

+ + + +

کیا آپ نہیں دیکھتے کہ بڑے بڑے فقہاء مثلاً صاحبِ مبسوط، صاحبِ ہدایہ اور اسی پائے کے لوگ بعض مسائل کی تحلیل و تنقیح کرنے کے بعد ایک فیصلے پر پہنچتے ہیں لیکن فوراً ہی یہ بھی فرما دیتے ہیں کہ ھٰذا امّالا یفتی بہ الناس اس فیصلے کیمطابق لوگوں کو فتویٰ نہیں دیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ تنقیح سے حاصل شدہ نتیجے کے مطابق فتویٰ نہ دینا احوالِ زمانہ کے تغیر ہی کا ثمرہ ہے۔ معلوم ہوا کہ بعض مسائل میں زمانی تبدیلیاں خود فقہاء کے نزدیک لائقِ رعایت بلکہ بعض حالتوں میں واجب الرعایت ہوتی ہیں۔

تب غور کیجئے کہ اعفاءِ لحیہ کا جو حکم خود مدیرِ زندگی کے نزدیک بھی اضافی اور زمانی نوعیت کا تھا وہ تغیراتِ زمانہ کے ساتھ کیوں متغیر نہ ہوگا۔ تغیر کی توضیح ہم کر چکے یعنی پہلے داڑھیاں رکھنا رواجِ عام تھا اور مونڈنا شاذ و نادر مدیرِ زندگی نے خود ہی اس تاریخی حقیقت کو بطورِ استدلال سپرد قلم فرمایا ہے۔ اب ہمارے زمانے میں داڑھیاں منڈانا رواجِ عام ہے اور داڑھی رکھنا شاذ و نادر۔ پوری دنیا میں اس سے بھی زیادہ کثرت سے داڑھی مونڈی جاتی ہے جتنی کثرت سے چائے اور سگریٹ پی جاتی ہے۔

تغیر کی ایک دلچسپ مثال امام ابن الہمام کی وہ عبارت بھی ہے جو مدیرِ زندگی ہی نے اپنے موقف کی تائید میں نقل کی ہے:-

"لیکن داڑھی ترشوانا جب کہ وہ ایک مٹھی سے کم ہو جیسا کہ بعض مغربی اور مخنث قسم کے مَردوں کا فعل ہے تو اس کو کسی نے بھی مباح قرار نہیں دیا ہے۔"

اندازہ فرمائیے۔ ابن الہمام کچھ بہت پرانے آدمی نہیں ابھی نویں صدی ہجری میں گذرے ہیں یعنی صرف پانچ ساڑھے پانچ سو برس ہوتے۔ پھر بھی ان کے دَور کا یہ حال ہے کہ فقط بعض مغربی اور مخنث قسم کے لوگ داڑھیاں منڈوا رہے ہیں باقی سب رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں ابن الہمام کو بھی اور دوسرے فقہاء کو بھی یہ فیصلہ دینا ہی چاہئے تھا کہ چھوٹی داڑھیاں رکھنے والے کفار و مشرکین کے تخالف میں مسلمان لمبی داڑھیاں ضرور رکھیں۔ جس زمانی و ہنگامی بنیاد پر حضورؐ نے اعفائے لحیہ کا حکم صادر کیا تھا وہ قابلِ لحاظ درجے میں اس وقت بھی موجود تھی مگر کیا آج بھی یہی حال ہے؟ ——

تقلیدِ جامد کی بات تو الگ ہے ورنہ اندھا بھی دیکھ رہا ہے کہ اب داڑھی منڈانا عالمگیر رواج بن گیا ہے اور ساڑھے ننانوے فی صدی کفار و مشرکین داڑھی کے قتلِ عام کے دلدادہ ہیں۔ آج ابن الہمام زندہ ہوتے تو بھولے سے بھی نہ کہہ سکتے کہ داڑھی فقط مخنث قسم کے لوگ منڈواتے ہیں۔ بڑے بڑے مدبر، فلسفی، سائنس داں، علماء اور متین و وجیہ لوگ سبھی کلین شیو کے خوگر ہیں۔ انھیں مخنث کون کہے گا۔ جب دنیا بھر میں داڑھی کا رواج عام تھا اور اسے مردانگی کی علامت سمجھا جاتا تھا تو بیشک کچھ مَردوں کو داڑھی منڈا دیکھ کر ان کی نسوانیت کا تصور ذہنوں میں انگڑائیاں لے سکتا تھا اور انھیں مخنث کہہ دینے کی گنجائش تھی جس طرح کہ بہت سے لباس والوں کے درمیان ایک "لنگوٹی پوش" نظر آجائے تو اسے ننگا کہا جا سکتا ہے لیکن جب مغربی تہذیب بلیڈ اور استرا لیکر نکلی اور پوری دنیا پر چھاتی چلی گئی۔ ذہنوں کے زاویے اور فکر و نظر کی قدریں بدلیں داڑھیوں کے لہلہاتے ہوئے چمن ویران ہو گئے۔ ہر طرف منڈے ہی منڈے چہرے نظر آنے لگے تو پھر فطری طور پر اس تصور کے لئے کوئی گنجائش نہ رہی جو منڈی ہوئی داڑھی اور نسوانیت میں جوڑ لگاتا تھا۔ نہ ان تخیلات کے اُبھرنے کا امکان رہا جنکی بناء پر کوئی مرد "مخنث" نظر آتا ہے۔ دنیا بھر میں لنگوٹیاں باندھنے کا رواج عام ہو جائے تو پھر کوئی "لنگوٹی پوش" ننگا محسوس نہ ہوگا۔

کام تعصّب اور تنگ نظری سے نہیں چلا کرتا حقائق کو تسلیم کرنا چاہئے چاہے وہ کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں۔ شتر مرغ ریت میں چونچ دے لیگا تو آندھی کا وجود مٹ نہیں جائے گا۔ پوری دنیا داڑھی منڈوں سے بھر گئی ہے تو اب تخالف اور امتیاز

تعلیمات دی ہیں وہیں یہ منفی روش بھی تعلیم فرمائی ہے کہ جو مسلمان اسلامی اقدار کا پاس نہ کرے اور فسق و فجور میں مبتلا ہو جائے اس سے دوسرے مسلمانوں کو ترکِ تعلق کر لینا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بھری دنیا میں اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرے گا۔ اسے اپنی گراوٹ کا احساس ہوگا۔ اس کے لئے معاشرتی زندگی میں طرح طرح کی دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔ وہ نکو بن جائے گا۔ اب یا تو وہ اخلاقی رذائل سے باز آئے یا پھر اچھوت بن کر اپنے کئے کی سزا بھگتے۔ سچ یہ ہے کہ اگر نخلع و نترک من یفجرک کے عہد پر مسلمان عمل کرنے لگیں تو بے شمار برائیاں ختم ہو سکتی ہیں بھلا کون آسانی سے گوارا کرے گا کہ خویش و اقارب اس سے کٹ جائیں، اہلِ محلہ اس سے نفرت کریں اور جدھر سے وہ گذرے بیزار نگاہیں اس کا کلیجہ چھیدتی چلی جائیں۔ جسے اس کے نفس نے گناہ پر آمادہ کر بھی دیا وہ کم سے کم اخفاء کی کوشش ضرور کریگا۔ یہ نہیں کہ آج کل کی طرح دن دہاڑے فسق و فجور کا بھی ارتکاب کرتا رہے اور فخر سے گردن اونچی کر کے اکڑتا بھی پھرے۔ رائے عامہ کی مار بہت بری ہوتی ہے۔ اخلاقی معائب کے نتیجے میں اگر ہمیں عزیز و اقرباء کے مقاطعے کا اندیشہ ہو تو کم ہی جرأت کریں گے کہ دھڑلے سے گناہ کئے جائیں۔

افسوس ہمارے علماء تک آج اس کی پروا بہت کم کرتے ہیں کہ قنوت میں کئے جانے والے روزانہ کے عہد کا تقاضا کیا ہے اور کن کن فساق و فجار سے رسم و راہ رکھ کر وہ گناہوں اور سیاہ کاریوں کی ہمت افزائی کر رہے ہیں۔ ایک عالم کسی شرابی یا سود خوار کی دعوت کھانے چلا جائے گا تو پھر کیونکر عوام کے قلوب میں شراب و سود کی مطلوبہ نفرت باقی رہ سکے گی۔ یہ تاویل لغو ہے کہ فلاں سود خوار جائز آمدنی بھی رکھتا ہے اور ہماری دعوت اس نے اسی جائز آمدنی سے کی ہے۔ اول تو اس تاویل کی صداقت معلوم۔ کیا دلیل ہے یہ جاننے کی کہ جائز آمدنی کو ناجائز آمدنی سے علیحدہ رکھا گیا ہے دوسرے دلیل مہیا ہو بھی جائے تو عوام بہرحال ظاہری عمل دیکھتے ہیں عمل جب یہ ہو کہ مولوی صاحب ایک جانے پہچانے شراب فروش یا سود خوار یا بلیک کش کے گھر دعوت کھانے یا اسکی کسی تقریب میں شرکت کرنے تشریف لے جا رہے ہیں تو عوام پر اثر اس کا لازماً یہی ہوگا کہ شراب و سود کی نفرت ان کے قلوب میں گھلا جائے گی اور فاسق و فاجر لوگوں سے ترکِ تعلق کا جذبہ مردہ ہوتا چلا جائے گا۔

یہ رواداری اور رحم و رافت نہیں دینی بے حسی اور جمود ہے کہ اللہ کے کھلے نافرمانوں سے دوستانہ روابط قائم رکھے جائیں اور صلح کل ہونے کی داد لی جائے۔ نرمی اور رواداری گناہ ہے، اگر اس سے اخلاقی رذائل کو شہ ملتی ہو۔

دینی کتابیں

اشرف الجواب — مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طرف سے بعض سوالوں کے اہم جواب۔
مکمل دو حصے ساڑھے چار روپے۔

التشبہ فی الاسلام — غیر اقوام کی مشابہت کو اسلام کس نظر سے دیکھتا ہے مکمل ساڑھے چار روپے

آئینہ نماز — صرف نماز ہی کے نہیں بلکہ پانچوں ارکان اسلام کی تفصیل مع مسائل ضروریہ۔
قیمت ڈیڑھ روپیہ

سچی باتیں — از مولٰنا عبدالماجد دریابادی۔
قیمت تین روپے ۸۷ پیسے

خلاصہ اشرف السوانح — مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حالات و سوانح۔ دو روپے

حکیم الامتؒ کی مجلسیں — مولٰنا اشرف علیؒ کی روح نواز مجالس کا پُرکیف تذکرہ
قیمت دو روپے

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک — از:۔ مولٰنا مسعود عالم ندویؒ
قیمت ڈھائی روپے

کراماتِ صحابہؓ — از:۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ
قیمت ڈیڑھ روپیہ

مسئلہ سود — از:۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب۔
قیمت سوا روپیہ

چوکھٹ کے اندر — عورتوں کے لئے چند نفیس مضامین۔
قیمت ایک روپیہ

عبقات — اختلافی موضوعات اور علوم تصوف پر شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی مشہور کتاب
ترجمہ:۔ از مولانا مناظر احسن گیلانی۔
قیمت ساڑھے دس روپے

چین و روس کی تصویریں

عالمی سیاست میں جمہوریت — موجودہ بین الاقوامی سیاست کے پُر پیچ رجحانات کو سمجھنے کے لئے اس مختصر سی کتاب کا مطالعہ ازحد مفید ہے۔
ضخامت ۱۱۵ صفحات۔ قیمت صرف آٹھ آنے

آزادی کی نئی وسعتیں — مصنف:۔ اروِن ڈی کینہم۔
آزادی کے تصور میں جو نئی رنگ آمیزیاں ہوتی ہیں ان کی معلومات افروز کہانی، کرسچین سائنس مانیٹر کے ایڈیٹر اروِن ڈی کینہم کی زبانی۔ جمہوری سماج کے جدید تر رجحانات کا ولولہ انگیز تجزیہ۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ صرف آٹھ آنے

اُنیس سو چوراسی — مصنف:۔ جارج آرویل۔
مترجم:۔ سید سہیل واسطی۔
مشہور ہندوستانی نژاد مغربی مصنف جارج آرویل کا وہ شہرہ آفاق ناول جس نے یورپ میں تہلکہ ڈال دیا تھا۔ اُردو کا یہ خوبصورت ایڈیشن آرٹ پیپر کی آٹھ تصویروں سے مزین ہے
ضخامت ۳۴۰ صفحات۔ قیمت ڈھائی روپے

ظلمتِ نیمروز — سابق کمیونسٹ دانشور آرتھر کوسلر کا بلند پایہ نظریاتی ناول جس کا ترجمہ اُردو کے صاحبِ طرز ادیب جناب گوپال مِتّل نے کیا ہے۔ ایک ایسے ملک کی کہانی جو آورش وادی انقلابیوں کے ہاتھ میں پڑ کر جنت بنتے بنتے جہنم بن گیا۔ ضخامت ۲۹۶ صفحات۔ قیمت سوا روپیہ۔

چین کے مسلمان — کروڑوں مسلمان کیا ہوئے؟ انھیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا؟ کمیونزم کی آدم خوری کا دستاویزی تذکرہ۔ قیمت صرف چار آنے۔

سویٹ نظام کی چھ کنجیاں — جچے تلے عقلی و نقلی دلائل پر مشتمل ایک سنجیدہ اور معیاری کتاب جو دلچسپ بھی ہے اور حقیقت افروز بھی۔ صفحات ۳۲۴ صرف ایک روپیہ۔

آزادی کا ادب — بعض منتخب مقالوں، افسانوں اور منظومات کا مجموعہ جنھیں نیک تعمیری مقاصد کے تحت چھاپا گیا ہے۔ مجلد تین روپے

مستقل عنوان

شمس نوید عثمانی

کیا ہم مسلمان ہیں؟

"جب تمھیں اپنے کسی بھائی کا سانحۂ غم یاد آئے ——
تو اس وقت یاد کرو تم اپنے بھائی ابوبکرؓ کو —— ان کارناموں کی بنیاد پر جو انھوں نے سرانجام دیئے۔ نبیؐ کے بعد وہ ساری مخلوق کا نچوڑ تھے —— خدا سے ڈرنے میں بھی اور خلق خدا سے انصاف کرنے میں بھی۔ اور انھوں نے جو ذمہ داری اٹھائی اس کو اس طرح پورا کر دکھایا کہ اس سے زیادہ کا تصور ممکن نہیں۔ وہی ہیں وہ "ثانی" جن کا نام فوراً حضورؐ کے بعد آتا ہے اور دشواریوں میں ان کی رفاقت کو سراہا گیا ہے اور —— وہی ہیں وہ پہلے شخص جس نے سب سے پہلے رسولوں کی تصدیق کی ——"

آغازِ اسلام کے چشم دید گواہ، شاعرِ اسلام حضرت حسانؓ بن ثابتؓ نے کبھی یوں حضرت ابوبکرؓ کے گن گائے تھے، یہ شاعری نہیں ٹھوس حقیقت تھی۔ ٹھوس تاریخ تھی کہ "حقیقت" جیسے ہی ان کے سامنے آئی اس کے خیرمقدم اور پذیرائی میں انھوں نے فی الفور اپنا سینہ کھول دیا، دل چیر کر رکھ دیا۔ حقیقت کے علم اور اعتراف کے درمیان یہاں سرے سے کوئی فاصلہ ہی نہیں جیسے سورج کے طلوع اور روشنی کے پھیلاؤ میں کوئی فاصلہ نہیں۔ تین سو ساٹھ پتھروں کو معبود ماننے والوں کی بھیڑ میں کھڑے ہو کر انھوں نے جوں ہی حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے معصوم ترین ہونٹوں سے یہ سنا کہ "کوئی معبود نہیں لیکن خدائے یگانہ!" اس دم انھوں نے اس عظیم ترین حقیقت کی زبردست سنسنی محسوس کی کہ خدائے زندۂ جاوید۔ خدائے یگانہ سچ مچ انسان کی رگِ جاں سے بھی نزدیک تر ہے۔ نظریں اس کو نہیں چھو سکتیں لیکن وہ قلبِ نظر کی گہرائیوں تک کو چھو لیتا ہے —— اور انسانی ہستی کے ظاہر و باطن پر اس کی ہستی راج کرتی ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن کے گہرے دوست کی حیثیت سے ہمیشہ ان کے دوش بدوش چلنے والے ابوبکرؓ نے جیسے ہی آں حضرتؐ کی زبان مبارک پر رسالت کا مقدس دعویٰ ابھرتا ہوا سنا۔ وہ ایک غلام کی شان عجز و انکساری کے ساتھ خدا کے آگے جھکے اور خدا کے رسولؐ کے نقوشِ پا چومنے کے لئے برابر سے ہٹ کر ان کے پیچھے آ گئے۔ دوستانہ برابری کے سالہا سال کے درجہ کو رسالتِ محمدیؐ میں فنا کر دینے کا یہ پُرشوق منظر دیکھنے کی چیز تھا۔ خدا جانے خود اس شخص کے جذباتِ سپردگی کا کیا عالم ہو گا کہ جس کو دیکھنے والے شمعِ رسالت کے پروانے بن گئے۔ سوزِ توحید و رسالت کے اس منظر کو دیکھ دیکھ کر سراپا سوز و گداز ہو گئے اور کتنے ہی مکے کے قیمتی لال خدا کے رسولؐ کی طرف پروانہ وار بڑھے اور اس شمعِ حیات کے گرد طواف کرنے لگے۔ ان میں زبیر بن عوامؓ تھے۔ عبدالرحمٰنؓ بن عوف تھے۔ عثمانؓ بن عفان تھے۔ سعدؓ ابن ابی وقاص تھے۔ طلحہؓ بن عبداللہ تھے —— اور نجانے دوسرے کتنے ہی وہ حق پسند جلیل القدر انسان جو اسلام کے افق پر مہرو ماہ بن کر چمکے اور زیرِ زمین جانے کے بعد بھی آج تک تاریخ کی وسعتیں ان کے نور سے جگمگا رہی ہیں۔

حق و صداقت کی طرف بڑھنے والے اس عظیم انسانی گروہ پر جہاں رسالتؐ کی مقناطیسی شخصیت سحرِ حلال کا اصل کام کر رہی

تھی وہاں ان کے جذب و جنوں کی آگ بھڑکانے میں ابو بکرؓ کی شان صدیقیت کا بھی حصہ تھا۔ اس لئے خدا کے آخری پیغام کی اس اوّلین تصدیق کا صدیقی کارنامہ درحقیقت ایک عظیم ترین ـــ لامتناہی احسان ہے ان تمام پاک روحوں پر جو شروع سے آج تک خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائیں اور جو رہتی دنیا تک ایمان لاتی رہیں گی۔ ابو بکرؓ کا ایمان لانا ایک فردِ واحد کا ایمان لانا نہ تھا بلکہ ان کی شخصیت کی آڑ میں درحقیقت وہ تمام خوش قسمت انسانیت ایمان لائی تھی جس کی تقدیر میں اپنے خالقِ اکبر کا دیدار اور محمدؐ کی شفاعت لکھی ہوئی ہے۔ ان کے ایمان و یقین میں پوری نوعِ انسانی کا ہمہ گیر سوز و گداز سمٹ آیا تھا۔ ان کے دل میں آدمؑ کے تمام مومن بیٹوں اور حوّا کی تمام مومنہ بیٹیوں کے کروڑوں دلوں کی بے قرار دھڑکنیں یکجا ہو گئی تھیں۔

رسولِؐ خدا کے سینے پر جو وحی نازل اور ہونٹوں پر بلند ہو رہی تھی ابو بکرؓ کا پورا وجود اس کے سانچے میں ڈھلتا جا رہا تھا اور ان کے گھر کے صحن میں انکی چھوٹی سی عبادتگاہ سے حقیقت کی پرسوز صدائے بازگشت نشر ہو رہی تھی۔ شام اور یمن کی راہوں پر کبھی جو شخص اسبابِ تجارت کا بوجھ اٹھائے نظر آتا تھا۔ آج اس کے شانوں پر خدا کے عرش سے اتری ہوئی اس بلند ترین حقیقت کا بوجھ تھا جس کو اٹھانے کے تصور سے ہی سمندروں کا بے قرار سینہ چاک چاک اور پہاڑوں کا جگر پانی پانی ہو گیا۔ ریگستان کے تپتے ہوئے سرخ و سوزاں ذرّوں نے دیکھا کہ وہ خدا کا یہی پیغام گھر گھر پہنچانے کی دھن میں تلووں سے لہو ٹپکاتا پھر رہا ہے تو رات کو آسمان کے ان گنت تاروں نے دیکھا کہ اس کا پورا وجود خدائے واحد کے قدموں میں پڑا ہوا دردِ بندگی سے سلگ اور سسک رہا ہے اور ہونٹوں پر قرآن کی لاہوتی آواز ایسے آنسوؤں سے تربتر ہو کر اٹھتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے ریگزار اور پہاڑوں کی سرزمین مکّے پر خونیں آنسوؤں کی بوچھار ہو رہی ہے پتھر کے بے حس پجاریوں کا دل سینے سے نکلا جا رہا ہے اور مردوں اور عورتوں اور بچوں کا بے قرار بھیڑ اس کی دیوار تلے کھڑی ہوئی اس نالۂ نیم شبی پر سر دھن رہی ہے جس کو یہ دنیا بے سمجھے تڑپ جائے اور سمجھ جائے تو فرطِ شوق سے مر جائے!

شعلوں کی دہکتی ہوئی سیج کی طرح جھلسا دینے والی ریگستانی راہوں پر دو انسان ہر جگہ ساتھ ساتھ دیکھے گئے! ان میں ایک وہ شخص تھا جس کی امانت و دیانت اور صداقت کی قسم چالیس سال سے مکّے کی گلی گلی میں کھائی جا رہی تھی تو دوسرا وہ تھا جس کو بلانوش شرابیوں کے کافر مکّہ نے کبھی ایک بار بھی نشے میں نہیں دیکھا تھا۔ محمدؐ اپنے خدا کے اشارہ و نبیر تخاروں اور وحشی ترین انسانوں کی اونچی نیچی دنیا میں جدھر سے نوائے حق بلند کرتے ہوئے گذرتے، ابو بکرؓ کی بے قرار آواز پیچھے پیچھے بلائیں لیتی، لرزتی اور وجد کرتی ہوئی آتی:۔

"میں گواہی دیتا ہوں! ـــ اے دنیا میں گواہی دیتا ہوں! ـــ میں تصدیق کرتا ہوں کہ اس آدمی کی رگوں میں قریش کا بہترین خون ہے۔ اس کے قلب و روح میں سوائے نور کے کچھ نہیں ـــ اس کے کردار میں امانت و صداقت کے جوہر کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں ـــ میں ایک دو دن نہیں چالیس سال سے اس کی زندگی کے دن اور رات دونوں دیکھتا آیا ہوں اور اسکی شخصیت کو ہر وقت اپنی حدِ نظر سے زیادہ اونچا پایا ہے ـــ میں کیسے بتاؤں یہ کتنے اچھے ہیں۔ کتنے سچے ہیں ـــ میں ان کی صداقت کی گواہی دیتا ہوں ـــ اے لوگو! میں گواہی دیتا ہوں ......"

توحید و رسالت کی درد بھری آواز سینۂ رسولؐ سے اٹھتی اور شہادتِ حق کا صدیقی نعرۂ مستانہ خونِ دل و جگر ٹپکاتا ہوا ساتھ آتا۔ ساری دنیا ایک ساعت کے لئے سکتے میں آجاتی! ـــ آخر آخر سنگدلوں نے ان دونوں کو گھور کر دیکھا خود پرستوں کے کان کھڑے ہوئے! ـــ اور انسان کی جھوٹی خدائی کی ناپاک زنجیروں میں جکڑے ہوئے کتنے ہی غلاموں اور لونڈیوں نے آنکھ میں آنسو بھر کر سسکی لی:۔

"ہائے کیسی دل کش ہے یہ آواز کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ـــ کاش ہم اس آواز پر تن من دھن نثار کر سکتے کاش خدا کا کوئی بندہ ہمیں انسانی غلامی سے نکال کر

خدا کی بندگی میں داخل کرا سکتا!"

یہ پکار خدا کے اسی بندے کے کان میں پڑی جس کا نام ابوبکرؓ صدیق تھا۔ سنتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور عمر بھر کے خون پسینے کی گاڑھی کمائی بے دریغ خرچ کر دی ان بیکسوں اور غلاموں پر جن سے ان کا خون کا نہیں — مفادات کا نہیں خالص ایمان کا رشتہ تھا۔ ایک رشتۂ اخوت جس میں اپنے اور بیگانے کا کوئی امتیاز نہیں۔ جہاں کسی سے کچھ لینے کے لئے نہیں دیا جاتا۔ بلکہ جہاں دینے والا لینے کے ہر دروازے کو یہ کہہ کر اپنے ہاتھوں سے بند کر دیتا ہے کہ "تم سے مجھے کسی اجر و صلہ کی طلب نہیں میری مزدوری میرے رب کے ہاتھ میں ہے۔" خدا کے نہ ماننے والوں نے بھی کبھی ان غلاموں کو خریدا تھا تاکہ اپنی جھوٹی خدائی کا کھلونا انکو بنا کر سینہ پھلا سکیں اور غرور سے سر اٹھا سکیں۔ ابوبکرؓ جیسے اللہ والے نے بھی ان غلاموں اور لونڈیوں کو منہ مانگے دام دے کر خریدا تھا لیکن صرف اس لئے کہ خدا کے بندوں اور بندیوں کو خدا کی بندگی کی آزادی دلا کر توحید کے آستانے پر جھکا دیں اور ساتھ ساتھ خود بھی سجدۂ شکر میں گر جائیں۔ ان گلوخلاصی پانے والوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ہاں ان میں بلالؓ حبشی تھے۔ عامرؓ بن فہیرہ تھے۔ ان میں نذیرہؓ تھیں۔ نہدیہؓ اور جاریہؓ تھیں۔ محمد مصطفےٰ صلعم کے فیضِ نظر نے یہ ابوبکرؓ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا؟ — وہی ابوبکرؓ جو بنی تمیم کے ایک کامیاب سوداگر کی حیثیت سے کبھی سونے چاندی سے دنیا کے ساز و سامان کا مول تول کیا کرتے تھے آج وہی ان کی دولت تھی جس کے عوض وہ دنیا نہیں جنت خرید رہے تھے — خدا کی خوشی خرید رہے تھے!

حق و صداقت کے جاں نثاروں کا قافلہ بڑھتا گیا۔ اور حق و صداقت سے چڑنے والوں کی مکروہ تیوریاں چڑھتی گئیں۔ دعوۂ حق کرنے والوں کے مقابلے میں اب ظلم و ستم کی قہرمانیت پوری طرح حرکت میں آ چکی تھی۔ اب خدا کا نام وہی لے سکتا تھا جس نے سر سے کفن باندھ لیا ہو اور اپنی جان، ہتھیلی پر رکھ لی ہو اس مقام پر کیسا عظیم ثبات تھا رسولِ خدا اور ان کے نام لیواؤں کے قدموں میں! زبانوں کے تیر و نشتر سہنے کے لئے گھائل سینے بے تکلف کھلے ہوئے تھے — بھوک اور پیاس کی شدت میں آگ کی طرح جلتی ہوئی زمین پر گھسیٹے جانے کے لئے غلام اور لونڈیاں تک وادیٔ خطر میں بے جھجک کود پڑی تھیں جہاں قدم قدم پر ہلاکت کی دھمک تھی۔ موت کی خوفناک چاپ تھی۔ بے حسی اور سنگدلی کی تاریکی میں درندوں کی طرح شعلہ بار آنکھیں تھیں — مظلوموں کا خون ٹپکاتے ہوئے کرخت ہاتھ تھے۔ اور کھوپڑیوں سے کھیلنے والی بے رحم ٹھوکروں کی باڑھ تھی۔ وہاں قدم قدم پر خدا کے نام پر سر دھڑ کی بازی لگانے والے پروانوں کی طرح ٹوٹے پڑتے تھے۔ اور اس کاروانِ عشق کی چوٹی پر خدا کے رسولؐ کے قدموں کو جو شخص زخمی اور پیاسے ہونٹوں سے چومتا چلا آ رہا تھا وہ ابوبکر صدیقؓ ہی تھا۔ ہائے اے ابوبکرؓ! خدا کی ہزار ہزار رحمتیں ہوں آپ کی جان پاک پر کہ خدا اور رسولؐ پر فدا ہونے والوں نے ہمیشہ آپ کو فداکاری کے نقطۂ عروج پر ہی دیکھا۔ وہاں دیکھا جہاں کوئی نہ تھا۔ جہاں فداکاری و سرفروشی کی ساری رفعتیں اپنی آخری حدوں کا اعلان کر رہی تھیں۔

جب دنیا نے یہ منظر دیکھا کہ مکہ کے بچے بچے سے اپنے لئے "امین و صادق" کا خراج لینے والا عامیوں اور راہگیروں تک سے گالیاں سن رہا ہے اور جسم نازک پر چوٹ پر چوٹ کھا رہا ہے لیکن اس کے باوجود اپنے اعلانِ حق پر جوں کا توں اٹل ہے جب دنیا نے دیکھا کہ یہ ثابت قدم داعیٔ حق خانہ کعبہ میں خدا کا پیغام بلند کرتے ہوئے جراحتوں اور چوٹوں کی گود میں بیہوش کر کے گرا دیا گیا تو دنیا نے یہ بھی دیکھا کہ اس وادیٔ قہر و خطر میں والہانہ کود کر جس شخص نے درد بھری چیخ ماری وہ خدا کی قسم ابوبکر صدیقؓ کے سوا کوئی نہ تھا۔ پیغمبرؐ پر درندوں کی طرح ٹوٹ پڑنے والوں پر وہ بجلی بن کر گرا اور للکارتے ہوئے کہا۔

"تمہیں خدا سمجھے اے لوگو! — کیا تم اس پاکباز رسولؐ کی جان ہی لے لوگے جس کی خطا بس یہ ہے کہ وہ خدا کو اپنا خدا کیوں کہتا اور کہلانا چاہتا ہے!"

ایک بار نہیں — ایسا ہی واقعہ دو بار ہوا — اور دونوں بار لوگوں نے دیکھا کہ عشق الٰہی اور حبِ رسولؐ کا پروانہ تلوار کی دھار پر رقص کر رہا ہے۔ "ظلم و ستم" کو ظلم و ستم کہنے والے

پر ظالموں کی وحشی بھیڑ ٹوٹ پڑی اور خون آشامی کے بل پر بندۂ حق کو بے ہوش کر دیا گیا تو اس کی صدائے حق خاموش ہوئی۔ لیکن جو لوگ اس کی زندہ لاش کو کاندھوں پر اٹھا کر اس کے گھر لائے انھوں نے اپنے کانوں سے سُنا اور آنکھوں سے دیکھا کہ جوں ہی اُس کو ہوش آیا تو اپنا نہیں اس کو سب سے پہلے محمد مصطفٰےؐ کا ہوش آیا تھا۔ اس نے آنکھ کھولی تو اپنے زخموں پر نظر نہیں کی۔ زبان کھولی تو درد بھری کراہ نہیں بلند کی۔ اس نے تو ماں کے لئے بے قرار بچے کی طرح یہ سوال کیا:-

"خدارا یہ بتاؤ کہ رسولؐ خدا کیسے ہیں اور کہاں ہیں؟
خدا کے لئے مجھے جلدی سے اٹھاؤ اور حضورؐ کے قدموں
میں لے جا کر ڈال دو۔ میں اپنی آنکھوں سے انکی صورت
دیکھنا چاہتا ہوں۔"

خدا ہی جانے اس انسانِ کاملؐ ـــ خدا کے بندے اور رسولؐ کی شخصیت کیا چیز ہو گی جس کے ناوکِ کرم سے گھائل ہونے والے اپنے زخموں کو اس طرح پیار کرتے تھے ـــ جس کو ان عظیم انسانوں نے دیوانہ وار چاہا جو خدا کے سوا کسی کو نہ چاہتے تھے ـــ خدا اور خدا کے رسولؐ کے لئے ابو بکر صدیقؓ نے سچ مچ اپنا سب کچھ نثار کیا۔ بنو تیم کا یہ خوش حال اور معزز ترین فرد جس کو کبھی لوگ جھک جھک کر سلام کیا کرتے تھے اب وہی اس پر بڑھ بڑھ کر دار کر رہے تھے۔ تین سو ساٹھ بتوں کے سامنے خانۂ کعبہ میں اس کو جسمانی مار دی گئی اور اس کے خاندانی وقار کی دھجیاں اُڑانے کی ناپاک جسارت کی گئی۔ لیکن دنیا کے ہر اعزاز کے مقابلے میں ابو بکرؓ نے غیرتِ بندگی کی لاج رکھی۔ حُبِ رسولؐ کا نام روشن کیا اور عظمتِ توحید کا سکہ بٹھانے کے لئے اپنی پوری زندگی کو خاک میں ملا دیا۔ جب ناپاک ہاتھوں نے ان کی عزت و آبرو پر دست درازیاں کیں تو انھوں نے فخر و مسرت سے بیتاب ہو کر سجدے میں سر رکھ دیا کہ خوش قسمت ہے وہ شخص جس کی جان جان آفریں کے کام آئے ـــ جب غلاموں اور لونڈیوں کو خدا کے حوالے کر دینے کے لئے دنیا نے ان سے کہا کہ:-

"دام پیارے ہیں یا خدا کا نام؟ ـــ دعوٰیٔ بندگی
کا ثبوت ہم زبان سے سُن چکے اب تمھاری جیب سے لینا
چاہتے ہیں؟"

اور خدا کا نام لینے والے نے فوراً مُنھ مانگے دام پیش کر دیئے غلاموں اور لونڈیوں کو خریدا اور اسی دم یہ کہہ کر آزاد کر دیا کہ:-

"تمام انسان خدا کے بندے اور آدم کے بیٹے ہیں اور
آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔ جاؤ بندگی کی پیاس
سے سلگتی ہوئی پیشانیاں لئے ہوئے اسی کے در پر جھک
جاؤ جس کے در پر میں خود جھکا ہوا ہوں اور جس در کے
سوا کوئی دہلیز اس قابل نہیں کہ اشرف المخلوقات
اس کے آگے اپنی پیشانی ٹیک سکے۔"

تنے ہوئے گھونسے اور بپھری ہوئی ٹھوکریں اُبھریں اور خدا کا نام لینے والے سے کہا:-

"خدا کا نام پیارا ہے یا خاندانی نام و نمود؟ ـ یاد رکھو
کہ خدائے واحد کا نام لوگے تو اس تمام عزت و شوکت
سے ہاتھ دھونا ہوگا جو بنو تیم کے معزز گھرانے کے
ایک معزز ترین فرد کی حیثیت سے تمھیں آج تک حاصل
رہی ہے۔"

ابو بکرؓ نہ مانے ـــ نام خدا پر دنیا بھر کی ٹھوکریں کھانا قبول کیا۔ آخرت کی سرخروئی کی چاہ کو زمین کی ذلت و عقوبت کا کوئی خطرہ ذرا بھی تو نہ سہما سکا۔ لیکن جیسے ہی دنیائے کفر و شرک نے ان کی متاعِ ایمانی پر دست درازی کرنی چاہی اور خدا کا نام لینا دشوار کر دیا تو گھر اور وطن ان کو شیطانی قید خانہ معلوم ہونے لگا جہاں سے دامن بچا کر وہ جنگلوں چڑھ جاتے اور دیس بدیس کی ٹھوکریں کھانے کی آرزو کرنے لگتے۔

"اے خدا کے رسولؐ!" انھوں نے ماہیٔ بے آب ہو کر عرض کیا:-

"دیکھ رہے ہیں آپ؟ ـ یہ دنیا اب میرے ہونٹوں کو
سی دینا چاہتی ہے اور مجھے مجبور کر رہی ہے کہ خدا کی
بندگی میں آجانے کے بعد خدا کا نام لینا چھوڑ دوں۔
خدارا اجازت دیجئے کہ اس وطن اور گھر بار کو چھوڑ
کر جینے کے لئے کوئی ایسا گوشۂ عافیت ڈھونڈ نکالوں

جہاں میری زبان آزادی سے خالق اکبر کا نام پکار سکے۔"

حضورؐ نے دیکھا کہ ابوبکرؓ کا تمام جسم جراحتوں اور چوٹوں سے پاٹ دیا گیا ہے۔ حضرت طلحہؓ بن عبداللہ کی روح میں ایمان کی جوت جگانے کے "جرم" میں ان کے چچا نوفل بن خویلد نے طلحہؓ کے ساتھ ابوبکرؓ کو جو دردناک جسمانی مار دی ہے اس کی چوٹوں کے نشانات ان کے جسم پر جگہ جگہ تمتما رہے ہیں۔ حضورؐ نے دیکھا کہ خدا کی راہ میں زخم پر زخم کھانے والا ترک وطن کا ایک اور زخم کھانے کے لئے کس درجہ بے تاب و بے قرار ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے ان کو اجازت دیدی کہ تم اگر اسی پر مُصر ہو کہ خدا کے لئے ساری دنیا چھوڑ دو تو خوشی سے سوئے حبشہ ہجرت کر سکتے ہو۔

حضرت ابوبکرؓ نے مکے کے در و دیوار پر حسرت بھری نظر ڈالی۔ کیسا سخت وقت تھا کہ گھر بار، وطن اور اہلِ وطن چھوٹ رہے تھے۔ سب سے زیادہ یہ کہ خدا کا رسولؐ چھوٹ رہا تھا لیکن کیسا حسین تھا یہ وقت! جب خدا کی طرف بڑھنے والے بندے نے محسوس کیا کہ اس کا خدا خود بھی بہ نفسِ نفیس اس عاجز و درماندہ بندے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ ایک قدم بڑھتا ہے تو خدا اس کی طرف دس قدم آگے بڑھتا ہے۔ اور وہ تیز چل کر جاتا ہے تو خدا اپنی عظیم رحمت کے ساتھ بندے کی پذیرائی میں دوڑتا ہوا آتا ہے! ۔ کوئی بتاؤ آخر وہ کونسا اعزاز ہے جس کی آرزو اور جس کا تصور اس بندہ نوازی کے بعد کیا جا سکے؟ ۔ ہزاروں وطن ۔ ہزار بار تصدق ایسی بے وطنی پر جس کے قدموں کی دھول میں جنت گری پڑتی ہو ۔۔ ہزاروں دنیائیں ہزاروں بار قربان اس بے کسی اور غریب الدیاری پر جہاں ساری خدائی چھوٹ رہی ہو اور خدائے قدرداں مل رہا ہو! ۔۔ یہی تھی وہ جاں نواز حقیقت جو اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے جسم و جاں میں رچی ہوئی تھی ۔۔ وہ گھر کے ٹھنڈے سائے اور وطن کے زندہ مناظر سے کٹ کر جلتے ہوئے ریت کے ٹیلوں کے درمیان یکہ و تنہا قدم قدم پر یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ ہرگز تنہا نہیں ۔۔ یہاں بھی کوئی ان کے ساتھ ہے ۔ وہی "کوئی" جس کے بعد کسی کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

آگ برساتے ہوئے ریگستان میں کیف و سرخوشی سے وجد کرتے ہوئے مومن کو ایک "کافر" نے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ یہ قارہ کا سرمایہ دار ابن الدغنہ تھا۔ اس نے سوچا کہ بنو تمیم کا یہ معزز سوداگر آج کس سفر پر چلا جا رہا ہے جہاں نہ اس کے ساتھ تجارت کا ساز و سامان ہے اور نہ کوئی رفیقِ سفر! لیکن پھر بھی اس کے بشرے سے وہ خوشی اور بے نیازی کا نور ٹپک رہا ہے جیسے تمام دنیا کی حکمرانی اس کو مل گئی ہو۔

"اے ابوبکر کہاں چلے؟" حیرت و استعجاب کے ساتھ رئیس قارہ نے سوال کیا۔

"قوم نے مجھے وطن سے نکال دیا ہے ۔ اب مجھے خدا کی زمین پر ایک ایسا کونہ ڈھونڈ نکالنا ہے جہاں میں آزادی سے خدا کی پرستش کر سکوں۔"

حضرت ابوبکرؓ کی آواز میں دل کی چوٹ اور ایمان کی جاں نواز حلاوت تھی۔ ایمان کا کیسا بے پناہ تھا یہ منظر کہ ایک کافر کے سرد و سیاہ سینے میں انسانیت کا سوز جاگ اٹھا۔ درد کی ایک اشک آلود ہنسی اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ جذبات سے بوجھل آواز میں ایک کافر کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے:۔

"نہیں اے ابوبکرؓ! میں تمھیں کبھی نہ جانے دوں گا! ۔ تم بیکسوں کی مدد کرتے ہو ۔۔ بے نواؤں کی پکار سُنتے ہو ۔۔ مہمانوں کے لئے فرشِ راہ ہوتے ہو۔ نہیں! ۔ میں تمھیں نہ جانے دوں گا! ۔۔ آؤ میرے ساتھ واپس چلو ۔۔ میں عہد کرتا ہوں کہ تم میری امان میں رہوگے اور تمھیں خدا کی عبادت کرنے سے کوئی نہ روکے گا۔"

وہی جسے کفر و شرک نے دیس سے نکل جانے پر مجبور کیا تھا ہاں اسی کو پھر دیس میں واپس لانے کے لئے وہی کفر و شرک اس کے پاؤں پڑ رہا تھا! ۔۔ یہ کفر کی صدائے شکست تھی۔ یہ ایمان و اخلاق کا اعلانِ فتح و ظفر تھا۔ یہ خدائے بندہ نواز کی قدرت کا ایک اشارہ تھا! ۔

ابوبکرؓ پھر ایک نئی شانِ خودداری کے ساتھ اس طرح واپس آئے کہ قارہ کا دولت مند سردار ابن الدغنہ ایک ہرکارے کی طرح قریشی سرداروں میں گھوم پھر کر یہ اعلان کر رہا تھا کہ:۔

"میں اپنی اماں میں ابوبکرؓ صاحب کو واپس لایا ہوں۔
اے لوگو! تمھیں غیرت آنی چاہیئے کہ تم مکے کو ایک ایسے
بھلے مانس سے خالی کردینا چاہتے ہو جو غمزدوں کی ہمدردی
کرتا اور دکھیاروں کا دکھ درد میں جان و مال سے حصّہ
لیتا ہے۔"

کچھ دن یہ لوگ اس توقع کے ساتھ حالات کا جائزہ لیتے رہے کہ ایک بار ملک بدر ہوجانے والا دوسری بار جلا وطن ہونے کے ڈر سے اپنے طرز عمل میں کوئی احتیاط۔ کوئی تبدیلی پسند کرتا ہے کہ نہیں؟ انھوں نے دیکھا کہ ابوبکرؓ کا نالۂ نیم شبی ہررات ان کی "گھریلو مسجد" سے پوری قوت کے ساتھ بلند ہورہا ہے، توخدا کو بھول کر میٹھی نیند سونے والے کافروں کے دل ہل رہے ہیں۔ جو آواز کبھی گھر سے باہر مکہ والوں کو ڈھونڈتی پکارتی پھرتی تھی اب وہی آواز گھر کے اندر سے یوں بلند ہوتی ہے کہ دنیا اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہے۔ قریشی سرداروں کا وفد ابن الدغنہ سے ملا اور اعلان کردیا کہ اب ابوبکرؓ کو گھر کے اندر رہتے ہوئے خدائے واحد کا نام بلند کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ابن الدغنہ نے قریشی سرداروں کے غضبناک تیور دیکھے تو ہانپتا کانپتا ہوا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا:۔

"کیوں اپنی جان کے دشمن ہوئے ہو؟ — خدا کا
نام لے لیکر تم سارے مکہ کو خفا کئے دے رہے ہو۔
مجھے خطرہ ہے کہ اس طرح میں بھی تمھیں پناہ دینے
کے عہد کو برقرار نہ رکھ سکوں گا۔"

یہ اعلان ایک زبردست دھمکی تھی۔ یہ دھمکی اس زلزلہ کی دھمک تھی کہ مکے میں خیریت سے رہنا چاہتے ہو تو خدا کی اعلانیہ پرستش سے باز آجاؤ — ورنہ یہ طے ہے کہ تمھیں مسل ڈالا جائے گا۔ لیکن وہ مؤمن جو خوب جانتا تھا کہ زلزلۂ محشر کیا چیز ہے اور دوزخ کے آتشیں تصور میں کس بلا کی ہولناکیاں ہیں اس نے کمال شانِ استغناء سے ابن الدغنہ کی باتوں کو سنا' ابن الدغنہ کے وہم و گمان پہ سکتہ سا چھا گیا جب اس نے اپنے کانوں سے ابوبکرؓ کی یہ بے نیاز آواز سنی:۔

"مجھے تمھاری پناہ درکار ہی نہیں ہے — میرے
لئے خدا اور خدا کے رسولؐ کی پناہ بالکل کافی ہے۔"

یا معبود! تیری اس دنیا میں کبھی خدا پر ایمان لانے والا دنیا پر بے نیازی سے لات مار کر خطرات کے منجدھار میں یہ اعلان کرسکتا تھا کہ "اس کو کسی کی پناہ درکار نہیں — اس کے لئے تو خدا اور خدا کے رسولؐ کی پناہ کافی ہے۔" لیکن آج ہمارے تصورات اس بات کو سوچ کر شل ہوجاتے ہیں کہ "کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے؟ کیا خدا پر ایمان لانے والا خدا پر اس طرح عملی بھروسہ کا مظاہرہ کرسکتا ہے؟" لیکن کاش ہم سوچ سکتے کہ یہ باتیں سوچنے کی نہیں۔ کر گذرنے کی ہیں۔ خدا پر بھروسہ کا لطف اٹھایا ہی تب جاسکتا ہے جب خدا کے لئے خطرات کو قبول کرنے کی جرأت دکھائی جائے۔ آگ اسی وقت پھولوں کی سیج بن سکتی ہے جب کوئی ابراہیم خدا کا نام لے کر آگ میں کود پڑے۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ خطرہ مول لینے سے پہلے خدا کی پناہ گاہ کا دروازہ ہمارے لئے چوپٹ کھول دیا جائے۔ آگ کے شعلے پہلے لالۂ وگل میں ڈھل جائیں۔ پھر ہم اللہ اللہ کرکے اس میں کود پڑیں۔ سچے مومنوں نے کبھی یوں نہیں سوچا — اور ہم ہمیشہ ہر وقت کچھ اسی طرح سوچ رہے ہیں!! —

مراسلہ بلا تبصرہ

محترم المقام جناب مولانا صاحب السلام علیکم۔

آپ کے رسالہ تجلی میں جو نومبر ۶۲ء میں جماعت تبلیغی اور جماعت اسلامی سے متعلق مضمون کسی سائل کے جواب میں آپ کی طرف سے شائع ہوا ہے میں حرف بہ حرف اسکی تائید کرتا ہوں۔ حق یہ ہے کہ آپ نے حق ادا کردیا ہے۔

مگر آنجناب کے مضمون کے جواب میں ابو الفیض صاحب مسولوی بنگلوری کا مضمون جو تبلیغی جماعت کا تعارف کرانے کے لئے تجلی فروری ۶۲ء میں آیا ہے محل نظر ہے۔ مجھے ابو الفیض صاحب سے اس بارے میں قطعی اتفاق ہے کہ جماعت اسلامی کا برحق ہونا سورج کی شعاعوں کی طرح عیاں ہے مگر ان کا یہ استدلال کہ تبلیغی جماعت جماعت اسلامی کو گمراہ اور بے دین نہیں سمجھتی یہ اتنا ہی غلط ہے جتنا کہ جماعت اسلامی کا گمراہ ہونا غلط ہے مجھے کہنے دیجئے کہ ابو الفیض صاحب شاید ہندوستان میں نہیں رہتے یا وہ کسی تہ خانے میں اپنے اوقات گذارتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جماعت تبلیغی کی ہر آنے والی ٹولی ہر ممکن طریقے سے جماعت اسلامی کو گمراہ اور بے دین قرار دیتی ہے۔

آج ہی میرے دوست جمشید علی خاں صاحب کا خط جلال آباد سے آیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "تبلیغی جماعت والے یہاں پر جماعت اسلامی کو قادیانیوں سے زیادہ خطرناک اور بے دین کہتے ہیں اور مودودی صاحب پر کفر کا فتویٰ لگاتے ہے۔ نیز کہتے ہیں کہ مودودی صاحب قرآن کا ترجمہ قطعی غلط اپنی رائے کے مطابق کرتے ہیں اور صحابہ کرامؓ اور ائمہ عظام کی شان میں شدید گستاخیاں کرتے ہیں۔ ایک ٹولی نے کسی دوکان پر جماعت اسلامی کا کلینڈر دیکھکر ہی اس دوکاندار کو بے دین اور مرتد قرار دیدیا ہے۔"

ان حالات کی موجودگی میں جو کہ سورج کی طرح اظہر من الشمس ہیں۔ میں مولانا ابو الفیض سے آپکی معرفت یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے وہ معلومات کہاں سے حاصل کی ہیں جنکا حوالہ انھوں نے اپنے مضمون میں دیا ہے۔ نیز اگر واقعی صورت حال وہی ہے جو فضل العلماء ابو الفیض صاحب نے اپنی تحریر میں ظاہر کی ہے تو انکا سب سے اہم فرض ہے کہ وہ موجودہ صورت حال سے تبلیغی جماعت کے سربراہوں کو بہ تفصیل مطلع کریں اور تمام شاخوں کو ہدایات نامہ مرکز کیطرف سے جاری کیا جائے جسمیں جماعت اسلامی کی اگر حمایت نہ کی جائے تو مخالفت سے دورہ کرنیوالی ٹولیوں کو سختی سے منع کیا جائے۔ میں باادب مولانا ابو الفیض سے درخواست کرونگا کہ وہ جماعت اسلامی کے بارے میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی رائے دریافت کریں جیسے کہ دوسرے تمام علماء کی آراء سامنے ہیں اسی طرح تبلیغی جماعت کے سب سے بڑے رہنما کی رائے بھی سامنے آنی چاہیئے۔ بہتر ہوگا کہ صاحب مضمون خود حضرت مولانا محمد یوسف صاحب سے ملاقات کرکے زبانی معلومات حاصل کریں، میرا اندازہ یہ ہے کہ ہر ایک جماعت جو گشت پر چلتی ہے اسکو خصوصیت سے ہدایات دیجاتی ہیں کہ جماعت اسلامی کے کام کو ڈھانے کا جو بھی ممکن طریقہ ملے گریز نہ کیا جائے

اس خط لکھنے کا محرک میرے دوست کا وہ مایوس کن خط ہے جو انھوں نے بڑے درد بھرے انداز میں لکھا ہے جن کا یہ فقرہ تیر کی طرح دل میں چبھ گیا ہے کہ:۔

حالات دن بہ دن نزاکت اختیار کرتے جارہے ہیں۔ میرے کئی ساتھی متزلزل ہوچکے ہیں اس سلسلے میں اقامت دین کی راہ میں استقامت کیلئے دعا کے خواہش مند ہیں۔" فقط

سید طیب حسن۔ گڑھی پختہ مظفر نگر

امام احمد بن حنبلؒ مصنفہ :- استاذ ابوزہرہ - ترجمہ :- عمر فاروقی ایم۔ اے۔
قیمت نو روپے

القاموس الجدید ایک رفیع الشان اُردو عربی ڈکشنری بے شمار اُردو الفاظ کے عربی مترادفات کے علاوہ اس میں ضرب الامثال محاورات اور زبان کے نئے تغیرات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ضروری مقامات پر تصاویر کے ذریعہ مفہوم کو واضح کیا گیا ہے۔ مفید، بیش قیمت اور جلیل القدر عربی سیکھنے والوں کے لئے خاص تحفہ ہے۔ قیمت سات روپے۔

حیات انورؒ فخر المحدثین مولانا انور شاہ صاحبؒ کا مفصل تذکرہ۔ آپ کے علمی کمالات کا نقش جمیل۔
قیمت چار روپے

محمد رسول اللہ ﷺ مشہور مصری مصنف توفیق الحکیم کی کتاب کا عمدہ اُردو ترجمہ مکالمے کے انداز میں لکھی ہوئی حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ بے حد دلچسپ اور پُر کیف
قیمت پانچ روپے

ابوبکر صدیقؓ مصنفہ :- محمد حسین ہیکل۔ ترجمہ :- شیخ محمد احمد پانی پتی۔
قیمت پانچ روپے

عمر فاروق اعظمؓ مصنفہ :- محمد حسین ہیکل۔ ترجمہ :- حبیب اشعر۔ نو روپے۔

خالد سیف اللہؓ اسلام کے عظیم مجاہد حضرت خالد بن ولیدؓ کی سوانح - سوا دو روپے۔

فارابی معلم ثانی حکیم ابوالنصر فارابیؒ کے علم و فضل اُن کی سوانح اور کمالات، تجدید فلسفہ و منطق کے مفصل و مکمل حالات - قیمت پونے دو روپے۔

باندیوں کا مسئلہ (الدُّرُّ الثمین) جہاد میں ہاتھ آئی ہوئی عورتوں کو باندی بناکر رکھنے کی دینی و علمی حیثیت۔ کتاب میں مصنف کا ایک خط اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کا جواب بھی شامل ہے۔ ڈیڑھ روپیہ۔

منہاج العابدین (اُردو) امام غزالیؒ کی سب سے آخری تصنیف جو آپ کی پوری زندگی کی تعلیمات کا خلاصہ اور تصوف کا نچوڑ ہے۔ مجلد آٹھ روپے۔

جناب اسعد گیلانی کی پانچ کتابیں

مولانا مودودی سے ملیئے	مجلد	۶/۵۰
تصویریں	"	۳/۲۵
تحریک مجاہدین کا انقلابی پہلو	"	۳/-
انتظار (جدید مضامین)	"	۱/-
کتاب انقلاب (")	"	۱/-

درویشی کیا ہے؟ مشائخ و صوفیاء کے ایمان افروز ارشادات - قرآن و سنت سے ہم آہنگ بلیغ و نفیس توضیح مجلد سوا دو روپے۔

صحیفہ ہمام بن منبّہ حضرت ابوہریرہؓ کا مرتب کرایا ہوا قدیم ترین مجموعۂ حدیث مع تشریح۔ مکتوباتِ نبویؐ کے فوٹو بھی شامل کتاب ہیں۔ قیمت ساڑھے تین روپے۔

مقالاتِ شیخ الہندؒ وحی کی حقیقت اور ایمان دیانت کے باہمی ربط پر ایمان افروز گفتگو۔ مشہور مفسر قرآن مولانا محمود الحسن شیخ الہندؒ کے قلم سے - ایک روپیہ۔

محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح کی مستند سوانح مولانا مسعود عالم ندویؒ کے قلم سے
قیمت پونے تین روپے

محاسن اسلام اسلام کی خوبیوں پر مولانا اشرف علیؒ کی ایمان افروز تقریر - صرف ڈیڑھ روپیہ

عہد رسالت کی مقدس خواتین اپنے موضوع کی یکتا کتاب - ڈیڑھ روپیہ -

اونچی دکانیں صدیق الحسن گیلانی کے دلچسپ شہ پارے
قیمت ایک روپیہ

(۱) رہبر حج
(۲) نصیحۃ المسلمین
ہر ایک کیلئے ۸ نئے پیسے کا ٹکٹ پتہ ذیل پر بھیجکر مفت حاصل کیجئے۔
ابوالمجاہد معرفت ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب
پوسٹ اوجھیانی - ضلع بدایوں

مستقل عنوان

ملّا ابن العرب مکّی

مسجد سے میخانے تک

ذرا دیکھنا یہ کس کی تصویریں ہیں

ٹرین کسی بد مست شرابی کی طرح لڑکھڑاتی ہوئی چل رہی تھی۔ ہمارا ڈبہ ویسے تو خیر سے سکنڈ کلاس تھا، لیکن فی الحقیقت وہ مرحوم انٹر کلاس کا ایک نہایت سن رسیدہ ڈبہ تھا جسے ریلوے والوں نے شاید ہنگامی حالات کے تحت محکمۂ آثار قدیمہ سے واپس منگا لیا تھا۔ اس کی گدیاں اُدھڑی ہوئی تھیں۔ فرش میں گڑھے تھے۔ چول چول ڈھیلی پڑی تھی۔ اس کی پیشانی پر اگر ریلوے والے سکنڈ کی علامت نہ ڈال دیتے تو غالباً تھرڈ کلاس والے بھی اسے چوتھا درجہ سمجھ کر آگے بڑھ جاتے۔ فدوی کا خیال ہے کہ ایسا ایک آدھ ڈبہ ہر گاڑی میں ضرور جُڑا ہوا ہونا چاہیئے کیونکہ یہ ہمارے قومی کردار، ہماری سیاست، ہماری جمہوریت اور ہمارے سماجی اطوار کی بڑی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔

ڈبے میں اس وقت ہم چار نفر تھے۔ دو ہم دو وہ۔ ہم سے مراد تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ ملّا اور ملّائن۔ مگر "وہ" کی مراد سمجھنے میں ذرا دیر لگے گی۔ میرے لئے وہ اجنبی ہی تھے۔ ایک مرد اور ایک لڑکی۔

مرد کی عمر چالیس سے کم نہ رہی ہوگی اور لڑکی شاید بیس بائیس کی ہو۔ مرد کے مانگ بنے ہوئے بالوں میں سفیدی کا تناسب تقریباً چالیس فیصدی تھا لیکن لڑکی کے بال بے حد سیاہ اور لمبے تھے۔ لمبائی کا اندازہ اُن دو چوٹیوں سے ہو رہا تھا جو اس کے دونوں برہنہ بازوؤں پر جھول رہی تھیں۔ ہو سکتا ہے ان میں کچھ مصنوعی بال بھی شامل ہوں، لیکن آج کے زمانے میں اصلی اور مصنوعی کے چکر میں پڑنے والے احمق کہلاتے ہیں۔ میری بلا سے وہ اصلی ہوں یا مصنوعی ہر صورت میں وہ عریاں بازوؤں کے گورے پن کو نمایاں کرنے کے لئے بہت کافی تھے جیسا کہ حق ہے کافی ہونے کا۔

ایک گھنٹہ پیشتر مرد اس ڈبے میں اکیلا داخل ہوا تھا۔ وہ سوٹ کیس ہاتھ میں سنبھالے اس وقت داخل ہوا تھا جب گاڑی حرکت میں آ چکی تھی۔ ڈبے میں اس وقت صرف ہم ہی ہم تھے۔ ملّائن نے چہرے سے نقاب الٹ رکھا تھا۔ سامنا ہوا اور بھرپور ہوا گو اس کی مدت پل بھر سے زیادہ نہ رہی ہو۔ پھر نصف گھنٹے تک اس ڈبے میں اور کوئی نہیں آیا۔ اس مدت میں وہ سگریٹ پی پی کر اخبار پڑھتا رہا مگر رہ رہ کر اس کی چور نظریں ملّائن کا بھی جائزہ لے لیتیں۔ برقعہ دل کش ہو تو دعوتِ نظارہ کا کام دیتا ہے۔ ملّائن کا برقعہ سیاہ ساٹن کا تھا جس کی وضع بڑی پُرکشش تھی۔ ایسے برقعے میں اگر چڑیل بھی ہو تو دیکھنے والے تصورات کے شیش محل بنائے بغیر نہیں رہتے۔ مگر ملّائن تو چشم بد دور چندے آفتاب چندے ماہتاب تھیں۔ نہ سہی ہونٹوں پر لپ اسٹک اور جبین و عارض پر پاؤڈر کی تہہ لیکن وہ سب کچھ تھا جس نے ہمارے دور کے آرٹ، کلچر اور تہذیب و تمدّن کو جنم دیا ہے۔ جس نے ثقافت کے نوک پلک درست کئے ہیں۔ گو کہ ملّائن اب رُخ بدل کر کھڑکی سے سمٹی بیٹھی تھیں، مرد کی طرف ان کی پشت تھی، لیکن وہ اللہ کا بندہ امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

میں اندر ہی اندر اونگھتا رہا۔ نصف گھنٹے بعد ایک اسٹیشن سے چوتھا مسافر داخل ہوا اور یہ وہی لڑکی تھی جس کا تذکرہ میں ابھی کر چکا ہوں۔ وہ اکیلی ہی سوار ہوئی۔ سامان کے نام اسکے ہاتھ میں ایک خوبصورت پرس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے طائرانہ نظریں ڈالیں اور پھر ٹھٹک گئی۔ مرد بھی ٹھٹکا۔ وہ ایک دوسرے کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ دفعتاً مرد پہچان لینے کے انداز میں بولا :-

"ارے نرگس تم!"

اور لڑکی چہکی تھی — "اوہ ماسٹر صاحب آپ!"

پھر وہ خاصے گرمجوشی سے ملے تھے۔ گرمجوشی کا مطلب یہ کہ لڑکی مرد کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی اور مرد نے اس کے دونوں شانوں پر اپنے ہاتھ ٹیک کر بڑی مسرور آواز میں کہا تھا :-

"بیوٹی فل بیبی بیوٹی فل — اب تو تم بہت بڑی ہو گئیں۔"

اس کے بعد ان میں غیر مختتم گفتگو شروع ہو گئی تھی۔ معلوم ہوا کہ کئی سال پہلے لڑکی جب اسکول میں پڑھتی تھی تو یہ صاحب اس کے استاد تھے۔ اب لڑکی کالج میں پڑھ رہی ہے۔

گاڑی کے شور میں ان کی گفتگو سننا ذرا دشوار تھا۔ بعض باتیں وہ قصداً بھی دبی ہی زبان سے کہہ رہے تھے لیکن میں بلا ارادہ ہی ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا۔ بظاہر میرے چہرے کے سامنے کتاب کھلی ہوئی تھی لیکن کان اسی طرف لگے تھے اور نظریں بھی تھوڑے تھوڑے وقفے سے ادھر ہی پھسل جاتی تھیں۔

شاعروں کی منطق سے تو لڑکی کو حسین کہنا مشکل ہے۔ اس کی ناک موٹی تھی اور آنکھیں چھوٹی۔ کمر بھی اتنی پتلی نہیں تھی کہ خوردبین کے بغیر نظر نہ آسکے، لیکن ثقافتی نقطۂ نظر سے وہ سو فی صدی حسین تھی۔ چست لباس، شاندار میک اپ اور زہر شکن ادائیں۔ ان چیزوں کی موجودگی میں کون کافر اس کے حسین ہونے سے انکار کر سکتا ہے۔ وہ حسین نہ ہوتی تو مجھے کتاب بینی کا سوانگ بھی نہ رچانا پڑتا۔ کتاب ہاتھ میں لینے کا منشا یہی ملائن کو یہ اطمینان دلانا تھا کہ بھاگوان بدگمان مت ہونا۔ تمہارا سعادت مند شوہر ایسی کسی لڑکی میں دلچسپی نہیں لے سکتا جس کے ننگے بازو تمہارے برقعے پر طنز کرنے کی جسارت کر رہے ہوں۔

ہمارے اور ان کے درمیان صرف ایک خالی سیٹ حائل تھی۔ اس سیٹ کے گدّے اور پشتے کے درمیان تقریباً نصف بالشت خلاء موجود تھا۔ میں اس خلاء کو کتاب کی آڑ سے کھڑکی کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ کئی بار مجھے اسی خلاء سے یہ دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی کہ محترم استاد کی انگلیاں نیک بخت شاگردہ کی بلوریں انگلیوں اور کلائیوں پر مچل رہی ہیں۔ وہ فلم، کلچر، ثقافت اور تہذیبی ارتقاء کے موضوعات پر شارٹ ہینڈ میں گفتگو کر رہے تھے۔ لڑکی نے فر فر کئی مشہور اداکاروں کے نام لئے۔ پھر کہنے لگی :-

"ممی دلیپ کمار کی بہت مداح ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ دلیپ کے بالوں کا اسٹائل جنگ باز قوموں کیلئے پُرامن معصومیت کا بڑا مؤثر پیغام ہے"!

میں نے دُھڑ دُھڑی لی۔ لڑکی کی ممی کا دعویٰ میرے لئے فلسفے کی کڑوی گولی سے کم نہ تھا۔ مگر لڑکی نے سوچنے کا موقع نہیں دیا۔

"اور ڈیڈی کو وجینتی مالا بہت پسند ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وجینتی کا ہر رقص سماج کی کسی نہ کسی دُکھتی رگ پر انگلی رکھتا ہے اور اس کے پیروں کی ہر جنبش ہمارے جہالت زدہ سماج کے ان پھوڑوں کی نشاندہی کرتی ہے جو زندگی کی جدید قدروں کو اپنائے بغیر کبھی اچھے نہیں ہو سکتے"۔

"ویری نائس۔ تمہارے ڈیڈی نے بڑی گہری بات کہی" — ماسٹر صاحب لڑکی کی انگلیوں پر دباؤ دیتے ہوئے بولے "سچا آرٹ ہمیشہ صحت مند رجحانات کی نمائندگی کرتا ہے وجینتی کا رقص، لتا کا ترنم، دلیپ کی ایکٹنگ یہ سب نئی زندگی کی شائستہ اور روشن قدروں کے ترجمان ہیں۔ ان سے ہم سماج کو سنوار سکتے ہیں۔ جہالت اور رجعت پسندی کا خاتمہ کر سکتے ہیں"۔

اس کے بعد انگریزی فلموں کی باتیں شروع ہو گئیں۔ لڑکی ان کے بارے میں بھی کافی معلومات رکھتی تھی — مگر

ماسٹر صاحب نے ایک ایسی فلم کا ذکر چھیڑا جس کے بارے میں لڑکی کو کہنا پڑا:-

"نہیں یہ فلم میں نے نہیں دیکھی۔"

"بڑی شاندار فلم ہے - اٹلی کی مشہور ڈانسر ایزوبیلا نے اس میں اپنے آرٹ کا بڑا ونڈرفل مظاہرہ کیا ہے۔"

"ایزوبیلا!" لڑکی نے پُرشوق آواز میں دہرایا "اس ڈانسر کا چرچا میں نے بہت سنا ہے مگر آج تک دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

"بیڈلک - ارے ایزوبیلا کو نہیں دیکھا تو پھر تم نے دنیا میں کیا دیکھا - اس فلم میں اس کا وہ لاجواب ڈانس بھی ہے جس کے لئے وہ دنیا بھر میں مشہور ہے۔"

"کس قسم کا ڈانس؟"

"ٹماٹوک - اک دم آرٹ فل - وہ تہہ بر تہہ کتنی ملبوسات زیب تن کرکے ڈانس شروع کرتی ہے - پھر ہر گردش میں یہ ملبوسات ایک خاص تکنک کے ساتھ ایک ایک کرکے جسم سے جدا ہوتے جاتے ہیں - رفتہ رفتہ لباس کے نام کی ایک دھجی بھی اس کے بدن پہ باقی نہیں رہتی اور کمال یہ ہے کہ لباس کو تن سے جدا کرنے کے اس تدریجی عمل میں وہ اپنے ہاتھ بالکل استعمال نہیں کرتی۔"

"آپ کا مطلب شاید یہ ہے کہ بہت ضروری ہی لباس اس کے بدن پر باقی رہ جاتا ہوگا؟"

"نہیں — ضروری کا لفظ اس موقع پر بے محل ہے ضرورت تو ایک اضافی شے ہے - ہم جاڑے میں کوٹ اور جسٹر پہنتے ہیں لیکن گرمیوں میں بش شرٹ ہی ضرورت کا مفہوم پورا کردیتی ہے اسی طرح آرٹ اور فن کے دائرے میں ضرورت کا معیار ہماری عام زندگی سے مختلف ہے۔ کیا تم نے ایلورا اور اجنتا وغیرہ کی نقاشی اور آرٹ کا حال نہیں پڑھا - وہاں سچائیاں بالکل بے نقاب ہیں - آرٹ زندگی کے سادہ اور فطری رُخ کا ترجمان ہوتا ہے اسے مصنوعی لباسوں اور پردوں سے مقید کرنا وحشیانہ تنگ دلی ہے۔ تم دیکھوگی ایزوبیلا لباس کی مصنوعی قید سے نکل ایک مقدس اور نورانی اپسرا کی شکل اختیار کرلیتی ہے - اس کے ایک ہوئے بدن سے کرنیں سی پھوٹتی ہیں اور تماشائی کچھ دیر لئے رنگین قوسِ قزح کی اُن حسین فضاؤں میں اُڑ جاتے جہاں فطرت اپنے بالکل حقیقی اور سادہ رنگ میں ہے۔"

لڑکی خاموشی سے ماسٹر صاحب کا منہ تکتی رہی اس نے اسی نوع کے لطیف نکتے کالج میں بھی ضرور سنے ہوں گے شاید اسی لئے وہ ان پر مبہوت نہیں ہوسکی

"تم یہ سُنکر خوش ہوگی کہ یہ فلم اگلے سنڈے تمھارے ہی شہر میں دیکھی جاسکتی ہے۔"

"کس ہال میں؟" لڑکی نے بے ساختہ پوچھا۔

"ہال میں نہیں - ہمارے ملک کے جاہل وبس ماندہ عوام ابھی ضبطِ نفس اور خودی کے میدان میں اتنے آگے نہیں بڑھ سکے کہ اس طرح کی فلمیں عام سنیماؤں میں دکھائی جاسکیں - اس کی نمائش رینبو نائٹ کلب کے اسٹیڈیم میں مخصوص اجازت کے تحت مخصوص لوگوں کے لئے ہوگی۔"

"پھر؟ ہماری پہنچ وہاں کیسے ہوسکے گی۔"

"اس کی فکر مت کرو - رینبو والوں سے میرے ذاتی تعلقات ہیں - سنڈے کو میں تمہارے یہاں پہنچ رہا ہوں امید ہے کہ تمھاری ممی اور ڈیڈی مجھے بھولے نہ ہوں گے۔"

"مگر وہ اس طرح کی فلمیں دیکھنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔"

"تم بہت بھولی ہو—" ماسٹر صاحب نے لڑکی کے رخسار پر بڑے پیار سے انگلیوں کا چپت مارتے ہوئے کہا "ہم ان سے یہ کب کہیں گے کہ ہم کونسی پکچر دیکھنے جارہے ہیں — ویسے یہ مت سمجھو کہ تمہارے ڈیڈی آرٹ کے بارے میں تاریک خیال ہیں - اسی کلب میں انھوں نے بڑے شوق سے ہالی وڈ کی وہ مشہور فلم دیکھی تھی جس میں دو جاسوس لڑکیوں کو ننگا کرکے کوڑے مارے گئے ہیں۔"

"نہیں!" لڑکی چونکی — "ڈیڈی اتنے نرم دل ہیں کہ ایسا منظر فلم میں بھی دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتے

"ٹھیک ہے — مگر جب کوڑے مارنے کا آغاز ہوا تھا تو انھوں نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ دونوں جاسوس لڑکیاں ننگی کرکے ستونوں سے باندھ دی جاتی ہیں پھر کئی منٹ تک اسی سیٹ پر کچھ ڈائیلاگ چلتے ہیں۔ اس کے بعد سزا کی ابتدا ہوتی ہے۔"

گاڑی ایک اسٹیشن پر رک گئی۔ ان کی باتوں کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ کوئی نیا مسافر ڈبے میں داخل نہیں ہوا۔ پھر گاڑی چلی تو ماسٹر صاحب دفعتاً مجھ سے مخاطب ہوئے:-

"مولانا آپ کے پاس ماچس ہوگی؟"

میں چونکا یا یوں کہئے کہ چونکنے کی ایکٹنگ کی۔

"جی۔ جی ہاں ہوگی — مگر آپ کیا جادوگر ہیں؟" میں آنکھیں پھیلا کر حیرت کا مجسمہ بن گیا۔

"جادوگر" انھوں نے سوالیہ نظروں سے مجھے گھورا۔

"اور نہیں تو کیا۔ آپ کو بھلا کیسے معلوم ہوا کہ میں مولانا ہوں؟"

میرے اس سائنٹفک استدلال پر پل بھر کے لئے وہ متحیر ہوئے مگر میرے چہرے سے اس وقت شاید حماقتوں کا فوارہ ابل رہا تھا۔ ان کا تحیر اگلے ہی لمحے تمسخر آمیز دلچسپی میں بدل گیا لڑکی کے چہرے پر بھی استہزائی تبسم کھیلنے لگا۔

"اوہ — دراصل مجھے قیافہ شناسی میں مہارت ہے۔ آپ کی داڑھی سوفی صدی کسی مولانا ہی کی داڑھی ہوسکتی ہے۔"

"....اوررر—" میں نے بوکھلاہٹ کے انداز میں اس طرح داڑھی کو مٹھی میں پکڑا جیسے اس کی موجودگی پر شرمندہ ہوں اب میری حماقت میں چار چاند لگ گئے تھے۔

"تعجب ہے، مولانا—" انھوں نے میرے ہاتھ سے ماچس لیتے ہوئے کہا "آپ آج بھی داڑھے اور برقعے میں یقین رکھتے ہیں۔"

"جی نہیں — میں یقین وقین کچھ نہیں رکھتا۔ میرا بس چلے تو ساری داڑھیوں اور برقعوں کو چلم میں رکھ کر پی جاؤں — مجھے ایسی لڑکیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔" میرا شرمیلا سا اشارہ نرگس کی طرف تھا۔ "مگر یہ ظالم زمانہ یہ سماج — یہ .... یہ قدم قدم پر [illegible] کرتا ہے۔"

"[illegible] کے ساتھ کون ہیں" انھوں نے درمیانی نشست [illegible] پوچھا۔ ان کی نظریں ملائن کے برقعے پر پھیل رہی تھیں۔

"میری شامت — میری پرلے سرے کی دقیانوسی بیوی"

انھوں نے ذرا سا مڑ کر نرگس کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے پھر وہ بڑی لجاجت سے بولے:

"آپ دلچسپ آدمی ہیں — اگر اجازت ہو تو ہم اِدھر آجائیں؟" ان کا مطلب درمیان کی خالی سیٹ سے تھا۔

"جی ہاں شوق سے —"

اس وقت ملائن نے ایسی خونخوار نظروں سے مجھے گھورا جن کی قہرمانی نقاب کی جالی پھاڑے دے رہی تھی۔ گھٹنے کا ایک ٹھوکا بھی میری کوکھ میں لگا لیکن اتنے ہی میں وہ دونوں پاس کی سیٹ پر آچکے تھے۔ ملائن اور بھی کونے میں سمٹ گئیں۔ ان کا بس چلتا تو اس وقت مجھے کچا ہی چبا جاتیں۔ کم سے کم زبان کے تیر تو ضرور چلاتیں، لیکن خدا بھلا کرے مولانا اشرف علیؒ کا ان کی کسی کتاب میں انھوں نے پڑھ لیا ہے کہ عورت کی آواز بھی عورت ہی ہے پس غالباً اسی لئے ایک اجنبی مرد کی موجودگی میں زبان نہیں کھول سکتی تھیں۔

"بات یہ ہے مولانا — فرسودہ اور تنگ نظر سماج کیخلاف مردانہ وار بغاوت کئے بغیر ہم اونچے نہیں اٹھ سکتے۔ ہم دونوں آپ ہی کی طرح مسلمان ہیں۔ ہمیں اسلام کی صداقت پر اٹل یقین ہے، لیکن اسلام کو بات بات میں گھسیٹ کر لانا مذہب کی توہین ہے۔ مذہب مسجد اور منارے کے دائرے کی چیز ہے۔ اسے وہیں رہنا چاہیئے۔ زمانہ ہم سے ہمہ گیر انسانی قدروں کا مطالبہ کر رہا ہے۔"

"بالکل بالکل...." میں نے زوردار تائید کی "قدریں اور تہذیب اور قیامت... نہ وہ ثقافت وغیرہ کے الفاظ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں مگر بڑی مشکل یہ ہے ماسٹر صاحب کہ بازار میں کوئی ایسی کتاب نہیں ملتی جس میں نئی تہذیب کے بنیادی اصول قواعد درج کر دیئے گئے ہوں۔ میں انھیں سیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ مسکرائے — "ارے یہ کونسی مشکل ہے۔ سب سے پہلا اور اہم اصول تو یہی ہے کہ دقیانوسی اخلاقی تصورات کو ذہن سے جھٹک دیجئے۔ یہ عورت غریب کو جانوروں کی طرح باندھ کر

رکھنا' یہ پردہ' یہ داڑھی وغیرہ وغیرہ۔ ان سب چیزوں کے بارے میں مہذب ملک کا عمل آپ کے سامنے ہے۔ عورت اور مرد کو شاید فقط ان میں بھی ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے۔ پھر یہ کہاں کی شرافت ہوگی کہ ان دونوں کے خلا ملا پر پابندیاں لگائی جائیں۔"

"ٹھیک ہے جناب، میں خود بھی بارہا اسی طرح سوچتا ہوں ۔۔۔ مگر ماسٹر صاحب ہمارا دقیانوسی سماج تو قدم قدم پر روڑے اٹکاتا ہے۔"

"سماج کے ٹھوکر مار دیجئے۔"

"ماری تھی ماسٹر صاحب۔ مگر اپنا ہی انگوٹھا ٹوٹ گیا ظالم سماج کا کچھ نہ بگڑا۔"

نرگس کھلکھلا کے ہنسی۔ ماسٹر بھی مسکرائے۔

"آپ کا مطلب؟" انھوں نے سوال کیا۔

"اب کیا بتاؤں۔ میری ایک خالہ زاد بھتیجی ہے وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ ایک مرتبہ ہم دونوں سینما چلے گئے تھے وہاں ہمیں ایک گانا بہت پسند آیا جو ہیرو ہیروئن نے گایا تھا ایک دن اس کے سب گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے تو ہم دونوں نے اسی گانے کی نقل شروع کر دی۔ اتنے میں اس کا بڑا بھائی آگیا اسے بڑا غصہ آیا۔ میں نے کہا بھائی غصہ مت کرو ہم تو فقط نقل کر رہے ہیں۔ اس پر اس نے ایک بڑی خراب بات کہی پھر وہ طیش میں آکر اپنی بہن کی طرف بڑھا۔ میں نے اس موقع پر فلم "پھول رہی سرسوں" کا ایک مکالمہ دہرا دیا ۔۔۔

۔۔۔"ظالم! تو ہمیں مار بھی ڈالے تو ہماری محبت مرنے والی نہیں۔ ہمارے خون کے ایک ایک قطرے سے ہمیشہ یہی آواز آتی رہے گی کہ محبت امر ہے محبت امر ہے۔" ۔۔۔ اس مکالمہ کو سُنکر وہ آگ بگولا ہو گیا اور پھر مجھے نہیں معلوم کتنے چانٹے اور مکّے اس نے میرے رسید کئے ہیں۔ بہت پٹ جانے کے بعد میں نے بے خیالی میں اس کے ایک گھونسہ رسید کر دیا۔ اس کے نتیجے میں اس کے سارے دانت باہر آگئے اور پھر عدالت سے مجھے ایک مہینے کی سزا ہوئی۔"

وہ دونوں ہنسے۔

"وہ آپ کی خالہ زاد بھتیجی کا بھائی یقیناً جاہل اور گنوار ہوگا۔" ماسٹر صاحب نے اس انداز میں کہا جیسے وہ سچ مچ میرے بھی ماسٹر ہوں "مہذب لوگوں میں رومانس اور ذاتی معاملات میں اس تنگدلی کا کوئی وجود نہیں۔ آخر آپ خود سوچئے، انسان کے فطری تقاضوں کے بہاؤ کو روکنا اعصاب کے لئے کس قدر مضر ہوگا۔ نئی تہذیب انسان کو اس کے پیدائشی حقوق دیتی ہے۔ آزادی دیتی ہے۔ دنیا کی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیتی ہے۔"

"زندہ باد زندہ باد" میں احمقوں کی طرح لہرایا "آپ جیسا مہذب آدمی آج پہلی بار مجھے ملا ہے ۔۔۔ جی ہاں میں اب سماج سے بغاوت کروں گا۔ فرسودہ اخلاق سے بغاوت کروں گا۔"

"یقیناً کیجئے ۔۔۔ میں مشورہ دوں گا کہ اس کی ابتداء اسی وقت ہو جائے۔" یہ کہتے ہوئے ماسٹر صاحب نے ملائن کے برقعہ پر شاید بیسویں بار نظر ڈالی تھی۔

"کیوں نرگس کیا تم بھی مولانا کو یہی مشورہ نہیں دو گی؟"

"ہاں مولانا۔ ہم سبھی کو مل جل کر تہذیب و تمدن کی زلفیں سنوارنی ہیں۔ مجھے دیکھئے۔ اکیلی سفر کر رہی ہوں۔ کون میرا کیا بگاڑ لے گا ۔۔۔"

"میں ۔۔۔ میں آپ ہی کو دیکھ رہا ہوں مس نرگس ۔۔۔ یہ آپ کے بازو کتنے دلکش ہیں ۔۔۔" یہ کہتے کہتے میں نے اس کے عریاں بازو کو انگلیوں سے چھوا۔ وہ چمک گئی۔ ماسٹر صاحب نے بھی بُرا سا منھ بنایا۔

"یہ آپ کیا کرتے ہیں ۔۔۔" نرگس ہنہنائی۔

"کیا کرتا ہوں" میں نے حیرت سے آنکھیں جھپکائیں۔ "آپ لوگ جو کچھ تعلیم دے رہے ہیں اسی پر عمل شروع کرتا ہوں ۔ کیا ۔۔۔ کیا مجھ سے آپ کا مفہوم سمجھنے میں غلطی ہوئی؟"

"نہیں نہیں" ماسٹر صاحب نے دوستانہ لہجے میں کہا "سمجھنے میں آپ نے غلطی نہیں کی۔ منشاء یہ ہے کہ نئی تہذیب میں بھی بے تکلفی کے کچھ مراتب ہیں جن میں تدریج کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ ۔۔۔ ابھی آپ اور مس نرگس میں بے تکلفی نہیں ہے۔"

"ہو جائے گی۔ ابھی میں ان سے پیار کی میٹھی میٹھی باتیں

مردوں گا تو ہو جائے گی۔ ویسے میں نے سُنا ہے کلبوں اور ڈرامے میں نئے نئے مرد نئی نئی عورتوں کے بازو میں بازو ڈال کر ڈانس کرتے ہیں۔ ابھی آپ ہی فرما رہے تھے کہ فطری تقاضوں کے بہاؤ کو روکنا اعصاب کا ستیاناس کر دینا ہے۔"

انھوں نے تشویش ناک نظروں سے مجھے گھورا۔ شاید وہ اپنی اس رائے پر نظرِ ثانی کرنا چاہتے تھے جو انھوں نے میرے بارے میں قائم کی تھی۔ میرے چہرے پر اب بھی سنجیدگی نہیں تھی شاید حماقت ہی کے طوفان اُمنڈ رہے تھے۔

"آپ لوگ عجیب ہیں۔" میں نے حیرت کے انداز میں کہا "ابھی تو فرسودہ اخلاق اور ظالم سماج سے بغاوت کا درس دے رہے تھے۔ کیا اس کا مطلب صرف اتنا ہی تھا کہ مجھے اپنی داڑھی مونڈ کر بیوی کا برقعہ نوچ ڈالنا چاہئے۔"

انھوں نے الجھن بھری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"مس نرگس!" میں لہرایا "آپ سوچئے یہ مردوں کے صبر و ضبط کو چیلنج دینے والا چست اور نیم عریاں لباس آپ نے کیوں پہنا ہے — یہ چہرے پر غازے اور سُرخی کا لیپ کیوں ہے۔ یہ آپ کے بدن سے سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو کیوں آ رہی ہے — اور ماسٹر صاحب آپ بھی سوچئے جب آپ جیسا روشن خیال انگلیوں کا فقط لمس بھی اپنی شاگردہ کے بازوؤں پر برداشت نہیں کر سکا۔ حالانکہ یہ بازو اسی لئے برہنہ کئے گئے ہیں کہ دیکھنے والے ان سے بقدرِ ظرف استفادہ کر سکیں — تو بتائیے اس غریب بھائی کو جاہل اور گاؤدی کہنے کا آپ کو کیا حق ہے جس نے فلمی گانے کی نقل برداشت نہیں کی تھی۔"

"آپ نہایت چار سو بیس معلوم ہوتے ہیں۔" ماسٹر صاحب بھنا گئے "شرم نہیں آتی داڑھی لگا کر ایسی باتیں کرتے۔"

"شرم ایک اضافی چیز ہے ماسٹر صاحب۔ آپ کو مس نرگس کے ساتھ ایزد بیلا کا ننگا ناچ دیکھتے ہوئے شرم نہیں آئے گی تو میں آخر داڑھی پر کیوں شرماؤں —

معاف کیجئے سماج کے جتنے بھی دشمن آج تک مجھے ملے ہیں وہ سب آپ ہی کی طرح نازک مزاج تھے۔ ان کی بھی یہی خواہش تھی کہ میں اپنی بیوی کا برقعہ نوچ پھینکوں — لیکن جب وہی حق میں نے استعمال کرنا چاہا جو وہ خود استعمال کرنا چاہتے تھے تو وہ بکھر گئے۔ مرنے مارنے پر تل گئے۔ کیا یہ بھی نئی تہذیب کا کوئی بنیادی قاعدہ ہے؟"

"آپ تاریک خیال ہیں۔ عیاش ہیں۔ خود غرض ہیں۔" ان کی آواز میں شعلے لپک رہے تھے چہرہ مارے تاؤ کے لبوترا ہو گیا تھا۔

"کمال ہے صاحب" میں استعجاب کی شان قائم رکھتے ہوئے بڑبڑایا "آپ ایک ہی چیز کو سیاہ بھی کہہ رہے ہیں اور سفید بھی۔ عیاشی تو نئی تہذیب کا پہلا سنگِ بنیاد ہے پھر اسے آپ تاریک خیالی کیسے کہہ سکتے ہیں۔"

ان کے چہرے پر ایسے آثار تھے کہ شاید ہاتھ چھوڑ بیٹھیں۔ مگر مجھے کوئی فکر نہیں تھا کیونکہ ان کے بازوؤں کا کس بل میں پہلے ہی تول چکا تھا۔ بہت ہوتا تو بس یہ ہوتا کہ پہلے ہی ریلے میں وہ ایک دو ہاتھ رسید کر جاتے مگر اس کے بعد انھیں سانس لینے کی مہلت بھی شاید ہی ملتی۔

دفعتاً وہ دونوں یہاں سے اُٹھ کر اپنی پہلی جگہ جا بیٹھے۔

"ڈیر ماسٹر صاحب میری ماچس؟"

انھوں نے بوکھلا کر ماچس جیب سے نکالی اور میری طرف پھینک دی۔

"آپ خفا ہو گئے جناب" میں نے لجاجت سے کہا "حالانکہ قدرے تو آپ کی شاگردی پر ہمہ تن آمادہ ہے۔"

"شٹ اپ" وہ تڑخے "خواتین کی موجودگی میں لڑائی بھڑائی شائستگی کے خلاف ہے ورنہ . . . ورنہ . . ."

"ہاں ہاں ورنہ کیا — آپ پسند کریں تو میری بیوی اور مس نرگس بیت الخلاء میں چلی جائیں گی۔ پھر آپ مجھے کھڑکی سے باہر پھینک دیجئے گا۔"

"چپ رہو" وہ حلق کے بل چیخے۔ نرگس کی آنکھوں میں خوف جھانک رہا تھا۔ ملاّئن کا ہمیر پچر شاید یکسو دس مو

وہ کتنی بار کہنی اور گھٹنے کی زبان سے مجھے خاموشی اختیار کرنے کا حکم دے چکی تھیں مگر دیوانگی کی اس رو کو میں کیا کرتا جو کبھی کبھی میری کھوپڑی پر خول کی طرح مڑھی جاتی ہے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کم سے کم ایک ٹکر ماسٹر صاحب سے ضرور ہو اور میں انھیں یہ نکتہ سمجھا سکوں کہ جبڑے پر پڑے ہوئے ایک فولادی گھونسے سے بڑھ کر سچا آرٹ کوئی نہیں۔

لیکن گاڑی ایک اسٹیشن پر رُکی اور وہ دونوں اُتر گئے اتر کر وہ کسی دوسرے کمپارٹمنٹ میں جا بیٹھے ہوں گے۔ ایک سکنڈ کلاس اسی گاڑی میں اور بھی تھا شاید اسی لئے نئے مسافر اِدھر آ بھی نہیں رہے تھے۔

اب ملائن کا گھٹا ہوا طوفان اُبلا۔ گاڑی چلتے ہی انھوں نے نقاب اُلٹ دیا۔ آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ رخسار لال بھبوکا تھے۔

"ہائے میرے اللہ۔ آپ کا دماغ آخر کس قسم کا ہے۔ سچ ایسا غیر ذمہ دار کوئی ہو۔"

"برداشت کرو میں اپنے دماغ سے خود عاجز ہوں۔"

"اب اگر وہ ماسٹر پولیس کو بلا لایا تو؟"

"ہم دونوں جیل جائیں گے۔ وہاں مفت کی روٹی ملے گی۔"

"خدا کے لئے سنجیدگی اختیار کیجئے میرا تو دل سینے سے نکلا جا رہا ہے۔"

"ہائیں ــــ یعنی جانتی ہو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے۔"

"بھاڑ میں گیا مطلب۔ مجھے خبر ہوتی تو کبھی بھی آپ کے ساتھ سفر نہ کرتی ــــ دیکھ لیجئے گا اگلے ہی اسٹیشن پر پولیس ضرور آئے گی۔"

"بلا سے آئے۔ میں تمھارے سوا دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ تمھاری ہی وجہ سے تمھارے بھیا کا بھی رعب مانتا ہوں۔"

"وہی بلا وجہ کی باتیں۔ اللہ ہی ہے جو آج عزت رہ جائے۔"

"عزت اور ذلت تو ہمیشہ سے اللہ ہی کے قبضے میں ہے بھاگوان بیچ جانو وہ دونوں خود ڈر رہے ہوں گے کہ کہیں میں پولیس کو نہ بلا لاؤں۔"

"کیوں؟"

"شاگردہ کو ننگا ناچ دکھانے کا پروگرام بنانا ابھی ہمارے پس ماندہ ملک میں لائق دست اندازی پولیس ہو سکتا ہے۔ حالانکہ داڑھی اور برقعہ ابھی تک جرم نہیں ہیں۔"

"وہ تو یہ رپورٹ کریں گے کہ آپ نے لڑکی پر دست درازی کی تھی۔"

"ہرگز نہیں کریں گے۔ انھیں کسی بکھیڑے میں پڑنے کی فرصت کہاں۔ بہت ممکن ہے وہ اپنے اپنے اسٹیشنوں تک سفر کرنے کے بجائے قریب ہی کے کسی جنکشن پر اُتر جائیں۔ ماسٹر شاگردہ کو سمجھائے گا کہ ڈیریبی یہ مولانا نہایت خبیث قسم کا انسان معلوم ہوتا ہے پتا نہیں کیا جھگڑا کھڑا کر دے آؤ ہم یہ گاڑی چھوڑ کر شہر چلیں۔ وہاں پکچر دیکھیں گے اور پھر کسی اور گاڑی سے سفر کریں گے۔"

"آپ کا دماغ تو ہر وقت آسمانوں میں اُڑتا رہتا ہے۔ میں نے تو کان پکڑے جو آئندہ آپ کے ساتھ سفر کروں۔"

(ملا زندہ صحبت باقی)

(بقیہ "چاند کے داغ" از صفحہ ۵۸)

بے سود ہوگا کیونکہ سبھی جانتے ہیں کہ یہ جماعتیں تربیت یافتہ مقررین پر مشتمل نہیں ہوتیں۔ پھر بھی یہ کھٹک ضرور رہی کہ اگر ہجرت ونصرت کے سلسلے میں عاجز کی معروضات کسی تردید کی گنجائش نہیں رکھتی تھیں تو انھیں ایک حق پرست اور عالی ظرف مومن کی طرح یہ ضرور کہنا چاہئے تھا کہ واقعی یا ہمارے دل میں اُتری (اور آئندہ ہم یہ اصطلاحیں استعمال نہیں کرینگے یا کم سے کم اتنا ہی کہتے کہ جو کچھ عامر عثمانی نے کہا ہے اسے ہم اصحاب الرائے کی خدمت میں پیش کرکے کسی نتیجے پر پہنچینگے لیکن انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ ہاں مجلس کے خاتمے پر جب عاجز نے موصوف سے بالمشافہ گفتگو کرتے ہوئے عرض کیا کہ بندے کی کسی بات سے آپ کو تکلیف ہوئی ہو تو معاف فرما دیں اور عاجز کی معروضات کے جواب میں کچھ کہنا چاہیں تو بلا تکلف کہیں۔ تب انھوں نے فرمایا کہ ہم اپنے بزرگوں تک اس بات کو پہنچائیں گے اور ان کی رائے معلوم کریں گے۔

اس طرح یہ مجلس ختم ہوئی۔ ہمارا گمان یہ ہے کہ تبلیغی دوست نے بزرگوں تک بات پہنچانے کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ فقط دفع الوقتی تھا۔ ان کے انداز سے یہ نہیں ظاہر ہوتا تھا کہ ہماری گذارشات کو انھوں نے اچھے دل سے لیا ہو۔ وعدے کا لب ولہجہ بھی جان چھڑانے ہی کا تھا۔ ایسی صورت میں کیا توقع ہو سکتی ہے کہ غلطی کی اصلاح ہو سکے گی۔ مان لو وہ صاحب اوپر تک بات پہنچا ہی دیں تو اس کی امید پھر بھی کم ہی ہے کہ ہجرت اور نصرت کی جان بخشی ہو سکے گی۔ ہمیں بعض تبلیغی دوستوں سے گفتگو کا موقع ملتا رہتا ہے۔ سچی بات ہے ان میں ہمیں وہ مہلک جراثیم پرورش پاتے نظر آ رہے ہیں جنھیں "غرورِ عجز" اور "پندارِ خاکساری" کی جڑ کہا جا سکتا ہے۔ ان میں ہم نے دوسری جماعتوں سے خصوصاً جماعت اسلامی کے خلاف ذہنی جارحیت کا احساس کیا ہے اور اس متعفن مادے کو بھی سونگھا ہے جسے فصیح اردو میں "جہل مرکب" کہتے ہیں۔

یہ باتیں تبلیغی دوستوں کو بڑی ناگوار گذرینگی۔ لیکن یہ نا گوار ...

محمود الحسینی

چاند کے داغ

بھوپال کے روزنامہ "ندیم" کے فاضل ایڈیٹر جناب محمود الحسینی اُن معدودے چند خوش نصیبوں میں ہیں جنھوں نے اگرچہ مدرسے میں دینی تعلیم حاصل نہیں کی نہ کسی معلوم حلقۂ رشد و ہدایت سے ان کا کوئی رابطہ رہا، لیکن ان کے دل و دماغ اُن فاسد و کاسد تصورات سے مسموم نہ ہو سکے جو آج ہمارے متعفن ماحول میں ہوا اور پانی کی طرح عام ہیں۔ وہ دین کے بارے میں بڑے نپے تُلے اور سلجھے ہوئے تصورات رکھتے ہیں جن کا وقتاً فوقتاً اظہار ان کی تحریروں سے ہوتا رہتا ہے

یہ اداریہ جو آپ آگے پڑھیں گے انھوں نے ندیم کی تین قسطوں میں شائع کیا تھا، لیکن ان کی دانست میں ندیم کا حلقہ چونکہ تجلی کے مقابلے میں محدود ہے اس لئے انھوں نے پسند فرمایا کہ اسے تجلی میں شائع کرائیں۔ افادیت محسوس کرکے ہم نے بھی ان کے فیصلے پر صاد کر دیا اور اب یہ فکر انگیز تحریر آپ کے مطالعہ کے لئے حاضر ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کا عنوان انھوں نے "الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن!" رکھا تھا مگر ہم نے اسے بدل دیا ہے۔ گو کہ تغیر کی اجازت خود انھوں ہی نے اپنے خط میں دی تھی، لیکن اس اجازت سے فائدہ اٹھانے کا سبب یہ نکتہ ہے کہ فی الحقیقت ان کا عنوان اپنے معنوں پر منطبق نہیں تھا۔ تبلیغی جماعت کی اختیار فرمودہ جن اصطلاحات پر انھوں نے گرفت کی ہے وہ ایسی ہی ہیں کہ ان کے الفاظ اور معانی میں بحالت موجودہ نہ صرف تفاوت ہے بلکہ بُعد المشرقین ہے۔ اختتام پر شاید ہم اور بھی کچھ عرض کریں۔

عامر عثمانی

تاج المساجد کا سہ روزہ دینی اجتماع خدا کے فضل و کرم سے اپنے تمام پروگرام پورے کرکے نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ آج کے عام دینی بے حسی کے دور میں شہری اور دیہاتی مسلمانوں کا دور دور سے آکر ایک جگہ جمع ہو جانا جب کہ وہاں ان کی دنیاوی دلچسپی کی کوئی چیز نہیں ہے۔ نہایت قابل قدر اور قابل شکر ہے۔ اس سے بعض اہم باتیں سامنے آتی ہیں۔ آنکھوں سے نظر آجاتا ہے کہ اس گئے گذرے دور میں بھی مسلمانوں کو اپنے دین سے کس قدر گہرا لگاؤ ہے۔

"ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی" اس بات پر جس قدر خدا کا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ اس کام کی بدولت منتشر مسلمانوں میں ایک مرکزیت پیدا ہو رہی ہے منتشر افراد کا ایک مرکز پر جمع ہو جانا خصوصاً مرکز دینی پر جہاں دنیا کی کوئی آسودگی نہ ہو بجائے خود بہت بڑی طاقت ہے اور اسی طاقت سے بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں۔ دیہات کے بے پڑھے لکھے مسلمانوں میں دینی شعور اور دین سے لگاؤ پیدا ہو جانا اور ان کا اس طرح ایک آواز پر ایک مرکز پر مجتمع ہو جانا اور پھر جمع مقصد کے ساتھ دور دراز علاقوں میں پھیل جانا یہ اتنی بڑی بات ہے کہ جو شاید اس طریقہ کے علاوہ جو تبلیغی جماعت

اختیار کیا ہے کسی اور طرح ممکن نہیں ہے۔
جن لوگوں کو باہر نکل کر اس طرح دینی خدمت کرنے کا موقع نہیں ملا ہے ان کو بھی اس سالانہ اجتماع کی بدولت نہایت ایمان پرور نظارے دیکھ کر سرور اور آنکھیں ٹھنڈی کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور بہت سے سوتے ہوئے دل بھی ان نظاروں کو دیکھ کر جاگ پڑتے ہیں۔ یہی چیزیں اس دعا پر مجبور کرتی ہیں کہ اللہ دین کے ان خادموں کو کامیاب اور ان کی اس جاں فشانی کو بار آور کرے اور ان کو زیادہ سے زیادہ صحیح اور اعلیٰ خدمت کا موقع دے ان کو اپنی حفاظت اور امان میں رکھے۔ ان اعلےٰ اور قابل قدر خدمات کے باوجود یہ کہنا دشوار مشکل ہے کہ اسمیں کسی اصلاح کی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی انسانی کام ہر پہلو سے بے عیب نہیں ہوسکتا۔ صحیح ارتقاء کے لئے ضروری ہے کہ حاصل شدہ خوبیوں سے زیادہ اُن خوبیوں پر نظر رکھی جائے جو ابھی حاصل نہیں ہوئی ہیں۔ اس جذبے کے تحت گہرے اخلاص اور نہایت ادب کے ساتھ دو ایک باتیں عرض کرنے کو جی چاہتا ہے اگرچہ اتنے بڑے عالموں کی خدمت میں ہم جیسے غیر عالم کی گذارش کو یہ کہہ کر رد کیا جاسکتا ہے۔ اور خود کا ضمیر بھی کچھ اسی طرح کی کیفیت محسوس کرتا ہے کہ یہ چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے۔ یا یہ کہ دریا میں اترے ہوئے غواص پر کنارے پر بیٹھے ہوئے شخص کا تبصرہ ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اخلاص اور دردمندی کسی علمی سند کی محتاج نہیں ہے۔ نہ "الدین نصیح" علماء کے لئے مخصوص ہے
ایک دینی کام میں دینی اصطلاحات کا استعمال صحیح بھی ہے اور جذبات پیدا کرنے اور صحیح اسپرٹ برقرار رکھنے کے لئے ضروری بھی ہے، لیکن اتنا ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ان اصطلاحات کو صحیح مقام پر ان کی پوری معنویت کے ساتھ استعمال کیا جائے ورنہ فائدے سے زیادہ نقصان کا اندیشہ ہے، لیکن یہاں یہ اندازہ ہوا کہ اس معاملہ میں اتنی احتیاط نہیں کی جاتی جتنی کرنی چاہئے۔ مثال کے طور پر یہاں "ہجرت" اور "نصرت" کا بہت استعمال ہوتا ہے۔

ایک جماعت تبلیغ کے لئے نکلی وہ "ہجرت" کی جماعت ہے جس کا رتبہ اعلیٰ ہے اور اس میں نکلنے والے مہاجرین ہیں دوسری جماعت اس غرض سے نکلی ہے کہ کسی مقام پر جاکر اس جماعتِ مہاجرین کا استقبال کرے تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو۔ یہ دوسری جماعت انصار کی جماعت ہوگئی اور اس کا رتبہ پہلی جماعت سے کم قرار پایا۔ یا یہ کہ جماعت میں نکلنے والے مہاجرین کے گھر والوں کا خیال رکھنا، گھر والوں سے مہاجرین کو خطوط لکھواتے رہنا وغیرہ۔
یہ سب کام نصرت کے ہیں اور یہ کام کرنے والے انصار کا لقب یا مقام پانے کے مستحق ہیں۔ اس کام پر لوگوں کو آمادہ کرنے کے لئے ہجرت اور نصرت کے الفاظ اسی طرح استعمال کئے جاتے ہیں اور حضور صلعم کے ساتھیوں اور مہاجرین و انصار کے احوال و مقامات سے اس کو اس طرح جوڑ دیا جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہ ہجرت اور نصرت بھی بالکل اسی طرح کی ہجرت و نصرت ہے۔ مثلاً فرمایا گیا کہ دیکھو، عشرہ مبشرہ تمام کے تمام مہاجرین میں تھے ہم ان دینی اصطلاحات کے اس طرح کے استعمال کے بارے میں پہلے بھی اظہار خیال کرچکے ہیں اور — تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را + گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را — کے مصداق پھر کہنا چاہتے ہیں کہ علماء حضرات سے زیادہ کون اس بات سے واقف ہوگا کہ ہجرت ایک مخصوص اسلامی اصطلاح ہے۔
داعیٔ حق صلعم جب اپنے وطن میں دعوتِ حق پیش کرتے کرتے اس مقام پر پہنچتے ہیں کہ ان کے اہلِ وطن ان کی بات سننے کے بجائے طرح طرح سے ایذا دے کر اُن کو اپنے وطن میں رہنا مشکل کردیتے ہیں اور جب وہ یہ محسوس کرلیتے ہیں کہ میرے اہلِ وطن پر حق واضح ہوکر اتمام حجت ہوگیا ہے اور آپ اپنے وطن میں رہ کر خدا کی بندگی کرنا میرے لئے امر محال ہوگیا ہے تب وہ کسی ایسی جگہ منتقل ہوجاتا ہے جہاں اس کو اپنی دعوت کے پھیلنے کا امکان بھی نظر آتا ہے اور وہاں رہ کر وہ خود بھی آزادی سے خدا کی عبادت کرسکتا ہے۔ جہاں تک انبیاء علیہم السلام کا تعلق ہے۔ ان کی ہجرت خدا کے حکم سے ہوتی ہے اور کسی مقام

سے نبی کے ہجرت کر جانے کے بعد یا تو نبیؑ اور اصحابؓ ہی کو اس قوم پر غلبہ اور تسلط عطا کیا جاتا ہے یا پھر اس قوم پر عذاب نازل ہو جاتا ہے۔

نبی کو ہجرت کا حکم اس وقت تک نہیں ملتا جبتک کہ ہجرت کے شرائط پورے نہ ہو جائیں۔ یعنی نبیؐ کے مخاطبین پر حق اس طرح واضح نہ ہو جائے کہ ہٹ دھرمی کے علاوہ کسی غلط فہمی کا امکان باقی نہ رہ جائے اور یہ کہ نبیؐ اور اصحابِ نبی صلعم کے لئے وہاں رہتے ہوئے آزادی کے ساتھ اپنے رب کی عبادت اور بندگی ممکن نہ رہی ہو۔ نظامِ دینی میں "ہجرت" کی یہ شرطیں اتنی اہم ہیں کہ ایک نبیؐ نے وقت سے پہلے ہجرت کی تو ان پر عتاب نازل ہوا۔

یہ تو ہوئی اصطلاحی ہجرت، لیکن اس کے ساتھ ایک اور چیز ہے جسے اللہ کے رسولؐ نے ہجرت فرمایا ہے۔ آنحضورؐ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ! کون سی ہجرت افضل ہے؟ فرمایا کہ تو ان چیزوں کو چھوڑ دے جو اللہ کو ناپسند ہیں! اس ارشاد سے بھی دراصل اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے جو پہلے بیان ہوا۔ اصلی مہاجر اگر ترک وطن کرتا ہے تو اس لئے کہ اس کے وطن میں قانون الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے مواقع نہیں ہیں۔ غرض یہ ہے کہ ہجرت کا ان میں سے کوئی بھی مفہوم لیا جائے۔ اس تبلیغی سفر پر وہ پوری طرح منطبق ہی نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ اس سفر کو ہو بہو وہی ہجرت قرار دے دیا جائے۔ وہ ہجرت معصیت کی دنیا سے طاعت کی دنیا کی طرف ہوتی ہے اور اس سفر میں دعوت کا مشن ہوتا ہے یا تربیت کا۔ ہماری ناقص رائے میں جس طرح کسی دنیوی غرض سے ترکِ وطن کو اور کسی خوف سے بھاگ کھڑے ہونے کو ہجرت کہنا اس اعلیٰ درجہ کی اصطلاح کا منہ چڑانا ہے۔ اسی طرح دینی رنگ میں اور دینی اغراض کے لئے ان اصطلاحوں کو استعمال کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب ہم کسی وجہ سے ان اصطلاحوں کی بلندیوں تک نہیں پہنچ پاتے یا نہیں پہنچنا چاہتے تو ان کو اپنی پستیوں میں اُتار لاتے ہیں۔ اسی طرح "نصرت" اور "انصار" کو لیجئے۔ انصار مومنین کی اس جماعت کا لقب ہوا ہے جس نے دین کی نصرت وحمایت میں دیدہ و دانستہ خود کو اور اپنے اشراف اور اطفال کو پورے عرب کی تلواروں اور معاشی مقاطعہ کے سامنے پیش کر دیا تھا چنانچہ بیعتِ عقبہ کے موقع پر رات کی مجلس میں اسلام کے ان اولین مددگاروں (انصار) نے اس نتیجہ کو اچھی طرح جانکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا۔ اس وقت جب کہ بیعت ہو رہی تھی انصار کے ایک وفد کے ایک نوجوان رکن سعد بن زرارہؓ نے اُٹھ کر کہا:۔ "ٹھیرو! اے اہلِ یثرب ہم لوگ جو ان کے پاس آئے ہیں تو یہ سمجھتے ہوئے آئے ہیں کہ یہ اللہ کے رسولؐ ہیں اور انھیں یہاں سے نکال کر لے جانا تمام عرب سے دشمنی مول لینا ہے۔ اس کے نتیجے میں تمھارے نونہال قتل ہوں گے اور تلواریں تم پر برسیں گی لہٰذا اگر تم اس کو برداشت کرنے کی طاقت اپنے اندر پاتے ہو تو ان کا ہاتھ پکڑو اور اگر تمھیں اپنی جانیں عزیز ہوں تو پھر چھوڑ دو اور صاف صاف عذر کر دو۔ کیونکہ اس وقت عذر کر دینا خدا کے نزدیک زیادہ قابل قبول ہو سکتا ہے۔" اسی طرح کی بات اس موقع پر وفد کے ایک دوسرے رکن عباس بن عبادہؓ نے بھی کہی تھی اور ان دونوں حضرات کی بروقت تنبیہات کے جواب میں تمام وفد بالاتفاق کہا تھا کہ:۔ "ہم انھیں لیکر اپنے اموال کو تباہی و بربادی اور اپنے اشراف کو ہلاکت میں ڈالنے کے لئے تیار ہیں۔" تب وہ مشہور بیعت واقع ہوئی جسے تاریخ میں بیعتِ عقبہ ثانیہ کہتے ہیں۔

اتنی سی تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اہلِ مدینہ نے کن حالات میں کیسے سخت خطرات میں کس جذبہ اور کس عزم و ارادہ سے اپنے آپ کو دین کی نصرت وحمایت کے لئے پیش کیا تھا اور بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ان کے یہ اندیشے بے جا نہیں تھے اور ان کو اس نصرت کی کیا قیمت ادا کرنی پڑی تھی تب جاکر وہ کہیں "انصار" کا معزز لقب پانے کے مستحق ہوئے جو غالباً حضرت مسیحؑ کے اس جواب سے ماخوذ ہے جو انھوں نے حضرت مسیحؑ کی پکار "مَنْ

أَنْصَارِيْ إِلَى اللّٰهِ کے جواب میں دیا تھا۔ نَحْنُ أَنْصَارُ
اللّٰهِ اور جس کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان سے
فرمایا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ
ایک طرف لفظ نصرت اور انصار کی تاریخ۔ پس منظر اور
ان کی کیفیت کو سامنے رکھیئے پھر ہجرت کی کیفیت اور اسکی
شرائط کو سامنے لائیے اور دوسری طرف یہ دیکھیے کہ چند
لوگ ذکر و تبلیغ کرتے ہیں، گھروں سے نکلتے ہیں اور دو تین دن
آس پاس کے دیہاتوں میں گذار کر دس پانچ یا سو دو سو میل
دوسرے کسی مقام پر پہنچ جاتے ہیں اور انھیں مہاجرین کے
لقب سے پکار دیا جاتا ہے چند لوگ ملکر ذکر کرتے ہوئے دس
پانچ یا سو دو سو میل دور جاکر اس جماعت کا استقبال کرتے
ہیں تاکہ اس کی حوصلہ افزائی ہو اور واپس آکر اپنے اپنے
کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں اور انھیں انصار کا معزز
لقب مل جاتا ہے اور یہ تقابل کرکے آدمی حیران رہ جاتا ہے
اور سوچنے لگتا ہے کہ اس ہجرت اور نصرت کو اُس ہجرت و
نصرت سے آخر کیا لفظی و معنوی مناسبت ہے؟ چھوٹے
اور کم درجہ کے کام کو بڑے اور اونچے درجہ کے کام سے
منسوب کرنا غلط نہیں ہے۔ لیکن یہ اسی وقت صحیح ہو سکتا
ہے جب کہ کام وہی ہو صرف درجہ اور مرتبہ کا فرق ہو
دین کی تبلیغ کرنا خود اپنی جگہ قابل قدر بات ہے۔ داعیانِ
دین کی حوصلہ افزائی کرنا بھی اپنی جگہ بڑی عبادت ہے
ان عبادات کا قابلِ قدر ہونا اور لائق اجر ہونا اس کا
محتاج نہیں ہے کہ آپ ان کو وہ حیثیت دیدیں جو ان کی
فی الاصل نہیں ہے۔ نماز کو نماز کہیئے کیونکہ وہ خود بہت
بڑی عبادت ہے، لیکن اس کو جہاد تو نہ کہیئے۔ وہ جہاد
نہیں عبادت ہے۔

علمائے کرام سب سے زیادہ اس بات سے واقف ہیں
کہ اسلامی اصطلاحات میں وہی روح اور وہی اسپرٹ
برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کو اپنے صحیح مقام
پر استعمال کیا جائے بلکہ علماء حضرات پر ہی یہ ذمہ داری
ہے کہ کسی اصطلاح میں سے اگر اس کی روح نکل گئی ہے تو وہ
اس میں وہی روح پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ بے خبر
اور ناواقف لوگ تو بعض اعلیٰ درجہ کی اسلامی اصطلاحات
کی مٹی پلید کر ہی رہے ہیں۔ مثلاً شہید جو کہ اپنے اندر
معنے کی ایک دنیا رکھتا ہے اور یہ معزز لقب
اس کو ملتا ہے جس نے سر دے کر حق کی شہادت دی اب
اس لفظ کی ایسی مرمت کی گئی ہے کہ ہر مقتول کو شہید
اور امر شہید کہا جانے لگا ہے۔ اب اگر بعض اسلامی
اصطلاحوں کا غیروں کے ہاتھوں سے "جھٹکا" ہونے
کے ساتھ بعض دوسری اصطلاحیں اپنوں اور علماء و
اتقیاء کے ہاتھوں ذبح ہونے لگیں تو فریاد کس سے کی
جائے اور بات اتنی ہی نہیں ہے کہ یہ عمل اصل حقیقت کے
اعتبار سے اصلیت و حقیقت سے خالی ہے، بلکہ تربیت
کے نقطۂ نظر سے بھی یہ مضر ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے اور
جب آپ اس معمولی چلت پھرت کو اتنا اونچا مقام
عطا کردیں گے تو بیچارے ان سادہ لوح مبلغین پر کیا
گذرے گی جنھوں نے ابھی اس راہ میں قدم رکھا ہی
ہے اور جو ابھی نفس کی مکاریوں اور انسان کی چھپی ہوئی
کمزوریوں سے واقف نہیں ہیں۔ کیا ان کی مذہبی پیاس
ان القاب سے تسکین نہیں پاجائے گی؟ اور وہ شعوری طور پر
اس فریب میں مبتلا نہیں ہو جائیں گے کہ ہم مہاجرین و
انصار ہیں، کیونکہ:-

بڑی مشکل سے ہوتی ہے برائی پر نظر پیدا
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں

کیا ہزاروں بندگانِ خدا کا جہالت اور جاہلیت
سے نکل کر فریب نفس میں مبتلا ہو جانا کوئی فائدے کا سودا
ہے؟ غالباً انھیں بے احتیاطیوں کا نتیجہ ہے کہ جو لوگ
زیادہ دنوں تک اس کام میں مصروف رہے ہیں ان میں
سے بعض اپنی اپنی خدمات کی خود قدر کرنے لگے ہیں۔ وہ
جب دوسروں کو بے عملی کا طعنہ دیتے ہیں تو ان کے تصور
میں چاہے نہ ہو لیکن تحت الشعور میں یہی ہوتا ہے کہ ہم
باعمل ہیں ایک خدا ترس آدمی دوسروں کی بے عملی نہیں بلکہ

عمل دیکھتا ہے اور اس آسانی سے دوسروں پر بے عملی کا الزام نہیں لگاتا کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ :-

"اے ایمان والو! تم لوگ ایک دوسرے کا تمسخر نہ اڑاؤ۔ ممکن ہے جس کا تمسخر کیا جائے وہ تمسخر کرنے والے سے بہتر ہو۔"

اس پہلو سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام معتدل نظام فکر وعمل ہے اور اسی توازن واعتدال اور روحانیت ومادیت کے حسین ترین امتزاج نے اُسے دنیا کے تمام افکار ونظریات اور نظامہائے حیات سے ممیز کر دیا ہے۔

اگر کسی بھی مصلحت کی وجہ سے اس توازن واعتدال کو ختم کر دیا جائے تو اسلام کی حقیقی قدر وقیمت باقی نہیں رہیگی۔ اس بات کو اس مثال سے سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ جوارش جالینوس طبِ یونانی کے خاص مرکبات میں سے ہے۔ اب اگر کوئی شخص حکیم جالینوس کے اجزاء اور ترکیب کے خلاف اس کے اجزاء میں کمی بیشی کرکے کوئی جوارش بنائے تو وہ اپنی تمام افادیت کے باوجود جوارش جالینوس بہرحال نہیں ہوگی۔ اسی مثال سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ نظامِ دینی میں ارکان کی تقدیم اور تاخیر اور ان میں کچھ کو نظر انداز کرنے اور کچھ پر غلو کرنے کے نتیجہ میں جو نتائج ظاہر ہوں گے وہ اس لئے محتاج تشریح نہیں ہیں کہ امتِ مسلمہ کے زوال اور انحطاط پر جسکی گہری نظر ہے وہ اس فکر ونظر کے فساد کے تاریخی پس منظر سے اچھی طرح واقف ہے۔

یہی وہ رجحانات ہیں جو طاقتور بن کر رہبانیت اور خانقاہیت کو جنم دیتے ہیں اور انسانی ذہن ماضی پرستی میں اس شدت کے ساتھ جکڑ دیا جاتا ہے کہ وہ صحت مند عصری تقاضوں کی نفی کرکے اس قسم کے رجعت پسندیوں کو جیتے جی آثارِ قدیمہ بنا دیتا ہے۔ اقبال نے اس بات کو اس طرح کہا ہے۔

وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہ ہو قوت وشوکت کا پیام

آخر مردِ مومن اس جہانِ بے ثبات کو غیروں کیلئے چھوڑ کر کب تک ہر قسم کی تہذیبی، تمدنی، تعلیمی اور عمرانی ترقیوں سے بے نیاز و بے بہرہ رہے گا۔ تہذیبی اور اقتصادی زبوں حالی اس نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے کہ جن محلوں میں لڑکے کثیف لباس پہنے آوارہ گردی کرتے نظر آتے ہیں اور آبادی میں غلاظت اور گندگی کے ڈھیر ہوتے ہیں اسی کے بارے میں بے تکان کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ مسلم محلہ ہے۔

مسلم سماج کی اس تباہی وبربادی اور ہلاکت کی کس پر ذمہ داری ہے؟ نباتات اور جمادات کی طرح تقدیر کی پابند اس مخلوق کے روز وشب کس طرح ٹھیک ہو سکتے ہیں؟ یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے جسے نظر انداز کر دیا جائے۔ اسلام طہارت اور پاکیزگی کو نصف ایمان قرار دیتا ہے، لیکن گندے مکانات اور میلے کچیلے کپڑے مسلمانوں کی علامت بن گئے ہیں۔ کیا اسی شان سے ہم دنیا کی ذہنی روحانی اور اخلاقی قیادت کے فرائض انجام دیں گے۔

ہمارے نزدیک یہ ایسی تشویشناک صورت حال ہے جس سے علمائے کرام کو صرفِ نظر نہیں کرنا چاہئے۔ ویسے بھی انتہائی عسرت وافلاس کو ایمان کے لئے خطرناک کہا گیا ہے جب معدہ بھوک سے سلگتا ہے تو اعتقادات اور ایمانیات کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ مذہب کے محدود تصور کو اپنا لیا گیا ہے اور تمام محنت، کاوش اور کوشش کا ماحصل یہ ہے کہ زندگی کے ایک خاص شعبہ میں تقویٰ کی بہار آجائے۔ عبادات اور معاملات کو ہم آہنگ بنانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جا رہی۔ یہی وجہ ہے کہ بنیادی تبدیلی کے بجائے جزوی اور وقتی تبدیلی رونما ہو رہی ہے اور ایک شعبہ میں کچھ اصلاح ہو رہی ہے تو دوسرے شعبوں میں تخریب کی برہم زنی کا یہ عالم ہے کہ ہر طرف اس کی ہی قہرمانی نظر آتی ہے

ہم چاہیں گے کہ زندگی کو ناقابلِ تقسیم وحدت سمجھ کر ہمہ جہتی ترقی کا لائحہ عمل مرتب کیا جائے ورنہ ہندوستان میں پست اقوام کی تعلیمی، تہذیبی اور اقتصادی ترقی سے جو خلا پیدا ہو رہا ہے اُسے مسلمان پُر کریں گے۔ کاش مسئلہ کے

اس پہلو کی طرف بھی ہمارے علمائے کرام غور و خوض کرتے تب انھیں معلوم ہوتا کہ بگاڑ کے سوتے کہاں سے اُبل رہے ہیں اور طاغوتی طاقتیں کس طرح موجودہ دور کے علمی نظریات سے مسلح ہیں اور ظاہر ہے کہ باطل کی نئی اقسام کو اچھی طرح سمجھے بغیر اصلاح کا جو نقشہ مرتب کیا جائے گا وہ صحیح نہیں ہوگا انسانی ذہن نے اتنی ترقی تو کرلی ہے کہ وہ اپنے ہی ہاتھ سے تراشے ہوئے اصنام کو قاضی الحاجات نہیں سمجھتا لیکن مختلف نظامہائے فکر کی صورت میں جو "آذری تہذیب" انسانی فکر و نظر کے ساتھ اعمال پر محیط ہوتی جارہی ہے۔ جبتک اس سے واقفیت نہ ہو اسلام اور ان باطل ادیان کے تقابلی مطالعہ کے ذریعہ ہدایت و گمراہی کے فرق کو واضح نہیں کیا جاسکتا۔ جدیدیت کا مزاج ہے کہ بات کو نہیں سمجھنی اور اس کی تفہیم کے لئے منطقی استدلال اور عقلیت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

اس صورتِ حال کا مقابلہ صرف اسی طرح کیا جاسکتا ہے کہ نئی نسل کو نئے افکار و نظریات کی ذہنی غلامی سے نجات دلائی جائے اور اسلام کو اس کی حقیقی شکل و صورت میں پیش کیا جائے۔

تجلّی

فاضل مدیر ندیم کا پرسوز اور فکر انگیز اداریہ کسی تبصرے یا اضافے کا محتاج نہیں ہے لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ ابھی اپریل کے پہلے عشرے میں راقم الحروف کو خاص اسی موضوع پر مختصر سی تقریر کرنی پڑی۔ اس کا تذکرہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔

تقریر بجائے خود ایک فن ہے جو مشق و تمرین چاہتا ہے ہم اس میدان کے مرد کہاں لیکن آقائے گونگا بھی نہیں پیدا کیا ہے اس لئے ضرورت متقاضی ہو تو قلم کی طرح زبان بھی بری بھلی چل ہی جاتی ہے۔

غالباً سات آٹھ افراد پر مشتمل ایک جماعت "علی مسجد" میں آئی ہوئی تھی۔ یہ ہمارے محلے کی مسجد ہے۔ مغرب کی جماعت کے بعد ایک تبلیغی بزرگ نے اعلان فرمایا کہ سب لوگ سنن و نوافل کے بعد ذرا رُک جائیں کچھ عرض کرنا ہے۔ پھر کچھ دیر بعد انھوں نے کھڑے ہو کر حاضرین سے کہا کہ عشاء سے ایک گھنٹہ قبل ہمیں محلے میں گشت کرنا ہے آپ حضرات اس میں ہمارے ساتھ شریک ہوں۔

یہ ارشاد اگر اتنا ہی مختصر ہوتا تو گنجائش کلام نہ تھی لیکن اس کے ساتھ انھوں نے کئی منٹ تقریر کی اور اس میں مکرر سہ کرر وہی ہجرت اور نصرت کی اصطلاحیں استعمال کیں جن پر مدیر ندیم نے تنبیہ کی ہے۔ اپنے سفر کو وہ ہجرت قرار دے رہے تھے اور اُس اعانت کو جو اہلِ محلہ گشت میں شریک ہونے کی صورت میں فرمائیں گے نصرت۔ ان اصطلاحوں کو چند منٹوں میں کئی بار دہرانا اور برملا دہرانا اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ یہ جماعت کے حلقوں میں چل نکلی ہیں اور ان کا مصدر و منبع عام شرکاء کا دماغ نہیں ہے بلکہ وہ اُوپر کا حلقہ ہے جو سربراہی کی خدمات انجام دے رہا ہے

ہمیں مجبوراً اس پر آمادہ ہونا پڑا کہ جب عشاء کے بعد یہ حضرات محفل وعظ جمائیں تو ہم ان اصطلاحوں کے بارے میں دلسوزی کے ساتھ تنبیہ کا فریضہ ادا کریں۔

ایسا ہی ہوا۔ جب عشاء بعد نمازی مجلس کی شکل میں بیٹھ گئے اور ایک بزرگوار نے وعظ کا آغاز کرنا چاہا تو ہم نے عرض کیا کہ ہمیں بھی کچھ کہنا ہے۔ اس پر وہ ٹھہر گئے اور ہم نے کھڑے ہو کر کلماتِ ماثورہ کے ساتھ اپنی معروضات پیش کردیں۔ ان معروضات کو تحریر کا جامہ اس لئے پہنانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان میں چند دلائل بھی ہیں جن پر غور و فکر کی دعوت ہم نے مخاطبین کو دی تھی اور اب بھی یہ دعوت سارے ہی افرادِ جماعت کو۔ خصوصاً اس جماعت کے رہنماؤں کو پیغام التفات دینے کے لئے ذیل کی سطور میں حاضر ہے۔

ہم نے جو کچھ کہا اسے تقریر ہی کے انداز میں لکھے دیتے ہیں تاکہ نقل مشابہ اصل کا تقاضا پورا ہو جائے:-

حضرات!

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے کچھ بھائی صرف

رضائے الٰہی کی خاطر دور سے چل کر ہمارے پاس آتے ہیں۔ یہ اربابِ سعادت ہیں اور جس جماعت سے ان کا رشتہ ہے اگرچہ بندہ اس سے بہت زیادہ واقف نہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہے کہ یہ ایک بہت بڑے بزرگ مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی ساختہ پرداختہ ہے جنھیں اگرچہ آنکھ سے دیکھنے کی سعادت بندے کو نصیب نہیں ہوئی لیکن جس طرح خدا کو آنکھوں سے نہیں دیکھا عقل سے پہچانا ہے اسی طرح شنیدہ روایات اور ممدوح کے مکتوبات کے مطالعے سے عاجز ان کی بزرگی میں یقین رکھتا ہے۔ ہمارے یہاں بدقسمتی سے یہ تعصب اور تنگ نظری بہت عام ہوتی جارہی ہے کہ اپنے سلسلے اور حلقے والے بزرگوں کو تو بہت اونچا سمجھا جاتا ہے لیکن باہر کے بزرگوں کو اس نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہ بہت بری بات ہے اور بندہ اس کا بالکل قائل نہیں ہے اولیاء اللہ کہیں کے بھی کسی بھی حلقے اور سلسلے کے ہوں ان کی عظمت کو کھلے دل سے تسلیم کرنا چاہئے بشرطیکہ ان کے سلوک و طریقت میں بدعت و معصیت کے طور طریق شامل نہ ہوں۔

دوستو! — میری نگاہ میں تبلیغی جماعت کا کام بلاشبہ کارِ خیر ہے اور میں نے تجلی میں ہر موقعہ پر اس کی واجبی افادیت کو برملا تسلیم کیا ہے۔ لہٰذا جو کچھ میں عرض کرنے والا ہوں اسے مخالفت کے رُخ سے نہ لیا جائے بلکہ میری معروضات دراصل اس مجبوری پر مبنی ہیں کہ میں نے دارالعلوم میں دین کا علم پڑھا ہے اور قرآن و حدیث میں آیا ہے کہ ایک عالم اگر ضرورت پیش آجانے کے باوجود علم کو چھپاتا ہے تو اس سے اس بخل اور غفلت کا حساب لیا جائے گا لہٰذا میں مجبور ہوں کہ اُن ارشادات کے بارے میں جو میرے ایک محترم مہمان کی زبان سے نماز مغرب کے بعد صادر ہوئے تھے وہ تنبیہ پیش کردوں جس کا تقاضا علم کرتا ہے۔

آپ حضرات جانتے ہیں کہ ہر لفظ اور ہر اصطلاح کے کوئی متعین معنی ہوتے ہیں — ہمیں اپنے استعمال میں ان متعین معنوں کا لحاظ لازماً کرنا چاہئے۔ تبلیغی سفر اور گشت وغیرہ بے شک کارِ خیر ہے اس کے مقدس ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن جس طرح حج کا نام نماز اور نماز کا نام روزہ نہیں رکھا جاسکتا اسی طرح اس سفر کو سفرِ ہجرت کا نام دینا اور اعانت کرنے والوں کو "انصاری" بنادینا الفاظ کا بڑا غلط اور بے محل استعمال ہے۔ آپ حضرات خوب جانتے ہیں کہ ہجرت کیا شے ہے اور انبیاء علیہم السلام کے کن اسفار پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ ایک نبی پر جب چین کی نیند حرام کردی جائے۔ اس کی دعوت کے آگے جبر و ظلم کی دیواریں کھڑی کردی جائیں، اسے ستایا جائے عبادت سے روکا جائے اور اس کی زبان پر تیغ و سناں کے تالے ڈالنے کی بھرپور جد و جہد کی جائے اس وقت اللہ کے حکم سے وہ اور اس کے پیرو اپنا گھر بار چھوڑ کر کسی دوسری بستی کی راہ لیتے ہیں اور مقصود اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ جو دعوتِ حق ان کی زندگی کا مشن ہے اس کے لئے سازگار فضا تلاش کریں اور اس تلاش میں گھر بار دھن دولت سب پر اس طرح لات ماردیں گویا وہ اپنے مشن کے مقابلہ میں ساری دنیا کی دولت کو ہیچ سمجھتے ہیں۔

یہ تھی ہجرت۔ اس کا انحصار صرف نبوت ہی میں نہیں۔ امت میں بھی جو افراد یا گروہ دعوتِ حق کو اپنا مقصدِ زندگی بنا کر چلیں گے اگر انھیں اسی نوع کی شدید مخالفتوں کا سامنا پیش آئے اور ان پر بھی اہلِ بستی جبر و تشدد کے پہاڑ توڑنے لگیں تو ان کے لئے بھی اپنے گھروں کو چھوڑ کر کسی موزوں جگہ چلا جانا ضروری ہو جائے گا اور اس سفر کو سفرِ ہجرت کا نام دیا جائے گا بشرطیکہ یہ گریز و فرار پر مبنی نہ ہو بلکہ اقامتِ دین ہی کا جذبہ اس کا محرک اور محور رہے۔

اور نصرت کیا تھی۔ یہ بھی آپ حضرات سے پوشیدہ نہیں، جن اہلِ مدینہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہؓ کو سہارا دیا تھا انھوں نے درحقیقت اپنے آپ کو کفار و مشرکین کی تلوار کے آگے رکھدیا تھا۔ وہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ان چند مسلمانوں کو پناہ اور مدد دینے کا مطلب پورے عرب کو اپنا دشمن بنالینا ہے لیکن یہ سب دیکھتے اور سمجھتے ہوئے بھی انھوں نے آغوشِ محبت پھیلا دیا، اہلِ ایمان کو سر آنکھوں پر لیا اور حق کی محبت کے قدموں میں اپنی پوری

کائنات رکھ دی۔ یہ معمولی بات نہیں تھی۔ بڑے دل گردے کا کام تھا۔ پھر اپنے اپنے اموال میں انھوں نے جس دریا دلی کے ساتھ مہاجرین کو برابر کا شریک بنایا تھا وہ بھی تاریخ میں آپ اپنی مثال ہے۔ یہی لوگ انصاری کہلاتے اور آپ جانتے ہیں کہ قرآن کس دل گداز اور وجد انگیز لہجے میں مہاجرین و انصار کی تعریف کرتا ہے۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

تو بزرگو اور بھائیو! ہجرت کسی ایسے پُرامن سفر کا نام نہیں ہے کہ آپ دو چار دن یا مہینے کے لئے بال بچوں کے رزق کا انتظام کر کے نکلیں اور سو دو سو یا ہزار دو ہزار میل چل پھر کر بہ اطمینان گھر لوٹ آئیں۔ نہ نُصرت اس تفریح نما اعانت کا نام ہے کہ دس بیس اہلِ محلہ آپ کے ساتھ کچھ دیر گشت کر آئیں یا آپ کے جلسۂ وعظ کی رونق بڑھا دیں یا آپ کے التماس پر چلّوں کے لئے نام لکھوا لیں۔ نُصرت اور ہجرت دو عظیم اصطلاحیں ہیں جن کا استعمال اس طرفہ ہجرت و نصرت پر کرنا دین کے ساتھ مذاق اور مہاجرین و انصار کی جلالتِ شان کے ساتھ تمسخر کرنا ہے۔ آپ علمی پہلو سے سوچئے۔ جب مکہ فتح ہو چکا تو اللہ کے رسولؐ نے فرمایا لا ھجرۃ بعد الفتح۔ فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے۔ اگر اِدھر اُدھر تبلیغ کی خاطر جانے آنے کو بھی "ہجرت" کہنا جائز سمجھا جا سکتا تو کیا حضورؐ کا مطلب یہ ہوگا کہ اب فتح مکہ کے بعد تبلیغ ہی کا سلسلہ ختم ہے؟ ظاہر ہے کوئی احمق بھی یہ مطلب نہیں لے سکتا۔ تبلیغ کے لئے گھروں سے نکلنا تو ہر زمانے میں مامور و مستحسن ہی رہے گا اور فتح مکہ کے بعد صحابہؓ فرداً فرداً بھی اور جماعتیں بنا کر بھی دور دور تبلیغ کے لئے جاتے تھے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ ایسے تبلیغی سفر "ہجرت" نہیں کہلائے جا سکتے ورنہ حضورؐ کے مذکورہ ارشاد کا مفہوم ہی کچھ نہ رہے گا۔

علاوہ ازیں محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ نے بے شمار سفر کئے ہیں۔ ان کے اسفار دنیاوی نہیں تھے بلکہ وہ احادیث کی تلاش میں گھروں سے نکلے تھے۔ آج کل کی طرح نہ وسائلِ سفر اتنے فراواں تھے نہ راستے ہی اس درجہ مامون تھے۔ سڑکیں تک کمیاب تھیں۔ ریتیلے اور سنگلاخ راستوں میں مہینوں وہ مشقتیں اٹھاتے ہوئے کٹھن منازل طے کرتے تھے اور مقصود تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات جمع کرنا۔ اللہ اکبر کتنا بلند مقصود۔ ان کے یہ اسفار دراصل بڑے مقدس اسفار تھے۔ جب تک حشر نہیں برپا ہوتا ان بزرگوں کو ہر طالب حدیث اور ہر عاملِ دین کے فعل و عمل سے ثواب کا حصہ پہنچتا رہے گا۔ انھوں نے طلب حدیث میں جو مشقتیں اٹھائی ہیں ان کا تصور بھی آج کی تبلیغی جماعتیں نہیں کر سکتیں۔ لیکن اس کے باوجود ان حضرات نے اپنے سفر کو ہجرت کا نام نہیں دیا، بلکہ "رحلت" کی اصطلاح استعمال کی اور پورے چودہ سو برسوں میں کسی بھی امام، عالم، مجتہد، شیخ اور فقیہ نے عام قسم کے تبلیغی اسفار کو ہجرت کا نام نہیں دیا پھر کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ ہم جو نہایت اطمینان سے چند روز کے لئے مامون راستوں اور مامون قریوں میں تبلیغ کرنے نکلتے ہیں اور جب جی چاہے بہ اطمینان گھروں کو لوٹ آتے ہیں اپنے سفر کو "ہجرت" کا نام دے سکیں۔ اسی طرح "نصرت" کی اصطلاح ایسے تعاون کے لئے درست نہیں جس کو ادنیٰ سی بھی نسبت انصار رضی اللہ عنہم کے ایثار سے نہ ہو۔

بھائیو اور بزرگو!

یہ جو کچھ میں نے کہا ہے تبلیغی جماعت کی مخالفت میں نہیں کہا بلکہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ازراہِ اخلاص و اخوۃ کہا ہے۔ اس لئے کہا ہے کہ مجھ پر کتمانِ علم اور حق پوشی کا الزام نہ آئے۔ اگر میری معروضات میں کوئی علمی و عقلی نقص ہے تو میرے تبلیغی دوست ضرور اس کی نشاندہی فرمائیں میں ان کی جگہ بیٹھوں گا اور وہ میری جگہ تشریف لا کر معقولیت کے ساتھ میرے قصور اور اپنے اختیار کردہ طرزِ عمل کی صحت کا اثبات فرمائیں۔ مقصود مناظرہ نہیں ہے بلکہ میں یقیناً ٹھنڈے دل سے ان کے فرمودات سنوں گا اور رہنمائی حاصل کرنے میں دریغ نہیں کروں گا۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

تقریر ختم ہوئی۔ اس کے بعد ایک تبلیغی بزرگ نے کلمۂ طیبہ پر تقریر فرمائی لیکن عاجز کی معروضات سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ ان کی تقریر کے خام پہلوؤں پر اظہارِ رائے کر

(باقی بر صفحہ ۵۰)

نقد و تبصرہ — تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنے ضروری ہیں — عامر عثمانی

کھرے کھوٹے

فتاویٰ ستاریہ

سائز ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۲۲۴ کتابت وطباعت کام چلاؤ۔ کاغذ رف، قیمت مجلد چار روپے شائع کردہ :- مکتبہ سعودیہ۔ حدیث منزل کراچی

یہ کتاب اہل حدیث عالم مولانا الحافظ الحاج ابو محمد عبد الستار دہلوی کے ان فتاویٰ کی جلد اول ہے جو وقتاً فوقتاً "صحیفہ اہل حدیث" نامی پرچے میں شائع ہوتے رہے ہیں

موٹی سی خامی اس کی یہ ہے کہ ترتیب و تبویب کے مروجہ طرز کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ ایک موضوع کے مسائل دوسرے موضوع میں خلط ملط ہیں جسکی وجہ سے قاری کے لئے مطلوبہ مسئلہ نکالنا آسان نہیں۔

کسی کتاب فتویٰ کو شروع سے آخر تک پڑھنا ظاہر ہے تبصرہ نگار کے لئے بہت دشوار ہے تبصرے کی خاطر ہم نے اس کے متعدد مقامات دیکھے اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ صرف اہل حدیث ہی اس سے فائدہ اُٹھا سکیں گے۔ اہل حدیث بھی شاید سب مستفید نہ ہو سکیں بلکہ زیادہ تر وہی افراد مستفید ہوں گے جو ایک طرف ژرف نگاہی سے محروم ہوں دوسری طرف مولانا عبد الستار صاحب کے علم و فہم پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکیں کوئی شک نہیں کہ سیکڑوں فتاویٰ پر مشتمل اس مجموعے میں کتنے ہی فتوے ایسے بھی ہیں جن میں صاحب فتویٰ نے صحیح شرعی موقف کی ترجمانی اور تائید سلیقے کے ساتھ کی ہے اور عرق ریزی و کاوش میں بھی سعی بلیغ فرمائی ہے لیکن کتنے ہی فتاویٰ اس نوع کے ہیں کہ انہیں پڑھ کر دل دھک سے رہ جاتا ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ ایسی کچی اور بے تہہ باتیں ایک شیخ الحدیث کے قلم سے کیسے نکلیں۔ مثلاً اس سوال کے جواب میں کہ بے نمازی کی نماز جنازہ جائز ہے یا نہیں۔ وہ بڑے شد و مد سے چار پانچ صفحات لکھ ڈالتے ہیں کہ ہرگز جائز نہیں وہ کافر ہے۔

ہمیں نہیں معلوم کہ دیگر علمائے اہل حدیث کا بھی یہی مسلک ہے یا وہ اس سے اختلاف رکھتے ہیں ہر صورت میں یہ مسلک اس سطح بینی اور افلاس تفقہ کی نمایاں مثال ہے جو اہل حدیث دوستوں کے فتووں میں عموماً پایا جاتا ہے بظاہر صاحب فتویٰ نے اپنے فتوے کو کافی احادیث اور آیات سے مزین کیا ہے لیکن عطار اور حکیم میں فرق ہے۔ حضور کے ارشاد مبارکہ کو اگر ایسی ہی سطحیت اور عجلت کے ساتھ استعمال کر لیا جائے تو مسلمان کے "خارجی اور معتزلی" بننے میں ذرا بھی دیر نہیں لگے گی۔ آخر حضور ہی نے تو کہا ہے کہ جس میں دیانت نہیں اس میں ایمان نہیں۔ جو پڑوسی کے لئے "خطرہ" بن جائے وہ مومن نہیں جس نے چوری کی یا زنا کیا وہ عالم ارتکاب میں ایمان سے نکل گیا۔ پھر تو خوارج کی طرح ان سب کو کافر کہئے۔ سخت حیرت ہے کہ عمل اور عقیدے کے واضح فرق کو نظر انداز کر کے فتویٰ دیا جاتا ہے حالانکہ جن کتابوں میں ترک صلوٰۃ کو "کفر" کہا گیا ہے انہی کتابوں میں حضور کا یہ ارشاد بھی موجود ہے کہ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا وہ جنت کا حقدار ہو گیا۔ حضور کے ارشادات کا منشاء اور غایت سمجھے بغیر فقط سطح بینی کے ساتھ یہ فتویٰ لگا دینا کہ بے نمازی کی نماز جنازہ جائز نہیں تفقہ فی الدین کے فقدان اور ایمان و عمل کی حقیقت سے بے خبری کی بہت بھونڈی مثال ہے۔ حد ہے کہ جو لوگ بالکل تارک نماز نہیں بلکہ صرف پابندی میں متساہل ہیں انہیں بھی مفتی صاحب نے کافر بنا چھوڑا۔ فرمایا گیا کہ جو لوگ نماز پڑھتے رہتے ہیں اور پھر چھوڑ دیتے ہیں وہ چھوڑنے کے وقت کافر ہو جاتے ہیں۔ ان کی بھی نماز جنازہ اس وقت جائز ہے جب یہ تحقیق ہو جاوے کہ مرض الموت سے قبل انہوں نے توبہ کر کے نماز کی پابندی شروع کر دی تھی اور مرتے دم تک پابند رہے یہ تحقیق نہ ہو تو انہیں بے نماز پڑھے ہی کافروں کی طرح دفن کر دیا جائے گا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

دوسری مثال یہ ہے کہ ایک شخص نے پوچھا زید نے غصہ میں اپنی منکوحہ کو طلاق دیدی یہ طلاق ہوئی یا نہیں جواب دیا جاتا ہے کہ نہیں ہوئی اور دلیل میں ایک حدیث بے سوچے سمجھے بغیر پیش کر دی جاتی ہے کہ طلاق کے موضوع پر اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں ایک ذمہ دار عالم کو ان سب کی روشنی میں طے کرنا چاہئے کہ غضب سے حضورؐ کی مراد کیا تھی۔ مگر وہی تفقہ کا فقدان کہ غضب کے معنے مجرد غصے کے لے لئے اور فتویٰ داغ دیا۔ کوئی پوچھے کہ طلاق خوشی اور محبت میں کب دی جاتی ہے اگر ایسے ہی بے تہہ اور مغالطہ انگیز فتوی پر عمل کیا جانے لگے کہ۔

"شرع محمدی میں جو طلاق حالت غصہ و غضب میں دی جائے اس کا کوئی اعتبار نہیں،، ص۵۳

تو قانون شرعی کا قصہ تمام ہوا اور ہر شخص کے لئے دروازہ کھل گیا کہ طلاقیں دیا کرے اور بیویاں جوں کی توں اس کے تصرف میں رہا کریں۔

دو عیب اہل حدیث بزرگوں کے فتوی میں عموماً نظر آتے ہیں۔ ایک یہ کہ جن روایتوں سے وہ استدلال کریں گے ان کے بارے میں کوئی فنی نقص ان کے نزدیک اہمیت نہیں رکھے گا لیکن جن روایات سے احناف استدلال کریں گے ان کا فنی نقص وہ کرید کرید کر لائیں گے اور اسے اندارج کر کے دکھائیں گے۔ دوسرا یہ کہ صحابہ کا تعامل اور تابعین و ائمہ کا فکر و عمل ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ بس روایت دیکھ لیں گے اور یہ تفحص نہیں کریں گے کہ صحابہ نے اسکا کیا منشاء سمجھا تھا اور ائمہ و فقہاء نے علم و عقل کے کن قوی تقاضوں پر اس کا کیا مفہوم معین کیا ہے۔ رکعات تراویح، طلاق ثلاثہ، فاتحہ خلف الامام جیسے مسائل میں ان کا موقف کھلے طور پر اس بنیادی کجی کی نشاندہی کرتا ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم کے فکر و عمل پر انہیں شایان شان بھروسہ نہیں حالانکہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ عبادات کے باب میں صحابہ سے زیادہ کوئی قابل اعتماد نہیں اور قانون سازی کے باب میں ان جلیل القدر ائمہ سے بڑھ کر کسی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا جو بیدار ذہنی خلوص و خشوع، استحضار اور ژرف نگاہی کی خصوصی اہلیتیں لیکر دنیا میں آئے تھے اور پوری پوری عمریں اسی نازک ترین کام میں لگا کر دنیا کو فکر و تفقہ کا ایک عظیم سرمایہ دے گئے۔

بدعات کی مذمت میں ہم بھی اہل حدیث سے پیچھے نہیں ہیں لیکن مقصد میں اگر کسی امر مباح کو بدعت بنا دینا ظلم ہے۔ سائل نے پوچھا کہ اکثر مدرسوں اور اسکول یا عدالت وغیرہ میں متعلم واسطے ادب معلم و افسر وغیرہ کھڑے ہوتے ہیں شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ جواب دیا گیا کہ کسی کے لئے ادباً و تعظیماً قیام کرنا سوائے ذات باری کے شرک ہے کیونکہ یہ خاصہ خدا ہے وقوموا للہ قانتین۔ اس کے بعد حضور کی وہ حدیث نقل کی جس میں تعظیماً کھڑے ہونے کو منع فرمایا گیا ہے۔

حالانکہ حدیث ہی میں بنی قریظہ کے واقعے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اذن بھی منقول ہے کہ قوموا الیٰ سیدکم۔ اپنے سردار کی تعظیم کیلئے کھڑے ہو جایا کرو یہ روایت ضعیف بھی نہیں ہے بلکہ حافظ ابن حجر اور حافظ سیوطی رحمہما اللہ نے تو اس پر میلاد والے قیام کو بھی جائز قیاس کر لیا ہے۔ حالانکہ یہ قیاس تفقہ کی کمی کا ثمرہ ہے کیونکہ میلاد والے قیام کا تعلق محض ایک امر موہوم اور خیال و تصور سے ہے حالانکہ حدیث مذکورہ میں واقعات کی دنیا کی گفتگو ہے۔ تاہم یہ تو معلوم ہوا کہ جہاں قیام کی مخالفت کرنے والی ترمذی کی حدیث صحیح ہے اسی طرح یہ اذن دینے والی روایت بھی معتبر ہے۔ پھر اس تضاد کو کیسے رفع کیا جائے؟ —— اسی مرحلہ پر فقیہ اور غیر فقیہ میں امتیاز ہو جاتا ہے۔ ابتداءً جب صحابہؓ میں توحید رچی بسی نہیں تھی تو عجمیوں جیسے قیام تعظیمی کو بھی اسی طرح منع کیا گیا جس طرح زیارت قبور کو منع کیا گیا تھا۔ پھر جب توحید رچ بس گئی۔ خطرہ نہیں رہا کہ قیام کی راہ سے ذہن وادی شرک میں جا پہنچے تو اسی طرح اجازت دیدی گئی جس طرح زیارت قبور کا اذن عطا فرمایا گیا پھر بھی اگر کوئی مفتی آج یہ کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی بزرگ یا حاکم کی تعظیم کیلئے کھڑے ہو جانے والے مسلمان کے ساتھ سلام اور مصافحہ ترک کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ مرتکب شرک ہے تو اس کے سوا کیا کہا جائے کہ ایسے مفتی کو فتوے دینے کے بجائے کوئی ایسا شغلہ اختیار کرنا چاہئے جس میں فکر و تفقہ کی زیادہ ضرورت نہ ہو بلکہ محض مکھی پر مکھی مارنے سے کام چل جایا کرے۔

سوال ہوا کہ عورتوں کا مسجدوں میں پنج وقتہ نماز یا نماز جمعہ کے لئے آنا جائز ہے یا نہیں۔ جواب دیا کہ جائز تو ہے مگر زیب و زینت کے ساتھ نہیں، جواب لکیر پیٹنے کی حد تک صحیح ہے لیکن زمانے کے حال سے باخبر مفتی کو اس کا جواب اور طرح دینا چاہئے تھا۔ فتوے سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ اگر عورتیں زیب و زینت کے بغیر مساجد میں تک

جماعت ہوا کریں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے ــــ حالانکہ ہمارے زمانے میں عورتوں کا بغیر زیب و زینت بھی مساجد میں قدم رنجہ فرمانا اور جماعتوں سے نمازیں پڑھنا جائز نہیں ہے۔ کسی خاص موقع پر استثناء تو ممکن ہے لیکن عام شرعی قاعدہ ہمارے زمانہ میں لازماً یہی بنے گا کہ عورتوں کو اس سے روکا جائے۔ کیا نہیں دیکھتے کہ جب ہیضے وغیرہ کی وبا پھوٹ نکلتی ہے تو محکمۂ صحت امرود اور پھونٹ جیسے پھلوں کی ممانعت کر دیتا ہے حالانکہ اصلاً یہ پھل شوق سے کھائی جانے والی نعمتوں میں سے ہیں تو عورتوں کے مساجد میں آکر نماز پڑھنے کا وہ عمل جو حضور ؐ کے دور میں رائج تھا کیوں آج مستحق ممانعت نہیں ہو جائے گا جبکہ عیش پرستی، لذت پسندی، فسق جنسی بے راہ روی، آخرت سے لاپروائی، خدا سے بے خوفی اور فحاشی و بے حیائی معاشرے میں وبا کی طرح پھیل گئی ہو۔

سوال ہوا کہ ننگے سر نماز پڑھنا کیسا ہے۔ جواب دیا گیا کہ یہ بھی سنت ہے؟

خوب ہے جواب۔ پھر تو اہل حدیث کی مساجد میں سارے ہی نمازی کبھی تو ننگے ہی سر نظر آنے چاہئیں۔ مگر ہمیں تو ایسا نظر نہیں آیا حالانکہ بارہا ان مساجد میں نماز پڑھی ہے۔ کاش مفتی صاحب تفکر فرماتے کہ کسی عمل کو "سنت" قرار دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ سنت کے اگر یہی معنی ہوں کہ جو بھی فعل حضور سے کبھی سرزد ہو گیا وہ سنت ہے پھر تو نفل اور مستحب کی اصطلاحیں کتابوں سے کھرچ دینی چاہئیں۔ کیا اہل حدیث حضرات فرض نمازوں سے قبل و بعد کی کچھ رکعات کو سنت اور کچھ کو نفل نہیں کہتے؟ اگر کہتے ہیں تو کیوں جبکہ مذکورہ جواب کی روشنی میں حضور کا ہر عمل اصطلاحاً "سنت" ہی بن جاتا ہے۔

صحیح جواب یہ تھا کہ ننگے سر نماز پڑھنا اصولاً مکروہ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کی کراہت اس وقت اٹھ جاتی ہے جب کسی ہنگامی وجہ سے خصوصی فروتنی اور خشوع و الحاح پیش نظر ہو جیسے کہ حج میں بعض امور اظہار فقر و الحاح کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ یہ کہنا کہ ننگے سر نماز پڑھنا بھی "سنت" ہے اس اصطلاح کا بے محل بلکہ گمراہ کن استعمال ہے۔

احناف سے کد اہل حدیث کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس مجموعے میں اس کی جھلکیاں کیوں نہ ملتیں۔ صفحہ ۲۹۶ پر امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی فرضیت کا ذکر کر کے فرمایا گیا ہے۔

"اس میں کسی کو کلام نہیں اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ"

گویا امام ابوحنیفہ اور ان کی تقلید کرنے والا سوادِ اعظم کھلا احمق ہے احمق بھی کیسا کافرین و مشرکین جیسا کیونکہ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ قرآنی تلمیح ہے اور قرآن میں یہ تذلیل و تحمیق صرف ان لوگوں کی گئی ہے جو ملت ابراہیمی سے گریز کرتے ہوئے کفر و شرک پر قائم رہے وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ (بقرۃ) تو مفتی صاحب کے ریمارک کا یہ مطلب نکلا کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھنے کا فیصلہ ابوحنیفہؒ اور اُن کے کروڑوں مقلدین کی ایسی ہی بدترین حماقت ہے جیسی مشرکین و کفار کی یہ حماقت کہ باوجود واضح ہو جانے کے ملت ابراہیمی سے روگرداں ہیں۔

پھر بھی اگر کوئی یوں کہدے کہ اہل حدیث حضرات ائمہ کی توہین کرتے ہیں تو یہ بزرگ اسے مفتری اور کذاب قرار دیں گے حالانکہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا امام مالک کے نزدیک بھی فرض نہیں۔

ایک اور نمونہ:۔ عشر و خراج کی بحث میں صفحہ ۳۰۲ پر فرماتے ہیں

"مگر حنفی مذہب کے بڑے ٹھیکیدار امام ابن ہمام مصنف فتح القدیر نے تینوں کو مخدوش و منظور فیہ قرار دیا ہے۔"

ذرا بتائیے "ٹھیکیدار" کا لفظ یہاں کس ذہنیت کی غمازی کر رہا ہے؟ شیخ الحدیث ہو کر ایک عالم سلف پر ایسی غیر متین نشتر زنی کیا سنجیدہ علماء کے شایان شان ہے؟

حاصل یہ ہے کہ جو لوگ معتد بہ علم اور نکتہ شناس عقل رکھتے ہیں وہ فتاویٰ ستاریہ کے کتنے ہی فتاویٰ پر کڑھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اللہ اکبر کہاں وہ ائمہ احناف کی ژرف نگاہی بالغ نظری، تعدیل، اعماق و امعان، استحضار، گہرائی اور کہاں یہ اہل حدیث بزرگوں کی سطح بینی، سہل نگاری، لفظ پرستی، خود فریبی اور نخوت ـــــ نخوت نے سوا کیا کہیں گے اگر کوئی صحابہؓ تک کے فکر و تدبر اور تعامل سے بے نیاز ہو کر حدیث فہمی کا مدعی بن جائے۔ کاش اہل حدیث دوست اس نکتہ کو سمجھتے کہ محض کتابیں پڑھ لینا "قانون سازی" کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ اس دقیق اور طرح دار فن کے لئے کچھ خدا داد صلاحیتیں بھی ضروری ہیں جن کے بغیر بڑے سے بڑا حافظ حدیث بھی صرف عطار رہتا ہے حکیم نہیں بن جاتا کہنے کو "فقہ الحدیث" بڑا مقدس عنوان ہے لیکن اس

عنوان کو مقلدین کے بالمقابل ایک نعرہ بنانے والے بزرگوں میں وہ ذہنی استعداد بہت کم پائی جاتی ہے جو "فقہ" کے لئے درکار ہے۔

اے اہل نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

حضرت معاویہؓ کی سیاسی زندگی

چشم و دل فرش راہ۔ کسی بھی صحابی کا نام آجائے تو دل کو کیسا کیف حاصل ہوتا ہے ــــ پھر امیر معاویہؓ جیسا صحابی کہ اگرچہ خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم جیسی عرش پیما فضیلت اسے حاصل نہیں مگر ملک و ملت کو ایک ہولناک طوفانِ ظلمت و ہلاکت سے بچانے جانے کی وہ سعادت اس کے حصے میں ضرور آئی ہے جو قیامت تک کے لئے احسان کے عنوان سے جریدۂ عالم پر ثبت رہے گی ویسے قرآنی تصریح کے مطابق انسان تو زیادہ تر ناشکرا ہی ہے۔ کیسے کیسے عالی مرتبہ اور دقیقہ رس بزرگ ہیں جو غلط روایات سے دھوکا کھا کر حضرت معاویہؓ کے کارناموں کو خراج نفرت و بیزاری کے سوا کچھ نہیں دیتے لیکن سچائی بالکلیہ فنا کب ہوتی ہے۔ ایسے لوگ بھی کچھ نہ کچھ موجود رہی ہیں جو رفض و تشیع کی اس کی ہزاروں برس پشت تک پہچانتے ہیں اور فاسد و کاسد روایات کے فلک بوس انبار سے حضرت معاویہؓ اور دوسرے صحابہؓ کی حرمت و عزت کے موتی ڈھونڈ نکالنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔

زیرِ تبصرہ مبسوط کتاب کراچی کے مشہور اشاعت گھر اصح المطابع (آرام باغ) نے چھاپی ہے۔ صفحات ۴۵۶ سائز متوسط۔ طباعت و کتابت نفیس۔ کاغذ عمدہ۔ جلد حسین ڈائی لگی ہوئی۔ گرد پوش بڑا دلکش اور نظر افروز۔ قیمت:۔ دس روپے

مؤلف ہیں مولانا سید علی احمد۔ مختصر مگر دقیع مقدمہ رقم فرمایا ہے جناب مولانا احتشام الحق تھانوی نے جو اس وقت پاکستان کے معروف و ممتاز عالموں میں ہیں۔ ایک فاضل تبصرہ نگار کو حیرت ہے کہ

"ایسی لغو کتاب پر حضرت مولانا احتشام الحق
تھانوی نے دیباچہ کیونکر لکھ دیا"

اب ان فاضل تبصرہ نگار کو کون بتائے کہ تاریخ کے باب میں معاملہ خوش فہمیوں اور غلط اندیشیوں کی جو عینک انہوں نے لگا رکھی ہے ضروری نہیں کہ دوسرے لوگ بھی اسے ہی لگایا کریں مولانا احتشام الحق کو نہ حضرت علیؓ سے خود ساختہ محبت تھی نہ حضرت معاویہؓ سے خود کاشتہ قسم کا بغض لہٰذا انہوں نے ایک ایسی کتاب کی تعریف سپردِ قلم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جو شروع سے آخیر تک نہایت متین اور شائستہ اسلوب میں تمام صحابہ کی عظمت و تقدیس کا اثبات کرتی ہے اور علی و معاویہ رضی اللہ عنہما کو روشِ عام کے مطابق دو دشمن اور حریف دکھانے کے عوض سبائیوں کی مکاریوں اور دسیسہ کاریوں کا ہدف دکھاتی ہے۔ یہ تعدیل اور صحابیت کا دفاع ان لوگوں کو کیسے بھاتا جو غیر شعوری طور پر روافض کے پروپیگنڈے سے داغ داغ ہیں اور علی و معاویہؓ کے موضوع پر معاویہ اور ان کے ساتھیوں کو غدارِ اسلام پکارے بغیر گفتگو ہی نہیں کر سکتے۔ ان کی نازک مزاجی کا یہ حال ہے کہ ان کی دانست میں ایک باغیرت مسلمان کے لئے اس کتاب کا فقط پڑھ لینا ہی بہت مشکل ہے حالانکہ ہم اسے اول سے آخر تک پڑھنے کے بعد ببانگ دہل کہتے ہیں کہ جس مسلمان میں جتنی زیادہ غیرت و حمیت صحابہ کی حرمت و آبرو کے بارے میں ہوگی اتنے ہی لطف و انہماک سے وہ اس کتاب کو پڑھے گا اور جو مسلمان اس کتاب کو ناگواری اور دشواری کے ساتھ پڑھے وہ چاہے علم و ہنر کے دوسرے شعبوں میں ارسطو ہی کیوں نہ ہو مگر صحابیت کی تقدیس کے معاملہ میں اس کے اندر غیرت و حمیت کا شائبہ بھی باقی نہ رہا ہوگا۔

اس کتاب کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ میں کسی ایک کو خطاوار اور دوسرے کو سراپا حق ثابت کرنے کے عوض اُس اصل فتنے کی نشاندہی کی جائے جس نے ان دو عظیم مومنوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا دیا اور اسلام کی تاریخ میں ایک ناخوشگوار باب کا اضافہ ہوگیا۔ واقعہ یہ ہے کہ صدیوں کے مسلسل پروپیگنڈے نے علی و معاویہ کے تصادم کی ایسی مکروہ تصویریں بہ امت کے سوادِ اعظم کو مطمئن کر دیا ہے جو صحابیت کے مقامِ بلند کا احساس رکھنے والوں کو شرم سے پانی پانی کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ اچھے اچھے مستند اداروں کی کتابوں میں معاویہ عمرو بن العاص اور مغیرہ بن شعبہ جیسے حضرات ایسے گرے درجے کے مسلمان نظر آئیں گے جنہیں ہمارے گئے گذرے زمانے کے کسی بھی دنیا پرست سیاسی لیڈر سے تشبیہ دی جا سکتی ہو۔ واویلا ثم واویلا۔ سید علی احمد صاحب نے اسی المناک صورت حال کی

سلاح کے لئے بڑے یقین، سلیقے، ذہانت اور کاوش کے ساتھ وہ
مواد پیش کیا ہے جو قارئین کو صحابیت کی شانِ عالی کا احساس دلا کر
س راز سے آگاہ کر سکے کہ اعلیٰ کردار سے انحراف تو نہ حضرت علیؓ
نے کیا تھا نہ حضرت معاویہؓ نے وہ دونوں اور ان کے ساتھی صحابہ
پنے تمام اعمال و افعال میں اسی بلندی پر متمکن تھے جو رسول اللہ
ملی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ بزرگوں کے شایانِ شان
ی لیکن فسق و فجور دشمنانِ اسلام نے پھیلایا، واقعات کی
مویر میں ناپاک رنگ سبائیوں اور رافضیوں نے بھرے،
ڑاؤ کو مبتذل زاویئے شیطان کے پیروؤں نے دئیے، جھوٹی
ہانیاں بد تماشوں نے گھڑیں اور خانوادۂ علیؓ کی عقیدت و
حبت کا ڈھونگ رچا کر حضرت معاویہ اور بے شمار صحابہ کے سیرت
و کردار کو متہم کرنے کا مشن دغا بازوں نے چلایا۔

قارئین کو اس نتیجے تک پہنچانے میں گو کہ کتاب کے بعض مقامات
کا استدلال تشنہ بھی ہے۔ بعض مقامات پر جھول بھی رہ گئے ہیں۔
کچھ فیصلے تخمین و ظن سے بھی کر لئے گئے ہیں۔ مگر مجموعی حیثیت سے کتاب
جاندار ہے وقیع ہے اور ایک ایسے پاکیزہ اطمینان تک پہنچانے والی
ہے جس کی خاطر بعض کمزور دلائل کو بھی انگیز کر لیا جائے تو سودا
مہنگا نہیں۔ ویسے یہ نکتہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ غلط تصورات
کی جو چٹان صدیوں کی مسلسل کوشش سے بنائی گئی ہے اور اسے
مضبوط تر کرنے میں خود اہل سنت کا بھی تعاون برابر کار فرما ہے
اسے توڑنے اور ڈھانے کا کام بڑا دشوار ہے۔ کدالیں اچٹ
بھی سکتی ہیں اور تھکے ہوئے بازو شل بھی ہو سکتے ہیں لہٰذا صحابیت
دشمن تصورات کی ناپاک گرد و پیکر چٹان کو ڈھانے کے سلسلے میں
اگر سید علی احمد کے بعض دلائل ہلکے بھی رہ گئے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں
وہ انسان ہیں ڈائنامیٹ نہیں۔ بشر ہیں فرشتے نہیں۔ انصاف کی راہ
پر اگر کوئی گرتا پڑتا بھی چلا ہے تو وہ اس شخص سے بہرحال بہتر ہے
جو ظلم کی راہ پر دوڑا چلا جا رہا ہے۔

لیجئے چند خامیوں کی نشاندہی تو ہم بھی کئے دیتے ہیں۔
صفحہ ۲ پر زکوٰۃ کے سلسلہ میں یہ جو کہا گیا کہ۔

"ہم نے خیرات کھانے والا ایک مستقل طبقہ
ہندوؤں کی طرح قائم کر رکھا ہے اور سالانہ
دو دو روپیہ دے کر سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے پانچ ہزار
روپیہ زکوٰۃ میں دیدیا صحابہ کے یہاں یہ دستور نہ تھا
وہاں سب زکوٰۃ بیت المال میں جمع ہوتی تھی اور اسے
منظم طریقہ پر خرچ کیا جاتا تھا"

اسے اگلے ایڈیشن میں بدل دینا چاہئے انفرادی طور پر زکوٰۃ
نکالنے کی روش دین سے انحراف کا مظہر نہیں مجبوری کا ثمرہ ہے
اسلامی حکومت ہی نہ ہو تو کہاں کا بیت المال۔ انفرادی زکوٰتیں کسی
خیرات کھانے والے مستقل طبقے کو نہیں دیجاتیں وہ عموماً مستحقین
ہی کو پہنچتی ہیں اسلامی حکومت نہ ہونے کی صورت میں تملیک کی
قید کے ساتھ انفرادی طور پر زکوٰۃ دینا ہی اولیٰ اور انفع طریق ہے
بشرطیکہ زکوٰۃ کے مضمرات و متعلقات پر بالغ نظری سے غور
کیا جائے۔ تبصرے میں تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں ہمارا مشورہ
ہے کہ مؤلف ہمارے اجمال سے خود ہی تفصیل اخذ کر کے اگلے
ایڈیشن میں اصلاح کر دیں

الفئۃ الباغیہ کی بحث میں مؤلف کی نظر اس پہلے مقام
سے چوک گئی جہاں امام بخاریؒ نے اولاً یہ روایت بیان کی ہے۔ اسی
مقام پر شارحینِ بخاری (ابن حجر، عینی، قسطلانی وغیرہ) نے اپنی اپنی
صلاحیتوں کے جوہر دکھلائے ہیں کتاب الجہاد تو، جہاں سے مؤلف
نے روایت لی ہے مؤخر مقام ہے۔ اتفاق سے اس میں کتابت
کی غلطی بھی ہوگئی ہے یدعوھم الی اللہ ویدعونھم الی النار
چھپ گیا۔ حالانکہ یدعونہ الی النار ہونا چاہئے تھا۔

کہیں کہیں انشا میں بھی سقم رہ گیا ہے۔ صفحہ ۲۸۱ پر۔

"تمام بنو ہاشم اور حضرت ابن عمر وغیرہم رضوان اللہ
علیہم اجمعین نے حضرت ابن الزبیر سے بیعت نہیں
کی اور امیر المومنین عبد الملک سے کی البتہ حضرت
ابن الزبیر کو وہ بالفعل خلیفہ سمجھتے تھے۔"

"بالفعل" یہاں برمحل استعمال نہیں ہوا۔

صفحہ ۲۸۸ پر۔ "لیکن یہ خود جب امیر یزید کی حمایت کریں
اور ان کی حکومت کو مضبوط کرنے کے درپے ہوں
تو پھر کسی کو بولنے کا کیا موقع رہا"؟

درپے محلِ مدح میں استعمال نہیں ہوتا۔ مثلاً ہم نہیں کہتے آزار

تو بولیں گے مگر وہ پتے اعانت نہیں کہیں گے۔

صفحہ ۲۳۴ پر اَمَا وَاللہِ لَقَدْ کُنْتُ اَنْہَاکَ عَنْ ھٰذَا کا ترجمہ کیا گیا ہے " خدارا دیکھو میں نے تمہیں اس کام سے روکا تھا۔" ہم ترجمہ کرتے تو یوں کرتے کہ " قسم اللہ کی .... "

صفحہ ۲۵۴ پر ــــ "کتاب وسنت سے ادنیٰ ترین دلیل بھی اس بارے میں پیش نہیں کی جاسکتی اور نہ کوئی محکم دلیل دی جاسکتی ہے "

یہ تو الٹی النشا ہوئی۔ جب ادنیٰ ترین دلیل بھی پیش نہ کی جاسکتی ہو تو محکم دلیل کا ذکر کیا معنی۔ کہنا یوں چاہئے تھا کہ کتاب وسنت سے کوئی قوی ومحکم تو کیا ضعیف وادنیٰ دلیل بھی نہیں پیش کی جاسکتی۔

یہ چند جزئی اور معمولی خامیاں ہیں جو کتاب کی اعلیٰ قدر وقیمت میں ہرگز حارج نہیں۔ زاویۂ نظر کی اصابت اور اسلوب تحریر کی شائستگی کے اعتبار سے کتاب نہایت قیمتی ہے۔ رہا بعض لوگوں کا اس پر ناک بھوں چڑھانا کہ واقدی کو داستان گو اور بعض اور بزرگوں کو بعض اعتبار سے فریب خوردہ وغیر محتاط کہدیا گیا تو یہی بات ہے صحابیت کی طرف سے دفاع اور رفض کی بیخ کنی کیلئے مورخین سلف اور علمائے تاریخ کی اندھی عقیدت کا چشمہ اتارنا ہی پڑے گا۔ ویسے لطیفہ یہ ہے کہ جو لوگ واقدی، ابن سعد، خطیب بغدادی، حافظ سیوطی اور مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہم اللہ پر تنقید وتبصرے کو جرم عظیم ٹھیرا رہے ہیں وہ اپنے دائرے میں امام غزالی، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ تک پر تنقید وتبصرے کو ایک جائز حق اور عدل کا تقاضہ قرار دیتے رہے ہیں۔ نیز یہ تو ان کے بنیادی نظریات میں شامل ہے کہ اللہ اور رسول کے سوا کوئی معیار حق نہیں۔

وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا کَالُوْھُمْ اَوْ وَّزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ ۝ اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝ یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

زمزمہ

جناب رشید کوثر فاروقی کی غزلوں کا مجموعہ۔ کتابت عمدہ طباعت کچھ کم عمدہ۔ کاغذ سفید۔ صفحات ۱۶۰۔ جلد پر سنہری ڈائی

قیمت تین روپے۔ شائع کردہ۔ ادارہ ادبیات عالیہ ۱۳۱
ادارہ ادبیات عالیہ ۱۳۱ خیالی گنج۔ لکھنؤ۔

شعر وسخن کے مجموعے آئے دن چھپتے رہتے ہیں لیکن صفِ اوّل کی چیزیں کم سامنے آتی ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ رشید کوثر کا یہ مجموعہ صفِ اوّل کی چیز ہے۔ حالانکہ موصوف عوامی شہرت کے اعتبار سے گمنام سے ہیں لیکن شہرت کسی فنکار کی عظمت کا معیار نہیں بہت سے ہیرے غیر معروف وادیوں میں پڑے رہ جاتے ہیں۔

کوثر صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ اسلام پسند ہیں لیکن یہ اسلام پسندی ان کے شعر کو بوجھل اور خشک نہیں بناتی۔ نہ فن کے تیکھے پن پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ان کے اسلوب میں رچاؤ اور شگفتگی ہے۔ کیف اور گداز ہے۔ ان کے کنائے تغزل سے معمور اور شادابی سے مالا مال ہیں۔ لفظی در وبست میں پختگی ہے سلیقہ ہے۔ سرشاری کی وہ کیفیت جو شعر کو شعر بناتی ہے ان کے یہاں خاصی ابھری ہوئی ہے۔ تخیل کی پرواز بلند ہے اور سامنے کی باتیں بھی وہ ایسی ہنرمندی سے کہتے ہیں کہ وہ سامنے کی نہیں رہ جاتیں۔ جگہ کی قلت نہ ہوتی تو ہم ان کے سو پچاس اشعار قارئین کی ضیافت طبع کے لئے ضرور نقل کرتے لیکن تنگ دامانی کا مداوا کہاں سے لائیں۔ تاہم دو چار تو نقل کئے ہی دیتے ہیں۔

کیا کسی بلال نے پھر حرم میں دی آذان
وجد میں ہیں کنگرے رقص میں ہیں برجیاں

دل کی دھڑکنوں کے ساتھ گنگنا رہا ہے کون
یہ نفس نفس میں ہیں کس کی نے نوازیاں

نہیں ہے سایہ نشینان رہگذر کے لئے
یہ نیش درد کی لذت یہ نوش غم کی مٹھاس

خود اپنے ہی غبار پریشاں میں گم ہوا
افواہ اڑ گئی کہ لٹا کارواں کہیں

تم حبیب کھو لٹا دوں دل کی بساط ہی کیا
جیسی خوشی تمہاری ہیں کیا مری خوشی کیا

ایسے اور اس سے بہتر اشعار اس مجموعے میں بہت ہیں جیسے ہیں نہ کہیں دھبہ بھی ہونا ہی چاہئے تھا مثلاً

کرشمہائے خرد مارشانہ اضحاک
ہنوز ابھی ہوئی ہر بیات کی بیچاک
روش گیہ مہ و انجم کی سیر خوب مگر
نظر نہیں ہے تو ہر دعوی خبر کا واک

پہلا شعر اکثر قارئین کے لئے گورکھ دھندا ثابت ہوگا اور دوسرے شعر میں کا واک کو کڑوی گولی کی طرح حلق سے اتارنا ہوگا۔

وہ نشہ چاہئے ساقی کہ پھر اتر نہ سکے
کہیں شراب و سبو سے بجھی ہے روح کی پیاس

شعر بڑا اچھا ہے مگر "شراب" کے بعد سبو زائد ہی ہے۔
الحاصل چند ایسے داغ دھبوں کو چھوڑ کر جو ہر حال میں انسانی کاوشوں کا جزو لازم ہوا کرتے ہیں نوائے حق ایک نہایت قابل قدر تحفہ ہے جس سے ہر صاحب ذوق کو حظ اندوز ہونا چاہیئے۔

پرویز کے بارے میں علماء کا متفق فتوے

جس طرح چنگیز، فرعون، ہلاکو اور نمرود جیسے نام کسی مزید تعارف کے محتاج نہیں ہیں اسی طرح پرویز بھی ایک ایسا مشہور و معروف نام بن چکا ہے جس کے تعارف کی کوئی احتیاج پڑھے لکھے لوگوں کو نہیں ہو سکتی۔

ایک پرویز شیریں فرہاد کے قصے میں ہوا کرتا تھا لیکن جب سے مسٹر پرویز نے اسلام کا ایک مکمل اور محیر العقول تصور پیش کر کے نام پیدا کیا ہے اس وقت سے اس نام کے ساتھ کسی شیریں فرہاد کی یاد نہیں آتی بلکہ اس پاکستان کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے جہاں کارگہ مغرب میں ڈھلے ہوئے ذہن مصطفےٰ کمال والا اسلام لانے کی جد و جہد میں مشغول ہیں اور جہاں اسلام کا نام لیکر ننگی مادہ پرستی اور تہذیب مغرب زدگی کی تمام لعنتوں کو بالجبر امتِ مسلمہ پر تھوپا جا رہا ہے حد ہے وہاں "سائنٹفک قرآن" نامی کتاب پر سرکاری انعام دیا گیا حالانکہ اس کتاب کا مصنف اپنی مرض خبط الحواسی کے باعث اس لائق تھا کہ اسے پاگل خانے بھیجا جائے یا کسی چڑیا گھر میں نمائش کے لئے رکھدیا جائے۔ علمی متانت و دیانت تو دور کی بات ہے اس کتاب کی انشاء تک اتنی خام اور بے تہہ ہے کہ کوئی خوش ذوق اسکا مطالعہ بھی پسند نہ کرے گا۔ مضحکہ خیز جہالت، قرآن و حدیث سے کامل بے خبری، علم و منطق کے معروف اصولوں سے تہی دامنی اور اسلام کے باطنی رخ سے بیزاری اس کتاب کی نمایاں خصوصیات ہیں پھر بھی اس پر ماشاء اللہ انعام دیا گیا۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ پاکستانی اہل اقتدار کی نگاہ میں اسلام کو مسخ کرنے والی اور ننگی مادہ پرستی کو فروغ دینے والی ہر کوشش حوصلہ افزائی کی مستحق ہے چاہے وہ کسی تھیٹر کے تھرڈ کلاس مسخرے کی یاد دلانے سے زیادہ کوئی سنجیدگی نہ رکھتی ہو۔

ایسے اقتدار کے ظل عاطفت میں مسٹر پرویز کو جو بھی رعائتیں اور عنائتیں میسر آتی رہیں کم ہیں۔ یہی "اوپر" والوں کی پشت پناہی تو ہے جس نے پرویز صاحب کے فن شریف کو لائق التفات بنایا ورنہ ان کا فن جن شاہکار جہالتوں اور فاحش ضلالتوں کا سرمایہ دار ہے انھیں اپنی موت آپ مرجانے میں زیادہ دیر نہیں لگنی چاہئے تھی۔

اب حالات اور حوادث کا کوئی کیا کرے۔ جب حالات ایسے ہی پیدا ہو گئے ہوں کہ مسٹر پرویز کی ذہنی بے راہ روی ایک مستقل تحریک و تنظیم کی شکل اختیار کر گئی ہو اور غیر اسلامی تعلیم و تربیت کے ماحول میں نشو و نما پانے والی نئی نسل اس شیطانی تحریک کا نرم چارہ بننے لگی ہو تو علماء پر بھی یہ ذمہ داری آہی جاتی ہے کہ وہ جس حد تک استطاعت ہو سکے اس تحریک کی سمیت اور اس کے چلانے والوں کی شیطنت آشکارا کرتے رہیں۔ علم و منطق کے میدان میں انہوں نے پرویز صاحب کی ہر لغو بیانی کا توڑ کیا اور یہ فریضہ بھی ان [illegible] تھا کہ عامۃ المسلمین کو پرویز صاحب کے ارتداد و کفر

سے آگاہ کردیں چنانچہ یہ فریضہ بھی انہوں نے ادا کر ہی دیالاونیز تبصرہ کتاب اسی کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ استفتاء مجمل نہیں۔ اس میں پرویز صاحب کے خیالات ان کی تحریروں سے مع حوالہ تفصیلاً پیش کئے گئے ہیں اور اس کا کوئی امکان نہیں چھوڑا گیا ہے کہ خیالات کی ترجمانی میں تحریف و تلبیس کا شبہ کیا جاسکے۔

فتوی بھی مجمل نہیں۔ اس میں کافی شافی حد تک قرآن سنت کے دلائل ثبت قرطاس کئے گئے ہیں اور اس پر دو چار دس پانچ نہیں ایک ہزار ستائیس علماء کی تائید و تصدیق ثبت ہے۔ استفتاء ممالک اسلامیہ کے علماء کو بھی بھیجا گیا تھا۔ وہاں سے مختلف مشاہیر کے جو جواب آئے وہ اس تعداد سے علیحدہ شامل کتاب ہیں۔ ایک شامی عالم نے فقط ایک جملے میں جو کچھ کہدیا ہے وہ سارے مسئلہ کا نچوڑ سمجھئے۔

"غلام احمد الجدید (مسٹر پرویز) کے گوناگوں
معتقدات فاسدہ کا ہر آئیٹم بجائے خود اتنا
لغو و باطل ہے کہ تنہا وہی انھیں اسلام سے
کلی طور پر خارج کر دینے کے لئے کافی ہے۔"

یہ کتاب مدرسہ عربیہ۔ نیوٹاؤن۔ کراچی ۵ نے شائع کی ہے صفحات ۲۵۶۔ قیمت قسم اعلیٰ تین روپے، قسم دوم دو روپے۔ کنجوسی کے سوا کیا کہیں کہ ہمیں برائے تبصرہ قسم دوم ہی بھیجی گئی لیکن یہ اگر قسم اعلیٰ ہے تو ہمارا مشورہ ہے کہ "اعلیٰ" کا لفظ حذف کیا جائے۔ یہ مجموعی گیٹ اپ کے لحاظ سے ایسی نہیں کہ لفظ "اعلیٰ" کا حق ادا کر سکے۔ واللہ اعلم بالصواب

Regd. No, A 972 TAJALLI Deoband U. P.

ایڈیٹر۔ عامر عثمانیؒ (فاضل دیوبند)

62 NP.

چین اور روس کی زندہ تصویریں

کمیونزم کی پہلی کتاب جس میں کمیونزم سے متعلق سیکڑوں سوالات کے مکمل و مفید جوابات درج ہیں - قیمت ایک روپیہ -

ظلمت نیمروز مصنف :- آرتھر کوئسلر - مترجم :- گوپال مِتّل -
سابق کمیونسٹ دانشور آرتھر کوئسلر کا بلند پایہ نظریاتی ناول جس کا ترجمہ اُردو کے صاحب طرز ادیب جناب گوپال مِتّل نے کیا ہے - ایک ایسے ملک کی کہانی جو آدرش وادی انقلابیوں کے ہاتھ میں پڑکر جنت بنتے بنتے جہنم بن گیا - ضخامت ۲۹۶ صفحات - قیمت سوا روپیہ -

عثمان بطور چین میں مسلمانوں پر کیا گذری ؟ ایک کہانی ایک تاریخ - سوا روپیہ -

اوریانگسی بہتا رہا ناول کے پیرائے میں چین کی ایک حسرت انگیز داستان - قیمت ایک روپیہ

کمیونزم اور کسان کمیونزم کو ایشیائی نقطۂ نظر سے سمجھنے سمجھانے کی کامیاب کوشش جو بے شمار دستاویزی حوالوں سے مزین ہے - قیمت ڈھائی روپے -

عالمی سیاست میں جمہوریت مصنف :- لیسٹر بی پیرسن کنیڈا کے سابق وزیر خارجہ اور اتحادی سبھا کے سابق صدر مسٹر لیسٹر بی پیرسن کے چھ عالمانہ مقالوں کا مجموعہ - بین الاقوامی سیاست میں جمہوریت کے کردار اور جمہوری اصولوں کی کارفرمائی کے امکانات کا سیر حاصل تجزیہ موجودہ بین الاقوامی سیاست کے پُرپیچ رجحانات کو سمجھنے کیلئے اس مختصر سی کتاب کا مطالعہ ازحد مفید ہے - ضخامت ۱۱۸ صفحات
قیمت صرف آٹھ آنے

آزادی کی طرف ایک روسی افسر کی آپ بیتی جو بھاگ کر امریکہ میں پناہ گزیں ہوا - نہایت دلچسپ اور عبرت ناک - تین روپے -

آزادی کی نئی وسعتیں مصنف :- اروِن ڈی کینہم
آزادی کے تصور میں جو نئی رنگ آمیزیاں ہوئی ہیں ان کی معلومات افروز کہانی ، کرسچین سائنس مانیٹر کے ایڈیٹر اروِن ڈی کینہم کی زبانی - جمہوری سماج کے جدید تر رجحانات کا ولولہ انگیز تجزیہ - ضخامت ۱۱۲ صفحے - صرف آٹھ آنے

ادب میں ترقی پسندی کمیونزم ادب و صحافت کی آڑ میں کیا کھیل کھیلتا ہے - ایک روپیہ -

پتھر کے دیوتا چھ آپ بیتیاں - جاذبِ توجہ حیرتناک
ایک روپیہ

اُنیس سو چوراسی مصنف :- جارج آرویل - مترجم :- سیّد سہیل واسطی -
مشہور ہندوستانی نژاد مغربی مصنف جارج آرویل کا وہ شہرہ آفاق ناول جس نے یورپ میں تہلکہ ڈال دیا تھا - اُردو کا یہ خوبصورت ایڈیشن آرٹ پیپر کی آٹھ تصویروں سے مزین ہے -
ضخامت ۳۴۰ صفحات - قیمت ڈھائی روپے

چین کے مسلمان کروڑوں مسلمان کیا ہوتے ؟ انھیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا ؟ کمیونزم کی آدم خوری کا دستاویزی تذکرہ - صرف چار آنے ۴/-

سوویٹ نظام کی چھ کنجیاں جچے تلے عقلی و نفسی دلائل پر مشتمل ایک سنجیدہ اور معیاری کتاب جو دلچسپ بھی ہے اور حقیقت افروز بھی - صفحات ۳۲۴ -
قیمت صرف ایک روپیہ

آزادی کا ادب بعض منتخب مقالوں ، افسانوں اور منظومات کا مجموعہ جنھیں نیک تعمیری مقاصد کے تحت چھاپا گیا ہے - قیمت مجلّد تین روپے -

لینن انقلاب روس کے بانی لینن کی مستند سوانح - بے لاگ اور غیر جانبدارانہ - ایک روپیہ -

سوویت روس کی حقیقت دو حصے - دو روپے -

جولائی ۱۹۶۳ء

ماہنامہ تجلّی دیوبند

شمارہ نمبر ۵

جلد نمبر ۱۵

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

سالانہ قیمت سات روپے۔ فی پرچہ ۶۲ پیسے

غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۱۸ شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پوسٹل آرڈر پر کچھ نہ لکھئے بالکل سادہ رکھئے

اشد ضروری

اگر اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ

اس پر آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ اگر آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا (وی پی سات روپے باسٹھ پیسے کا ہوگا) منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

••• پاکستانی حضرات •••

ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیج کر رسید منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتہ ہمیں بھیجدیں رسالہ جاری ہو جائیگا۔

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

دفتر تجلّی۔ دیوبند۔ ضلع سہارنپور (یو۔ پی)

پاکستانی حضرات:۔ نیچے لکھے ہوئے پتہ پر منی آرڈر بھیجکر وہ رسید ہمیں بھیجدیں جو منی آرڈر کرتے وقت ڈاکخانہ سے ملتی ہے۔

مدیر

عامر عثمانی

فاضل دیوبند

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے "نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند" سے چھپوا کر اپنے دفتر تجلّی دیوبند سے شائع کیا

مکتبہ عثمانیہ۔ مینا بازار ۲۲۸۰

پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی (پاکستان)

آغازِ سخن

وہی غلافِ کعبہ!

"تذکیۂ نفس" کے جلیل القدر مصنف مولٰنا امین احسن اصلاحی میثاق نام کا ایک ماہنامہ نکالتے ہیں۔ یہ اگرچہ اکثر و بیشتر تعطیل و تاخیر ہی کا شکار رہتا ہے، لیکن جب بھی اس کے نکلنے کی نوبت آئے اس میں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے لئے طنز و طعن اور سبّ و شتم کے کچھ تحفے ضرور مل جاتے ہیں۔ اِلّا ماشاء اللہ۔

ویسے تو مولانا اصلاحی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، لیکن خاص طور پر "تذکیۂ نفس" کی یاد ہمیں اس لئے آئی کہ یہی وہ مظلوم کتاب ہے جسے خود اپنے مصنف کیخلاف احتجاج کرتے اور ہچکیاں لیتے ہم نے اکثر سُنا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زبان و قلم سے پند و وعظ کے موتی بکھیرنا اور لطائف و بصائر کے دریا بہانا زیادہ مشکل کام نہیں ہے لیکن مشکل کام یہ ہے کہ آدمی خود اپنے گریبان میں منھ ڈال کر اس حقیقت کا ادراک کر سکے کہ وعظ و خطابت اور لفاظی و سخن طرازی کی ایک ٹن مقدار سے تقویٰ اور تذکیۂ نفس کی ایک تولہ مقدار بھی حاصل نہیں ہوتی۔ یہ جنسِ گراں بہا اگر خالی زبان و قلم کے درختوں میں لگا کرتی تو وہ تمام اسلاف احمق ہی کہلاتے جنھوں نے اپنے ایک ایک سانس کو کردار و عمل کے سانچے میں ڈھال کر یہ ثابت کیا تھا کہ باطن کی اصلاح صابن کے حسین بلبلے بنانے کا نام نہیں بلکہ کردار کی آگ میں تپنے اور نفس امّارہ کو ایڑیوں سے رگڑنے کا نام ہے۔

مولانا اصلاحی کے علم و فضل اور زبان و قلم کی تقدیس سے کون نامراد انکار کر سکتا ہے، لیکن مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی مخالفت میں تحقیر و تضحیک کی جو روش، جو اسٹائل، جو نہج و انداز انھوں نے مستقلاً اپنا رکھا ہے اس سے یہ ہرگز ظاہر نہیں ہوتا کہ تذکیۂ نفس اور اخلاقِ عالیہ کا جو زرّیں سبق وہ بڑی آن بان سے دوسروں کو دیتے ہیں وہ خود ان کے اپنے حلق سے بھی نیچے اُترا ہو۔

جارحانہ سوءِ ظن، اینٹھا ہوا لب و لہجہ، کڑوے الفاظ، ادّعاء و نخوت کا ہمہمہ اور عناد کی گلکاری۔ یہ ہیں وہ خصوصیات جو ہر وہ شخص ان کے طنز و طعن میں دیکھ سکتا ہے جسے مولانا مودودی سے اللہ واسطے کا بیر نہ ہو۔ انانیت ان کی ایک ایک سطر سے اُبلتی ہے حالانکہ انانیت ہی وہ شے ہے جو کبھی تقویٰ اور صفائے باطن کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔

یہ تمہید ہم نے یہ بتانے کے لئے اُٹھائی کہ خیر سے تازہ میثاق میں بھی غلافِ کعبہ کی بحث زیبِ قرطاس ہوئی ہے۔ کیسے نہ ہوتی۔ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پر سنگ باری کا کوئی موقعہ ہاتھ آئے اور مولانا اصلاحی چُوک جائیں یہ ناممکن ہے۔ پچھلے مہینوں میں میثاق نہیں نکل سکا تو آپ نے بعض رسائل کو مراسلہ بھیج کر یہ مقدس فریضہ انجام دیا۔ اب میثاق نکلا تو اس میں چھ صفحات پر معارف کے تانے بانے پھیلائے ہیں حالانکہ پچھلے ترجمان القرآن میں مولانا مودودی نفسِ واقعہ کے متعلق جو تفصیلات پیش کر چکے ہیں ان کے بعد کسی بھی متین و ثقہ اور خوش اوقات انسان کے لئے اس موضوع پر مزید جھک مارنے کی گنجائش

نہیں رہ گئی تھی۔[1] لیکن جس قوم کی کشتی بحرِ ظلمات کے گردابوں میں چکر کھا رہی ہو اس کی سب سے بڑی بد قسمتی یہی تو ہوتی ہے کہ اس کے ذی صلاحیت افراد کو بوالفضولی کی چاٹ لگ جاتی ہے اور وہ اندر سے ڈھول کی طرح کھوکھلے ہو جاتے ہیں۔ ڈھول بجتا بہت زور سے ہے مگر اس کا پیٹ چاک کیجئے تو ہوا کے سوا کچھ نہ ملے گا۔

چھ صفحات میں مولانا اصلاحی نے جو کچھ کہا ہے وہ سطح بینوں کو تو شاید علمی نوع کی چیز نظر آئے لیکن ہم بلا تکلف کہہ سکتے ہیں کہ اس کی علمی حیثیت بے لگام جذبات کی آمیزش نے مجروح کر دی ہے۔ اہلِ حدیث دوستوں کے بارے میں ہمیں صبر تھا کہ وہ بال سے باریک تر نزاکتوں کو سمجھنے اور زیادہ گہرائی میں جانے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے لہٰذا ایسے تمام مسائل میں انھیں معذور تصور کرنا چاہیئے جن کی کشاد و بست ابو حنیفہؒ کی ژرف نگاہی، امیر معاویہؓ کی دور اندیشی اور عمر فاروقؓ کی فراست کی مقتضی ہو۔

لیکن مولانا اصلاحی ایسے نہیں تھے۔ ان میں ذکاوت بھی ہے اور علم بھی۔ تفقہ بھی ہے اور تنوّر بھی۔ اگر جذباتی مغلوبیت اور تحت الشعور میں جڑ پکڑا ہوا کبر و زعم ان کے دماغ کے سوراخوں پر سیمنٹ نہ چڑھا دیتا تو ان کے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ غلافِ کعبہ کے ہنگامۂ دیدار کا تعلق غلاف کی شعاری حیثیت سے نہیں تھا بلکہ ان محسوس و مرئی اوصاف سے تھا جن کی طرف آدمی تعبّد کے جذبے سے نہیں رفعِ استعجاب کے جبلّی تقاضے سے دوڑتا ہے۔ وہی شوق جو زید عمر بکر کو تاج محل، ایلورا، الحمرا، اہرامِ مصر، عجائب گھر اور کسی بھی نادر و ممتاز شاہکار کی طرف ہنکا کر لے جاتا ہے اسی کی کارفرمائی یہاں بھی تھی اور اس بحث میں بطور معارضہ قربانی کے جانوروں پیش کرنا یا کسی بھی ایسے شعیرے کی مثال دینا جس میں محسوس و مشاہد سامانِ کشش نہ ہو کم سمجھی کی دلیل ہے۔ اس نکتۂ خفی کو ہم مئی کے آغازِ سخن میں کھول کر بیان کر چکے ہیں اور تجلی ہر ماہ میثاق کے تبادلے میں جاتا بھی ہے لیکن یا تو مدیر میثاق نے ہمارا اداریہ پڑھا نہیں یا پڑھا تو اس سے اثر پذیر ہونے میں ان کی انا آڑے آئی۔ دونوں ہی صورتیں افسوسناک ہیں۔ نہ پڑھنا تو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ موصوف اپنی رائے کے مقابلے میں کسی اور کی رائے کو سننا بھی پسند نہیں کرتے۔ اور پڑھ کر اثر نہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ اخلاص کا خانہ بالکل بند ہے ورنہ مخلص آدمی ہر مرحلے میں قوی دلائل اور صداقتوں کو قبول کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔

اپنے مضمون میں انھوں نے وہی ہدی کے جانوروں کا تذکرہ بطور معارضہ کیا ہے جن کا ذکر اہلِ حدیث اور دیگر معترضین کرتے آرہے ہیں۔ اگر وہ علم اور دیانت کے ٹھوس تقاضوں کا احساس فرماتے تو اس تذکرے کے ساتھ انھیں ہمارے بیان کردہ محکم اور ناقابلِ تردید فرق پر بھی نقد کرنا چاہیئے تھا، لیکن وہ اس طرح گذر گئے گویا کسی نے ہدی والے بے تہہ معارضے کا توڑ کیا ہی نہیں۔ یہ انانیت نہیں تو اور کیا ہے۔ اسے نخوت اور جمود نہیں کہتے تو پھر کیا کہتے ہیں۔ ہم آج بھی معترضین کے تمام اساطین وائمہ کو مخاطب کر کے ببانگِ دہل عرض کرتے ہیں کہ اس تمثیل سے تمہارا معارضہ خود تمہارے ہی موقف اور دعوے کی کھلی تردید ہے۔ جب تم خود ہی مان رہے ہو کہ ہدی کے جانوروں سے وہ معاملہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا جو غلافِ کعبہ کے ساتھ کیا گیا ہے بلکہ یہاں تک تم بطور اعتراض بیان کر چکے ہو کہ قرونِ اولیٰ میں خود غلافِ کعبہ سے بھی ایسا معاملہ نہیں کیا گیا تو آپ سے آپ ظاہر ہو گیا کہ پاکستان کے ہنگامۂ غلاف کا تعلق غلافِ کعبہ کی شعاری حیثیت سے تھا ہی نہیں، بلکہ

---

[1] ویسے نفسِ بدعت کے متعلق مولانا مودودی نے اپنے اس مقالے میں جو کچھ کہا ہے وہ بچا تُلا نہیں ہے اور اس پر کوئی کلام کرے تو اسے جھک مارنا نہیں کہیں گے۔ خود ہمیں بھی اس میں کلام ہے۔ ہم تقسیم بدعت کے باب میں وہی موقف اصح الاصح سمجھتے ہیں جو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوبات میں، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے تقویۃ الایمان میں اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے فتح الملہم میں اختیار کیا ہے خود مولانا مودودی کا بھی یہی موقف رہا ہے جیسا کہ فاران کے توحید نمبر میں شائع شدہ ان کے مقالے سے ظاہر ہے لیکن آج اگر انھوں نے کسی بدعت کا مندوب و مباح ہونا ممکن الوقوع تسلیم کر لیا ہے تو یہ ویسی ہی بحث طلب بات ہے جس کے بارے میں منطق اور علم کلام کی کتابوں میں فیہ نظرٌ کا پیٹنٹ فقرہ دہرایا جاتا ہے۔ — عامر عثمانی

ئی اوصاف سے تھا جو آدمی کے ذوقِ استعجاب کو ہوا
تے ہیں۔ پھر بدعت وسنت کی بحث اُٹھانا چہ معنی دارد ؟
کل تم یہ بھی کہو گے کہ زید اس لئے بدعتی ہے کہ وہ دہلی
جامع مسجد، آگرے کا تاج محل، اعتماد الدولہ کا مقبرہ دیکھنے
تھا !

بدعت۔ بدعت۔ بدعت ایک رٹ ہے جو مسئلہ کی
اکتوں کا ادراک کئے بغیر لگائی جا رہی ہے اور حد یہ ہے کہ
فِ کعبہ کے ہنگامے سے جو تعلق مولانا مودودی اور جماعت
سلامی کا اِن فتنہ گروں نے اپنے ذہنوں سے تصنیف کر کے
عتراض وتردید کا طوفان اُٹھایا ہے اس پر اصرار برابر
ری رہے گا خواہ مولنا مودودی کتنی ہی صراحت سے
اس کی تردید کرتے رہیں۔ یہ للّٰہیت ہے تو دنیاداری کسے
کہتے ہیں اور یہ انصاف ہے تو ظلم کس چڑیا کا نام ہے ؟

آئیے ہم آپ کو تذکیہ نفس کے عالی مقام مصنف کے
صرف ایک ہی فقرے کے آئینہ میں دکھلائیں کہ ان کے نفسِ
مزکیٰ کا کیا عالم ہے۔ فرماتے ہیں :-

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بات منقول ہے
اس سے بھی یہی واضح ہے کہ غلافِ کعبہ کو آپ نے
حضرت ابراہیمؑ یا حضرت اسمٰعیلؑ کی سنت کی حیثیت
سے اختیار نہیں فرمایا بلکہ زمانہ قبل از اسلام کی
ایک ایسی یادگار کی حیثیت سے باقی رکھنا پسند
فرمایا جس میں کسی خاص دینی ضرر کا کوئی پہلو نہیں
تھا۔"

سمجھے آپ کیا بات ہوئی ؟
شاید نہیں سمجھے۔ دماغ کو ذرا پوری طرح یکسو کر لیجئے اور
اور پھر دیکھئے کہ جس فقرے پر ہم نے خط کھینچ دیا ہے اس میں کس بلا
کا زہر ہے۔
اگر آپ اُردو زبان وانشاء پر عبور نہیں رکھتے تو کسی
صاحبِ فن سے دریافت کیجئے کہ جب ہم یوں کہتے ہیں :-
"فلاں چیز میں کوئی خاص خرابی نہیں۔"

تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے ؟
اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قائل اس شے کو خرابی سے
بالکل ہی پاک تو نہیں سمجھتا البتہ یہ ضرور کہتا ہے کہ کوئی قابلِ ذکر
خرابی اس میں نہیں ہے۔

ایک مثال :-
زید وعمرو کچھ سرگوشی کر رہے ہیں۔ بکر دریافت کرتا ہے
— "کیوں جناب کیا باتیں ہو رہی ہیں ؟" — زید جواب دیتا
ہے "کوئی خاص بات نہیں !"
اب کیا آپ اس جواب کا یہ مطلب لیں گے کہ سرے
سے کوئی بات ہی نہیں ہو رہی تھی ؟ ظاہر ہے یہ مطلب نہیں
لیا جائے گا بلکہ جواب کا حاصل یہ ہو گا کہ باتیں تو ضرور ہو رہی
تھیں مگر وہ ایسی نہیں تھیں کہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہوں۔ گویا
اس طرح کے فقرے میں لفظ "خاص" کا استعمال کسی شے کے
وجود ہی سے انکار کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اس کے معتد بہ اور
اہم ہونے سے انکار کے لئے ہوتا ہے۔
روزمرّہ کے اس معلوم قاعدے کو ذہن نشین کر لینے کے
بعد آپ ادراک کیجئے کہ مولانا اصلاحی کا مطلب کیا نکلا —
انھوں نے "دینی ضرر" پر خاص کا لفظ داخل کیا ہے۔ مفہوم
یہی تو بنتا ہے کہ جس یادگار کو اللہ کے رسولؐ نے قائم رکھنا
پسند فرمایا اس میں معتد بہ قسم کا دینی ضرر تو بے شک نہیں تھا
مگر کسی نہ کسی درجے اور ڈگری کا دینی ضرر بہرحال موجود
تھا۔ کم سے کم اسے مستحسن وپسندیدہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔
یہ صاف طور پر ختمی مرتبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے دامنِ اقدس پر چھینٹے اُڑانا ہے۔ پس منظر یہ ہے کہ مولنا
مودودی نے اپنے مضمون میں اس امرِ واقعہ کا ذکر کیا تھا کہ
کعبہ پر غلاف چڑھانے کے رواج کو رسول اللہ علیہ وسلم نے
باقی رکھا لہٰذا اس کی مشروعیت میں اختلاف کا سوال ہی
پیدا نہیں ہوتا۔ مولانا اصلاحی اس کا رد فرماتے ہوئے اس
خیال کو بالکل بے بنیاد بتلاتے ہیں کہ غلاف شعائر اللہ میں سے
ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ کہتے ہیں کہ اسے شعائر اللہ میں شمار
کرنا بدعت ہے۔

سچ پوچھئے تو موصوف کی یہی بات سچی ہے، لیکن چھوڑیئے اسے۔ دیکھنا خط کشیدہ فقرے کی زہریلی جڑوں کا ہے۔ مولانا اصلاحی کے لئے یہ تو ممکن نہیں تھا کہ تاریخ کو جھٹلا سکیں، لیکن چونکہ مولانا مودودی کا رد بہرحال کرنا تھا لہٰذا غلافِ کعبہ کی بھی دبی بھنچی تحقیر ان سے ممکن تھی کر گذرے اور جوشِ مخالفت میں یہ بھی نہیں دیکھا کہ اُبال کے چھینٹے کس دامنِ مطہر تک پہنچ گئے ہیں۔ چونکہ حضورؐ نے غلافِ کعبہ کی دیرینہ رسم کو قائم رکھنا پسند فرمایا لہٰذا یہ تو کھل کر کیسے کہا جا سکتا تھا کہ اس رسم میں دینی ضرر اور قباحت و شناعت ہے لیکن یہ بہرحال کہہ گذرے کہ ہاں کوئی خاص دینی ضرر اس میں نہیں ہے۔ کیا یہاں ہم حلقۂ تدبر قرآن کے بلند بانگ قائد کو قرآن کی ایک آیت یاد دلائیں؟

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (النساء)	قسم ہے تیرے رب کی وہ صاحبِ ایمان نہ ہوں گے اگر تجھے ہی اپنے اختلافات میں قاضی و حَکَم نہ بنائیں پھر جو کچھ تو فیصلہ کر دے اس کے قبول میں ان کے دلوں میں ذرا بھی تنگی نہ پائی جائے اور خوش دلی کے ساتھ اسے مان لیں۔

+ + + +

حضورؐ نے غلاف کعبہ کی رسم کو قائم رہنے دیا۔ اہل علم جانتے ہیں کہ یہ قائم رہنے دینا ہی بجائے خود اس کے مرادف ہے کہ حضور کے نزدیک یہ رسم قباحت سے مبرا اور استحسان و استحباب کی سرمایہ دار تھی۔ جب حضورؐ نے اسے باقی رکھنے کا فیصلہ فرما دیا اور پونے چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ اس فیصلے پر امت کے تعامل اور مداومت کا اعلان کر رہی ہے تو اُن لوگوں کے تزکیۂ نفس نہیں بلکہ ایمان ہی کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے گی جو اس فیصلے کو خوش دلی سے نہیں بلکہ با دلِ ناخواستہ و استکراہ کے ساتھ قبول کر رہے ہوں۔

ہمیں معلوم ہے کہ مولانا اصلاحی اور ان کے ہمنوا کبھی نہیں تسلیم کریں گے کہ مذکورہ خط کشیدہ فقرہ انھوں نے اس مفہوم میں کہا تھا۔ تسلیم کرنے کا تو مطلب یہ ہوگا کہ دن دہاڑے اپنے منہ پر سیاہی مل لیں لیکن تسلیم اور اعتراف نہ کرنے سے حقائق تو نہیں بدلا کرتے۔ انسان کے ذہن اور حقیقی جذبات کا بیرومیٹر دراصل وہی الفاظ و عبارات ہوا کرتے ہیں جو لاشعوری طور پر بے ساختہ زبان و قلم سے نکل جائیں جس طرح شرابی نشے میں، تپ زدہ ہذیان میں اور سونیوالا خراٹے میں بلا ارادہ اپنا دل زبان پر لے آتا ہے اسی طرح بے اختیار نکلنے والے الفاظ میں آدمی کا باطن سمٹا ہوا ہوتا ہے۔ مولانا اصلاحی شعوری طور پر تو یہ کہنے کی جرأت کبھی نہیں کر سکتے کہ غلافِ کعبہ کی جس رسم کو حضورؐ نے بقاء و ثبات سے نوازا اس میں حسن و جمال کا شائبہ تک نہیں تھا، بلکہ کسی نہ کسی درجے کی قباحت پائی جاتی تھی، لیکن جو الفاظ ان کے قلم گوہر رقم سے ٹپکے ہیں وہ بہرحال اسی ذہنیت کے آئینہ دار ہیں کہ مولانا مودودی کی تغلیط میں غلافِ کعبہ کو جتنا بھی حقیر ٹھیرایا جا سکے ٹھیرا دو۔ ایک طرف کہا گیا کہ غلاف کعبہ شعیرہ ہے ہی نہیں اسے شعائر اللہ کی فہرست میں لکھنا بجائے خود بدعت ہے۔ دوسری طرف فرمایا گیا کہ اس میں کسی خاص دینی ضرر کا پہلو نہیں ہے۔ یعنی دینی ضرر تو ہے مگر معتدبہ نہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کیا یہی طور طریق "تزکیۂ نفس" کے مظہر ہوا کرتے ہیں؟ حریف کے پیچھے تالی بجا دو چاہے اپنی بغلیں ننگی ہو جائیں!

بدترین شخص وہ ہے جو اپنی کہے اور دوسروں کی نہ سُنے مولانا مودودی بار بار کہے جا رہے ہیں کہ غلافِ کعبہ کا زیر بحث ہنگامہ کوئی ایسا ہنگامہ نہیں تھا جسے کسی اچھے یا بُرے مقصد سے میں نے یا میری جماعت نے خود شروع کیا ہو۔ ہم نے شرکت تو صرف اس وقت کی جب مشیت کے پیدا کردہ حالات کے تحت عوام نے اس ہنگامے کا تار خود ہی چھیڑ دیا اور ناممکن ہو گیا کہ ان کے طوفانی جذبے پر ہم روک لگا سکیں۔ اس وقت ہم نے شرکت کی اور اس مقصد سے کی کہ جس ہنگامے کو چار و ناچار ہونا ہی ہے اسکے سیلِ بے مہار کو حتی الوسع غلط راہوں پر جانے سے بچائیں اور پھٹ پڑنے والے طوفان کو کم سے کم غیر ضرر رساں

رُخ پر بہالے جائیں۔

لیکن مولانا اصلاحی جیسے لوگوں کا واویلا برابر جاری رہے گا۔ وہ یہی رٹ لگائے جائیں گے کہ یہ ہنگامہ پہلے سے اسکیم بناکر سیاسی استحصال اور گھٹیا اغراض کی خاطر برپا کیا گیا۔ ذرا مولانا اصلاحی کے اختتامی فقرے دیکھئے کیسے صفائے روحانی، تزکیۂ نفس اور اخلاق حسنہ کے فوارے ان سے اُبل رہے ہیں۔

"ہر زمین ہر چیز کی کاشت کے لئے موزوں نہیں ہوا کرتی۔ ایک زمانے تک تو ہمارے یہ احباب (جماعت اسلامی والے) اس زمین میں توحید کی کاشت کے لئے جدوجہد کرتے رہے لیکن تجربے نے ان کو بتایا کہ اس سنبل کی کاشت کیلئے یہ زمین شور ہے البتہ غلاف کعبہ کی برکت سے ان دوستوں پر اس زمین کی نئی صلاحیتوں کا انکشاف ہوا ہے اب دیکھئے شرک و بدعت کی فصل اُگانے اور بڑھانے میں ان کا رول کیا رہتا ہے۔ اس میدان کے دوسرے حریفوں کا ریکارڈ توڑتے ہیں یا اس میں بھی پھسڈی ثابت ہوکر خسر الدنیا والآخرۃ کے مصداق ٹھیرتے ہیں۔"

ہے کوئی حد اس الزام تراشی، اس سوء ظنی، اس فقرے بازی کی؟ ــــ اُن اذیت پسند ساسوں کی طرح جو بہوؤں کی ہر جنبش و حرکت میں سو طرح کے کیڑے ڈالتے رہنا اپنا فرض منصبی خیال کرتی ہیں مولانا اصلاحی بھی جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے باطن کی مکروہ سے مکروہ تصویر پیش کرنا اولین فریضہ سمجھنے لگے ہیں۔ ورنہ منصف مزاج اور خداترس لوگ بے پر کے کبوتر اُڑانے کا شغل کبھی نہیں کیا کرتے۔ کاش مولانا اصلاحی سوچیں کہ اس طرح کے خفیف طریقوں سے وہ اپنی عظمت کا لوہا نہیں منوا سکتے بلکہ ڈر ہے کہ یہ اطوار کہیں ان کی بچی کھچی عظمت کا بھی کفن نہ بن جائیں۔

اے اللہ! ہر مومن کو "ہم چو ما دیگرے نیست" کے خناس سے بچا اور ہر واعظ کو خود اپنی اصلاح کی توفیق دے۔ مولانا اصلاحی بڑی صلاحیتوں اور بڑے کام کے آدمی ہیں لیکن ہدایت اور گمراہی، توفیق اور بے توفیقی سب تیرے ہی ہاتھ ہے۔ تو ہی ہے جو اس ہیرے کو سیاہ کیچڑ کی تہوں میں بیٹھ جانے سے بچا سکتا ہے۔

شمس پیرزادہ

بات چل ہی رہی ہے تو ہم ایک اور دلچسپ کہانی چھیڑیں گے ایک صالح بزرگ ہیں "شمس پیرزادہ"۔ یہ حلقۂ بمبئی کے امیر جماعت اسلامی ہیں اور ان کی نیک شہرت ہی کی بناء پر ہم انھیں "بزرگ" کہہ رہے ہیں ورنہ عمر کا ہمیں علم نہیں۔ اندازہ یہی ہے کہ عمر میں بھی ہمارے بزرگ ہی ہوں گے۔ خیر سے ایک خوشنما اور پاکیزہ قسم کا مقالہ انھوں نے بھی غلاف کعبہ کے موضوع پر شروع ہی میں سپرد قلم فرمایا تھا اور وہ روزنامہ "دعوت" میں چھپکر ہمارے بھی زیب مطالعہ ہوا تھا۔ مطالعہ کے بعد ایک بے اختیار مسکراہٹ کے ساتھ ہم نے اخبار ایک طرف رکھدیا۔ یہ مسکراہٹ دراصل ان کی سادہ لوحی پر اُبھری تھی۔ نیکی اور علم اور چیز ہے، لیکن تفقہ! ـــ یہ نعمت عام کہاں۔ وہ اگر فقیہ ہوتے تو قلم اٹھانے سے پہلے فوراً ان کا ذہن اس آیت کی طرف جاتا:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ ۔ (الحجرات)

اے اہل ایمان! اگر تمھارے پاس کوئی فاسق خبر لیکر آئے تو ذرا تحقیق کر لیا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ نادانی سے کسی قوم پر چڑھ دوڑو اور بعد میں اپنے کئے پر پچھتاؤ

اہل بصیرت جانتے ہیں کہ آیات قرآنیہ کبھی آؤٹ آف ڈیٹ نہیں ہوتیں اور ان کے مصداق و مفہوم [illegible] بڑے وسیع ہوتے ہیں۔ یہی آیت کہنے کو تو ایک خاص زمانے اور خاص واقعے سے متعلق ہے لیکن کیا یہ آج بھی ہمیں یہ درس نہیں دیتی جس اظہار رائے اور نقد و نظر کا تعلق واقعات سے ہو

دادِ تحسین دینے سے قبل خود واقعات کی تحقیق کا حق۔ داکرو۔ گستاخی معاف آج کل کے اخبارات و رسائل تو عموماً ایسے شاندار فاسق ہیں کہ منہ پر جھوٹ بولیں اور ذرا نہ شرمائیں۔ ان بیچاروں کا بیشتر فسق لاشعوری ہوتا ہے جس کی جڑیں مردود الشہادۃ قسم کی ایجنسیوں اور نامہ نگاروں کے پیٹ میں اُتری ہوئی ہوتی ہیں مگر تھوڑا سا فسق شعوری بھی ہوتا ہے۔ گاہے گاہے یہ جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں۔ یا کسی "سچ" پر اپنے میلانات کا ایسا ملمع چڑھاتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ کبھی چیونٹی سے ہاتھی اور کبھی ہاتھی سے چیونٹی بن جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ شمس پیرزادہ کی معصوم سادہ لوحی اگر بیدار ذہنی سے تال میل رکھتی تو انھیں قلم اُٹھانے اور ایک عظیم قائد و مفکر کو سبق سکھانے سے پہلے صبر و حلم کے ساتھ تحقیق کرنا چاہیئے تھا کہ جو لوگ جماعت اسلامی اور مولٰنا مودودی کے خلاف ہمیشہ کمانوں کے چلّے چڑھائے رہتے ہیں وہ اگر کسی واقعے کا ڈھول پیٹ رہے ہیں تو اس کی پوست کندہ حقیقت کیا ہے۔ روایات کا تو یہ حال ہے کہ بات ایک منہ سے دوسرے منہ تک جاتے جاتے کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ پھر قضیہ کو سوں دُور کا ہو، اور خبر رسانی کی خدمت وہ لوگ انجام دے رہے ہوں جن کے کردار کا کوئی معتد بہ علم اس کے سوا ہمیں نہ ہو کہ مولٰنا مودودی کی کسی خطا کے ایک باریک سے نقطے کو چیانٹی کی طرح پھیلاتے چلے جانے میں انھیں یدِ طولیٰ حاصل ہے تو آخر کہاں کا انصاف اور کیسی دانشمندی ہے کہ فوراً ہماری رگِ صالحیت پھڑکے اور کھٹ سے ہم نقد و نظر اور تحکیم و تحکم کی دکان سجا کر بیٹھ جائیں۔

پیرزادے صاحب نے تو حد ہی کر دی ہے کہ حاصل کلام کے طور پر فرماتے ہیں:۔

> "مولانا مودودی کی نیت پر شبہ کئے بغیر یہ سمجھتا ہوں کہ ان کا اجتہاد سراسر غلط ہے اور بہتر یہ ہے کہ مولٰنا اس سے رجوع فرمالیں۔"

کوئی پوچھے محترم پیرزادے! کہاں کا اجتہاد اور کیسی بدعت جب کہ مولانا مودودی سرے سے جشن زیارت کے محرک و مجوز ہی نہیں تھے۔ ہاں اگر مولانا مودودی کا فقط اتنا کہنا ہی "اجتہاد" کا ہم معنی ہے کہ غلافِ کعبہ کے شوقِ دیدار میں جوق در جوق نکل پڑنا جائز ہے اور اسی پر پیرزادے صاحب بار بار احتجاج کرتے ہیں کہ کتاب و سنت یا قرنِ اولیٰ کے تعامل سے یہ فعل ثابت نہیں تو کل کیا وہ یہ نہ کہیں گے کہ تاج محل یا قصر الحمراء یا شاہی مسجد کو کئی کئی آدمیوں کا مل کر دیکھنے جانا قرونِ اولیٰ سے ثابت نہیں لہذا یہ بھی بدعت ہے۔

گستاخی معاف۔ بدعت کے لئے اگر آپ کی ذکاوت حس کا یہی عالم ہے تو یہ کیا بات ہے کہ اپنے نامِ نامی کے ساتھ "پیرزادہ" لکھنے کی بدعت نے آپ کی قوتِ شامہ کو کوئی دُکھ نہیں پہنچایا۔ قرآن و سنت یا قرونِ اولیٰ کے تعامل سے قبیلہ و خاندان یا مولد و وطن کی طرف ناموں کی نسبت کا ثبوت تو ملتا ہے لیکن "پیرزادہ" اور "ابن القطب" جیسے عزت مآب نام نہیں ملتے۔ ہو سکتا ہے آپ کے والد یا دادے پیر ہی رہے ہوں لیکن اس امتیاز کو نام ہی کا ٹانک لینا اگر نمود و نمائش، تفوق پسندی اور تفاخر کے دائرے میں نہیں آتا تو کم سے کم بدعت ضرور کہلائے گا۔ راقم الحروف کے والد بھی بفضلہ تعالیٰ پیر ہی تھے۔ نہ صرف والد بلکہ اور بھی کئی خاندانی اکابر شیخ، علامہ اور مرشد ہو گزرے ہیں مگر ہمیں تو کبھی نہ سوجھی کہ خدا کی اس دین سے ایسا ہی فائدہ اٹھا جائیں جیسا آپ اٹھا رہے ہیں۔ سوجھ جاتی تو آپ ہی کہتے کہ یہ بدعت ناقابلِ برداشت ہے پھر یہ کیسی ذکاوتِ حس ہے کہ ہزار میل دُور سے تو آپ نے مولانا مودودی کی بدعت سونگھ لی لیکن رگِ گلو کے قریب جو مادہ سڑ رہا ہے اس کی لہک نہ پا سکے۔

"پیرزادہ" آخر ہے کس چڑیا کا نام؟ راستہ چلتے سے پوچھ لیجئے آپ کا نام سنکر وہ یہی کہے گا کہ کوئی بریلوی بزرگ ہوں گے۔ الفاظ کا اگر کوئی مزاج ہوتا ہے تو آپ کو خود بھی اور آپ کی جماعتِ اسلامی کو بھی غور کرنا چاہیئے کہ "پیرزادہ" جیسے القاب کو نام کا دُم چھلّا بنالینا کس حد تک متانت و ثقاہت سے ہم آہنگ ہے اور کہاں تک یہ جماعت اسلامی کے مزاج و مذاق سے جوڑ کھاتا ہے۔

گہے بر طارمِ اعلےٰ نشینم ✤ گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

ایک بات رہ گئی۔ ہم نے کہا تھا کہ جب پیرزادے صاحب کا مضمون ابتداءً ہم نے پڑھا تھا تو مسکرا کر رکھ دیا تھا۔ پھر یہ آج جو ہمیں اس کا ذکر کرنے کی سوجھی ہے تو اس کی لِم یہ ہے کہ چشمِ بد دور "الفرقان" نے بھی اسے اپنی تازہ اشاعت میں نعمتِ غیر مترقبہ کے طور پر نقل کیا ہے کرنا ہی چاہیئے تھا۔ ہند و پاک میں بہت لوگ ایسے ہیں جنھیں مولانا مودودی کے گوشت سے زیادہ مزیدار غذا کوئی نہیں لگتی۔ اس کا پارچہ ہاتھ لگ جائے تو کباب بنا کر کھاتے ہیں۔ نہ لگے تو نوچ نوچ کھانے سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ اب یار لوگ پیرزادے کا مضمون اچھال رہے ہیں تو ہمارا بھی جی چاہا کہ ذکرِ خیر کر ہی دیں۔ ذکرِ خیر سے زیادہ کچھ لے دے کرنا اس لئے درست نہیں کہ بنیاد ہی جب کسی محل کی زمین پر نہ ہو تو بام و در کی قیمت معلوم! پیرزادے صاحب نے چند اخبار دیکھ کر کچھ واقعات فرض کر لیے۔ پھر بدعت و سنت کی بحث شروع کر دی۔ وہ دیگر سطح بینوں کی طرح ہنگامۂ غلاف کو "تعبد" ہی سے جوڑ رہے ہیں اور نصیحت کر رہے ہیں کہ تعبدی معاملات میں قیاس سے کام لینا صحیح نہیں ہے۔ اب ہم کتنی مرتبہ دہرائیں کہ اے دانشورو یہ ہنگامۂ عبادت نہیں تھا۔ اس کا جوہری تعلق عبادت سے کچھ نہیں۔ یہ تو رفعِ استعجاب کے فطری شوق کا ایک مظہر تھا اور بس۔ اگر یہ کارِ ثواب کے طور پر حصولِ اجر و برکت کے لئے برپا کیا گیا ہوتا تو سب سے بلند بانگ مخالف خود ہم اس کے ہوتے۔ کیوں بربادیِ وقت کا ایک نیا سامان اس بحث کے ذریعہ امت کے لئے پیدا کر رہے ہو خاص طور پر پیرزادے صاحب سے ہم عرض کریں گے کہ مولانا مودودی بھلے سے پاکستان جا چکے ہوں اور وہاں سے یہاں کی جماعت کا کوئی عملی ربط نہ رہا ہو، لیکن دینی معاملات میں ذہنی قیادت اور تحریک کی تنظیم و تاسیس کا جو شرف انھیں حاصل ہے کیا وہ بھی اس جغرافی حد بندی نے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا — اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو اپنے ایک محسن اور ذہنی قائد پر زبانِ اعتراض دراز کرنے سے پہلے جماعت اسلامی کے ایک عہدیدار کو تحقیقِ حال کا فریضہ ضرور ادا کرنا چاہیئے تھا۔ اس کا کوئی قابلِ اطمینان ذریعہ نہیں تھا تو صبر کرتے۔ آخر حکیم نے نسخے میں تو نہیں لکھ دیا کہ غلافِ کعبہ کی بحث میں فوراً حصّہ لو اور ہزار میل دور بیٹھ کر اس صدی کے ایک ممتاز اسلامی مفکر کو ایسا مشورہ ضرور دو جس کے پیر ہی نہ ہوں۔

اسی سلسلہ کا ایک خط

جناب عالی قدر زید رافتکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ
مزاج گرامی؟

اولاً۔ میں خواستگارِ معافی ہوں کہ آنجناب کی مصروفِ مفید کار توجہ میں مخل ہو رہا ہوں۔

ثانیاً۔ یہ کہ "غلافِ کعبہ" کے سلسلے میں جناب والا کے زورِ بیان اور گرمیِ تحریر مندرجہ "تجلی ماہ مئی ۶۳ء" کے مطالعہ کے بعد جناب شمس پیرزادہ صاحب کے زاویۂ فکر اور اظہارِ خیال مندرجہ الفرقان مئی ۶۳ء (جس کی ادا اس بے مایہ اور ہیچمداں کی نظر میں شاید سنجیدہ بھی ہے اور ٹھنڈی بھی) کو حوالہ میں پیش کرنے کی جسارتِ بے جا کا مرتکب ہوتے ہوئے جناب ہی کے مضمون "توحید نمبر فاران" صفحہ ۲۳۶ میں مندرجہ ذیل عبارت توضیحاً ملاحظہ عالی میں پیش ہے:-

> "دین کے رنگ میں رنگی ہوئی مصفا ترین بصیرت خوب دیکھتی ہے کہ جو طریقے ابتداء میں نہایت خلوص و للہیت سے نکالے جاتے ہیں وہی کچھ عرصہ بعد کیا سے کیا ہو جاتے ہیں۔۔۔" اور صفحہ ۲۵۶ میں:-

> "توحیدِ حقیقی کی حقیقت و لذت سے بے خبر اور اسلام کی روح سے ناواقف لوگ کسی طرح ان حدود میں رہنا گوارا نہیں کرتے جو اللہ نے اپنے رسولؐ کے واسطے سے صریح اور جلی طور پر متعین فرما دی ہیں۔"

تو کیا جناب کا یہ اظہار جناب شمس صاحب کی تائید میں نہیں ہے؟ جناب والا کا یہ کلیہ عام (جو عوام کی نفسیات کا حقیقی اور اٹل ترجمان ہے) تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کسوٹی ہی پر کیا حق

طومار کو نہ جانچا جائے؟ بادی النظر میں یہ ایک وسوسہ سا دل میں پیدا ہوا ہے جو پیش ملاحظہ گرامی ہے۔

بہر تقسیم صاد کن وخواہ عتاب

معافی کا خواستگار

محمد مظہر اللہ۔ خریداری ۳۴۹۹۔ اعظم پورہ۔ نمبر ۵۷ A

حیدر آباد (۱۰) مورخہ ۲۶/۵/۶۳

جواب:۔

وعلیکم السلام

بے شک پیرزادے صاحب کی ادائے نگارش سنجیدہ بھی ہے اور ٹھنڈی بھی۔ لیکن لفظی سنجیدگی اور لب ولہجے کی ٹھنڈک اس بات کی ضمانت نہیں ہوا کرتی کہ معنوی گہرائی بھی پائی جا رہی ہو۔ ایک سوال ہم آپ سے کرتے ہیں۔ یہ جو پیرزادے صاحب حافظ ابن حجر کے توسط سے حضرت عائشہؓ کے ایک فیصلے کو غلافِ کعبہ کے یکسر غیر محترم اور بے حیثیت ہونے کے ثبوت میں پیش کر رہے ہیں تو اسی منطق سے کیا آپ یہ بھی مانیں گے کہ جو لباس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہن کر اُتارا تھا وہ بھی یکسر غیر محترم، بے حیثیت اور اس درجہ معمولی تھا کہ اس سے برکت حاصل کرنے کے خیال ہی کو آپ اسی طرح بدعت ومعصیت قرار دیں گے جس طرح غلاف کعبہ کے احترام کو دے رہے ہیں؟

اگر دیں گے تو پھر اُن صحابہ کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے گی جو اس لباس کو آنکھوں سے لگاتے تھے جو اسے جزوِ کفن بنانا سعادتِ کبریٰ سمجھتے تھے، جن کی نگاہ میں یہ ایک معظم اور عزیز ترین شے تھی؟

اور اگر نہیں دیں گے تو پھر یہ بات آپ کا دماغ کیسے قبول کرتا ہے کہ رسولؐ کے جسم سے مس ہو کر تو کوئی لباس محبوب و محترم بن جائے، لیکن بیت اللہ کی زینت بننے کے بعد اس میں کسی بھی درجے کی محبوبیت وحرمت نہ آئے؟

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اگر یہ فرمایا ہے کہ غلاف کعبہ جب بیت اللہ سے اتر گیا تو اس کے کپڑے کو حائضہ اور جُنبی افراد پہن سکتے ہیں ۔۔ تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ زمانۂ حیض یا حالتِ جنابت کی ناپاکی چونکہ ظاہری ومرئی غلاظت نہیں ہے اس لئے اس کپڑے کے جسم پر پڑ جانے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن یہ مطلب تو نہیں ہے کہ اس کپڑے سے خونِ حیض یا مادۂ منی کا پوچھنا یا اسے فرش کے طور پر پیروں میں روندنا بھی درست ہے۔ غلط سمجھتا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ جسمِ رسولؐ یا بیت اللہ سے ہمکنار ہونے کے بعد بھی کسی کپڑے میں شمہ برابر تقدیس، برکت اور خصوصیت پیدا نہیں ہوتی۔

رہی ہماری وہ عبارت جو آپ نے بطور معارضہ نقل کی ہے تو ذرا گہرائی سے غور کیجئے تو کوئی تعارض باقی نہیں رہیگا بدعت کی بحث تعبدی اُمور میں اُٹھی ہے۔ دین میں کوئی نئی بات گھڑنا بدعت ہے۔ جو کچھ ہم نے اپنے محوّلہ بالا مضمون میں یا کسی اور تحریر میں بدعت سے متعلق کہا ہے اس کا جوڑ ایسے ہی اُمور سے ہے جو ثواب وبرکت کی غرض سے گھڑے جائیں اور پھر انھیں رواجِ مستقل بنا لیا جائے جیسے میلاد، فاتحہ خوانی، نیاز، قبروں کے میلے وغیر ذلک۔ لیکن غلافِ کعبہ کا ہنگامہ جدا نوعیت کا تھا۔ وہ ثواب وبرکت کے حصول کی نیت سے نہیں برپا کیا گیا۔ وہ دینی اطوار وافعال کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تو آدمی کے تفریح پسند مزاج، ندرت پسند طبیعت، عجوبہ پسند فطرت اور رفع استعجاب کے جبلّی تقاضے کا مظہر تھا۔ شہروں میں بڑی بڑی نمائشیں ہوتی ہیں ابھی دلّی میں بین الاقوامی نوع کی نمائش ہوئی تھی جس میں اکثر ممالک نے اپنے پویلین لگائے تھے۔ امریکہ اور روس وغیرہ کے پویلین پر تماشائیوں کا ٹھٹ لگا رہتا تھا۔ ان میں مسلمان بھی بے شمار ہوتے تھے تو کیا ان سب کو بدعتی کہیں گے؟

اگر نہیں کہیں گے تو خوب سمجھ لیجئے کہ اندر کی جو تحریک ترغیب انھیں پویلین میں کھینچ لے گئی تھی اصلاً وہی غلافِ کعبہ کے ہنگامے کی جڑ بنیاد ہے۔ تعبدی حسیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ پویلین کی بجائے لوگ کسی نئی مسجد کو دیکھنے جوق در جوق جائیں تب بھی یہ فعل تعبدی نہیں کہلائے گا۔ حالانکہ دیکھئے مسجد سے بڑھ کر دینی حسیات کا جوڑ کس چیز سے ہوگا۔

حاصل یہ کہ فقیہہ کو سطح کے نیچے اُتر کر اُمورِ مختلفہ کے

لطیف و نازک فرق کو سمجھنا پڑتا ہے ورنہ گھوڑا گدھا سب ایک لائن میں آجائیں۔ جو شخص ائمہ و فقہاء کے مناہج فکر اور طرقِ اجتہاد پر نظر رکھتا ہے اس کے لئے یہ کوئی حیرت اور تشویش کی بات نہیں کہ ایک ہی نوع اور ایک ہی شکل و صورت کے متعدد مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کا حکم لطیف و خفی وجوہ کی بناء پر بدل جائے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ گاڑی جب کانٹا بدلتی ہے تو اس کا آغاز نقطہ ایک نقطے سے ہوتا ہے۔ یہ نقطہ کتنا ہی موہوم ہو لیکن پھیل اور بڑھ کر گاڑی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔ ایسا ہی معاملہ قانونِ شریعت کا ہے۔ مناط و علت کا خفی تر فرق بھی بعض اوقات نہایت وسیع اور گوناگوں نتائج کا حامل ہو جاتا ہے۔

آپ ممکن ہے ہماری معروضات کو پوری طرح نہ سمجھ سکیں۔ اس صورت میں دو ہی طریق ہیں۔ یا تو ہمارے نکتہ نظر پر اعتماد کر کے شکوک و شبہات کو دل سے نکال پھینکئے یا پھر جس کے فکر و نظر پر آپ کو بھروسا ہو اس کی پیروی کیجئے یہ بہت مشکل ہے کہ ہم جس فکری سطح پر بات کر رہے ہیں اس تک پہنچے بغیر کوئی ہمارے خیالات کا وزن محسوس کر سکے۔

دوسرا خط

(مکتوب نگار کی خواہش ہے کہ ان کا نام و پتہ نہ شائع نہ کیا جائے)

محترمی جناب ایڈیٹر صاحب ماہنامہ تجلّی دیوبند

السلام علیکم۔ مزاج گرامی ؟

احوال آنکہ فدوی عرصہ قریباً نو ماہ سے ماہنامہ تجلّی کا مطالعہ کر رہا ہے اور چونکہ یہ ماہنامہ غیر جانبدارانہ پالیسی رکھتا ہے (یعنی مذہبِ اسلام کی خدمت کرنے کے لئے اس رسالہ نے کسی بڑے سے بڑے آدمی کو بھی معاف نہیں کیا اگر کسی نے کوئی غلط بات کہدی تو آپ کے قلم نے اُس کی نشاندہی کر دی) موجودہ دور کے علمائے کرام میں خصوصاً اور عوام میں اختلافاتِ فروعی و بنیادی کا جو سیلاب آیا ہوا ہے اُسے روکنے کے لئے تجلّی نے بہت کوشش کی ہے اور کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ تجلّی کو دین اسلام کی خدمت کرنے کے لئے اور ترقی دے اور مولانا عامر عثمانی صاحب اور دیگر معاونین حضرات کو جزائے خیر دے۔ آمین۔

محترمی مولانا صاحب میں اب آپ کی خدمت میں ایک عرض داشت پیش کرنا چاہتا ہوں امید ہے آپ راقم الحروف کی عرضداشت پر توجہ مبذول فرمائیں گے۔

آج بندہ کو آپ سے اس لئے مخاطب ہونا پڑا ہے کہ ماہ مئی کے شمارہ ماہنامہ تجلّی میں آپ نے غلافِ کعبہ کو آغاز سخن کا موضوع بنا کر اس مسئلہ کو بہت اچھالا ہے۔ معاف کرنا۔ میں نے اس مضمون کا ایک ایک حرف پڑھا ہے اور میں نے یہ سمجھا ہے کہ آپ خود بھی جذبات کی تیز رَو میں بہہ گئے تھے ورنہ مجھے یہ اُمید نہیں تھی۔

میں یہ جانتا ہوں کہ آپ نے صرف اعتراضات کے جواب دیئے ہیں اور آپ کے جوابات بہت صحیح اور برمحل تھے لیکن ایک اعتراض جو کہ بنیادی تھا اُس کا جواب گول کر گئے۔۔۔۔ وہ اعتراض یہ تھا کہ منتظمینِ جماعت اسلامی اپنے مسلمان بھائیوں کے موجودہ احوال و اطوار اور ماحول سے پوری طرح باخبر تھے اور اپنی بے بسی و مجبوری کا حال بھی جانتے ہوں گے کہ اتنے بڑے مجمعوں میں نہ تو انکی اپیل چلے گی اور نہ ہی کوئی پختہ سے پختہ دلیل۔ نیز یہ بھی ضرور جانتے ہوں گے کہ اہل بدعت ایتاوار ضرور کریں گے۔ (اور یہ بھی بعید از امکان نہیں ہے کہ اہل بدعت حضرات غلاف کعبہ کی زیارت کو بنیاد بنا کر پھر نیا کوئی مسئلہ بدعت پیدا کر دیں) اس لئے جماعت اسلامی کے اکابر علماء کو سرپرستی (زیارت کرانے کی) نہیں کرنی چاہئے تھی۔

زیارت غلاف کعبہ کو میرے خیال میں آجتک کسی نے بدعت نہیں کہا بلکہ واقعاتِ بدعت ہی کو بدعت کہا گیا ہوگا یا ذریعۂ بدعت (موجودہ ماحول میں)

اب آپ ہی بتلایئے کہ کیا ان لوگوں نے (مخالفین زیارتِ غلافِ کعبہ) صحیح بات نہیں کہی تھی اور اگر غلط بھی ہو تو آپ کو حسن ظن رکھنا چاہئے تھا نہ کہ سوءِ ظن۔

نیز اُن حضرات کا مقصد یہ تھا کہ آئندہ کبھی ایسا نہ ہو جب تک موجودہ فضا قائم ہے۔ حالات اور خیالات بدلنے سے یہ کام پھر بھی شروع کیا جا سکتا ہے۔

آپ کی اطلاع کے لئے یہ بھی عرض کر دوں کہ بندہ خود بھی اپنے گھر سے ۲۰ میل دُور شہر کیمبل پور میں صرف زیارت غلافِ کعبہ کے لئے گیا تھا۔ عقیدت اور سائنس کے ملے جُلے جذبات کے تحت۔

جواب:۔

تجلّی نے حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے کی جو صبر آزما راہ پہلے دن سے اختیار کی تھی الحمد للہ وہ آج تک اسی راہ پر چل رہا ہے۔ کسی خاص مسئلہ میں اگر کچھ لوگوں کی تشفی ہماری معروضات سے نہ ہو سکے تو انھیں فی الفور یہ فیصلہ نہیں کر لینا چاہئیے کہ ہم معقولیت کا دامن چھوڑ کر جذبات کی راہ پر لگ گئے ہیں۔

حیرت ہے مئی کے آغازِ سخن کا ایک ایک حرف پڑھ لینے کے بعد بھی آپ کہہ رہے ہیں کہ ہم کسی بنیادی اعتراض کو "گول" کر گئے ہیں۔ حالانکہ ایک منصف مزاج اور فہیم آدمی کے لئے یہ آغازِ سخن ہر پہلو سے تشفی بخش تھا اور اس اعتراض کا بھی شافی جواب اس میں موجود تھا جسے آپ کی دانست میں "گول" کر دیا گیا ہے۔

خیر اب براہِ راست اپنے مکتوب کا جواب سُنئیے:۔

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی اپنے مسلمان بھائیوں کے احوال و اطوار سے واقف ہی تو تھے جس کی وجہ سے انھوں نے دفعتہً آگے بڑھ کر اُس ہنگامۂ جشن و زیارت کے اہتمام و انصرام میں شرکت کر ڈالی جو کسی فرد یا جماعت کے منصوبے اور پروگرام کے بغیر ہاتھ پیر نکال رہا تھا اور جس کے بارے میں بجا طور پر اندیشہ کیا جا سکتا تھا کہ اگر اسے یوں ہی برپا ہونے دیا گیا تو بدعات و خرافات کے بڑے مکروہ مناظر سامنے آئینگے۔

مولانا مودودی نے واقعات کی جو تفاصیل بیان کی ہیں اگر ان پر ہی کسی کو اعتبار نہ ہو اور وہ مولانا موصوف کو دروغگو قرار دے تب تو ہمیں اس شخص سے کوئی گفتگو نہیں کرنی۔ لیکن اگر یہ تفاصیل مطابقِ واقعہ ہیں تو جشنِ غلاف کی جس سرپرستی اور انصرام کو اعتراض و ملامت کا ہدف بنایا جا رہا ہے ہمارے نزدیک وہ خراجِ تحسین کا مستحق ہے۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ناگزیر حالات و حوادث کے تحت اگر کوئی زلف دراز لعف برائی ظہور میں آنے والی ہو اور مصلحین کے لئے بروقت آگے بڑھ کر اس کی اصلاح ممکن ہو تو وہ ہرگز آگے نہ بڑھیں بلکہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے کونے میں بیٹھے رہیں؟

اگر ایسا چاہتے ہیں تو بہت غلط چاہتے ہیں اور اگر نہیں چاہتے تو جماعت اسلامی کی بروقت شرکت اور سرپرستی کو ہدفِ اعتراض بنانا اُلٹی گنگا بہانا ہے۔ اسے تو داد دیجئے کہ اس کی بروقت شرکت اور سعی و جہد سے جشنِ غلاف کا غلغلہ انداز ہنگامہ سلیقے میں ڈھل گیا۔ وہ ہاتھ پیر توڑے بیٹھی رہتی تو ہنگامہ تو بہرحال برپا ہونا ہی تھا لیکن نظم و نسق، ذکر اللہ اور صحتمند شوق و ذوق کے جو مظاہر اس میں سامنے آئے وہ کبھی نہ آتے، بلکہ ہڑبونگ، بدعت و معصیت اور وہی گراوٹ اس کا طرّۂ امتیاز بنتی جو درگاہوں کے سالانہ میلوں میں یا اسی نوع کے دیگر اجتماعات میں عموماً دیکھی جا سکتی ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ معترضین سے ہمیں حسنِ ظن رکھنا چاہئیے تھا۔ بجا فرمایا لیکن یہ آپ نے نہیں دیکھا کہ معترضین نے حسن ظن کے لئے بنیاد ہی کہاں چھوڑی تھی۔ ان کی عام حالت یہ رہی ہے کہ چھانٹ چھانٹ کر قبیح و مکروہ پہلوؤں کو اچھالتے رہے ہیں۔ حالات و کوائف کی جو تصویر انھوں نے اپنے قلموں سے بنائی ہے اسے دیکھئے اور پھر مولانا مودودی کی کھینچی ہوئی تصویر ملاحظہ فرمائیے۔ صاف معلوم ہوگا کہ معترضین فقط معائب، فقط مکروہات اور فقط بدنما پہلوؤں کو اُبھارنے میں سرگرداں اور روشن پہلوؤں پر پردہ ڈالنے میں کوشاں رہے ہیں۔ انصاف یہ تھا کہ خیر و شر کی مجموعی مقدار کا تقابلی مطالعہ فرماتے اور دیانت داری کے ساتھ واقعات کی صورت گری کرتے لیکن کٹ جائے زبان جو انھوں نے کسی روشن پہلو کا بھی منصفانہ اعتراف کیا ہو۔ ان کے قلمی کیمرے ننھے ننھے داغ دھبّوں کو اس طرح انلارج کر کے پیش کرتے گئے گویا حسن و جمال اور خیر و برکت کا تو اس پورے ہنگامے میں کوئی وجود ہی نہیں تھا لیکن مولانا مودودی نے

جو تفصیلات پیش کی ہیں وہ کچھ اور ہی ہیں۔ ان سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس ہنگامے میں غلبہ خیر ہی کا تھا۔ اتنا نمایاں غلبہ کہ اگر معترضین کے واضح فرمودہ داغ دھبّوں کو مطابقِ واقعہ بھی مان لیا جائے تو ان کی حیثیت اُس غلاظت سے زیادہ نظر نہیں آتی جو دریا میں گر کر کالعدم ہو جاتی ہے اور دریا کا مائے صافی جوں کا توں طاہر و مطہّر رہتا ہے۔

دوسری بڑی رکاوٹ حسن ظن کی راہ میں یہ تھی کہ ان حضرات نے اپنے قصائد کا مطلع ہی اس مضمون سے شروع کیا کہ یہ جشنِ غلاف مولانا مودودی کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے جو سیاسی استحصال اور مفاد پرستی کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ یہ مطلع سُنکر کون منصف مزاج حسن ظن پر قائم رہ سکے گا۔ خباثتِ نفس اور خدا فراموشی کا اس سے بڑا مظہر اور کیا ہوگا کہ کسی اقدام و عمل کی قرار واقعی تحقیق و تنقیح کے بغیر ہم ایک ایسے شخص کی نیت پر حملہ کرنے لگیں جسے زمین و آسمان اور چاند ستارے مدت سے داعیِ حق کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ مولٰنا مودودی کے بعض خیالات و مزعومات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن انھیں بدنیت، مفاد پرست اور بے کردار باور کرنا ذرّیاتِ شیطانی کے سوا کسی کا کام نہیں ہو سکتا۔ کوئی شخص بظاہر کتنا ہی صوفی، شیخ، قطب اور خضر صورت ہو لیکن اگر وہ مضبوط شواہد کے بغیر دوسروں کی نیت کو متہم کرتا ہے تو یقین کیجئے کہ اس کے قلب کے کسی گوشے میں شیطان نے آشیانہ بنا کر رکھا ہے۔ پھر بھلا ہم حسنِ ظن کی کوڑی کونسی تہہ سے لاتے۔ ایک مہینہ ہم نے صبر و ضبط کیا۔ اخبارات و رسائل دیکھ دیکھ کر غور و فکر کرتے رہے۔ خبروں، بیانوں، اعتراضوں اور واقعات کے گوناگوں پہلوؤں کو علم و فہم کے کانٹے پر تولا اور تب کہیں جا کر پورے اعتماد کے ساتھ اُس فیصلے پر پہنچے جسے مفصّل و مدلّل طور پر مئی کے آغازِ سخن میں پیش کر دیا گیا ہے۔ کہاں کی جذباتیت، جذباتیت تو یہ ہوتی کہ ہم بھی اعتراض و واویلا کے فلک شگاف غلغلے کی لَے سے لَے ملا لیتے۔ مگر ہم نے جذبات کے سرکش گھوڑے کی لگام پکڑ کر ٹھیک وہی کہا جو معقولیت کا تقاضا اور بے لاگ عدل کا مطالبہ تھا۔

آپ کی اپنی یہ روش بڑی پُر لطف ہے کہ ہمیں میل سفر کر کے غلاف کا دیدار کرنے بھی گئے اور خیر سے جشنِ یار ہی پر ناک بھوں بھی چڑھا رہے ہیں۔ محترم بھائی! اگر ایسا جشن مذموم تھا تو خود آنجناب نے اس کی رونق کیوں بڑھائی اور اگر مذموم نہیں تھا تو اس کے سرپرستوں پر اعتراض چہ معنی دارد؟

حاصل کلام یہ کہ اس بحث کو اب طاقِ نسیاں پر رکھئے ہم جو کچھ کہہ چکے وہ انشاء اللہ بارگاہِ عدل میں پتھر کی لکیر ہے۔ معقولیت کے ساتھ اگر کسی بزرگوار نے ہمارا تعقب کیا تو ہم دلائل کا سامنا کرنے کے لئے بالکل تیار ہیں، لیکن بوالفضولوں کی چرب زبانی کا نوٹس اس موضوع پر ہم نہیں لے سکیں گے۔

انگریزی اخبار

واقعہ کچھ بھی رہا ہو کہانی یونہی مشہور ہے کہ ایک حسین لڑکی نے ارسطو کی گردن میں اوڑھنی کی لگام ڈال کر اسے گھوڑا بننے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس کہانی سے بظاہر تو صنفی جذبے کی قوت کا اظہار ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تنہا صنفی جذبہ ہی وہ واحد جذبہ نہیں ہے جس کے آگے آدمی کے دل و دماغ ہتھیار ڈال دیتے ہیں بلکہ کوئی بھی جذبہ ہو جب وہ ساون کے بادلوں کی طرح شامیانہ بن کر دل و دماغ کی وسعتوں پر چھا جائے گا تو علم و فہم کی ساری صلابت اور ذہن و بصیرت کی تمام متانت غفلت کی گہری نیند سو جائے گی۔

لکھنؤ کے مشہور کانگریسی اخبار "قومی آواز" کے مدیر شہیر جناب حیات اللہ انصاری ایک فہیم، متین اور معقول آدمی ہیں۔ ان کے فکر و قلم کی صلاحیتوں سے انکار کون کر سکتا ہے۔ انھوں نے جب بھی ذہنی تعصبات اور جذباتی لگاؤ سے بالاتر ہو کر قلم چلایا ہے شعور و بصیرت کی فضا میں خاصے چمکیلے لہریے بناتے چلے گئے ہیں۔

لیکن اس دورِ نامسعود میں کسی بھی معقول سے معقول آدمی کا گوناگوں مسائل کے ہر اسٹیج پر تعصبات اور جذباتی غلو سے بالاتر رہنا آسان نہیں۔ اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ ہم قصد و شعور کی حد تک صاف، صد فی صد مخلص اور معقولیت پسند ہوتے ہیں، لیکن پس پردہ ہمارے تحت الشعور میں کوئی نہ کوئی جذباتی گرہ ایسی پڑی ہوئی ضرور ہوتی ہے کہ ہم کسی سیدھے راستے پر مستقیم انداز میں چلنے کے قابل نہیں رہتے اور ہمارا اخلاص، ہمارا حسنِ نیت، ہماری متانت اور ہمارا جذبۂ عدل گستری منطقی تضاد کے الجھادے سے بچ نہیں پاتا۔

یہ تمہید ہم نے جناب حیات اللہ انصاری کے اس اداریئے پر مختصر سی گفتگو کرنے کے لئے اٹھائی ہے جس کے مطالب ہم تک ۲۶ اور ۲۷ مئی ۱۹۶۳ء کے روزنامہ "دعوت" کے ذریعہ پہنچے ہیں۔ گو کہ مدیر دعوت ان مطالب پر حق گفتگو ادا کر چکے ہیں لیکن ہم یہاں صرف اس نفسیاتی پہلو کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں کہ حماقت ہمیشہ احمق ہی نہیں کرتے اور بچکانہ حرکتیں صرف بچوں ہی سے سرزد نہیں ہوتیں بلکہ جذباتی لگاوٹوں کی زد میں آ کر اچھے اچھے دانشور بھی حماقت اور طفلانہ اندازِ فکر کے شاہکار پیش کر جاتے ہیں۔

کسے نہیں معلوم کہ ہندوستان کے مسلمان ایک اچھے انگریزی اخبار کی فکر میں ہیں۔ اس فکر نے ذہنی بحث و تمحیص کے بعد عملاً جو شکل اب تک اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ چند فعال قسم کے ذمہ دار مسلمانوں کا ایک بورڈ معرضِ وجود میں آ گیا ہے جس کا نام ہے اسلامک پبلیکیشنز۔ اسکے توسط سے اخبار کے لئے سرمایہ جمع کیا جا رہا ہے اور اخبار کے مقاصد کا تمام تر تعلق جملہ مسلمانانِ ہند سے ہے نہ کہ کسی خاص سیاسی یا مذہبی پارٹی سے۔ اسی لئے بے شمار ایسے لوگ بھی چندہ دے رہے ہیں جو جماعت اسلامی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، بلکہ بعض ایسے ہیں جنھیں جماعت اسلامی سے خاصا اختلاف ہے، لیکن وہ بھی مالی تعاون سے گریز نہیں کر رہے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اول تو اسلامک پبلیکیشنز اور جماعت اسلامی ایک ہی چیز کا نام نہیں ہے۔ دوسرے یہ انگریزی اخبار کی ضرورت ملک و ملت کی فلاح کیلئے اتنی شدید اور ناگزیر ہے کہ اسے اگر جماعت اسلامی ہی پورا کرنے کا بیڑہ اٹھائے تب بھی ہمیں ذیلی و فروعی اختلافات سے صرفِ نظر کر کے تعاون دینا چاہیئے۔

فاضل مدیر جناب انصاری صاحب خدا کے فضل سے مومن ہیں کافر نہیں۔ ہوش مند ہیں مغفل نہیں، مسائل حاضرہ سے باخبر ہیں بے بہرہ نہیں۔ اس کے باوجود اگر وہ اچانک بڑے تند و مد سے اس مجوزہ انگریزی اخبار کی مخالفت پر اتر آئے ہیں اور ان کے قلم گوہر رقم نے استدلال کے نام پر نہایت بچکانے اور مضحکہ خیز خاکے اپنے اخبار کے کالموں میں کھینچ دیئے ہیں تو اس کی توجیہہ آپ کو یقیناً اسی کہانی میں ملے گی جس کا ہم نے آغاز میں ذکر کیا فرق اتنا ہے کہ افسانوی ارسطو کی ذہنی متانت کا خانہ خراب کرنے والی ایک گوشت پوست کی حسینہ تھی، لیکن انصاری صاحب کے فکر و بصیرت پر چھاپہ مارنے والا پردۂ زنگاری کا ایک ایسا معشوق ہے جو گوشت پوست کی قید سے آزاد ہے۔ ہوا کی طرح لطیف اور تخیل کی طرح غیر مرئی۔ ہم کبھی اس پردہ نشین کا ذکر نہ کرتے اگر انصاری صاحب نے بیٹھے بٹھائے دوسروں پر سنگباری نہ شروع کر دی ہوتی لیکن ایک اچھا خاصا ہوشمند آدمی اگر دفعتاً اینٹ پتھر مارنے لگے تو اس حرکت کی کچھ نہ کچھ توجیہہ کرنی ہی پڑیگی۔

قومی آواز نیشنلسٹوں کی ملکیت ہے اور انصاری صاحب اس کے مالک نہیں فقط ملازم ہیں۔ ملازم کے لئے عملاً ممکن ہی نہیں کہ آقا کی پالیسی سے انحراف کر کے اپنی روزی برقرار رکھ سکے۔ علاوہ ازیں انصاری صاحب ذاتی طور پر بھی کچھ خاص نظریات رکھتے ہیں۔ یہ نظریات اس لحاظ سے تو خاص نہیں ہیں کہ انھیں خود موصوف ہی کے ذہن رسا نے جنم دیا ہو۔ ان کا خام مواد تو تمام تر مغرب ہی کے معدنِ علم و فن سے حاصل کیا ہوا ہے، لیکن اس لحاظ سے ضرور خاص ہیں کہ ان کا بنیادی تصادم جماعت اسلامی کے

نظریات سے ہوتا ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں ان کا اصل ٹکراؤ اسلام سے ہے۔ وہ اسلام جو جغرافی اور نسلی تعصبات کی پستیوں سے بہت اُوپر بین الاقوامی اور آفاقی بلندیوں پر آشیانہ بناتا ہے۔

نیشنلزم ـــــ خواہ اس کے کتنے ہی خوبصورت معنی کوئی پیش کرے اصلاً پرانے دَورِ جہالت کی یادگار ہے۔ نئے مادہ پرست فکر نے اس پر مخمل اور لیڈی منٹن کے غلاف ضرور چڑھائے ہیں، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کم ظرفی، خود غرضی اور تنگ دلی کے ملغوبے پر چاندی کے ورق چپکا دینے سے خمیرہ مروارید ظہور میں آجائے گا؟ تاریک زمانوں کا وحشی انسان بھی ذہنی اعتبار سے نیشنلسٹ ہی تھا۔ تبدیلی کچھ ہوئی ہے تو جغرافی لکیروں میں، دوائر کے پھیلاؤ میں، اسالیبِ تعبیر میں اور مظاہر کے خدوخال میں۔ روح نہیں بدلی منزل نہیں بدلی۔ وہی چیز جسے نیشنلزم کی زبان میں قوم کہا جاتا ہے دَورِ وحشت میں قبیلہ کہلاتی تھی۔ فرق حجم و ضخامت کا ہے اجزاءِ ترکیبی کا نہیں۔

انصاری صاحب باضابطہ نیشنلسٹ ہوں یا نہ ہوں مگر نیشنلزم کی نمائندگی کرتے کرتے انھیں جماعت اسلامی سے کد ضرور ہو گئی ہے کیونکہ اس جماعت کے نظریات قرآن و سنت والے اسلام کے نمائندہ ہیں اور قرآن و سنت والا اسلام پونے چودہ سو برس سے ہر اُس ازم کی تردید کرتا چلا آرہا ہے جس کی بنیاد میں حق پرستی کے عوض کوئی اور پرستی شامل ہو۔

ہو سکتا ہے زیر تذکرہ انگریزی اخبار کی مخالفت پر مدیر موصوف کو ان کے آقاؤں نے اُکسایا ہو لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ خود انھی کے دل و دماغ کی پیداوار ہو۔ دونوں صورتوں میں بات وہی نکلتی ہے کہ جذبات کے ہاتھوں عقل نے مات کھائی اور اچھا خاصا فہیم و متین آدمی آسیب زدگی کا مظاہرہ کرنے لگا۔

آسیب زدگی نہیں تو اسے آخر کیا کہیں گے اگر ایک اچھا خاصا آدمی یکایک سوالات کی یہ مشین گن داغنی شروع کر دے کہ

"اخبار کیوں نکالا جا رہا ہے؟ وہ مسلمانوں کو کن کن باتوں سے بچائے گا اور کس طرف لے جائے گا؟ اس کے سامنے مسلمانوں کی کیا منزل ہو گی اور اس منزل کا راستہ کیا ہو گا؟ آپ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے مفاد کے لئے اخبار نکالا جا رہا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ مسلمانوں کے مفاد سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

یہ سوالات ایک لمبی لائن ڈوری سے ہم نے بطور نمونہ نقل کئے۔ کوئی انصاری صاحب سے پوچھے آپ کون ہیں یہ سوالات کرنے والے اور ماؤزے تنگ کے انداز میں دندنانے کا حق آپکو جمہوری ہندوستان میں کہاں سے ملا؟ یہ الگ بات ہے کہ ایسے تمام سوالات کے جوابات بڑی آسانی سے پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن پیش وہ کرے جو ہذیان اور سنجیدگی میں فرق نہ کر سکتا ہو۔ جذباتی لگاوٹوں نے اگر انصاری صاحب کے ذہنِ مقدس میں انانیت اور خود پرستی کا گھروندا نہ بنا دیا ہوتا تو وہ اس نادر شاہی انداز میں لاطائل سوالات کی باڑھ مارنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لیتے کہ میں ہوں کون اور میرا مقام و منصب کیا ہے خدا گنجے کو ناخون نہ دے۔ انصاری صاحب اگر کسی ملک کے سلطان بنا دیئے جائیں تو اخبار نکالنے کی اجازت تو درکنار وہ شاید کسی کو ایک بگھہ زمین جوتنے کا بھی اذن مشکل ہی سے دے سکیں گے کیونکہ جس غریب دہقانی سے اچانک ایک درجن سوالات اس نوع کے کر لئے جائیں کہ تم کیوں زمین جوت رہے ہو۔ اسکی پیداوار کا کیا کرو گے؟ گیہوں کیوں بوتے ہو، جوار کیوں نہیں بوتے؟ جوار کا ارادہ ہے تو ایکھ کا ارادہ کیوں نہیں کیا؟۔ ظاہر ہے وہ بیچارہ سٹ پٹا کر رہ جائے گا اور انصاری صاحب جس طرح مجوزہ اخبار کے لایعنی ہونے کا فیصلہ دے رہے ہیں اسی طرح سلطان کی حیثیت میں زمین جوتنے کو لایعنی قرار دیں گے

یہ دراصل وہی تکنک ہے جو اہلِ قرآن نے دین کے باب میں اختیار کی ہے۔ یعنی دین کے ہر مسئلے کو متنازعہ بنا دو مسلمانوں کے انگریزی اخبار کی افادیت تمام مسلمانوں کے نزدیک قطعی طور پر مسلّم اور ناقابلِ اختلاف ہے انصاری صاحب نے سوالات کی چاندماری کے ذریعہ مسئلہ کی اسی حیثیت کو تارپیڈو کرنا چاہا ہے انھیں جماعت اسلامی یا اسلامک پبلیکیشنز کو جواب دہی کے

ٹھہرنے میں کھڑا کرنے کا ذرہ برابر بھی حق نہ ہو، ان کے سوالات شمہ برابر بھی معقولیت نہ رکھتے ہوں، لیکن یہ فائدہ بہرحال اس اقدام سے انھیں پہنچ سکتا ہے کہ جس اخبار کا وجود میں آنا انھیں یا ان کے مالکوں کو ناگوار ہے اسکی افادیت دُور اُسے کی متحمل ہو جائے اور متفق علیہ مسئلہ اختلاف کا مورد بن جائے۔

ہم بحث کا دروازہ کھولے بغیر انصاری صاحب کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ فکر رسا کی جولانی دکھلانے اور اشہبِ قلم کو بے تکان دوڑانے کے اور بہت میدان ہیں ملک ملت کے متعدد مسائل آپ کی پیہم توجہات، مسلسل چارہ گری اور انتھک تب و تاب کے محتاج ہیں۔ ان میں سر کھپائیے تو دین اور دنیا دونوں میں سرخ رو ہوں گے۔ جماعت اسلامی سے کہیے تو اس کا غبار ایسی راہ سے نکالئے کہ پوری ملتِ مسلمہ کا مفاد گرد آلود نہ ہو۔ انگریزی اخبار کا معاملہ سب مسلمانوں کے مفاد سے وابستہ ہے اس کی مخالفت میں ردّ و قدح کا دروازہ کھولنا انانیت اور خود فریبی کا بہت بھونڈا مظاہرہ ہے۔

عامر عثمانی ۱۰ر جون ۱۹۶۳ء

تجلّی کی ڈاک

پرویزیات

سوال:- از ابوالخیر۔ کراچی

ایک عرصہ سے مروجہ درود کے متعلق "طلوع اسلام" لاہور نے عجیب چکر میں ڈال دیا ہے۔ طلوع اسلام کا کہنا یہ ہے کہ قرآن میں خدا تو مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ "اے ایمان والو! نبیؐ پر صلوٰۃ بھیجو اور مسلمان بجائے نبیؐ پر صلوٰۃ بھیجنے کے اُلٹے خدا ہی سے کہتے ہیں کہ اے خدا تو محمد پر صلوٰۃ بھیج"۔

لہٰذا جناب سے گذارش ہے کہ اس گورکھ دھندے کو سلجھائیے اور حسب ذیل باتوں کو مسلمانوں کی تسلی کے واسطے صاف کر دیجئے۔

۱۔ کیا طلوع اسلام کا دعویٰ صحیح ہے؟

۲۔ کیا درود میں آلہٖ اصحابہٖ ازواجہٖ وذریاتہٖ ختمی مرتبتؐ نے بتلایا ہے؟ اگر نہیں تو یہ اضافہ کب اور کیوں ہوا؟

الجواب:-

بعض سوالات ڈاک کے انبار میں اس طرح دب جاتے ہیں کہ ان پر توجہ دینے کی نوبت مہینوں میں آتی ہے۔ یہ سوال بھی انھی میں سے ایک ہے۔ یہ شاید اس زمانے میں آیا تھا جب پرویز صاحب پر علماء کا متفقہ فتویٰ کفر نہیں لگا تھا۔ اس کا جواب اس وقت غیر ضروری ہی معلوم ہوا تھا کیونکہ جس شخص نے تہیہ کر لیا ہو کہ اسلام کی ہر ہر قدر اور ہر ہر عقیدے سے تمسخر کرتے رہے گا اس کے ہر ہر نعرۂ مستانہ پر کوئی کہاں تک داد دے۔

اور آج بھی اس کا جواب لا حاصل ہی معلوم ہوتا ہے۔ پرویز صاحب کا کفر و زندقہ اس درجے کو پہنچا کہ اب ان کے کسی طعن و استہزاء کو منھ لگانا ایسا ہی ہے جیسے کسی عیسائی یا کمیونسٹ کے ہفوات پر وقت ضائع کرنا۔ تعجب پرویز صاحب پر نہیں ان لوگوں پر ہے جو تمام معاملاتِ دنیاوی میں زیرک و دانا ہونے کے باوجود دینی اُمور میں موم کی ناک بن جاتے ہیں اور ہر زہ سراؤں کا ہر ہذیان انھیں تشویش اور تزلزل میں مبتلا کر دیتا ہے۔

مثلاً یہی درود کا مسئلہ لیجئے۔ کیا ایک مبتدی اور معمولی عقل کا آدمی بھی یہ بات نہیں جانتا کہ ہر زبان میں متعدد الفاظ ایسے ہوتے ہیں جنھیں مختلف مواقع پر ایک سے زائد معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ "کوّا" بولتے ہیں۔ یہ ایک پرندے کا نام بھی ہے اور حلق کے اندر ایک ننھے سے عضو کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ لفظ "گھورا" کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر بھی صادق آتا ہے اور گھورنے سے واحد غائب کا صیغہ بھی ہے۔ لفظ "کھانا" مصدری معنی میں بھی مستعمل ہے اور خود طعام کو بھی کہتے ہیں۔ ایسی بے شمار مثالیں اُردو، ہندی، انگریزی، عربی ہر زبان میں موجود ہیں۔ عربی کا ایک لفظ مولیٰ ہی لیجئے۔ یہ مالک و آقا کے لئے بھی مستعمل ہے۔ آزاد کردہ غلام کے لئے بھی۔ دوست اور محب کے لئے بھی اور سرپرست اور بزرگ کے لئے بھی۔ ہمارے زمانے میں اس کا استعمال ضمیر جمع متکلم لگا کر علماء کے لئے عام ہے — یعنی مولٰنا۔

جب یہ ایک معروف و معلوم صورتِ حال ہے تو آخر کسی سلیم القلب انسان کے لئے اس شرارت آمیز اعتراض میں کیا جان ہو سکتی ہے کہ اللہ نے نبیؐ پر صلوٰۃ بھیجنے کا حکم دیا تھا لیکن مسلمانوں نے خود اللہ سے درخواست کرنی شروع کر دی کہ نبیؐ

پر صلوٰۃ بھیجیے!

قرآن اٹھائیے۔ سورۂ احزاب میں آیا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا	اے اہل ایمان صلوٰۃ بھیجو نبیؐ پر اور سلام بھیجو سلام کہہ کر۔

اسی کی بنیاد پر پرویز صاحب کہتے ہیں کہ خدا مسلمانوں کو نبیؐ پر صلوٰۃ بھیجنے کا حکم دیتا ہے۔ بات بالکل درست ہے لیکن اسے موصوف نے جس بچکانہ اعتراض اور استہزاء کی تمہید بنایا ہے اس پر حیران و پریشان ہونے سے پہلے لوگوں کو قرآن کھول کر دیکھنے کی تکلیف تو کرنی ہی چاہیئے تھی۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں اسی آیت سے متصل قبل پرویز صاحب کے لایعنی اعتراض کا جواب اور مسلمانوں کے معروف طرزِ عمل کا مبنیٰ موجود ہے۔ اس آیت سے قبل کا ٹکڑا یہ ہے:۔

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ۔	اللہ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔

کیا اس سے صراحۃً معلوم نہیں ہوا کہ صلوٰۃ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو صرف انسان ہی کسی دوسرے انسان پر بھیجے بلکہ وہ ایسی چیز بھی ہے جو خدا اور فرشتے بھی نبیؐ پر بھیجتے ہیں۔ جب یہ بات ہے تو پھر اس میں کیا غبار ہے کہ اہل ایمان خود بھی نبیؐ پر صلوٰۃ بھیجیں اور اللہ سے بھی دعا کریں کہ وہ نبیؐ پر صلوٰۃ بھیجے۔

زیادہ سے زیادہ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ جب اللہ اپنی محکم صراحت کے مطابق نبیؐ پر صلوٰۃ بھیجتا ہی ہے تو پھر مسلمانوں کو اس سے اس کی استدعا اور دعا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تو رزق، صحت اور اولاد وغیرہ بھی دیتا ہے پھر ان چیزوں کی دعا ہم اس سے کیوں مانگتے ہیں۔

کھلی بات یہ ہے کہ لفظ صلوٰۃ کے ایک سے زائد معنی ہیں۔ اگر کوئی یوں کہے کہ "صلوٰۃ" صرف رحمت کو کہتے ہیں تو اس قرآنی بیان کے کوئی معنی ہی نہیں رہیں گے کہ فرشتے نبیؐ پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔ رحمت بھیجنا تو خالصۃً اللہ کا کام ہے نہ کہ فرشتوں یا انسانوں کا۔ خود ایمان والوں کو صلوٰۃ بھیجنے کی جو ہدایت کی گئی ہے وہ بھی مہمل ٹھیرے گی۔

اور اگر "صلوٰۃ" کے بارے میں دعویٰ کیا جائے کہ فقط دعائے رحمت کو کہتے ہیں تو یہ فقرہ مہمل ہو جائے گا کہ اللہ نبیؐ پر صلوٰۃ بھیجتا ہے۔ کیا کوئی دیوانہ بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ اللہ نبیؐ کے لئے دعائے رحمت کرتا ہے!

معلوم ہوا کہ اسی متذکرہ ایک آیت میں لفظ "صلوٰۃ" دو جداگانہ مفہوموں میں استعمال ہوا ہے۔ خدا کا صلوٰۃ بھیجنا تو رحمت نازل کرنے کے ہم معنی ہے اور فرشتوں یا مومنوں کا صلوٰۃ بھیجنا دعائے رحمت کا مرادف۔

جب قرآن ہی سے —— بلکہ اس کی ایک ہی آیت سے وہ دونوں امور ثابت ہو گئے جن میں سے ایک کا پرویز صاحب مذاق اُڑا رہے ہیں تو معلوم ہو گیا کہ اس تمسخر کا مبنیٰ کسی قسم کی علمی و عقلی غلط فہمی نہیں، بلکہ حدیثِ رسولؐ اور صلحائے امت سے بغض و عناد ہے۔ چونکہ اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں حدیث ہی میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ صحابہؓ نے عرض کیا:۔

> "اے اللہ کے رسولؐ! سلام کا طریقہ تو ہمیں معلوم ہو چکا یعنی السلام علیکم ایّها النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ لیکن یہ جو اللہ نے صلوٰۃ بھیجنے کی ہدایت نازل فرمائی ہے اس کا کیا طریقہ ہے؟"

اس کے جواب میں حضورؐ نے وہ درود تلقین کیا جو نمازوں میں پڑھا جاتا ہے اور جس پر پرویز صاحب انتہائی کمینے پن سے چوٹ کر رہے ہیں۔ "کمینہ پن" تو ہلکا لفظ ہے۔ کوئی لفظ اس شقاوت اور سیاہ قلبی کا حق ادا نہیں کر سکتا کہ ایک شخص مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے اس درود کا مذاق اُڑائے جو قوی ترین اسناد سے مروی ہے اور جس پر پونے چودہ سو سالوں سے تمام امت قولاً و عملاً متفق ہے۔ مسلمانوں میں فروعی اختلاف کے تحت کتنے ہی فرقے پیدا ہو گئے ہوں لیکن ایسا کوئی فرقہ پیدا نہیں ہوا جو درود کا مذاق اُڑائے اور حسین الفاظ میں لپیٹ کر ملحدوں والا تاریک ذہن امتِ مسلمہ کے دماغوں میں اتارنے کی ناپاک کوشش کرے۔

آپ —— یعنی سائل صاحب —— آپ پر بھی تعجب ہے کہ پڑھے لکھے ہو کر پرویز کے چھوڑے ہوئے بے تہہ شوشے کو

گورکھ دھندے کا نام دے رہے ہیں۔ اگر دین اور احکامِ دین کی کچھ بھی قدر آپ کے دل میں ہوتی تو اس پرویزی شوشے کو سنتے ہی قرآن کھولتے اور کم از کم اس آیت کو تو دیکھ ہی لیتے جو بھی مذکور ہوئی۔ اسے دیکھنے کے بعد لازماً آپ کو اسی فیصلے پر پہنچنا چاہیے تھا کہ گورکھ دھندا دین میں کچھ نہیں دینی احکام تو صاف ہیں کجی اور تاریکی پرویز صاحب کے اپنے دماغ میں ہے جو ہر قیمت پر حدیثِ رسول اور اجماعِ امت کا مذاق اڑانا چاہتے ہیں۔

رہا اصحابہ وازواجہ وذریاتہ کے الفاظ کا معاملہ تو اس میں بھی کوئی تشویشناک پہلو نہیں۔ یہ سب آلِ محمد کے اجمال کی تفصیل ہے۔ آل کہتے ہیں ہم خیال، ہم نوا، ہم مسلک لوگوں کو۔ جس طرح یہ دعا کرنے میں کہ:۔

"اے اللہ تمام مسلمانوں پر رحم فرما"

ہمارے والدین اور عزیز واحباب سب آگئے لیکن اسکے باوجود ہم خصوصی تعلق کی بناء پر والدین اور بھائی بہن، دوست وغیرہ سب کے لئے نام بنام انفرادی دعائیں مانگتے ہیں اسی طرح اگرچہ آلِ محمد میں تمام صحابہؓ اور ازواجِ مطہرات اور صالحینِ امت آگئے، لیکن خصوصی تعلق کی بناء پر لفظاً لفظاً بھی ان کا ذکر دعا میں کرلیں تو کوئی الجھن کی بات نہیں۔ حضورؐ ہی نے اس تصریح کا اضافہ فرمایا ہو یا بعد کے لوگوں نے ہر صورت میں ادنیٰ سا شک اس کے مندوب و مستحسن ہونے میں نہیں پایا جاتا جو شخص اعتراض و تضحیک ہی کو مطمحِ نظر بنالے وہ تو دنیا کی ہر چیز پر آوازے کس سکتا ہے اور جاہل و غبی لوگ اس کے بہکائے میں بھی آسکتے ہیں لیکن جب آپ جیسے پڑھے لکھے لوگ بھی اس کے چکر میں آنے لگیں تو یہ فضا کے انتہائی مسموم ہونے کی علامت ہے۔

صلوٰۃ کا لفظ "نماز" کے لئے بھی آتا ہے یہ کس سے پوشیدہ ہے۔ قرآن میں زیادہ تر نماز ہی کے لئے اسے استعمال کیا گیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ جب "صلوٰۃ بھیجنے" کا ذکر ہو تو نماز مراد نہیں ہوسکتی خواہ بھیجنے کی نسبت اللہ کی طرف ہو یا ملئکہ کی یا مومنین کی۔ خود آپ بھی یہ تصور نہیں کرسکتے کہ صلوٰۃ کے معنی ہر حال میں ایک ہی ہوں گے۔ لہٰذا پرویز صاحب کا تمسخر سماعت فرمانے کے بعد خود ہی قرآن کھول کر دیکھ لینا چاہیے تھا کہ یہ تمسخر کسی التفات کا مستحق بھی ہے یا فقط حدیث دشمنی اور شیطان زدگی نے اسے جنم دیا ہے۔ جب آپ جیسے لوگ نرم چارہ بن جائیں تو اس نئی پود کا جو بھی حشر ہو کم ہے جسکی نشوونما اور تعلیم وتربیت خالص کافرانہ ماحول میں ہورہی ہے

کافرانہ ماحول اسی کو مت سمجھیے جہاں سب کافر بستے ہوں۔ بدترین کافرانہ ماحول وہ ہے جہاں بسنے والے تو مدعیانِ اسلام ہی ہوں لیکن انھوں نے مادہ پرستانہ طرزِ فکر کو دل وجان سے قبول کرلیا ہو اور پورے اسلام کو مادیت ہی کے گرد طواف کرانے کے درپے ہوں۔ ایسے ماحول میں ہر غیر اسلامی عقیدہ خودرو گھانس کی طرح بڑھے گا اور اسلامی عقائد پر خزاں چھاجائے گی۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً۔

زبانات

سوال ۲:۔ از بدیع الزماں خاں۔ مظفرپور۔

ہمارے یہاں ایک صاحب ہیں جو معمولی اردو پڑھنا لکھنا بھی جانتے ہیں اور مدعیِ اسلام ہونے کے باوجود حال ہی میں عقائد ذیل کا استخراج کیا ہے۔

(۱) ہمارے نزدیک مذہب کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ مولوی ملاؤں نے مذہب کے نام ایک ڈھونگ رچا رکھا ہے۔

(۲) ہمارے نزدیک نماز روزہ وغیرہ کوئی چیز نہیں ہے نیز کتاب اللہ کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔

(۳) اچھے اعمال پر جنت کی بشارت اور برے اعمال پر دوزخ کی وعیدیں بے کار اور لغو اور دل بہلانے کی باتیں ہیں۔

جواب طلب امور یہ ہیں کہ ایسے عقائد سے متصف انسان کو صحیح معنوں میں مسلمان کہہ سکتے ہیں؟ غضب کی بات یہ ہے کہ بہت سے جاہل مسلمان ایسے معتقد انسان کے ہم خیال ہوتے جارہے ہیں۔

الجواب ۲:۔ حیرت ان صاحب پر نہیں جن کا آپ نے

ذکر کیا حیرت آپ پر ہے کہ یہ "سوالات" ارسال فرمائے۔ کل اگر کوئی دیوانہ یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ دن اور تاریکی لازم و ملزوم ہیں یا "رات" اس وقت کو کہتے ہیں جب سورج نصف النہار پر ہوتا ہے تو کیا آپ پھر بھی یہ سوال مدیر تجلی کی خدمت میں ارسال فرمائیں گے کہ اس شخص کا دعویٰ کس حد تک درست ہے اور اسے صحیح معنوں میں دانش مند کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔؟

اگر ایسا مضحکہ خیز سوال آپ نہیں کر سکتے تو آخر یہ انتہائی مضحکہ خیز سوال کیسے کر ڈالا کہ جو شخص کفر صریح کا اعلان بالجہر کر رہا ہو اسے صحیح معنوں میں مسلمان کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟

برادرم! اس شخص کو اپنی بکواس کرنے دیجئے اور اگر واقعتہً کچھ دیوانے مسلمان ایسے بھی ہیں جو اس پاگل کے ہذیان کو حلق سے نیچے اُتار سکتے ہیں تو انھیں بھی اللہ کے سپرد کیجئے انھیں فقط جاہل کہنا لفظ جاہل کی توہین ہے۔ یہ تو جانور ہیں بلکہ جانور سے بھی بدتر۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مذکورہ دیوانے کے جو تین قول آپ نے نقل فرمائے ان میں سے ہر ایک قول بجائے خود ایسے کفرِ مبین اور صریح گمراہی پر مبنی ہے کہ اس کے بعد اس دیوانے کے مسلمان رہنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی حکومت ہوتی تو یہ شخص توبہ پر مجبور کیا جاتا۔ توبہ نہ کرتا تو مار ڈالا جاتا۔ اسلامی حکومت نہیں ہے تو اس کی کم سے کم سزا یہ ہے کہ ہر طرح کا تعلق اس سے منقطع کر لیجئے۔ ہم کسی علمی و عقلی مسئلہ میں تو دادِ تحقیق دے سکتے ہیں لیکن کریک اور شیطان زدہ لوگوں کے ہذیانات پر دادِ تحقیق دینا ہمارے بس سے باہر ہے اور غیر ضروری بھی!۔

بُری ذہنیت

سوال ۳:۔ از ابوالکاظم محمد حنیف قاسمی۔ مالیگاؤں۔

آج مسلمان اپنے مذہبی فرائض کو ادا کرنے کے لئے اپنے اندر وہ آزادی نہیں پاتے جو مذہب نے ان کو دے رکھی ہے یا تو ان کو سرے سے ادا ہی نہیں کر سکتے یا ادا کرتے بھی ہیں تو بہت سے جرائم کذب بیانی مکر و فریب کا ارتکاب کرکے رشوت ستانی شرعی نقطہ نظر سے جو انتہائی مذموم اور ناپاک عمل ہے آج دوسری قوموں کے ساتھ مسلمان بھی مبتلا ہیں اور رشوت کے خوگر ہو چکے ہیں معمولی اور ادنیٰ کاموں سے لیکر بڑے بڑے کام حتیٰ کہ خالص مذہبی اُمور میں بھی رشوت دینے پر مجبور ہیں اور دیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد۔ الراشی والمرتشی کلاھما فی النار جیسی صریح اور سخت وعیدوں کے ہونے کے باوجود سرکاری مجبوریاں کچھ اس قسم کی ہیں کہ بغیر رشوت دیئے کوئی چارہ نہیں۔ حج بیت اللہ جیسے مقدس اور پاکیزہ مقصد کے لئے بھی ویزا اور پاسپورٹ بناتے وقت رشوت سے ہم نہیں بچ سکے ایسے گھناؤنے اور متضاد ماحول میں رشوت کے جواز کی کوئی ممکن صورت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ امید کہ گذشتہ مراسلے کی طرح اس کو بھی قابل توجہ سمجھ کر جواب مرحمت فرمائیں گے

الجواب ۳:۔

سوال ترتیب دینے میں آپ نے زیادہ غور و فکر سے کام نہیں لیا۔ پہلے ہی فقرے کا صحیح مفہوم میں نہیں سمجھ سکا ہوں۔ آخر وہ کونسی پابندیاں ہیں جو فرائض کی ادائگی کے سلسلے میں حکومت نے ہم پر عائد کر رکھی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ گائے کی قربانی کا تذکرہ کر سکتے ہیں لیکن اس سے بھی آپ کے دعوے کا اثبات نہیں ہوتا۔ فرض صرف قربانی ہے نہ کہ گائے کی قربانی بھینس، بکرے اور بکری کی قربانی سے بھی فریضہ ادا ہو جاتا ہے لہذا یہ کہنا خلافِ واقعہ ہوگا کہ فریضۂ قربانی کی ادائگی میں رکاوٹ ڈالدی گئی۔ ایک ایسے ملک میں جہاں گائے کو مقدس سمجھا جاتا ہو اسکی قربانی پر پابندی لگ جانا قدرتی سی بات ہے جب کہ اقتدار مقدس سمجھنے والوں کے ہاتھ میں ہو۔ ہاں اگر کسی بھی ذبیحے کا قانونی جواز اس ملک میں باقی نہ رہتا تو بے شک کہا جا سکتا تھا کہ فریضے کی ادائگی پر پابندی لگ گئی۔

دوسرا مسئلہ حج کے متعلق بعض پابندیوں کا ہے — تو یہ پابندیاں بھی ایسی ہرگز نہیں ہیں جنھیں بہت زیادہ واویلا کی بنیاد بنایا جائے۔ حج زندگی میں صرف ایک بار فرض ہے۔ اس ایک بار میں حکومت نے کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ کچھ قیود اگر بڑھائے

ہیں تو نفل حج کے لئے بڑھاتے ہیں۔ یہ بھی صرف قیود ہیں بندش
نہیں۔ پھر ان کا تعلق بھی اقتصادی پہلوؤں سے ہے نہ کہ مذہبی
آزادی میں رخنہ ڈالنے کے پہلو سے۔

تو ہمیں بتایا جائے کہ کونسا فریضہ ہے جسے مسلمان سرے
سے ادا ہی نہیں کر سکتے؟

جہاں تک مسلمانوں کی اپنی بداعمالیوں کا تعلق ہے تو
اس میں مفتی کیا کرے اور حکومت کو الزام کیوں دیا جائے مسلمان اگر
کذب ودغا کا ارتکاب کرتے ہیں، رشوت لیتے دیتے ہیں اور
نوع بہ نوع بداخلاقیوں میں گرفتار ہیں تو اس کا حل یہ کس طرح
ہو سکتا ہے کہ میں آپ کی خواہش پر رشوت کا جواز ڈھونڈ کے
لاؤں۔'

محترما! حرام کو حرام ہی رہنے دیجئے۔ یہ بہت بُری
ذہنیت ہے کہ اگر کوئی بُرائی عام ہو گئی ہے تو اس کو مٹانے
یا کم سے کم خود کو اس سے بچانے کی سعی بلیغ کرنے کے عوض جواز و
اباحت کے دلائل ڈھونڈے جائیں ہمارا خیال یہ ہے کہ رشوت
جس قدر عام ہے اس سے زیادہ مسلمانوں کی خدا فراموشی اور دنیا
طلبی عام ہے۔ وہ بے شمار ایسے اخلاقی رذائل میں مبتلا ہیں جن پر
انھیں کوئی مجبور نہیں کرتا لہٰذا اگر کسی موقع پر مجبوراً رشوت بھی دینی
پڑے تو احتجاج کس منھ سے کر سکتے ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ مسلمان
خود کو اسلامی اخلاق کا پابند بنالیں اور صبر واستقلال سے
اسلامی احکام پر ڈٹے رہنے کا عزم کرلیں تو یہی ناپاک ماحول
جس کی آج عام شکایت ہے ان کے لئے کچھ سے کچھ ہو جائے گا۔
علاج یہ نہیں ہے کہ مفتیوں سے حرام کو حلال کرنے کی تاویلات
طلب کرو علاج یہ ہے کہ حرام کے خلاف جہاد کرو اور جہاد یہ ہے
کہ جو دنیاوی مفادات کردار کا خون کئے بغیر حاصل نہ ہو سکتے
ہوں ان سے حقارت کے ساتھ منھ پھیر لو۔ زبانی جمع خرچ سے کچھ
نہیں ہوتا۔ کردار سازی کے لئے نفس کا سر کچلنا پڑتا ہے تکلیفیں
اٹھانی پڑتی ہیں۔ کردار کا مجسمہ بن جاؤ پھر دیکھو یہی ناپاک
ماحول تمھیں کیا کچھ نظافتیں عطا کرتا ہے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ رشوت دینے سے حتی الوسع پرہیز
کرنا چاہئے۔ اگر حج کا ویزا یا پاسپورٹ بغیر رشوت دئے حاصل
نہیں ہوتا تو حج مت کیجئے۔ کس نے کہا ہے کہ آپ حج ضرور کریں
چاہے رشوت دینی پڑے۔ حج صرف اُس شخص پر فرض ہے جو
بیت اللہ پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو۔ بغیر پاسپورٹ اور ویزا
کے پہنچنا ممکن نہیں اور ان چیزوں کے حصول میں بقول آپ کے
رشوت دینا ضروری ہے لہٰذا یوں کہئے کہ معصیت کا ارتکاب
کئے بغیر سفر حجاز ناممکن ہے۔ معصیت کی اجازت اللہ رسولؐ
نے دی ہی نہیں لہٰذا سفر حجاز آپ کی استطاعت سے باہر ہوا۔

کوئی دنیاوی ضرورت بغیر رشوت کے پوری نہ ہو رہی ہو
اور یہ اتنی اہم ہو کہ آپ اس سے صرفِ نظر نہ کر سکتے ہوں تو
رشوت اسی طرح دیجئے جس طرح حالتِ اضطرار میں شراب و خنزیر
استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ غیر باغٍ وّلا عاد۔ آپ کے قلب
میں انتہائی استکراہ ہونا چاہئے اور یہ جذبہ ہونا چاہئے کہ آئندہ
اس ناپاکی سے ملوّث نہیں ہوں گے۔

عبث باتیں

سوالؐ :- از مصطفیٰ۔ ضلع ۲۴ پرگنہ۔ (مغربی بنگال)

حضرت آدم علیہ السلام کو لا الٰہ الا اللہ کی تعلیم دے کر اللہ
جل شانہٗ نے دنیا میں بھیجا تھا۔ آدمؑ ابو البشر ہیں ان سے قبل
دنیا میں انسان نام کی ہستی ہی نہیں تھی، البتہ جنات کی آبادی
ماضی بعید میں موجود تھی۔ مگر یہ تو صاف معلوم نہیں کہ جن شرک
کے مرتکب تھے۔ فتنہ فساد کرتے تھے۔ بحکم الٰہی فرشتوں کے جتھے
نزول فرمائے اور فتنہ و فساد رفع کر دیتے تھے تو شرک باللہ
کے ناپاک عقیدے سے جب ماضی بعید میں دنیا بالکل ناآشنا
تھی تو اس حالت میں لا الٰہ الا اللہ کی تعلیم سے مقصد کیا ہے؟
اس سے مطلب تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا دیگر الٰہ کو
ماضی بعید میں بھی پوجا جاتا تھا۔ اگر غیر اللہ کی پوجا کا وجود ہی نہ تھا
تو لا الٰہ الا اللہ کی تعلیم سے ماضی بعید میں کیا فائدہ تھا؟

الجوابؐ :-

ایک شخص امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ
کی خدمت میں آیا اور دریافت کیا کہ یا امیر المومنین وَالنّٰزِعٰتِ
غَرْقًا کا کیا مطلب ہے؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ناخوشگوار نظروں سے اسے گھورا اور فرمایا:۔

" اچھا تم والنّازعات غرقاً کا مطلب پوچھتے ہو، میں تمہیں بتاؤں گا "

یہ کہہ کر آپ نے اس شہر کے حاکم کے نام جہاں کا یہ شخص رہنے والا تھا ایک رقعہ لکھ کر دیا اور فرمایا کہ اسے کھولنا مت فلاں حاکم کے پاس لے جاؤ وہ تمہیں مطلب سمجھا دے گا۔

یہ شخص بات کی تہہ کو نہ پہنچ سکا اور جا حاکم کو رقعہ تھما دیا۔ رقعہ میں لکھا تھا کہ " یہ شخص بوالفضول اور بیکار معلوم ہوتا ہے اس کی مرمت کرو اور کسی کام پر لگاؤ " حاکم نے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے ایماء کے مطابق اس شخص کی خاصی مزاج پرسی کی اور تب اسے معلوم ہوا کہ ذہنی عیاشی کا کیا صلہ ہوتا ہے۔

اے برادر! آپ کو آخر ایسے سوالات کرنے کی کیا پڑی ہے جن میں نہ نفعِ دنیا نہ نفعِ دین۔ مفید کاموں سے دلچسپی رکھنے والوں کا ذہن کبھی عبث چیزوں کی طرف نہیں جاتا۔ جو شخص عبث اور دور از کار سوالات کرتا ہے وہ در اصل ذہنی مریض ہے۔ اس مرض کا علاج یہ ہے کہ بار آور کاموں کی طرف توجہ دیجئے۔ ملک و ملت کی خدمت کیجئے ذکر اللہ میں وقت لگائیے۔ تجلی میں سوال و جواب کا مقصد محض ذہنی عیاشی اور تفریح نہیں ہے۔ یہ آپ کا سوال شامل صرف اس لئے کر دیا ہے کہ دوسرے ناظرین کو بھی عبرت حاصل ہو اور وہ عبث سوالات سے اپنا اور دوسروں کا وقت برباد نہ کریں۔

نوشہ کی سواری

سوال ۵:۔ (ایضاً)

شادی کے موقع پر تقریباً ہر جگہ دولھا پالکی، موٹر، کتا حسب مقدرت کسی نہ کسی سواری پر سوار ہو کر دولھن کے یہاں جاتے ہیں۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ آنحضرت صلعم نے متعدد شادیاں کی تھیں۔ نیز صاحب زادیوں کے بھی بیاہ کئے تھے، اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی حالتِ اسلام میں متعدد شادیاں کی تھیں مگر کہیں یہ ثبوت نہیں ملتا کہ دولھا کسی سواری پر سوار ہو کر دولہن کے یہاں شادی کے لئے گیا ہو۔ فلہذا یہ رسم بدعت ہے۔ سواری ترک کرنا ہی اس موقع پر سنت ہے۔ کیا یہ دلیل صحیح ہے؟

الجواب ۵:۔

بدعت کی بحث ان اعمال میں آتی ہے جو ثواب برکت کی نیت سے کئے جائیں۔ دولھا کا پیدل جانا یا سوار ہو کر جانا دونوں باتیں رسم و رواج سے متعلق ہیں ثواب وغیرہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ سوار ہو کر جانا سنت نہیں ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سوار ہو کر جانا بدعت ہے۔ "بدعت" کا مطلب تو ارتکاب گناہ ہوتا ہے نوشہ سوار ہو کر جائے تو شرعاً اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

پردہ

سوال ۶:۔ (ایضاً)

پردہ کی آیات میں اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا سے مطلب کیا ہے؟ کیا چہرہ بھی اس کے اندر داخل ہے؟ چہرہ کھلا رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب ۶:۔

براہ راست قرآن و حدیث سے مسائل کا استنباط کرنا عوام کا منصب نہیں۔ پردے کی آیات اور اس سے متعلقہ امور پر بڑے بڑے ائمہ و علماء تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں لہٰذا جس شخص کو دین عزیز ہو اسے صرف یہ پوچھنا چاہئے کہ علمائے حق کا کیا مسلک اور فیصلہ ہے۔ یہ نہیں پوچھنا چاہئے کہ الّا ما ظھر منھا میں کیا داخل ہے اور کیا نہیں؟

پردے کے بارے میں ہر ہوشمند جانتا ہے کہ وہ بجائے خود مقصود و مطلوب نہیں ہے بلکہ اصل مقصد عفت و عصمت کا تحفظ ہے۔ ایک ایسے دورِ نامسعود میں جب کہ شہوانی محرکات فواحش، جنسی ترغیبات اور بے حیائیاں ہوا اور پانی کی طرح عام ہیں اصل مقصود کو پس پشت ڈال کر لفظی بحثوں میں الجھنا

اور منطق آرائیاں کرنا دماغ تاریک ہونے کی علامت ہے اگر اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی عفت و عصمت عزیز ہے تو کان دبا کر علمائے حق کے اس فیصلے کی عملی تائید کیجئے کہ عورت کا چہرہ تو درکنار اس کی آواز بھی "عورت" ہے۔ چہرہ ہی کھل گیا تو پھر رہا کیا۔

البتہ جن کی حِس معطل ہو چکی ہو، جنھیں حقیقتاً عفت و حیا اور عصمت و آبرو کی قدر و قیمت کا کماحقہٗ احساس نہ ہو وہ لفظوں کی کھال نکالنے اور زبانی جمع خرچ کی داد لینے میں وقت ضائع کریں۔

جوتش

سوال:۔ (ایضاً)

جوتشی لوگ ہتھیلی کی لکیریں دیکھ کر ماضی کے حالات بیان کرتے ہیں اور مستقبل میں ہونے والے واقعات کی پیشینگوئی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کا کہا ٹھیک بھی ہو جاتا ہے۔ کیا اس پر اعتماد کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔

یہ سب غیر اسلامی دھندے ہیں۔ اعتماد تو بعد کی بات ہے، اسلام سرے سے ہاتھ دکھانے ہی کو منع کرتا ہے۔ کیا ضرورت ہے کہ آپ مستقبل کا حال جاننے کی کوشش کریں جب کہ تقدیر اپنی جگہ اٹل ہے۔ مستقبل کا صرف اتنا ہی حال جاننا مفید ہے جتنا اللہ اور رسولؐ نے مصرح فرما دیا ہے اس سے زیادہ کے چکر میں پڑنا وقت، پیسے اور انرجی کا زیاں ہے۔

بدعات محرم

سوال:۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس انعال میں کہ محرم کا چاند دیکھ کر شہید کربلا (بنگلہ ہو یا اردو)، پڑھنا شروع کرنا اور دسویں کی رات میں ختم کرنا کیسا فعل ہے؟ ہمارے یہاں اکثر لوگ کثرت سے پڑھتے ہیں اور شوق سے لوگ سننے جاتے ہیں اور لوگ ثواب سمجھ کر سنتے ہیں۔

نمبر ۲:۔ محرم کے مہینے میں عورتیں نشان (جھنڈے) کے نیچے غسل کرتی ہیں، اس غرض سے کہ بچہ پیدا ہوگا اور نذر مانتی ہیں کہ کل جنگی یعنی کھیلنے کودنے والوں کو پلاؤ یا کھچڑہ کھلائیں گے۔ کیا یہ مشرکانہ کام نہیں؟ اگر ہیں تو پھر مولوی مشتاق احمد نظامی ایڈیٹر پاسبان کیوں نہیں منع فرماتے ہیں۔

الجواب:۔

یہ سب لغویات و بدعات ہیں۔ "شہید کربلا" وغیرہ پڑھنے کا التزام تو بدعت تک محدود ہے لیکن جھنڈوں کے نیچے حصولِ مراد کے لئے نہانا شرک و زندقہ ہے۔ ایسی خرافات کے پھیلاؤ میں دراصل ہمارے علماء کے تساہل اور خوابِ راحت کا بڑا دخل ہے۔ بیچارے جہلاء تو ان لغویات کی قباحت کو سمجھتے نہیں مگر علماء کو بھی عموماً پروا نہیں ہے کہ کون کس کنویں میں گرتا ہے۔ ہندوستان کی فضا تو شرک و زندقہ کے لئے یوں بھی سازگار ہی تھی اس میں شیعت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ تعزیہ داری، جھنڈے بازی، ماتم و شیون سب شیطانی حرکات ہیں۔ ان کی کوئی اصل دین میں نہیں ہے۔

مسواک اور برش

سوال ۹:۔ از خلیل احمد۔ بیاور

کیا آج کل کے زمانہ کے ٹوتھ برش بھی مسواک کا حکم رکھتے ہیں اور کیا پنج وقتہ نماز کے وقت بجائے مسواک کے ان برشوں سے دانت صاف کر لئے جائیں تو کچھ حرج تو نہیں ہے؟

الجواب ۹:۔

قواعدِ ظاہری اور ثمراتِ معنوی کسی بھی اعتبار سے دانتوں کے برش مسواک کے مماثل نہیں ہو سکتے۔ سنت حضورؐ کے اتباع کا نام ہے۔ حضورؐ جب مسواک استعمال کرتے تھے تو سنت بھی مسواک ہی سے ادا ہوگی۔ استعمال کے علاوہ مسواک کی تحسین و ترغیب میں حضورؐ کے صریح ارشادات بھی مروی ہیں۔ لہٰذا مسواک کے سوا کوئی چیز ادائے سنت کے ہم معنی نہیں ہو سکتی۔

معنوی فوائد بھی مسواک ہی میں ہیں۔ دانتوں کے برش کا فائدہ تو ناقابل اعتبار ہے۔ ہم نے تو یورپ کے ایک نئے محقق ڈاکٹر کا یہ ارشاد بھی پڑھا ہے کہ دنیا کے سارے ٹوتھ برش دریا برد

کردو یہ دانتوں کے لئے تباہ کن ہیں۔ خود اپنا تجربہ ہمیں یہ ہے کہ ٹوتھ برش کا چند ماہی استعمال ہی دانتوں کے لئے مضر ثابت ہوا اب یہ الگ بات ہے کہ جو چیز یورپ و امریکہ میں مقبول ہو جائے اور تہذیب جدید کا لازمہ سمجھی جائے وہ زہر بھی ہو تو دنیا کا مرعوب ذہن اسے تریاق ہی سمجھے گا۔ شراب، مرد و زن کی مخلوط زندگی، نلج رنگ وغیرہ کے اظہر من الشمس مضرات و قبائح تو کسی کے سمجھے میں کوئی چٹکی نہیں لیں گے ہاں ان کے فوائد و منافع جگ مگ کرتے نظر آئیں گے۔ پھر بھلا ٹوتھ برش کے نقصان رساں ہونے کے وہ کیسے قائل ہو سکتے ہیں۔

نہ ہوں۔ یہ تو بہرحال طے ہے کہ ٹوتھ برش کے فوائد و اثرات تخمینی اور ظنی ہیں جب کہ مسواک کے فوائد و برکات تخمین و ظن سے بلند سطح یقین پر فائز ہیں۔

حاصل جواب یہ کہ جسے سنت کا ثواب کمانا ہے وہ تو مسواک منتخب کرے انشاء اللہ ضمناً معنوی منافع بھی کہیں نہیں گئے اور جسے خالصتہً مادیت کا چسکا ہو وہ ٹوتھ برش استعمال کرتا پھرے۔ حلال بہرحال وہ بھی ہے۔ ھذا ما عندی ولعلم عند اللہ۔

گڑے مُردے

سوال :۔ از محمد سمیع اللہ۔ کراچی۔

اس بات کا جواب اگر بذریعہ پوسٹ کارڈ دیں تو بڑی عنایت ہوگی کہ مولانا طیب صاحب نے جو کتاب خلافت معاویہؓ و یزید کے رد میں لکھ ڈالی زعم میں آکر۔ آپ نے اس کا جواب کسی کتابی شکل میں دیا یا نہیں۔ اگر دیا ہے تو احقر کو مطلع کریں ورنہ اس طرف ضرور اور بہت جلد توجہ فرمائیں۔ جہاں آپ نے اس قدر کوشش کی ہے حق بات کے اظہار میں اور سہی۔ یہ میری ہی نہیں بلکہ میرے بہت سے دوست اور احباب کی تمنا ہے۔ اس کتاب سے بہت سے لوگ غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہیں۔

الجواب :۔

اس کتاب اور اس موضوع پر تجلی میں ہم بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور "تحقیق مزید" نامی کتاب میں اس کا بڑا حصہ نقل کر دیا گیا ہے اب کچھ لکھنا غیر ضروری ہوگا۔

عقیقہ

سوال :۔ (ایضاً)

حضرت مولانا شاہ اصغر حسین صاحب محدثؒ اپنی مؤلفہ کتاب الجواب المتین فتاویٰ محمدی میں ارقام فرماتے ہیں کہ عقیقہ ساتویں روز کیا جائے یا چودھویں روز یا اکیسویں روز۔ اس کے بعد اگر کیا تو عقیقہ کی سنت ادا نہ ہوگی۔ البتہ کھانا کھلانے کا ثواب ضرور مل جائے گا۔ ثبوت میں ایک حدیث مع حوالۂ کتاب درج ہے، لیکن دوسرے علماء کہتے ہیں اور بہت سی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ عمر کے کسی حصے میں بھی کر سکتے ہیں صرف اس بات کا خیال رہے کہ پیدائش کے روز سے ایک روز قبل ہو تاکہ ساتویں روز آکر پڑے۔ البتہ ایک صاحب نے یہ بھی کہا کہ یہ مسئلہ اس روایت سے نکالا ہے کہ حضورؐ نے اپنا عقیقہ خود کیا تھا۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے محدثین نے اس روایت کی تکذیب کی ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات آئی، لیکن اطمینان جب ہی ہوگا جب آپ جواب مرحمت فرمائیں گے۔ بہت سے لوگ جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور بڑے ہو کر عقیقہ کرتے ہیں یا بچہ کی پیدائش سے ۲۱ روز کے بعد وہ باز آجائیں گے۔ ایک صاحب نے دارالعلوم دیوبند سے فتوے فتویٰ منگایا تھا وہاں سے بھی یہی جواب آیا کہ ہر وقت کر سکتے ہیں بس ساتویں روز ہو۔ یعنی اگر یوم پیدائش پیر ہے تو اتوار کو عقیقہ کر دے۔ عقیقہ بھی ہو گیا سنت بھی ادا ہو گئی (لیکن انکا اب کچھ اعتبار نہیں۔ کئی فتوے میں نے خود منگائے جو غلط ثابت ہوئے نہ معلوم کہاں کے بنے ہوئے مفتی پکڑ پکڑ کر رکھ لئے ہیں مفت کے) میرے خیال سے یہ بہت بڑا گناہ ہوگا اگر ایک کام کو ہم سنت سمجھ کر کریں اور وہ سنت نہ ہو (یا بدعت ہو) اس کے متعلق خوب روشنی ڈالیں کہ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے کیا مدت معین ہے؟ کب تک کیا جا سکتا ہے جو سنت ادا ہو جائے؟

الجواب :۔

ہمارے نزدیک تحقیقی بات یہ ہے کہ جس شخص میں عقیقہ کرنے کی استطاعت ہو اور کوئی اور مانع بھی نہ پایا جا رہا ہو اسے ساتویں یا چودھویں یا اکیسویں روز اس سنت سے فارغ ہو جانا چاہئے

ورنہ بہت ضائع ہو جائے گی اور بعد میں اس کی تلافی نہ ہو سکے گی۔ عقیقہ فرض وواجب تو ہے ہی نہیں، سنت ہے۔ جس طرح سنت نمازوں کا ایک محل ہے اور اس محل کے سوا کسی اور محل میں پڑھنے پر وہ قضا کہلائیں گی ———

قضا میں ادا کا ثواب کہاں۔ ہاں کسی شرعی عذر کی بناء پر برمحل ادا نہیں کر پایا ہے تو قضا میں بھی ادا جیسا ثواب ملیگا۔ یہی حال عقیقے کا ہے۔ اگر عقیقے کا خرچ موجود نہیں تھا یا اور کوئی شرعی عذر عقیقے کی ادائگی میں مانع تھا تو مذکورہ تینوں دلوں میں ادا نہ کر پانا سنت کا ضیاع نہیں کہلائے گا۔ پھر جب خرچ مہیا ہو جانے یا عذر دور ہو جانے کے بعد عقیقہ کرے گا تو سنت کا ثواب مل جائے گا۔

لیکن استطاعت ہوتے ہوئے بلا عذر ان تینوں دلوں کی بجائے بعد میں کرے گا تو اگرچہ ثواب پھر بھی کچھ نہ کچھ ملے گا مگر اتنا نہیں جتنا بروقت کرنے سے ملتا ہے۔

مصافحہ

سوال ۱۲:- (ایضاً)

مصافحہ اور معانقہ کے متعلق اسلام کی تعلیم کیا ہے، کن کن مواقع پر اس کا کرنا ثابت ہے۔ آنحضورؐ صحابہ تابعین تبع تابعین رضوان اللہ اور ائمۂ سلف سے نیز ان مواقع کے علاوہ بھی ایسا کرنا درست ہوگا یا بدعت۔؟

الجواب ۱۲:-

مصافحہ اسلامی تہذیب ومعاشرت کا ایک آئیٹم ہے جو باہمی تعلق اور موانست ومودت کی نشاندہی کرتا ہے۔ قرون اولیٰ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصافحہ سلام کی طرح تو کثیر الحمل نہیں تھا۔ البتہ ایسے اوقات میں اس کا استعمال کافی ہوتا تھا جب دو اجنبی مسلمان ایک دوسرے سے ملیں یا دو شناسا کچھ مدت کی جدائی کے بعد ملاقات کریں صحابہ رضوان اللہ علیہم سلام تو خدمت سرکارؐ میں ہر حاضری پر کرتے تھے، لیکن مصافحہ کا التزام نہ تھا۔ سلام ایک زبانی فعل ہے لہذا اس کی کثرت میں کوئی تعب اور دشواری نہیں لیکن مصافحہ ایک عضویاتی عمل ہے لہذا اسکی غیر معمولی کثرت اور مداومت والتزام میں دشواری و پریشانی ہے اسلام آسانیاں پیدا کرتا ہے دشواریاں نہیں لہذا اس کو سلام جیسی اہمیت نہیں دی گئی۔

یہ تو تھی واقعاتی کیفیت۔ اب معنوی کیفیت پر توجہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مصافحہ عبادات کی نوع میں سے نہیں ہے لہذا جو لوگ اسے عبادات سے جوڑ دیتے ہیں وہ صریح غلطی پر ہیں۔ مثلاً بعض جگہ نمازوں کے بعد اس کا التزام کیا جاتا ہے اس میں عملاً دقت ہے اور عقیدۃً خامی۔ ہر چیز اس کی حد میں رکھنا ہی دیانت ودانشمندی ہے۔ مصافحہ کو نہ تو اتنا اہم بنائیے کہ جان ضیق میں آجائے نہ ایسا نظر انداز کیجئے کہ نام و نشان ہی مٹ جائے۔

الشہاب الثاقب

سوال ۱۳:- از آغا حسن۔ ضلع مظفرپور (بہار)

الشہاب الثاقب مؤلفہ مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کس معیار کی کتاب ہے۔ اس کے بارے میں علمائے عظام کے کیا نظریئے ہیں۔ یہاں اس کے بارے میں کافی اختلاف چل رہا ہے۔ خصوصاً بدعتیوں نے کافی پریشان کر رکھا ہے آپ جو فیصلہ کریں گے وہی اچھا ہوگا۔ بنائے مخالفت یہ ہے کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قبلہ اعظمی شیخ الحدیث استاد مولانا منظور احمد صاحب نعمانی نے اس کتاب کو فاضلانہ رسالہ تحریر فرمایا ہے —— چنانچہ شیخ الاسلام صفحہ ۲۲ میں لکھتے ہیں کہ "اس دور کی یادگار آپ کا "فاضلانہ رسالہ" الشہاب الثاقب ہے جس میں بریلوی فتنہ کی بیخ کنی کی ہے اور آپ ماہنامہ تجلی فروری و مارچ ۵۹ء کے صفحہ ۱۷۶ پر تحریر فرماتے ہیں کہ "ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ نہ صرف الشہاب الثاقب کا انداز تحریر دافعی غیر محمود اور لائق اجتناب ہے بلکہ ہم وہابیوں کے اور بھی بندوں سے کہیں کہیں ازراہ بشریت الفاظ انداز کی ایسی لغزشیں ہوگئی ہیں کہ قابل اصلاح کہنا چاہیئے۔

نیز اسی رسالہ میں صفحہ ۴۲ کالم ۲ پر آپ نے اسی قسم کی بات پر فرمائی ہے۔ لہٰذا ہم کس کی بات مانیں، آپ کی یا جناب اعظمی صاحب کی اور اس کتاب کو کسی چیز کے ثبوت میں پیش کر سکتے ہیں یا نہیں۔ پورا جواب ماہنامہ تجلی میں شائع فرمائیں۔

الجواب ۱۳:۔

استاذ المکرم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی کتاب "الشہاب الثاقب" کے بارے میں مولانا اعظمی دام ظلہ نے اور ہم نے جو کچھ کہا وہ بظاہر متصادم سا نظر آتا ہے لیکن فی الحقیقت اس میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ بدعت کے رد اور باطل معتقدات کی تردید میں بلا شبہ یہ کتاب اچھی کتاب ہے، اور اسی مجموعی افادیت کے پیش نظر مولانا اعظمی یا کسی اور کی تعریف و تحسین اس کے بارے میں بالکل بجا ہے۔

لیکن ہم نے جو رائے ظاہر کی تھی وہ اس کے انداز تحریر اور اسلوب گفتار سے متعلق ہے۔ ہمارے شیخ مولانا مدنیؒ بڑے بے لاگ، صاف گو، نڈر اور مخلص بزرگ تھے جس بات کو انھوں نے جیسا سمجھا ویسا ہی بر ملا کہہ گزرے اور امورِ باطل کے معاملہ میں وہ رواداری و نرمی کے قائل نہ تھے۔ شدت اور سخت گیری پر عامل تھے۔ مزاج کی فطری خصوصیات بہرحال رنگ لاتی ہیں۔ ابوبکرؓ کی نرمی اور عمر فاروقؓ کی شدت کبھی ایک سطح پر نہیں آسکتیں اسی طرح ابوحنیفہؒ کے مزاج کا سمندر جیسا بھاری بھرکم ٹھیراؤ اور ابن تیمیہؒ کے مزاج کی گرمی اور حدت کا فرق بہرحال قائم رہے گا۔ پھر بھلا کیا تعجب ہے جو مولانا حسین احمد مدنیؒ یا مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ جیسے جلیل القدر بزرگوں کی تحریروں میں ان کے مزاجوں کا ایک خاص انداز کہیں کہیں اپنی گہری چھاپ ڈال جائے اور یہ چھاپ ردِ عمل کی حیثیت سے تو قابل اعتراض نہ سمجھی جائے لیکن غیر اضافی اعتبار سے داغدار محسوس ہو۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تجلی کے جس مقام سے آپ نے ہمارے فقرے نقل کئے وہاں مطالب و معانی کا نہیں اسلوب و انداز کا تذکرہ تھا اور اسلوب و انداز کے لحاظ سے بے شک الشہاب الثاقب میں بعض مقامات پر ایسی گرما گرمی اور شدت پائی جاتی ہے کہ وہ نہ پائی جاتی تو حکمت و مصلحت کے پہلو سے بہتر ہوتا۔

ایک الشہاب الثاقب ہی کی بات نہیں۔ ہم سے اور ہمارے اسلاف سے از راہ بشریت علمی، فکری اور منطقی لغزشیں ہوتی ہی رہی ہیں۔ ہم اگر مختلف دینی گروہوں کے باہمی اختلافات میں رواداری اور فیاضی کا عنصر شامل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ایمانداری کے ساتھ خود اپنی لغزشیں بھی تسلیم کرنی چاہئیں تاکہ دوسرے گروہ بھی خود تنقیدی اور رواداری پر آمادہ ہوں۔ فروعی اختلافات کی سب سے بڑی بنیاد یہی ہے کہ ہر شخص اپنے بزرگوں اور اپنے رہنماؤں کو عملاً خطا و نسیان سے بلند سمجھتا ہے جس کے نتیجے میں انکی کسی رائے یا عمل کے خلاف وہ ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں ہوتا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہم ضرورت کے وقت خود اپنے ائمہ فکر — فقہائے احناف پر بھی نقد و نظر سے گریز نہیں کرتے اور جس دھبے کو ننگ دامن سمجھتے ہیں اسے زینت دامن ثابت کرنے کی سعی نہیں کرتے۔ اسی طرح اگر دوسرے لوگ بھی حق کو گروہی تعصبات سے بالا تر ہو کر قبول اور نشر کرنے کی عادت ڈالیں تو امت کا بیڑا پار ہو جائے۔

بدعتیوں سے کہدیجئے کہ مطالب و معانی کے اعتبار مولانا مدنیؒ کے فرمودات عین قرآن و سنت کے ترجمان ہیں اور دین میں اصل اہمیت معانی و مطالب ہی کو حاصل ہے۔

الفاظ کے پھندوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے؟

شرک اور مشرک

سوال ۱۴:۔ (ایضاً)

"تقویۃ الایمان" برابر مطالعہ میں رہتی ہے اور طبیعت کا رجحان بھی اس کی جانب کافی ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ

حضرت مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا ہے کہ اس کا پڑھنا اور رکھنا عین اسلام ہے اور اس کے تمام دلائل کتاب اللہ اور احادیث سے ماخوذ ہیں۔ اس لئے جب بھی موقعہ ملتا ہے کچھ نہ کچھ ضرور دیکھ لیتا ہوں اس میں ایک عبارت نظر سے گذری جس کی بنا پر میں عجیب کشمکش میں مبتلا ہوگیا۔ آپ کی خدمت میں سوال پیش ہے اس کو بھی شائع فرماکر عند اللہ ماجور ہوں تاکہ دوسرے لوگ بھی مستفید ہوں۔ (عبارت یہ ہے) تقویۃ الایمان صفحہ ۶۵ میں یہ مسطور ہے کہ "کوئی نام رکھتا ہے علی بخش، پیر بخش غلام محی الدین، غلام معین الدین یہ سب جھوٹے مسلمان سچے شرک میں مبتلا ہیں"۔

صفحہ ۶۶ پر بھی اسی قسم کی عبارت ہے۔ اور تذکرۃ الرشید کے صفحہ ۱۳ پر حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کا پدری و مادری نسب نامہ یوں درج ہے۔ (پدری نسب نامہ یہ ہے)

"رشید احمد ابن ہدایت، احمد بن پیر بخش بن غلام حسن بن غلام علی"۔

مادری نسب نامہ :-

"رشید احمد بن کریم النساء بنت فرید بخش بن قادر بخش بن محمد صالح بن غلام محمد"۔

تقویۃ الایمان کی اس عبارت کی بناء پر حضرت کے آباواجداد مشرک ہوں گے یا نہیں ؟

الجوابـ :-

دین کا یہ نکتہ ہم تجلی میں بارہا بیان کرچکے ہیں کہ کسی فعل کو فعلِ شرک یا فعلِ کفر کہنے کا لازمی مطلب یہ نہیں ہوا کرتا کہ اس کا مرتکب مشرک یا کافر ہوگیا۔ احادیث میں آیا ہے کہ چوری، زنا، لوٹ مار سب کافرانہ اعمال ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ ریا یعنی دکھاوا شرک ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ جس میں دیانت نہیں اس میں ایمان نہیں جو ہمسائے کو تکلیف پہنچائے وہ مومن نہیں وغیر ذلک۔

خوارج اور معتزلہ کو ایسی ہی روایات وآیات سے یہ غلط فہمی ہوئی کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب کافرومشرک ہوجاتا ہے یا کم سے کم خارج از اسلام تو ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن تمام علمائے حق نے قرآن وسنت ہی کے قوی دلائل سے یہ صحیح تر عقیدہ اخذ کیا ہے کہ کوئی مسلمان چور، یا زانی یا لٹیرا یا ہمسایہ آزار یا خائن مجرد اِن معاصی کے ارتکاب سے کافرومشرک نہیں ہوجاتا حتیٰ کہ ریا تک سے جو شرکِ اکبر ہے مسلمان خارج از اسلام نہیں ہوتا۔

کیوں ؟ — اس لئے کہ تمام گناہ اپنی سرشت کے اعتبار سے خاندانِ کفروشرک ہی کے چشم وچراغ ہیں۔ اسلام اللہ کی فرماں برداری اور مکمل خود سپردگی کا نام ہے۔ جو افعال نافرمانی پر مبنی ہوں وہ اسلام سے قرابت نہیں رکھ سکتے۔ لہذا معاصی کو کفروشرک ہی کے شجرِ خبیثہ کا پھل اور برگ وبار قرار دیا جائے گا۔ لیکن اصلاً کفروشرک ذہن وقلب کی کیفیات اور عقیدۃً وذہنیت سے تعلق رکھتا ہے۔ افعال فقط مظاہر ہیں۔ اگر کافرانہ ومشرکانہ افعال کا ارتکاب کرتے ہوئے ہوئے انسان عقیدۃً ونیت کے اعتبار سے بھی کفروشرک ہی سے ملوث ہے تو اس کے کافرومشرک ہوجانے میں کوئی شک نہیں، لیکن اگر عقیدۃً ونیت کے خانوں میں ایمان موجود ہے اور کفروشرک نے شعوری حیثیت اختیار نہیں کی تو اس شخص کو اسلام کا قانون کافرومشرک قرار نہیں دے گا اور اسکی موت پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی مسلمانوں ہی کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا اور مغفرت کی دعاؤں میں کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔

یہ بنیادی قاعدہ ذہن نشین کرلیجئے تو وہ شبہات دور ہوجائیں گے جو آپ کو مولانا گنگوہیؒ کے شجرہ نسب پر پیدا ہوئے ہیں۔ ان کے اجداد میں سے کسی نے اگر اپنے بیٹے کا نام پیر بخش یا فرید بخش رکھا تھا تو تقویۃ الایمان کی تصریح کے مطابق بے شک یہ فعل مشرکانہ ہے۔ لیکن یہ ثابت نہیں ہوسکا کہ یہ نام رکھنے والے کیا بطور عقیدہ بھی یہ تصور رکھتے تھے کہ اللہ کے سوا کوئی اولاد بخش سکتا ہے۔ یہ تصور ہوتا تو یہ لوگ سچ مچ مشرک ہوگئے ہوتے لیکن ایسا ثابت نہیں تو انھیں مسلمان ہی مانا جائے گا اور صرف یہ ریمارک دیا جاسکے گا کہ یہ فعل انھوں نے کم فہمی یا جہالت کے باعث مشرکانہ کیا تھا جس کی ہرگز تقلید نہیں کرنی چاہئیے۔

ویسے بھی کرمفرماکو یہی ضد ہو کہ ہم تو تقویۃ الایمان کی تائید میں انھیں سچ مچ مشرک ہی مانیں گے تو اگرچہ یہ لغویت ہوگی لیکن پھر بھی اس سے مولانا گنگوہیؒ کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ کسی کا باپ دادا کافر و مشرک ہو گذرا تو اس میں اس کا کیا قصور۔ اور نسب نامہ بیان ہوگا تو ظاہر ہے ٹھیک ٹھیک وہی نام دیئے جائیں گے جو رکھے جا چکے۔ حضرت عکرمہؓ کا باپ ابوجہل تھا تو اسے ابوجہل ہی کہیں گے اور عکرمہ ابن ابوجہل کہلائیں گے۔ مگر کیا اس سے عکرمہؓ کی عظمتِ صحابیت مجروح ہوگئی ؟

مولانا گنگوہیؒ کے اجداد جو کچھ بھی رہے ہوں ان کے ایمان و کفر کی بحث میں پڑنے سے فائدہ ؟ بات وہی درست ہے جو تقویۃ الایمان میں قرآن و سنت کی بنیاد پر کہی گئی اسکی زد کہیں بھی پڑے پڑا کرے۔

غیر ثقہ کتابیں

سوال ۱۵:- (ایضاً)

ارواح ثلٰثہ و تذکرۃ الرشید، یہ دونوں کیسی کتابیں ہیں۔ اس میں کچھ واقعات منقول ہیں جن سے بدعتی حضرات کافی طعن و تشنیع اور مذاق کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیلئے دو تین واقعات درج کئے جاتے ہیں کہ آپ بھی نظر ڈالیں اور اس کا جوابِ شافی مجبوب رسالہ تجلی میں ظاہر کریں۔

ارواح ثلٰثہ صفحہ ۲۸۹ حضرت والد ماجد مولٰنا حافظ محمد احمد صاحب و عم محترم مولانا حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہما نے بیان فرمایا کہ "ایک دفعہ گنگوہ کی خانقاہ میں مجمع تھا۔ حضرت گنگوہیؒ و حضرت نانوتویؒ کے مرید و شاگرد سب جمع تھے اور یہ دونوں حضرات بھی وہیں مجمع میں تشریف فرما تھے کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے حضرت مولٰنا قاسم نانوتویؒ سے محبت آمیز لہجے میں فرمایا یہاں ذرا لیٹ جاؤ۔ حضرت نانوتویؒ کچھ شرما سے گئے مگر حضرت گنگوہیؒ نے پھر فرمایا تو بہت ادب کے ساتھ چت لیٹ گئے حضرت بھی اسی چارپائی پر لیٹ گئے اور مولانا قاسم نانوتوی کی طرف کروٹ لیکر اپنا ہاتھ ان کے سینے پر رکھ دیا جیسے کوئی عاشق صادق اپنے قلب کو تسکین دیا کرتا ہے۔ مولانا قاسم نانوتوی ہر چند فرماتے ہیں کہ میاں کیا کر رہے ہو یہ لوگ کیا کہیں گے۔ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا لوگ کہیں گے کہنے دو۔"

(تذکرۃ الرشید جلد دوم صفحہ ۲۴۵)

آپ (یعنی مولوی رشید احمد گنگوہیؒ) ایک مرتبہ خواب بیان فرمانے لگے کہ "مولوی محمد قاسمؒ کو میں نے دیکھا کہ دلھن بنے ہوئے ہیں اور میرا نکاح ان کے ساتھ ہوا پھر خود ہی تعبیر فرمائی کہ آخر ان کے بچوں کی کفالت کرتا ہی ہوں"

(تذکرۃ الرشید حصہ دوم صفحہ ۲۸۹)

مولوی رشید احمد گنگوہیؒ نے ایک بار ارشاد فرمایا۔ میں نے ایک بار خواب دیکھا تھا کہ "مولوی محمد قاسم دولھن کی صورت میں ہیں اور میرا ان سے نکاح ہوا ہے۔ سو جس طرح زن و شوہر میں ایک دوسرے کو فائدہ پہنچتا ہے اسی طرح مجھے ان سے اور انھیں مجھ سے فائدہ پہنچا ہے" چند سطر بعد یہ توضیح اور ہے حکیم محمد صادق کاندھلوی نے کہا الرجال قوامون علی النساء یعنی مرد حاکم ہیں عورتوں پر آپ نے یعنی گنگوہی صاحب نے فرمایا آخر ان کے بچوں کی تربیت کرتا ہی ہوں۔

اس کے علاوہ بھی بہت سے عجیب واقعات ہیں۔

الجواب ۱۵:-

عقیدت و ارادت رکھنے والے لوگ جب اپنے شیوخ اور ائمہ کا تذکرہ لکھیں گے تو قدرتی بات ہے کہ مبالغے اور جانبداری سے دامن بچانا ان کے لئے بہت دشوار ہوگا۔ عقیدت کی آنکھ اپنا خاص دائرہ بناتی ہے اور نیازمندی سے لبریز دماغ مقناطیس کی طرح ہر اس روایت کو مرغوب غذا کی طرح قبول کر لیتا ہے جس سے اس کے ممدوحین کی عظمت و تقدیس کا جھنڈا اونچا ہوتا ہو۔

اس بنیادی اصول کے پیش نظر ارواح ثلٰثہ اور تذکرۃ الرشید جیسی کوئی بھی کتاب زیادہ سے زیادہ اتنی ہی قابل اعتماد ہو سکتی ہے کہ اس میں جو باتیں معقول نظر

آئیں انھیں مان لیا جائے اور جو غیر معقول محسوس ہوں انھیں
رد کردیا جائے۔ روایت کا فن، فن حدیث کے سلسلے میں اپنے
آخری کمال کو پہنچ چکا۔ وہاں تو راویوں کے حالات اور انکے
بارے میں اہل الرائے کے خیالات کا مطالعہ کرکے یہ فیصلہ
دینا ممکن ہے کہ کونسی روایت کس درجے میں قابل قبول ہے
لیکن تذکرۃ الرشید یا ارواح ثلثہ جیسی کسی بھی کتاب کی روایات
پر اطمینان اور بھروسہ کرلینے کے لئے کافی شافی شہادتوں کا
حصول عملاً محال ہے۔ لہٰذا ان میں جو روایات قرین قیاس
اور نتیجہ خیز نظر آئیں ان سے تو سبق لیجئے اور جو ایسی نہ ہوں انھیں
نظر انداز کردیجئے۔

ویسے ارواح ثلثہ کی نقل فرمودہ روایات میں ہمیں کوئی
ایسی خرابی نظر نہیں آئی جس کی وجہ سے آپ بدگمان اور
متوحش نظر آرہے ہیں۔ آخر اس میں کیا عیب یا استحالہ ہے
کہ دو بزرگ ایک چارپائی پر لیٹ جائیں اور ایک کے ہاتھ کا
لمس اور دباؤ دوسرے کے اندر کسی نوع کا روحانی و باطنی
فیض پہنچا دے۔ متعدد احادیث سے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے
آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کا لمس کتنی ہی بار
امراض کے لئے شفا ثابت ہوا ہے اور روحانی فیوض بھی
اس سے پہنچے ہیں۔ تو ایسے زمانے میں جب کہ آواز جیسی غیر
مادی چیز کے نقل و انتقال کا نظارہ ریڈیو اور وائرلیس جیسی
ایجادات کی صورت میں ہر شخص کھلی آنکھوں سے کررہا ہے
یہ بات کیوں غیر معقول سمجھی جائے گی کہ ایک بزرگ نے اپنے
ہاتھ کے لمس اور دباؤ سے کسی شخص کو روحانی فیض پہنچا دیا۔

رہی "عاشق صادق" کی تمثیل تو وہ خود تذکرہ نگار کا
انداز بیان ہے نفس حکایت سے اس کا تاریخی تعلق کچھ بھی نہیں۔

تذکرۃ الرشید کی متذکرہ دونوں روایتوں میں فقط
خوابوں کا بیان ہے۔ خواب تو عموماً ہوتے ہی عجیب و غریب
ہیں اگر کسی مرد کا دلھن بنا ہوا نظر آنا حیرتناک ہے تو اس پر
بے اعتباری یا استکراہ کیوں ہے خوابوں میں تو اس سے کہیں زیادہ
محیر العقول اور خرقِ عادت چیزیں نظر آجاتی ہیں۔

الرجال قوامون علی النساء جیسی نکتہ سنجیوں کو ہمارا
مزاج پسند نہیں کرتا کیونکہ قرآن کے معاملے میں جتنی احتیاط برتی
جائے اولیٰ ہے، لیکن ہمارا یا کسی کا بھی مزاج دین کے معاملے
میں قاضی نہیں مانا جاسکتا۔ اگر کسی سلف نے متذکرہ نکتہ سنجی
کرہی لی ہے تو اس پر بدگمانی کی عمارت اٹھانا درست نہیں

شر انگیزی

سوال ۱۶۱ :- (ایضاً)

حفظ الایمان مؤلفہ حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ
ص۷ پر ہے "پھر یہ کہ آپ کی ذات مقدس پر علم غیب کا حکم
کیا جانا اگر بقول زید صحیح ہے تو دریافت طلب یہ امر ہے کہ اس
غیب سے مراد بعض غیب ہے یا کل۔ اگر بعض علوم غیبیہ مراد ہیں تو
اس میں حضور کی کیا تخصیص ہے۔ ایسا علم تو زید و عمرو بکر بلکہ ہر
صبی و مجنون بلکہ جمیع بہائم کو حاصل ہے"۔

اس عبارت میں لفظ ایسا آگیا ہے اس پر آجکل بدعتیوں
نے عجیب رنگ بھرا ہے۔ اب آپ ہی اس کی عقدہ کشائی
فرمائیں اور تجلی میں شائع کریں۔

توضیح البیان فی حفظ الایمان مؤلفہ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب
چاندپوری ثم دربھنگوی ص۸ مطبع قاسمی دیوبند باہتمام مولوی
محمد طیب رقمطراز ہیں۔ واضح ہو کہ ایسا کا لفظ فقط مانند اور
مثل ہی کے معنی میں مستعمل نہیں ہوتا بلکہ اس کے معنی اس قدر
اور اتنے کے بھی آتے ہیں جو اس جگہ متعین ہیں اور مولانا مدنی
صاحبؒ الشہاب الثاقب ص۱۰۱ پر لکھتے ہیں کہ حضرت مولانا
تھانویؒ عبارت میں لفظ ایسا فرمارہے ہیں۔ لفظ اتنا تو
نہیں فرمارہے ہیں اگر لفظ اتنا ہوتا تو اس وقت البتہ یہ احتمال
ہوتا کہ معاذاللہ حضور علیہ السلام کے علم کو اور چیزوں کے
برابر کردیا۔

توضیح البیان کی عبارت سے مدنی صاحبؒ کافر ہوتے
جاتے ہیں اور الشہاب الثاقب کی عبارت سے مرتضیٰ
صاحب کافر ہوتے ہیں۔

(بات سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ فوراً اس کی
تلاش کریں)۔

جواب ۱۶ :—

جب کوئی فرد یا گروہ نفسانیت کی راہ چل کر عناد و نفرت تعصب، ہٹ دھرمی اور شر انگیزی کو مقصدِ حیات بنالیتا ہے تو پھر اس کی غیر مختتم وسیسہ کاریوں سے شریف اور سنجیدہ لوگوں کا مامون رہنا سخت مشکل ہے۔

اہل بدعت کے پاس کرنے کا کام اس کے سوا ہے کیا کہ اپنا تاریک دماغ بھولے بھالے عوام کے دماغوں میں آلٹتے رہیں اور جو بھی فرد یا گروہ مشعل لے کر آگے بڑھے اس کی راہ روک کر کھڑے ہوجائیں۔ فروعی مسائل پر بحثیں اور بدعتو نپر اصرار ہی ان کی کل پونجی ہے۔ ان کے بازار کی رونق چرب زبانی وہرزہ سرائی پر منحصر ہے۔ کسی بدعتی کو آپ نہیں دیکھینگے کہ وہ اعلائے کلمۃ الحق اور خدمتِ دین وملت کے میدان میں کوئی مثبت اور اتحاد آفریں پیغام لے کر دو قدم چلنے کی زحمت اٹھا رہا ہو۔ اثبات کے خانے میں مبتدعین کے یہاں صرف عرس، فاتحہ، قوالی، میلاد اور اسی نوع کے گوناگوں مشاغل ہیں۔ باقی نفی ہی نفی ہے۔ فلاں کافر فلاں ملحد فلاں وہابی فلاں جہنمی۔

دیوبندی علماء سے تو انھیں خصوصی کد ہے۔ آئے دن طرح طرح کے لایعنی اعتراضات اٹھائے جائیں گے۔ جوابات کے لئے ان کے کان بہرے ہیں۔ سو بار ان کے کسی اعتراض کا شافی جواب دیدیجئے۔ یہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے پھر اسی اعتراض کو دہراتے رہیں گے گویا کبھی بھی آج تک اس کا جواب بن نہیں آیا۔ ایسے فتنہ پردازوں کا توڑ استدلال سے بہت مشکل ہے۔ کون متین اور خوش اوقات آدمی ان سے جھک جھک کرنے میں اپنی انرجی اور وقت برباد کرنا پسند کرے گا۔

ہمیں تعجب ہے کہ جس اعتراض کو آپ نے ہمارے آگے پیش کیا ہے اس کی لغویت خود آپ پر کیوں منکشف نہیں ہوئی۔ عقل سلیم کے لئے تو ایسے اعتراضات صابن کے جھاگوں سے زیادہ کچھ بھی حیثیت نہیں رکھ سکتے۔

ہر پڑھا لکھا جانتا ہے کہ اردو میں لفظ ایسا تشبیہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تشبیہ کا مسلّم قاعدہ ہے کہ مشبّہ اور مشبّہ بہ کے درمیان مکمل مماثلت اور یکسانی مقصود نہیں ہوا کرتی بلکہ کسی خاص وصف میں اشتراک ہوتا ہے مثلاً آپ کہیں کہ زید تو ایسا ہے جیسا شیر۔ اس کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ زید بہادر ہے، قوی ہے بس۔ یہ نہیں ہوگا کہ وہ بھی شیر کی طرح چار ہاتھ پیروں پر چلتا اور جنگلی جانوروں کو دانتوں سے پھاڑ کھاتا ہے۔

مولانا اشرف علیؒ کی عبارت میں یہی لفظ ایسا پایا جارہا ہے جس پر اہل بدعت عرصۂ دراز سے اپنے خبثِ نفس اور دماغی تاریکی کا مظاہرہ کئے جارہے ہیں۔ حالانکہ دل ودماغ اگر عناد وتعصب سے خالی ہوں تو کسی بھی پڑھے لکھے آدمی کو مولانا مرحوم کی اس عبارت میں ایک صاف ساده سچائی کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ تذکرہ علم غیب کا ہورہا ہے۔ اہلِ بدعت کج فکری کے باعث اللہ کے رسولؐ کو عالم الغیب کہتے اور سمجھتے ہیں حالانکہ یہ اتنی جاہلانہ اور مشرکانہ بات ہے کہ اگر دورِ فاروقی میں کوئی ایسا کہتا تو مارے دُرّوں کے بدن کی کھال گرادی جاتی۔ مگر اب تو زمانہ آزادیٔ کامل کا ہے۔ قرآن کو ماننے والے خدا اور اس کی صفات سے جو بھی تمسخر چاہے کریں کون ان کے منھ میں لگام دے سکتا ہے۔

خیر۔ مولانا اشرف علیؒ بطور معارضہ اہل بدعت سے سوال کرتے ہیں کہ جس غیب کے علم کا دعویٰ آپ حضرات سرکارِ رسالتؐ کے لئے کرتے ہیں اس سے آپ کی کیا مراد ہے۔ آیا آپ کی مراد یہ ہے کہ حضورؐ کو ازل سے لیکر ابد تک ہر ہر امرِ غیب کا علم تھا یا یہ کہ بعض امورِ غیب کا علم تھا۔ اگر بعض کا علم مراد ہے تو اس میں سرکارِ رسالت ہی کی کیا خصوصیت ہوئی۔ ایسا علم یعنی بعض امورِ غیب کا علم تو ہر کہ ومہ حتیٰ کہ جانوروں تک کو حاصل ہے۔

حکیم الامت کا یہ ارشاد مسلّمات میں سے ہے۔ قرآن میں چیونٹی تک کی طرف وحی کئے جانے کا تذکرہ آتا ہے لہٰذا وہ علم غیب ہی ہوگا جس کا انحصار وحی پر ہو۔ اب

اہلِ بدعت کے بس میں اس مسلّمہ صداقت کی تردید تو تھی نہیں
لہٰذا انھوں نے یہ شوشہ چھوڑا کہ "ایسا" سے مراد "اتنا اور اس
قدر" ہے۔ یہ ایسا ہی شگوفہ تھا جیسے زید کو شیر جیسا کہنے کا مطلب
یہ لیا جائے کہ زید سیرت و صورت ہر لحاظ سے یکسر شیر کی مانند
ہے۔ مرتضیٰ حسن صاحب سے کوئی پوچھے کہ "اَب" کے معنی دادا اور
پردادا کے بھی آتے ہیں تو کیا جب بھی کوئی لفظِ "اَب" بولیگا
آپ پردادا ہی مراد لیں گے چاہے وہ کتنا ہی کہے جائے کہ
میں تو اپنے والد کا ذکر کر رہا ہوں؟

اگر ایسی دھاندلی اہلِ انصاف کا کام نہیں تو یہ دھاندلی
سوائے انصاف دشمنوں کے اور کون کر سکتا ہے کہ "ایسا" کے
معنی "اتنا" کرے اور اپنے دماغ کا تعفن مولانا اشرف علیؒ کی
عبارت میں اُلٹ کر فتنہ و انتشار کی آگ بھڑکائے۔

ایک شخص اپنے محبوب کی تعریف میں کہتا ہے "وہ تو
چاند ہے"

تو کیا کسی غبی سے غبی آدمی کو بھی یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے
کہ اس نے اپنے محبوب کو تمام صوری و معنوی اوصاف میں
چاند کا مماثل قرار دیدیا؟

ظاہر ہے احمقوں کے سوا بلکہ فتنہ پرداز معاندوں کے
سوا ایسا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ سب جانتے ہیں کہ چاند
کہنے کا مطلب حسن و جمال میں تشبیہ دینا ہے اور بس۔

ٹھیک اسی طرح جب مولانا اشرف علیؒ یوں کہتے ہیں
کہ بعض اُمورِ غیب کے علم میں زید عمر بکر اور جانور تک شریک ہیں
تو یہ مفہوم کوئی بد باطن اور فتنہ جُو ہی نکال سکتا ہے کہ سرکارِ
رسالت ﷺ اور دیگر حیوان و انسان کا علم غیب مقدار و تعداد کے
اعتبار سے بھی برابر ہے۔ جس طرح بچہ بھی جانتا ہے کہ حسین
سے حسین آدمی وزن، جسامت، ہیئت اور جملہ اوصاف و
خواص میں چاند کا مماثل نہیں ہو سکتا اسی طرح جاہل سے جاہل
مسلمان بھی جانتا ہے کہ جس مقدار اور جس نوع کا علم اللہ نے
آخری پیغمبر ﷺ کو عطا فرمایا بالکل اتنا اور ویسا تو کسی غیر نبی یا غیر
انسان کو تو کیا دیگر انبیاء کو بھی نہیں دیا گیا۔ مسلمان نام ہی اس کا
ہے کہ ہمارے حضورؐ عیسائیت اور یہودیت وغیرہ سے جداگانہ
جو امتیازی احکام و ہدایات لیکر آئے ہیں ان پر ایمان لایا جائے۔
یہ سارے احکام بذریعۂ وحی نازل ہوئے اور گوناگوں امورِ غیب
اللہ نے اپنے آخری پیغمبرؐ پر ایسے منکشف فرمائے جن میں کوئی دوسرا
آپ کا حریف نہیں۔ یہ سب جب مسلمات میں سے ہے تو مولانا
اشرف علیؒ کے رقم فرمودہ تمثیلی لفظ "ایسا" کا مفہوم وہ کیسے لیا
جا سکتا ہے جو شریر اہلِ بدعت لیتے ہیں۔ کیا فاطر العقل دیوانے
کے سوا بھی کوئی یہ بات کہہ سکتا ہے کہ جس مقدار میں حضورؐ کو
اُمورِ غیب کا علم تھا اسی مقدار میں ہر انسان بلکہ جانوروں
تک کو حاصل ہے؟

خوب سمجھ لیجئے تمثیل و تشبیہ صرف اس وصف میں ہے
کہ اللہ کے سوا ہر مخلوق کا علمِ غیب ناقص ہے۔ حضورؐ کو دنیا
بھر سے زیادہ علم سہی لیکن ازل سے لیکر ابد تک کے ہر ہر جلی و
خفی اور چھوٹے بڑے واقعے کا علم ہرگز نہیں تھا۔ یہ علم کامل
تنہا خدا کا حصہ ہے۔ عدمِ کمال کے وصف میں انبیاء اور غیر
انبیاء سب برابر ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے دو شخص ہوں جن
میں سے ایک کے پاس ایک ہزار روپے ہوں اور دوسرے کے
پاس دس لاکھ روپے۔ ظاہر ہے دوسرا پہلے کے مقابلہ میں بہت
دولت مند ہے لیکن یہ کہنا پھر بھی یقیناً بجا ہوگا کہ کروڑ پتی نہ
ہونے کے وصف میں دونوں شریک ہیں۔ بالکل اسی پر مولانا
اشرف علیؒ کے معارضے کو قیاس کیجئے۔ وہ یہ نہیں کہہ رہے
اور دنیا کا کوئی بھی ہوشمند سلامتی ہوش و حواس کے ساتھ یہ
نہیں کہہ سکتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جس مقدار میں اُمورِ غیب
کا علم حاصل تھا اسی مقدار میں ہمہ شما کو بھی حتیٰ کہ جانوروں کو
بھی حاصل ہے۔ ایسا صریح البطلان، احمقانہ اور لایعنی مفہوم مولانا
اشرف علیؒ جیسے عالم کے سر چپکنا صریحاً اہلِ بدعت کی شرارت
اور فتنہ انگیزی ہے۔ وہ تو یہ کہہ رہے ہیں کہ جس طرح فقط ہزار
دو ہزار روپوں کا مالک کروڑ پتی ہونے کے وصف سے عاری
ہے اسی طرح دس بیس لاکھ روپے کا مالک بھی اس وصف سے
عاری ہے اور جس طرح معمولی انسانوں کو کامل علم غیب حاصل
نہیں ہے اسی طرح حضورؐ کو بھی کامل علم غیب حاصل نہیں ہے۔
تھان میں سے دس گز کپڑا نکال لیجئے یا صرف دو گز نکال لیجئے

یہ بہرحال کہا جائے گا کہ کیڑا اپنی موجودہ مقدار میں "نقصان" نہیں ہے۔ اسی یکسانی کو علم غیب کے سلسلے میں مولانا اشرف علیؒ نے "ایسا" کے تمثیلی لفظ سے بیان کیا ہے اب اس دھینگا مشتی اور ہٹ دھرمی کو کوئی کیا کرے کہ فتنہ گر لوگ "ایسا" کا "اتنا" بنا دیں اور جاہل و بے خبر مسلمانوں کو اکابر امت کے خلاف بھڑکاتے پھریں۔

عالم الغیب ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ہستی جسے تمام اُمورِ غیب کا علم ہو۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ جسے ایک دو یا دس بیس اُمورِ غیب کا علم ہو اسے بھی عالم الغیب کہدیا جائے۔ اسی وجہ سے یہ خطاب بلند خدا کے لئے خاص ہے اور خدا کے سوا کسی کے بارے میں اس خطاب کی نسبت کرنا شرک ہے۔ جہالت ہے۔ بد دماغی ہے

لیکن اہلِ بدعت کا طرۂ امتیاز ہی علم و عقل کے تقاضوں کا خون کرنا اور جہلاء کے گروہ بنا کر امت میں تفرقہ ڈالنا ہے۔ ان کی پست فکری کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ حضورؐ کو بشر کہنا ہی ان نازک مزاجوں کے کلیجے پر سانپ لوٹا تا ہے۔ یہ اتنا نہیں سمجھتے کہ قرآن نے جو حضورؐ سے اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ کا اعلان و اعتراف کرایا اس سے وہی جزئی تمثیل مقصود ہے جو مولانا اشرف علیؒ کے "ایسا" میں پائی جا رہی ہے۔ "میں تم ہی جیسا بشر ہوں"۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہوا کہ نفسِ بشریت میں حضورؐ اور امتی سب برابر ہیں۔ وہی آدم کی اولاد۔ وہی بشری جبلتوں کے پیکر۔ وہی مریض ہونے والے بھول جانے والے لغزش کرنے والے کمزور مجسمے۔ اب اہلِ بدعت کا تو چونکہ دماغ ہی اوندھا چلنے کا عادی ہے لہذا وہ گھبرائے کہ ہائیں حضورؐ بھلا ہمارے جیسے بشر ہوں۔ ہم گنہگار، غلام، بے حیثیت اور وہ معصوم، آقا اور معزز و مکرم۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اور وہ یکساں ہوں یہ لوگ تمثیل و تشبیہ کی علمی حقیقت سے باخبر ہی نہیں یہی وجہ ہے کہ مولانا اشرف علیؒ تو درکنار انھیں خدا تک کے کلام میں کلام ہے اور حضورؐ کو بشر کہتے ہوئے بھی ان کی جان نکلتی ہے، حالانکہ بشریت کا اثبات خود اللہ تعالیٰ تکرار و اصرار کے ساتھ فرما رہا ہے۔

الحاصل اپنے سوا ہر گروہ کے بزرگوں میں کیڑے ڈالنا اور ان کی تحریر و تقریر سے من مانے مفاہیم اخذ کر کے تفرقہ پھیلانا اہل بدعت کا پرانا شغل ہے۔ انھیں لاکھ بار کسی اعتراض و الزام کا شافی جواب دیجئے مگر یہ سُنی اَن سُنی کر دیں گے اور برابر وہی رٹے جائیں گے۔ انھیں غالباً اس خوش فہمی نے مار لیا ہے کہ جن بزرگوں کی قبروں کو ہم نے معبد بنا رکھا ہے، جن کے نام کی نیازیں ہم دیتے ہیں، جن کی توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں وہ لازماً ہمیں عذاب آخرت سے بچا لیں گے اور جنت ہمارے لئے رزرو ہو چکی ہے لہذا اب جو بھی حرکتیں کئے جاؤ سب روا ہے۔ ایسی خوش فہمی جسے ہو جائے اس کی بے کرداری اور خرمستی کے منھ میں کون لگام دے سکتا ہے۔

اہلِ بدعت کا شرک

سوال ۷۷:۔ از عبد الغفار۔

گذشتہ ماہ کے رسالے میں آپ نے بعنوان "وہی دیرینہ بیماری" تحریر فرمایا ہے کہ "فقہ حنفی ہی نہیں تمام فقہاء کرام ایسے شخص کو کافر کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو حاضر و ناظر یا غیب داں جانے لیکن رضاخانی حضرات کو کافر کہنا قدرے مشکل ہے کیونکہ وہ تاویل سے ایسا مانتے ہیں"۔ مذکورہ جواب سے یہاں دو آدمیوں کے درمیان جھگڑا پیدا ہو گیا ہے۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ جناب کی عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی اللہ تعالےٰ کے سوا دوسرے کو حاضر و ناظر یا غیب داں جانے وہ کافر و مشرک ہے۔ اس اصول سے رضاخانی وغیرہ کوئی بھی مستثنا نہیں۔ دوسرے صاحب کہتے ہیں کہ نہیں جناب نے رضاخانیوں کو مشرک و کافر کہنے سے مستثنا کیا ہے۔ بدیں وجہ کہ وہ تاویلاً ایسا کہتے ہیں۔ جناب! آخر وہ کونسی معقول شریعت مطہرہ تاویل ہے۔ ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ

کسی تاویل سے مشرک مشرک نہ رہے۔ مثلاً زید یا عمر جو عالم اور مدرس بھی ہے قرآن پاک آیت کریمہ علمک مالم تکن تعلم اور سورۂ جن کی آخری آیات سے (عالم الغیب الی ان قال الا من ارتضیٰ من رسول) تحریف معنوی کرکے یہ کہتا ہے کہ ان آیات کی روسے نبی پاک صلعم تمام احوال اول تا قیامت حتیٰ کہ ہر شخص کا ذاتی علم بھی اور فلاں شخص جنتی ہے اور فلاں دوزخی فلاں فلاں جگہ مرے گا۔ ہر مادہ کے پیٹ کا حال ہے کہ نر ہے یا مادہ وغیرہ وغیرہ جانتے ہیں اور مدعی اس بات کا ہے کہ حضور صلعم کو تمام علم مذکورہ عطائی ہے۔ براہ کرم تشریح فرمائیں کہ مذکورہ الصدر آدمی کہتا ہے کہ جو اس کے خلاف عقیدہ رکھے وہ بے ادب اور گستاخ رسولؐ ہے وہ امت محمدیہ سے خارج ہے۔ کیا ایسے عقیدے والے امام کے پیچھے نماز ادا ہو جائے گی؟ کیا اس شخص کی تاویل مذکورہ آیات کی درست ہے؟ ایسے عقیدے والا مشرک وکافر ہے یا نہیں؟ مسئلہ قرآن مجید اور سنت و اجماع کی روشنی میں بیان فرمائیں۔

الجواب :-

جس طرح سزائے موت کسی مجرم کی آخری سزا ہے اور اس میں عدالتیں انتہائی احتیاط برتنے کی پابند ہیں اسی طرح کسی مومن پر فتویٔ کفر عائد کرنا آخری الزام ہے جس کے بارے میں انتہائی محتاط روش ضروری ہے۔

اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ تھوڑا بہت علم غیب دنیا میں ہر شخص کو حاصل ہے۔ آپ امریکہ نہیں گئے امریکہ کیا آپ نے اپنے ہی ملک کی بہتیری بستیاں نہیں دیکھیں مگر آپ جانتے ہیں کہ امریکہ اور یہ ان دیکھی بستیاں حقیقت ہیں مشاہدہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ مقامات آپ کے لئے غیب ہی کا درجہ رکھتے ہیں لہٰذا لغوی اعتبار سے آپ کو ان کے تعلق سے "عالم الغیب" کہہ دینا خلاف واقعہ نہ ہوگا۔

مگر اصطلاح میں "عالم الغیب" اسے کہتے ہیں جو تمام غیبی امور سے باخبر ہو۔ جب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لا یعلم الغیب الا ھو۔ اللہ کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا تو صریحاً اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ تمام اُمورِ غیب کی اطلاع اللہ کے علاوہ کسی کو نہیں۔ دس بیس پچاس امورِ غیب کی اطلاع تو سبھی کو ہے لیکن اس اطلاع کا مدار مختلف مادّی ذرائع پر ہے اور مادّی ذرائع سے حاصل شدہ علم علمِ غیب نہیں کہلاتا۔ ہاں بعض غیبی اُمور کی اطلاع اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو مادّی اسباب وعلل کے بغیر وحی اور القاء کے ذریعے بھی کر دیتا ہے اسی کا ذکر مَنْ اِرْتَضٰی والی آیت میں ہے۔ بریلویوں کو اس سے غلط فہمی ہوئی کہ تمام ہی اُمورِ غیب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مُطلع کر دیا گیا۔ یہ فاحش وصریح غلط فہمی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ فریب خوردہ حضرات یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ سارا علم عطائی ہے یعنی باری تعالےٰ نے عطا فرمایا ہے لہٰذا کھلے مشرکین کی صف پہنچنے سے بال بال بچ جاتے ہیں۔ اللہ کسی کو کسی غیبی چیز کا علم عطا کر دے اس اعتقاد میں کوئی قباحت نہیں۔ قباحت اور استحالہ صرف اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اپنے برابر علم عطا کر دے۔ یہ لوگ اپنے دماغی توازن کی خرابی، فراست کی کمی اور نفس کی بے راہ روی کے باعث اس قباحت اور استحالے کا ادراک نہیں کر پاتے لہٰذا گمراہ اور بدعتی ضرور کہلائیں گے مگر قانونی الفاظ میں مشرک ومرتد نہیں کہلائیں گے۔

ویسے صحیح اسلامی حکومت قائم ہو تو اس کا فرض ہوگا کہ ایسے واہی عقائد رکھنے والوں کی مزاج پرسی کرے، ان کو وارننگ دے اور پھر بھی یہ باز نہ آئیں تو اسلامی تعزیرات کا ڈنڈا استعمال کرے۔ ایسے عقائد رکھنے والوں کے پیچھے نماز درست نہیں۔ یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان سے معاشرتی تعلقات رکھے جائیں۔ اگر تاویل کے ذریعہ انھیں امت مسلمہ ہی کے زمرے میں رکھا جائے تب بھی ان کی بدعت شدیدہ اس پر ان کا اصرار کھلا فسق ہے۔ فساق وفجار سے ترک تعلق کا عہد بلکہ اقرار ہر نمازی روزانہ دعائے قنوت میں کرتا ہے۔

حدیث کی کس مپرسی

سوال ۱۵۱ :- از عبد الرشید۔ ضلع سیال کوٹ۔ پاکستان۔

مشکوٰۃ شریف پڑھنے کا اتفاق ہوا اُس کے صفحہ ۱۴۳ (مطبوعہ سعیدی) پر یہ چار احادیث پڑھیں:۔

(۱) وعن أبي الهيّاج الأسدي قال قال لي عليٌّ ألا أبعثك على ما بعثني عليه رسول الله صلى الله عليه وسلم أن لا تدع تمثالاً إلا طمستهٗ ولا قبرًا مشرفًا إلا سوّيته (رواہ مسلم)

حضرت ابو الہیاج اسدی کہتے ہیں کہ مجھ سے علیؓ نے کہا کیا میں تجھ کو اُس کام پر مامور نہ کروں جس پر رسولِ خدا صلعم نے مجھ کو مامور کیا تھا اور وہ یہ ہے کہ نہ چھوڑ تو کسی تصویر کو یعنی جہاں دیکھے تو کسی تصویر کو اُس کو محو اور نیست و نابود کردے اور جہاں کسی قبر کو اونچا دیکھے اُسکو برابر کردے۔

+ + + +

(۲) وعن جابرٍ قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن تجصّص القبر وأن يُبنى عليه وأن يُقعد عليه (رواہ مسلم)

(۲) حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے قبروں کو پختہ کرنے سے قبروں پر عمارت بنانے سے اور قبروں پر بیٹھنے سے۔

(۳) وعن أبي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لأن يجلس أحدكم على جمرةٍ فتحرق ثيابهٗ فتخلص إلى جلده خيرٌ له من أن يجلس على قبرٍ (رواہ مسلم)

(۳) حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اگر تم میں سے کوئی آگ کی چنگاری پر بیٹھ جائے اور وہ اس کے کپڑے کو جلا کر اُس کی جلد تک پہنچ جائے تو یہ بہتر ہے اس سے کہ وہ قبر پر بیٹھے۔

(۴) وعن جابرٍ قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن تجصّص القبور وأن يُكتب عليها وأن توطأ (رواہ الترمذی)

(۴) حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ منع فرمایا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو پختہ کرنے سے اور قبروں پر لکھنے سے اور قبروں کو روندنے سے۔

ہو سکتا ہے مجھ سے کتابت میں غلطی ہو گئی ہو مگر آنجناب پر مشکوٰۃ کا باب دفن المیت پوشیدہ نہیں ہوگا اس لئے مہربانی فرما کر تجلی میں ضرور اس پر لکھیں۔

تعجب کا مقام ہے کہ کیا امتِ مسلمہ کو کتاب مشکوٰۃ شریف میں یہ احادیث پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا ضرور پڑھتے ہوں گے مگر اس کے باوجود ہر قبر پر عرس اور میلے رچائے جاتے ہیں اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا بات ہے کیا آپ اس پر روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟

بالکل کھلے اور صاف لفظوں میں مذکورہ چاروں احادیث یہ ثابت کر رہی ہیں کہ قبریں برابر کر دی جائیں قبروں پر بیٹھا نہ جائے، قبریں پکی نہ بنائی جائیں۔ کیا کچھ ہم جیسے بے علم مسلمان دماغ ماؤف ہوا جاتا ہے کہ آخر ہم بے علموں کو بھی تو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ کیا جواب دیں گے۔ ایک طرف یہ احادیث ہیں اور دوسری طرف سوائے دماغی نکتہ سنجیوں کے کچھ بھی نہیں۔

(نوٹ) یہ بھی تحریر کیا جائے کہ یہ قبریں پختہ بنانیکا رواج کب سے شروع ہوا اور اس کا موجد کون ہے اور یہ کیسے رواج پا گیا؟

الجواب:۔

روشنی ڈالنے کی تو اِن احادیثِ صحیحہ میں کوئی بات ہی نہیں ہے۔ یہ اپنے مفہوم و مراد میں صریح ہیں اور روایت کے اعتبار سے مضبوط۔ ہاں سرد آہ بھرنے اور رو دینے کا بے شک مقام ہے کہ جس امت کے آقاؐ کی تعلیمات یہ ہوں اس امت میں قبر پرستی ایک مستقل دینی مشغلے کی نوعیت اختیار کر جائے۔ عرس تو خیر جہلاء کی ایجاد ہے اور قبروں پر نذر و نیاز اور استمداد کی بیلا تو خیر سڑے ہوئے بدعتی رچاتے ہیں لیکن اس کو کیا کہئے کہ تصوف کے بعض سلسلوں میں قبروں سے ربط ضبط مستقل تعلیم کی حیثیت رکھتا ہے اور قبروں سے کسبِ فیض کرنے والوں میں ایسے ایسے شیوخ نظر آتے ہیں جن کے زہد و تقویٰ کی قسمیں کھائی جا سکتی ہیں۔

واحسرتا۔ واویلاہ!

مسلم کی جو روایت آپ نے نمبر ۲ پر نقل کی اس کے ذیل میں مشہور شارح مسلم امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث

کی رو سے پختہ قبر بنانا، قبر پر عمارت تعمیر کرنا اور قبر پر بیٹھنا حرام ٹھیرا۔ جمہور علماء کا یہی مذہب ہے اور امام شافعیؒ نے کتاب الام میں فرمایا ہے کہ میں نے بہت سے ائمہ و علماء کو دیکھا کہ وہ قبروں کے گنبد وغیرہ گرانے کا حکم صادر کرتے تھے اور فقہاء نے کہا ہے کہ قبر پر بس اتنی ہی مٹی لگائی جائے جتنی اس کی کھدائی سے نکلی ہے اس سے زیادہ مکروہ ہے بھلا اس کے بعد قبر کو گچ کرنے اور پختہ بنانے یا اس پر عمارت بنانے کا جواز قابلِ تصور تک کیسے ہو سکتا ہے۔

محمد بن عبد الوہاب نجدیؒ جنھیں آج طرح طرح کی گالیاں دی جاتی ہیں ان کا قصور یہی تو تھا کہ احکام پیغمبر کی تعمیل میں انھوں نے عالی شان مقبروں اور پختہ قبروں کو ختم کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ بھلا یہ بات اس امت کو کیسے گوارا ہوتی جس نے قسم کھالی ہے کہ دین کو خالص کر کے ہر گز نہیں لیں گے، بلکہ ہر آیت اور حدیث کی اپنے آباؤ اجداد کی روش کے مطابق تاویل کریں گے بلا سے حدیث رسولؐ کس مپرسی کے عالم میں پڑی رہ جائے مگر یہ ہر گز نہیں ہونا چاہیئے کہ تصوف کے مبتدعانہ مشاغل وو ظائف کی توہین ہو جائے۔

فسادِ اندازِ فکر

سوال[19]:۔ از شکیل احمد۔ حیدر آباد۔

ہم چند دوستوں کے درمیان آج کل ایک مسئلہ زیر بحث ہے وہ یہ کہ ایک مسلمان کتب فروش اپنی دوکان میں فلمی، رومانی اور سیاسی، مذہبی ہر مکتبۂ فکر کے کتب و رسائل فروخت کر سکتا ہے یا نہیں؟

ہم میں کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ ایک مسلمان کیلئے یہ قطعاً ناجائز ہے یا کم سے کم اس "طوفانِ جاہلیت" میں خلافِ اسلام کتب و رسائل فروخت کرنا نامناسب تو ضرور ہے۔ ایسی کتابیں پڑھ کر جو لوگ "باطل" اختیار کریں گے اس کی ذمہ داری فروخت کرنے والے پر بھی ہوگی اور وہ گمراہ ہونے والے کے گناہ میں شریک بھی ہوگا۔

اس کے برخلاف دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ تنقیدی مطالعہ کے لئے ہر مکتبۂ فکر کا لٹریچر فروخت کر سکتے ہیں تاکہ لوگ تمام سیاسی و مذہبی عقائد و نظریات کا مطالعہ کر سکیں۔ کوئی شخص "باطل" قبول کرے گا تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہوگا۔ غیر اسلامی اور خلافِ اسلام لٹریچر فروخت کر سکتے ہیں تاکہ لوگ اس کا تنقیدی اور تقابلی مطالعہ کریں اور ان سے واقف ہوں۔ رہا فلمی اور رومانی لٹریچر تو وہ ہر جگہ اور ہر شہر میں بیسیوں مقامات پر فروخت ہوتا ہے۔ چند لوگوں کے فروخت نہ کرنے سے باطل کی روک تھام تو نہ ہوگی۔ شائقین کہیں نہ کہیں سے بہر حال خرید ہی لیں گے پھر بلا وجہ نفع سے کیوں محروم رہا جائے۔۔۔ دونوں میں کس کا موقف اسلام کے مطابق ہے؟ جواب دیجئے۔ کیونکہ ہم سب آپ کی رائے سے خواہ وہ کچھ بھی ہو اتفاق کرنے کے لئے تیار ہیں۔

الجواب[19]:۔

دوسرے گروہ کا موقف باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صریح طور پر حکم دیا ہے کہ ظلم و گناہ کے کاموں میں تعاون مت کرو رشوت، سود، شراب وغیرہ کے احکام آپ کے سامنے ہیں۔ بیچنا تو درکنار شراب کے بیرل اور ظروف کو ادھر سے ادھر پہنچانے کی مزدوری کرنا بھی حرام ہے۔ اب اگر اس نامعقول اور زہریلے استدلال کو اہمیت دی جائے کہ چند لوگوں کے فروخت نہ کرنے سے باطل کی روک تھام نہ ہوگی اور شائقین کہیں نہ کہیں سے بہر حال خرید ہی لیں گے تو پھر شراب کی تجارت اور کشید میں کیا رکاوٹ رہ جاتی ہے۔ ایک شخص کسی لڑکی سے پیشہ کرائے تو وہ بھی بڑے اطمینان سے کہہ سکتا ہے کہ میں کیوں نفع سے محروم رہوں جب کہ پورے پورے بازار طوائفوں کے موجود ہیں اور میں نے یہ پیشہ نہ کیا تب بھی شائقین دوسری جگہوں سے ضرورت پوری کر لیں گے!

یاد رکھئے! آخرت میں ہر شخص اپنے فعل و عمل کا جوابدہ ہے۔ کسی فعل کے اختیار یا ترک کرنے کا انحصار شریعت میں اس بات پر ہے کہ وہ فعل بجائے خود کیسا ہے۔ اگر برا ہے تو اس کا اختیار کرنا گناہ ہوگا اور اچھا ہے تو اس کے اختیار

ثواب لے گا۔ آج دنیا بھر میں گناہ وطغیان ہی کا غلبہ ہے۔
کوئی بد سے بدتر برائی ایسی نہیں جس کے جواز پر وہی دلیل نہ
لائی جا سکے جو مستفسر کردہ گروہ لایا ہے۔ آخر کیا آپ دو چار
آدمی رشوت نہ لیں تو رشوت کا چلن بند ہو جائے گا؟ سود
سے پرہیز کریں تو سودی کاروبار مٹ جائے گا؟ شراب نہ
بیچیں تو شراب دنیا سے اُڑ جائے گی؟ نہیں۔ ظاہر ہے کہ
نہیں۔ پھر تو ہر شخص کے لئے گناہ کا راستہ کھل گیا اور بھلائیوں
کا قصہ ہی پاک ہوا۔

تنقیدی مطالعہ کی بات بھی محض ایک تاویلِ بارد ہے
تنقید بچوں کا کھیل نہیں۔ مختلف ازموں، مذہبوں اور نظاموں کا
تقابلی مطالعہ کر کے نقد و نظر سے کسی فیصلے پر پہنچنا عامۃ الناس
کے بس میں کہاں۔ عام دکانوں سے کتابیں خریدنے والوں کی
غالب اکثریت سب جانتے ہیں کہ بے شعور اور کم سواد ہوتی
ہے یا کم سے کم ایسی تو ہرگز نہیں ہوتی کہ اس سے نقد و نظر
کے ہفت خواں طے کرنے کی توقع کی جا سکے۔

علاوہ ازیں تنقیدی و تقابلی مطالعہ کے لئے بنیادی
کتابیں درکار ہوتی ہیں جنھیں امہات کہا جاتا ہے۔ دکانوں
میں عام طور پر بکنے والا لٹریچر اس سطح کی چیز کہاں۔ کمیونزم ہو
یا سوشلزم قادیانیت ہو یا بہائیت، ان پر جو کتابیں بازار
میں عموماً ملتی ہیں وہ تو سرتاسر پروپیگنڈے اور ملمع کاری کا
پلندہ ہوتی ہیں۔ انھیں پڑھ کر لوگ گمراہ تو ہو سکتے ہیں کسی
بہتر نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے خلاف لٹریچر فروخت کرنے
والا تاجر ایسے ہی لوگوں کی صف میں شامل ہے جن کے بارے
میں قرآن نے متعدد بار کہا ہے کہ وہ ثمن قلیل کی خاطر آخرت
کو، اللہ کی آیات کو، صداقت و تقویٰ کو بیچ کھاتے ہیں۔
اس کا ضمیر نزاع کے عالم میں ہے اور اپنی غلط کاری کے جواز
کے لئے جو دلائل وہ پیش کر رہا ہے وہ دراصل ضمیر ہی کی آخری
ہچکیوں کا نفسیاتی ردِ عمل ہیں۔ اثم و عدوان سے تعاون
قیامت تک حرام ہی رہے گا چاہے ہمارا نفسِ امّارہ اس کی
اباحت پر زمین سے آسمان تک دلائل کا انبار لگا دے۔

ویسے یہ ملحوظ رہے کہ حرمت کا حکم صرف ایسے ہی لٹریچر
کی فروخت پر لگے گا جو اسلام اور اس کے اصول و اقدار
کے واقعۃً منافی ہو۔ کمیونزم، قادیانیت، نیچریت،
عیسائیت وغیرہ تو عقائد کی رو سے اور شہوانیت کو ہوا
دینے والا فلمی و رومانی لٹریچر اخلاقی اقدار کے اعتبار سے
صریحاً اسلام کی ضد ہے۔ لہٰذا اس کی فروخت اور اشاعت
بلاشبہ گناہ ہے۔ مگر ایسا لٹریچر بیچنا گناہ نہ ہوگا جو کسی بھی
ازم اور نظام کے بارے میں تحقیقی معلومات مہیا کرتا ہو۔ ایسا
ہی لٹریچر تنقیدی و تقابلی مطالعہ کا فائدہ دے سکتا ہے اور
اسی سے قاری کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

شمس نوید عثمانی

مستقل عنوان

کیا ہم مسلمان ہیں؟

غیرتِ بندگی

جنگ اُحد کے زخموں کی کسک ابھی احساسات کی تہ میں گم نہ ہوئی تھی کہ حضرت منذرؓ بن عمرو ایک اور زخم تازہ کھانے کے لئے تیار ہو گئے۔ شہر معونہ سے آئے ہوئے ایک وفد نے خدا کے رسولؐ سے عرض کیا تھا کہ ہمیں اور ہماری بستی کو ایسے داعیانِ حق کی ضرورت ہے جو اپنے فیض قلب و نظر سے وہاں کی مشرکانہ تاریکیوں سے جہاد کر سکیں ــ جو اپنے دردِ دل کو الفاظ میں ڈھال کر ہمیں اس بات کا موقع عطا کر سکیں کہ ہم اسلام کے پیغام کو سُنیں، سوچیں، سمجھیں اور پھر زندگی کا آخری فیصلہ کرنے کے قابل ہو سکیں۔ خدا کے رسولؐ اور رسولؐ کے جاں نثاروں نے اجنبی انسانوں کی اس دعوت کو بغور سنا اور ایک لمحہ کے لئے تذبذب میں پڑے بغیر یہ فیصلہ کر لیا کہ جن لوگوں کی زندگی کا پہلا اور آخری مقصد ہی یہ ہے کہ خدا کے بندوں کو خدا کا آخری پیغام پہنچا دیں ان کو بہرحال اس پکار کے جواب میں شہر معونہ کی وادی میں پہنچ جانا ہو گا۔

سوچنے کے لئے تو اس وقت اور بہت کچھ سوچا جا سکتا تھا۔ حق اور باطل کی زہرناک کشمکش آنکھوں کے سامنے تھی۔ بدر و اُحد کے وہ میدان پوری طرح پیش نظر تھے جہاں خون میں نہائے ہوئے ذرّے اور لاشوں سے پٹی ہوئی زمین نے کھول کر بتایا تھا کہ سچائی کا اعلان کرنا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بغیر کبھی ممکن نہیں ہوا۔ تمام ملک پر جنگ و جدل کی فضاؤں کا تسلط تھا اس لئے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ داعیانِ حق کو اپنی امان میں لیجانے والے یہ اجنبی لوگ اپنے عہد پر قائم رہیں گے یا غدّاری پر اُتر آئیں گے۔ جانے والے زندہ واپس آئیں گے یا ان کی لاشیں بھی ہاتھ نہ آسکینگی لیکن وہاں نہ غدّاری کے اندیشوں پر غور و فکر میں وقت ضائع کیا گیا نہ راہ کی شعلہ باریوں کو سوچا گیا اور نہ غزوۂ اُحد کے گہرے زخموں کے نشانات پر نظر ڈالی گئی۔ وہاں صرف ایک بات سوچی گئی کہ جن سینوں میں خدا نے اپنے پیغامِ حق کی عظیم امانت اُتاری ہے ان سینوں سے خون کے اُبلتے ہوئے فوّاروں کو بھی اسی پیغام کو نشر کرنا ہو گا۔

ستّر انصار کو اپنی سرکردگی میں لئے ہوئے حضرت منذر بیر معونہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جانے والوں میں سے کسی ایک نے بھی اپنے گھروں اور عزیزوں کی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ ان کی پشت دنیا کی طرف تھی اور ان کا رُخ اپنے خدا کی طرف تھا۔ پوری ملّت میں سے اپنے انتخاب پر کسی نے کوئی احتجاج نہ کیا۔ کوئی حیل و حجت نہ ہوئی۔ بلکہ خدا کی راہ میں آبلہ پائیوں اور جسم فگاریوں کے اس نئے موقعہ کو پاکر ان کے چہرے آخرت کی کامیابیوں کے نورانی یقین سے جگمگا اُٹھے۔ پھولوں کی طرح کھل گئے۔

یہ وفد جو انسانیت اور انسان کا بہترین دردمند دوست اور خالص جھوٹ اور گمراہی کا جانی دشمن تھا جیسے ہی بیر معونہ کے نزدیک پہنچا اس دعوت کا پردہ فاش ہو گیا۔ خدا کے نہتے سپاہیوں پر ـــ انسانیت کے درد اور خدا کے خوف سے کانپتے ہوئے سینوں پر قبائلی جتھے

حملہ کر دیا ـــ اور تھوڑی سی دیر میں سوائے منذرؓ کے سارے داعیانِ حق تہہ تیغ کر دیئے۔ اپنے ساتھیوں کی خونچکاں لاشوں اور غداروں کی زہریلی تلواروں کے درمیان کھڑے ہوئے منذر بن عمروؓ سے کہا گیا کہ "تمھیں زندہ چھوڑ دیا جائے گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تم ہم سے زندگی کی بھیک اور امان کی پیش کش طلب کرو۔"

وہ چہرہ جو اپنے بہترین ساتھیوں کی بے رحمانہ ہلاکت پر سراپا درد و گداز بنا ہوا تھا ان الفاظ کو سنتے ہی یکایک سرخ ہو گیا۔

وہ جانتے تھے کہ حملہ آور ظالم اور غدار ہیں اور اپنی جان کی اماں طلب کرنا بھیک نہیں اپنا جائز حق طلب کرنے کے ہم معنی ہے۔ لیکن وہ یہ بھی خوب جانتے تھے کہ سوال کرنے کے قابل صرف ایک ہی در ہے ـــ ہاتھ پھیلانے کے لائق صرف ایک ہستی کی بارگاہ ہے ـــ زندگی کی بھیک بھی ان ہاتھوں سے قبول نہیں کی جا سکتی جو مومنوں کے خون سے رنگین اور کفر و شرک کی گھناؤنی نجاستوں سے آلودہ ہیں۔ ہاں وہ جانتے تھے کہ زندگی کس زندگی کا حقیقی اور شاندار نام ہے ـــ وہ جانتے تھے کہ اس انسان سے زیادہ خوش قسمت کوئی نہیں ہو سکتا جس نے باطل کے رحم و کرم پر جینے کے بجائے خدا کے نام پر مر جانا پسند کر لیا ہو ـــ جس نے اپنی جانِ عزیز، اپنے جاں آفریں کے قدموں پر لٹا دی ہو۔ اسی لئے ایک لمحہ کے لئے پس و پیش میں پڑے بغیر آخرت کے اس مسافر نے کفر کی اس شاندار پیشکش کو قدموں سے روندتے ہوئے اعلان کیا کہ میں تم سے زندگی نہیں وہ شہادت طلب کرتا ہوں جو ایک مومن کی زندگی کی سب سے حسین آرزو ہوتی ہے۔

خدا کے رسول ﷺ نے جب یہ واقعہ سنا تو اس مجاہد کی توصیف میں پکار اٹھے کہ "انھوں نے موت کی طرف خود پیش قدمی کی۔"

ایمان ـ ایک مسلسل تڑپ

معن بن عدیؓ نے غزوۂ بدر سے شروع ہونے والے معرکۂ جاں نثاری کے ہر ہر قدم پر تلواروں کی چھاؤں میں اعلائے کلمۃ الحق کیا تھا۔ اس لئے وہ خوب جانتے تھے کہ اس نازک گھاٹی میں کیسے کیسے زخم کھانے پڑتے ہیں۔ لیکن خدا جانے کیسی تھی وہ زخموں کی روحانی لذت کہ وہ خون میں نہاتے گئے اور اعلانِ حق کا جذبہ بے اختیار کچھ اور تر و تازہ ہوتا گیا۔ درد جتنا سوا ہوا درماں سے بے نیازی بڑھتی گئی، خطرات بڑھتے گئے اور قلبی سکون و نشاط کچھ اور نکھرتا گیا ـــ میرے مولا! کیا چیز تھا وہ ایمان بالغیب ـ آخرت کی فلاح کا وہ بے پناہ یقین ـــ رضائے الٰہی کا وہ جذبہ سرشار جو راحتوں سے جی چرآتا تھا اور اذیتوں کو سینے سے لگاتا تھا جیسے زخموں اور آبلوں کی سیج پر چین سے نیند آتی تھی ـ جو تلواروں کی خونیں چھاؤں میں کیف و سرور کی شان سے مسکراتا تھا۔

جب حضور ﷺ کی وفات کا جاں گداز واقعہ پیش آیا اور نوّے نوّے زخم کھا کر بھی مسکرانے والے چہرے اس ایک زخم پر شدتِ درد سے زرد ہو گئے اور آنسوؤں سے تر ہو گئے تو کسی کے خوں چکاں سینے سے ہوک اٹھی اور یہ آواز معنؓ بن عدی کے کانوں میں آئی "کیا اچھا ہوتا اگر ہم آپ کے سامنے ہی مر گئے ہوتے!"

"میں یہ نہیں چاہتا!" معنؓ بن عدی کی بے قرار چیخ ایک نعرۂ پر شوق میں ڈھلتی چلی گئی "سن لو عدی کا بیٹا یہ نہیں چاہتا ـــ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ حق کی شہادت دیتے ہوئے جس طرح رسولِ خدا ﷺ کی پاک زندگی میں زخم کھائے تھے وصال کے بعد بھی یہ زخم کھاتا چلوں ـ کھاتا رہوں اور جب آخرت میں خدا کے رسول ﷺ سے ملاقات ہو تو عرض کر سکوں کہ آپ ﷺ کے پیچھے بھی آپ کا غلام آپ کی تصدیق کا فرض ادا کرتا رہا تھا۔"

پہلی آواز میں بھی بلا کا درد تھا اور دوسری پکار میں بھی لیکن اس دوسری پکار میں درد ہی نہیں درد کی طلب بھی تھی۔ اس تڑپ نے دوسروں کو بھی تڑپا دیا ـــ رگوں میں تھکے ماندہ خون کی رفتار تیز ہو گئی اور چہرے شہادتِ حق کی

بجلیاں دوڑانے لگے۔ سارا ماحول پکار اٹھا "ہاں۔ ہم سب یہی اور صرف یہی چاہتے ہیں۔"

شہادت کی والہانہ پذیرائی

جب عمواس میں طاعون نے زبردست وبا کی شکل اختیار کر لی تو حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح حضرت معاذؓ بن جبل کے پاس آئے اور کہا:۔

"بہتر یہ ہے کہ اس وبائی علاقے کو خیرباد کہہ دیا جائے ــــ دیکھتے نہیں ہو یہ وبا نہیں بلکہ آگ کا ایک دہکتا ہوا الاؤ ہے۔" بظاہر یہ ایک خوبصورت مشورہ تھا لیکن معاذؓ بن جبل کے چہرے سے اس بات کو سن کر غم و غصہ کے گہرے جذبات ٹپک پڑے۔ وہ تیزی سے اٹھے اور لوگوں کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے اپنے جذبات و خیالات پر سے یوں پردہ اٹھایا:۔

"لوگو! ــــ یہ وبا نہیں خدا کی رحمت ہے!"

یہ فقرہ ــــ جذبات سے چھلکتا ہوا پُراسرار فقرہ سنتے ہی سب لوگ چونک اٹھے!۔ یہ معاذ کو کیا ہوا ہے؟۔ یہ معاذ آخر کیا کہہ رہے ہیں؟۔ درد، دکھ، سوز اور کاہشوں کی اس آگ بھری آندھی کو۔ طاعون کی اس طوفانی وبا کو خدا کی رحمت قرار دیا جا رہا ہے!!۔ لیکن حیرت و احتجاج کے جذبات میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے لوگوں کو معاذؓ بن جبل کے اگلے فقروں نے اچانک یقین، اطمینان اور تائید کی ایک نئی دنیا میں پہنچا دیا۔ "میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا" حضرت معاذؓ بن جبل کی پُرشوق آواز روحوں کو جگاتی اور دلوں کو چونکاتی ہوئی بلند ہوئی "کہ مسلمان جب ملک شام کی طرف ہجرت کریں گے اور شام ان کے تسلط میں آجائے گا تو وہاں ایک وبا پھیلے گی جس میں جسم پھوڑے کی طرح گھائل ہو جائے گا ــــ اس وبا کا جو شخص شکار ہو گا اس کا شمار شہداء میں ہو گا اور اس کے اعمال پاک و صاف ہو جائیں گے۔" حدیثِ رسولؐ کو بیان کرتے ہوئے

جب معاذؓ شہادت اور تزکیۂ اعمال کی اس بشارت تک آئے تو ان پر وجد و سرشاری کی کیفیت طاری ہو گئی آخرت کی اس شاندار کامیابی کے تصور نے ان کو بیخود سا کر دیا جو خدا کی بارگاہِ جلال میں ایک شہید ہی کے حصے میں آنے والی ہے۔ مواخذہ کے خوف اور احتساب کی کڑی گھاٹیوں کے مقابلے میں بے حساب رحمت اور مکمل نجات کے اس روشن موڑ کو دیکھ کر ــــ سامنے دیکھ کر وہ وارفتگی کے عالم میں بے اختیار پکار اٹھے "خداوندا! اگر یہ بات میں نے تیرے رسولؐ ہی سے سنی ہے تو میرے گھر میں اپنی رحمت کو نازل فرما اور میرا دامنِ شوق اس کے حصۂ وافر سے بھر دے!"

سننے والے ایک بار پھر چونک اٹھے۔ لیکن یہ چونکنا بربنائے حیرت و احتجاج نہیں بلکہ اس رشک و عقیدت کی پیداوار تھا جن کے شدید جذبات معاذؓ کی شہادت طلبی کی سرمستیاں دیکھ کر ایک ایک سینے میں جاگ اٹھے تھے۔ لوگ یہ ایمان کا پُرشوق منظر دیکھ رہے تھے ــــ سر دھن رہے تھے، لیکن سوچ رہے تھے کہ کیا وبا میں شہادت کا پہلو دیکھ کر فرطِ شوق سے بے تاب ہونے والا اس کی عملی گھاٹیوں کو بھی اسی بیتابیٔ شوق سے طے کر سکے گا؟

عملی گھاٹی شروع ہو گئی ــــ حق کی پہلی آزمائش بنکر یہ وبا معاذؓ کے گھر میں داخل ہوئی اور ان کے لختِ جگر کو اپنی آتشیں لپیٹ میں لیتے ہوئے سوال کیا "بولو؟ ــــ اب کیا کہتے ہو؟ ــــ"

اسی وقت بیٹے ــــ درد اور ٹیس کی گود میں تڑپتے ہوئے بیٹے کے لبوں پر غیب کی آواز مجاہد کو تسلی اور توفیق دیتی ہوئی ابھری "حق تیرے پالن ہار کی طرف سے ہے پس تو شک و شبہہ میں پڑنے والوں میں سے نہ ہو جانا!"

بے اختیار اس سعادت مند بیٹے کا مجاہد باپ پکار اٹھا "تو اگر میرے خدا نے چاہا مجھے صبر کرنے والوں میں پائے گا۔۔۔" اور سچ مچ شہادت کا متوالا صبر کے جادے پر بے پروا نہ وار رقص کرتا رہا ــــ عبدالرحمنؓ بن معاذ سپردِ خاک کر دیئے گئے مگر معاذ بن جبل کے چہرے سے وہی

صبر و رضا اور وہی ذوقِ شہادت کا نور اُبلتا اور ٹپکتا رہا — دو بیویاں لقمۂ اجل ہوئیں مگر معاذؓ — مجاہد معاذؓ اپنے مقامِ ذوق و شوق پر خدا سے ملاقات کا پیغام سننے کے لئے ہمہ تن گوش بر آواز بنے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے سچ مچ وبا کی آگ نہیں، بلکہ رحمت کے جنتی پھولوں کی بارش ان کے گھر کے اُوپر ہو رہی ہے اور تمام فضا کو رنگ و بو کی حسین طغیانی میں غرق کئے دیتی ہے — آخر تکمیل آرزو کا وقت آیا اور جس رحمت کے لئے دامنِ شوق پھیلایا گیا تھا وہ معاذؓ کے دامن میں آ گئی۔ ان کی انگلی پر — انگشتِ شہادت حق پر شہادت حق کی پہلی کرن بن کر طاعون کا پھوڑا نمودار ہوا تو حضرت معاذؓ کا چہرہ کلی کی طرح کھل گیا اور شمع کی طرح روشن ہو گیا۔ وہ اس موت کا خیر مقدم کرتے ہوئے دیدہ و دل فرشِ راہ کر رہے تھے جس کا انعام دائمی سکون کی دائمی زندگی ہے۔ کیف و سرور بکھیرتا ہوا یہ درد جیسے جیسے بڑھتا گیا حضرت معاذؓ بن جبل کی روح اپنے خدا کے قریب ہوتی گئی۔ اب وہ اپنے خدا کے قریب ہوتے ہوتے اس سے سرگوشیاں کرنے میں محو تھے اور انکے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے یہ آواز آ رہی تھی "اس درد کے آگے دنیا بھر کی راحتیں ہیچ ہیں — لایعنی ہیں"۔ شدّتِ درد سے غشی طاری ہو گئی لیکن جوں ہی ہوش آیا دنیا نے انکے لبوں پر کراہ کے بجائے واہ سنی "خداوندا!" وہ خدا سے سرگوشی فرما رہے تھے "مجھے اپنا ہی غم دے۔ تُو خوب جانتا ہے کہ میں تجھے کتنا پیار کرتا ہوں!"۔

تمام دن اسی جذب و کیف میں کٹا جو دیکھنے میں سراپا درد تھا اور محسوس کرنے والے کے لئے سراپا درماں — رات ہوئی تو مرض کی شدّت کچھ اور بڑھ گئی اور خدا سے ملاقات کرنے کا انتظار کرنے والی روح فرطِ شوق سے بے قرار ہونے لگی۔ گھڑی گھڑی پوچھتے کیا صبح ہو گئی؟ — جیسے ان کو بتا دیا گیا ہو کہ اگلا دن وہ دن ہو گا جب خدا کا بندہ اپنے خدا سے جا ملے گا۔ لوگ جواب دیتے "ابھی رات باقی ہے"۔ آخر سپیدۂ سحر نمودار ہوا — پو پھٹی اور اس کی اطلاع سنتے ہی مسرت کی ایک رَو موجِ نور کی طرح بیمار کی رگ و پے میں دوڑ گئی "مرحبا!

— مرحبا!!" وہ پکار اٹھے "اے اجل! خوش آمدید! — میرے خدا! تو خوب جانتا ہے کہ مَیں تجھ سے جتنا پیار کرتا رہا ہوں اتنا ہی ڈرتا بھی رہا ہوں — میرے مالک! آج میری تمنّاؤں کی لاج تیری رحمت کے ہاتھ ہے۔ میری تمناؤں کے واحد مرکز! — اے میری اُمیدوں کے اکیلے سہارے! مجھے تجھ سے بڑی بڑی اُمیدیں ہیں۔ میں اس رات سے پناہ چاہتا ہوں جس کی صبح دوزخ میں جھونکتی ہو! . . . "

زندگی — سوزِ شہادت اور حق کے پیار اور خوفِ تقویٰ سے سلگتی ہوئی زندگی لمحہ بہ لمحہ موت کے قریب تر ہو رہی تھی اور حضرت معاذؓ کے چہرے سے روح و دل کی وہ دو آتشہ کیفیت جھلک رہی تھی جس میں سوز بھی تھا اور ساز بھی۔ شوق بھی تھا اور اضطراب بھی۔ وہ جوں جوں منزلِ سکون کے نزدیک آ رہے تھے اضطراب بڑھتا جا رہا تھا — بڑھتا جا رہا تھا تاکہ پھر ایک بار ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ یہ اضطراب ان آخری الفاظ میں ڈھل گیا اور پھر اس عظیم لافانی سکون و نشاط میں گم ہو گیا جو ایک انسان کو خدا کے قدموں کے سوا کسی بھی جگہ نہیں مل سکتا "مجھے نہ موت کا ملال ہے اور نہ دنیا چھوٹ جانے کا۔ مجھے فکر ہے تو یہ ہے کہ اپنے خدا کو کیا جواب دوں گا!"

فرض اور احساسِ فرض کی اس مؤمنانہ تڑپ پر رحمت کو پیار آیا اور تڑپنے والی روح کے لئے آغوشِ رحمتِ باری کھل گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون — یہی تھیں وہ کامیاب روحیں جو سچ مچ اپنے خدا سے راضی ہوئیں اور ان کا خدا ان سے راضی ہو گیا —

آج پھر کفر و باطل کی عفریتی طاقتیں یہ کہہ رہی ہیں — "زندہ رہنا چاہتے ہو تو ہم سے زندگی کی بھیک طلب کرو!" لیکن کوئی منا رین عمرو موجود نہیں جو غیرتِ بندگی سے اس پیشکش پر ٹھوکر مار کر کہہ سکے کہ "ہم صرف اسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں جس کے آگے سر جھکاتے ہیں"۔ آج پھر میلاد اور سیرت کے جلسوں میں حبِ رسولؐ کے مدعی اس دَور کی یاد میں

روتے اور تڑپتے ہیں جب خدا کا رسولؐ خدا کے بندوں کے درمیان موجود تھا۔ لیکن کوئی معنؓ بن عدی یہ پکار بلند نہیں کرتا کہ "حبِّ رسول کا ایک بڑا تقاضا یہ بھی تو ہے کہ حضورؐ کی تصدیق کی جاتی رہے۔" آج پھر یہ دنیا حق و صداقت کے چاہنے والوں کے لئے ایسی وباؤں اور آفتوں کی بھٹی بنی ہوئی ہے جہاں شہادتِ حق اور تزکیہ و طہارت کی آرزو پوری کی جاسکتی ہے مگر کوئی معاذؓ بن جبل نظر نہیں آتا جو پھولوں سے ڈھکی ہوئی دوزخ کو بھانپ کر کانٹوں سے پٹی ہوئی جنت کی جھلک دیکھ سکے اور عذاب آخرت سے نجات پانے کے لئے دنیا کے دُکھ درد کو "رحمت" قرار دے سکے!۔

کہاں گئے وہ لوگ جو دنیا کو فانی اور آخرت کو باقی مانتے تھے؟ جو ہمہ تن شوق اور سراپا پرستش ہو کر خدا کے آگے جھکتے تھے اور صرف اس انتظار و آرزو میں اپنی جان کو لئے پھرتے تھے کہ جاں آفریں کی طرف سے کب اور کہاں اس جان کو طلب کیا جاتا ہے — ہے کوئی جو اس سوال کا جواب خود اپنے آپ کو اور ساری دنیا کو دے سکے؟—

نہایت نفیس عکسی قرآن اور حمائلیں

آرڈر میں صرف وہ نمبر لکھ دینا کافی ہے جو ہر ایک کے ساتھ درج ہے

قرآن ● ترجمہ:۔ شیخ الہندؒ ● تفسیر:۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ۔ یہ مقبول ترین مترجم قرآن کچھ دنوں سے نایاب تھا۔ الحمد للہ اب کچھ نسخے مہیا ہوئے ہیں نفیس ایڈیشن۔ ہدیہ مجلد ۲۵ روپے (اس کا نمونہ نہیں بھیج سکیں گے)

قرآن دو ترجمے والا ۶۸ ● (۱) مولانا شاہ رفیع الدینؒ ● (۲) مولانا اشرف علیؒ۔ حاشیے پر مستند تفاسیر کا خلاصہ۔ آغاز میں انبیاء و صحابہؓ کے احوالِ مقدسہ، سورتوں کے خواص، غزوات کے تذکرے اور اسی نوع کی دیگر مفید چیزیں اردو میں دی گئی ہیں۔ لکھائی چھپائی نفیس۔ کاغذ اعلیٰ آرٹ پیپر دبیز۔ زمین سبز۔ ہدیہ مجلد ریگزین چودہ روپے۔ مجلد چرمی ساڑھے سترہ روپے۔ یہی قرآن نسبتاً ہلکے کاغذ پر (اس کا نمبر ۶۶ ہے) ہدیہ مجلد ریگزین تیرہ روپے مجلد چرمی ساڑھے سولہ روپے۔ یہی قرآن کچھ اور ہلکے کاغذ پر (اس کا نمبر ۶۷ ہے) زمین حنائی مجلد ریگزین بارہ روپے۔ مجلد چرمی ساڑھے پندرہ روپے

قرآن ایک ترجمہ والا ۶۴ ● ترجمہ:۔ مولانا اشرف علیؒ ● حاشیہ پر مختصر بیان القرآن سائز تجلی سے کچھ بڑا۔ کاغذ ولائتی سفید۔ آغاز قرآن میں بہت سی مفید چیزیں۔ مثلاً سورتوں کے خواص، ان ناموں کی تفصیل جو قرآن میں آئے، ان مقامات کا نقشہ جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے مجلد ریگزین کا ہدیہ بارہ روپے۔ مجلد چرمی ساڑھے پندرہ روپے

قرآن بلا ترجمہ ۳/۵ کاغذ آرٹ پیپر ولائتی۔ کتابت طباعت بے نظیر۔ ہر سطر کے بعد لائن، حروف کشادہ۔ تجلی سائز۔ کمزور نگاہ والوں کیلئے بہت عمدہ۔ مجلد ریگزین ہدیہ آٹھ روپے۔ چرمی ساڑھے گیارہ روپے۔

حمائل مترجم ۸۰ ● ترجمہ:۔ شاہ عبد القادر محدث دہلویؒ کاغذ آرٹ، زمین رنگین۔ سائز تجلی سے نصف۔ مجلد کمبج ہدیہ دس روپے۔ مجلد پلاسٹک کور گیارہ روپے۔

حمائل مترجم ۳۵ ● ترجمہ:۔ مولانا فتح محمد صاحب۔ حاشیے پر مختصر تفسیر۔ زمین سبز۔ کاغذ ولائتی۔ سائز تجلی سے نصف۔ مجلد پلاسٹک کور۔ ہدیہ گیارہ روپے۔

حمائل مترجم ● ترجمہ:۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ۔ ● تفسیر:۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ۔ زمین حنائی سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ سے کچھ بڑا۔ غیر مجلد بارہ روپے۔ مجلد ریگزین ساڑھے تیرہ روپے (اس کا نمونہ نہیں بھیج سکیں گے)

حمائل بلا ترجمہ ۲۳ کاغذ سفید مضبوط۔ سائز تجلی سے نصف حروف کافی روشن۔ ہر سطر کے بعد لائن مجلد کمبج ہدیہ پانچ روپے۔

حمائل ۱۳ بالکل ۲۳ جیسی بس فرق یہ ہے کہ ہر سطر کے بعد لائن نہیں ہے۔ مجلد پلاسٹک پانچ روپے۔

حمائل ۲۶ بلا ترجمہ پاکٹ سائز۔ کاغذ باریک اور چکنا (بائبل پیپر) سفر کے لئے خاص تحفہ۔ جلد پلاسٹک کور۔ ہدیہ مجلد چار روپے۔

حمائل ۲۴ بلا ترجمہ بہت ہی مختصر سائز۔ حافظوں کے مطلب کی۔ کاغذ عمدہ۔ جلد پلاسٹک کور ہدیہ دو روپے

نمونے مفت طلب فرما سکتے ہیں

مکتبہ تجلی۔ دیوبند یو۔ پی

اخذ و اقتباس

دُھوپ اور سائے

اونچی دکان پھیکے پکوان

برطانیہ کی خبر ہے کہ وہاں ۱۹۶۱ء میں ایک سال کے اندر ۳۱ ہزار طلاقیں ہوئیں۔ یہ اعداد و شمار بڑے ہولناک ہیں جو خوش حال اور ترقی یافتہ ممالک کی گھریلو زندگی کے ایک بھیانک پہلو کو پیش کرتے ہیں جن ملکوں کی سماجی زندگی قابلِ رشک ہے جو اپنی دیانت داری، فرض شناسی اور محنت و جفاکشی کے لئے مشہور ہیں اور جنھوں نے سائنس کی ترقی دے کر ساری دنیا پر احسان عظیم کیا ہے۔ افسوس ہے کہ وہ عائلی زندگی پر قابو پانے میں قاصر ہے۔ جو قوم اپنی تنظیمی صلاحیتوں کے لئے شہرۂ آفاق ہو وہ اگر اپنی ازدواجی زندگی میں اس قدر بدنظمی اور انتشار کا ثبوت دیتے تو اس سے اس کے سوا اور کیا ثابت ہوگا کہ گھریلو زندگی، زندگی کے عام قواعد اور اصولوں سے مستثنیٰ ہے اور ضروری نہیں کہ عام سماجی اور قومی زندگی میں اعلیٰ اصولوں کو برتنے والا گھریلو زندگی میں بھی کسی اعلیٰ اصول کا پابند ہو۔

برطانیہ میں طلاق کے ساتھ ایک دوسرا پیچیدہ مسئلہ یہ ہے اگر ایک شخص کسی عورت کے ساتھ چالیس سال گذار دے مگر اس کے ساتھ نکاح نہ کر سکے تو اس کے مرنے کے بعد اس کی جائداد کا وارث کون ہوگا؟ چنانچہ ایک بڑے میاں نے ایک عورت کے ساتھ تیس سال گذارے۔ اس نے بڑھیا کے نام وصیت بھی کی ہے کہ اگر اس کا انتقال ہو جائے تو جائداد کا زیادہ تر حصہ بڑھیا کو ملنا چاہئے، لیکن برطانیہ کا قانون یہ ہے کہ جائداد کی وارث وہی عورت ہو سکتی ہے جو باقاعدہ نکاح کی رُو سے رفیقۂ حیات بن چکی ہو۔ اگر ایک مرد کی ایک اصل بیوی ہے اور دوسری داشتہ بن کر ساتھ رہتی ہے تو جائداد اور پنشن کا حصہ اس کی اصل بیوی کو ملے گا اور داشتہ کو محروم کر دیا جائے گا۔

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ برطانیہ میں اصل بیوی کے ساتھ ایک یا دس داشتاؤں کو رکھنا خلاف قانون نہیں ہے، جس شخص کو "توفیق" ہو وہ اصل بیوی کے ساتھ اگر چاہے تو بیس داشتائیں رکھ سکتا ہے۔ سوسائٹی بھی ایسے شخص کو برداشت کرتی ہے، اصل بیوی کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن آپ حیرت سے سُنیں گے کہ اگر کوئی شخص ایک اصل بیوی کے ساتھ دوسرا نکاح بھی کر لے اور دوسری عورت کو داشتہ کے طور پر نہیں بلکہ بیوی کے طور پر رکھے اور اسے پہلی بیوی کے ساتھ اپنی جائداد کا وارث قرار دے تو وہ ایک بڑے جرم کا مرتکب ہوگا اور دوسری بیوی سے نکاح قابلِ تعزیر جرم قرار پائے گا۔

مغربی ممالک کے قانون میں ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری عورت سے شادی کرنا قانوناً ممنوع ہے۔ وہاں کا قانون کسی شخص کو بھی چند زوجیت کی اجازت نہیں دیتا۔ دوسری بیوی کی موجودگی کو نہ سوسائٹی برداشت کرتی ہے اور نہ پہلی بیوی ہی اس کی اجازت دے سکتی ہے۔ لیکن یہی پہلی بیوی اور یہی نیک نہاد سوسائٹی اس شخص پر کسی وقت بھی انگشت نمائی نہیں کر سکتی جو ایک بیوی

کی موجودگی میں ایک دو چار داشتائیں بھی رکھتا ہو۔ قانون بھی اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ سوسائٹی بھی اس پر نکیر نہیں کرتی اور پہلی بیوی کو بھی اس پر اعتراض نہیں ہوتا گویا نکاح کے بغیر ایک مرد خواہ کتنی ہی عورتوں کی عزت خراب کرے وہ سب کے لئے قابل برداشت ہے لیکن اگر ایک شخص دوسری عورت کو قید نکاح میں لے آئے تو مغربی ممالک کی پوری جوڈیشری حرکت میں آجائے گی اور سوسائٹی بھی اس پر نفریں کرے گی اور بیوی بھی بغاوت پر آمادہ ہو جائے گی۔

شہرت یہ ہے کہ مغربی ممالک میں سو فی صدی لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ ساتھ ہی وہ ریشنلسٹ (عقلیت پسند) بھی ہیں۔ وہ ہر بات پر سائنسی نقطۂ نگاہ سے غور کرتے ہیں، انکے لئے نامعقول باتوں کا ماننا غیر ممکن ہے۔ وہ توہمات سے نفرت کرتے ہیں اور ہر نظریئے کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں، لیکن ہم دریافت کریں گے کہ آخر اس میں کیا معقولیت ہے کہ دوسری عورت کو قید نکاح میں لانا تو جرم ہو اور داشتہ بنا کر اس کے ساتھ چالیس سال گذار دینا جرم نہ ہو۔

بلکہ یوں کہئے کہ دوسری عورت سے شادی کرنا تو عیش پرستی، شہوت رانی، ہوسناکی اور رندی قرار پائے، اور بے نکاحی عورتوں کے ساتھ — جن کی تعداد معین نہیں — پوری عمر بسر کر دینا اور وہ بھی اصل بیوی کی موجودگی میں عین عفت مآبی، ضبط نفس، فرشتگی اور درویشی ٹھیرے؟ جرم یہ نہیں کہ ایک شخص اصل بیوی کی موجودگی میں دوسری عورت کی عزت خراب کرے، جرم یہ ہے کہ ایک عورت کی موجودگی میں دوسری عورت سے نکاح کر لیا جائے!

جن ممالک میں خواتین کی طرف سے جنازۂ زوجیت کیخلاف آواز بلند ہوتی ہے، وہاں خاوندوں کی عیش پرستانہ زندگی اور داشتاؤں کے ساتھ خلط ملط ہونے کے خلاف آج تک کوئی آواز نہیں اٹھی، کیا ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہونگے کہ خواتین کو مردوں کی ہوسناکی اور رندی پر نہیں بلکہ ضابطہ میں نکاح کرنے پر اعتراض ہے۔ اب یہاں آپ اسلام کے قانونِ ازدواج پر عقل و بصیرت کی روشنی میں غور کیجئے اور پھر بتلایئے

کہ اس کا قائل کون ہے کہ:-

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

(از روزنامہ دعوت دہلی- ۳۰ مارچ ۱۹۶۳ء)

امریکہ میں گھریلو زندگی

حال میں ایک امریکن سیاح نے تاج محل کی زیارت کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ یادگار گھریلو زندگی کے لئے محبت کا ایک دستور العمل قرار پا سکتی ہے۔ انھوں نے امریکہ کی گھریلو زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے طلاقوں کے اعداد و شمار پیش کئے اور کہا ہم چاہتے ہیں کہ طلاق کے معاملات وکیلوں کے ہاتھ میں نہ پڑیں بلکہ ایک فیملی سنٹر قائم کیا جائے جہاں منسٹر، ماہر نفسیات اور ڈاکٹر اپنی مہارت سے طلاق کے واقعات کو روکیں اور اپنی کوششوں سے طلاق کو ناممکن بنا دیں۔ آپ نے بتایا کہ امریکہ میں ۲۵ سے تیس تک فیصدی۔ سویڈن اور ڈنمارک میں ۷ افیصدی اور برطانیہ میں آٹھ فیصدی طلاقیں ہوتی ہیں اور جب طلاقوں کی کثرت اتنی ہوتی ہے تو اس کا اثر بچوں پر پڑنا لازمی ہے۔ اسی وجہ سے امریکہ میں گذشتہ دس سال کے اندر ۱۸ سال تک کے بچوں میں تین سو فی صدی کا اضافہ ہوا ہے۔ طلاق کے بعد بچوں کی دیکھ بھال نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ جرائم پیشہ بن جاتے ہیں صرف ایک شہر کیلی فورنیا میں دس کروڑ روپے سالانہ طلاقوں کی فیس سے وصول کئے جاتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ امریکہ میں بہت ہی معمولی اسباب پر طلاق حاصل کر لی جاتی ہے۔

سماجی کینسر

امریکن سیاح نے کہا کہ اکثر حالات میں بیوی طلاق حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور طلاق کے بعد وہ ایک تو خاوند کی جائداد میں برابر کی حصہ دار بنتی ہے۔ دوسرے اسکے نان و نفقہ کا خرچ خاوند پر ڈالا جاتا ہے۔ تیسرے اسے بچوں کی پرورش کا بار اٹھانا پڑتا ہے۔ چوتھے عدالت کے تمام اخراجات بھی اسی کو ادا کرنے پڑتے ہیں۔ وکلاء ایسی عورتوں کو عدالت کی طرف رجوع کرنے کی شہ دیتے ہیں اور عورت فوراً مان جاتی

ہے کیونکہ عدالت کے مصارف اسے نہیں بلکہ اس کے خاوند کو
ادا کرنے پڑتے ہیں۔ آپ نے آخر میں کہا کہ امریکہ میں طلاق کا جواز
ایک سماجی کینسر ہے۔ بلکہ اسے عورت اور مرد کے درمیان خانہ جنگی
سے تعبیر کرنا چاہئے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس خانہ جنگی میں زخمیوں اور
مقتولوں کی تعداد کم سے کم رہ جائے۔

فطرت سے انحراف کی سزا

امریکہ دنیا کا دولت مند ترین ملک ہے۔ وہاں کا ہر فرد
خوش حال ہے۔ سائنس اور ایجادات میں بھی وہ دنیا کا پیشرو
ہے۔ وہاں نہ یونیورسٹیوں کی کمی ہے اور نہ لائبریریوں کی۔ اسی
نے نامور سائنس داں پیدا کئے ہیں۔ اسی کو جمہوری بلاک کی
سربراہی بھی حاصل ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود وہاں کی
سائنس خاندانی اور عائلی زندگی کو متوازن نہ بنا سکی اگر وہاں
سو شادیاں ہوتی ہیں تو تیس کا انجام طلاق ہوتا ہے۔ حالانکہ
عیسائی مذہب میں طلاق قطعاً ناجائز ہے لیکن اس سیلاب میں
چرچ بھی بہتا جارہا ہے۔ اسلام میں طلاق کی اجازت ہے مگر
انتہائی مجبوری کی حالت میں جس طرح جسم کی انگلی گل جاتی ہے
اور اسے اس لئے کاٹ دیا جاتا ہے کہ وہ باقی جسم کو متأثر نہ
کرسکے۔ اسی طرح اسلام میں طلاق کی اس وقت اجازت ہے
جب ازدواجی زندگی کا مقصد فوت ہوجائے اور جدائی کے
بغیر چارہ نہ رہے۔ عیسائیوں نے مذہبی نقطۂ نظر سے فطرت
کا مقابلہ کیا اور طلاق کو ہر حالت میں حرام ٹھیرایا جس کا نتیجہ
یہ نکلا کہ طلاق نے ایک وبائی شکل اختیار کرلی۔ یہی حال
دو عورتوں سے شادی کرنے کا ہے۔ عیسائیوں میں دوسری
عورت سے شادی کرنا ممنوع ہے۔ مگر اس کا غیر فطری ردِ عمل
یہ ہوا کہ داشتاؤں کا رواج چل نکلا۔ اب مغربی ممالک میں
دوسری شادی تو حرام ہے، لیکن ایک بیوی کی موجودگی میں
دس داشتاؤں کا رکھنا کوئی جرم نہیں۔ قدرت نے فطرت
سے انحراف کی سزا کہاں جا کر دی ہے؟

(از روزنامہ الجمعیۃ دہلی۔ ۳۱ مارچ ۶۳ء)

جو بویا ہے وہی کاٹوگے

**۱۹۷۰ء میں امریکہ میں ناجائز بچوں کی تعداد
ایک کروڑ ہوجائے گی۔ ۱۹۶۳ء میں
اٹھارھویں بچے میں سے صرف ایک بچہ
جائز ہوگا۔**

واشنگٹن ۶ رمئی۔ امریکہ کے ایک موقر ہفت روزہ
پوسٹ نے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا ہے کہ اس وقت ستر لاکھ
شہری ایسے ہیں جو ناجائز طور پر پیدا ہوئے ہیں اور ان کے
والدین کا صحیح علم کسی کو نہیں ہے پوسٹ نے لکھا ہے کہ اگر حرامی
بچوں کی یہی رفتار رہی تو ۱۹۷۰ء میں ان کی تعداد ایک کروڑ
ہو جائے گی۔ پوسٹ نے بچوں کی پیدائش کی تفصیل پیش کرتے
ہوئے لکھا ہے کہ امریکہ میں تقریباً ڈھائی لاکھ لڑکیاں ہر سال
بغیر شادی کے ہی ماں بن جاتی ہیں اور ہر سال تقریباً دس لاکھ
لڑکیوں کے ناجائز حمل گرائے جاتے ہیں اور پھر دلھن بننے
والی ہر چھٹی لڑکی حاملہ ہوتی ہے۔ پچیس سال کے دوران
امریکہ کی شرح پیدائش میں ۴۰ فیصد اضافہ ہوا ہے لیکن ناجائز
تعلقات کی بنا پر حرامی بچوں کی تعداد دگنی ہوگئی ہے اور
نتیجہ یہ ہے کہ اب ۱۹۶۳ء کے دوران امریکہ میں جو بچے پیدا
ہوں گے ان میں سے ہر اٹھارہ بچوں میں صرف ایک بچہ
جائز ہوگا۔ باقی سترہ ناجائز ولادت پائیں گے۔ حکومت
امریکہ ناجائز بچوں کی دیکھ بھال پر ہر سال خزانہ سے اٹھارہ
کروڑ ڈالر (نوے کروڑ روپیہ) خرچ کرتی ہے پھر ان ناجائز
ولادتوں سے تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے دردناک حالات
میں ان لڑکے لڑکیوں کا دماغی توازن بگڑ جاتا ہے، بیروزگاری
میں اضافہ ہوتا ہے ماہر انسانیات ڈاکٹر مارگریٹ کا کہنا ہے
کہ ہم اپنے لڑکے لڑکیوں کو جو آزادانہ اختلاط کی اجازت
دیتے ہیں یہ اس کا نتیجہ ہے ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ کم عمری
کا میل ملاپ خطرناک ہے۔ چونکہ ہمارا معاشرہ کچھ اس قسم
کا ہے کہ یہاں بغیر شادی شدہ لڑکوں کو میاں بیوی کی طرح
رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ حرامی بچوں کی پیدائش ہے

دماغی صحت کے قومی ادارہ کے ڈاکٹر کلاک ونسٹ کا کہنا ہے کہ ہمارا معاشرہ ناجائز جنسی تعلقات سے چشم پوشی کرتا ہے یا اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ہماری فلموں اور ناولوں میں ناجائز جنسی تعلقات کو ایک معمولی کھیل اور تماشا کے طور پر پیش کیا جاتا ہے مختلف میلوں حتیٰ کہ فٹ بال کے مقابلوں میں "ملکۂ حسن" کے مقابلے دراصل جنسی آوارگی اور حرامی بچوں کی پیدائش میں خشت اول کا کام دیتے ہیں۔ گیارہ سال کی لڑکیوں کو لڑکوں سے آزادانہ طور پر پھرنے کے مواقع مہیا کئے جاتے ہیں اور لڑکی نمائش و نمود دیرجان دیتی ہے اور اس طرح بدکاری شروع ہوجاتی ہے۔

(از روزنامہ دعوت دہلی ۸ رمئی ۱۹۶۳ء)

وزیر اعظم اور اُردو

اُردو سے وزیر اعظم پنڈت نہرو کو خصوصی لگاؤ ہے وہ ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ اُردو ہندوستان کی زبان ہے اور وہ دوسری زبانوں کے ساتھ ترقی کر رہی ہے اور ترقی کرے گی اُسے آگے بڑھنے سے نہ روکنا چاہیئے اور اسے ترقی کے مساوی مواقع ملنے چاہئیں۔ دو سال قبل دہلی کے وگیان بھون میں ہندوستان بھر کے اُردو اخبارات اور رسائل وغیرہ کی ایک نمائش ہوئی تھی۔ وزیر اعظم نے اس کا افتتاح کیا تھا اور اُردو کے لئے انتہائی ہمت بخش اور ہمدردانہ کلمات بھی استعمال کئے گئے تھے لیکن جب اُردو کے ساتھ وزیر اعظم کی عملی ہمدردی اور ہمت افزائی کا وقت آتا ہے تو ہم وزیر اعظم کو بالکل لاچار و بے بس پاتے ہیں۔

یوپی، بہار، دہلی اور پنجاب میں اُردو کو علاقائی زبان کا درجہ دینے کی بات اب بہت پرانی ہوچکی ہے وہ محضرنامہ بھی اب دیمک کی خوراک بن چکا ہوگا جو حامیانِ اُردو نے اس سلسلے میں پیش کیا تھا لیکن سہ زبانی فارمولے کی بات تو ابھی نئی ہے۔ حامیانِ اُردو کو توقع تھی کہ بعض صوبوں میں اور خاص طور پر یوپی میں سہ لسانی فارمولے میں اُردو کو ضرور شامل کرلیا جائے گا۔ اس طرح حامیانِ اُردو کی اشک شوئی ہوجائے گی اور یہ بھی ظاہر ہوجائے گا کہ ہمارے حکمرانوں کے اذہان صاف ہیں لیکن غریب اُردو کو سہ لسانی فارمولے کے سایہ میں بھی پناہ نہیں ملی۔

گزشتہ روز اسی وگیان بھون میں جہاں وزیر اعظم نے اُردو اخبارات و رسائل کی نمائش کا افتتاح کیا تھا جب پریس کانفرنس میں وزیر اعظم کی توجہ یوپی میں سہ لسانی فارمولے سے اُردو کو خارج کرکے سنسکرت کو لانے کے مسئلہ پر مبذول کرائی گئی تو انھوں نے بڑی بے کسی اور مجبوری کے ساتھ یہ جواب دیا کہ:— "وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ حکومت یوپی کو اپنا سہ لسانی فارمولہ بنانے کا اختیار ہے۔"

اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ اگر حکومت یوپی کوئی زیادتی کرتی ہے اور کسی لسانی اقلیت کا حق غصب کرتی ہے تو اسے وزیر اعظم نہیں ٹوک سکتے۔ اس مرحلے پر ہم یہ سوال کریں گے کہ جب وزیر اعظم کی طرف سے اُردو کے فروغ اور اسکی ہمت افزائی کی بات کی جاتی ہے تو اس کی راہ میں رُکاوٹ ڈالنے اور اس کی ہمت شکنی کرنے والوں کے خلاف کوئی آواز کیوں نہیں اُٹھائی جاتی اور اس سوال کا جواب ہی اُردو سے وزیر اعظم کی محبت کے معیار کو واشگاف کر دیتا ہے۔ وزیر اعظم کو یہ تسلیم ہے کہ سنسکرت ایک کلاسیکل زبان ہے اور سہ لسانی فارمولے میں تین جدید زبانوں کو شامل ہونا چاہیئے۔ اس کے باوجود اُردو پر حکومت یوپی کے ظلم و ستم پر وہ کوئی تبصرہ کرنے سے معذور ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ اس کی کیا وجہ ہے؟

ایک طرف تو آئین کی چودہ قومی زبانوں میں اُردو کو بھی شامل کیا گیا ہے اور دوسری طرف اُردو کو ہر سطح پر ختم کرنے کا عمل جاری ہے۔ سہ لسانی فارمولے کے ذریعے اُردو کی تعلیم کے مناسب انتظام کی ایک راہ نکلی تھی۔ مگر اُردو کی جگہ پر سنسکرت کو لاکر یہ راہ بھی بند کر دی گئی۔ کاش ہمیں کوئی یہ بتا سکتا کہ اُردو پر اس ظلم ناروا کا کیا جواز ہے؟

جب وزیر اعظم پنڈت نہرو اُردو کو اس کا جائز حق نہیں دلا سکتے تو پھر انھیں یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ ملک میں کوئی لسانی سامراج غلبہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہے ملک کی

تمام زبانیں ترقی کر رہی ہیں اور ان کی ترقی کی راہ میں کوئی دوسری زبان رکاوٹ نہیں ڈال رہی ہے۔ حال ہی میں وزیر اعظم نے مدراس میں کہا تھا کہ ملک میں کسی زبان کی ترقی کی راہ میں کسی دوسری زبان کو نہیں حائل کیا جا رہا ہے لیکن کیا وہ بتائیں گے کہ لسانی فارمولے میں اُردو کی جگہ پر سنسکرت کو لاکر اُردو کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالی گئی ہے؟ ہم سنسکرت کے دشمن نہیں ہیں سنسکرت ایک مردہ اور مذہبی زبان ہے اسے ترقی کا موقع ضرور ملنا چاہیئے، لیکن اُردو کی قبر پر سنسکرت کو۔ یہ اسکیم ہمیں یقیناً پسند نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا شور وغل لاحاصل ثابت ہوگا کیونکہ ہماری آواز میں کوئی طاقت نہیں ہے اور ہم متحد و متفق ہوکر اُردو کے حقوق کے حصول کی کوششیں نہیں کرتے ہیں لیکن آئین نے ہمیں رائے کی آزادی دی ہے۔ اس لئے ہم وزیر اعظم سے احتجاج کر رہے ہیں۔ کاش وہ ہمارے اس احتجاج پر توجہ کر سکتے۔

(از روزنامہ نئی دنیا۔ ۱۹ر جون ۶۳ء)

مکتوب حجاز

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر الفرقان لکھنؤ کا مکتوب اُن کے صاحبزادہ کے نام۔

بیچارے مصری اور یمنی مسلمان اس سال نہیں آسکے ہیں موجودہ سیاسی اختلاف کی وجہ سے ان دونوں حکومتوں نے اپنے شہریوں کو بالکل اجازت نہیں دی۔ شاید اپنے عوام کی تسلی ہی کے لئے قاہرہ کا ریڈیو مسلسل اعلان کر رہا ہے کہ اس سال حجاج بہت کم آئے بس ہندوستان و پاکستان سے کچھ آگئے ہیں اور بہت تھوڑے سے بعض دوسرے ملکوں سے۔ اور زیادہ تر ملکوں نے احتجاجاً بائیکاٹ کر دیا اور یہ کہ حرم شریف ایک فوجی چھاؤنی بنا ہوا ہے اور اس کے اردگرد سخت فوجی انتظامات ہیں۔ ٹینکوں کا حصار ہے اور حالات نازک اور خطرناک ہیں اور حجاج کو طرح طرح کی پریشانیاں ہیں۔ مجھے خود تو ان دنوں میں کہیں کا بھی ریڈیو سننے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن متعدد دوستوں نے قاہرہ ریڈیو کے حوالے سے مجھ سے یہ بات نقل کی۔ غالب تمہیں اندازہ ہوگا کہ قاہرہ ریڈیو کے بارے میں جب بعض دوست ہم سے کہا کرتے تھے کہ وہ اپنی سیاسی مصلحتوں کے لئے بیجا جھوٹا پروپیگنڈا کرتا ہے اور بعض اوقات اس میں سو فی صدی جھوٹ ہوتا ہے تو میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ ان دوستوں کو مصر کی موجودہ حکومت سے چونکہ بہت شدید اختلاف ہے اسلئے ان کا مصر کے بارے میں یہ ذہن بن گیا ہے اور میرا ذہن اس بارے میں کبھی ان سے پوری طرح موافقت نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس تازہ تجربے کے بعد اندازہ ہوا کہ واقعی قاہرہ کی اس قسم کی نشریات کا قطعاً کوئی اعتبار نہیں اور وہ اپنی سیاسی مصلحتوں کے لئے سو فی صدی جھوٹے پروپیگنڈے کرنا اپنے لئے صحیح سمجھتے ہیں۔ ٹینک اور فوجی انتظامات کا کیا ذکر یہاں کہیں کسی کے ہاتھ میں رائفل بھی نہیں دیکھی۔ اس سے چوتھائی بلکہ اس کے دسویں حصے کے انتظام کے لئے ہر ملک میں اچھی خاصی پولیس فورس کی ضرورت پڑتی ہے لیکن یہاں اس کا قطعاً ذکر نہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ قاہرہ ریڈیو نے یہاں گرانی کا بھی ذکر کیا ہے کہ ایک روٹی دو ریال کی مل رہی ہے لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ حالانکہ اس کے برعکس ہمیں حیرت ہے کہ اتنے بڑے عظیم الشان بین الاقوامی مجمع میں ہر طرح کی چیزیں خاص کر کھانے کی چیزیں کیوں اتنی ارزاں ہیں۔ پھلوں کا بھی یہی حال ہے بہت اچھی قسم کی موسمی ایک روپیہ سیر۔ اور بہت عمدہ قسم کے سیب دو روپے سیر ہیں یہاں دنیا کی مصنوعات کی ارزانی تو معلوم و معروف ہے کیونکہ یہاں کسی قسم کا ٹیکس نہیں ہے لیکن اس وادیٔ غیر ذی زرع میں لاکھوں کے اس مجمع کے باوجود جس کا سلسلہ مہینوں سے جاری ہے اور ابھی مہینوں تک جاری رہے گا۔ کھانے پینے کی چیزوں کی یہ ارزانی نہایت حیرت انگیز اور بس اللہ کی قدرت کی نشانی ہے۔

(از ہفتہ وار صدق جدید لکھنؤ ۱۴ر جون ۶۳ء)

عمدہ کتابیں

جناب اسعد گیلانی کی دو کتابیں

صحیفۂ ہمام بن منبہ — حضرت ابو ہریرہؓ کا مرتب کیا ہوا قدیم ترین مجموعۂ حدیث مع تشریح۔ مکتوبات نبویؐ کے فوٹو بھی شامل کتاب ہیں۔ ساڑھے تین روپے

سچے رسولؐ کی سچی تعلیم — زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق تعلیماتِ رسالت کا ایمان افروز مجموعہ۔ قیمت مجلد ڈیڑھ روپیہ۔

انتظار (جدید مضامین) " " " ۱/-

کتاب انقلاب (") " " " ۱/-

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک — از:۔ مولنا مسعود عالم ندوی قیمت ڈھائی روپے

مقالاتِ شیخ الہندؒ — وحی کی حقیقت اور ایمان و دیانت کے باہمی ربط پر ایمان افروز گفتگو۔ مشہور مفسر قرآن مولانا محمود الحسن شیخ الہندؒ کے قلم سے۔ ایک روپیہ۔

درویشی کیا ہے؟ — مشائخ و صوفیاء کے ایمان افروز ارشادات۔ قرآن و سنت سے ہم آہنگ۔ بلیغ و نفیس توضیح۔ سوا دو روپے۔

چوکھٹ کے اندر — عورتوں کے لئے چند نفیس مضامین قیمت ایک روپیہ

محمد بن عبدالوہاب — ایک مظلوم اور بدنام مصلح کی مستند سوانح۔ مولانا مسعود عالم ندویؒ کے قلم سے۔ قیمت پونے تین روپے۔

اونچی دکانیں — صدیق الحسن گیلانی کے دلچسپ شہ پارے۔ قیمت ایک روپیہ

عہدِ رسالت کی مقدس خواتین — اپنے موضوع کی یکتا کتاب۔ ڈیڑھ روپیہ

کراماتِ صحابہؓ — از مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ ڈیڑھ روپیہ

محاسن اسلام — اسلام کی خوبیوں پر مولانا اشرف علیؒ کی ایمان افروز تقریر۔ صرف ڈیڑھ روپیہ۔

عبقات — اخلاقی موضوعات اور علوم تصوف پر شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی مشہور کتاب۔ ترجمہ از مولانا مناظر احسن گیلانیؒ۔ ساڑھے دس روپے۔

زبدۃ المناسک — حج اور احکام حج پر مفصل و مدلل کتاب:۔ مصنفہ۔ استاذ الاساتذہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ۔ ہدیہ مجلد آٹھ روپے۔

حقوق الاسلام — اپنے وقت کے زبردست عالم قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی مفید ترین تصنیف جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کی رو سے کس پر کس کا کیا حق ہے۔ اللہ، رسولؐ، صحابہؓ، علماء، والدین، اقرباء، حاکم، شوہر، بیوی، اولاد، پڑوسی۔ غرض ہر ایک کے حقوق کی تفصیل۔ رسالہ سماع و مزامیر بھی شامل کتاب ہے۔ اردو ترجمہ عام فہم قیمت مجلد دو روپے۔

فتوح الغیب — شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مقالات کا اردو ترجمہ۔ مجلد ڈھائی روپے۔

القاموس الجدید — ایک رفیع الشان اردو عربی ڈکشنری۔ بیشمار اردو الفاظ کے عربی مترادفات کے علاوہ اس میں ضرب الامثال محاورات اور زبان کے نئے تغیرات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ضروری مقامات پر تصاویر کے ذریعہ مفہوم کو واضح کیا گیا ہے۔ مفید، بیش قیمت اور جلیل القدر عربی سیکھنے والوں کیلئے خاص تحفہ ہے۔ سات روپے

مکتبہ تجلی دیوبند (یو۔پی)

مستقل عنوان

ملا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

آپ نے نون غنّہ ضرور سُنا ہوگا لیکن یے غنّی کبھی نہیں سُنی ہوگی - میں نے بھی نہیں سنی تھی مگر قسمت کا لکھا بہر حال پورا ہوتا ہے - ایک ایسے غنچہ ذہن بزرگوار کی زبان سے یے غنّی سُننی پڑی جنھوں نے شاید نون غنّہ بھی کبھی نہ سنا ہوگا - ان کا نام شیخ مسیتا تھا - یہ ان متعدد کرم فرماؤں میں سے ایک تھے جو ہم زوجین کو اسٹیشن سے لینے بیل گاڑیوں سمیت آئے تھے -

بیل گاڑی کا سفر تصوراتی نقطۂ نظر سے بڑی رومانٹک چیز ہے - ذرا سوچیے دائیں بائیں دھان کے، سرسوں کے، ارہر کے کھیت جن کے نرم و نازک سائے میں خدا معلوم کتنی مرتبہ شیریں فرہاد کا، سوہنی مہنوال کا، وامق عذرا کا کھیل کھیلا گیا ہوگا، محبّت کے گیت گائے گئے ہوں گے - کھیتوں کے پیچھے آموں کے باغ جن کے گھنے سائے میں نہ جانے کتنے ہیروؤں اور ہیروئنوں کے گاتے ہوئے ڈوئٹ یعنی فلمی گانے قاف کی پریوں کی طرح پھڑپھڑاتے پھر رہے ہوں گے - نیچے زمین اوپر آسمان - آسمان پر سورج، زمین پر گھانس اور ریت - یہ سب تصوراتی سطح پر کتنا دل کش ہے لیکن عملاً اس سے واسطہ پیش آجائے تو سچی بات ہے اپنی تو کچھ ویسی ہی کیفیت ہوئی جیسی میاں تقدیر حسین کی ہوتی تھی - تقدیر حسین چھ مہینے تک ایک بی اے پاس خاتون مِس پروینہ کے عاشق رہے - اس دوران میں بارہا مجھ سے کہا کرتے :-

" ملا اگر پروینہ مجھے نہ مل سکی تو خودکشی کرلوں گا "

پھر پروینہ سے ان کی شادی ہوگئی - چھ ماہ بعد مجھ سے کہنے لگے :-

" ملا ! کسی نہ کسی طرح پروینہ سے میرا پیچھا چھڑا دو ورنہ خودکشی کرلوں گا "

تو بیل گاڑی کا سفر ہاضم ضرور ثابت ہوا یہاں تک کہ شاید معدے کی بڑی آنت نے چھوٹی آنتوں کو چبا ڈالا لیکن رومانٹک ثابت نہیں ہوا - کھیت بے شک تھے - باغ بھی تھے - کئی راجبہے اور نالے بھی راہ میں آئے جن کا بہتا ہوا پانی تخیلاتی اعتبار سے پگھلی ہوئی چاندی اور حسین آنچلوں کی رومانوی سرسراہٹوں سے کم نہیں ہوتا - مگر دانتوں میں کرکراتے ہوئے ریت، آنکھوں میں چبھتے ہوئے غبار اور بھیجے کو کھولاتی ہوئی دھوپ کے سامنے اسوقت رومان اور محبّت کان دبا کر چپکے سے سرک گئے - ذہن کے کسی بعید تر گوشے میں بھی رومانس کا کوئی چراغ نہیں جل رہا تھا - جب راستے کے بے تکے نشیب و فراز ہم زوجین کو ایک دوسرے سے ٹکرا دیتے تو ملائن کے منہ سے سسکیاں نکلتیں، میں بھی کبھی معذرتاً اور کبھی حقیقتاً کراہتا - ایک دفعہ تو ہم دونوں کے سر ٹکرا گئے تھے -

" بڑا اُبرا سفر ہے — آپ ذرا اپنے سہارے بیٹھیے "

انھوں نے نہایت بیزاری سے کہا :-

" کیا کہتی ہو نیک بخت آج ہی تو سہارا لینے کا وقت آیا ہے - گھر اور گھنی چھوڑ آئی چکی ہیں "

واقعی گاڑی کے چوبی تختے اور ریڑھ کی ہڈی کے

ہیں مسلسل تصادم جاری تھا۔ دونوں کہنیاں کسک رہی تھیں۔ اب
ن اگر ملائن کا سہارا نہ لیتا تو کس کا لیتا۔ غنیمت یہ ہے کہ اس
یل تانگے میں کوئی تیسرے صاحب نہیں دھرے گئے تھے مگر پھر
ھی یہ اتنا مختصر سا تھا کہ اگر گردشِ دوراں ہم زوجین کے ہموں
ا چربیاں نہ اچک لے گئی ہوتی تو ہم میں سے فقط ایک ہی اس
میں سما سکتا تھا۔

"کتنی خوشگوار فضا ہے بیگم۔ اہا وہ دیکھو جری کے کھیت
میں گاؤں کی ایک الہڑ حسینہ اور اس کا کتا ——— اور وہ دیکھو
کیکر کی پھننگل پہ نیل کنٹھ ———"

انھوں نے بے ساختہ دیکھا ضرور تھا مگر پھر بہت ہی ناگفتہ بہ
لہجے میں بڑبڑائی تھیں:۔

"بس آپ ہی دیکھیئے۔ مجھے کیا معلوم تھا بیل گاڑی کا
سفر ایسا ہوتا ہے۔"

"اوہو تو کیا تم سمجھی تھیں بیل گاڑی ہمیں ہوا میں تیرا کر
لے جائے گی۔"

"ایسا بھی کیا راستہ۔ قدم قدم پر گڑھے اور پھر چڑھائی۔"

"سبق لو یہ زندگی کے نشیب و فراز ہیں۔ وہ کسی شاعر نے کہا
ہے نا۔۔۔۔"

"بس شاعر کو رہنے دیجئے۔ آخر کتنا راستہ اور باقی ہے؟"

"بس چھ میل ——— ہم ابھی دو میل آئے ہیں۔"

"اللہ توبہ ——— اس سے تو پیدل چل لیتے۔ اُف آپ ذرا
اپنے سہارے بیٹھیئے۔"

بیل گاڑی چلتی رہی۔ آگے پیچھے کئی بیل گاڑیاں اور تھیں
یہ کاروانی انداز کا سفر اگر سینما کے پردے پر دیکھتے تو کتنا اچھا لگتا
میں چاہ رہا تھا کہ میں اور ملائن ہیرو ہیروئن کی طرح باتیں کریں۔
میں کہوں اے جانِ بہار! یہ زمین سے آسمان تک بکھری ہوئی
دھوپ کی چاندی کتنی حسین ہے۔ میں اس سے تیرے ماتھے کا
ٹیکہ اور کانوں کے آویزے بنواؤں گا۔ اس سے پہلے کہ سونے
کی طرح چاندی بھی کسی قانون کی زد میں آئے ہمیں موقع سے فائدہ
اُٹھانا چاہیئے ——— وہ کہے۔ اے سرتاجِ من سلامت۔ نہ توبہ
اے میری تمناؤں کے چشم و چراغ ——— اٹھ وہ کیا ہوتا ہے ——— میری
دل کی دنیا کے مالک چاندی کے زیور پہنا تم کسی چوڑھی چماری
کو۔ ہمارے ڈیڈی تو کل ہی خالص سونے کے بُندے اور بازوبند
اور ہار خرید کر لائے ہیں۔ ڈیڑھ سو روپے تولہ آج بھی جتنا چاہیے
سونا لے لو۔ تمھاری محبت سچی ہے تو ہمیں جڑاؤ نیکلس لا کر دو۔

میں کہوں۔ ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ذرا سورج ڈوبنے دو
میں شفق کے طلائے خالص سے دس تولے کا نیکلس بناؤں گا جسکی
رگ رگ میں ستارے جڑے ہوئے ہوں گے۔

لیکن ملائن کا موڈ اس قدر خراب تھا کہ گفتگو چلی ہی نہیں
مجبور ہو کر میں بھی خاموش ہو گیا اور تصور کے پردے پر چند
مناظر اُبھرنے ڈوبنے لگے جو ابھی ریل کے سفر میں سامنے آئے تھے
گڑھی بھوندو ناتھ سے ایک کانگریسی بزرگ سوار ہوئے
بزرگ ان کی گاندھی کیپ کی وجہ سے کہہ رہا ہوں ورنہ عمر میں
تو مجھ سے بڑے نہ رہے ہوں گے۔ چہرے کی بناوٹ بھی اصلوں
جیسی نہیں تھی۔ ویسے اصیل کانگریسی آج کل ملتا بھی مشکل ہی سے
ہے۔ فدوی کو بارہا ان حماموں میں جھانکنے کی سعادت نصیب
ہوئی ہے جہاں کانگریسی حضرات فقط لنگوٹ باندھ کر غسل کرتے
ہیں۔ جنھیں لباس کے چھکٹے میں ہمیشہ کانگریس کا مکھن سمجھا تھا
وہ بھی کپڑے اُتار کر ویسے ہی نظر آئے جیسے اپنے صوفی نمکین کو
مس طمنچہ اس وقت نظر آئی تھی جب وہ رات کو تھیٹر میں اسیر
عاشق ہو کر صبح اس کے ڈیرے پر ملنے گئے تھے۔

خیر ذکر ان کانگریسی بزرگ کا ہو رہا تھا جو گڑھی بھوندو
ناتھ سے سوار ہوئے تھے۔ ان کے پاؤں میں ٹیڈی بائیز والا
نکیلا بوٹ تھا مگر لباس پورا کھدر ہی کا تھا جو نیتا ہونے کی
ناقابل تردید علامت ہے۔

انھوں نے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی ایک ایسے
انداز میں ڈبے کا جائزہ لیا تھا جو ازبسکہ شہزادوں کیلئے خاص
سمجھا گیا ہے پھر وہ سامنے کی سیٹ پر بیٹھ گئے تھے۔

اب انھوں نے دستی بیگ سے چند اخبار نکالے۔ ایک
ہندی ایک انگریزی اور ایک کسی ایسی زبان کا جس کا نام
تک مجھ جاہل کو نہیں معلوم۔ پھر جیب سے بیڑی کا بنڈل نکالا
اور بڑے رکھ رکھاؤ سے اس کا کاغذ پھاڑ کر ایک بیڑی

برآمد کی۔ اسے ہونٹوں تک لے جاکر دانتوں سے اس کا سرا کاٹا اور پھر خاصے اہتمام سے اس کا دوسرا سرا ماچس پر گھِس کر ٹھیک کیا۔ میں یہ سب دلچسپی اور حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ پانچ پانچ پیسے جیسے معیاری سگرٹوں کے ساتھ تو یہ تکلف برتتے بعضوں کو دیکھا ہے لیکن بیڑی کے ساتھ یہ خسروانہ سلوک شاید جمہوری قدروں کی پاسداری میں تھا۔

ڈھینگاپور سے ایک نئے مسافر سوار ہوئے۔ خاکی لباس۔ طویل قامت۔ بھاری بھرکم اور وجیہہ۔ کافی ساز و سامان کے ساتھ ایک لڑکی بھی ان کے ساتھ تھی۔ سنہری اور قدامت زدہ۔ قدامت زدہ یوں کہ نہ اس کے بازو عریاں تھے نہ گریبان چاک تھا۔ نہ لباس ہی ایسا چست تھا کہ دیکھنے والوں کے تلووں میں چیونٹیاں رینگا دے۔ رخسار غازے سے، ہونٹ سرخی سے اور آنکھیں ڈھٹائی سے محروم۔

"بیٹی تم ادھر بیٹھ جاؤ۔"

لڑکی ملازمین کے قریب جا بیٹھی۔ وہ خود درمیانی سیٹ پر جم گئے۔ کچھ دیر بعد ان میں اور کانگریسی مہاشے میں رسمی گفتگو کا آغاز ہوا۔ اس سے واضح ہوا کہ وہ تھے امر سنگھ اور مہاشے تھے دیوداس۔ امر سنگھ کو سخت شکایت تھی کہ عین اس وقت جب ان کے ریٹائر ہونے کا وقت قریب آپہنچا تھا گورنمنٹ نے ان کا تبادلہ کر دیا ہے۔ وہ جیلر تھے۔

"بڑی کوشش کی صاحب" وہ گونجیلی آواز میں دیوداس سے کہنے لگے "مگر تبادلہ نہیں رکا۔ ہر افسر بادشاہ بنا ہوا ہے۔"

"کاش کچھ پہلے آپ سے رسم و راہ ہو جاتی تو یہ معمولی سا کام چٹکیوں میں ہو جاتا۔" دیوداس نے ہمدردانہ کہا "میں وزارت داخلہ کے کسی بھی افسر کو فون کر دیتا بلکہ براہِ راست جواہر لال ہی کو کہہ دیتا، کیا مجال تھی کہ تبادلہ نہ رکے۔"

امر سنگھ نے انھیں گھورا پھر ترخ کر بولے :۔

"کچھ پروا نہیں۔ بھیجو کہاں بھیجتے ہو۔ سات سمندر پار بھی بھیجو گے تو میں اپنی بچی سمیت وہیں گھر جما لوں گا۔"

کمال ہو گیا۔ تبادلے کے خلاف جتنی شدید بیزاری ایک لمحہ پہلے جیلر صاحب کے لہجے میں پائی جا رہی تھی اتنی ہی فراواں لاپروائی بھی اب صاف جھلک رہی تھی۔ پھر دیر تک ان میں رنگارنگ باتیں ہوتی رہیں۔ موسم کی باتیں سیاست کی باتیں، سماج، کلچر اور آم کے اچار کی باتیں۔ شدہ شدہ گفتگو بھارتی وزیروں، گورنروں اور ذیلی افسروں تک پہنچی۔ اب مسٹر دیوداس کچھ اس طرح کے فقرے فرما رہے تھے :۔

"بڑا اندھیر ہے صاحب۔ جسے دیکھو فرعون بنا ہوا ہے۔ دو ٹکے کا آدمی کام نہیں کر کے دے گا جب تک اسے نوٹوں کی کھڑکھڑاہٹ نہ سنائی دے۔ مجھے دیکھئے زندگی بیت گئی کانگریس کے ساتھ۔ مار سہیں جیلیں کاٹیں مگر آج وہ ناکارے لوگ جنھیں بھگوان کی غلط بخشی نے کرسیاں بخش دی ہیں سیدھے منھ بات نہیں کرتے نہ کسی کی قربانیوں کی قدر نہ پچھلے تعلقات کا پاس۔ دھکے کھاتے جاؤ کوئی کام وقت پر ہو کے نہیں دیتا۔"

جیلر امر سنگھ پھٹ سے بولے :۔

"تم یار بڑے جھوٹے ہو۔ کچھ دیر پہلے تو پنڈت نہرو کو فون کر رہے تھے۔"

دیوداس کا چہرہ فق ہو گیا۔

"او... اور... آپ سمجھے نہیں...."

"ہاں ہاں سمجھا تو بس تم کانگریسیوں ہی کے حصے میں سارا آگیا ہے۔ ارے میں تم لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ کرنا دھرنا جو کچھ تھا آزادی سے پہلے کر چکے اب تو بلا وجہ کی اینٹھ مروڑ ہے۔ تمھیں ہی ابھی کسی کرسی پر بٹھا دو پھر دیکھو زمین پر قدم نہیں رکھو گے۔ حرام کی کھاؤ گے کھا کھا کے غرّاؤ گے۔"

دیوداس غریب بقول شخصے منھ تکتا رہ گیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ جیلر صاحب ایسے منھ پھٹ ثابت ہوں گے۔

گنپت نگر کے اسٹیشن سے ایک اور کانگریسی سوار ہوئے۔ وہ بھی دیوداس ہی کی طرح سیاسی یتیم نظر آ رہے تھے۔ سیٹ کوئی مکمل طور پر خالی نظر نہیں آئی تو ادھر ٹھہر گئے۔ یتیمی کے باوجود ان کے رخِ انور پر وہ خاص قسم کی نخوت

ضرور جھلک رہی تھی جو کھدر پوشی کا معروف لازمہ ہے اور جس کی بالائی سطح بھیگی بلّی کی یاد دلاتی ہے۔

ڈوپسکی برتھ پر کہنی کے بل لیٹ کر انھوں نے سگریٹ نوشی شروع کردی۔ امر سنگھ کو ان کا اوپر چڑھنا ہی خاصا گراں گذرا تھا پھر جس شان کے ساتھ وہ سگریٹ کے کش لے رہے تھے وہ تو امر سنگھ جیسے تہار لوگوں کے لئے چیلنج سے کم نہیں تھا۔ امر سنگھ کی دہاڑ سے دفعتاً ڈبہ گونج اٹھا۔

"تم ایک تو بدتہذیبوں کی طرح سر پر چڑھ گئے پھر اکڑ اکڑ کے سگریٹیں پی رہے ہو۔ پھینکو سگریٹ۔"

نئے مہاشے کے چہرے پر حیرت، جوش اور کھسیاہٹ کی ملی جلی لہر آئی۔ وہ سیدھے ہو بیٹھے اور چٹکی بجا کر سگریٹ کا گل جھاڑتے ہوئے مشتعل آواز میں بولے:-

"آپ۔۔۔ ب بڑے جاہل آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ جانتے ہیں میں کون ہوں؟"

"تم ملکہ وکٹوریہ کے چچا بھی ہو تو مجھے پروا نہیں۔ پھینکو سگریٹ ورنہ۔۔۔۔"

"ورنہ کیا؟" مہاشے بڑبڑائے۔

"کیا — بتاؤں کیا؟"

دفعتاً امر سنگھ کھڑے ہوگئے اور سگریٹ مہاشے کے ہاتھ سے چھین کر کھڑکی سے باہر پھینک دی۔

"اب اگر تم نے سگریٹ سلگائی تو تمھیں بھی کھڑکی سے باہر پھینک دوں گا۔"

مہاشے غصّے اور بے بسی کے سنگم پر دم بخود سے ہوگئے تھے۔ چہرہ کشیدہ، ماتھے پر جھول، آنکھیں پھٹی پھٹی، گال سرخ

"ڈیڈی جانے بھی دیجئے۔" لڑکی شکایت آمیز لہجے میں بولی۔

"بکو مت" امر سنگھ دہاڑے "یہ دو کوڑی کے لونڈے گاندھی کیپ لگا کر نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگتے ہیں۔"

دیوداس پر بھی خوف طاری تھا۔ وہ ملتجیانہ لہجے میں بولا:-

جانے بھی دیجئے جیلر صاحب — یہ سپرنٹنڈنٹ جامن پرشاد کے بھانجے ہیں۔"

"سیکڑوں دیکھے ہیں سپرڈنٹ۔ ہم نے دسیوں وزیر بنا ڈالے۔ ہمارا دیا ہوا سرٹیفکٹ نہ ہوتا تو کتنے ہی وزیر آج گھانس کھودتے پھرتے۔"

"سرٹیفکٹ۔۔۔۔؟"

"ہاں ہاں اور کیا — جیل جانے سے بڑھکر قابلیت اور کیا ہوگی مگر اس قابلیت کی سند ہمارا سرٹیفکٹ ہی تو ہوتا ہے۔"

او پروالے مہاشے بھی مسکرائے۔ "بھی" اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مسکرانے کی بجائے ان کے تیور اکھڑنے کے تھے، لیکن یہ یقین کر لینے کے بعد کہ یہ کڑیل قسم کا وحشی جیلر گردن توڑ کر ہاتھ میں دیدے گا انھوں نے ہتھیار ڈالدیئے تھے۔

"آپ تو ڈیڈی ریل کو بھی جیل کا وارڈ سمجھ بیٹھے ہیں۔" لڑکی نے بُرا سا منھ بنا کر کہا "کبھی کوئی لٹھ پڑا تو کیسی بُری بات ہوگی۔"

"بہت دیکھے ہیں لڑنے والے۔ ارے بیٹی یہ گاندھی کیپ والے کہیں لڑنے کا بوتا رکھتے ہیں۔ یہ تو فقط باتیں بناتے ہیں۔ لکچر دیتے ہیں۔ پیسہ بٹورتے ہیں۔"

"معاف کیجئے گا —" دیوداس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "آپ کو سارے دیش کی توہین نہیں کرنی چاہیئے۔"

"سارا دیش — دماغ بھی درست ہے" امر سنگھ اُلٹ پڑے "تم لوگ بھی یار بڑے ڈھیٹ ہو۔ ارے سارا دیش اگر کانگریس کے ساتھ ہوتا تو یہ آئے دن کانگریسی کنڈیڈیٹ کو ہار کیوں ہوتی۔ ہوش کی دوا کرو۔ یہی حال تم لوگوں کی خوش نہمی کا رہا تو اگلے دوسرے الیکشن میں چت پڑے نظر آؤ گے۔"

"پھر بھی صاحب کانگریس کانگریس ہے۔"

"کیا بات ہوئی" امر سنگھ نے دیوداس کو گھورا۔ "ہم کب کہتے ہیں کہ کانگریس کانگریس نہیں رنجیت فلم کمپنی ہے۔ ارے تم تم ہو ہم ہم ہیں — پھر؟"

"معاف کر دیجئے جیلر صاحب — یہ لوگ بچے ہیں۔"

میں نے پہلی بار دخل دیا۔ انھوں نے رُخ پھیر کر مجھے بھی گھورا پھر ترش کر بولے ـــ "ارے مولی صاحب ہم کیا معاف کر دیں انھیں تو بھگوان بھی معاف نہیں کرے گا۔ یہ لوگ کانگریسی نہیں ہیں۔ انھوں نے تو کانگریس کا بھیس بدل لیا ہے اندر سے دیکھو تو دس طرح کا کاٹھ کباڑ ملے گا مگر کانگریس دانگریس کہیں نہیں ملے گی ـــ"

"واہ واہ ـــ کیا بات کہدی ہے" میں نے داد دی وہ بُرا سا منھ بنا کر بولے :ـــ

"آپ بھی کانگریسی معلوم ہوتے ہیں ـــ"

میرا ہاتھ بے اختیار سر کی طرف گیا۔ وہاں رام پوری ٹوپی تھی۔ کپڑے بھی کھدر کے نہیں تھے۔ پھر یہ الزام کیسا؟

"بالکل نہیں جیسا صاب۔ میں تو کانگریس کے پڑوس میں بھی نہیں پھٹکتا ـــ"

"کاہیں کا پڑوس۔ اب کانگریس کسی جماعت کا نام نہیں ہے مولی صاحب! وہ تو ایک خاص ذہنیت بن کر رہ گئی ہے۔ میں نے بہت سے غیر کانگریسی بھی پکّے کانگریسی دیکھے ہیں ـــ"

"پکّے کانگریسی؟"

"یعنی اصلی کانگریسی نہیں پکّے۔ اوپر سے پکّے اندر سے کچے۔ یعنی کہ بس کھاؤ کماؤ باتیں بناؤ، دولت جوڑو وغیرہ وغیرہ ـــ"

میں نے دل ہی دل میں دہرایا ـــ "اوپر سے پکّے اندر سے کچے ـــ یعنی چہ؟"

لڑکی اور ملائن میں کیا باتیں ہوتی رہیں اس پر میری توجہ نہیں تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انھوں نے کافی باتیں کی ہیں اور ایک دوسرے سے بے تکلفی کی حد تک مانوس ہو گئی ہیں۔ لڑکی کا نام اوشا کرن تھا۔ بھولی بھالی مگر ذہین۔ جو کچھ پڑھا لکھا تھا گھر ہی پر پڑھا لکھا تھا۔ سخت گیر اور قدامت پسند باپ نے اسکول کا رُخ نہیں کرنے دیا تھا شاید اسی لئے اس کے دلکش چہرے پر چاندنی کی کرنوں جیسی پاکیزگی تھی معصومیت تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنی وہ بچی یاد آئی جو سیکڑوں کوس دور اپنی دادی کے ساتھ زندگی گذار رہی ہے۔ وہ بھی اب اتنی ہی بڑی ہوگی یا شاید کچھ چھوٹی ہو۔

دفعتًا تصور کے پردے پر تاریکی چھا گئی۔ بیل گاڑی کا پہیہ کسی گڑھے میں جا پڑا تھا جس کے نتیجے میں ہم زوجین کے سر ٹکرا گئے۔

خدا خدا کر کے یہ سفر تمام ہوا۔ منزلِ مقصود گاؤں کی ایک حویلی تھی جہاں شادی کے سلسلے میں خاصی رونق آئی ہوئی تھی۔

اب سنیئے نئی غضب کی بات۔ اگلے روز شیخ سیتا کہنے لگے

"کیوں جی ملّاجی صاب آپ بھی چلیں گے جیارت شریف کو؟"

"کیسی زیارت؟" میں نے ان کا منھ تکا۔

"اجی وہی گونگ عرب کا جلسہ ہے ـــ"

"گونگ عرب!" میں چکرایا یہ کس قسم کی ترکیب تھی ـــ یادداشت کی سطح پر کئی ہم وزن الفاظ ابھرے۔ لعلِ یمن۔ چاہِ ذقن۔ رشکِ ختن۔ لیکن گونگ کس چڑیا کا نام ہے۔ عرب کے ساتھ اس کا کیا جوڑ۔ فارسی ترکیب چہ معنی دارد؟

"ہاں جی" شیخ بولے "آپنے تو سن ہی لیا ہوگا ہماری طرف گونگِ عرب اُترے ہوئے ہیں ـــ"

پھر وہی گونگِ عرب!

ان کے معصوم چہرے پر نظریں گاڑے میں جلدی جلدی اپنی کھوپڑی کی وسعتوں میں دوڑتا رہا۔ آخر کار بڑی تگ و دَو کے بعد یہ راز کھُلا کہ وہ یائے غنّہ بول رہے تھے۔ یعنی گونگِ عرب لعلِ یمن کی طرح مرکب اضافی نہیں تھا بلکہ مرکب توصیفی تھا ـــ گونگے عرب!

"یہ گونگے عرب کون ذات شریف ہیں؟" میں نے پوچھا

"پتہ نہیں مولوی جی۔ سنا ہے بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ مہینے بھر سے اپنے علاقے میں اُترے ہوئے ہیں۔ آج پاس والے گاؤں میں ان کا جلسہ ہے ـــ"

"خوب ـــ تو چلیئے ہم بھی زیارت کریں گے ـــ"

دوسرے گاؤں تک پیدل سفر بیل گاڑی کے سفر

ـے بہر حال بہتر ثابت ہوا۔ جلسہ ایک بڑے سے درخت کے نیچے کچی زمین ہی پر ہونا تھا۔ اسٹیج کے طور پر ایک تخت ڈالدیا گیا تھا۔ سامعین کچھ آچکے تھے کچھ آرہے تھے۔ ٹمٹماتی ہوئی لالٹینوں کی مُردہ سی روشنی عجیب پُر اسرار فضا پیدا کر رہی تھی کچھ دیر بعد پاس کے مکان سے کچھ لوگ نکلے۔ ایک صاحب لالٹین ہاتھ میں لٹکائے راستہ دکھانے کے لئے آگے بڑھے۔

"آئیے مولوی جی" شیخ مسیتا جلدی سے بولے" وہ گونگے عرب صاب آگئے مصافحہ کرلیں۔"

میں نے آنے والوں پر نگاہِ غور ڈالی تو کاسۂ سر کے بیچوں بیچ ہنڈا سا جل گیا۔ یہ تو وہی وارث علی اور شہادت علی تھے رضوان آباد کے اسٹیشن والی یتیم خانہ پارٹی کے منیجر اور ڈائرکٹر[۵۱]۔ وہ دونوں ایک معزز ہستی کو بیچ میں لئے آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ ہستی ظاہر ہے گونگے عرب کے سوا کون ہوسکتی تھی۔ لمبا قد۔ سُرخ سفید چہرہ۔ طویل داڑھی۔ سر پر عمامہ۔ پنڈلیوں تک چوغا۔ میں پل بھر کے لئے تو دھوکا کھا گیا۔ مگر جب وہ قریب آئے تو مصنوعی داڑھی کے پیچھے محرّر رفیق کا چہرہ پہچان لینا کم سے کم میرے لئے مشکل نہیں تھا!

تو یہ تھے گونگے عرب!

میں آگے بڑھنے کے عوض کچھ پیچھے ہی ہٹ گیا تاکہ ان کی نظر مجھ پر نہ پڑسکے۔ مجھے دیکھ کر ان کے حواس درست نہیں رہ سکتے تھے۔ بعید نہ تھا کہ بھاگ ہی پڑتے اور جلسے کا تخت اپنے معزز مہمان کے فراق میں آہیں بھرتا رہ جاتا۔

تخت پر گونگے عرب صاحب کو دولھا کی طرح بٹھایا گیا۔ دائیں بائیں ان کے ساتھی بیٹھے۔ مصافحوں کا سلسلہ برابر جاری تھا اور گونگے عرب کے مکھڑے سے نور کی پھواریں چھوٹ رہی تھیں۔ دیہاتیوں کے چہرے عقیدت کی افراط سے سبز کاہی رنگ اختیار کر گئے تھے۔

آخر کار وارث علی نے کھڑے ہوکر تقریر شروع کی۔

"بھائیو اور بزرگو! آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے معزز عرب مہمان ایک مہینے سے اس علاقے میں آئے ہوئے ہیں۔ یہ ہم سب کی خوش قسمتی ہے کہ مکّے اور مدینے شریف سے ایک اتنے بڑے بزرگ نے ہم لوگوں کو زیارت کے فیض سے نوازا۔ اللہ اللہ۔ کیسے پہنچے ہوئے اولیاء ہیں۔ کاش ان کے زبان ہوتی تو آپ دیکھتے کہ کتنے شمارہ حافظ، قاری اور عالم ہیں مگر قدرت کو یہی منظور تھا کہ یہ بے زبان رہیں۔

خیر۔ کان کھول کر سن لیجئے۔ مکّے شریف کے پاس جو بستی ہے مولد شریف وہاں نمازیوں کو بڑی پریشانی تھی کیونکہ کوئی مسجد نہیں تھی۔ ہمارے ان حضرت نے مسجد بنانے کا بیڑا اُٹھایا اور عرب کی حکومت کو درخواست دی وہاں سے دس ہزار روپے مسجد کے لئے ملے مگر مسجد کے خرچ کا تخمینہ ستر ہزار کا تھا۔ پس ہمارے حضرت سر پر کفن باندھ کر گھر سے نکلے اور ملک ہندوستان آئے کیونکہ یہاں کے مسلمان بہت سخی اور نیک مشہور ہیں۔ بیچارے شہر شہر چندہ کرتے پھر رہے ہیں مگر زبان نہیں اس لئے ہم لوگوں نے اپنا کام دھام چھوڑ کر انکا ساتھ دینا ضروری خیال کیا تاکہ عرب والی مسجد بن جائے اور ہم سب کو ثواب حاصل ہو۔ ابھی تک بیس[۲] ہزار جمع ہوئے ہیں۔ خوب سمجھ لیجئے جو بھی آدمی مسجد بنوانے میں حصّہ لے گا اسکے لئے جنت میں ایک بہت بڑی حویلی بنائی جائے گی۔ وہاں وہ حوروں کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔"

ان کے بعد شہادت علی کھڑے ہوئے اور کافی لمبی تقریر جھاڑی جس کا ماحصل یہ تھا کہ مسجد کی تعمیر میں چندہ دینا تو ویسے بھی واجب ہے مگر جب معاملہ مکّے مدینے شریف کے پڑوس کا ہو تو دل کھول کر چندہ نہ دینے سے آدمی کافر ہوجاتا ہے۔ نہ اس کی بیوی بیوی رہتی ہے۔ نہ بچّے بچّے مانے جاتے ہیں۔ یعنی جس مسلمان نے چندہ نہ دیا اس کے مال جائداد وغیرہ موت کے بعد اس کے بچوں کو نہیں ملیں گے بلکہ اُس شخص کے بچوں کی طرف منتقل ہوجائیں گے جس نے سَو روپے سے اُوپر چندہ دیا ہے۔

دیہاتیوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایک گھبرا کے بولا۔ "پو آیا ہے مولبی دھرما کے دار!"

---

[۵۱] تفصیل کے لئے دیکھئے تجلّی خاص نمبر ۶۳ء۔

دراصل شہادت علی کی آواز بڑی بھاری اور گونجیلی تھی
۔۔۔ دوسرا اپنے ساتھی سے بولا :۔
"یار بھانے اپنی جورو انے ایک بیسی روپے جکات کے جوڑ رکھے ہیں کہے تو دیدوں چندے میں ؟"
"دیدے بے دیدے نہیں تو جورو بچے بے فجول میں کھات ہو جائیں گے"
"مگر یار وہ بھاگن میں جو مولوی آفت علی۔۔۔ کچھ ایسا ہی سا نام تھا۔۔۔"
"سرایت علی" دوسرے نے نقطے نگل کر تصحیح کی
"ہاں وہ کہہ گیا تھا کہ جکات ہمیں دیجیو نہیں تو بھتنی لگ جائے گا۔ اسی کے لئے جروا نے سینت کے رکھی ہے اب بول اس کی مانوں یا عربی ساب کی ؟"
"عربی ساب کا مکابلہ کون سالا کر سکے ہے سرایت علی تو مجھے استاد معلوم دے ہے"
قریب تھا کہ چندے کی بارش شروع ہو جائے میں اپنی جگہ کھڑا ہو کر بلند آواز سے بولا :۔
"اے مولوی صاحب! بندہ لقاء اللہ بقائی بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہے ——— اجازت ہو تو کہے"
وہ تینوں چونکے۔ یہ نام اور یہ آواز اتنی جلدی بھول تھوڑی گئے ہوں گے۔
وارث علی کی کپکپاتی سی آواز بلند ہوئی :۔
"سلام علیکم بقائی صاحب۔ مزاج تو خوش ہیں۔ مہربان بندہ پرور نصف لی و نصف لک ھذا قوم جاہلون"
"نہیں شاہ صاحب۔ آپ اعلان کیجئے چندہ اس وقت نہیں جمع کیا جائے گا ——— ہم رات میں باہمی معاملا طے کر لیں گے"
"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ بھائیو بزرگو۔ چندہ صبح کو دیجئے گا تاکہ رسید وغیرہ دینے میں ہمیں آسانی ہو ——— ہم جمعدار نتھو کے گھیر میں ٹھیر رہے ہیں ———"
پھر مجمع اکھڑ گیا تو میں اسٹیج پر پہنچا اور وہاں سے

ہم چاروں نتھو کے گھیر کی طرف چل دیئے۔ مگر دشواری یہ تھی کہ شیخ مستانا بھی ہمارے ساتھ تھے اور ان کے سامنے یتیم خانہ پارٹی کا راز فاش کر دینا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ہو سکتا تھا گاؤں والے عرب اینڈ کمپنی کو مار مار کے سیج مچ گو نگا بنا دیں۔
میں سوچ رہا تھا کتنا بہت سارا پیسہ انھوں نے آس پاس سے بٹورا ہو گا۔ وہ سب ان کے پیٹ سے نہ نکلا تو کچھ بھی نہ ہوا۔
"دیکھئے شہادت علی صاحب" میں نے کہا "میں ابھی نصف گھنٹے میں ادھر آتا ہوں آپ انتظار کریں"
پھر شیخ مستانا کو لیکر میں وہاں سے ہٹ آیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انھیں کہاں دھکا دوں۔ اسی ادھیڑ بن میں پندرہ منٹ گذر گئے اور ہم گاؤں کے نیم تاریک راستوں میں یونہی دھکے کھاتے رہے۔ وہ اس آوارہ گردی سے الجھ تو ضرور رہے تھے مگر مارے رعب کے یا یوں کہئے مارے اخلاق کے بول کچھ نہیں رہے تھے۔ آخر کار کہنے لگے :۔
"مولوی جی آپ کہیں تو ہم دس منٹ کیلئے اپنے ہم جلف سے مل آئیں۔ آپ جب تک عرب صاب کے پاس بیٹھیں"
"ٹھیک ہے" میں نے دل میں الحمد للہ کہا۔ پھر ان کے رخصت ہوتے ہی چھلاوے کی رفتار سے گھیر نتھو کی طرف چلا۔
مگر آہ کیا کہہ گیا ہے ایک ظالم شاعر :۔
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر
وہاں جھنڈی ہل رہی تھی۔ عرب کمپنی کا سایہ تک ہاتھ نہ آسکا۔
"وہ تو صاب کھیا جی کی گیل تسریف لے گئے ہیں" ایک جوان نے بتایا۔ کھیا جی کا گھر کہاں ہو گا یہ پوچھ کر کیا کرتا۔ کھلی بات تھی کہ وہ فرار ہو چکے ہیں۔
اب کیا کروں ؟
کئی تانیئے ذہنی کشمکش میں دانت پیستا رہا۔ ایک بار زبان بھی پیس لی۔ ویسے تو میں خدائی فوجدار نہیں تھا۔ بھاگ گئے تو بھاگ جانے دو میرے باپ کا کیا بگاڑ گئے۔ مگر کھوپڑی

کے پیدا کیے ہوئے خلل کا کوئی علاج نہیں۔ وہاں سے کوئی پکارا۔—
ڈوب مرو ملّا۔ بالشتیے تمھیں اُلّو بنا گئے۔ ہاہاہا....ہاہاہا....
"نہیں" میں اندر ہی اندر چیخا "میں پاتال سے بھی انھیں کھود نکالوں گا۔"

ملّا زندہ صحبت باقی

خصائل مسلمین — شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے پوتے شاہ محمد اسحٰقؒ کی مشہور کتاب "مسائل اربعین" کا اُردو ترجمہ۔ چالیس مروّجہ بدعتوں کا رد مستند کتب فقہ کے حوالوں سے۔ مجلّد دو روپے۔

سوانح خواجہ معین الدین چشتی — محبوب العارفین حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اثر انگیز سوانح حیات۔ جو اجمیر کی خاک میں استراحت فرما رہے ہیں۔ ساڑھے چار روپے۔

الوسیلہ — شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کی مشہور کتاب جس میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ قرآن میں وَابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ کہہ کر اللہ نے جس وسیلے کی طرف توجہ دلائی ہے وہ آخر کیا ہے؟ مجلّد نو روپے۔

چند لاجواب رسائل — "زندگی" کے سابق مدیر مولانا سید حامد علی کے علم وقلم محتاج تعارف نہیں۔ آپ نے وقت کے تقاضوں کے عین مطابق مفید ترین مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جو چھوٹے چھوٹے رسالوں کی شکل میں چھپتا رہا ہے تاکہ غریب سے غریب آدمی بھی فائدہ اُٹھا سکے۔ اب تک درج ذیل کتابچے چھپ کر آچکے ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ گہرے علمی وعقلی موضوعات کو مصنف کے شستہ وپاکیزہ قلم نے عام فہم اور دل نشیں بنا دیا ہے۔

(۱) خدا کا انکار کیوں؟ قیمت ۳۲ پیسے (۲) کیا خدا کی ضرورت نہیں؟ ۳۲ پیسے (۳) ملحدین کے شبہات ۳۲ پیسے (۴) خدا پرستی ملحدین کی نظر میں ۳۲ پیسے (۵) ہندوستان کا دفاع اسلام اور فن حرب کی روشنی ۳۵ پیسے۔

(قیمتیں معمولی مگر مضامین بیش بہا)

سچی باتیں — از مولانا عبدالماجد دریابادی۔ تین روپے ۸۷ پیسے۔

اصح السیر — سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر لاجواب کتاب، محققانہ مگر دلچسپ، مستند وقیع اور بیش بہا۔ سیرت کی کتابوں میں اس کتاب کو اپنا جواب آپ مانا گیا ہے۔ قیمت مجلّد دس روپے۔

دو خاص نمبر

تجلّی کا خلافت نمبر — ایک روپیہ
چراغ راہ کا سالنامہ ۱۹۶۱ء — ڈیڑھ روپیہ

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند — مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ اور مولانا مفتی محمد شفیع کے فتاویٰ کا مجموعہ

"فتاویٰ دارالعلوم دیوبند" کے نام سے بارہا چھپا ہے، لیکن اس کی ترتیب وتبویب اور کتابت وطباعت ناقص ہی رہی اب ایک نیا ایڈیشن عمدہ ترتیب وتبویب اور کتابت وطباعت کے معیاری انتظام کے ساتھ چھاپا گیا ہے یہ عوام وخواص سب کے لئے خاصے کی چیز ہے آٹھ حصوں کا یہ ضخیم مجموعہ ہزاروں فتاویٰ پر مشتمل ہے جو ہماری روزمرہ کی زندگی میں قدم قدم پر کام آنے والے ہیں۔ مکمل قیمت ۲۱ روپے
اگر مجلد چاہیں گے تو ہر دو حصہ کی ایک جلد۔ یعنی آٹھ حصوں کی چار جلدیں پانچ روپے میں تیار ہوں گی۔ گویا مجلّد کی قیمت ۲۶ روپے ہو جائے گی۔ مجلد بذریعہ ریل طلب کیا جائے تو اخراجات میں کفایت رہے گی۔

قرآن کیا سکھاتا ہے؟ — قرآنی تعلیمات کا مختصر لیکن جامع درس۔ مجلّد ایک روپیہ ۷۵ پیسے

عورت اور اسلام — مسلمان عورت کی زندگی کے تقریباً سارے ہی گوشوں کے بارے میں اسلامی احکام۔ شادی۔ طلاق۔ نان نفقہ، رضاعت، عقیقہ اور گوناگوں مسائل کے معتبر جوابات۔ مجلّد دو روپے ۶۲ پیسے

فسادات جبلپور وساگر — ایک عبرت انگیز کتاب۔ قیمت دو روپے

مکتبہ تجلّی۔ دیوبند (یوپی)

خط اور جواب

ہماری عادت نہیں کہ تجلّی میں ان خطوط کو شائع کیا کریں جو مدح وتحسین میں آتے رہتے ہیں۔ لیکن آج ایک ایسا خط شائع کیا ہی جارہا ہے جس میں توصیف کا کچھ حصہ پایا جاتا ہے۔ مقصود اس حصّے کی اشاعت نہیں بلکہ ان سوالات کا جواب دینا ہے جو اس خط کا منشائے تحریر ہیں لیکن اس حصّے کو حذف اس لئے نہیں کیا کہ تحدیث نعمت کا بھی شرع میں ایک مقام ہے۔ اللہ کا کتنا بڑا فضل وانعام ہے کہ مکتوب نگار کی طرح اور بھی ہزاروں اللہ کے بندے ایسے ہیں جن کے لئے تجلّی کا مطالعہ غذا اور لباس جیسی ضروریات زندگی کی فہرست میں شامل ہو کر رہ گیا ہے۔ ذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔
مکتوب کے خاتمے پر علی الترتیب جوابات ملاحظہ فرمائیے۔ عامر عثمانی

محترمی مولانا عامر عثمانی صاحب (ایڈیٹر ماہنامہ تجلی دیوبند) السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تیرہ سال سے ترجمان القرآن اور دو سال سے تجلّی کا مطالعہ میری زندگی کا جزو ہے۔ ان دونوں کے مطالعہ کو میں نے زندگی کے اسی خانہ میں رکھا ہے جس میں رہائش، غذا اور لباس۔ یہ جسم کی سلامتی کے لئے ہیں تو وہ روح کی پاکیزگی کے لئے۔ اگر روح کی پاکیزگی کا التزام نہیں تو جسم جانور بھی رکھتے ہیں۔ ان دونوں رسالوں سے متعلق میرے تاثرات کیا ہیں، یہ بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ ہاں! اس کی شرح میری سطور بالا کر سکتی ہیں۔ البتہ اتنا سمجھتا ہوں کہ تجلّی اپنے نام کی خوب لاج رکھے ہوئے ہے ظلمات کے سینے چاک کرنا اور عادلانہ تنقید طرۂ امتیاز ہے طعن وتشنیع اور رکیک حملوں کے درمیان شرک وبدعت کا رد تجلّی کا نصب العین ہے۔ رہا ترجمان القرآن دوسرے معنوں میں "جماعت اسلامی" یا پھر یوں کہئے کہ محترم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلام کی خدمت جس طرح اپنے اوپر لازم کرلی اور جس قابلیت ومستقل مزاجی سے قرآن وسنت کی روشنی میں وہ اس تحریک کو چلا رہے ہیں کچھ انھیں کا حصہ ہے۔ ان کی جماعت کے اغراض ومقاصد صرف ایک ہی جملے کے گرد اگرد گھومتے ہیں اور وہ یہ کہ اسلام زندگی کے ہر گوشہ پر حاوی ہو (جو کوئی نئی بات نہیں حقیقت بھی یہی ہے اور اسی کا نام مکمل اسلام ہے) اس میں کچھ کٹھن گھاٹیاں بھی ہیں جو لوگ تاب نہیں لا سکتے وہ اپنی کمزوری کا اقرار کرتے ہوئے شرماتے ہیں۔ لہٰذا ان کے خلاف محاذ قائم کر رکھا ہے۔ میں کہتا ہوں آج اس بیسویں صدی کا دوسرا نصف حصّہ جس افراط وتفریط۔ خلفشار اور عقیدوں کے انتشار میں گذر رہا ہے اور ہر ازم نے اسلام کے خلاف صفیں لا کھڑی کی ہیں مولانا موصوف بڑی پامردی سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ ہمیں فخر کرنا چاہئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مولانا جیسا مجاہد اور صاحب فکر انسان ہمیں عطا کر رکھا ہے جس کا ہر سانس ہماری جانوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ اللہ آپ کو اور ان کو استقامت عطا فرمائے۔ آمین۔

معاف کیجئے تحریر کی طوالت عریضہ کا مقصد فوت کئے دے رہی ہے دوسری طرف آپ کا قیمتی وقت ضائع ہو رہا ہے عرضداشت کا مقصد چند الجھنیں دور کرنا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ آج کل فخر اس میں ہے کہ وضع حمل مشن اسپتال میں جاکر عیسائی نرسوں کے ہاتھ سے کرایا جائے۔ چلیئے ایک حد تک درست تھا مگر اب بچے کی ختنہ بھی یہی عیسائی لیڈی ڈاکٹر کرتی ہیں اور ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کے سر پر عمامہ، کاندھے پر عربی رومال، جسم پر گھٹنوں سے نیچا کرتہ، ٹانگوں میں شرعی پاجامہ اور زبان پر قال اللہ و قال الرسول۔ کیا عورت وہ بھی عیسائی عورت کے ہاتھ سے ختنہ جائز ہے؟

۲۔ ایک جمعہ کو بازار میں اتنی دیر ہوئی کہ قریب کی مسجد میں جماعت کھڑی ہونے کی تیاریاں دکھائی دیں۔ لپکا مسجد میں داخل ہوا وضو کیا اور دو چار صفیں چیرتا ہوا اندر پہنچا نماز شروع ہوئی جب اطمینان سے سانس آیا تو معلوم ہوا کہ میں کہاں ہوں۔ نماز سے باہر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب میں نماز میں کم الجھن میں زیادہ مبتلا ہو گیا۔ رفع یدین کروں یا نہ کروں۔ مجھے اسی حالت میں ایک بات یاد آئی۔ میں جب بنگال میں تھا تو میرے ایک غیر مقلد دوست جو زمیندار بھی تھے حاجی اور عالم بھی۔ اور پیر کے نام سے مشہور تھے ایک جمعہ کو شہر میں آئے میں نے اور انھوں نے ایک ہی مسجد میں نماز ادا کی اور انھوں نے رفع یدین نہیں کیا نہ آمین بالجہر کہی مسجد کے باہر جب آئے تو میں نے عرض کیا قبلہ مسلک کے خلاف کیوں ہوا؟ فرمانے لگے، میں نے حنفی امام سے (قتدیت بھذا الامام) کا عہد کیا اور نبھایا۔ لہٰذا میری پوری نماز اسی اُدھیڑبن میں گذر گئی۔ کیسی رفع یدین اور کیسی ساکن۔ اب آپ اس مسئلے پر روشنی ڈالئے اگر ایسا اتفاق ہو تو کیا کیا جائے؟

۳۔ یہاں ایک صاحب ہیں جنھوں نے کچھ عملیات کے ذریعہ ایک جن سے دوستی کر لی ہے۔ مغرب یا عشاء کے بعد وہ جن کو بلاتے ہیں لوگ اُن سے سوالات کرتے ہیں اور وہ اس کا جواب دیتے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ دین کی باتیں معلوم کرو۔ یہ عمل ہفتہ اور اتوار کی شام کو ہوتا ہے۔ ہفتہ عورتوں کے لئے اور اتوار مردوں کے لئے مخصوص ہے۔ قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے وہ درود اور کچھ وظائف پڑھتے ہیں اور حاضرین سے بھی درود پڑھنے کو کہتے ہیں پھر آنکھیں بوجھل ہو کر بند ہو جاتی ہیں آواز میں نمایاں فرق ہو جاتا ہے۔ ہر سائل کے سوال پر پہلے پوچھتے ہیں نماز پڑھتے ہو اگر نہیں تو پنجگانہ نماز کی ہدایت کے ساتھ کچھ پڑھنے کو بتادیتے۔ وہ لوگوں کے ہمزاد کو بھی بلا دیتے ہیں۔ دریافت کرنے پر دور دراز مقام پر کون کیا کر رہا ہے اور کس حال میں ہے یہ بھی بتادیتے ہیں۔ مُردوں کی روحوں کو بھی بُلا دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی روح کو بھی بلایا۔ یہ سُنکر تو میرا دل کانپ اُٹھا۔ پھر اور ایک طریقہ ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ کسی بھی زبان کے حروف لکھ کر ان کے سامنے رکھدیجئے اور سوال کیجئے وہ اس کا جواب اس طرح دیں گے کہ ان کی شہادت کی انگلی جلد جلد حروف پر جائے گی آپ حروف جمع کر کے مطلب حل کر لیجئے۔ فرض کیجئے ہاں میں جواب ہے تو انگلی بالترتیب ہ، الف اور ن پر جائے گی۔ اب جو صاحب آتے ہیں (یعنی جن) ان کا حال سنیئے۔ ان کا اسم گرامی راحیل صاحب ہے اور ان کی عمر ساڑھے پانچ ہزار سال ہے۔ اب ان عامل صاحب سے متعلق سنیئے۔ ان صاحب کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں اور بہت قریب سے جانتا ہوں

—— اور اتنا جانتا ہوں کہ شخصیت تشخیص کرنے میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں۔ بہت بامروت۔ صاحب اخلاق۔ امانت دار مخیر۔ دوسروں کے دُکھ درد میں بے لوث بے نام و نمود کام آنے والے۔ عزیزوں میں صلہ رحمی کے جیتے جاگتے نمونے۔ صوم وصلوٰۃ کے سختی سے پابند شرع۔ کمی یہ ہے کہ اُردو انگریزی کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ فارسی عربی سے نابلد عربی قرآن پاک کی حد تک۔

مذہبی معلومات نہ ہونے کے برابر۔ مجھ سے ایک صاحب نے پوچھا۔ میں نے عرض کیا کہ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ شریعت میں کوئی گنجائش نہیں۔

اب آپ سے ملتجی ہوں کہ دو چار باتوں کا جواب عنایت فرماکر اس پر روشنی ڈالئے (۱) جنوں کی عمر اتنی ہی ہوتی ہے؟

(۲) جنوں کو یہ طاقت ہے کہ برزخ سے نکال کر روحوں کو اس طرح پیش کر سکیں اور اگر کر سکیں تو کیا کسی پیغمبرؐ کی روح بھی اس طرح بُلائی جا سکتی ہے؟ (۳) ہمزاد کی کیا حقیقت ہے؟

میں برزخ کو آزادی اور قید خانے کا درمیانی حصّہ جانتا ہوں۔ پیغمبروں کی روحیں یا پھر جن کی روحوں کو اللہ نے چاہا بہشت میں ہیں۔ نیاز مند

جمیل عفی عنہ۔ ڈیولائن ۵۲ کراچی۔

جواب ۱:- اگر اچھا مسلمان نائی میسّر ہے جو ختنہ کرنے میں مہارت رکھتا ہے تب تو یہ بات مکروہ ہوگی کہ اسے چھوڑ کر آدمی ہسپتالوں کا رُخ کرے اور عیسائیوں سے یہ کام کرائے لیکن اگر یہ آسانی میسّر نہیں ہے تو ہمارے خیال میں کسی بھی مذہب والے ماہر سے یہ کام کرا لینا قباحت نہیں رکھتا۔ اس مسئلے کو کسی اور عالم سے بھی پوچھ دیکھیں۔ اگر وہ ہمارے خیال کا رد کرے تو اس کے دلائل سے ہمیں بھی آگاہ فرمائیے گا۔

جواب ۲:- رفع یدین اور آمین بالجہر جیسے مسائل کی حقیقی نوعیت ہم متعدد بار واضح کر چکے ہیں۔ ان مسائل کا اختلاف سنت و بدعت کا اختلاف نہیں بلکہ ہر فریق کا تکیہ سنت ہی پر ہے۔ لہٰذا کسی خاص وقت کسی خاص داعیے سے ایک فریق دوسرے فریق کے مسلک پر عمل کرے تو کوئی خرابی لازم نہیں آتی۔

مبارک زمانوں میں تو یہ رواداری عام تھی کہ کسی ایک فریق کے مجمع میں دوسرا فریق اپنے مسلک پر عمل پیرا ہو تو کسی کی انگلی اس پر نہ اُٹھے۔ لیکن اب زمانہ نحوست و نفسانیت کا ہے۔ فراخ دلی اور رواداری عنقا ہوئی۔ کہنے کو ہم یہی کہتے ہیں کہ چاروں فقہی مذاہب برحق ہیں لیکن عملی حالت یہ ہے کہ اگر ہماری مسجد میں کوئی اللہ کا بندہ زور سے آمین کہہ گذرے تو ہماری ناک کے بال جل جاتے ہیں اور سلام پھیرنے کے بعد چھیدنے والی نظروں کے تیروں سے یہ شخص چھلنی ہو جاتا ہے۔

ایسے حالات میں اولیٰ یہی ہے کہ ان فروعی مسالک میں جو فرضیت یا وجوب سے متعلق نہیں ہیں آدمی لچک سے کام لے اور خواہ مخواہ جھگڑا پیدا نہ کرے۔

جن بزرگوار کا آپ نے ذکر کیا ان کے اس عمل کو ہم دانشمندانہ قرار دیتے ہیں کہ انھوں نے حنفی امام کے پیچھے اپنے مسلک پر عمل نہیں کیا۔ لیکن ان کی جس ذہنی کیفیت کا آپ نے تذکرہ کیا ہے وہ قابلِ تعریف نہیں۔ اُدھیڑ بن چہ معنی دارد جب کہ رفع یدین اور آمین بالجہر کو فرض و واجب کوئی بھی ثابت نہیں کر سکتا۔ بہترین بات یہ ہوتی کہ وہ پورے سکونِ قلب اور خشوع سے نماز پوری کرتے۔ یہ حرکت و جنبش کی جسمانی ہیئتیں تو فقط جسم ہیں روح وہ خشوع و خضوع اور توجہ الی اللہ ہے جو نماز کو نماز بناتی ہے۔ جب معلوم ہے کہ احناف کا رفع یدین اور آمین بالجہر سے پرہیز بھی دلائلِ علمی ہی پر مبنی ہے اور قرآن و سنت سے گریز کا کوئی شائبہ اس میں نہیں تو ان بزرگ کو نہایت سکونِ قلب سے نماز پوری کرنی چاہئے تھی۔

جواب ۳:- یہ معاملات ایسے ہیں جن میں ہم بالکل کورے ہیں۔ علم ظاہری کے مصادر سے تو ہمیں پتہ نہیں چلا کہ کوئی شخص روحوں کو ـــ حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کی روحوں کو عمل کے ذریعے بلا سکتا ہے لیکن عملیات و وظائف کا بہرحال کچھ اثر ہے اور ارواح و اجنّہ کا معاملہ علم ظاہری سے تعلق نہیں رکھتا۔ لہٰذا کسی سرد و گرم چشیدہ عالم سے اس کی تحقیق کیجئے۔ ہم اپنی بے بضاعتی کا اعتراف کرتے ہیں۔

عامر عثمانی

بہشتی زیور مکمل و مدلل کون پڑھا لکھا آدمی ہے جس نے مولانا اشرف علیؒ کی اس بیش بہا اور مقبول ترین کتاب کا نام نہ سُنا ہوگا۔ ہر مسلمان گھر کے لئے ایک نعمت، عورتوں کا مشیر، مردوں کے لئے مستقل رہنما۔ اس کا عمدہ اور صاف ستھرا ایڈیشن ہم سے طلب فرمائیے۔ دو جلدوں میں مکمل۔ بارہ روپے۔ مجلد پندرہ روپے

نمازیں نماز اور اس کے متعلقات یعنی وضو، جماعت اور صحیح طریقہ نماز کی تفصیل، ضروری مسائل و ہدایات۔ بچوں اور بڑوں کے لئے مفید۔ چھ آنے۔

بزم پیغمبرؐ منتخب احادیث رسولؐ کا مجموعہ مفید ترجمہ و تشریح کے ساتھ۔ سوا روپیہ۔

اسلام تلوار سے نہیں پھیلا غیر مسلموں کی شہادتیں اور اعترافات ۷۵ پیسے

عمرو بن العاصؓ اس صحابی رسولؐ، فاتح مصر، تلوار کے دھنی اور بلند پایہ مدبّر کی داستان حیات۔ جسے خود اللہ کے رسولؐ نے مدبر اسلام کے خطاب سے نوازا۔ بیحد دلچسپ، اثر انگیز اور مستند۔ قیمت مجلد سوا دو روپے۔

فاران کا توحید نمبر سیکڑوں صفحات کا یہ نمبر ماضی قریب میں بڑی شہرت پا چکا ہے۔ اب پھر شائع کیا گیا ہے۔ بدعت و زندقہ کے رد اور سنت کے اثبات میں بے نظیر چیز ہے۔ چوٹی کے علماء کے مضامین سے مزین۔ ساڑھے چار روپے (مجلد چھ روپے) شائقین فوراً طلب کریں ورنہ پھر پہلے کی طرح ختم ہو جائے گا اور فرمائشیں بیکار کرنی پڑیں گی۔

باندیوں کا مسئلہ (اللہ الصمد) جہاد میں ہاتھ آئی ہوئی عورتوں کو باندی بنا کر رکھنے کی دینی و علمی حیثیت۔ کتاب میں مصنف کا ایک خط اور مولانا ابو الکلام آزاد کا جواب بھی شامل ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

خلاصہ اشرف السوانح مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حالات و سوانح۔ دو روپے۔

فارابی معلم ثانی حکیم ابو النصر فارابیؒ کے علم و فضل، اُن کی سوانح اور کمالات، تجدید فلسفہ و منطق کے مفصل و مکمل حالات۔ پونے دو روپے۔

محمد رسول اللہؐ مشہور مصری مصنف توفیق الحکیم کی کتاب کا عمدہ اردو ترجمہ۔ مکالمے کے انداز میں لکھی ہوئی حضورؐ کی سیرت مقدسہ بیحد دلچسپ اور پُرکیف۔ قیمت پانچ روپے۔

ابو بکر صدیقؓ مصنفہ:۔ محمد حسین ہیکل۔ مصری ترجمہ:۔ شیخ محمد احمد پانی پتی۔
قیمت پانچ روپے

عمر فاروق اعظمؓ مصنفہ:۔ محمد حسین ہیکل۔ مصری ترجمہ:۔ حبیب اشعر۔ نو روپے

اشرف الجواب مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طرف سے بعض سوالوں کے اہم جواب۔
مکمل دو حصے ساڑھے چار روپے۔

حیات انورؒ فخر المحدثین مولانا انور شاہ صاحبؒ کا مفصل تذکرہ۔ آپ کے علمی کمالات کا نقش جمیل
قیمت چار روپے

منہاج العابدین (اردو) امام غزالیؒ کی سب سے آخری تصنیف جو آپ کی پوری زندگی کی تعلیم کا خلاصہ اور تصوف کا نچوڑ ہے۔ مجلد آٹھ روپے۔

آئینہ نماز صرف نماز ہی کے نہیں بلکہ پانچوں ارکان اسلام کی تفصیل مع مسائل ضروریہ۔
قیمت ڈیڑھ روپیہ

حکیم الامتؒ کی مجلسیں مولانا اشرف علیؒ کی روح نواز مجالس کا پُرکیف تذکرہ۔
قیمت دو روپے

الفرقان شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کے ایک روح نواز رسالے کا اردو ترجمہ جس میں کرامت و بزرگی کی علامات اور ولایت کی حقیقت پر لاجواب گفتگو کی گئی ہے۔
قیمت مجلد مع حسین کور چار روپے

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

کھلا خط

سانپوں کی اقسام کا شمار شاید ممکن ہو لیکن ان فروعی اختلافات کا شمار ناممکن ہے جو شیطان نے امتِ مسلمہ کے درمیان ادھر سے اُدھر تک پھیلا دیئے ہیں۔ عوام بیچارے عوام ٹھیرے وہ کتنے ہی دھڑوں اور گروہوں میں بٹ جائیں لیکن اُن کی تفریق و انتشار کی ذمہ داری اُن خواص پر ہے جو اپنے آپ کو علماء کہتے اور سمجھتے ہیں۔ علم اگر سند یا داڑھی یا جبہ وعمامے کا نام ہے تو بے شک ہندو پاک میں اس جنس کی کوئی کمی نہیں لیکن اگر علم اُس نورِ باطن اُس عرفان ومعرفت اور اُس بصیرت وتنور کا نام ہے جو انسان کو حقائق کی سیر کراتا ہے تو کہنا چاہیئے کہ علماء کی جنس اب نایاب سے نایاب تر ہوتی جارہی ہے۔

بھلا اُس شخص کو عالم کون کہے گا جو لنگر لنگوٹ کس کر اس مسئلہ پر آمادۂ جنگ ہو جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ قبر حیاتِ دنیاوی ہے یا حیات برزخی۔ جو اس اختلاف پر مرنے مارنے کا تہیہ کرلے کہ حضورؐ حاضر و ناظر ہیں یا نہیں جو نوری اور بشری کے چکر میں اپنا اور دوسروں کا وقت برباد کرتا پھرے۔

بے شک بحث وتمحیص کا بھی ایک مقام ہے۔ فروعی مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کرتے رہنا دین سے تعلق کی علامت ہے اور یہ بات علماء کے فرائض میں داخل ہے کہ نوع بہ نوع مسائل میں عوام کی رہنمائی کرتے رہیں لیکن ہر چیز حدِ اعتدال سے گذر کر فتنہ بن جاتی ہے۔ اہم ترین مسائل سے منھ موڑ کر فروعی مسائل میں جھک مارتے رہنا اور علمی اختلافات کو جنگ و جدل کا رنگ دینا فتنۂ عظیم ہے۔ یہ فتنہ موجود تو ہندو پاک میں پہلے ہی سے ہے لیکن کچھ دنوں سے پاکستان میں اس نے وہ زور پکڑا ہے کہ الامان والحفیظ۔ مناظرے۔ چیلنج، مارپیٹ، حتّٰی کہ قتل و خونریزی بھی ذہنی بے راہ روی اور تاریک دماغی کی کوئی حد ہے کہ علماء حضورؐ کی حیاتِ قبر پر لڑتے ہیں۔ جبریلؑ اور ابوبکرؓ کی نسبت تفاضل پر لڑتے ہیں۔ آمین بالجہر اور رفع یدین پر لڑتے ہیں۔ حالانکہ انہیں یک جان ہو کر لڑنا چاہیئے تھا اُس مادہ پرستانہ تصورِ حیات سے جو ایک ہمہ گیر سیلاب کی صورت میں اسلام کی ایک ایک قدر اور ایک ایک بنیاد کو بہائے لیئے جارہا ہے۔ انھیں جنگ کرنی چاہیئے تھی اس طاغوتی اقتدار سے جو دن دہاڑے اسلام کی جڑوں پر کلہاڑا چلا رہا ہے وہ حقیقی دشمن کو نظر انداز کر کے آپس ہی میں دست وگریباں ہیں اور اس کا انجام شاید وہی ہوگا جو مصطفٰے کمال کے ترکی میں اسلام کا ہوا۔

ابھی کچھ ہی دن ہوئے پاکستان کی فضا میں اس لایعنی بحث نے بھونچال پیدا کر رکھا تھا کہ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات بعد الممات کیسی ہے دنیاوی یا برزخی؟ بڑے بڑے علماء واتقیاء میدان میں اترے ہوئے تھے۔ تحریر وتقریر کے موسلا دھار آبشار گر رہے تھے۔ ایسا ہی لگتا تھا جیسے یہ مسئلہ طے نہ ہوا تو زمین وآسمان اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے اور گردشِ دوراں رک جائے گی۔ شیطان مسرور تھا۔ مغرب پرستوں کے دلوں کی کلیاں کھلی ہوئی تھیں۔ اسی زمانے میں مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا جانا پاکستان ہوا اور آپ نے کوشش کی کہ یہ خواہ مخواہ کی جنگ بند ہو جائے۔ الحمد للہ کہ موصوف کی کوششیں خاصی موثر ثابت ہوئیں اور طوفان کی شدت کم ہوگئی۔

لیکن وقتی طور پر نزاع کا ہلکا پڑ جانا صلح کا ہم معنی نہیں۔ صلح دلوں کی وسعت اور جذبۂ رواداری سے جنم لیتی ہے ذہن و قلب تعصب سے لبریز ہوں تو کہاں کی صلح اور کیسا اتحاد۔ افسوس کہ جدل پیشہ علماء میں اب بھی اتحاد و اخوت کی کوئی نمود نہیں ہے اور عناد و افتراق کے جراثیم برابر پرورش پا رہے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ فقط اوپر کی لیپا پوتی سے پائدار اتحاد ہو بھی نہیں سکتا۔ پائدار اتحاد کے لئے ضروری ہے کہ کسی مشترک مقصد و منزل کا تصور ان کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو اور سب مل کر ایک ٹیم کی طرح اس کی طرف گامزن ہوں۔ یہ مشترک مقصد وہی ہو سکتا ہے جسے جماعت اسلامی نے روز اول سے اپنایا ہے اور اسی مقصد کی لگن امت مسلمہ کو ایک ہی سمت میں چلنے والے کارواں کی شکل دے سکتی ہے۔ یہ مقصد نیا نہیں۔ مولانا مودودی یا کسی اور داعی کا وضع کردہ نہیں۔ یہ تو وہی مقصد علیا ہے جس پر خالق کائنات نے انسانوں سے ازل کے دن عہد الست لیا تھا جس کی صدا وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ کے مقدس الفاظ میں گونج رہی ہے۔ جو تمام انبیاء اور رسل کا حاصلِ زندگی رہا ہے اور جسکے سوا کوئی مقصد امت مسلمہ کی نجات کا ضامن نہیں ہو سکتا۔

اس تمہید کے بعد "کھلا خط" ملاحظہ فرما لیا جائے۔ اس کا تعلق اگرچہ پاکستان سے لیکن دینی امور جغرافیائی حد بندیوں کے اسیر نہیں اس لئے خط بھیجنے والوں کی خواہش پر اسے شائع کیا جا رہا ہے۔

عامر عثمانی

بنام مولانا مفتی محمود صاحب و مولانا غوث ہزاروی ناظم جمعیت العلماء اسلام پاکستان

السلام علیکم و رحمۃ اللہ برکاتہ۔ کیا آپ حضرات سے اتنی بات دریافت کرنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں خاص طور پر پاکستان میں تفرقہ بازی اور گروہ بندی کی لعنت روز بروز کیوں جڑ پکڑتی جا رہی ہے۔ ہمیں افسوس ہے اس بات کا کہ اہل حق جنہیں دنیا کی قیادت کرنا تھی آج وہ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا فخر سمجھتے ہیں۔ آپ سے مخفی نہ ہوگا کہ پچھلے دنوں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند جب کہ پاکستان میں ماہ جون ۱۹۶۲ء تشریف لائے تھے تو مسئلہ حیات النبی پر مابین علماء دیوبند سمجھوتہ کرا گئے تھے جہاں تک مجھے علم ہے ان دونوں فریقین نے متفقہ طور پر رضامندی کا اظہار کیا تھا اور حضرت قاری صاحب بھی خوش ہو کر واپس دیوبند تشریف لے گئے تھے لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ فریقین علماء دیوبند بدستور اسی سابقہ ضد پر اڑے ہوئے ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے کو اپنے جلسوں میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں یہ کیوں ؟

جبکہ ایک بار سمجھوتہ ہو چکا ہے پھر اندرونی اختلاف رکھنے کا مقصد کیا ہے ؟ حالانکہ جمعیت العلماء اسلام کی طرف سے مندرجہ ذیل شہروں میں ماہ مارچ ۱۹۶۳ء کے مختلف تاریخوں میں سالانہ اجلاس منعقد کئے گئے تھے۔ جن میں فریق ثانی علماء کو شرکت کے لئے ہرگز ہرگز دعوت نہیں دی گئی ہے اور اب تک یہی حال ہے۔ یا یہ کہو کہ فریق ثانی علماء اہلسنت والجماعت سے خارج ہیں جب یہ بھی نہیں تو پھر اندھیرے میں تیر چلانے کا کیا فائدہ ؟ وہ مقامات ——— ذیل میں درج ہیں

(۱) خود جمعیت العلماء اسلام کا مرکزی مدرسہ قاسم العلوم ملتان (۲) مدرسہ اسلامیہ فاروقیہ کچہری روڈ۔ ملتان۔ (۳) جامع رشیدیہ منٹگمری (۴) تنظیم اہل سنت لاہور زیر صدارت مولانا محمد اجمل خان (۵) مدرسہ عربیہ نعمانیہ کمالیہ (۶) صدر الدین شاہ خان گڑھ خطیرہ۔

اگر معزز علماء حق حضرات کی یہی کیفیت رہی تو خدا معلوم اس قوم کا کیا حشر ہوگا جسکے علماء فروعی مسائل پر بُری طرح سے

الجھ رہے ہیں جب کہ موجودہ ملکی حالات قطعاً اس بات کی اجازت نہیں دیتے براہ نوازش ان باتوں کا جواب اپنی جمعیت العلماء اسلام کے جریدہ میں تفصیل عنایت فرمادیں۔

اراکین دار الحدیث محمدیہ رودجہاں
ضلع ڈیرہ غازیخان۔ مغربی پاکستان

دُرِ نجف

آنکھیں دُکھنے میں دُرِ نجف کا کردار!

بینائی کے تحفظ اور امراض چشم کے ازالے میں تو آپ دُرِ نجف کی اطمینان بخش تاثیر دیکھ ہی رہے ہیں۔ ایک اور بات نوٹ کیجئے:۔ آنکھیں دُکھنے آنے والی ہوں یا آچکی ہوں سوتے وقت دو دو سلائی سرمہ ڈالئے پھر آنکھیں بند کر کے انگلی کے ذریعے اپنا ہی لعاب دہن دونوں آنکھوں پر لگا لیجئے اس سے پپوٹوں پر نمی آجائے گی۔ اس کے بعد انگلی پر ذرا سا سرمہ لیکر پپوٹوں پر مل لیجئے اور سو جائیے۔ انشاء اللہ لگتے ہی روز حیرتناک فائدہ پائیں گے۔ اس لیپ کی نوبت شاید ہی دو تین راتوں سے زیادہ آئے

طلب کرنے پر خالص جستی کیمیائی سلائی بھی بھیجی جاتی ہے جس کی قیمت صرف دو آنے ہے

دار الفیض رحمانی دیوبند

ماہنامہ تجلی دیوبند

ایڈیٹر۔ عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

62 NP.

سنکارا
ایک تغذیہ بخش اور وٹامنوں سے بھرپور ٹانک، جس میں
متعدد ایسی جڑی بوٹیاں شامل ہیں جن کی دوائی افادیت
مدت دراز سے تسلیم کی جاتی ہے۔ سنکارا کھوئی ہوئی
طاقت کو بڑی جلدی بحال کر دیتا ہے۔
ہمدرد
دہلی ، کانپور ، پٹنہ
صافی
نظامِ عصبی کے فعل
کو درست کرتی ہے
خون کو صاف کرتی
ہے اور شفاف خون
پیدا کر کے چہرے پر
تازگی لاتی ہے۔
SAFI
دہلی ـ کانپور ـ پٹنہ
10 AUG
DELHI

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تجلّی

شمارہ نمبر ۶

جلد نمبر ۱۵

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

سالانہ قیمت سات روپے فی پرچہ ۶۲ پیسے

غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۱۰ شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پوسٹل آرڈر پر کچھ نہ لکھیے بالکل سادہ رکھیے

اشد ضروری

اگر اس دائرے میں سُرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس پر آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی۔پی کی اجازت دیں۔ اگر آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا وی پی سات روپے باسٹھ نئے پیسے کا ہوگا، منی آرڈر بھیج کر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

پاکستانی حضرات

ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیج کر رسید منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتہ ہمیں بھیجدیں سالہ جاری ہو جائے گا۔

فہرست مضامین مطابق ماہ اگست ۱۹۶۳ء

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

دفتر تجلّی۔ دیوبند ضلع سہارنپور یو۔پی

پاکستانی حضرات:۔ نیچے لکھے ہوئے پتے پر منی آرڈر بھیجکر وہ رسید ہمیں بھیجدیں جو منی آرڈر کرتے وقت ڈاکخانہ سے ملتی ہے۔

مکتبہ عثمانیہ۔ مینا بازار ۸۰-۲۲

پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی (پاکستان)

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے "نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند" سے چھپوا کر اپنے دفتر تجلّی دیوبند سے شائع کیا۔

آغازِ سخن

"قومیت" کا مسئلہ

راولپنڈی (پاکستان)
۷ر جولائی ۱۹۶۳ء۔

مکرمی و محترمی جناب مولانا عامر عثمانی صاحب
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ صاحب "میثاق" لاہور ماہ جون ۱۹۶۳ء کی اشاعت صفحہ ۶ اور ۷ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"جمال عبدالناصر کے نعرۂ قومیت کا ذکر آگیا ہے تو اسکے متعلق بھی ہم چند باتیں ظاہر کردینا ضروری سمجھتے ہیں ہمارے نزدیک یہ قومیت کا نعرہ ہے تو ایک غیر اسلامی نعرہ۔ ایک مسلمان حکمراں کی حیثیت سے جمال عبدالناصر کے شایانِ شان بات یہی تھی کہ وہ اسلامی اتحاد کی دعوت بلند کرتے۔ یہی اُن کے ایمان کا تقاضا تھا اور اسی میں اُن کے لئے۔ قوم عرب کے لئے۔ تمام مسلمانوں کے لئے بلکہ تمام بنی نوعِ انسان کے لئے حقیقی خیر و برکت تھی۔ لیکن اس نعرہ کے لئے اِس سے کہیں زیادہ بلند عزم و ہمت کی ضرورت ہے جو جمال عبدالناصر کے اندر موجود ہے۔ وہ عرب کے موجودہ حالات میں اسرائیل اور سامراجی طاقتوں کی چیرہ دستیوں کے مقابلے کے لئے عرب قومیت کو تو جگا سکتے ہیں لیکن اسلامی روح کو بیدار کرنا اُن کے بس کا کام نہیں ہے۔ تاہم یہ خیال بالکل غلط ہے کہ عرب قومیت کا یہ نعرہ کسی درجے میں بھی اسلام یا مسلمانوں کے ملی اتحاد کے خلاف ہے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہونا تو الگ رہا اس کا مزاج دوسری اقوام کے خلاف جارحانہ بھی کسی درجے میں نہیں ہے۔ جمال عبدالناصر اِس قومیت کے ذریعے سے نہ تو مصر کے فرعون اور مکہ کے ابوجہل کو زندہ کرنا چاہتے ہیں نہ کسی قوم یا علاقہ پر فتح و تسخیر کی کمند پھینکنا چاہتے۔ وہ جو کچھ چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ پوری قوم عرب کے سینہ پر اسرائیل کو جو مسلط کر دیا گیا ہے اس کے عذاب سے اور سامراجی سازشوں کے فتنوں سے عرب قوم کو بچائیں۔ یہ فیصلہ تو مستقبل کریگا کہ وہ اپنے اس مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں لیکن یہ مقصد نہایت عظیم۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مقدم شے یہی ہے کہ پوری قوم ایک جھنڈے کے نیچے آجائے۔ اس کے بغیر اس میں شبہ نہیں ہے کہ عرب قوم کا مستقبل نہایت تاریک ہے۔ خدا کرے کہ یہ قوم اپنی زندگی اور موت کے اس مسئلہ کو سمجھ جائے اور جس خانہ جنگی کی حالت میں اِس کو سامراجیوں اور ان کے ایجنٹوں نے اس وقت مبتلا کر دیا ہے۔ ایک مرتبہ اس سے نکل کر وہ پھر دُنیا کو اپنے اتحاد اور اپنی سطوت کا تماشا دکھا سکے"

مندرجہ بالا اقتباس کو پڑھ کر ذہن ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ قومیت کا یہ نعرہ ایک غیر اسلامی نعرہ بھی ہے۔ اور ایک مسلمان کے شایانِ شان اور اُس کے ایمان کا تقاضا بھی یہ ہے کہ وہ اسلامی اتحاد کی دعوت بلند کرے۔ لیکن یہ عرب قومیت کا نعرہ کسی درجے میں، اسلام یا مسلمانوں کی ملی اتحاد کے خلاف بھی نہیں۔ کیا جو چیز غیر اسلامی ہے۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کے ملی اتحاد کے لئے کسی درجے میں مفید بھی ہو سکتی؟ اگر اس عرب قومیت کے نعرے کے پردے

[illegible] فرعون کو نہیں زندہ کرنا چاہتے۔ تو [illegible] کے [illegible] سے ایشن کے سامنے (جیسا کہ عام روایت ہے) [illegible] مقصد کے لئے نصب کر دیا گیا ہے۔ کیا صاحب [illegible] کے علم میں یہ بات نہیں آئی۔ کیا اُن کے علم میں یہ بات نہیں آئی کہ فراعنۂ مصر کو مصر میں زور شور سے قومی ہیرو تسلیم کیا جا رہا ہے اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں فراعنۂ مصر کے گیت گائے جا رہے ہیں۔ اِس عصبیتِ جاہلیہ کے باوجود جو مصر میں آج کل جمال عبد الناصر کے ذریعہ سے پروان چڑھ رہی ہے۔ یہ ارشاد کہاں تک صحیح ہے کہ جمال عبد الناصر مصر کے فرعون اور مکّہ کے ابو جہل کو زندہ نہیں کرنا چاہتے اور پھر یہ سوال بھی حل طلب ہے کہ کیا ایک مسلمان کے لئے یہ درست ہے کہ اگر وہ اپنے اندر بلند عزم و ہمت کو موجود نہیں پاتا تو وہ اسلام کی صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر جاہلیت کے راستے کو منتخب کر لے؟

از راہِ کرم محولہ بالا اقتباس کے متعلق "تجلّی" میں اپنے مفصّل خیالات سے مستفید فرمائیں۔ تاکہ میری اور میری طرح سوچنے والوں کی الجھنیں دُور ہو سکیں۔

اُمید ہے کہ آپ ماہِ اگست کے "تجلّی" میں ضرور اپنے خیالات سے استفادہ کا موقع دیں گے۔ فقط والسلام

احقر شیخ اللہ دتا۔ راولپنڈی (پاکستان)

تجلّی

عجیب بات ہے کہ جو استفسار آپ کو صاحبِ میثاق سے کرنا چاہیے تھا وہ ہم سے کر رہے ہیں اور محترم صاحبِ میثاق کے جس طُرفہ تضاد کو آپ نے خود پوری طرح محسوس کر لیا ہے اس کی تفصیل ہم سے چاہتے ہیں۔ غالباً آپ تجلّی کافی دنوں سے پڑھ رہے ہوں گے۔ اگر ایسا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ چیستاں بنانے کا فن ہمیں نہیں آتا۔ دو اور دو چار کی طرح بات کہنا ہماری عادت ہے اور چاہے ہمیں کتنا ہی طول اختیار کرنا پڑے کوئی پہیلی ہم تجلّی میں قارئین کے بجھانے کے لئے نہیں چھوڑتے۔ پھر بھلا ہم دوسروں کی پہیلیاں کیا بوجھ سکیں گے۔ صاحبِ میثاق نے جو کچھ کہا وہ فی الحقیقت کوئی ٹھوس فکری بنیاد نہیں رکھتا بلکہ ایک ایسے ذہن کا آمدہ ہے جس کے تانے بانے میں تحت الشعوری عناد اور عصبیت کی نفسیاتی گرہیں پڑی ہوئی ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل آسان نہیں۔ اس کے لئے ہمیں کافی طول اختیار کرنا ہوگا گو کہ مصر و عرب کی سیاست ایسا موضوع نہیں جس پر زیادہ جگہ اور وقت صرف کرنے میں عملاً کوئی خاص افادیت ہو، لیکن دو وجوہ سے ایسا کرنا ضروری بھی ہے۔ اوّلاً یوں کہ منصفانہ تنقید کا حق تفصیل میں جائے بغیر ادا ہونا مشکل ہے۔ ثانیاً یوں کہ جس نوع کی الجھن پر مشتمل شیخ اللہ دتا صاحب کا منقولہ بالا مکتوب ہے، اسی طرح کی الجھن پر مشتمل ایک خط کا مفصّل جواب مولانا اصلاحی نے جولائی ۶۳ء کے میثاق میں بھی دیا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس خط اور جواب خط کو جماعت اسلامی ہند کے آرگن "دعوت" نے بھی اپنی ۲۵ جولائی ۶۳ء کی اشاعت میں اس تائیدی فقرے کے ساتھ نقل کر لیا ہے کہ:۔

"متوازن نقطۂ نظر اپنانے کی ضرورت"

گویا ادارۂ دعوت مولانا اصلاحی کے ارشادات کی تحسین و تحمید میں کافی مستعد نکلا۔ ہم تسلی بخش تفصیل اور دلائل و شواہد کے ساتھ یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ نہ تو مولانا اصلاحی اپنی تضاد بیانی اور غیر منطقی فکر کی ژولیدگی پر متنبہ ہو سکے ہیں نہ ادارۂ دعوت سطح سے نیچے جانے کی توفیق پا سکا ہے۔ عام لوگ خوبصورت الفاظ اور دلکش حرفوں کی الٹ پھیر سے دھوکا کھا جائیں تو انہیں معذور سمجھا جا سکتا ہے لیکن جماعت اسلامی ہند جیسی ثقہ، بالغ نظر اور اصول پسند جماعت کا آرگن بھی محض سطح بیں اور سادہ لوح بنکر رہ جائے یہ حادثہ [illegible] کم نہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہم میثاق سے وہ [illegible] سوال جواب نقل کرتے ہیں جس کا ابھی ذکر کیا [illegible] کی الجھن شیخ اللہ دتا صاحب کے مکتوب میں [illegible] ہی الجھن اس خط میں بھی ہے جس کا جواب [illegible] اصلاحی نے

دیا ہے۔ اس طرح یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ شیخ صاحب اگر بیمار ہی بجائے یہ خط مولانا اصلاحی کو بھیجتے تو ان کا جواب کیا ہوتا۔

سوال

آپ نے مئی کے پرچہ میں عرب کی سیاسی کشمکش پر جو نوٹ لکھا ہے وہ بہت خوب ہے۔ آپ نے حالات کا جو تجزیہ پیش کیا ہے اس سے وہ بہت سے شبہات بالکل صاف ہو گئے ہیں جو جمال عبد الناصر کے خلاف اس وقت عرب اور دوسرے مسلمان ملکوں میں پھیلائے جا رہے ہیں لیکن بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قومیت کا نعرہ اسلام کے خلاف ہے اس وجہ سے یہ نعرہ بلند کر کے جمال عبد الناصر ایک فتنہ کو جگا رہے ہیں جس سے مسلمانوں کے ملی اتحاد کو نقصان پہنچے گا۔ یہ بات تو آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ نعرہ اسلام کے خلاف ہے لیکن چونکہ آپ اس کی زد اسلام اور مسلمانوں پر نہیں سمجھتے بلکہ حکومتِ اسرائیل اور سامراجیوں پر سمجھتے ہیں اس وجہ سے آپ نے جمال عبد الناصر کے موقف کی تائید کی ہے۔ لیکن جو چیز اسلام کے خلاف ہے اور جس سے جاہلی نعروں کو تقویت حاصل ہونے کا اندیشہ ہے کیا یہ صحیح ہوگا کہ اس کو فروغ پانے کا موقع دیا جائے میں یہ بات بطور اعتراض نہیں پیش کر رہا ہوں بلکہ اپنے ایک شبہ کا ازالہ چاہتا ہوں۔

جواب

یہ بات صحیح نہیں ہے کہ قومیت کا شعور یا اظہار بجائے خود کوئی ایسی چیز ہے جس کے لئے اسلام میں سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ قومیت کے بھی کچھ جائز اور فطری حقوق ہیں جن کو اسلام نے تسلیم کیا ہے اور ان کے احترام کی تاکید کی ہے بلکہ ان کو اپنے مقاصد میں شامل کر لیا ہے۔ اس عنوان پر میرا ایک مفصل مضمون میثاق کی پچھلی اشاعتوں میں نکل چکا ہے۔ اس کو پڑھ لیجئے اس سے بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں گی۔ قومیت میں فساد اس وقت شامل ہوتا ہے جب یہ بجائے خود حق و باطل کی کسوٹی بن جائے اور اس کا تعصب یہ جارحانہ اور کافرانہ روپ دھار لے کہ "میری قوم خواہ حق پر ہو یا باطل پر" کسی قوم کا اپنے فطری حقوق کے تحفظ کے لئے بیدار اور منظم ہونا یا اس مقصد کے لئے اس کو منظم ہونے کی دعوت دینا نہ کفر ہے نہ نعرۂ جاہلیت۔ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ بالکل بے سوچے سمجھے ایسا سمجھتے ہیں۔

اگر عرب ترکوں کے خلاف یا ترک عربوں کے خلاف مصری شامیوں کے خلاف یا شامی مصریوں کے خلاف، افغانی پاکستانیوں کے خلاف یا پاکستانی افغانیوں کے خلاف، مجرد اپنی عربیت یا ترکیت یا مصریت یا شامیت یا افغانیت یا پاکستانیت کے زعم میں نعرہ لگائیں اور اپنی قومیت ہی کو اپنے برحق ہونے کی دلیل ٹھیرالیں اور کسی بالاتر اصول حق و عدل کو یا اسلام کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو بلاشبہ ان کی قومیت خلافِ اسلام اور ان کا نعرہ، جاہلیت کا نعرہ ہے لیکن اگر ان کے اندر اپنے کسی جائز حق کی مدافعت کے لئے شعورِ قومیت ابھرے تو یہ اسی طرح جائز بلکہ ثواب ہے جس طرح کسی خاندان کے لوگ اپنے ناموس کی حفاظت کے لئے کسی حملہ آور کے مقابل میں ایک مشترک جذبہ کے ساتھ اُٹھتے ہیں۔

اگر جمال عبد الناصر آج عربی قومیت کا صُور اسی مقصد سے پھونکتے جس مقصد سے ایک زمانہ میں ترکوں کو مصر و حجاز سے بے دخل کرنے کے لئے انھی سامراجیوں نے مصر و حجاز اور شام میں پھونکا تھا۔ تب تو بلا شبہ وہ قابلِ ملامت تھے، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ اس وقت یہ صورت حال نہیں ہے۔ جمال عبد الناصر عربوں کو ترکوں یا افغانیوں یا پاکستانیوں کے خلاف نہیں منظم کر رہے ہیں بلکہ اسرائیل اور سامراجیوں کے خلاف منظم کر رہے ہیں ان کے پیش نظر اسلام یا مسلمانوں کی مخالفت نہیں بلکہ عرب قوم کی مدافعت ہے وہ چاہتے ہیں کہ کسی پر حملہ [illegible] کرنا چاہتے [illegible] بن کر ایک عظیم خطرہ کے مقابل [illegible] کرنا چاہتے ہیں۔

اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس مقصد کے لئے بھی ہمیں اسلامی اتحاد کی دعوت ہی کو ذریعہ بنانا چاہئیے تھا تو یہ بات کہنے کے لئے تو بالکل ٹھیک ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ موجودہ حالات میں کسی متحدہ اسلامی بلاک کی تنظیم کی راہ میں کتنی ناقابل عبور مشکلات ہیں۔ جب صرف عرب کے متحد ہونے میں سامراجیوں نے اتنے اڑنگے ڈال رکھے ہیں تو پورے عالم اسلامی کے اتحاد کو وہ بھلا کب ممکن ہونے دیں گے جب کہ عالم اسلامی میں سے ایک ایک ملک کی شہ رگ انھی کے ہاتھ میں ہے۔ ایسے حالات میں جمال عبد الناصر نے اگر اپنے کام کو عرب ہی تک محدود رکھا تو انھوں نے بڑی حقیقت پسندی کا ثبوت دیا اور اپنی طاقت و صلاحیت کا انھوں نے صحیح اندازہ کیا۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسرائیل کی صورت میں جو مصیبت نازل ہوئی ہے وہ براہ راست عرب ہی پر نازل ہوئی ہے۔ اس کا احساس جتنا ان کو ہو سکتا ہے ہم کو اور آپکو نہیں ہو سکتا۔ ہم اور آپ تو زیادہ سے زیادہ کچھ زبانی ہمدردی کا اظہار کر سکتے ہیں لیکن ان کے لئے تو یہ موت اور زندگی کا مسئلہ ہے اس وجہ سے عرب میں اگر کچھ رمق باقی ہے تو توقع یہی ہے کہ وہ اس خطرۂ عظیم کے مقابل میں متحد ہو جائے گا۔ ورنہ تقدیر کے نوشتہ کو کون مٹا سکتا ہے!

آج جمال عبد الناصر پر فرعونیت کے احیاء کا الزام جو دھرا جا رہا ہے یہ سب سامراجیوں کا پروپگنڈا ہے۔ پہلے انھوں نے ترکوں کو زک دینے کے لئے قومیت کا یہی افسوں عربوں مصریوں کو پڑھایا اور اب جب اسکی زد خود ان پر پڑی ہے تو یہ اسلامیت کے علم بردار بن گئے ہیں۔ جو لوگ بلا تحقیق اس قسم کی باتیں آج پھیلا رہے ہیں میرے نزدیک وہ اسلام کی نہیں بلکہ بالواسطہ اسرائیل کی خدمت کر رہے ہیں، لیکن ان لوگوں کو اس کا شعور نہیں ہے۔ میں جمال عبد الناصر کی اسلامیت کی وکالت نہیں کر رہا ہوں۔ میں ان کو اسی قسم کا مسلمان حکمراں سمجھتا ہوں جس قسم کے ہمارے اور آپ کے حکمراں ہیں۔ مغربیت جس طرح سب کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے ان کی گھٹی میں بھی پڑی ہوئی ہے۔ آمر مزاج ہونے کی وجہ سے ان سے بعض شدید قسم کی غلطیاں بھی صادر ہوئی ہیں لیکن یہ بالکل ہی لایعنی بات ہے کہ وہ فرعونی تہذیب کے احیاء کے علمبردار ہیں۔ اگر وہ فرعونی تہذیب کے علمبردار ہیں تو ان سے زیادہ نادان کوئی بھی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ اس نعرہ کے ساتھ ان کے اتحاد عرب کا خواب کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ وہ مذہب کے تقاضوں کو سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں لیکن اپنی سیاست کے تقاضوں کو تو اچھی طرح سمجھتے ہیں نا؟ جو شخص عدن سے لیکر الجزائر اور مراکش تک کی وحدت کا خواب دیکھ رہا ہو وہ چاہے موسیٰؑ اور محمدؐ کا نام لے یا نہ لے لیکن فرعون کا نام لے کر اپنے ایک حوصلہ مندانہ خواب کو خواب پریشاں بنانے کی حماقت تو بہرحال نہیں کرے گا۔

ترکوں کے خلاف جب مصر وغیرہ میں نسلی قومیت کی تحریک ابھری تھی تو بلاشبہ اس کا مزاج یہی تھا کہ "مصر مصریوں کے لئے ہے" اور فراعنہ ہمارے بڑے تھے ہیں"۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قومیت کا مزاج بنانے میں عیسائی ادیبوں اور قبطی مفکروں کو بڑا دخل تھا۔ ان کے لٹریچر اور ان کے افکار سے متأثر نیشلسٹ قسم کے مسلمان بھی اسی قسم کی بولیاں بولنے لگے تھے لیکن یہ زمانہ ماضی کی باتیں ہیں اس قسم کی باتوں کی ذمہ داری آج جمال عبد الناصر پر ڈالنا ہمارے نزدیک انصاف کے خلاف ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ آج جمال عبد الناصر قومیت کے اس تنگ تصور کے ساتھ اتحاد عرب کی راہ میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ سامراجیوں کو پروپگنڈے میں مہارت کی داد دینی پڑتی ہے کہ اسی قومیت کو ایک زمانہ میں تو اسب بنا کر انھوں نے ترکوں کا عرب ممالک سے جنازہ اٹھوا دیا اور آج اس کو کفر بنا کر جمال عبد الناصر کی گردن مرزا دینے کے درپے ہیں تاکہ اسرائیل کا جو خنجر انھوں نے امت محمدؐ کے سینے میں پیوست کیا ہے اس وقت

تک پیوست ہی رہے جب تک عرب قوم کی جان نہ نکل جائے۔ پھر داد دیجئے ان خوش قسمتوں کی خوش قسمتی پر کہ اس پروپگنڈے میں تعاون کے لئے ہمارے اندر ہی سے ان کو ہر قسم کے آدمی ہاتھ آگئے ہیں۔

مراسلہ و مذاکرہ ۔ امین احسن اصلاحی

تجلی | جو شخص تدبر نہ کرے یا تدبر کا اہل ہی نہ ہو وہ تو مولانا اصلاحی کے اس خوش رنگ جواب سے نہ صرف مطمئن ہو سکتا ہے بلکہ داد و تحسین کے ڈونگرے بھی برسا سکتا ہے، لیکن جو شخص جذبۂ عدل اور علم و تحقیق کے پورے ارتکاز کیساتھ اس جواب کو پڑھے گا وہ اس کے سوا کسی نتیجے پر نہیں پہنچے گا کہ مولانا فقط الفاظ کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ آپنے دیکھا انھوں نے اپنے اس سلسلہ کے مفصل مضمون کے لئے میثاق بابت جون و جولائی ۶۲ء کا حوالہ دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اسے پڑھ لیجئے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔ ہم نہایت تعجب کے ساتھ عرض کریں گے کہ اس محولہ مضمون کو پڑھنے کے بعد ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑا ہے کہ یا تو نفسیاتی پیچیدگی کے باعث مولانا خود اپنی ہی تحریروں کے مطالب و مضمرات سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں رہے ہیں یا پھر وہ سبھی قارئین کو فہم و ذکا سے اتنا محروم خیال کرتے ہیں کہ وہ ان کے خیالات کے تضاد و انتشار کا ادراک نہیں کر سکیں گے۔ حقیقت جو کچھ بھی ہو ہم اگلی اشاعت میں ان کا ۶۲ء والا مضمون نقل کر کے دکھلائیں گے کہ یہ مضمون بجائے غلط فہمیاں رفع کرنے کے نہایت واضح طور پر ان کے موجودہ جواب کی تردید و تغلیط کرتا ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ ۶۲ء میں انھوں نے جو کچھ کہا تھا وہ تو واقعتہً فکرِ صحیح کا نقش لطیف تھا اور اب جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ ایک ایسے نادرست اور ژولیدہ فکر کا آوردہ ہے جس کے زاوئیے فاسد تعصبات نے کج کر دئیے ہیں۔ دعویٰ بلا دلیل ہماری عادت نہیں۔ وہ مضمون انشاء اللہ اگلے ماہ تجلی کے صفحات میں نقل ہوگا فی الحال ہم صرف منقولہ بالا جواب کے بعض مطالب پر گفتگو کرتے ہیں۔ وباللہ التوفیق۔

سب سے پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ فضیلت مآب جناب جمال عبدالناصر کے تصورِ قومیت کے تمام معنوی گوشوں کا علم و ادراک اور ان کے عزائم و مقاصد اور جذبہ و نیت کے جغرافیے کا علم مولانا اصلاحی کو آخر کن ذرائع سے ہوا جو وہ اتنی قطعیت کے ساتھ ان کی وکالت کر رہے ہیں وکالت اس سے بڑھ کر کیا ہو گی کہ مصر و حجاز کے دورہ کرنے والے متعدد فضلاء اور ملک ملک کے بے شمار اخبارات نے جو اطلاعیں دی ہے پیش کی ہیں مولانا اصلاحی ان سب کو نہایت وثوق کے ساتھ سامراجیوں کا پروپیگنڈہ قرار دے رہے ہیں اور وہ لوگ ان کی نظر میں سمجھ بوجھ سے بے بہرہ اور فریب خوردہ ہیں جنھوں نے مصری نعرۂ قومیت کو اس کی آخری تہہ تک دیکھنے کے بعد اس سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔

جہاں تک ہمیں علم ہے مولانا اصلاحی مصر تشریف نہیں لے گئے۔ ویسے جاتے بھی تو ہر ہوشمند جانتا ہے کہ مجرد جانے اور چند دن یا چند ہفتے کسی دوسرے ملک میں قیام فرمانے سے پوست کندہ حقائق کا علم کم ہی کسی کو ہو سکتا ہے۔ کیا حال ہی کی یہ نظیر موجود نہیں کہ بعض حضرات روس کی دعوت پر روس تشریف لے گئے اور وہاں انھیں اسلام دشمنی کی بجائے اسلام نوازی اور رواداری کے مناظر نظر آئے اور پھر اپنے وطن لوٹ کر ان سادہ لوحوں نے بچوں کی طرح روس کی شان میں قصیدہ پڑھ دیا۔

مولانا اصلاحی اگر مصر تشریف لے گئے ہوتے اور یہ باور کرنے کے لئے کوئی قرینہ موجود ہوتا کہ جمال عبدالناصر صاحب کے دل و دماغ اور روح کے نہاں خانے میں انھیں جھانکنے کا موقع نصیب ہوا ہے اور نعرۂ قومیت کے طول و عرض، اثرات و ثمرات اور سمت و رُخ کا مطالعہ کرنے کے لئے انھیں بے لاگ مطالعے کا چانس میسر آیا ہے تب تو عبدالناصر کی طرف سے ان کی صفائی اور مصری تحریکِ قومیت کی ترجمانی کوئی وزن رکھتی بھی، لیکن گھر بیٹھ کر محض تخیل اور مشق تحریر کی مدد سے کاغذی خاکے بنانا اور بے دلیل فیصلے کر کے حقائق کو پروپیگنڈہ قرار دینا سنجیدگی کے دائرے میں

نہیں آتا۔

مولانا کے پیش نظر جواب کو پڑھنے والا ایک سادہ لوح آدمی اس کے سوا کیا سمجھے گا کہ قوم پرستی محض ایک سادہ سی چیز ہے جو فقط نیت اور ارادے کی تبدیلی سے اپنی حیثیت بدل دیتی ہے۔ نیت میں کچھ فساد ہے تو قوم پرستی مذموم لیکن نیت ذرا صاف ہے تو قوم پرستی کار ثواب۔

حالانکہ اس مضحکہ خیز اور سراپا فریب تاثر کی لغویت ہر آنکھ والے پر ظاہر ہے اور خود مولانا ہی نے اپنے ۶۰ء والے مضمون میں بڑے شدومد اور تفصیل کے ساتھ اسکی لغویت کو محقق کیا ہے۔ قوم پرستی ماضی میں فقط ایک سادہ سا نظریہ رہی ہوگی تو رہی ہوگی لیکن جیساکہ مولانا نے تین سال پہلے کے مضمون میں منقح فرمایا ہے اب یہ ایک سادہ نظریہ نہیں باقاعدہ ازم ہے۔ ایک ذیل درذیل قسم کا مسلک ہے۔ گوناگوں مفردات سے ترکیب پایا ہوا معجون ہے۔ اسکی رگ رگ میں بعض ایسے عناصر لہو بنکر دوڑ رہے ہیں جنھیں کسی طرح بھی اس سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ فقط مقصد اور نیت کی تبدیلی کی بنیاد پر یہ دعویٰ کرنا کہ آج کی "قوم پرستی" عبادت بن سکتی ہے ایسا ہی ہے جیسے آپ یوں کہیں کہ نکولی کو انگور سمجھ کر نوش کرنے سے نکولی کی تلخی شیرینی میں بدل سکتی ہے اور اس سے وہی اثرات و فوائد حاصل ہو سکتے ہیں جو انگور سے حاصل ہوتے ہیں۔

مولانا اصلاحی تین سال قبل بجا طور پر مصرح فرما چکے ہیں کہ آج کی قوم پرستی ویسی معصوم و سادہ نہیں جیسی ازمنۂ گذشتہ کی قوم پرستی ہوا کرتی تھی۔ آج کی قوم پرستی تو نقائص و مفاسد کا ایک پلندہ ہے اور یہ نقائص و مفاسد ایسے نہیں ہیں کہ جس کا جی چاہے انھیں ٹوپی کی طرح اُتار کر الگ رکھدے بلکہ وہ تو اس نظریے کے خمیر اور فطرت میں داخل کر دیئے گئے ہیں۔

لیکن آج مولانا یہ سب بھول کر "قوم پرستی" کو فقط تلوار جیسی ایک سادہ چیز باور کرا رہے ہیں جو بجائے خود نجس نہیں بلکہ اس کی نجاست غلط استعمال پر منحصر ہے اور استعمال اگر صحیح محل میں ہو تو اسے بجا طور پر طاہر و مطہر قرار دیا جاسکتا ہے۔ آپ دیکھئے انھوں نے اپنے جواب میں سارا زور ناصر صاحب کے حسنِ نیت اور مقصد کی پاکیزگی پر دیا ہے۔ گویا مقصد و نیت کی پاکیزگی کا یقین دلانے کے بعد وہ سمجھ رہے ہیں کہ جمال ناصر کے نام نہاد "نعرۂ قومیت" پر اب کسی ایراد و اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہی حالانکہ اپنے تین سال پہلے کے مضمون میں — جو اگلے تجلی میں نقل کیا جائے گا وہ کھل کر بتا چکے ہیں کہ عصر حاضر کا نظریۂ قومیت اپنے مزاج اور فطرت ہی میں تنگ نظری، حسد، جارحیت، ہٹ دھرمی اور اسی نوع کے گوناگوں مفاسد کو اس طرح سمیٹے ہوئے ہے کہ جو بھی فرد یا گروہ اس نظریہ کو اختیار کرے گا وہ ان مفاسد کی داروگیر اور لپیٹ سے بچ کر نہیں جاسکتا۔

اگر بات اتنی ہی سی تھی کہ:۔

"قومیت میں فساد اس وقت شامل ہوتا ہے جبکہ
بجائے خود حق و باطل کی کسوٹی بن جائے اور اس کا تعصب
یہ جارحانہ اور کافرانہ روپ دھارلے کہ "میری قوم
خواہ حق پر ہو یا باطل پر —"

تو پھر تین سال پہلے یہ دردسری اُٹھانے کی کیا ضرورت تھی کہ تفصیل کے ساتھ نظریۂ قومیت کے مفاسد زیب قرطاس فرمائیں اور یہ تاکید بھی ساتھ ساتھ کرتے جائیں کہ یہ مفاسد نظریۂ قومیت کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے ہیں۔ یہ اسکے مزاج کا جزوِ لاینفک ہیں۔ انھیں الگ کرکے نظریہ قومیت کو اختیار کرنا عملاً محال ہے۔

مزید لطف یہ کہ قسط اول میں مولانا نے نسلی قومیت کے کچھ بدترین مفاسد گنوائے۔ پھر دوسری قسط میں "وطنی قومیت" پر گفتگو کرتے ہوئے آغاز ہی میں فرمایا کہ:۔

"وطنی قومیت کے اندر مذکورہ بالا مفاسد کے علاوہ
کچھ مزید مفاسد بھی ہیں —"

اب کیا ہمارے یہ عرض کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ جمال ناصر کا اختیار فرمودہ نظریۂ قومیت فقط نسلی ہی نہیں ہے بلکہ وطنی بھی ہے۔ وطنی بھی کیا معنے وہ تو اصلاً

وطنی ہی ہے۔ پھر بھی آج مولانا یہ باور کرا رہے ہیں کہ نظریۂ قومیت میں فساد بس اس وقت شامل ہوتا ہے جب ٹھیٹ کافرانہ روپ دھار لے! — یہ سادہ لوحی یا پھر مغالطہ اندوزی کی بڑی شاندار مثال ہے۔

اور یہ بھی نہ بھولئے کہ ابھی تک ہم نے اُس حسن ظن سے تعرض نہیں کیا جو مولانا نے جمال ناصر کی ذات سے وابستہ کیا ہے۔ اس حسن ظن کو قرین عقل مان کر بھی بات وہ نہیں بنتی جو مولانا بنانا چاہتے ہیں لیکن اگر ہم جمال ناصر کے اسوۂ و کردار پر نظر کریں، ان کے اُس اعمالنامے کو دیکھیں جو شاہ فاروق کے بعد سے اب تک منصۂ شہود پر آیا ہے اور انکے دل و دماغ کی شدید مغرب زدگی کو سامنے رکھیں تو پھر کسی ادنیٰ سے حسن ظن کی بھی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ مانا ان میں کچھ خوبیاں بھی ہیں، وہ اپنے بعض کارناموں کے لئے — بشرطیکہ ان کارناموں کا انتساب ان کی طرف درست ہو — لائق تعریف بھی ہیں، لیکن خوبیاں تو ابوجہل اور ابولہب میں بھی تھیں۔ خوبیاں اُن پاکستانی حکمرانوں میں بھی ہیں جو پاکستان کو قرآن و سنت والے اسلام کا مدفن بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ خوبیاں ہمارے ہندوستانی حاکموں میں بھی ہیں جو سیکولرازم کے حقیقی تقاضوں کو پامال کرنے میں کسی رستم سے کم نہیں لیکن سوال تو ان خوبیوں کا ہے جنھیں خود اسلام نے معروف اور محاسن کے خانے میں درج کیا ہے۔ جمال ناصر ایسی کسی خوبی کے حامل ہوتے جسے اسلام بھی محترم قرار دیتا جب تو امید کی جاسکتی تھی کہ ان کا نعرۂ قومیت اسلامی اقدار کا کچھ نہ کچھ لحاظ ضرور کرے گا لیکن موصوف جس درجے کے مغرب زدہ، متجدد اور مادہ پرست ہیں اس کے ہوتے ایک احمق ہی یہ حسن ظن رکھ سکتا ہے ان کا نعرۂ قومیت کوثر و تسنیم میں ڈوبا ہوا ہوگا۔

اور یہ جو کہا گیا کہ جمال ناصر کے پیش نظر کسی قوم یا علاقے پر فتح و تسخیر کی کمند پھینکنا نہیں تو اس پر ہنسی آگئی۔ جن بیچاروں سے اپنے ہی بدن کا تھلتھلا گوشت سنبھالے نہیں بن رہا ہے وہ کسی پہلوان کے بدن سے پارچہ کاٹنے کا خواب کیا دیکھیں گے بقول شخصے ننگی کیا نہائے کیا نچوڑے۔ مولانا اصلاحی جمال ناصر کے حسنِ نیت کا انکشاف نہ فرمائیں تب بھی دنیا خوب جانتی ہے کہ اب وہ سیلِ رواں ریت میں جذب ہوچکا جو قلب بطحا سے اُٹھکر شرق و غرب پر چھاتا چلا گیا تھا۔ اب تو عرب سورماؤں کا کام فقط یہ رہ گیا ہے کہ اپنی ہی بوٹیاں نوچا کریں۔ جب جس کا موقع پڑے اپنی ہی قوم پر چڑھ دوڑے اور دار و رسن کے بازار سج جائیں۔ کہنے کو جاہلی بربریت کا دور ختم ہوچکا ہے لیکن اسلام کی عینک لگا کر دیکھئے تو ظلم و غصب کی ہر ادا نئے بانکپن کے ساتھ آج بھی جلوہ گر ہے۔ یہ ظلم و غصب نہیں تو اور کیا ہے کہ جب کوئی حکمراں چاہے لوگوں کے کاروبار اور املاک کو قومیا لے۔ اور اس بھی بڑا ظلم یہ ہے کہ اس سفّاکی کو نام دے اسلام کا۔ زندہ باش جمال عبدالناصر۔ تم عظیم ہو، تمہارا مقصد بھی عظیم ہے۔ تم اصلاح کے سوا کچھ نہیں چاہتے۔ ہاں اصلاح اور خدمت کی نیت سے یہ ضرور چاہتے ہو کہ سعودی عرب کی اینٹ سے اینٹ بج جائے اور اس کے ہر اونچے مقام پر — حتّٰی کہ گنبدِ خضرا پر بھی قومیت کا شاندار پرچم لہرائے۔ وہ قومیت جس کی نظر فریب جھلی پر فراعنہ کی تصویریں پیاز کے عرق سے بنائی گئی ہیں تاکہ تم جب چاہو یہ عوام کی نظروں سے غائب رہیں اور اور جب چاہو آنچ دکھاکر اُنھیں اُبھار دو۔

استدلال یا سخن سازی؟

مولانا کے جواب کی کچھ سطریں خصوصیت سے لائق تجزیہ ہیں۔ انھوں نے فرمایا:—

> "اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس مقصد کے لئے بھی انھیں اسلامی اتحاد کی دعوت ہی کو ذریعہ بنانا چاہئے تھا تو یہ بات کہنے کے لئے تو بالکل ٹھیک ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ موجودہ حالات میں کسی متحدہ اسلامی بلاک کی تنظیم کی راہ میں کتنی ناقابل عبور مشکلات ہیں۔ جب صرف عرب کے متحد ہونے میں سامراجیوں نے اتنے اڑنگے ڈال رکھے ہیں تو پورے عالم اسلامی کے اتحاد کو وہ

[illegible] ممکن ہونے دیں گے جب کہ عالم اسلامی میں سے ایک ایک ملک کی شہ رگ انھی کے ہاتھ میں۔ ایسے حالات میں جمال عبدالناصر نے اگر اپنے کام کو عرب ہی تک محدود رکھا تو انھوں نے بڑی حقیقت پسندی کا ثبوت دیا اور اپنی طاقت و صلاحیت کا انھوں نے صحیح اندازہ کیا۔"

ذرا تدبر فرمایئے یہ کیا ارشاد ہوا ہے۔ ایک شخص سوال کرتا ہے کہ جمال عبدالناصر نے اتحادِ عرب کے مقصدِ نیک کو حاصل کرنے کے لئے عصر حاضر کے فاسد ترین نظریئے، نظریۂ قومیت کو اساس کیوں بنایا خود اسلام کو اساس کیوں نہ بنایا۔ دوسرے لفظوں میں اس شخص کا سوال یہ ہے کہ دفاع اور تحفظ کی خاطر تمام ممالکِ عربیہ میں اتحاد و مواخاۃ کی فضا پیدا کرنے کے لئے جمال عبدالناصر نے اُس نظریۂ قومیت کو اختیار کیوں کیا جو اپنے مزاج اور فطرت ہی میں ناگزیر مفاسد لئے ہوئے ہے۔ اُس اسلام کو اختیار کیوں نہ کیا جو مفاسد کا قاطع اور فلاحِ دارین کا ضامن ہونے کے علاوہ گہرے قلبی و روحانی اتحاد کا سب سے مضبوط، محکم اور پاکیزہ ذریعہ ہے؟

گویا سائل ذریعے اور وسیلے کے بارے میں سوال کر رہا ہے یہ نہیں کہہ رہا کہ اتحاد و انضباط کی کوشش کا دائرہ صرف عرب تک کیوں محدود رکھا گیا، عرب سے باہر سارے ہی اسلامی ممالک تک کیوں نہ پھیلایا گیا؟ لیکن مولانا اصلاحی اصل سوال کو الفاظ کے پھیر میں گم کر کے جواب دے رہے ہیں اُس سوال کا جو کیا ہی نہیں گیا۔ دوبارہ ان کی عبارت پڑھیئے وہ فرماتے ہیں کہ موجودہ حالات میں متحدہ اسلامی بلاک کی تنظیم سخت دشوار ہے۔ متحدہ اسلامی بلاک ظاہر ہے صرف ممالکِ عربیہ کے اتحاد کو نہیں کہتے یہ اصطلاح تو دنیا کی تمام مسلمان مملکتوں کے نظم و اتحاد پر صادق آتی ہے پھر نفسِ سوال سے اس گل افشانی کا کیا تعلق رہا؟ یہ ایک الگ بحث ہے کہ متحدہ اسلامی بلاک کی راہ میں کیا فقط سامراجیوں ہی کے اڑنگے حائل ہیں یا سب سے بڑی رکاوٹ خود مسلمان حکمرانوں کا مادہ پرست، مغرب زدہ اور خدا فراموش ذہن ہے۔ ہماری تو مختصر رائے یہ ہے کہ سامراجیوں یا کمیونسٹوں یا کسی بھی حریف گروہ کی دسیسہ کاریوں پر ذمہ داری ڈال دینے کا سستا نسخہ دراصل اپنی کمزوریاں چھپانے کا ایک پٹا ہوا نسخہ ہے۔ اس نسخے کو ہمیشہ وہی لوگ استعمال کرتے ہیں جو خود اپنے سے چھپنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو الزام دے کر اپنی تن آسانیوں کا جواز پیدا کرتے ہیں تاہم یہاں یہ بحث نہیں بحث یہ ہے کہ جس دائرے میں جمال عبدالناصر اتحاد و تنظیم کا صور پھونکنا چاہتے ہیں اسی دائرے میں یہ صور اسلام کی قدرِ مشترک کے عوض نسلی و وطنی قومیت کے ذریعہ کیوں پھونکنے کی سعی نامشکور کی جا رہی ہے جب کہ بالغ نظر مفکرین کے نزدیک قوم پرستی تو وہ بھی فاسد کا فاسد ہی ہے جس کی عمارت اسلام کے [illegible] پایوں پر اٹھائی جائے۔ اسلام کو [illegible] بغیر [illegible] خدا پرستی کے کسی "پرستی" کا احیاء و ارتقا ممکن ہی نہیں ہے لہٰذا مسلم قوم پرستی بھی اپنے مضرات و خصوصیات کے اعتبار سے تو وہ غلاظت ہی ہوگی۔ مگر جب قوم پرستی کی عمارت نسلی و وطنی قبیل پایوں پہ اٹھائی جائے [illegible] محترم

جمال عبدالناصر صاحب اٹھا رہے ہیں تب تو ادنیٰ درجے میں بھی کسی خیر یا اسلامی معنی میں خیر کی امید کرنا چیل کے گھونسلے میں ماس تلاش کرنے کے مرادف ہے۔

جمال عبدالناصر کے اس تدبر کی تعریف کرنا بھی یہاں بے محل ہی تھا کہ انھوں نے اپنے کام کو عرب ہی تک محدود رکھا۔ سائل کب کہہ رہا ہے کہ انھیں پوری دنیائے اسلام تک ہاتھ بڑھانا چاہئے تھا۔ سائل کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ مصر کا حکمراں صرف دنیائے عرب ہی کو متحد و منظم کرنے کی کوشش کرے۔ پورا عرب تو کیا اگر عرب کے صرف دو تین ہی ممالک تک آقائے مصر اپنی مبارک کوششوں کا دائرہ محدود کر دیتے تب بھی اعتراض کی بات نہیں تھی۔ اعتراض تو اس ذریعے پر ہے جسے حصولِ مقصد کا وسیلہ بنایا گیا ہے۔ یہ ذریعہ فاسد و غلیظ ہے۔ اس کے تقاضے اسلامی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں قدم قدم پہ یہ اسلامی اقدار و تعلیمات سے متصادم ہے۔ سائل کہتا ہے کہ مقصدِ اتحاد حاصل کرنے کی خاطر آقائے مصر کو قومیت کا شعور نہیں اُبھارنا چاہئے تھا کیونکہ "قومیت" اب ایک سادہ اور مجرد احساس کا نام نہیں رہا ہے بلکہ وہ تو ایک ذلیل و رذیل ازم ہے۔ ایک مرتب نظریہ ہے۔ اس کو اُبھارنے سے اسلامی قدریں اس سے بھی زیادہ پامال ہوں گی جتنی وہ اب تک ہو رہی ہیں۔ اس کے بجائے اسلامی شعور کو اُبھارنے کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔ اسلامی شعور سے بڑھ کر امتِ مسلمہ کے لئے مبارک اور پائدار بنیاد اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

مولانا اصلاحی اس سوال کا جواب نہیں دیتے۔ عذر ضرور پیش کرتے ہیں کہ جمال عبدالناصر اس کے اہل ہی نہیں۔ عذر بے شک معقول ہے لیکن اس کی معقولیت اگلے ہی لمحے ختم ہو جاتی ہے جب مولانا نعرۂ قومیت کی تحسین شروع کر دیتے ہیں۔ یہ کہاں کی معقولیت ہے کہ جو شخص کسی مقصدِ عظمیٰ اور منزلِ نیک کی طرف اسلام کے ساتھ نہ چل سکتا ہو وہ اسلام دشمن نظریات کے ساتھ سفر کرے تو ایک سلیم القلب عالمِ دین اس کی تعریف کرنے بیٹھ جائے اور مقصد و منزل کے حسن کو ناپاک وسائلِ سفر پر منطبق کر دے۔

یہ سب اس صورت میں ہے جب ہم یہ مان بھی لیں کہ ناصری نعرۂ قومیت اتحادِ عرب کے لئے واقعتہً کوئی مؤثر اور نتیجہ خیز وسیلہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہمیں تو اسی میں کلام ہے۔ جس کے منہ پر آنکھیں ہوں وہ دیکھے کہ اس نام نہاد نعرے سے قبل دنیائے عرب میں امن و آشتی کا پارہ کیا تھا اور اب کیا ہے۔ اب تو دنیائے عرب میں کشت و خون، شکست و ریخت، عناد و کدورت، تیار زد و تصادم اور تیغ و تفنگ کا وہ بھونچال آیا ہوا ہے کہ الامان والحفیظ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ بھونچال، یہ خون برساتی ہوئی آندھی، یہ برادر کشی، یہ وحشی سانڈوں جیسی دھما چوکڑی اسی نعرۂ قومیت ہی کے برگ و بار ہوں۔ آج منافقت کا سب سے بڑا حربہ خوبصورت الفاظ ہی قرار پا گئے ہیں۔ بڑی خوبصورت بات ہے کہ آؤ ہم سب وطنی اشتراک کی بنیاد پر متحد ہو کر اسرائیل اور سامراجیوں کے جارحانہ حربے کند کر دیں لیکن اس حسین دعوت کی تہوں میں آقائے مصر کی حبِّ جاہ اور شاہ مزاجی کس حد تک کارفرما ہے اس کا اندازہ ان خونناک حالات سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نعرے کی برکت سے دنیائے عرب میں عفریت کی طرح سر اٹھا چکے ہیں۔ جہاں بھی دو گروہوں کو گردنیں ناپنے اور سینے چھلنی کرنے کا شیطانی کھیل کھیلتے دیکھئے سمجھ لیجئے کہ ایک گروہ ان میں ناصر کے طرفداروں کا ضرور ہے۔

خیر یہ مان بھی لیجئے کہ آقائے مصر نہایت مخلص، دردمند اور ایثار پیشہ ہیں۔ ان کا نعرۂ قومیت صدقِ صد مخلصانہ ہے اور خالص [illegible] کے [illegible] ہی کے آغوش میں پلا ہے۔ لیکن یہ بات ہر صاحبِ فہم کے لئے سامنے کی بات ہے کہ خالص مادیت کی بنیاد پر مرتب کی [illegible] کوئی تحریک اور فقط مادی وسائل پر مبنی کوئی منصوبہ [illegible] قوم کو [illegible] سے نجات دلا سکتا ہے نہ سامراجی سازشوں سے۔ [illegible] عرب [illegible] مصر اگر مر کر بھی زندہ ہو جائیں تو بحالتِ موجودہ وہ مادی وسائل کی سطح پر نہ سامراجیوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں نہ کمیونسٹوں کا مقابلہ

تو مجاہدہ قوت کی ترازو کا پاسنگ بھی شاید ہی بن سکیں۔
امریکہ تو خیر بڑی چیز ہے اسرائیل کی بالشت بھر سرزمین بھی ان کے لئے توپ کا دہانہ بنی رہے گی کیونکہ اس کی پشت پر نہ صرف یہ کہ چچا سام کا دستِ شفقت ہے اور نہ صرف یہ کہ روس بھی اس کی بقا کو اپنے سیاسی مصالح کے عین مطابق خیال کرتا ہے بلکہ وہ ایک نئی زندگی پانے والی قوم کی جوان اور شوریدہ سر امنگوں کی جولانگاہ ہے۔ یہود نے بہت کچھ کھو کر جو کچھ پایا ہے وہ یہی بالشت بھر کی سلطنت ہی تو ہے اس کی بقا کے لئے وہ آگ اور خون کا ہر کھیل بڑی جرأت اور حوصلے سے کھیلنے کے لئے ہمہ تن آمادہ ہیں۔ بھول جائیے کہ اس آفت رسیدہ قوم کی تاریخ کیا رہی ہے۔ تازہ ترین حقیقت یہ ہے — چاہے وہ کتنی ہی کڑوی ہو — کہ یہ قوم عام کردار کے اعتبار سے کم از کم مصری مسلمانوں سے اونچی اٹھی ہوئی ہے۔ مصر، عرب کا پیرس بن چکا ہے۔ یہاں نحن ابناء الفراعنہ کے نعرے لگتے ہیں۔ افطار کے وقت شرابیں پی جاتی ہیں۔ جنسی بے راہ روی خودرَو گھانس کی طرح عام ہے۔ یہاں ایک مسلمان وکیل کھل کر کہہ سکتا ہے کہ وراثت میں عورت کا حصہ مرد کے مقابلہ میں نصف ٹھیرانا رجعت پسندی ہے اور کوئی نہیں پوچھتا کہ تیرے منھ میں کے دانت ہیں، یہاں قرآنی محکمات کے خلاف قوانین بنتے ہیں، یہاں وہ سب کچھ ہوتا ہے جس کی کماحقہ ترجمانی کے لئے منافقت زندقہ، ہٹ دھرمی اور ضلالت کے الفاظ بھی کفایت نہیں کرتے پھر کیسے نہ کہا جائے کہ اسرائیل کے یہودی کردار میں اتنے گرے ہوئے نہیں۔ ان کے یہاں زبان و عمل کا اتنا شدید تضاد و نفاق نہیں پایا جاتا۔

اس تنقیح سے بتانا یہ مقصود ہے کہ خدائی نصرت و رحمت کے تمام امکانات کا سدِّباب کر لینے کے بعد یہ فقط دیوانے کا خواب ہی ہوگا کہ قومیت کے جھنڈے تلے پوری قوم عرب جمع ہو کر اسرائیل اور سامراجیوں کے چھکے چھڑا سکے گی خدائی نصرت پر نظر رکھنے والے تو بے شک ٹوٹے ہوئے ہتھیاروں اور عددی قلت کے باوجود قوی دشمن پر غالب آنے کا خواب دیکھنے میں حق بجانب کہے جا سکتے ہیں۔ اس خواب کی پشت پر تاریخ ہے قرآنی آیات ہیں، لیکن اخلاقی و روحانی اقدار سے یک قلم ستبرداری دے بیٹھنے کے بعد امکانات و توقعات کا مدار صرف مادی قوت کے تناسب و توازن پر رہ جاتا ہے، خیالی خوش فہمیوں کیلئے کوئی جگہ نہیں باقی بچتی۔ جمال ناصر اگر ٹھیٹ مادّہ پرست بن چکے ہیں اور اسی راہ سے قوم عرب کو اونچا اٹھانا چاہتے ہیں تو مولانا اصلاحی جیسے شاید چند ہی مدبرین اس میں شک کر سکیں کہ یہ شیخ چلّی کا خواب ہے جس کی تعبیر کے لئے مستقبل کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ آپ اپنی تعبیر ہے اور دنیا اسے اس کی آخری تہہ تک دیکھ رہی ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے کہ قومیت کا نعرہ مصری مومنوں کی لوحِ قلب سے اسلام کے دھندلے نقوش بھی ایک ایک کر کے کھرچ دے لیکن یہ نہیں ہوگا اور نہیں ہو سکتا کہ بے ضمیری، نفاق اور بدکرداری کی کھاد سے نشو و نما پانے والا شجرِ قومیت وہ فرخندہ برگ و بار لا سکے جن کا امکان مولانا اصلاحی کو نظر آ رہا ہے۔ نمکولی سے نیم ہی پیدا ہوتا ہے انگور نہیں۔ ٹرکی کی تازہ مثال آپ کے سامنے ہے۔ سادہ لوحوں نے مصطفےٰ کمال سے بھی خوشنما امیدیں باندھی تھیں۔ اسے غازی کمال پاشا کہہ کر خوشی کے گیت گائے گئے تھے لیکن ہوا کیا؟ — وہی کہ ایلوے کے درخت سے انار نہیں مل سکے اور کتّے کا گوشت اپنی آخری بوٹی تک کتے ہی کا رہا۔ یہی حشر ہر جگہ ہوگا ہمیشہ ہوگا۔ خدا کسی کا رشتے دار نہیں۔ وہ کسی کا دشمن بھی نہیں۔ عیسائی، یہودی، کمیونسٹ سب اسی کے بندے ہیں۔ تمکّن فی الارض کا قانون سب کے لئے یکساں ہے۔ ہزار جمال ناصر یہودیوں کے بدن کا ایک بال نہیں اکھاڑ سکتے اگر قوت کا سرچشمہ انھوں نے بدکرداری ہی کو بنا لیا ہے۔ قوم پرستی بھی اپنی تمام تر شناعتوں کے باوجود کردار چاہتی ہے۔ کردار کے بغیر سونا بھی مٹی ہے۔

خدا کی شان ہے قوم عرب کو اسرائیل اور سامراج کے فتنوں سے بچانے کے مقصد کو آج مولانا اصلاحی جیسا علیم و فہیم "مقصدِ عظیم" کہہ رہا ہے حالانکہ یہ بات اُن دنیا دار اور مادہ پرست مفکرین کے کہنے کی تھی جن کے پاس قوم پرستی سے اونچا کوئی نصب العین نہیں۔ مولانا موصوف بھی یہی کہتے

ہیں تو فریاد کس سے کریں۔ قومی خدمت بے شک بڑا کام ہے لیکن اسلامی اقدار و اصول کی لاش پر خدمت کا محل بنانا خالص شیطانی کارنامہ ہے۔ کسی فلساز کی زبان پر تو "اکبر اعظم" کا لفظ بچ سکتا ہے، لیکن ایک عالم دین اگر ایسا کہنے لگے تو رونے کا مقام ہوگا!

مشتے نمونہ از خروارے

سچی بات یہ ہے کہ مشاہدے کو جھٹلانا، متواتر اطلاعات کی تکذیب کرنا اور ہزاروں میل دور بیٹھ کر آقائے مصر کے حسن نیت کا خیالی نقشہ کھینچنا بڑے دل گردے کی بات ہے یا پھر کرامت کہئے۔ ہم کم سواد تو بس اتنا ہی جانتے کہ قومیت اور اتحاد عرب کے نام پر مصر میں تہذیب جاہلی اور ثقافت فرعونی کا احیاء ایسے مسلکے کی شکل اختیار کر چکا ہے کہ جس کی جھلکیاں مشاہدین کے بیان کے مطابق وہاں کی سیاسی، سماجی، ثقافتی، معاشی اور منزلی زندگی کے ایک ایک گوشے میں نظر آتی ہیں۔ آج کی صحبت میں ہم فقط ایک چھوٹی سی مثال پیش کریں گے۔

مصر کے دارالسلطنت قاہرہ کے عرب آبزرور کی قریبی اشاعت میں ایک اشتہار کسی ہوٹل کا شائع ہوا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

"فراعنہ کی پکار"

قدیم تہذیب کی یہ عظیم یادگاریں آپ کو دعوت دے رہی ہیں۔ انھوں نے ماضی پر بھی حکمرانی کی تھی اور مستقبل بھی ان ہی کے زیر نگیں ہوگا۔"

("دعوت" ۲۸ر جولائی ۱۹۶۳ء)

دیگ سے نکالا ہوا ایک لقمہ ہی اگر دیگ کے تمام چاولوں کی کیفیت بتانے میں کافی سمجھا گیا ہے تو اس ایک اشتہار ہی سے اندازہ لگائیے کہ ناصری نعرۂ قومیت کو فرعونی تہذیب و ثقافت سے پاک اور بری باور کرانے کی خیالی کوشش کیا قدر و قیمت رکھتی ہے۔ مصر ایک آہنی آمریت کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے بچہ بچہ جانتا ہے کہ جمال عبدالناصر جس چیز کو ناپسند کرتے ہیں اسے تحس نحس کرنے میں ذرا بھی تکلف نہیں برتتے۔ اسلام — قرآن و سنت والا اسلام انھیں ناپسند تھا۔ اس اسلام کے علمبردار اخوان کو انھوں نے بے دریغ پیس کر رکھدیا۔ صلحاء و اتقیاء کے لہو سے انھوں نے جور و ستم کی ایک نئی تاریخ لکھی اور آج بھی ان کے احاطۂ اقتدار میں حقیقی اسلام کے احیاء اور مغربی تہذیب کے استیصال کا علم اُٹھانے والا کوئی شخص آزادی کے چند سانس نہیں لے سکتا۔

ایسے جبار حکمراں کی عین ناک کے نیچے کون مائی کا لال عظمتِ فرعونی کو شان کے ساتھ زینتِ اشتہار بنا سکتا تھا اگر اسے پوری طرح معلوم نہ ہوتا کہ یہ نغمۂ کفر آقائے نامدار کی سماعت پر شمہ برابر گراں نہیں گذرے گا۔ مت سمجھئے کہ عرب آبزرور کا ایڈیٹر کوئی یہودی یا نصرانی یا کمیونسٹ ہے۔ جی نہیں۔ ایڈیٹر ہیں جناب ڈاکٹر عبدالحامد یہ نام کسی نسلی کافر کا تو نہیں ہو سکتا۔ ثابت ہوا کہ مصری نعرۂ قومیت کے اجزائے ترکیبی میں حضرت موسیٰؑ کے بالمقابل فرعون کو ہیرو قرار دینے کا جزء مسلّمہ طور پر شامل ہو چکا ہے اور اخبار والے جانتے ہیں کہ فرعونیت کے گن گانے کی جو صریح کافرانہ حرکت کسی واقعی مسلمان حکمراں کے دائرۂ اقتدار میں سر تن سے جدا کرا دینے کا موجب ہو سکتی تھی وہ مصر کی چار دیواری میں آقاؤں کی خوشنودی کا وسیلہ بنے گی۔

پھر یہ پہلو بھی نظر میں رہے کہ معاملہ اشتہار کا ہے۔ آج کل اشتہارات میں وہی عناصر شامل کئے جاتے ہیں جو کشش عام کا موجب ہوں۔ آپ دیکھتے ہی ہیں کہ اکثر و بیشتر اشتہارات تصاویر سے مزین ہوتے ہیں۔ تصاویر بھی زیادہ تر عورت کی کیونکہ عورت اس دور کا بہت بڑا نقطۂ کشش ہے۔ لہٰذا ہوٹل والا اگر قاہرہ کے اخبار میں مذکورہ بالا اشتہار دیتا ہے تو اس سے پتا چلتا ہے کہ "فرعونیت" اب مصری عوام کے لئے فقط گوارا ہی نہیں خاصی مرغوب اور کشش انگیز چیز بن گئی ہے۔ جس طہارت و قدوسیت کو

مولانا اصلاحی ناصری نعرۂ قومیت کے ساتھ وابستہ کر رہے ہیں اس کی پرچھائیں بھی اگر "جمہوریۂ مصر" میں پائی جاتی تو اس نوع کا اشتہار دینے کا واحد مطلب یہ ہوتا کہ اگلے ہی دن ہوٹل میں تالا پڑ جائے اور ہوٹل کے منیجر صاحب سرکاری سمن پر عدالت میں نظر آئیں۔ مگر جب آقائے مصر کی تحریک قومیت ایک سوچی سمجھی اسکیم کی شکل میں اسلامی اقدار کو مدفون اور فرعونی تہذیب و ثقافت کو زندہ کرنے کی مسلسل جدوجہد کر رہی ہو تو نتیجہ یہی نکلنا چاہیئے تھا جو آپ کے سامنے ہے۔

مزید گفتگو کے لئے اگلی اشاعت کا انتظار فرمائیے۔

ڈیفینس آف انڈیا رولز

ہم سیاست کی نزاکتوں پر عبور نہیں رکھتے لہٰذا یہ مسئلہ ہمارے دائرۂ تنقید سے باہر ہے کہ جو مخصوص ہنگامی قانون چینی جارحیت سے نمٹنے کے لئے ہماری حکومت نے نافذ کیا تھا وہ کس حد تک جائز ہے اور اسے کب تک مسلط رہنا چاہیئے؟ لیکن آج اس قانون کے نامِ گرامی کو اس لئے زیبِ عنوان بنانا پڑا ہے کہ حلقۂ اورنگ آباد کے امیر جماعت اسلامی جناب محمود احمد خاں صاحب کو اسی قانون کے تحت دھر پکڑنے کی خبر اخبار میں پڑھی ہے۔ تعجب تو ذرا بھی نہیں ہوا۔ افسوس ضرور ہوا۔ افسوس صید کی حالت پر نہیں کہ وہ تو خوش قسمت ہے۔ صیّاد کی حالت پر ہوا کہ کمزوروں پر ہاتھ ڈال کر وہ خود اپنی کمزوری کا اعلان کر رہا ہے۔ محمود احمد صاحب کے بھائی نے چونکہ ہائی کورٹ میں درخواست دیدی ہے اور اسکی سماعت منظور کی جا چکی ہے۔ لہٰذا اگناہ اور بے گناہی پر تو ہم کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتے۔ البتہ یہ یاد دہانی اپنے حکمرانوں کو ضرور کرائیں گے کہ تم نے آج تک جتنے بھی افرادِ جماعت کو وقتاً فوقتاً گرفتار کر کے جیل میں ڈالا ہے ان کا کوئی جرم تم عدالتی پیمانے پر ثابت نہیں کر سکے۔

تم میں یہ ہمت ہی نہیں ہوتی کہ کیس کو ان عدالتوں میں لا سکو جن کے انصاف پر ہم اور تم برابر کا اعتماد کرتے ہیں۔ ہمت کیسے ہوتی، تم خود جانتے ہو کہ جماعت اسلامی والے کسی بھی ایسے فعل کے مرتکب نہیں ہیں جسے "جرم" قرار دیا جا سکے۔ ارتکاب تو کجا جماعت اسلامی والوں کے دلوں میں قانون شکنی کا تصور تک نہیں آتا کیونکہ جس اسلام کی تعلیم و تبلیغ کو انھوں نے اپنی زندگی کا مشن بنایا ہے خود اسی کی تعلیم یہ ہے کہ حاکم کی اطاعت کرو چاہے وہ کوئی بدشکل اور نکٹا حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ پُرامن مشاغل، ظاہر و باطن کی یکسانی، عدل و صداقت اور شرافت و بردباری اسلام کے ازلی و ابدی پیغامات ہیں۔ اسلام کو عزم و شعور کے ساتھ سینے سے لگانے والا فرد وہ میں اس وقت بھی پائی نہیں جائے گا جب خفیہ پولیس کا پورا طائفہ اپنے بستروں میں گہری نیند سو رہا ہو۔

بڑی گھٹیا اور بھونڈی بات ہے کہ ڈیفینس کا جو بھاری بھرکم قانون سازش پسندوں اور تخریب کاروں کے شر سے بچنے کے لئے وضع ہوا ہے اسے ایک شاندار مضبوط حکومت سچائی اور انصاف کے پروانوں پر استعمال کرے۔ تم ہمیں پکڑو اور عدالت سے پھانسی کا فیصلہ صادر کرا دو ہم تمھیں ظالم نہیں کہیں گے، لیکن یہ تو کھلا ظلم ہے کہ سیدھے سچے لوگوں کو تم اس لئے جیل میں ڈالتے ہو کہ وہ تمھارے لگائے ہوئے چرکوں پر فریاد کرتے ہیں، تمھاری غیر منصفانہ جارحیتوں پر کراہتے ہیں اور تم سے رحم، رعایت، بخشش نہیں صرف انصاف چاہتے ہیں۔

بڑائی کی بھی ایک شان ہوتی ہے۔ رستم اگر ضعیفوں کو پچھاڑتا پھرے تو سوائے کم ظرفوں اور چھچھوروں کے کون اسے داد دے گا۔ تم بحیثیت فرد بڑے نہیں بھی لیکن ایک عظیم اور شاندار ملک کی مسندِ عزت قسمت نے تمھیں عطا کی ہے اس کی لاج تو تمھیں رکھنی ہی چاہیئے۔ لاج کے علاوہ مکافاتِ عمل کے آفاقی قانون پر بھی تمھیں کم سے

ایسے نازک وقت میں تو نظر رکھنی ہی چاہیئے جب کہ چین جیسے درندہ صفت سے سابقہ پیش آگیا ہے۔ ظلم کا بیج کبھی شیریں برگ و بار نہیں لاتا۔ آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں قدرت اسی دنیا میں تمھیں مکافاتِ عمل کی منطق سمجھا کر رہے گی۔

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

حاصل کلام یہ ہے کہ محمود احمد خاں صاحب کی گرفتاری ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ ان کا کوئی جرم ہے تو انھیں عدالت میں لاؤ۔ عدالت میں نہیں لا سکتے تو پھر اقرار کرو کہ تم اپنے ہی بنائے ہوئے قانونوں کے وفادار نہیں ہو۔ محمود احمد صاحب کو مبارک باد کہ یہ گرفتاری التفاتِ چشمِ ناز کی علامت ہے۔ دیکھنے میں یہ جفا سہی لیکن جفا تغافل سے بہرحال بہتر سمجھی گئی ہے۔

ہر بوالہوس کے واسطے دار و رسن کہاں

(عامر عثمانی)

کراچی سے ایک خط

۵ جولائی ۶۳ء

مکرم مولانا صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

گذارش ہے کہ آپ کا ماہ جون کا تجلی پڑھا آپ نے "فتاویٰ ستاریہ" پر تبصرہ کیا ہے اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ اس مجموعۂ فتاویٰ کے منتسب جناب مولانا عبدالستار صاحب کی مثال آپ اس طرح خیال فرمائیں جس طرح عیسائیوں میں دو فرقے ہیں۔ ایک کیتھولک۔ دوسرا پروٹسٹنٹ۔

حنفی مذہب میں بریلوی اور دیوبندی شیعہ میں امامیہ اور اسماعیلیہ۔ اسی طرح اہل حدیث میں ایک امامیہ اہل حدیث دوسرا اہل حدیث جس طرح کیتھولک، بریلوی اور اسماعیلیہ وغیرہ ائمہ کی عزت واحترام کا خیال نہیں کرتے۔ اسی طرح امامیہ اہل حدیث بھی سلف کا دشمن ہے۔ جس طرح سبائیہ نے تحریف کی ہے اور حضرت معاویہؓ ویزید اور عبدالملک اور مروانؓ وغیرہم کے خلاف طوفان بدتمیزی برپا کیا ہے اسی طرح ان حضرات یعنی امامیہ اہل حدیث نے بھی ائمہ سلف کیخلاف بدتمیزی برپا کر رکھی ہے۔ ایک بلکہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے خلاف ہی نہیں بلکہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رضی اللہ عنہ امام بخاریؒ وغیرہ کے خلاف بھی زہر افشانی کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا آپ برائے مہربانی آئندہ تمام اہل حدیث کو نشانہ نہ بنائیں بلکہ امامیہ اہل حدیث پر جو اپنے آپ کو غرباء اہلحدیث کہتے ہیں تنقید وتبصرہ فرمائیں۔ کیونکہ اہل حدیث کے نظریہ کے متعلق نومبر ۶۲ء میں مولانا محمد حنیف صاحب ندوی نے جو کچھ فرمایا ہے اس پر آپ دسمبر ۶۲ء کے تجلی میں تبصرہ کر چکے ہیں امید ہے کہ آپ میری گذارشات کو مدنظر رکھیں گے اگر آپ اس خط کو تجلی میں شائع کر دیں تو بڑی مہربانی ہو کیونکہ اس سے دوسرے علماءِ دیوبند کی غلط فہمی بھی دُور ہو گی۔

آپ یاد رکھیں جس صحابہ اور ائمہ کی عزت نہیں وہ چاہے کتنا ہی پرہیزگار ہو ہمیں دلی نفرت ہے۔ یہ امامیہ اہل حدیث نے عاشورہ محرم پر شر انگیز واقعۂ کربلا پر مضمون لکھا ہے جس سیاستہ کو مات کر دیا ہے۔ فقط والسلام

آپ کا مخلص :۔ ابوالسعادات محمد مبارک۔

تجلی

اہل حدیث کی اقسام کو تو آپ ہی جانیں ہمارا مشن اور فریضہ صرف یہ ہے کہ باطل کو جہاں بھی پائیں وہیں ٹوک دیں اور حق جہاں بھی ملے وہیں تائید وحمایت کے لئے سینہ سپر ہو جائیں۔ جس کا جی چاہے تجلی کا فائل دیکھ لے حنفی ہونے کے باوجود ہم احناف کی اندھا دھند طرفداری نہیں کرتے اور اہل حدیث کی مخالفت بھی ہر ہر مرحلے پر ہم نے اختیار نہیں کی ہے۔ ظلم جو کرے وہ ظالم ہے اور صداقت کا علم جس کے ہاتھ میں ہو وہ سچا ہے۔ کاش دوسرے بھی گروہی تعصبات اور فرقہ وارانہ جانبداریوں سے بلند ہو کر سوچنے لگیں تو باہمی جدل ونفاق اور تفریق وانتشار کی خلیج بہت کچھ پٹ سکتی ہے۔

عامر عثمانی

تجلّی کی ڈاک

داڑھی سے متعلق

سوال :- از محمد حسین کراچی۔

جولائی کے تجلّی میں داڑھی کی مقدار کے مسئلے پر آپ نے جو کچھ لکھا وہ دل میں اُتر گیا۔ گو کہ کوفت اس سے ہوئی کہ متعلقہ صفحات بے ترتیب جُڑ گئے ہیں اور اُلٹ پلٹ کر پڑھنے سے یکسوئی اور محویت کا خون ہوگیا۔

یہ بات پھر بھی تشنہ ہی رہی کہ آیا کسی صحابی کی داڑھی بھی یک مشت سے کم تھی یا نہیں۔ یہ مسئلہ تاریخ کا ہے اور اسکی تحقیق ہوسکے تو صحیح ترین نتیجہ اخذ کرنا آسان ہوجائے گا۔ اگر سارے ہی صحابہؓ لازماً یک مشت یا اس سے زیادہ داڑھی رکھتے ہوں تو پھر یہ کہنا شاید غلط ہوگا کہ یک مشت کی مقدار واجب نہیں ہے؟

الجواب :-

ہمیں خود بھی یہ معلوم ہوکر کوفت ہوئی کہ ڈاک کے متعدد صفحات پر غلط نمبر پڑ گئے ہیں۔ ویسے تو یقین ہے کہ قارئین نے اپنی سمجھ سے اس خامی کی تلافی کرلی ہوگی اور مضمون کا ربط قائم کرکے ہی مطالعہ فرمایا ہوگا۔ لیکن بعض قارئین کی حالت میں یہ بھی ممکن ہے کہ صفحات کی ترتیب پر توجہ دینے کی بجائے یہ سوچ کر آگے بڑھ گئے ہوں کہ شاید مدیر تجلّی کے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہوگیا ہے۔

خامی کا علم ہمیں اتنی دیر میں ہوا کہ جولائی کے تجلّی میں "تصحیح" شائع نہ کرسکے۔ اب اتنی دیر ہوچکی ہے کہ "تصحیح" "مُکّا جو بعد از جنگ یاد آئے" کا مصداق ہوگی۔ تاہم "بھاگتے چور کی لنگوٹی" بھی ایک کہاوت ہے۔ لہٰذا اسی کے ضمن میں ہم اب تصحیح پیش کئے دیتے ہیں تاکہ فائل رکھنے والے حضرات صفحات کے مطبوعہ نمبر کاٹ کر صحیح نمبر ڈال لیں۔

صورت یہ ہے کہ صفحات کے نمبر تو ٹھیک چھپے ہیں، لیکن ان کا مضمون آگے پیچھے ہے۔ یہ گڑبڑ صـ۲۵ سے صـ۳۳ تک ہے۔ مطالعہ اس طرح کرنا چاہئے کہ صفحہ ۲۴ کے بعد ۲۷ پھر ۲۸ پھر ۲۵ پھر ۲۶ پھر ۳۱ پھر ۳۲ پھر ۲۹ پھر ۳۰ پھر ۳۳۔ گویا صفحات کے نمبر کتابت ہونے میں تو خوب غلطی ہوئی ہے مگر کوئی چیز کم زیادہ نہیں ہوئی ہے۔ جس کا جی چاہے وہ ذرا سی توجہ سے اس غلطی کی اصلاح کرسکتا ہے۔

آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو داڑھیوں کی فرداً فرداً تاریخ ملنی عادۃً محال ہے دوسرے اس کا کوئی فیصلہ کن تعلق مسئلے کے شرعی حل سے ہے بھی نہیں۔ جب حدیث سے معلوم ہوگیا کہ داڑھیاں بڑھانے کا حکم اس وقت دیا گیا جب بعض مجوسیوں نے داڑھیاں کم کرنی شروع کردی تھیں اور صراحۃً بھی بتادیا گیا کہ اس حکم کا منشاء کفار کی مخالفت اور مسلمانوں کی امتیازی شان کا بقاء ہے تو قرنِ اوّل کی ایک ایک داڑھی کو ناپنا بے کار ہی ہوگا۔ یقینی بات ہے کہ جملہ صحابہؓ نے حکم پیغمبر کی تعمیل کی ہوگی۔

لیکن آج کے دور میں جب کہ داڑھی مونڈنا پورے عالم کی وباء عام ہے حکم کا منشاء یک مشت سے کم داڑھیاں بھی بخوبی احسن پورا کردیتی ہیں لہٰذا وجوب صرف داڑھی کا ہوگا نہ کہ یک مشت کا۔ سختی اور تنگی اسلام کا مزاج نہیں ہے۔ فقہاء کو قانون اور تقویٰ، واجب اور مندوب میں فرق کرنے کا

...کبھی نہیں بھولنا چاہئے۔ تجدد، مجرد عقلیت اور سلف کے قول و عمل سے بے تعلقی کے ہم سخت خلاف ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہمیں لکیر کا فقیر بننے سے پرہیز کرنا چاہئے اور زمانی تغیرات کے اثرات و ثمرات سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔

حضرت اویس قرنیؓ

سوال ۲:- از فرمان شاہ۔ پشاور

اصحاب رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو دعا کے واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منتخب کرنا آخر اس میں کیا حکمت آپ کے نزدیک ہے باوجودیکہ اعلیٰ درجہ کے صحابہؓ موجود تھے اُن کو امت کے لئے دعا کے واسطے نہیں کہا گیا

الجواب ۲:-

ہر بات کی حکمت جاننا انسان کے بس کا روگ نہیں۔ کہنے کو ہم بھی بہت کچھ کہہ سکتے ہیں لیکن اس کی حیثیت خالص تخمین و ظن کی ہوگی لہٰذا ہمارا جواب یہ ہے کہ حکمت کی تحقیق کسی حکیم الامت سے کیجئے۔ خدا کے فضل سے بڑے بڑے حاذق حکیم مارکیٹ میں موجود ہیں۔ وہ آپ کو یہ تک بتا سکتے ہیں کہ سانپ پیٹ کے بل کیوں چلتا ہے اور بھیڑیا دو پیروں سے کیوں نہیں چلتا۔ ہمیں فقط اتنا ہی معلوم ہے کہ سانپ کے پیر نہیں ہوتے لہٰذا وہ پیٹ کے بل چلنے پر مجبور ہے اور بھیڑیا چوپایہ ہے لہٰذا انسانوں کی طرح نہیں چل سکتا۔ یہ حکمت نہیں مشاہدہ ہے۔ فقط انداز بیان ہے۔ حکمت یہ ہوگی کہ اللہ میاں سانپ کے پیر لگا دیتے تو اس میں کیا نقصان ہوتا اور نہیں لگائے تو کیا فائدہ؟ یہ لطائف و اسرار حکماء ہی بتا سکتے ہیں مگر ہم حکیم نہیں صرف عامی عثمانی ہیں۔ ہم سے آپ مسئلے پوچھیے حکمتیں مت پوچھئے۔

پیداوار کی زکوٰۃ

سوال ۳:- (ایضاً)

ہمارے یہاں باغات ہیں جو کہ بیشتر سال اجارہ پر فروخت ہوتے رہتے ہیں مثلاً آٹھ سال یا کم و زیادہ آیا ان کا عشر وغیرہ مشتری پر ہے یا کہ بائع پر ہے کیونکہ یوم حصاد کا مصداق مشتری ہوتا ہے اور حکماً جو فائدہ وہ بائع سے لیتا ہے وہ بھی من وجہٍ یوم حصاد ہی کا مصداق ہے۔

الجواب ۳:-

مشتری پر ہے۔ یہ رائے امام ابوحنیفہؒ کے صفِ اول کے شاگرد قاضی ابویوسفؒ کی ہے اور باغات کے پھل کی خرید و فروخت کے جو طریقے ہمارے زمانے میں عموماً رائج ہیں ان میں یہی رائے اُس روح انصاف کی حامل نظر آتی ہے جس کی بنیاد پر امام اعظم اپنے تفقہ کی عمارت اٹھاتے تھے۔

بعض علماء نے امام اعظمؒ اور ان کے شاگرد زفرؒ کے ایک قول سے باغات کا عشر مالک کے ذمّے قرار دیا ہے لیکن یہ قول ہمارے زمانے میں مفتی بہ نہیں۔ ہمارے خیال میں تو اس قول سے بھی وہی رائے مستنبط کی جا سکتی ہے جس پر قاضی ابویوسفؒ پہنچے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فتنہ ہی فتنہ

سوال ۴:- از عبدالرشید۔ کشتواڑ۔

یہاں ایک مولوی صاحب جو محلہ کی مسجد میں امامت بھی کرتے ہیں اور بریلوی مکتب خیال کے حامی ہیں، ارشاد فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلعم کا جنازہ نہیں پڑھا گیا ہے۔ اُن کتب کا حوالہ عنایت فرمائیے جن میں حضور کے جنازے کا تذکرہ ہے۔ اور یہ کہ جنازہ کس نے پڑھا ہے تاکہ مولوی صاحب کو مطمئن کیا جا سکے۔

الجواب ۴:-

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر مسئلہ میں اطمینان اور بے اطمینانی کا سوال کیوں اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

حضورؐ کی نماز جنازہ پڑھی گئی یا نہیں پڑھی گئی یہ سوال کسی مورخ، کسی سیرت نگار، کسی اسکالر کے لئے تو مرکز توجہ بن سکتا ہے لیکن مسجد کے کسی امام یا ہمہ شما کے لئے آخر اس میں کیا دلچسپی ہے؟ ہمارا تو خیال یہ ہے کہ جو امام مسجد غیر ضروری مسائل اُبھارے اور خواہ مخواہ دماغوں کی پُرسکون فضاؤں میں بھونچال پیدا کرے اسے امامت سے الگ کر دینا چاہئے۔

متذکرہ امام صاحب اگر اپنی جہالت کے باعث یہ یقین رکھتے ہیں کہ حضورؐ کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی گئی تو چلئے ان کی جہالت انھیں مبارک۔ مگر یہ کیا مصیبت ہے کہ وہ اس قطعاً غیر ضروری موضوع کو موضوعِ گفتگو بھی بناتے ہیں؟ نیز خود آنجناب سے بھی شکایت ہے کہ آپ نے کیوں اس مسئلے میں دلچسپی لی۔ آپ کے علم میں اگر یہ ہے کہ نمازِ جنازہ ہوئی تھی تو آپ اپنی جگہ خوش امام صاحب اپنی جگہ خوش۔ اس کی کیا ضرورت ہے کہ آپ تحقیق کی فکر کریں اور پھر انھیں مطمئن فرمائیں۔

یہ سب بوالفضولی کے دائرے کی باتیں ہیں۔ امام صاحب نے اگر برسبیل تذکرہ کہہ ہی دیا تھا کہ حضورؐ کا جنازہ نہیں پڑھا گیا تو سننے والوں کو کہنا چاہئیے تھا کہ اچھا نہیں پڑھا گیا ہوگا ہمیں کیا لینا اور اگر سامعین میں سے کسی کو معلوم تھا کہ امام صاحب غلط کہہ رہے ہیں تو اسے بس اتنا کہہ دینا چاہئے تھا کہ فلاں کتاب میں آپ کے خیال کی تردید موجود ہے۔ اس پر امام صاحب مانتے یا نہ مانتے بات یوں ختم کر دینی تھی کہ سنیئے امام صاحب! وقت ورانرجی کی بربادی کے لئے پہلے ہی سے اختلافی مسائل کچھ کم نہیں ہیں۔ آپ ایک نیا مسئلہ کھڑا کر کے فتنے کی کاشت مت کیجئے۔ حضورؐ کی نمازِ جنازہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کی ادنیٰ سی بھی ضرورت عوام کو درپیش ہو۔ آپ جو کچھ بھی درست سمجھتے ہوں اسے دل میں رکھیئے ورنماز پڑھا کر اپنی تنخواہ اور روٹی لینے پر قناعت کیجئے

یہ تمہیدی گذارشات ذہن نشین کر لینے کے قابل ہیں۔ باہمی اختلافات اسی طرح تو بڑھتے ہیں کہ ہم ذرا ذرا سی غیر ضروری باتوں کو اہمیت دیکر لڑنا مرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ دراصل شیطان ہی دماغوں میں پیچ ڈالتا ہے کہ بیٹھے بٹھائے بحثیں اُٹھایا کرو۔ ہم اگر اہم اور غیر اہم، ضروری اور غیر ضروری کا فرق کرنے کا بیڑا اٹھالیں تو پھر سے تمام اختلافی بحثیں سرد خانے میں چلی جائیں گی اور ہر لحظہ جدل ونزاع کے زاویئے تراشنے والے دل و دماغ اتفاق وتعاون کی بنیادیں ڈھونڈنے پر مائل ہو سکیں گے۔

اب جواب سنیئے کہ حضورؐ کی نمازِ جنازہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کی تفصیل متعدد کتب حدیث کے علاوہ صحاح ستہ کی ایک کتاب "ابن ماجہ" میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب یوم سہ شنبہ کو حضورؐ کی تجہیز وتکفین کر لی گئی تو جسد مبارک گھر ہی میں ایک تخت پر رکھا گیا پھر مختلف جماعتیں ایک ایک کر کے آتیں اور نماز پڑھتیں۔ جب مرد فارغ ہو گئے تو عورتوں اور بچوں نے بھی علی الترتیب نماز پڑھی۔

ہاں یہ طے ہے کہ اس نماز کا امام کوئی نہیں تھا۔ نماز میں کیا پڑھا جائے یہ معاملہ بھی زیرِ غور تھا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ اور لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَسَعْدَیْکَ الخ پڑھو۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا تھا کہ ایک ایک جماعت جائے اور تکبیر کہے پھر دعا پڑھے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ لوگ جاتے تھے اور اپنی اپنی تکبیر کہہ کر دعا پڑھتے تھے۔ یہ ثابت نہیں کہ سب نے ایک ہی دعا پڑھی ہو۔

بہرحال حضورؐ کی نمازِ جنازہ پڑھا جانا معلوم ومعروف ہے۔ ہاں اس کی امامت بیشک کسی نے نہیں کی اور شاید یہی جزو امام صاحب کے دماغ میں خلط ملط ہو کر نمازِ جنازہ کے انکار کا موجب بن گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

دکان کے بورڈ

سوالؔ:۔ (ایضاً)

علمائے بریلی یہاں اکثر تشریف لاتے ہیں اور اُنکا رسالہ "نوری کرن" یہاں کے ماحول کے عین مطابق ہے۔ وہ اپنے آپ کو اہلِ سنت والجماعت کہتے ہیں اور باقی مسالک کو گمراہ اور بے دین قرار دیتے ہیں، لیکن علماءِ دیوبند بھی تو اہلِ سنت والجماعت سے منسلک ہیں۔ لیکن عقائد میں زمین وآسمان کا فرق کیوں ہے؟ یہاں کے لوگ محض اہلِ سنت والجماعت کا نام سُن کر علماءِ بریلی کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ براہِ مہربانی مفصل

تحریر فرمایئے کہ ایک ہی مسلک میں سے دو فرقے کہاں سے نکل آئے اور حقیقت کیا ہے تاکہ لوگ محض اہل سنت کے نام کے دھوکے میں نہ آئیں۔

الجواب :-

کیا آنجناب کے علم میں نہیں کہ جو لوگ حدیث کا انکار کر کے دین کا تیا پانچہ کر دینا چاہتے ہیں انھوں نے اپنا نام رکھا ہے اہل قرآن ؟ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جس کمیونزم کا خمیر ہی مطلق العنانی جبر و تشدد اور قہاری سے اٹھا ہے وہ اپنے آپ کو عوام کا خادم اور جمہوریت کا واحد علمبردار کہتا ہے ؟ اور کیا آپ کو اطلاع نہیں کہ آج کی تقریباً تمام ہی مسلم حکومتوں کے حکمراں اپنے آپ کو اسلام کا خادم بلکہ عاشق کہتے ہیں حالانکہ اسلام ان سے پناہ مانگتا ہے اور ساری بے اسلامیاں ان کے گھر کی لونڈی ہیں ؟

تو سیدھی سی بات ہے کہ پیتل کو پیتل کہہ کر سونے کے بھاؤ کوئی نہیں بیچ سکتا۔ برابر کا کھوٹ ملانے والے بھی سینہ تان کر یہی کہیں گے کہ جناب بالکل خالص سونا ہے تبھی اناڑی گاہک انھیں بھرپور دام ادا کر سکیں گے۔ ٹھیک یہی حالت اُن القاب و آداب کی ہے جو اکثر گروہ اپنے لئے منتخب کر لیتے ہیں۔

" اہل سنت والجماعت " ابتداءً کوئی لقب نہیں تھا بلکہ اسی طرح ایک بیانِ واقعہ تھا جس طرح چار ہاتھ پَیروں پر چلنے والے جانوروں کو " چوپایہ " کہہ دیتے ہیں۔ جو لوگ سنت کی راہ پہ چلتے اور معلوم و معروف عقائد میں اسلاف کا اتباع کرتے انھیں اہل سنت والجماعت کہہ دیا جاتا تھا۔ پھر اس نے گمراہ فرقوں کے بالمقابل ایک امتیازی نام کی حیثیت اختیار کر لی اور اس نام کی تقدیس و طہارت پر سوادِ اعظم کا ذہنی اتفاق ہو گیا۔ اب اس کی مثال سونے کی سی ہے کہ بریلوی مکتبۂ فکر اپنے کھوٹے اور کم قیمت عقائد کے سکوں کو پوری قیمت پہ چلانے کے لئے اپنا نام اہل سنت والجماعت رکھتا ہے۔ عوام بیچارے کیا جانیں اس بورڈ کے پیچھے کیا ہے۔ وہ دھوکا کھا جاتے ہیں اور سونے کے نام پر رانگ اور پیتل بکتا ہے۔

سچ پوچھئے تو حقیقت کے اعتبار سے اہل سنت والجماعت کہلانے کے اہل دیوبندی ہی علماء ہیں۔ گو کہ ان کے یہاں بھی کچھ نہ کچھ فساد در آیا ہے، تاہم باعتبار کثرت وہ اہلسنت والجماعت کہلائے جا سکتے ہیں۔ رہے بریلوی تو وہ چاہے اپنا نام کچھ بھی رکھ لیں مگر یہ حقیقت کبھی نہیں بدل سکتی کہ ان کے عقائد کی بنیاد قرآن و سنت کے محکمات پر نہیں متشابہات پر ہے اور متشابہات کے بارے میں خود قرآن ہی نے تصریح کر دی ہے کہ ان کے چکر میں بس گمراہ لوگ ہی پڑتے ہیں۔ توہم، غلو، تشدد، خود پرستی اور کند ذہنی۔ یہ ہے معجونِ بریلویت کا پورا نسخہ۔ یہ بیچارے اپنے آپ کو سب سے بڑا حنفی کہتے ہیں حالانکہ امام ابوحنیفہؒ کے مبلغ فکر اور منہجِ تفقہ سے ان کے فکر و تدبر کا فاصلہ ہزار میل سے کم نہیں۔

دعا کا مسئلہ

سوال :- (ایضاً)

اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کی عمر مقرر فرمائی ہے۔ کیا اس میں کمی بیشی ممکن ہے ؟ یعنی کیا کسی کی بددعا سے کوئی کام وقت مقررہ سے پہلے ہو سکتا ہے، یا دعائے خیر سے کسی کی عمر میں اضافہ ہو سکتا ہے ؟ اگر موت کا وقت اٹل ہے تو کیا علاج معالجہ اور گڑگڑا کر خدا سے عمر درازی کی دعائیں مانگنا بے سود نہیں ہے ؟

الجواب :-

معلوم ہوتا ہے آپ کو فرصت کافی ہے ورنہ کام کے لوگوں کو گڑے مُردے اُکھاڑنے کی مہلت کہاں۔ بندہ پرور! تقدیر کا مسئلہ عوامی اسٹیج پر چھیڑے جانے کا مسئلہ نہیں ہے۔ ویسے بھی حضورؐ نے اس پر بحث کرنے سے منع فرمایا ہے۔

خوب سمجھ لیجئے۔ ہر چیز اٹل ہے۔ تقدیریں لکھی جا چکی ہیں اور تقدیروں ہی میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ فلاں شخص فلاں وقت یہ دعا کرے گا۔ یہ علاج کرے گا یہ جد و جہد کرے گا وغیرہ دعا عبادت ہے۔ ہونا تو وہی ہے جو نوشتۂ تقدیر میں درج ہے۔ البتہ دعا کرنے والے کو ثواب مفت میں مل رہا ہے۔

یہ بھی سن لیجئے کہ تقدیر پر ایمان رکھنا اسلام کے بنیادی اُمور میں سے ہے۔ سعادت مند ہیں تو منطقی چون و چرا کے بغیر ایمان رکھئے۔ منطق سب کچھ دے سکتی ہے مگر دل کا اطمینان

اور روح کا نشاط نہیں دے سکتی۔ تقاریب کے مسئلہ میں بس یہی مصرع حرفِ آخر ہے:-

کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمہ را

(آپ کے باقی دو سوالوں کا جواب ماہنامہ اسلامی دنیا بابت ماہ جولائی ۱۹۶۳ء میں دیا جارہا ہے۔ تجلی کے لئے کبھی بیک وقت تین سے زائد سوالات نہ بھیجئے)۔

مولانا مودودی پر ایک اعتراض

سوال :- از حیدر علی - راجا ئم ٹیہ (میدک)

یہاں کے بعض حضرات سورۃ بقرہ کے رکوع نمبر ۲۹ کی پہلی آیت کہ صرف دو طلاق ہیں اس کے بعد رجوع کرلینے سے پھر سابقہ حالت عود کر آتی ہے گویا رجوع کرنا توبہ کی مصداق اور پھر تین طلاق کا حق حاصل رہتا ہے۔ ایسی ہی توضیح ترجمہ سے کرتے ہیں۔

مولانا مودودی صاحب کی تفہیم جس میں انھوں نے واضح کیا ہے کہ "دو طلاق کے بعد جب رجوع کیا جائے تو آئندہ زندگی بھر میں صرف ایک ہی طلاق پر تین طلاق بشمول سابقہ دو کے ہو جاتے ہیں۔"

اس توضیح کو یہاں کے بعض حضرات مولانا کی خود ساختہ بتلاتے ہیں۔

براہِ کرم تجلی کی قریبی اشاعت میں اس غلط فہمی کو مدلل پیش فرمائیں تو باعث تشکر ہوگا۔

الجواب :-

جہل مرکب کا مہلک مرض تھا تو پہلے بھی مگر اب یہ بلائے عام کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ جہل مرکب اسے کہتے ہیں کہ ایک مسئلہ سے آپ جاہل ہوں مگر خود کو اس کا عالم خیال کریں۔

جن معترض حضرات کا آپ نے ذکر کیا وہ اسی مرضِ خبیثہ کے مریض ہیں۔ انھیں خود فریبی کی محویت میں یہ بھی ہوش نہ آیا کہ مولانا مودودی کی تصریح پر اعتراض کرنے سے قبل یہ تو دیکھ لیں کہ دوسرے مفسرین و فقہاء کیا کہتے ہیں۔ اگر وہ دیکھ لیتے تو جہل مرکب کا بدنما مظاہرہ کبھی نہ کرتے۔

آیت	ترجمہ
آیت اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ (سورۂ بقرہ)	طلاق رجعی ہے دو بار تک اسکے بعد رکھ لینا موافق دستور کے یا چھوڑ دینا (ترجمہ شیخ الہند)

اس کی شانِ نزول ہی علماء نے یہ لکھی ہے کہ اسلام سے قبل مردوں نے یہ ظالمانہ وطیرہ اختیار کر رکھا تھا کہ بیوی کو طلاق رجعی دیتے پھر عدت کے خاتمے سے قبل رجوع کر لیتے۔ اس کے بعد جب جی چاہتا پھر یہی کرتے۔ اس طرح وہ زندگی میں دسیوں بار طلاق و رجعت کا کھیل کھیلتے جس سے عورت کی جان ضیق میں آجاتی۔ اللہ نے اسی ناپاک اور سفاکانہ صورتِ حال کا علاج کرنے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی۔ عربی تفاسیر کے حوالے عام قارئین کے لئے مفید نہ ہوں گے۔ لہٰذا ہم شیخ الہندؒ کے ترجمے اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی تفسیر والے قرآن کا حوالہ دیتے ہیں کہ اس آیت کا حاشیہ (نمبر۵) ملاحظہ فرمالیا جائے۔ وہاں نہ صرف یہ کہ وہی بات رقم کی گئی ہے جو مولانا مودودی نے رقم کی بلکہ اس آیت کا مفاد و مقصد بھی یہی بیان کیا گیا ہے۔ یعنی جو جاہل اور سنگدل لوگ بار بار رجعی طلاقیں دے کر رجوع کرتے رہتے ہیں وہ خدا کے نافرمان اور ظالم ہیں۔ رجوع کے بعد پچھلی حالت میں لوٹتی بلکہ طلاق نامۂ اعمال میں ثبت ہو جاتی ہے۔ دو بار طلاق اور رجوع کا کھیل کھیلنے کے بعد تیسری مرتبہ رجعت ممکن نہیں ہے۔

اِن جہلاء کو اور کسی ماخذ تک دسترس نہ ہو تو مولانا اشرف علیؒ کا بہشتی زیور ہی اٹھا کر دیکھ لیں۔ حصہ چہارم "تین طلاق دینے کا بیان" کے زیرِ عنوان مسئلہ نمبر ۱۵ میں یہ ملے گا:-

> "کسی نے اپنی عورت کو ایک طلاق رجعی دی پھر میاں راضی ہو گیا اور روک رکھا (یعنی رجعت کرلی) پھر دو چار برس میں کسی بات پر غصہ آیا تو ایک طلاق رجعی اور دیدی جس میں روک رکھنے کا اختیار رہتا ہے پھر جب غصہ اترا تو روک رکھا

اور نہیں چھوڑا یہ دو طلاقیں ہوچکیں اس کے بعد اگر کبھی ایک طلاق اور دیدیگا تو تین پوری ہوجاویں گی اور اس کا وہی حکم ہوگا جو ہم نے صـ۴۷ پر بیان کیا ہے کہ بے دوسرا خاوند کئے اس مرد سے نکاح نہیں ہوسکتا۔"

فرمائیے کیا ایک پرائمری پاس بچہ بھی صاف نہیں دیکھ سکتا کہ یہ وہی بات ہے جو مولانا مودودی نے کہی اور جسے جہل مرکب کے مریض مولانا موصوف کی "خود ساختہ" کہہ رہے ہیں؟

یہ بھی سن لیجئے کہ بہشتی زیور کے مسائل بڑی بڑی کتب فقہ سے لئے ہوئے ہیں، چنانچہ مکمل مدلل بہشتی زیور کے حواشی پر آپ یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ درّ مختار، عالمگیری اور دیگر مستند کتابوں کے حوالے موجود ہیں۔ یہ تصریح ان لوگوں کے لئے ہم نے کی جو مولانا اشرف علیؒ کا پایہ نہیں جانتے ورنہ جو لوگ آپ کی مرتبت سے واقف ہیں انھیں معلوم ہی ہے کہ ممدوح رحمۃ اللہ علیہ خود ساختہ باتیں نہیں کہتے بلکہ قرآن، حدیث اور فقہی دفتر پر گہری وسیع نظر رکھتے ہیں۔

حاصلِ جواب یہ کہ مولانا مودودی کی تفسیر سے عالمانہ اختلافِ رائے کا ہر شخص مجاز ہے لیکن جاہلوں اور متعصبوں کو اس وادی میں قدم رکھ کر اپنی رسوائی نہیں کرنی چاہئے۔

طلاق کا ایک خاص مسئلہ

سوال:۔ (ایضاً)

ایک صاحب ملازم سرکار ہیں اُن کی بیوی دو سال سے مرض دق میں مبتلا ہے۔ ظاہر ہے کہ تعلقات ازدواجی نہیں رکھے جاسکتے۔ وہ طلاق دینا چاہتے ہیں، دوسری شادی گورنمنٹ کی اجازت سے ہوسکتی ہے، لیکن وہ پہلی کو رکھ کر دوسرا عقد کرنا نہیں چاہتے۔ شرعی آڑ لیکر طلاق کا جواز قرار دیتے ہیں۔ اگر ان سے سوال کیا جائے کہ اگر وہی مرض مرد کو ہوتا تو کیا عورت تیمارداری سے اپنے کو فارغ کرلیتی اس پر وہ سکوت کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں کیا طلاق دی جاسکتی ہے؟ اگر طلاق دی جائے تو مریضہ کی تیمارداری اور دیکھ بھال کس کے ذمہ ہو۔ براہِ کرم اس کی بھی صراحت فرمائیے گا۔

الجواب:۔

اس مسئلہ کے دو پہلو ہیں۔ ایک قانونی۔ ایک اخلاقی۔

قانونِ شرعی تو یہ ہے کہ متذکرہ صورتِ حال میں شوہر چاہے طلاق دے چاہے اس بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرلے اسے اختیار ہے۔ طلاق دینے کی صورت میں صرف دورانِ عدّت کا نان نفقہ مرد پر واجب ہے اس کی ذمہ داری اس پر نہیں ہے کہ عدّت کے بعد عورت کیسے گذارہ کرے گی اور کون اس کا علاج یا تیمارداری کرے گا۔

اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا مرد کی آمدنی دو بیویوں کی متحمل ہوسکتی ہے؟ اگر ہوسکتی ہے تو یہ بات سفّاکی اور حیوانیت میں داخل ہوگی کہ بیچاری بیمار بیوی کو طلاق دیدی جائے۔ اگر بیوی کے ایسے رشتے دار موجود نہیں ہیں جو طلاق کے بعد اس کی کفالت کرسکیں تب اس حیوانیت کا پارہ اور بڑھ جائے گا۔

لیکن اگر مرد واقعتًا اتنی آمدنی نہیں رکھتا کہ دو بیویوں کو روٹی کپڑا دے سکے اور موجودہ بیوی بیماری یا کسی بھی وجہ سے اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ مرد کی جنسی ضرورت پوری نہیں کرسکتی تو توجہ کے قابل دو اور اُمور ہیں۔ ایک خود مرد کی اپنی کیفیت اسے دیکھنا ہوگا کہ کیا وہ جنسی خواہش کو دباکر زندگی بسر کرسکیگا۔ دوسرے یہ کہ طلاق کی صورت میں عورت کے لئے کوئی ٹھکانا ہے یا نہیں۔

اگر مرد کے جنسی جذبات مُردہ ہوچکے ہوں تب تو اسے طلاق اور نئے نکاح کے چکر میں نہ پڑنا چاہئے۔ گھرداری کے انصرام میں وہ خدّام سے بھی کام لے سکتا ہے۔ لیکن اگر جذبات مردہ نہیں ہوئے اور اندیشہ ہے کہ وہ گناہ کی راہ پر نکل جائیگا تو طلاق دینا ہی اولیٰ ہے۔ البتہ مطلقہ بیوی کی کفالت کرنے والا اگر کوئی نہیں ہے تو اسے ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ دینے کا اہتمام

مرد کو رکھنا چاہئے۔

گورنمنٹ کی اجازت کا معاملہ یہ ہے کہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے معقول وجہ ثابت ہوجانے پر اجازت مل جاتی ہے، لیکن اجازت نہ ملے تو اب مرد کو خود دیکھنا ہوگا کہ ملازمت کی خاطر وہ ایک بے گناہ عورت کو دردانگیز حالت میں بے یارو مددگار چھوڑ دینا پسند کرے یا اخلاقی تقاضوں پر ملازمت کو قربان کردے۔ یہاں مفتی کے دخل دینے کا کوئی معاملہ نہیں یہاں تو ہر شخص کی اپنی اخلاقی حِس کام کرے گی۔ قانون تو بہرحال مرد کو طلاق دینے کا اختیار دیتا ہے اور یہ معارضہ کوئی معارضہ نہیں ہے کہ خود مرد مریض ہوتا تو وہ یہ بات کیسے پسند کرلیتا کہ عورت اسے چھوڑ جائے۔ مرد اور عورت نکاح وطلاق کے معاملات میں برابر نہیں ہیں۔ خود اللہ تعالیٰ ہی نے مرد کو قوّام بنایا ہے اور نکاح وطلاق کی باگ مرد کے ہاتھ میں دی ہے تو اس افضلیت کو چیلنج کرنا مسلمان کے لئے کیسے ممکن ہے۔

قانونی واخلاقی دونوں پہلو ہم نے واضح کردیئے۔ قانون یہی ہے کہ مرد ہر حال میں طلاق دے سکتا ہے، یہ نافذ ہوگی اور عدت کے بعد مرد پر کوئی ذمہ داری عورت کی نہیں رہجائیگی اگر مطلقہ مریض ہے اور دنیا میں کوئی بھی اس کی کفالت کرنے والا موجود نہیں ہے تب بھی مرد کے ہاتھ سے اختیارِ طلاق کی باگ نہیں چھینی جاسکتی نہ اسے مجبور کیا جاسکتا ہے کہ بعد عدت بھی مطلقہ کا بارِ کفالت اُٹھائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ احکم۔

حج میں تجارت

سوال ۹:- از سہیل ادیب۔ مئوناتھ بھنجن۔

کیا حاجی کے لئے حج کے پہلے یا بعد حرم میں تجارت کرنا ممنوع ہے؟ اور کیا اگر کوئی حاجی کچھ سامان بغیر کسٹم فیس ادا کئے لیکے گھر چلا آیا تو وہ چور کہلائے گا اور اس کا فعل چوری کے مترادف ہوگا؟

ہمارے یہاں عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حاجی کے لئے تجارت کرنی ہی ممنوع ہے اور اس کا بغیر کسٹم دیئے ہوئے مال لیکے گھر چلا جانا "چوری" ہے۔ کیا ہندوستان کی حکومت کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف چلنے پر ہم شرعًا ماخوذ ہونگے؟

الجواب ۹:-

ہمیں شریعت کا کوئی ایسا حکم نہیں معلوم جس کی رو سے حج سے قبل یا بعد حاجی کے لئے تجارت حرام ہو۔ یہ خیال جن حضرات کا ہے ان کی دلیل معلوم ہونی چاہئے۔

البتہ متعلقہ حکومتوں کے قوانین کی خلاف ورزی بیشک جرم شرعی ہے۔ جو بھی کسٹم وغیرہ متعلقہ حکومتوں نے لگایا ہے اس کی ادائیگی کرنی چاہئے۔ ہندوستان کی حکومت ہو یا انگلینڈ اور انڈونیشیا کی۔ جو شخص جہاں کا شہری ہے وہاں کے قوانین کی پابندی اس کا فرض ہے۔ یہ تو ہوسکتا ہے اور ہونا چاہئے کہ کوئی بھی حکومت اگر کوئی ظالمانہ قانون بنائے تو وہاں کے باشندے آئینی حدود میں اس کے خلاف جدوجہد کریں اور اگر یہ قانون شریعت کے خلاف ہے تو اس کی تعمیل نہیں کرنی چاہئے لیکن دوسری تمام طرح کے قوانین کی پابندی امرِ ضروری ہے خصوصًا چنگی اور کسٹم وغیرہ کی ادائگی کا تاکیدی حکم تو احادیث سے ثابت ہے۔ کسی کے نزدیک اگر ہندوستان کے لگائے ہوئے کسٹم کی شرح ظالمانہ ہے تو اسے ہندوستانی عوام کو اپنا ہمنوا بنا کر آئینی جدوجہد اصلاحِ حال کی کرنی چاہئے۔ مگر جب تک وہ کامیاب نہ ہو حکومت کی معیّنہ شرح سے کسٹم ادا کرنا ضروری ہے۔ اس کے معاملے میں بددیانتی کرنا جرم ہوگا۔

بے راہ روی

سوال ۱۰:- (ایضًا)

یزید اور معاویہؓ کے بارے میں آپ کی رائیں پڑھ چکا ہوں اور ان سے کسی قدر اتفاق بھی رکھتا ہوں، لیکن میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں اکثر جگہوں پر ہمارا فعل ہمارے قول کے بالکل مخالف ہے۔

میں آپ کو اپنی بستی کے بارے میں بتاتا ہوں کہ یہاں کی اکثر آبادی اہل سنت والجماعت ہے۔ شیعہ صرف ایک گھرانہ ہے لیکن یہاں سے نکلنے والے تعزیوں کی تعداد بیس کے لگ بھگ ہوتی ہے اور سب یہی اہل سنت والجماعت

ہوسکتاہیں جو تعزیہ بناتے ہیں اور مجھے سخت تعجب اس وقت ہوتا
ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ یہاں کے رؤسائے ملت مولانا
حبیب الرحمٰن صاحب محدث اور مولانا عبد اللطیف صاحب
نعمانی ان باتوں سے واقف ہیں مگر کبھی کہیں پر بھی ان سے
اس کے خلاف کوئی بات نہیں سُنی گئی۔ بلکہ ان کے ان لوگوں سے
تعلقات بہت گہرے ہیں جو کہ تعزیہ نکالتے یا نکلواتے ہیں
آپ کا اس مسئلے میں کیا خیال ہے اور یہ سب تعزیہ بنانے
والے ہماری ہی جماعت کے لوگ ہوتے ہیں۔ میرا اُس وقت
ندامت سے سر جھک جاتا ہے جب کوئی دوسری جماعت
کا شخص یہ کہدیتا ہے کہ تم لوگوں کا ٹھیک ہی کیا ہے۔ آج
اپنے کو "سُنّی" کہہ رہے ہو اور کل محرم کے روز تعزیہ نکالوگے
کیا تعزیہ نکالنا سنّی ہونے کے متقابل ہے؟ ۔

الجواب:۔

جی ہاں مزیداری یہی ہے کہ کتنے ہی تعزیئے نام نہاد
سُنّی نکالتے ہیں۔ تعزیہ داری کی حرمت میں علماء حق
کی دو رائیں نہیں۔ لیکن برائیوں کے فروغ میں علماء و
اتقیاء کی یہی روش تو خوب معاون ثابت ہو رہی ہے کہ
وہ روزانہ وتروں میں اللہ تعالیٰ سے نخلع ونترک من
یفجرک کا اعتراف واقرار کرنے کے باوجود عملاً بے حسی کا
شکار ہیں۔ نام تو اچھے اچھے ہر بُرائی کے رکھے جاسکتے ہیں۔
دیکھ ہی لیجئے ناچ گانے کا نام کلچر اور ایکٹروں کا نام "اسٹار"
ہے۔ اسی طرح ہم بُرے کام کرنے والوں سے تعلق قائم رکھنے
اور بُرائیوں کو نظر انداز کرنے کا نام شفقت، رواداری،
نرمی رکھ لیتے ہیں مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ نام ہماری دینی بے حمیتی
اور دنیا سازی کے حسین غلاف ہیں۔ اگر اہلِ حق تمام ان لوگوں
سے یکسر تعلق منقطع کرلیں جو تعزیئے نکالتے ہیں یا دوسرے
فسق وفجور میں مبتلا ہیں تو پھر دیکھئے برائیوں کی کمر کس طرح
ٹوٹتی ہے۔

مختصر یہ کہ تعزیہ داری متفق علیہ طور پر گناہ ہے۔ ہم جو
بار بار کہتے رہے ہیں کہ خود سُنّی بھی گوناگوں معتقدات میں شیعیت
کا شکار ہوگئے ہیں وہ یونہی تھوڑی کہتے ہیں۔ ایک تعزیہ داری
کیا حضرت علی اور حضرت حسنین رضی اللہ عنہما کی توصیف و
منقبت کے انداز واسلوب میں بے شمار جھلکیاں رفض و
تشیع کی اچھے اچھے اہلِ علم سنیوں کے یہاں ملتی ہیں اور ہم جیسا
کوئی سرپھرا ان کی نشاندہی کردے تو اسے خارجی، یزیدی،
ناصبی اور نہ جانے کیا کیا کہا جاتا ہے۔ اللھم ارنا الحق
حقاً والباطل باطلاً۔

تین طلاقیں

سوال :۔ از معین الدین۔ حیدرآباد۔

یہاں پر ایک شخص جو اہل سنت والجماعت سے تعلق
رکھتا ہے، اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاق دے چکا ہے،
ظاہر ہے کہ اب رجوع نہیں کرسکتا، مگر یہاں پر ایک اہلحدیث
عالم ہیں انھوں نے فتویٰ دیا ہے کہ وہ شخص رجوع کرسکتا ہے
موصوف نے حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ جو شخص
ایک ساتھ تین طلاق دیتا ہے وہ ایک ہی شمار ہوتی ہے
اس لئے عدّت کے اندر رجوع کرسکتا ہے۔ اس فتوے سے
ہم لوگ حیران ہیں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا، لہذا
اہل سنت والجماعت کے دلائل تجلی کی قریبی اشاعت میں
تحریر فرمائیے تاکہ اہل سنت والجماعت مطمئن ہوجائیں۔ ہمیں
عالم صاحب سے مناظرہ نہیں کرنا ہے؟

الجواب:۔

اس مسئلہ پر کافی تفصیل سے ہم تجلی میں لکھ چکے ہیں لیکن
افسوس کہ "تجلی کی ڈاک" ابھی کتابی صورت میں شائع
نہیں ہوسکی اس لئے یہ کہنے سے معذور ہیں کہ یہ مسئلہ "تجلی کی
ڈاک" میں دیکھ لیا جائے۔

جو شخص مسلکاً اہل حدیث ہو اس کے لئے بالکل بجا
ہے کہ اہل حدیث عالم کے فتوے پر عمل کرے۔ لیکن جو حنفی ہو
اس کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ ضرورت پڑنے پر غیر حنفی
علماء سے فتویٰ لیتا پھرے۔ کسی معمولی سے معاملہ میں تو غرض
پرستی کی یہ راہ بُرے بھلے گوارا بھی کی جاسکتی ہے لیکن نکاح
طلاق کے مسائل میں یہ سخت مخدوش اور مہلک ہے۔

اہلِ حدیث علماء مختار ہیں کہ اپنے علم و فہم کے مطابق جو کچھ درست سمجھیں اسی کے موافق فتویٰ دیں، لیکن ہمارے نزدیک نہایت مضبوط دلائل سے یہ ثابت ہے کہ ایک وقت میں دی ہوئی تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں جن کے بعد رجوع ممکن نہیں۔ احادیث ہماری نظر میں بھی ہیں۔ پیچ کی بات یہ ہے کہ اہلِ حدیث حضرات اپنے مطلب کی روایات تو عوام کے سامنے اس طرح پیش کر دیتے ہیں گویا ان کے خلاف کوئی روایت کتبِ احادیث میں موجود ہی نہیں لیکن جن روایات سے احناف استدلال کرتے ہیں ان کی طرف اشارہ تک نہیں کرتے حالانکہ اہلِ حدیث دوستوں کی پسندفرمودہ روایات بعض منسوخ ہیں اور بعض قابلِ تاویل۔ یہی وجہ ہے کہ یک وقت تین طلاقوں کے واقع نہ ہونے کا مسلک یا تو رافضیوں نے اختیار کیا ہے یا اہلِ حدیث نے۔ ورنہ امت کا سوادِ اعظم تین کے وقوع پر متفق ہے۔ کیسے نہ ہو امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام اوزاعیؒ، امام نخعیؒ، امام ثوریؒ سب کی یہی رائے ہے۔ خلیفۂ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ اعلانِ عام کہ ایک وقت کی دی ہوئی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی، امام طحاویؒ کی معانی الآثار میں مضبوط سند سے مروی ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ جن احادیث سے بظاہر اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے وہ اگر منسوخ یا مؤول نہ ہوتیں تو عمر فاروقؓ جیسا صحابی ایسا اعلان کرتا۔ جو لوگ برابر یہی کہے جا رہے ہیں کہ تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی ہیں۔ وہ دراصل یہ کہہ رہے ہیں کہ عمر فاروقؓ نے علی الاعلان شریعت کے ایک فیصلے کو بدلا اور حضورؐ کے ارشاد کو اُلٹ دیا۔ شیعہ اور رافضی حضرات سے تو ایسی ناپاک بات کی توقع رکھنی ہی چاہیے، لیکن اہلِ حدیث دوستوں پر تعجب ہے۔ اس کی زد صرف ذاتِ عمرؓ ہی پر نہیں پڑتی۔ ہزاروں صحابہؓ اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں کیونکہ جب حضرت عمرؓ نے اعلانِ عام کیا تو کسی بھی صحابی نے اس سے اختلاف نہیں کیا جس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ ان سب کے نزدیک یہ اعلان شریعتِ محمدیؐ کے عین مطابق تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک وقت میں دی ہوئی تین طلاق کا مغلظہ ہونا تقریباً اجماعی مسئلہ ہے جس سے اختلاف کرنے والوں کا قول معتبر نہیں ہے۔ طلاق دینی ہے تو ایک دو۔ دو دو۔ یہ کیا کہ تین تین کی رٹ لگا رہے ہو اور پھر مفتیوں کا دروازہ کھٹکھٹاتے پھرتے ہو۔ تین تین ہی ہیں ایک نہیں غرض پڑنے پر اپنے ائمہ کو چھوڑ کر دوسروں کے دروازے جھانکتے پھرنا بندگی کی راہ نہیں مفاد پرستی اور بے راہ روی ہے۔

کیوں کا مرض

سوال ۱۲:- از عظمت اللہ شریف۔ ورنگل (آندھرا پردیش)

یہاں کے ایک غیر مسلم صاحب بہت دلچسپی سے وحیدالدین صاحب کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ لیکن ایک سوال میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ "خدا نے ہمیں کیوں پیدا کیا"۔ اُن سے کہا گیا کہ خدا ہمیں پیدا کر کے آزمانا چاہتا ہے، لیکن اُن کا کہنا یہ ہے کہ "خدا آخر پیدا ہی کیوں کرے اور پھر آزمائے ہی کیوں"۔ اس سوال کا جواب دینا ظاہر ہے آسان تو ہے نہیں۔ اگر تجلی میں شائع کریں تو اس قسم کے سوالات کرنے والوں کو مطمئن کرنے میں مدد ملے گی۔

الجواب ۱۲:-

ویسے تو آپ کا یہ سوال اور اس کے بعد کا سوال (جو آگے آرہا ہے) دونوں اس لائق نہ تھے کہ ان سنجیدہ صفحات میں شامل کئے جاتے لیکن کبھی کبھی لطیفے بھی سنجیدگی میں ملاحت پیدا کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔ بس اسی خیال سے انھیں شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے۔

یہ سوال تو بہت بعد کا ہے کہ خدا نے ہمیں کیوں پیدا کیا اور کس لئے وہ ہمیں آزمانا چاہتا ہے۔ پہلے تو آپ ان غیر مسلم صاحب سے یہ دریافت کیجئے کہ آپ کی ناک آنکھوں اور منہ کے درمیان کیوں ہے آنکھوں سے اوپر پیشانی پر کیوں

ممکن ہے۔ کیا حرج تھا اگر کانوں کی جگہ آنکھیں ہوتیں اور آنکھوں کی جگہ فقط ایک بڑا سا کان لٹک رہا ہوتا تاکہ اس سے مکھیاں اڑائی جاسکتیں۔

"کیوں" ایک ایسا مرض ہے جس کی نہ کوئی تھاہ ہے نہ علاج۔ یہ پوری کائنات تو بہت بڑی ہے۔ یہ "پورا انسان" تو اپنے اوصاف و خصوصیات کے اعتبار سے نہایت وسیع و عریض ہے۔ فقط ایک چہرے کے بارے میں "کیوں" کی بحث طویل چھیڑ دی جائے تو سوالات کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا جو کام کے لوگ ہیں وہ کبھی "کیوں" کے گورکھ دھندے میں نہیں پھنستے لیکن کام چور اور خیال پرست لوگ سوائے چوں چرا کے کچھ کر کے نہیں دیتے۔

ان غیر مسلم صاحب کو متانت کے ساتھ سوچنا چاہئے کہ ہر روز متعدد ایسے کام کرتے ہیں جن کی توجیہہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ ایسا کرنے کو ان کا دل چاہتا ہے۔ کیوں چاہتا ہے یہ زلف در زلف معمہ ہے اس کے چکر میں پھنس کر تو صبح سے شام تک فقط ایک دلی خواہش کی بھی عقلی توجیہہ ممکن نہیں ہوسکتی۔ تو اتنی بڑی کائنات جس انسان کی خاطر اللہ نے پیدا کی ہے اس کی تخلیق پر "کیوں" کی گردان کرنا ظاہر ہے اپنا اور دوسروں کا وقت برباد کرنے کے سوا کسی بھی نتیجے تک نہیں پہنچا سکتا۔ خدا نے ایک کام کرنا چاہا اور کر دیا۔ کیوں چاہا؟ اس کا جواب وہ دے جو خدا کا رازدار اور مشیر ہو۔ اگر متذکرہ غیر مسلم صاحب کو اپنے قیمتی اوقات صحیح مصرف میں لگانے ہیں تو سوچنے کی بات یہ نہیں ہے کہ آدمی کیوں پیدا کیا گیا، غور کرنے کی بات یہ ہے کہ پیدا شدہ انسان کے فرائض کیا ہیں۔ اسے اپنے پیدا کرنے والے کے ساتھ کس نوع کا تعلق رکھنا چاہئے۔ اس تعلق کے عملی تقاضے کیا ہیں۔ دنیا میں زندگی گذارنے کا صحیح اور معیاری طریق کیا ہے۔ وغیر ذلک۔

تضادِ مبین

سوال ۱۳: (ایضاً)

ایک مسلم تعلیم یافتہ جو مغربی مفکرین سے زیادہ مرعوب ہیں کہتے ہیں کہ محمد نے خدا، آخرت اور رسالت کی جو تعلیم دی تھی وہ دراصل ایک اسٹیٹ قائم کرنے کے لئے ایک پالیسی ہے۔ اس طرح محمد لوگوں کے ذہنوں میں ایک عقیدہ راسخ کر کے اپنا کام بنانا چاہتے تھے۔ اس طرح خدا، آخرت اور رسالت کی تعلیم (نعوذ باللہ) محمد کی ایک ڈپلومیسی تھی۔

امید کہ آپ اس پر مختصراً ہی لکھ کر ان کے الزام کو غلط ثابت کریں گے۔

الجواب ۱۳:—

میں نے ایک گورے آدمی کو دیکھا کہ اس کا سارا بدن بالکل سیاہ تھا۔ میں نے آگ کی بہت بڑی بھٹی دیکھی جس کی وجہ سے کئی کئی میل تک کی فضا یخ بستہ ہوگئی تھی!

ان فقروں پر آپ چونکیں گے اور خیال کریں گے کہ لکھنے والے کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ لیکن میرے بھائی جو خیالات آپ نے مغرب زدہ صاحب کے ذکر کئے ان کی موجودگی میں انھیں "مسلم" کہنا بھی ان فقروں سے کم مضحکہ خیز اور چونکا دینے والا نہیں ہے۔ آگ اگر پانی نہیں ہوسکتی، سیاہی کو اگر سفیدی نہیں کہا جاسکتا تو پھر ایسے شخص کو "مسلم" بھی نہیں کہا جاسکتا جس کی ذہنی حالت یہ ہو۔

جو کچھ ان صاحب نے کہا وہ کوئی الزام نہیں ہے جس کی صفائی کی جائے۔ وہ تو ہذیان ہے بلکہ اس سے دیوانے کی بڑ ہے۔ اس کی صفائی تو درکنار اس کا سننا بھی کوئی شریف آدمی پسند نہیں کرسکتا۔

اہمیت یہاں اس ہذیان کی نہیں بلکہ اہم بات دیکھنا ہے کہ جن مسلمانوں کا ان صاحب سے کوئی تعلق ہے انھوں نے ان کفریات کو سن کر کیا طرز عمل اختیار کیا۔ ان کا ردِ عمل کیا رہا۔ ایسے شیطان زدہ شخص کو اگر اب بھی احباب و اعزا مسلمان ہی سمجھ رہے ہیں اور اس سے قرابت و محبت کے تعلقات حسب معمول رکھے ہوئے ہیں تو انھیں سمجھ لینا چاہئے کہ آگ کے غار میں وہ بھی پہنچے۔ جو کچھ ان صاحب نے کہا وہ

کفرِ صریح ہے۔ بدترین قسم کا الحاد ہے۔ ایسا شخص تائب نہ ہو تو اسلامی عدالت اس کے قتل کا فیصلہ دے گی۔ اسلامی عدالت نہیں ہے تو کم سے کم یہ فرض بہرحال ان کے ملنے جلنے والے مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے کہ یکسر ان سے ہر طرح کا تعلق منقطع کرلیں۔ روزانہ وتر میں اقرار کیا جاتا ہے کہ نخلع ونترک من یفجرک۔ اگر صرف فسق و فجور ہی کسی شخص سے انقطاعِ روابط کے لئے کافی ہیں تو کفرِ مبین سے بڑھ کر انقطاعِ کامل کے لئے اور کیا چیز درکار ہے۔

کسی بھی اعتراض والزام کا جواب دینے سے ہم گھبراتے نہیں، لیکن اعتراض اور بکواس، الزام اور ہذیان میں فرق کرنا بہرحال ہر سمجھدار آدمی کا فرضِ منصبی ہے لہٰذا بجائے جوابدہی کے ہم صرف مشورہ ہی پیش کر سکتے ہیں کہ متذکرہ مسلم صاحب سے تمام روابط ختم کر دیئے جائیں اور اس دھوکے میں نہ رہا جائے کہ وہ اب بھی مسلمان ہیں۔

پوتوں کی وراثت

سوال ۴: از ملک رئیس الرحمٰن خاں۔ غازی پور۔

زید کی زندگی ہی میں اس کا بیٹا انتقال کر گیا تو اب زید کا پوتا زید کی جائداد میں سے کچھ بھی نہیں پا سکتا۔ وہ محجوب ہو گیا۔ ایسا کیوں؟

الجواب: پوتے کی وراثت کے مسئلے پر تجلی میں بارہا لکھا جا چکا ہے آپ غالباً اس کے پرانے قاری نہیں۔ لہٰذا بقدرِ گنجائش جواب پھر پیش خدمت ہے۔

وراثت کا معاملہ فقط ایک جذبے کا معاملہ نہیں ہے وہ ایک ٹھوس، معقول اور مبنی بر اصول قانون کا معاملہ ہے جسے رحم اور صدقہ و خیرات کی بنیاد پر نہیں بلکہ خون کے رشتوں پر استوار کیا گیا ہے۔ فرض کیجئے آپ ایک دولت مند آدمی ہیں، آپ کے پڑوس میں ایک نہایت غریب کنبہ آباد ہے۔ رحم و شفقت کا جذبہ محجوب الارث پوتے کو وارث قرار دینے پر ذہن و قلب کو آمادہ کرتا ہے ٹھیک وہی جذبہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس غریب پڑوسی کو آپ کی دولت میں کافی حقِ وراثت ملنا چاہئے۔ نیز اگر آپ کے چار بیٹے ہیں اور دو ان میں سے بہت بڑی تنخواہوں کے ملازم اور دو بے کار ہیں تو یہی جذبہ کہتا ہے کہ آپ کے ترکے میں اول الذکر بیٹوں کو کم اور مؤخر الذکر بیٹوں کو زیادہ ملنا چاہئے۔

لیکن آپ یا اور کوئی معقول آدمی جذبۂ مذکورہ کے ان تقاضوں کو غلط ہی قرار دے گا اور دنیا کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ یہ تقاضے کبھی معقول نہیں سمجھے گئے۔ پھر آخر ایک پوتے ہی کا معاملہ ایسا کیوں ہو گیا کہ بجائے قانون اور اصول کو دیکھنے کے ہماری نگاہ فقط جذبۂ رحم پر جم جائے اور جن بنیادوں پر اللہ نے قانونِ وراثت بنایا ہے انھیں نظر انداز کر کے ہم فقط سطحی میلان کو معقولیت کی مسند پر متمکن کر دیں۔

وراثت کا قانون تین بنیادی ضابطوں پر مبنی ہے۔

(۱) کسی بھی شخص کا مال اس کی موت ہی کے بعد مالِ وراثت بن سکتا ہے۔ جیتے جی وہ اس کا اپنا ہے اور کسی عزیز و قریب کا ادنیٰ سا حصہ بھی اس میں بطورِ وراثت نہیں ہے۔

(۲) مالِ وراثت زندوں ہی میں تقسیم ہو گا۔ جو لوگ صاحبِ مال کی زندگی ہی میں مر چکے ہیں ان کا حصہ ترکے میں نہیں لگایا جائے گا چاہے وہ زندہ وارثوں کے مقابلہ میں صاحبِ مال کے زیادہ قریبی رشتہ دار رہے ہوں۔ مثلاً زید کا بیٹا بکر تھا جو زید کی زندگی ہی میں مر گیا۔ اب زید مرتا ہے تو اس کا ترکہ زندہ وارثوں کو پہنچے گا۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ مرحوم بیٹے کو وارث قرار دے کر دوسروں کو محروم کر دیا جائے۔

(۳) مالِ وراثت وارثوں کے ظاہری و مادی احوال کی مناسبت سے تقسیم نہیں ہو گا بلکہ خونی رشتوں کے اعتبار سے بٹے گا۔ یعنی یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ جن جن لوگوں کو از روئے قانونِ وراثت کا حصہ پہنچ رہا ہے ان میں کون غریب ہے کون امیر، کون کماؤ ہے کون بیکار۔ کون مرحوم کا دوست رہا ہے اور کون مرحوم کی خدمت کرتا رہا ہے۔ یہ سب کچھ نہیں، جتنا جس کا حصہ بن رہا ہے وہ اسے ملے گا چاہے ظاہری احوال کچھ بھی ہوں۔

ان بنیادی قواعد کو سامنے رکھ کر غور کیجئے مرحوم شخص کا بیٹا

اس کی زندگی ہی میں فوت ہوگیا وہ شخص مر جائے تو اس کے ترکے میں اس مرحوم بیٹے کو حصّہ دار بنانے کا کونسا تُک ہے۔ مرحوموں کو حصہ دار بنانا تو اسلام ہی کیا کسی بھی قانون میں معقول نہیں سمجھا جاتا۔ پھر آخر پوتوں کے محروم رہ جانے میں کیا الجھن اور تعجب ہے۔ پوتوں کا بجائے خود مستقلاً وارث نہ ہونا تو سب جانتے ہیں کہ ایک مسلّمہ امر ہے۔ اسلام ہی میں نہیں کسی بھی دستور میں یہ قاعدہ موجود نہیں ہے کہ مرنے والے کے بیٹا بیٹی کی موجودگی میں بھی پوتوں نواسوں کو ترکہ میں سے حصہ ملے گا۔ یعنی پوتوں نواسوں کا معاملہ لڑکیوں جیسا نہیں ہے کہ چاہے لڑکوں کے مقابلہ میں انھیں نصف ملے مگر ملے گا ضرور۔ پوتوں کو تو ایک حبّہ بھی نہیں ملتا اگر ان کا باپ زندہ ہے۔ کسی بھی ملک و قوم کے قانونِ وراثت میں یہ نہیں دکھایا جاسکتا کہ مرنے والے کے جو بیٹا بیٹی زندہ موجود ہیں ان کی اولادوں کو بھی دادا نانا کے ترکے میں سے کچھ نہ کچھ حصّہ مل کر رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پوتا پوتیوں کا بجائے خود مستقل وارث ہونا دنیا کے کسی بھی قانونِ وراثت میں تسلیم نہیں کیا گیا۔ لہٰذا یہ اعتراض و احتجاج تو مہمل ہوگا کہ اسلام نے کیوں ایسا نہ کیا۔ اب رہا وہ اعتراض اور تحیّر کہ یتیم پوتوں کو محروم کیوں کیا گیا تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی یوں پوچھے کہ غریب ہمسائے کو دولت مند ہمسائے کی وراثت سے کیوں محروم کیا گیا۔ جواب ظاہر ہے کہ قانونِ وراثت کا جوڑ رحم اور داد و دہش کے جذبے سے نہیں لہو کے تعلق سے ہے۔ غریب ہمسائے کو رحم کھا کر آپ لاکھوں روپے دیدیں لیکن قانونِ وراثت کی عمارت جن اصول پر اٹھی ہے ان کی رو سے یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ قانوناً بھی یہ ہمسایہ مالِ وراثت میں حصہ دار ہے ٹھیک اسی طرح کسی یتیم پوتے کو متوفی کے زندہ ورثاء رحم کھا کر چاہے کتنا ہی حصّہ دیدیں لیکن قانوناً اس کا کوئی حق مالِ وراثت میں نہیں ہے۔ حق اسی صورت میں مانا جاسکتا ہے جب اس بنیادی قاعدے کو توڑ دیا جائے کہ وارث صرف زندہ اشخاص ہوں گے۔ پوتوں کا جو باپ خود اپنے باپ کی زندگی ہی میں مر چکا ہے اسے اب زندہ فرض کر کے آپ شریکِ وراثت بنا دیں تب ہی یہ ہو سکتا ہے کہ اس کا حصّہ اس کی زندہ اولاد کی طرف منتقل ہو جائے۔ لیکن اس صورت میں فقط پوتوں ہی کی کیا خصوصیت ہے۔ پھر تو مرحوم کی بیوی اور دیگر اعزاء تک بھی حصّے پہنچنے چاہئیں۔ آخر ہم مرتے ہیں تو ہمارے ترکہ میں فقط ہمارے بیٹا بیٹی ہی تو حصہ دار نہیں ہوتے بیوی کا بھی حصّہ ہوتا ہے۔ نیز بات فقط پوتوں ہی تک کیوں محدود رہے نواسا نواسیوں نے کیا خطا کی ہے۔ اگر ایک مرحوم بیٹے کو زندہ فرض کر کے وارث مانا جاسکتا ہے تو ایک مرحوم بیٹی کا بھی یقیناً یہی حق ہونا چاہئے۔ مثلاً زید کی بیٹی چند بچے چھوڑ کر زید کی زندگی ہی میں مرگئی۔ اب زید مرتا ہے تو جس طرح مرے ہوئے بیٹے کو وارث مان کر اس کا حصّہ پوتوں کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اسی طرح اس مری ہوئی بیٹی کو بھی وارث مان کر اس کا حصّہ ورثاء کی طرف منتقل کرنا چاہئے۔ اس کے وارثوں میں شوہر بھی ہے اور بیٹا بیٹیاں بھی۔

اور پھر بات اسی حد تک پر کیسے رُک جائے گی۔ جب مرحوموں کو زندہ فرض کر کے شریکِ وراثت کرنا درست مان لیا گیا تو پھر کسی بھی مرحوم کو چاہے وہ مورث سے کوئی بھی رشتہ رکھتا رہا ہو اس انوکھے قاعدے سے کیوں نوازا نہیں جائے گا۔ سوچئے اگر یہی قاعدہ چل جائے تو وراثت کے قانون کا کیا مضحکہ بنے گا۔

دراصل پوتوں کی وراثت کے معاملہ کو اُن مغرب زدہ متجددین نے ہوا دی ہے جو اسلام سے جاہل اور متنفر ہونے کے باوجود خود کو مفکرِ اسلام اور نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہیں ان کا سب سے محبوب مشغلہ یہ ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے عوام کو علماء و فقہاء سے متنفر کریں، یہ یقین دلائیں کہ علمائے سلف تنگ نظر اور کم سمجھ تھے، مغربی طرزِ فکر کو دماغوں میں اُتاریں اور ان پابندیوں کی دھجیاں بکھیر دیں جو اسلام نے انسان کے اعمال و کردار پر عائد کی ہیں۔ عوام بیچارے کم علم ہیں۔ انھیں قانونی و فقہی گہرائیوں کا کیا شعور۔ انھوں نے تو بس اتنا سوچا کہ بیچارے یتیم پوتوں کو وراثت میں حصّہ مل جائے تو اچھی ہی بات ہے، لیکن اس سے آگے اُن محکم ترین اور

شیرازہ بنا، اصولوں کو ذرا بھی زیرِ غور نہ لاسکے جن کا شیرازہ ان کے سطحی جذبۂ رحم سے بکھر جاتا ہے۔ قوانین یک رُخے جذبوں کی اساس پر نہیں بنا کرتے ان میں گوناگوں عقلی مصالح کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا کم علم اور کم فہم لوگوں کو کیوں اور کیسے کے چکر میں پڑنے کے بجائے علمائے حق پر اعتماد کرنا چاہیئے اور جو بات ان کے ذہن و شعور کی دسترس سے باہر ہے اس میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ آخر کیا آپ کے لئے اتنا ہی جان لینا کافی نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک سے آج تک کسی بھی صحابی، تابعی، امام، شیخ، فقیہ اور اسلامی مفکر نے ادنیٰ سا بھی شبہ اس میں نہیں کیا کہ پوتوں کا محجوب الارث ہونا ہی انصاف و معقولیت کے عین مطابق ہے۔ کیا آپ یا کوئی بھی معقول آدمی یہ خیال کرسکتا ہے کہ پونے چودہ سو سال کے تمام علمائے حق کو اتنی عقل نہ آئی جتنی آج کے بعض بدبنے مفکرین اور مغرب زدہ متجددین کو آئی ہے معاذ اللہ۔ یہ بدبخت لوگ اس مسئلہ کو من مانے انداز میں اُچھال کر عامۃ الناس کو یہ تصور دیتے ہیں کہ تمام علمائے سلف و خلف تنگ دل ہیں جاہل ہیں کم عقل ہیں بے رحم ہیں۔ حالانکہ اصلاً ان لوگوں کا نشانہ خود اسلام ہے۔ خود قرآن و سنت ہیں۔ یہ کھل کر تو یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتے کہ اللہ اور رسولؐ ظالم ہیں۔ حالانکہ اصلاً ان لوگوں کے قلوب کو اللہ اور رسولؐ ہی سے بیزاری ہے۔ اسلام سے تنفر ہے کیونکہ اسلام مغربی ملمع تہذیب کی تحسین کرنے کی بجائے اس کا ابطال کرتا ہے اور عیاشی و تن آسانی کا مخالف ہے لیکن یہ لوگ آڑ لے لیتے ہیں رب زبانی کی اور مجرم ٹھیرا دیتے ہیں علماء کو حالانکہ علماء کا قصور س سے زیادہ کچھ نہیں کہ انھوں نے قرآن و سنت کے احکام و صول کو سینے سے لگا کر پوری پوری عمریں تفقہ اور شرعی امین کی تدوین و ترتیب میں بتادیں۔ پوتوں کو محجوب انھوں نے ہیں کیا ہے بلکہ وہ تو خود اللہ اور رسولؐ کے قانون میں محجوب یں انھوں نے صرف یہ کیا ہے کہ اللہ اور رسولؐ کے فیصلوں سرِ تسلیم خم کردیا ہے اور پوری امتِ مسلمہ کو ان فیصلوں سے ہی کھی ہے۔ پوتوں کے معاملہ کی آڑ لیکر انھیں بے رحم اور تنگ دل قرار دینے والے رحم و فیاضی کے پیکروں نے کیا کبھی یہ بھی کہا ہے کہ غریب ہمسائے کو شریکِ وراثت کرنا یا دولت مند بیٹے کو مفلس بیٹے کی برابر حصۂ وراثت دینا ظلم ہے؟ اگر نہیں کہا تو کیوں نہیں کہا؟ جو سطحی اور غیر معقول جذبہ پوتوں کے لئے حقِ وراثت کا طالب ہے، اسی کا تقاضا تو یہ بھی ہے کہ سیٹھ کے مرنے پر مفلس پڑوسی مالا مال ہوجایا کریں اور جو بیٹا لاکھوں کا مالک ہے اسے باپ کی جائداد میں اس لئے حصہ نہ دیا جائے کہ دوسرا بیٹا نہایت مفلس ہے۔ یا دیا ہی جائے تو برائے نام۔ زیادہ حصہ مفلس بیٹے کو عطا کیا جائے کیونکہ رحم و عدل کا ظاہری تقاضا تو یہی ہے! — رحم اگر قانونِ وراثت پر اثر انداز ہوسکتا ہے تو پھر تو یہ قانون قانون ہی نہیں بچوں کی گیند بن جائے گا۔ خوب سمجھ لیجئے قوانین کی تنابیں موم اور دھاگوں کی نہیں فولاد کی ہوا کرتی ہیں۔ اصول جذباتی ترنگوں کے غلام نہیں ہوا کرتے حکمراں اور رہنما ہوتے ہیں۔ پوتوں پر رحم کھا کر جس کا دل چاہے قارون کا خزانہ عطا کردے لیکن قانوناً انھیں ایک پائی کا بھی حصہ دار ماننا یہ معنی رکھتا ہے کہ قانونِ وراثت کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔

حمل کی مدت

سوال ۱۵:— (ایضاً)

ایک بیوہ کو اگر دو سال یا ڈھائی سال (اس کے شوہر کی موت کے بعد) تک بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے باپ کا وارث ہوتا ہے؟

الجواب ۱۵:—

جی ہاں ہوتا ہے۔ بالعموم مدتِ حمل نو دس ماہ ہے لیکن اس سے کم اور زیادہ کا بھی عام مشاہدہ ہے۔ ایسے واقعات بھی نادر نہیں ہیں کہ حمل پیٹ میں دو ڈھائی سال تک رہا ہے لہٰذا جب تک مضبوط دلائل سے یہ نہ ثابت ہو کہ عورت نے [illegible] اس کا بچہ مرحوم باپ ہی کا مانا جائے گا۔ خود عورت اقرار زنا کرلے یا اس کے زنا کا مشاہدہ چار آدمی کرلیں تب تو یقیناً حرامی کہلائے گا لیکن مجرد اس وجہ سے اسے حرامی نہ کہہ سکیں گے

باپ کی موت کے دو ڈھائی سال بعد پیدا ہوا ہے۔

اگر کہا جائے کہ شوہر کی موت کے وقت یا اس کے چند بعد تک کوئی علامت حمل کی نہیں پائی جا رہی تھی اس سے معلوم ہوا کہ بعد میں زنا کیا گیا ہے اور بچہ اسی زنا کا ثمرہ ہے تو یہ استدلال بھی کمزور ہوگا۔ شاذ و نادر سہی لیکن ایسا ہو بہر حال سکتا ہے کہ نطفہ قرار تو پا جائے لیکن کافی دن تک نشو و نما پائے جسم کی بعض خرابیاں ایسے اتفاق کو ممکن بنا دیتی ہیں لہٰذا امکان و اشتباہ کی موجودگی میں عورت پر الزام زنا ثابت نہیں مانا جائے گا۔ یہ الزام بہت سخت ہے اور شریعت اس کیلئے غیر مشتبہ اور قطعی شواہد کی طالب ہے۔

بریلوی مذہب

سوال ۱۶ :- از محمد یعقوب - کراچی -

یہ بریلوی فرقہ کہاں سے اور کس طرح ایجاد ہوا اور اسکی جڑ بنیاد کیا ہے؟ کیا حقیقت میں یہ گورنمنٹ کی ایجاد ہے۔ جیسا کہ سنتے ہیں یا اپنی ہوا و ہوس کی بنا پر انھوں نے دین کو بگاڑنا اپنا شعار بنایا ہوا ہے۔ احمد رضا صاحب نے جو ترجمہ کیا ہے اسمیں غیر اللہ کو جو کہ انسان ہونے سے تعلق رکھتے ہیں بُت قرار دیا ہے اور تفسیر نعیمی والے نے ایاک نعبد کی تفسیر میں گیارھویں، اور تیجہ، چہلم، دسواں وغیرہ فٹ کیا ہے۔ جاء الحق و زہق الباطل لاہور اچھرہ سے شائع ہوئی اس نے کو د الکفر اور غلو کیا ہوا ہے۔ ناچیز کا منشاء صرف یہ ہے کہ ہندوستان میں پہلے دیوبند کی درسگاہ قائم ہوئی یا بریلی میں سچا دین حجاز سے آیا؟ عوام کو یہ نہیں معلوم کہ کس لئے ایسا کر رہے ہیں جو نہ قرآن کریم سے ثابت ہے اور نہ عقل سلیم سے۔

الجواب ۱۶ :-

یہ فیصلہ کہ بریلوی مذہب انگریزوں کا ساختہ پرداختہ ہے اہل تحقیق ہی کر سکتے ہیں ہمیں اس سلسلے کے تاریخی واقعات کا زیادہ علم نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور جانتے ہیں کہ جب علمائے حق نے انگریز کے خلاف علم بغاوت اٹھایا تھا اور اس کی ناانصافیوں کے مقابلہ میں سر ہتھیلی پر رکھ کر جم گئے تھے اس وقت بریلوی مکتبۂ فکر کے علماء نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور علمائے حق کو کچلنے والے انگریزی اسلحہ خانے میں بریلوی علماء کے تشدد دانہ فتوے بھی بطور ہتھیار شامل تھے۔

تاہم یہ وقتی لغزش علماءِ بریلی کی اصل کجی نہیں ہے بلکہ اصل کجی ہے زاویۂ فکر کا فاسد ہونا۔ کیمرے کا لینس خراب ہو تو حسین سے حسین شے کی تصویر بھی ناقص آئے گی۔ اسی طرح آدمی کا فکری زاویہ ٹیڑھا ہو تو وہ ہمیشہ ٹیڑھے ہی راستے کو صراطِ مستقیم سمجھے گا۔

خلاصہ یہ کہ بریلوی عقائد کے سائے۔ سے بھی دور بھاگیے یہ دل و دماغ میں ظلمتیں بکھیر کر علم اور عقل دونوں کا خانہ خراب کر دیتے ہیں۔ پہلے دیوبند میں مدرسہ قائم ہوا یا پہلے بریلوی مذہب نے جنم لیا، یہ لاحاصل بحث ہے۔ دین کی اساس تو پہلے دن سے قرآن و سنت ہیں اور قرآن و سنت کا بے لاگ مطالعہ بریلوی طرزِ فکر کی کھُلی تردید کرتا ہے۔

سایۂ رسولؐ

سوال ۱۷ :- از سید محمد - بمبئی -

میں اگرچہ آپ سے عقائد میں اختلاف کرتا ہوں پھر بھی تجلی کبھی کبھار پڑھا کرتا ہوں۔ میں علمائے بریلی کے مسلک کا ہوں "نوری کرن" جو بریلی سے ماہوار نکلتا ہے میں اس کا خریدار ہوں۔ شمارہ نمبر ۳ ماہ جون میں عقائد دیوبند پر فریقین کی بحث ہے۔ میں یہ رسالہ آپ کو بھیج رہا ہوں آپ خود بھی مطالعہ کیجئے اور کسی ایک مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالئے تجلی کی قریبی اشاعت میں۔ مجھے بذریعہ وی پی جواب والا تجلی روانہ کیجئے۔

مومن گجرات لائبریری میں تجلی آتا تھا مگر اب بند ہو گیا ہے اس لئے اب پڑھنا بھی بند ہے۔ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ ہونے کا رد تجلی میں لکھا ہے میں اسکی تفصیل کی تعریف کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ ویسی ہی تفصیل نوری کرن کے جواب میں اختیار کریں گے۔ میں جانتا ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ تھا۔ یہی بہت سے

ثبوت نوری کرن میں پڑھے ہیں اور ایک ثبوت مولوی ابوالوفا صاحب شاہجہانپوری کے بیان سے بھی مجھ کو ملا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ دائی حلیمہ نبی کریم ؐ کو اپنے مکان پر لے گئیں تو آپ کے نور سے اندھیری کوٹھری روشن ہو گئی اور دائی حلیمہ ہمیشہ آپ کو ساتھ رکھتیں جب اندھیری کوٹھری میں کوئی چیز تلاش کرنی ہوتی تھی کیونکہ آپ کے نور سے کوٹھری روشن ہو جاتی تھی۔

الجواب :-

"نوری کرن" مجھے بھی بھیجا جا رہا ہے لیکن یہ اپنی صورت و سیرت دونوں اعتبار سے ایسا رہا کہ بندہ تو اس کے مطالعہ کی اہلیت اپنے اندر نہ پا سکا۔ خراب کتابت خراب چھپائی عربی عبارتیں غلط۔ گیٹ اپ یعنی صوری ہیئت ذوق سلیم کو مرجھا دینے والی۔ طرز تحریر پست، غیر متین اور ناپختہ۔ علمی گہرائی کا دُور دُور پتہ نہیں۔ ان تمام اوصاف کی موجودگی میں اس کے سوا کوئی چارہ سمجھ میں نہ آیا کہ جب یہ آئے تو بند کا بند الماری میں رکھ دیا جائے۔

حضورؐ کا سایہ ہونے نہ ہونے پر میری معروضات آپ بھی پسند فرما چکے ہیں۔ رہا مولوی ابوالوفا صاحب کا نقل فرمودہ استدلال تو اس کی حیثیت فقط اتنی ہے کہ جہلاء اور حمقاء کو بہکا دیا جائے۔ بریلوی مکتب فکر کا اصول ہی یہ ہے کہ مشکوک، ضعیف، متشابہ اور غیر صریح روایات کو دانتوں سے پکڑو اور صریح و محکم روایات سے نظر بچالو یا ان کی ایسی تاویلات کرو کہ فرشتے تک انسانی ذہن کی اس کاریگری پر عش عش کرتے رہ جائیں۔ ذرا اندازہ کیجئے۔ یہ حلیمہ دائی والی روایتیں تو کسی درجے میں بھی مضبوط نہیں مگر انھیں مولوی ابوالوفا جیسے لوگ آنکھوں سے لگاتے ہیں اس کے مقابلہ میں بخاری و مسلم کی جن روایات سے اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے ان پر نظر ہی نہیں ڈالی جاتی۔

پھر ہم پوچھتے ہیں کیا ایک ذرا سا ہیرا تاریک کوٹھری میں ہلکی سی روشنی نہیں پھیلا دیتا؟ اگر پھیلا دیتا ہے تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ ہیرے کا سایہ نہیں پڑتا؟ اللہ کے بندو! چراغ یا بلب یا پیٹرومکس یا ہیرا اگر روشنی خارج کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ روشنی ہی کی طرح ان کا بھی کوئی ٹھوس وجود نہیں آپ ان میں سے ایک ایک چیز کو دھوپ میں رکھ کر دیکھئے سایہ پڑے گا اور ضرور پڑے گا۔ تو اگر حلیمہ دائی والی روایات درست بھی ہوں تو اس سے یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ جسم مطہر بھی ٹھوس نہیں تھا۔ یہ جسم اگر روشنی خارج کرتا رہا ہے تو یہ چشم ما روشن دل ماشاد، لیکن روشنی خارج کرنے والی اشیاء بجائے خود تو غیر مرئی اور بے جسم نہیں ہوا کرتیں۔

الحاصل سایہ نہ ہونے پر کوئی مضبوط دلیل نہیں اور سایہ ہونے کی بے شمار دلیلیں ہیں۔

نئے ادارے

سوال ۱۸ :- از علاؤ الدین۔ نیچ کینٹ۔

یہاں چند ایسی سوسائیٹیاں مسلمانوں کی بنی ہیں جن میں ہر ممبر ماہ بماہ مبلغ پانچ روپے ادا کرتا ہے جس سے ایک کافی رقم جمع ہو جاتی ہے۔ اس جمع شدہ رقم میں سے حسب ضرورت اپنے ہی ممبر قرض لیتے ہیں مثلاً اگر کسی ممبر نے مبلغ نوّے روپے بطور قرض کمیٹی سے لئے تو اسکو ادائیگی کے وقت مبلغ سو روپے دینے ہوں گے۔ لہٰذا از روئے شریعت ایسے لین دین کا کیا حکم ہے؟

الجواب ۱۸ :-

یہ دس زائد روپے اگر قرض ادا کرنے والے کی ملکیت سے خارج قرار پا کر سوسائٹی کی ملک ہو جاتے ہیں تب تو یہ ربٰو ہے۔ البتہ اگر ان پر ملکیت ادا کرنے والے ہی کی مسلّم رہے اور دیر سویر کسی نہ کسی مرحلے میں یہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہوں تو سود کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔

ویسے اس طرح کے اداروں سے بچنا ہی اولیٰ ہے کیونکہ دین سے لاپرواہی یا علم کی کمی کے باعث ان میں جلی یا خفی طور پر ایسی صورتیں ظہور میں آتی ہی رہتی ہیں جو فاسد کا سبب ہیں۔

مسلمانوں کی شرک نوازیاں

سوال[۱۹]:— از محمد عثمان۔ ضلع چمپارن (بہار)

(۱) یہاں بستی میں ایک دینی درسگاہ ہے اس کی ملازمت کے امیدوار ہو کر ایک عالم دین بزرگ تشریف لائے۔ دوران تذکرہ میں حضور صلعم کا ذکر خیر آگیا اور بات یہاں تک پہنچی کہ آیا حضورؐ کا سایہ تھا یا نہیں۔ ان بزرگ نے جواب میں ارشاد فرمایا قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتَابٌ مُّبِيْنٌ (کیا آپ کو معلوم نہیں کہ نور کا سایہ نہیں ہوتا) کیا مندرجہ بالا آیت کا ترجمہ یہی ہے؟ اور حضور صلعم کا سایہ نہیں تھا؟

(۲) پھر جمعہ کے خطبے میں ان ہی بزرگ نے فرمایا کہ آنحضرتؐ کے رتبہ کا کیا پوچھنا ہے۔ حضورؐ تو حضورؐ ہی تھے۔ آیئے آپ کو حضورؐ کے غلاموں کے غلام کا رتبہ بتاؤں۔ حضرت بڑے پیر ایک بار وضو کے لئے بیٹھے ان کا خادم خاص پانی لئے کھڑا تھا۔ یکایک ان کی نگاہ اوپر اٹھ گئی اور وہ عالم استغراق میں تھے۔ کچھ دیر کے بعد جب ان کی محویت ختم ہوئی تو اپنے خادم کی طرف جو وضو کا پانی لئے کھڑا تھا متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ "ابھی میں عرش پر دربار خداوندی میں حاضر تھا کہ جنتیوں کی فہرست نظروں سے گذری اس میں میں تمہارا نام ڈھونڈھتا رہا مگر کہیں نہیں پایا میں بہت تشویش میں پڑ گیا۔ پھر خداوند کریم سے لڑ جھگڑ کر تمھارا نام جنتیوں کی فہرست میں درج کرایا۔" اس واقعہ کی کیا حقیقت ہے؟

(۳) یہاں بستی میں ایک با فیض مزار ہے۔ ذی الحجہ کی نویں اور دسویں تاریخوں میں ہزارہا خدا کے بندے اور بندیاں عید قرباں جیسے تہوار میں بھی گھروں سے نکل کر مرادوں سے اپنا دامن بھرنے کی خاطر جمع ہو جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ امسال اس مبارک تقریب کے بعد ہی مزار کے سامنے انکے ذمہ داروں کی طرف سے ایک وعظ کی مجلس منعقد کی گئی اس میں ایک عالم دین بزرگ نے وعظ میں فرمایا کہ (انا اعطیناك الكوثر۔ دلے نبی ہم نے تمھیں کثرت کا مالک بنادیا) یعنی زمین آسمان چاند سورج' رزق' حیات اور موت سب کا مالک بنا دیا۔ اور اس کے ثبوت میں انھوں نے بہت سارے واقعات پیش کئے۔ مثلاً حضورؐ چاند کے مالک اس طرح ہوئے کہ آپؐ نے اشارہ کیا اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ اگر وہ بجائے حضورؐ کے خدائے تعالیٰ کی ملک میں ہوتا تو وہ اپنے مالک خداوند قدوس سے دریافت کر لیتا کہ میں تیرے رسولؐ کی بات مانوں یا نہیں؟ مگر اس نے ایسا نہیں کیا' بلکہ حضورؐ کا اشارہ پاتے ہی حکم کی تعمیل کی۔ اسی طرح کے شواہد اور واقعات سے وہ حضورؐ کی ملکیت پوری کائنات پر ثابت کرتے رہے۔ لوگ اس سے بہت اثر لے رہے ہیں! مہربانی فرما کر اس کی پردہ کشائی کیجئے۔

الجواب[۱۹]:—

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ ہونا ایک خود ساختہ عقیدہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں چند سال قبل اس پر ہم بہت تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں جسے انشاء اللہ مجوزہ کتاب "تجلی کی ڈاک" میں شامل کر دیا جائے گا۔

جس استدلال کا آپ نے یہاں ذکر کیا اس کا بھی شافی کافی جواب دیا جا چکا ہے۔ یہ جاہلوں کو بہکانے والے عالم اتنا نہیں سوچتے کہ تشبیہ میں دو چیزوں کے درمیان مکمل یکسانی مفہوم نہیں ہوتی' بلکہ کسی وصف خاص میں اشتراک ہوا کرتا ہے۔ متذکرہ آیت میں اول تو یہی طے نہیں کہ نور سے مراد حضورؐ کی ذات ہے یا وہ دین جو قرآن ہی کے الفاظ میں نور اور روشنی ہے دوسرے یہ مان بھی لیں کہ مراد حضورؐ ہی کی ذات ہے تو اس کے سوا کوئی مطلب نہیں نکلے گا کہ حضورؐ کی ذات علم و حی اور اخلاق حسنہ کا مصدر و مرکز ہے' اس سے دنیا بھر میں علم و اخلاق کا نور پھیلا اور دلوں کی سیاہیاں دھل گئیں جس طرح آپ محبوب کو چاند سے تشبیہ دیتے ہیں اور مطلب یہ نہیں ہوتا کہ محبوب جملہ اوصاف و خواص میں چاند کی مانند ہے بس ایک وصف خاص "حسن وجمال" میں تشبیہ مقصود ہوتی ہے اسی طرح اگر حضورؐ کو نور کہا جائے تو مقصود صرف اتنا ہی ہوگا کہ جس طرح نور' ظلمت کو مٹا دیتا ہے اسی طرح حضورؐ کی قولی و عملی تعلیمات نے کفر و معصیت کی تاریکیاں مٹائیں اور دنیا بھر کو روشنی عطا کی۔

(۲) اس طرح کی کہانیاں موٹی عقل اور فالی عقیدت والے نیازمندوں کی گھڑی ہوئی ہیں جہلاء کو پھانسنے میں یہ چارے کا کام دیتی ہیں اور شکم پرست واعظین ان سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان پر علمی بحث تو جب ہو جب کہ ان کی کوئی اصل بھی ہو۔ بے اصل اور من گھڑت کہانیوں پر بحث کون کرے اور کیا کرے۔

(۳) مزاروں کی آفت تو ہر طرف ہے۔ شیطان نے اللہ سے کہا تھا کہ میں زندگی بھر تیرے ماننے والوں کی راہ میں گھات لگاؤں گا اور انھیں طرح طرح کی تاریک راہوں پر بھٹکا کر رہوں گا اسی شیطانی وسیہ کاری کے مظاہر دنیا میں بکھرے پڑے ہیں اور ان میں بہت نمایاں مظہر یہ ہمارے "مزار" ہیں۔

رہی وہ نکتہ سنجی جو انا اعطینك الكوثر کے تحت واعظ صاحب نے کی ہے وہ ان کے ذہنی بگاڑ کا ثبوت اور قلبی فساد کی دلیل ہے۔ ایسے واعظوں سے بچئے یہ وقت، دماغ اور دل برباد کرنے کے سوا کوئی خدمت انجام نہیں دیتے۔ صحیح عقیدہ یہ ہے کہ ذرّے سے لیکر چاند سورج تک اور تحت الثریٰ سے لیکر آسمانوں کی آخری بلندیوں تک ہر شے کا مالک پہلے بھی اللہ ہی تھا اور آج بھی اللہ ہی ہے۔ تمام انبیاء بشر تھے، بندے تھے، ان کے معجزات ان کی اپنی قوت وقدرت کا مظہر نہیں تھے بلکہ اللہ ہی کے اشارے پر ظہور میں آتے تھے۔ چاند اور سورج تو بڑے اجرام ہیں، ایک بے حقیقت ذرّے اور تنکے پر بھی ملکیتِ تامہ کبھی کسی کو نہیں ہوئی نہ آئندہ ہو سکے گی حتیٰ کہ دنیا کے سب سے بڑے انسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی کبھی ایک پل کے لئے بھی کسی بے مقدار ذرّے تک کے مالکِ کل نہیں ہوئے مالکِ کل سے مراد یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ہر شے کا کامل طور پر مالک ہے اور جو فیصلہ وہ اس کے بارے میں کر دے اس میں کوئی دخل نہیں دے سکتا اس طرح کی کامل مالکیت کبھی کسی کو نصیب نہیں ہوئی اور نہیں ہو سکتی۔ چاند اگر حضورؐ کے اشارے سے دو ٹکڑے ہو جاتا ہے تو اس سے یہ معنی ایک احمق ہی نکال سکتا ہے کہ اللہ تو حضورؐ کو مسندِ خدائی عطا کر کے ایک طرف جا بیٹھا تھا اور اب حضورؐ کو مطلق اختیار واقتدار حاصل تھا کہ چاند کے ٹکڑے کریں یا سورج کو واپس لوٹائیں۔ یہ معنی صریح شرک ہیں۔ جو بھی معجزہ ظہور میں آیا اللہ کے حکم پر آیا۔ علمائے حق اس عقیدے پر متفق ہیں کہ معجزات خود انبیاء کے اپنے بس میں نہیں ہوتے۔

بقدرِ گنجائش جواب ہم نے دیدیا لیکن کم سواد واعظوں کی مارے کم علم عوام کو بچانا ایسے جوابوں کے بس کا روگ نہیں واعظوں کی دکان چمکتی رہے گی اور دینِ حق گوشۂ عزلت میں منھ چھپائے ٹھنڈی آہیں بھرتا رہے گا۔ فیا حسرتا۔

حضرت خدیجہؓ کا مہر

سوال نمبر ۲: — از سید خواجہ نصیرالدین اورسیر۔ گدوال

معلوم ہوا ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کا مہر مبارک ۱۲½ اوقیہ یا ۵۰۰ درہم تھا۔ ایک درہم کتنا ہوتا ہے؟ اور ہندوستانی سکہ کے لحاظ سے اس کی قیمت کتنی ہوتی ہے۔ واضح طور پر لکھیں؟

الجواب: —

انگریزی سکہ کے اعتبار سے ایک درہم تقریباً سوا چار آنے کا بیٹھتا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ مہر فاطمیؓ کم وبیش ۱۳۵ روپے ہوا۔ احوال اور زمانے کے تغیرات سے مختلف ممالک کے سکوں کی قدر وقیمت میں کیا کچھ فرق واقع ہوا ہے اس کا پتہ وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو ریاضی اور معاشیات کے ماہر ہوں ہم فقط اتنا ہی جانتے ہیں کہ آج اگر کوئی مہر فاطمہ باندھے اور سکوں میں اس کی تفصیل نہ کرے تو احتیاطاً ۱۴۰ روپے واجب ہونے چاہئیں۔

ویسے ایک تنبیہ یہاں ہم ضرور کریں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنا بے شک بہت بڑی سعادت ہے لیکن کچھ امور ایسے بھی ہیں جن میں زمانی ومکانی تغیرات اور مصالح کا لحاظ کئے بغیر سنّت کی پیروی کرنا بڑی نزاکتیں رکھتا ہے۔ مہر کی قدر وقیمت ایک اضافی شے ہے۔ مرد اگر لکھ پتی ہے تو دو چار ہزار روپے کے مہر کی اس کے معاملہ میں کوئی بھی حیثیت نہیں اور اگر غریب ہے تو ہزار روپے بھی کافی

وزن رکھتے ہیں۔ مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ مہر اتنا ہو جو مرد کی مالی حیثیت کے اعتبار سے کچھ وزن اور قیمت رکھتا ہو۔ اگر مرد یہ مہر بوقت نکاح ہی ادا کر دے تب بھی اسے یہ احساس ضرور ہوگا کہ میں نے ایک قیمتی شے خریدی ہے اور اگر مہر بطور قرض اس کے ذمہ رہے تب بھی وہ اس کی اہمیت اور وزن محسوس کرے گا۔ یہی احساس ہے جو بارہا مرد کے غم و غصہ کے لئے لگام ثابت ہوتا ہے جسے ڈھیل ہو کر کھٹ سے طلاق دیدینا بہت زیادہ عام ہو جاتا اگر مہر کا تسمہ لگا ہوا نہ ہوتا۔ مہر معجل کی صورتوں میں بھی اس مصلحت کی افادیت مسلّم ہے۔ اگر بوقتِ نکاح ہی مہر ادا کر رہا ہے تب بھی فائدہ یہ ہوگا کہ مرد کے دماغ میں یہ احساس جاگزیں رہے گا کہ اس نے ایک قیمتی شے خریدی ہے اور اگر ادا تو نہیں کیا مگر یہ شرط طے ہو گئی ہے کہ جب بھی عورت طلب کرے گی مہر دینا ہوگا (یہ بھی مہر معجل ہی کی صورت ہے) تو بھی افادیت ظاہر و باہر ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت نہایت مفلس تھے جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ سے آپ کا نکاح ہوا۔ پانچسو درہم ان کے لئے ایک خاصی بڑی رقم تھی۔ وہ فوراً ہی تو اسے ادا کرنے کی پوزیشن ہی میں نہ تھے۔ بعد میں بھی ادا کرنا خاصا دشوار ہوتا اگر مالی حالت یہی رہتی۔ لہٰذا مہر کے معاملہ میں سنت دراصل مہر فاطمہ کی ظاہری رقم نہیں ہے بلکہ وہ نسبت ہے جو اس رقم اور حضرت علیؓ کی مالی حالت کے مابین پائی جا رہی تھی۔ آج اگر ایک شخص اپنی بیٹی کا نکاح ایک لکھ پتی سے کرتا ہے اور بطور سنت مہر فاطمہ باندھتا ہے تو ہمارے خیال میں یہ سنت کی ایسی ہی پیروی ہوگی جیسے زید کی پیروی بکر اس طرح کرے کہ زید کے قدموں نے جو نشان کسی کچی سڑک پر بنائے ہیں بکر ٹھیک ان پر قدم رکھتا ہوا چلے۔ یہ بظاہر تو نقشِ قدم پر چلنا ہے لیکن فی الاصل بے عقلی ہے۔ اسی طرح سنت اس مقدار کو سمجھ لینا جو حضورؐ نے مہر فاطمہ کی معین کی تھی معقولیت، ژرف نگاہی اور حکمت سے بعید ہے۔ مہر کا مقصود مرد کو یہ احساس دلانا ہے کہ عورت کا جسم کوئی بے قیمت شے نہیں ہے۔ اسی پر اختیار حاصل کرنا ہے تو قیمت بھی غیر معمولی ادا کرنی ہوگی حضرت علیؓ نادار و تہی دست تھے ان کے اندر پانچ سو درہم کا مہر بھی یہ مطلوبہ احساس پیدا کرنے کے لئے کافی تھا۔ لیکن آج آپ شاید ایک فقیر اور قلاش کے قلب و دماغ میں بھی مہر فاطمہ والی رقم سے اس احساس کا سایہ تک پیدا نہیں کر سکتے۔ تب مقصودِ سنت اور مہر کی مصلحت کا تقاضا کہاں پورا ہوگا اگر آج آپ نے سنت کے شوق میں مہر فاطمہ کو اختیار کیا۔ یہ تو وہ رقم ہے کہ سو دو سو روپے ایک مزدور، ایک رکشا چلانے والا، ایک محرر اور چپراسی بھی چٹکی بجاتے ادا کر سکتا ہے۔

ایک اور بات۔ مان لیجئے آپ نے اپنی بیٹی کا مہر، مہرِ فاطمہ باندھ کر سنت کا ثواب کما بھی لیا مگر خود بیٹی کی حق تلفی تو آپ نے کر ہی دی۔ عورت کا یہ حق ہے کہ مہر میں اسے ایک معتد بہ رقم ملے۔ رقم کونسی معتد بہ ہوگی اور کونسی نہیں اس کا انحصار ظاہر ہے کہ مالی پوزیشن پر ہے۔ جس مرد سے اپنی بیٹی کی شادی کرنے آپ جا رہے ہیں وہ اگر فرض کیجئے ایک ایسا تاجر ہے جو آج کل دس ہزار سالانہ کی آمدنی پر انکم ٹیکس ادا کر رہا ہے اور کچھ دکانیں کچھ زمینیں بھی اسکی ملکیت میں ہیں تو کون احمق ہے جو یہ کہہ سکے کہ دو چار سو کی رقم اس کے لئے معتد بہ ہوگی۔ آپ کی بیٹی کا بجا طور پر حق ہے کہ اس مرد سے بیاہی جانے کی صورت میں مہر کم سے کم ڈھائی تین ہزار باندھا جائے۔ مہر فاطمہ باندھ دیا تو یہ ایسی کورانہ سنت پسندی ہوگی جسے مہر کی بجائے "مہر کا مذاق" کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس مرد اگر کروڑ پتی ہے تو مہر بھی ایسا ہی ہونا چاہئے کہ اس کی حیثیت کے اعتبار سے اسے معتد بہ کہا جا سکے۔ دو چار ہزار میں لڑکی حوالے کر دینا یہ معنی رکھے گا کہ آپ نے خسارے کا سودا کیا۔

شرمانے کی بات نہیں۔ خود خالق کائنات ہی نے عورت کے جسم کو ایک ایسی شے قرار دیا ہے جس پر تصرف مالی ذمہ داری قبول کئے بغیر جائز ہی نہیں پھر کیوں نہ ہم اپنی بیٹیوں کے فطری اور جائز حق کا کما حقہ لحاظ رکھیں۔

انصاف یہی ہے کہ مہر اتنا ہو جو مرد کی مالی پوزیشن کے لحاظ سے نہ تو بے حقیقت قرار پائے نہ اتنا زیادہ ہو کہ ادا کرنا جوئے شیر لانا ہو۔ آپ کو معلوم ہوگا حضرت عمرؓ نے ایک بار مہر کی مقدار پر پابندی عائد کرنی چاہی تھی لیکن ایک بوڑھیا نے برسرِ عام اس خلیفۂ وقت کو ٹوک دیا تھا کہ اے امیر المومنین! خدا نے تو فلاں آیت میں مہر کے معاملہ میں کامل آزادی دی ہے پھر تمھیں کیا حق ہے کہ پابندیاں لگاؤ۔ اور امیر المومنینؓ نے شرمندہ ہو کر کہا تھا کہ افسوس ہے مجھ پر۔ مجھ سے زیادہ عالم تو بوڑھی عورتیں ہیں۔ پھر آپ نے پابندی کے خیال سے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔

ساری داستان سرائی کا مطلب یہ ہے کہ مہرِ فاطمہ اگرچہ تقریباً ۱۳۵ روپے ہے اور بادی النظر میں اسے مسنون بھی کہہ سکتے ہیں لیکن جو لوگ آج احوال و ظروف پر نظر کئے بغیر محض سنت کا ثواب لوٹنے کے لئے اپنی بیٹیوں کا مہر، مہرِ فاطمہ باندھ دیتے ہیں وہ نیک دل تو کہے جا سکتے ہیں، مگر دانشمند نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

نسلی امتیاز

سوال[۲۱] :۔ از محمد انوار بیگ۔ حیدر آباد سندھ۔

عرصہ دراز سے یہ مشاہدہ کیا جا رہا ہے کہ ہند میں (مراد ہند و پاکستان) سادات اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے برتر خیال کرتے رہے ہیں اور اُن کا کہنا ہے کہ آلِ رسول ہونے کی حیثیت میں اُن کو عامۃ المسلمین پر فوقیت حاصل ہے بنا بریں دیگر مسلمان اُنھیں عظمت دیتے رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طبقہ میں احساس کمتری اور دوسرے طبقہ میں احساس برتری پیدا ہوتا چلا گیا جو قرآن اور منشائے حدیث کے خلاف ہے۔ لہذا اسی کے پیش نظر چند استفسارات کر رہا ہوں جو درج ذیل ہیں

(ا) سید کہلانے کی وجہ؟

(ب) سادات کا سلسلہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟

(ج) بقول ایک روایت کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ کے متعلق یہ فرمایا تھا کہ یہ دونوں جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں اگر اس لحاظ سے انھیں اور اُن کی اولاد کو سید کہا جائے تو اس سلسلہ میں کئی ضمنی سوالات پیدا ہوتے ہیں:۔

(۱) کیا سید لقب ہے یا خطاب؟ اگر سید لقب یا خطاب ہے تو حسنین کریمینؓ کی اولاد کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے آباء کے لقب کو اپنے اوپر چسپاں کریں اور اس نسبت سے سید کہلائیں جیسے کرنل کا بیٹا کرنل نہیں ہو سکتا اور قاضی کا بیٹا قاضی نہیں ہو سکتا۔ اگر سادات کا سلسلہ حضرت علیؓ سے چلا ہے تو کیا وجہ ہے کہ حضرت فاطمہؓ کی اولاد سید کہلانے کی مستحق ہے اور حضرت علیؓ کی دوسری ازواج سے جو اولاد ہیں وہ سید کہلانے کی مستحق نہیں؟

ایک روایت ہے کہ حضرت امام حسنؓ کے متعلق حضورؐ نے فرمایا کہ یہ میرا بیٹا سید ہے مسلمانوں کے دو بڑے گروہ میں صلح کرا دے گا۔ اگر اس نسبت سے سید کہا جاتا ہے تو صرف امام حسنؓ ہی سید کہلانے کے مستحق ہیں نہ کہ امام حسینؓ؟ اگر سادات کا سلسلہ حضورؐ کی صاحب زادی حضرت فاطمہؓ کی نسبت سے ہے تو ایشیائی قانون کے تحت بیٹی کے نسب سے کوئی سلسلہ نہیں چلتا

(د) کیا اسلام میں حسب نسب کو فوقیت حاصل ہے یا تقویٰ اور پرہیزگاری کو۔ اور کیا سادات کو آلِ رسول ہونے کی حیثیت سے کوئی فوقیت حاصل ہے اور اُن کا احترام سید ہونے کی حیثیت سے ہم پر واجب ہے؟ اہل بیت کی جو عظمت حضورؐ نے بیان فرمائی ہے تو کیا یہ عظمت قیامت تک ہونے والی سادات نسل کے لئے ہے؟

الجواب[۲۱] :۔

آپ نے سوال در سوال کی زحمت فضول اٹھائی۔ قرآن کی فقط ایک آیت ساری ایں و آں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ تم میں سے جو زیادہ متقی ہے وہی اللہ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔ تقویٰ خدا سے ڈرنے کو کہتے ہیں اور خدا سے ڈرنا یہ ہے کہ مسلمان کا کردار قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو، اور وہ اخلاقِ حسنہ پر جان دیتا ہو۔ بس بات ختم ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری خطبہ بھی اسی حقیقت کا اعلان ہے۔

رہی یہ بات کہ کیا حسب و نسب کی بنیاد پر کوئی شرف کسی کو حاصل ہو سکتا ہے یا نہیں تو ہم کہیں گے کہ بے شک حاصل ہو سکتا ہے لیکن اس شرف کی کچھ حدیں ہیں۔ مثال سے بات سمجھ میں آئے گی۔ گھی ایک عمدہ چیز ہے۔ آپ کو ماننا پڑے گا کہ تیل اور چربی پر اسے شرف اور فوقیت حاصل ہے، لیکن ایک ایسے سالن کا تصور کیجئے جس میں گھی تو خوب ڈالا گیا ہو لیکن نمک اتنا جھونک دیا گیا ہو کہ ایک لقمہ نگلنا مشکل ہو جائے۔ یا مرچیں بھر دی گئی ہوں۔ یا پکایا ٹھیک طور پر نہ گیا ہو۔ ان تمام حالتوں میں کوئی بھی شخص محض اس لئے اس سالن کو شوق سے نہیں کھائے گا کہ اس میں گھی پڑا ہوا ہے۔ اسے یا تو نالی میں بہایا جائے گا یا کتوں کی خوراک بنا دیا جائے گا۔

ٹھیک اسی طرح کا معاملہ "شرفِ سیّدی" کا سمجھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبی رشتہ رکھنا بلا شبہ ایک شرف ہے، سعادت و امتیاز ہے۔ لیکن سیّد صاحب اگر کردار کے معاملے میں ہیٹے ہوں اور تقویٰ سے ان کی جھولی خالی ہو تو ان کی مثال متذکرہ سالن جیسی ہوگی۔ شرف کو کیا لیکر چاٹیں جبکہ گناہ اور خدا فراموشی کی غلاظتوں نے اس شرف کو اسی طرح ضائع کر دیا ہے جس طرح کڑوا نمک اور پکانے کی خرابی سالن کے نفیس گھی کو ضائع کر دیتی ہے۔ سیّد صاحب اگر متقی ہوں، عقائد صحیحہ کے حامل ہوں اور اس غرور و تکبر سے خالی ہوں جو ہر بھلائی کو فاسد و متعفن کر دیتا ہے تو بے شک وہ لائق احترام ہیں اور ان کا "شرفِ سیدی" سونے پر سہاگہ ہے۔ ہم دل سے ان کی تکریم کریں گے کیونکہ سرکارِ رسالت ﷺ سے نسلی رشتہ بہر حال ایک خداداد اعزاز ہے جس پر حسد نہیں شکر نعمت کا اظہار کرنا چاہئیے۔

حدیث میں جو حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو جوانانِ جنت کا سردار کہا گیا ہے وہاں سیّد سے مراد نسل و نسب نہیں ہے۔ وہاں تو فقط یہ مراد ہے کہ ان معظم نواسوں کے زمانے میں جتنے مسلمان جوان مرے ہیں ان کی سرداری جنت میں ان دونوں کو ملے گی۔ جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حضور نے بوڑھوں کا سردار فرمایا۔ وہاں بھی یہی مراد ہے کہ جتنے بوڑھے مسلمان ان کے زمانے میں مرے وہ جنت میں ابو بکر ہی کے زیرِ سیادت ہوں گے۔

سلسلۂ نسب تو بے شک باپ ہی سے چلتا ہے لیکن اوّل تو حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی حضور ہی کے خانوادے میں سے تھے دوسرے سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہونا بہر کیف ایک خونی رشتہ ذاتِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رکھتا ہے لہٰذا اس رشتے کا احترام ہر مسلمان کے دل میں ہونا چاہیئے۔ البتہ احترام کو اعتدال سے گذارنا حماقت ہے جیسا کہ سالن میں ٹھیک مقدار سے دوگنا گھی جھونکنا حماقت ہے۔

کتنے ہی اہل سنت ہمارے اس جواب سے خوش نہیں ہونگے لیکن ہم کسی کی خوشی یا ناراضگی کی خاطر صداقت کا خون نہیں کر سکتے۔ سیّد ہونا بہر حال ایک خداداد نعمت ہے جس پر رشک آنا چاہیئے لیکن اس نعمت کی شکر گذاری اکڑنے اور مونچھوں پر تاؤ دینے سے نہیں ہوگی۔ اللہ اکڑباززوں کو پسند نہیں کرتا۔ شکر گذاری یہ ہے کہ سادات اللہ اور رسول ﷺ کے آستانے پر عقیدتاً اور عملاً اپنی پیشانیاں ٹیک دیں۔ ان کی نیک عملی پوری امت سے بڑھ کر نمایاں ہو۔ وہ زہد و طاعت میں ہمارے سچ مچ کے سردار بن جائیں پھر دیکھئے ہم کس طرح ان کے پیر چومتے ہیں۔

مگر ہو یہ رہا ہے کہ شکر تو کس کا یار لوگوں نے اس خداداد شرف کو دکان کا بورڈ بنا لیا ہے اور ٹھیک برہمنی ذہنیت کے ساتھ غیر سیّدوں کو اچھوت بنانے کی سعی نامشکور جاری ہے۔ خواہ مخواہ گردنیں اکڑی ہوئی ہیں۔ اخلاق اور تقویٰ کا سایہ تک اعمال میں نہیں۔ ایسے سیّدوں سے وہ جفت ساز، پارچہ باف، رکشا پولر، خونچہ فروش نو مسلم اچھا جو خدا سے ڈرتا، اس کی بندگی کا حق ادا کرتا اور زمین پر سر جھکا کر چلتا ہے إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ یہ اعلان لافانی ہے۔ اٹل ہے۔ سیّدوں کو تو ان کی بد عملی کی ڈبل سزا ملے گی جیسا کہ آپ قرآن میں دیکھ سکتے ہیں کہ اللہ نے ازواجِ مطہرات کو وعید سنائی کہ تم اور عورتوں جیسی نہیں ہو برائی کرو گی تو دہری سزا ملے گی۔ اسی طرح سادات کو بغلیں بجانے اور سیکڑوں کی

جانے کے عوض ڈرنا چاہئے کہ اخلاق اور نیکی کے مجسمے صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتۂ خاص رکھتے ہوئے بھی انھوں نے زہد و تقویٰ کے تقاضے پامال کئے تو آخرت میں وہ کڑی پکڑ ہوگی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ وہاں نسب حسب نہیں دیکھے جاتے وہاں تو آوازہ لگتا ہے کہ:۔

پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

خود حضورؐ بھی مستحقِ سزا مجرموں کی سفارش نہیں کرینگے اپنے رشتہ داروں کی تو اور بھی نہیں کریں گے۔ وہ وزیروں اور گورنروں کی طرح خویش پرور اور غیر منصف نہیں ہیں۔ انھوں نے زندگی ہی میں صاف کہہ دیا تھا کہ فاطمہ! اگر تم بھی چوری کروگی تو تمھارے بھی ہاتھ کٹیں گے۔ ایسا پیکرِ عدل بھلا آخرت میں اُن سادات کی سفارش کیوں کرنے لگا جنھوں نے زندگی بھر اپنے کچھنوں سے دین کو رسوا کیا اور خدا کی نافرمانیوں میں آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔

حیات بعد الموت

سوال[۲۲]:۔ از سعید احمد ثنائی۔ گوجرانوالہ

ایک دن امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ "زیارت القبور" پڑھ رہا تھا جس کو لاہور کے تاجران کتب حافظ محمد شریف۔ عبد الغنی نے شائع کیا ہے۔ اس کے صفحہ ۱۲ میں زیارتِ مسنونہ و شرعیہ کے تحت ایک حدیث دیکھی جس کے الفاظ یوں ہیں — حضورؐ نے فرمایا:۔

ما من رجل یمر رجل کان یعرفہ فی الدنیا فیسلم علیہ الا رد اللہ روحہ حتی یرد علیہ السلام۔ (ترجمہ) جب کسی شخص کا گذر کسی آشنا کی قبر پر ہوتا ہے اور وہ اُس پر سلام بھیجتا ہے۔ تو خدا تعالیٰ اُسکی روح اس کی طرف پھیر دیتا ہے اور وہ اپنے بھائی کے سلام کا جواب دیتا ہے۔

اس پر کچھ شبہ گذرا۔ مقامی طور پر ایک دو علماء سے دریافت کیا لیکن تسلی نہ ہوئی۔ بالآخر آپ کو یہ تکلیف دے رہا ہوں کہ تجلّی کی ڈاک میں اس پر مفصل تحریر فرمادیں۔ پھر عرض کروں گا کہ بالضرور میری اس گذارش پر غور فرمائیں اور ضرور ضرور تجلی کی ڈاک میں اسکے حُسن و قبح پر روشنی ڈالیں مشکور رہوں گا۔

الجواب[۲۲]:۔

معلوم نہیں آپ کا شبہ اور الجھن کیا ہے۔ اول تو غیبی معاملات میں بحث و منطق کی بجائے روایت کے قوت و ضعف پر التفات کرنا چاہئیے۔ روایت مضبوط ہے تو بات مان لیجئے۔ مضبوط نہیں تو نظر انداز کر دیجئے۔

دوسرے عقلاً بھی اس میں کوئی استحالہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کی روح کو جب چاہے اس کے جسم سے مربوط کردیں روح کو پھیرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس طرح وہ موت سے قبل جسم کو زندہ رکھے ہوئے تھی اسی طرح اب بھی وہ جسم میں داخل کر دی جاتی ہے اور یہ جسم زندہ حیثیت میں سلام کا جواب دیتا ہے۔

نہیں۔ مطلب صرف اتنا ہے کہ جس طرح ہزاروں میل تک پھیلے ہوئے برقی تاروں میں نقطہ بٹن دبانے سے ایک ربطِ خاص پیدا ہوجاتا ہے اسی طرح روح اور جسم میں ایک ربط و تعلق پیدا کر دیا جاتا ہے۔

عالمِ غیب کی باتوں کو دو اور دو چار کی طرح سمجھ لینا انسان کے بس سے باہر ہے۔ صرف ہلکا تصور ممکن ہے۔ ہمارے نزدیک قبر والوں کو سلام کرنے کی تعلیم کا مفاد یہ ہے کہ مرنے کے بعد والی زندگی کا عقیدہ تر و تازہ رہے۔ جو لوگ قبر میں مٹی ہوچکے انھیں سلام کرنا تحت الشعور میں اس یقین کو تقویت دیتا ہے کہ یہ لوگ مٹے نہیں بلکہ کسی نہ کسی حیثیت میں باقی ہیں۔ مٹ گئے ہوتے تو سلام بے فائدہ تھا۔ حیات بعد الموت اسلام کا اہم ترین بنیادی عقیدہ ہے بلکہ تمام عقائد کا سرچشمہ کہئے لہٰذا اسے تر و تازہ رکھنا ہر حال میں ضروری ہے۔

اسپرٹ کا کاروبار

سوال[۲۳]:۔ از ناصر احمد۔ بنگلور سٹی

ہمارے شہر میں چند مسلمان تاجروں کو حکومت کی جانب سے اسپرٹ (SPRIT) کا کوٹا دیا گیا ہے۔ یہ شئے فرنیچ پالش وغیرہ بنانے میں استعمال ہوتی ہے
تاجران مذکور اس کو غلط راہ میں استعمال کرتے ہیں۔ خلاصہ اس شئے کو بجائے پالش بنانے کے ایسے ہی فروخت کر دیتے اور عوام اسے خرید کر نشہ کے طور پر یعنی بطور شراب استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ اس چیز کا اس طرح غلط استعمال قانوناً جرم بھی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک ایسے شخص یا تاجر کے پاس سے اس شئے کو اس طرح بغیر اپنے مصرف میں لائے عوام کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور اس کو معلوم بھی رہتا ہے کہ لوگ اسے خرید کر بطور شراب ہی استعمال کرتے ہیں تو ایسے شخص سے کسی دینی کام کے لئے کچھ چندہ وغیرہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب[۲۲]:۔

اگر حکومت کی طرف سے کوٹہ پالش کی خاطر دیا گیا ہے فروخت کرنے کے لئے نہیں تب تو اس کی فروخت جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر صورت یہ ہو کہ جن لوگوں کو کوٹہ دیا گیا ہے وہ خود پالش کا کام نہ کرتے ہوں بلکہ پالش کا کام کرنے والے ان سے خریدتے ہوں تو ان کے لئے فروخت کرنا جائز ہے۔ اگر خریدنے والے بجائے صحیح مصرف میں لانے کے اسے غلط مصرف میں استعمال کرتے ہیں تو یہ ان کی ذمہ داری ہے اسپرٹ اور شراب کا حکم ایک نہیں ہے یعنی شراب کی طرح اسپرٹ کی تجارت حرام نہیں ہے بشرطیکہ یہ نشہ بازوں کے ہاتھ فروخت نہ کی جائے۔

پالش کا کام کرنے والوں کے علاوہ اگر مذکورہ تاجر اسپرٹ کو ایسے لوگوں کے ہاتھوں فروخت کریں گے جو اسے بطور شراب استعمال کرتے ہیں تو یہ فعل حرام ہوگا۔ کوٹہ جس مقصد کے لئے دیا گیا ہے اسی میں استعمال ہونا چاہئے اور یہ ذمہ داری بہر حال فروخت کرنے والوں پر عائد ہوتی ہے کہ دیدہ و دانستہ غلط لوگوں کے ہاتھ نہ بیچیں۔ ہاں خود پالش کرنے والے ہی اسے خرید کر غلط مصرف میں لاتے ہیں تو بیچنے والا بری الذمہ ہو جاتا ہے۔

کسی بھی ناجائز طریقے سے کمایا ہوا روپیہ کسی دینی کام میں لگانا جائز نہیں۔

حیرتناک

سوال[۲۳]:۔ از طلبائے دار العلوم احمدیہ سلفیہ۔ دربھنگہ (بہار)

ہم لوگوں کے استاد جناب مولانا عبید الرحمٰن صاحب اس مدرسہ احمدیہ سلفیہ دربھنگہ ہیں۔ ان کی صلاحیت پر ہم لوگوں کو اس لئے اعتبار ہے کہ وہ "علمی دیو" ہیں۔ مگر اس کے باوجود کبھی کبھی موصوف ایسی ایسی باتیں اپنے منطقی دلائل سے ثابت کرتے ہیں جو ہم لوگوں کے دل میں نہیں اترتیں۔

بخاری کے درس کے دوران انھوں نے ایک دن بتایا کہ "کتا کا جھوٹا نجس نہیں ہے، بلکہ اس کا جھوٹا استعمال کیا جا سکتا ہے صرف کٹھ ملاؤں کی کم علمی کی وجہ سے کتا نجس بن رہا ہے"۔ دوسرے دن پھر انھوں نے حضرت مریم علیہا السلام کے متعلق کہا کہ "حضرت مریمؑ کے بارے میں کٹھ ملا سب یہ سمجھتے ہیں کہ بغیر کسی وسیلے اور سبب کے لڑکا پیدا ہوا۔ حالانکہ قرآن میں صاف لفظوں میں ہے کہ حضرت جبریلؑ انسانی شکل میں حضرت مریمؑ کے پاس گئے جب کہ حمام میں تھیں اور وہاں جاکر "مادۂ منویہ" کو جو وہ خدا کے یہاں سے لائے تھے کسی طرح ان کے جسم میں سرایت کر دیا۔ جیسا کہ آج کل ڈاکٹر وغیرہ بھی انجکشن کے ذریعہ بغیر باپ کے بچہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے"۔ الغرض اس طرح کی باتیں بہت ساری ہیں، براہ مہربانی ان دونوں مسئلوں کی وضاحت بذریعہ تجلی فرمائیں۔

الجواب[۲۳]:۔

ہمیں یقین نہیں آتا کہ ایک بخاری کا درس دینے والے عالم کی طرف ایسی باتوں کا انتساب درست ہو۔ کتا نجس العین مانا گیا ہے۔ اس کے بلا ضرورت پالنے پر حدیث میں وعید بھی آئی ہے۔ پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کتے کے جھوٹے کو ناپاک کہنے والے فقہاء کٹھ ملا ہیں۔

خیر یہ معاملہ تو پھر ہلکا تھا لیکن دوسرا معاملہ شدید نازک ہے معلوم نہیں کونسا قرآن ہے جس میں وہ باتیں صاف لفظوں میں

تو کیا مبہم لفظوں میں ہی درج ہوں جن کی نسبت استاد موصوف کی طرف کی گئی ہے۔ حضرت جبریلؑ مریمؑ صدیقہ کے پاس سو قت آئے جب وہ حمام میں تھیں! اس ارشاد کا مطلب تو بظاہر یہ ہے کہ معاذ اللہ جبریلؑ ایسے وقت میں آئے جب مریمؑ صدیقہ مادرزاد برہنہ تھیں۔ استغفر اللہ۔ کہاں ہے وہ قرآن جس میں یہ شرمناک اور خلافِ واقعہ بات بیان کی گئی ہو۔ قرآن میں تو صرف اتنا ہی بتایا گیا ہے کہ جبریلؑ مریمؑ صدیقہ کے سامنے آئے۔ سورۂ مریم، سورۂ آل عمران دیکھ لیجئے ایسا کوئی اشارہ تک وہاں موجود نہیں کہ صدیقہ اس وقت حمام میں تھیں۔

پھر حضرت جبریلؑ کے پھونک مارنے کا یہ مطلب نکالنا کہ وہ خدا کے یہاں سے مادۂ منویہ لائے تھے اور اس پھونک کے ذریعے انھوں نے اسے حضرت مریمؑ کے جسم میں انجکٹ کر دیا پرلے سرے کی کند ذہنی اور خرافات پسندی ہے۔ جو شخص بھی ایسی بات کہے اس کے ایمان باللہ میں صریح ضعف ہے۔ اس کا مادہ پرستانہ ذہن اس گمراہی میں مبتلا ہے کہ جن معجزات اور مافوق الفطرت امور کا ظہور انبیاء علیہم السلام کے سلسلے میں ہوا وہ سب کے سب اسباب و علل کے پابند تھے اور اللہ تعالیٰ بھی اپنے وضع فرمودہ اصولِ فطرت سے اس درجہ مجبور ہے کہ اب جو کچھ بھی وہ ظہور میں لانا چاہے گا وہ لازماً انھی اصول کے تحت لانا ہوگا۔ پناہ بخدا۔

زیادہ گفتگو ہم اس لئے لاحاصل سمجھتے ہیں کہ ہمیں غالب گمان ہے متذکرہ بالا خیالات کے انتساب میں آپ طلباء سے کچھ غلطی ہوئی ہے۔ یقین نہیں آتا کہ بخاری کا استاد ایسی واہی باتیں کہے گا جو صرف مغرب زدہ اور مادیت گزیدہ جہلاء ہی کو زیب دیتی ہیں۔

محراب کا مفہوم

سوال[۲۴]:- از فرید مظہر۔ ورنگل دکن

حکیم الامت حضرت اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمۂ قرآن مجید کے حاشیہ پر بحوالہ جامع احادیث طبرانی و بیہقی یوں تصریح فرماتے ہیں کہ حضرت ابن ابی الجعدؓ نے موسیٰ جہنیؓ کی روایت نقل کی ہے کہ فرمایا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری اُمت خیر پر رہے گی جب تک وہ اپنی مسجدوں میں نصاریٰ کی طرح محراب نہ بناویں۔

اس عبارت کے الفاظ محراب "نہ" بناویں کے اخذ مفہوم میں تذبذب ہو رہا ہے کہ آیا منفی لفظ "نہ" مثبت کے معنی دے رہا ہے۔ یا منفی کر اگر منفی کے ہے تو اس عبارت سے واضح طور پر ممانعت کا حکم صادر ہوتا ہے۔ مگر اکثر مساجد پختہ محرابوں سے مزین ہیں۔ حتیٰ کہ دارالعلوم دیوبند جیسے علماء فضلاء کا مرکز بھی اس بدعت سے مبرا نہیں ہے۔ جبکہ اسکی کراہیت میں بہت سے کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کے آثار مروی ہیں۔ ازراہِ تلطف مساجد میں محراب و منبر کی تعمیر سے متعلق احادیث مبارکہ کی روشنی میں مدلل جواب مسائل تجلی (تجلی کی ڈاک) میں مرحمت فرمائیں تو جزاک اللہ فی الدارین خیراً کا مصداق ہے۔

الجواب[۲۴]:-

پریشانی آپ کو در اصل اس لئے پیش آ رہی ہے کہ لفظ "محراب" کا آپ نے وہی مفہوم سمجھ لیا جو اُردو میں رائج ہے یعنی کمان کی شکل میں بنی ہوئی وہ جگہ جہاں امام کھڑا ہوتا ہے۔

لیکن قرآن میں یہ لفظ اس مفہوم میں استعمال نہیں ہوا بلکہ جہاں جہاں یہ آیا ہے اس سے مراد وہ حجرے ہیں جو عیسائی حضرات اپنے گرجوں کے قریب زمین کی سطح اونچی کر کے بنایا کرتے تھے اور ان میں اصل عبادت گاہوں کے خدام اور مجاور وغیرہ رہا کرتے تھے۔ ان کی حیثیت آرام گاہ کی بھی تھی اور عبادت گاہ کی بھی۔ آل عمران میں دیکھئے۔

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ۔	جس وقت آتے اسکے پاس زکریا حجرے میں (ترجمہ شیخ الہندؒ)

یا مثلاً سورۂ ص میں:-

وَهَلْ أَتَاكَ نَبَأُ الْخَصْمِ إِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ۔	اور پہنچی ہے تجھکو خبر دعوے والوں کی جب دیوار کود کر آئے عبادت خانے میں (ترجمہ شیخ الہند)

+ + + +

نیز سورہ آلِ عمران میں :۔

وَهُوَ قَائِمٌ يُّصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ	جب وہ کھڑے تھے نماز میں حجرے کے اندر (ترجمہ شیخ الہندؒ)

+ + + +

نیز سورہ مریم میں :۔

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ	پھر نکلا اپنے لوگوں کے پاس حجرے سے۔ (〃)

+ + + +

گویا قرآن میں جملہ ہی مقامات پر محراب اُن ذیلی عبادت کدوں اور اعتکاف و ریاضت کے حجروں کے لئے استعمال ہوا ہے جو نصرانیوں کے یہاں عام تھے۔

خود اسی مقام پر جس کے حوالے سے آپ سوال پیش فرما رہے ہیں فقرہ نمبر ۱ کی تشریح کے تحت، یہ عبارت موجود ہے :۔

"محراب سے مراد وہ ہے جہاں وہ عبادت کرتے تھے محل خلوت و مجلس مناجات تھی۔ آج کل جو مسجدوں میں محراب بنائی گئی ہیں وہ مراد نہیں ہیں۔"

حیرت ہے پھر کیسے آپ کا یہ شکوہ اپنی جگہ باقی رہا کہ آجکل اکثر مساجد محرابوں سے مزین ہیں حتیٰ کہ دارالعلوم دیوبند جیسے علماء و فضلاء کا مرکز بھی اس بدعت سے مبرّا نہیں ہے۔

کیا اب پھر اس بات کو دہرانے کی ضرورت باقی رہ گئی کہ ہم آج اصطلاحاً جس چیز کو محراب کہتے ہیں اس کی کوئی حرمت یا کراہت حدیث میں نہیں آئی بلکہ ممانعت ان محرابوں کی آئی ہے جن کا اہلِ اسلام میں آج کوئی وجود نہیں۔

مستقل عنوان

مُلّا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

"چینی چینی چینی - تم مجھے جینے بھی دوگی یا مٹی کا تیل پی کر انگارے چبالوں۔"

"مٹی کا تیل بھی آٹھ دن سے گھر میں نہیں ہے۔" ملائن نے میری دھمکی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "روز بجلی غارت ہو جاتی ہے اور روز کئی کئی موم بتیاں پھنک جاتی ہیں - گھر میں تیل ہو تو چراغ لالٹین کچھ جل جائے مگر آپ کو ان باتوں سے کیا سروکار۔"

"مجھے عورت بنا دو تم شوہر بن جاؤ پھر دیکھوں گا میری فرمائشیں تمھیں کے دن زندہ رہنے دیں گی۔ جب دیکھو فرمائش جب دیکھو فرمائش - یہی حال رہا تو میں کسی دن تبلیغی جماعت میں نکل جاؤں گا - چھ چھ مہینے کے چلے دوں گا پھر تمھارے بھیا کہا کریں گے کہ ــــ اب اسے ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لیکر۔"

"گھر کے سودا سلف کو آپ فرمائش کہتے ہیں" وہ ناخوشگوار لہجے میں بولیں "میری بلا سے کچھ مت لائیے میں تو فاقہ بھی کر لوں گی۔"

انھوں نے نتھنے سکیڑے - پھر درد انگیز آواز میں سلسلۂ کلام کو آگے بڑھایا:-

"فرمائش بس ایک آپ سے کی تھی - دو مہینے ہو گئے آپ نے یہ بھی دیکھنا گوارا نہیں کیا کہ کون کیا بھونک رہا ہے۔"

"فرمائش ؟ ــــ کون سی فرمائش ؟"

"بس رہنے دیجئے۔"

"نہیں بتاؤ تو ــــ"

"بتاؤں کیا - آپ سے فقط سو روپوں کو کہا تھا کہ کہیں سے فالتو لے آئیے - دلّی سے ریحانہ اور فوزیہ کو دس پانچ دن کے لئے بلا لیں تو خالہ مرحومہ کی رُوح کو چین آئے - کیا سوچتی ہوں گی بچاری کہ میرے مرتے ہی سب نے میری اولاد سے آنکھیں پھیر لیں۔"

"تم اپنے عقائد درست کرو - تمھاری خالہ کی ہڈیاں بھی اب قبر میں سرمہ ہو چکی ہوں گی۔"

"بدن خاک ہو جائے مگر روح تو نہیں مرتی۔"

"نہ مرتی ہو گی لیکن رُوح کے کھوپڑی نہیں ہوتی پھر کیسے سوچے گی۔"

ملائن نے بُرا سا منھ بنایا - اپنے زندہ اور مردہ عزیزوں کے بارے میں ان کے احساسات بڑے نازک ہیں - ان کے چہرے پر جھنجھلاہٹ ملا ہوا احتجاج اُبلتا دیکھ کر میں نے جلدی سے کہا:-

"اچھا خیر روحیں ضرور سوچتی ہوں گی لیکن یہ تو بتاؤ کیا تم جہیز میں بلیڈ بھی لائی تھیں ؟"

"بلیڈ ! ؟"

"ہاں ہاں بلیڈ ــــ جیبیں آج کل بلیڈ ہی سے کاٹی جاتی ہیں - چوری ڈاکہ تو میری سال خوردہ ہڈیوں کے بس کا ہے نہیں - رشوت کی بھی کوئی مد تمھارے بھیا صاحب کے آفس میں میسّر نہیں - تنخواہ ساری تمھارے پائے حنائی پر نچھاور کر دیتا ہوں پھر بتاؤ سو روپے فالتو کسی کی جیب کاٹے بغیر کہاں سے لاؤں۔"

"پچھلے مہینے تو آپ نے کہا تھا کہ ایک نفع بخش کاروبار شروع کیا ہے اب ہمارے دِلدّر دُور ہو جائیں گے۔"

"کہا تھا مگر نتائج قدرت کے ہاتھ میں ہوتے ہیں ابھی سنگھاڑا چل رہا ہے"

"مجھے پاگل بناتے ہیں۔ کہیں بھی کوئی کاروبار آپ نے نہیں کیا"

"سو فیصدی کیا تھا ۔۔۔ تھا کیا اب بھی کر رکھا ہے مگر آثار اچھے نہیں ہیں"

"آخر بتائیے تو کیا کاروبار ہے؟"

"ہم نے ۔۔ یعنی میں نے اور صوفی مسکین نے برابر کے سرمایے سے شتر مرغ کے انڈے خریدے تھے۔ صوفی مسکین نے ذمہ لیا تھا کہ وہ ایک عمل کے ذریعے ان انڈوں سے بھینسیں برآمد کرلیں گے . . . "

"خدا کے لئے جان نہ جلائیے۔ آپ کاروبار کرہی نہیں سکتے"

"اچھا تو سچ ہی سننا چاہتی ہو ۔۔ سنو میں نے بیس روپے خرچ کر کے شاہ ولایت کی بنی میں ایک مزار بنوایا تھا۔ خواجہ بدر الزماں گیسو دراز کا مزار۔ مگر وہاں ابھی تک اُلّو بول رہا ہے۔ سالے گدھے شاید بریلی، اجمیر اور حیدر آباد چلے گئے تمھارا دیوبند تو وہابستان ہے ہالستان لے دے کے ایک دیہاتن چاند سا بیٹا مانگنے آئی تھی سوا روپیہ نیاز کا دیا اور چراغ میں چار پیسے کا کڑوا تیل ڈال دیا بس۔ وہ سوا روپیہ بھی خبیث کلوے نے ہضم کرلیا کہہ رہا تھا صاحب حقہ پیئے بغیر اونگھ آتی ہے، دو آنے روز کا تمباکو تو ضرور ہی ہوتا۔ میں نے کہا کہ مردود حقہ پینے والوں کی قبر میں گز گز بھر کے کیڑے پڑیں گے۔ پھٹ سے بولا صاحب مجھے تو قبر میں جانا ہی نہیں۔ دلّی شہر کے ایک نجومی نے میرا ہاتھ دیکھ کر بتایا تھا کہ تم دریا میں ڈوب کے مروگے ۔۔۔ اب بتاؤ اس بیہودے سے میں کہاں تک مغز مارتا۔ حساب یہ بنا کہ مہینے بھر کی فالتو آمدنی ۔۔ کل سوا روپیہ۔ مزار پر ڈیوٹی دینے کے لئے کلوے کو درکار ہے قریباً چار روپے ماہوار کا تمباکو۔ بیس روپے خرچ ہوئے مزار بنوانے اور کلوے کا صوفیانہ جوڑا تیار کرانے پر . . . "

مجھے اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دینی پڑی کیونکہ ملائن کے چہرے پر میری کاروباری ناکامی کی دردانگیز کہانی نے غم خواری کے آثار پیدا کرنے کے عوض ایک استہزائی تبسم نمایاں کر دیا تھا۔ شاید ایسے ہی المناک موقع پر کسی ستم زدہ شاعر نے سر پیٹ کر کہا ہوگا:۔

طعنۂ اہل جہاں کی سبھی پروا کب تھی
تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ ذلت ہے یہی

"خالی باتیں کسی مرض کا علاج نہیں ۔۔" انھوں نے کیتلی میں اُبلتے ہوئے پانی کو چائے کی پتی ڈالے بغیر انگیٹھی سے اُتارتے ہوئے کہا" چینی نہیں لائیں گے تو چائے کو بھی صبر کیجئے"

میرے دل پر گھونسہ پڑا۔ چائے کے بغیر قلم کیسے چلے گا۔ گھٹی تک میں چائے ملی ہو تو چائے کے بغیر ذہن کی گرہیں کیسے کھل سکتی ہیں۔ چینی کا ڈپو بند ہو جانے کے بعد چار دن تک تو چینی سوا دو روپے کلو ہاتھ آتی رہی تھی۔ سنا جا رہا تھا کہ اب راشن کارڈ بن رہے ہیں بن جائیں گے تب نئے ڈپو کھلیں گے۔ پہلی بار جب ایک روپیہ دو آنے کی نصف کلو ملائن کے دست حنائی پر لا کر رکھی تو انھوں نے ٹھیک ایسی نظروں سے مجھے گھورا تھا جیسے تھانے دار ملزم کو گھورتا ہے

"تم ہوش میں ہو" میں جھلا کر بولا تھا:۔

"آں ۔۔ ہاں" وہ جیسے سوکر جاگی تھیں "سچ بتائیے یہ کتنے کی ہے۔ میں نے تو آپ کو دو روپے دیئے تھے"

"ان کا میں نے نیلا تھوتا خرید لیا ہے ۔ سنا ہے چھٹانک بھر نیلا تھوتا کھا کر آدمی بڑی شاندار موت مرتا ہے"

"آپ کو تو ہر وقت مذاق سوجھتا ہے" انھوں نے رو دینے کے انداز میں کہا "ذرا خرچ اُٹھا کر دیکھئے تو پتہ چلے۔ ابھی مہینے کے بارہ دن باقی ہیں اور کیش بکس مرے پیٹے میں فقط نو روپے پڑے ہیں ۔ سچ بتلائیے یہ چینی کتنے کی لائے؟"

"بتا تو چکا ہوں ایک روپیہ بارہ نئے پیسے کی"

ہائے اللہ۔ ایک روپے پندرہ پیسے کی تو پوری کلو مل رہی تھی ــــ"

"تھی تو ماضی کا صیغہ ہے بانو انگریز کے زمانے میں آٹا بیس سیر کا ملتا تھا اور مغلوں کے دور میں ایک روپے کا آٹا لے جانے کے لئے ہاتھی لانے کی ضرورت پڑتی تھی۔ حال کی بات کرو حال کی ــــ"

چینی کی پوٹلی ابھی تک انھوں نے ایسے ہی انداز میں پکڑ رکھی تھی جیسے بادلِ ناخواستہ مُردہ چوہے کی دُم پکڑ رکھی ہو۔ گرہ کا سرا ان کی چٹکی میں تھا اور پوٹلی کسی پھانسی پائے ہوئے خرگوش کی طرح لٹک رہی تھی ــ بے یقینی کے آثار اب بھی ان کی آنکھوں میں جھلک رہے تھے۔

"آخر آپ نے دن دہاڑے لٹنا قبول کیسے کر لیا" وہ پیر پٹخ کر بولیں۔ "غضب خدا کا یہ مٹھی بھر چینی ایک روپے بارہ پیسے کی"

"شکر کرو بھاگوان مل تو گئی ہے۔ خبر ہے کتنا وقت برباد کر کے ہاتھ آئی ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ دینے والے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئلے لیکر اشرفیاں دے رہا ہو ــ اگر مجھے چائے کی طلب نہ لگ رہی ہوتی تو یقین کرو اس کے چانٹا مار دیتا۔ ایسا منھ بنا رہا تھا بے ایمان کہ جیسے ابھی ابھی فلسفے کی ڈگری لیکر آرہا ہو ــ"

"کیا وقت آگیا ہے۔ ارے آپ نے اسے گرفتار کیوں نہ کرا دیا اب تو ایمرجنسی ہے ڈیفنس آف انڈیا کے تحت ایسے قصائی بلیک مارکیٹیوں کو پھانسی دلوانی چاہئے۔"

"دلواؤں گا۔ ذرا مجھے گورنر ہو جانے دو۔ درخواست تو بھیج چکا ہوں تقرری کے احکام بھی بس صبح شام آنے ہی والے ہیں۔"

"آپ دو منٹ بھی سنجیدگی سے گفتگو نہیں کر سکتے" ــــ لائن بڑی فراخت سے بولیں "آخر سوچئے تو مہینہ کیسے پورا ہوگا سارے پیسے تو آگ کی چینی ہی کے پیٹ میں اتر جائیں گے۔"

"عشاق کا شیوہ راضی برضا رہنا ــ حکومت کانگریس کی ہے۔ کانگریس ہماری ہے۔ حالات جیسے بھی پیدا ہوں ہمیں وفاداری کے تقاضے نبھانے چاہئیں ــ کہو کیا میں اب بھی سنجیدہ نہیں ہوں ؟"

"جہنم میں گئی ایسی سنجیدگی۔ آخر یہ چینی کو آگ کہاں لگ گئی فیکٹریاں تو رات دن دھڑا دھڑ چل رہی ہیں ــ"

"زبان سنبھال کر بات کرو ورنہ ڈیفنس آف انڈیا رول گھر کی دیوار پھلانگ کر بھی گلا دبا سکتا ہے۔ خبر بھی ہے ہمارے وزیر خوراک نے پانچ لاکھ ٹن چینی ملک سے باہر فروخت کر کے ۲۰ کروڑ کا زرِ مبادلہ کمایا ہے۔"

"کمایا ہوگا۔ یوں تو ایک ایک بوری باہر بھجوا دیں کا زرِ مبادلہ ہاتھ آئے گا۔"

"آئے گا نا" میں نے ان کی تعریض کو قوم پرستی کا جامہ پہنایا "تو خوش ہو جاؤ وزیر خوراک نے امریکہ اور جاپان سے واپسی پر یہ مژدہ بھی سنایا ہے کہ یہ دونوں دوست ملک اس پر تیار ہو گئے ہیں کہ پانچ لاکھ ٹن سے دس لاکھ ٹن تک چینی بھارت سے خرید لیا کریں گے ــ جانتی ہو ٹن کسے کہتے ہیں ؟"

وہ چڑ گئیں ــــ

"پھر وہی مذاق۔ اب میں جھاڑو پھری کیا ٹن بھی نہیں جانوں گی ــ"

"بس تو حساب لگا لو یہ مژدہ ہماری برآمدی تجارت میں کتنی شاندار ترقی کی خبر دیتا ہے۔"

"پھر تو کیا تعجب ہے گیہوں اور چاول بھی باہر کو ڈھلنے لگے"

"کوئی پروا نہیں۔ ہمارے ملک کو اس وقت زرِ مبادلہ کی ضرورت ہے اگر کوئی ملک خود ہمیں بھی خریدنے پر آمادہ ہو تو کوئی حرج نہیں اگر دس بیس لاکھ ہم جیسے فالتو نفر بیچ کر دس بیس کروڑ کا زرِ مبادلہ حاصل کر لیا جائے۔ کروڑوں کی آبادی میں آخر دس بیس لاکھ سے کیا فرق پڑے گا۔"

"بھاڑ میں جائے۔ معاشیات کے ہفت خواں آپ ہی طے کیجئے۔ میں دیکھوں گی نو روپے میں بارہ دن کیسے کٹتے ہیں۔"

میں نے سوچا کہ چلو فی الوقت تو کوئی قیامت نہیں ٹوٹ رہی۔ کل کی کل دیکھی جائے گی مگر دن گذرتے کیا دیر لگتی ہے۔ اگلی صبح پھر آرڈر جاری ہوا کہ چینی لاؤ ــ

"کیا؟ — مزاج تو درست ہے؟" میں بھنایا

"مت لائیے۔ میں بھی رکشا منگا کر بھیا کے یہاں جا رہی ہوں۔"

"سبحان اللہ۔ فقط چینی کے قحط میں یہ حال ہے۔ اگر گیہوں کا قحط پڑ گیا تو شاید میری موجودگی ہی میں دوسرا نکاح بھی کر لوگی۔۔۔"

"خدا کے لئے گالی منہ سے مت نکالیئے" وہ تقریباً کانپ کر بولیں "میں تو آپ کے ساتھ زندگی بھر فاقے کر سکتی ہوں، لیکن دانش میاں کو بغیر چینی کے دودھ کہاں سے دوں۔"

"جاتا ہوں بابا جتنے دھکے تقدیر میں لکھے ہیں وہ تو کھانے ہی پڑیں گے۔ لاؤ دو روپے نکالو۔"

"دو کیا آپ راکیش بکس جھاڑ لے جائیے۔ اب تو معبود اٹھا ہی لے۔"

"ہائیں ہائیں — یہ کوسنے کاٹنے کا کونسا موقع تھا؟"

"پھر کیا کروں روز روز وہ ہر چیز گراں ہوتی جا رہی ہے۔ آپ کو اپنے گھچڑوں سے فرصت نہیں۔ پائی پائی کا میزان لگاتے لگاتے دماغ کی ایک ایک نس پھوڑے کی طرح کسکنے لگی ہے آپ کی بلا سے۔"

"نیک بخت میرا کونسا مشغلہ تمہیں گھچڑ نظر آ رہا ہے۔ کیا تم چاہتی ہو میں سارے دن گھر میں بیٹھا بیٹھا گرانی کا ماتم کیا کروں۔ تحمل سے کام لو علاج رونا دھونا نہیں ہے اپنے بھیا سے کہو میری تنخواہ بڑھائیں۔"

"بھیا ہی کے پاس کونسا قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔"

آخر کار دو روپے لیکر میں وہیں پہنچا جہاں سے کل نصف کلو چینی خریدی تھی۔ لیکن آج وہاں کسی بھاؤ نہیں ملی۔ دو چار جگہ اور دھکے کھائے مگر بے سود۔ تھک ہار کر بُورا خرید لایا۔ وہ بھی دو روپے سیر ملا۔ چائے بنی تو وہ شربت بنفشہ سے کم نہیں تھی۔ یہ بھی واضح ہوا کہ اس میں سیل کھڑی ملی ہوئی ہے۔

اگلے روز پھر وہی رونا تھا۔ ایک طرف حضرت "گونگے عرب" کی سوانح تکمیل کو پہنچانے کا فکر دوسری طرف ملائن کے چہرے پر برستی ہوئی مایوسی کی خلش۔ چھیٹے صاحب ذرا سے بوسے کا دودھ نہیں پی رہے تھے رو رو کر چھتیں اُڑائے دے رہے تھے۔ ملائن یکایک پھٹ پڑیں:-

"خدا جانے آپ ہی کو چینی کیوں نہیں ملتی۔ یاسمین کے گھر تو کل ہی میں نے دیکھا کنستر بھرا رکھا تھا۔"

"یاسمین کے باپ کو جانتی ہو۔ شری خادم علی تبریزی وہ پرانے خادم قوم ہیں۔ ان کے یہاں دس بوریاں بھی ہوں تو تم نظر لگانے والی کون۔"

"آپکو تو ان سے خاصی سلام دعا ہے لے آئیے تھوڑی سی۔"

"کر چکا ہوں کوشش۔ مگر انھوں نے کورا جواب دیدیا کہ میں بلیک نہیں کرتا۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے ان سے کہیئے ٹھیک داموں سے دیدیں۔"

"کہا تھا مگر وہ بولے اس وقت چینی کا بازار ڈانواڈول ہے۔ جب تک نرخ میں جماؤ نہ آجائے کسی بھی بھاؤ سے دینا ملک قوم سے غداری ہوگی۔"

"آگ لگے۔ پھر اُدھار مانگ لی ہوتی۔"

"مانگی تھی۔ کہنے لگے بخشش لاکھوں کی حساب پائی پائی کا۔ یہ زمانہ ایمرجنسی کا ہے ملک نازک حالات سے گذر رہا ہے۔ چین مردود برابر سر پر منڈلائے جا رہا ہے۔ ایسے غیر معمولی حالات میں اُدھار کے معاملات ملک کی سالمیت اور قومی دفاع کے خلاف ہوں گے۔"

"اور آپ یہ سب ٹھنڈے پیٹوں سُنا کیئے؟!"

"نہیں بھاگوان میں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں۔"

اگلے دو دن بڑے قیامت کے گذرے۔ تنگ آکر میں نے صوفی تمکین کو جھنجوڑا۔

"تم صوفی صاحب ہمیشہ بشارت دیتے رہے ہو کہ اولیا کی کرامت برحق ہے۔ لاؤ دکھاؤ کہاں برحق ہے۔"

"دکھا بھی دیں گے کوئی موقع تو آنے دو" وہ سینہ پھلا کر بولے:-

"موقع کے سینگ نہیں ہوتے۔ موقع اس سے بہتر کیا ہوگا

کہ چینی دوا ہمیں کو بھی نہیں مل رہی۔"

"ہو۔۔۔۔ ہو۔۔۔۔ ہو" وہ اپنے خاص انداز میں ہنسے

"تم بھی یار ہر بات میں تحول کرتے ہو۔ بھلا کرامات کا ان فضولیات سے کیا تعلق۔"

"پھر کاہیں سے تعلق ہے۔ میرا محبوب مجھ سے نہیں بچھڑا وہ تو دن رات میرے سینے پر مونگ دل رہا ہے۔ مجھے چاند سا بچہ نہیں چاہیئے۔ میرا کوئی مقدمہ نہیں چل رہا۔ میرا روزگار بھی بُرا بھلا جیسا بھی ہے لگا ہی ہوا ہے۔ بس چینی دلوا دو اس سے بہتر مصرف کرامت کا اور کیا ہو سکتا ہے۔"

"ہو ہو ہو" وہ پھر ہنسے۔ "چینی تو برسوں سے ہمیں بھی نہیں ملی۔ ہم تو ہوٹل میں چائے پی رہے ہیں۔"

"صوفیائن سمیت؟"

"جی نہیں۔ یہاں ایسے ہوٹل کہاں جو عورتوں کو بھی ساتھ لے جایا جائے۔ دلّی میں البتہ ہم ایک مرتبہ ساتھ ساتھ گئے ہیں۔ نئی دلّی کا ہوٹل تھا۔"

"برقعے سمیت؟"

"ہاں برقعہ تو خیر تھا مگر پُرانی دلّی سے نکل کر ہم نے نقاب الٹوا دیا تھا۔"

"ماشاء اللہ ۔۔۔ پھر کسی نے آنکھ وانکھ ماری؟"

"ہاں۔۔۔۔ آئیں۔ آنکھ کون سور کا بچہ مار سکتا تھا۔"

"آنکھ ہمیشہ انسان کا بچہ مارتا ہے ۔۔۔ خیر آگے کیا ہوا؟"

"بڑا اعلیٰ درجے کا ہوٹل تھا۔ ہم نے وہاں ناشتہ کیا۔ کرسیوں کے گدّے ایسے نرم تھے کہ بس جی چاہتا تھا بار بار اٹھو بار بار بیٹھو۔ صوفیائن تو وہاں سے لیٹنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔"

"ہوں۔۔۔۔ پھر؟"

"اماں وہاں مردوں سے زیادہ عورتیں تھیں ۔۔۔ کئی تو میمیں ہوں گی۔ پتہ نہیں یہ میمیں پنڈلیوں پر کچھ کھال وال چڑھاتی ہیں یا ان کی پنڈلیاں ہی ایسی ہوتی ہیں اک دم براق۔ رُواں تک نظر نہیں آیا۔"

"تم نے قریب سے دیکھا تھا؟"

وہ پل بھر کو جھجکے پھر آواز دبا کر رازداری کے انداز میں بولے:۔

"یار ایک میم تو ہمارے پاس ہی والی کرسی پر بیٹھی تھی اور اس کے ساتھ کوئی مرد بھی نہیں تھا۔ ہم نے نہایت غور سے دیکھا بلکہ ایک دفعہ تو ہمارا عربی رومال کاندھے سے گر گیا تھا۔ اسے اُٹھاتے ہوئے اس کی پنڈلی کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔"

"قسم کھاؤ رومال خود گرا تھا یا تم نے گرایا تھا؟"

ان کے چہرے پر حیا اور فخر کے ملے جلے لہریئے سرسرائے آنکھوں میں چمک آ گئی۔

"اب تم سے کیا پردہ ۔۔۔ ہم نے خود ہی گرایا تھا۔"

"ویلڈن ۔۔۔ پھر؟"

"بس پھر کیا۔ بہت غور سے دیکھا۔ ایک دفعہ کو تو یہی دل چاہا کہ چھو کر بھی دیکھیں مگر پردیس کا معاملہ تھا ہمت نہیں ہوئی۔"

"چھو لیا ہوتا میمیں ایسی باتوں کا بُرا نہیں مانتیں۔ ویسے مان بھی جائیں تو ذرا ادا کے ساتھ۔ آئی ایم سوری کہہ دینا چاہیئے وہ خوش ہو جاتی ہیں۔"

"نہیں یار ڈر لگا۔ ایک مرتبہ ایسی ہی ایک جلد بازی کی وجہ سے بڑا گڑبڑ گھٹالا ہو گیا تھا۔"

"کیا؟"

"تمھیں نہیں بتائیں گے ۔۔۔ ایک دفعہ تمھیں پیراں کلیر والی یاسمین کی بات بتا دی تھی تم نے ساری دنیا میں پھیلا دی۔"

"میں نے نہیں پھیلائی وہ تو تمہارے جوڑی دار صوفی شمس الہُدیٰ نے پھیلائی تھی۔ خیر تو نئی دلّی کے ہوٹل میں آپ کی زوجہ کا کردار کیا رہا؟ غالباً وہ ابھی تک ماں تو نہیں بن سکی ہیں؟"

صوفی صاحب نے جواب دینے کے عوض طویل آہ کھینچی ان کے چہرے پر ایک رنگ آیا ایک گیا۔ آنکھیں اُداس

پھوٹیں۔ کانپتے لبوں سے فرمانے لگے:۔

"اُف ملا صاحب

مطربِ بامزاج دان محبت نہیں جگر
نغمہ یہ اس نے چھیڑ دیا درمیاں سے کیا

آپ نے بھی کیا ذکر چھیڑ دیا۔"

مجھے چونکنا پڑا کیونکہ یہ شعر ان کے مذاق و معیار سے ذرا بلند تھا۔ میں نے ٹھیک انھی کی سطح پر پہنچکر درد بھرے لہجے میں عرض کیا:۔

"یقین کیجئے صوفی صاحب۔ اس بارے میں مجھے آپ سے بے حد ہمدردی ہے

دردِ دل گر بانٹنے کی چیز ہو
بانٹ لیں اپنے پرائے دردِ دل

فدوی تو کئی بار پیشکش کر چکا ہے کہ آپ میرے دو چار بچے مستعار لے لیں۔"

"چھوڑیئے بھائی جان اس موضوع پر گفتگو کرنے سے دل و جگر کے ٹکڑے اُڑ جاتے ہیں۔ یہی غم بھلانے کے لئے تو ہم دلّی کی سیر کو گئے تھے۔"

"پھر بھولا؟"

"عارضی طور پر ــــ آپ بھی کبھی گئے ہیں نئی دلّی کے کسی ہوٹل میں؟"

"گیا ہوں۔ ایک مرتبہ سو کا نوٹ سڑک پر پڑا مل گیا تھا بس جبھی جانا ہوا تھا۔"

"تو آپ کا کیا خیال ہے؟ میمیں کیا پنڈلیوں پر استرا استعمال کرتی ہیں؟"

لوٹ پھیر کر پھر وہی پنڈلی ــــ سوال کا لہجہ بھی بڑا پُر شوق تھا۔ ان کی باچھیں کچھ اس طرح کھلی ہوئی تھیں جیسے اس سوال کے جواب پر ان کی فلاح دین و دنیا کا انحصار ہو۔ میں چکرا یا۔ میمیں بہت سی نظر سے گذری ہیں مگر ان کی ساقہائے سیمیں پر ریسرچ کا خیال کبھی پیدا نہیں ہوا۔ ہوتا بھی تو جان کی بازی لگائے بغیر ریسرچ کی کوئی صورت نہیں تھی۔

"نہیں صوفی صاحب عاجز کی معلومات اس بارے میں بڑی ناقص ہیں بس اتنا ضرور علم ہے کہ میموں کے اجسام سے خوشبو خوب پھوٹتی ہے۔"

"پھوٹتی ہے نا؟" وہ لہک کر بولے "خدا گواہ ہے ہم نے بھی محسوس کی تھی، شاید وہ اصغر علی محمد علی کا عطر حنا استعمال کرتی ہیں۔"

"جی نہیں۔ وہ ماں کے پیٹ ہی سے معطّر پیدا ہوتی ہیں"

کافی دیر اسی نوع کی باتیں چلتی رہیں میں بھول ہی گیا کہ موضوع گفتگو تو "چینی" تھا۔ پھر موضوع اس وقت یاد آیا جب صوفی صاحب نے دفعتاً کہا:۔

"یار چائے تو پلواؤ۔ بڑے بداخلاق ہوتے جا رہے ہو۔"

"نام بھی مت لو۔ کل سے چینی کا ایک دانہ نصیب نہیں ہے نمکین کہو تو پلوا دوں۔"

"تو چلو ہوٹل میں چلیں۔ چائے کے بغیر باتوں میں لطف نہیں آتا۔"

"آپ ہو آیئے مجھے اس وقت کام ہے۔"

"کام کی ایسی تیسی۔ چلو اٹھو ہمیں ابھی تم سے کئی معاملات میں مشورہ لینا ہے۔"

ہوٹل کی میز پر اخبار پڑا تھا۔ چائے آنے تک صوفی صاحب نے اسے الٹا پلٹا۔ دفعتاً ان کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں میں تھرک پیدا ہوئی۔

"ارے مار ڈالا۔ دیکھو تو یار کس مزے کی خبر!" انھوں نے اخبار میری طرف بڑھا کر ایک کالم کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے یونہی بے دلی سے نظر ڈالی مگر پھر بجلی سی رگ و پے میں کوند گئی۔ خبر ڈنک مارنے والی تھی:۔

"لکھنؤ ۱۷ر جولائی۔ معلوم ہوا ہے کہ یو پی کے وزیر اعلیٰ شری چندر بھان گپتا نے کل رات کو اپنے وزیر جنگلات شری الگو رائے شاستری سے اس بنا پر استعفیٰ طلب کیا ہے کہ انھوں نے ایک "عورت" رکھی ہوئی ہے اور ایسا کر کے وہ وزارت کی بدنامی کا باعث بن رہے ہیں۔"

جب تک میں پڑھتا رہا صوفی صاحب مجسم شوق بنے بہ مشکل

ضبط کیے رہے۔ پھر پھٹ سے بولے :۔

"کمال ہے یار یہ عورتوں کا چکر اتنے بڑے لوگوں میں بھی چلتا ہے"۔

مجھے ان کی معصومیت پر ترس آگیا۔

"اب تم شاید یہ بھی کہو گے کہ کمال ہے یہ بڑے لوگ بھی روٹی کھاتے ہیں"۔

"واہ۔ یہ کیوں کہیں گے" وہ اُلجھ کے بولے۔

"پھر عورتوں کے چکر پر تعجب کیوں۔ تعجب اس پر کرنا چاہیئے کہ وزیر اعلیٰ نے اس بے حقیقت سی بات کو الزام بنا کر پیش کیا"۔

"تو کیا یہ الزام نہیں ہے" وہ تعجب سے بولے :۔

"نہیں الزام کا اس میں کوئی سوال نہیں۔ یہ دَور صرف دو چیزوں کا ہے دولت اور عورت۔ یہ دو بھی ایک دوسرے میں اس طرح گتھ گئی ہیں کہ اب یہ دو نہیں فقط ایک ہیں"۔

"یہ کیا فلسفہ ہوا؟"

"فلسفہ نہیں سائنس کہو۔ سائنس حقائق سے بحث کرتی ہے وہ اشیاء کو چھو کر، برت کر، ان کی کھال اُدھیڑ کر دیکھتی ہے اور فلسفہ تو محض ہوائی قلعے بنانے کا نام ہے"۔

"اب تم دہابیت پھیلاؤ گے" صوفی صاحب بیزار ہو کر بولے "ہمارا ملک روحانی ملک ہے۔ یہاں کے وزیر وزراء کو عورتوں کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیئے"۔

"روحانی ملک" میں نے رُوح کی تہ کو حلق کی آخری تہہ سے کھینچا پھر چائے کی چُسکی لی۔ دو تین اور لوگ بھی اِدھر ہی متوجہ ہو گئے تھے۔ "آپ نے صوفی صاحب کبھی روحوں کو بھیک مانگتے بھی دیکھا ہے؟"

"ہو ہو ہو۔۔۔۔ تم بھی یار ایک سے ایک بات نکالتے ہو"۔

"مذاق نہیں ـــــ آپ اپنی روح سے پوچھیں۔ جب آپ نئی دلی کے ہوٹل میں بیچاری میم کی عریاں پنڈلیوں کو بھوکی نظروں سے تک رہے تھے اس وقت آپ کی روح کے ہاتھ میں بھیک کا ٹھیکرا ضرور نظر آیا ہوگا"۔

"ارے چپ" ـــــ صوفی صاحب گھبرا کے چیخے "اللہ تم بڑے بدتمیز آدمی ہو ـــــ سب لوگ سُن رہے ہیں"۔ آخری فقرہ انھوں نے چپکے سے کہا تھا۔

"یہ لوگ بھی فرشتے نہیں ہیں مائی ڈیر ـــــ انھیں کوئی میم نظر آجائے تو ان کی روح بھی اس کی ننگی پنڈلیوں سے بھیک مانگنے میں دریغ نہیں کرے گی۔ یہ آب و ہوا کا اثر ہے صوفی صاحب ـــــ عورت اور پیسہ یہ دونوں چیزیں آکسیجن بن کر ہوا میں سرایت کر گئی ہیں"۔

"ہاں کر گئی ہوں گی لعنت بھیجو ـــــ ہم تو خبر دکھا کے خطا میں پکڑے گئے"۔

"نہیں نہیں دل تھوڑا مت کیجئے۔ خبر یقیناً دلچسپ ہے۔ ویسے یہ آپ کو بھی ماننا پڑے گا کہ فقط ایک عورت کسی وزیر کے شایانِ شان نہیں ہو سکتی"۔

"کیا؟"

"ارے ایک دو فالتو عورتیں تو معمولی تاجر، سیٹھ، ٹھیکیدار سبھی رکھ لیتے ہیں۔ وزیروں کا ظرف زیادہ وسیع ہونا چاہیئے"۔

"بس اب زبان بند کرو ـــــ ہنگامی قانون کا زمانہ ہے، کسی سرکاری آدمی نے سُن لیا تو تمہارے ساتھ ہم بھی پھنسیں گے"۔

"کیوں۔ کیا بات آپ کے خیال میں قانون کے خلاف ہے"۔

"ہٹاؤ یار ہو گی کچھ ـــــ یہ وزیروں پر فقرے کسنا کونسا قانون کے مطابق ہے"۔

"فقرے کون کس رہا ہے یہ تو مسلّم حقائق ہیں جن اصول و اقدار پر پورا کاروبارِ زندگی چل رہا ہے ان کی رو سے تو یہ بات ذرا بھی جرم نہیں ہے کہ فلاں شخص نے ایک فالتو عورت رکھ لی بڑے وزیر شری گپتا صاحب اگر پاکباز ہیں زاہد و عابد ہیں تو یہ ان کا ذاتی فعل ہے دوسرے لوگ اپنی رنگین مزاجیوں سے دست بردار کیوں ہوں"۔

"واہ کیا بدماشی بھی جرم نہیں ہے" صوفی صاحب جھلا کر بولے۔

"بدماشی کس چڑیا کا نام ہے ـــــ آپ سینما تو دیکھتے ہیں نا؟"

اس سوال پر وہ گھبرا گئے "یار آہستہ۔ تم تو ہم

کے رہو گے ــــ"

"کیسی بدنامی۔ یہ جتنے لوگ یہاں ہیں سب اسی دنیا کے باشی ہیں ــــ"

"خیر خیر ــــ"

"تو سنیما میں آپ دیکھتے ہیں نا کہ ایک لڑکا ایک لڑکی سے محبت عشق لڑاتے ہیں۔ گا گا کر جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ جنگل، پہاڑ، پارک جگہ جگہ تنہائیوں میں ملتے ہیں۔ ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہو جاتے ہیں کہ ایک کا سانس دوسرے کے سانس میں اُلجھ جاتا ہے ــــ یہ سب بدمعاشی نہیں عین تہذیب ہے۔ وزیر اور فقیر، ماں اور بیٹے، بھائی اور بہن سب نہایت شوق اور دلچسپی سے شب و روز یہ کھیل دیکھتے ہیں۔ اسے آرٹ، فن، تفریح کہا جاتا ہے۔ پھر بھلا یہ تفریح اپنے فطری اور ناگزیر انجام تک پہنچ جائے تو بدمعاشی کہاں سے نکل آئی ــــ نہیں ذرا سوچو جس میوے کو تم پکنے کے مراحل میں انگور کہو گے وہ پوری طرح پک جانے پر نمکولی کیسے کہلائے گا۔"

"لعنت ہے یار تمہاری جھک جھک پر ــ چلو اب اٹھو۔ ہمیں تو مشورہ کرنا تھا۔ سارا وقت خراب کر دیا۔"

"خفا مت ہو پیارے ــــ فقیر تو بس اتنا چاہتا ہے کہ دانش میاں کے لئے کہیں سے چینی دلوا دو۔ پھر تم ہزار ہمیں کی پنڈلیا سونگھتے پھرنا مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"خبیث ہو تم ہم کیوں سونگھیں پنڈلیاں ــــ ایک بات کیا کہدی تھی تم سے بس سر ہو کے رہ گئے۔"

"نہیں ڈیر نہیں۔ اشارہ سمجھا کرو۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی وزیر عورت رکھے یا یوجا پاٹ کرے عوام کو کم سے کم ضروریاتِ زندگی تو ملنی ہی چاہئیں۔ پانچ لاکھ ٹن چینی باہر بھیجدی گئی۔ عوام ایک ایک دانے کے لئے لائن میں لگے ہوئے ہیں۔ تمھیں خبر ہے انعام اللہ کے ساتھ کیا پیش آیا۔ وہ بیمار تھا، تیز بخار کے عالم میں چینی کے ڈپو پر آیا کیونکہ اس کا بے ماں کا بچہ پھیکا دودھ نہیں پی سکتا تھا۔ ڈپو پر لمبی لائن تھی وہ مرتا کھپتا لائن میں لگ گیا ــــ مگر جب نصف گھنٹہ بعد اس کے آگے والے صاحب کا نمبر آیا تو تقسیم کرنے والے بزرگوار نے کہدیا کہ بس اب کل ملے گی۔"

"ارے ہو گا یار۔ یہ تو دنیا ہے یہاں سب چلتا ہے۔"

"چلتا ہے نا ــــ یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ وزیر جنگلات نے فرض کرو ایک عورت رکھ بھی لی تو کونسی قیامت ٹوٹ گئی یہ تو دنیا ہے یہاں سب چلتا ہے۔"

(ملازمہ صحبت باقی)

نقد و تبصرہ — عامر عثمانی

کھرے کھوٹے

تبصرے کیلئے ہر کتاب کے دو۲ نسخے آنے ضروری ہیں

ہمیں رنج ہے کہ ہر ماہ نقد و تبصرے کا التزام نہیں ہو پاتا۔ اس ناغے کا تعلق ہماری اس بے بسی سے ہے کہ ضروری کاموں کے ہجوم میں بعض مرتبہ پورے پورے مہینے تبصرہ طلب کتابوں کے مطالعہ کا وقت نہیں نکلتا۔ شروع سے اب تک ہمارا معمول رہا ہے کہ تبصرے مفصّل ہوں اور کما حقہٗ مطالعے کے بغیر نہ کئے جائیں، لیکن اب خیال ہو رہا ہے کہ شاید یہ معمول نبھ نہ سکے۔ تبصرہ طلب کتابوں کی کثرت ہے اور مطالعہ کی فرصت مطلوبہ مقدار میں میسر نہیں۔ لہٰذا اب یہی کرنا پڑے گا کہ نسبتاً کم اہم کتابوں کے معاملے میں سرسری مطالعہ پر اکتفا کیا جائے۔ بالاستیعاب مطالعہ صرف اہم تر کتابوں کا ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمارے وقت، قوت اور حوصلے میں برکت عطا فرمائے وما التوفیق الّا باللہ۔ (عامر عثمانی)

علماء دیوبند اور اُردو ادب

● مؤلفہ:۔ مولانا عبداللہ حیدر آبادی (فاضل دیوبند)

● شائع کردہ:۔ مکتبہ مجلس قاسم المعارف۔ دیوبند یو۔پی۔ صفحات ۱۶۷ ناول سائز۔ کتابت گھٹیا۔ چھپائی غیر معیاری کاغذ رف۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

یہ کتاب خاصی دلچسپ اور وقیع ہو سکتی تھی بشرطیکہ اس کا مؤلف کوئی ایسا شخص ہوتا جسے اللہ تعالیٰ نے شعر و ادب کا مذاقِ سلیم اور نقد و نظر کا سلیقہ عطا کیا ہوتا لیکن ہمیں رنج ہے کہ اس کتاب کے فاضل مؤلف میں مطلوبہ اوصاف موجود نہیں ہیں۔ ان کا ذوق و شوق اور اکابر سے عقیدت و محبت تو قابلِ تحسین ہے، لیکن شعر و ادب کی نزاکتوں سے بے خبری اور نقد و تحقیق کی شایانِ شان صلاحیتوں سے تہی دامنی کے باعث ان کی یہ کتاب ایک چھوٹے درجے کی تالیف بن گئی ہے جو تجلی کے صفحات میں طویل تبصرے کی مستحق نہیں۔ رہی سہی کسر ناشر صاحبان کی ستم ظریفی نے پوری کردی۔ کتابت و طباعت کے نقائص کو تو خیر کاتب اور پریس کے سر تھوپا جا سکتا ہے، حالانکہ ان کی ذمہ داری بھی بالواسطہ ناشر ہی پر جاتی ہے، لیکن تصحیح کی ریکارڈ توڑ خامیوں کو سوائے ان کے کس کے سر منڈھا جائے۔ ذرا چند نمونے ملاحظہ فرمائیے:۔

اگر پوچھے کوئی یہ مجھ سے آکر
کہ کیا گذری ملے دیوانے تجھ پر   ص۱۵

بیاں اب حال اپنا کرتا ہوں میں
کہ جن فکر میں روز مرتا ہو ں میں

کہ آتی ہے تیرے سے چمن چمن میں بہار   ص۲۲

بہت دنوں سے تمنا ہے کیجیے عرض حال   ص۱۴

وہ آرزو ہیں جو مدتوں سے دل میں بھری   "

دیاں ہو تمام بے بال و پر کا گیو گذار   "

جو خوشی ہو تجھ سے وہ اور اس کی عشرت اظہار

چھاپا ہو کر گئے جمع دو لوں نے ‏ ص۲۷
چھپ چکا جبکہ یہ حرزِ جاں
ہاتف غیب نے بے تشہیر ‏ ‏″
ملا ہے آپ کو اس بزم میں پہلا جام ‏ ص۴۲
اسی پہ ختم ہو میرا عرض مطلب کا ‏ ص۴۲

یہ غلطیوں کے انبار سے چند نمونے ہیں۔ نہیں سمجھ میں آتا کہ جس کام کا آدمی اہل نہ ہو اسے کرے کیوں۔ علمائے دیوبند کے مرید نما عقیدتمندوں اور کور ذوقوں کے سوا جس کے سامنے بھی یہ کتاب جائے گی وہ خندۂ استہزاء سے اس کا استقبال کرے گا۔

نفس موضوع کے بارے میں مختصراً یہ ہے کہ علمائے دیوبند نے گاہے ماہے شاعری بے شک کی ہے لیکن ان کے بارے میں یہ کہنا بڑی بے تہہ اور بچکانہ بات ہے کہ :-

"یہ بزرگ (یعنی دیوبندی بزرگ) اگرچہ اردو ادب اور شعر و سخن کے استاذ نہیں مانے گئے تاہم ان کے فکر نازک اور طبع رسا نے جب بھی اس میدان میں جولانی کی ہے تو ان کے قدم ماہرینِ فن کے قدموں کے ساتھ ساتھ رہے ہیں اور اپنی تصنیفات اور تالیفات کے لحاظ سے اُردو زبان کے محسنین کہلائے جانے کے مستحق ہیں ــ" ص۱۱

ویسے اس مدح سرائی سے ہمیں خوش ہونا چاہئے تھا، کیونکہ ممدوحین کی فہرست میں ہمارے دادے ہمارے نانے اور ہمارے شیوخ سبھی ہیں لیکن عدل و صداقت سے نظریں چرانا ہمارے بس کا نہیں اس لئے فقط یہی کہہ سکتے ہیں کہ محترم مؤلف نے یہ کتاب لکھ کر اچھا نہیں کیا۔

ایک بہت بڑا فلسفی، سائنس داں، انجینیر اور ادیب و عالم بھی گاہے گاہے اپنے گھر میں گنگنا لیتا ہے اور اس گنگناہٹ میں بعض اچھے سُر بھی ضرور پائے جاتے ہیں لیکن وہ شخص مسخرہ ہی کہلائے گا جو فرطِ عقیدت میں اس گنگناہٹ کو ریکارڈ کر کے موسیقی کے مقابلے میں پیش کرے اور یہ دعویٰ فرمائے کہ ان گنگناہٹوں سے فن موسیقی کی بڑی خدمت ہوئی ہے۔

علمائے دیوبند کی شاعری کی مثال بالکل ان گنگناہٹوں جیسی ہے۔ وہ دینی و علمی بصائر کے سمندر تھے۔ زہد و طاعت کے مجسمے، روحانیات کے قائد اور سچے خادم اسلام۔ انھوں نے اگر اپنی زندگی کے اُن حصوں میں جب کہ ان کی معنوی عظمتیں پختگی و تیز کی منزلوں سے گذر رہی تھیں کبھی کبھار کچھ شعر کہہ لئے ہیں تو انھیں بس اتنا ہی قابلِ اعتنا سمجھنا چاہئے جتنا گھریلو گنگناہٹوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ انھیں مستقل موضوع بنا کر خواہ مخواہ جھنڈے پر چڑھانا اور مریدوں کے انداز میں ان کے قصیدے پڑھنا اہلِ نظر کے نزدیک اتنا ہی مضحکہ خیز ہوگا جتنا گھریلو گنگناہٹوں کا ریکارڈ ماہر موسیقاروں کے نزدیک۔

اکابر کا تمام سرمایۂ شعری ہمارے سامنے ہے۔ آج کے ترقی یافتہ معیار پر نہیں بلکہ انھی کے زمانے کے معیارِ فن پر جانچنے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سرمایہ بحیثیت مجموعی کوئی اونچی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ بے ادبی ہوگی اگر ہم کھل کر اظہار رائے کریں۔ کھل کر اظہار رائے ویسے بھی بے محل ہی ہوگا کیوں کہ شعر و ادب ان کا میدان نہ تھا۔ بڑے سے بڑا آدمی زندگی میں بہت سے چھوٹے اور فضول کام بھی کرتا ہے۔ سرورِ کونین ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی نہیں جس کے شب و روز کا ایک ایک لمحہ آفاقی عظمتوں کا یکساں طور پہ امین ہو اور جس کی زنجیر حیات کی ساری ہی کڑیاں خالص سونے کی ہوں مرحوم علمائے دیوبند نے یوں ہی بر سبیل تفریح کبھی کبھار شاعری کی ہے اور بعض زندہ علمائے دیوبند بھی اس شغلہ سے تھوڑی بہت دلچسپی رکھتے ہیں لیکن اس ضمنی اور غیر اہم شغل کو خواہ مخواہ ان کی حقیقی عظمتوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرنا نا سمجھی کی بات ہے جس طرح پرائمری کی دیواروں پر لٹکی ہوئی رنگا رنگ تصویریں اور سینریاں ایسی چیز نہیں ہوتیں کہ انھیں آرٹ اور مصوری کی صفوں میں رکھا جائے۔ اسی طرح ہمارے مرحوم اور زندہ علمائے دیوبند کی شاعری ایسی چیز نہیں ہے کہ اسے بجائے تاریخ کے لٹریچر کی حیثیت دی جائے۔ بے شک بعض نمونے بہتر اور ممتاز بھی نکلتے ہیں لیکن ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے رونے والے کے لحن میں کچھ گانے کے سُر بھی شامل ہوجائیں ــــ ناحل کی

چھاپ اس شاعری پر اتنی گہری ہے کہ شعریت کا ہر زاویہ دب کر رہ گیا ہے۔ بشق و مزاولت کی کمی قدم قدم پر نمایاں ہے۔ شعر فقط قافیہ پیمائی کا نام نہیں۔ کسی مفہوم کو بحر میں مقید کر دینا بھی شعر کی مکمل تعریف نہیں ہے۔ مختصر یہ ہے کہ یہ شاعری ایسی ضرور ہے کہ ہم معتقدین و منتسبین اپنی نجی مجلسوں میں بیٹھ کر اس پر سبحان اللہ اور واہ واہ کے گلہائے عقیدت نچھاور کریں لیکن ایسی نہیں ہے کہ منظر عام پر اسے ایک کارنامے کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔

نثر کا جہاں تک تعلق ہے اس میں بھی علمائے دیوبند کا بحیثیت ادیب بہت اونچا مقام نہیں۔ مولانا اشرف علیؒ کے قلم نے لاکھوں الفاظ سپردِ قرطاس کئے ہیں اور ان کے احسانات سے ہند و پاک کی امتِ مسلمہ دبی ہوئی ہے لیکن ادب و انشاء کے پہلو سے وہ بھی مولانا شبلیؒ اور سید سلیمان ندویؒ کے مماثل نہیں۔ علامہ انور شاہ صاحبؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ بیشک ادیب تھے، لیکن دریائے معانی کی غواصی میں وہ اس درجہ منہمک رہے کہ الفاظ کے نوک پلک درست کرنے پر زیادہ توجہ نہیں دے سکے اسی لئے انھیں ہم دنیائے معانی کا تاجدار تو کہہ سکتے ہیں لیکن ادب و انشاء کی صفِ امامت میں جگہ نہیں دے سکتے (ذکر صرف اُردو کا ہے عربی کا نہیں)۔

تصانیف ہمارے مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی بھی بہت ہیں لیکن جن لفظوں میں اس کتاب کے مؤلف نے ان کی تحسین کی ہے وہ بلاشبہ تحسین ناشناس ہے۔ ممدوح مکرم کی خطابت، نکتہ سنجی اور بسیار نویسی کے ہم بھی قائل ہیں لیکن انشاء پردازی! — اسے جانے ہی دیجئے!

خلاصہ یہ کہ زیر تبصرہ کتاب نہ لکھی جاتی اور نہ چھپتی تو اچھا تھا۔ دونوں ہی کام ہو گئے تھے تو کم سے کم ہم جیسے منہ پھٹ تبصرہ نگار کو تو برائے تبصرہ نہ بھیجی جاتی۔ لیکن مصیبت یہی ہے کہ خود مؤلف یا ناشرین کو اپنے کارنامے کی خامیوں کا اندازہ کرنے کی حس ہوتی تو وقت اور پیسے کی بربادی ہی کیوں ہوتی۔ ایک نومشق مصور بڑی محنت سے کسی چیز کی تصویر بناتا ہے تو یہی یقین رکھتا ہے کہ اس نے بڑا تیر مارا حالانکہ اہل نظر کے نزدیک اس کا یہ مبتدیانہ کارنامہ کچھ بھی نہیں ہوتا اسی طرح اس کتاب کے مؤلف اور ناشرین یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ انھوں نے بڑا معرکہ سر کیا ہے۔ اسی حسن ظن کے تحت وہ تبصرے کے بھی خواہش مند ہیں۔ اب ہم کیا کریں اگر فریضۂ تبصرہ ادا نہ کریں۔

سیرت سیدنا عثمان ذی النورینؓ

● تالیف: سید نور الحسن بخاری ● شائع کردہ:— دار التصنیف والاشاعت۔ محلہ تدبیر آباد۔ ملتان شہر ● لکھائی چھپائی معیاری۔ کاغذ کیمیکل— ● صفحات ۴۲۶ قیمت مجلد پانچ روپے۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ وہ مظلوم صحابی ہیں جن پر ان کی زندگی ہی میں اتہام و افترا کے ترکش خالی کئے گئے اور ایک خاص منصوبے کے تحت جھوٹے الزامات کی توپیں داغی گئیں۔ پھر ظلم و شیطنت نے آخری ناپاک قلم اُٹھا کر انھیں شہید کر ڈالا۔

زیر تبصرہ کتاب اسی مظلوم شہید کی سیرت مقدسہ کا بیان ہے۔ مؤلف نے بجا فرمایا کہ:—

"جہاں حضرت ابوبکر صدیق الاکبر، حضرت عمر فاروق الاعظم، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسین رضی اللہ عنہم کے محاسن و محامد اور فضائل و کمالات پر ہزاروں ورق رقم ہوئے اور ان قدوسیوں کی سیرت و تاریخ پر بیسیوں ضخیم کتابیں ہر زمانے میں لکھی گئیں وہاں اسلام کی یہ ایک عظیم و جلیل اور سراپا حسین و جمیل ہستی ہے جس کی سیرت پر اُردو تو اُردو فارسی اور عربی میں بھی (جہاں تک ہمارا محدود علم ہے) آج تک کوئی مبسوط و مفصل کتاب نہیں لکھی گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تاریخ کی اسی بے التفاتی کا نتیجہ ہے کہ آج پڑھے لکھے مسلمان بھی اس حسن سراپا و جمال مجسم ذات کی دلآویز خوبیوں اور ایمان افروز اخلاقی رعنائیوں سے بالکل بے علم و بے خبر ہیں۔"

الحمد للہ کہ فاضل مؤلف کو سیرت نگاری کا سلیقہ بھی ہے اور نقد و نظر کا شعور بھی۔ آپ نے بڑے ہی دلچسپ اور ایمان افروز انداز میں سیرت ذی النورین کو شبت قرطاس کیا ہے۔ صائب نقطہ نظر، معتدل زاویہ فکر، صحیح و غلط میں امتیاز کی صلاحیت اور عدل و دیانت کا اہتمام۔ یہ سب موجود ہو تو کتاب کیوں نہ اعلیٰ معیار کو چھو لے۔

شہادت ذی النورین یہ سیرت عثمانؓ کا حصہ ثانی ہے جو بخاری صاحب ہی کے قلم کا نقشِ جمیل ہے۔ ضخامت وہی ۲۶۶ صفحات اور قیمت بھی وہی پانچ روپے۔

حضرتِ عثمانؓ پر ان کی حیات ہی میں فتنہ پردازوں نے جو الزامات تراشے تھے وہ اگرچہ شرارت و مکاری کا شاہکار تھے اور تمام ثقہ ہم عصر ان کی بے بنیادی پر متفق تھے لیکن بعد کے کچھ بلید الذہن لوگوں نے حضرت علیؓ کی غالی عقیدت اور بنی اُمیّہ کے عناد میں ان الزامات کو نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ ان میں اضافے کر کر کے پھیلایا اور بدقسمتی سے آج تک اس خباثت کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ کتاب بڑے مؤثر انداز میں فتنہ پردازوں کی اس شرارت کا توڑ کرتی ہے اور اس میں ان تمام حقائق کو سلیقے سے جمع کر دیا گیا ہے جو اسلاف کی کتابوں میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے۔ جسے یہ معلوم کرنا ہو کہ تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم کے نزدیک حضرت عثمانؓ فضل و مرتبت میں تیسرے نمبر پر کیوں تھے اور حضرت علیؓ پر ان کا فائق ہونا کس لئے مسلّم تھا اسے یہ دونوں کتابیں ضرور پڑھنی چاہئیں۔ بخاری صاحب کا یہ احسان بڑی قدر و قیمت کا حامل ہے کہ اُردو میں انھوں نے دو مبسوط جلدیں شہیدِ مظلوم سیدنا عثمانؓ پر مرتب فرما دیں اور امّت کو بڑی حد تک اُس فرض سے سبکدوش کر دیا جو اس سلسلے میں اس پر عائد ہوتا تھا۔

ہمیں ڈر ہے کہ یہ دونوں جلدیں بھی پاکستان میں ضبط نہ ہو جائیں کیونکہ "حضرت معاویہؓ کی سیاسی زندگی" جیسی کتاب جہاں ضبط کی جا سکتی ہے وہاں کسی بھی کتاب کے لئے امان نہیں۔

مذکورہ کتاب میں مؤلف کا جرم صرف اتنا تھا کہ انھوں نے روشِ عام کے مطابق حضرت معاویہؓ اور یزید اور مغیرہؓ و عمروؓ کو حقیر و ذلیل کرنے کے عوض انصاف اور سعادتمندی کا حق ادا کیا تھا۔ یہی جرم ناقابلِ معافی بن گیا۔ ظاہر ہے کہ حضرت عثمانؓ کی صفائی اور توصیف کا جرم بھی ناقابلِ معافی ہی ہونا چاہئے۔ شیعہ حضرات تمام صحابہؓ پر سب و شتم کریں، امہات المومنینؓ کی شان میں کھلی گستاخیاں کریں اور گالی بازی کو اپنا مذہب بنالیں تو کچھ نہیں لیکن کوئی شخص حضرت علیؓ، اہل بیت اور تمام ہی صحابہؓ کے مکمل احترام اور نیازمندی کے ساتھ حضرت معاویہؓ اور مغیرہؓ و عمروؓ کی تعریف کرنے لگے تو گردن زدنی اور گمراہ۔

حاصل تبصرہ یہ کہ سید نور الحسن بخاری نے حضرتِ عثمانؓ پر یہ دو جلدیں لکھ کر نہ صرف دینی لٹریچر میں ایک بیش بہا اضافہ کیا ہے بلکہ تمام اُردو داں مسلمانوں کو ان کا مرہون احسان ہونا چاہئے کہ کم علمی اور مخالف پروپیگنڈے کے تحت جو کانٹے حضرت عثمانؓ جیسی عظیم شخصیت کے بارے میں ان کے ناپختہ اذہان و قلوب میں جاگزیں ہو گئے ہیں ان سب کو یہ کتاب ایک ایک کر کے نکالتی ہے۔ ہم نے مکتبہ تجلی کو مشورہ دیا ہے کہ اس بیش بہا کتاب کو حاصل کر کے اپنے حلقے میں پھیلایا جائے خدا کرے اس کی کوئی صورت نکل آئے۔

شیطان جاگ اٹھا یہ جناب تخلص بھوپالی کے ان دلچسپ مضامین کا مجموعہ ہے جو ان کے مرحوم اخبار "بھوپال پنچ" میں چھپ چکے ہیں۔ موصوف ایک خاص طرز کے مزاح نگار ہیں۔ ان کا اپنا ایک رنگ ہے اور مزاح کے ساتھ وہ طنز بھی ان کے یہاں خاصی مقدار میں موجود ہے جو کسی بھی ذہین اور حساس فنکار کی فطرت کا جزو ہوا کرتا ہے ان کی دو کتابیں ماضی قریب ہی میں چھپ کر مقبول ہوئی ہیں "پوسٹ مارٹم" اور "پاندان والی خالہ" یہ تیسرا مجموعہ بھی انشاء اللہ قبولیت کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔ تیکھا پن، مشاہدے کی لطافت، رچاؤ، روانی اور بے ساختگی یہ اوصاف ان کے یہاں عام ہیں۔ ان کے مزاحیہ شہ پارے پڑھ کر دل و دماغ کو نہ صرف نشاط حاصل ہوتا ہے بلکہ غور و فکر کی غذا بھی مہیا ہوتی ہیں۔

محسنِ صورت کی بات کچھ نہ پوچھئے۔ اچھی کتابت' لپسندیدہ طباعت' عمدہ کاغذ' دل کش سائز' جلد بھی اچھی۔ صفحات ۱۹۲ ہیں اور قیمت دو سو چھتر نئے پیسے!

ہاں ایک بات ہماری ناقص فہم سے بالا رہی۔ شروع ہی میں ایک صفحے پر مادرِ وطن کے اُن غیور اور فرض شناس سپاہیوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے جنھوں نے ملک کی خاطر جانیں دے کر ہمالہ کی چوٹیوں کی آبرو رکھ لی۔ یہ سب مصنف ہی کے الفاظ ہیں۔ الفاظ پر ہمیں کلام نہیں۔ کلام اس پر ہے کہ بالکل غیر متعلق مضامین کے اس مجموعے کی پیشانی آخر اس نذرانۂ عقیدت کے لئے موزوں کہاں تک تھی؟ اس سے تو بہتر یہ تھا کہ مخلص صاحب ایک بڑا سا پوسٹر اسی عبارت کا الگ سے چھاپ کر سرکاری عمارتوں کے آس پاس لگوا دیتے اور ایک ایک عدد سرکاری محکموں کو بھی ڈاک سے بھجوا دیتے۔

ہر چیز کا ایک محل ہے۔ ناک ناک ہی کی جگہ رہنی چاہیئے اور کان کان ہی کی جگہ۔ ہماری فہمِ ناقص کے مطابق یہ خراجِ عقیدت اس کتاب کے ماتھے پر جچا نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سفرنامۂ حجاز

یہ روش اب بہت زور شور سے چل گئی ہے کہ حج کو جانے والا ہر صاحبِ قلم سفرنامہ لکھتا ہے اور یہ چھپ چھپا کر ہدیۂ ناظرین ہوتا ہے۔ روش بُری نہیں۔ اس سے ایک ہی موضوع پر گوناگوں تاثرات سامنے آتے ہیں اور گلزارِ مطالعہ میں بہارِ صد رنگ کا لطف آجاتا ہے۔

زیرِ تبصرہ سفرنامہ جناب مولانا عبدالرؤف رحمانی کے قلمِ گوہر رقم کی تراوش ہے جو جانے پہچانے علماء میں سے ہیں عالم ہونا تو خیر کوئی نادر بات نہیں مگر ندرت اس میں ہے کہ مولنا میں وہ گروہی تعصب اور تشدد نہیں پایا جاتا جو آج کل ہوا اور پانی کی طرح عام ہے۔ آپ مسلکاً اہلِ حدیث ہیں' لیکن ہم جیسے حنفی گدی نشینوں سے مخلص دوستی اور اختلافی مسائل میں فراخ دلی اور رواداری۔ البتہ یہ بھی مسلک سے آپ کو بھی بیزاری [illegible] بیزاری

ہونی بھی چاہیئے۔ رواداری اور مفاہمت کے کچھ حدود ہیں۔ بات ان حدوں سے باہر کی ہو تو مفاہمت بے حسی اور جمود کے ہم معنی قرار پائے گی۔

یہ سفرنامہ خاصا دلچسپ ہے اور معلومات کا خزینہ بھی۔ قدم قدم پر ایسے تبصرے اور ریمارک ملتے ہیں جو مولنا کے مذاقِ علمی اور صاحب نظری کے شایانِ شان ہیں۔ اگرچہ جذبہ واحساس کے وہ لطیف و نازک زاویئے تو بہت کم ہیں جو بحر اور قافیے سے آزاد ہونے کے باوجود غزل کے ایک حسین شعر کی طرح دل میں اُتر جائیں' لیکن اوسط درجے کی دلپذیر انشاء جوئے رواں بن کر پوری کتاب میں بڑے خوشگوار انداز میں بہہ رہی ہے۔ مولانا کو قدم قدم پر شعر استعمال کرنے کا بڑا ملکہ ہے۔ اُردو فارسی اشعار کثرت سے بکھرے نظر آتے ہیں۔ نثر میں چار چاند لگ جاتے ہیں اگر برمحل اور برجستہ اشعار قلم سے ٹپکتے جائیں۔ یہ خوبی اچھے حافظے کے بغیر میسر نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ موصوف کے حافظے اور حسنِ مذاق میں برکت و تقویت دے۔ مولانا ابوالکلام کے بعد شاید ہی کوئی صاحبِ قلم اپنی نثر کو اشعار کے اتنے بہت سارے نگینوں سے زینت دے سکا ہو۔ ہمیں تو اس سفرنامے کے مطالعہ میں ان شعروں کی وجہ سے خاص لطف آیا۔ گو اس سلسلے میں ایک ناچیز سا مشورہ بھی ہمیں دینا ہے۔ اس مشورے کے دو پہلو ہیں۔

ایک یہ کہ مولانا کو اشعار کے انتخاب میں مذاق و معیار کی یکسانی پر خاص نگاہ رکھنی چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ اول و دوم درجے کے اشعار کے ساتھ ساتھ تیسرے اور چوتھے درجے کے شعروں کو بھی دخل در معقولات کی اجازت دیدی جائے مولانا آزاد کے یہاں معیار کا تضاد نہیں ملتا وہ شعر پر شعر سپردِ قلم کرتے ہیں لیکن گھٹیا اور بچکانہ اشعار کو راہ نہیں دیتے موصوف کو بھی بیدار ذہنی کے ساتھ اس کا خاص خیال رکھنا چاہیئے۔ کہیں کہیں ایسے غیر ثقہ اشعار کو بھی وہ جگہ دیتے ہیں جو ان کے مذاقِ شعری کے لئے طعن سے کم نہیں۔

دوسرا یہ کہ فقط اپنے حافظے پر اعتماد نہ کیجئے بلکہ شائع ہونے سے قبل اس کے اشعار کسی ایسے شخص کو [illegible]

دکھلا لیجئے جو شعر و سخن کا مذاق اور طبع موزوں رکھتا ہو۔ کتنے ہی شعر ہمیں ایسے ملتے ہیں جنھیں یادداشت کے خلل نے لنگڑا لولا بنادیا ہے۔ یادداشت کی لغزش کوئی بڑی لغزش نہیں لیکن اشعار کا معاملہ یہ ہے کہ ان میں یادداشت کی لغزش مذاقِ شعری کا پردہ فاش کردیتی ہے۔ ایک شخص حافظے کی غلطی سے شعر کا کوئی لفظ بدل دے تو کوئی بڑا قصور نہیں، لیکن اگر وہ بحر و وزن ہی کا ستیاناس کردیتا ہے تو ثابت ہوگا کہ اس کا مذاقِ شعری بے جان اور طبیعت ناموزوں ہے۔ مزید وضاحت کے لئے اسی سفرنامے سے ہم مثالیں پیش کرتے ہیں۔

عمرے باید کہ یار آیا بکنار — ص۵

مرحبا اے پیکِ فرخ فال ما — ص۴۱

افلاک منور ہو تری نور سحر سے — ص۱۸۴

شرمندہ ہو فطرت تری اعجاز سحر سے — "

ظہور روح قدس ہیں بہ صورت بشری — ص۱۹۲

ہشدار کہ نتواں بہ یک آہنگ سرودن — ص۱۹۳

قربان پاپہ شوم کہ بکوئت رسیدہ است — ص۲۴۷

ان مصرعوں کی وہ غلطیاں جن پر ہم نے خط کھینچ دیا ہے کتابت کی غلطیاں سمجھ میں آتی ہیں جو ناخوشگوار ضرور ہیں مگر صاحب کتاب کے مذاقِ شعری کو مجروح نہیں کرتیں لیکن متعدد نمونے ہم ان اشعار کے پیش کرتے ہیں جن کا الزام کاتب اور مصحح کو دینا مشکل ہے۔

ادنیٰ سی التفات سے اس ذات پاک نے — ص۸

التفات مؤنث نہیں۔ "سی" کے بجائے "سے" لکھنا چاہیئے تھا۔

تحفہ بعزیزان وطن خواہد گفت — ص۱۹

ہر کہ تختہ ازیں ورطہ بہ ساحل برود

پہلا مصرعہ اگرچہ بحالت موجودہ بھی بے بحرا نہیں لیکن یہ وہ بحر نہیں ہے جو دوسرے مصرعے کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے لفظ "ما" حافظے سے اتر گیا ہے۔

تحفہ ما بعزیزانِ وطن خواہد گفت

اب دونوں مصرعوں کی بحر ایک ہوئی۔

کہاں میں اور کہاں یہ موسم گل — ص۴۳

نسیم صبح تیری مہربانی

ہمارا خیال ہے پہلے مصرعہ میں "موسم گل" نہیں "نکہتِ گل" ہونا چاہیئے۔ تاہم ایسا سہو قابل نظر اندازی ہے البتہ ذیل کے نمونے خصوصی توجہ کے طالب ہیں

دیکھتے ہی حضرت ابراہیم کی باچھیں کھل گئیں — ص۴۷

اگر یہ مولانا کا سہو نہیں بلکہ "خیابانِ دانش" ہی میں اسی طرح چھپا ہے تو پھر بھی اس کی عروضی خامی کی اصلاح یوں کرلینی چاہیئے تھی:۔

دیکھتے ہی حضرت ابراہیم کی باچھیں کھلیں

صفحہ ۹۳ پر یہ دو مصرعے :۔

بہ نقل از استاداں یاد دارم

مقامات از بہر دو بیروں ہست فردا

خارج از بحر ہیں۔

بہت رہا کیا ہے لطف یار ہم پر بھی

گذر چکی ہے یہ فصل بہار ہم پر بھی

پہلا مصرعہ یادداشت کے سہو کا ہدف ہوا ہے یا پھر جہاں سے مولانا نے نقل کیا ہے وہیں غلط چھپا ہے۔ بہر حال میں موزونیِ طبع کا تقاضا تھا کہ اسے یوں درست کرلیا جاتا

رہا کیا ہے بہت لطفِ یار ہم پر بھی

صفحہ ۱۰۸ پر :۔

فریدون فرخ فرشتہ نہ بود

زمشک و عنبر سرشتہ نہ بود

دوسرا مصرعہ لنگڑا ہوگیا۔

بادشاہ نے کی وہ عزت افزائی میری

اور

اسکے فیض پاکی منت خواہ کان لعل خیز

نہیں کہا جاسکتا کہ ان دونوں مصرعوں میں کاتب کی کارگذاری کتنی ہے اور مولانا کا سہو کتنا۔

اب اتنا اور سُن لیجئے حضرت

جو حق پر نہ چلے اس پر بھی لعنت

دونوں ہی مصرعے ناقص البحر ہیں۔

فلسطین و جزائر کے ہنگامۂ جاری کا
غم نہ کر کہ یہ پیغام ہے بہاری کا

پورے شعر کا مثلہ ہو گیا۔

کتاب میں پھیلے ہوئے صدہا اشعار کے مابین دس بیس ناقص شعر اگرچہ کتاب کی قدر و قیمت کم نہیں کرتے لیکن محترم مولانا کے مذاقِ سلیم اور موزونیتِ طبع پر اس سے داغ آتا ہے۔ آئندہ اس بارے میں خاص احتیاط برتی جائے تو اولیٰ ہے۔

سفرنامہ کا ہم دل سے خیرمقدم کرتے ہیں اور اربابِ ذوق کو اس کے مطالعہ کا مشورہ دیتے ہیں۔ صفحات ۲۵۶ کتابت طباعت گوارا۔ کاغذ سفید قیمت تین روپے۔ (ہماری رائے میں قیمت زیادہ سے زیادہ ڈھائی روپے ہونی چاہئے تھی)

خانوادۂ قاضی بدرالدولہ

جلد اوّل :— ● تالیف افضل العلماء محمد یوسف کوکن عمری ایم، اے ● صفحات ۵۴۲۔ ● سائز بڑا۔ لکھائی چھپائی اچھی۔ کاغذ گلیزڈ۔ ● قیمت مجلد ساڑھے آٹھ روپے۔

مولانا محمد یوسف صاحب ابن تیمیہؒ کی سوانح لکھکر شہرت و قبولیت کا خراج حاصل کر چکے ہیں۔ پیش نظر کتاب بھی ان کے محققانہ مزاج و مذاق کا دلکش نمونہ ہے۔ یہ جنوبی ہند کے ایک ایسے سعید و مبارک خاندان کا تاریخی تذکرہ ہے جو بقول مؤلف نویں صدی ہجری کے آغاز سے مسلسل دینی و علمی خدمات انجام دیتا چلا آرہا ہے اس نوع کی کتابوں پر شایان تبصرہ کرنے کے لئے خاص نوع کی صلاحیتیں چاہئیں جن سے ہم خود کو بہرور نہیں پاتے۔ لہٰذا نقد و نظر کی ذمہ داری اٹھائے بغیر بس اتنا ہی کہیں گے کہ جن جن مقامات سے اس وقیع کتاب کو دیکھا بیش قیمت پایا۔ بے شمار تاریخی دستاویزوں سے مزین کرتے ہوئے فاضل مؤلف نے تلاش و تفحص کا حق ادا کیا ہے۔ انشاء رواں اور شگفتہ ہے۔ اسلوب دلپذیر اور عام فہم۔ تاریخی ریسرچ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک اچھا تحفہ کہی جاسکتی ہے۔

ہمارے عائلی مسائل

● از مولوی محمد تقی عثمانی ● شائع کردہ :— دارالاشاعت۔ مولوی مسافر خانہ کراچی ۱ ● طباعت و کتابت غنیمت۔ ● قیمت مجلد پونے چار روپے ● صفحات ۲۵۶۔

محمد تقی صاحب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے صاحبزادے ہیں اور علمی مزاج و مذاق ورثے میں پایا ہے۔ دارالعلوم کراچی کے منصب تدریس پر فائز ہیں اور قرطاس و قلم سے بھی شغف رکھتے ہیں۔

پاکستان میں حکومتی سطح پر جو ظلم عائلی قانون کی شکل میں دین و شریعت پر کیا گیا ہے اس سے کون ناواقف ہے۔ اس قانون کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ پاکستان میں اُس ناپاک ذہن کو بڑا عروج حاصل ہوتا جارہا ہے جو اسلام ہی کے نام پر اسلام کا تیاپانچہ کر دینا چاہتا ہے اور شاہد مغرب کی جلوہ طرازیوں نے اسے ایسا مسخر کیا ہے کہ وہ ہر قیمت پر قرآن و سنت والے اسلام کا خاتمہ کر دینے کا متمنی ہے۔ ویسے تو اس تحریک زنادقہ کے بے شمار گوشے اور حربے ہیں لیکن پوتے کی میراث، تعدد ازدواج، احکام طلاق اور عمرِ نکاح کے چند مسائل کو مخصوص طور پر اس نے اپنی دسیسہ کاریوں کی آڑ بنایا ہے۔ یہ آڑ کارگر یوں ہو گئی کہ خود حکومتِ پاکستان کے اربابِ اقتدار بھی مغربیت ہی کے اسیر ہیں اور ایک فاسد و کاسد عائلی قانون نے ڈنڈے کی پشت پناہی حاصل کر لی ہے۔ علماء بیچارے اس سے زیادہ کیا کرتے کہ استدلال کے ذریعہ اس قانون کی شناعتیں واضح کریں۔ وہ برابر اس کام کو خوش اسلوبی سے کرتے آرہے ہیں۔ اور عزیزی مولوی محمد تقی نے بھی اسی کارِ خیر میں ہاتھ بٹایا ہے انھوں نے متذکرہ عنوانات میں سے ایک ایک کو لیکر مخالف و موافق دلائل میں موازنہ اور محاکمہ فرمایا ہے ان کے اسلوب میں علمی متانت بھی ہے، فکری اصابت بھی اور سلیقہ گفتار بھی ان کے قلم میں ابھی سے ایسی پختگی پائی جاتی ہے جو ان کی عمر کی

نسبت سے لائق رشک ہے۔ اللہ تعالیٰ مزید حسن و زیبائی عطا فرمائے۔

ویسے تو متذکرہ مسائل خصوصی تعلق پاکستان ہی سے رکھتے ہیں لیکن ہندوستان بھی ان کی گونج سے خالی نہیں ہے اور یہاں بھی زنادقہ کا زہریلا فکر پر پرزے نکال رہا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بھی یقیناً مفید ہوگا۔ خاص طور پر اس سنئے فتنے کے تعلق سے جو چند سر پھرے اور اجہل مسلمانوں کی درخواست پر حکومت نے ایک کمیٹی کی تجویز پاس کرکے بیدا کیا ہے اس کتاب کا مطالعہ افادیت کا حامل ہوگا۔

کتاب کی قیمت ہمارے ہندوستانی معیار پر کچھ زیادہ ہے تین روپے ہوتی تو موزوں ہوتا۔

مطالب قرآن

یہ قیمتی کتاب اس کی مستحق تھی کہ موصول ہوتے ہی زیر تبصرہ آجاتی لیکن حالات کی ستم ظریفی یا پھر ہماری بے توفیقی کہئے کہ تقریباً چھ ماہ بعد اسکا نمبر آرہا ہے جس کے لئے ہم ناشر و مرتب دونوں سے شرمندہ ہیں۔

یہ کتاب دراصل اُس تفسیر القرآن کا ایک جزو ہے جو ماہنامہ "الحق" میں ماہ بہ ماہ چھپ رہی ہے۔ تجلی سائز کے ۱۶۰ صفحات پر سورۂ الحمد اور پوری سورۂ بقرۃ کی تفسیر کتابی صورت میں شائع کردی گئی ہے۔ کتابت و طباعت غنیمت کاغذ سفید۔ ہدیہ ڈھائی روپے۔

محترم مفسر جناب صفوۃ الرحمان صابر بڑے دردمند، خلوص کیش اور ذی بصیرت انسان ہیں۔ حیدرآباد کا علاقہ اپنے گردونواح سمیت جن بدعات و خرافات سے لبالب بھرا ہوا ہے اس کی شرک نواز فضا میں صابر صاحب اور ان کے معروف ادارے "ادارۂ اہل سنت وجماعت" کا وجود دنتکدے میں اذان کے مرادف ہے۔ توحید سے گہرا تعلق اور شرک و بدعت سے بیزاری۔ یہ ہے اس ادارے اور امیر ادارہ کی نمایاں تر خصوصیت۔ ویسے یہ ضرور ہے کہ ردّ عمل کی رو میں صابر صاحب سے گاہے گاہے ایسی شدت بھی ظہور میں آئی ہے جسے قدرے لچک دینا متانت و حکمت کے عین مطابق ہوتا لیکن اسکے لئے انھیں قصوروار ٹھیرانا اس لئے مشکل ہے کہ جہالت و ضلالت جب شتر بلے کے عوض ننگا ناچ ناچنے پر اتر آئیں اور جہالت مرکبہ علم والوں پر استہزاء کے قہقہے اڑانے لگے تو اہل بصیرت کا مشتعل ہوجانا فطرت ہی کا تقاضا ہے۔

تاہم یہاں گفتگو صابر صاحب کے عام خیالات و معتقدات کی نہیں تفسیر القرآن کی ہے۔ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ گوناگوں تفاسیر کے درمیان یہ تفسیر ایک خاص قدر و قیمت رکھتی ہے اور اس کی افادیت میں دو رائے کی گنجائش نہیں۔ آغاز میں موصوف نے عربی صرف و نحو کے ابتدائی قواعد بھی سپرد قلم فرما دیئے ہیں جن سے مبتدی حضرات کو خاصا فائدہ ہوگا۔ تفسیر میں آپ نے ترجمہ و تفسیر کو الگ الگ نہیں رکھا ہے بلکہ فصاحت اور ربط و تسلسل کا لحاظ رکھتے ہوئے دونوں چیزوں کو آمیز کردیا ہے۔ یہ طریقہ اگرچہ محتاط نہیں سمجھا گیا تاہم تعلیم و تفہیم کے لئے غیر موزوں بھی نہیں ہے۔ خوبی یہ ہے کہ مفسر نے اپنی وسعت مطالعہ اور نکتہ سنجی کی نمائش نہیں کی ہے، بلکہ سادہ لیکن پُرکار انداز میں قرآنی مطالب ہی پیش فرمائے ہیں۔ اس سے قارئین کے دل و دماغ نہ تو موضوع سے دور جاتے ہیں نہ وہ تساہل اور تعطل ان کے اندر پیدا ہوتا ہے جو دور دراز نکتہ سنجیوں اور لاطائل قسم کی سخن طرازیوں کا نفسیاتی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ ایسی تفسیریں کس کام کی جو مفسر کے علم و مطالعے کا رعب تو دلوں پر بٹھائیں لیکن اصل مقصد — قرآن کا فہم اور عمل کی تحریک — دب کر رہ جائے۔

اللہ تعالیٰ صابر صاحب کو جزائے خیر دے انھوں نے کام سے کام رکھا ہے رنگ برنگی روایات اور تاویلات کے جنگل میں نہیں بھٹکے۔

شرک و بدعت ان کا خصوصی ہدف ہیں اور توحید کے نوک پلک درست کرنا ان کی زندگی کا مشن۔ ہمیں امید ہے کہ ان کی تفسیر پڑھنے والے دین کی حقیقت، قرآنی تعلیمات کے مقصد اور توحید کے بنیادی تقاضوں سے قریب تر ہوتے جائیں گے۔

حیدرآباد ہم نے نہیں دیکھا لیکن دیکھنے والوں سے

جو کچھ سنتے ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بدعات و شرکیات کے اعتبار سے بریلی اور بدایوں بھی شاید ہی اس کا مقابلہ کر سکیں۔ ہماری طرف شرابیوں، افیمچیوں، سر پھنگوں اور دیوانوں تک کی قبریں ضرور پجتی ہیں لیکن یہ شرف علاقہ حیدر آباد ہی کو حاصل ہے کہ وہاں "چلّے" کے نام سے ایسی بھی قبریں پجتی ہیں جن میں کیچوے کا بچہ تک دفن نہیں۔ خالی مٹی کے ڈھیر۔ کوئی دفن نہیں ہوا مگر قبر موجود ہے۔ اس بگڑے دل علاقے میں ادارۂ اہل سنت والجماعت جیسی تنظیم کا وجود فال نیک ہے، اور جو اہل استطاعت اسے تعاون دیں گے وہ انشاء اللہ اجر جزیل کے مستحق ہوں گے۔ بات موضوع سے ہٹی ہوئی ہے مگر بے ساختہ قلم کی نوک پر آرہی ہے کہ حیدر آباد ہی وہ علاقہ ہے جہاں لڑکے والے ہندوؤں کی طرح لڑکی والوں سے "جہیز" وصول کرتے ہیں۔ ویسے تو یہ کمینہ اور نجس رسم بہار کے علاقے میں بھی ہے لیکن سنا ہے کہ حیدر آباد تو کئی قدم آگے ہے۔ صابر صاحب کا ادارہ اگر اس کی طرف بھی توجہ دے تو بڑا مبارک ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ جو فرد یا گروہ اس شیطانی اور ٹھیٹ کافرانہ رسم کو مٹانے میں اپنی صلاحیتیں کھپائے گا اسے دس تفسیریں لکھنے سے زیادہ ثواب ملے گا۔

تبصرے کا خلاصہ یہ ہے کہ "مطالب قرآن" کا سلسلہ مفید سلسلہ ہے اور عامۃ المسلمین کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

العقیدۃ السنیۃ

اس کتاب پر دو وجہ سے تفصیلی تبصرہ مشکل ہے۔ ایک یوں کہ یہ عربی میں ہے۔ قارئین تجلی کی غالب ترین اکثریت اردو ہی تک محدود ہے اس لئے مفصل تبصرے کی بھی ہوئی رہنمائی ان کے کسی کام کی نہ ہوگی۔

دوسرے یوں کہ یہ بڑے پائے کی کتاب ہے جس پر شایانِ شان تبصرہ ہم سے زیادہ قابلیت کا آدمی کر سکتا ہے۔ ہم اس گوہر گرانمایہ کی قرار واقعی پرکھ کے اہل نہیں ہیں۔ تاہم اپنی سی کوشش بہرحال کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی پر اللہ کی ہزار ہزار رحمتیں ہوں، بتکدۂ مشرق میں وہ اپنے دور کے ابراہیم ہوئے ہیں۔ عقل و نقل دونوں کا محیط، درایت اور تعدیل کے امام۔ حکمت ان کی کلاہ کا طرّہ اور فلسفہ و منطق ان کے ایوانِ تبحر کے دربان۔ اصطلاحاً وہ فلسفی نہیں تھے۔ شکر کی جا ہے کہ نہیں تھے۔ فلسفہ قوائے عمل کو شل کرتا اور ذہن و قلب کے رابطۂ صحیحہ کی رگیں کاٹتا ہے۔ لیکن زلف در زلف نزاکتوں کا احاطہ کرنے اور پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہونے کا جو قیمتی عنصر فلسفے کے خمیر میں پایا جاتا ہے وہ بہرحال شاہ صاحب کو قادرِ مطلق نے عطا فرمایا تھا۔ یہ عنصر جب طاعت و تقویٰ سے مل جائے تو کیمیا بنتا ہے۔ شاہ صاحب کی اکثر کتابوں میں فلسفے اور دین کے خوشگوار امتزاج نے ایک شاندار تفقہ کی شکل اختیار کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب شاہ صاحب ہی کے ایک رسالے "العقیدۃ الحسنۃ" کی فاضلانہ شرح ہے۔ اصل رسالہ امام ابو حنیفہؒ سے منسوب "فقہ اکبر" کی طرح مختصر ہے لیکن اسی کی طرح قیمتی اور وزنی بھی۔ اس میں دین کے اساسیات کو حسن ایجاز کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ خدائے تعالیٰ کی ذات و صفات پر محکم گفتگو ہے اور شرک کی جڑیں کاٹ دی گئی ہیں۔ اساسی عقائد میں یہ بھی شامل ہے کہ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بڑے انسان ابوبکرؓ تھے پھر عمرؓ پھر عثمانؓ پھر علیؓ رضوان اللہ علیہم۔ اس عقیدے کا خصوصی تذکرہ تبصرے میں عجیب لگے گا کیونکہ اسے تو اہل سنت کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ لیکن خصوصی تذکرے کا مقصد یہ یاد دلانا ہے کہ خلفائے راشدین میں تفاضل کی یہ معروف ترتیب صرف ایک رائے اور خیال کے درجے کی چیز نہیں ہے بنیادی اہمیت کی چیز ہے۔ زمانے کی ستم ظریفی دیکھئے ابوبکرؓ و عمرؓ کی افضلیت پر تو بے شک اہل سنت پورے شعور و بصیرت کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں لیکن حضرت عثمانؓ کے باب میں ان کا ایمان فقط روایتی سا رہ گیا ہے وہ عام طور پر نہ صرف مناقبِ عثمانی سے بے خبر ہیں بلکہ تشیعی آئیڈیالوجی کے چاروں طرف پھیلاؤ نے ان کے تحت الشعور پر کچھ معاندانہ خطوط بھی کھینچ دیئے ہیں جن کا اعتراف اگرچہ وہ نہ کریں لیکن ایسے ہر موقع پر یہ اندرونی فساد ظاہر ہو کر ہی رہتا ہے جب حضرت

علیؓ کی منقبت میں حدود جائز سے گذر جاتے ہیں۔

خیر یہ سب یہاں موضوع سے خارج ہے۔ بات شاہ صاحب کے رسالے کی ہو رہی تھی۔ اس رسالے کا لفظ لفظ موتی ہے۔ پھر اس کی شرح و توضیح کیا کہنے۔ مولانا محمد ادریس ندوی نے فصیح عربی میں حق شرح ادا کیا ہے اور جس طرح متن کو دیکھ کر "فقہ اکبر" کی یاد آتی تھی اسی طرح شرح کے مطالعے نے ملا علی قاری کی "شرح الفقہ الاکبر" کی یاد دلا دی۔ فاضل شارح نے امام ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ سے خصوصی استفادہ کیا ہے۔ شیخ عز الدینؒ، حافظ سیوطیؒ، امام آلوسیؒ، امام غزالیؒ، سبکیؒ، شوکانیؒ اور قرطبیؒ وغیرہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ سیوطی اور سبکی رحمہما اللہ تعالیٰ جیسے علمائے اجل کو ہم بعض موضوعات پر قطعاً سند نہیں سمجھتے، لیکن ان کی جلالت شان اور عظمت میں کوئی شبہ نہیں۔

کچھ تشنگی سی شرح میں اس مقام پر ضرور محسوس ہوئی ہے جہاں اختتام خلافت اور ملک عضوض کا ذکر آیا ہے۔ یہاں فاضل شارح ذرا بسط اور ژرف نگاہی سے کام لیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ بحالت موجودہ شرح خود متن بن کر رہ گئی ہے۔ ایسا متن جو کھٹکتا ہے۔

کتاب کا مقدمہ مولانا ابو الحسن علی ندوی کا ہے جو ان کی جانی پہچانی تحریروں کی طرح پر مغز، فکر انگیز اور فصیح و بلیغ ہے۔ صفحات ۸۶ سائز متوسط۔ کتابت ٹائپ کی ہے مگر طباعت زیادہ بہتر نہیں ہو سکی۔ تصحیح کے نقائص بھی خاصے ہیں۔ قیمت دو روپے۔ شائع کردہ:۔ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

جدید تبلیغی نصاب مکمل — مجلد ۵/۵۰

اسلام کیا ہے؟ — مجلد ۲/۱۵

دینی کتابیں

صحیفۂ ہمام بن منبہ — حضرت ابو ہریرہؓ کا مرتب کیا ہوا قدیم ترین مجموعۂ حدیث مع تشریح۔ مکتوباتِ نبویؐ کے فوٹو بھی شامل کتاب ہیں۔ قیمت ساڑھے تین روپے۔

سچے رسولؐ کی سچی تعلیم — زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق تعلیماتِ رسالت کا ایمان افروز مجموعہ۔ قیمت مجلد ڈیڑھ روپیہ۔

جنابِ اسعد گیلانی کی دو کتابیں

انتظار (جدید مضامین) ایک روپیہ

کتاب انقلاب (”) ایک روپیہ

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک — از مولانا مسعود عالم ندوی۔ ڈھائی روپے

مقالاتِ شیخ الہندؒ — وحی کی حقیقت اور ایمان و دیانت کے باہمی ربط پر ایمان افروز گفتگو۔ مشہور مفسرِ قرآن مولانا محمود الحسن شیخ الہندؒ کے قلم سے۔ ایک روپیہ

درویشی کیا ہے؟ — مشائخ و صوفیاء کے ایمان افروز ارشادات قرآن و سنت سے ہم آہنگ بلیغ و نفیس توضیح۔ سوا دو روپے۔

چوکھٹ کے اندر — عورتوں کے لئے چند نفیس مضامین۔ قیمت ایک روپیہ

محمد بن عبد الوہابؒ — ایک مظلوم اور بدنام مصلح کی مستند سوانح۔ مولانا مسعود عالم ندویؒ کے قلم سے۔ قیمت پونے تین روپے۔

اونچی دکانیں — صدیق الحسن گیلانی کے دلچسپ شہ پارے۔ قیمت ایک روپیہ

عہدِ رسالت کی مقدس خواتین — اپنے موضوع کی یکتا کتاب۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ

کراماتِ صحابہؓ — از مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ ڈیڑھ روپیہ

محاسنِ اسلام — اسلام کی خوبیوں پر مولانا اشرف علیؒ کی ایمان افروز تقریر۔ صرف ڈیڑھ روپیہ۔

عبقات — اختلافی موضوعات اور علوم تصوف پر شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی مشہور کتاب۔ ترجمہ:۔ از مولانا مناظر احسن گیلانیؒ۔ ساڑھے دس روپے۔

زبدۃ المناسک — حج اور احکامِ حج پر مفصل و مدلل کتاب۔ مصنفہ:۔ استاذ الاساتذہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ۔ ہدیہ مجلد آٹھ روپے۔

حقوق الاسلام — اپنے وقت کے زبردست عالم قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی مفید ترین تصنیف جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کی رُو سے کس پر کس کا کیا حق ہے۔ اللہ رسولؐ صحابہ علماء۔ والدین۔ اقرباء۔ حاکم۔ شوہر بیوی۔ اولاد۔ پڑوسی۔ غرض ہر ایک کے حقوق کی تفصیل۔ رسالہ سماع و مزامیر بھی شامل کتاب ہے۔ اردو ترجمہ عام فہم۔ قیمت مجلد دو روپے۔

فتوح الغیب — شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے مقالات کا اردو ترجمہ۔ قیمت مجلد ڈھائی روپے۔

القاموس الجدید — ایک رفیع الشان اردو عربی ڈکشنری جس میں اردو الفاظ کے عربی مترادفات کے علاوہ اس میں ضرب الامثال محاورات اور زبان کے نئے تغیرات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ضروری مقامات پر تصاویر کے ذریعہ مفہوم کو واضح کیا گیا ہے۔ مفید بیش قیمت اور جلیل القدر۔ عربی سیکھنے والوں کیلئے تحفہ۔ سات روپے

مکتبہ تجلی دیوبند (یوپی)

مکمل فہرست کتب مفت طلب فرمائیے

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ پر قاضی سلیمان منصور پوریؒ کی شہرۂ آفاق کتاب کا مختصر تعارف یہ ہے کہ اہل علم اسے علمی اعتبار سے مستند مانتے ہیں اور اندازِ بیان، دلکشی، رچاؤ اور دروبست کے لحاظ سے یہ اپنا جواب آپ ہے۔ سوز و گداز میں ڈوبا ہوا اسلوب ستھرا اور نکھرا ہوا فکر۔ عبارتیں رواں، شگفتہ اور دلنشیں۔ مدت سے یہ قیمتی کتاب نایاب تھی اب خاصے اہتمام کیساتھ تین جلدوں میں شائع کیگئی ہے۔ قیمت مکمل غیر مجلد بیس ۲۰ روپے۔

(مجلد تین جلدوں میں ۲۵ روپے)

خصائل مسلمین

شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے پوتے شاہ محمد اسحٰقؒ کی مشہور کتاب "مسائل اربعین" کا اُردو ترجمہ۔ چالیس ۴۰ مروجہ بدعتوں کا رد مستند کتب فقہ کے حوالوں سے۔ مجلد دو ۲ روپے۔

سوانح خواجہ معین الدین چشتیؒ

محبوب العارفین حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اثر انگیز سوانح حیات۔ جو اجمیر کی خاک میں استراحت فرما رہے ہیں۔ قیمت ساڑھے چار روپے۔

الوسیلہ

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کی مشہور کتاب جس میں نہایت شرح و بسط کیساتھ بتایا گیا ہے کہ قرآن میں وَابْتَغُوا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ کہہ کر اللہ نے جس وسیلے کی طرف توجہ دلائی ہے وہ آخر کیا ہے؟ مجلد نو روپے

اصح السیر

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر لاجواب کتاب، محققانہ مگر دلچسپ، مستند و جامع اور بیش بہا۔ سیرت کی کتابوں میں اس کتاب کو اپنا جواب آپ پایا گیا ہے۔ قیمت مجلد دس روپے۔

سچی باتیں

از مولانا عبد الماجد دریابادی۔ تین روپے ۵۰ پیسے

فتاویٰ دار العلوم دیوبند

مولانا مفتی عزیز الرحمٰن اور مولانا مفتی محمد شفیع کے فتاویٰ کا مجموعہ "فتاویٰ دار العلوم دیوبند" کے نام سے بارہا چھپا ہے لیکن اسکی ترتیب و تبویب اور کتابت و طباعت ناقص رہی ہے اب ایک نیا ایڈیشن عمدہ ترتیب و تبویب اور کتابت و طباعت کے معیاری انتظام کیساتھ چھاپا گیا ہے یہ عوام و خواص سب کے لئے خاصے کی چیز ہے آٹھ حصوں کا یہ ضخیم مجموعہ ہزاروں فتاویٰ پر مشتمل ہے جو ہماری روزمرہ کی زندگی میں قدم قدم پر کام آنیوالے ہیں۔ مکمل قیمت ۲۱ روپے۔

اگر مجلد چاہیں گے تو ہر دو۲ حصہ کی ایک جلد یعنی آٹھ حصوں کی چار جلدیں پانچ روپے میں تیار رہوں گی۔ گویا مجلد کی قیمت ۲۶ روپے ہو جائیگی۔ مجلد بذریعہ ریل طلب کیا جائے تو اخراجات میں کفایت رہے گی۔

دو۲ خاص نمبر

تجلی کا خلافت نمبر	ایک روپیہ
چراغ راہ کا سالنامہ ۱۹۶۰ء	ڈیڑھ روپیہ

قرآن کیا سکھاتا ہے؟

قرآنی تعلیمات کا مختصر لیکن جامع درس۔ مجلد ایک روپیہ ۷۵ پیسے۔

عورت اور اسلام

مسلمان عورت کی زندگی کے تقریباً سارے ہی گوشوں کے بارے میں اسلامی احکام شادی، طلاق، نان نفقہ، رضاعت، عقیقہ اور گوناگوں مسائل کے معتبر جوابات۔ مجلد دو روپے ۲۵ پیسے۔

فسادات جبلپور و ساگر

ایک عبرت انگیز کتاب قیمت دو۲ روپے

فہرست کتب مفت طلب فرمائیے

مکتبہ تجلی دیوبند یو۔پی

مکمل فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

نہایت نفیس عکسی قرآن اور حمائلیں

آرڈر میں صرف وہ نمبر لکھدینا کافی ہے جو ہر ایک کے ساتھ درج ہے

قرآن ● ترجمہ:- شیخ الہندؒ ● تفسیر:- علامہ شبیر احمد عثمانیؒ - یہ مقبول ترین مترجم قرآن کچھ دنوں سے نایاب تھا - الحمدللہ اب کچھ نسخے مہیا ہوئے ہیں - نفیس ایڈیشن - ہدیہ مجلد ۲۵ روپے (اس کا نمونہ نہیں بھیج سکینگے)

قرآن دو ترجمے والا ۶۸ ● (۱) مولانا شاہ رفیع الدینؒ ● (۲) مولانا اشرف علیؒ

حاشیے پر مستند تفاسیر کا خلاصہ - آغاز میں انبیاء و صحابہؓ کے احوالِ مقدسہ، سورتوں کے خواص، غزوات کے تذکرے اور اسی نوع کی دیگر مفید چیزیں اُردو میں دی گئی ہیں - لکھائی چھپائی نفیس - کاغذ اعلیٰ آرٹ پیپر دبیز - زمین سبز - ہدیہ مجلد ریگزین چودہ روپے - مجلد چرمی ساڑھے تیرہ روپے یہی قرآن نسبتاً ہلکے کاغذ پر (اس کا نمبر ۶۶ ہے) ہدیہ مجلد ریگزین تیرہ روپے مجلد چرمی ساڑھے سولہ روپے - یہی قرآن کچھ اور ہلکے کاغذ پر (اس کا نمبر ۶۷ ہے) زمین حنائی مجلد ریگزین بارہ روپے مجلد چرمی ساڑھے پندرہ روپے

قرآن ایک ترجمہ والا ۶۴ ● ترجمہ:- مولانا اشرف علیؒ ● حاشیہ پر مختصر بیان القرآن

سائز تجلی سے کچھ بڑا - کاغذ ولایتی سفید - آغازِ قرآن میں بہت سی مفید چیزیں ہیں - مثلاً سورتوں کے خواص، ان ناموں کی تفصیل جو قرآن میں آئے - ان مقامات کا نقشہ جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے - مجلد ریگزین کا ہدیہ بارہ روپے مجلد چرمی ساڑھے پندرہ روپے

قرآن بلا ترجمہ ۳/B کاغذ آرٹ پیپر ولایتی - کتابت طباعت بے نظیر - ہر سطر کے بعد لائن - حروف کشادہ - تجلی سائز - کمزور نگاہ والوں کیلئے بہت عمدہ - مجلد ریگزین ہدیہ آٹھ روپے - چرمی ساڑھے گیارہ روپے -

حمائل مترجم ۸۰ ● ترجمہ:- شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ - کاغذ آرٹ، زمین رنگین - سائز تجلی سے نصف - مجلد کمرچ ہدیہ دس روپے - مجلد پلاسٹک کور گیارہ روپے -

حمائل مترجم ۳۵ ● ترجمہ:- مولانا فتح محمد صاحب - حاشیے پر مختصر تفسیر - زمین سبز - کاغذ ولایتی - سائز تجلی سے نصف - مجلد پلاسٹک کور - ہدیہ گیارہ روپے -

حمائل مترجم ● ترجمہ:- شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ ● تفسیر:- مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

زمین حنائی سائز ۳۰×۲۰/۱۶ سے کچھ بڑا - غیر مجلد بارہ روپے - مجلد ریگزین ساڑھے تیرہ روپے (اس کا نمونہ نہیں بھیج سکیں گے)

حمائل بلا ترجمہ ۲۳ کاغذ سفید مضبوط - سائز تجلی سے نصف حروف کافی روشن - ہر سطر کے بعد لائن - مجلد کرچ ہدیہ پانچ روپے -

حمائل ۱۳ بالکل ۲۳ جیسی بس فرق یہ ہے کہ ہر سطر کے بعد لائن نہیں ہے - مجلد پلاسٹک پانچ روپے

حمائل ۲۶ بلا ترجمہ پاکٹ سائز - کاغذ باریک اور چکنا (بائبل پیپر) سفر کے لئے خاص تحفہ - جلد پلاسٹک کور - ہدیہ مجلد چار روپے -

حمائل ۲۴ بلا ترجمہ بہت ہی مختصر سائز - حافظوں کے مطلب کی - کاغذ عمدہ - جلد پلاسٹک کور - ہدیہ دو روپے

نمونے مفت طلب فرما سکتے ہیں

مکتبہ تجلی - دیوبند (یو۔پی)

مکمل فہرست کتب مفت طلب کریں

DURR.E.NAJAF

DARULFAIZ RAHMANI DEOBAND

انجن کی فولادی آنکھ سے خارج ہونے والی تیز برقی روشنی ہی ٹرین کو اندھیری راتوں میں بے تکلف سفر کے قابل بناتی ہے۔ اسی طرح آپ کی روشن اور صحت مند آنکھیں دن اور رات کے ہر حصہ میں آپ کی رہنمائی کرتی ہیں۔

قدیم اطبّاء

کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مرض کو جڑ سے اکھیڑ کر صحت کی بنیادیں مضبوط کرتے تھے۔

دُرِّ نجف بھی ایک قدیم ہی نسخے سے تیار کیا جاتا ہے جو بینائی کے جوہر کو فطری اعتدال پر قائم رکھنے میں اپنی نظیر آپ ہے۔ مرض اور صحت دونوں حالتوں میں یکساں مفید۔

آخر عمر تک نگاہ قائم رکھنے کیلئے بیشمار لوگ دُرِّ نجف استعمال کرتے ہیں۔

62
nP.

ایڈیٹر۔ عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

ماہنامہ **تجلّی** دیوبند

شمارہ ۷ — جلد ۱۵

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

سالانہ قیمت سات روپے
فی پرچہ ۶۲ پیسے

غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۱۸ شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر
پوسٹل آرڈر پر کچھ نہ لکھئے بالکل سادہ رکھئے

شذرہ — اگر اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیج کر یا وی پی کی اجازت دیں۔ اگر آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا (وی پی سات روپے باسٹھ نئے پیسے کا ہوگا) منی آرڈر بھیج کر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

پاکستانی حضرات:- ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیج کر رسید منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتہ ہمیں بھیج دیں رسالہ جاری ہو جائے گا

فہرست مضامین مطابق ماہ ستمبر ۱۹۶۳ء

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ
دفتر تجلّی - دیوبند ضلع سہارنپور (یوپی)

پاکستانی حضرات
نیچے لکھے ہوئے پتہ پر منی آرڈر بھیج کر وہ رسید ہمیں بھیجدیں جو منی آرڈر کرتے وقت ڈاکخانہ سے ملتی ہے۔

مدیر
عامر عثمانی
فاضل دیوبند

مکتبہ عثمانیہ - مینا بازار ۲۸۰
پیر الٰہی بخش کالونی کراچی

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے "نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند" سے چھپوا کر اپنے دفتر تجلّی دیوبند سے شائع کیا

یہ اداریہ کتابت کے مرحلے سے گذر چکا تھا اس وقت اطلاع آئی کہ مسلم پرسنل لاء میں اصلاح کی تجویز حکومت نے منسوخ کردی ہے۔ الحمدللہ۔ اداریہ چونکہ ایک اصولی گفتگو پر مشتمل ہے اس لئے ردّ نہیں کیا گیا۔ جزوی ترمیم کیساتھ پیش خدمت ہے۔ اُمید ہے توجہ سے پڑھا جائے گا۔

آغازِ سخن

پرسنل لا کا آزمائشی مسئلہ

جون ۶۳ء کے تجلی میں مسلم پرسنل لا کے نئے پرابلم پر ہم اظہار خیال کرچکے ہیں۔ مسئلہ اگر خالی نظری اور منطقی ہوتا تو پھر سے اس موضوع کو تازہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن واقعہ اس کے برعکس ہے۔ مسئلہ نہ صرف عملی ہے بلکہ اتنا اہم اور پہلودار ہے کہ ملک وملت کا درد رکھنے والے کسی بھی ہوشمند کا اس کی طرف سے بے پروا ہوجانا خطرناک نتائج کا حامل ہوگا۔

خوشی کی بات ہے کہ مسلمانوں کے سوچنے سمجھنے والے حلقے فرداً فرداً بھی اور جماعتی پیمانے پر بھی اس مسئلہ پر خاص توجہ دے رہے ہیں۔ ملک بھر میں احتجاج کی صدائیں گونج رہی ہیں۔ جوش اور عزم کا اظہار کیا جارہا ہے۔ یہ زندگی کی علامت ہے۔ ضروری ہے کہ ملت کے ایک فرد اور ملک کے ایک شہری کی حیثیت سے ہم اپنے اکابرِ ملت اور اربابِ حل وعقد کے سامنے مسئلہ کے بعض ایسے گوشے بھی رکھیں جن پر زیادہ سنجیدگی سے سوچنے اور تبادلۂ خیال کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ہمارے خیال میں یہ ہندوستان کی پوری ہی مسلم اقلیت کے لئے آزمائش کا ایک ایسا نازک مسئلہ ہے کہ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مسلمانوں کے تمام فرقوں اور جماعتوں کو محدود گروہی نقطۂ نظر اور ذیلی عصبیتوں سے بلند ہوکر فکر و تدبر کرنا چاہیئے۔ کامل اتحاد و توافق کا ثبوت دینا چاہیئے۔ ایک دوسرے کے مشوروں پر کان دھرنے چاہئیں اور اگر اقدام وعمل کے سلسلے میں زید کو بکر سے یا بکر کو عمر سے کوئی اختلاف ہو تو اس پر مناظراتی ہما ہمی دکھلانے کے عوض خلوص ومتانت کے ساتھ اختلاف کی گتھی سلجھانی چاہیئے۔

یہ تمہید اس لئے اُٹھائی گئی کہ راقم الحروف کو جمعیۃ العلمائے ہند کی مجلس عاملہ کے ایک خاص فیصلے کو سمجھنے میں دشواری پیش آرہی ہے جس کی تفصیل ۱۳؍اگست ۶۳ء کے روزنامہ الجمعیۃ میں شائع ہوئی ہے۔ عام حالات میں تو اس کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ جمعیۃ العلماء جیسی وقیع جماعت کے بلند مرتبہ اربابِ بصیرت اپنی عاملہ کے اجلاس میں کوئی فیصلہ کرنے کے بعد اس پر ہم جیسے بے بضاعتوں کے اعتراض واحتجاج کو سننا تک گوارا کرلیں گے لیکن آج کے خاص حالات میں خودنگری اور استغناء کی یہ برف پگھلنی چاہیئے۔ آج ہم آزمائش و ابتلا کے ایک ایسے دہانے پر کھڑے ہیں کہ باہمی افہام و تفہیم اور تبادلۂ خیال سے بے اعتنائی بہت بڑے خسران اور نامرادی کا تحفہ لاسکتی ہے۔ جو کچھ ہم کہنے والے ہیں اسے اعتراض کی بجائے افہام وتفہیم کی ایک مخلصانہ کوشش باور کیا گیا تو امید ہے کہ محترم اربابِ جمعیت اس پر ٹھنڈے دل سے تدبر فرماسکیں گے۔

مسلم پرسنل لاء میں مداخلت کی تجویز پر اکابرِ جمعیت نے مزاحمت اور مقابلے کا عزم جن الفاظ میں برسرِ منبر ظاہر فرمایا ہے وہ یقیناً شایانِ شان ہیں۔ ان میں وہ شعلہ لپک رہا ہے جو انسان کو فرض کی خاطر قربانی دینے اور مرمٹنے پر

آمادہ کرتا ہے۔ مثلاً پٹنہ کے کنونشن میں جمعیت کے ورکنگ صدر مولٰنا مفتی عتیق الرحمان صاحب نے فرمایا:۔

"دستور نے ہمیں جو آزادی دی ہے اگر ہم سے وہ چھیننے کی کوشش کی گئی تو ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔"

(الجمعیۃ ۲؍ اگست ۱۹۶۳ء)

یا مثلاً جمعیۃ کی مجلس عاملہ کے ۱۱؍ اگست والے اجلاس میں میرٹھ والے عام اجلاس کی تائید کرتے ہوئے اعلان کیا:

"جو قانون مسلمانوں کے لئے پرسنل لاء کی حیثیت رکھتا ہے اس کا تحفظ حکومت کا اہم ترین فرض ہے۔ مسلمان قطعاً برداشت نہیں کر سکتے کہ اس میں حکومت کی جانب سے کوئی مداخلت کی جائے۔"

(الجمعیۃ ۱۳؍ اگست ۱۹۶۳ء)

یہ فقط دو نمونے ہیں۔ ہمارے رہنما قسم کے ارباب نے مختصر سی مدت میں اسی نوع کے دو ٹوک، واضح اور فیصلہ کن الفاظ کثرت سے کہے ہیں۔ ان سے ظاہر ہوا کہ ہمارے بزرگوں کے لہو میں ابھی گرمی ہے۔ بہاؤ ہے۔ اُبلنے اور سنسنانے کی صلاحیت ہے وہ جذباتی اعتبار سے فقط ایک لاش نہیں رہ گئے ہیں لیکن یہ اس سے ظاہر نہیں ہوا کہ اس جذباتی ہماہمی کے پیچھے کوئی گہرا شعور اور جہد و عمل کی کسی مستقیم راہ کا واضح تصور بھی موجود رہا ہو۔

اتفاق ـــ جی ہاں محض اتفاق ہی کی بات ہے کہ فی الوقت حکومت نے اپنی تجویز کو معرض التوا میں ڈال دیا ہے اور اخبارات سے معلوم ہوا کہ جب تک کوئی اقلیت خود ہی گذارش نہ کرے اس کے پرسنل میں ترمیم نہیں کیجائیگی الحمدللہ۔ اس فیصلے نے فی الحال تو ہماری لاج رکھ ہی لی۔ اور جو بادل گرجے تھے وہ ہمارے زبانی دعووں کا عملی امتحان لئے بغیر ہی بن برسے گذر گئے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا آئندہ کے لئے بھی ہمیں اس سلسلے میں مطمئن ہو جانا چاہیئے؟

ہمارا خیال ہے کہ اطمینان کا ہرگز موقع نہیں۔ مسلم پرسنل لاء میں اصلاح و ترمیم کی تجویز آج تو ممکن ہے فقط ابھی ابھی معرض ظہور میں آئی ہو کہ پنڈت نہرو کی تصریح کے مطابق اس کی درخواست بعض مسلمانوں کی طرف سے کی گئی تھی لیکن یہ سمجھ لینا درست نہ ہوگا کہ خود حکومت کے ذہن میں اس کا کوئی رجحان اور قصد سرے سے موجود ہے ہی نہیں۔ تقریباً آٹھ سال قبل ۱۹۵۵ء کی ایک ریڈیائی تقریر میں مرکزی وزیر قانون جناب مسٹر پاٹسکر نے کہا تھا:۔

"ہم نے اپنے آئین کے نفاذ یعنی ۲۶؍ جنوری ۵۰ء کے بعد سوشل میرج ایکٹ، ہندو میرج ایکٹ پاس کئے ہیں۔ ہندو قانون وراثت کا مسودہ پارلیمنٹ میں زیر غور ہے، یہ سب ضابطہ دیوانی کو یکساں بنانے کے اقدامات ہیں، محض جذباتی لوگ اقدامات کی مخالفت کرتے ہیں اور یہ دریافت کرتے ہیں کہ ہم صرف ہندو قانون کو ہی ایک ضابطہ میں لانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں۔ اس کا جواب صاف ہے کہ سارے سماج کو متحد اور مضبوط بنانے کے لئے ہمیں سب سے پہلے اس کے بڑے حصے کو ہی اکھٹا کرنا ہوگا۔ ہم اس وقت تک سارے بھارت کے لئے ایک واحد ضابطۂ دیوانی بنانے کا خیال بھی نہیں کر سکتے جب تک ہم ملک کے ان لوگوں کے شخصی قوانین کو ایک ضابطہ میں نہیں لے آتے جنھیں ہندو کہا جاتا ہے اور جو ملک کی آبادی کا پچاسی فیصدی ہیں۔"

اور سن پچپن ہی میں انھی وزیر قانون نے ایک پریس کانفرنس میں بحیثیت وزیر قانون ارشاد فرمایا تھا:۔

ہندو قوانین میں جو اصلاح کی جا رہی ہے وہ مستقبل قریب میں ہندوستان کی تمام آبادی پر نافذ کی جائے گی اگر ہم ایسا قانون بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو ہماری پچاسی فیصدی آبادی کے لئے ہو تو اس کا نفاذ باقی آبادی پر کرنا مشکل نہ ہوگا اس قانون سے پورے ملک میں یکسانیت پیدا ہوگی۔ ایک مرتبہ آبادی کی اکثریت اس قانون کی ضرورت کو تسلیم کرلے تو دوسروں پر اس کا نفاذ مشکل نہ ہوگا۔ اس قانون میں کوئی بات مذہبی نہیں ہے بلکہ

بلکہ ایک سماجی قانون ہے۔ (دستور)

ان قرار دادات میں کوئی ابہام نہیں۔ یہ قطعیت کے ساتھ بتاتے ہیں کہ اقلیتوں کے لئے اپنے جداگانہ معاشرتی اور عائلی قوانین کو ایک ہی سانچے میں ڈھالنے کا ارادہ حکومت کے سامنے ایک بنیاد اور تخم کی حیثیت سے بہر حال موجود ہے جسے بروئے کار لانے کے لئے وہ کسی بھی سازگار وقت اور مساعد حالات میں عملی قدم اُٹھا سکتی ہے۔

اس صورت میں بے نتیجہ نہ ہوگا اگر ہم اُس فیصلے کے بارے میں گفتگو کریں جو جمعیۃ العلماء کی مجلس عاملہ کی طرف سے سامنے آیا ہے۔ گو کہ تجویز ملتوی ہو جانے کے بعد یہ بحث غیر ضروری ہی معلوم ہو گی۔ لیکن فی الاصل یہ غیر ضروری نہیں بلکہ مفید ہے کیونکہ اس کا تعلق اصول سے ہے اور اصولوں کی نظری حیثیت ہنگامی نہیں ہوتی اگر ایسا ہی کوئی بھونچال اُٹھے تو آج کی گفتگو کی روشنی میں ہمیں محکم و مستقیم اصولوں پر جمے رہنے کا ایک مفید سبق ہاتھ آئے گا۔

۱۱ر اگست کے اجلاس میں جمعیۃ کی عاملہ نے فیصلہ کیا ہے:۔

"یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کا قانون ایک مکمل اور پائیدار قانون ہے جس میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں ہے اسی بناء پر یہ اجلاس ان خبروں کو بھی قابلِ وثوق نہیں سمجھتا جو مسلم ممالک کے متعلق اخبارات میں شائع ہو رہی ہیں کہ "سوشل ریفارمز" کے عنوان سے اسلامی قانون میں ترمیمات کی گئی ہیں۔ یہ اجلاس اس موقع پر ضروری سمجھتا ہے کہ ان خبروں کی تحقیق کی جائے اور اُن ممالک سے رابطہ قائم کر کے ان کے یہاں کی منظور کردہ اصلاحات معلوم کی جائیں اور ان پر غور کیا جائے۔"

اس کے بعد سات افاضل پر مشتمل ایک کمیٹی بنانے کا تذکرہ ہے جو ان ممالک سے مراسلت کر کے یہ معلومات فراہم کرے گی۔

ہمارے ناقص خیال میں یہ فیصلہ دو خامیوں داغدار ہے

خامی نمبر ۱

ایک یہ کہ اس میں تجاہلِ عارفانہ کی آڑ لی گئی ہے۔ اگر صورت حال یہ ہوتی کہ مصر یا پاکستان یا کسی بھی مسلمان مملکت میں بعض خلاف اسلام قوانین بننے کی اطلاع صرف غیر مسلم وقائع نگاروں اور اِکّا دُکّا غیر ثقہ صحافیوں کی دی ہوئی ہوتی اور قابل وثوق ذرائع اس کی تصدیق نہ کر رہے ہوتے تب تو جمعیۃ کی مجلس عاملہ اس اطلاع کو نا قابلِ وثوق کہنے میں حق بجانب تھی، لیکن صورت حال اس کے برعکس ہے۔ عربی، انگریزی اور اُردو اخبارات و رسائل کے چند سالہ فائل اُٹھا کر دیکھے جائیں تو بہت بڑی تعداد ایسے مقالوں، بیانوں، خبرناموں اور مراسلوں کی مل جائے گی جن سے قطعیت اور یقین کے ساتھ معلوم ہو جاتا ہے کہ بعض مسلمان مملکتوں میں کچھ نہ کچھ قوانین خلافِ اسلام ضرور بنے ہیں اور مغرب زدہ حکمرانوں نے شرعی قوانین میں بعض ایسی ترمیمیں یقیناً کی ہیں جن کے باطل ہونے پر معروف و ثقہ علماء متفق ہیں۔ تو کیا کوئی بھی ہوشمند جمعیۃ العلماء کے پختہ کار اربابِ حل و عقد کو اتنا بے خبر باور کر سکتا ہے کہ وہ اس تمام مواد سے آج تک بے بہرہ رہے ہوں؟

دور نہ جائیے۔ پاکستان کے جدید عائلی قوانین آپ کے سامنے ہیں۔ ان کو جس شدت، تواتر، قطعیت اور جبر کیساتھ علمائے پاکستان کا پورا طائفہ اسلام کے خلاف ایک خطرناک جسارت قرار دے رہا ہے اس کا فلک شگاف شور تو شاید قبروں کے مُردے بھی سُن رہے ہوں گے۔ بہت کہا جا سکتا ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض علمائے پاکستان کے نزدیک ان قوانین کا ہر ہر جز اور ہر ہر دفعہ خلاف اسلام نہیں ہے" بلکہ صرف بعض دفعات خلاف اسلام ہیں مگر اس کہنے سے اصولی صورت حال میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس سے یہ بہر حال ثابت ہے کہ پچاس نہ سہی بیس سہی ـــــ بیس نہ سہی دو چار سہی، کچھ نہ کچھ قوانین پاکستان

میں ایسے ضرور نافذ ہوئے ہیں جن کے خلاف اسلام اور یکسر
باطل ہونے پر پاکستان کے تمام علماء ہر مکتب فکر کے
ائمۂ مذہب اور تمام دینی فرقوں کے فضلاء قطعی طور پر متفق الرائے
ہیں۔ جن ہندوستانی علماء نے ان عائلی قوانین کا مطالعہ
فرمایا ہے وہ بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے کہ سارے علماءِ
پاکستان کا واویلا بے بنیاد ہے اور اس مجموعۂ قوانین میں کوئی
بھی دفعہ اسلام کی بعض محکم اور اٹل قانونی دفعات کے خلاف
نہیں ہے۔

پھر ایسی کچی بات تجاہل عارفانہ کے سوا کیا کہلائے گی
جیسی جمعیۃ کی عاملہ سے منسوب ہوئی ہے۔ اس کا صریح مطلب
اس کے سوا کیا ہے کہ ہم دنیا کی کسی بھی مسلمان مملکت کے بارے
میں یہ یقین کر لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں کہ وہاں اسلام کے
کسی بھی محکم قانون میں فاسد نوع کی ترمیم کی گئی ہو یا کوئی
صریح خلافِ اسلام قانون نافذ کیا گیا ہو۔

عجیب بات یہ ہے کہ مسئلہ تو تھا واقعات کا، لیکن
اس کے لئے دلیل لائی گئی منطق سے۔ پھر یہ دلیل بھی بجائے
خود ایک چٹکلہ ہے دلیل نہیں۔ بے شک اسلام کا قانون
ایک مکمل اور پائدار قانون ہے لیکن یہ بھی تو آپ سب کو اور
پوری دنیا کے اربابِ بصیرت کو معلوم ہے کہ آج اکثر و بیشتر
مسلم مملکتوں کی زمامِ اقتدار ایسے مسلمانوں کے قبضے میں ہے جنھوں
نے مغربی تہذیب اور مادہ پرستانہ فلسفۂ زندگی کی ذہنی
غلامی میں ایک نیا اسلام وضع کیا ہے ایسا اسلام جو خود آپ
حضرات کے نزدیک بھی کفر و زندقہ اور الحاد و نفاق کے آستانے
پر گھٹنے ٹیک چکا ہے۔ مصطفےٰ کمال والے ٹرکی سے آپ بیخبر
نہیں ہو سکتے۔ جمال عبدالناصر کا مصر بھی آپ کی نظر سے
پوشیدہ نہیں ہے۔ پاکستان کے سابق و لاحق حکمرانوں سے
بھی آپ واقف ہیں۔ پھر یہ کون مان لے گا کہ آپ جیسے
ذی علم وسیع المطالعہ اور دیدۂ بینا رکھنے والے پختہ کار
حضرات اس بدیہی حقیقت سے بے خبر ہوں کہ حکمران طبقوں
کی مغرب زدگی نے ان مملکتوں کو کہاں سے کہاں لے جا کر پھینکا
ہے اور کس طرح اسلامی اقدار کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کافرانہ
اقدار کو اسلام کا نام دے کر رواج دیا جا رہا ہے۔

ہماری طرح غالباً تمام ہی عقیدت مند آپ کی طرف
اتنی شاندار بے خبری کی نسبت نہیں کر سکتے بلکہ یہی گمان
کریں گے کہ آپ نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا گیا ہے۔ تجاہل
عارفانہ کو نہ جانے آپ نے کس لئے مفید خیال کیا حالانکہ نفسیات
کے اس مسئلہ سے مبتدی بھی واقف ہیں کہ تجاہل عارفانہ
اپنے موقف کی کمزوری ہی کے اعتراف کا ایک روپ ہے
جان بوجھ کر کسی امرِ واقعہ سے لاعلمی کا اظہار کرنے والا در
اصل واقعات کی شہادت کو اپنے خلاف پاتا ہے اسی لئے
وہ سرے سے واقعات ہی کو تسلیم کرنے سے گریز کرتا ہے۔
حقائق سے آنکھیں چرانا ایک کمزوری ہے اور اسی کمزوری
کا علمی نام تجاہل عارفانہ رکھ دیا گیا ہے۔

پاکستان کی مثال دیدینے کے بعد مصر کے تذکرے کی
ضرورت نہیں۔ اکیلے پاکستان ہی میں اگر دو چار خلافِ اسلام
قوانین کا نفاذ مسلمات میں سے ہو تو خود ہی ثابت ہو گیا کہ
ادائے تجاہل سے تلخ حقائق کی پردہ پوشی نہیں ہو سکتی۔ تاہم
ایک ذرا سی جھلک مصر کی بھی دیکھتے ہی چلئے۔

مصر کی ایک فاضلہ مسز اصلاح اقبال۔ بی۔ ایس
سی (قاہرہ) کے ایک عربی مکتوب کا اردو ترجمہ ابھی اس
اگست کے شہاب (لاہور) میں شائع ہوا ہے۔ یہ موصوفہ
پاکستان تشریف لائی تھیں اور وہاں نام نہاد عائلی قوانین
کے قضیے میں علماء اور متجددین کی فکری آویزشوں کا مطالعہ
فرمایا تھا۔ یہ شائع شدہ خط اسی مطالعہ کی بازگشت ہے۔
اس کے صرف تین پیرے ہم یہ دکھانے کے لئے نقل کرتے
ہیں کہ مصر میں متعدد خلاف اسلام قوانین نہ صرف نافذ
ہو چکے ہیں بلکہ انھیں نافذ ہوئے اتنا عرصہ گذر چکا ہے کہ
نتائج کی دنیا میں ان کی کونپلیں اور برگ و بار بھی خوب
خوب ہویدا ہو چلے ہیں۔

مصری خاتون کے خط کا کچھ حصہ

" پھر ایک فاضل خاتون نے یہ بھی کہا ہے کہ یہی قوانین

مصر میں بھی رائج ہیں اور چونکہ مصری لوگ پاکستانیوں سے زیادہ عربی جانتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ آرڈی ننس اسلام سے نہیں ٹکراتا۔ میں اس محترمہ سے پوچھتی ہوں کہ کیا مصر کے بسنے والوں اور عربی زبان بولنے والوں کا نام اسلام ہے؟ یا یہ عربی بولنے والے لوگ معبودِ ثانی ہیں جنھیں ان مصلحتوں کا علم ہے جو اللہ تعالیٰ کو معلوم نہ تھیں؟

میں مصر کی رہنے والی ہوں اور اے فاضلہ! میں تجھے اور تیرے ہمنوا اصحاب کو دعوت دیتی ہوں کہ وہ خود مصر جاکر اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ وہاں سماجی بنیادیں کس بری طرح سے منہدم ہو چکی ہیں۔ وہاں جاکر آپ براہِ راست مشاہدہ کریں کہ تعلقات کے استحکام، عورت کی عزت و تکریم اور عائلی تعلقات کے استحکام کے دعویٰ کے ساتھ یہ اسلام سے باغیوں کے بنائے ہوئے قوانین ہی ہیں جن سے معاشرے میں زبردست انتشار رونما ہوا ہے ہاں ہاں! ان قوانین نے عورت کے حقوق کی حفاظت کی ہے مگر اس طرح کہ قبینہ کلبوں، عام محفلوں بلکہ چوراہوں پر اسے خدا کے باغیوں اور ہوس کے بندوں کے قدموں تلے روندا گیا ان قوانین اور ضوابط نے ایک ایسا معاشرہ تیار کیا ہے جس میں تقریباً اسّی فی صد (۸۰٪) مردان امراضِ خبیثہ میں مبتلا ہیں جن کا علاج بس اللہ ہی کے پاس ہے۔

مصر میں مغرب کے ان اندھے پرستاروں نے عورت کو ان اصولوں اور قوانین کے ذریعے اللہ کے قوانین کا باغی تو بنا لیا مگر سوال یہ ہے کہ خود عورت کا انجام کیا ہوا؟ مگر افسوس مصر میں ان نتائج کے کھل کر سامنے آجانے کے باوجود آج پاکستان میں بھی بجنسہٖ یہی قوانین ہیں جن کے نفاذ کا بعض لوگ چیخ چیخ کر مطالبہ کر رہے ہیں۔"

(اقتباس ختم ہوا)

یہ ہے مصر کی ایک جھلک۔ پھر بھی اگر کوئی سادہ لوحی اور تجاہلِ عارفانہ کی روش اختیار کرے تو اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

مری خاک تک لحد میں نہ رہی امیر باقی

خامی نمبر ۲

یہ بات بڑی خوش آئند اور محمود ہے کہ جمعیۃ کی عاملہ نے جو کمیٹی بنائی ہے اس کے فرائض میں اپنے یہاں کی سماجی ضرورتوں کا جائزہ اور اس سلسلہ میں مناسب اقدام کے متعلق عاملہ کو مشورہ دینا بھی شامل ہے۔ یہ کام بہت پہلے کرنے کا تھا تاہم خدمت، اصلاح اور رفاہِ عام کی کوئی بھی اسکیم اگر خارجی محرکات ہی کے دباؤ سے روبہ عمل آجائے تو جمود و بے حسی سے بہرحال بہتر ہے۔ ہم تہہ دل سے اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اس کی حیثیت وقتی اور اضافی نہ ہو بلکہ اسے ایک اہم ترین فریضہ مستقل کی حیثیت دیدی جائے۔

خیر مقدم کے باوجود خامی کی نشاندہی بھی ہم ضرور کریں گے۔ خامی یہ ہے کہ اس عمدہ اقدام کو ایک ایسی تمہید کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے جس کے التزامی معنی یہ نکلتے ہیں کہ ہم ہندوستانی مسلمانوں کے پرسنل لا میں من مانی ترمیمیں کرنے کے لئے حکومت اور تجدد پسند حضرات کا یہ استدلال کسی نہ کسی درجے میں معقول اور لائقِ التفات ضرور ہے کہ جب دوسری مسلمان مملکتوں میں قانونی ترمیمات کی گئی ہیں تو اسی نوع کی ترمیمات ہم بھی اپنے ملک میں کر سکتے ہیں۔

تھوڑی دیر کے لئے ہم یہ فرض کئے لیتے ہیں کہ کسی مسلمان مملکت میں بعض خلافِ اسلام قوانین کا نفاذ و اجرا مسلّمہ حقیقت نہیں ہے اور ایسی خبروں کی تہہ تک پہنچنے کے لئے ایک کمیٹی بنا دینا جمعیۃ کا ایک موزوں فیصلہ ہے، لیکن جس موقعے اور سیاق میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کیا اس کے پیش نظر اس سے یہ مطلب نہیں اخذ کیا جا سکتا کہ مذہبی مسائل کے باب میں کسی اور مسلم مملکت کے فعل و عمل کو جمعیۃ ایک ایسی نظیر کی حیثیت دینے پر راضی ہے جس کے مطابق ہم ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی مسائل میں ترمیم کرنا حکومت کے لئے جائز قرار پائے۔

زیادہ واضح الفاظ میں ہمارا مطلب یہ ہے کہ

مسلمان مملکت میں کچھ بھی قوانین رائج ہوں ان کی مثال دیکر
خود ہمارے مذہبی قوانین میں کسی کا مداخلت کرنا اصولاً غلط ہے
ہمارے عقائد کا سرچشمہ قرآن و حدیث ہیں مصر و حجاز یا شام
و عراق کے مسلمانوں کا فعل و عمل نہیں۔ ہمارا دین اضافی
نہیں ہے۔ ہم کسی ایسے عقیدے کے بارے میں جو ہمارے
نزدیک قرآن وسنت سے محکم طور پر ثابت ہو یہ سننے تک
کو تیار نہیں ہیں کہ کس مسلمان مملکت نے اس کے متعلق کیا رویّہ
اختیار کیا۔ مصر یا پاکستان وغیرہ اگر پورا کا پورا دستور
خالصتہً ملحدانہ مدوّن فرمالیں تب بھی اس کا حوالہ
دے کر ہم سے کسی ایک عقیدے کی تبدیلی کا مطالبہ نہیں کیا
جا سکتا۔

یہ بنیادی بات جمعیۃ العلماء کے افاضل بھی خوب
جانتے اور مانتے ہیں لیکن افسوس کہ جس محل اور سیاق میں
انھوں نے تحقیقی کمیٹی بنائی ہے وہ اس موقف کو غبار آلود
بناتا ہے اور اغیار کو یہ سمجھنے کا موقع فراہم کرتا ہے کہ پرسنل لا
میں مداخلت کو تسلیم نہ کرنا در اصل اس لئے ہے کہ جمعیۃ العلماء
کے نزدیک کسی بھی مسلمان مملکت میں اسطرح کی مداخلت مستند
ذرائع سے معلوم نہیں ہوسکی ورنہ معلوم ہوجاتی تو وہ بھی
اس جیسی مداخلت اور ترمیم کو قبول کر لینے پر آمادہ ہوجاتی
یہ نہایت فاسد، شر آمیز اور لغوترین نقطۂ نظر ہے جس کی
تردید جمعیۃ کی طرف سے کھُل کر تاکید و تکرار کے ساتھ ہونی
چاہیئے۔

۱۴ اگست کے الجمعیۃ میں ایک شذرہ بھی اس موضوع
پر سپرد قلم کیا گیا ہے۔ الجمعیۃ کے شذرات ہم بہت شوق
سے پڑھتے ہیں اور مدیر الجمعیۃ جناب محمد عثمان فارقلیط کی
بالغ نظری، اصابتِ رائے اور منفرد نوع کی انشاء اور اسلوب کے
تہہ دل سے مداح ہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ شذرہ انھوں
نے روا روی میں لکھ دیا ہے۔ ان کے حسنِ نیت اور خیالات
کی پاکیزگی میں ہمیں ادنیٰ سا شک نہیں، لیکن ان کے اس
پُر وثوق دعوے کو ہم فقط خوش فہمی ہی سمجھتے ہیں کہ حکومت
مصر نے مسلم پرسنل لاء میں کوئی مداخلت نہیں کی بلکہ اس کا
معاملہ علماء کے سپرد کردیا اور پھر ان علماء نے شریعت کی
روشنی میں جو سفارشات کیں انھیں ہی منظور کرلیا گیا۔

واقعے کی یہ تصویر اس سطحی حد تک تو ضرور درست
ہوسکتی ہے جس حد تک تھیٹر اور سینما کی تصاویر ہوتی ہیں،
لیکن حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو اپنے پڑوسی پاکستان
ہی کی تازہ مثال یہ بتانے کے لئے بالکل کافی ہے کہ مغرب
زدہ اور تجدد پسند مسلم حکمراں اپنی اسلام دشمن جدّت
طرازیوں کو عینِ اسلام باور کرانے کے لئے کس قسم کے علماء
کی آڑ لیا کرتے ہیں۔ مدیر محترم کو معلوم تو ہوگا کہ اسلامیات
کے بارے میں فیصلہ کن سفارشیں پیش کرنے کے لئے حکومت
پاکستان نے "معتبر علماء" کی جو کمیٹی بنائی ہے وہ کس شان کی
ہے۔ اس میں دو کے علاوہ تمام ہی حضرات اس آن بان
کے ہیں کہ انھیں ہنوز شراب، سود، قمار اور زنا تک کی
حرمت پر پورا یقین نہیں ان کے علم کا سرچشمہ مغربی فکر و
تہذیب کی کارگاہیں ہیں جہاں سے انھوں نے تھوڑا سا
اسلام سیکھا ضرور ہے لیکن سیکھنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں
کہ ہر اسلامی قدر کو مغربی سانچوں میں ڈھال سکیں۔ اگر پاکستان
کے سرکاری علماء اس رنگ کے ہوسکتے ہیں تو اُس مصر کے سرکاری
علماء کیسے ہوں گے جس کے صدرِ مملکت عبد الناصر صاحب
مطلق العنانی، جبّاریت، مکر و فریب، پروپگنڈہ اور مغرب
زدگی میں صدرِ پاکستان سے گزوں آگے ہیں۔ محترم فارقلیط
صاحب غالباً صرف حسنِ ظن کی بناء پر کہہ گئے ہیں کہ مصر میں
ترمیم شدہ پرسنل لاء کی تمام دفعات شریعت کے مطابق
ہیں۔ ہماری معلومات اس کی تائید نہیں کرتیں۔

علاوہ ازیں شذرے کا بین السطور ٹھیک اسی اصولی
خامی کی تائید کرتا نظر آرہا ہے جس کا شکوہ ہم نے جمعیت کی
عاملہ کے فیصلے میں کیا۔ موصوف کو شکایت ہے کہ:-

"بعض لوگ جب مسلم ممالک میں مسلم پرسنل لاء میں
ترمیم کی کوئی بات سُننے میں تو انھیں یہ کہنے میں
تامل نہیں ہوتا کہ مسلم ممالک کا طرزِ عمل ہمارے
لئے حجت نہیں۔ یہ بات تو پوری واقفیت کے

بعد کہنی چاہیئے۔"

ہم کہتے ہیں کہ پوری واقفیت حاصل کرنے کا مسئلہ بالکل جداگانہ مسئلہ ہے۔ اس محکم اور بنیادی اصول کا اعلان کرنے کے لئے کہ دوسرے کسی بھی ملک کا طرزِ عمل ہمارے لئے حجت نہیں ہے پوری واقفیت حاصل کرنے کا انتظار لایعنی بلکہ مضرت رساں ہوگا۔ جس طرح کسی نئے مدعیِ نبوت کو جھوٹا قرار دینے کے لئے اس کے دلائلِ نبوت معلوم کرنے کا انتظار ذہنی کفر ہے اسی طرح اپنے مذہبی اُمور میں کسی کی مداخلت برداشت نہ کرنے کا اعلان دیگر ممالک کے طرزِ عمل پر منحصر کر دینا معقولیت اور اصول پسندی کی نفی ہے۔ مصر و پاکستان یا کسی بھی مسلم مملکت نے کوئی قانون واقعتہً خلافِ اسلام بنایا ہو یا نہ بنایا ہو۔ وہاں الف سے یا تک ملحدانہ دستور نافذ ہو جائے تب بھی ہم اپنے لئے اسے حجت اور نظیر ماننے کو ہرگز تیار نہیں۔ مدیر محترم کے الفاظ میں اگر اخبارات اور لیڈر یہ کہہ کر ہماری زبان بند کرنا چاہتے ہیں کہ مسلم ممالک میں بھی پرسنل لا میں ترمیم کی گئی ہے کیا وہاں کے مسلمان شریعت کے دشمن ہیں یا ہندوستان کے مسلمانوں نے اسلام کا ٹھیکہ لیا ہے۔ تو ہمارا جواب وہ نہیں جس کی طرف جمعیت کی عاملہ اور الجمعیۃ کے فاضل مدیر اشارہ کر رہے ہیں بلکہ یہ ہے کہ بے شک اپنے معاملاتِ دینی کے ہم خود ہی ٹھیکیدار ہیں پھبتیاں کس کر یا طعنہ دیکر ہمیں مغالطہ نہیں دیا جا سکتا۔ ہم نے جو بنیادی عقائد اللہ اور رسول ؐ کے آفاقی ارشادات سے لئے ہیں وہ اضافی نہیں ہیں مستقل بالذات ہیں ان پر مصر یا پاکستان یا انڈونیشیا یہاں تک کہ مرکز اسلام حجاز تک کا طرزِ عمل اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

اور یہ جو "شریعت دشمنی" کی تعریف کی گئی تو اس کی بے حقیقتی ایک مثال سے سمجھو۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہندوستان نظری اعتبار سے سچائی، دیانت، عدل، اخوت اور دیگر اعلیٰ اقدار کا "دشمن" نہیں ہے پھر بھی یہاں عملاً ان قدروں کا کیا حال ہے؟ گلی گلی جھوٹ، بددیانتی، رشوت ستانی ملاوٹ، بلیک، برادرکشی اور سیاہ کاری کا دھندا چل رہا ہے تو اپنی تعریف کو یہاں بھی آزما کر دیکھو۔ یا تو تمھیں ماننا پڑے گا کہ لوگوں کا بدکردار ہونا اس پر منحصر نہیں ہے کہ وہ اپنے "کردار دشمن" ہونے کا بھی اعتراف و اعلان ضرور کریں یا پھر کہنا پڑے گا کہ یہ ساری موجود برائیاں فی الحقیقت نیکیاں ہیں، لائقِ تقلید خوبیاں ہیں کیونکہ ہمارا ہندوستان چشم بددور "خوبیوں کا دشمن" تو نہیں ہے۔

اگر پہلی بات مانتے ہو تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کسی بھی مسلم حکومت کے لوگ ضابطے میں "اسلام دشمن" نہ ہوتے ہوئے بھی خلافِ اسلام اقدام و عمل کی جرأت کر سکتے ہیں ان کی حرکتوں کو فقط اس منطق سے اسلامی قرار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ بظاہر مسلمان ہیں اور خود کو "اسلام دشمن" نہیں کہتے۔

اور اگر دوسری بات کہتے ہو تو تمہارا مقام پاگل خانے کے سوا کہیں نہیں۔ کوئی عملی بُرائی اور بے انصافی اس لئے خوبی اور انصاف نہیں مانی جا سکتی کہ اس کا ارتکاب کرنے والوں نے اپنے "انصاف دشمن" ہونے کا اعلان نہیں کیا ہے۔

الحاصل ہرزہ سراؤں کے جس طعن و تمسخر سے گھبرا کر جواب کا ایک کمزور رُخ اختیار کیا جا رہا ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں اگر سوال علم و استدلال کا ہو تو معترضین کے ہر ہر باطل اعتراض کو ہر رُخ سے کاٹا جا سکتا ہے، لیکن سوال تو بدقسمتی سے طاقت اور ضعف، جبر اور مجبوری، کمزوری اور ڈنڈے کا ہے عثمانیہ یونیورسٹی ڈنڈے کے زور سے اُردو کا مرقد بنا دی گئی مگر علم و استدلال منھ دیکھتے رہ گئے۔ سہ لسانی فارمولے میں سنسکرت کو درآمد کر لیا گیا لیکن عقل و منطق نے سرپیٹ کر جنگل کی راہ لی ہمارے محترم رہنما اور اولوالعزم علماء اگر دیانت داری سے یہ سمجھتے ہیں کہ مسلم پرسنل لا میں حکومت کی دراندازی ناقابلِ برداشت ہے تو کبھی بھی وہ کمزور موقف نہیں اختیار کرنا چاہیئے جس کا اظہار متذکرہ فیصلے سے ہوتا ہے بلکہ ادنیٰ سے ابہام، جھجک اور اینچ پینچ کے بغیر یہ محکم، قوی اور صحیح تر موقف اختیار کرنا چاہیئے کہ دنیا کے کسی ملک کا فعل و قول ہمارے دینی تصورات و عقائد کی کاٹ چھانٹ کے لئے استعمال

نہیں ہو سکتا۔ مصر ہو یا پاکستان، عراق ہو یا حجاز، ان کے کسی کارنامے کو ہم اپنے دینی معاملات میں خلل انداز نہیں ہونے دیں گے۔ نہیں ہونے دیں گے۔ نہیں ہونے دیں گے۔

تازہ برہان (دہلی) اور معارف (اعظم گڈھ) میں پرسنل لا کے موضوع پر شذرات آئے ہیں۔ ان کے وقیع اور قیمتی ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے لیکن ہمارے ناقص خیال میں یہ بھی ایک ایسے فکری عنصر کی آمیزش سے خالی نہیں ہیں جسکے صالح اور خالص ہونے پر ہم خود کو مطمئن نہیں پاتے۔ افہام و تفہیم کی غرض سے انشاء اللہ اگلے ماہ اس بارے میں کچھ عرض کیا جائے گا۔ وباللہ التوفیق۔

مراسلہ

افسوسناک

محترمی جناب ایڈیٹر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

اگست کا شمارہ ملا۔ "تجلی کی ڈاک" میں "حیرتناک" کی سُرخی نظر آئی۔ سوال پڑھنے پر واقعی ہمارے اوپر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ کس جسارت کے ساتھ ایسی غلط باتوں کا انتساب استاذنا حضرت مولانا عبید الرحمٰن صاحب کی ذاتِ گرامی کی طرف کیا گیا ہے۔ آنجناب نے اپنے جواب کے آخری حصہ میں جس خلوص نیتی کا اظہار فرمایا ہے اس کے لئے ہم تمام طلبہ آپ کے تہہ دل سے مشکور رہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ انتساب سراسر غلط ہے اور مولانا نے ہرگز وہ باتیں نہیں کہی تھیں جن کا ذکر سائل نے کیا ہے اور ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ ہم طلبہ کو بھی اس میں ملوث کیا ہے۔ فلعنۃ اللہ علی الکاذبین۔ یہ حرکت کسی بد خواہ نے ہمارے شیخ سے محض کسی ذاتی پرخاش کی بناء پر کی ہے۔ ہم طلبائے بخاری دار العلوم احمدیہ سلفیہ نے ہرگز اس قسم کا کوئی استفسار بلکہ سرے سے کوئی سوال ہی آپ کے مؤقر جریدے میں نہیں بھیجا ہے۔ ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ اپنی ستمبر کی اشاعت میں ہمارا یہ تردیدی بیان نمایاں طور پر شائع فرمائیں تاکہ مولانا کے بارے میں ہند و پاک کے بیشمار ذہنوں میں جو بدگمانی پیدا ہوگئی ہے وہ دُور ہو سکے ــــ امید ہے کہ آپ ہماری اس درخواست کو شرفِ قبولیت بخش کر ہمیں شکریئے کا موقع عنایت فرمائیں گے۔ والسلام۔ از طرف:۔ طلبائے جماعت ثامنہ دار العلوم احمدیہ سلفیہ لہریا سرائے دربھنگہ

تجلی ــــ اللہ تعالیٰ فتنہ پردازوں کو نیک توفیق دے۔ ۲۱ راگست کو دار العلوم احمدیہ سلفیہ کے انچارج صاحب کا خط بھی ہمیں موصول ہوا تھا کہ یہ دار العلوم کی عزت و وقار کا سوال ہے۔ لہذا آپ سوال کا اصل مسودہ ہمیں بھیجدیں۔ ہم نے ۲۳ ر کو جوابی رجسٹری سے اصل خط بھیجدیا ہے۔ خدا کرے یہ فتنہ طول نہ پکڑے۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔

آئینہ حیرت

سادہ و پُرکار طرز کے مشہور شاعر جناب عبد المجید حیرت کا منتخب کلام۔ دل آویز۔ معیاری اور پُر لطف۔ ذوق لے

مراسلہ

مکرمی تسلیم!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

عرض ہے کہ جولائی کے تجلی میں کراچی کے جلیل نامی ایک صاحب کا خط شائع ہوا جس میں موصوف نے اپنے تیسرے سوال میں جو جنوں کے متعلق ہے مزید ضمنی ۳ سوالات کئے ہیں جن میں سے ایک سوال جنوں کی عمر کا بھی ہے۔

اتفاق سے ایک حدیث نظر سے گذری تھی جو مندرجہ ذیل ہے۔ جس سے جنوں کی طویل عمر کے بارے میں ہمیں جو تعجب ہوتا ہے دور ہو جاتا ہے۔

بخاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث ہے کہ ابو ہریرہ رض سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ گذشتہ رات حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ کا ایک جن چھوٹ کر آیا اور میری نماز توڑ دانا چاہتا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر قابو عطا فرمایا تو میں نے اس کو پکڑ لیا اور ارادہ کیا کہ اس کو مسجد کے کسی ستون سے باندھ دوں تاکہ تم سب اس کو دیکھ لو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ"

چونکہ حضورؐ کے زمانہ اور سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں ہزارہا سال کا عرصہ ہے اس لئے اس حدیث سے جنوں کی طویل عمر کا پتہ چلتا ہے۔

اگر مولانا مناسب سمجھیں تو اس حدیث کو شائع کرکے یہ بتادیں کہ جنوں کی عمر طویل ہوتی ہے اور مزید مناسب تشریح فرمادیں۔

آپ کا مخلص محمد عبد العزیز

نارائن کھیڑی۔ ضلع میدک آندھرا

تجلی

لیجئے آپ کی خواہش کے احترام میں گرامی نامہ شائع کردیا گیا۔ لیکن ہم ابھی تک اسی خیال پر قائم ہیں کہ جس سوال کا جواب علیٰ وجہ البصیرت دینے کی اہلیت آدمی میں نہ ہو اس کے جواب میں مختصر سی معذرت ہی محفوظ اور بہتر راستہ ہے۔ جنوں سے متعلق متعدد احادیث ہماری بھی نظر میں تھیں لیکن سوال کی نوعیت کے پیش نظر ان احادیث کا تذکرہ لا حاصل معلوم ہوا۔ جنوں کی عمر ہزاروں برس طویل ہوتی ہے۔ حدیث سے اس کی تائید پیش کردینا اگرچہ سائل کے ایک ضمنی سوال کا جواب ضرور ہے لیکن اصلاً جو گورکھ دھندا سوال میں پایا جارہا ہے اس کا کوئی حل نقل فرمودہ حدیث سے نہیں نکلتا بلکہ اس کا حل کوئی ایسا ہی ماہر فن کرسکتا ہے جو اس طرح کے گورکھ دھندوں میں ید طولیٰ رکھتا ہو۔

ویسے سچ پوچھئے تو ایسے گورکھ دھندوں سے ہم سخت بیزار ہیں۔ یہ دین فطرت کے حقیقی تقاضوں سے غافل کردینے والے مسائل و مشاغل ہیں۔ وہی لوگ ان میں دلچسپی لے سکتے جنھیں کرنے کا کوئی اور کام نہ ہو۔ غالباً اگلے شمارے میں اس موضوع پر ایک عنایت فرما کا مفصل اور دلچسپ خط شائع کیا جائے گا۔

نہایت نفیس عکسی قرآن اور حمائلیں

آرڈر میں صرف وہ نمبر لکھ دینا کافی ہے جو ہر ایک کے ساتھ درج ہے

قرآن • ترجمہ: شیخ الہندؒ • تفسیر: علامہ شبیر احمد عثمانیؒ
یہ مقبول ترین مترجم قرآن مجید کچھ دنوں سے نایاب تھا۔ الحمدللہ اب کچھ نسخے مہیا ہوئے ہیں۔ نفیس ایڈیشن۔ ہدیہ مجلد ۲۵ روپے (اس کا نمونہ نہیں بھیج سکیں گے)۔

قرآن دو ترجمے والا ۶۸ • (۱) مولانا شاہ رفیع الدینؒ • (۲) مولانا اشرف علیؒ
حاشیے پر مستند تفاسیر کا خلاصہ۔ آغاز میں انبیاء و صحابہؓ کے احوال، مقامات، سورتوں کے خواص، غزوات کے تذکرے اور اسی نوع کی دیگر مفید چیزیں اردو میں دی گئی ہیں۔ لکھائی چھپائی نفیس۔ کاغذ اعلیٰ آرٹ پیپر دبیز۔ زمین سبز۔
ہدیہ مجلد ریگزین چودہ روپے۔ مجلد چرمی ساڑھے سترہ۔
یہی قرآن نسبتاً ہلکے کاغذ پر (اس کا نمبر ۶۶ ہے) ہدیہ مجلد ریگزین تیرہ روپے۔ مجلد چرمی ساڑھے سولہ روپے۔ یہی قرآن تھوڑے ہلکے کاغذ پر (اس کا نمبر ۶۷ ہے) زمین حنائی مجلد ریگزین بارہ روپے۔ مجلد چرمی ساڑھے پندرہ روپے۔

قرآن ایک ترجمہ والا ۶۴ • ترجمہ: مولانا اشرف علیؒ • حاشیہ پر مختصر بیان القرآن
سائز تجلی سے کچھ بڑا۔ کاغذ لائٹی سفید۔ آغاز قرآن میں بہت سی مفید چیزیں مثلاً سورتوں کے خواص، ان ناموں کی تفصیل جو قرآن میں آئے۔ ان مقامات کا نقشہ جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ مجلد ریگزین کا ہدیہ بارہ روپے۔
مجلد چرمی ساڑھے پندرہ روپے۔

قرآن بلا ترجمہ ۳/۵ کاغذ آرٹ پیپر ولائتی۔ کتابت طباعت بے نظیر۔ ہر سطر کے بعد لائن، حروف کشادہ۔ تجلی سائز۔ کمزور نگاہ والوں کیلئے بہت عمدہ۔ مجلد ریگزین ہدیہ آٹھ روپے۔ چرمی ساڑھے گیارہ روپے۔

حمائل مترجم ۳۵ • ترجمہ: مولانا فتح محمد صاحب • حاشیے پر مختصر تفسیر۔ زمین سبز۔
کاغذ ولائتی۔ سائز تجلی سے نصف۔ مجلد پلاسٹک کور۔
ہدیہ گیارہ روپے

حمائل مترجم • ترجمہ: شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ • تفسیر: مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
زمین حنائی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ سے کچھ بڑا۔ غیر مجلد بارہ روپے۔ مجلد ریگزین ساڑھے تیرہ روپے (اس کا نمونہ نہیں بھیج سکیں گے)۔

حمائل بلا ترجمہ ۲۳ کاغذ سفید مضبوط۔ سائز تجلی سے نصف۔ حروف کافی روشن۔ ہر سطر کے بعد لائن۔ مجلد کرمچ ہدیہ پانچ روپے۔

حمائل ۱۳ بالکل ۲۳ جیسی بس فرق یہ ہے کہ ہر سطر کے بعد لائن نہیں ہے۔ مجلد پلاسٹک
ہدیہ پانچ روپے

حمائل ۲۶ بلا ترجمہ پاکٹ سائز۔ کاغذ باریک مگر چکنا بائبل پیپر۔ سفر کیلئے عمدہ تحفہ۔ جلد پلاسٹک کور۔ ہدیہ مجلد چار روپے۔

حمائل ۲۴ بلا ترجمہ بہت ہی مختصر سائز۔ حافظ کے مطلب کی۔ کاغذ عمدہ۔ جلد پلاسٹک کور۔ ہدیہ دو روپے۔

نمونے مفت طلب فرما سکتے ہیں

مکمل فہرست کتب مفت طلب کریں

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔ پی)

صحیفہ ہمام بن منبہ — حضرت ابو ہریرہؓ کا مرتب کیا ہوا اقدم ترین مجموعۂ حدیث مع شرح۔ مکتوبات نبویؐ کے فوٹو بھی شامل کتاب ہیں۔
قیمت ساڑھے تین روپے ۳/۵۰

رسولؐ کی سچی تعلیم — زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق تعلیماتِ رسالت کا ایمان افروز مجموعہ۔ قیمت مجلد ڈیڑھ روپیہ ۱/۵۰

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک — از۔ مولانا مسعود عالم ندوی۔ ڈھائی روپے

مقالاتِ شیخ الہندؒ — وحی کی حقیقت اور ایمان و دیانت کے باہمی ربط پر ایمان افروز گفتگو۔ مشہور مفسر قرآن مولانا محمود الحسن شیخ الہندؒ کے قلم سے
قیمت ایک روپیہ ۱/-

درویشی کیا ہے؟ — مشائخ و صوفیاء کے ایمان افروز ارشادات قرآن و سنت سے ہم آہنگ بلیغ و نفیس توضیح۔ سوا دو روپے ۲/۲۵

محمد بن عبدالوہابؒ — ایک مظلوم اور بدنام مصلح کی مستند سوانح۔ مولانا مسعود عالم ندویؒ کے قلم سے۔ قیمت پونے تین روپے۔ ۲/۷۵

کراماتِ صحابہؓ — از مولانا اشرف علی تھانویؒ
قیمت ڈیڑھ روپیہ ۱/۵۰

محاسن اسلام — اسلام کی خوبیوں پر مولانا اشرف علیؒ کی ایمان افروز تقریر۔ ڈیڑھ روپیہ۔

عبقات — اخلاقی موضوعات اور علوم تصوف پر شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی مشہور کتاب۔
ترجمہ از:۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ ساڑھے دس روپے۔

زبدۃ المناسک — حج اور احکام حج پر مفصل و مدلل کتاب مصنفہ:۔ استاذ الاساتذہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ۔ ہدیہ مجلد آٹھ روپے۔ ۸/-

فتوح الغیب — شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مقالات کا اردو ترجمہ۔ ڈھائی روپے ۲/۵۰

حقوق الاسلام — اپنے وقت کے زبردست عالم قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی مفید ترین تصنیف جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کی رو سے کس پر کس کا کیا حق ہے۔ اللہ، رسولؐ، صحابہؓ، علماء، والدین، اقرباء، حاکم، شوہر بیوی، اولاد، پڑوسی غرض ہر ایک کے حقوق کی تفصیل رسالہ سماع و مزامیر بھی شامل کتاب ہے۔ اردو ترجمہ عام فہم۔
قیمت مجلد دو روپے۔ ۲/-

بہشتی زیور مکمل و مدلل — کون پڑھا لکھا آدمی ہے جس نے مولانا اشرف علیؒ کی اس بیش بہا اور مقبول ترین کتاب کا نام نہ سنا ہوگا۔ ہر مسلمان گھر کے لئے ایک مفتی، عورتوں کا مشیر، مردوں کیلئے مستقل رہنما۔ اس کا عمدہ اور صاف ستھرا ایڈیشن ہم سے طلب فرمائیے۔ دو جلدوں میں مکمل بارہ روپے۔ مجلد پندرہ روپے۔

بدعت کیا ہے؟ — بدعتوں کے رد اور سنتوں کے اثبات میں ایک مشہور و مقبول کتاب، عرس، قوالی، تیجہ، چہلم، الابلاسد کے لئے چیلنج۔ مجلد تین روپے۔

اسلام تلوار سے نہیں پھیلا — غیر مسلموں کی شہادتیں اور اعترافات۔ ۷۵ پیسے

عمرو بن العاصؓ — اس صحابیٔ رسولؐ، فاتح مصر، تلوار کے دھنی اور بلند پایہ مدبر کی داستانِ حیات جسے خود اللہ کے رسولؐ نے "مدبر اسلام" کے خطاب سے نوازا۔ بیحد دلچسپ، اثر انگیز اور مستند۔ مجلد سوا دو روپے۔

فاران کا توحید نمبر — سیکڑوں صفحات کا یہ نمبر ماضی قریب میں بڑی شہرت پا چکا ہے اب پھر شائع کیا گیا ہے۔ بدعت و زندقہ کے رد اور سنت کے اثبات میں بے نظیر چیز ہے۔ چوٹی کے علماء کے مضامین سے مزین۔ ساڑھے چار روپے (مجلد چھ روپے) شائقین فوراً طلب کریں ورنہ پھر پہلے کی طرح ختم ہو جائے گا اور فرمائشیں بے کار کرنی پڑیں گی۔

اسلام کیا ہے؟ — مجلد قیمت ڈھائی روپے ۲/۵۰

مکمل فہرست کتب مفت طلب فرمائیے

مُسلمان اور ہندوستانی قومیت

جناب عبداللطیف اعظمی (ایڈیٹر ماہنامہ جامعہ)

۱۶ر جولائی ۶۳ء

محترمی السلام علیکم

آج اتفاق سے جون کے "تجلّی" میں ماہنامہ جامعہ دہلی کے ایک مضمون کے بارے میں ایک استفسار اور آپ کا جواب نظر سے گذرا۔ استفسار میں پروفیسر آل احمد سرور کے ایک ایک مضمون "ہندوستانی قومیت اور مسلمان" کا ایک اقتباس دیا گیا ہے اور آپ سے پوچھا گیا ہے کہ "اس رائے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

نقل کردہ عبارت میں دو باتیں کہی گئی ہیں جو بالکل واضح ہیں۔ ایک یہ کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنی تفسیر قرآن میں اسلام کی حقیقی تعلیم پر روشنی ڈالی ہے اور دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ مولانا آزادؒ نے اپنی زندگی کے ذریعہ سے ثابت کیا ہے کہ قومی زندگی میں دل وجان سے شرکت ہی اقلیتوں کے لئے صحیح راہِ عمل ہے۔ سوال کرنے والے بزرگ نے جو ایک غزل گو شاعر ہیں۔ اس کی کوئی وضاحت نہیں کی ہے کہ ان سیدھے سادے جملوں میں کیا بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی ہے جو آپ سے سمجھنا چاہتے ہیں۔ یا ان دونوں باتوں سے یا ان میں سے کسی ایک سے ان کو اختلاف ہے تو اسے بیان کرنا چاہئے تھا، تاکہ آپ اسی کے مطابق جواب دیتے۔ مگر اس کے باوجود آپ نے جواب لکھا ہے مگر استفسار کی وضاحت کی آپ کو ضرورت نہیں تھی تو کم سے کم آپ کو پروفیسر آل احمد سرور کا مضمون تو پڑھ ہی لینا چاہئے تھا۔ آپ نے لکھا ہے کہ "افسوس ہمیں مارچ کا جامعہ نہیں مل سکا۔" مجھے نہیں معلوم کہ اس کے حصول کیلئے آپ نے کیا کوشش کی تھی جس میں ناکامی ہوئی، لیکن اسکا یقین ہے کہ اگر آپ اظہار رائے کے لئے یہ شمارہ مفت بھی طلب کرتے تو ضرور مل جاتا۔ لیکن اس سے زیادہ عجیب اور افسوسناک بات یہ ہے کہ آپ نے اصل عبارت تحریف کرکے وہ مطلب پیدا کر دیا ہے جو مضمون نگار نے نہیں لکھا ہے۔ فاضل مضمون نگار نے یہ بالکل نہیں لکھا ہے کہ مولانا آزادؒ نے اپنی تفسیر قرآن میں ہندوستانی قومیت کی حمایت اور تائید کی ہے مگر آپ بلا تامل ان کی طرف منسوب کر دیتے ہیں کہ "وہ (سرور صاحب) گمان کرتے ہیں تفسیر القرآن کا سارا لبّ لباب فقط یہ ہے کہ اقلیتیں قومی زندگی میں دل وجان سے شرکت کیا کریں وغیرہ۔"

آگے چل کر آپ مزید وضاحت فرماتے ہیں کہ "ہمیں اس سے کوئی اختلاف نہیں کہ ہندوستان کے تمام ہی باشندوں کو مل جل کر اپنے وطن کی خدمات انجام دینی چاہئیں اور مولانا آزادؒ کی تفسیر یا ان کے اسوے نے اگر یہی تعلیم دی ہے تو چشم ما روشن دلِ ماشاد، لیکن یہ کہنا کہ یہی تعلیم اسلام کی حقیقی تعلیم ہے اور اسی کی بنیاد پر مولانا آزادؒ کی تفسیر کو سب سے بڑی "خدمت" قرار دینا ایک خاص نوع کے سیاسی اندازِ فکر کی بازگشت کے سوا کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔"

آپ کے بارے میں یہ گمان تو نہیں کیا جا سکتا کہ سرور صاحب کی چند سطری صاف اور سادہ عبارت سمجھنے میں آپ قاصر رہے ہے۔ یہ تصور کرنا اس سے زیادہ مشکل ہے کہ آپ نے قصداً

عبارت میں تحریف کی ہے۔ اب آپ ہی اس پر روشنی ڈال سکتے ہیں کہ آپ کو یہ غلط فہمی کیوں کر ہوئی؟

پروفیسر آل احمد سرور نے زیر بحث مضمون میں جو کچھ لکھا ہے اس پر گفتگو کرنے کا یہ مناسب موقع نہیں ہے لیکن ناظرین "تجلی" کو اس مضمون کے بارے میں صحیح واقفیت بہم پہنچانے کے لئے ذیل میں چند مختصر اقتباسات نقل کرتا ہوں۔ خود سرور صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں اس کا نمبروار خلاصہ دیدیا ہے۔ جناب عبدالمجیب صاحب حیرت نے آپ کو جو اقتباس بھیجا تھا وہ اسی خلاصہ کا آٹھواں نمبر ہے۔ میں نمبرا اور نمبر۲ پیش کرتا ہوں:۔

۱۔ اسلام اور قومیت میں کوئی تضاد نہیں ہے ہندوستانی مسلمان اسلام کے سچے پیرو ہوتے ہوئے ہندوستانی قومیت کے علم بردار رہ سکتے ہیں۔ اس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ حسن تدبر سے دور کی جاسکتی ہیں۔ رکاوٹوں کی ذمہ داری میں سب شریک ہیں۔

۲۔ قومیت کا تصور جیسے جیسے فروغ پاتا جائے گا اور جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا جائیگا اسی نسبت سے اکثریت میں مذہب کی بنیاد پر سیاست کو متعین کرنے کا جذبہ کمزور ہوگا اور اگر اقلیت مذہبی بنیاد پر سیاست نہیں چلائے گی تو یہ عمل اور جلد ہوگا۔

مضمون میں ایک جگہ سرور صاحب نے اکثریت کے بارے میں لکھا ہے:۔

"ہندوستانی قوم اگر اپنے جمہوری نظام، قومی بنیاد، غیر مذہبی ریاست کے تصور کو زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری دیکھنا چاہتی ہے تو اس کا یہ فرض ہوگا کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو خوش اور مطمئن رکھے اور ان کے روحانی سرمائے کو جو اسلام کے نام سے دنیا کے سامنے ہے اپنائے اور اس سے حسب توفیق مدد لے۔ یہ مدد شراب بندی کے قوانین اور جنسدو کوڈ بل کے سلسلے میں اب بھی لی جارہی ہے اور ابھی اس سلسلے میں بہت سے امکانات ہیں۔" والسلام

بہت بہت شکریہ کہ آنجناب نے گرامی نامے سے نوازا۔ جو ذہنی کوفت آپ کو میرے جون والے جواب سے ہوئی ہے اسکے لئے میں تہہ دل سے معافی چاہتا ہوں۔ اسے میری نااہلی ہی سمجھئے کہ آپ جیسا دیدہ ور میری معروضات پر نہ صرف معترض ہوا بلکہ خط لکھنے پر بھی مجبور ہوا۔ لیکن میری ناقص فہم اب بھی یہ نہیں ادراک کر سکی ہے کہ "تحریف" آپ نے کس چیز کو قرار دیا ہے۔ کسی شخص کی عبارت سے اگر کوئی من مانا مفہوم لے لیا جائے تو اسے بے شک تحریف معنوی کہتے ہیں لیکن آپ تو ناچیز کو اصل عبارت میں تحریف کا مجرم گردان رہے ہیں حالانکہ اصل عبارت تو سائل کے خط سے جوں کی توں نقل کردی گئی ہے اور جواب میں جو بھی مفہوم بندے نے اس عبارت کا لیا ہے وہ اگر آپ کی دانست میں غلط بھی ہو تو بہرحال میں نے اسے واوین (کوامے) دیکر نہیں لکھا ہے کہ اس پر کسی کو خود آل احمد سرور صاحب کی عبارت ہونے کا دھوکا ہو۔ پھر یہ الزام کیسا کہ:۔

"آپنے اصل عبارت میں تحریف کر کے وہ مطلب پیدا کردیا کہ۔۔۔"

خیر آپ کا الزام سر آنکھوں پر، لیکن تشویشناک بات یہ ہے کہ بندے کی ناقص فہم تو آپ کے توضیحی مکتوب کے بعد بھی یہ سمجھنے سے قاصر رہی ہے کہ میرے جون والے معترض فیہ جواب میں کونسی سطر یا کونسا لفظ ایسا ہے جس سے مجھے رجوع کرلینا چاہیئے۔ جناب آل احمد سرور صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"مولانا آزاد نے سب سے بڑی خدمت یہ کی ہے کہ۔"

کیا اس ارشاد میں لفظ "خدمت" واحد استعمال نہیں کیا گیا؟ ــــ اگر کیا گیا تو کھلی بات ہے کہ اب آگے ایک ہی سب سے بڑی خدمت کا بیان ہوگا۔ آگے اس ایک خدمت کو ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:۔

"کہ اپنی تفسیر القرآن کے ذریعے اسلام کی حقیقی تعلیم پر روشنی ڈالی اور اپنی زندگی کے ذریعے یہ ثابت

کردیا کہ قومی زندگی میں دل و جان سے شرکت ہی
اقلیتوں کے لئے صحیح راہِ عمل ہے۔"

لفظ "تعلیم" بھی یہاں واحد ہی استعمال کیا گیا، جمع نہیں۔
پھر قومی زندگی میں شرکت کی بات حرفِ عطف "اور" کیساتھ
اسی کے ساتھ مربوط نظر آرہی ہے۔ تو کیا یہ مفہوم نکالنے کا کوئی
موقع نہیں کہ اسلام کی حقیقی تعلیم سے لکھنے والے نے وہی چیز
مراد لی ہے جسے مولانا آزادؒ نے اپنی زندگی کے ذریعے عملاً
ثابت کیا ہے؟

چھوڑیئے۔ اپنے قصور کے اعتراف یا انکار سے قبل میں
چند باتیں آپ سے ان دو نمبروں کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں
جنھیں آپ نے سرور صاحب کے مضمون سے توضیحاً نقل کیا ہے۔ ان
کے جواب ہی پر میرے جون والے معروضے کے خطا و صواب
کا انحصار ہے۔

(۱) مجھے بتائیے ہندوستانی قومیت سے مراد کیا ہے۔ اگر
محترم سرور صاحب نے اپنے کسی قلم پارے میں اس اصطلاح
کا جامع و مانع مفہوم بیان فرمایا ہے تو براہ کرم وہ مجھے مہیا
فرمادیں اور اگر نہیں فرمایا تو خود آنجناب زحمت فرمائیں کہ
جس ہندوستانی قومیت کی تدریس موصوف نے فرمائی
ہے اس کا ٹھیک ٹھیک منشاء، حدود، جغرافیہ کیا ہے،
اس کے بعد ہی موصوف کے گراں قدر خیالات کو پوری
طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ عاجز کا خیال یہ ہے کہ آج کے دورِ فتنہ
میں اصطلاحات سے بڑا جادو کوئی نہیں۔ پہلے اصطلاحات
مقصد و منشاء کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہوا کرتی تھیں لیکن
آج ان سے بڑا کوہِ گراں مقصد و منشاء کی راہ میں کوئی نہیں
یہ ایک خوشنما برقعے کی حیثیت اختیار کرگئی ہیں کہ میں یا آپ
نقاب سرکائے بغیر بالکل نہیں جان سکتے کہ اندر کوئی پری جمال
ہے یا ایک حبشن جس کے چہرے پر برص کے داغ ہیں۔ زہرِ قاتل
لیجئے اور کسی خوبصورت سی اصطلاح کے نظر فریب غلاف میں بھر کر
پیش کردیجئے بے شمار ہاتھ اسے شوق سے ہونٹوں تک لے
جائیں گے۔ اصطلاحات ۔۔ خصوصاً سیاسی اصطلاحات۔
۔۔ خدا کی پناہ! آپ سرور صاحب کی عبارت کو صاف و سادہ
بتاتے ہیں لیکن میں اسے بے حد مبہم پا رہا ہوں از راہِ کرم
"ہندوستانی قومیت" کے خدوخال واضح فرمائیں نیز یہ بھی
بتائیں کہ "اسلام" سے کیا مراد ہے ۔۔ "اسلام" بھی ایک اصطلاح
ہی ہے۔ پہلے یہ اصطلاح متفقہ طور پر قرآن، سنت، اجماع
اور قیاس سے عبارت تھی، لیکن آج اسے اور بہت سی اصطلاحات
کی طرح طبعزاد سانچوں میں ڈھالا جاچکا ہے۔ ایک اسلام وہ ہے
جس کے امام عصر لاہور والے غلام احمد پرویز صاحب
ہیں ۔۔ ایک اسلام قادیانیوں کا ہے۔ ایک اسلام وہ
ہے جس کا پہلا اور آخری کلمہ "ماتمِ حسینؓ" ہے۔ جناب
سرور صاحب کے بیش قیمت فرمودات کا ٹھیک ٹھیک
منشاء اسی صورت میں سمجھا جاسکتا ہے جب یہ معلوم ہو جائے
کہ "ہندوستانی قومیت" اور "اسلام" کے اصطلاحی
الفاظ وہ کس مفہوم میں بول رہے ہیں۔

(۲) فرمایا گیا ہے کہ:-

"اگر اقلیت مذہبی بنیاد پر سیاست نہیں چلائیگی
تو یہ عمل اور جلد ہوگا۔"

یہ فرمودہ بھی توضیح طلب ہے۔ مذہبی بنیاد پر سیاست
چلانے نہ چلانے کی بات بظاہر سادہ ہونے کے باوجود
حقیقتاً خاصی پُرپیچ ہے۔ مثلاً اسی تازہ مسئلہ کو لیجئے کہ
حکومت مسلمانوں کے پرسنل لا میں اصلاحات کا ارادہ کررہی
ہے۔ ہندوستانی قومیت کا ایک علمبردار کہہ سکتا ہے کہ اس
ارادے کی مخالفت دراصل سیاست کو مذہبی بنیاد پر چلانے
کے مرادف اور قومیت کے تقاضوں کی نفی ہے۔ ہندوستانی
دستور کا ایک رہنما اصول یہ ہے کہ ریاست پورے ہندوستان
کے لئے یکساں شہری ضوابط (سول کوڈ) تشکیل دینے کی جدو
جہد کرے گی۔ جو لوگ پرسنل لا کے سلسلے میں شور مچارہے ہیں وہ
اس رہنما اصول سے انحراف کرکے "ہندوستانی قومیت" کے
احساس سے تہی دامن ہونے کا ثبوت پیش کررہے ہیں۔

دوسری مثال یہ ہے کہ آج کی ہندوستانی سیاست
میں "پارٹی" کو خدا کا منصب دیدیا گیا ہے۔ جب پارلیمنٹ
میں کانگریس کی طرف سے کوئی بل پیش ہوتا ہے تو وہ سب کا

[illegible] کا تحریری ممبروں کے نام حکمنامہ جاری کر دیا جاتا ہے۔ گویا [illegible] کے کسی جزو یا پورے ہی بل سے کسی ممبر کو دیانتاً کتنا ہی اختلاف ہو لیکن سیاست کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنے ضمیر کی لاش پر کھڑا ہو کر بل کی حمایت کرے یا کم سے کم الخاموشی نیم رضا کا ثبوت دے۔

اب بتائیے اگر ایک ممبر کا مذہب اس روش کو بدترین قرار دیتے ہوئے قطعی حکم دیتا ہے کہ عدل و صداقت کا ساتھ دو اور اس حکم کے تحت یہ شخص سیاست کا تقاضا ٹھکرا دیتا ہے تو سرور صاحب کیا فرمائیں گے — آیا وہ اسے مذہبی بنیاد پر سیاست چلانے کا نام دیں گے۔ یا اس کی تحسین کریں گے۔

میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ سرور صاحب مذہب کو کس حد تک سیاست سے بے دخل کرنے کے قائل ہیں۔ آپ کوئی معیّن مثال دیکر سمجھائیں کہ فلاں فرد یا جماعت سیاست کو مذہب کی بنیاد پر چلانے کی مجرم ہے اور فلاں جماعت کی روش اس خطا سے پاک ہے تبھی سرور صاحب کا دلی منشا مصرّح ہو سکے گا۔

تجلّی کے صفحات آپ کے لئے حاضر ہیں بشرطیکہ آپ اصطلاحوں اور اشاروں کے عوض صاف و سادہ الفاظ میں تفہیم فرما سکیں۔ سرور صاحب کے مقالہ میں اگر واقعتہً ملّتِ مسلمہ کے لئے کوئی مفید پیغام اور لائقِ التفات سبق موجود ہے تو بندہ خود بھی اس کے ابلاغ میں شریک ہو جائے گا۔ تعاونوا علی البرّ والتقویٰ

تجلّی کی ڈاک

جماعتِ اسلامی اور جماعت سازی

سوال:- از محمد اسعد اسرائیلی۔ سنبھل (مراد آباد)

جماعت اسلامی کے حضرات کبھی کبھی کہتے ہیں کہ اسلام بس کتابوں میں ہی رہ گیا ہے۔ عملی جدّ وجہد بالکل نہیں۔ حضرات علمائے کرام فقہ کی کتابوں اور اسلام کے عمرانی وسیاسی نظام کا برابر مطالعہ کرتے رہتے ہیں لیکن کوئی عملی جدو جہد نہیں کرتے سوال یہ ہے کہ جماعت اسلامی کا وہ کونسا عمل ہے جسپر "حکومتِ الٰہیہ کی کوشش" کے جملے کا اطلاق ہوسکتا ہے کتابیں چھاپنے کے علاوہ وہ کونسا نیا کام کر رہی ہے؟ کتابیں پڑھنے اور چھاپنے اور جلسے سننے کے علاوہ کونسا کام ہے جو اسے اس کے مقصد کے قریب کر رہا ہے؟

اس کے علاوہ اس کے مقصد سے انکار کرنے والے بھی معدودے چند ہیں پھر جماعت کی تشکیل سے کیا فائدہ؟ بالفاظ دیگر جماعتیں کیوں بنائی جاتی ہیں ان کا فائدہ کیا ہے؟

اسلام میں اجتماعیت کا مفہوم کیا ہے؟ حضرت عمرؓ کا ارشاد لا اسلام الا بجماعۃٍ اس کے متعلق چند سوال ہیں:-

(۱) کیا اس جماعت سے مراد کوئی اصطلاحی جماعت (پارٹی) ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کا ثبوت؟

(۲) اگر اس جماعت سے مراد پارٹی نہیں بلکہ اسلامی اجتماعیت کی روح (رسائل ومسائل) مراد ہے تو مولانا مودودی نے اسے جماعت اسلامی کے حق میں کیوں استعمال کیا؟

(۳) اگر لا اسلام الا بجماعۃٍ سے حضرت عمرؓ کی یہ مراد ہے کہ جب تک کوئی مسلمان کسی جماعت میں شامل نہ ہو اس کا اسلام نامکمل رہتا ہے تو سوال یہ ہے کہ پارٹی میں شرکت سے اسلام میں کیا زیادتی ہوتی ہے؟

الجواب:-

آپ کا سوال کئی ایسے سوالوں کا مجموعہ ہے جنھیں ذہنی انتشار نے ایک دوسرے میں خلط ملط کر دیا ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ تنقیح کے ساتھ جواب پیش کردوں۔

(۱) یہ بات کہ "اسلام بس کتابوں ہی میں رہ گیا ہے عملی جدوجہد عنقا ہے" فقط جماعت اسلامی ہی نہیں کہتی بلکہ ساری دنیا کہتی ہے۔ اسی مفہوم کے لئے تو ایک کہاوت بھی خاصی عام ہوگئی ہے۔

مسلمانی در گور و اسلام در کتاب

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ لہذا اسے فقط جماعت اسلامی کی طرف منسوب کرکے بطور اعتراض پیش کرنا مذاق بلکہ ستم ظریفی کا دلچسپ نمونہ ہے۔

پھر اس سلسلے میں اچانک حکومتِ الٰہیہ کا ذکر کر بیٹھنا اور بھی لطیفہ ہے۔ جماعت اسلامی یا کوئی بھی جماعت یا فرد اگر مسلمانوں کی عام بے عملی اور علماء کے تساہل وتعطل پر آنسو بہاتا ہے تو اس کا یہ مطلب آپ نے کیسے لے لیا کہ وہ حکومتِ الٰہیہ کے فراق میں رو رہا ہے۔ حکومتِ الٰہیہ کی اصطلاح تو بہت دن ہوئے سرد خانے میں جا چکی

اور ہمارے نزدیک یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ یہ اصطلاح اپنے حقیقی مفہوم میں اگرچہ نہایت پاکیزہ اور محمود ہے لیکن اس کے الفاظ چونکہ غلط فہمیوں کا موجب ہوتے رہے ہیں اور اسے من مانے سیاسی معنی پہنانا ہر دسیسہ کار کے لئے آسان ہے اس لئے بہت اچھا کیا اگر جماعت اسلامی نے اسے گوشۂ عزلت میں رکھدیا۔ پھر یہ آپ حکومتِ الٰہیہ کا شوشا کیوں لے بیٹھے؟

خوب سمجھ لیجئے جماعت اسلامی کا نصب العین اصطلاحات کے چکر سے ہٹ کر واضح اور غیر مبہم الفاظ میں پہلے بھی یہ تھا اور آج بھی یہی ہے کہ معاشرے میں ان اقدار و تصورات کو غالب کرے جو اللہ کو محبوب ہیں اور ان نظریات و اعمال کو بیخ و بن سے اکھیڑے جو اللہ کی ناراضی کا مظہر ہیں اس نصب العین کا تعارف اگر مختلف اوقات میں حکومتِ الٰہیہ اور اقامتِ دین جیسی اصطلاحوں سے کرایا گیا ہے تو اس کی موجد بھی جماعت اسلامی نہیں ہے بلکہ بہت پہلے سے ایسا ہوتا آرہا ہے۔ آپ تعارفی الفاظ کے چکر میں مت پڑیئے بلکہ یہ دیکھئے کہ خود نصب العین میں کیا خرابی ہے۔ ہمارے نزدیک تو یہی وہ نصب العین ہے جس کے لئے انبیاء و رسل مبعوث ہوئے۔ اسی کو قرآن نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جامع الفاظ میں تمام امت کے لئے مؤکد فرمایا ہے اور یہی ہر مسلمان کا منتہائے نظر ہونا ہی چاہیئے۔

(۲) آپ پوچھتے ہیں کہ جماعت اسلامی اس نصب العین کے لئے سوائے قلمی اور زبانی جمع خرچ کے اور کر کیا رہی ہے

ہمارا جواب یہ ہے کہ خود آپ بتلایئے اسے یہ سب چھوڑ کر اور کرنا کیا چاہیئے؟

ایک غریب آدمی خواب دیکھتا ہے کہ وہ اپنے نوعمر بیٹے کو ولایت پاس کرائے گا۔ اس خواب کی تعبیر سے ہم آغوش کرنے کے لئے وہ ایک طرف بیٹے کو پرائمری میں داخل کر دیتا ہے دوسری طرف کسی تاجر کے یہاں دو گھنٹے کیلئے بہی کھاتے کی ملازمت کر لیتا ہے تاکہ دن بھر کسی دوسری جگہ ملازمت کرنے کے بعد جو یافت ہوتی ہے اس کے علاوہ بھی کچھ کما سکے اور اس ذیلی ملازمت سے حاصل شدہ پیسہ بیٹے کی خاطر جمع کرے۔ تیسری طرف وہ ایک بڑے آفیسر کے گھر کا سودا سلف بھی مفت لانے کی خدمت انجام دیتا ہے کیونکہ اسے امید ہے کہ آگے چل کر یہ آفیسر اس کے بیٹے کو ولایت بھجوانے میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

اب غور کیجئے۔ جس وقت وہ بہی کھاتے میں سر کھپا رہا ہوتا ہے یا جس وقت وہ ترکاری والے سے آفیسر صاحب کے لئے ایک روپے کے ٹماٹر خرید رہا ہوتا ہے اس وقت کیا اس کے اس فعل میں اور اس خواب میں جسے اس نے زندگی کا نصب العین بنا لیا ہے کوئی محسوس مرئی ربط ہوتا ہے؟ کیا کوئی ظاہر بین آدمی کہہ سکتا ہے کہ یہ بالکل غیر متعلق سے کام اسے ایک دُور افتادہ نصب العین کی طرف بڑھا رہے ہیں؟

ظاہر ہے کہ نہیں اور بالکل نہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ اصلاً ان کاموں کا نصب العین سے گہرا تعلق ہے دونوں میں ایک مخفی لیکن منطقی ربط موجود ہے۔ ایسا قوی ربط جیسا کہ روٹی پکانے اور درخت سے لکڑی کاٹنے میں پایا جاتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح جماعت اسلامی کے بارے میں سوچئے۔ آپ جانتے ہیں کہ شخص مذکور کے بیٹے کو مدتوں تک اپنے وطنی اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنا ہوگا۔ باپ کو عرصۂ دراز کی محنت سے پیسہ جمع کرنا ہوگا۔ پھر سفارش اور خوشامد کے چکر چلیں گے۔ تب کہیں جا کر یہ نظر آئے گا کہ بیٹا جہاز میں بیٹھ کر ولایت جا رہا ہے۔ اسی طرح جماعت اسلامی کو بھی اپنے نصب العین کی خاطر مدتوں ایسے کام کرنے ہوں گے جو بادی النظر میں تو اس کی منزل مقصود سے کوئی محسوس رشتہ رکھتے نظر نہ آئیں، لیکن معنوی حیثیت سے وہ بالیقین اس سے مربوط ہوں۔ فرق یہ ہے کہ ایک بچے کو ولایت پاس کرانے کا نصب العین تو ایک سادہ سا معمولی سا نصب العین ہے جس کی راہ میں کوئی کوہِ گراں حائل نہیں۔ اس کا زمانی فاصلہ بھی بیس تیس سال سے زیادہ نہیں ہے وہ نادر اور اچھوتا بھی نہیں ہے۔

لیکن ایک پورے معاشرے کو بدلنے اور نئے سانچے میں ڈھالنے کا نصب العین بے حد عظیم، پیچیدہ اور کٹھن ہے اس کا زمانی فاصلہ بھی لامحدود ہے۔ اس کی راہ میں کوہ گراں بھی ایک دو نہیں بے شمار حائل ہیں۔ یہ اس اعتبار سے نادر اور اچھوتا بھی ہے کہ مادہ پرست فکر و تہذیب کے زبردست تسلط نے اقدار و افکار کے تمام خانے باطل و فاسد نظریات سے بھر دیئے ہیں اور روحانی و آسمانی اقدار و اصول کیلئے تل دھرنے کی جگہ باقی نہیں رہ گئی ہے۔

بتائیے کیا ایسے دشوار، بعید، کٹھن اور نادر نصب العین کیلئے بھی یکایک ایسی جست ممکن ہے جسے سر کی آنکھوں سے دیکھ کر آپ یا کوئی بھی ظاہر بیں پکار اٹھے کہ ہاں یہ لگائی ہے چھلانگ نصب العین کی طرف۔ چھلانگ تو درکنار ایسے دور افتادہ اور بلند تر نصب العین کے لئے تو ایک سمت رفتار قدم بھی ایسا اٹھانا بحالاتِ موجودہ دشوار ہی ہے جسے فقط سر کی آنکھیں استعمال کرنے والے نصب العین کی طرف سفر کا نام دے سکیں۔ یہ روٹی پکانے کا کام نہیں ہے کہ جب آپ آٹا گوندھتے دیکھیں تو پکار اٹھیں کہ ہاں اب روٹی پکے گی۔ یہ بڑا باریک اور جان جوکھوں کا کام ہے۔ اسے چشم بصیرت پر معنویت کی عینک لگا کر دیکھئے جب تو اندازہ ہو سکے گا کہ منزل کی سمت سفر کا آغاز ہوا ہے یا نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جماعت اسلامی زبان اور قلم سے جو کچھ کر رہی ہے وہ اس کے نصب العین سے غیر مربوط نہیں بلکہ دونوں کے مابین ایک معنوی اور منطقی ربط پایا جاتا ہے۔ اگر آپ یا کوئی بھی صاحب الرائے یہ گمان کرتا ہے کہ جماعت کے موجودہ مشاغل، مساعی اور طریق کار کا اصل مقصد سے جوڑ نہیں ہے تو اسے صاف صاف بتانا چاہیئے کہ مقصد سے جوڑ رکھنے والے کام کونسے ہیں اور حصولِ مقصد کے لئے کیا کچھ کرنا چاہیئے۔ فقط اعتراض "تخریب" کے مرادف ہے۔ تخریب کے ساتھ نئی تعمیر کا نقشہ بھی بتائیے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ جماعت کے کام میں کوئی خامی نہیں۔ جماعت انسی مخلوق کا ایک گروہ ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ الانسان مرکب من الخطاء والنسیان اس کے افراد سے فکری، عملی ہر طرح کے قصور سرزد ہوئے ہوں گے آگے آگے بھی ضرور ہوں گے۔

بہت ممکن ہے وہ بعض موٹی موٹی غلطیاں بھی کر رہی ہو، لیکن مجمل بلکہ بعض حالتوں میں مہمل اعتراضات سے حاصل ؟

(۳) رہا یہ سوال کہ جب اصل مقصد اور نصب العین سے انکار و اختلاف کرنے والے معدودے چند ہیں تو جماعت کیوں بنائی گئی ؟

تو یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ یوں پوچھیں کہ جب ملک کے تحفظ اور اسے حملہ آوروں کی دستبرد سے بچانے کے مقصد و نصب العین پر ملک کا بچہ بچہ متفق الرائے ہے تو آخر فوج کس لئے بنائی جاتی ہے۔ بے شمار دولت فوجی تنظیموں پر کیوں خرچ کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ کامل امن کے زمانے میں بھی محکمۂ فوج جوں کا توں قائم رہتا ہے اور کبھی کسی حکمراں نے اپنی فوج سے یہ نہیں کہا کہ جاؤ اب سب کے سب گھروں پر پیر پسار کے سو رہو کیونکہ سارا ملک حفاظتِ وطن کے مقصد پر متفق ہو چکا ہے۔

محترم بھائی۔ دنیا کے سارے ہی کام نظم و انتظام اور تال میل سے چلتے ہیں۔ یہ کہہ دینا تو آسان ہے کہ معدودے چند کے علاوہ مقصد سے کسی کو انکار نہیں، لیکن اس مقصد کے لئے جد و جہد اور تیاری نظم و ضبط ہی کے ساتھ ممکن ہے کیا آپ نہیں دیکھ سکتے کہ دنیا کا ہر کام ہر شعبۂ زندگی میں نظم و انضباط ہی کے ساتھ چل رہا ہے۔ نظم و ارتباط ہی کا دوسرا نام جماعت ہے اور کائنات کا چپہ چپہ شاہد ہے کہ نظم سے بڑھ کر ظاہری شئے کوئی نہیں۔ سورج، چاند، زمین، ان میں کتنا فاصلہ ہے لیکن فاطرِ کائنات نے ان سب کو ایک اجتماعی رشتے اور ایک ہمہ گیر نظم میں جکڑ دیا ہے۔ کیسا نادان، کتنا بچہ ہے وہ شخص جو یوں پوچھے کہ کسی بڑے کام کی انجام دہی کے لئے جماعت بنانے کی کیا ضرورت ہے؟

اور کیا آپ نے یہ نہیں سوچا کہ کسی مقصد سے محض لفظا

حصول مقصد میں کچھ بھی معاون نہیں ہوتا جب تک کہ عملی جد و جہد کی جائے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ نماز روزے کی فرضیت پر سبھی مومنوں کا اتفاق ہے لیکن عمل پیرا کتنے ہیں؟ جماعت اسلامی کے مقصد اور نصب العین سے اگر معدودے چند کے سوا کسی کو اختلاف نہیں تو اس سے حاصل کیا جب تک کہ اتفاق رکھنے والے افراد مل جل کر عملی جد و جہد نہ کریں اور کسی عملی تعبیر پر متفق نہ ہوں۔ "جماعت" اسی کا نام تو ہے کہ کسی مقصد کے لئے کچھ لوگ مجتمع ہوں اور کچھ قواعد و ضوابط ایسے بنالیں جو متحدہ مساعی کیلئے ممد و معاون ثابت ہوسکیں۔

(۴) حضرت عمرؓ کا قول آپ نے قدرے نقص کے ساتھ نقل کیا۔ بجماعۃ نہیں بلکہ بالجماعۃ ہے اور یہ الف لام کا التزام معمولی نہیں بلکہ اسی میں یہ تنبیہ پوشیدہ ہے کہ جس "جماعت" کو حضرت عمرؓ اسلام کے لئے ناگزیر قرار دے رہے ہیں وہ بھیڑ اور انبوہ سے عبارت نہیں ہے بلکہ ایک منظم، باقاعدہ اور با اصول گروہ سے عبارت ہے۔

مولانا مودودی نے درست کہا کہ اس الجماعۃ سے مراد کوئی معین پارٹی نہیں بلکہ روح اجتماعیت مراد ہے لیکن کون نہیں جانتا کہ روح کے لئے جسم چاہئے۔ جسم ہی نہ ہوگا تو روح کارفرمائی کہاں کرے گی۔ اس کا ظہور کہاں ہوگا۔ مولانا مودودی ہوں یا کوئی بھی داعی و مصلح۔ جب وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حکم ربانی کی تعلیم میں اپنے ماحول، حالات اور مقتضیات کی مناسبت سے جد و جہد کا آغاز کرتا ہے تو ضروری ہوتا ہے کہ کچھ ایسے لوگوں کو اپنے ساتھ لے جو متعلقہ کاموں میں اس کا ہاتھ بٹا سکیں پھر جد و جہد کے نتیجے میں جتنے بھی افراد اس کی دعوت پر لبیک کہنے والے ملتے رہتے ہیں وہ انھیں ساتھ لے کر کام کو آگے بڑھاتا جاتا ہے۔ اسی مشترکہ اقدام و عمل کے حاملین کا نام "جماعت" ہے۔ کوشش اور خواہش تو داعی و قائد کی یہی ہوتی ہے اور یہی ہونی چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ آدمی اسکے ساتھ آجائیں اور اسلامی روح اجتماعیت کی کارکردگی کیلئے نہایت وسیع اور شاندار جسم ظہور میں آئے لیکن نتائج اپنے قبضے میں نہیں ہوا کرتے۔ دعوت پر لبیک کہنے والے جتنے بھی افراد مل سکیں وہی "جماعت" ہیں اور اس جماعت کا ایک نام رکھ دینا بھی ایسا ہی بے ضرر اور قدرتی فعل ہے جیسے ہم ہر پیدا ہونے والے بچے کا ایک نام رکھ دیتے ہیں۔ نام سے مقصود تعارف ہوتا ہے۔ ایک بچے کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ اس کا یہ منشاء نہیں ہوتا کہ نام رکھنے والے کے نزدیک بس یہی بچہ اللہ کا بندہ ہے اور باقی ساری دنیا بتوں کی بندی ہے۔ اسی طرح ایک داعی و مصلح اپنی جماعت کا جو نام رکھتا ہے اس کا یہ منشاء نہیں ہوتا کہ اس نام کے مفہوم کا اطلاق بس اسی کی جماعت پر ہوگا اور اس جماعت سے باہر کے لوگ اس مفہوم کے دائرے سے خارج ہوں گے۔

اجتماعی اور اہم کاموں کے لئے کچھ لوگوں کا چند اصول و قواعد پر اتفاق کر کے جماعتی شکل اختیار کرنا عقلاً، فطرتاً اور نقلاً ہر لحاظ سے معقول بات ہے جس پر اعتراض کرنا قلت تدبر کی علامت ہے اور جماعت کے لئے کسی امیر کا انتخاب بھی ہر اعتبار سے ضروری ہی ہے حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ جو دو آدمی بھی سفر کو نکلیں تو ان میں سے ایک امیر قرار دے لیا جائے۔ جب سادہ سے جسمانی سفر کا یہ حکم ہے تو دشوار و پیچیدہ معنوی سفر کے لئے تو یقیناً یہ حکم زیادہ شد و مد سے جاری ہوگا۔

الحاصل اسلام کی روح اجتماعیت کو جاری و ساری کرنے کے لئے ایسی جماعت بنانا جو مقتضیات وقت کے مطابق امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے آسمانی حکم کی بہتر سے بہتر طور پر تعمیل کر سکے، عقل و نقل کا ایک کھلا تقاضا ہے اور مولانا مودودی نے بھی "جماعت اسلامی" کے نام سے ایک جماعت اسی لئے بنائی تھی۔ آج ان کی جماعت پاکستانی ہو چکی، لیکن اسی نام کی ایک جماعت اپنے ملک میں بھی موجود ہے۔ ان دونوں جماعتوں میں اگرچہ ضابطے کا کوئی رشتہ نہیں لیکن اعلائے کلمۃ الحق، اصلاح معاشرہ اور

اقامتِ دین کے مقاصدِ عظیمہ کے اعتبار سے ان میں ایک ایسا معنوی و فکری ربط یقیناً موجود ہے جیسا کہ آج سے تیرہ سو برس قبل کے ایک مرحوم مسلمان اور آج کے ایک زندہ مسلمان میں۔

(۴) پارٹی میں شرکت سے اسلام میں کیا زیادتی ہوتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کسی پارٹی میں شرکت علامت ہوتی ہے اس بات کی کہ شریک ہونے والا ایک طرف اس نصب العین سے اتفاق رکھتا ہے جس کے لئے یہ پارٹی بنی ہے دوسری طرف وہ اُس طریق کار سے بھی متفق ہے جو اس پارٹی نے اپنے نصب العین کے لئے تجویز کیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ شرکت مظہر ہوتی ہے اس اندرونی احساس کی کہ ہمیں مشترکہ مقاصد کے لئے مل جل کر کام کرنا چاہیئے۔ اسی احساس کا نام ہے احساسِ اجتماعیت۔ آدمی اگر صرف اُن چیزوں تک اپنی دلچسپی کو محدود رکھے جن کا تعلق اس کے ذاتی و انفرادی سود و زیاں اور ذاتی رنج و راحت سے ہے اور ایسی چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ لے جو اُس جیسے اور بہت سے انسانوں سے متعلق ہیں تو سمجھا جائے گا کہ اس کے اندر روا جی احساسِ اجتماعیت موجود نہیں ہے۔ وہ خود غرض، خود پرور اور مفاد پرست ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جو اسلامی اسپرٹ کی نفی کرتی ہے اور اسی پر تنبیہ کرنے کے لئے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ لا اسلام الا بالجماعۃ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں صرف ایک پارٹی تھی ـــ حزب اللہ۔ یہ نام قرآن کا دیا ہوا ہے۔ اس پارٹی میں جو شریک ہوا مسلمان کہلایا اور جو باہر رہا حزب الشیطان کا فرد شمار ہوا۔ آپ دیکھ لیجئے حزب اللہ کا ایک ایک فرد کس درجہ روحِ اجتماعیت سے سرشار تھا۔ میرِ کارواں کے حکم ہی پر نہیں فقط اشاروں پر ہر رکنِ جماعت سراپا نیاز، مجسم تعمیل اور تصویرِ انقیاد تھا۔ انہیں کوئی چیز مشترکہ مقاصد اور متفق علیہ نصب العین سے زیادہ عزیز نہیں تھی۔ ایک کا کانٹا چبھتا تھا تو دوسرے سب تڑپ اُٹھتے تھے۔

آج مسلمانوں میں متعدد پارٹیاں ہیں۔ لہٰذا یہ صورت تو باقی نہیں رہی کہ فلاں پارٹی میں شامل نہ ہوئے تو حزب الشیطان کا فرد بن گئے ہاں یہ ضرور ہے کہ احیائے دین، اصلاحِ معاشرہ اور انہدامِ باطل کی خاطر کام کرنے والی مختلف پارٹیوں میں سے کسی میں شریک ہو جانا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس شخص کے اندر احساسِ اجتماعیت مرا نہیں۔

مثالاً یوں سمجھئے کہ ایمان ایک غیر مرئی کیفیت کا نام ہے جو دل و دماغ کے نہاں خانوں میں چھپی رہتی ہے۔ اب ہم اور آپ جو نماز روزہ کرتے ہیں تو ان میں سے کوئی بھی چیز بجائے خود ایمان نہیں بلکہ ایمان کا مظہر اور علامت ہے۔ انہی مظاہر علائم کا نام اسلام رکھا گیا ہے۔ کوئی شخص اعمالِ شرعیہ سے واسطہ نہیں رکھے گا تو آپ کے لئے یہ فیصلہ دینا مشکل ہوگا کہ اس کے دل و دماغ میں دولتِ ایمان ہے یا نہیں اور ہے تو کس مقدار اور کیفیت میں ہے۔ ٹھیک اسی طرح اُن لوگوں کے بارے میں جو مشترکہ مقاصد کے لئے کسی جماعت میں شرکت نہیں کرتے اور خود اپنے طور پر بھی کوئی اجتماعی نوعیت کا کام انجام نہیں دیتے یہ فیصلہ دینا مشکل ہے کہ ان کے اندر اجتماعیت کا احساس زندہ ہے یا نہیں اور ہے تو کس مقدار اور کیفیت میں۔

گویا جماعت میں شرکت کسی اندرونی کیفیت میں اضافہ یا کمی کا موجب نہیں ہوتی بلکہ اس کیفیت کا مظہر، علامت ثبوت ہوتی ہے۔ البتہ جس طرح اعمالِ صالحہ ایمان کی کیفیت میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں اسی طرح کسی میں شریک ہو کر مشترکہ جدوجہد کرنے کا عمل، احساسِ اجتماعیت میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ آپ کی الجھنیں رفع ہو جائیں۔ پھر بھی اگر ہمیں کامیابی نہیں ہوئی تو سلسلہ بحث دراز کرنے کی ضرورت نہیں۔ کافی ہوگا کہ ہم اور آپ ایک دوسرے کے لئے دعا کریں۔ آپ یہ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو زیادہ بہتر اور مؤثر طریق پر بات کرنے کا سلیقہ عطا فرمائے اور ہم یہ دعا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی ذہنی ژولیدگی کو انضباط و اصابت میں تبدیل فرما دے۔

آمین

ثم آمین

[illegible] بلا بندر کے سر

سوال: — از محمد علی — سہسرام — ضلع شاہ آباد۔

ایک صاحب یہ اعتراض کرتے ہیں کہ علمائے دیوبند عالم ہیں؛ قابل بہت ہوتے ہیں میں اسے مانتا ہوں کہ اُن کی بہت گہری ہوتی ہے لیکن علم کی زیادتی نے انھیں گمراہ کیا اور انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ بشری نظریہ سے ہم بھی عبادت کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رتبہ و مرتبہ پا سکتے ہیں اور نبی ہو سکتے ہیں تو مجھے یہ دریافت کرنا ہے کہ علمائے دیوبند میں وہ کون عالم ہیں اور کس کتاب میں مع صفحہ اس قسم کا نظریہ ظاہر کیا ہے اور اُن کے اس وقت کتنے پیرو ہم خیال ہیں۔ اُن عالم کا نام اُن کے ہم خیالوں کا نام کتاب وغیرہ کے حوالے سے دیں۔

الجواب: —

دیوبند کے کسی عالم نے تو کبھی ایسی مجنونانہ بات کہی نہیں البتہ جن لوگوں کو اللہ نے عقل رسا نہیں دی ہے یا ان کی عقل کے زاویوں کو تعصبات نے کج کر دیا ہے وہ ضرور علمائے دیوبند کی کتابوں سے ایسے واہی تباہی مطالب و معانی اخذ کر کے فتنے کا مواد اکٹھا کرتے رہتے ہیں۔ آپ کا مطالعہ اس سلسلے میں کم معلوم ہوتا ہے ورنہ یہ بات آپ کو ضرور معلوم ہوتی کہ ایک بہت بڑے دیوبندی عالم کی ایک عبارت سے یہ گمراہ کن مفہوم بریلوی دوستوں نے اخذ کیا ہے اور دنیا بھر میں اس کی تشہیر کرتے ہیں۔ دیوبندیوں کی طرف سے بارہا تحریراً اور تقریراً واضح کیا گیا کہ یہ مفہوم اس عبارت کا ہے ہی نہیں ورنہ دیوبندی علماء پاگل نہیں ہو گئے ہیں کہ ایسی واہی بات کہیں جس کا سر ہی نہ پیر، مگر بریلوی دوستوں کی عادت ہے کہ وہ جواب نہیں سنا کرتے صرف اعتراض، پروپیگنڈہ، الزام تراشی کیا کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ جو کچھ آپ کو بتایا گیا وہ سراسر غلط ہے اور کسی دیوبندی عالم کی تحریر سے اس کا یہ گمراہ کن عقیدہ اخذ کر لینا اخذ کرنے والے کے دماغی بحران اور کم فہمی کا نتیجہ ہے۔ ہماری صداقت کا بہترین ثبوت یہ ہوگا کہ آپ اس عقیدہ و خیال کے بارے میں دار الافتاء دار العلوم دیوبند سے سوال کریں کہ جو شخص ایسا عقیدہ رکھتا ہو اس کے بارے میں کیا فتویٰ ہے۔ جواب سے آپ کو خود معلوم ہو جائے گا علمائے دیوبند اس عقیدے کی تردید و تغلیط کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

یہ تو جواب ہوا۔ اب ایک نصیحت سُن لیجئے۔ ہر سُنی سُنائی بات کو دہرا دینا بھی جھوٹ کی ایک قسم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کفیٰ بالمرء کذباً ان یحدث بکل ما سمع کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ وہ جو کچھ بھی سُنے اسے بلا تکلف بیان کر دے۔ آپ نے جب علمائے دیوبند کے بارے میں ایسے لغو عقیدے کی سماعت فرمائی تھی جو ہر عالم و جاہل مسلمان کے نزدیک صریحاً لغو ہے تو آپ کو چاہئیے تھا اِس کان سُنکر اُس کان اُڑا دیں۔ اگر ایسا نہیں کر سکتے تھے تو پھر کہنے والے سے ثبوت مانگا ہوتا۔ یہ کیا کہ شوشہ تو چھوڑا کسی اور نے اور آپ سوال کرنے بیٹھ گئے ہم سے۔ آئندہ اس طرح کے معاملات میں احتیاط، تدبّر اور معاملہ فہمی سے کام لیں۔

چین اور روس کی زندہ تصویریں

کمیونزم کی پہلی کتاب
جس میں کمیونزم سے متعلق سیکڑوں سوالات کے مکمل و مفید جوابات درج ہیں۔ قیمت ایک روپیہ ۔ ۱/-

ظلمت نیم روز
مصنف:۔ آرتھر کوئسلر
مترجم:۔ گوپال متل
سابق کمیونسٹ دانشور آرتھر کوئسلر کا بلند پایہ نظریاتی ناول جس کا ترجمہ اردو کے صاحب طرز ادیب جناب گوپال متل نے کیا ہے۔ ایک ایسے ملک کی کہانی جو آورتس وادی انقلابیوں کے ہاتھ میں پڑ کر جنت بنتے بنتے جہنم بن گیا۔ ضخامت ۲۹۶ صفحات۔ قیمت سوا روپیہ ۱/۲۵

عثمان بطور
چین میں مسلمانوں پر کیا گذری؟ ایک کہانی ایک تاریخ ۔ سوا روپیہ۔ ۱/۲۵

اور یانگسی بہتا رہا
ناول کے پیرائے میں چین کی ایک عبرت انگیز داستان۔ ایک روپیہ ۔/۱

کمیونزم اور کسان
کمیونزم کو ایشیائی نقطۂ نظر سے سمجھنے سمجھانے کی کامیاب کوشش جو بیشمار دستاویزی حوالوں سے مزین ہے۔ قیمت ڈھائی روپے۔ ۲/۵۰

عالمی سیاست میں جمہوریت
مصنف:۔ لیسٹر بی پیرسن۔
کینیڈا کے سابق وزیر خارجہ اور اتحادی سبھا کے سابق صدر مسٹر لیسٹر بی پیرسن کے چھ عالمانہ مقالوں کا مجموعہ۔ بین الاقوامی سیاست جمہوریت کے کردار اور جمہوری اصولوں کی کارفرمائی کے امکانات کا سیر حاصل تجزیہ۔ موجودہ بین الاقوامی سیاست کے پُر پیچ رجحانات کو سمجھنے کیلئے اس مختصر سی کتاب کا مطالعہ از حد مفید ہے۔ ضخامت ۱۱۸ صفحات۔ قیمت صرف آٹھ آنے۔

آزادی کی طرف
ایک روسی افسر کی آپ بیتی جو بھاگ کر امریکہ میں پناہ گزیں ہوا۔ نہایت دلچسپ اور عبرت ناک ۔ تین روپے ۳/-

آزادی کی نئی وسعتیں
مصنف:۔ اروِن ڈی کنہم۔
آزادی کے تصور میں جو نئی رنگ آمیزیاں ہوئی ہیں ان کی معلومات افروز کہانی کرسچین سائنس مانیٹر کے ایڈیٹر اروِن ڈی کنہم کی زبانی۔ جمہوری سماج کے جدید رجحانات کا ولولہ انگیز تجزیہ۔ ضخامت ۱۱۲ صفحے۔ صرف آٹھ آنے

ادب میں ترقی پسندی
کمیونزم ادب و صحافت کی آڑ میں کیا کھیل کھیلتا ہے۔ ایک روپیہ

پتھر کے دیوتا
چھ آپ بیتیاں۔ جاذب توجہ حیرت ناک
قیمت ایک روپیہ ۱/-

انیس سو چوراسی
مصنف:۔ جارج آرویل۔
مترجم:۔ سید سہیل واسطی۔
مشہور ہندوستانی نژاد مغربی مصنف جارج آرویل کا شہرہ آفاق ناول جس نے یورپ میں تہلکہ ڈال دیا تھا۔ اردو کا خوبصورت ایڈیشن آرٹ پیپر کی آٹھ تصویروں سے مزین۔ ضخامت [illegible] صفحات [illegible]

چین کے مسلمان
کروڑوں مسلمان کیا ہوئے؟ انھیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا؟ کمیونزم آدم خوری کا دستاویزی تذکرہ۔ صرف پچیس پیسے۔

سوویٹ نظام کی چھ کنجیاں
جچے تلے عقلی و نقلی دلائل پر مشتمل ایک سنجیدہ اور دلچسپ کتاب جو دلچسپ بھی ہے اور حقیقت افروز بھی۔ صفحات [illegible]
قیمت صرف ایک روپیہ ۱/-

آزادی کا ادب
بعض منتخب مقالوں، افسانوں اور منظومات کا مجموعہ جنھیں نیک تعمیری مقاصد کے تحت چھاپا گیا ہے۔ قیمت مجلد تین روپے ۳/-

لینن
انقلاب روس کے بانی لینن کی مستند سوانح بے لاگ اور غیر جانبدارانہ۔ ایک روپیہ

سوویت روس کی حقیقت
دو حصے۔ دو روپے

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام (ندوۃ العلماء لکھنؤ) کی چند معرکۃ الآراء مطبوعات

عربی، اردو، انگریزی اور ہندی جو ہر لحاظ سے معیاری اور مفید ہیں

تاریخ دعوت و عزیمت • تین جلدوں میں (از مولانا ابوالحسن علی ندوی) ... غیر مجلّد ۱۷/۵۰

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر • مکمل (〃 〃 〃) ... مجلّد ...... ۵/—

ہندوستانی مسلمان • .... 〃 (〃 〃) .... 〃 ۳/۵۰

نیا طوفان اور اس کا مقابلہ • ...... 〃 (〃 〃) غیر مجلّد .... —/۳۷

مسلمان اور ہندوستانی پور فتح اُردو • ... 〃 (〃 〃) 〃 .... —/۱۰

نشان راہ • .... 〃 (〃 〃) 〃 .... —/۳۷

مقالات سیرت • .... 〃 (ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی) ۴/۵۰

طوفان سے ساحل تک اُردو • .... 〃 (محمد اسد۔ سابق نام لیوپولڈ ویس) مجلّد ۵/-

مانوتا کا سندیش (ہندی) • .... (مولانا ابوالحسن علی ندوی) .... غیر مجلّد .... —/۷۵

اسلامک فیتھ اینڈ پریکٹیس (انگریزی) • (از مولانا منظور نعمانی) .... مجلّد .... ۴/—

اسلام اینڈ دی ورلڈ (انگریزی) • (از مولانا ابوالحسن علی ندوی) .... 〃 .... ۴/—

مسلمس اِن انڈیا (〃) • (〃 〃 〃) .... 〃 .... ۶/—

نیو مینس اینڈ الٹرا نسوبر (〃) • (〃 〃 〃) .... غیر مجلّد .... —/۵۰

موقف العالم الاسلامی تجاہ الحضارۃ الغربیہ (عربی) • .... (از مولانا ابوالحسن علی ندوی) ۲/۵۰

القادیانی والقادیانیہ • عربی ایڈیشن .... (〃 〃 〃) ۴/—

ردۃ ولا ابابکر لہا • 〃 .... (〃 〃 〃) —/۳۷

ملۃ ابراہیم وحضارۃ الاسلام • 〃 .... (〃 〃 〃) —/۵۰

الدعوۃ الاسلامیہ فی الہند وتطوراتہا • (عربی ایڈیشن) .... (〃 〃 〃) —/۵۰

اسمعوہا منی صریحۃ ایہا العرب • (〃) .... (〃 〃 〃) —/۳۷

الی قمۃ القیادۃ العالمیۃ • ..... (〃) .... (〃 〃 〃) —/۳۷

موقف المسلم ازاء اسلافہ الجاہلیین • (〃) .... (〃 〃 〃) —/۲۵

ثورۃ فی التفکیر • .... (〃) .... (〃 〃 〃) —/۳۷

ملنے کا پتہ:- **مکتبہ تجلّی۔ دیوبند یو۔پی**

جناب شمس نوید عثمانی

ہزار عنوان بدل بدل کر فسانۂ عشق کہہ چکا ہوں
مگر یہ محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے کچھ بھی کہا نہیں ہے

کیا ہم مسلمان ہیں؟

کتنی خوفناک تھی وہ رات! ——

قتل و خونریزی کی انتہائی دردناک اور انتہائی منظم
ازش کفر و شرک کی سیاہ کمین گاہ۔ دارُالنّدوہ سے
ی اور جلوہ گاہِ رسالتؐ کی دیواروں کو چھونے لگی۔ زہرناک
واریں میانوں سے باہر نکلی جاتی تھیں۔ نفرت و انتقام کا
پاک خون آگ بھری آنکھوں سے باہر ٹپکا پڑتا تھا۔
ھروں کے پجاری آج رات تہیّہ کر کے آئے تھے کہ سچائی
ر امانت کے مجسّمے کو آج نیست و نابود ہی کر کے دم لیں گے

اب کیا ہو سکتا تھا؟

رسولؐ کے لئے زندہ سلامت نکل جانے کے تمام
روازے ایک ایک کر کے بند کر دیئے گئے تھے۔ چاروں
رف سے مکان انتہائی سفّاک قاتلوں کے نرغے میں تھا جہاں
وت اپنے لہو آشام جبڑے کھولے زندگی کا راستہ روکے
ھڑی تھی۔ کفر نے اپنی دانست میں آج کائنات
کے سب سے زیادہ روشن اور مقدس چراغ کو گل کر دینے کا پورا
ہتمام کر لیا تھا۔

لیکن کہاں! وہ بے خبر اور نادان دشمن یہ تو جانتے
ہی نہ تھے کہ ابھی ایک سب سے بڑا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ زندگی
کے ایوان کا وہ صدر دروازہ جس کی محرابوں پر آدمؑ سے
لے کر محمدؐ تک بے شمار پیغمبروں کی پیشانیوں کا نور اور جگمگاتی
ئی روحوں کی تابشیں کبھی نہ دھندلے پڑنے والے نقوش
شکل میں کندہ تھیں۔ وہ دروازہ جس کی اینٹ اینٹ پر
ازلی و ابدی کہانی نقش تھی۔

"موت اور زندگی کا واحد مالک صرف ایک ہے۔
— صرف ایک ہی جس نے نوحؑ کی کشتی طوفان سے
نکالی، جس نے یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ میں بھی مرنے
نہیں دیا۔ جس نے موسیٰؑ کے لئے دریا کا سینہ شق
کر دیا اور جس کے حیطۂ قدرت سے کائنات کا
ایک ذرّہ بھی باہر نہیں۔"

ے فنک ننگی تلواریں، خون آشام تیوریاں اور سفاک
بندیاں آنکھوں کے لئے لرزہ خیز ہو سکتی ہیں مگر اس
دل کے لئے ان کی کوئی حقیقت نہیں جس کی اتھاہ گہرائیوں
میں یہ عقیدہ جڑیں پھیلا چکا ہو کہ نفع و نقصان کی فیصلہ کن طاقت
صرف اور صرف ایک ہستی کے ہاتھ میں ہے اور وہی خدا
ہے —— ہاں وہی میرا اکیلا خدا ہے۔

خدا کی قسم! یہی تھا ایمان بالغیب کا وہ فولادی دائرہ
جس کو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا پر مکمل ترین اعتماد
کی معصوم شان سے کھولا اور خدا کا حکم پاتے ہی بے خوف و
خطر تلواروں کی دھار پر دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے
ہوئے باہر تشریف لے آئے۔ یہ عقیدہ اگر معاذ اللہ کوئی
بے بنیاد عقیدہ ہوتا تو سنگین حقائق سے ٹکرا کر پاش پاش
ہو گیا ہوتا یہ عقیدہ ایک حقیقت تھا جس کے آگے ساری
دنیا ایک خوابِ پریشاں سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ سچائی پوری
قوت سے سامنے آئی تو جھوٹ اور ظلم کی ساری طاقتیں
تہ و بالا ہو کر رہ گئیں۔ جو لوگ باہر جلادوں کی طرح بپھرے ہوئے
کھڑے تھے وہ زندہ لاشوں اور بے حس و حرکت پتھروں کی

بت بنے کھڑے رہ گئے۔ وہ جنہیں خدا نظر نہ آتا تھا خدا کا رسولؐ بھی ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے ان کی نظروں سے اوجھل رہا۔ اکڑے ہوئے سر بے جان لاشوں کی طرح کاندھوں پر ڈھلک گئے۔ آنکھیں خوفناک اونگھ میں پتھرا کر رہ گئیں۔ تلواریں اٹھانے والے بازو شل ہو گئے۔ کیسی بے بس تھی وہ طاقت جس کے ساتھ خدا نہ تھا! خدا کا رسولؐ کفر کی اس بیچارگی پر زیرِ لب مسکراتا ہوا اپنی راہ پر آگے بڑھ گیا۔

کتنی انقلابی اور کیسے درسِ عبرت و موعظت سے معمور تھی وہ ہولناک رات! — یہی تھی وہ رات جس کی متاعِ معرفت کا سب سے بڑا حصہ ابو قحافہ کا بیٹا لے گیا۔ وہ بیٹا جس کا نام لینے سے پہلے ملائکہ وضو کرتے ہیں۔ وہ بیٹا جو کئی مہینوں سے اس ساعتِ سعید کا منتظر تھا جب وہ اپنے گھر بار، اپنے رشتہ و پیوند اور اپنی پوری دنیا کو پیچھے چھوڑ کر اپنے محبوب، آقا، اپنے سردار محمدؐ ابن عبداللہ کے ساتھ خانہ ویرانی اور ترکِ وطن کی سنگلاخ راہوں میں چرکے اور زخم کھاتا چلا جائے۔ وہ بیٹا جس کا سارا وجود محبت اور طاعت کے سانچے میں ڈھل کر ایک سجدۂ مجسّم بن گیا تھا — جانتے ہیں آپ، کون تھا وہ؟ — ابوبکرؓ — ایکبار پھر کہنے دیجئے۔ کون تھا وہ؟ — ابو قحافہ کا بیٹا ابوبکرؓ! — وہ پیکرِ صدق و تصدیق جس پر صداقت اور طمانیت، سکینت اور ایقان قیامت تک ناز کرتے رہیں گے۔ محمدؐ کے بعد سب سے بڑا انسان۔ ثانی اثنین اذ ھما فی الغار۔

لیکن ابھی چند لمحے صبر کیجئے۔ ابھی تو پُر خطرات کے دامن میں وہ انسانِ کاملؐ اکیلا ہی چلا جا رہا ہے جیسے معلوم ہے کہ میں اکیلا ہو کر بھی اکیلا نہیں ہوں خدائے کائنات میرے ساتھ ساتھ ہے۔ اس کے چہرے پر اسوقت بھی خوف کی کوئی سلوٹ نہ تھی جب زمین اس کے قدموں کے لئے موت کے خطروں سے ہٹ کر تلوار کی دھار بن گئی تھی۔ خون کی گردش نہ تیز ہوئی تھی نہ سست پڑی تھی۔ جسم میں کوئی جھرجھری تک نہ آئی تھی۔ ایمان و یقین کے لامتناہی انوار اس سیاہ رات میں بھی اس کے اس چہرے سے پھوٹے پڑ رہے تھے جس کو دیکھ کر پہلی نظر میں بڑے بڑے کج کلاہ رعب و داب سے تھرتھرا اٹھنے پر مجبور ہو جاتے تھے مگر دوسری نظر میں جس کا جاں نواز تبسّم ایک بھکاری کو بھی اس طرح مانوس کر لیتا تھا جیسے وہ اپنے بہترین دوست کی پناہ میں آگیا ہو۔

قدم قدم پر اُجڑے ہوئے مکانات احتجاج اور صدمے کی خاموشی کی تصویر بن کر اس کی صداقت کے قدم چوم رہے تھے۔ مکینوں نے آخرت کے زبردست یقین پر یہ رنگینیوں سے بھرپور دنیا تج ڈالی تھی جو انسانی بستیوں سے گھائل کر کے اس لئے نکالے گئے تھے کہ وہ اپنے خالق و مالک کی پرستش کیوں کرنا چاہتے ہیں — پھر وہ نکو بوچ بوچ کر انسانوں پر ظلم کیوں نہیں ڈھاتے؟ بچوں کو زندہ کیوں نہیں گاڑتے اور غلاموں کو اپنے جیسا انسان کیوں سمجھتے ہیں؟ یہی تھے وہ لوگ جنھوں نے دوسروں کو لوٹنے کے مقابلے میں خدا کے نام پر خود لٹ جانا پسند کیا۔ یہی تھے وہ لوگ ایمان جن کا نفسِ ناطقہ بن گیا تھا جو لذیذ دسترخوان اور سرد و شیریں پانی کی جوئے رواں کے عین کنارے بھوک اور پیاس سے جان دے سکتے تھے، مگر اپنے شیشۂ ایمان میں ایک بال بھی گوارا کرنے کو تیار نہ تھے۔

ان دردناک مکانوں کے چاروں طرف دور دور تک وہ گھر پھیلتے چلے گئے تھے جہاں خدا کی زمین پر بسنے والے اپنے خدا کو بھول بیٹھے تھے۔ جن کو زندگی کے جال میں پھنس کر خود اپنی موت بھی یاد نہ رہی تھی، یہ تھے وہ مکانات جو مظلوموں کے اجڑے ہوئے گھروں سے بھی زیادہ دردناک تھے۔ یہاں مکان آباد تھے لیکن مکینوں کے سینے اجاڑ پڑے تھے۔ یہاں سے اگر زندگی کی کوئی آواز آرہی تھی تو وہ غفلت میں ڈوبے ہوئے خرّاٹوں کی آواز تھی یا پھر ان گنے چنے مظلوم مسلمانوں کی کراہیں جن کو ظلم و ستم کی آہنی زنجیروں میں جکڑ کر خدا کی راہ میں سب کچھ قربان کر دینے سے بھی معذور کر دیا گیا تھا۔

انسانیت کے ان خوفناک ویرانوں سے گذرتے ہوئے حضورؐ کے مقدس چہرے پر گہرے درد کی کسک ہویدا تھی۔ یہ دیکھ کر آپ کا دل خون ہو رہا تھا کہ جنھیں خدا نے جن انسانوں کو جگانے کے لئے بھیجا تھا ان کے گھروں سے

روح ودل کی کیسی تاریکی اُبل رہی ہے۔ جیسے آپ کو یہ خیال تک نہ تھا کہ اس وقت خون خواروں کی ٹولی خود میرے تعاقب میں ہے۔ جیسے آپ کو صرف یہ رنج کہ مجھ پر ظلم ڈھانے والے خود اپنی جان کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔

یکایک آپ کے اداس چہرے پر روحانی خوشی کا نور پھیل گیا۔ موت اور خودکشی کی اس تاریک دنیا میں دُور سے زندگی کی آواز بھی آ رہی تھی۔ ان ویران کھنڈروں میں سامنے ہی ایک ایسا مکان بھی تھا جس کے در و بام پر ایک تابندہ روح کے روشن سائے خنک چاندنی کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔

جہاں خدا کے ایک بندے کو نیندوں کے نرم وگرم بستر سے کہیں زیادہ پیاری وہ جائے نماز تھی جس پر سجدہ میں گرتے ہی بندگی کی پرسوز پیشانی اللہ کے قدموں کو چھو لیتی ہے۔ یہ حضرت ابوبکرؓ کا مکان تھا۔ یہی تمیم کا وہ خوش نصیب تر الاسود اگر جس نے خدا کی رضا اور حقیقت خریدنے کے لئے اپنا سب کچھ قیمت میں پیش کر دیا تھا۔ یہی تھا وہ مکان جس کی سمت میں آخری رسولؐ کے قدم اُٹھ رہے تھے۔ یہی تھا وہ بندۂ مومن جس کے نصیب میں رفاقتِ رسولؐ کے آخری اعزاز کا فیصلہ مشیت کا قلم ازل ہی میں لوحِ تقدیر پر ثبت کر چکا تھا۔ ایک بار پھر اس پیارے اور لذیذ نام کو دہرانے دیجئے — — ابو قحافہ کا بیٹا ابوبکرؓ ثانی اثنین۔

"نہیں! — مجھے تمہاری پناہ نہیں چاہئے۔ میرے لئے خدا اور رسولؐ کی پناہ کافی ہے۔"

یہ فولادی عزیمت اور بے انداز یقین کے سانچے میں ڈھلے ہوئے واضح الفاظ ابوبکرؓ کے لبوں پر اس وقت اُبھرے جب قارہ کا سربرآوردہ کافر ابن الدغنہ یہ صریح دھمکی دے رہا تھا کہ تم زمین والوں کو خفا کر کے آسمان والے کو خوش کرنا چاہو گے تو میں اپنی امان تمہارے سر سے اُٹھا لوں گا۔ (۳۱) کے جواب (۳۰) مکہ ص ۹ ہے

جو الفاظ زمین و آسمان کے درمیان گونجے تھے وہ کوئی کھوکھلا جذباتی نعرہ نہیں تھے۔ غیرتِ بندگی نے ان الفاظ میں پورا خونِ حیات نچوڑ کر رکھ دیا تھا اور دنیا کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ خوفِ خدا اور خوفِ دنیا آگ اور پانی کی طرح کبھی یکجا نہیں ہو سکتے۔ حقیقت پسندی کا یہ لرزہ خیز اعلان الفاظ کے اندر نہ سما سکا تو ٹھوس تاریخی واقعات کے سیلِ رواں میں ڈھل گیا، یہ اُسی انقلاب انگیز رات کی بات ہے جب رسالت کا "سراج منیر" کفر و شرک اور خوف و خطر کی گھٹاؤں کو چیرتا ہوا نکل رہا تھا۔

جب آنحضرتؐ نے اس خطرناک رات کو حضرت ابوبکرؓ کے گھر جا کر یہ انکشاف کیا تھا کہ "آج رات میں خدا کے حکم سے مکہ سے جدا ہو رہا ہوں" تو آنکھیں صاف دیکھ رہی تھیں کہ حضورؐ کے تعاقب میں کفر و شرک کی کیسی کیسی بلائیں چلی آ رہی ہیں۔ لیکن ایک پل فکر دنیا پر ضائع کئے بغیر حضرت ابوبکرؓ نے گڑگڑا کر التجا پیش کی تھی "اے خدا کے رسولؐ! — مجھے بھی ہم رکابی کی سعادت عطا ہو" — وہ اس راہِ پُر خار پر وجد کرتے ہوئے چلے جو ان کو ساری خدائی سے دُور خدا کی طرف لے جا رہی تھی۔ آخرت کا گھر بسانے کے لئے وہ گھر بار چھوڑ رہے تھے۔ خدا کے رسولؐ کے مقابلے میں بیوی بچوں کو خیرباد کہہ رہے تھے۔ ایمان کے لئے دولتِ دنیا لٹا رہے تھے — ساری دنیا سے دامن جھٹک کر اپنی جان ہتھیلی پر لئے ہوئے وہ اس شخصؐ کے پیچھے ہو لئے تھے جو پوری قوت سے یقین دلا رہا تھا کہ "اے خدا کے بندو! میرے پیچھے آؤ تو خدا سے جا ملو گے۔"

غارِ ثور کے دہانے پر وہ دونوں اپنے اپنے اونٹوں سے اُترے۔ غار اپنی ہولناکیوں کے ساتھ منہ کھولے ہوئے تھا۔ لیکن وہ دونوں اس غار میں داخل ہو گئے تھے جن کو خوب یقین تھا کہ ہمارا خدا ہر جگہ ہے اور جو خدا ہے وہاں کوئی خوف نہیں۔ خدا اور خدا کے رسول [illegible] جاں نثار کہ ... الاستبانہ آگے بڑھا اور

۔۔ بھی با غار میں کود پڑا۔ اندر سے یہ والہانہ آواز آ رہی تھی "میرے ماں باپ آپ پر صدقے !۔ ذرا ٹھہریئے ! ۔۔ میں اس غار کو درست کر دوں !" فرطِ شوق میں اس نے جیب و گریباں کی دھجیاں کر لیں۔ ان دھجیوں سے غار کے ایک ایک سوراخ کو بند کیا اور جب خوب مطمئن ہو گیا کہ حضور کی جانِ گرامی کو اب کسی اندرونی گزند کا اندیشہ نہیں تو محض خدا کے در کا بھکاری جسم پر دھجیاں لگائے ہوئے دیدہ و دل میں خدا کی اس انمول امانت کو سمائے غار میں داخل ہوا۔

ذرا ٹھہریئے ۔۔ کیا ہم جیب و داماں کی ان دھجیوں کی قیمت کا کوئی اندازہ لگا سکتے ہیں جو عقیدت اور جاں نثاری کے پیکر نے غار کے سوراخوں میں اس لئے بھر دی تھیں کہ کوئی موذی جانور اس کے جان سے زیادہ عزیز آقا کو ایذا نہ پہنچا سکے ۔۔ قیمت ! العظمۃ للہ۔ سورج کی ساری کرنیں مل کر بھی تو فقط ایک دھاگے کا مول نہیں بن سکینگی۔ آسمانوں کے تمام ستارے، ساری کہکشائیں، نور و ضیا کے سارے مخازن ایک پلڑے میں رکھ دو اور پھر غارِ ثور والے ابوبکرؓ کے دامن کی ایک دھجی دوسرے پلڑے میں رکھو۔ تم دیکھو گے دوسرا ہی پلڑا جھکا ہوا ہے۔

تو یہی تھا وہ شخص جس کے بیوی بچے ایک خوفناک آتشِ انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھرے ہوئے دور مکے میں پڑے تھے نہ صرف بیوی بچے بلکہ اس کی عمر بھر کی پونجی جو لاٹھی کے دہانے پہ ڈھیر تھی، لیکن یہی تھا وہ شخص جس کے دل میں ٹھیک اس وقت بھی خدا اور خدا کے رسولؐ کے سوا کسی کے لئے کوئی جگہ نہ تھی جب دنیا بھر کی قیمتی چیزیں اسکے دل کا دروازہ پیٹ رہی تھیں۔ جس کے زانو کو محبوبِ خدا کا تکیہ بننے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ اللہ اللہ۔ وہ خدا کی سب سے قیمتی امانت جو آج ساری دنیا سے چھین لی گئی تھی وہی ابوبکرؓ کے دامن میں ڈال دی گئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے دیکھا کہ ان کے زانو پر حضورؐ کی شکل میں خدا کی قدرت بے حجاب ہو گئی ہے ۔۔ بے اختیار ان کی روح پکار اٹھی "ہاں میں نے گواہی دی تھی کہ اے محمدؐ ! آپ یقیناً خدا کے آخری رسول ہیں ۔۔ اور اے غارِ ثور کی دیوارو ! سن لو کہ ایک بار پھر یہی گواہی دینے کے لئے میرا دل تڑپ کر میرے ہونٹوں پہ آ گیا ہے ۔۔ ہاں خدا کی قسم ! میرے لئے خدا اور رسول کی پناہ کافی ہے ۔۔"

شہادتِ حق کی ادھر یہ پکار اٹھی اور ادھر خدا کی اٹل سنت کے مطابق ایک زبردست قربانی نے منہ کھولا۔ غار کی چھلنی دیواروں میں جو ایک سوراخ باقی رہ گیا تھا اسی کے اندر سے ایک سیاہ ناگ کا پھن نمودار ہوا، لیکن جان لیوا خطر کی صورت دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ کا جذبۂ ایثار کچھ اور جاگ اٹھا۔ وہ جسم و جاں جو تھکن سے چور اعضاء کے ساتھ رسولِ خدا کو راحت پہنچا کر خوشی اور کیف سے سرشار ہو رہے تھے جسم و جاں کی قربانی کے لئے بے قرار ہو گئے۔ یہ بات ان کیلئے موت سے زیادہ شاق تھی کہ رسولؐ خدا کی راحت میں خلل پڑ جائے۔ اس لئے ذرا سی حرکت کئے بغیر انھوں نے اپنے پاؤں سے اس خوفناک بِل کا منہ بند کر دیا جس سے ناگ سر نکال رہا تھا۔ آزمائش کی ایمان افروزیاں تیز سے تیز تر ہوئیں۔ سانپ نے زہر چکاں دانت حضرت ابوبکرؓ کے تلوے میں گڑو دیئے اور سارے خون کو زہر کی کربناک لہروں میں بدل دیا۔ لیکن محبت اور فرض کے محاذ پر جو قدم پہاڑ کی طرح جم گیا تھا وہ ٹس سے مس کیسے ہوتا۔ زہر کی آتشیں لہریں پورے جسم کو کانٹوں اور شعلوں پر گھسیٹ رہی تھیں لیکن ایمان کے تقاضے پھولوں کی سیج بن کر رہ گئے تھے۔ غیرتِ ایمانی سے ہونٹ سل گئے تھے ایک سسکی بھی تو نہ نکلی۔ ایک جھرجھری بھی تو نہ آئی صرف ایک آنسو ٹپکا ۔۔ ہائے وہ قیمتی آنسو جس کی تقدیر میں یہ اعزاز لکھا تھا کہ وہ خدا کے رسولؐ کے مقدس رخسار کو چومے اس پر پھیل جائے۔ سارے سمندر مل کر بھی زور لگائیں تو ایسا بیش بہا موتی کبھی پیدا نہ کر سکیں گے۔

اس اشک بے اختیار کے جواب میں رحمتِ خداوندی کو جوش آ گیا۔ حضورؐ تیزی سے چونک کر اٹھے اور ابوبکرؓ کی اشک آلود آنکھوں سے وہ آنکھیں چار ہوئیں جن میں انسانیت کی حلاوت اور خدا کی رحمت ستارہ بن کر جگمگا یا

کرتی تھی۔

"کیا بات ہے — اے ابوبکرؓ؟" انسانیت کے درد سے انتہائی بے قرار آواز حضورؐ کے ہونٹوں پر طلوع ہوئی تو ایک ساعت کے لئے ابوبکرؓ یہ بھی بھول گئے کہ وہ کس کرب سے دوچار ہیں۔

"کچھ نہیں اے خدا کے رسولؐ" عقیدت و شوق سے لبریز اور درد سے کانپتی ہوئی آواز میں حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا "میرے پاؤں میں سانپ نے ڈس لیا ہے"۔ — آواز درد کے مارے کانپ رہی تھی لیکن اس میں شکایت نہیں تھی۔ مایوسی نہیں تھی — حضورؐ نے فوراً اپنا لعاب مبارک اس جگہ لگا دیا جہاں سیاہ ناگ نے ڈس لیا تھا اور فوراً زہر کا اثر کافور ہو گیا۔ یہ اس ہستی کے لعاب دہن کا خداداد اعجاز تھا جس کے منہ سے وحی کے پھول جھڑتے اور پیغام خداوندی کے انوار ٹپکتے تھے۔

جسمانی آزمائش کے ایمان افروز خاتمہ پر ابھی حضرت ابوبکرؓ کی روح سجدۂ شکر ہی میں پڑی تھی کہ غار کے دہانے پر ایک اس سے بھی بڑی ایمانی آزمائش کی جھلک نظر آنے لگی، انھوں نے دیکھا کہ حضورؐ کے جانی دشمن غار کے کنارے تک آپہنچے ہیں۔ سانپ کے پھن مارنے کے بعد بھی جو انسان اپنی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا سکا ہو وہ خدا کے رسولؐ کو خطرہ کی زد میں دیکھ کر اس بیچارگی کے احساس سے نیم جاں ہو گیا کہ اس خطرے کو میری جان کی قربانی بھی نہیں ٹال سکتی۔ انھوں نے انتہائی تشویشناک نظریں حضورؐ کی طرف اٹھائیں اور غار کے دہانے پر نظر آنے والے قدموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی "اب ۔۔۔ کیا ۔۔ ہوگا ۔۔۔ اے خدا کے رسولؐ؟ یہ لوگ اگر ذرا جھک کر دیکھیں گے تو ہم صاف نظر آجائیں گے"۔

کتنی حسین تھی وہ "بے خوفی" جو خدا اور خدا کے رسولؐ کے قدموں پر جان و مال اور اہل و عیال کو قربان کر دینے کے جذبۂ بے اختیار نے اس انسان کے چہرے پر ایمان کا نور بنا کر پھیلا دی تھی — اور کیا شاندار تھا وہ "خوف" جو خدا کے رسولؐ کی جان کو بے پناہ خطرے میں دیکھ کر اس کے خون کی گردش اور دل کی دھڑکنوں کو نڈھال کئے دے رہا تھا۔ لیکن ٹھیک اس وقت جب ابوبکرؓ جیسے بندۂ مومن کی نظر انسانی بیچارگی کی طرف گئی تھی خدا کا رسولؐ صرف خدا اور خدا کی قدرت کی طرف آنکھیں اٹھائے ہوئے تھا۔ حضورؐ نے بھی اس خطرہ کو دیکھا اور ابوبکرؓ کے الفاظ سُنے — حضورؐ بھی یہ سمجھ رہے تھے کہ جو خطرہ سر پر آگیا ہے وہ غار میں داخل ہو جائے تو اس بند غار میں نہ مقابلہ کا موقعہ ہے اور نہ فرار کی کوئی راہ۔ لیکن انھیں یقین تھا کہ میں اس وقت بھی اس قادر مطلق کے سایۂ رحمت میں ہوں جس کی مٹھی میں ساری کائنات ایک ذرۂ بے مقدار سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔

"فکر مت کرو!" حضورؐ نے انتہائی سکون و استقلال کی شان سے تسلی دی "فکر مت کرو! — خدا ہمارے ساتھ ہے" وہ ہونٹ جن کے لعاب سے سیاہ ناگ کا زہر ہلاہل پانی پانی ہو گیا تھا ان ہونٹوں سے یہ الفاظ نکلے تھے یہ الفاظ ہر خوف و خطر کے احساس تک تریاق بنکر پہنچے اور فی الفور ابوبکرؓ نے محسوس کیا کہ غار کی بوسیدہ دیواریں آہن و فولاد کے قلعہ میں ڈھل گئیں جہاں کوئی بڑے سے بڑا خطرہ پر نہیں مار سکتا۔ ادھر ان کی روح سے وہی پکار اٹھی کہ "میرے لئے خدا اور خدا کے رسولؐ کی پناہ کافی ہے" اور ادھر انھوں نے دیکھا کہ غار کے کھلے ہوئے منہ تک آپہنچنے والے قدم پلٹے اور ان کی چاپ دشت و صحرا میں گرد کی طرح بکھر کر گم ہو گئی۔ وہ قدم جو پیغمبرؐ کی تلاش میں جنگل جنگل کی خاک چھان چکے تھے۔ جب خدا نے ان کو روکا تو "ایک نظر" کا فاصلہ طے نہ کر سکے! ابوبکرؓ یہ دیکھ رہے تھے اور وجد کر رہے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ حضورؐ کی پیغمبرانہ شخصیت اپنی مکمل ترین رعنائیوں کے ساتھ ان کی نظروں — تنہا ان کی نظروں کے سامنے جلوہ افروز ہے — وہ انسان کامل کو ان لامتناہی بلندیوں پر دیکھ رہے ہیں جہاں انسان اور خدا کے

نیاں سے زمین و آسمان کی ہر شے ہٹ گئی تھی اور پیغمبرؐ کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ اسباب و علل کے تمام پردے ہٹا کر خدا کی زبردست قدرت اس غار میں بے حجاب ہو گئی ہے۔

تین دن تک سچ مچ خدا کے سائے میں بسر کرنے کے بعد حضرت ابو بکرؓ آنحضرتؐ کے نقوش پا چومتے ہوئے غارِ ثور سے باہر نکلے تو انھیں محسوس ہوا کہ یہ تنگ و تاریک غار نہیں بلکہ ایک ناپیدا کنار دنیا تھی جہاں قدم قدم پر خدا کی قدرت اور انسان کی بندگی کھلی آنکھوں سے نظر آتی رہی تھی۔ وہ غار میں ایمان بالغیب لے کر گئے تھے لیکن باہر آئے تو ایمان بالغیب صدیوں کا فاصلہ تین دن میں طے کر کے عین الیقین اور مشاہدے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جس انسانؐ کو انھوں نے روح و دل کی شہادت سے نبی مانا تھا اس غار میں ان کی آنکھیں اس نبوت کا سراپا دیکھ رہی تھیں۔ غار سے باہر انھوں نے جس خدا کا یقین کیا تھا غار میں وہ خدا خود اپنا یقین دلاتے ہوئے اپنی لامتناہی قدرت کے چہرے سے حجاب پر حجاب اٹھا رہا تھا۔ لیکن شاید اس عرفانِ حق کی تکمیل میں ابھی ایک آنچ کی کسر باقی تھی ـــ ابھی ایک ایسا واقعہ بھی پیش آنا باقی تھا جہاں مجرم انسان کی طاقت اور خدائی طاقت کے درمیان غار کی دیواریں اور دنیا کی کوئی ظاہری رکاوٹ بھی حائل نہ ہو۔ پس منظر میں گرد و غبار کا بادل اٹھا اور ایک زہرناک تلوار کی بجلی چمک کر سر پر آ گئی۔ قریش کا ایک جنگ آزمودہ ہرکارہ سراقہ بن جعشم کے گھوڑے کی ٹاپوں سے زمین دہلنے لگی ـــ یہی تھا وہ بے رحم دشمن جسے سو اونٹوں کا حقیر انعام ایک پیغمبرؐ کا مقدس سر حاصل کرنے کی دھن سے پاگل کئے دے رہا تھا۔ خطرے کی زبردست بجلی سر پر ٹوٹ پڑنا چاہتی تھی اور پیغمبرؐ کی جانِ گرامی اس بے پناہ خطرے کی ٹھیک زد میں آ چکی۔ حبِ رسولؐ کے متوالے کو ایک بار پھر اس بیچارگی نے تڑپایا کہ میں خدا کی عظیم امانت کو بچانے کی کوشش میں بالکل بے بس ہوا جا رہا ہوں۔

"اے خدا کے رسولؐ!" وہ جاں نثاری کی حسرت میں پکار اٹھے "دشمن سر پر آ پہنچا ہے۔۔۔"

لیکن خدا کے رسولؐ کو خطرہ تو کیا خطرے کا احساس بھی گوارا نہ ہوا ـــ سکونِ دل نے ایمان و یقین کے جلال کی شکل اختیار کر لی اور فرمایا "اے ابو بکرؓ! تو کیا سمجھ رہا ہے ان دو کو جن کا تیسرا اللہ ہے؟" ـــ قدم قدم پر نبیؐ کی تصدیق کرنے والے نے اسی دم نبیؐ کے اس اشارے کی تصدیق کی اور کامل سکون و اطمینان کے عالم میں ان کی نظر انسانی ساز و سامان سے ہٹ کر خدا کی قدرت پر مرکوز ہو گئی۔ انھوں نے دیکھا کہ ادھر خدا کے رسولؐ نے اپنے خدا کے سامنے دعا کے لئے ہاتھ پھیلائے اور ادھر زمین شق ہوئی اور سراقہ کے گھوڑے کے دونوں اگلے پاؤں اس کے اندر دھنستے چلے گئے منھ کے بل گرنے والا کافر اٹھا ـــ اٹھ کر چلا اور پھر گرا ـــ آسمان والے کا اشارہ پاتے ہی زمین نے اس "مجرم" کو آگے بڑھنے کے لئے راہ دینے سے انکار کر دیا تھا جو بہت جلد "اعترافِ جرم" اور پھر اعترافِ حق تک پہنچنے والا تھا۔ بار بار منہ کے بل گرنے والا سراقہ اٹھا اور ہاتھ جوڑ کر جان کی امان مانگی۔ جو شخص ظاہری طاقت کے بل پر جان لینے کے لئے آیا تھا وہ خدا کی طاقت سے سہما ہوا خدا کے رسولؐ سے زندگی کی بھیک دامن میں لئے واپس جا رہا تھا۔ دل سے خدا کو قادرِ مطلق ماننے والے بندۂ مومن نے آنکھوں سے دیکھا کہ خدا قادرِ مطلق ہے جس کے ایک اشارے پر سب کچھ ہو سکتا ہے وہ سب کچھ جس کا تصور بھی آدمی پہلے سے نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد یہ قافلہ سوئے یثرب روانہ ہوا۔

"ہائے یہ قافلہ!" حضرت ابو بکرؓ کا غلام عامر بن فہیرہ سوچ رہا تھا جس کو حضرت ابو بکرؓ نے راہ دکھانے کے لئے اپنے اونٹ پر پیچھے بٹھا لیا تھا "ہائے یہ نرالا قافلہ جس میں دو انسان اور ایک خدا ہے! ـــ دنیا پوری قوت کے ساتھ اس قافلہ کا پیچھا کر رہی ہے لیکن اس کے نزدیک پہنچ کر بھی اس کو چھو نہیں پاتی ـــ

اور یہ قافلہ خدا کی قدرت و رحمت کی سیکڑوں نشانیوں سے گذرتا ہوا — نفرت و انتقام کی شیطانی طاقتوں سے بچتا ہوا ۱۲ ربیع الاوّل سنہ نبوی میں یثرب سے کچھ فاصلے پر قبا کے امن میں پہنچا تو حق و صداقت کے پروانے شمع رسالتؐ پر نثار ہونے لگے۔ یہ تھے وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسولؐ کے قدموں پر جانیں نثار کرنے کی پُرسوز تمنا پر سر دھن رہے تھے۔ جنھوں نے خدا کے لئے ساری دنیا سے جنگ مول لی تھی۔ اپنی ساری دنیا داؤ پر لگادی تھی۔ لیکن ان پروانوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور سب سے زیادہ سپردگی و ایثار کی تپش سے سلگتا ہوا پروانہ وہی شخص تھا جو ہجرت کی پُرخطر گھاٹیوں میں رسالتؐ کے قدموں کو خون و دل و جگر سے نکھارتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا اور جسکی زندگی کا ایک ایک سانس رسولِ خدا کی حفاظت میں سینہ سپر رہنے پر صرف ہوتا آیا تھا وہ یہاں بھی چادر تھامے ہوئے حضورؐ پر سایہ کئے ہوئے ساری دنیا سے منھ پھیر کر محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کے حسین چہرے کو والہانہ سپردگی کے ناقابل بیان عالم میں تک رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ تنہا اس "ایک چہرے" کو دیکھ دیکھ کر جی سکتا ہے — جیسے اس چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ ساری دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے — جیسے اسے خود اپنے وجود کی طرف بھی ایک نظر اٹھانے کی فرصت نہیں رہتی۔

اور — آج جب وہ چہرہ نظروں سے اوجھل ہے ہماری نظریں ایک بار پھر دنیا اور متاع دنیا کی طرف جم کر رہ گئی ہیں۔ اسلام کو خطرات میں گھرا ہوا چھوڑ کر ہم لوگ اپنے اپنے گھروں کی پناہ گاہوں میں چھپ کر جان بچانے کی کوششیں کر رہے ہیں ہمیں تمام مادّی وسائل سے امیدیں ہیں لیکن اسی واحد ذات سے کوئی امید نہیں جو تمام امیدوں کا حقیقی ملجا و ماویٰ ہے کہنے کو دعائیں اسی سے کرتے ہیں لیکن عمل تمام تر ایسا ہی ہے جو اس کی رحمت و نصرت کو نہیں غیظ و غضب ہی کو آوازیں دیتا رہتا ہے۔ خدا کی پناہ! کہاں وہ اسلام جو گوشت پوست کے انسانوں کو ایک سجدۂ مسلسل میں ڈھال گیا تھا اور کہاں یہ ہمارا اسلام جو پیہم بغاوت اور نافرمانیوں کی ایک غیر مختتم کہانی

فکر اور خوف کا
دل پر گہرا
اثر ہوتا
ہے
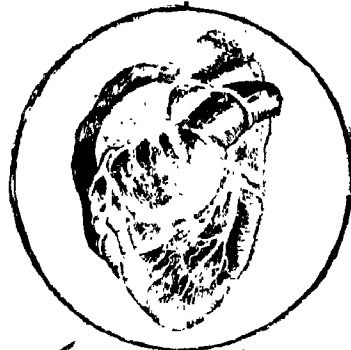
جس سے خون کی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں

صافی

نظامِ ہضمی کے عمل
کو درست کرتی ہے
خون کو صاف کرتی
ہے اور شفاف خون
پیدا کر کے چہرے پر
تازگی لاتی ہے۔

دہلی — کانپور — پٹنہ

از:- مولانا امین احسن اصلاحی

اسلامی قومیت کے عوامل

حسب وعدہ مولانا امین احسن اصلاحی کا ۱۹۴۶ء والا مضمون پورا کا پورا ہدیۂ ناظرین ہے۔ تجلّی کی تنگ دامانی گو کہ اتنی طویل نقل کی متحمل نہ تھی لیکن دو وجہ سے اس کو برداشت کیا جا رہا ہے۔ ایک یوں کہ ہماری نگاہ میں یہ مضمون قومیت کے موضوع پر ایک مستقیم اور صائب نقطۂ نظر کا حامل ہے۔ میثاق کی اشاعت زیادہ نہیں ہے۔ تین سال پہلے تو وہ اور بھی کم ہو گی۔ لہذا تجلّی میں نقل کا فائدہ یہ ہو گا کہ ایک اچھی چیز دور دور تک پہنچ جائے گی۔

دوسرے یوں کہ جمال عبدالناصر کے نعرۂ قومیت کو مولانا آج جو مقام عبادت عطا فرما رہے ہیں اس کی حیثیت و قیمت کا اندازہ خود انھی کی بھرپور تصریحات سے کرنے میں ناظرین کو ذرا بھی تشنگی باقی نہ رہ جائے۔ کہیں کہیں ہم نے بعض فقروں پر لائن کھینچ دی ہے۔ اس سے ان قارئین کی رہنمائی مقصود ہے جن کا ذہن طرّار نہیں ہے۔ طرار ذہن والوں کیلئے تو مولانا کا پورا مضمون ہی منھ سے بول رہا ہے کہ آج کا نظریۂ قومیت ناگزیر مفاسد کا ایسا پلندہ ہے جسے چٹکی بجاتے قندیل نور میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

اس مضمون کو پڑھ لیجئے پھر ہم بتائیں گے کہ وہ نفسیاتی تزویل سی کیا ہے جس کے تحت مولانا اصلاحی آج ناصری نعرۂ قومیت کے لب و عارض پر سرخی اور غازہ لگانے کی زحمت فرما رہے ہیں۔ (عامر عثمانی)

علمائے سیاست، ریاست کا تدریجی ارتقاء اس طرح بیان کرتے ہیں کہ خاندانوں کے اجتماع سے معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ معاشرہ اپنے ایک خاص دور میں قومیت کا روپ دھارن کرتا ہے اور جب قومیت اپنے سیاسی شعور کے لحاظ سے اس قدر ترقی کر جاتی ہے کہ اس کے تمام افراد ایک بالاتر اقتدار کی اطاعت کرنے لگتے ہیں تو ریاست وجود میں آ جاتی ہے۔

اس نظریے کی روشنی میں یہ بات بالکل صاف نظر آتی ہے کہ اگر کوئی شخص ریاست کے اوصاف اور اسکی خصوصیات سمجھنا چاہتا ہے تو اسے اس سے پہلے معاشرہ اور قومیت کی حقیقت اور ان کے اوصاف و خصوصیات پر غور کرنا اور ان کو سمجھنا ہو گا۔ اگر یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جائے کہ قومیت کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں اس کے مختلف اجزاء میں کن چیزوں سے اشتراک و اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ کیا محرکات ہیں جو ان میں باہم ربط و اتصال کا جذبہ پیدا کرتے اور ایکدوسرے کے لئے قربانی اور ایثار پر ابھارتے ہیں تو اس سے خود ریاست کی حقیقت اور اس کے اجزائے ترکیبی میں تعلق و اشتراک کی نوعیت اچھی طرح سمجھ میں آ سکے گی۔ قومیت اور ریاست میں وہی نسبت ہے جو نسبت بنیاد اور عمارت میں ہے۔ اگر بنیاد کا پورا نقشہ واضح ہو تو اصل عمارت کی نوعیت سمجھ لینے میں کوئی زحمت پیش نہیں آئے گی بالخصوص عمارت کے استحکام اور اسکی حمایت کے نقطۂ نظر سے اگر

[illegible] کی اصل چیز بنیاد ہی ہے لیکن
قومیت۔ اسی وجہ سے پہلے ہم یہ بتائیں گے کہ قومیت کن
عوامل کے اشتراک سے پیدا ہوتی ہے، ضعف اور قوت کے
لحاظ سے ان کے کیا درجے ہیں، ان عوامل سے متعلق جدید اور
قدیم نظریات میں کیا اختلاف ہے۔ پھر اس امر پر غور کریں گے
کہ ایک عام قومیت اور ایک اسلامی قومیت میں کیا فرق
ہے اور ان دونوں سے پیدا ہونے والی ریاستوں کے مزاج
اور ان کے اطوار پر اس فرق کے کیا اثرات مترتب ہوتے
ہیں؟

قومیت کے عوامل

قومیت چند چیزوں کے اشتراک سے وجود میں آتی ہے
نسل، زبان، جغرافی یک جائی، روایات اور مذہب۔
انسانوں کے کسی گروہ میں اگر یہ چیزیں مشترک ہوں
اور اس کے افراد میں ان کے اشتراک کا شعور بھی زندہ ہو
تو قدرتی طور پر وہ ایک دوسرے کی ہمدردی و حمایت
کرتے ہیں، ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کو
سمجھتے ہیں، رنج و راحت اور دکھ سکھ میں اپنے کو ایکدوسرے
کا شریک خیال کرتے ہیں اور زندگی کے مسائل پر ایک ہی
طرز پر سوچتے ہیں۔
نسل کا اشتراک حمایت و حمیت کا سب سے بڑا محرک ہے۔
زبان کا اشتراک ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے میں سب
سے بڑا معاون ہے۔ جغرافی یک جائی دوسروں کے مقابل
میں اپنے تحفظ اور مدافعت کا احساس پیدا کرنے کے لئے
سب سے زیادہ مؤثر عامل ہے اور تہذیب و روایات کا اشتراک
طرز فکر میں ہم آہنگی و ہم رنگی پیدا کرنے کیلئے سب سے زیادہ
کارگر ہے۔
جہاں اشتراک کے یہ تمام عوامل موجود ہوں وہاں اتحاد و
ارتباط کا جذبہ اور حمیت و حمایت کا ولولہ پایا جانا ایک
بالکل فطری چیز ہے۔ یہ جذبہ ارتباط و اتحاد پیدا کرنے کے علاوہ
دوسروں کے مقابل میں اپنے ایک علیحدہ تشخص کا احساس
اور تفوق و بالاتری کا ایک شعور بھی ابھارتا ہے۔ یہاں تک
کہ جن لوگوں کے اندر اشتراک کے یہ سارے پہلو جمع ہو جاتے
ہیں ان کے اندر نہایت تیز و تند خواہش اس بات کی بھی
پیدا ہو جاتی ہے کہ ان کے سارے معاملات خود ان کے
اپنے ہاتھ میں ہوں، اپنے تمام امر و نہی کے مالک وہ خود
ہوں، کسی غیر کو یہ حق حاصل نہ ہو کہ وہ اُن کے معاملات میں
کسی قسم کی دخل اندازی کر سکے۔
اس اشتراک کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ جہاں یہ پایا
جائے وہاں سرے سے کوئی اختلاف یا تصادم واقع ہی نہ ہو
شخصی اور خاندانی اغراض و مصالح میں برابر ٹکراؤ ہوتا
رہتا ہے، لیکن ایک بالاتر اقتدار اس طرح کی ساری آویزشوں
کو رفع کرتا رہتا ہے اور لوگ اس کے فیصلوں کے آگے
سر تسلیم خم کرتے رہتے ہیں۔ سر تسلیم خم کرنا صرف اس وجہ سے
نہیں ہوا کرتا کہ ایک قاہر اقتدار کے آگے کسی کے لئے دم
مارنے کی گنجائش نہیں ہوتی بلکہ اس میں بڑا دخل اس شعور
کو بھی ہوتا ہے کہ قومیت کے بڑے فوائد سے متمتع ہوتے
رہنے کے لئے ناگزیر ہے کہ قومیت کا ہر جزو ایثار و انکسار
کے اصول پر اپنے بعض چھوٹے فوائد کو قربان کرنے کے
لئے تیار رہے۔ اگر ہر شخص اپنے چھوٹے مفادات کی
قربانی پر راضی نہ ہو گا تو بالآخر اسے بڑے مفادات
سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ یہ شعور ایک خالص سیاسی
شعور ہے اور درحقیقت یہی شعور ہے جو کسی قومیت کو
ایک حقیقی وجود سیاسی کی حیثیت بخشتا ہے۔

قومیت کا نیا نظریہ

دنیا میں ابتداء سے مذکورہ عوامل ہی قومیت کے
اصلی عوامل کی حیثیت سے مسلم مانے گئے ہیں اور اس میں
شبہ نہیں ہے کہ یہ عوامل بالکل فطری اور قدرتی ہیں،
لیکن سائنس کی ترقیوں نے ان عوامل میں سے اکثر کو
شہر بدر کر کے اب ساری اہمیت صرف جغرافی حدود
یا دوسرے الفاظ میں وطن کو دیدی ہے۔ وطن کو ایک ہم

عامل کی حیثیت تو ابتداء سے حاصل رہی ہے، لیکن اب تو اصلی عامل ہی یہی ہے۔

اگر اس عامل کے ساتھ دوسرے عوامل بھی موجود رہیں تو بہتر لیکن اگر یہ موجود ہے اور دوسرے عوامل موجود نہیں ہیں تو اسی کو اصل قرار دے کر دوسرے عوامل اب اسی سے مصنوعی طور پر پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

وطن کے ایک فطری عامل قومیت ہونے سے تو جیسا کہ عرض کیا گیا انکار کی گنجائش نہیں ہے، لیکن جس نوعیت سے اب اس کی اہمیت تسلیم کی جانے لگی ہے وہ فطرت کے تقاضوں سے زیادہ ضرورت کی ایجاد ہے۔ سائنس کی ترقیوں نے اب قوموں میں تحفظ اور مدافعت کے احساس کو دوسرے تمام احساسات پر غالب کر دیا ہے اس وجہ سے قومیں اب جغرافی حدود کو بہت زیادہ اہمیت دینے لگی ہیں۔ اب نسل، زبان اور روایات کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی جتنی اہمیت دریاؤں، سمندروں، پہاڑوں اور دوسرے قدرتی دفاعی حصارات کو دی جاتی ہے۔ پہلے قومیتیں عموماً زمین کے اتنے ہی خطہ پر قناعت کرتی تھیں جتنے کو وہ اپنی نسل، اپنی تہذیب اور اپنی روایات کا گہوارہ سمجھتی تھیں، اس دائرے سے آگے بڑھنے کی خواہش صرف وہی قومیتیں کرتی تھیں جو غیر معمولی طور پر حوصلہ مند ہوتی تھیں اور جو دوسروں کو اپنا محکوم بنانے کا عزم داعیہ رکھتی تھیں۔ لیکن اب ہر قومیت اپنے وطن کے حدود، اقتصادی اور دفاعی نقطۂ نظر سے متعین کرتی ہے اور اس پورے دائرے پر وہ بہر حال قابض رہنا چاہتی ہے اگرچہ خود اس کا اپنا وجود اس کے وطن کی قبا سے چھوٹا ہو۔ وہ بجائے اس کے کہ اپنی قامت کے لحاظ سے اپنی قبا بنائے، کوشش یہ کرتی ہے کہ کھینچ تان کر کسی طرح اپنے وجود کو اس قبا کے مناسب بنا لے۔ اپنے آپ کو مصنوعی طور پر بڑھانے کا واحد طریقہ جو وہ اختیار کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اپنے وطن کے جو حدود وہ قرار دے لیتی ہے اس کے اندر جو دوسری قومیتیں ہوتی ہیں ان کو اپنے اندر ضم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ان قومیتوں کے اندر خود ان کی نسل، خود ان کی زبان اور خود ان کے مذہب یا روایات کے لئے جو احساسات پائے جاتے ہیں ان کو وہ دباتی ہے اور وطنی قومیت کے نظریہ کے تحت خود اپنی زبان اپنے مذہب، اپنی روایات اور اپنے اشخاص و رجال کے عزت و احترام کو ان کے ذہنوں پر مسلط کرتی ہے تاکہ وہ ظاہر و باطن دونوں میں غالب قومیت کے ہم رنگ ہو جائیں۔

مذکورہ عوامل کے نقائص

مذکورہ عوامل کے معروف عوامل قومیت ہونے سے تو جیسا کہ عرض کیا گیا انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن محض ان عوامل سے جو قومیت وجود میں آتی ہے اس کے مزاج میں بعض خرابیاں لازماً موجود ہوتی ہیں۔

پہلی خرابی تو اس کے اندر یہ ہوتی ہے کہ اس طرح کی قومیت نہایت تنگ نظر ہوتی ہے۔ ہر معاملہ میں اس کے زاویۂ نگاہ پر نسل اور قومی رنگ غالب ہوتا ہے۔ اس کی ساری توجہ کا مرکز پوری نسل انسانی میں سے صرف ایک حصہ ہوتا ہے اور اسی کو وہ پوری انسانیت سمجھتی ہے اس کے لئے یہ بالکل ناممکن ہوتا ہے کہ وہ کبھی تمام انسانوں کے معاملے پر، اس نقطۂ نگاہ سے غور کر سکے کہ یہ سب ایک ہی آدم و حوا کی اولاد، ایک ہی جسم کے اعضاء و جوارح، ایک ہی خاندان کے افراد اور ایک ہی برادری کے اجزاء ارکان ہیں۔ ایک قلیل حصے کے سوا ساری دنیا کے ساتھ اس کے تعلقات ہمدردانہ و مشفقانہ ہونے کے بجائے یا تو رقیبانہ و حاسدانہ ہوتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ مصلحت پرستانہ۔ یہ حقیقت کے اعتبار سے اپنے سوا سب کی بدخواہ اور دشمن ہوتی ہے اور یہ بدخواہی و دشمنی اس کے دائرے میں عیب کے بجائے ہنر سمجھی جاتی ہے اور اس کو قوم پرستی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

دوسری خرابی اس کے اندر یہ ہوتی ہے کہ ان عوامل سے بنی ہوئی قومیتیں بالتدریج خود آ اور باطل [illegible]

کا اندر جو حائل کرتی ہیں۔ ان کے اندر عصبیت کا جو جذبہ ہوتا ہے وہ ان کے مخصوص تقاضوں کی تحریک سے بالآخر اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ "میری قوم' خواہ حق پر ہو یا باطل پر" اس حد تک پہنچ جانے کے بعد یہ قومیت ہی حق و باطل کی کسوٹی بن جاتی ہے جو چیز اس کے حق میں جاتی ہے وہ تو حق بن جاتی ہے اور جو اس کے مفاد کے خلاف پڑتی ہے وہ باطل بنجاتی ہے۔ بڑے سے بڑا جھوٹ' بڑے سے بڑا ظلم اور بڑے سے بڑا فساد نیکی اور انصاف بن جاتا ہے اگر یہ کسوٹی اس کو نیکی اور انصاف قرار دیتی ہے اور واضح سے واضح سچائی اور قطعی سے قطعی انصاف کی بات بھی غداری اور بغاوت ٹھیرا دی جاتی ہے اگر یہ کسوٹی اس کو غداری اور بغاوت ٹھیرا دے۔ اس طرح کی قومیت کے دائرے کے اندر اس کا کوئی امکان نہیں ہوتا کہ کوئی شخص اس کسوٹی سے بالاتر کسی اور معیار حق و باطل کو سامنے رکھ کر کوئی بات کہہ سکے یا کوئی کام کر سکے۔ اگر وہ ایسی جرأت کرے تو عجب نہیں کہ اس کو پھانسی کی سزا ملے اگرچہ وہ سقراط ہی کے درجہ کا آدمی کیوں نہ ہو۔

اس میں تیسری خرابی یہ ہے کہ یہ از خود پھیلنے اور دوسروں کو قائل کر کے ان کو جیت لینے کی فطری صلاحیت سے بالکل محروم ہوتی ہے۔ اس کے لئے دو ہی صورتیں ممکن ہوتی ہیں۔ یا تو وہ اپنے خول کے اندر سمٹی سمٹائی پڑی رہے یا پھر جارحانہ عزم اور فاتحانہ حوصلہ کے ساتھ اُٹھے اور جن پر اس کا زور چلے ان کو زیر نگیں کر لے۔ ان دو صورتوں کے سوا اس کے لئے کوئی تیسری راہ نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے یہ یا تو دوسروں سے مار کھا جاتی ہے اگر اس کا مزاج منفعل اور شرمیلا ہوتا ہے یا دوسروں سے لڑتی بھڑتی رہتی ہے اگر اس کا مزاج جارحانہ ہوتا ہے۔ اس کے پاس دلوں کو جیتنے اور عقلوں کو قائل کرنے کے لئے کوئی چیز بھی نہیں ہوتی کہ جو لوگ اس کے دائرے سے باہر ہیں وہ اس کی منطق اور حجت سے مفتوح ہو سکیں۔ یہ طاقت صرف نظریات اور اصولوں میں ہوتی ہے کہ اگر وہ عقل و فطرت پر مبنی ہوں تو وہ دلوں کو مسخر کر لیتے ہیں اور لوگ ان کے قائل ہو کر خود ان کے علم بردار اور ان کے پیش کرنے والوں کے ساتھی بن جاتے ہیں لیکن نسل اور نسب پر بنی ہوئی قومیت کے اندر آخر دوسری نسل والوں کیلئے کونسی کشش ہو سکتی ہے؟ دوسروں کے اندر اس کے لئے اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو تعصب کے جواب میں تعصب' احساس برتری کے جواب میں احساس برتری اور نفرت کے مقابل میں نفرت ہی ہو سکتی ہے۔ اصول اگر عقل و فطرت پر مبنی ہوں تو ساری دنیا پر چھا سکتے ہیں اور تمام نسل انسانی' رنگ و خون اور زبان و تہذیب کے سارے اختلافات کے علی الرغم ان کے لئے اپنے دلوں کے دروازے کھول دیتی ہے لیکن کسی خاص نسل کے دعوے داروں کے آگے از خود لوگ کیوں سپر انداز ہو جائیں؟ اپنے اس نقص کے سبب سے کسی نسلی قومیت کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ کسی جہانی ریاست کی بنیاد رکھ سکے۔ اسطرح کی کسی قومیت نے اگر اپنی بلند حوصلگی کے سبب سے کبھی دنیا پر چھانے کی کوشش کی بھی ہے تو وہ آندھی اور طوفان کی طرح چھائی ہے اور طوفان ہی کی طرح غائب بھی ہو گئی ہے۔ سکندر' نپولین' چنگیز اور تیمور کی فتوحات کی وسعت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ جتنی تیزی کے ساتھ یہ آگے بڑھے ہیں اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ یہ پیچھے بھی لوٹے ہیں۔

اس کی چوتھی خرابی یہ ہے کہ نسل کا اشتراک قومیت کے ایک عامل کی حیثیت سے کوئی بہت زیادہ قوی عامل نہیں ہے، یہ تعاون و ہمدردی اور حمیت و حمایت کا محرک اسی حد تک بنتا ہے جس حد تک کسی نسل کے افراد میں ہم نسلی کی یادداشت تازہ ہو۔ یہ یادداشت چند پشتوں تک تو بلاشبہ باقی رہتی ہے لیکن اس سے آگے جا کر یہ اتنی مضمحل اور بے جان ہو جاتی ہے کہ اس کی حیثیت ایک واہمہ اور خیال سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ اوّل تو کسی نسل کے متعلق یہ دعویٰ کرنا ہی مشکل ہے کہ وہ اختلاط سے محفوظ ہے۔ یہ دعویٰ اگر کیا جا سکتا ہے تو زیادہ سے زیادہ ان قبائلی نسلوں ہی کی نسبت کیا جا سکتا ہے جن میں نسل کے تحفظ کا اہتمام بھی ہے اور جو اپنے محدود سیاسی اغراض کے لئے اس نسلی رابطہ کے شعور کو اپنے افراد کے اندر تازہ رکھنے کی بھی کوشش کرتی ہیں۔ دوسروں کے اندر

اس کی حیثیت جیسا کہ عرض کیا گیا ایک واہمہ اور خیال سے زیادہ
نہیں ہوتی اس وجہ سے قومیت کے ایک عامل کی حیثیت سے
اس کو کچھ ایسی اہمیت نہیں دی جا سکتی اور اس کے بل پر
کوئی بہت مضبوط اور وسیع قومیت قائم نہیں ہو سکتی۔

پانچویں خرابی اس کے اندر یہ ہے کہ ان عوامل سے جو
قومیت وجود میں آتی ہے اس میں خلطِ غالب چونکہ نسل کا شعور
ہی ہوتا ہے زبان، تہذیب، روایات، ادب اور دوسرے
عوامل سب پر اسی کا رنگ غالب ہوتا ہے اس وجہ سے
مذہب بھی اگر ان کے ساتھ شامل ہوتا ہے تو وہ بھی انھی کا
ایک تابع مہمل بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ بھی نسلی قومیت کی مذکورہ
خرابیوں کی کوئی اصلاح کرنے کے بجائے ان میں کچھ اضافہ
ہی کر دیتا ہے۔ ہماری مراد یہاں صرف انھی مذاہب سے
نہیں ہے جو مشرکانہ عقائد کے تحت انسانوں نے خود ایجاد
کئے ہیں۔ یہ مذاہب تو ہوتے ہی قومی اور نسلی ہیں بلکہ ہمارا
کہنا یہ ہے کہ ایک صحیح مذہب بھی نسلی عصبیت کے زیر
سایہ ایک نسلی مذہب بن کے رہ جاتا ہے اور اپنی تمام عقلی
اور فطری خوبیاں آہستہ آہستہ کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی سب سے
زیادہ واضح مثال یہود کا مذہب ہے۔ بنی اسرائیل نے
چونکہ کبھی اپنی نسلی قومیت کے خول سے باہر جھانکنے کی کوشش
نہیں کی اس وجہ سے انھوں نے اپنے مذہب کو بھی جو اصلاً
ایک خدائی مذہب تھا تراش خراش کر اپنی قومیت ہی کے
سانچے میں ڈھال لیا۔ توریت میں یہ جو بار بار آتا ہے کہ
"خداوند خدا اسرائیل کا خدا" اور "اے اسرائیل تو خدا کا
پہلوٹھا ہے" یہ سب اسی عصبیت نسلی کی پیدا کردہ تعبیریں
ہیں۔ انھوں نے مذہب سے روشنی لینے اور اس روشنی سے
اپنی نسلی عصبیت کی تنگ نظری دور کرنے کے بجائے اپنے
مذہب کو بھی اپنی ہی طرح تنگ نظر اور متعصب بنا ڈالا اور
یہ مذہب بجائے اس کے کہ ان خرابیوں کو دور کرنے میں کچھ
معین ہوتا جو نسل و نسب سے بنی ہوئی قومیت کے اندر مضمر
ہیں الٹا ان خرابیوں کو بھلائیاں ثابت کرنے میں ان کا
ایک بڑا مددگار بن گیا۔

اس میں چھٹی خرابی یہ ہے کہ اس قومیت کے مطالبات
اور فطرتِ سلیم اور عقلِ سلیم کے مقتضیات ایک خاص دائرہ
ہی تک ہم آہنگ رہ سکتے ہیں۔ اس خاص دائرے سے
آگے بڑھ کر عموماً ان کو ہم آہنگ رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔
اس دائرے سے آگے قومیت کے تقاضے صریحاً انسانیت
کے وسیع مفادات، اخلاق کے معروف مسلمات اور انصاف
کے ہمہ گیر اصولوں سے متصادم ہوتے ہیں۔ قومیت کے
علم بردار اس تصادم کو دور کرنے کے لئے قومیت کے مفاسد
کا اعتراف کرنے کے بجائے کوشش اس بات کی کرتے
ہیں کہ قومیت ہی کی اساس پر انسانیت، اخلاق اور انصاف
کا ایک بالکل ہی نرالا فلسفہ تیار کر دیں۔ یہ فلسفہ تیار تو
ہو جاتا ہے۔ پڑھے لکھے ذہین لوگ اگر آمادہ ہو جائیں تو کیا
نہیں کر سکتے لیکن یہ فلسفہ سلیم الفطرت انسانوں کو کبھی اپیل
نہیں کرتا۔ اس کے لئے مثال کے طور پر سولھویں صدی کے
سیاسی فلسفی میکاویلی کی تحریریں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس
طرح کے فلسفے اہل سیاست کی امنگیں پوری کرنے کا وقتی
طور پر ایک ذریعہ تو ضرور بن جاتے ہیں لیکن انسان چونکہ
ایک نسلی حیوان ہی نہیں بلکہ اپنی ایک عقلی و اخلاقی ہستی بھی
رکھتا ہے اور اس کا یہ پہلو اس کے تمام دوسرے پہلوؤں پر
غالب ہے اس وجہ سے اندر سے طبیعتیں ان سے برابر ابا کرتی ہیں
اور جس چیز پر کسی معاشرہ کے معقولیت پسند لوگ مطمئن نہ ہوں
اس کے بودے پن کو کتنے دنوں تک چھپایا جا سکتا ہے؟

وطنی قومیت کے مفاسد

وطنی قومیت کے اندر مذکورہ بالا مفاسد کے علاوہ کچھ
مزید مفاسد بھی ہیں جن کی طرف ہم یہاں اشارہ کرنا چاہتے
ہیں لیکن اصل بحث سے پہلے اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینا
ضروری ہے کہ وطن کا ایک عامل وطنیت ہونا ایک علیحدہ
چیز ہے اور وطن کو اساس بنا کر مختلف قومیتوں ایک
متحدہ قومیت کا کنبہ جوڑنا ایک علیحدہ شے ہے۔ جہاں تک
پہلی چیز کا تعلق ہے وہ مقتضائے فطرت ہے جس طرح ہر شخص

اس کا ہر عزیز ہوتا ہے۔ اس کے کونے کونے اور گوشے گوشے سے اس کی روایات وابستہ ہو جاتی ہیں۔ اس کی حفاظت اور اس کے اوپر اپنا حق قائم رکھنے کیلئے وہ بسا اوقات اپنا مال اور اپنی جان سب کچھ قربان کر دیتا ہے اور ایسا کر گذرنا ہر حق پسند کے نزدیک ایک مستحسن اور غیرت مندانہ کام سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر قومیت کو اس کا وطن عزیز و محبوب ہوتا ہے وہ اس کو اپنی جنم بھومی اور مادر وطن سمجھتی ہے اس کو اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کا گہوارہ خیال کرتی ہے۔ اس کے چپہ چپہ پر اس کے اسلاف کی عظمت اور اس کے آباؤ اجداد کے کارناموں کی تاریخ ثبت ہوتی ہے۔ اس کے دریا اور پہاڑ اور اس کے نشیب و فراز سب کی زبانوں پر اس کی روایتیں اور حکایتیں ہوتی ہیں۔ اس کے پہاڑوں میں اس کی زندگی کے سرچشمے اسکے کھیتوں اور باغوں میں اس کی معاش و معیشت کے ذخیرے اور اس کی وادیوں اور اس کے کہساروں میں اس کی خوشیاں اور اس کی بہاریں ہوتی ہیں اس وجہ سے ہر قوم اپنے وطن کو اپنی مشترک دولت سمجھتی ہے اور یہ اشتراک اس کے اندر ہم وطنی کا جذبہ پیدا کرتا ہے جو اس کو وطن سے مشترک استفادہ اور اس کی مشترک حفاظت و صیانت کے لئے برابر جوڑے رکھتا ہے۔ یہ چیز عین تقاضائے فطرت ہے نہ یہ عقل کے خلاف ہے اور نہ مذہب و اخلاق کے۔ لیکن دوسری چیز یعنی وطن کو اساس قرار دے کر مختلف قومیتوں کو ایک متحدہ قومیت میں جوڑ ڈالنا ایک بالکل مختلف چیز ہے جس کی خرابیاں بالکل واضح ہیں۔

وطن کی بنیاد پر مختلف قومیتوں سے ایک متحدہ قومیت جو بنتی ہے اس میں اصل مطمح نظر تو یہ ہوتا ہے کہ ایک وطن میں رہنے بسنے والی ایک سے زیادہ قومیتیں وطن کے سوا دوسرے عوامل قومیت۔ نسل و زبان، کلچر و روایات اور مذاہب کو جو ان کے اندر اپنے الگ الگ تشخص اور اپنی مخصوص انفرادیت کا احساس پیدا کرتے ہیں ختم کر دیں اور ان کی جگہ ایک مخلوط نسل، ایک مشترک زبان، ایک مشترک ثقافت اور ایک مشترک مذہب پیدا کرنے کی کوشش کریں، لیکن یہ بات کہنے میں بھی بڑی بھونڈی معلوم ہوتی ہے اور عملاً بھی بہت بعید از قیاس نظر آتی ہے اس وجہ سے کہی یوں جاتی ہے کہ مختلف قومیتیں الگ الگ تشخصات کو اگر محفوظ رکھنا چاہیں تو اپنے الگ دائروں کے اندر محفوظ رکھیں لیکن اجتماعی و سیاسی دائرے میں ایک ہی قوم کی حیثیت سے نمایاں ہوں اور اپنے انفرادیت پسندانہ رجحانات و عوامل کو اس میں مخل نہ ہونے دیں۔ اٹھارویں صدی سے پہلے پہلے تو عملاً یہی صورت تھی کہ غالب اور فتح مند قومیت مغلوب قومیت کے ان تمام تشخصات کو تقریباً ختم کر دیتی تھی جو اس کے انا کو زندہ رکھنے والے خیال کئے جاتے تھے، لیکن اٹھارویں صدی میں نپولین کی فتوحات اور اس کے بعد پہلی جنگ عظیم نے مختلف اسباب سے جن کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی، قومیتوں کے اندر اپنے امتیازی تشخصات کو زندہ اور باقی رکھنے کا احساس اتنا قوی کر دیا کہ غالب قومیتوں کے لئے ان سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں رہا۔ اب اگرچہ ایک نظریہ کی حیثیت سے یہ مسلم ہے کہ ہر قومیت کو اپنی ہستی، اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنے مذہب کو باقی رکھنے کا حق ہے اور یہ بات بظاہر نہایت اچھی بھی معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا سارا حسن صرف کاغذ کے صفحات ہی پر ہے، عمل میں آکر اس کی یہ ظاہری چمک دمک بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے اور اس کی تمام اندرونی خرابیاں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ ہم یہاں اس کی بعض نمایاں خرابیوں کیطرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

اس کی پہلی خرابی تو یہ ہے کہ یہ قومیت متضاد عناصر کا ایک مجموعہ ہوتی ہے۔ بظاہر تو یہ عناصر ایک ہی بندھن میں باندھ دیئے جاتے ہیں لیکن بباطن ان کی امنگیں اور ان کے حوصلے ایک دوسرے سے بالکل مختلف رہتے ہیں جہاں نسل، زبان، تہذیب، ادب اور مذہب کے اسنے

اختلافات موجود ہوں وہاں صرف ہم وطنی کا رشتہ ان کو باہم جوڑے رکھنے میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوتا۔ ان کے درمیان اختلاف اور نزاع کے جو محرکات موجود ہوتے ہیں وہ برابر اپنا عمل کرتے رہتے ہیں اور کبھی ان کو ایک قوم کی طرح پوری یک جہتی کے ساتھ کسی قومی نصب العین کے لئے کام نہیں کرنے دیتے۔ یہ قومیت کامیاب صرف اسی صورت میں ہوتی جب تضاد کے یہ اسباب یا تو سطحی ہوں یا پوری طرح دبا دیئے گئے ہوں یا دوسرے عناصر کمیت وکیفیت کے اعتبار سے اتنے ناقابل لحاظ ہوں کہ غالب عصبیت کے مقابل میں وہ کان دبائے پڑے رہنے پر مجبور اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہنے ہی میں اپنی سلامتی سمجھتے ہوں۔

اس کی دوسری خرابی یہ ہے کہ اس قومیت کی تشکیل کرنے والے مختلف اجزا مجبور ہوتے ہیں کہ اسکے پاس جو قیمتی ورثہ خود ان کی قومی روایات، قومی ادب اور اپنے آبائی دین کا ہے اس کو تو اجتماعی وسیاسی زندگی سے خارج کر کے سڑنے اور گلنے کے لئے چھوڑ دیں اور اس کی جگہ پر ہر چیز ایک مصنوعی شکل میں قبول کرنے پر راضی ہوں۔ یہ قربانی صرف انھی عناصر کو نہیں کرنی پڑتی ہے جو عددی اعتبار سے اقلیت میں ہوتے ہیں بلکہ بسا اوقات اپنے دوسرے ساتھی یا ساتھیوں کو مطمئن کرنے کے لئے شریک غالب کو بھی یہ قربانی کرنی پڑتی ہے۔ ادب میں رجحانات بدلتے ہیں، زبان کا ڈھانچہ متغیر ہوتا ہے۔ روایات کا ایک نیا ملغوبہ تیار ہوتا ہے۔ رسوم میں بالکل بیگانہ آمیزشیں ہوتی ہیں۔ تاریخ ایک نیا قالب اختیار کرتی ہے۔ جو عدو سمجھے جاتے تھے وہ ہیرو بنتے ہیں جو ہیرو خیال کئے جاتے تھے۔ بسا اوقات ان کے نام کتابوں کے صفحات اور ذہنوں کی الواح سے کھرچ کھرچ کر نکالے جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ مصیبت اس وطنی قومیت کے ہاتھوں مذہب پر آتی ہے۔ مذہب ایک قوی ترین عامل قومیت ہے اور سطحی مفادات کے آگے مشکل ہی سے مر تسلیم خم کرتا ہے۔ اس وجہ سے قومیت کی تشکیل میں اس کو سب سے بڑا مانع قرار دے کر اس کا علاج یہ سوچا گیا ہے کہ اس کو اجتماعی وسیاسی زندگی سے بالکل ہی خارج کر کے مسجد یا مندر یا کلیسا کے اندر بند کر دیا جائے[1]۔ اس کے بغیر وطنی قومیت کا ڈھانچہ کھڑا ہو ہی نہیں سکتا۔

اس میں تیسری خرابی یہ ہے کہ غالب قومیت کے اندر اگر نسلی اور مذہبی عصبیت پوری طرح جڑ پکڑے ہوئے ہے تو وہ وطنی قومیت کا روپ دھارن کر کے بھی دوسرے شریکوں کے مقابل میں اجتماعی وسیاسی زندگی کے ہر گوشے میں اپنے مفاد اور اپنے رنگ کو غالب رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے اگر اپنے حقوق کا نام لیں، اپنی زبان کا ذکر کریں، اپنی تہذیب کا رونا روئیں، اپنے مذہب کا حوالہ دیں تو اس کو گروہی تعصب، انتشار پسندی اور ملک وطن کے ساتھ غداری پر محمول کیا جاتا ہے لیکن شریک غالب دھڑلے کے ساتھ ساری چیرہ دستیاں کرتا ہے لیکن مجال نہیں ہے کسی کی کہ اس کے خلاف زبان ہلا سکے۔ اس حال کی بہترین مثال بھارت کی ہندو اکثریت کا طرز عمل ہے۔

اس کی چوتھی خرابی یہ ہے کہ بعض حالات میں شریک غالب بھی اس میں شدید نقصان اٹھاتا ہے۔ یہ صورت اس وقت پیش آتی ہے جب شریک غالب عددی اکثریت تو رکھتا ہو لیکن اس کے اندر وحدت اور تنظیم نہ ہو، معاشی اعتبار سے وہ بدحال اور سیاسی اعتبار سے وہ غیر منظم ہو، اس کے لیڈر سادہ لوح یا ابن الوقت ہوں، اس کے اندر محض مفاد اور اغراض کے لئے بہت سی پارٹیاں بن گئی ہوں جس سے اس کی سیاسی طاقت بالکل منتشر ہو گئی ہو اور یہ پارٹیاں محض وقتی مفاد اور حصول اقتدار کے لئے اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے سودے بازیاں کرتی ہوں۔ ایسی صورت میں عددی اکثریت رکھنے کے باوجود وہ کسی حوصلہ مند اور منظم اقلیت کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن کے رہ جاتی ہے۔ یہ اقلیت اپنی ہوشیاری اور جوڑ توڑ سے اس کی پارٹیوں کو اپنا آلۂ کار بنا لیتی

---

[1] ٹھیک یہی کام مصر میں کیا گیا ہے۔ تجلی۔

جو مقاصد یہ خود اپنے ہاتھوں پورے کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی وہ ان کے واسطے سے بڑی آسانی سے پورے کرلیتی ہے۔ اس میں بڑی سہولت اس کو اس وقت حاصل ہوسکتی ہے جب اس کو انتخابات میں شریک غالب کے نمائندوں کے انتخابات پر بھی اثر انداز ہونے کا موقع مل جائے۔ اس کی نہایت واضح مثال مشرقی پاکستان نے پیش کی۔ یہاں مسلمان عددی اکثریت رکھنے کے باوجود اپنی مذکورہ بالا کمزوریوں کے سبب سے ہندوؤں کے لئے ایک چراگاہ بنتے جارہے تھے اور اس علاقے میں مخلوط طریقۂ انتخاب رائج ہو جانے کے بعد اقلیت کی اکثریت پر اثر انداز ہونے کے مواقع اس قدر بڑھ گئے تھے کہ اکثریت نہ صرف تہذیب و تمدن اور مذہب کے اعتبار سے سخت نقصان اٹھا رہی تھی بلکہ ڈر پیدا ہوگیا تھا کہ ملک کی سالمیت ہی خطرے میں پڑ جائے۔

اس کی پانچویں خرابی اور سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ قومیت خطرات اور مشکلات کے مقابل میں عموماً بہت بودی ثابت ہوتی ہے[1]۔ وطنی عصبیت کا جذبہ ابھارنے کے لئے اگر کوئی محرک سب سے زیادہ قوی ہوسکتا ہے وہ کسی مشترک مصیبت کا ظہور یا اس کے ظہور کا خطرہ ہی ہوسکتا ہے لیکن یہ مشترک مصیبت بھی ایک وطنی قومیت کے مختلف عناصر میں اتحاد کا عام ولولہ اور حبِ وطن کا عام جوش صرف اسی صورت میں پیدا کرتی ہے جب قومیت کے تمام اجزا اپنے آپ کو وطن کے تمام ذہنی و مادی فوائد میں برابر کا شریک و سہیم سمجھتے ہوں۔ اگر یہ صورت نہ ہو (اور اوپر ہم بیان کرچکے ہیں کہ اس صورت کا پیدا ہونا صرف خاص حالات ہی میں ممکن ہے) تو جو اجزائے قومیت اپنے آپ کو مظلوم سمجھتے ہیں وہ اس مشترک مصیبت کو ایک مصیبت سمجھنے کے بجائے بعض حالات میں اس کو اپنے لئے رحمت سمجھتے ہیں اور ایسے مواقع پر ان کی ہمدردیاں اپنے وطنی ہم قوموں کے بجائے بیرونی حملہ آوروں ہی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ بیرونی حملہ آور اگر زیرک ہوں تو وہ کسی ملک کے اس اندرونی اضطراب سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ پہلی جنگِ عظیم کے موقع پر اتحادیوں نے جو یہ نعرہ لگایا تھا کہ یہ جنگ مظلوم و مقہور اقلیتوں کی آزادی کے لئے لڑی جارہی ہے اس نعرہ سے انھوں نے اپنے حریفوں کے مقابل میں بڑا فائدہ اٹھایا۔ اگرچہ اس سے فائدہ اٹھا چکنے کے بعد انھوں نے خود اس کی پوری بے حرمتی کی۔ اس پہلو سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وطن کی اساس پر بنی ہوئی قومیت اپنے اصلی مدعا کے اعتبار سے تو بودی اور پھسپھسی ہوتی ہے۔ البتہ ففتھ کالم یا اسلامی اصطلاح میں منافقین کی پرورش کے لئے یہ بہترین پناہ گاہ فراہم کرتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر قومیت کے تمام عناصر کو بالکل مساوی درجہ میں آسودہ اور مطمئن کیا جاسکے تو اس خرابی کو دور کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ خرابی خود وطنی قومیت کی تعمیر ہی میں مضمر ہے اس وجہ سے اس کو دور کرنا بہت مشکل ہے۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے مذکورہ عوامل پر تنقید

اب آئیے اسلام کی روشنی میں مذکورہ عوامل پر غور کیجئے کہ وہ ان کو کس حد تک رد، اور کس حد تک قبول کرتا ہے۔

اسلام ان تمام عواملِ قومیت کو نہ تو یک قلم رد ہی کرتا ہے اور نہ ان کو پورا کا پورا قبول ہی کرتا ہے۔ عوامل میں سے جو عامل جس حد تک عقل اور فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہے اس کو اس نے نہ صرف اختیار کرلیا ہے بلکہ اس کو جزوِ دین بنا دیا ہے جس کو نہ صرف ماننا ضروری ہے بلکہ اس پر ایمان لانا بھی ضروری ہے لیکن جہاں کہیں عقل اور فطرت کے حدود سے ان میں کوئی انحراف یا تجاوز ہے اسلام نے واضح الفاظ میں ان کی نشان دہی کردی ہے کہ یہ انحراف یا تجاوز حدود اللہ سے تجاوز ہے اور اس سے معاشرہ اور قومیت میں فساد کو راہ ملتی ہے جس کا اثر بالآخر سارے نظامِ زندگی پر پڑتا ہے۔

اسلام میں نسل و نسب کا درجہ

اسلام نسل و نسب کے رابطہ کو ایک نہایت قوی رابطہ تسلیم کرتا ہے۔ اس کو خاندان اور معاشرہ کی بنیاد قرار دیتا ہے

[1] [illegible]

رشتۂ رحم کاٹنے کو ایک گناہِ عظیم اور فساد فی الارض کا سبب بتاتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کو تنگ نظریوں اور تعصبات کے شبہ سے پاک رکھنے کے لئے مندرجہ ذیل حقائق بھی سامنے رکھ دیتا ہے۔

ایک یہ کہ تمام انسان ایک ہی خدا کی مخلوق اور ایک ہی آدم و حوا کی اولاد ہیں اس وجہ سے حقوق اگرچہ الاقرب فالاقرب کے اصول پر قائم ہیں لیکن اپنے خاندان یا اپنی قوم قبیلہ کو حق و باطل کا معیار نہیں بنا لینا چاہئے اور اس کے تعصب میں اندھے ہو کر انصاف اور سچائی کے بالاتر اصولوں سے منحرف نہیں ہو جانا چاہئے۔

دوسرا یہ کہ خاندانوں اور قبیلوں کی تمیز اور زبان اور رنگ کی تفریق محض شناخت اور تعارف کے لئے ہے۔ یہ نہ عزت اور شرافت کی کوئی کسوٹی ہے اور نہ خدا سے تقرب و توسل کی کوئی دلیل۔ خدا کی نظر میں درجہ اور مرتبہ صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو خدا سے ڈرنے والے اور اس کی شریعت اور اس کے قانون کا احترام کرنے والے ہیں اور یہی لوگ ایک اسلامی معاشرہ میں بھی حقیقی عزت و احترام کے مستحق ہیں۔

تیسرا یہ کہ اجتماعی و سیاسی زندگی کے لئے صرف وہی ضوابط صحیح ہیں جو انسانی فطرت کے مطابق خود انسانوں کے خالق نے بنائے ہیں نہ کہ وہ جو قومی و قبائلی عصبیت کے تحت خود انسانوں نے ایجاد کئے ہیں[1]۔

مذکورہ بالا حقائق قرآن و حدیث میں مختلف اسلوبوں اور طریقوں سے بیان ہوئے ہیں۔ ہم چند آیتوں اور حدیثوں کے ترجمے یہاں درج کرتے ہیں:-

"اے لوگو! اپنے اس خداوند سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی کو بھی پیدا کیا۔ پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں پھیلائیں اور اس اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے طالبِ مدد ہوتے ہو اور رحمی رشتوں کا احترام کرو اللہ تم پر نگہبان ہے۔" (سورۃ نساء آیت ۱)

یہ آیت ان بنیادی اصولوں کو واضح کر رہی ہے جن پر اسلامی معاشرہ (یا بالفاظ دیگر اسلامی قومیت) قائم ہے اس میں دو چیزوں کو باہمی ہمدردی اور باہمی تعاون و تناصر کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ ایک خدا کو جو سب کا خالق ہے اور ایک رشتۂ رحم کو جس کا شعور اگرچہ ایک خاص حد سے آگے جا کر مضمحل ہو جاتا ہے۔ لیکن فی الحقیقت وہ تمام نسلِ انسانی کے درمیان مشترک ہے۔ علاوہ ازیں عورت کو بھی اس معاشرہ میں برابر کا شریک ٹھیرایا گیا ہے اگرچہ اپنے فرائض کے اعتبار سے اس کا دائرہ مردوں کے دائرے سے الگ ہے۔

دوسری آیت کا ترجمہ ملاحظہ ہو:-

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک ہی مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تم کو خاندانوں اور قبیلوں میں اس لئے تقسیم کیا ہے کہ یہ چیز تمہارے لئے تعارف کا ذریعہ ہو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو خدا سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ اللہ علیم و خبیر رکھنے والا ہے۔" (حجرات ۱۳)

حدیث میں رشتۂ رحم کی اہمیت ملاحظہ ہو:-

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے خلق کو پیدا کیا یہاں تک کہ جب ان کو پیدا کر کے فارغ ہوا تو رحم کھڑا ہوا اور اس نے عرشِ الٰہی کو تھام کر کہا کہ یہ جگہ ہے اس کی جو قطع رحم سے تیری پناہ چاہے؟ ارشاد باری ہوا ہاں۔ کیا تو اس بات پر راضی نہیں ہے کہ میں اس سے جوڑوں جو تجھ سے جوڑے اور اس سے کاٹوں جو تجھ سے کاٹے؟ بولا میں اس پر راضی ہوں۔ ارشاد باری ہوا کہ یہ مقام تجھ کو بخشا گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو قرآن کی یہ آیت پڑھ لو (یعنی اس آیت سے اس مضمون کی تائید ہو جائے گی) فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا

[1] ...نہیں لوگوں کے کاروبار اور احوال کو من مانے انداز میں قومیا لینا خدا کا قانون ہے یا انسان کا خود ساختہ۔ جمال ناصر بہرحال اس کام میں اتنا...

...جامکم ۝ اُولٰئِكَ الَّذِیْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰۤى اَبْصَارَهُمْ [1]

(ریاض الصالحین بحوالہ مسلم و بخاری)

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ قطع رحم یا قطع قرابت اتنا بڑا جرم ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی پاداش میں قطع رحم کرنے والوں پر لعنت کر دیتا ہے اور ان کے دلوں دماغوں کو اندھا بہرا کر دیتا ہے۔

زبان و ادب کی حیثیت

اسلام معاشرہ کی تشکیل میں زبان و ادب کے مرتبہ اور اسکی اجتماعی و سیاسی اہمیت کو بھی تسلیم کرتا ہے لیکن اس کو بھی مجرد قومی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے اخلاقی معیاروں پر جانچ کر اس کے سلیم و سقیم اور خبیث و طیب میں فرق کرتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ قومی زبان اور قومی ادب کے نام سے رطب و یابس اور پاک و ناپاک کا جو انبار بھی اکٹھا کر دیا جائے وہ سب کا سب بلا کسی فرق و امتیاز کے یکساں عزت و احترام کے لائق قرار دے دیا جائے اور اس پورے کی حفاظت و صیانت اور اس سارے کی نقل و روایت ایک قومی فریضہ سمجھ لی جائے۔ حد یہ ہے کہ لاکھوں روپے دیہاتیوں کے گیتوں اور ان کے قصوں کہانیوں کے جمع کرنے، انکو مرتب کرنے اور پھر ان کو لوگوں کے ذہنوں پر لادنے پر ضائع کر دیئے جائیں۔ اسلام کا نقطۂ نظر اس معاملہ میں جیسا کہ عرض کیا گیا، بالکل عقلی و اخلاقی ہے۔ وہ صرف اسی ادب کو ادب قرار دیتا ہے جو صحیح منبع سے نکلا ہو اور جو ذہنوں کو صحیح غذا دینے والا اور طبیعتوں کو صحیح رُخ پر ڈالنے والا ہو۔ اگر محض ادبی اور قومی نقطۂ نگاہ سے اس معاملے کو دیکھا جائے تو حالی و اقبال کے ادب اور امانت لکھنوی اور زہرِ عشق کے مصنف کے ادب دونوں کے لئے احترام کے الگ الگ پہلو نکل سکتے ہیں لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو امانت اور شوق کے ادب کو ادب میں جگہ دینے کے بجائے عیب کی طرح چھپانا پڑے گا۔[2]

امرؤالقیس کو عرب میں ایک قومی شاعر ہونے کے لحاظ سے اشعر الشعراء کا بلند مقام حاصل تھا، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں فرمایا کہ اشعر الشعراء وقائدھم الی النار کہ یہ تمام شاعروں کا امام اور ان کو جہنم کی طرف لے جانے والا ہے۔ اگر حضورؐ بھی اس کو محض قومی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے تو اس کو اشعر الشعراء ہی قرار دیتے لیکن آپؐ کا نقطۂ نگاہ اخلاقی بھی تھا اس وجہ سے آپؐ نے ایک ایسے شاعر کے سارے ذخیرۂ ادبی کو رد کر دیا جس نے عرب کے قومی ادب کو اگرچہ سب سے قیمتی سرمایہ دیا تھا، لیکن ساتھ ہی بے حیائی اور فحاشی میں بھی آپ اپنی مثال تھا۔ اس کے برعکس آپؐ نے دوسرے اسلامی شاعروں کے کلام سنے اور ان کی تحسین فرمائی۔ زمانۂ جاہلیت کے بعض شاعروں اور خطیبوں کے کلام کی بھی آپؐ نے تعریف فرمائی۔ بعض خطیبوں کے متعلق تو یہ تک ارشاد ہوا کہ یہ حقیقت کے بہت قریب پہنچ گئے تھے لیکن حقیقت کو نہ پا سکے۔ حضرت عمرؓ مشہور جاہلی شاعر زہیر کے کلام کو بہت پسند کرتے تھے اور وجہ یہی تھی کہ اس کے کلام میں امرؤالقیس کی سی رندی و ہوسناکی نہیں ہے بلکہ نہایت گہری حکمت کی باتیں ہوتی ہیں اور ایسی خوبی کے ساتھ کہتا ہے کہ دل میں اُترتی چلی جاتی ہیں۔ یہ باتیں اس امر کا نہایت واضح ثبوت ہیں کہ اسلام میں قومیت کے ایک عامل کی حیثیت سے زبان و ادب کو ایک جگہ حاصل تو ہے لیکن صرف پاکیزہ ادب کو حاصل ہے۔ ہر ہرزہ سرائی کو اسلام یہ جگہ نہیں دیتا۔

تہذیب اور روایات

اسلام قومیت کی تشکیل میں تہذیب اور روایات کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتا ہے لیکن جس طرح وہ زبان و ادب کو

---

[1] پس تم سے یہی متوقع ہے، اگر تم منہ موڑے رہو، کہ تم زمین میں فساد مچاؤ اور رشتہ رحم کو کاٹو۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور انکے کان بہرے کر دیئے اور انکی آنکھیں اندھی کر دیں (محمد، ۲۲)

[2] کاش مولانا احسن مرحوم مجھ لیے، ضال و مضل اور اسلامی اخلاق سے منحرف ادب و ثقافت کا معائنہ فرمائیں جو جمال ناصر کے مصر سے ... [illegible]

اخلاقی کسوٹی پر جانچ کر اس کے صالح عنصر کو اپناتا اور فاسد کو رد کر دیتا ہے۔ اسی طرح وہ قومی تہذیب کے مظاہر اور قومی روایات کو بھی اخلاق کی کسوٹی پر جانچتا ہے اور اس جانچ کے بعد ان کا جو حصہ منکر ثابت ہو جاتا ہے اس کو تو رد کر دیتا ہے اور جو معروف ہوتا ہے اس کو اختیار کر لیتا ہے، قرآن کو پڑھیے تو آپ کے سامنے بار بار یہ بات آئے گی کہ فلاں بات معروف کے مطابق کرو۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس معاملے میں قومی دستور اسلام کی نظر میں پسندیدہ تھا جس کے سبب سے اسلام نے اس کی اس قدر عزت بڑھائی کہ اس کو خود اپنا ایک حصہ بنا لیا۔ برعکس اس کے قومی رسوم و عادات یا تہذیب اور روایات میں جو باتیں اخلاق کے اصول کے منافی یا حقیقت کے خلاف تھیں ان کو منکر قرار دے کر رد کر دیا۔ اسی طرح عرب کے تاریخی اشخاص میں سے لقمان اور ان کے فرزند کا نہایت اچھے انداز میں قرآن نے ذکر کیا ہے۔ بلکہ پوری قوم کے بوڑھوں اور نوجوانوں کے سامنے ان کو ایک لائق باپ اور ایک لائق فرزند کی مثال کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ان کی حکیمانہ نصیحتوں کا رتبہ تو اتنا بڑھایا ہے کہ وحی الٰہی نے ان کو خود قرآن کا ایک حصہ بنا دیا ہے۔ یہ لقمان عرب کے حکماء میں سے صرف ایک حکیم تھے کوئی پیغمبر نہیں تھے ان کے پیغمبر ہونے کا کوئی ثبوت کم از کم میرے علم میں نہیں ہے، اسی طرح قرآن نے ذوالقرنین کا ذکر ایک عادل اور خدا ترس حکمران کی حیثیت سے کیا ہے حالانکہ وہ ایک غیر قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ ان چیزوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام تہذیب اور روایات کو متعصبانہ نگاہ سے دیکھنے کے بجائے حق پرستانہ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا خود اپنا ایک معیار ہے جس پر جانچ کر وہ ایک چیز کو رد یا قبول کرتا ہے اور یہ معیار اخلاقی اور عقلی ہے نہ کہ قومی۔ قومی نقطۂ نگاہ تو ان معاملات میں بسا اوقات اتنا متعصبانہ ہو جاتا ہے کہ اس تعصب کے اندھے فرعون کو محض اس دلیل پر اپنا لیڈر مان لیں گے کہ وہ ان کی اپنی قوم سے تھا اگرچہ وہ نہایت مستبد اور ظالم تھا اور اس کے ظلم و استبداد ہی کے سبب سے اس کی پوری قوم عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئی اور حضرت موسیٰؑ کو محض اس بناء پر رد کر دیں گے کہ وہ نسلاً دوسری قوم سے تعلق رکھتے تھے اگرچہ وہ عدل و انصاف کے پیکر تھے اور ان کے ہاتھوں مظلوموں کو نجات ملی۔

اسلام کی نظر میں وطن کی حیثیت

اسلام وطن کو بھی بڑی اہمیت دیتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی مسلمان اگر اپنے وطن کی حفاظت کی راہ میں مارا جائے تو اس کی موت شہادت کی موت ہے لیکن وطن کی اس اہمیت کے باوجود اسلام نے وطن کو بھی حق کے اصولوں کے تابع ہی رکھا ہے۔ اس کو حق سے بالاتر نہیں قرار دیا ہے اسلام کی نظر میں انسان کی اصلی قدر و قیمت اس کے ایک عقلی و اخلاقی ہستی ہونے کی ہے نہ کہ کسی خاص رقبہ زمین کے باشندہ ہونے کی۔ اس وجہ سے وہ اس کے عقلی و اخلاقی مطالبات اور تقاضوں کو دوسرے تمام مطالبات اور علائق پر مقدم رکھتا ہے۔ اگر کسی مرحلے میں عقل اور اخلاق کے مطالبات اور وطن کے مطالبات میں تصادم واقع ہو جائے تو اسلام کی ہدایت یہ ہے کہ آدمی عقل و اخلاق کے مطالبات کا ساتھ دے۔ وطن کے مطالبات کو نظر انداز کر دے۔ اگر ایک سرزمین پر آدمی اپنے اخلاقی و ایمانی تقاضوں کو پورا نہ کر سکتا ہو بلکہ وہ مجبور ہوتا ہو کہ وہ جس نظریۂ حیات پر ایمان رکھتا ہے اس سے دست بردار ہو جن اخلاقی ضوابط کا پابند ہے ان کو نظر انداز کرے اور جن کی نگہداشت وہ اپنے فرائض میں سمجھتا ہے ان کو توڑے تو اس سرزمین کے ساتھ محض اس وجہ سے اس کا بندھے رہنا کہ یہاں سے اس کو پیٹ پالنے کو روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا ملتا ہے اس کی انسانیت کی توہین ہے۔ ایک سچا مسلمان ایسی حالت میں دو ہی راہیں اختیار کر سکتا ہے یا تو اس کی اصلاح کے لئے اپنا پورا زور لگائے اور اس کو اس قابل بنائے کہ اپنے دین و ایمان کے ساتھ وہاں زندگی بسر کر سکے اور اگر وہ یہ نہیں کر سکتا تو پھر دوسری راہ یہ ہے کہ وہ اپنے دین و ایمان کو لے کر

اپنی ایسی سرزمین کی طرف ہجرت کر جائے جہاں زندگی کے سب عیش چاہے حاصل نہ ہوں لیکن دین و ایمان کی آزادی حاصل ہو۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو عجب نہیں کہ وہ ایک مخالف ماحول میں ایمان کی نعمت ہی سے محروم ہو جائے۔

قرآن مجید کی ایک آیت کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

"جن لوگوں کو فرشتے اس حال میں موت دیتے ہیں کہ وہ (دار الکفر میں پڑے رہنے کے سبب سے) اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ فرشتے ان سے پوچھتے ہیں تم کس حال میں پڑے رہے؟ وہ کہتے ہیں ہم اپنے وطن میں بے بس اور مجبور تھے۔ فرشتے ان سے کہتے ہیں کیا خدا کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے وہی لوگ ہیں کہ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔" (۲۷ نساء)

مذہب

اسلام مذہب کو قومیت کی تشکیل میں سب سے زیادہ مؤثر اور سب سے زیادہ قوی عامل مانتا ہے[۵۱] لیکن اگر مذہب کی بنیاد شرک پر ہو یا قومی تعصبات کے تحت اس میں حق و انصاف کے فطری اصولوں کو بالکل مسخ کر دیا گیا ہو۔ یا وہ حقیقی فرائض اور واقعی حقوق کی تعلیم دینے کے بجائے صرف عوام کی خواہشوں کا ایک مجموعہ بن کے رہ گیا ہو تو ایسے مذہب کو اسلام نہ تو صحیح مذہب مانتا اور نہ اس طرح کے کسی مذہب پر قائم ہونیوالی قومیت کو صحیح قومیت تسلیم کرتا ہے۔ اس طرح کے مذہب میں وہ سارے مفاسد موجود ہوتے ہیں جو نسل و نسب اور زبان و رنگ سے بنی ہوتی قومیتوں کے اندر ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ دنیا کے مشرکانہ مذاہب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایجاد ہی اس لئے کئے گئے ہیں کہ وہ اپنے پیرؤں کے قومی تعصبات اور ان کی قومی امنگوں کو اشیرباد دیں۔ یہودی مذہب اگرچہ اپنی اصل کے لحاظ سے مشرکانہ مذہب نہیں ہے، بلکہ ایک آسمانی مذہب ہے لیکن بنی اسرائیل نے جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں۔ اس میں طرح طرح کی تحریفات کر کے اسکو خدائی مذہب کے بجائے اسکو اپنا ایک قومی مذہب بنا ڈالا۔ مذاہب کے اندر یہ فساد پیدا ہو جانیکے سبب سے اسلام ان میں سے کسی کو بھی اس لائق نہیں سمجھتا کہ وہ ایک صحیح المزاج قومیت کی بنیاد بن سکے

تجلّی

مضمون آپ نے ملاحظہ فرما لیا۔ اگر مولانا اصلاحی کا وہ جواب جو پچھلے "آغاز سخن" میں مع سوال پورا کا پورا نقل کیا جا چکا ہے حافظے میں تازہ نہ رہا ہو تو اسے ایک بار پھر دیکھ لیں اور ایمانداری کے ساتھ فیصلہ دیں کہ جس تضاد کا ہمیں شکوہ ہے کیا وہ ہمارے دماغ کی پیداوار ہے یا واقعتاً مولانا اصلاحی کی ان دونوں تحریروں میں صریح طور پر پایا جا رہا ہے۔ ہماری سمجھ پر بھروسہ نہ کیجئے، بلکہ اپنی سمجھ سے کام لیکر بتایئے کہ کیا پیش نظر مقالے سے صاف صاف یہ عیاں نہیں کہ دورِ حاضر کا نظریۂ قومیت مولانا اصلاحی کے نزدیک گوناگوں اور بد سے بدتر مفاسد کا نہایت متعفن مجموعہ ہے۔ ایسے مفاسد جو لباس کی طرح خارجی نہیں ہیں خون اور اعضائے رئیسہ کی طرح داخلی ہیں جنکی سمیت کا اثر لینا نہ لینا اس نظریئے کو اپنانے والے کی اختیاری شے نہیں بلکہ وہ اس نظریئے کے ہمراہ اسی طرح لپٹے چلے آئیں گے جیسے غلاظت کو چھوکر آنے والی ہوا کے ساتھ بدبو اور شراب کے ساتھ نشہ۔ وہ گندے کیڑوں کی طرح خود اسی کی کوکھ سے جنم لیں گے۔ وہ اس کی فطرت، اس کا مزاج، اس کی جدا نہ ہونے والی تاثیر بن چکے ہیں۔

ایک بار مقالہ گرامی کے خط کشیدہ فقروں پر دوبارہ نظر ڈال لیں۔ تقابلی مطالعہ کے لئے ہم مثالاً دو عبارتیں آمنے سامنے رکھتے ہیں۔

سن ساٹھ میں مولانا نے فرمایا تھا:۔

"دوسری خرابی اس کے اندر یہ ہوتی ہے کہ ان عوامل سے بنی ہوئی قومیتیں بالتدریج خود حق اور باطل کے لئے معیار کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ ان کے اندر عصبیت کا جو جذبہ ہوتا ہے وہ انکے مخصوص تقاضوں کی تحریک سے بالآخر اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ "میری قوم" خواہ حق پر ہو یا باطل پر۔"

اب سن ترسٹھ[۶۳] میں مولانا فرماتے ہیں:۔

[۵۱] لیکن جمال عبدالناصر کی تحریک قومیت سب سے پہلے مذہب ہی کو بیڑیوں میں جکڑ کر سیاست اور معاشرت کے دائرے سے باہر دھکیل رہی ہے

"قومیت میں فساد اس وقت شامل ہوتا ہے جب
یہ بجائے خود حق و باطل کی کسوٹی بن جائے اور اسکا
تعصب یہ جارحانہ اور کافرانہ روپ دھار لے کہ
"میری قوم! خواہ حق پر ہو یا باطل پر"
سن ساٹھ کی عبارت کا مفہوم و مدلول ہی نہیں منطوق
بھی آپ دیکھیں یہی تو ہے کہ آج کی قومیتیں جن عوامل سے
ترکیب پا رہی ہیں مولانا کے نزدیک وہ عوامل اپنی فطرت
اور ساخت ہی کے اعتبار سے ایسے ناخلف ہیں کہ انکی ساختہ
پرداختہ قومیت رفتہ رفتہ خود حق اور باطل کا معیار بنکر رہتی
ہے اور ان دنی فطرت عوامل کے ناگزیر تقاضے جذبۂ
عصبیت کو لازماً اس مقام تک پہنچا کر دم لیتے ہیں جہاں کا
نعرہ ہے۔

"میری قوم! خواہ حق پر ہو یا باطل پر"

مثال کی ضرورت محسوس فرمائیں تو یوں سمجھئے کہ مولانا
کی دانست میں نظریۂ قومیت کسی سادہ کاغذ کی مانند نہیں
کہ جس پر اچھی یا بری جو چاہے تحریر آپ لکھ لیں بلکہ وہ ایک
ایسا کاغذ ہے جس پر نہایت پختہ روشنائی سے زہریلی تحریریں
ثبت ہیں۔ ان تحریروں کا ایک کیمیاوی عمل ہے جو مہلک
شعاعیں اور تباہ کن گیس خارج کر رہا ہے۔

یا یوں سمجھئے کہ آج کا نظریۂ قومیت موصوف کے نزدیک
نبیذ جیسا سیال نہیں ہے جو نشہ آور ہونے کے لئے بعض خارجی
عوامل کا محتاج ہو، بلکہ وہ عین شراب ہے جس کے ایک ایک
قطرے میں نشہ روح کی طرح سمایا ہوا ہے۔ وہ ایسا محلول ہے
جس میں زہر گھول دیا گیا ہے۔

اب سن ترپسٹھ والے منقولہ بالا فقرے پر نظر کیجئے تو
جھٹکا سا لگے گا کہ یہ کیا؟ اس فقرے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ
نظریۂ قومیت کے ناگزیر اور غیر منفک مضرات و مفاسد
کی نشاندہی کے لئے جو لمبا مضمون مولانا نے سپرد قلم فرمایا
تھا وہ محض مذاق تھا۔ یہ نظریہ نہ بجائے خود برا ہے نہ اسکے
بطن سے کسی مفسدے کا پیدا ہونا لازم و ضروری ہے۔ یہ تو
ایک ورق سادہ ہے جس پر آیات لکھ لیں تو اسے مصحف

کہیں گے۔ یہ ایک سادہ شربت ہے جسے سڑا کر شراب نہ
بنانا آپ کے اختیار میں ہے۔ سوءِ اتفاق سے اگر یہ
ہی کافرانہ روپ دھار لے تب بھی آپ فقط اتنا ہی
سکیں گے کہ اس میں فساد "شامل" ہو گیا۔

"شامل" کا لفظ خصوصیت سے داد طلب ہے
جب مولانا آج کے نظریۂ قومیت کی ہجو لکھنے پر آمادہ
دیکھ لیجئے کہ کس طرح تن ہمہ داغ داغ کا سماں پیدا کر دیا
لیکن آج جمال عبدالناصر کا اقبال انھیں اس نظریے
کے حق میں اس حد تک شفیق و کریم بنا گیا ہے کہ جب یہ
صریح کافرانہ روپ دھار لے اس وقت بھی وہ فقط اتنا
ہی کہیں گے کہ اس میں فساد شامل ہو گیا ہے یہ نہیں کہیں گے
کہ یہ مکمل طور پر فاسد ہو گیا ہے۔ زندہ باش۔

تمھاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو مرے نامۂ سیاہ میں ہے

نفسیاتی وجہ

اب سنئے کہ ہمارے ناقص خیال میں مولانا اصلاً
کے اس تضادِ مبین کی معنوی بنیاد کیا ہے اور کیوں ان
جیسا فطین و ذکی آدمی اپنی ہی تضاد بیانی کا احساس
نہیں کر پا رہا ہے۔

بے بنیاد بدظنی کرنے والے پر خدا کی لعنت۔
حقیقت کسی بھی ایسے شخص سے جو غیر جانبداری سے
مولانا کی تحریریں پڑھ رہا ہو پوشیدہ نہیں ہے کہ جماعت
اسلامی سے ترک تعلق کرنے کے بعد جماعت اسلامی سے
عموماً اور مولانا مودودی سے خصوصاً ان کی ناراضگی
غم و غصہ اور سوءِ ظن بڑھتا ہی چلا گیا۔ بڑھنے کا مطلب
یہ نہیں کہ اس کا طول و عرض پھیل گیا بلکہ فروغ و اضافہ
کیفی نوع کا ہے یعنی نقش اور گہرے اور گہرے ہوتے
ہیں۔ شعور سے گذر کر اب ان نقوش کا عکس تحت الشعور
میں بھی جاگزیں ہو چلا ہے، بلکہ ہو چکا ہے جیسے
ہوا میں مرچ بس جاتی ہے اسی طرح کدورت ا

[illegible]ری میں رچ بس گئی ہے - اب اس کی بھی ضرورت نہیں کہ مولانا مودودی کا تخطیہ کرتے ہوئے وہ ارادہ بھی تخطیے کا رکھتے ہوں، بلکہ جس طرح سونے والے کے خوابوں میں پامال امنگوں اور کچلی ہوئی تمناؤں کے لرزیدہ سائے غیر شعوری طور پر آپ سے آپ تھرتھرانے لگتے ہیں ٹھیک اسی طرح محترم اصلاحی صاحب کی تحریروں میں بھی انکی تحت الشعوری کیفیات آپ سے آپ لہلہا اٹھتی ہیں -

کون نہیں جانتا کہ مولانا مودودی کچھ عرصے سے حکومتِ حجاز کی بارگاہ میں تھوڑی بہت قدر و منزلت کے مستحق گردانے جا رہے ہیں اور پھر کون نہیں جانتا کہ جمال عبدالناصر کا مصر آج حجاز کا دوست نہیں حریف بن چکا ہے - نعرۂ قومیت کو مرحبا - اس نعرے نے پوری دنیائے عرب کو نئے بھونچالوں سے روشناس کرایا ہے عوامل اور بھی ہیں لیکن چھری پر دھار نعرۂ قومیت ہی نے رکھی ہے - یہ نعرۂ قومیت وہ نہیں ہے جس کا تعارف مولانا اصلاحی نے ۱۹۶۳ء میں کرایا - یہ وہ ہے جس کا تفصیلی تعارف وہ ۱۹۶۰ء میں کرا چکے ہیں - اس کے برگ و بار سن ساٹھ والے ہی مضمون سے درسِ حکمت لیکر پھوٹے ہیں - یہاں مقصود سیاسی اسباب و علل کی گہرائیاں ناپنا نہیں - بہرحال مسلّم واقعہ ہے کہ مصر اور حجاز دو حریف کیمپوں میں تبدیل ہو چکے ہیں - مولانا مودودی نے اگرچہ حجاز کا ردیف بن کر کوئی ردّ و قدح مصر پر نہیں کی ہے، لیکن ان کے زبان و قلم سے وقتاً فوقتاً ایسے حقائق پر روشنی ضرور پڑی ہے جو صاحب الفضیلۃ جمال عبدالناصر کے حق میں نہیں جاتے - علاوہ ازیں خدائے مصر نے جو کچھ اخوان کے ساتھ کیا اسے منظرِ عام پر رکھنے اور اس پر احتجاج و فریاد کرنے کا جرم بھی مولانا مودودی کی جماعت اسلامی سے سرزد ہو چکا ہے - ان دونوں چیزوں پر مستزاد بارگاہِ حجاز میں مولانا مودودی کی قدر و منزلت - یہ تو کریلا اور نیم چڑھا والا مضمون ہوا - کیسے غضب کی بات ہے کہ جس شخص کی کج فہمی، کم علمی، ہوا پرستی اور کوتاہ قامتی کو مولانا امین احسن جیسا مفکر و مدبر واضح کر رہا ہو اسے حرمین شریفین کے والی سر آنکھوں پر جگہ دیں - یہ تو صریح اشتعال انگیزی ہے بالواسطہ توہین ہے - یہ اندھیر اگر مولانا موصوف کی خودی کو پیچ و تاب میں نہ مبتلا کرتا تو تعجب تھا - کر گیا تو ہرگز تعجب نہیں - اسی پیچ و تاب کا فنکارانہ مظہر وہ تضاد ہے جس پر ہم جھک مار رہے ہیں - تعصب بڑی ظالم چیز ہے یہ شعبدہ گر رائی کو پہاڑ اور پہاڑ کو چھچھوندر بنا کر دکھا سکتا ہے - ہرگز نہ سمجھیے کہ جمال عبدالناصر کی صفائی پیش کرتے ہوئے مولانا اصلاحی نے جو چھینٹے مولانا مودودی پر اڑائے ہیں ان کے بارے میں وہ بد دیانت ہیں - ہرگز نہیں - ان کی دیانت ہم سے زیادہ قوی اور انکا ایمان ہم سے کہیں بڑھ کر پختہ ہوگا، لیکن تحت الشعور کی وسیسہ کاریوں اور رچے بسے تعصب کی فتنہ طرازیوں کو وہ کیا کریں - لکھتے نیت نیک سے ہیں لیکن الفاظ آپ سے آپ ایک خاص رنگ دبیلئے ہوئے نوکِ قلم تک آتے ہیں اور کاغذ پر بکھر جاتے ہیں - آپ نے دیکھا ایک اچھے خاصے عالمِ دین رسول اللہؐ کو حاضر و ناظر کہہ رہے ہیں — کیا یہ بد دیانت ہیں؟ کیا ان کی نیت فاسد ہے - ہرگز نہیں - جو شخص نفسیات کی ابجد سے بھی واقف ہوگا وہ ضرور مانے گا کہ یہ مشرکانہ قول ارادۂ شرک کا ثمرہ نہیں - اس کے پیچھے بدنیتی کا کوئی شائبہ نہیں یہ تو فقط ثمرہ ہے ذہن کی اس کجی کا جس کا ذرا بھی شعور ان صاحب میں نہیں پایا جاتا - یہ تو آوردہ ہے اُس مخفی جہل کا جسے غلط تعلیم اور مسموم صحبت نے ان صاحب کے قوائے فکری میں رچا بسا دیا ہے - آپ کتنا ہی سمجھائیے کہ محترم یہ شیطانی عقیدہ ہے - یہ رسولؐ کی توصیف نہیں خدا کی توہین ہے - یہ صاحب کسی قیمت پر نہیں مانیں گے، بلکہ اُلٹا آپ ہی کو گمراہ اور بد دین قرار دیں گے - ٹھیک اسی طرح مولانا اصلاحی بھی نہیں مان سکتے اور نہیں محسوس کر سکتے کہ اپنے ہی تین سال قبل والے مضمون کے مضمرات و مدلولات ہی سے نہیں اس کے منطوق تک سے انحراف کرتے ہوئے آج وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کے پیچھے ذاتی فکر کی کوئی خرابی یا تہہ نشین تعصب کی کوئی کارفرمائی جلوہ طراز ہے - ان کے ہم مشرب اور مولانا مودودی سے سنگین قسم کا بَیر رکھنے والے بھی عامر عثمانی کے تجزیے سے متفق نہیں ہوں گے بلکہ آپسے مولانا مودودی کا مرید، بکواسی، جھکّی نہ جانے کیا کیا قرار دیں گے

[illegible] سب قرار دینے کی پروا کسے ہے۔ پروا تو صرف
یہ ہی ذات کی ہے جس کے آگے ہم سب کو حساب دینا ہے
وہی دل و دماغ کی نس نس سے ہر کیف و کم کو جوں کا توں باہر
ہٹے گا اور پھر اپنی اپنی کرنی کے پھل سب کو تفویض ہونگے۔
اللہ تعالیٰ خود پرستی، غرور، احساسِ برتری اور انانیت سے

بچائے۔ ہمیں اپنے علم و فہم کی اصابت پر اصرار نہیں ہمارا
غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اہلِ بصیرت خود ہی غور فرمالیں کہ ہماری
معروضات مولانا مودودی کی اندھی حمایت پر مبنی ہیں یا واقعۃً
مولانا اصلاحی سے ہی چوک ہوئی ہے۔ ھذا اما عندی
والعلم عند اللہ

حضرت معاویہؓ کی سیاسی زندگی

اپنی نوع کی پہلی بے نظیر کتاب۔ اس میں حضرت معاویہؓ کی شخصیت آپ کے مقام اور حکمت و سیاست کا بھرپور تعارف اس طرح کرایا گیا ہے کہ کسی بھی صحابی کا دامن داغدار نہیں ہوتا۔ صحابیت کی تقدیس پر لاجواب کرا در تحقیقی و تنقیدی مواد۔ کتابت و طباعت، کاغذ سب عمدہ۔ مجلد مع حسین ڈسٹ کور۔
قیمت دس روپے -/۱۰

ہمارے عائلی مسائل

پوتے کی وراثت، ایک سے زائد نکاح، عمر نکاح اور احکام طلاق سے متعلق مغرب زدوں کے باطل و فاسد موقف کا قوی رد اور اسلامی موقف کی مدلل تشریح۔ پونے چار روپے

دو خاص نمبر

تجلّی کا خلافت نمبر — ایک روپیہ -/۱
چراغ راہ کا سالنامہ ۱۹۶۰ء — ڈیڑھ روپیہ ۱/۵۰

جانے پہچانے اور وہ جنھیں کوئی نہیں جانتا

مشہور شاعر جناب انور صابری نے اس کتاب میں بعض معروف اور بعض گمنام شعراء کے مختصر حالات اور اشعار کے نمونے جمع کئے ہیں۔ دلچسپ چیز ہے۔ قیمت چار روپے۔

سوانح مولانا حسین احمد مدنیؒ

یہ بھی انور صابری صاحب ہی کی پیشکش ہے۔ مولانا مدنیؒ کے حالات، ان کا شجرہ اور ضروری کوائف شعر کی زبان میں۔ مجلد ڈیڑھ روپیہ۔

حیات امام ابوحنیفہؒ

مصر کے مشہور عالم استاذ ابوزہرہ کی معرکۃ الآراء تالیف۔ امام اعظم سیدنا ابوحنیفہؒ کی زندگی کے تمام گوشوں کا سیر حاصل محققانہ اور بسیط تعارف۔ اُردو ترجمہ دلکش۔ پندرہ روپے -/۱۵

حیات امام ابن تیمیہؒ

یہ بھی استاذ ابوزہرہ ہی کی فاضلانہ عرق ریزیوں کا نتیجہ ہے۔ ابن تیمیہؒ کے افکار و آراء، اوصاف و خصائل اور احوال و کوائف کی تفصیلی سرگذشت۔ ۲۱ روپے -/۲۱

حیات امام احمد ابن حنبلؒ

یہ بھی استاذ ابوزہرہ ہی کے بلند ذوقِ تحقیق کا ایک بیش قیمت شہ پارہ ہے۔ امام احمدؒ کی شاندار سیرت۔ فولادی عزم و ہمت اور اونچے علم و فہم کا مکمل خاکہ۔ نو روپے۔

تحفہ اثنا عشریہ (اردو)

خانوادۂ ولی اللّٰہی کے فہیم و متقی عالم شاہ عبدالعزیزؒ کی مشہور تالیف جو نہایت مضبوط دلائل سے شیعی عقائد کا رد کرتے ہوئے عقائد صحیحہ کا قیمتی مواد پیش کرتی ہے۔ بارہ روپے -/۱۲

مشارق الانوار

مستند احادیث کو فقہی ترتیب سے پیش کرنے والی لاجواب کتاب جو ثابت کرتی ہے کہ حنفی فقہ کی بنیاد ارشاداتِ رسولؐ ہی پر ہے۔ اردو ترجمہ مع عربی۔ چودہ روپے -/۱۴

ابوذر غفاریؓ

جلیل القدر صحابی سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے ایمان افروز واقعات و حالات مفصل اور مستند۔ مجلد دو روپے۔

باندیوں کا مسئلہ (اللّٰہ الثمین) جہاد میں ہاتھ آئی ہوئی عورتوں کو باندی بنا کر رکھنے کی دینی وعلمی حیثیت - کتاب میں مصنف کا ایک خط اور مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ کا جواب بھی شامل ہے۔ ڈیڑھ روپیہ

خلاصہ اشرف السوانح مولانا اشرف علیؒ کے حالات و سوانح - دو روپے -/۲

فارابی معلم ثانی حکیم ابو النصر فارابیؒ کے علم وفضل انکی سوانح اور کمالات، تجزیہ فلسفہ ومنطق کے مفصل ومکمل حالات - پونے دو روپے۔ ۱/۷۵

محمد رسول اللہ مشہور مصری مصنف توفیق الحکیم کی کتاب کا عمدہ اردو ترجمہ، مکالمہ کے انداز میں لکھی ہوئی حضورؐ کی سیرت مقدسہ بے حد دلچسپ اور پرکیف - قیمت پانچ روپے۔ -/۵

ابوبکر صدیقؓ مصنفہ:- محمد حسین ہیکل مصری - ترجمہ:- شیخ محمد احمد پانی پتی - پانچ روپے

عمر فاروق اعظمؓ مصنفہ:- محمد حسین ہیکل مصری - ترجمہ:- حبیب اشعر - نو روپے -/۹

اشرف الجواب مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طرف سے بعض سوالوں کے اہم جواب - مکمل دو حصے ساڑھے چار روپے ۴/۵۰

حیات انورؒ فخر المحدثین مولانا انور شاہ صاحبؒ کا مفصل تذکرہ - آپکے علمی کمالات کا نقش جمیل -
قیمت چار روپے -/۴

منہاج العابدین (اردو) امام غزالیؒ کی سب سے آخری تصنیف جو آپ کی پوری زندگی کی تعلیمات کا خلاصہ اور تصوف کا نچوڑ ہے - مجلد آٹھ روپے۔

آئینہ نماز صرف نماز ہی کے نہیں بلکہ پانچوں ارکان اسلام کی تفصیل مع مسائل ضروریہ - ڈیڑھ روپیہ۔

حکیم الامتؒ کی مجلسیں مولانا اشرف علیؒ کی روح نواز مجالس کا پرکیف تذکرہ۔
قیمت دو روپے -/۲

الفرقان شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کے ایک روح نواز رسالے کا اردو ترجمہ - جس میں کرامت و بزرگی کی علامات اور ولایت کی حقیقت پر لاجواب گفتگو کی گئی ہے - مجلد مع حسین کور، قیمت چار روپے - -/۴

رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ پر قاضی سلیمان منصورپوریؒ کی شہرہ آفاق کتاب کا مختصر تعارف یہ ہے کہ اہل علم اسے علمی اعتبار سے مستند مانتے ہیں اور انداز بیان دلکشی، رچاؤ اور دروبست کے لحاظ سے یہ اپنا جواب آپ ہے - سوز وگداز میں ڈوبا ہوا اسلوب ستھرا اور نکھرا ہوا نکھرا - عبارتیں رواں، شگفتہ اور دلنشیں - مدت سے یہ قیمتی کتاب نایاب تھی اب خاص اہتمام کے ساتھ تین جلدوں میں شائع کی گئی ہے - قیمت مکمل غیر مجلد بیس روپے۔ -/۲۰
(مجلد تین جلدوں میں ۲۵ روپے)

خصائل مسلمین شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے پوتے شاہ محمد اسحاقؒ کی مشہور کتاب "مسائل اربعین" کا اردو ترجمہ - چالیس مروجہ بدعتوں کا رد مستند کتب فقہ کے حوالوں سے - مجلد دو روپے۔ -/۲

سوانح خواجہ معین الدین چشتیؒ محبوب العارفین حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی اثر انگیز سوانح حیات - جو اجمیر کی خاک میں استراحت فرما رہے ہیں - قیمت ساڑھے چار روپے ۴/۵۰

الوسیلہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کی مشہور کتاب جس میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ قرآن میں وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ کہہ کر اللہ نے جس وسیلے کی طرف توجہ دلائی ہے وہ آخر کیا ہے؟
قیمت مجلد نو روپے -/۹

اصح السیر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر لاجواب کتاب، محققانہ مگر دلچسپ، مستند وقیع اور بیش بہا - سیرت کی کتابوں میں اس کتاب کو اپنا جواب آپ مانا گیا ہے - قیمت مجلد دس روپے۔

از:- ملا ابن العرب مکی

مستقل عنوان

مسجد سے میخانے تک

ایک مظلوم شوہر گرمیوں کی دوپہر میں ٹھیک بارہ بجے گھر لوٹا۔ اس کا معدہ مارے بھوک کے حلق تک چڑھ آیا تھا۔ اسے توقع تھی کہ اس کی شوہر پرست بیوی باورچی خانے کی پیڑھی پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ لیکن جب وہ اکسٹھ باسٹھ کرتا ہوا گھر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ باورچی خانہ تو ویران پڑا ہے اور بیوی دالان کے پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نوشت و خواند میں مشغول ہے۔

جی ہاں نوشت و خواند! بیوی کے ایک ہاتھ میں قلم تھا اور دوسرے میں اخبار۔ وہ زیر مطالعہ مضمون پر ٹک مارک لگاتی جا رہی تھی اور گاہے گاہے ایک کاغذ پر کچھ لکھ بھی لیتی تھی۔ اخبار کا مطلب آپ نے غلط سمجھا۔ وہ فی الحقیقت اخبار نہیں تھا مگر رسالہ بھی نہیں تھا وہ ایک بین بین چیز تھی۔ ویسے اسکی پیشانی پر "اخبار" ہی لکھا ہوا تھا مگر ظاہر ہے خچر کے ماتھے پر آپ گدھا یا گھوڑا لکھ دیں تو وہ اپنی نسل نہیں بدل لے گا۔ بہرکیف شوہر مارے غصے کے آگ بگولا ہو گیا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا بیوی کے سر پر پہنچا مگر بیوی اپنے شغل میں اس درجہ منہمک تھی کہ اسے اب بھی شوہر کی آمد کا احساس نہیں ہوا۔ دراصل شوہر کی طرف اس کی پشت تھی یا آسان لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ شوہر کا منہ اس کی پشت کی طرف تھا۔

شوہر نے فرط غیظ میں ارادہ کیا کہ پستول نکال کر بیوی کی عین گدی پر داغ دے مگر اس کے پاس پستول نہیں تھا پستول تو اس نے سوائے فلم کے کہیں دیکھا بھی نہیں تھا۔ پھر اس نے ارادہ کیا کہ شیر کی طرح دہاڑے لیکن وہ ایسا بھی نہ کر سکا۔ کیونکہ ایک پرانی یاد اس کے ارادے اور عمل کے درمیان مخل ہو گئی۔ ایک بار اس نے اپنے دوست صوفی منظوم سے ٹریننگ لے کے بیوی پر شوہرانہ طمطراق کی آزمائش کی تھی نتیجے میں اسے دو وقت مونگ کی دال اور تیسرے وقت بینگن کا بھرتہ کھانا پڑا تھا۔ مونگ کی دال تو خیر آدمی اگل نگل کر کھا بھی لے مگر بینگن کا بھرتہ — اس کا تو فقط نام ہی اسے بلڈ پریشر میں مبتلا کر دیا کرتا تھا۔

پھر اس نے کیا کیا؟

میں بتاتا ہوں کیا کیا — صبر کیا! — جی ہاں اس نے صبر کیا جس کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ آپ تاؤ کھائیں گے کہ معاذ اللہ اگر صبر ہی کرنا تھا تو شوہر بننے کی کیا ضرورت تھی۔ میں کہتا ہوں اگر آپ میری جگہ ہوتے تو آپ کو بھی صبر ہی کرنا پڑتا کیونکہ جس شوہر کا تذکرہ ہے وہ تو خود میں ہی ہوں۔ میں ہی ہوں وہ سیاہ بخت جو دوپہر میں بھوکا پیاسا لوٹا تھا اور میری ہی بیوی وہ بیوی ہے جو آمادۂ انتقام ہونے کی صورت میں بینگن کا بھرتہ ضرور اُبالتی ہے۔

جب اس اللہ کی بندی کا انہماک کسی طرح ختم ہونے میں نہ آیا تو میں نے فقط اتنا کیا کہ عین کان کے قریب منہ لیجا کر فاختہ کی بولی بول دی۔ یہ حرکت بچکانہ تھی یقیناً تھی لیکن مجھے ایسا شخص دکھلائیے جو دن رات کے چوبیس گھنٹے میں کسی نہ کسی وقت بچہ نہ بن جاتا ہو۔ آپ کی بیوی [illegible] مچ کی بیوی ہے تو قسم کھا کے بتائیے کیا آپ بھی دفعتاً اس کے سامنے بچہ نہیں بن جاتے . . . . . . نہ نہ . . [illegible] سے پہلے بات سمجھ لیجئے بچہ بننے کے لئے یہ ضروری نہیں

آپ فاختہ ہی کی بولی بولیں یا خدا نخواستہ گدھے کی طرح
ڈھینچوں ڈھینچوں کریں بچ نکلنے کے ہزار ڈھنگ ہیں میں تفصیل
میں جاؤں گا تو بات زلفِ یار کی طرح دراز ہو جائے گی۔
مختصر یہ ہے کہ میں نے فاختہ کی بولی بولی اور ضرور بولی۔ اگر
صوفی مسکین کا معاملہ ہوتا تو شاید میں گدھے کی بولی بولتا
لیکن آپ نے سنا ہوگا دنیا کے سب سے بڑے انسان ﷺ نے
عورتوں کے بارے میں فرمایا ہے:۔

"یہ آبگینے ہیں!"

پھر بھلا فاختہ سے بڑھ کر نرم و نازک آواز کس کی
ہو گی۔

"ہائے اللہ ـــ" وہ بے طرح چونکی "آپ تو زندگی
بھر بچے ہی رہیں گے۔"

"اور تم عین جوانی میں بوڑھی ہو جاؤ گی۔ یہ اپنے بھیا
کی طرح ماتھے پر درجن بھر شکنیں ڈال کر قلم گھسنا بڑھاپے کے
سوا کیا کہلائے گا۔ غالباً تم تنقید کی ٹانگ توڑ رہی تھیں؟"

اس کے چہرے پر جھینپا ہوا سا غصہ نمودار ہوا۔

"جب آپ نے لاپروائی اختیار کر لی ہے تو پھر آپ کا
فرض بھی کو انجام دینا ہو گا۔"

"یعنی؟" میں نے نہ سمجھنے کا مظاہرہ کیا۔

"آئے دن لوگ بھیا کے خلاف لکھتے رہتے ہیں آپ کے
کان پر جوں بھی نہیں رینگتی۔"

"کیوں رینگے۔ تمہارے بھیا بھی تو کان رکھتے ہیں ان پر
کوئی جوں کیوں نہیں رینگتی؟"

"ان کی بات اور ہے۔ اپنی ذات کے خلاف
کئے گئے حملوں کا خود دفاع کرنا وہ اپنی توہین سمجھتے ہیں آپ کو
حمیت ہوتی تو یہ فرض آپ کا تھا۔"

"میرا کیوں تھا۔ مجھے کلیر شریف جانے کے لئے آٹھ
دن کی چھٹی درکار تھی تمہارے بھیا نے نہیں دی۔ میں بے
چھٹی کے چلا جاتا تم نے پیسے نہیں دیئے۔ یہ ہے تم دونوں کا
کردار پھر بھلا میں کیوں تمہاری یا تمہارے بھیا کی پروا
کروں۔"

"شرم آنی چاہیئے آپ کو۔ بڑے اچھے لگتے داڑھی
لگا کر طوائفوں کا گانا سنتے۔"

"تو لاؤ پیسے دو میں داڑھی منڈوا کر چلا جاؤں گا۔
ویسے اگر تم بھی میرے ساتھ چلو تو یہ ضرور دکھلاؤں گا کہ زنانِ
عاشقانِ اولیاء کے حجرے میں داڑھیوں کی پوری کھیتی
لہراتی ہے۔"

"لہراتی ہو گی" وہ الکسا کے بولی "آپ جا کے نہا دھو لیجئے۔
غسل خانے میں سب سامان تیار ہے۔"

"وہ تو ہے پہلے یہ بتاؤ تمہارے چہرے پر ڈھائی کیوں
بج رہے ہیں؟"

"آپ ہی کا کرم ہے۔ اچانک کان میں کوک دیتے۔
گھر میں چوروں کی طرح چپکے چپکے آنا بڑی تکلیف دہ بات ہے۔"

"چپکے چپکے۔ تو کیا میں بگل بجاتا آیا کروں۔ یوں کیوں
نہیں کہتیں کہ کسی فلمی سورما نے تمہارے بھیا کی بڑی کس کے خبر
لی ہے بس اسی کے صدمے میں تم ہوش و حواس کھو بیٹھی ہو۔"

"ہوش و حواس کھوئیں میرے دشمن۔ ہاں آپ کی
طرح پتھر بھی نہیں ہوں کہ کسی بات کا اثر ہی نہ ہو۔ آپ تو کہا
کرتے تھے کہ اہلِ حدیث لوگ بڑے مسکین ہوتے ہیں۔"

"اب بھی کہتا ہوں۔ یہ ہمارے صوفی مسکین بھی تو ایک
زمانے میں اہلِ حدیث ہی تھے مگر کسی دنبالۂ عالم کے پھیر میں
آ کر قلندر بن گئے۔"

"دنبالۂ عالم؟"

"ہاں۔ جس عورت کی چوٹی گھٹنے تک لمبی ہو اسے
دمبالۂ عالم کہتے ہیں۔ بالائی دُم۔"

"اچھا اچھا آپ غسل خانے جائیے۔"

غسل خانے میں دیر نہیں لگی۔ اتنے میں ملائن بھی اپنی
نارمل حالت پر آ گئی۔ عجیب بات ہے کہ ملائن ویسے تو بڑے سے
بڑے حادثے کا مقابلہ حیرتناک تحمل سے کر جاتی ہے گی۔ شاید
یہ میری موت پر بھی نہ روئے، لیکن اپنے بھیا کے معاملے میں
یہ بالکل موم ہے ذرا آنچ لگی اور پگھلا۔

"کیوں نیک بخت" میں نے کھانے کے دوران پوچھا

"اگر ایک ڈاکو پستول تان کر تم سے پوچھے کہ بتاؤ عامر عثمانی کو ماروں یا ملا ابن العرب مکی کو تو تمھارا جواب کیا ہوگا؟"

"میں کہوں گی فقط مجھے مار دو مجھ میں ان دونوں کی رُوح سمائی ہوئی ہے۔"

"بکواس۔ اب وہ زمانہ نہیں کہ تہہ خانے میں پنجرا ہے، پنجرے میں طوطا ہے طوطے میں کالے دیو کی روح ہے۔"

"کیسے نہیں۔ کیا اب بھی لوگ بت نہیں پوجتے۔ اگر اتنا بڑا خدا ایک مورتی میں سما سکتا ہے تو دو انسانوں کی روحیں کسی تیسرے جسم میں کیوں نہیں سما سکتیں۔"

"استغفر اللہ۔ کیا تمھارا خیال ہے ڈاکو روحانیات کا فلسفہ پڑھ کر یہاں آئے گا۔ کان کھول کر سن لو میرا ڈاکو فقط مڈل پاس ہوگا یا ہو سکتا ہے اس نے اسکول ہی کا مُنھ نہ دیکھا ہو۔"

"تو پھر میں کہوں گی کہ گھر میں جو کچھ ہے سمیٹ لے جا، خون خرابہ کر کے کیا لے گا۔"

"اُنھ مفروضات کا جواب یوں نہیں ہوا کرتا۔ ہم نے فرض کیا ہے کہ وہ دو میں سے ایک کو ضرور شوٹ کرنا چاہتا ہے اب انتخاب تمھارے ہاتھ ہے۔"

"میں فرض کرتی ہوں کہ اس کے پستول میں گولی ہی نہیں ہے وہ تو فقط آٹھ روپے والا کھولنا لئے پھر رہا ہے۔"

"تو یہ جواب میرے سوال کا دو۔ مان لو وہ سچ مچ ہی ریوالور تانے کھڑا ہے پھر؟"

"کیوں مان لوں —— اچھا چلئے مان لیا۔ پھر آپ بھی سمجھ لیں کہ میں اسے چیٹے مار مار کر ادھ موا کر دوں گی۔"

"تمھیں منطقی مباحث کی تمیز نہیں ہے۔ لعنت بھیجو لاؤ وہ اخبار دکھاؤ۔"

"نہیں دکھاؤں گی۔ آپ پہلے وعدہ کریں اس کا جواب دیں گے۔"

"تم تو خود لکھ رہی تھیں لاؤ وہ بھی دکھاؤ کیا موتی بکھیرے ہیں۔"

"میں نے کچھ نہیں لکھا۔ میں بچاری کیا لکھتی۔"

"بچاریاں تو بہت لکھتی ہیں۔ آج کل ہر ادبی پرچے میں کسی نہ کسی بچاری کا شہ پارہ ضرور ملتا ہے۔"

"افسانوں کی اور بات ہے۔ ہم جھاڑو پھری عورتیں علمی مضمون کیا لکھیں گی۔"

"یہ لکھنوی ادائیں رہنے دو لاؤ دکھاؤ کیا لکھا ہے۔"

"ہرگز بھی نہیں آپ پیچھے پڑیں گے تو اخبار بھی چولھے میں رکھ دوں گی۔"

"تم بیوی ہو یا لاٹ صاحب —— لاؤ اخبار ہی لاؤ۔"

اب وہ چیز میرے ہاتھ میں آ ہی گئی جس کے بارے میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ نہ وہ اخبار ہے نہ رسالہ مگر اسکی پیشانی پر اخبار لکھا ہوا ہے۔ گویا اس کا نام یقیناً اخبار ہے مگر جنس نامعلوم جنس کی تحقیق آپ کرنا ہی چاہیں تو اتنا اتا پتا اور دیئے دیتا ہوں کہ پورا نام ہے:۔

"اخبار اہل حدیث"

اس میں کسی "سمراوی" بزرگ نے عنوان جمایا تھا۔

"مدیر تجلی کا قلم"

سمراوی کی پہیلی میں نہ بوجھ سکوں گا۔ ہو سکتا ہے وہ سمرسٹے کے رہنے والے ہوں۔ ہو سکتا ہے سمرقندی کو کاتب نے سمراوی بنا دیا ہو۔ ہو سکتا ہے سمرا کسی گاؤں کا نام ہو۔ یہ تیسرا ہی قیاس زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ مضمون کا اسلوب اور دروبست اسی کا مؤید ہے۔ سچ پوچھئے تو میں جھوم جھوم گیا۔

آپ خود سوچئے جس شخص سے آپ بیزار ہوں جسکی ایک ایک ادا آپ کو زہر لگتی ہو اسے کوئی بے نقط سُنانے لگے تو آپ کو کتنی خوشی ہوگی۔ مجھے سب سے زیادہ حسد اس لئے بھی ہے کہ ملا جی اپنے بھیا پر جسے اُردو میں مدیر تجلی کہتے ہیں جان دیتی ہے۔ بھائی پر جان دینا کوئی عیب نہیں۔ وہ اگر ترتیب گڑبڑ نہ کرتی تو مجھے کوئی اعتراض نہ تھا مگر اس نے تو غضب یہ ڈھایا ہے کہ اگر آپ اس سے پوچھیں تم بہن پہلے ہو یا بیوی؟ تو وہ پھٹ سے کہے گی پہلے بہن پھر بیوی۔ یہ ٹھیک ایسا ہی ہے جیسے مسلمانوں سے سوال کیا جاتا ہے کہ تم پہلے مسلمان ہو یا پہلے ہندوستانی تو فلاں قسم کے مسلمان [illegible]

ہیں ۔ جواب دیتے ہیں کہ پہلے مسلمان پھر ہندوستانی۔ یہ غلط آرائی
جواب جس طرح جن سنگھ اور ہندو مہاسبھا وغیرہ کو فرطِ حسد سے
شعلہ جوالا بنا دیتا ہے اسی طرح میں بھی بیوی کی خواہرانہ ذہنیت
کے انگاروں پر لوٹتا ہوں۔

آپ شاید کہیں یہ ترتیب تو قدرتی ہے۔ پہلے بہن پھر
بیوی۔ میں عرض کروں گا قدرتی ہے تو ہوا کرے۔ یہ بھی تو
قدرتی ہے کہ کچھ لڑکیاں بدصورت ہوتی ہیں اور کچھ خوبصورت
پھر کیوں پہلی بیچاریاں دوسری بیچاریوں سے جلتی ہیں ؟

الحاصل میں نے مضمون پڑھا اور دل ہی دل میں مزے
لیے۔ ظاہر میں تو اظہارِ غم ہی ضروری تھا۔ احتیاطاً دو چار
لمبے سانس بھی لئے تاکہ ان پہ آہِ سرد کا اطلاق ہو سکے۔

"واقعی بڑا دردناک حادثہ ہے۔" میں نے مضمون ختم
کرکے کہا "میرے خلاف اگر کوئی ایسا لکھتا تو میں تو فوجداری
کیس قائم کرتا۔ تم نے اپنے بھیّا کو بھی دکھایا ؟"

"دکھایا تھا۔"

"پھر ؟"

آغاز کا ایک پیرا پڑھا پھر اخبار مجھے لوٹا دیا۔"

"لوٹا دیا۔"

"ہاں کہنے لگے فاضل مضمون نگار کا بنیادی خیال ہی
غلط ہے پھر آگے کیا پڑھا جائے۔"

"خوب"

"یہ بھی کہا کہ پورا مضمون تو پڑھ لینا اگر کوئی علمی بات
قابلِ التفات نظر آئے تو نشان لگا کر رکھنا۔"

"تم نے پوچھا بھی کہ پہلے ہی پیرے میں انھیں بنیادی
غلطی کیا نظر آ گئی۔"

"پوچھا تھا۔ کہنے لگے یہ جو فاضل مضمون نگار نے میری
ذات کے بارے میں دو فقرے لکھے ہیں یہ دونوں ہی اُلٹے ہیں۔"

"کونسے فقرے ؟"

میں نے اخبار ملائن کی طرف بڑھایا۔ اس نے ذیل کے
فقروں پر انگلی رکھدی :-

"گو ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ عامر صاحب ایک
صاحبِ علم اور گہرے مطالعے کے آدمی ہیں۔ تاہم اتنا
ضرور کہیں گے کہ فطرت کی کجی اور ٹیڑھا پن ہر جگہ اپنا
رنگ لاتی ہے اور تعصب و عناد ہر مقام پر اپنا اثر
دکھاتا ہے۔"

"ہوں۔ تو اس میں اُلٹا پن انھوں نے کیا واضح فرمایا۔"
میرے الفاظ میں شاید طنز کی بو تھی۔ وہ تیورا کے بولی :-

"بس ختم کیجئے۔ آپ کو بھیّا سے خواہ مخواہ کا بیر ہو گیا ہے۔"

"معاذ اللہ میں نے کونسی گالی دی ۔۔ بھاگوان اتنی بھی
ذکاوتِ حِس مرض کہلاتی ہے۔"

"کیوں آپ مسکرائے کیوں۔ آپ کی مسکراہٹ میں تمسخر تھا۔"

"باپ رے۔ تم نے نفسیات کب سے پڑھی ہے۔ میں تو
فقط تمھاری دلداری کے لئے مسکرایا تھا۔ لو اب مسکراؤں تو
گولی مار دینا۔ ہاں تو الٹا پن ان فقروں میں کیا تھا ؟"

"بھیّا کہنے لگے کہ اس عبارت میں دو اندازے ہیں اور
دونوں ہی غلط ہیں۔ میرے علم و مطالعے کو صرف وہی لوگ
گہرا کہہ سکتے ہیں جو خود گہرے نہیں ہیں میرا علم و مطالعہ ایک
معمولی طالب علم سے زیادہ نہیں اور میری فطرت صرف
ایسے ہی لوگوں کو کج نظر آ سکتی ہے جن کی اپنی فطرت کا زاویہ
ٹیڑھا ہے۔"

"فطرت کا زاویہ ؟"

"یہ انھی کے الفاظ ہیں۔ میں خود بھی نہیں سمجھی تھی
مگر انھوں نے ایک مثال سے سمجھا دیا۔ کہنے لگے ایک بھینگا
آدمی کسی بھی شے کو اس کی ٹھیک حیثیت میں مشکل ہی سے
دیکھ سکتا ہے۔"

"مگر فطرت بھینگی نہیں ہوتی۔" میں نے اعتراض کیا

"نہ ہوتی ہو گی اب میں ان کے منھ تھوڑی آتی۔"

"خیر پھر تم نے کیا کہا ؟"

"میں کیا کہتی۔"

"کہا ہوتا کہ کم سے کم تیس چالیس ہزار آدمی آپ کے
علم و مطالعے کے بارے میں ایسی ہی رائے رکھتے ہیں۔ کیا ان
سب کی فطرت بھینگی ہے ؟"

"آپ ہی ان سے سوال جواب کیجئے گا میں نے تو فقط اتنا ہی کہا تھا کہ بھیّا آپ اس مضمون پر کچھ تو لکھیں کہنے لگے تم بچی ہو۔ جو مضمون صرف میری ذات سے بحث کرتا ہو اس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم پڑھ کر مجھے بتانا کہ اس میں مضمون نگار نے کتنی خاص مسئلے پر بھی اختلاف رائے کیا ہے یا صرف مجھ سے ہی ناراض ہے۔"

"تو تم نے کچھ نکالا؟ —— ٹک مارک تو بہت سے لگائے ہیں۔"

"لگائے تو ہیں مگر بھیّا شاید ہی انھیں لائق التفات سمجھیں۔ آپ نے بھی تو پڑھ ہی لیا بتائیے سوائے اظہار ناراضگی کے اس میں کونسا پیرا، کونسی سطر علمی ہے۔"

"پھر تم کیا خامہ فرسائی کر رہی تھیں؟ غالباً دو تین فل اسکیپ صفحے تو سیاہ کر ہی دیئے ہوں گے۔"

"انھیں چھوڑیئے آپ اپنی رائے کا اظہار فرمائیں۔"

"فرماؤں؟ یعنی یہ تم مجھ سے درباری بول رہی ہو!"

"آپ بھی تو بھولے بچے بن رہے ہیں بتائیے نا آپ نے مضمون پڑھ کر کیا محسوس کیا؟"

"بڑا صدمہ محسوس کیا۔ دل میں میٹھا میٹھا درد محسوس کیا۔"

"میرا سر محسوس کیا —— ڈھنگ سے جواب ہی نہیں دیتے۔"

"ٹھیرو میں ذرا بازار تک ہو آؤں، لوٹ کر اظہار خیال کروں گا۔"

میں نے دیکھ لیا تھا کہ جب میں دالان سے کمرے میں پہنچا تھا تو ملائن نے اپنا قلم کاغذ پھرتی سے نارکشتی والی صندوقچی میں رکھ دیا تھا جو دالان کے تخت پر رکھی تھی۔ وہ نصف بہتر ہونے کے باوجود نہیں جانتی کہ میری پشت پر بھی آنکھیں ہیں۔ در اصل کمرے کی سنگھار میز کے آئینے میں دالان کا منظر صاف نظر آ گیا تھا۔

دالان سے گزرتے ہوئے میں نے بڑی صفائی سے صندوقچی اٹھائی اور گھر سے باہر نکلا چلا گیا۔ تعاقب کا اندیشہ نہیں تھا کیونکہ بچے سب اپنے نانا کے گئے ہوئے تھے اور وہ ملازمہ بھی دو دن کی چھٹی پر تھی جسے دیکھ کر میں خود کو نواب محسوس کرنے کی سعیِ نامشکور کیا کرتا ہوں۔

آئیے آج ملائن کا اندازِ تنقید بھی دیکھیے۔ اس میں تسلسل اور باقاعدگی تو نہیں ملے گی مگر اس بہن کی زندہ تصویر ضرور ملے گی جو اپنے بھائی کو دیوانہ وار چاہتی ہے۔ اس نے کہیں کہیں سے مضمون کی عبارتیں نقل کی تھیں اور ہر عبارت کے بعد اپنے تأثرات قلم دیئے تھے۔ دل تھام کر ملاحظہ ہو:۔

م سے مراد مضمون کا اقتباس اور ت کا مطلب ملائن کا تأثر۔

م

"ہر ہٹ گائے (یعنی بے نکیل اونٹ) کا نام آپ حضرات نے ضرور سنا ہوگا۔ ان کی شرارت وایذارسانی ضرب المثل ہے۔ عامر صاحب کا قلم بھی ہر ہٹ گائے اور شتر بے مہار سے کچھ کم نہیں ان کا اندازِ تحریر ہر ہٹ گائے کی ایذارسانی سے کہیں زیادہ فتنہ انگیز ہوتا ہے۔"

ت

واہ بزرگوار۔ لکھنے کا شوق تھا تو قلم پکڑنے کا سلیقہ بھی سیکھتے۔ کیا تماشا ہے "ہر ہٹ گائے" کا مفہوم بے نکیل اونٹ بتاتے ہو پھر دو ہی تین سطر بعد یہ دونوں الگ الگ وجود بن جاتے ہیں۔ ایسی نادانی تو شاید پرائمری کے بچے بھی نہ کریں۔

خیر ڈاکٹر اقبال کا ایک شعر سنو:۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

عامر صاحب کا قصور بس یہی تو ہے کہ انھوں نے تہذیب جدید کے مکتب میں سخن سازی، منافقت، طمع کاری اور مصلحت پرستی کے ڈھنگ نہیں سیکھے وہ پرانے لوگوں کی طرح بے لاگ کھری کھری سناتے ہیں۔ وہ اصلاً نہ حنفی ہیں نہ شافعی نہ

[illegible] اور فقط مسلمان ہیں۔ ان کی زبان سمجھنا چاہتے ہو تو مسلمان ہو، خالص مسلمان ۔۔۔!

م

"عامر صاحب کی عامیانہ تقلید نے ان کی نگاہوں کو اس قدر بے نور کر دیا ہے اور قوت بینائی کو اس طرح چھین لیا ہے کہ ۔ ۔ ۔"

ت

خدا تمھیں غارت کرے، ایسی بے رحمانہ باتیں قلم سے کیوں نکالتے ہو۔ باغی غدار۔ تمھیں دعویٰ اہل حدیث ہونے کا ہے۔ کیا ہمارے پیارے حضورؐ نے بھی یوں منھ بھر کے کسی کو کوسا تھا۔ (ملا کہتا ہے۔ یہاں ملائن کے ہوش و حواس، علم و فہم سب ڈوب گئے۔ دوسرے لفظوں میں اسکی کھوپڑی کے انجر پنجر سب ڈھیلے ہو گئے۔ یہاں وہ صرف عورت ہے۔ عورت اور بہن جو جذبات کے طوفان میں تنکے کی طرح بہہ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ادھورے ہی اقتباس پر بپھر گئی۔ بقیہ جملہ آگے آتا ہے)

م

"۔ ۔ ۔ چھین لیا ہے کہ وہ اس بات سے معذور ہو گئے ہیں کہ اپنی بصارت و بصیرت سے کام لیکر اپنے علم و تفقہ کے ذریعے نمائش غلافِ کعبہ کے مسئلے کی تہہ تک پہنچ سکیں۔"

ت

اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ تم اہلِ حدیث لوگ مقلدوں سے بڑھ کر مقلد ہو۔ فرق بس یہ ہے کہ مقلدین صفائی سے خود کو مقلد کہتے ہیں اور تم پکے مقلد ہو کر بھی تقیہ کر جاتے ہو۔ تمھاری تقلید کی ڈور ایسے لوگوں سے بندھی ہوئی ہے جو خیر القرون سے گیارہ بارہ صدیوں کے فاصلے پر رہتے ہیں۔ حالانکہ بیشتر مقلدین کے اماموں کا فاصلہ خیر القرون سے دو صدی بھی نہیں۔ پھر قہر یہ ہے کہ تم سطح بینی کو حدیث دوستی سمجھتے ہو حالانکہ موتی کبھی سطح پر نہیں ہوتے وہ تو تہہ میں ملتے ہیں۔ تم میں سے جو غوّاص بھی ہے وہ بسا اوقات صدف کو موتی سمجھ بیٹھتا ہے حالانکہ صدف تو چند پیسے کے سیپ سے زیادہ کچھ نہیں۔ موتی اندر ہے۔ ویسے میں ایمان نہیں نگلوں گی تم میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو موتی نکال کر لائے ہیں۔ ان پر سلامتی ہو مگر تم پر سلامتی بہت مشکل ہے تم تو جہل مرکب میں گرفتار ہو۔ خدا محفوظ رکھے۔

م

"اہلِ حدیث کے بھی چند ذی علم حضرات نے اس مبارک موضوع پر مضامین سپرد قلم کئے تھے اور بدلائل قاطعہ یہ ثابت کیا تھا کہ غلافِ کعبہ کی نمائش فی نفسہ صرف بدعت ہی نہیں، بلکہ اپنے اندر بہت سے ایسے مضر اثرات کو بھی لئے ہوئے ہے جو اسلام کی حقانیت پر کیچڑ اُچھالنے کے مرادف ہیں۔"

ت

لاطائل پروپیگنڈے اور غل غپاڑے کو دلائل قاطعہ کہتے ہو۔ شرم تم کو مگر نہیں آتی۔ بدعت کی رٹ تم نے کیا لگائی اسلام کو بھی کفر بنا ڈالا۔ تمھی جیسے لوگوں نے یہ کچے پکے فتوے دیئے تھے کہ بوٹ پہننا حرام۔ ریل گاڑی میں بیٹھنا حرام نماز میں اتفاق سے بھی پائنچے ٹخنوں کو ڈھک گئے تو نماز فاسد۔ حقہ سگریٹ حرام۔ ہیٹ لگانا حرام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مکرومت۔ ہو سکتا ہے ایسے فتوے جھاڑنے والے بعض احناف بھی ہوں مگر ہر حنفی ذہنی اعتبار سے حنفی نہیں ہوتا۔ مغز میں گودے کی ایک خاص مقدار حنفیت کو جنم دیتی ہے۔ مقدار گھٹ گئی یا گودے میں کیڑے پڑ گئے تو سمجھ لو اصلی حنفیت ختم۔ باقی جو بچے گا وہ فقط مغلئی پاجامہ ہو گا یا چوغہ اور ایک مٹھی داڑھی۔

م

"جب عامر صاحب کی نظروں کے سامنے ایسے مدلل و مبرہن مضامین آئے تو ان کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں اور ان کا ماتھا بڑے زور سے ٹھنکا ۔ ۔ ۔"

ت

محاورے لکھنا سیکھو۔ کوئی زبان داں اس موقع پر ماتھا

جھینپنے کا محاورہ دیکھ پائے گا تو اپنا سر پیٹ لے گا۔

م

"اور اپنے آپ کو جب اہل حدیثوں کے مضامین کے جواب سے معذور و مجبور پایا تو بہت سٹپٹائے اور نگاہیں مارے شرم کے جھینپ گئیں۔"

ت

حد کر دی تمہاری جہالت نے۔ ماں کے پیٹ سے اُردو بولتے ہوئے نکلے ہو اور اتنا بھی نہیں جانتے کہ نگاہوں کا مارے شرم کے جھینپنا کوئی محاورہ نہیں ہے۔ کسی دیہاتن سے بھی پوچھو گے تو وہ بتا دے گی کہ نگاہیں مارے شرم کے جھکتی ہیں جھینپتی نہیں۔ تم لوگ حدیثوں سے بھی ایسے ہی اُلٹے سیدھے مفاہیم نکالتے ہو۔ جو اپنی مادری زبان کے محاورے صحیح استعمال نہ کر سکے وہ حدیث کی محاوراتی زبان کو کیا خاک سمجھے گا۔

عامر صاحب جھینپے ہوں یا نہ جھینپے ہوں مگر میں نے انھیں روتے ضرور دیکھا ہے۔ وہ اس لئے روتے ہیں کہ اہلِ علم کی بے بصری اور کج روی ان کے دل و جگر پھوڑا بن چکے ہیں۔ وہ روتے ہیں کہ یا اللہ اہلِ نظر کو کیا ہو گیا۔ بصیرت کہاں گئی۔ للہیت اور خلوص کو کس نے نگل لیا۔

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی

جھک جھک کرنے والے ہر طرف ہیں مگر ژرف نگاہی کا دُور دُور پتا نہیں۔ لڑنے کو ہر عالم تیار مگر محبت اور بھائی چارے کا جذبہ برف کی طرح یخ۔ مودودی کا کابوس خدا کی پناہ۔ مودودی دشمنی میں بعضوں نے تو غلافِ کعبہ کے جشن کو "ناپاک" جیسے لفظوں سے متصف کرنے میں بھی دریغ نہیں کیا بلا سے ہم جہنم میں جائیں مگر مودودی کو رسوا ضرور کریں گے۔ کر لو جی بھر کے کر لو خدا نے چاہا قبر میں کیڑے پڑیں گے منکر نکیر مار مار کے دہرا کر دیں گے۔ قیامت کے دن سائے کو ترسو گے۔

(ملا کہتا ہے، معاف کیجئے گا ناظرین عورت بہر حال عورت ہے وہ جب تک کوسے گی نہیں چین سے نہیں بیٹھے گی اس کے کوسنے پانی کے بلبلے ہوتے ہیں ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں)

م

"عامر صاحب! ایسی بعید از قیاس باتیں کہنے کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ یا تو آپ کے سامنے اہلِ حدیثوں کے علمی کارنامے آئے ہی نہیں۔"

ت

بس رحم کرو۔ جو سچ مچ اہلِ حدیث تھے تم نے انکی لٹیا ڈبو دی۔ نام رکھ لیا اہلِ حدیث مگر کھوٹے اور کھرے کی تمیز نہیں۔ بدنام کنندۂ نکو نامے چند۔ اے بزرگو جو اصلی اہلحدیث تھے وہ تو عامر صاحب کے بھی ممدوح ہیں۔ مگر کوئی تم کو بھی تم گھی منواؤ تو اس کی توقع عامر صاحب سے فضول ہے۔

برو ایں دام بر مرغِ دِگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

(ملا کہتا ہے یہ خالص بہن بول رہی ہے ورنہ آپ نے بھی سُنا ہو گا اور کم سے کم میں نے تو سُنا ہی ہے کہ عنقا کے دُم ہوتی ہے مگر اس بہن کے بھیا کو میں نے کبھی دُم سمیت نہیں دیکھا یہ میری نظر کا قصور ہے تو فاضل مضمون نگار کی طرف سے میں ملا ان کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ اپنے بھیا کی دُم ثابت کرے)

م

"شاید شکیل بدایونی نے آپ ہی جیسے متکبر اور دماغی پروازیوں میں مست لوگوں کے لئے کہا تھا۔

رونقِ چرخ دیکھنے والو
کچھ زمیں پر بھی چاند تارے ہیں"

ت

"دماغی پروازیوں" کے الفاظ جس شخص کے قلم سے نکل گئے ہیں وہ اگر خالص ولایتی نہیں تو اینگلو انڈین ضرور ہونا چاہیئے کاش آپ جیسے لوگ شیخ سعدی کا یہ شعر گرہ سے باندھتے۔

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

کیا آپ کے گروہ میں کوئی مادر زاد ہندوستانی نہیں

دینے ہے تو اس سے پوچھئے "دماغی پروازیوں" کس چڑیا کا نام ہے۔ بڑے بھائی! اہل حدیث کا مقدس لقب پلید مت کرو۔ پہلے تولو پھر بولو۔ تولتے ہوئے ڈنڈی مت مارو۔ ڈنڈی مارنی ضروری ہے تو آٹے دال کی دکان کھول لو۔ اور ہاں شکیل بدایونی تمھیں کیوں یاد آئے۔ کیا کل ہی کوئی پکچر دیکھی ہے۔ شرماؤ نہیں شکیل واقعی اچھے شاعر ہیں مگر نوشاد نے کیا خطا کی ہے جس کا ذکر تم بھول گئے۔ رفیع اور لتا کا بھی تذکرہ آجاتا تو تمھارے مضمون میں چار چاند لگ جاتے کیونکہ شکیل کے گانوں کو چار چاند یہی سب لگاتے ہیں۔

نہ نہ۔۔۔۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ شکیل کا شعر لکھنا فلم بینی کی قطعی دلیل ہے۔ نہیں بھائی صاحب یہ تو میں نے اندازاً کہا۔ غلط ہے تو ہزار بار توبہ۔ ویسے آپ کے حسن بیناہ تقدس سے جو تارک نماز کا جنازہ پڑھنا بھی حرام سمجھتا ہے یہ توقع نہیں تھی کہ ساری دنیا کے شاعر چھوڑ کر آپ کو بے اختیار شکیل بدایونی یاد آجائیں گے۔ علم النفس اگر کوئی چیز ہے تو پیچ بتائیے اس اتفاق کو کیا نام دیا جائے؟ اوہ! تو یہ آپ نے مشاعرے میں سنا تھا یا ٹھہریئے شاید "رعنائیاں" میں پڑھا ہوگا۔ کوئی بات نہیں آپ آئندہ مجروح سلطانپوری، قمر جلال آبادی، ساحر لدھیانوی جس کے چاہے شعر لکھیے دنیا یہی سمجھے گی کہ ماشاء اللہ لٹریری مطالعہ کافی وسیع ہے۔ یہ فلمی گانوں کی ایک ایک آنے والی کتابیں بھی تو آج کل لٹریچر ہی میں شامل ہیں۔ انھیں ہر شخص سینما ہال میں قدم رکھے بغیر بھی خرید سکتا ہے۔

دل کہتا ہے کہ یہاں ملائن انتقام کی رو میں بہہ گئی اہل حدیث لوگ کبھی سینما نہیں دیکھتے نہ وہ فلمی گانوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ گانے سے حظ اٹھانے کے لئے جس قسم کا گناہگار ذہن درکار ہے وہ اگر آدمی کی کھوپڑی میں ہو تو وہ حنفی بن جاتا ہے اہل حدیث نہیں رہ سکتا۔ ثبوت یہ ہے کہ مولانا آزادؒ گانے کے رسیا تھے پس ان کی اہل حدیثیت دھاروں دھار بہہ گئی۔ مانا وہ حنفی بھی نہ بن سکے لیکن بن جاتے اگر وزیر بننے کے بعد بھی انھیں غریب اسلام سے کچھ دلچسپی باقی رہ گئی ہوتی۔ الہلال و البلاغ والا ابو الکلام تو یقیناً حنفی تھا کیونکہ اس وقت بھی موسیقی سے اس کا ذہنی رشتہ بڑا گہرا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ بظاہر اس نے احناف ہی کے خلافِ مسلک گاہے ماہے کچھ لکھ دیا ہو لیکن جڑ بنیاد سے وہ حنفی ہی تھا۔ پھر وہ وزیر بن گیا اور حنفیت اور اہل حدیثیت دونوں باہوں میں باہیں ڈالے پکچر ہاؤس چلی گئیں۔ آج بھی جس کا جی چاہے مولانا آزادؒ کے مزار پر جاکر دیکھے۔ بالکل پاس والے میدان میں جہاں احناف اور اہل حدیث دونوں چار چار آنے میں تیل مالش کراتے ہیں شکیل بدایونی کا یہ مشہور نغمہ ——— جی ہاں نغمہ فضا میں رچا بسا ملے گا۔

یہ دنیا گول ہے
اوپر سے ڈھول ہے
اندر سے دیکھو پیارے بالکل خولم خول ہے

قسم لے لیجئے میں نے "چودھویں کا چاند" نہیں دیکھا —— یہ تو ملائن دیکھ کر آئی تھی۔ ملائن کا کمال یہ ہے کہ ایک دفعہ وہ بہشتی زیور بغل میں دبا کر سینما چلی گئی تھی۔ جب انٹرویل ہوا تو بہشتی زیور کا مطالعہ کرتی رہی۔ اس "جام و سنداں باختن" پر اسے نوبل پرائز ملنا مگر پرائز صوفی قنریل مار لے گئے" وہ رمضان میں افطاری اور مصلی لے کر شام والے شو میں پہنچ گئے تھے۔ کرتے بھی کیا فلم "رنگین راتیں" عین رمضان میں لگا تھا اور شوال تک چلنے کی امید نہیں تھی۔ روزہ تو گھڑی دیکھ کر افطار لیا اور مغرب انٹرویل میں پڑھ لی۔

درکفے جامِ شریعت درکفے سندانِ عشق

میں نے غیرت دلائی تھی تو دانت کٹکٹا کے بولے تھے:۔
"تم وہابی ہو۔ ہم میاں کے اشارے بغیر نہیں گئے تھے۔"

"میاں؟"
"ہاں اپنے بڑے سجادے صاحب۔"
"تو کیا وہ ہر حرام کو حلال کر سکتے ہیں؟"

"ضرور کر سکتے ہیں مگر تم جیسے وہریڑوں کے لئے نہیں، جو چیلا بن جائے اسے سب طرح کے مقامات سے گزرنا پڑتا ہے"

"یہ کونسا مقام تھا جو سنیما کے بیچوں بیچ ہو کر گذرتا ہے؟"

"باقی باللہ فانی فی اللہ۔ اس میں قبض اور بسط کے برزخ سے گذرنا پڑتا ہے۔"

"قبض اور بسط کا برزخ؟"

"اور کیا۔ روح نور کا قالب پہن کر لامکاں کے چکر کاٹتی ہے۔"

"اللہ اکبر۔ بیٹ میں مروڑ بھی ضرور ہوتا ہوگا؟"

"کیا؟" وہ برا سا منھ بنا کر غرّائے۔

"بگڑتے نہیں۔ مجھ گدھے کا خیال ہے کہ قبض اور بسط کا برزخ پیچش ہی ہو سکتا ہے۔ نہیں ایک بات کہتا ہوں"

"ملعون وہابی نکلو یہاں سے۔"

(ملّا زندہ صحبت باقی)

اعلان

ماہ اگست ۶۳ء کے ماہنامہ تجلّی میں کسی ایک طالب علم نے مدیر تجلّی سے کچھ سوالات کئے ہیں اور ان میں جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں ان کو غلط طور پر میری طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ میں اپنی اس تحریر کے ذریعے اعلان کرتا ہوں کہ ان خیالات سے مجھے دور کا بھی واسطہ نہیں اور نہ یہ میرے خیالات ہیں۔

عبید الرحمان الرحمانی
دار العلوم احمدیہ سلفیہ
دربھنگہ

محمد حسین چشتی ۔ کشمیر

پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ کا مسئلہ

پراویڈنٹ فنڈ کے مسئلہ پر تجلی میں معقول و منقول دونوں پہلوؤں سے کافی لکھا جا چکا ہے اور ہمارے نزدیک یہ بات بلا ریب طے ہے کہ دورانِ ملازمت میں یہ فنڈ وجوب زکوٰۃ سے مبرّا ہے۔ لیکن چشتی صاحب کا مضمون پھر بھی تحصیل حاصل نہیں کیونکہ یہ موضوع کے ان واقعاتی گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے جو تجربے اور خصوصی واقفیت ہی سے جانے جا سکتے ہیں موصوف کے اُس مکتوب کا بھی ایک پیرا مضمون کے آغاز میں دیا جا رہا ہے جو انھوں نے اس مضمون کے ساتھ رقم فرمایا ہے۔ ہمیں حیرت ہے۔ اور قارئین کو بھی اس حیرت میں ہمارا ساتھ دینا چاہئے کہ فاضل مدیر زندگی نے اس مضمون کو شائع نہیں کیا حالانکہ اس کا لب و لہجہ اور اس کے مطالب دونوں اس کے مستحق تھے کہ زندگی انھیں اپنے لئے باعثِ عار نہ سمجھا۔ علمی دیانت کا بھی یہی تقاضا تھا کہ مدیر زندگی اسے شائع کرتے ہوئے اس پر نقد فرماتے۔ لیکن انھوں نے کیوں اس کی اشاعت سے انکار کر دیا یہ وہ اور ان کا خدا ہی جان سکتا ہے۔ ہم بہرحال اسے جگہ دیتے ہیں۔

میں نے جی پی فنڈ کی زکوٰۃ کے مسئلے پر مدیر "زندگی" رام پور کو ایک مضمون بھیجا تھا تاکہ زندگی میں شائع فرما دیں۔ لیکن انھوں نے شائع کرنے سے انکار کیا تو میں نے مضمون واپس منگا لیا۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ یہ مضمون اگرچہ آپ کے مضمون کے خلاف ہے پھر بھی زندگی میں شائع ہو کر تقابلی مطالعے کا کام دے گا۔ انھوں نے پھر بھی شائع نہ کیا۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اسے "تجلی" میں شائع کر دیں گے۔

آپ کا بھائی　محمد حسین

ماہنامہ زندگی رام پور کے فروری ۱۹۶۳ء کے رسالے میں مولانا سید احمد قادری کا مضمون بعنوان بالا شائع ہوا ہے یہ مضمون راقم الحروف کی نظر سے گذرا۔ اس میں تفصیل کیساتھ بحث کی گئی ہے اور مضمون نگار نے علمی اور دینی نقطۂ نگاہ سے اپنے خیالات کو پیش کیا ہے۔ اخیر میں فنڈ کے بارے میں مولانا نے اپنی رائے کو مختصر انداز میں تحریر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ "فنڈ پر زکوٰۃ لازم آتی ہے۔"

راقم الحروف نہ عالم دین ہے نہ اُسے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ فاضل مدیر کے ساتھ بحث میں پڑ جائے۔ لیکن اس حیثیت سے کہ وہ ایک سرکاری ملازم ہے پراویڈنٹ فنڈ ادا کرتا ہے اور اس سے متعلق حالات اور تفصیلات سے کچھ واقف ہے یہ حق رکھتا ہے کہ وہ بھی تجربے کی بناء پر اِس بارے میں اپنی رائے پیش کرے۔

فاضل مضمون نگار نے مضمون کے اخیر میں لکھا ہے کہ پچانوے فیصدی ملازمین اپنی تنخواہوں سے فنڈ خوشی کٹواتے ہیں اس لئے اس رقم پر زکوٰۃ لازم آتی ہے۔ بندہ مضمون نگار کے اس دعوے کو مطابق واقعہ نہیں سمجھتا۔ یہ حقیقت ہے کہ گورنمنٹ یا پرائیویٹ اداروں نے پراویڈنٹ فنڈ کو ملازموں کی بہبودی کے لئے (اور اپنی سہولت کیلئے

ہی) قائم کیا ہے اور ایک ملازم کو ریٹائر ہونے کے وقت یا اُس کے عیال کو اُس کی وفات پر (اگر وہ دورانِ ملازمت میں مرجائے) اس جمع کی ہوئی رقم سے کافی مدد ملتی ہے۔ لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ تیس چالیس فی صد سے زائد ملازم نہیں ہونگے جو اپنی مرضی سے یہ رقم جمع کراتے ہونگے یہ کہنا کہ ۹۵ فی صدی ملازم یہ رقم بخوشی کٹواتے ہیں سراسر مبالغہ ہے۔

کساد بازاری اور مہنگائی کی وجہ سے اکثر غریب ملازم یہی چاہتے ہیں کہ پوری کی پوری تنخواہ اُن کے ہاتھ آجائے تاکہ وہ زندگی کی بنیادی ضروریات کو پورا کرسکیں — چونکہ گورنمنٹ یا پرائیویٹ ادارے اپنے ملازموں کی بہبودی کے لئے یہ رقم بہ جبر کاٹتے ہیں اس لئے عام ملازم صرف اُسی شرح پر فنڈ کٹواتے ہیں جو کم سے کم ہو۔ ورنہ زیادہ سے زیادہ شرح پر بھی کٹوایا جاسکتا ہے اور ملازموں کی اکثریت غریب ہی ہے۔

دوسری بات جو فاضل مضمون نگار نے پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ اُن کے خیال میں فنڈ گورنمنٹ کے پاس ودیعت ہوتا ہے اور ملازم کا اُس پر قبضۂ حکمی ہوتا ہے۔ اس رائے کے ساتھ راقم الحروف کو اختلاف ہے۔ جہاں تک فنڈ کے گورنمنٹ یا پرائیویٹ اداروں کے پاس ودیعت ہونے کا تعلق ہے اس میں صداقت ہے۔ لیکن یہ ایسی ودیعت نہیں کہ جب چاہو واپس حاصل کرلو یا استعمال کرلو۔ اِسی وجہ سے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس پر ملازم کا قبضۂ حکمی ہوتا ہے — کیا ذیل میں دیئے ہوئے حقائق کو پیش نظر رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ملازم کا اس پر سچ مچ قبضۂ حکمی ہے؟

۱۔ اگر کسی ملازم کے والدین یا بیوی بچوں میں سے کوئی مرجائے اور اُسے اس کی تجہیز و تکفین کے لئے روپے کی ضرورت ہو تو اُسے جی پی فنڈ سے روپیہ نہیں مل سکتا۔ بلکہ اس کام کے لئے فنڈ میں سے قرض بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔

۲۔ اگر کسی غریب ملازم کا مکان گرجائے تو اُسے مکان بنانے کے لئے فنڈ میں سے رقم حاصل کرنے کا حق نہیں۔ بلکہ اس کام کے لئے فنڈ میں سے بعض ملازمتوں میں قرض بھی نہیں مل سکتا۔

۳۔ اگر کوئی ملازم فنڈ میں سے قرضہ حاصل کرے تو اُسے اس رقم پر سود ادا کرنا پڑتا ہے جو وہ قرض کے طور پر حاصل کرلیتا ہے (یہ دوسری بات ہے کہ سود بعد میں اُس کے فنڈ کی رقم میں جمع کیا جاتا ہے)۔

۴۔ اگر کسی کی لڑکی بالغ ہو تو وہ اپنی جمع کی ہوئی فنڈ کی رقم کو اُس کے نکاح کے لئے استعمال نہیں کرسکتا (ہاں اُسے اس کام کے لئے فنڈ میں سے قرض مل سکتا ہے، لیکن وہ تو بہرحال قرض ہے اور اُس پر سود بھی دینا پڑتا ہے)۔

اس سے ثابت ہوا کہ دورانِ ملازمت میں اُسے فنڈ کی رقم پر تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں۔ کیا ایسے حالات میں فنڈ کی رقم پر دورانِ ملازمت میں اُس کا قبضۂ حکمی ہے جس پر زکوٰۃ لازم آتی ہو؟

راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ فنڈ کی رقم بلاشک ملازم کی رقم ہے اور ریٹائر ہونے پر ملازم کے لئے یہ ایک مادی سہارے کا کام دیتی ہے۔ لیکن دورانِ ملازمت میں اُسے اس پر کوئی مالکانہ استحقاق حاصل نہیں ہوتا۔ سچ پوچھئے تو یہ رقم عملاً ملازم کی اُس وقت ہوتی ہے جب وہ ریٹائر ہوجاتا ہے[۱]۔ اس لئے میرے خیال میں ملازمت کے دوران میں اس پر زکوٰۃ لازم نہیں آتی۔ چنانچہ راقم الحروف نے کئی سال ہوئے مولانا مودودی سے بھی اِس بارے میں استفسار کیا تھا۔ وہ خط اس وقت میرے پاس نہیں۔ البتہ میرا خیال ہے کہ انھوں نے بھی یہی رائے دی تھی کہ جو رقم مجبوراً دینا پڑے اُس پر زکوٰۃ لازم نہیں آتی، لیکن جو رقم اپنی مرضی سے دی جائے اُس پر زکوٰۃ لازم ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں یا دورِ خلافت میں

---

[۱] ہم یہاں تک کہیں گے کہ ریٹائر ہونے اور فنڈ کی رقم ہاتھ میں آنے کے دوران جو مدت دفتری قواعد کی خانہ پری میں صرف ہوتی ہے وہ بھی خارج از حساب ہی ہوگی۔ سالِ زکوٰۃ کا آغاز ٹھیک اُس وقت سے ہوگا جب یہ رقم کامل طور پر ہاتھ میں آجائے۔ تجلی

مسلمانوں۔ جیسے سرکاری یا غیر سرکاری ادارے نہیں تھے جو اپنے ملازموں سے بہ جبر فنڈ یا ایسی رقمیں اُنکی تنخواہوں سے کاٹتے ہوں اور پھر ملازمت کے اختتام پر اُنھیں واپس کر دیتے ہوں اس لئے ہمیں مروّجہ فنڈ کے معاملے میں اُس دَور سے بلا واسطہ (Direct) ہدایات نہیں ملتی ہیں۔

وہ جائداد ہی کیا ہے جو کسی سے بہ جبر وصول کی جائے اور اُس پر اُس کا تصرف نہ ہو۔ یہاں پوزیشن کچھ ایسی ہے کہ مدیون یعنی وہ ادارہ جس میں ملازمت کی جا رہی ہے جابر ہے اور دائن کی مرضی کے خلاف اُس کی خون پسینہ سے حاصل کی ہوئی کمائی کو بہ جبر وصول کرتا ہے اُس پر سود کھاتا ہے اور غیر اسلامی کاموں میں خرچ کرتا ہے جو بات دائن کو پسند نہیں۔

جولائی سنہ ۱۹٦۳ء سے ملازموں سے (Compulsory Deposit Scheme) کے تحت ٣٪ کے حساب سے بہ جبر فنڈ حاصل کیا جائے گا۔ یہ جی پی فنڈ کے علاوہ ہوگا اور یہ رقم کسی خاص مدت کے بعد ادا کی جائے گی۔ اگر مولانا سید احمد صاحب قادری کی بات کو تسلیم کیا جائے تو اس پر بھی زکوٰۃ لازم آئے گی کیونکہ یہاں بھی مدیون دَین کا معترف و مقر ہوگا۔ ایسے حالات میں اسلام کے احکام ایک مسلمان ملازم کے لئے وبال جان نظر آئیں گے کیونکہ ایک طرف اُسے جی پی فنڈ اور Compulsory Deposit ادا کرنا ہوگا اور دوسری طرف اس پر زکوٰۃ بھی ادا کرنا ہوگی۔ اس طرح اُس کو ہر طرف سے اقتصادی مار کا سامنا کرنا پڑے گا جو شارع کا مقصد نہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ مدیر زندگی کی رائے اسلام کی روح Spirit کے ساتھ تطابق نہیں رکھتی اور ہمیں صرف اُن رقوم پر زکوٰۃ دینی ہے جو ہم اپنی خوشی سے جمع کر لیتے ہیں۔ اُن رقوم پر زکوٰۃ لازم نہیں آتی جو بہ جبر کاٹی جاتی ہیں۔

نقد و تبصرہ مستقل عنوان

کھرے کھوٹے

چند اہم کتابوں کی رسید جو موصول ہو چکی ہیں

روح القرآن (آچاریہ ونوبا بھاوے) **تاریخ دعوت وعزیمت** (مولانا ابوالحسن علی) **رکعات تراویح** (مولانا حبیب الرحمان الاعظمی) **انوار الباری جلد اول** (مولانا سید احمد رضا) **قاموس القرآن** (مولانا قاضی زین العابدین) **خاتون پاکستان کا رسول نمبر** (کراچی)

ان پر انشاء اللہ جلد تبصرہ ہوگا

مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر

● مولفہ:- مولانا محمد تقی امینی ● شائع کردہ:- ادارہ علم و عرفان- اجمیر ● صفحات ۱۶۰ سائز خورد- لکھائی چھپائی غیر معیاری- قیمت مجلد تین روپے۔

مولانا امینی ان جلنے پہچانے لوگوں میں ہیں جن کے قلم کی قدر و قیمت کا اعتراف بعض اساتذہ نے بھی کیا ہے۔ وہ رواں لکھتے ہیں اور اس روانی میں علم و فہم کے لمعات کا عکس جمیل برابر دبتا ابھرتا رہتا ہے۔ ان کی تحریر کا مزاج ان کی عمر سے زیادہ متین اور سرد ہے۔ وہ کمال تحمل سے لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔

یہ کتاب ان کے فکر سنجیدہ کا ایک مفید اور وقیع مظہر ہے اس میں انھوں نے خاصی کاوش اور تفحص کے ساتھ مسئلہ اجتہاد کے ہر گوشے پر روشنی ڈالی ہے۔ اجتہاد کیا ہے اس کا دائرہ کہاں تک پھیلتا اور سکڑتا ہے۔ اس کی ضرورت کب اور کیوں ہوتی ہے۔ اس کے لئے کن صلاحیتوں کا پایا جانا لازمی ہے۔ اس کے مصادر و مبانی کیا ہیں وغیر ذلک یہ ساری وضاحتیں اس کتاب میں موجود ہیں۔ اس طرح کے موضوعات پر کام کرنے والوں کو اس کتاب سے خاصا خام مواد فراہم ہوسکے گا۔

رنج یہ ہے کہ طباعت و کتابت ڈھنگ کی نہیں ہوئی قیمت بھی زیادہ رکھی گئی ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو روپے مناسب تھے۔ دینی و علمی کتابوں کی اشاعت میں اگر کاروباری انتفاع کا جذبہ حد اعتدال سے بڑھ جائے تو خیر و برکت اٹھ جاتی ہے۔

وحدۃ الوجود والشہود

● مرتبہ:- ثناء الحق ایم-اے ● ناشر:- پاک اکیڈمی (۱۴۱ وحید آباد) گولیمار- کراچی ۱۸ صفحات ۱۶۰ لکھائی چھپائی کام چلاؤ- کاغذ سفید- قیمت ڈھائی روپے۔

"ہمہ اوست" کے مفہوم میں وحدۃ الوجود اور "ہمہ از اوست" کے مفہوم میں وحدۃ الشہود تصوف کی دو مشہور اصطلاحیں ہیں جن پر شیوخ و افاضل کے مابین ماضی میں بڑے ہنگامہ خیز مذاکرے ہوتے ہیں۔ آج کا دور ایسی اصطلاحات پر بحث تو در کنار ان کے تذکرے تک کا نہیں لیکن جس پس منظر میں پیش نظر کتاب منصۂ اشاعت پر آئی ہے وہ اس کے جواز کے لئے کافی ہے۔ دراصل یہ رسالہ فاضل مرتب کے نانا مولانا شیخ محمد تھانوی کا ہے۔ ممدوح تقریباً سو سال قبل کی ان تاریخی شخصیتوں میں

ہے جنھیں خانوادۂ ولی اللٰہی سے یک گونہ انتساب رہا ہے اور جن کے علم و تفقہ نے اپنے دائرے میں ممتاز خدمات انجام دی ہیں۔ شاہ عبد العزیزؒ کے عالی قدر نواسے شاہ محمد اسحٰقؒ جیسے عالم کا شاگرد ہونا کوئی معمولی اعزاز نہیں، یہی اعزاز ممدوح کو ولی اللٰہی خانوادے سے وابستہ کرتا ہے۔ اولاد ہونے کی حیثیت سے بھی شاہ اسحٰق صاحب کے لئے اس محترم ہستی کا ذکر و بیان بالکل بجا تھا۔ اور اس کی ذاتی خصوصیات بھی متقاضی تھیں کہ جو بھی حالات و کوائف میسر آ سکیں کتابی شکل میں محفوظ کر دیئے جائیں۔ شاید اسی لئے کتاب کا بڑا حصّہ مولانا مرحوم کے سوانح پر صرف کیا گیا ہے اور اصل رسالہ صرف ۳۵ صفحات کا ہے اس کی زبان فارسی ہے اور فارسی بھی تھوڑے دقیق۔ دقیق ہونی ہی چاہیئے تھی ایک تو مسئلہ غامض و عمیق دوسرے عربی الفاظ و اصطلاحات کا استعمال اس میں ناگزیر۔ بڑا اچھا ہوتا اگر اردو ترجمہ بھی اس کا ساتھ ہی کر دیا جاتا۔ ویسے اس کمی کو خود فاضل مرتب نے رسالہ سے قبل ہی ۱۵ صفحات اسی موضوع پر اردو میں لکھ کر پورا کرنا چاہا ہے۔ گو یہ صفحات بڑے بیش قیمت ہیں۔ ان میں مرتب نے لائق تحسین ایجاز کے ساتھ مسئلہ کا تعارف اور بعض چوٹی کی شخصیتوں کے اقوال و آراء کو شامل کیا ہے لیکن بایں ہمہ خود اصل رسالہ کے ترجمے کا خلا اس سے کما حقہ، پورا نہیں ہو سکا۔

سوانح کا حصّہ کافی دلچسپ اور فکر انگیز ہے اسمیں بعض اُن غلط فہمیوں کا بھی متانت اور خوش اسلوبی کے ساتھ ازالہ کیا گیا ہے جو "تذکرۃ الرشید" اور "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" کے بعض مندرجات سے پیدا ہوتی تھیں۔ مؤلف کے قلم میں شگفتگی اور روانی ہے درو بست (ٹکنک) اتنا کشش آمیز ہے کہ دورانِ مطالعہ طبیعت نہیں اُکتاتی ورنہ سوانح اور تذکرے عموماً بور ہوتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں اپنے سبھی اسلاف کے تذکار سے وقتاً فوقتاً بصارت و بصیرت کا رشتہ جوڑتے رہنا کئی لحاظ سے مفید ہے۔

صفحہ ۱۱۲ پر نہ جانے کیسے مرتب کے منجھے ہوئے قلم سے یہ فقرہ نکل گیا:۔

"۔۔۔۔اُن دلائل کو جو شاہ صاحب نے پیش کی تھیں تقویت پہنچانے کی سعی کی۔"

"دلائل" کا لفظ تو بلا اختلاف مذکر ہے۔ بعض اور جمعیں مثلاً سوانح، مصالح وغیرہ تو مؤنث اور مذکر دونوں طرح استعمال ہوتی ہیں لیکن دلائل اور کوائف وغیرہ کو مؤنث کہیں نہیں دیکھا۔

عام لوگ اصل رسالے سے کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکیں گے کیونکہ یہ فارسی میں ہے اور فارسی سمجھنے والے روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ۱۶۰ صفحات میں اس رسالے کا پھیلاؤ فقط ۳۵ صفحات میں ہے۔ ۱۵ صفحات اسی مسئلہ پر فاضل مرتب کے ہیں جو بڑے جاندار اور قیمتی ہیں۔ ان میں انھوں نے دو اساطین، شاہ ولی اللہ اور حضرت مجدد الف ثانی رحمہم اللہ کے نقاط نظر کو مختصراً پیش کر کے مسئلے کو قریب الفہم کر دیا ہے باقی سب صفحات سوانح پر مشتمل ہیں جو سب کے لئے دلچسپ ثابت ہوں گے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ

● از جناب سلام اللہ صدیقی
● ناشر:۔ مکتبہ اسلامی للہ پورہ (ناطمان) بنارس۔ صفحات ۸۲ قیمت ۸۸ پیسے

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں ام المومنین حضرت عائشہ رضؓ کے حالات و سوانح پیش کئے گئے ہیں۔ ویسے تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر زوجہ تمام مسلمانوں کی ماں اور ہر صاحب ایمان کی عقیدت و احترام کا ملجا ہے لیکن حضرت عائشہ اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر ان سب میں ایک امتیازی شان رکھتی ہیں۔ سرکارؐ کو سب سے زیادہ محبت آپ ہی سے تھی۔ آپ ہی کو اللہ تعالیٰ نے وہ علم و تفقہ اور فراست و بصیرت کا نور عطا فرمایا تھا جو آپ کا ہم عمر

سے اعجاز قدرت کا امتیازی نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ بلا کی ذہین، بیدار مغز، فقیہہ، صاحب الرائے۔ سیرت صورت عمل اسوہ ہر شے نورٌ علیٰ نور۔ کیسے نہ ہوتا دنیا کے سب سے بڑے انسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے التفات خاص کا مرکز ہونا ہی محاسن و مناقب کی محکم دلیل ہے۔ جوہری، پتھر کو آنکھوں سے نہیں لگاتا۔ جتنا قیمتی ہیرا ہوگا اتنا ہی جوہری کی نظر میں محبوب ہوگا۔

سلام اللہ صدیقی اپنی بعض تالیفات کے ذریعہ اہل علم سے روشناس ہو چکے ہیں۔ وہ تاریخ و روایت کے فن کا خاص ذوق رکھتے ہیں۔ قلم بھی ستھرا ہے۔ عقائد بھی نکھرے ہوئے ہیں۔ ایسا ہی شخص متناقض و متضارب روایات کے ذخیرے سے ثقہ اور مفید روایات چن کر لا سکتا ہے۔

یہ کتاب متوسط پیمانے پر حضرت صدیقہ رضؓ کے حالات سامنے لاتی ہے اور ہر مسلمان کے لئے قابل مطالعہ ہے۔ کاش کتابت کا انتظام کچھ اور بہتر ہوتا۔ کاغذ اچھا سفید ہے۔

اقلیت و اکثریت کے مسائل کتاب و سنت کی روشنی میں

● از مولانا عبد الرؤف رحمانی

ملنے کا پتہ:- عبد الرؤف رحمانی معرفت قاضی تبارک اللہ۔ بڑھنی بازار۔ وامدت گنج۔ ضلع بستی۔

اقلیت و اکثریت کا مسئلہ ہمارے زمانے کی نمو پذیر اصطلاحات کے چکر میں ایک ایسا سیاسی مسئلہ بن چکا ہے جس پر موٹی سے موٹی کتاب بھی لکھی اور بھاری بھرکم انداز میں لکھی جا سکتی ہے لیکن مولانا رحمانی نے اس مسئلہ کو اصطلاحات کے چکر میں الجھایا نہیں بلکہ ایک سادہ مزاج اور درد مند مسلمان کی طرح سیدھے سادھے اسلامی انداز میں پیش فرمایا۔ یہ انداز سیاسی مزاج رکھنے والوں کو تو نہیں جچے گا مگر عام لوگوں کے لئے دلچسپی اور افادیت سے لبریز ہے۔ مصنف نے اپنی عادت کے مطابق جگہ جگہ شعر بھی استعمال کئے ہیں جن سے انشاء کا رنگ نکھر آیا ہے۔ تاریخی مواد تو آپ کا خاص میدان ہے۔ روایات کے التزام سے آپ اپنی تحریروں کو لٹریری بنا لیتے ہیں۔ یہ کتاب بھی اس خصوصیت سے خالی نہیں۔ پڑھنے والوں کو اس کتاب میں بھی بہت کچھ ملے گا۔

صفحات ۹۶ لکھائی چھپائی کاغذ سب غنیمت
قیمت صرف ایک روپیہ۔ (عامر عثمانی)

SPIRIT AND MATTER RECONCILED

روح اور مادے میں نئے سرے سے مصالحت

از سید امین احمد مرحوم — بی۔ اے، بی۔ ایل، آئی، سی، ایس، ایڈوکیٹ پٹنہ ہائی کورٹ — سابق ممبر بہار لیجسلیٹو اسمبلی و کاؤنسل۔

صفحات ۱۲۰ مجلّد۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

ملنے کا پتہ:- مسز فاطمہ امین احمد مرحوم۔ نمائش روڈ۔ پٹنہ ۱۔ بہار۔ انڈیا۔

یہ کتاب انگریزی میں اس موضوع پر لکھی گئی ہے کہ زندگی نہ صرف روح ہے اور نہ صرف مادّہ بلکہ روح اور مادہ کا ایک امتزاج ہے اور یہ کہ اس "امتزاج" کو حاصل کرنے کا واحد راستہ خدا کا نازل کردہ آخری دین "اسلام" ہے۔ کتاب کا لکھنے والا یہ کتاب لکھ کر اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے چلا گیا، لیکن اس کی یہ قابل رشک مذہبی کاوش نہ جانے کتنے مردہ دلوں میں زندگی کی نئی روح پھونکنے کے لئے اس کے پیچھے زندہ رہے گی۔ مصنف مرحوم کے قلم سے جو "سوزِ دروں" ٹپک رہا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ انشاء اللہ یہ کتاب بہت دنوں تک زندہ رہے گی۔ کتاب و سنت کا مسلسل مطالعہ اس کتاب کے صفحات میں نچوڑ دیا گیا ہے۔ ترتیب و تشکیل بھی فکر انگیز ہے اور انداز تحریر بھی دل نشین۔ مصنف نے اپنی طرف سے آخری ابواب

میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن باقی کتاب میں وہ صرف کتاب و سنت کی ترجمانی میں محو ہیں۔ کہیں کہیں ترجمہ میں "آزادی" کی جھلک ملتی ہے مثلاً:-

"اور مضبوطی سے تھام لو سب کے سب مل کر اس رسّی کو جو خدا تمہارے لئے بڑھاتا ہے۔" (صفحہ ۱۳)

"جو خدا تمہارے لئے بڑھاتا ہے" بریکٹ میں ہونا چاہئے۔ کیونکہ آیت کے الفاظ کی تشریح میں یہ بات کہی گئی ہے۔ یا "قل ھو اللہ احد" کے ترجمہ میں "صمد" کے معنی "Eternal and Absolute" کئے ہیں حالانکہ اس کے معنی ہیں "بے نیاز۔ غنی" اور انگریزی میں اس کے لئے "Self-Sufficient" ہونا چاہئے۔

دوسری بات محلِ نظر یہ ہے کہ جہاں آیاتِ قرآنی کے حوالوں کا قابلِ قدر اہتمام کیا ہے وہاں احادیث کے حوالے نہیں دیئے گئے۔ یہ بڑی کمی رہ گئی۔ ان چند گوشوں کو چھوڑ کر پوری کتاب قابلِ قدر اور قابلِ استفادہ ہے۔

(شمس نوید)

TAJALLI DEOBAND U.P. Rgd .NO A 972

62
nP.

ایڈیٹر۔ عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

ماہنامہ چراغ راہ کراچی اپنی سابقہ روایات کے مطابق اکتوبر ۱۹۶۳ء میں منعقد ہونے والے کل پاکستان جماعت اسلامی کے موقع پر شائع کر رہا ہے۔ مزید تفصیلات کے لئے ایک پوسٹ کارڈ لکھکر فولڈر طلب فرمائیں۔

مضامین کی ایک مختصر جھلک

حصہ اول

- فریضہ اقامت دین
- مجدد الف ثانی اور انکی تحریک
- تحریک اسلامی شاہ ولی اللہ اور انکے بعد

حصہ دوم

- جماعت اسلامی کا موجودہ مرحلہ
- اسلامی انقلاب کیلئے جماعت اسلامی کی جدوجہد
- جماعت اسلامی اور جمہوریت
- جماعت اسلامی اور خارجہ پالیسی
- جماعت اسلامی اور خدمت خلق
- جماعت اسلامی کا معاشی پروگرام
- جماعت اسلامی کے اجتماعات
- جماعت اسلامی کا تربیتی پروگرام
- جماعت اسلامی عالمی لٹریچر میں
- تحریک اسلامی مشرقی پاکستان میں

حصہ سوم

میری تحریکی زندگی کا ایک اہم واقعہ (مختلف تاثرات)

حصہ چہارم

مذاکرہ: تحریک اسلامی کا مستقبل

حصہ پنجم

- داعی کے دعوتی خطوط

آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت اور خوبصورت سرورق کے ساتھ

ضخامت: ۳۰۰ صفحات   قیمت: ۴ روپے

عام اشاعت: فی پرچہ ۶۲ پیسے   سالانہ چندہ معہ خاص نمبر ۹ روپے

ناظم ادارہ۔ ماہنامہ چراغ راہ۔ ۵۷ وینس مینشن نکل روڈ۔ کراچی ۲

ہندوستان میں ترسیل زر کا پتہ ——— محمد منظور الحسن ۹۸/۸۸ پریم نگر۔ کانپور۔ یو۔پی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ
تجلّی
دیوبند

شمارہ ۸ — جلد ۱۵

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

سالانہ قیمت سات روپے

فی پرچہ ۶۲ پیسے

غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۱۸ شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پوسٹل آرڈر پر کچھ نہ لکھیے بالکل سادہ رکھیے

اشد ضروری

اگر اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس

پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ اگر آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا (وی پی سات روپے باسٹھ نئے پیسے کا ہوگا) منی آرڈر بھیج کر آپ وی خرچ سے بچ جائیں گے۔

پاکستانی حضرات:۔ ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیجکر رسید منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتہ ہمیں بھیجدیں تاکہ رسالہ جاری رہ سکے

فہرست مضامین مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۶۳ء

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

دفتر تجلّی دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی)

مدیر
عامر عثمانی
فاضل دیوبند

پاکستانی حضرات

نیچے لکھے ہوئے پتہ پر منی آرڈر بھیجکر وہ رسید ہمیں بھیجدیں جو منی آرڈر کرتے وقت ڈاکخانہ سے ملتی ہے رسالہ جاری ہو جائے گا۔

مکتبہ عثمانیہ۔ مینا بازار ۲۲۸۰
پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی (پاکستان)

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے "نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند" سے چھپوا کر اپنے دفتر تجلّی دیوبند سے شائع کیا

آغازِ سخن

ایک ہی موضوع پر لگاتار لکھنا قارئین کے لئے تو کوفت کا باعث ہونا ہی چاہیئے خود لکھنے والے کے لئے بھی کوئی خوشگوار مشغلہ نہیں لیکن حالات کے تقاضے اعادے اور تکرار ہی کے طالب ہوں تو پھر کیسے ان سے صرفِ نظر کیا جائے۔ آج غنیمت یہ ہے کہ پرسنل لاء کے موضوع پر فریاد و احتجاج کے عوض اظہارِ مسرت کی نوبت آئی ہے۔ ناشکری ہوگی اگر ہم تحدیثِ نعمت کے طور پر اس طمانیت بخش اطلاع کا ذکر نہ کریں کہ نہ صرف مرکزی حکومت نے مسلم پرسنل میں دخل دینے کا ارادہ فی الحال ختم کر دیا ہے بلکہ مہاراشٹر کی اسمبلی میں پیش شدہ ایک اور بل بھی۔ جو اسی نوعیت کا تھا دم توڑ چکا ہے۔

پھر مزید مسرت کی بات یہ ہے کہ اس تازہ فتنے کے کچوکوں سے چوکنا ہو کر ملت کے متعدد عمائد وا کابر نے کچھ کرنے کا بھی قصد فرمایا ہے۔ ایک طرف جمعیۃ العلمائے ہند نے آستینیں چڑھائی ہیں۔ دوسری طرف مولٰنا سید ابو الحسن علی ندوی کی دعوت پر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ممتاز علماء و افاضل کے اجتماع کے نتیجے میں ایک ادارے کی بنیاد پڑ گئی ہے جس کے کنوینر مولانا محمد تقی امینی صاحب طے پائے ہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ اصل خطا نہ حکومت کی ہے نہ اُن مسلمان نما انگریزوں کی جو پرسنل لائی فتنے کے محرک بنے ہیں۔ خطا تو ہماری کمزوریوں اور تن آسانیوں کی ہے مگر زور کو کوئی معاف نہیں کرتا۔ کسی بھی چھوٹے یا بڑے زخم کا مداوا ڈھونڈنا ہے تو صرف منفی طرزِ عمل، صرف فریاد و شیون سے کام نہیں چلے گا کچھ مثبت اقدامات بھی کرنے ہونگے، پامردی جفاکوشی اور جذبۂ صادق کا بھی ثبوت دینا ہوگا۔

اہلِ فکر اور ذی فہم علماء کے مسرت انگیز آغازِ کار کے بعد اس کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ ہم معاصر معارف اور برہان کے اداریوں پر گفتگو کرنے کا جو ارادہ پچھلے "آغازِ سخن" میں ظاہر کر چکے ہیں اسے ضرور ہی عملی جامہ پہنائیں۔ مقصود نہ تعقب تھا نہ خوردہ گیری۔ صرف اس اندیشے نے دل کو بیتاب کیا تھا کہ پرسنل لاء کے سلسلہ میں علماء کرام عملی جدو جہد کا جو خاکہ بنانے چلے ہیں اس میں دانستہ یا نادانستہ کسی غلط یا مریض فکر کی آمیزش نہ ہو جائے، لیکن الحمد للہ کہ لکھنؤ کے منعقدہ اجتماع میں مولانا سید ابو الحسن ندوی نے جو گراں قدر مقالہ پڑھا ہے اس سے خاصا سامانِ تسکین مہیا ہوا ہے اور اس اجتماع میں چونکہ معارف و برہان دونوں کے فاضل مدیر بھی موجود تھے اس لئے ان کا اتفاقِ رائے یقین دلاتا ہے کہ بات بگڑے گی نہیں۔ سید صاحب کا قیمتی مقالہ ابھی ربیع الثانی کے الفرقان میں نظر نواز ہوا۔ انھوں نے اپنی جانی پہچانی روش کے مطابق پرسنل لاء کے مسئلہ پر نہایت سنجیدہ اور عالمانہ انداز کی گفتگو کی ہے۔ انھوں نے دیگر مسلم ممالک میں پرسنل لاء کے قوانین اور ان کے مختلف ادوار کا جائزہ پیش فرمایا ہے اور اربابِ فکر کے آگے خاصا اہم مواد رکھ دیا ہے۔ کوتاہی ہوگی اگر ہم اپنے اس تاثر کو ظاہر نہ کریں کہ یہ مقالہ بے حد قابلِ قدر ہونے کے باوجود ایسا احساس دلاتا ہے جیسے

کسی خاص ملک کے بارے میں سید صاحب نے رعایت اور چشم پوشی کی روش اختیار کی ہو۔ ہو سکتا ہے کوئی رخنہ اور خلا انھیں عدم گنجائش کی بناء پر چھوڑ دینا پڑا ہو۔ اغلب یہی ہے کیونکہ ایک مختصر مقالہ زیادہ تفصیل اور جامعیت کا متحمل نہیں ہو سکتا بہر حال اصلی چیز جس پر انھوں نے بلا ابہام زور دیا ہے وہی ہے جس کا رونا ہم پچھلے دو اداریوں میں رو چکے ہیں۔ ذرا دیکھئے وہ فرماتے ہیں:۔

"ہم اس حقیقت کا برملا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے لئے کوئی مسلم ملک قطعی و کلی طور پر واجب الاتباع اور واجب التقلید نہیں اور نہ کسی ملک کے جدید رجحانات، نئے قوانین اور حکومت کے فیصلے ہمارے اوپر حجت بن سکتے ہیں۔ ماسوا اس بات کے کہ یہ کوئی شرعی اور فقہی دلیل نہیں، قانون اسلامی کے مآخذ اور اس کی بنیادیں کتاب، سنت اجماع و قیاس عالمگیر و دائمی ماخذ ہیں۔"

اور فرمایا:۔

"۔۔۔ کسی ایسے مسئلے میں جس میں غلط تجدد، مغربی افکار و اقدار سے مرعوبیت، قانون سازی میں سطحیت و عجلت صاف جھلکتی ہو اور شرعی اصول اس کی تائید نہ کرتے ہوں، ہمارے لئے کسی بڑے سے بڑے مسلمان یا عرب ملک کا کوئی فعل یا قانون حجت نہیں بن سکتا۔ اگر سارا عالم اسلامی کسی غلط چیز پر اتفاق کرلے اور سارے مسلمان ممالک اور وہاں کے علماء کوئی غلط فیصلہ کریں یا اپنے حدود سے تجاوز کریں تو بھی ہم ہندوستانی مسلمان شریعتِ اسلامی کو اپنے سینے سے لگائے رکھنے اور خدا کے قانون کو آخری قانون سمجھتے رہنے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور اگر خدانخواستہ سارا عالم اسلام بھی دین و شریعت سے انحراف کرے تو بھی کسی چھوٹی سے چھوٹی اقلیت کے لئے بھی یہ انحراف حجت اور وجہِ جواز نہیں ہوگا۔"

یہ ہے وہ محکم اور صحیح ترین بنیادی نکتہ جس پر جمعیۃ العلماء کی عاملہ والی تجویز سے حرف آتا دیکھ کر ہم تڑپ اٹھے تھے۔ یقیناً ارباب عاملہ کے قلوب میں اس اصول سے انحراف کا داعیہ ہرگز نہ ہوگا، لیکن متن میں نہ صرف ابہام تھا بلکہ صاف طور پر ایسا بین السطور موجود تھا جس سے حریف قوتیں ناجائز فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ الحمد للہ کہ ایک ذمہ دار اجتماع میں ایک ممتاز عالم نے اس نکتے کو بے غبار طور پر ابھار دیا اور یہ بات منقح ہو گئی کہ علماء کرام اگر مسلم ممالک کے قوانین کا جائزہ لینے کے لئے کوئی کمیٹی بناتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہاں کسی قانون کے پائے جانے کا ثبوت مل جانے پر وہ اپنے یہاں بھی اسے حجت مان لیں گے بلکہ مقصود صرف یہ ہوگا کہ وہ مطالعے اور مشاہدے کی روشنی میں اپنے گھر کی اصلاح بہتر طور پر کر سکیں۔

خیال ہوتا ہے کہ معارف و برہان کے اداریوں سے ہمارا بالکلیہ صرفِ نظر کہیں غلط فہمیوں کا موجب نہ بن جائے اس لئے کم سے کم مختصراً یہ وضاحت ضرور ہونی چاہئے کہ ہمیں گفتگو کن امور پر کرنی تھی۔

معارف (اگست ۱۹۶۳ء) کا اداریہ اس کی عام روش کے مطابق مختصر لیکن وزنی ہے۔ اس کے فاضل مدیر اختصار کے ساتھ پُر مغز باتیں کہنے کے عادی ہیں اور ان کے یہاں جذبے کے مقابلہ میں فکر و احساس اور تدبر و تحمل کا سرمایہ اتنا وافر ہے کہ کبھی کبھی یہ ہم جیسے مشتعل مزاج اور غیر ثقہ لوگوں کے مزاج پر بار ہو جاتا ہے۔ انھوں نے مسلم پرسنل لاء کے ہنگامہ خیز مسئلہ پر ڈیڑھ صفحے میں جو کچھ کہا اس کی معنوی قدر و قیمت سے انکار ممکن نہیں لیکن اس کا جو نفسیاتی پس منظر وہ پیش فرما گئے ہیں وہ ہمارے ناقص خیال میں نظر ثانی کا محتاج ہے۔ انھوں نے فرمایا:۔

"اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جدید تمدن نے زندگی کے مختلف شعبوں میں ایسے مسائل

پیدا کر دیتے ہیں جن کا وجود ہماری فقہ میں نہیں ہے اور مسلمانوں کا ایک طبقہ ایمانداری سے ان کا اسلامی حل چاہتا ہے۔ جب اسکو اس میں مایوسی ہوتی ہے تو وہ دوسری راہیں تلاش کرتا ہے۔ اس سے مغرب زدگی، تجدد پسندی، ملحدانہ خیالات اور ملحدانہ تحریروں کو پھیلنے کا موقع ملتا ہے۔"

اولاً تو ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ مدیر معارف جیسے اونچے درجے کے حضرات کا اسلامی فقہ کے بارے میں اس طرح کا ریمارک برمحل اور جچا تلا ہے۔ دنیا کا کوئی دفتری قانون ایسا نہیں ہو سکتا جس میں مستقبل کے گوناگوں احوال و وقائع کی تمام جزئیات کا تفصیلاً احاطہ کر لیا گیا ہو۔ پھر اکیلی فقہ اسلامی ہی کا ذکر اس انداز میں کیوں کہ اس سے استخفاف کا وسوسہ پیدا ہو اور تاک میں لگے ہوئے معاند اس سے ناجائز فائدہ اٹھا جائیں۔ فقہ کے خلاؤں اور رخنوں کا ذکر کچھ اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ کیا جائے تو مدیر معارف جیسے جلیل القدر علماء و فقہاء کی شان کے عین مطابق ہوگا، کیونکہ بعض ایسے جدید مسائل کا پیدا ہو جانا جو پچھلی فقہ میں موجود نہ ہوں اس فقہ کی خامی اور تہی دامنی کا ثبوت نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک ناگزیر فطری افتاد ہے۔ شارح خود بھی اچھی طرح سمجھتے ہوں گے کہ اگرچہ بعض جدید مسائل اپنی سطحی شکل و ہیئت کے اعتبار سے ہماری فقہ میں موجود نہیں ہیں — اور انھیں ہونا بھی نہ چاہئے تھا — لیکن انھیں خاطر خواہ طور پر حل کرنے کی فکری بنیادیں بہرحال فقہ میں موجود ہیں لہذا الزام جاتا ہے تو ان علماء کی طرف جاتا ہے جنھیں بروقت ان بنیادوں پر تفقہ کی عمارت اٹھا کر اپنی ذمہ داریاں پوری کرنی چاہئیں تھیں۔ وہ جمود و تعطل اور فکر و عمل کے بحران کا شکار رہے ہیں تو انصاف یہ ہے کہ الزام کا سارا بوجھ انھی کے سر پر رکھا جائے اور ایسی کوئی بات نہ کہی جائے جس سے خود فقہ کے استخفاف کا شبہ پیدا ہو۔

ثانیاً یہ کہ اپنی پرانی فقہ کی نارسائیوں کو ہم کسی درجے میں تسلیم بھی کر لیں پھر بھی کیا کوئی بالغ نظر اور صحیح الفکر والشعور یہ کہہ سکتا ہے کہ جن نام نہاد مسلمانوں نے حکومت کو شہ دے کر یہ حالیہ ہنگامہ کھڑا کیا تھا ان کے فکر و احساس کو ایمانداری چھو کر بھی گئی ہے؟ پیچیدگیوں میں الجھ کر مایوس ہو جانا اور پھر غلط راہیں اختیار کرنا ایک قابلِ رحم کیفیت ہے لیکن جن کرسی نشین مسخروں کا دانت سب سے پہلے نکاح و طلاق کی محکم نصوص پر ہو گیا ان کی ذہنی کیفیات بھی کسی رحم کی مستحق ہیں؟ — ہم سمجھتے ہیں خود مدیر معارف بھی ان شکم سیروں کی متعفن نفسیات سے بے خبر نہ ہوں گے لیکن معارف سے جو عبارت ہم نے نقل کی وہ نادانستہ طور پر ان کی شرارتِ نفس کو سندِ جواز اور ان کے فکری الحاد کو استحقاقِ رحم عطا کرتی ہے۔ ان نفوسِ قدسی کے بارے میں ابھی آگے ہم مستقلاً کچھ کہنے والے ہیں لہذا یہاں اتنے ہی پر بس کرتے ہیں اور اپنے تمام ہی محترم علماء اور اہلِ قلم کی خدمت میں عاجزانہ ملتمس ہیں کہ کسی حال میں بھی ان مغرب گزیدہ ذہنوں کی ہمت افزائی مت کیجئے جن کا نفاق و زندقہ اسلام کے حق میں کفر سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

مدیر برہان کے نظرات نسبتاً مفصل ہیں۔ انھوں نے بعض باتیں نہایت صائب اور جچی تلی کہی ہیں۔ ان کی روشن فکری، خلوص، بصیرت اور علم و خبر سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ کبھی کبھی عجلت اور تیز روی برت جاتے ہیں۔ ان کی چاق چوبند ذکاوت نے پہلے ہی مرحلے میں فکر کی جو سمت معین کر دی اب وہ اپنی بصیرت کا سفر اسی پر شروع کر دینگے اور چونکہ ذہین و ذکی ہیں اس لئے رفتارِ سفر نہایت تیز ہوگی لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماحول کے خفی اثرات اور بعض لطیف عوامل سمت کے تعین میں بال برابر فرق پیدا کر دیتے ہیں جس کے نتیجے میں آگے چل کر فرق اتنا بڑھ جاتا ہے کہ چاند کی طرف چھوڑا ہوا راکٹ چاند سے ہزاروں میل کٹ کر گذرتا ہے

وہ کہتے ہیں:-

"ہماری ذاتی رائے یہ تھی کہ اس وقت حکومت کی طرف سے جو کمیشن بن رہا تھا اس کی مخالفت نہیں ہونی چاہیئے تھی۔ مخالفت کا جو طوفان اب اٹھا وہ اس وقت بھی بلکہ زیادہ قوت کے ساتھ اٹھایا جا سکتا تھا جب کہ کمیشن علماء پر مشتمل نہ ہوتا یا ہوتا مگر اس کی سفارشات تحریم حلال اور استحلالِ حرام کے ہم معنی ہوتیں۔"

مولانا سید محمد میاں صاحب نے بھی پرسنل لاء کے موضوع پر ایک گراں قدر مضمون یکم ستمبر ۶۳ء کے الجمعیۃ میں سپردِ قلم فرمایا ہے۔ اس کا فکری رُخ اور بنیادی منہاج نہایت مستقیم ہے لیکن مدیر برہان کی اس رائے کو انھوں نے بھی قبول نہ کرنے کے باوجود سنجیدہ قرار دیا ہے۔

کیا واقعی یہ سنجیدہ ہے؟ — اس پر غور و فکر کرنا چاہیئے اپنی حکومت کا جو کردار ہمارے سامنے ہے۔ مسلمانوں کے بارے میں جو اس کا اندازِ فکر ہے — آمرانہ کلیت کیتنی ور ازنکاز کا جو عنصر اس کے سوشلزمی عقیدے میں دن بدن بڑھتا جارہا ہے۔ اس کی موجودگی میں — کم سے کم مذہب سے متعلق معاملات کی حد تک یہ خیال سنجیدہ نہیں معلوم ہوتا کہ اسے ہم اپنا پہنچا بلا مزاحمت پکڑنے دیں اور احتجاج و مخالفت کو اس وقت کے لئے اُٹھا رکھیں جب اس کی انگلیاں رگِ گلو تک پہنچ جائیں —

دنیا پرست حکومتوں کی نظر میں "علماء" کس جنس کا نام ہے۔ یہ ڈھکا چھپا نہیں۔ نمونہ دیکھنا ہو تو پاکستان حکومت کی وضع فرمودہ "اسلامی مشاورتی کونسل" کا دیدار کیا جائے۔ ابھی چند ہی روز تو ہوئے جب پنڈت نہرو نے اپنے ایک جواب میں فرمایا تھا کہ حکومت نے اصلاحی کمیٹی بنانے کا ارادہ بطور خود نہیں کیا بلکہ بعض ذمہ دار مسلمانوں ہی کی توجہ دہانی اور مطالبے پر کیا ہے — اب ذرا دیکھئے یہ ذمہ دار مسلمان کون ہیں۔ مسٹر طارق جیسے لوگ! جنھیں دین سے متعلق کسی مسئلہ میں "ذمہ دار" سمجھ لینا اتنا ہی معقول ہو سکتا ہے جتنا عامر عثمانی کو سائنس کے مسائل میں دخل اندازی کا اہل مان لینا یا رقص و سرود کے فن میں کسی شیخ الحدیث کو اتھارٹی تسلیم کر لینا۔

مختصر یہ کہ ایک غیر مخلص اور اپنے مخصوص اسلوبِ فکر کی تابع حکومت کو دین کے دائرے میں ایک بھی قدم آگے بڑھانے کی اجازت دیدینا کم و بیش ایسا ہی ہے جیسے کسی مشین گن سے مسلح چور کو خزانے کی بلڈنگ پر سیڑھی لگانے کی اجازت مرحمت فرما دینا۔ اس کا جو نفع محسوس کیا گیا ہے وہ ہماری ناقص رائے میں اس کی مضرتوں کے آگے بالکل ہیچ ہے۔

ایک بات اور مدیر برہان کے اداریئے میں محلِ نظر معلوم ہوئی۔ انھوں نے فرمایا:-

"اسلامی معاشرے میں مختلف خارجی اور داخلی اسباب سے جو شدید ترین فساد دوسرے ملکوں میں پیدا ہو رہا ہے وہ ہندوستان میں بھی کچھ کم نہیں ہے اسلئے ضرورت ہے کہ یہاں بھی ان کی روک تھام کے لئے قوانین بنائے جائیں تاکہ کوئی شخص مذہب کی آڑ میں ہوائے نفس کی تکمیل و تسکین کی جرأت نہ کر سکے۔"

ہم عرض کرتے ہیں کہ اول تو یہی دعویٰ مشاہدے اور واقعات کے بالکل خلاف ہے کہ ہندوستان کے اسلامی معاشرے کا فساد دیگر ممالک کے شدید معاشرتی فساد سے کم نہیں۔ یہ دعویٰ شاید تخیل کے زور پر کر دیا گیا ہے ورنہ جہاں تک عائلی مسائل اور گھریلو زندگی کا تعلق ہے ہندوستان کے مسلم معاشرے کا فساد اُن ممالک کے فساد کے مقابلہ میں عشرِ عشیر بھی نہیں جہاں مسلمانوں نے مغربی اندازِ نظر قبول کر لیا ہے۔ جہاں جس درجہ میں مغرب کے عائلی تصورات اور تہذیبی افکار کی پذیرائی ہوئی اسی درجے میں عائلی فساد بڑھتا گیا اور اخلاقی قدروں کے پرخچے اُڑتے گئے۔ مختلف ممالک میں نکاح و طلاق کے اعداد و شمار پر نظر ڈالئے۔ معلوم ہوگا کہ جن مسلم معاشروں نے اسلام کے عائلی قوانین میں تبدیلیاں کر لی ہیں یا عملاً انھیں پیچھے ڈال دیا ہے وہیں

فساد کی بھرمار ہے اور اسے روز افزوں فروغ حاصل ہو رہا ہے اس کے مقابلہ میں ہندوستان کے مسلم معاشرے کا فساد ــ عائلی معاملات کی حد تک اتنا بھی نہیں جتنا مَن کے مقابلے میں دس سیر۔ پھر یہ دس سیر بھی زیادہ تر یا تو اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ مسلمانوں کے بعض حلقوں میں غیر اسلامی رسوم کو اپنا لیا گیا ہے یا ایسی عدالتیں موجود نہیں ہیں جہاں سے ٹھیک اسلامی قوانین کے مطابق بہ آسانی انصاف مل سکے۔ پہلی وجہ کی ایک مثال حیدرآباد اور بہار وغیرہ کی وہ منحوس اور اسلام دشمن رسم ہے جسے جہیز اور جوڑے کا نام دیا جاتا ہے اور دوسری وجہ مثال سے بالاتر ہے۔ ہندوستان کے کسی بھی گاؤں یا قصبے میں ایک بد نہاد شوہر بیوی کو معلق کر کے ڈال دیتا ہے ــ اب کیا اسلامی پرسنل لا اس مظلومہ کو انصاف دلوانے والے بہترین قوانین سے عاری ہے؟ ــ ہرگز نہیں۔ اسلام کے پاس تو زریں قوانین ہیں اور خیر سے ہمارے ملکی قانون میں پرسنل لا پر قدغن بھی نہیں، لیکن اس کے باوجود ہر آنکھ والا جانتا ہے کہ اس مظلومہ کیلئے انصاف کی صندل تک پہنچنا ایک نیا درد سر مول لئے بغیر عملاً ممکن ہی نہیں۔

تو ضرورت حقیقتاً اس کی نہیں کہ زور نئے قوانین بنانے پر دیا جائے۔ زور اس بات پر دینا چاہئے کہ اسلامی پرسنل لا کے مثبت اور منفی دونوں طرح کے قوانین کو نافذ کرنے کی آسانیاں مہیا کی جائیں۔ قانون کی واجبی تاثیر کو پیچیدہ اور طویل الذیل ضابطوں سے روند کر سرمہ نہ بنا دیا جائے رہا بعض ایسی پیچیدگیوں کا معاملہ جو اپنے قالب اور ہیئت کے لحاظ سے نئی ہیں اور جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہماری پرانی فقہ ان سے خالی ہے تو انھیں بیشک اجتہادِ صحیح کے ذریعہ نئے قوانین سے سلجھایا جا سکتا ہے لیکن یہ بات ہرگز فراموش نہ ہونی چاہئے کہ ہماری اصل مصیبت اسلامی فقہ کی تہی دامنی اور اچھے قوانین کی نایابی نہیں بلکہ یہ ہے کہ قوانین سے فائدہ حاصل کرنے کی راہیں دشوار بنا دی گئی ہیں اور ہمارے جہل، لاپروائی اور بے شعوری نے اس دشواری کو اور زیادہ بڑھایا ہے قانون کیا کرے گا اگر ہم ذہنی اور عملی دونوں اعتبار سے مُغفل بن چکے ہوں۔

یہ تو ایک بات تھی۔ دوسری بات تشویش کی یہ ہے کہ جو مفصل فقرہ ہم نے مدیر برہان کا نقل کیا اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود ان کی نگاہ میں بھی ایک سے زائد بیویوں کا مسئلہ نہ صرف یہ کہ خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے بلکہ اس اسٹیج میں پہنچ چکا ہے کہ نام نہاد اصلاح کی پہلی زد اسی پر پڑنی چاہئے۔ "شدید ترین فساد" کے الفاظ تو عام تھے جن کے ذیل میں بیویوں پر شوہروں کے مظالم کی تمام ہی صورتیں آ سکتی تھیں لیکن جب نئے قوانین بنانیکی ضرورت کا واحد مبنیٰ انھوں نے اس بات کو قرار دیا:ــ

"کہ کوئی شخص مذہب کی آڑ میں ہوائے نفس کی تکمیل و تسکین کی جرأت نہ کر سکے۔"

تو معلوم ہوا کہ ان کے پیش نظر اُن مصیبتوں کا سدِّ باب نہیں ہے جو غیر اسلامی رسوم یا مَردوں کی سنگدلی کے باعث عورتوں کو درپیش ہیں بلکہ اکیلی اس مصیبت کو وہ سب کچھ سمجھ رہے ہیں کہ کچھ لوگ ایک سے زیادہ بیویاں کر لیتے ہیں۔

یہ تو بالکل وہی منہاجِ فکر ہے جو اس لائق تھا کہ مولٰنا اس کے رد میں پیش پیش ہوتے۔ اوّل تو یہ ایک قطعاً خیالی اور طبعزاد مفروضہ ہے کہ مسلمان معاشرے میں ایک سے زائد بیویاں کرنے کا شوق کوئی ایسی وبائی شکل اختیار کر گیا ہے جس کا سختی سے نوٹس لینے کی ضرورت ہے ــ افتراء اور خالص افتراء ــ ہم بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ اگر ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کو ایک برائی فرض کر لیا جائے اور پھر پورے ملک کا سروے کر کے دیکھا جائے تو یہ بُرائی کسی بھی دوسری برائی کے مقابلہ میں کم بلکہ اقل قلیل ملے گی اور پھر یہ جائزہ لیا جائے کہ دو بیویوں والے کتنے گھر ایسے ہیں جہاں دونوں بیویاں واقعتہً مظلوم کہی جا سکتی ہیں تو گنتی اور بھی کم ہو جائے گی۔ یہ ضروری تو نہیں کہ دو بیویوں کی موجودگی گھر کو جہنم ہی بنا دے۔

دوسرے یہ جو ہوائے نفس کی تکمیل و تسکین جیسے الفاظ ممدوح نے استعمال فرمائے ہیں ان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مغرب زدہ متجددین کی طرح ممدوح بھی یہی خیال فرماتے ہیں کہ مرد کو ایک سے زائد بیوی لانے کی اجازت اسلام صرف مجبوری کی حالت میں دیتا ہے ـــــ مثلاً پہلی بیوی بانجھ ہو یا کسی ناگفتہ بہ مرض کا شکار ہو یا ایسی ہی کوئی اور صورت درپیش ہو جس میں دوسری بیوی لائے بغیر کام نہ چل سکے ـــ لیکن اگر ایسی کوئی مجبوری درپیش نہیں ہے بلکہ مرد جنسی تقاضے اور طبعی میلان کی بنیاد پر دوسری بیوی لاتا ہے تو ممدوح کے نزدیک یہ فعل نہ صرف مذہب کی آڑ میں عیاشی ہے بلکہ اس لائق ہے کہ اسے جبراً قانون کے ذریعے روکا جائے۔

ہمیں نہیں معلوم شریعت کے مصادر میں سے یہ خیال کس مصدر سے اخذ کیا گیا ہے۔ قرآن، سنت، اجماع اور قیاس ان میں سے تو ہر ایک اسکی تردید کرتا ہے۔ اسکی بنیاد فی الحقیقت اس مفروضے پر ہے کہ ایک سے زیادہ بیوی رکھنا بالذات ایک برائی ہے جسے فقط اُن مجبوریوں کی بناء پر جائز قرار دیا جا سکتا ہے جو چشمِ سر سے نظر آنے والی ہوں۔ اگر ان مجبوریوں کے بغیر فقط جذباتی تقاضوں کی بنیاد پر کوئی شخص دوسری بیوی لاتا ہے تو اس کا یہ فعل ہوائے نفس کی تسکین اور عیاشی جیسے مذموم اور قادح الفاظ کا مستحق قرار پائے گا چاہے یہ جذباتی تقاضے کتنے ہی شدید ہوں۔

اسی طبعزاد مفروضے کو پاکستان کی عائلی رپورٹ میں بھی بایں الفاظ پیش کیا گیا ہے کہ:-

"اگرچہ ہمارے معاشرے میں مَردوں کی بہت تھوڑی سی تعداد تعدد ازدواج پر عمل کرتی ہے، لیکن اس ضمن میں ان کے مقاصد اور طریقۂ عمل ہمیشہ غیر عقلی اور غیر اسلامی ہوتے ہیں۔" (شق نمبر ۱۹)

"غیر عقلی" کا لفظ اپنے مدلول و مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ یہ ہر جذبے کو، چاہے وہ خالصتہً جنسی نوع کا ہو یا ذوقی اور وجدانی نوع کا دوسری شادی کی اباحت کے لئے ناکافی قرار دیتا ہے اور "غیر اسلامی" کا لفظ مبہم ہے۔ یہ دراصل سیاستہً استعمال کیا گیا ہے۔ تجدد پسند حضرات اس لفظ کی آڑ میں ہر اسلام کو کفر اور ہر کفر کو اسلام قرار دینے کا ڈرامہ بہت دنوں سے کھیل رہے ہیں اور آئندہ بھی کھیلیں گے۔

یہ موضوع بحث و نظر کی کافی گنجائش رکھتا ہے لیکن چونکہ ہمارے خیال میں مدیر برہان نے زیر بحث فقرہ روانی میں لکھ دیا ہے اور انھیں اس کے عواقب و مضمرات پر اصرار نہ ہوگا اسلئے اسی اجمال پر اکتفا کرتے ہیں۔

انھیں بھی پہچانیئے

مثالِ ماہ چمکتا تھا جس کا داغِ سجود
خرید لی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی

وزیر قانون مسٹر اشوک سین نے جب راجیہ سبھا میں یہ فرمایا کہ حکومتِ ہند نے مسلم پرسنل لاز میں ترمیم کا ارادہ ترک کر دیا ہے کیونکہ مسلمانوں کی اکثریت اس کے خلاف ہے اور اقلیتوں کے پرسنل لاز کے بارے میں حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ جب تک خود اقلیتوں ہی کی مرضی نہ ہو ان کے پرسنل لاز میں کوئی ترمیم نہ کی جائے تو جانتے ہیں آپ طارق نامی ممبر نے کیا فرمایا؟ ـــ سنیئے انھوں نے فرمایا:-

"اصلاح کرنا حکومت کا کام ہے۔ جب مسلم ملکوں میں شرعی قوانین میں ترمیم کی گئی ہے تو پھر ہندوستان میں یہ سوال کیوں اُٹھایا جا رہا ہے کہ مسلمان خود ان قوانین میں ترمیم کرنے کے لئے حکومت پر دباؤ ڈالیں۔"

اور ایک سے زاید بیوی پر پابندی عائد کرنے کی غرض سے ایک کانگریسی ممبر مسٹر علی حسن ہمدانی نے جو بل ۱۹۶۱ء میں مہاراشٹر لیجسلیٹو اسمبلی میں پیش کیا تھا اسے اب رائے عامہ کے دباؤ سے مجبور ہو کر واپس لیتے ہوئے جو کچھ ان صاحب نے فرمایا اسے بھی سُنیئے۔ وہ کم وبیش یہ ہے کہ اگرچہ رائے عامہ کے آگے بے بس ہو کر میں بل واپس لے رہا ہوں لیکن تعدد ازدواج کی مخالفت اسمبلی کے اندر بھی اور باہر بھی مسلسل کرنا میرا مقصدِ زندگی ہوگا ـــ سمجھے آپ؟

یہ صورتِ حال ملتِ مسلمہ کو اس نکتے پر غور کرنے کی
دعوت دیتی ہے کہ مسلمانوں جیسے نام رکھنے والے جن لوگوں کی
اسلامی تصورات سے بیزاری اور مغربی افکار کی ذہنی غلامی
کا یہ عالم ہو کہ وہ قرآن کی بعض محکم نصوص سے نہ صرف
منحرف ہوں بلکہ ان کے خلاف علی الاعلان بیزاری،
استکراہ اور نفرت کا اظہار کرنے میں جھجک محسوس نہ کرتے
ہوں کیا انھیں واقعتہً مسلمان ہی مانتے رہنا چاہیئے، یا
منافقین کے زمرے میں شمار کرنا چاہیئے؟

چونکئے مت۔ بات کو پہلے اچھی طرح سمجھ لیجئے! ایک
تو ہے عملی انحراف۔ زید نماز روزہ کچھ نہیں کرتا۔ شراب
پیتا ہے، سود کھاتا ہے۔ انگریزوں کی طرح رہتا سہتا ہے
اسے ہم دائرۂ اسلام سے خارج نہیں کہیں گے۔ کیونکہ
یہ بداعمالیاں فقط معصیت ہیں اور معصیت مسلمان
کو کافر نہیں بناتی، لیکن دوسری چیز ہے ذہنی انحراف۔
زید شراب نہ پیئے، سود نہ کھائے لیکن قرآن وسنت کے
کسی مسلّم اور متفق علیہ حلال کو حرام بتانے کے درپے ہو نیز
وہ یہ تصور رکھتا ہو کہ خدا اور رسولؐ کے بتائے ہوئے
بعض قوانین ظالمانہ ہیں اور ان کے مقابلے میں مغربی
مقنّنوں کے وضع فرمودہ قوانین زیادہ مہذب، زیادہ
عادلانہ اور زیادہ مفید ہیں تو ہم اور آپ کہیں یا نہ کہیں
لیکن قرآن وسنت یہی کہتے ہیں کہ یہ شخص وادیِ کفر میں
داخل ہو گیا اور اس کا شمار منافقین میں ہوگا

نام سے دھوکا مت کھائیے۔ دیوار کا نام آپ
مرغی رکھ دیں تو وہ انڈے نہیں دینے لگے گی۔ خیر سے کتنے
ہی خدا بیزار اور مذہب دشمن کمیونسٹ ایسے ہیں جو نسلاً
مسلمان ہیں اور آج بھی ان کے نام مسلمانوں ہی جیسے ہیں مگر
کیا انھیں مسلمان مانا جائے گا؟

مسٹر طارق اور مسٹر ہمدانی جیسے حضرات کی روش
میں اگر حسنِ تاویل کی کوئی ادنیٰ سی بھی گنجائش ہو تو اس کی
اطلاع ہمیں ضرور دی جائے۔ ایک سے زائد بیویاں کرنے کا
رواج اگر معاشرے میں اس درجہ عام ہو چکا ہوتا کہ اس سے
صرفِ نظر ممکن نہ ہوتا اور تعددِ ازدواج کی وجہ سے عورتوں
کی کوئی معتد بہ تعداد ایسی مصیبتوں کا شکار ہوتی جن پر
تڑپ اُٹھنا درد مند اور حساس لوگوں کیلئے ایک فطری
فعل قرار دیا جا سکتا تب تو یہ تاویل ممکن تھی کہ طارق و
ہمدانی جیسے درد آشنا اور شریف الطبع لوگ ترحم کے
جذبے سے بیتاب ہو گئے ہیں اور تعددِ ازدواج کی مخالفت
مغرب کی ذہنی غلامی کا ثمرہ نہیں بلکہ قابلِ قدر انسانی
جذبات کا ایک طوفانی تقاضا ہے جو فکری اعتبار سے
نادرست ہونے کے باوجود خلوص اور نیک نیتی سے خالی
نہیں۔

لیکن جب صورتِ حال اس سے بالکل مختلف ہو
اور تعددِ ازدواج کی قرآنی اجازت نے ذرا سا بھی فتنہ
معاشرے میں کھڑا نہ کیا ہو تو کسی مسلمان کا معاشرے کے
دوسرے زخموں اور ناسوروں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے
سب سے پہلے اسی قرآنی اجازت پر پہرے بٹھانے کی سرگرم
کوشش اس کے سوا کیا معنی رکھتی ہے کہ اس کے پیشِ نظر
قوم وملت کے کسی واقعی زخم کا اندمال اور کسی حقیقی مصیبت
کا استیصال نہیں بلکہ مغرب کی ذہنی غلامی کے تحت وہ
قرآن کی ایک تحلیل پر خطِ تحریم کھینچ دینا چاہتا ہے جو
اس کے غلامانہ اندازِ فکر اور فاسد مزاج و وجدان کے
نقطۂ نظر سے شرمناک، غیر منصفانہ اور لائقِ نفرت ہے۔

تعددِ ازدواج کا سرے سے کوئی قابلِ توجہ مسئلہ
ہی نہ ہونا نہ صرف واقعات کی روشنی میں امرِ مسلّم ہے
بلکہ خیر سے یہ نام نہاد مصلحین بھی ایسا ہی جانتے اور سمجھتے ہیں۔
مسٹر ہمدانی صاحب کے پیش کردہ بل کی پہلی سطر ملاحظہ ہو:۔

"تعددِ ازدواج کی اگرچہ مسلم پرسنل لاء کے تحت
اجازت دی گئی ہے لیکن وہ عملاً ترک کر دیا
گیا ہے اور مسلم رائے عامہ یک زوجگی کی مؤید ہے۔"

دیکھا آپ نے۔ ہمدانی صاحب خود اعتراف کرتے
ہیں کہ تعددِ ازدواج باوجود اجازت ہونے کے متروک
ہو چکا ہے۔ پھر وہ ایک ملعون قسم کا بل پیش فرماتے ہوئے

جب یہ کہتے ہیں کہ :-

"ہر گاہ کہ مسلمانوں میں دو زوجگی کو روکنا ضروری ہے"۔

تو اس کے سوا کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ کسی موجود خرابی اور حقیقی آفت کا ازالہ ادنیٰ درجے میں بھی ان کا مقصود نہیں، بلکہ مقصود صرف اور صرف قرآن کی دی ہوئی اباحت کو حرام قرار دینا اور محکم نصوص کی نظریاتی مخالفت کرنا ہے۔ ایمان کا محل اور مسکن اگر انسان کے قلب و ذہن ہی ہیں تو بتایا جائے کہ کیا کسی قلب و ذہن میں قرآن و سنت کی صداقت و حقانیت اور ان کی بعض صریح و محکم نصوص سے بدترین قسم کا عناد، بیزاری، نفرت اور دشمنی بیک وقت جمع ہو سکتے ہیں؟ کیا کوئی شخص یہ عقیدہ رکھتے ہوئے بھی مسلمان سمجھے جانے کا مستحق ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے بعض ایسے امور کو حلال کر دیا ہے جنھیں حرام کرنا اور روکنا ضروری تھا۔

رواداری اور فراخ دلی کا غرّہ رکھنے والے لوگ ہمیں کٹر، متشدد، ملّا اور تنگ نظر نہ جانے کیا کیا کہہ گذریں گے لیکن ان کے طعن سے ڈر کر ہم ان آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ صحیحہ کو تو فراموش نہیں کر سکتے جن میں منافقین کے کردار، خصائل اور احکام بیان کئے گئے ہیں۔ ہمیں بتاؤ اگر مسلمانوں جیسے نام رکھ کر قرآنی تصورات و نظریات اور احکام و اصول سے علانیہ بیزاری، ڈنکے کی چوٹ عداوت اور بے محابا جنگ منافقت نہیں ہے تو ——————

منافقت کس چڑیا کا نام ہے۔ کسی طارق اور ہمدانی کو یہ تو بے شک اختیار ہے کہ وہ کوئی بھی نظریہ اور عقیدہ رکھے وہ خدا کا انکار بھی کر سکتا ہے اور پچاس خدا بھی مان سکتا ہے لیکن یہ بڑی بزدلی اور دغابازی کی بات ہے کہ خدا کی کتاب پر ایمان اور اطمینان نہ رکھتے ہوئے بھی وہ اپنے آپ کو مسلمان ہی شمار کراتا ہے۔ مسلمان اسے کہتے ہیں جس کے قلب میں ایمان ہو اور ایمان کسی نسلی یا جغرافی خصوصیت کا نام نہیں ایک کیفیت کا نام ہے۔ یہ کیفیت مٹ جائے تو ایمان ختم ہوا۔ تعدد ازدواج کی قرآنی اجازت نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا اور ہمدانی صاحب خود مانتے ہیں کہ اس اجازت سے عملاً فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے پھر بھی وہ یہ کہنے میں ادنیٰ سی شرم، خوفِ خدا اور اسلامی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے کہ

"مسلمانوں میں دو زوجگی کو روکنا ضروری ہے"۔

تو اس کے سوا کیا کہا جائے کہ یہ کفرِ مبین بول رہا ہے کاش یہ "علی حسن" نام رکھنے والے محترم اپنے نام ہی کی کچھ لاج رکھتے اور تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھتے کہ علی اور حسن رضوان اللہ علیہما دونوں نے کتنی کتنی بیویاں رکھی تھیں اور طارق وہ تھے جن کے اعتماد علی اللہ اور قوتِ ایمانی نے اپنے بیڑے کی ساری کشتیاں فنا کے گھاٹ اتار دی تھیں مگر آج کے مسٹر طارق خدا اور اس کی ہدایات سے اس قدر خفا اور بدگمان ہیں کہ قوانین شرعیہ میں سرکاری ترمیم و اصلاح کے بغیر انھیں نیند نہیں آتی۔ ذرا تیور تو دیکھئے حکومت ایک غلط راہ پر چلنے سے انکار کر رہی ہے مگر طارق صاحب کہتے ہیں رک جاؤ یہ راہ تو تمہارے ہی روندنے کے لائق ہے۔ تم مت پروا کرو کہ مسلمان کیا چیخ پکار کر رہے ہیں۔ وہ گدھے ہیں۔ پرسنل لاء کا حلیہ بگاڑو۔ خدا اور رسول کی بھول چوک کو درست کرو۔ العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ

ترا وجود سراپا تجلّیِ افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

یہاں ہمیں استاذِ محترم مولانا مدنیؒ کے صاحب زادے مولانا اسعد صاحب کا ایک تاثر یاد آتا ہے جو مالی گاؤں کے تازہ فساد کی رپورٹ میں درج ہے :-

"میرا تاثر یہ ہے کہ فساد اس لئے نہیں ہوتا کہ مسلمان باجہ بجانے میں آڑے آتے ہیں بلکہ مالیگاؤں کے اسی فساد کی اگر تفصیلات پر اگر غور کیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ میں یہ رائے قائم کرنے میں حق بجانب ہوں گا کہ فساد اس لئے کیا گیا کہ مسلمان اس گستاخی کا تصور ہی کیوں کرتے ہیں کہ مسجد کے سامنے باجہ نہیں بجایا جا سکتا"۔ (الجمعیۃ ۱۲ ستمبر ۱۹۶۳ء)

اس تاثر میں جارحیت کے نشے اور اسلام دشمنی کے جذبے سے مخمور فرقہ پرست ذہن کی صادق صد درست عکاسی

کی گئی ہے۔ مسجدوں کے سامنے باجے بجانے میں عملاً
اب کوئی روک نہیں۔ مسلمان صرف یہ التماس ہی کر سکتا
ہے کہ برادرانِ وطن عین نماز کے وقت اگر مسجدوں کے
سامنے چند ساعتوں کے لئے باجہ روک دیں تو یہ مروّت
اور اخلاق کے عین مطابق ہوگا۔ اس التماس کو ٹھکرا
کر اگر برادرانِ وطن باجہ ضرور بجاتے ہیں تو مسلمان صبر
تحمل کے سوا کسی ردِ عمل کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ پھر بھی
اگر برادرانِ وطن آمادۂ فساد ہوتے ہیں اور آئے دن مسلمانوں
کے جان و مال پر قیامتیں ٹوٹتی ہیں تو ظاہر ہے کہ اس کی
وجہ وہ اشتعال اور غصہ نہیں جو کسی من چاہے
شغل سے روک دیئے جانے پر پیدا ہوتا ہے بلکہ وجہ
صرف اور صرف یہ ہے کہ فرقہ پرستوں کو اسلامی تصورات
ہی سے کد ہے۔ وہ مجرد اسی بات پر اونٹتے اور کھولتے
ہیں کہ مسلمان ہمارے باجوں گاجوں کو اپنی مساجد کیلئے
ناخوشگوار کیوں سمجھتے ہیں۔ وہ کس لئے اپنے مذہبی
تصورات واقدار کو بالائے طاق رکھ کر ہمارے ہم مسلک
ہم مشرب نہیں ہو جاتے۔ اسی خواہش کے کئی خوبصورت
نام بھی رکھے گئے ہیں جو خود حکومت کے حلقوں میں
خاصے مقبول ہیں۔

تو کچھ اسی نوع کا معاملہ تجدد پسندوں کا ہے کہ
مسلم پرسنل لاء میں ترمیم و تنسیخ کا داعیہ ان کے اندر کسی
معقول اور شریفانہ احساس نے پیدا نہیں کیا بلکہ
انھیں تو مجرد اسی بات سے کد ہے کہ مسلم معاشرے میں
تعددِ ازدواج کی اجازت ہی کیوں باقی ہے جب کہ استادِ
مغرب اسے غیر مہذب، شرمناک اور ظالمانہ قرار دیتا
ہے۔ فرقہ پرستوں کی طرح انھیں بھی کسی عملی بنیادِ اشتعال
کا سامنا نہیں بلکہ اصلاً غصہ خدا اور رسولؐ پر ہے کہ
کیوں انھوں نے تعددِ ازدواج کو مباح قرار دے کر ہمیں
امریکہ و انگلستان سے شرمسار کیا۔ لیکن براہِ راست
خدا اور رسولؐ پر غصہ اُتارنا ذرا کارے دارد تھا لہٰذا
بالواسطہ مسلم پرسنل لاء کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

مگر ٹھیرئیے۔ نتائج اخذ کرنے میں جلدی مت کیجئے
ہمارا تجربہ طارق و ہمدانی جیسے حضرات کے بارے میں فتوائے
کفر نہیں ہے۔ فتویٰ اونچے درجے کے علماء کا منصب ہے
اور کسی مدعیِ اسلام کو کافر قرار دینے کے لئے علماء کی ایک
معتد بہ جماعت کا اتفاق بھی از بسکہ ضروری ہے۔ اکیلے
ہم کیا اور ہمارا فیصلہ کیا۔ ہم تو عامۃ المسلمین سے فقط یہ
کہنا چاہتے ہیں کہ انھیں بھی پہچانیئے! یہ اقتدار کی مسند
تک آپ ہی کے ووٹوں سے پہنچے ہیں۔ انھیں ووٹ دیتے
وقت آپ نے کچھ نیک امیدیں وابستہ کی ہوں گی لیکن
ان کے دَورِ اقتدار کی پوری فردِ عمل دیکھئے اسمیں کہاں
تک انھوں نے آپ کی توقعات کو پورا کیا ہے اور کہاں تک
امیدوں کا گلا گھونٹا ہے۔ یہ وقت معینہ پر پھر آپ سے
ووٹ مانگیں گے۔ آپ کانگریس کے نام پر انھیں پھر
نوازدیں گے ـــ کانگریس کو ووٹ دینا نہ دینا الگ مسئلہ
ہے ہمیں اس سے بحث نہیں بحث صرف اس سے ہے کہ
کیا وہ مسلمان ہمارے ووٹوں کے مستحق ہیں جو اسلام کے بنیادی
تصورات پر خار کھائے بیٹھے ہیں اور ایک سیکولر گورنمنٹ
کو مسلمانوں کے پرسنل لاء میں کتر بیونت پر ابھارنے کا
فتنہ انگیز شوق پالتے ہیں؟

سوچئے اور سوچ کر فیصلہ کیجئے!

اگلا شمارہ ڈاک نمبر ہوگا!

جمع شدہ ڈاک کی ایک بڑی مقدار سے عہدہ برآ
ہونے کے لئے ارادہ کیا گیا ہے کہ اگلا پرچہ ڈاک نمبر ہو
اور عام شماروں سے ضخامت بھی زیادہ ہو۔ اس کے لئے
ہمیں وقت بھی نسبتاً زیادہ ہی چاہئے۔ لہٰذا نومبر اور دسمبر
کی اشاعتوں کو یکجا کر کے انشاء اللہ یکم دسمبر کو یہ نمبر ارسالِ
خدمت کیا جائے گا۔ نومبر میں تجلی کی غیر حاضری آپ پر شاق
ضرور ہوگی لیکن تقریباً ہر سال ہی آپ تجربہ کرتے ہیں کہ ایک
ماہ کا خلا آپ کی اس محبت میں اضافے ہی کا موجب بنتا ہے
جو آپ کو تجلی سے ہے۔ ظاہر ہے صحت کی قدر و عافیت محسوس

کرنے کے لئے کبھی کبھار بیماری آنی ہی چاہیئے۔ جب ا تی
ملاقات کی لذت میں اضافہ کرتی ہے بشرطیکہ تعلقِ خاطر
جانانہ رہو۔ ویسے پیشگی تلافی کے طور پر ہم نے پیش نظر شمارے
میں آٹھ صفحات زائد دیئے ہیں۔ نمبر تو انشاء اللہ دوگنے
کے قریب ہوگا ہی۔
آپ لوگ "مسجد سے میخانے تک" کو بھی اس نمبر میں
دیکھنا ضروری خیال فرمائیں گے یا نہیں یہ آپ جانیں۔
ہم تو غیر ضروری ہی سمجھتے ہیں لیکن خود آپ نے اصرار کیا تو جیت
آپ ہی کی ہوگی۔ کیونکہ تجلی آپ ہی کا ہے۔ آپ ہی کے
دم سے ہے۔
ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں کہ اس نمبر کی قیمت
سوا روپیہ ہوگی۔

مستقل عنوان

تجلّی کی ڈاک

داڑھی سے متعلق

سوال ۱: ۔ از سید یٰسین قادری ضلع رائچور (میسور)

ڈاڑھی کے مسئلے پر جناب مولانا مودودی صاحب جناب سید احمد عروج قادری صاحب اور آنجناب کے تبصرے نظر سے گذرے اور حسب ذیل نکات پر خاکسار کی تشفی نہ ہو سکی:۔

(۱) آیا ایک مشت داڑھی کے بارے میں تمام علماء سلف کا اتفاق ہے؟ اگر ہے تو بقول شیخ مولانا مجدد الف ثانیؒ قول جمہور علماء کا ہی قابل قبول ہے اور اس کا خلاف قابل رد۔ اور اگر نہیں تو براہ کرم خیر القرون کے چند علماء کے فتاویٰ کے بابت کم سے کم مقدار نقل فرمائیں۔

(۲) میرے کئی دوست احباب جو شاید اس طنز سے کہ "خشخشی سے تو صفائی بہتر" ماشاء اللہ سے بڑی داڑھی رکھتے تھے جناب مودودی صاحب کے فتوے کے بعد سب خشخشی ہی پر اُتر آئے ہیں۔ کیونکہ نفس کی وسیسہ کاریوں کے تحت داڑھی رکھنا اتنا وقت طلب نہیں ہے جتنا کہ ایک مشت رکھنا اور اب تو عالموں کا فتویٰ بھی ہاتھ آگیا ہے اور آپ کے استدلال کے مطابق کہ صفائی سے تو کم سے کم داڑھی بہتر ہی ہے۔ مگر آپ کو شاید یہ معلوم ہونے پر تعجب ہو کہ یہاں چھوٹی خشخشی داڑھی فیشن میں داخل ہو گئی ہے۔ کئی کرسچین اور اہل ہنود تک چھوٹی خشخشی داڑھیاں رکھتے ہیں۔ ایسی حالت میں اوّل الذکر اور ثانی الذکر خشخشی میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ نیز ان حضرات کے عمل (یعنی داڑھی ایک مشت کو خشخشی بنانے) کے سلسلے میں ذمہ دار کون رہے گا کیونکہ ادھر چھوٹی داڑھی فیشن کی فیشن ادھر آخرت کی بلا بھی ٹل گئی سنت بھی پوری ہو گئی۔ بقول کسے۔ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

رہا مضحکہ خیزی کا سوال جیسا کہ آنجناب نے تجلی میں ارشاد فرمایا ہے "تو تمام ہی سنتیں ان سرپھرے انگریزی طرز کے مسلمانوں تک کو مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں تو پھر کوئی عقلمند جسکی نیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کی ہو انکا خیال ہی کیوں کرے۔

الجواب ۲:۔

جو شخص اس کا مدعی ہو کہ یک مشت داڑھی تمام علمائے سلف کے نزدیک واجب ہے، اسے خود ہی اس کا ثبوت بھی پیش کرنا چاہئے۔ تمام علمائے سلف تو درکنار جہاں تک ہمیں علم ہے فقط چاروں شہرۂ آفاق ائمہ کا بھی اتفاق ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کر دیا جائے تو بحث ختم اور اختلاف بالائے طاق۔

آپ شاید نہیں جانتے کہ جمہور علماء کے الفاظ اصطلاحاً ایک سے زائد معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ ایک معنی تو ایسے ہیں کہ جب وہ ملحوظ ہوں تو جمہور علماء کی رائے سے اختلاف کوئی مضائقہ نہیں رکھتا۔ کسی بھی صاحب علم سے پوچھ لیجئے وہ آپ کو بتائے گا کہ فقہ کی ادبی کتابوں میں جابجا اس کی تصریحات ملتی ہیں کہ فلاں مسئلہ میں جمہور علماء کی یہ رائے ہے لیکن امام ابو حنیفہؒ یا امام شافعیؒ یا امام مالکؒ

یا امام احمدؒ یا قاضی ابو یوسفؒ یا زفرؒ نے اس سے اختلاف کیا ہے ایک مفہوم بے شک ایسا ہے جسے ملحوظ رکھنے کی صورت میں جمہور علماء کی رائے سے اتفاق اور قبول و انقیاد ضروری ہوجاتا ہے اسی مفہوم کے لحاظ سے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جمہور علماء کے قول کو قابل قبول اور اس کے خلاف کو لائق رد کہا ہے، لیکن یہ ثابت کرنا ہمارے نہیں بلکہ دعویٰ کرنے والوں کے ذمے ہے کہ یک مشت داڑھی کے وجوب پر علمائے سلف کا ایسا ہی اتفاق ہے کہ اس سے اختلاف کو غیر جائز قرار دیا جائیگا

یہاں ایک مفصل علمی گفتگو کا محل تھا، لیکن جس غیر علمی اور غیر متین فکر و فہم کا مظاہرہ آپ اور آپ کے ستم ظریف دوستوں نے ہماری اور مولانا مودودی کی متعلقہ معروضات کے سلسلہ میں کیا ہے اس کے بعد کوئی حاصل اس دردسری کا نظر نہیں آتا۔ خدا جانے تفریح اور تمسخر کے کس موڈ میں آپ حضرات نے یہ تحریریں مطالعہ فرمائیں کہ اس طرح کی کچی پکی باتیں کرنے کی نوبت آئی جیسی آنجناب نے ثبت قرطاس کی ہیں۔

۲ــــ اس نمبر کے تحت جو کچھ آپ نے رقم کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے مبینہ دوست بڑے ہی سعادت مند واقع ہوئے ہیں۔ ادھر مولانا مودودی کی زبان سے یک مشت داڑھی کے واجب نہ ہونے کی بات نکلی اور ادھر وہ حجام کی دکان پر پہنچ کر اپنی لمبی داڑھیاں خشخشی کرا آئے۔ خوشا فرمانبرداری! پھر تو یقین ہے کہ مولانا مودودی برسہابرس سے ایک سچے مسلمان کی زندگی کا جو خاکہ اور فکر و عمل کا جو نقشہ پیش کرتے چلے آرہے ہیں اسے بھی ان سعادت مندوں نے کامل طور پر اپنا لیا ہوگا۔ یہ عبادت و اخلاق، تہذیب و تمدن، ملازمت اور کاروبار، مشاغل و معمولات تمام ہی شعبوں میں مولانا مودودی کے واضح فرمودہ معیار اسلام کا زندہ پیکر بن گئے ہونگے اگر ایسا ہے تو اس خدائے لایزال کی قسم جس کے قبضے میں ہماری جانیں ہیں وہ اپنی خشخشی داڑھیوں کے باوجود اُن یک مشت داڑھی والوں سے بہتر ہیں جنھوں نے خدا کی کامل اطاعت کے عوض زندگی کے کتنے ہی دائروں میں انحراف و سرکشی کا راستہ اختیار کیا۔ جن کا ظاہر و باطن یکساں نہیں اور جو دین و ملت کے حقیقی درد سے بیگانہ ہیں۔ ان دوستوں سے کہئے کہ آپ بشوق خشخشی داڑھی رکھیئے۔ اگر آپ کی پوری زندگی مولانا مودودی کے تصریح کردہ قالب ایمانی کے مطابق ہے اور داڑھی کے سلسلہ میں آپ کا طرز عمل ٹھٹھول اور استہزاء پر مبنی نہیں ہے تو آخرت کی بیش بہا نعمتیں انشاء اللہ آپ کے لئے محفوظ ہیں۔

لیکن اگر ایسا نہیں ہے، یعنی داڑھی تو انھوں نے مولنا مودودی کا نام لے کر خشخشی کرالی مگر اپنے مشاغل، اپنے کردار، اپنے تصورات اور اپنے شب و روز کو اُس سانچے میں نہیں ڈھالا جس کی طرف مولانا مودودی عرصۂ دراز سے مسلسل دعوت دیتے چلے آرہے ہیں تو کوئی منصف مزاج اور معاملہ فہم آدمی اس کے سوا کیا فیصلہ دے گا کہ خشخشی داڑھیوں کے سلسلہ میں مولنا مولانا مودودی یا کسی بھی عالم کی آڑ لے کر باتیں بنانا فقط شغل تفریح ہے۔ دین سے تمسخر ہے، داڑھی کے مسئلہ کو انھوں نے موضوع تفریح بنالیا ہے۔

یہ معروضات تو اس صورت میں تھیں کہ جس فتوے کی نسبت آپ اور آپ کے دوست مولانا مودودی اور عامر عثمانی کی طرف کررہے ہیں وہ واقعۃً خشخشی داڑھی کا جواز پیدا کرنے والا ہوتا لیکن امر واقعہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ نسبت ہی غلط بلکہ افترا آمیز ہے مولنا مودودی نے داڑھی کی مقدار کے مسئلہ پر جو کچھ لکھا ہے وہ رسائل و مسائل میں موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے یا تو آپ کے دوستوں نے اسے پڑھا ہی نہیں یا پڑھا تو پھر سنجیدگی اور بردباری کو بالائے طاق رکھ کر فقط اعتراض، تضحیک اور تفریح کے موڈ میں پڑھا۔ یہ بات نہ ہوتی تو خشخشی داڑھیوں کی ترغیب اس میں [illegible] ہرگز نظر نہ آتی۔ آپ کے مبینہ دوستوں سے تو مجھے التفات کی اُمید نہیں خود آپ سے ضرور گذارش کروں گا کہ دل و دماغ کو جارحانہ خیالات سے صاف کر کے رسائل و مسائل جلد اول میں صفحہ ۱۸۷ سے صفحہ ۱۸۹ تک بغور ملاحظہ فرمالیں۔ اس میں آپ کو صرف یہ ملے گا کہ مولانا مودودی ظاہر کے مقابلے میں باطن پر زیادہ زور دینے کی ترغیب دے رہے ہیں اور

اختلاف انھیں یک مشت داڑھی کے واجب ہونے سے
ہے نہ کہ وہ داڑھیاں چھوٹی کرانے کی ہدایت فرماتے ہیں
یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک عالم یوں کہے کہ وتر کے بعد دو
رکعات پڑھنا واجب نہیں ہے۔ تو کیا احمقوں یا متعصبوں
کے سوا اس کا مطلب کوئی بھی شخص یہ لے گا کہ یہ عالم
ترکِ نوافل کا سبق دے رہا ہے اور کیا اس آدمی کو آپ
ہوشمند کہہ سکیں گے جو پہلے تو وتر کے بعد دو رکعت پڑھتا
رہا ہو لیکن اس قول کے سنتے ہی خوش ہو کر پکار اٹھے
کہ اب ہمیں عالموں کا فتویٰ مل گیا ہے لہٰذا یہ دو رکعات
ہم چھوڑتے ہیں۔

خود ہمارے متعلقہ تبصرے کے ساتھ آپ اور آپ کے
دوستوں کی فہم و دیانت نے جو برتاؤ کیا ہے وہ بھی عجیب ہے
آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے جو داڑھی کے
مسئلے پر مولانا مودودی اور مولانا عروج قادری کی آراء
پر جون کے تجلی میں تبصرہ کیا ہے اس میں خشخشی اور برائے
نام داڑھیوں کی ہمت افزائی کی ہے حالانکہ معاملہ صریحاً
اس کے برعکس ہے۔ ایک بار پھر جون کا تجلی اٹھا کر دیکھ
لیجئے ہمارے تبصرے میں خشخشی داڑھیوں کے جواز کی بجائے
وضاحت اور تکرار کے ساتھ ان کے غیر مشروع اور ممنوع
ہونے کا اعلان کیا گیا ہے۔

مثلاً صفحہ ۲۵ (تجلی جون ۶۳ء) پر واضح الفاظ
ہیں:-

"معقول بات یہ ہے کہ داڑھیوں کو چھوٹی بھی نہ کی
جائے اور اتنا کاٹا بھی نہ جائے کہ وہ داڑھی کا جیبی
ایڈیشن بن جائیں۔"

صفحہ ۲۹ پر:-

"داڑھی کا ڈھلاؤ منڈوانے کی طرف نہ ہونا
چاہئے بس شرعاً اتنا ہی کافی ہے۔"

"گناہ کی سرحد وہاں سے شروع ہوتی ہے جب
داڑھی میں اور کسی پارک کی مشین سے ہموار کی
ہوئی گھانس میں فرق دشوار ہو جائے ایسی برائے
بیت داڑھیاں یقیناً قابلِ نکیر ہیں۔"

فرمائیے کیا یہ خشخشی داڑھیوں کے جواز کا فتویٰ ہے
یا ان کے غیر مشروع ہونے کا۔ اصولاً بھی ہم نے زور دیا ہے کہ
داڑھی کا میلان بہرحال اِعفاء اور اضافے کی طرف ہونا
شرعاً ضروری ہے۔ اس سے خشخشی اور فرینچ کٹ داڑھیاں
بداہتہً جواز کے دائرے سے خارج ہو گئیں۔ آپ جانتے
ہی ہیں کہ سو میں چالیس کا نام قلت ہے ساٹھ کا کثرت۔
داڑھی کا طبعی اوسط جو کچھ ہے اگر اس کے نصف سے کم
داڑھی رکھی گئی تو لازماً سمجھا جائے گا کہ رجحان منڈوانے
کی طرف ہے اور اگر نصف سے زائد ہے تو میلان اعفاء اور
اضافے کی طرف ہوگا۔ یک مشت سے قدرے کم داڑھی بھی
داڑھی کے طبعی اوسط طول و عرض سے آدھی نہیں رہ جاتی
بلکہ زائد ہی ہوتی ہے لہٰذا اس میں میلان اعفاء کی طرف
پایا گیا۔ مگر خشخشی داڑھیاں طبعی مقدار کے نصف سے کم ہوتی
ہیں لہٰذا وہ یقیناً اس حدیث کے خلاف ہیں جس میں داڑھی
بڑھانے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ دونوں رخساروں کی طرف تو
بس برائے بیت ہی رہ جاتی ہیں لہٰذا ہمارے جون والے تبصرے
سے ہی ان کی حرمت اور قباحت بالکل واضح ہے۔ پھر بھی
آپ کے دوست اگر یہ فرمانے لگیں کہ خشخشی داڑھیوں کے جواز
میں مولانا مودودی اور دیگر علماء کا فتویٰ مل گیا تو اسے مسخرے
پن کے سوا کیا کہیں گے۔ یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے ایک شخص ٹخنوں
سے اوپر کا نیکر پہنے اور جب اسے سمجھایا جائے کہ بھائی یہ
حرکت ٹھیک نہیں تو وہ سینہ تان کر کہے کہ واہ کیوں ٹھیک
نہیں ہم تو علماء کے فتوے کے مطابق عمل کر رہے ہیں۔ آپ
حیران ہو کر پوچھیں کہ بھائی کونسا فتویٰ؟ ذرا ہمیں بھی تو اس کی
زیارت کراؤ وہ کھٹ سے کتاب اٹھا لائے اور ورق کھول
کر دکھلائے کہ دیکھئے پاجامے کا ٹخنوں سے اوپر رکھنا ضروری
قرار دیا گیا ہے!

فرمائیے اس وقت آپ کے دل پر کیا گذرے گی؟۔
فتویٰ تو ٹخنے کھلے رکھنے کا اور کھینچ دیا گیا اسے ربڑ کی طرح

گھٹنوں سے بھی اُدپرا — اگر واقعی اس شخص کے حسنِ فہم پر آپ بھنا جائیں گے تو آخر اپنے دوستوں کی اس حرکت پر کیوں نہ بھنائے کہ عامر عثمانی تو صرف اس پر زور دے رہا ہے کہ داڑھی کا ایک مشت ہونا واجب نہیں ہے یک مشت سے قدرے کم بھی ہو جائے تو ترکِ واجب کا فتویٰ نہیں دینا چاہئے، لیکن آپ کے دوست خوشی سے پھولے نہیں سمائے ہیں کہ خشخشی کے جواز کے لئے "عالموں" کا فتویٰ ہاتھ آگیا حالانکہ خشخشی کو خلافِ شرع قرار دینے کے معاملہ میں ہمارا جون والا تبصرہ ذرا بھی مبہم نہیں ہے۔

خدا معاف کرے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ آپ کے دوستوں کے کاسۂ سر میں مغرب زدوں والا ذہن پرورش پا رہا ہے مغرب زدوں کا یہی حال ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ نے اگر گڑیاں کھیلی ہیں تو یہ کاریگر اس سے مجسمہ سازی کا جواز نکالیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر کبھی بچیوں کو دف بجا کر گیت گاتے سن لیا ہے تو یہ حضرات اس کے بطن سے گانے بجانے کی تمام ترقی یافتہ اصناف کی اباحت برآمد کریں گے۔ اگر قرنِ اوّل میں عورتیں منھ کھول کر ضرورۃً راستوں میں چلی ہیں تو اسے بنیاد بنا کر یہ کرمفرما خاتونِ عصرِ حاضر کی تمام عریانیوں اور رُومان آفرینیوں پر جواز کی مہر لگائیں گے۔

اپنے دوستوں سے کہئے انھیں جیسی بھی داڑھیاں رکھنی ہوں رکھیں مونڈنی ہوں مونڈیں مگر خواہ مخواہ مولٰنا مودودی یا عامر عثمانی کی آڑ کیوں لیتے ہیں۔ ایسی بے تہہ باتوں سے مسخرے پن کا مظاہرہ تو ضرور ہو سکتا ہے، لیکن خدا کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔

مزید بحث و نظر کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے ہم ایک بار اپنے عقیدہ و مسلک کو غیر مبہم الفاظ میں دہرائے دیتے ہیں تاکہ جسے ہمارے موقف کے بارے میں واقعتہً غلط فہمی ہوئی ہو وہ اس کی اصلاح کر لے۔

(۱) ہمارے نزدیک داڑھی رکھنا شرعاً واجب ہے اور اسکا تارک شرعی اصطلاح میں فاسق ہے۔

(۲) داڑھی کا اطلاق صرف اُن داڑھیوں پر ہو سکتا ہے جن کا میلان ارخاء و اعفاء یعنی داڑھی بڑھانے کی طرف ہو۔ میلان سے مراد یہ ہے کہ داڑھی کی طبعی مقدار کا جو اوسط ہے داڑھیاں اس کے نصف سے کچھ زائد ہوں کم نہ ہوں۔ کم ہوں گی تو میلان مونڈنے اور کاٹنے کی طرف سمجھا جائے گا اور ان پر اسی طرح ترکِ واجب کا اطلاق ہو گا جیسے منڈی ہوئی داڑھی پر۔

(۳) عرف عام میں جنھیں خشخشی یا فرنچ کٹ کہا جاتا ہے وہ داڑھی کے اطلاقِ شرعی سے خارج ہیں ان کو اختیار کرنے والا مونڈنے والوں کی صف میں ہے۔

(۴) گفتگو صرف اس پر ہے کہ ایک شخص کی داڑھی یکمشت سے قدرے کم ہو لیکن وہ اتنی کم نہ ہو کہ میلان منڈوانے کی طرف ہو گیا ہو تو ہمارے ناقص خیال میں یہ شخص واجب کا تارک اور فاسق کہلانے کا مستوجب نہیں ہے بعض علماء کہتے ہیں کہ اس نے واجب کو ترک کیا۔ اپنی اپنی رائے ہے۔ ہماری دانست میں یک مشت کی مقدار ایک تخمینہ اور اندازہ ہے جسے فقہاء نے اجتہاد سے نکالا ہے اس کے معقول و محمود ہونے میں کلام نہیں لیکن اس پر وجوب کا حکم لگانا دشوار ہے کیونکہ واجب ایک قانونی اصطلاح ہے اور اس اصطلاح کا یقینی اطلاق جتنے مضبوط اور قطعی دلائل چاہتا ہے وہ غالباً موجود نہیں ہیں۔

(۵) اضحوکہ بننے سے پرہیز کا مشورہ ہمارا اختراع کردہ نہیں بلکہ فقہائے سلف کا وضع فرمودہ ہے اور اس وضع میں وہ موجد کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ اس کی جڑیں حدیث رسولؐ میں ہیں۔ جو چیز شرعاً ضروری ہو اس سے دست برداری تو جائز ہی نہیں ہے چاہے دنیا بھر اسے مضحکہ خیز قرار دے لیکن غیر ضروری اُمور میں لوگوں کے طعن و تمسخر سے بچنے کا جذبہ مذموم نہیں ہے۔ حدیث میں وارد شدہ حکم اعفاء (داڑھی بڑھانے کے حکم) کا منشاء اگر یہ ہوتا کہ داڑھی کا ایک بال بھی مت کاٹو تو کوئی بھی بڑا فقیہ یہ کہنے کی جرأت کیسے کر سکتا تھا کہ داڑھی کو اس درجہ مت بڑھاؤ کہ مضحکہ خیز لگنے لگے۔ اعفاء کے حکم کا منشاء فقط یہ ہے کہ داڑھی کو داڑھی کی طرح رکھو۔ محض نام کی داڑھی کافی نہیں ہاں یک مشت کی مقدا

فقہاء کا اجتہادی تخمینہ ہے جو بہترین ضرور ہے لیکن واجب کہنا اسے مشکل ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یہ ہے داڑھی کے سلسلہ میں ہمارا موقف۔ اسے جو لوگ غلط خیال کریں وہ بہ شوق اس کے خلاف رائے رکھیں لیکن اس کی آڑ لے کر اپنی خشخشی داڑھیوں کو ہمارے سر ڈالنا ستم ظریفی ہے معقولیت نہیں۔

نوٹ:۔ آپ کا سوال ۲ اور ۳ جو انگریزی بالوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتوں سے متعلق ہے عبارت کے اعتبار سے اُلجھا ہوا اور خاصہ شکستہ لکھا ہوا ہے۔ اگر دونوں کا جواب مطلوب ہی ہو تو دوبارہ سنبھال کر لکھنے کی زحمت فرمائی جائے۔ یہ مشورہ ضرور ملحوظ رہے کہ مولانا مودودی یا کسی بھی شخص کے کسی مسلک و رائے پر اگر آپ کو اعتراض ہو تو سنی سنائی باتوں پر کچے پکے اعتراض کرنے کے عوض پہلے اس شخص کی متعلقہ تصریحات کو اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرمالیں

آپ کا چوتھا سوال درج ذیل ہے۔

تمباکو نوشی

سوال ۴:۔ (ایضاً)

سنا گیا ہے کہ سگریٹ و بیڑی وغیرہ کے تمباکو میں افیون گانجہ وغیرہ کا پانی، مارا ہوا پارہ وغیرہ ملایا جاتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو از روئے حدیث کہ:۔

"جس کی زیادہ مقدار نشہ لائے اس کی کم سے کم مقدار بھی حرام ہے"۔

تمباکو نوشی کی شرعی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟

الجواب ۴:۔

آپ نے سنا اور پڑھا ہوگا کہ احناف تقلید پر زور دیتے ہیں اور براہِ راست قرآن وحدیث سے اجتہاد و استنباط کا حق معیاری صلاحیتیں رکھنے والوں کے سوا کسی کے لئے تسلیم نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہی تو ہے کہ جب تک اونچے درجے کی صلاحیتیں نہ ہوں آدمی اجتہاد اور تک بندی میں فرق نہیں کر سکتا۔

آنجناب ایک پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ اپنی تصریح کے مطابق تجلی بھی کافی دنوں سے مطالعہ فرما رہے ہیں۔ اس کے باوجود آپ نے ایک حدیث سے ایسا نتیجہ اخذ کیا جو کسی بھی معتبر فقیہ کی رائے سے جوڑ نہیں کھاتا۔ آپ نے گو صاف نہیں کہا ہے کہ سگریٹ بیڑی وغیرہ شرعاً حرام ہونے چاہئیں لیکن سوال کا انداز یہی کہہ رہا ہے کہ متذکرہ حدیث سے آپ کی قوتِ اجتہاد سگریٹ بیڑی وغیرہ کی حرمت ہی اخذ کر رہی ہے۔ یہ غلط خیال ہے۔ سگریٹ بیڑی، حقہ اور پان میں کھائے جانے والے تمباکو حرام نہیں ہیں۔

گانجہ اور افیون وغیرہ بلا شبہ منشیات میں ہیں اور حرام ہیں کیونکہ ان کی زائد مقدار نشہ پیدا کرتی ہے، لیکن سوال گانجے اور افیون کے حلال و حرام کا تو در پیش نہیں ہے سوال در پیش ہے سگریٹ بیڑی وغیرہ کا۔ کیا سگریٹ بیڑی کی بھی زائد مقدار نشہ پیدا کرتی ہے؟ ــــ اگر نہیں کرتی اور یقیناً نہیں کرتی تو فقط اس لئے انھیں حرام نہیں قرار دیا جا سکتا کہ ان کی ساخت میں کسی نشہ آور چیز کے کچھ اجزا شامل ہیں۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ زمین سے اُگی ہوئی جو بھی شے ــــ گیہوں سے لیکر سیب اور سنترے تک ــــ ہم کھاتے ہیں اس میں کھاد کے بعض کیمیاوی اجزا ضرور تحلیل ہوتے ہیں۔ کھاد غلاظت ہی کا نام تو ہے۔ غلاظت بجائے خود حرام ہے لیکن وہ سارے پھل اور اجناس حلال ہیں جن کے نشو و نما میں غلاظت کے طبعی عناصر نے خوب خوب کارفرمائی کی ہے۔

دوسری مثال ماءِ کثیر کی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ مویشیوں نے دریا میں بول و براز کر دیا، لیکن شریعت کہتی ہے کہ دریا کا پانی جوں کا توں پاک ہے اور آپ اسے بہ شوق پی سکتے ہیں۔ اس سے وضو اور غسلِ جنابت بھی کر سکتے ہیں۔ یعنی یہ طاہر بھی ہے اور مطہر بھی ــــ کیوں؟ ــــ اس لئے کہ اجزائے غلاظت کی جو طبعی ترکیب سبب حرمت تھی وہ تحلیل ہونے کے کیمیاوی عمل سے ختم [illegible] غلاظت کالعدم

سمجھی جائے گی۔

ابھی کچھ روز ہوئے شور اٹھا تھا کہ ہلدی کو رنگین بنانے میں گوبر سے کام لیا جاتا ہے۔ اس پر بھی ہم نے یہی سپرد قلم کیا تھا کہ کوئی مضائقہ نہیں۔ گوبر اگر طبخ وانطباخ اور تجزیہ تحلیل کے اثر سے اپنی حقیقت کھو چکا ہو تو حرمت بھی معدوم سمجھیے۔

خورد ونوش کے مروجہ تمباکو گانجے اور افیون یا کسی بھی نشہ آور چیز کی آمیزش سے تیار کئے جاتے ہوں لیکن یہ بجائے خود کسی بھی مقدار میں وہ نشہ پیدا نہیں کرتے جو شریعت میں مدار حرمت ہے پھر انھیں حرام کس دلیل سے کہا جا سکتا ہے۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ حلال وحرام اور فرض وواجب وغیرہ اسلام کی آئینی اصطلاحیں ہیں۔ ان کے تعین میں بڑی احتیاط درکار ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک چیز تقویٰ یا ثقاہت اور شان کے خلاف نظر آئے مگر اس پر "حرام" کا حکم لگانا مضبوط شہادت چاہتا ہے۔

تاریخ کے قیمتی جواہر

تاریخ فیروز شاہی فیروز شاہ تغلق کی مکمل سوانح عمری اور اس کے پرشکوہ عہد کا مفصل تذکرہ — سوا آٹھ روپے

قاضی خاں نظام الملک کی شاندار تاریخ
مغلیہ دور حکومت حصہ اوّل — بابر سے جہاں گیر تک۔ پونے نو روپے
حصہ دوئم — دور شاہجہانی سوا آٹھ روپے
حصہ سوئم — دور عالمگیری گیارہ روپے

تاریخ غرناطہ اندلس کے مشہور شہر غرناطہ کے مشاہیر کا مکمل تذکرہ۔ ہمارے تابناک ماضی کا ایک باب۔ مکمل دو حصے۔ بائیس روپے

فتوح البلدان اسلامی تاریخ کا بڑا قیمتی ماخذ جو اپنے مؤلف کے نام پر تاریخ بلاذری کے نام سے مشہور ہے۔ ترجمہ عمدہ۔ قیمت مکمل پندرہ روپے

عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہمارے ماضی قریب کی تاریخ۔ دلچسپ مگر عبرت آموز واقعات کا خزانہ۔ بارہ روپے

تاریخ اسلام مؤرخ اسلام اکبر شاہ نجیب آبادی کی مشہور تاریخ جو تفصیل اور جامعیت میں اپنی مثال آپ ہے۔ مکمل تین حصے چھتیس روپے

سفرنامہ ابن بطوطہ ابن بطوطہ کی ۲۵ سالہ سیاحت کی نہایت دل چسپ اور معلوماتی آفریں داستان، جو دستاویزی اہمیت کی حامل ہے۔ پندرہ روپے

مآثر عالمگیری اورنگ زیب عالمگیر کے پچاس سالہ شاندار دور حکومت اور بزم و رزم کی چشم دید کہانی عالمگیرؒ کے دائمی مصاحب محمد ساقی مستعد خاں کے قلم سے۔ نو روپے بارہ آنے

شاہجہاں کے ایام اسیری اور عہد اورنگ زیب مغل شہنشاہیت کے ایک نازک دور کی عبرت آموز روداد۔ فرانسیسی سیاح کے قلم سے جو اس دور کا تماشائی تھا۔ بارہ روپے

آئینۂ حقیقت نما ہندوستان کے تعلق سے مسلم فاتحین کے مستند حالات۔ تحیر خیز اور سبق آموز۔ بارہ روپے

امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی امام اعظم کے سیاسی مسالک اور اجتماعی سرگرمیوں کی بصیرت افروز تصویر کشی۔ بارہ روپے

البرامکہ دنیائے اسلام کے نامور وزراء خالد برمکی، یحییٰ برمکی اور جعفر برمکی کے عروج و زوال کی فکر انگیز کہانی۔ بارہ روپے

صحابیاتؓ ازواج مطہرات اور دیگر صحابیات کے ایمان افروز حالات و کوائف۔ چھ روپے

سفینۃ الاولیاء شہزادہ دارا شکوہ کا رقم کردہ مشاہیر اولیاء کا تذکرہ۔ پونے سات روپے

ابوبکرؓ و عمر فاروقؓ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے قلم سے ان دو عظیم صحابیوں کا مفصل تذکرہ جن کا ہمسر امت میں کوئی نہیں۔ پونے سات روپے

عثمانؓ و علیؓ یہ بھی ڈاکٹر طٰہٰ حسین ہی کی تالیف ہے۔ اسلامی تاریخ کے ایک ہولناک خونیں انقلاب کی داستان۔ بارہ روپے

تذکرہ شاہ ولی اللہؒ مولانا مناظر احسن گیلانی کے قلم سے شاہ ولی اللہ الدہلوی کا شاندار تذکرہ۔ ساڑھے چار روپے

مکتبہ تجلّی دیوبند

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ پر قاضی سلیمان منصور پوری رح کی شہرہ آفاق کتاب کا مختصر تعارف یہ ہے کہ اہل علم نے سے علمی اعتبار سے مستند مانتے ہیں اور انداز بیان دل کش، رچاؤ اور درد و لبست کے لحاظ سے یہ اپنا جواب آپ ہے۔ سوز و گداز میں ڈوبا ہوا اسلوب، ستھرا اور نکھرا ہوا فکر۔ عبارتیں رواں، شگفتہ اور دل نشیں۔ مدت سے یہ قیمتی کتاب نایاب تھی اب خاصے اہتمام کے ساتھ تین جلدوں میں شائع کی گئی ہے۔ قیمت مکمل غیر مجلد بیس روپے -/۲۰
(مجلد تین جلدوں میں: پچیس روپے)

محمد رسول اللہ ﷺ مشہور مصری مصنف توفیق الحکیم کی کتاب کا عمدہ اردو ترجمہ، مکالمہ کے انداز میں لکھی ہوئی حضور کی سیرت مقدسہ بیحد دلچسپ اور پُرکیف۔ قیمت پانچ روپے -/۵

ابوبکر صدیق رض مصنفہ: محمد حسین ہیکل مصری۔ ترجمہ: شیخ محمد احمد پانی پتی۔ پانچ روپے

عمر فاروق اعظم رض مصنفہ: محمد حسین ہیکل مصری۔ ترجمہ: حبیب اشعر۔ نو روپے۔

منہاج العابدین (اردو) امام غزالی رح کی سب سے آخری تصنیف جو آپ کی پوری زندگی کی تعلیمات کا خلاصہ اور تصوف کا نچوڑ ہے۔ مجلد آٹھ روپے

باندیوں کا مسئلہ (الدّر الثمین) جہاد میں ہاتھ آئی ہوئی عورتوں کو باندی بناکر رکھنے کی دینی و علمی حیثیت۔ کتاب میں مصنف کا ایک خط اور مولانا ابوالکلام آزاد رح کا جواب بھی شامل ہے۔ ڈیڑھ روپیہ۔

خلاصہ اشرف السوانح مولانا اشرف علی رح کے حالات و سوانح۔ دو روپے -/۲

خصائل مسلمین شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رح کے پوتے شاہ محمد اسحاق رح کی مشہور کتاب "مسائل اربعین" کا اردو ترجمہ۔ چالیس مروجہ بدعتوں کا رد مستند کتب فقہ کے حوالوں سے۔ مجلد دو روپے -/۲

الوسیلہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رح کی مشہور کتاب، جس میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ قرآن میں وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ کہہ کر اللہ نے جس وسیلے کی طرف توجہ دلائی ہے وہ آخر کیا ہے؟ مجلد نو روپے۔

اصح السیر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر لاجواب کتاب، محققانہ مگر دلچسپ، مستند، وسیع اور بیش بہا۔ سیرت کی کتابوں میں اس کتاب کو اپنا جواب آپ مانا گیا ہے۔ قیمت مجلد دس روپے۔

سوانح خواجہ معین الدین چشتی رح محبوب العارفین حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی اثر انگیز سوانح حیات۔ جو اجمیر کی خاک میں استراحت فرما رہے ہیں۔ ساڑھے چار روپے۔ ۴/۵۰

الفرقان شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رح کے ایک رسالے کا اردو ترجمہ۔ جس میں کرامت و بزرگی کی علامات اور ولایت کی حقیقت پر لاجواب گفتگو کی گئی ہے۔ مجلد مع حسین کور۔ چار روپے۔

فارابی معلم ثانی حکیم ابو النصر فارابی رح کے علم و فضل ان کی سوانح اور کمالات، تجدید فلسفہ و منطق کے مفصل و مکمل حالات۔ پونے دو روپے۔

اشرف الجواب مولانا اشرف علی تھانوی رح کی طرف سے بعض سوالوں کے اہم جواب مکمل دو حصے۔ ساڑھے چار روپے ۴/۵۰

حیات انور رح فخر المحدثین مولانا انور شاہ صاحب رح کا مفصل تذکرہ۔ آپ کے علمی کمالات کا نقش جمیل۔ قیمت چار روپے -/۴

آئینۂ نماز صرف نماز ہی کے نہیں بلکہ پانچوں ارکان اسلام کی تفصیل مع مسائل ضروریہ۔
قیمت ڈیڑھ روپیہ ۱/۵۰

حکیم الامت رح کی مجلسیں مولانا اشرف علی رح کی روح نواز مجالس کا پُرکیف تذکرہ۔ قیمت دو روپے -/۲

(عبداللطیف الاعظمی (ایڈیٹر جامعہ دہلی)

پراویڈنٹ فنڈ کی نوعیت کی مزید وضاحت

ستمبر ۱۹۶۳ء کے "تجلّی" میں پراویڈنٹ فنڈ کی نوعیت اور تفصیلات کے متعلق جناب محمد حسین چشتی صاحب کا مضمون نظر سے گذرا۔ اس سے قبل مولانا سید احمد قادری صاحب مدیر "زندگی" اور مولانا عامر عثمانی صاحب مدیر "تجلی" کی بحثیں بھی پڑھ چکا ہوں۔ دونوں مدیروں میں جو اختلاف رائے ہے اس کے بارے میں مجھے کچھ عرض کرنا نہیں ہے۔ جہانتک اس مسئلے کا مذہبی پہلو ہے میرے خیال میں اسکے تمام پہلوؤں پر پوری وضاحت کے ساتھ بحث و گفتگو ہوچکی ہے۔ لیکن اس کے باوجود چشتی صاحب کے مضمون کی اشاعت اس لئے ضروری سمجھی گئی کہ بقول مدیر تجلّی "یہ موضوع کمان واقعاتی گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے جو تجربے اور خصوصی واقفیت ہی سے جانے جا سکتے ہیں۔" خود فاضل مضمون نگار کا بھی دعویٰ یہی ہے کہ انھوں نے جو تفصیلات پیش کی ہیں وہ "حقائق" ہیں۔ ممکن ہے یہ کسی مخصوص جگہ کیلئے حقائق ہوں۔ مگر ہر جگہ یہی قاعدے ضابطے نہیں ہیں۔ یہ بات ضرور ہر جگہ یکساں ہے کہ پورا فنڈ جس میں ادارہ یا محکمہ کا حصہ بھی شامل ہو دورانِ ملازمت میں نہیں ملتا، مگر اسی طرح ہر جگہ یہ قاعدہ بھی تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ضرور ہے کہ مخصوص حالات میں کچھ شرائط کے ساتھ قرض کی صورت میں فنڈ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ "مخصوص حالات" قرض کے شرائط اور قرض کی مقدار کے متعلق مختلف جگہ مختلف قاعدے ہیں۔ مثلاً چشتی صاحب نے کچھ ایسی صورتیں لکھی ہیں جن میں ان کی ریاست کا محکمہ فنڈ کی بنیاد پر قرض نہیں دیتا مگر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں جس کے حسابات کی تنقیح سرکاری آڈیٹر کرتے ہیں اور جس کو حکومت ہند سے پورے خسارے کے بقدر امداد ملتی ہے۔ اُن تمام صورتوں میں ایک ملازم اپنے حصّے کے پورے فنڈ کے مساوی قرض لے سکتا ہے۔ ہمارے یہاں ایسی مثالیں بھی ہیں کہ بعض کارکنوں نے دوسروں کے فنڈ کی بنیاد پر قرض لئے ہیں۔ اگرچہ یہ رقمیں قرض کے نام پر ملتی ہیں، مگر اسی کو ملتی ہیں جس کا پراویڈنٹ فنڈ ہو اور کارکن کی جس قدر رقم ہو اسی حساب سے قرض ملتا ہے۔ اس لئے غالباً یہ کہنا نامناسب اور غلط نہیں ہوگا کہ ایک طریقے سے پراویڈنٹ فنڈ ہی ایک محدود مدت کیلئے مل جاتا ہے۔ نیز اس بنیاد پر اگر کوئی شخص یہ رائے قائم کرے کہ دورانِ ملازمت میں پراویڈنٹ فنڈ پر تصرف کا حق حاصل ہے تو یہ بات کچھ غلط نہیں ہوگی۔

چشتی صاحب نے کئی جگہ سود کا بھی ذکر کیا ہے کہ صاحبِ فنڈ کو قرض ملتا ہے تو اس کو سود بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔ معلوم نہیں اس ذکر سے وہ کیا نتیجہ نکالتے ہیں۔ بہرحال صاف بات ہے اگر فنڈ کی رقم پر صاحبِ فنڈ کو سود ملتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ فنڈ کی بنیاد پر جب قرض لے تو اس پر سود ادا نہ کرے ورنہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ملازمین اپنی رقم پر تو سود وصول کرلیں اور جب اسی رقم کی بنیاد پر ادارہ یا محکمہ انکو قرض دے یا بالفاظ دیگر ان کی جمع شدہ رقم میں سے جس پر قاعدہ کے مطابق سود ادا کیا جاتا ہے۔ کچھ یا کُل رقم ایک معینہ مدت کے لئے واپس کرے تو اس پر سود وصول نہ کرے۔ لطف کی

یہ ہے کہ چشتی صاحب اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ
فنڈ کی بنیاد پر جو قرض لیا جاتا ہے اس کا سود بعد میں واپس
مل جاتا ہے۔ ان کی عبارت یہ ہے:-

"اگر کوئی ملازم فنڈ میں سے[۵] قرضہ حاصل کرے تو
اسے اس رقم پر سود ادا کرنا پڑتا ہے جو قرض کے
طور پر حاصل کر لیتا ہے (یہ دوسری بات ہے کہ
سود بعد میں اس کی فنڈ کی رقم میں جمع کیا جاتا
ہے)"

چشتی صاحب نے زیر بحث مضمون میں لکھا ہے کہ فنڈ کی رقم
بہ جبر وصول کی جاتی ہے۔ ان کے اپنے الفاظ ہیں" وہ جائز
ہی کیا ہے جو کسی سے بہ جبر وصول کی جائے"۔ "مدیر" زندگی" نے
لکھا تھا کہ "پچانوے فی صدی ملازمین اپنی تنخواہوں سے فنڈ
بخوشی کٹواتے ہیں" چشتی صاحب اس کی تردید کرتے ہوئے
لکھتے ہیں:-

"امر واقعہ یہ ہے کہ تیس چالیس فی صد سے زائد
ملازم نہیں ہوں گے جو اپنی مرضی سے یہ رقم جمع کراتے
ہوں گے۔ یہ کہنا کہ پچانوے فی صدی ملازم یہ
رقم بخوشی کٹواتے ہیں سراسر مبالغہ ہے۔"

موصوف نے اس پر روشنی نہیں ڈالی کہ انھوں نے کس
سے یہ تناسب معلوم کیا ہے اور جب کوئی بات بے ثبوت کے
کہنی ہو تو تیس چالیس کی کیا قید ہے۔ وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ
دو چار فیصدی سے زیادہ نہیں ہوں گے" بلکہ زیادہ زور پیدا
ہوتا اگر وہ لکھتے کہ ایک فیصدی ملازم بھی نہیں ملے گا جو
اپنی مرضی سے فنڈ وضع کرواتا ہو۔ بہر حال جہاں سالہا سال
سے فنڈ وضع کیا جاتا ہے وہاں مرضی اور عدم مرضی کا اندازہ
کرنا مشکل ہے۔ سوائے اس کے کہ اس سلسلے میں اگر مخالفت یا
موافقت میں کوئی احتجاج کیا جائے تو احتجاج کرنے والوں کی تعداد
کے لحاظ سے ایک بات کہی جا سکتی ہے مگر چشتی صاحب نے ــــ

ــــ اسی طرح قادری صاحب نے بھی ــــ اس طرح کا کوئی حوالہ
نہیں دیا ہے۔ لیکن اگر کسی جگہ فنڈ کے وضع کرنے کا نیا نیا
قاعدہ بنایا جائے اور وہاں کے ملازم اس کو خوشی سے منظور کریں
تو اس پر قیاس کر کے ایک عام اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی خیال
سے جامعہ ملیہ کا تجربہ میں یہاں پیش کرتا ہوں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پراویڈنٹ فنڈ کا جب قاعدہ
بنایا گیا تھا تو اس وقت کوئی خارجی دباؤ نہیں تھا۔ اگر جامعہ
کے اساتذہ اور کارکن چاہتے کہ یہ قاعدہ نہ بنایا جائے تو کوئی
ان کو مجبور کرنے والا نہیں تھا۔ اس وقت جامعہ میں تنخواہیں
بھی بہت کم تھیں۔ اس میں ذرا سی کمی بھی کارکنوں کے لئے
بڑی تکلیف کا باعث ہوتی تھی۔ مگر اس عسرت اور تنگی کی
حالت میں پراویڈنٹ فنڈ کا مروج قاعدہ یہاں نافذ کیا
گیا۔ ایک طویل عرصے تک چپراسیوں کو اس قاعدے سے مستثنیٰ
رکھا گیا مگر ان کے مطالبے اور اصرار پر ان کی تنخواہوں سے
بھی وضع کیا جانے لگا۔

چشتی صاحب نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ "گورنمنٹ یا
پرائیویٹ ادارے اپنے ملازموں کی بہبودی کے لئے یہ رقم
بہ جبر کاٹتے ہیں اسی لئے عام ملازم صرف اس شرح پر فنڈ
کٹواتے ہیں جو کم سے کم ہو۔ ورنہ زیادہ سے زیادہ شرح پر بھی
کٹوایا جا سکتا ہے" کم سے کم شرح پر فنڈ کٹوانے کی تردید میں
میں جامعہ کے ایک ادارے کی مثال پیش کرتا ہوں۔ اورل
انسٹی ٹیوٹ ابھی حال ہی میں قائم ہوا ہے اور مرکزی وزارت
تعلیم کے ماتحت ہے۔ شروع شروع میں ایک عرصے تک جامعہ
ملیہ کے قاعدے کے مطابق اس ادارے کے اساتذہ اور کارکنوں
کی تنخواہوں سے بھی دس فی صدی کے حساب سے فنڈ وضع ہوتا
مگر جب وزارت تعلیم کے علم میں یہ بات آئی تو اس نے اس پر
اعتراض کیا اور اس کے بعد مرکزی حکومت کے قاعدے کے
مطابق ۸½ فیصدی کے حساب سے فنڈ وضع ہونے لگا۔ اس پر
اورل انسٹی ٹیوٹ کے اساتذہ اور کارکنوں نے مرافعہ پیش
کیا اور خواہش کی کہ جامعہ ملیہ کے قاعدے کے مطابق انکی تنخواہوں
سے دس فی صدی فنڈ وضع کیا جائے۔ چشتی صاحب کا یہ بیان

۵؎ زیر خط حصہ " فنڈ میں سے " قابل غور ہے۔ اس سے میرے
اس خیال کی حمایت ہوتی ہے کہ قرض کی صورت میں فنڈ یا فنڈ کی کچھ
رقم ایک مدت معینہ کیلئے واپس کی جاتی ہے۔ (لطیف اعظمی)

بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ عام طور پر ملازمین زیادہ سے زیادہ شرح پر فنڈ وضع نہیں کراتے۔ حالانکہ ان کو اس کی اجازت ہے۔ اس کی وجہ چشتی صاحب کو معلوم ہوگی، مگر انھوں نے اپنے مضمون میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ شاید ایسا اس لئے کیا ہے کہ اس کو بیان کر دینے سے کم سے کم شرح والی بات غلط ہو جاتی۔ واقعہ یہ ہے کہ لوگ صرف اسی شرح پر فنڈ وضع کروانا پسند کرتے ہیں، جس شرح پر حکومت یا ادارہ بھی فنڈ میں رقم جمع کرے۔ مثلاً جامعہ میں قاعدہ ہے کہ دس فیصدی کارکن کی تنخواہ سے رقم وضع کی جاتی ہے اور اسی قدر جامعہ کی طرف سے رقم شامل کی جاتی ہے۔ اب اگر جامعہ میں یہ قاعدہ بھی ہو کہ اس کے کارکن دس فیصدی سے زیادہ رقم وضع کروا سکتے ہیں مگر جامعہ اپنی طرف سے صرف دس فی صدی ہی رقم شامل کرے گا تو غالباً ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جو اس زائد شرح پر رقم وضع کروائے۔ کیونکہ اگر وہ کچھ رقم پس انداز کرنا چاہتا ہے تو بینک اور ڈاکخانے کیا برے ہیں۔

فاضل مضمون نگار نے آخر میں مختصراً لازمی بچت اسکیم پر بھی بحث کی ہے۔ لازمی بچت اسکیم اس میں شبہ نہیں کہ فنڈ سے بالکل مختلف چیز ہے اور اس کے بارے میں یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ یہ رقم لوگوں کی مرضی کے خلاف اور جبراً وصول کی جارہی ہے۔ اگر یہ رقم جبراً وصول نہ کی جاتی تو اس کی شکل بڑی حد تک بینک کے سے ملتی جلتی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے مولانا عامر عثمانی صاحب نے تجلّی کے کسی شمارے میں فکسڈ ڈیپازٹ کے متعلق فقہی نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ اگر "جبر" کی وجہ سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو تو میرے خیال میں لازمی بچت پر زکوٰۃ کے وجوب یا عدم وجوب کا وہی حکم ہونا چاہئے جو فکسڈ ڈیپازٹ کے متعلق ہے۔

تجلّی اصل قانونی نکتہ یہی ہے کہ ایک ملازم جب اپنے فنڈ کی بنیاد پر قرض لیتا ہے تو اسے اس قرض پر سود بھی ادا کرنا ہوتا ہے۔ بحث اس سے نہیں کہ یہ سود ادا کرنا بجائے خود کیسا ہے۔ سودی لین دین کی حرمت سے قطع نظر اگر یہ مان ہی لیں کہ چونکہ ملازم کو فنڈ کی رقم پر سود ملتا ہے لہٰذا جب وہ اسی فنڈ کی بنیاد پر قرض لے تو انصاف یہی ہے کہ وہ بھی اس قرض کو مع سود ادا کرے۔ چلئے ٹھیک ہے لیکن اس سے یہ تو ثابت ہوا کہ ابھی تک فنڈ کی رقم فی الواقع اس کی ملک نہیں ہے ورنہ اپنی ہی جمع سے کوئی شخص کچھ لے تو اس پر سود ادا کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ قرض لینے کی صورت میں سود بھی لازم آنا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ فنڈ کی رقم پر ملازم کا حقِ مالکانہ اُس حقِ مالکانہ سے مختلف ہے جسے فقہاء نے وجوبِ زکوٰۃ کی بنیاد مانا ہے۔

رہے وہ ادارے جن میں سود کا گذر نہیں تو ان کی بحث پہلے ہو چکی۔ ہمارے اس یقین میں ابھی تک کوئی کمزوری نہیں آئی کہ فنڈ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

تصحیح گزشتہ ماہ ایک انگریزی کتاب "روح اور مادے میں نئے سرے سے مصالحت" پر تبصرہ شائع ہوا تھا اس کے پتے میں "نمائش روڈ" غلط چھپ گیا درست "اگزیبیشن روڈ" ہے۔ ویسے یہ کتاب مکتبہ تجلّی سے بھی مل سکتی ہے۔

بہشتی زیور مکمل و مدلل کون پڑھا لکھا آدمی ہے جس نے مولانا اشرف علیؒ کی اس بیش بہا اور مقبول ترین کتاب کا نام نہ سنا ہوگا۔ ہر مسلمان گھر کے لئے ایک مفتی، عورتوں کا مشیر، مردوں کے لئے مستقل رہنما۔ اس کا عمدہ اور صاف ستھرا اڈیشن ہم سے طلب فرمائیے۔ دو جلدوں میں مکمل بارہ روپے۔ مجلد پندرہ روپے۔ ۱۵/-

حقوق الاسلام اپنے وقت کے زبردست عالم قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی مفید ترین تصنیف جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کی رو سے کس پر کس کا کیا حق ہے اللہ، رسولؐ، صحابہؓ، علماء، والدین، اقرباء، حاکم، شوہر، بیوی اولاد، پڑوسی غرض ہر ایک کے حقوق کی تفصیل رسالہ سماع و مزامیر بھی شامل کتاب ہے۔ اردو ترجمہ عام فہم۔ مجلد دو روپے ۲/-

بدعت کیا ہے؟ بدعتوں کے رد اور سنتوں کے اثبات میں ایک مشہور و مقبول کتاب، عُرس قوالی، تیجہ، چہلم، الا بلا سب کے لئے چیلنج۔ مجلد تین روپے۔

اسلام تلوار سے نہیں پھیلا غیر مسلموں کی شہادتیں اور اعترافات۔ ۷۵ پیسے۔

عمرو بن العاصؓ اس صحابی رسولؐ فاتح مصر، تلوار کے دھنی اور بلند پایہ مدبر کی داستانِ حیات جسے خود اللہ کے رسولؐ نے "مدبرِ اسلام" کے خطاب سے نوازا۔ بیحد دلچسپ اثر انگیز اور مستند۔ مجلد سوا دو روپے۔ ۲/۲۵

صحیفہ ہمام بن منبہ حضرت ابو ہریرہؓ کا مرتب کیا ہوا قدیم ترین مجموعۂ حدیث مع تشریح مکتوبات نبویؐ کے فوٹو بھی شامل کتاب ہیں۔ ساڑھے تین روپے

سچے رسولؐ کی سچی تعلیم زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق تعلیماتِ رسالت کا ایمان افروز مجموعہ۔ قیمت مجلد ڈیڑھ روپیہ۔ ۱/۵۰

مقالاتِ شیخ الہندؒ وحی کی حقیقت اور ایمان و دیانت کے باہمی ربط پر ایمان افروز گفتگو۔ مشہور مفسرِ قرآن مولانا محمود الحسن شیخ الہندؒ کے قلم سے۔ قیمت ایک روپیہ ۱/-

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک از مولانا مسعود عالم ندوی۔ ڈھائی روپے

درویشی کیا ہے؟ مشائخ و صوفیاء کے ایمان افروز ارشادات قرآن و سنت سے ہم آہنگ بلیغ و نفیس توضیح۔ سوا دو روپے۔ ۲/۲۵

محمد بن عبد الوہابؒ ایک مظلوم اور بدنام مصلح کی مستند سوانح۔ مولانا مسعود عالم ندویؒ کے قلم سے۔ قیمت پونے تین روپے۔ ۲/۷۵

کراماتِ صحابہؓ از مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ ۱/۵۰

محاسنِ اسلام اسلام کی خوبیوں پر مولانا اشرف علیؒ کی ایمان افروز تقریر۔ ڈیڑھ روپیہ۔

عبقات اختلافی موضوعات اور علوم تصوف پر شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی مشہور کتاب۔ ترجمہ:- از مولانا مناظر احسن گیلانی۔ ساڑھے دس روپے۔

زبدۃ المناسک حج اور احکام حج پر مفصل و مدلل کتاب مصنفہ:- استاذ الاساتذہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ۔ ہدیہ مجلد آٹھ روپے۔

فتوح الغیب شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے مقالات کا اردو ترجمہ۔ ڈھائی روپے۔ ۲/۵۰

"فاران" کا توحید نمبر سیکڑوں صفحات کا یہ نمبر ماضی قریب میں بڑی شہرت پا چکا ہے اب پھر شائع کیا گیا ہے۔ بدعت و زندقہ کے رد اور سنت کے اثبات میں بے نظیر چیز ہے چوٹی کے علماء کے مضامین سے مزین۔ ساڑھے چار روپے (مجلد چھ روپے) شائقین فوراً طلب کریں ورنہ پھر پہلے کی طرح ختم ہو جائے گا اور فرمائشیں بے کار کرنی پڑیں گی۔

اسلام کیا ہے؟ مجلد قیمت ڈھائی روپے۔ ۲/۵۰

اخلاق محمدیؐ پانچ روپے

مستقل عنوان

شمس نوید عثمانی

کیا ہم مسلمان ہیں؟

ہر شخص اس دنیا میں صبح کی پو پھٹتے ہوئے دیکھتا ہے کہ موت اس کے تسمۂ پاپوش سے بھی نزدیک تر ہوتی ہے یہ تھا عربی کا وہ شعر جس نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاک ہونٹوں پر شدتِ جذبات میں جیسے دیپک راگ کی سی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب وطن، گھر بار اور خود اپنی زندگی کی ساری دلی چاہتیں خدا اور رسول ؐ کی چاہت پر نثار کر دینے کے بعد مدینہ کی ناسازگار آب و ہوا میں وہ بیماری کی مسلسل کڑی آزمائش جھیل رہے تھے۔ صحت تھی کہ دن بدن بگڑتی جا رہی تھی، لیکن ایمان و عمل کے گیسو کچھ اور سنور رہے تھے۔ جسم سوئے قبر گرتا نظر آ رہا تھا مگر اللہ سے بچھڑی ہوئی روح کی زبردست بیتابیاں اس اللہ کے بندے کو جیسے زمین و آسمان سے آگے تیزی سے وہاں اڑائے لئے جا رہی تھیں جہاں اس کائنات کی کسی نامعلوم خلوت میں مخلوق اپنے خالقِ اکبر سے ملاقات کرنے والی ہے۔ یہ تھے وہ نرالے دیدۂ و دل جو ایمان بالغیب کی انوکھی روشنی میں قریب زندگی کے ہر کہر کو چیرتے ہوئے زندگی کے یقینی انجام کو جوتے کے تسمے سے بھی نزدیک تر دیکھا کرتے جو عام حالات میں اس وقت بھی نظر نہیں آتا جب موت بالکل سر پر آ کھڑی ہو۔ کون جانے کہ یہ موت کی قربت کا محض ایک احساس ہی تھا یا جہادِ زندگی کے تھکے ماندے مسافر کے قدموں کو اس کی منزلِ فلاح نے خود آگے بڑھ کر چوم لیا تھا۔ ان کو ہرگز یہ غم نہ تھا کہ یہ دنیا چھوٹ رہی ہے جو ہزاروں حسرتوں اور تعلقات کی شکل میں ہمارے گوشت پوست میں رچی بسی ہے۔ ان کو تو یہ خوشی تھی کہ وہ سچ مچ جس کے ہیں اسی کے پاس چلے جا رہے ہیں۔ کھنچے چلے جا رہے ہیں۔ یہی تھا وہ وجد انگیز احساس جس نے جسمانی دکھ درد کی ہر کراہ کو بھلا کر حضرت صدیق اکبر ؓ کو وارفتگی کے عالم میں یہ شعر گنگناتے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

رسولِ ؐ خدا کو اس صورتِ حال کا پتہ چلا تو شافیِ مطلق کے اس مریض کو خود شافیِ مطلق کے حوالے کرتے ہوئے اس کے درد کا درماں کرنے کی بے قرار دعا کی:۔

"اے اللہ! تو مکہ کی طرح — یا اس سے بھی بڑھ چڑھ کر — مدینہ کا پیار ہمارے دلوں میں ڈال دے۔ اس کی آب و ہوا کو روگوں سے پاک فرما دے اس کی پیداوار کے پیمانوں میں برکت عطا فرما اور اس کے وبائی بخار کو جحفہ میں منتقل کر دے"۔

مقدس سینے سے نکلی ہوئی پکار فرش سے چلی اور سیدھی عرش تک پہنچی۔ مدینہ کی آب و ہوا میں انقلاب برپا ہو گیا۔ دلوں کی گہرائیوں میں وطنی جذبات کی کایا پلٹ گئی اور مدینہ کے پیار نے سینوں میں ذوق و شوق کی ہلچل ڈال دی۔ وہ مریض جو بسترِ علالت کی شکن بن گئے تھے محسوس کر رہے تھے کہ ان میں نئے سرے سے جان پڑ گئی ہے وہ جس نے کمال یقین کے ساتھ اعلان کیا تھا کہ "مجھے کسی کی پناہ نہیں چاہیئے۔ میرے لئے خدا

اور رسولؐ کی پناہ کافی ہے" ہاں اس کے لئے خدا اور رسولؐ کی پناہ بہرحال کافی و شافی ثابت ہو کر رہی۔ حضرت ابوبکرؓ بستر علالت سے ایک حیاتِ تازہ کی جولانیاں لئے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور خدا سے بچھڑی ہوئی روح رسولؐ خدا کے پُرسکون پہلو میں کھڑی ہو کر فرض کے محاذ پر چٹان بن گئی۔

نئی صحت، نئی زندگی، سارے جگ سے نرالی اخوت اور تازہ دم سدا بہار ایمان کے رنگ و نور سے وادیٔ یثرب میں "مدینہ" نام کی جو ارضی جنت تعمیر ہو رہی تھی اب وہاں خدا کا گھر تعمیر ہونا تھا۔ مسجد کی عمارت کے لئے جو جگہ سب سے زیادہ موزوں نظر آئی وہ کچھ یتیموں کی ملکیت تھی۔ یتیموں کا دل شوق سے مچل گیا کہ یہ خدائی اعزاز ان کے حصے میں آ رہا ہے۔ انھوں نے کوئی قیمت لینے سے انکار کر دیا۔ لیکن یتیموں کے بہترین والی اور بیکسوں کے سب سے بڑے غم خوار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھلا یہ کب گوارا ہو سکتا تھا کہ معاوضہ دیئے بغیر ان یتیموں کو ان کی اس ملکیت سے محروم کر دیا جائے۔ اخیر تو یہ فکر تھی کہ انسان کی جھولی میں دولتِ دو جہاں سمیٹ دیں اداشناس رسالت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اشارہ پاتے ہی اپنا سرمایۂ حیات حضورؐ کے قدموں پر لا ڈالا اور مدینہ میں خدا کا گھر تعمیر ہو گیا۔ مکہ میں اپنا سب سے پہلا گھر تعمیر کرانے کا اعزاز خدا نے اپنے خلیلؑ کو بخشا تھا۔ مدینہ میں مسجد نبوی کی تعمیر کا شاندار موقعہ آیا تو خدا کی نظرِ انتخاب حضرت ابوبکر صدیقؓ پر پڑی جن کے بارے میں خدا کے رسولؐ نے فرمایا تھا کہ خدا کے سوا اگر میں کسی کو اپنا دوست بناتا تو وہ ابوبکرؓ ہی ہوتے۔ اسی انسان کے خون پسینے کی کمائی اس قابل قرار پائی کہ اس معبد نور کی بنیادوں میں سوزِ بندگی بنکر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سما جائے۔

اب حق و باطل کا معرکہ تیز و تند تلوار کی دھار بن چکا تھا۔ اب جنگ کی سُرخ و سیاہ گھٹائیں ہر افق سے منڈلاتی ہوئیں مدینہ کی طرف بڑھی آ رہی تھیں۔ اب اللہ والوں کو زخم کھانا ہی نہیں ظالم کے سینے پر چرکہ لگانا بھی لازمی تھا۔ وہ مومن جو تیرہ سال سے صبر و سکوت کی قربانگاہ میں کھڑے ہوئے تھے اب ان کو غیرتِ بندگی کے بیقرار تقاضے خون کے دریاؤں اور تلواروں کی چھاؤں میں آجانے کی دعوت دے رہے تھے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ حضورؐ جہاں بھی تشریف لے گئے یہ پروانۂ رسولؐ کشاں کشاں ساتھ آیا۔ خوف و خطر کے اس مقام پر بھی دنیا نے یہی دیکھا کہ ساری دنیا سے دامن جھٹک کر چل دینے والا بے نیاز انسان یہاں بھی ٹھیک اسی ادائے جاں سپاری سے دامنِ مصطفےؐ کو بچوں کی طرح چمٹا ہوا ہے۔ جیسے ان کو زندگی کا وہ ایک لمحہ بھی دائمی موت سے زیادہ شاق تھا جب ان کے اور محمدؐ کے درمیان ذرا سا بھی فاصلہ حائل ہو جائے!

جب جنگِ بدر کے ہمت آزما میدان میں پہلی بار اس حقیقت کا تاریخی فیصلہ ہونا تھا کہ اکیلا زبردست خدا کافی ہے یا پتھروں سے ڈھالے ہوئے سیکڑوں جھوٹے خدا؟ جب باطل کے پاس سوائے خدا کے سب کچھ تھا اور حق کے دامن میں رحمتِ خدا کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ جب بھوک اور افلاس سے کچلے ہوئے مٹھی بھر انسان خدا پر بھروسہ اور محمدؐ کا اعتبار کر کے وہاں تک کھنچ آئے تھے جہاں موت اور زندگی کی سرحدوں پر کفر و شرک کی ساری قہرمانیت جبڑے پھیلائے کھڑی تھی۔ جہاں بھولے بھالے انسانوں کو کچا چبا جانے کے لئے درندگی اور شیطنت کا ایک جنگل کا جنگل دانت پیستا اور چنگھاڑتا ہوا آگے بڑھا چلا آ رہا تھا — جہاں صرف ایمان کی طاقت سے آہنی ہتھیاروں کو توڑ دینا اور آبدار تلواروں کو کُند کر دینا تھا — جہاں دلوں کے سوز سے فولادی چٹانیں پگھلا دینی تھیں۔ جہاں بے سرو سامانی کو ثابت کرنا تھا کہ وہ ساز و سامان پر بھاری ہے۔ جہاں انسان کو اپنا عجز اور اللہ کی کبریائی کا ثبوت ایک ساتھ پیش کرنا تھا۔ وہاں جہاں باطل کی دیوپیکر صفوں میں کفر و سرکشی نے شور و شر سے آسمان سر پر اُٹھا لیا تھا وہاں خیمۂ رسالت میں بندگی کا عجز آخری انتہاؤں کو چھو رہا تھا۔ یہاں خدا کی شانِ بے نیازی سے لرزہ براندام ہو کر جن و بشر کے آقا محمدؐ کبھی فرش خاک پر سر رکھتے تھے، اور کبھی ایک بھکاری کی طرح خدا کے سامنے ہاتھ پھیلا کر بہزار خشوع گڑگڑاتے تھے — گڑگڑاتے تھے اور غیرتِ خداوندی

اور رحمت کو تڑپ تڑپ کر پکارتے تھے۔ اس وقت بھی وہ
رازدانِ رسالت حضورؐ کے پہلو میں کھڑا ہوا شہادتِ حق
کی ہوک سے تھرتھرا رہا تھا، جب عبد و معبود کے درمیان
ناز و نیاز کے اس عجیب و غریب عالم میں آں حضرتؐ کی
تڑپ ان دعائیہ الفاظ تک پہنچی :-

"یا اللہ! مجھے بے یار و مددگار نہ چھوڑ! مجھ سے
تو نے جو وعدہ کیا ہے اس کو پورا فرما۔ اگر تیرے
یہ مٹھی بھر بندے آج اس میدان میں کام آگئے تو کیا
اے خدا! — اے خدا!! تو یہ چاہتا ہے کہ زمین
پر کبھی تیری پرستش نہ ہو۔۔۔ کیا۔۔۔"

تو بے اختیار حضرت ابوبکرؓ کا کلیجہ منھ کو آگیا۔ دل
کی بیقرار دھڑکنیں ہونٹوں پر تڑپ گئیں اور ساری انسانیت
کا سوزِ حق — سوزِ شہادتِ حق اپنی آواز میں سمیٹتے ہوئے
انھوں نے آنسوؤں سے بھیگی اور جوش سے کانپتی ہوئی آواز
میں سرگوشی کی "اللہ کا رسولؐ سچا ہے — سچ کہتا ہوں
اللہ کا رسولؐ بالکل سچا ہے۔"

اُدھر جنگ تھی کہ شدت پکڑ رہی تھی۔ اِدھر دعائے
رسولؐ کا دلدوز سوز تھا کہ جسم و جاں اور کون و مکاں سے
آگے نکلا جا رہا تھا۔ اُدھر وحشیوں کی چنگھاڑ سے فضاؤں
میں شگاف پڑ رہے تھے۔ ادھر روح و دل کی ہوک تھی کہ
ذرّوں سے ستاروں تک کائنات کا دل ہلائے دے رہی
تھی۔ حضرت ابوبکرؓ ان دونوں کے درمیان تھے۔ ادھر
فرض تھا جو خون کے ایک ایک قطرے کو گرمائے دے رہا
تھا۔ ادھر رسولؐ کا درد دل تھا جو ان کو تڑپائے دے رہا
تھا کہ حضورؐ کے قدموں پر اپنا دل چیر کر — کلیجہ نکال کر
رکھ دیں۔ فرطِ شوق سے ان کا وجود "دو نیم" ہوا جاتا
تھا کہ ادھر بھی کام کر سکے اور ادھر بھی کام آسکے۔ محاذِ
جنگ کی للکار سنائی دیتی تو برقِ نیم بسمل کی طرح تڑپتے،
بل کھاتے ہوئے نکل جاتے پھر خیمۂ رسول نظر آتا تو موت
اور زندگی دونوں کو بھولے ہوئے — آتش و آب کے طوفانوں
کو چیرتے ہوئے — پارے کی طرح لرزتے تڑپتے ہوئے حضورؐ
کے پاس دوڑ کر آتے اور پھر ایک نظر حضورؐ کو دیکھ کر شہادت
کی نئی دھن میں محاذِ جنگ کی طرف جست کر کے موت کی
آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتے، اس عالم میں انھوں نے تلوار کی
چھاؤں میں کھڑے ہو کر خیمۂ رسالتؐ کی طرف پلٹ کر
دیکھا تو شدتِ جذبات سے ایک بجلی سی گر گئی — ایک
سنسنی خیز، رقت انگیز منظر نے ابوبکرؓ کی تمام توجہ کو اپنے
اندر جذب کر لیا۔ انھوں نے دیکھا کہ حضورؐ اب دعا میں
اس قدر گم ہو چکے ہیں کہ آپ کو اور کسی بھی شے کا ہوش
باقی نہیں ہے۔ ارتعاش و اضطراب کا عالم یہ تھا کہ آپ کی
ردائے مبارک شانوں سے کھسکتے کھسکتے زمین پر جا گری تھی
اور آپؐ اسی طرح ہاتھ پھیلائے ہوئے معبودِ حقیقی کے آگے
گڑگڑا رہے تھے۔ پیغمبرؐ کی یہ کیفیت کتنی دلدوز اور کیسی
ہوش رُبا تھی کہ حضرت ابوبکرؓ افتاں خیزاں خیمے کی طرف
دوڑ رہے تھے۔ اشک بار۔ بیقرار۔ پروانہ وار! — صرف
اس لئے کہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر زمین پر گر گئی
تھی۔ ہائے ان مقدس شانوں سے ڈھلک کر اس چادر کا
زمین پر گر جانا ابوبکر صدیقؓ کے لئے زمین و آسمان کے
گر جانے سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ وہ ممتا سے بیقرار ماں
کی طرح آئے اور اس حسین چادر کو اشک آلود آنکھوں سے
لگا کر پھر انھیں شانوں پر درست کر دیا جن شانوں پر
دنیا بھر کی غم خواری کا بوجھ کوہِ گراں کی طرح رکھا
ہوا تھا۔

یہ تھا وہ "سوزِ دعا" جس کی تپش سے بھوکے پیاسے
مومنوں کے سینوں میں عشق و اطاعت کے اونچے
جذبات جوالا مکھی کی طرح پھٹے پڑتے تھے۔ یہ سوزِ دعا
تھا جو صدیقی جرأت پر — حوصلوں اور ولولوں پر نغمۂ
حدی کا ساحرانہ کام کر رہا تھا۔ نڈھال ہوتے ہوئے
قدموں میں بجلیاں سی لپکتی تھیں۔ شل ہوتے ہوئے
بازوؤں میں خون کی روانی سُست پڑتے پڑتے اچانک
ایک طوفان بن جاتی۔ باطل کی زبردست طاقت کو
دیکھ کر آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جانے سے پہلے دل

فرطِ شوق سے شق ہوتے اور خدا کی طاقت پر اہلِ ایمان ایک سیلِ نور بن کر اُبل پڑتا - زخموں سے ٹپکتے ہوئے ہر ہر قطرۂ خون میں جب آخرت کی سرخروئی ایک جاں نواز جھلک بنکر دکھائی تو زخموں سے چور جسم جراَت و استقلال کی چٹانیں بن جاتے - یہ سوزِ دعا تھا جس سے زمین و آسمان میں سنسنی دوڑ رہی تھی - انسان موج در موج آگے بڑھ رہے تھے - فرشتے ہجوم در ہجوم زمین پر اُتر رہے تھے تاکہ ان انسانوں کے دوش بدوش کھڑے ہونے کا فخر حاصل کر سکیں جن کے متعلق مشیتِ ایزدی کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ قیامت کے دن خدا کی داہنی طرف جگہ پائینگے جب خدا انتہائی جلال میں بساطِ کائنات کو اپنے ہاتھوں میں لپیٹ کر کہہ رہا ہوگا "آج کے دن کس کا راج ہے؟ — اللہ زبردست اکیلے کا!"

آخر حق فاتح نکلا - شہادتِ حق کے لئے کھلے ہوئے سینوں کو باطل پیٹھ دکھا کر بھاگ رہا تھا - بندگی کا حلقہ گردن میں ڈال لینے سے جن لوگوں نے انکار کیا تھا ان کے ہاتھوں میں خدا کے بندے زنجیریں پہنا رہے تھے - غرور و تکبر سے زمین کو دہلانے والے سلاسل میں جکڑے ہوئے سہمے کھڑے تھے - یہ نفرت و سفاکی کے مجرم تھے - یہ انسانیت کے ہتیارے تھے - یہ خدا کے باغی تھے اسی لئے سب سے بڑے ظالم تھے —— وہ ظالم جو دوسروں پر ظلم و ستم کر کے درحقیقت خود اپنی جانوں پر آخری ستم ڈھاتے ہیں - لیکن یہ ظالمانہ مظلومیت کا دردناک پہلو اسوقت ان کے جرائم کی سیاہی میں اس طرح چھپ کر رہ گیا تھا کہ حضرت عمر فاروق رضؓ نے جوشیلی آواز میں یہ رائے پیش کی ان سب کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے اور ساتھ ہی نسل و خون کا بت بھی اس طرح پاش پاش کر دیا جائے کہ ہر مومن اس کافر کو قتل کرے جو اس کا اپنا قریبی عزیز ہو - لیکن رحمۃ اللعالمینؐ نے فرمایا ان لوگوں کو معاف کیا جائے تو کیا حرج ہے — ہائے وہ شفیق دل جو اسوقت بھی اجازت نہ دیتا تھا کہ کفر کے یہ مجرم کفر کی موت مر کر ہمیشہ کے لئے دوزخ کا ایندھن بنیں - آپ اس وقت بھی بچین تھے کہ سرکشی کے جرم میں تلوار کے نیچے پڑی ہوئی گردنیں اٹھیں اور خدا کی چوکھٹ پر پیشانی ٹیک دیں - اسلام کی مسلسل مظلومیت اور کفر کے پے بہ پے مظالم کو دیکھتے ہوئے حضورؐ کی اس تجویز کو حیرت بھری خاموشی سے سنا گیا - لیکن اس خاموشی کو توڑتی ہوئی اور حضورؐ کی تائید کرتی ہوئی جو پہلی آواز آئی وہ حضرت ابوبکرؓ کے سوا کس کی ہو سکتی تھی — ابوبکرؓ جس کے سازِ دل کے تمام تار مضرابِ رسالتؐ کے اشاروں پر حرکت کرتے تھے - حضورؐ نے جو کچھ کہا - ابوبکرؓ کے سینے سے ہمیشہ اسکی صدائے بازگشت آئی -

جنگِ اُحد میں جب خود مسلمانوں کی ایک المناک فروگذاشت سے بساطِ فتح و ظفر تہہ و بالا ہو کر رہ گئی تھی - جب گھائل کفر نے شکست کا گہرا گھاؤ کھا کر پیچھے سے اچانک حملہ کیا — جب مومنوں کو سوچنے سمجھنے کی فرصت بھی نہ ملی اور ہوش و حواس نے ایمانی تقاضوں کا ساتھ چھوڑ دیا - جب وہ قدم زمین پر رکھے ہوئے تھرتھرا رہے تھے جن میں تلواروں کی دھار پر بھی جنبش نہ ہوتی تھی - جب قتلِ رسولؐ کی ہوش ربا افواہوں نے اہلِ ایمان کو سکتے میں ڈال دیا تھا — اُس جنگ میں بھی شروع سے آخر تک حضرت ابوبکرؓ کے قدموں میں بال برابر جنبش نہ ہوتی تھی خوف اور غم کی جس ہولناک آندھی میں جہاد و عزیمت کے سربفلک پہاڑ ذرّوں کی طرح اُڑ رہے تھے اس وقت ابوبکرؓ کی زندگی میں خوف اور غم کے تمام جذبات احساسِ فرض کو آگے بڑھنے کے لئے دست بستہ راستہ دے رہے تھے - جب معرکۂ فرض سر ہو گیا تو یہی وہ شخص تھا جو گھائل پیغمبر کے نقوشِ پا کو خونِ دل و جگر سے نکھارتا ہوا حضورؐ کے ساتھ ساتھ پہاڑ کی بلندی پر چڑھ رہا تھا - حضورؐ کے زخم رسیدہ چہرے کو دیکھ کر ان کا کیا حال ہوا ہوگا؟ یہ سوچنے کی بات نہیں - وہی شخص جو اس کے لئے ہزار بار تیار تھا کہ سیاہ ناگ اس کو غارِ ثور میں ڈس لے، مگر

حضورؐ کے خواب راحت کو ذراسی ٹھیس نہ پہنچے وہی اب یہ
دیکھ رہا تھا کہ حضورؐ کا مقدس چہرہ خون میں نہایا ہوا ہے
بھلا کس کی سکت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خونچکاں کیفیات
کا اندازہ کر سکے۔ اگر کچھ اندازہ ہوتا ہے تو اس زبردست
واقعہ سے ہوتا ہے کہ زخموں سے چور چور جیالوں کو جب گھائل
رسولؐ نے یہ حکم دیا کہ زخموں پر پھائے رکھنے سے پہلے انھیں بھی
اور اسی وقت کفار کا پیچھا کرنا ہے۔ تو حضرت ابوبکرؓ ایک
خوں چکاں بجلی کی طرح ان درندوں کے تعاقب میں زخمی شیر کی
طرح لپکے جن کے گھناؤنے ہاتھوں نے انسانیت کے بہترین مجموعہ
کا روشن چہرہ زخموں سے لہولہان کر دیا تھا۔

غزوۂ بنی مصطلق میں جب وہ جوشِ ایمانی اور دست و بازو
کے جوہر دکھا کر حبیبِ خدا کے ساتھ فاتحانہ مگر فرطِ شکر سے عاجزانہ
پلٹ رہے تھے تو یہی وقت تھا جب ایک سپاہی پر پھولوں کی بارش
ہوا کرتی ہے مگر یہاں یہ حال تھا کہ ٹھیک اس وقت ان کے
ننگ و ناموس پر تیر و نشتر کی بوچھار ہو رہی تھی جب منافقوں
کی انتہائی شر پرداز ٹولی نے ابوبکرؓ کی چہیتی بیٹی زوجۂ رسولؐ
اور امت کی ماں حضرت عائشہؓ صدیقہ کے خلاف رسوائے
زمانہ مہم چھیڑی تھی جب ایمان و یقین سے روشن سینوں میں سوء
ظن اور بدگمانی کا شیطانی خنجر بھونکا جا رہا تھا۔ جب ایک
طرف نبیؐ کی روح کو دوسری طرف حضرت ابوبکرؓ کی شرافت
کو مجروح کر دینے کے لئے وحشیانہ وار کیا گیا تھا۔ لیکن اس وقت
بھی حضرت ابوبکرؓ نے اپنے جذبات کی طرف نہیں اسوۂ رسولؐ
کی طرف ہی دیکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ حضورؐ انتہائی اضطراب کے
باوجود کس شانِ صبر و سکوت کے ساتھ قدم اٹھا رہے ہیں تو وہ بھی
سر جھکا کر اسی راہ پر ہو لئے۔ ایک چیخ بھی نہ نکلی۔ ایک گرم
نظر بھی تو نہ اٹھائی۔ شدید اضطراب کی کرب ناکیاں اور پھر
مکمل صبر و سکوت! چند قدم اس راہ پُرخار پر چلے تھے کہ
زخمی دل پر ایک اور بجلی گری۔ پتہ چلا کہ اس لرزہ خیز فتنہ کا
شکار کچھ سادہ دل مسلمان بھی ہو گئے ہیں اور ان مسلمانوں میں وہ
مسطحؓ بن اثاثہ بھی شامل ہیں جن کی عمر بھر کی کفالت پر حضرت ابوبکرؓ
نے اپنی آغوشِ محبت کی بہترین گرمجوشیاں صرف کی تھیں۔
خود اپنے پروردۂ نعمت کے ہاتھوں کو اپنے ننگ و ناموس کے
خون سے رنگین دیکھ کر ان پر جو بھی قیامت گذر گئی ہو کم ہے
لیکن اس وقت بھی انھوں نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ دل تھام کر
اور کلیجہ مسوس کر رہ گئے۔ وہ اس وقت تک کچھ کہنے کی بجائے
صرف سہنا چاہتے تھے جب تک حقیقت خود واضح نہ ہو جائے
وہ خوب جانتے تھے کہ یہ الزام ایک عفیفہ کی پاکدامنی پر غلط
حملہ ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ حضورؐ کی بے چینی اور فتنہ انگیز
منافقوں کی فتنہ طرازیوں کے درمیان حضرت عائشہؓ کے
ڈھانچے لگے جا رہے ہیں اور آنسوؤں سے تر بتر تکیے پر سر ڈالے
ہوئے کانٹوں اور شعلوں کی سیج پر تڑپ رہی ہیں۔ لیکن کوئی
شے صدیقی صبر کا پیمانہ نہ چھلکا سکی وہ سینے پر صبر کی سل رکھے
ہوئے اور ہونٹوں پر تقویٰ کے قفل چڑھائے ہوئے صرف
اس لئے خاموش تھے کہ یہ خاموشی اسوۂ رسولؐ تھی ۔۔۔ یہ
رضائے الٰہی کا دلکش تقاضا تھا۔ یہ ادا ان کے جذبات پر کتنی
ہی شاق کیوں نہ ہو ان کو دل و جان سے زیادہ پیاری تھی کہ یہ
ان کے مولا کو پیاری ہے ۔۔۔ آخر صبر کی جاں گدازیاں اپنے
نیک انجام کو پہنچیں۔ انتظار کے پہاڑ سے دن کٹ ہی گئے
اور آسمانی آواز نے اعلان کیا کہ زمین پر یہ فتنہ سراسر کذب و
افترا ہے۔ ابوبکرؓ اس وقت بولے جب خدا خود بول اٹھا تھا۔
اخلاق و شائستگی کی حدوں میں رہتے ہوئے اس وقت بھی
انھوں نے اس سے زیادہ احتجاج نہ کیا کہ "خدا کی قسم! اس
فتنہ پردازی کے بعد میں مسطحؓ بن اثاثہ کی کفالت نہیں کر سکتا۔"
یہ ایک حلیم ترین بندۂ مومن کے الفاظ تھے جہاں سادہ و متین
الفاظ کی تہہ میں مجروح جذبات کے طوفان دبے ہوئے تھے۔
لیکن ابھی اس فیصلہ کن اعلان کی گونج بھی ختم نہ ہونے پائی تھی
کہ خدا کی دوسری آواز نے حضرت ابوبکرؓ کو محویتِ جذبات
سے چونکا دیا۔

"تم میں سے بڑے اور ذی استطاعت لوگ نزد
اقربا، مسکینوں اور راہ خدا میں گھر بار چھوڑ دینے
والوں کو (مدد) نہ دینے کی قسم نہ کھائیں۔ اور چاہئے
کہ ان کے قصور معاف کریں اور درگذر کریں۔ کیا

"تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو بخش دے؟ اور اللہ انتہائی معاف کرنے والا اور ترس کھانے والا ہے۔"

خدا کی یہ آواز سنتے ہی حضرت ابو بکرؓ نے اپنی آواز دبا دی — اپنے زبردست جذبات کا گلا گھونٹ دیا۔ یہ الفاظ کہ "کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو بخش دے؟" حضرت ابو بکرؓ کی روح کو تڑپا دینے والا سوال تھا۔ غیرت و خودداری کے جذبات عجز بندگی میں ڈھل گئے۔ دل و جگر کا گرم خون آنسوؤں میں تبدیل ہو گیا۔ خدا کا پرستار خدا کے قدموں پر گرتے ہوئے گڑگڑا رہا تھا "ہاں میرے مولا میں چاہتا ہوں — میں یہ چاہتا ہوں کہ تو مجھے بخش دے —" سجدے سے سر اُٹھایا اور اعلان کیا "خدا کی قسم! اب بھی ہمیشہ مسطح کا کفیل رہوں گا۔ ہمیشہ ہمیشہ۔"

سمع وطاعت کا مقام آتا تو وہ سراپا گوش اور پیکر تسلیم و رضا ہوتے تھے۔ لیکن غیرتِ بندگی پر ذرا سی آنچ آتی تو پھر ان کا جوش و خروش دیدنی ہوتا۔ جب صلح حدیبیہ کے تاریخی موڑ پر مشیت ایزدی کے رموز اہل ایمان کیلئے ایک زبردست راز تھے۔ جب اسلام شانِ مغلوبیت کے ساتھ کفر سے معاہدہ کرتے وقت یہ اعلان کر رہا تھا کہ یہ حق و صداقت کی کھلی ہوئی جیت ہے۔ جب جوشِ جہاد سے کانپتی ہوئی اور جذبات سے رُندھی ہوئی آواز میں حضرت عمرؓ نے حضورؐ سے بیتابانہ سوال کیا تھا کہ "کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔؟" اس وقت صدیق اکبر حضرت عمرؓ کو ایک طرف لیجا کر کیسی بھولی بھالی باتیں کر رہے تھے "حضورؐ تو اللہ کے رسول ہیں بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ کا کہنا نہ مانیں اور دیکھو عمرؓ اللہ حضورؐ کا مددگار ہے۔" لیکن جب کفار مکہ کے ایلچی عروہ بن مسعود نے حضورؐ کا دل دُکھانے والی یہ چھوٹی بات کہی کہ "اے محمدؐ! خدا کی قسم میں تمھارے ساتھ ایسے چہرے اور ایسے لوگ دیکھتا ہوں کہ وقت پڑے گا تو وہ تمھیں چھوڑ کر الگ ہو جائیں گے" تو یہی فرشتہ خو حلیم ترین انسان تھا جس کا چہرہ غیرت و جراحت سے لال ہو گیا — وہی شخص جو سیاہ ناگ کے زہریلے پھن سے چپ چاپ خود کو کٹوا سکتا تھا۔ ایک کافر کا وہ طنز برداشت نہ کر سکا جس کی اصل چوٹ اسکے اپنے وجود پر نہیں بلکہ غیرتِ ایمانی اور پیمان بندگی پر پڑ رہی تھی مجروح جذبات کے طوفانی تھپیڑوں کو چند سادہ و شائستہ الفاظ میں سمیٹتے ہوئے آپ نے پلٹ کر طنز کیا "اچھا تو ہم رسول اللہؐ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے!؟" بظاہر کتنے سادہ الفاظ تھے لیکن ان کے تیور میں نہ جانے کون سے جذبات کی زبردست یورش تھی کہ ان الفاظ کی کاٹ تلوار سے زیادہ تیز نکلی۔ عروہ بن مسعود نے تڑپ کر پوچھا "یہ کون شخص ہے آخر؟" لیکن جواب میں حضرت ابو بکرؓ کا نام سنا تو ان کی شخصیت سے مرعوب ہو کر سر جھکا لیا اور بولا "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ اگر میرے سر پر آپ کے احسانات نہ ہوتے تو میں نہایت سخت جواب دیتا۔"

— اور —

یوں ہی جہاد در جہاد ایمان و عمل کی قربانگاہوں میں حق و صداقت کی قیمت سمجھتے اور حق و صداقت پر جاں نثاری کی والہانہ ادائیں سمجھاتے ہوئے جب وہ غزوۂ تبوک کی تاریخی منزل تک پہنچے تو قربانی کے جذبے نے ان کو سراپا قربانی بنا دیا۔ غزوۂ تبوک کی تیاریوں میں جب ہر مومن مالی و جانی حصہ لینے کے شوق میں اپنی بساط سے آگے نکلا جا رہا تھا۔ جب حضرت عمرؓ نے نصف گھر بار اُٹھا کر راہ مولا میں لٹاتے ہوئے سوچا تھا کہ شاید نیکی کی دوڑ میں آج میں صدیق اکبرؓ پر بازی لیجا سکوں گا — اس وقت حضرت ابو بکرؓ ایک کونے میں غلام و مسکین کی طرح یوں سمٹے ہوئے بیٹھے تھے جیسے بہت کچھ کر گذرنے کی زبردست تڑپ ہو مگر عملاً اس تڑپ کا حق ادا نہ ہو سکا ہو۔ اس عالم میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ "آج وہ خدا اور رسول کیلئے کیا لائے ہیں؟" تو عجز و فنا دگی میں ڈوبا ہوا یہ جواب ملا "جو کچھ تھا وہ سب لے آیا ہوں" یہ جواب اور پھر یہ ادائے عاجزانہ — حاضرین سناٹے میں آ گئے۔ خدا کے رسولؐ فرط شفقت سے پکار اُٹھے "اور گھر والوں کے لئے آخر کیا چھوڑ کر آئے ہو؟" — "خدا اور خدا کا رسول!" محبت اور عقیدت

کے درد میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔

ہاں ـــ اے گردش تقدیر! کبھی ہماری سب سے قیمتی متاع کا نام "خدا اور خدا کا رسولؐ" ہی تھا۔ کسی اور کا تو رونا کیا، سچ یہ ہے کہ ہمیں اب خود بھی یہ یقین کرنا دشوار ہے کہ کیا سچ مچ ہم اب بھی ٹھیک وہی ہیں جو کبھی تھے؟ کبھی ہمارا یہ حال تھا کہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی یہ محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کچھ بھی نہیں ہو سکا اب کچھ نہ کر سکنے کے باوجود ہم اس طرح مطمئن ہیں جیسے بندگی کے سارے حقوق ادا کر چکے ہوں! ہاں خدا کا شکر ہے کہ ہمیں اپنی اس "دیوانگی" کا دکھ بھرا احساس ہے اور بس یہی وہ احساس ہے جس کے دم تک ہمارا ایمان زندہ ہے۔ لیکن کیا یہ ایمان کی جاں بلب طاقت زندگی اور موت کا پل صراط طے کرنے کے لئے کافی ہے؟ ـــ کیا کبھی یہ فکر ہمیں ستاتی ہے کہ ـــ "کیا ہم مسلمان ہیں؟"۔

چین اور روس کی زندہ تصویریں

کمیونزم کی پہلی کتاب جس میں کمیونزم سے متعلق سیکڑوں سوالات کے مکمل و مفید جوابات درج ہیں۔ قیمت ایک روپیہ۔

ظلمتِ نیم روز مصنف:۔ آرتھر کوئسلر
مترجم:۔ گوپال متل
سابق کمیونسٹ دانشور آرتھر کوئسلر کا بلند پایہ نظریاتی ناول جس کا ترجمہ اُردو کے صاحبِ طرز ادیب جناب گوپال متل نے کیا ہے۔ ایک ایسے ملک کی کہانی جو آزادی کے انقلابیوں کے ہاتھ میں پڑ کر جنت بنتے بنتے جہنم بن گیا۔ ضخامت ۲۹۶ صفحات۔ قیمت سوا روپیہ 1/25

عثمان بطور چین میں مسلمانوں پر کیا گذری؟ ایک کہانی ایک تاریخ۔ سوا روپیہ 1/25

اور یانگسی بہتا رہا ناول کے پیرائے میں چین کی ایک عبرت انگیز داستان۔ ایک روپیہ۔

کمیونزم اور کسان کمیونزم کو ایشیائی نقطۂ نظر سے سمجھنے سمجھانے کی کامیاب کوشش جو بیسیوں دستاویزی حوالوں سے مزیّن ہے۔ قیمت ڈھائی روپے۔

عالمی سیاست میں جمہوریت مصنف:۔ لیسٹر بی پرسن کنیڈا کے سابق وزیر خارجہ
اور اتحادی سبھا کے سابق صدر مسٹر لیسٹر بی پرسن کے چھ عالمانہ مقالوں کا مجموعہ۔ بین الاقوامی سیاست جمہوریت کے کردار اور جمہوری اصولوں کی کارفرمائی کے امکانات کا سیر حاصل تجزیہ موجودہ بین الاقوامی سیاست کے پُرپیچ رجحانات کو سمجھنے کے لئے اس مختصر سی کتاب کا مطالعہ از حد مفید ہے۔ ضخامت ۱۱۸ صفحات۔ قیمت صرف آٹھ آنے۔

آزادی کی طرف ایک روسی افسر کی آپ بیتی جو بھاگ کر امریکہ میں پناہ گزین ہوا۔ نہایت دلچسپ اور عبرتناک۔ تین روپے

آزادی کی نئی وسعتیں مصنف:۔ اروِن ڈی کینہم۔
آزادی کے تصور میں جو نئی رنگ آمیزیاں ہوئی ہیں ان کی معلومات افروز کہانی کرسچین سائنس مانیٹر کے ایڈیٹر اروِن ڈی کینہم کی زبانی جمہوری سماج کے جدید تر رجحانات کا ولولہ انگیز تجزیہ۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات قیمت صرف آٹھ آنے۔

ادب میں ترقی پسندی کمیونزم ادب و صحافت کی آڑ میں کیا کھیل کھیلتا ہے۔
قیمت ایک روپیہ۔

پتھر کے دیوتا چھ آپ بیتیاں۔ جاذبِ توجہ عبرتناک
قیمت ایک روپیہ

اُنیس سو چوراسی مصنف:۔ جارج آرویل۔
مترجم:۔ سید سہیل اسقطی۔
مشہور ہندوستانی نژاد مغربی مصنف جارج آرویل کا وہ شہرۂ آفاق ناول جس نے یورپ میں تہلکہ ڈال دیا تھا۔ اُردو کا خوبصورت ایڈیشن آرٹ پیپر کی آٹھ تصویروں سے مزیّن۔ ضخامت ۳۴۰ صفحات۔ ڈھائی روپے۔

چین کے مسلمان کروڑوں مسلمان کیا ہوئے؟ انھیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا؟ کمیونزم کی آدم خوری کا دستاویزی تذکرہ۔ صرف پچیس ۲۵ پیسے۔

سوویٹ نظام کی چھ کنجیاں جو کہ عقلی و نقلی دلائل پر مشتمل ایک سنجیدہ اور معیاری کتاب جو دلچسپ بھی ہے اور حقیقت افروز بھی صفحات ۳۲۴۔ قیمت صرف ایک روپیہ

آزادی کا ادب بعض منتخب مقالوں، افسانوں اور منظومات کا مجموعہ جنھیں نیک تعمیری مقاصد کے تحت چھاپا گیا ہے۔ مجلد تین روپے۔

ایک روپیہ **سوویت روس کی حقیقت**:۔ دو حصے۔ دو روپے

(مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یوپی))

مستقل عنوان

از:- ملا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

بعض اوقات بیوی کا پڑھا لکھا ہونا بھی مصیبت بن جاتا ہے - ملائن توے پر بیٹھی تھی لیکن اس کے ہاتھ میں اخبار تھا - ہاتھ میں نہیں بلکہ یوں کہیئے کہ چولھے کے برابر رکھی ہوئی ایک دیگچی پر اس نے اخبار پھیلا رکھا تھا - جب میں گھر میں داخل ہوا اس کے دونوں ہاتھ پیڑا بڑھا کر روٹی بنانے میں مشغول تھے، مگر نظریں اخبار پر تھیں - میں کھنکارا تو اس نے چونک کر نظریں اُٹھائیں - چونکنے کا مطلب یہی تھا کہ مطالعہ گہری محویت کے ساتھ ہو رہا تھا -

"جبھی تو میری صحت گرتی جا رہی ہے" میں نے حسرتناک لہجے میں احتجاج کیا "باورچی خانہ لائبریری بنا لیا جائے گا تو جلی ہوئی روٹیوں اور کچے سالنوں کے سوا وہاں سے کیا برآمد ہوگا۔"

"پرواہ مت کیجئے" وہ تڑسے بولی "ابھی گھنٹہ بھر پہلے صوفی مسکین ارشاد فرما گئے ہیں کہ ٹھیک پانچ بجے آپ کو درگاہ بھیجدیا جائے --- شاید آگرے یا بمبئی سے کوئی ٹولی آئی ہوگی پھر تو آپ کی صحت ماشاء اللہ ہوا سے باتیں کرے گی ---"

میں نے بوکھلا کر اسے گھورا - اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے یا چٹکی لے رہی ہے - کچھ دنوں سے اس کے مزاج و اطوار میں تبدیلی آتی جا رہی تھی - پہلے وہ اکثر میری باتوں پر چلا بیٹھا کرتی تھی - الجھتی تھی جھلاتی تھی مگر رفتہ رفتہ یہ کیفیت زوال پذیر نظر آنے لگی - اب وہ بسا اوقات حیرتناک تحمل اور شگفتہ مزاجی سے کام لیکر ایسی باتیں کہہ جاتی ہے کہ میں اندر ہی اندر سر پیٹ کر یہ شعر گنگنانے لگتا ہوں -

میں ترا عکس ہوں کہ تو میرا
اس سوال و جواب نے مارا

آپ سے کیا پردہ، وہ دراصل مجھے میرا ہی آئینہ دکھانے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے - غالباً یہ سبق اس کے بھیا ہی نے پڑھایا ہوگا - جو کچھ بھی ہو میں نے بُرا سا مُنھ بنا کر جواب دیا -

"جھوٹ مت بولا کرو - صوفی مسکین کل اجمیر گئے ہیں۔"

"پھر وہ ان کے بھائی صوفی تمکین ہوں گے۔"

"وہ آٹھ دن سے ہسپتال میں پڑے ہیں۔"

"پھر وہ ان کے خالو صوفی تمکین ہوں گے۔"

"تمکین صاحب تنکار پر ہیں۔"

"اب چوتھا قافیہ آپ ہی بتلائیے - کوئی نہ کوئی آیا ضرور تھا۔"

"میری موت آئی ہوگی --- میرا خیال ہے اب یہ گھر پاگل خانے میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔"

"بس جھلا گئے - آپ نے برسوں اسی طرح میرا خون جلایا ہے۔"

"میں پیدائشی احمق ہوں مگر تمھیں احمق بننے کا کوئی حق نہیں۔"

"مولانا اشرف علیؒ نے لکھا ہے کہ بیویوں کو شوہروں کے رنگ میں رنگ جانا چاہیئے - جو کچھ آپ ہیں وہی میں بھی بننے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

" شرم نہیں آتی مولانا اشرف علی کا نام لیتے۔ ان کے متوسلین سے تو تمھیں خصوصی بیر ہے۔"

" میرے دشمنوں کو ہو بیر۔ یہ آپ نے کیسے کہا ؟"

" کیا مولانا صادق صاحب میرے مرید ہیں ؟"

" مولانا صادق صاحب !"

اس کی آنکھوں میں سوال تھا۔

" اور نہیں تو کیا۔ بھولی بن رہی ہو جیسے خبر ہی نہیں۔"

" میں کسی مولانا صادق کو نہیں جانتی ۔۔۔"

" ٹھیک ہے۔ کل کو کہنا میں کسی ملّا ابن العرب کو نہیں جانتی۔"

" ارے تو بتایئے نا کونسے مولانا صادق ؟" ۔۔۔

" بہت اچھے۔ ابھی تو ایک بھی مولانا صادق کو نہیں جان رہی تھیں۔ ابھی بہت سے مولانا صادق ہو گئے جن میں سے میں چھانٹ کر بتاؤں کہ کون سے مولانا صادق ۔۔۔"

" توبہ۔ آپ تو میل کا بیل بنا دیتے ہیں۔ اب بتائیں گے بھی ؟"

" یہ کیا پڑھ رہی ہو ؟"

میں نے اخبار کی طرف اشارہ کیا جو صادق جدید کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا اس کی آنکھوں میں چمک سی آئی

" اچھا ۔۔۔ یہ مطلب تھا آپ کا ۔۔۔ مولٰنا دریابادی کہہ دیتے تو کیا بگڑ جاتا ۔"

" ایک ہی بات ہے۔ مجھے ناموں میں طول پسند نہیں"

" مگر خود آپ کا نام ؟" اس نے چبھتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔

" میرا نام میرے گناہوں کی سزا ہے " میں نے یونہی کہا۔ یونہی سے مطلب یہ کہ منطقی اعتبار سے یہ جواب کیا اس تھا مگر اس کی چٹاخ پٹاخ سے میرا بھیجا گرم ہو گیا تھا اور گرم بھیجا منطق فلسفے سب کو جلا کر بھسم کر دینے میں اکسیر مانا گیا ہے۔

کھانے کے دوران میری نظر ایک عنوان پر پڑی جس نے چٹنی کا مزا دیا:۔

" اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے "

یہ عنوان صادقِ جدید ہی میں تھا جسے ابھی تک ملانی نے ہاتھ ہی میں لے رکھا تھا۔

" بھئی واہ ۔۔۔ ذرا سناؤ تو کیا لکھا ہے۔"

" جی نہیں۔"

" ارے واہ ۔ کیوں نہیں ؟"

" پھر آپ کہیں گے کہ مجھے مولانا اشرف علیؒ کے متوسلین سے بیر ہے۔"

" وہ تو کہوں گا۔ اچھا چلو نہیں کہوں گا سناؤ ۔۔۔"

" میں کیوں سناؤں۔ آپ خود پڑھ لیجئے ۔۔۔"

" تم سناؤ گی تو میں سننے کے ساتھ ساتھ تمھارے چہرے کا بھی مطالعہ کرتا رہوں گا۔ تمھیں نہیں معلوم جب تم تاؤ کھاتی ہو تو تمھارے چہرے پر تجریدی آرٹ کے کیسے کیسے نمونے نمودار ہوتے ہیں۔"

" آپ کو خدا سمجھے۔ اب تو میں اور بھی نہیں سناؤں گی۔"

" نہیں سناؤ گی ؟"

" ہرگز نہیں سناؤں گی۔"

" مت سناؤ۔ مگر میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس عنوان نما مصرعے کا پہلا مصرعہ تمھیں یاد نہیں ہے۔ یہ شعر میں نے سن سینتالیس سے پہلے کہا تھا۔"

" ضرور کہا ہو گا۔ اقبال اور غالب سب آپ ہی کے شاگرد تھے۔"

" اوچھی جا رہی ہو ۔۔۔ اچھا بھاگوان لاؤ اخبار دو میں خود ہی پڑھ لوں گا۔"

یہ تو بری بات ہو گی کہ میں اکیلا اکیلا پڑھ لوں اور ناظرین منھ دیکھتے رہ جائیں۔ لیجئے آپ بھی سنیئے ۔۔۔ ویسے سننے سے پہلے یہ ضرور ذہن نشین فرمالیں کہ شعر کے بارے میں میں نے ملانی سے غلط بیانی نہیں کی تھی واقعۃً یہ میرا ہی شعر ہے ثبوت کے لئے پہلا مصرعہ ملاحظہ ہو:۔

ملّا ثبوت لائے جو مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

صدق پارہ

"اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے"

مولانا مودودی کا ایک تازہ بیان ایک سوال کے جواب میں

"اگر کنونشن مسلم لیگ کسی ایسے امیدوار کو نامزد کرے گی جو دیندار ہو، تو جماعت اسلامی اس کی بھی حمایت نہیں کرے گی۔ کیونکہ کنونشن مسلم لیگ سے جماعت اسلامی کے اصولوں پر شدید اختلافات ہیں۔۔۔۔ اگر کنونشن مسلم لیگ کسی فرشتہ کو بھی کھڑا کرے گی تو جماعت اسلامی اسکی بھی حمایت نہیں کرے گی۔"

(المنیر۔ لائل پور پاکستان ۱۱ راگست)

اقتباس اگر صحیح نقل ہوا ہے تو سارے "کافر گر" مولوی صاحبان کو مبارک ہو کہ اب انھیں مولانا مودودی کی بھی سند و ہم نوائی حاصل ہو گئی! —— اب تک تو یہی سنا تھا کہ مولانا مودودی کے ہاں معیار انتخاب صرف صالحیت ہے۔ اب معلوم ہوا کہ نہیں کوئی شخص لاکھ صالح ہو، تقوی و دینداری کا جامہ پہنے ہوئے ہو (فرشتہ ہو) لیکن اس کا تعلق فلاں سیاسی جماعت سے ہے جو ہر صورت و بہر حال ایک مسلم ہی جماعت ہے تو اس کی حمایت نہیں بلکہ مخالفت ہی کی جائے گی! —— اس سیاسی پارٹی کا عمل کتنا ہی عظیم ہو، بہر حال ارتداد و ترک اسلام تو نہ ہوگا، لیکن یہاں وہی محض تعبیری و استنباطی اختلاف نے اسے اسلامیت سے معرا کرکے کفر و ارتداد کی صف میں لاکھڑا کر دیا ہے! —— بریلی کے بدنام اور غالی حضرات بھی اس سے زیادہ اور اس کے سوا کیا کہتے ہیں کہ چونکہ فلاں اور فلاں فرقے تعبیر اسلام اور استنباط مسائل میں ہم سے شدید اختلاف رکھتے ہیں اس لئے ہم انھیں اسلام کی برادری سے خارج کرنے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں —— طنز و تعریض کی نہیں۔ ملت کے حق میں یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ ایک دینی شخصیت سیاسیات حاضرہ میں غرق ہو کر کہاں سے کہاں پہنچ گئی! (صدق جدید)

ایک بار پڑھنے سے دل نہیں بھرا تو میں نے دوبارہ پڑھا۔ چٹخارے لے لے کر پڑھا۔ کنکھیوں سے ملائن کی طرف بھی دیکھتا جا رہا تھا جس کے سرِ نازک پر یہ چٹخارے شاید ہتھوڑا بن کر برس رہے تھے۔ چٹخاروں سے مراد ظاہر ہے سبحان اللہ۔ ماشاء اللہ۔ واہ وا جیسے الفاظ تھے جو بے ساختہ میری زبان پر آئے جا رہے تھے۔ پہلے تو اس کے لقمہ چبانے کی رفتار کم ہوئی۔ پھر ہونٹ بھنچے، پھر ناک کے نتھنے پھڑ پھڑائے۔ وہ دراصل ضبط اور بے ضبطی کی شدید کشمکش سے گذر رہی تھی۔

"بھئی واللہ —" میں نے تقریباً جھوم کر ایک ہی سانس میں کہا "مبصر ہو تو ایسا ہو، مفکر ہو تو ایسا ہو، مدبر ہو تو ایسا ہو، مفسر ہو تو ایسا ہو۔"

ایک سانس میں چار قافیوں سے زیادہ کیا یاد آتے۔

"رُک کیوں گئے" وہ بھنا کر بولی "ایک بڑا اچھا قافیہ ابھی باقی ہے — محرّر ہو تو ایسا ہو!"

"محرّر تمھارے بھیا ہوں گے" میں نے ترکی بترکی جواب دیا۔

"آپ ہر بات میں بھیا کو مت گھسیٹا کیجئے۔ ایسا ہی بھیا سے بیر اور مولانا دریابادی سے عشق ہے تو تجلی چھوڑ کر صدق میں ملازمت کر لیجئے۔" اسے طرارہ آگیا تھا۔

"ضرور کر لیتا مگر لکھنؤ والے مولوی کرم الٰہی کہہ رہے تھے کہ وہاں دس روپے سے زیادہ تنخواہ نہیں مل سکے گی۔"

"اور پھر بھی آئے دن احتجاج کرتے ہیں کہ تجلی کے ڈیڑھ سو تھوڑے ہیں۔ بھیا سے کہہ کر تنخواہ اور بڑھواؤ۔"

"کس کے لئے کرتا ہوں۔ تمھارے لئے تمھاری اولاد کے لئے۔ کونسا مجھ پر احسان کریں گے اگر تمھارے بھیا ہزار بھی دیدیں گے۔ بڑے آئے بھیا۔ ارے بھیا تو ایسے ایسے ہوئے ہیں کہ اپنی بہنوں کو سلطنتیں دے دی ہیں۔ میرے کوئی بہن نہ ہوئی ورنہ میں تو اسے ہیروں میں تول دیتا۔"

"ٹھیک ہے۔ بیویاں کمبختیں تو اس لائق بھی نہیں کہ انھیں کِلوں ہی میں تول دیا جائے۔ کتنے دنوں سے کہہ رہی ہوں ایک تنور پے فالتو لے آئیے —"

"معاذاللہ۔۔ یہ تنور پھر تم نے نکالا۔ بھاگوان حقائق

کی بات کرو۔ کوئلے بھی کم سے کم اتنے مہنگے ضرور ہیں کہ تمھیں تولنے کے لئے آدھی تنخواہ خرچ کرنی ہوگی۔"

"اور ہیرے تو بہت سستے ہیں۔ کانچ کے ٹکڑے بھی خریدنے جائیں گے تو کوئی سینک سلائی سی بہن ڈیڑھ سو میں نہیں تل سکتی۔"

"پھر؟ ۔ ۔ ۔ یعنی اس حسابی بحث کا تعلق ہمارے موضوع سے کیا ہوا؟"

"بھاڑ میں جائے موضوع۔ آپ صدق پڑھیئے۔"

"وہ تو پڑھا۔ ایمان سے کہنا مولانا صدق کیسا باریک کاتتے ہیں؟"

"وہ تو کبھی کبھی سنک جاتے ہیں۔" ملائن اکدم بھڑک اٹھی۔

"ائے ائے۔ پاگل ہوئی ہو۔ ایسی بچکانہ بات۔"

"بچکانہ بلا سے ہو مگر مجنونانہ نہیں۔ مولانا دریابادی نے جو کچھ لکھا ہے وہ تو دیوانگی کے دائرے میں آتا ہے۔"

"استغفر اللہ۔ تمھیں اتنا بھی احساس نہیں کہ ایک عورت مردوں پر تنقید نہیں کر سکتی کجا کہ ایک اتنے بڑے اہلِ قلم پر تنقید۔ تنقید کیا یوں کہو کہ سبّ و شتم۔"

"میں نے اتنی بڑی گالی نہیں دی جتنی مولنا دریابادی نے مولانا مودودی کو دی ہے۔ اگر میں اندھی نہیں ہوں تو بتائیے مولانا مودودی کے منقولہ فقروں میں کس لفظ سے کفر و ارتداد کا فتوی تو درکنار اشارہ تک نکلتا ہے؟"

میں سٹپٹایا۔ واقعی میں فرطِ شوق میں چیک نہیں کر سکا تھا کہ کنونشن مسلم لیگ کے کسی امیدوار کو خارج از اسلام قرار دینے کی جسارت مولانا مودودی نے کس جملے میں کی ہے۔ گھبرا کر دوبارہ عبارت پڑھی۔ یہ تو یقینی تھا کہ مولانا مودودی نے جرم کیا ہے کیسے ممکن ہے کہ مولانا دریابادی جیسا بطلِ جلیل بال کی کھال نکالے اور بچھڑ سے اونٹ برآمد نہ ہو۔ قصور یقیناً میری کوتاہیٔ فہم کا تھا۔ تین بار نہایت باریک بینی سے بھیجے سے لیکر معدے تک کا زور لگا لیا پھر بھی حرفِ مطلب برآمد نہ ہوا تو میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کھانسیوں کا دورہ ڈال لیا

یہ طریقہ مہنگا ضرور پڑتا ہے۔ حلق میں خراشیں آجاتی ہیں۔ کھوپڑی خواہ مخواہ تھرانے لگتی ہے، لیکن جان بہرحال چھوٹ جاتی ہے۔ وہی ہوا جو پہلے کئی بار ہو چکا ہے۔ یعنی ملائن جلدی سے پانی لائی۔ اسے یقین تو نہیں تھا کہ کھانسی کا یہ دورہ برحق ہے لیکن یا تو ازراہِ مروّت یا ازراہِ انتظام وہ اسے سراسر ڈھونگ قرار دینے پر بھی آمادہ نہیں تھی۔

کئی منٹ بعد میں بے سُدھ سا ہو کر آرام دہ بستر پر دراز ہو گیا اور ملائن کے چہرے پہ ہمدردی کا نور برستا رہا گو اس کے پیچھے طنز کی سیاہ پرچھائیاں بھی تھیں۔

نیند تو کیا آتی مگر اسے بیداری بھی نہیں کہہ سکتے۔ بین بین عالم تھا۔

ظہر کے بعد چائے پی گئی۔ مجھے ہر آن اندیشہ تھا کہ ملائن اب پھر وہی سوال کرے گی۔

"دکھاؤ مولانا مودودی نے کفر و ارتداد کا فتوی کہاں جڑا ہے؟"

مگر وہ خاموش رہی۔ یہ الگ بات ہے کہ مزاج پرسی کے دوران اس کی آنکھیں بے آواز قہقہے اڑاتی محسوس ہوتی ہیں اور اس کی دبی دبی مسکراہٹ میری دُکھتی رگ میں چٹکیاں لیتی رہی ہو۔

نماز کے بہانے میں گھر سے نکلا اور جماعت سے فارغ ہوتے ہی مولوی رحمانی صاحب کی خدمت میں پہنچا یہ صوفی راز داں کے ہم زلف ہیں اور ان کے چچا عبد الصمد صاحب سے ہمارے خاندانی تعلقات رہے ہیں۔

ان سے بڑا "مودودی دشمن" میری نظر سے نہیں گذرا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اگر فرشتوں کی غلطی سے مودودی صاحب کو جنت میں داخلہ مل گیا تو میں اس جنت کو بھی جہنم ثابت کروں گا اور اگر ثابت نہ کر سکا تو خود جہنم میں چھلانگ لگا دوں گا۔ ان کی شہرۂ آفاق کتاب "مرغی کی ایک ٹانگ" بریلوی حلقوں میں بھی اتنی ہی مقبول ہے جتنی دیوبندی حلقوں میں کیونکہ اس میں بڑی مضبوط دلیلوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ مودودی صاحب

کے منکر ہیں گو لفظاً ہر وہ انکار نہیں کرتے لیکن جس خدا کو
وہ خدا مانتے ہیں وہ خدا ہے ہی نہیں۔ خدا وہ ہے جسے
ہم مانتے ہیں۔

دروازے پر مجھے کئی منٹ انتظار کرنا پڑا مگر
اس سے کوفت نہیں ہوئی کیونکہ اندر سے ریڈیو کی
سامعہ نواز لہروں پر پاکستانی مغنیہ کا وہی وجد انگیز
نغمہ سماعت نواز ہو رہا تھا جسے سن کر بریلوی تو کیا
بعض اہل حدیث کو بھی وجد کرتے دیکھا گیا ہے۔

"بڑے بے مروت ہیں یہ حسن والے انھیں دل لگانے کی کوشش نہ کرنا"

مگر آواز یک لخت بند ہو گئی

غالباً میری حاضری کی اطلاع پر ریڈیو بند کر دیا گیا تھا

کچھ دیر بعد ہم یعنی میں اور مولوی رحمانی صاحب
ان کے شاندار ڈرائنگ روم میں چائے اڑا رہے تھے۔
دبیز قالینوں اور نرم گاؤ تکیوں کا یہ ڈرائنگ روم —
— ہائے ہائے — اس کی دیواروں پر بڑے بڑے
چوکٹوں میں وہ نوع بہ نوع ایڈریس اور تہنیت نامے
جڑے ہوئے تھے جو مولوی صاحب کو وقتاً فوقتاً ایک
بہترین مقرر اور واعظ کی حیثیت میں ملتے رہتے ہیں۔
چائے تقریباً اسی معیار کی تھی جس کے بارے میں مولانا
آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے بلیغ ارشادات "قصائد چائیہ"
کے نام سے چار دانگ عالم میں شہرت یاب ہو چکے ہیں۔

مولوی رحمانی کے ایک وصفِ خاص کا اور
ذکر کر دوں۔ انھیں مودودیت سے شدید نفرت ہونے
کے علاوہ ہر اس عالم سے کد ہے جو قادیانیوں کو امت مسلمہ
میں شامل نہیں سمجھتا۔ اس کد کے چکر میں انھوں نے اپنی
پروردہ ایک یتیم و اسیر لڑکی کی شادی بھی ایک قادیانی جوان
سے کر دی ہے۔ جس وقت اس شادی پر اہلِ محلہ نے لے
دے کی تھی وہ کسی لائبریری سے صدق جدید کا فائل
اٹھا لائے تھے اور متعدد عبارتیں دکھلا کر لوگوں کو قائل
کیا تھا کہ دیکھو ایشیا کا صفِ اول کا عالم اور مرد راست گو
قادیانیوں کے اسلام کا نہ صرف قائل ہے بلکہ اس پر زور
بھی دیتا ہے۔ لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف آنکھیں
پھاڑ کر دیکھا تھا پھر نکاح کے چھوارے کھا کھا کر چلتے بنے تھے

"میری حیثیتِ عرفی خطرے میں ہے مولانا؟" میں نے
صدق جدید ان کے آگے پٹختے ہوئے دردیلے لہجے میں کہا۔
وہ اخبار اٹھاتے ہوئے گویا ہوئے — "کیا
بات ہے؟"

"پہلے اسے پڑھ لیجئے" میں نے اسی صدق پارے
پر انگلی رکھ دی۔ انھوں نے پڑھا۔ پڑھنے کے دوران ان کا
چہرہ انگریزی گلاب کی طرح کھلتا جا رہا تھا۔ داڑھی کے
بالوں کی نوکیں بسنت کی سرسوں کی طرح لہلہانے لگی تھیں
اور گردن کی رگیں اس طرح متحرک تھیں جیسے جرعہ جرعہ کر کے
شربت پی رہے ہوں۔

"بہت عمدہ — واللہ بہت اچھے" وہ دفعتاً
چہکے۔

"کیا اچھے — قبلہ اسی اچھائی نے تو میری مٹی
پلید کر دی ہے۔"

"کیا مطلب؟" انھوں نے کسیلی نظروں سے مجھے
گھورا۔

"بہت خراب مطلب ہے مولانا۔ آپ ذرا انصاف
تو فرمائیے اگر ایک شوہر اپنی بیوی سے ذہنی طور پر شکست
کھا جائے تو اس کے لئے زندہ رہنے کا کیا جواز رہ جاتا ہے؟"

"کون بیوی — کس کا شوہر" ان کے چہرے سے
بیزاری اور تحیر دونوں ہویدا تھے۔

"میری بیوی — میں خود ہی اپنی بیوی کا شوہر
ہوں مولانا .... اور بس ... میرا مطلب یہ
ہے کہ وہ میری بیوی تشریح پوچھتی ہے۔"

"تشریح — بیوی — کیا ہانک رہے ہو — بھئی
سیدھی بات کرو۔"

"میں بھی آپ ہی کی طرح اس صدق پارے کو
پڑھ کر خوش ہوا تھا مگر وہ میری بیوی کہنے لگی کہ مولانا
کبھی کبھی سنک جاتے ہیں ..."

"کیا۔۔۔؟" وہ حلق کے بل چیخے۔

"سمجھنے کی کوشش کیجئے ح حضرت — وہ دراصل ایڈیٹر تجلی کی بہن ہے وہابیت اس کی رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔"

"استغفر اللہ — تم بیویوں کی زبان سے ایسی بکواس سننے کی تاب لا سکتے ہو۔"

"نہیں لا سکتا۔ یقین کیجئے تاب میں بھی نہیں لا سکا تھا اسی لئے تو کھانسیوں کا دورہ ڈالنا پڑا۔"

"جانے کیا ہانکتے ہو — ارے میں کہتا ہوں طمانچہ کیوں نہیں مارا؟"

"باپ رے کیا آپ کا مطلب ہے میں چانٹا مارتا؟"

"اور نہیں تو کیا — مرد کے سامنے عورت علماء کی شان میں اتنی شدید گستاخی کرے تو اس کی زبان کھینچ لینی چاہئے۔"

"وہ صرف عورت نہیں ہے مولانا۔ وہ میرے سالے کی بہن بھی ہے۔"

"پھر؟" وہ غرائے۔

"پھر تو بس پھر۔۔۔ مم مطلب یہ کہ اس نجی معاملہ پر کسی اور وقت گفتگو کریں گے۔ مجھے تو آپ یہ سمجھا دیجئے کہ مولانا مودودی کے منقولہ الفاظ میں کفر وارتداد کا فتوےٰ کس کونے میں دبک گیا ہے کہ میں نے بہت کوشش کی مگر پرچھائیں تک نہیں ملتی۔"

"ہوں۔۔۔ یہ تو ہم ابھی غور کر کے بتائے دیتے ہیں" انھوں نے دوبارہ اخبار پر توجہ مبذول فرمائی۔

میرے لئے انتظار کے لمحے بڑے شاید تھے۔ دل سے دعائیں نکل رہی تھیں کہ اے اللہ۔ اپنے اس نیک بندے رحمانی پر علم غیب منکشف فرما۔ دراصل مجھے یقین ہو چلا تھا کہ علم غیب کی مدد کے بغیر مولانا مودودی کے فقروں سے وہ گوشۂ مکنون برآمد نہیں کیا جا سکتا جس پر مولانا دریابادی کے تبصرے کی عمارت اٹھی ہے۔

"یہ دیکھو" رحمانی صاحب کی پُرمسرت آواز ابھری "مودودی کہتا ہے کہ ہم مسلم لیگ کی حمایت نہیں کریں گے چاہے

وہ فرشتہ ہی ہو۔ اب بتاؤ کیا قرآن میں فرشتوں پر بھی ایمان لانا اتنا ہی ضروری قرار نہیں دیا گیا ہے جتنا اللہ کے رسولوں اور آسمانی کتابوں پر۔"

"جی بے شک"

"تو پھر۔ فرشتے کے انکار سے کیا مودودی کافر نہیں ہوا؟"

"ہو گیا — مگر وہ۔۔۔۔ وہ ملانی نہیں مانے گی۔۔۔"

"نہیں کیسے مانے گی۔ تم شوہر ہو یا وہ؟"

"اس مسئلہ پر بھی کسی اور وقت گفتگو کریں گے۔ ابھی تو آپ ذرا اسی تشریح اور کر دیں تاکہ میں اسے لاجواب کر سکوں۔"

"مزید تشریح کی کیا حاجت ہے" وہ تلخ لہجے میں بولے "ایمان بالملائکہ ختم ہوا تو سارا ایمان ختم ہوا —"

"بالکل بجا — مم مگر سوال مودودی کے کافر ہونے کا نہیں۔ وہ تو ہے ہی کافر۔ سوال یہ ہے کہ اس مرد کافر نے مسلم لیگی مرد مومن پر کفر والحاد اور خارج از اسلام ہونے کا الزام کہاں جڑا ہے۔"

"کہاں جڑا ہے۔ اسی بیان میں جڑا ہے۔ دیکھتے نہیں کیسے کہہ رہا ہے کہ ہم ہرگز اس کی حمایت نہیں کریں گے چاہے وہ دیندار ہی کیوں نہ ہو۔ دینداروں کی حمایت سے گریز فقط کافر ہی کر سکتا ہے۔"

"پھر وہی بات — یعنی تحصیل حاصل؟"

"کیا؟" وہ بھپکے۔

"جی ہاں۔ اس منطق سے بھی مودودی کا کفر ہی ثابت ہوتا ہے مگر وہ تبصرہ۔۔۔۔؟"

"کیا تبصرہ تبصرہ رٹے جا رہے ہو۔ ارے کیا مولانا دریابادی کو ایسا ویسا سمجھا ہے۔ دھوم ہے ان کے اخبار کی ساری دنیا میں۔"

"بالکل یہی بات میں نے ملانی سے کہی تھی — مگر وہ نکتہ بحث سے بھاگنے نہیں دیتی۔"

"نامرد ہو تم۔ ارے طمانچہ رسید کیا ہوتا۔ بڑی آئی ملانی۔"

"مم مگر جناب دیکھئے تو ذرا ہم ملکر غور کریں — ایک سے

دو بھلے ۔ ۔ ۔"

"جاؤ میاں اب ہمیں داروغہ صاحب سے ملنا ہے۔ انھوں نے خاص طور پر یاد فرمایا تھا"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ آپ کہیں تو میں اپنی بیوی کی رپٹ لکھوا دوں ــــ نہیں میں مشورۃً پوچھتا ہوں۔"

انھوں نے تند نظروں سے مجھے گھورا۔ اس تندی میں شک کروٹیں لے رہا تھا۔

"اچھا ــــ تو اب مجھ سے بھی تمسخر کرو گے ــ"

"توبہ توبہ جناب ــــ میں آخر اور کر دوں بھی کیا۔ آپ کی ذات سے بڑی امیدیں تھیں کہ میری سرخروئی کا سامان کریں گے مگر ۔ ۔ ۔"

"ہاں ہاں بہت ہوئی اگر مگر ــــ بس اب پھر ملینگے۔"

وہ کچھ گھبرا سے گئے تھے۔ گھبراہٹ کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ ان کے اندرونِ خانہ سے ریڈیو کی آواز پھر آنی شروع ہو گئی تھی۔

پیار کیا کوئی چوری نہیں کی۔ پیار کیا تو ڈرنا کیا

"یہ خبیث محلے کے نیچے آ کر ریڈیو سے لپٹ جاتے ہیں ــــ ارے او عبد الرحیم ــــ مردود کہاں مر گیا۔ دیکھنے میں ہی جا کر اس خرافات کو بند کراتا ہوں۔"

"چھوڑیئے بھی ــــ اس گانے سے کافی ڈھارس بندھتی ہے۔"

"کیسی ڈھارس؟" وہ غالباً رَو میں کہہ گئے۔

"بات یہ ہے مولانا ۔ ۔ ۔ خیر ہٹائیے ۔ ۔ ۔ اجی ہاں ایک تکلیف آپ کو اور دینا چاہتا ہوں۔ داروغہ صاحب کے وسیلے سے چند کٹے سیمنٹ کے دلوا دیجئے۔"

"مشکل ہے۔ آپ براہِ راست درخواست دیکر حاصل کر لیں۔"

"یہ آپ کہہ رہے ہیں مولانا ــ حالانکہ آپ ہی کی کتاب "وسیلہ پکڑو" پڑھ کر میں توسل کا قائل ہوا ہوں۔ اگر اللہ میاں تک کے دربار میں بغیر توسل کے دعا کی شنوائی نہیں تو سیمنٹ خالی درخواست سے کیسے مل جائے گا ــ"

"فضول باتیں کرتے ہو ــــ سبھی لوگ درخواستیں دے کر لے رہے ہیں۔"

"لے رہے ہوں گے مگر مجھے تو کامیابی نہیں ہوئی۔"

"تم نے درخواست دی تھی؟"

"جی ہاں۔ دس کٹوں کے لئے درخواست گذاری تھی مگر منظوری ہوئی صرف دو کٹوں کی۔ باپ دادے کا مکان بیٹھا جا رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہو چکی ہیں۔ راج سے تخمینہ لگوایا تھا تو اس نے بتایا کہ دس کٹوں سے کم میں کام نہیں چلے گا۔"

"استغفر اللہ۔ جب دس کا تخمینہ لگا تھا تو پچیس کی درخواست کیوں نہیں دی۔"

"یعنی ڈھائی گنا جھوٹ!" میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

"جھوٹ سچ کیسا۔ جب معلوم ہے کہ مطلوبہ مقدار سے آدھا تہائی ملتا ہے تو دُگنے تگنے کی درخواست دینی ہی چاہئے۔"

"یہ بھی کر چکا ہوں۔ جب دس کی درخواست پر دو ملے تھے تو ایک اور درخواست یہی لکھ بھیجی تھی کہ آٹھ کٹوں کی ابھی اور ضرورت ہے لہذا ان کٹوں کی منظوری عطا فرمائی جائے۔"

"ہائیں ۔ ۔ ۔" انھوں نے قہقہہ اُڑایا "کیا یہی لکھ بھی دیا تھا؟"

"جی ہاں۔ میری بیوی نے کہا تھا کہ اگر تم نے غلط بیانی کر کے سیمنٹ حاصل کیا تو میں سارا کا سارا نالی میں بہا دوں گی۔ وہ دہاین ہے مولانا میری تو زندگی برباد کر رکھی ہے ــ"

"تم چوڑیاں پہن لو۔ شرم نہیں آتی بیوی کی غلامی کرتے ــ"

"جی ہاں ــــ یہ موضوع بڑا نازک ہے ــــ مگر وہ دیکھئے آپ ہی اپنے اسٹاک سے آٹھ کٹے دیدیں۔ آپ نے

تو نے ایک ہی مہینے پچاس کٹے حاصل کئے تھے ـــــ"

"تمھیں کیسے معلوم ہوا؟" وہ تڑپ کر بولے۔

"رام ناتھ بتا رہا تھا۔ وہ تحصیلدار کے پیش کار کا دوست ہے۔"

"ہم۔۔۔۔ ارے بھائی وہ تو میں نے اپنی ضرورت کو حاصل کئے تھے۔ خانقاہ میں کئی کمرے بننے ہیں۔"

"جی ہاں بے شک بننے ہوں گے ـــــ لیکن مولانا" میں نے رازداری کے انداز میں کہا ـــــ "پندرہ کٹے آپ نے چودھری گلفام کو عنایت فرمائے ہیں ـــــ آٹھ ہمیں بھی عنایت فرمادیں۔"

ان کے چہرے پر ایک سایہ سا گذر گیا۔

"تم سے کس نے کہا؟" ان کی آواز میں کاٹ کھانے کا انداز تھا۔

"چودھری گلفام کی بیوی مسٹرائن سے ذکر کررہی تھی مسٹرائن میری خالہ کے سگے بہنوئی کی پھوپی زاد بہن ہے۔"

"جھوٹ بولا اس حرافہ نے۔ ہم نے صرف بارہ کٹے دیئے تھے وہ بھی چودھری کے سخت اصرار پر۔ اس کی چھت بیٹھی جارہی تھی ـــــ"

"جی ہاں جی ہاں۔۔۔۔"

"کیا جی ہاں جی ہاں ـــــ"

"یعنی آپ ٹھیک ہی فرمارہے ہیں مسز گلفام نے تین کٹوں کا جھوٹ بولا ـــــ مگر مجھے تو صرف آٹھ کی ضرورت ہے ـــــ بڑی مہربانی ہوگی اگر۔۔۔۔"

"بھئی بہت پریشان کرتے ہو ـــــ خیر تم بھی اپنی ضرورت پوری کرلینا۔ کیا کریں ہم سے تو بے مروتی نہیں برتی جاتی ـــــ"

"شکریہ شکریہ ـــــ خدا آپ کی قبر کو نور سے بھردے ـــــ تو کس وقت لے جاؤں؟ ـــــ"

"لے جانے کا سوال نہیں۔ ہم خود رات میں بھجوا دیں گے۔۔۔۔ بس تم شام تک قیمت بھجوادو ـــــ"

"بالکل۔ ضرور" میں خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ آٹھ کٹوں کے انتظار میں وہ پہلے سے لئے ہوئے دو بھی مٹی ہوتے جارہے تھے۔ کئی مہینے ہوئے جب غریب خانہ کا ایک کمرہ ڈھے گیا تھا۔ دوسرے کمرے کی دیوار میں دراڑ آگئی تھی۔ غسل خانے اور باورچی خانے کا حال بھی سقیم تھا۔ سوال اٹھا کہ مرمت کیسے ہو جیبیں اور کیش بکس تو خالی پڑے ہیں۔ راج نے بتایا تھا کہ مکمل مرمت پر کم سے کم دس کٹے تو سیمنٹ ہی کے لگ جائیں گے۔ مزدوری الگ رہی۔ ملّائن نے نہ جانے کس کونے آنتر سے سو روپے تو برآمد کرکے میرے حوالے کئے تھے کہ سیمنٹ خرید لاؤں۔ میں ان دنوں بے حد ضرورت مند تھا۔ کئی گفتہ اور ناگفتہ حوائج کے سلسلے میں صوفی مریخ سے تقریباً اسّی روپے لیکر خرچ کرچکا تھا اور اب وہ بھی تقاضوں پر تقاضے کررہے تھے۔ سیمنٹ گیا جہنم میں۔ اسّی ان کی ناک پر مارے۔ البتہ دس کٹوں کی درخواست ضرور تحصیل میں داخل کردی اسکے نتیجے میں دو کٹے ہاتھ لگے۔ ملّائن نے کہا کہ لاؤ باقی روپے مجھے واپس کرو۔ میں سوائے دروغ بے فروغ کے اور کیا عذر لاتا۔ نوبت بہ جنگ رسید۔ مگر غنیمت ہے جنگ میں ہم میاں بیوی ہاتھ پیر استعمال نہیں کرتے فقط آہوں اور آنسوؤں کی باڑھ چلتی ہیں۔ یہ مفت کا میگزین زخم نہیں ڈالتا، بلکہ اُلٹا دل و دماغ کا غبار دھو کر مثل آئینہ بنادیتا ہے۔ الحمدللہ خانہ جنگی کا یہ دور بخیر و عافیت گزر گیا مگر جب ایک دن اس کے بھیّا نے کہا کہ مکان کی مرمت کیوں نہیں کرائی جاتی تو مجھے سو فیصدی یقین ہوگیا کہ اب یہ بہن اپنے بھیّا سے مرحوم سَو روپوں کا رونا روئے گی اور مجھے شہر چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا مگر خدا مولانا اشرف علیؒ کو جوارِ رحمت میں جگہ دے شاید انھی کی کتابوں کا اثر ہے کہ اس نے یہ واقعہ گول ہی کردیا اور فقط اتنا کہا کہ روپوں کا انتظام نہیں ہے مرمت کیسے ہو۔

اگلے روز ملّائن کی زبانی یہ خوش خبری سننے میں آئی اس کے بھیّا نے سَو روپے بھجوا دیئے ہیں کہ سیمنٹ منگا لیا جائے۔ راج مزدوروں کی اُجرت بھی وہ خود ہی ادا کردینگے میں نے کھٹ سے کہا لاؤ روپے جلدی سے مجھے دو سیمنٹ خرید

خرید لاؤں مگر وہ اس بار محتاط ہوگئی تھی کہنے لگی کہ جب آپ درخواست کی منظوری کرالیں گے تب روپے دوں گی۔ میں نے کہا کہ اچھا تیس روپے تو مجھے دے ہی دو سیمنٹ کا کٹہ آٹھ روپے کچھ پیسوں میں آتا ہے۔ آٹھ کے لئے ستر بہت کافی ہوں گے تیس فضول رکھے رہنے سے کیا فائدہ۔ اس نے پہلے تو انکار کیا مگر جب میں نے الحاج وزاری کی تو مان گئی۔ عورتوں کی ذہنی کیفیات کو سمجھنا آسان نہیں۔ جب یہ تیس وہ مجھے دے رہی تھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے اور ہونٹوں پر تبسم بھی۔ میں نے وجہ نہیں پوچھی تھی کیونکہ اندیشہ تھا کہیں پوچھ گچھ کے چکر میں اس کا ارادہ ہی نہ بدل جائے۔

ستر روپے سیمنٹ کے لئے جمع نہ ہوتے تو مولنا رحمانی سے درخواست ہی کی نوبت نہ آتی۔ وہ پسیج گئے تھے یہ بہت بڑی بات تھی۔ دل ہی دل میں رشک کر رہا تھا کہ دیکھو اللہ والے ایسے ہوتے ہیں۔ کتنی جلدی بیچاروں کو مجھ پر رحم آگیا۔ ہو سکتا ہے اس رحم کی ایک وجہ یہ بھی ہی ہو کہ میرے پیر بوقلندر رحمۃ اللہ علیہ کے بھانج داماد ان کے دادا پیر کے چچازاد بھائی لگتے تھے۔ روحانی سلسلوں کے روابط کو سنا ہے طریقت کے سالکین بڑی اہمیت دیتے ہیں۔

مولانا رحمانی کے حسن مروّت پر عش عش کرتا میں گھر پہنچا تو ایک سنگلاخ مرحلہ ملائن کو یقین دلانے کا طے کرنا پڑا۔ وہ پیسے دینے پر آمادہ نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں غلط بیانی کر رہا ہوں۔ بمشکل تمام جب میں نے اس کے سر کی قسم کھائی تب اس نے ستر نکال کر دیئے اور میں بھاگم بھاگ لوٹا۔ مولانا رحمانی نے ازراہِ عنایت یہ بھی منظور کر لیا تھا کہ اگر میں ایک گھنٹے کے اندر اندر پیسے لے آؤں تو وہ داروغہ صاحب سے ملنا کچھ مؤخر کر دیں گے۔ راستے میں یہ حساب بھی میں نے لگا ہی لیا کہ ایک کٹہ اگر پورے ساڑھے آٹھ کا بھی ملا تو دو روپے پھر بھی بچ ہی جائیں گے۔ آٹھ آنے ڈھلائی کے سمجھ لو تو بھی ڈیڑھ بچا۔ ڈیڑھ میں کتنے ضروری کام ہو سکتے ہیں — "بلبل بغداد" کا ٹکٹ خریدا جا سکتا ہے۔ پاسنگ شو کے پیکٹ آسکتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

"یہ لیجئے قبلہ —" میں نے نہایت فخر و مسرت سے دس دس کے ساتوں نوٹ مولنا رحمانی کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

"یہ کیا — صرف ستر!" انھوں نے بڑے کھردرے لہجے میں کہا۔

"جی ہاں دو ڈھائی جو کچھ بچیں وہ آپ مجھے عنایت فرما دیں . . . جی کیا فرمایا صرف ستر!" میں چونک اٹھا۔

"اور کیا — تم نے تو آٹھ کٹے طلب کئے تھے —"

"بے شک اسی لئے تو ستر لایا ہوں۔"

"تم ہوش میں بھی ہو۔ یہ کیا لغویت ہے کہ ہر بات میں مذاق کو دخل دیتے ہو —" انھیں خاصا طرارہ آگیا تھا

"مذاق کیسا مولنا — کیا دس دس کے سات نوٹ مذاق کہلاتے ہیں؟"

میں ان کے طرزِ عمل پر حیران تھا۔

"گھانس کھا گئے ہو تم" انھوں نے جھلّا کر نوٹ میری گود میں پھینک دیئے "یہ تو پانچ کٹوں کی بھی قیمت نہیں —"

"مار ڈالا — مولانا اب آپ خود ہی مذاق پر اتر آئے —"

"میرے پاس فضولیات کے لئے وقت نہیں" وہ اُٹھنے لگے۔

"ارے ارے جناب — ذرا ٹھیرئیے تو — میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ رہا ہوں۔"

"کیا تمھیں معلوم نہیں کہ بازار کی شرح فی کٹہ پندرہ روپے ہے؟"

"پ . . . پن . . . درہ روپے۔"

میں فرطِ استعجاب میں ہکلانے پر مجبور ہو گیا۔

"اور کیا — میں نے تو خیال کیا تھا کہ چلو تمہارا کام نکل جائے گا۔ مگر دنیا میں ناشکری ہی ناشکری رہ گئی ہے۔"

"تو کیا چودھری گلفام کو بھی آپ نے اسی ریٹ سے دیئے تھے؟"

"نہیں تو کیا وہ ہمارا چچا لگتا ہے — خوب سمجھ لو اب تو

بندرہ کا بھی مل رہا ہے۔ پھر کسی بھاؤ نہیں ملے گا —"

اندرونِ خانہ کا ریڈیو بڑے دردناک سروں میں الاپ رہا تھا:-

کبھی خود پہ کبھی حالات پہ رونا آیا

آپ تاڑ گئے ہوں گے کہ ملّا غلط بحث کرتا ہے۔ کہاں مولانا دریابادی کا صدق پارہ اور کہاں سیمنٹ کا کالا بازار۔

عرض یہ ہے مہربان کہ بندہ گاہے گاہے مولانا مناظر احسن گیلانی رح کی کتابیں دیکھتا رہتا ہے۔ وہ خدا بخشے غلط بحث کے امام تھے۔ ان کی وسعتِ مطالعہ اور کثرتِ معلومات کا جواب نہیں مگر غلط بحث کا بھی جواب نہیں۔ بس جب کبھی ان کی کوئی کتاب پڑھی ہے کم و بیش ایک ہفتے تک غلط بحث کے جراثیم بھیجے میں کلبلاتے رہے ہیں۔ ایک مرتبہ تو یہاں تک ہوا کہ کتاب ختم کر کے چائے پینے ہوٹل میں گیا تو چائے اور قلفی کے برف کا ایک ساتھ آرڈر دے بیٹھا۔

"قلفی کا برف!" بیرا چونکا "صاحب تو یہاں نہیں مل سکے گا۔"

"تو پھر لگا ہوا اور بیچ لے آؤ —"

"کیا آپ چائے اور اور بیچ ساتھ پئیں گے" اس نے ڈرتے ڈرتے استفسار کیا۔

ہاں ---- ہیپ — ارے نہیں لاحول ولا قوۃ — صرف چائے لاؤ۔"

تو حضور آمدم برسرِ مطلب - امیدوں کا ملجا و ماویٰ اب فقط صوفی رازداں رہ گئے تھے۔ وہ بھی مودودی صاحب سے بہت خفا ہیں۔

ملے مگر اس حال میں کہ اپنے دو نئے مریدوں کو کشفِ ارواح اور مراقبۂ باطن کے اسرار سمجھا رہے تھے۔ مجھے آتا دیکھا تو چہرے پر ناگواری کے آثار اُبھرے۔ میں ادب سے کونے میں جا بیٹھا اور تقریباً دس منٹ بعد انھوں نے ہر دو مرید کو رخصت کر دیا تو میری طرف متوجہ ہوئے۔

"صرف چند منٹ لوں گا صوفی صاحب" میں نے ان کے بگڑے ہوئے موڈ کی رعایت سے کہا "ایک آپ ہی پورے شہر میں مشکل کشا رہ گئے ہیں ورنہ ہرگز زحمت نہ دیتا —"

ان کے چہرے پر نور سا پھیل گیا۔ کڑے تیور ڈھیلے پڑ گئے۔

"فرمائیے کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

میں نے صدق جدید سامنے ڈال دیا۔

کوئی پانچ منٹ بعد وہ فرما رہے تھے:-

"مودودی کی یہی حرکتیں ہیں۔ اخبار کا تبصرہ بالکل برحق ہے۔"

"مگر قبلہ وہ نہیں مانتی۔ یعنی وہ میری بیوی —"

"کیا نہیں مانتی؟ —" وہ غرّائے۔

"وہ کہتی ہے کہ جو کچھ مودودی صاحب نے کہا ہے اس میں کسی پارٹی یا اس کے رکن کو مرتد اور کافر قرار دینے کا شائبہ تک نہیں — میں نے بہت سمجھایا کہ مودودی صاحب کی صفائی پیش کرنے والے جہنم میں جاتے ہیں مگر وہ منطق لڑا رہی ہے۔"

"آپ کی شادی غالباً تجلّی والوں میں ہوئی ہے؟" انھوں نے لفظِ تجلّی اس انداز سے کہا جیسے مینڈک چبا رہے ہوں۔

"جی ہاں یہی شامتِ اعمال ہے۔"

"پھر تو کوئی علاج نہیں۔ وہابیت کے جراثیم اس خاندان کی رگ رگ میں سمائے ہوئے ہیں۔"

"لیکن صوفی صاحب وہ جو غالب نے کہا ہے ناکہ "صحبتِ طالح ترا طالح کند" — تو رفتہ رفتہ میری کھوپڑی بھی گدھوں کی چراگاہ بنتی جا رہی ہے۔ اب دیکھیے نا لاکھ زور لگاتا ہوں کہ مودودی صاحب کے الفاظ سے ..."

"مودودی کو صاحب کہتے ہو" انھوں ناخوشگوار

لہجے میں ٹوکا۔

"سوری ـــ ویری سوری ـــ مگر صوفی صاحب یہ لفظ میں ایک اور معنی میں بولتا ہوں۔"

"کیسے معنی؟"

"جی ہاں ـــ وہ ... یعنی یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ "صاحب لوگ" فرنگیوں کے لئے بولتے ہیں ....

.. جی ہاں بس میں اسی معنی میں ...."

"اوہ ... ماشاء اللہ ..." وہ کھل اٹھے۔

"آپ جانتے ہی ہیں اِنّما الاعمالُ بالنّیات" میں نے فخر سے سینہ تان کر کہا "خیر تو میں عرض کر رہا تھا کہ خود مجھے بھی مودودی صاحب کے الفاظ میں تبصرے کی جسٹر نہیں مل رہی ہے۔"

"میاں صاف تو ہے کہ جماعت اسلامی حمایت نہیں کرے گی چاہے مسلم لیگی کتنا ہی دیندار ہو ـــ یہ گویا کفر و ارتداد کا فتویٰ تو ہے۔"

"بالکل ہے۔ مگر وہ ملّائن کی بچی بڑی طرار ہے۔ وہ کہے گی کہ پاکستان بننے سے پہلے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں ہی طرف بڑے بڑے علماء تھے۔ کانگریسی عالم کہتا تھا کانگریسی امیدوار کو ووٹ دو چاہے وہ ہندو، سکھ یا ناستک ہی کیوں نہ ہو ـــ ناستک سمجھتے ہیں نا آپ؟"

"ناستک ... شاید ایک ضلع کا نام ہے ـــ"

"جی وہ ناسک ہے ـــ ناستک ملحد کو کہتے ہیں۔ مسلم لیگی عالم کہتا تھا کہ کانگریسی امیدوار کو ووٹ مت دو چاہے وہ مولانا حسین احمدؒ ہی کیوں نہ ہوں ـــ ایک بہت بڑے کانگریسی قطب نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر خواجہ خضر بھی کانگریس کے نام پر ووٹ مانگیں گے تو ہم انھیں ٹھینگا دکھا دیں گے ـــ تو کیا یہ سب کفر و ارتداد ہی کے فتوے تھے؟"

"کن لوگوں کی مثال دیتے ہو ـــ ارے کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگوا تیلی۔ مودودی ایک تو پاکستانی ہے دوسرے بددین ہے تیسرے بچّہ ہے ...."

"بچہ ہے!" میں اس طرح اُچھلا جیسے سانپ کے پھن پر پیر پڑ گیا ہو۔

"اور کیا۔ ہم نے سنا ہے اس کی عمر مشکل سے تیس چالیس کی ہوگی ـــ"

"م مگر قبلہ ـ پچھلے سال تو آپ ہی کا فتویٰ ایک پوسٹر میں چھپا تھا کہ مودودی نے اخبار میں اپنی فوٹو دی ہے اس سے اس کی بددینی اور بھی نورٌ علیٰ نور ہوگئی۔"

"پھر؟"

"تو فوٹو تو آپ نے دیکھا ہوگا۔ اس میں ایک بالشت کی سفید داڑھی تھی۔"

"ارے داڑھی کا کیا ہے۔ یہ دلیپ کمار وغیرہ تو اکثر مصنوعی داڑھی لگا ... اخ .... ہپ .... وہ کیا ہوتا ہے نوچندی کا میلہ وہاں ہم نے خود مصنوعی داڑھی مونچھیں بکتی دیکھی ہیں ـــ"

یہ ریمارک اتنا ولولہ انگیز تھا کہ فرطِ بیخودی میں میرا ہاتھ ان کی داڑھی پر جا پہنچا اور جب تک وہ "کیا کرتے ہو کیا کرتے ہو" کا نعرہ لگائیں میں خاصی طاقت صرف کر کے اطمینان کر چکا تھا کہ کم سے کم ان کی داڑھی مصنوعی نہیں ہے۔ انھوں نے پاس رکھا ہوا عصا گھما کر میری کھوپڑی پر رسید کیا۔ یہ اگر سچ مچ نشانے پر جا پڑتا تو مجھے وصیت کی بھی مہلت نہ ملتی مگر وہ ہوا میں گھوم کر خود ان کے شانے پر پڑا اور ہائے کر کے وہ پیچھے کو اُلٹ گئے اب سوائے بھاگنے کے کیا چارہ تھا۔

رات کے کھانے پر دفعتاً ملّائن نے ایک بات چھیڑی۔

"آپ ایک دن کسی کتاب کے حوالے سے بتا رہے تھے کہ خارجی لوگ بے حد عابد زاہد تھے۔ مارے تقویٰ کے ان کے بدن سوکھ گئے تھے وغیرہ وغیرہ۔"

"ہاں ہاں تو پھر؟"

"مگر پھر بھی سب علماء انھیں مردود قرار دیتے ہیں"

"دینے دو ـــ یعنی؟"

"اس کا مطلب یہی تو ہوا کہ ایسی دینداری کا کوئی

مقام نہیں جس کا ڈھانچہ صحیح نظریات و عقائد کی سطح سے خالی ہو۔"

"اچھا تو تم مولانا مودودی کی وکالت کرو گی۔"!

"مولانا مودودی کی نہیں۔ سچائی اور انصاف کی۔ — یہ بات تو سو فیصدی بے بنیاد اور ہوائی ہے ہی کہ مولٰنا مودودی کے جس بیان کا تعلق رائی برابر بھی کفر و ارتداد کے فتوے سے نہیں تھا اسے مولانا دریابادی کی ستم ظریفی نے خواہ مخواہ بانس پر چڑھا دیا — میں کہتی ہوں بات بھی مولٰنا مودودی نے وہی کہی ہے جو دنیا کے تمام عقلاء کہتے آئے ہیں اور اسی پر ساری دنیا کا عمل ہے — کیا آج بھی جمعیۃ العلمأ کے بزرگ یہ نہیں کہتے پھرتے کہ کانگریس کا ساتھ دو کانگریسی امیدوار کی جھولی میں ووٹ ڈالو۔ انھیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ کانگریس کے بالمقابل جو شخص کھڑا ہونے والا ہے وہ ذاتی طور پر اچھا ہے یا برا۔ فاسق ہے یا عابد و زاہد۔ نہ اس سے کوئی مطلب ہے کہ کانگریس جن امیدواروں کو کھڑا کرے گی وہ نیک ہوں گے یا بد۔ مسلمان ہوں گے یا ہندو۔ خائن ہوں گے یا دیانت دار — وہ تو بس الاپے جاتے ہیں کہ کانگریس کے ہاتھ مضبوط کرو — اسکا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ فوقیت اصولوں کو دی جا رہی ہے۔ فوقیت کیا سب کچھ اصولوں ہی کو سمجھا رہا ہے۔ کانگریس چند اصول و نظریات ہی سے تو عبارت ہے۔ آپ کانگریسی امیدوار کے بالمقابل جنید و شبلی کو بھی قبروں سے نکال کر کھڑا کر دیں تو جمعیۃ العلماء کا بچہ بچہ یہی کہے گا کہ کانگریسی امیدوار کو جتاؤ۔ جنید و شبلی کو ہراؤ — ایسا بارہا ہوا ہے کہ کانگریسی امیدوار ذاتی حیثیت میں سوائے "جاندار" کے کچھ بھی نہ تھا اور مدِ مقابل ذاتی کردار اور اچھی شہرت کے اعتبار سے سب کچھ تھا مگر جمعیۃ العلماء کے کسی عالم کی بھی مثال آپ پیش نہیں کر سکتے کہ اس نے ان ذاتی حیثیتوں کا لحاظ کر کے اپنا موقف بدلا ہو — اور جمعیۃ العلماء ہی پر منحصر نہیں۔ دنیا میں ہر جگہ ہمیشہ یہی ہوا ہے اور یہی ہوگا کہ بنیادی فوقیت اصول و نظریات کو دی جائے گی اور اجتماعی تنظیموں کے لئے ذہنی ہم آہنگی تلاش کی جائے گی۔"

"محترمہ — معزز خاتون۔ آپ اپنے شوہر کو پاکستانی جاسوس ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہیں — مولٰنا مودودی کی حمایت میں یہ دھواں دھار تقریر شوہر اور بیوی دونوں کا بیڑہ غرق کر دے گی۔"

"ڈرے وہ جس کے دل میں چور ہو — میں پوچھتی ہوں یہ آخر بات کیا ہوتی کہ اگر مولٰنا مودودی اصولی اختلافات — عقائد کے اختلافات نہیں اصولوں کے اختلافات کی بناء پر کنونشن مسلم لیگ کی سیاسی حمایت نہ کرنے کا اعلان کرتے ہیں تو مولٰنا دریابادی نہ جانے کس ترنگ میں کفر و ارتداد اور ترکِ اسلام کا رونا لے بیٹھتے ہیں۔ کیا تُک ہوا۔ کیا جوڑ لگا — آخر کوئی توجیہہ تو کیجئے۔"

"ہمیں تو مولانا رحمانی اور صوفی رازداں دونوں نے یہی بتایا ہے کہ مولانا دریابادی کا تبصرہ برحق ہے اب کیا تم ان سے بھی زیادہ عقلمند ہو۔"

"یہ لوگ اس لائق ہیں کہ ان پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی جائے۔" اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ چہرہ لال بھبوکا ہو گیا تھا — "کنونشن مسلم لیگ چند اقتدار پرست اور طالع آزما لوگوں کی جماعت ہے۔ اگر اس کا کوئی رکن خیر سے زاہد و عابد بھی ہو تو اس سے اُس منزل میں کیا تبدیلی واقع ہو گی جس کی طرف اس کے اصول و نظریات سفر کر رہے ہیں۔"

"ضرور ہو گی۔ بزرگ لوگ عملیات وغیرہ جانتے ہیں جن اور ہمزاد بلکہ ہوائیں اور چاند سورج تک ان کے قبضے میں ہوتے ہیں۔"

"مولوی رحمانی سے بڑا یاوہ گو تو شاید ہی سو سو کوس کوئی نکلے۔ یہ اپنے گریبان میں منھ ڈال کر نہیں دیکھتے کہ برابر مولٰنا مودودی کی مخالفت میں زبان اور قلم چلاتے ہیں — کیوں؟ آخر کس لئے۔"

"خوشی ان کی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ جماعت اسلامی

کے نظریات وعقائد ابوجہل کے بلغم سے نکلے ہیں۔"

"جلنے نکلے ہوں گے۔ لیکن مطلب تو یہی ہوا کہ خود ان کے نزدیک بھی یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ مولانا مودودی یا جماعتِ اسلامی کا کوئی رکن کردار و عمل کے اعتبار سے کیسا ہے۔ جماعت کے اصول و نظریات ان کی دانست میں گمراہ کن ہیں تو مخالفت بھی ضرور کی جائے گی۔"

"وہ تو کی جائے گی۔ تمہارے پیٹ میں کیوں درد اٹھتا ہے۔"

"کاش کوئی مولانا دریابادی سے پوچھتا کہ سیاست کے دائرے میں جب کوئی جماعت کسی دوسری جماعت کی حمایت نہ کرنے کے سلسلے میں اصولی اختلافات کا حوالہ دیتی ہے تو اس سے بریلویوں والی بازاری تکفیر کا واہمہ تک بھی آخر کہاں پیدا ہوتا ہے۔ کیا مولانا مودودی نے یہ کہا ہے کہ ہمارا اختلاف توحید یا رسالت یا ایمان بالملائکہ جیسے عقائد میں ہے؟"

"کچھ بھی کہو مولانا دریابادی ایک مانے ہوئے مبصر ہیں۔ علامہ ہیں۔ وغیرہ وغیرہ ہیں۔"

"ضرور ہیں لیکن ہر شخص میں کچھ کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔ ارسطو کی کہانی آپ ہی نے سنائی تھی کہ ایک حسین لڑکی نے اسے گھوڑا بننے پر مجبور کر دیا تھا۔"

"کیا؟" میں غرغرایا۔

"بات کمزوری کی ہے۔ جس چیز نے ارسطو کو گھوڑا بنایا وہ لڑکی نہیں تھی وہ خود ارسطو کے اندر کی ایک کمزوری تھی۔ اگر آپ سنجیدگی سے غور کریں تو یہ نکتہ ضرور سمجھ سکیں گے کہ ایک بلند پایہ انسان ہونیکے باوجود مولانا دریابادی کے بعض تبصرے گڑبڑ کیوں ہوتے ہیں۔ ۔۔۔ مگر فضول ہے آپ سنجیدگی اختیار نہیں کر سکتے۔"

"میں اس وقت قطعاً سنجیدہ ہوں بلکہ رنجیدہ بھی ہوں کیونکہ مولانا دریابادی کا تبصرہ برحق ثابت نہ ہو سکا تو میرا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔"

"میرا تو کچھ اور خیال ہے۔" ملائن نے بلیغ انداز میں کہا "مولانا دریابادی کسی زمانے میں دہریئے بھی رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے وہ اسلام کی طرف لوٹ آئے اور اب ہرگز اس مردہ دہریت کے لئے ان پر طعن نہیں کیا جا سکتا لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ یہی مردہ دہریت ان کے دماغ کی کسی نس میں گرہ چھوڑ گئی ہو۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"آپ سوچیئے۔ وہ قادیانیوں تک کو مسلمان قرار دینے پر اصرار کرتے ہیں۔ انھیں غلام احمد پرویز تک کے کفر پر وثوق نہیں ہے۔ وہ اُن شیعوں تک کو مومن مانتے ہیں جن کے دین کا اہم تر اصول خلفائے ثلاثہ کو گالیاں دینا، اُمہات المومنین کی بے توقیری کرنا اور حضرت علیؓ کو خدا بتانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے تمام تر علم و فہم اور صالحیت کے باوجود ان کے تحت الشعور نے دین کے بنیادی عقائد کی وہ حقیقی اہمیت تسلیم نہیں کی ہے جو واقعتہً انکی ہے۔ بھیا نے ایک دن بتایا تھا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو اُس شخص کو بھی برملا کافر قرار دیتے تھے جو کسی مدعی نبوت سے دلیلِ نبوت طلب کرے اور دلیل معلوم کرنے سے قبل اس کے کذب میں شک کرتا ہو۔"

"بھیا کا ذکر رہنے دو ـــــ وہ تو قوالی کے بھی خلاف ہیں ـــــ"

"مزید ثبوت مولانا دریابادی کے اسی تبصرے میں موجود ہے۔" اس نے میری تعریض کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "وہ کہتے ہیں کہ ـــــ" اب تک تو یہی سنا تھا کہ مولانا مودودی کے ہاں معیارِ انتخاب صرف صالحیت ہے"۔ دیکھئے۔ یہاں بھی مولانا دریابادی کے تحت الشعور نے صالحیت کو عقائد و اصول سے الگ کر کے لیا۔ وہ تماش بینوں کی طرح صرف سطح دیکھ رہے ہیں۔ حالانکہ مولانا مودودی نے جب کبھی بھی "صالحیت" کو معیار قرار دیا ہے تو یہ صالحیت صرف داڑھی اور عمامے اور صوم وصلوٰۃ کی صالحیت نہیں تھی بلکہ وہ صالحیت تھی جو صحیح عقائد اور مضبوط اصولوں کی

کہ کہاں سے جنم لیتی ہے ۔"

"خدا رحم کرے ۔۔۔ مجھے ڈر ہے کہیں تم جنس نہ بدل لو یہ خشک اور پیچیدہ باتیں نسوانیت سے بھلا کیا رابطہ رکھتی ہیں ۔"

"مذاق اڑائے جائیے مگر میں آپ کے دماغ سے مرعوبیت کے کیڑے نکال کر دم لوں گی ۔ اور لیجئے ایک تازہ ترین مثال، کراچی کے فاران نے رسالہ "خاتونِ پاکستان" کے رسول نمبر پر تبصرہ کرتے ہوئے ہلکی سی حیرت اس بات پر ظاہر کی تھی کہ اس میں غلام احمد قادیانی اور غلام احمد پرویز دونوں کے مضامین نظم و نثر موجود ہیں ۔ اس پر ۲۰ ستمبر کے صدق میں مولانا دریابادی بالکل بے محل طور پر مَن قال اور ما قال کی منطق پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہمیں تو اگر بالفرض ابوجہل و ابولہب کی بھی کہی ہوئی نعت ہاتھ لگ جاتی تو فخر و مسرت سے چھاپ دیتے ۔"

"بات تو پتے کی ہے ۔" میں نے ہانک لگائی ۔

"پتے کی ضرور ہے مگر کیا پتہ لگا ۔ یہی نا کہ ذہنی کفر و نفاق سے مولانا کو کوئی استکراہ نہیں ۔ اسلام کے بنیادی معتقدات سے ان کا کوئی گہرا جذباتی رشتہ نہیں ۔ وہ ابوجہل بولہب کی کہی ہوئی نعت کو سر آنکھوں پر لینے کے لئے تیار ہیں حالانکہ ایک زندہ ضمیر اور صحت مند شعور منافقت کی آہٹ تک سے کانپ اٹھتا ہے ۔ میں نہیں سمجھتی اگر مولانا کے نزدیک ہر موقعے پر یہی اصول درست ہے کہ نظر قول پر رہے نہ کہ قائل پر تو پھر وہ ان قرآنی آیات کے بارے میں کیا کہیں گے جن میں نکیر کی گئی ہے کہ اے لوگو ایسی باتیں کیوں کہتے ہو جن پر تم عامل نہیں ہو ۔"

"بابا معاف کرو ۔۔۔ تم نے تو دماغ کا چھوارا بنا دیا ۔ سمجھ میں نہیں آتا تم ایک آدھ تبصرے کو کیوں لے بیٹھتی ہو ۔ صدق میں تو ہر ہفتے دسیوں تبصرے چھپتے ہیں ۔ کیا وہ مولانا دریابادی کی بالغ نظری، دینی حمیت، ژرف نگاہی اور حق پسندی کے شاہکار نہیں ہوتے ۔"

"ہوتے ہیں ۔ میں بڑے شوق سے انھیں پڑھتی ہوں ۔ م مگر ۔۔۔ چلئے چھوڑئیے ۔"

"نہیں کہہ ڈالو ۔۔۔ مگر کیا ؟"

"بہتر سے بہتر مشین کا بھی ایک آدھ پینچ ڈھیلا رہ سکتا ہے ۔۔۔ یا پھر یوں سمجھئے ان کی دنیائے فکر میں عقل و فراست کے بے شمار قمقمے جل رہے ہیں لیکن چند گوشے ایسے بھی ہیں جن کے بلب فیوز ہوگئے ہیں ۔"

"مرتد ہو جاؤ گی ۔ ایسی گستاخانہ باتیں کرتی ہو ۔ اچھا بس ختم ۔۔۔۔ نہ نہ اب ایک لفظ نہیں ۔ سارے مولوی جائیں جہنم میں یہ لڑتے ہی رہیں گے ۔"

(ملا زادہ صحبت باقی)

"دعوت اتحاد"

مرزا رسول بیگ ندیال

قوموں کے عروج و ترقی کا زیادہ تر انحصار افراد کے باہمی اتحاد و اتفاق پر ہوتا ہے کوئی قوم اُس وقت تک دنیا میں سربلند و سرخرو نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے تمام افراد ایک ہی شیرازے میں منسلک نہ ہو جائیں۔ ایک جسم ایک باڈی نہ بن جائیں تاریخ کے عمیق مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قوموں اور ملتوں کے زوال و تنزل کا راز ان کے اپنے افراد کے باہمی نفاق اور انتشار فکر و عمل ہی میں مضمر رہا ہے روئے زمین پر کئی قومیں اور کئی ملتیں اُبھریں اور اوج کمال پر جا پہنچیں لیکن عدم اتحاد اور جاہلی عصبیت کی بنا پر جلد ہی ہلاک اور فنا ہوتی چلی گئیں یہی وجہ ہے کہ ہمیں قرآن بار بار اتحاد باہمی کی اہمیت و ضرورت پر زور دیتا ہے اور خبردار کرتا ہے کہ۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا ؕ

تم سب ملکر اللہ کی رسی کو مضبوط تھامے رہو اور آپس میں متفرق نہ ہو جاؤ اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد رکھو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اُس نے تمہارے دلوں میں باہمی الفت پیدا کر دی اور تم اُسکی نعمت (اسلام) کی بدولت بھائی بھائی بن گئے تم (آپس کی عصبیت کی بدولت) آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا۔

اسلام جس قدر اتحادِ باہمی کی اہمیت و ضرورت پر زور دیتا ہے اس کی نظیر دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملتی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ فرائض کے علاوہ اخلاقی تعلیمات میں بھی اتحاد باہمی کو خصوصی طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً غریبوں اور مفلسوں سے محبت یتیموں اور لاوارثوں پر شفقت، اعزہ و اقربا سے مروّت، مظلوموں اور بیکسوں کی اعانت وغیرہ۔ اسلام کا کوئی فریضہ کوئی تعلیم اور کوئی ہدایت ایسی نہیں جس میں اتحاد باہمی کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو یہ خصوصی امتیاز صرف اسلام ہی کو حاصل ہے لیکن اس کے باوجود امت مسلمہ کی یہ سب سے بڑی ٹریجڈی ہے کہ اپنی تاریخ کے ابتدائی دور ہی میں نفاق و اختلاف کا شکار ہو گئی اس کی زندگی میں کئی انقلاب آئے گو ناگوں مضرات وقوع پذیر ہوئے اور امت مسلسل نزاعات باہمی کا تختۂ مشق بنی رہی ہزاروں گمراہ ہوتے رہے لاکھوں نے اپنی عاقبت برباد کر لی اور امت کا شیرازہ پارہ پارہ ہو کر رہ گیا۔

تاریخ کے غائر مطالعہ سے ہمیں اس نفاق اور نزاع باہمی کے دو وجوہ نظر آتے ہیں اولاً یہ کہ تاریخ کے دوران جب کبھی کفر اسلام سے کھلکر برسرپیکار ہوتا تھا تو تمام اُمت متحد ہو کر اس سے ٹکرا جاتی تھی لیکن تاریخ گواہ ہے کہ جب وہی کفر حق صداقت کا لبادہ اوڑھ کر آیا تو اُمت اس کے دام فریب میں یوں آگئی ہے جیسے ایک بھولی چڑیا کسی صیاد کے جال میں۔ ابتدا سے دشمن کا یہ وہ حربہ رہا ہے جس سے آج تک امت اپنے آپ کو بچا نہ سکی اور مسلسل نفاق و اختلاف کا شکار ہوتی رہی۔

ثانیاً یہ کہ قلتِ علمی کے باعث امت مسلمہ کی اکثریت فروعات و محکمات کے فرق و امتیاز سے ہمیشہ قاصر رہی۔ یہی سبب تھا کہ جب کبھی مذہب کے سربراہ جزوی و فروعی اختلافات کی بنا پر دو فرقوں میں بٹ جاتے تو یہ نادان اُمت

ان فروعی اختلافات کو اصول و محکمات کا اختلاف سمجھ لیتی اور تقلیداً یہ بھی دو فرقوں میں بٹ جاتی اس کے بعد ایک فرقہ دوسرے فرقے کی نظر میں خارج از دین اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے دشمن جاں ہو جاتا تھا۔ تلواریں حرکت میں آجاتیں اور زبانیں شتر بے مہار بن جاتیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ساری اُمّت مخالفت اور باہمی نزاع کی طوفانی زد میں آجاتی اور سیلاب انتشار میں یوں بہہ جاتی کہ ـــــ اسکا دین وایمان ہرطرح خطروں میں گھر جاتا۔ واقعی یہ امت اپنی تاریخ میں جس قدر جری ثابت ہوئی ہے اُسی قدر نادان بھی واقع ہوئی ہے

ماضی کا کوئی دور ایسا نہیں گذرا جس میں یہ ستائی نہ گئی ہو۔ اس کی تاریخ کیا ہے ایک پر درد افسانہ ہے سراپائے رنج والم ہے۔ مجسّمۂ آہ وفغاں ہے اسے کہیں خارجیوں نے فریب دیا ہے تو کہیں معتزلیوں نے۔ کہیں خلافتی فتنوں نے دھوکا دیا ہے تو کہیں شیعہ وسنی اختلافات نے کہیں مسئلہ خلق قرآن نے اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا تو کہیں سلاطین لعنا اور قاہر وجابر خلفاء نے۔ کہیں صوفی کے فلسفۂ تصوف نے اسے شریعت کا باغی بنادیا تو کہیں انکار حدیث کے مغالطے نے کہیں لیگ وکانگریس کے پرفریب نعروں نے اسے بہکا دیا تو کہیں بریلوی و دیوبندی اختلافات نے اور آج مسلمان (اسلامی وتبلیغی) جماعتوں کی رسّہ کشی میں بُری طرح آگئے ہیں۔ ایک دوسرے سے بیگانے اور پرائے ہوتے جارہے ہیں مسلمانوں کی اس حالت زار پہ ایک دردمند دل پھٹنے لگتا ہے اور آنسو اُمنڈ آتے ہیں۔ کاش یہ لڑنیوالے جانتے کہ ان فروعی اختلافات کے باوجود ہم سب ایک ہیں ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں ہیں ایک ہی ساز کے مختلف نغمے ہیں اور ایک ہی اصل کے مختلف کھلونے ہیں اور ایک ہی منزل کی سمت رواں دواں مختلف کارواں، اور کاش یہ جانتے کہ ہمیں ایک دوسرے سے دست وگریبان ہونا نہیں بلکہ دست وبازو بننا ہے ایک دوسرے کے لئے سبب تکلیف وضرر نہیں بلکہ باعث خیر وعافیت بننا ہے۔

لیکن افسوس کہ آج ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ آج مذہب کے سربراہ ماضی کی طرح پھر ایک بار جزوی وفروعی اختلافات کی بنا پر دو طبقوں میں منقسم ہو چکے ہیں اور عامۃ المسلمین فروعات ومحکمات کی تفریق سے قاصر تقلیداً یہ بھی اپنے آپ کو دو طبقوں میں تقسیم کر چکے ہیں۔

ایک طبقہ دوسرے طبقے کے خلاف محاذ قائم کر رہا ہے محض علمی تعصب اور جماعتی عصبیت کی بنا پر کفر والحاد کے فتوے جاری ہو رہے ہیں اسلامی اخوت وبھائی چارگی کا ہمہ گیر جذبہ محض جماعتی دائروں تک ہی تنگ ہو کر رہ گیا ہے کبھی دعوت دین کی طرف دیجاتی تھی لیکن آج جماعتوں کی طرف دی جارہی ہے کبھی اسلامی دائرے کا پھیلاؤ مقصد وجود اور حاصل زندگی تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن آج ممبروں کی کثرت ہی سب کچھ سمجھی جارہی ہے اور کبھی وعظ ونصیحت کا مقصد اشاعتِ دین ہوتا تھا۔ لیکن آج عموماً ہر تقریر، ہر تحریر، ہر خطاب اور ہر اجتماع کی تہہ میں اشاعت جماعت پنہاں ہوتی ہے حتّٰی کہ ہر انفرادی ملاقاتیں بھی جماعتی خود غرضیوں کے اثرات سے خالی نہیں ہوتیں

یہ طرز ٹھیک ان دوا فروشوں جیسا ہے جو اپنی بے اثر اور غیر منفعت بخش ادویات کو مقبول عام بنانے کی خاطر خوبصورت، پھبے دار باتوں اور دیدہ زیب پیکنگ کا سہارا لیتے ہیں۔ ابتداً ان کی دوائیں بک جاتی ہیں لیکن کچھ عرصہ بعد جب اُن ادویات کی حقیقت فاش ہو کر عوام میں ان کی قدر گرنے لگتی ہے تو اُس کیساتھ ساتھ لیبل کی قدر بھی لازماً گر جاتی ہے۔ اور آخر کار ایک وہ دن بھی آجاتا ہے کہ جہاں پر وہی لیبل عوام کی نظروں میں "نشانِ شوم" بن کر رہ جاتا ہے۔

لہذا میں جماعتوں کے متعلقین اصحاب قلم، خطیب واعظین اور مقررین سے پُرخلوص گذارش کروں گا کہ اپنی خدا داد صلاحیتوں کو تشریح واحیائے دین کی خاطر استعمال کریں اسلام کو جماعتوں کے قیام واستحکام کی خاطر استعمال کرنے کی پالیسی ترک کر دیں۔ یہ روش انتہائی خطرناک ہے نعوذ باللہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ ان جماعتوں کے غلبے پر

مستقل عنوان نقد و تبصرے

(تبصرے کیلئے ہر کتاب کی ۲ جلدیں آنی ضروری ہیں)

کھرے کھوٹے

روح القرآن | مترجم:- آچاریہ ونوبا بھاوے ● لکھائی چھپائی عکسی۔ صفحات ۳۸۴۔ قیمت مجلد چار روپے
● شائع کردہ:- اکھل بھارت سروسیوا سنگھ۔ راج گھاٹ۔

بھودان تحریک کے مشہور قائد آچاریہ ونوبا بھاوے کی محترم شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے آپ ان معدودے چند لیڈروں میں سے ہیں جن پر کسی نہ کسی درجے میں مصلح کا اطلاق ہوسکتا ہے اور جن کے قلب و دماغ کی محرابوں پر ابھی اخلاق و روحانیت کے چراغ بجھے نہیں ہیں۔ یہ بہت غنیمت ہے کہ دین و مذہب کی جو دیواریں مادہ پرستانہ فکر و تہذیب کے روز افزوں سیلِ تند میں ایک ایک کرکے بیٹھتی جارہی ہیں انھیں سہارا دینے والے چند افراد تو موجود رہیں۔ گو یہ سہارے بہت کمزور ہیں لیکن ان کے دم سے کچھ نہ کچھ فریب تسلی کا سامان تو بہرحال رہے گا۔

روح القرآن کو ہم نے بڑے شوق سے پڑھا۔ کوئی شک نہیں آچاریہ جی نے کافی محنت کی ہے اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ایک لائق تحسین و تکریم کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ جس ماحول میں نفرت و انتقام کی گرم آندھیاں تیزی سے چل رہی ہوں اور کتنی ہی توپوں کے دہانے اسلام کی طرف کھلے ہوئے ہوں اکثریت ہی کے ایک بلند مرتبہ فرد نے دلوں کو جوڑنے کے مقصد سے اپنا قیمتی وقت اسلام اور قرآن کے مطالعہ پر صرف کیا پھر روح القرآن جیسی چیز پیش کردی۔ اس کتاب میں نہ صرف توحید، رسالت اور عقیدہ آخرت کی وضاحت کرنے والی آیات آگئی ہیں بلکہ اعمال صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کی تعلیم و ترغیب والا حصہ بھی معتد بہ مقدار میں موجود ہے۔ ایک سرسری نظر میں آچاریہ جی کو اس کتاب کی تدوین کے لئے دل کھول کر داد دی جاسکتی ہے۔

لیکن ذرا گہرائی میں اُتریئے تو کچھ اور بھی کہنا پڑے گا۔ ہمارا خیال ہے دلوں کو جوڑنے کے جس پاکیزہ مقصد سے انھوں نے یہ مشقت اُٹھائی ہے وہ کسی درجے میں بھی شاید ہی اس کتاب سے حاصل ہو۔ کتاب پڑھتے ہوئے ہم یہی فیصلہ نہیں کرپائے تھے کہ یہ مدوّن کن لوگوں کے لئے کی گئی ہے اور کون اس سے کس قسم کا فائدہ اُٹھاسکے گا۔ اسی دوران خود آچاریہ جی کا یہ بیان کسی اخبار میں نظر سے گذرا کہ روح القرآن غیر مسلموں کے لئے ترتیب دی گئی ہے تاکہ وہ اسلام سمجھیں اور مسلم و غیر مسلم ایک دوسرے کے قریب آئیں۔

مقصد یقیناً بڑا پاکیزہ ہے اور آچاریہ جی کے حسنِ نیت پر بھی شبہ کی ضرورت نہیں لیکن تعجب ہوتا ہے کہ ان جیسے دیدہ ور سے جس ژرف نگاہی، حکمت طرازی اور بالغ نظری کی توقع تھی اس کی جھلکیاں کم سے کم ہمیں تو روح القرآن میں خاطر خواہ حد تک نظر نہیں آئیں۔ باغ سے رنگ رنگ کے پھول بے شک انھوں نے چن لئے ہیں جس کے تعلق سے انکی کتاب کو سبدِ گل سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے، لیکن ان پھولوں سے کوئی ایسا گلدستہ یا ہار نہیں بنا سکے جس سے ان کے اصل مذاق اور ہنرمندی کا بھرپور مظاہرہ ہوسکتا۔ اور تو اور انھوں نے یہ بھی غور نہیں فرمایا کہ بے شمار تراجم انھوں نے ایسے دیئے

کا حقیقی مفہوم ومنشاء غیر مسلم قاری کی دسترس سے دور ہے گا۔ مثلاً لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ کا ترجمہ کیا ہے۔

"کوئی بوجھ ڈھونے والا کسی دوسرے کا بوجھ ڈھو نہیں سکتا۔"

اس سے قطع نظر کہ "ڈھو نہیں سکتا" ترجمہ غلط ہے کتنے زیرک ایسے ہو سکتے ہیں جو ٹھیک طور پر سمجھ پائیں کہ اس آیت میں قرآن نے کیا کہا ہے۔

یا مثلاً عنوان دیا گیا اَمَّنْ خَمْسَہ۔ غیر مسلم تو کجا مسلم عوام بھی اس پر چکرا کر ہی رہ جائیں گے۔ خصوصاً جب کہ پیش نظر ایڈیشن آیات کے بغیر صرف ترجمے ہی پر مشتمل ہے تو سوائے چیستاں کے اسے اور کیا سمجھا جائے گا۔

پوری کتاب میں بے شمار ایسے مقامات ہیں جن کے مطالعہ سے دو ہی نتیجے زیادہ متوقع ہیں یا تو قاری بے مزا ہو کر کتاب ایک طرف رکھ دے گا یا پھر اٹکل پچو مطالب اخذ کرے گا۔ یہ مقامات ضروری تفسیر کے متقاضی تھے۔ بہت ساری آیات کے تراجم پیش کرنے سے یہ کہیں بہتر تھا کہ تھوڑی آیات کا انتخاب کیا جاتا مگر ضروری توضیح بھی ساتھ ہوتی۔

اس کتاب میں ۹ حصے اور تینتیس۳۳ باب ہیں جنمیں ایکہزار۱۰۶۵ پینسٹھ آیات کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ ناشر کا کہنا ہے کہ عربی متن ابھی بلاک سازی کے مراحل سے گذر رہا ہے کتاب کی شدید مانگ کے پیش نظر فی الحال خالی ترجمہ چھاپ دیا گیا ہے۔ کتاب کے ملحقے پر ضمیمہ بھی ہے جس میں آیات کے مکمل حوالے درج کئے گئے ہیں۔

ناشر نے مقدمے میں لکھا ہے کہ:-

"پریس میں بھیجنے سے پہلے کتاب کا مسودہ بنارس کے دو عالموں، حضرت مولانا عبد العلیم صاحب نائب شیخ الجامعہ مظہر العلوم اور حضرت مولانا محمد حسن احسن مظہری صدر المدرسین مدرسہ چراغ علوم کی خدمت میں نظر ثانی کے لئے پیش کیا گیا۔ تعلیم وتعلم کی کئی مصروفیات کے باوجود ان حضرات نے پورے خلوص اور انتہائی توجہ کے ساتھ اس ترجمے کو جانچا۔ آخر میں کشمیر کے مشہور عالم دین حضرت مولانا محمد سعید صاحب مسعودی نے اپنی علالت کے باوجود اس پر نظر ثانی کی۔ ان حضرات نے مشورے بھی دیئے جن سے ہم نے بڑی حد تک فائدہ اٹھایا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب کو زیادہ سے زیادہ مفید اور بے عیب بنانے کی خاصی کوشش کی گئی ہے لیکن پھر بھی ہماری نظر کو اس میں قدم قدم پر لائق گرفت چیزیں نظر آرہی ہیں تو اس کے دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں۔ یا تو ان علمائے کرام نے مسودے کے جائزے پر خصوصی توجہ ہی نہیں دی بس رسماً تحسین وتوثیق فرما دی یا پھر انھوں نے اپنی نقد ونظر کی صلاحیتوں کو جگائے بغیر مطالعہ فرمایا۔

سب سے پہلی بات تو نام ہی کے متعلق کہنے کی تھی کہ "روح" کی بجائے لفظ "تعلیمات" زیادہ موزوں رہتا۔ جسم اور روح کے مابین قدر وقیمت کا جو فرق ہم سب کے ذہنوں میں پایا جاتا ہے ویسا کوئی فرق قرآنی آیات میں متصور نہیں۔ قرآن کی ہر آیت معنوی اعتبار سے دوسری ہر آیت کی ہم قیمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف ایک آیت کا انکار پورے قرآن کا انکار سمجھا گیا ہے۔

یہ لطیف بات اگر محترم علماء کو بروقت نہیں محسوس ہو سکی تھی تو کم سے کم یہ تو ضرور بتلا دینا چاہئے تھا کہ ایک لفظی اسلوب کی حیثیت سے اگر کسی آیت کو روح القرآن کہا جا سکتا ہے تو وہ وہی آیت ہے جسے اس کتاب میں نہیں لیا گیا۔

إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ	بلاشبہ دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔

اور اسی آیت کا تکملہ ہے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔	اور جس شخص نے اسلام کے سوا کسی اور دین کو لگائی وہ دین ہرگز قبول نہیں کیا جائیگا اور یہ شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والوں سے ہوگا۔

یہ دو آیات ظاہر ہے ایک ہی مفہوم کے دو مثبت و منفی اسلوب ہیں۔ اگر کسی مفہوم کا نام روحِ قرآن رکھا جا سکتا ہے تو یقیناً وہ یہی مفہوم ہے کیونکہ اس ایک مفہوم کو عقیدے کے خانے سے خارج کر دینے پر تمام تعلیمات اسلامیہ کی وہ حیثیت رہ جاتی ہے جو روح سے خالی جسم کی۔ معلوم نہیں کیوں آچاریہ جی نے اس "روح" کو نظر انداز کر دیا حالانکہ یہ دونوں آیتیں قرآن کے شروع ہی میں ہیں (آلِ عمران)

کتاب میں عنوانات کی وہ بھرمار ہے کہ طبیعت کُند ہو جاتی ہے۔ کتنے ہی عنوانات نہ صرف یہ کہ بے ضرورت ہیں بلکہ چسپاں بھی نہیں ہیں۔ کہیں کہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ آچاریہ جی نے تفکر کی زحمت ہی نہیں اُٹھائی۔ جیسے عنوان دیا گیا:۔

"پانچ طرح کا کام" ص ۳۲۹

اور زیرِ عنوان یہ ترجمہ دیا گیا:۔

(۱) اے نبی! بے شک ہم نے تم کو بھیجا ہے بتانے والا (شاہد) خوشخبری دینے والا اور ہوشیار کرنے والا بنا کر۔

(۲) اور اللہ کی طرف سے، اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر۔"

بس عنوان اور معنون ختم ہوا۔ کوئی بتلائے حساب کے کس قاعدے سے یہاں آچاریہ جی نے پانچ کام مشاہدہ فرمالئے ہماری ناقص فہم میں تو نہیں آیا کہ پانچ کام یہاں کونسے ہیں۔

بعض عنوانات میں آچاریہ جی نے قرآن کی بجائے اپنا ذاتی ذہن پیش کیا ہے۔ مثلاً:۔

"سرمایہ مسلمان نہ ہو سکا"

اس کی لفظی ہیئت کی ذمہ داری تو مترجم پر ڈالی جا سکتی ہے۔ اچاریہ جی نے عنوانات مراٹھی میں دیئے تھے جس کا اُردو ترجمہ جناب عبد القیوم صاحب کے تعاون سے شری اجیت دیش پانڈے نے کیا لیکن جو مدعا اس عنوان میں جھانک رہا ہے وہ ظاہر ہے اچاریہ جی ہی کا ہے۔ اس مدعا کو اسلام سے زیادہ کمیونزم سے جوہری ربط ہے۔

یا مثلاً عنوان ہے —— "ذخیرہ اندوزی حرام ہے"

یہ بھی غیر قرآنی طرزِ فکر کی تراوش ہے آچاریہ جی روحانی اقدار سے گہرا تعلق رکھنے کے باوجود بعض افکار میں خدا بیزار کمیونزم سے متأثر ہیں اور اسی تأثر کی ایک جھلک اس عنوان میں موجود ہے۔ ہر پڑھا لکھا شخص جانتا ہے کہ اسلام میں ذخیرہ اندوزی علی الاطلاق حرام نہیں ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ صفحہ ۱۹۴ پر یہ سرخی دی گئی ہے — "دین کے ارکان" لیکن اس ذیل میں صرف نماز، روزہ اور حج کا ذکر آیا۔ زکوٰۃ کا تذکرہ نہیں۔ حالانکہ قرآن کا مطالعہ کرنیوالے کا "قربانی" کو سہواً چھوڑ جانا تو ممکن بھی ہے مگر زکوٰۃ کو چھوڑ جانا ممکن نہیں ہے وہ تو اکثر جگہ صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ مذکور ہے۔

مزید لطیفہ یہ کہ اسی شاہ عنوان کے تحت ذیلی عنوان دیا گیا:۔

"کھانے میں اللہ کا نام"

اور دو آیتوں کا درج ذیل ترجمہ دے کر بات ختم کر دی گئی:۔

(۱) "پس اگر تم لوگ اللہ کی نشانیوں پر ایمان رکھتے ہو تو جس پر اللہ کا نام ذکر کیا گیا ہو اس میں سے کھاؤ"

(۲) "اور اس میں سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام ذکر نہ کیا گیا ہو"

کیا ہم یہاں آچاریہ جی کی نیت اور خلوص پر شک کرنے میں حق بجانب نہ ہوں گے؟ انھوں نے قصداً ترجمہ ایسا دیا ہے کہ ناواقف قاری کا ذہن "قربانی" اور ذبیحے کی طرف نہ جا سکے بلکہ وہ کھانے نہ کھانے کے مثبت و منفی کو عام کھانوں کے ساتھ منسوب کر لے۔ حالانکہ اچاریہ جی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان آیات کا تعلق جانوروں کے ذبیحے سے ہے۔ ناشر نے آغاز میں بتایا ہے کہ روح القرآن کی تدوین میں مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ کی تفسیر والا قرآن بھی سامنے رکھا گیا ہے تو پھر اس کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

سو تم تھا" اس جانور میں سے جس پر نام لیا گیا ہے اللہ کا"

کیا پھر بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ "ذبح" کو چھپا جانے میں آچاریہ جی مخلص ہیں! — ذبح کے سلسلے میں اچاریہ جی کے ذاتی خیالات کا علم اس تقریر سے بھی ہوتا ہے جو ابھی ۲ جون کو انھوں نے کلکتہ کے دیش بندھو پارک میں کی ہے اور جسے کلکتہ ناگرک سنگھ کی طرف سے پمفلٹ کی شکل میں چھاپا گیا ہے۔

صرف ایک جملہ :-

"ہندو اور مسلمان دونوں میں سے کوئی بھی دانائی کا ثبوت نہیں دے سکتا جب تک کہ وہ مذہب کے نام پر جانوروں کی قربانی سے دستبردار نہ ہو جائے"

مسلمان تو شاید اس دانائی کا ثبوت کبھی نہ دے سکیں لیکن اچاریہ جی نے بہر حال اس دانائی کا ثبوت بایں طور دے دیا ہے کہ پوری روح القرآن میں جانوروں کے "ذبح" کا ذکر آنے ہی نہیں دیا۔

کچھ عنوانات تو اس کتاب کے لفظاً یا مفہوماً غلط ہی ہیں جیسے — "ادخال بہ کتاب — ضیاءِ کتاب — بہترین ماہیت لو — پرندوں کی بھی امتیں — رضا جوئی میں خود فروشی — اہنسا پن — اہنسائی عقیدہ — برہمچاری یحییٰ — عدم سرقہ — قتل خمسہ۔

اس طرح کے عنوانات کو صاحبِ عنوان کی مادری زبان نہ ہونے کی رعایت سے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ لیکن جو کچھ عنوانات کے تحت دیا گیا ہے وہ بجائے خود قیمتی ہونے کے باوجود ایک حکیمانہ شیرازہ بندی اور ایک مستقیم بنیادی فکر سے تہی مایہ ہے اتنا بھی تو نہیں کیا گیا کہ جہاں توضیح و تفسیر کے بغیر مفہوم سمجھنا ممکن ہی نہیں تھا وہیں کوئی حاشیہ دیدیا جاتا۔ حد ہے کہ فَبِاَیِّ آلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَان کے ترجمے میں (پس تم دونوں اپنے پروردگار کے کن کن احسانات اور کرشمہ سازیوں سے مکرو گے) یہ تک نہیں بتایا گیا کہ "تم دونوں" کا خطاب کس سے ہے۔ حالانکہ سورۃ الرحمٰن کی جن چند آیات کے ترجمے پر مرتب نے اکتفا کیا ہے وہ بھی وہی ہیں کہ جن سے ذرا سا اشارہ تک اس بات کا نہیں ملتا کہ اللہ کا خطاب کن دو سے ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نیک خیالات کے باوجود اچاریہ جی نے روح القرآن کی ترتیب و تدوین کا کام شایانِ شان بیدار مغزی اور فراست و بصیرت کے ساتھ نہیں کیا ہے۔ نقائص اور بھی ہیں لیکن تبصرے کی تنگ دامانی استقصاء کی متحمل کہاں۔ کتابت و تصحیح کی غلطیاں بھی خاصی ہیں۔ حاصلِ تبصرہ یہ ہے کہ ہماری دانست میں روح القرآن اُن توقعات کو پورا نہیں کرتی جو حسنِ ظن رکھنے والے ہر ہوشمند کو آچاریہ ونوبا جی کی بلند، مشہور اور محترم ذات سے تھیں۔ تأسف اُن علماء پر بھی ہے جنھیں مسودہ دکھلا کر اصلاح کی خواہش کی گئی لیکن انھوں نے دانشورانہ اور بے لاگ مشورے نہیں دیئے۔

رکعات تراویح | مؤلفہ :- محدث شہیر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی۔

شائع کردہ :- جامعہ مفتاح العلوم۔ مئو ضلع اعظم گڑھ۔
صفحات ۱۰۰ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

ناظرین بھولے نہ ہوں گے کہ نہ صرف اس کتاب پر پہلے تبصرہ ہو چکا ہے بلکہ اس پر اہلِ حدیث دوستوں کی طرف سے جو لے دے ہوئی اس پر بھی اور جواب الجواب پر بھی تبصرہ ان صفحات میں آ چکا ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۷ء میں طبع ہوا تھا۔ دوسرا اب چھپا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ خاتمۂ کتاب پر ایک ضمیمہ شامل کیا گیا ہے جس میں عبدالباری صاحب قاسمی نے بعض اُن اعتراضات کا کامیاب جائزہ لیا ہے جو اہلِ حدیث دوستوں کی طرف سے کتاب پر کئے گئے تھے۔

سچ پوچھیے تو اب سے ایک سال پہلے تک ہم اپنی کم علمی اور قلّتِ مطالعہ کے باعث نہ تو مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کے بلند مرتبۂ و مقام سے پوری طرح واقف تھے نہ اہلِ حدیث بھائیوں کی مسلسل جارحیت سے۔ اس ایک سال کے مطالعہ نے ایک طرف ہمیں اس حقیقت کا شعور دیا کہ مولانا اعظمی فنِ حدیث میں قابلِ رشک براعت و مہارت کے سرمایہ دار

اور صرف ہند و پاک ہی کے نہیں دنیائے عرب کے ارباب بھی ان کے کمالِ تبحر کے معترف ہیں اور دوسری طرف یہ گاہی دی کہ احناف پر غیر منصفانہ اور مغالطہ آمیز نکتہ چینی کا جو سلسلہ امام بخاریؒ اور خطیب بغدادیؒ سے چلا تھا وہ صرف یہ کہ منقطع نہیں ہوا ہے بلکہ حال کے ڈیڑھ سو برسوں میں اسے خاصا نشو و نما دیا گیا ہے۔ یہ بحث بڑی ناخوشگوار ہے اس لئے بس اتنی ہی اشارت پر اکتفا کرتے ہوئے تبصرے کی طرف آنا موزوں ہوگا۔

احناف اور اہلِ حدیث کے مابین نزاعی مسائل میں رکعاتِ تراویح کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ اگر کوتاہ فہمی اور کم ظرفی دخیل نہ ہوتی تو نزاع کا پارہ اتنا نہ چڑھتا لیکن کم ظرفوں کے چھچھورے پن سے یہ نزاع بھی معرکہ کا نزاع بن گیا اور اب تو ہر سال معمول بن گیا ہے کہ رمضان سے قبل اس موضوع پر رنگ برنگے پوسٹر اور مضامین نظر آئیں اور دسیسہ کار ذہن اپنی سرگرمیوں سے تفرقے کی خلیج کو وسیع تر کرتے جائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ زیرِ تبصرہ کتاب ایسی ہی غوغا آرائیوں اور انتہا پسند جارحیتوں کا ایک نہایت سنجیدہ، ٹھوس اور بیش بہا علمی جواب ہے جسے پیش کر کے فاضل مؤلف نے ایک اہم فرضِ کفایہ ادا کیا ہے۔

مولانا اعظمی کا خداداد کمال یہ ہے کہ انتہائی دقیق و نازک نکاتِ فن کو بھی اس سلاست و بلاغت کے ساتھ سپردِ قلم فرماتے ہیں کہ ابہام اور ژولیدگی کے بغیر بات آئینہ ہو جاتی ہے۔ ان کی قوتِ حافظہ کا تو ہمیں علم نہیں لیکن ان کے رشحاتِ قلم میں فراست کا جو نور، جو گیرائی، جو عبور اور جو کامل دست رس پائی جاتی ہے اس سے خاتم المحدثین علامہ انور شاہ صاحب کاشمیریؒ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ وہی روشن دراست، وہی استحضار، وہی نگاہ کی جامعیت وہی تبحر اور وہی شانِ نقد۔ پہلے تبصرے کے وقت ہم کتاب کو پڑھ ہی چکے تھے، لیکن اب پھر لفظاً لفظاً پڑھا۔ اسی کے ساتھ وہ مصنفات بھی دوبارہ دیکھے جو اس کتاب کے تعقب میں اہلِ حدیث بزرگوں کی طرف سے شائع ہوئے ہیں۔ کیا کہئے کہ کیا نتیجہ نکلا۔ مختصر پیرائے میں اس نتیجے کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ فقہِ حنفی کی رفعت و برتری کے بارے میں جو وثوق ہمیں تھا وہ اور گہرا ہو گیا اور دونوں فریقوں کے اختلافات کی جو بنیادی وجہ ہم مدت ہوئی تشخیص کر چکے ہیں اسے تائید مزید حاصل ہوئی۔ بنیادی وجہ قدرے اجمال کے ساتھ تو پہلے بھی ہماری کسی نہ کسی تحریر میں مذکور ہو چکی ہے۔ آج "تکلف برطرف" کے انداز میں اسے صاف ہی بیان کر دیں تو کیا مضائقہ ہے۔ سُنئے۔ ہمیں یقین ہے کہ احناف اور اہلحدیث دونوں کا فکری مصدر و مبنیٰ ایک ہی ہے۔ دونوں صراطِ مستقیم کے راہی اور خدا اور رسولؐ کے معاملہ میں یکسر مخلص ہیں۔ لیکن اختلافات کی وجہ ہے ذہنی صلاحیتوں کا قدرتی فرق۔ خدا سے لڑا تو نہیں جا سکتا کہ اس نے ذہانت و فراست اور ذہنی صلاحیتوں کو متعدد مراتب و مدارج میں کیوں بانٹ دیا۔ ذہین ابوذر غفاریؓ بھی تھے، ابو ہریرہؓ بھی تھے، ابو ایوب انصاریؓ بھی تھے لیکن کیا یہ ذہنی تنور اور فکری مناہج کے اعتبار سے حضرت عمرؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم کی صف میں آسکے؟ — امام ابو حنیفہؒ ساری زندگی حدیث و قرآن کے غائر مطالعے میں کھپا دیتے پھر بھی امامِ اعظم نہ بن سکتے اگر ان کے کاسۂ سر میں خطیب بغدادیؒ یا حافظ سیوطیؒ یا علامہ سبکیؒ جیسا داغ ہوتا۔ جہاز چار سو اور چھ سو میل فی گھنٹہ بھی اڑتے ہیں۔ بے شک یہ رفتار ریل اور موٹر کی رفتار سے بہت زیادہ ہے۔ انھیں آپ سائنس کی ایک قیمتی صنعت کہہ سکتے ہیں لیکن ان کی مشینری کو بھلا ان خلائی جہازوں کی مشینری سے کیا نسبت جو ایک گھنٹے میں بیس بائیس ہزار میل کا فاصلہ طے کر جاتے ہیں۔

ان امثلہ کی روشنی میں اہلِ حدیث کے فکری مدارک اور احناف کے فکری مناہج کے فرق کو سمجھ لیا جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ اہلِ حدیث کی کوتاہ اندیشیاں ارادی اور اختیاری نہیں بلکہ فطری اور اضطراری ہیں۔ انھیں قلتِ علم نے نہیں قلتِ فراست نے مارا۔ وہ گمراہ نہیں بلکہ

ہیں۔ ایک سو میل فی گھنٹہ اُڑنے والے طیارے کے انجن میں یہ صلاحیت کہاں کہ گھنٹے بھر میں دو ہزار میل کی خبر لائے۔ بے شک اہل حدیث حضرات میں خاصے ذہین افراد بھی ہوئے ہیں اور غالباً آج بھی ہیں۔ انکے خلوص، للّٰہیت، علم و مطالعے کی کثرت اور ذوقِ بندگی سے بھی علی الاطلاق انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے بعض افراد سے ہمیں بڑی عقیدت و محبت بھی ہے، لیکن اس مشیتِ ایزدی کو کیا کہیں کہ خالقِ کائنات نے ذہانت و فراست کا جو خاص الخاص نور اپنے ایک بندے ابوحنیفہؒ کو ودیعت کیا تھا وہ کچھ اور ہی تھا۔ اس کے تنوّر اور قوتِ نفوذ کے لئے کوئی بھرپور لفظ ہمیں لغت میں نہیں ملتا مجبوراً ہمیں جیٹ طیاروں کی مثال سے کام چلانا ہوگا۔ ابوحنیفہؒ کی فرید و وحید ذہانت سماءِ فکر میں اُس خلا پیما جہاز کی مانند تھی جو زمین کی کشش کا سینہ چیر کر آسمانوں سے باتیں کرتا ہے۔ پھر جس طرح اس فلک سیر جہاز کا ہر پرزہ نسبتاً خصوصیت کا حامل ہوتا ہے اسی طرح ابوحنیفہؒ کو بھی اللہ نے خصوصی معاون عطا فرمائے تھے۔ اس کے برخلاف فکر و تفقہ کے دوسرے ائمہ کی ذہانت و فراست یہ حیثیت نہیں پا سکی امام بخاریؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ۔ یہاں تک کہ وہ ابن تیمیہؒ بھی جنھیں ہم ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے بڑے پائے کا انسان سمجھتے ہیں کششِ زمین کی حدوں ہی میں رہے۔ انھیں جیٹ اور مگ طیاروں کا نام دے لیجئے۔ جیٹ اور مگ بھی سائنس کے شاہکاروں ہی میں شامل ہیں مگر اپنی تمام خوبیوں کے باوجود یہ کششِ ارضی کی حدیں پھلانگنے پر قادر نہیں۔ ابوحنیفہؒ تفقہ کا سوئمبر تھے۔ ان کی دینی بصیرت و فراست مقابلے سے بالاتر ہے۔ جس طرح تمام انبیاء و رسل کی عظمت و تقدیس پر دل سے ایمان رکھنے کے باوجود ہم خاتم الرسل محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو خیر الوریٰ، سید الانس والجن، خلاصۂ کائنات، شاہکارِ تخلیق اور لاثانی کہنے میں خود کو حق بجانب تصور کرتے ہیں اسی طرح تمام محدثین و فقہاء اور ائمہ و فضلاء کی عظمت و منزلت کا تہہِ دل سے اعتراف کرنے کے باوجود امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کو سید الفقہاء، امام المفکرین، زبدۃ المتفقہین اور بصیرتِ دینی میں فرید و وحید کہنے میں خود کو حق بجانب خیال کرتے ہیں۔ ان کی اس مخصوص حیثیت کو چیلنج یا تو جاہل اور متعصب کر سکتا ہے یا پھر وہ لوگ جو ان کے مدارکِ فکر کی بلندیوں تک پہنچنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ والحمد للّٰہ رب العٰلمین۔

یہ ہے ہماری بنیادی تشخیص۔ ظاہر ہے اہلحدیث بھائی اسے نہیں مانیں گے لیکن کسی کے ماننے نہ ماننے سے حقائق نہیں بدلا کرتے۔ جس کا جی چاہے ایک معمولی سے نمونے کے طور پر زیرِ تبصرہ کتاب غور سے پڑھ لے اور پھر ان تحریروں کو پڑھے جن میں اس کے رد کی سعی کی گئی ہے اسے یہی محسوس ہوگا کہ اہل حدیث تو اُس غوّاص جیسے ہیں جو پانی کے اندر اُبھری ہوئی ایک چٹان کو سمندر کی تہہ سمجھ بیٹھا ہے لیکن احناف اس غوّاص کی مانند ہیں جو سمندر کو اس کی آخری گہرائی تک ناپ ڈالنے کی تاب و تواں رکھتا ہے۔

خلاصۂ تبصرہ یہ کہ رکعاتِ تراویح کی تعداد کے موضوع پر امامِ عصر مولانا اعظمی کی تالیف رکعاتِ تراویح ایک بیش بہا کتاب ہے جس کے رد میں لکھی گئی تحریریں ہم ایسے کم علموں کو تو کسی درجے میں خوشنما نظر آ سکتی ہیں لیکن ٹھوس اور گہرا علم رکھنے والے ـــــ بشرطیکہ علم کو سہارنے والا مضبوط دماغ بھی ان کے پاس ہو انشاء اللہ یہی کہیں گے کہ مولانا اعظمی نے مسلکِ حنفی کے احقاق کا حق ادا کر دیا ہے اور فقہ حنفی کو جو گہرا، قوی اور جوہری ربط قرآن و سنت سے ہے وہ کسی بھی دوسرے مسلک کو میسّر نہیں۔ ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء۔

ناشکری ہوگی اگر ہم یہ نہ کہیں کہ رکعاتِ تراویح کے طالبعلمانہ مطالعے نے ہمیں نہ صرف براہِ راست علمی فائدہ پہنچایا ہے بلکہ اس کے طفیل ہمیں اور بھی بہت کچھ پڑھنے اور سمجھنے کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔ کاش مولانا

اعظمی قریب ہوتے تو ہم ان سے بہت کچھ سیکھتے۔ آس پاس اونچی دکان والے تو بہت ہیں مگر علم و تفقہ کی ایسی کانیں اب نایاب ہوتی جا رہی جن کا پکوان پھیکا نہ ہو۔ ہمارا تو خیال یہ ہے کہ اب بہ نرمانہ ہم جیسے نام کے علامہ تو ضرور پیدا کرے گا، شمس العلماء، حکیم الاسلام، ارسطوئے دوراں اور مٹی کے بقراط بھی ضرور جنم لیتے ہی رہیں گے لیکن انور شاہؒ، شبیر احمد عثمانیؒ، حبیب الرحمٰن الاعظمی اور مولانا مودودی جیسے لوگوں کی مسند نہ جانے کب تک خالی رہے گی۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا "ان کے" بعد

(مولانا اعظمی اور مولانا مودودی ہمیں معاف فرمائیں کہ ان دونوں کی حد تک یہ شعر مستقبل کی بکار ہے حال کی نہیں!)

قاموس القرآن

مرتبہ:۔ قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی۔

شائع کردہ:۔ مکتبہ علمیہ۔ قاضی منزل۔ میرٹھ۔

صفحات ۳۰۸۔ طباعت متوسط۔ کتابت معیاری۔ کاغذ سفید۔ جلد بندی باسلیقہ۔ قیمت نو روپے۔

اس کتاب پر ہم نے ۱۹۵۷ء میں تبصرہ کیا تھا۔ اگر اسی تبصرے کو جوں کا توں ہم نقل کر دیتے تب بھی کوئی مضائقہ نہ تھا، لیکن کتاب کی شانِ رفیع کا تقاضا ہے کہ ایک بار پھر تبصرہ لکھ کر قدردانی کا ثبوت کیا جائے۔

لغت کی خشک وادی میں قدم زن ہونا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ اس کے لئے ایک خاص طرح کی طبعی مناسبت بھی ضروری ہے۔ الحمد للہ کہ یہ طبعی مناسبت مولانا زین العابدین میں کما حقہٗ پائی جاتی ہے جس کا مظاہرہ قاموس القرآن سے قبل بیان اللسان جیسی نفیس ڈکشنری میں ہو چکا ہے۔

قاموس القرآن، قرآن کریم کے الفاظ و معانی کی وضاحت و تحقیق پر مشتمل ہے اور جہاں تک ہم جیسا ناطلب

اس کے جستہ جستہ مطالعے سے سمجھ سکا ہے یہ بڑے ہی کام کی چیز ہے۔ فاضل مرتب نے بڑی عرق ریزی اور بیدار ذہنی کے ساتھ قدیم و جدید ائمۂ زبان و لغت سے استفادہ کر کے نہ صرف الفاظ کے معانی دیئے ہیں بلکہ محل استعمال اور نحو و صرف کے تعلق سے پیدا ہونے والے ذیلی نکات و مباحث کو بھی خوش اسلوبی سے سمیٹا ہے۔ اس طرح قرآن کی یہ لغت صرف عوام کے ہی نہیں خواص کے بھی کام آنے والی شے بن گئی ہے۔ ہو سکتا ہے ہر انسانی کارنامے کی طرح اس میں بھی کچھ خامیاں اور فروگذاشتیں ہوں لیکن ان کی نشاندہی ہم جیسے اطفال مکتب کے بس کا روگ نہیں انھیں تو وہی کثیر العلم اور بالغ نظر علماء چیک کر سکتے ہیں جو عربی زبان و لغت کے ماہر ہوں۔ ہمارے اور قارئین کے اطمینان کے لئے تو بس اتنا ہی کافی ہے کہ اس کتاب کی تحسین متعدد اُن افاضل و اکابر نے کی ہے جن کی رائے پر پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً استاذِ محترم مولانا محمد اعزاز علیؒ کی تحسین جو عربی زبان، ادب اور لغت کی مہارت میں اپنے وقت کے یکتا استاد تھے۔ حق یہ ہے کہ ثقہ اکابر کی تقریظ و تحسین کے بعد کتاب کا ہمیں دوبارہ تبصرے کے لئے دینا فاضل مؤلف کی خوردنوازی اور قدر افزائی ہے۔ ہم کتاب کی افادیت کے پیش نظر مکتبہ تجلی کو مشورہ دے رہے ہیں کہ اسے اپنے ذخیرے میں ضرور شامل کرے۔ واللہ المیسر۔

انوار الباری اردو شرح صحیح البخاری

اثر کاوش:۔ مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری (فاضل دیوبند)

شائع کردہ:۔ مکتبہ ناشر العلوم۔ بجنور (یوپی)

صفحات ۲۰۸ سائز مثل تجلی۔ لکھائی چھپائی گوارا۔ قیمت ساڑھے تین روپے۔

صحیح بخاری کی اس بے نظیر اردو شرح کے مقدمے پر — جو بجائے خود ایک بسیط و وقیع تالیف سے کم نہ تھا — تبصرہ آ چکا ہے۔ للہ الحمد کہ آج اصل شرح کا حصہ اول بھی مطبوعہ شکل میں سامنے ہے۔ اصلاً تو یہ پوری شرح

خاتم المحدثین علامہ انور شاہ صاحب ہی کے افاضات علیہ پر مبنی ہے، لیکن حق تلفی ہوگی اگر ہم یہ نہ کہیں کہ شاگرد رشید مولانا احمد رضا نے استاد کی تقاریر کو منضبط اور مدون کرنے میں بطور خود بھی نہایت عرق ریزی اور کاوش کا ثبوت بہم پہنچایا ہے وہ صرف ناقل نہیں لائق تزئین کار بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ حیات دراز اور توفیق کثیر عطا فرمائے اگر بخاری کی یہ شرح اسی شان کے ساتھ ان کے ہاتھ تکمیل پا گئی تو بڑا کارنامہ ہوگا۔

امام بخاری بہت بڑے انسان تھے۔ ان کی صحیح بخاری کے کیا کہنے۔ پھر بخاری کے شہرۂ آفاق شارح حافظ ابن حجر عسقلانی بھی اپنے فن کے ممتاز امام ہوگئے ہیں لیکن مغالطوں اور غلط اندیشیوں کی رَو میں ان دونوں معظم ہستیوں نے ابوحنیفہ اور حنفیت پر جو ستم توڑے ہیں ان کی نشاندہی اور پھر جواب دہی علامہ انور شاہؒ جیسے اساطین ہی کا منصب ہوسکتا ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انتہائی اشتعال انگیز جارحیتوں اور متعصبانہ جانب داریوں کا تجزیہ بھی ایسے تحمل، ادب اور اکرام کے ساتھ کرتے ہیں کہ بایدو شاید۔

یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ امام بخاریؒ جیسے محسن امت کی بشری کمزوریوں کو ضرورۃً بے نقاب کرنے والی شرح بخاری کوئی فتنہ ہے۔ فتنہ تو جب تھا کہ حفظ مراتب کا لحاظ نہ رکھا جاتا۔ تقاضائے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ابوحنیفہؒ اور حنفیت کی طرف سے محققانہ دفاع وقت کی اہم ضرورت ہے۔ راقم الحروف کو بحیثیت ایڈیٹر نہ جانے کتنے ایسے خطوط پمفلٹ اور اشتہاروں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے جن سے یہ المناک صورتِ حال منکشف ہوتی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور حنفی فقہ کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں، کج فکریاں اور جہالتیں نہ صرف عام ہیں بلکہ معاندانہ پروپیگنڈوں کے ذریعے انھیں برابر فروغ دیا جارہا ہے۔ یہ سو فیصدی باطل اور لغویات تو کم و بیش نعرے کی شکل اختیار کر گئی ہے کہ ابو حنیفہؒ علم حدیث میں کوتاہ تھے۔ حتیٰ کہ جن بعض اہل علم سے اس صریح تحقیر کی توقع نہیں کی جاسکتی وہ بھی یہ کہنے میں نہیں چوکتے کہ فلاں حدیث کا علم ابوحنیفہؒ کو نہ ہوسکا ہوگا اسی لئے انھوں نے فلاں مسئلہ میں خلاف حدیث رائے قائم کی۔

حالانکہ گہری اور بے لاگ تحقیق بتاتی ہے کہ الزام دہی کی یہ معصوم سی شکل بھی یکسر دروغ ہی ہے۔ ابوحنیفہؒ کا تبحر فی الحدیث بے مثال رہا ہے اور روایت کے مغز تک پہنچنے اس کے مفہوم کو صحیح ترین جامہ پہنانے اور اس کے ضعف و قوت کو جانچنے میں صحابہؓ کے بعد ان کا کوئی حریف امت میں نہیں ہے۔ امام بخاریؒ پر خدا کی رحمت ہو انھوں نے ایک لاجواب کتاب صحیح بخاری مدوّن کرنے کے باوجود بعض ایسے راویوں کی روایتیں ضرور لیں جو تشیعت یا اعتزال سے متہم تھے اور ان ہی ایتوں سے اجتہاد و استنباط بھی کیا لیکن امام ابوحنیفہؒ نے کسی ایک بھی ایسی روایت کو اجتہاد کا مصدر و مبنی نہیں بنایا جسکے صوری یا معنوی ہیولیٰ پر ادنیٰ سا بھی داغ رہا ہو۔ کہا جاتا ہے امام بخاری علل حدیث کی واقفیت میں بے مثال تھے۔ بے شک تھے لیکن یہ دعویٰ ان کے ہم عصر محدثین اور ان کے بعد آنے والے ماہرین فن کے تعلق ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ رہے ابوحنیفہؒ تو وہ اس میدان میں بھی امام بخاری سے آگے ہی ہیں۔ وہ ایسے جوہری ہیں جو ملکۂ انتخاب میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ امام بخاریؒ کو شہنشاہ المحدثین کہئے، محسن امت کہئے، زہد و طاعت کا پیکر کہئے، مگر ابوحنیفہؒ کی بات ہی کچھ اور ہے۔ جیسے صحابہؓ میں صدیق اکبرؓ۔ عدیم المثال اور ناقابل مقابلہ اسی طرح غیر صحابہ میں ابوحنیفہؒ یگانہ اور تقابل سے بالاتر۔ وصف فراست میں تمثیل چاہو تو عمرؓ و علیؓ کی مثال لے لو۔ علیؓ بھی بہترین ذکاوت و فراست کے مالک تھے مگر عمرؓ کے نور فراست کا عالم کچھ اور ہی تھا۔

جاہلوں یا حاسدوں اور متعصبوں نے ابوحنیفہؒ پر عمل بالرائے یا غلو فی القیاس یا جہیت وارجاء یا

حدیث سے قلتِ آگاہی کے جو بھی الزامات لگائے ہیں وہ غلط در غلط ہیں لیکن ان کو شیوع اس لئے حاصل ہوا کہ ان کی ٹیڑھی بنیادوں میں سیسہ بدقسمتی سے امام بخاریؒ جیسے برگزیدہ حضرات نے بھرا تھا۔ حمیدی اور اسحاق بن راہویہ جیسے اساتذہ کی زہر افشانیوں نے امام بخاریؒ کے ذہن کو اتنا مسموم کر دیا کہ وہ ایسے بعض راویوں کی روایت تو قبول فرما لیتے ہیں جو ابو حنیفہؒ کے پیر بھی چھو لیں تو سعادتمند کہلائیں لیکن نہیں لیتے تو ابو حنیفہؒ کی روایت نہیں لیتے۔ الزام دیتے ہیں۔ طنز و طعن کرتے ہیں۔ حد ہے کہ اپنی تاریخ کبیر میں ابو حنیفہؒ کا تعارف ایک ایسے راندۂ امت کی حیثیت سے کراتے ہیں جس کی روایت اور رائے دونوں کو لوگوں نے کوڑے پر پھینک دیا ہو۔ کاش امام بخاریؒ دس پانچ صدی اور زندہ رہتے تب دیکھتے کہ جس چراغ پر انھوں نے تھوکا تھا اس کی سکون بخش روشنی کہاں سے کہاں پہنچی اور کیسے کیسے اولیاء و اتقیاء نے حنفیت کے آستانے پر سر ٹیک دیئے۔

دوسرا سبب غلط پروپگنڈے کی اشاعت کا یہ ہوا کہ احناف شایانِ شان دفاع سے ایک گونہ غافل رہے۔ بے شک متقدمین و متاخرین میں بہترین دفاع کرنے والے نایاب نہیں رہے۔ آج بھی بقیدِ حیات افاضل میں علامہ کوثری اور مولانا عبدالرشید نعمانی طال اللہ بقائہما کے نام نامی فخر سے لئے جا سکتے ہیں مگر ضرورت اس سے بھی زیادہ کی تھی۔ ضرورت اس کی تھی کہ دفاع کا جو مواد بالغ نظر علماء نے تحریراً اور تقریراً مہیا کیا تھا اسے بیش از بیش اشاعت دی جاتی۔ دنیا کی ہر وقیع زبان میں اس کے ترجمے ہوتے اور منظم طور پر خصوصی محنت کی جاتی ہماری جن کوتاہیوں نے شیعت کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا ہے کم و بیش ویسی ہی کوتاہیاں اور بے توفیقیاں حنفیت کے حریف کیمپ کی تقویت کا موجب بنی ہیں۔ بات کہاں سے کہاں پہنچی۔ انوار الباری، اردو

شرح بخاری کے بارے میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نہ صرف عوام اسے پڑھیں بلکہ اساتذہ بھی اس کا غائر مطالعہ فرمائیں یہ "گھر کی مرغی دال برابر" کا مصداق بن کر نہ رہ جانی چاہئے یہ غلط فہمی بھی نہ ہو کہ فاضل مؤلف نے اس میں امام بخاری کی تحقیر و توہین کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ العیاذ باللہ۔ کوئی بھی سچا حنفی امام بخاری جیسے محسنِ اعظم کی تحقیر کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ دیکھیں گے کہ شارح نے احترام و ادب کے تمام معیاری تقاضوں کو حتی الوسع ملحوظ رکھا ہے اور سوائے اسکے کہ مناسب مقامات پر پوری دیانت اور حق پسندی کیساتھ حنفیت کے اصلی خدوخال نمایاں کرنے کا فریضہ ضرور ادا کیا ہے اور کوئی چیز آپ ایسی نہیں پائیں گے جس سے یہ احساس ہو کہ صحیح بخاری کی عظمت و تقدیس کے بارے میں شارح کی عقیدت آپ سے کچھ پیچھے ہے۔ سچے احناف میں اگر دوسرے مکاتب فکر کے خلاف تعصب ہوتا تو ان کے مدرسوں میں بخاری، مشکوٰۃ اور شرح نووی جیسی مجلدات کو اتنی ناگزیر قسم کی اہمیت کبھی حاصل نہ ہوتی۔

شرح کے اس حصۂ اوّل میں ایمان و عمل کی بحث بسط کے ساتھ آگئی ہے۔ کاش مؤلف کے قلم میں سلاست، روانی اور نکھار کی کیفیت کچھ اور ہوتی۔ کہیں کہیں تو وہ شاید بھول ہی گئے ہیں کہ ان کے عام قاری کس استعداد کے ہونگے بے شک دقیق مباحث اور ٹھوس فنی نکات کو عام فہم انداز میں بیان کرنا کارے دارد ہے مگر محال نہیں آگے کے لئے ہم مؤلف کو زبان و انشاء کے پہلو پر مزید توجہ کا مشورہ دینگے یہ الفاظ پر بے شمار خط کھینچنے کی عادت بھی کچھ اچھی نہیں کہیں کہیں اس کی افادیت مسلّم ہے مگر بھرمار سے تو اس افادیت کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک اوسطاً نوے فی صد خطوط بے ضرورت کھینچے گئے ہیں۔ کتابت بس گوارا ہی ہے معیاری نہیں۔ کہیں کہیں طباعت کے نقص نے گوارا کو بھی ناگوار بنا دیا ہے۔

اس حصّے کے شروع اور آخر میں ناشر نے افاضلِ اکابر کی توصیفی خطوط بھی شامل کئے ہیں۔ ان کی بھی بڑی

اہمیت ہے لیکن مولانا ابوالوفا صاحب کے عالمانہ گرامی نامے کے بعض فقرے کچھ کھٹکے :-

"کیا مولوی اسمٰعیل دہلوی حنفی تھے، ان کے اقوال و افعال حنفیت کی ضد کے حامل نہیں؟" (ص۳۱)

اگر مراد شاہ اسمٰعیل شہیدؒ ہیں تو یہ اندازِ گفتگو سخت محلِ نظر ہے۔ اول تو شہید موصوف کی حنفیت کے قائل متعدد بلند پایہ علماء و صلحاء ہیں جن میں ایک نام شیخ وقت حضرت گنگوہیؒ کا بھی لیا جا سکتا ہے۔ دوسرے وہ حنفی نہ بھی ہوں تب بھی جس وصفِ خاص کے باعث انکا نام نہایت عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے اور لیا جانا چاہئیے وہ وصف گروہی لگاوٹوں سے بلند خالص دین سے مربوط ہے۔ اسکی ذرا سی بھی تحقیر اسلام کی ایک نہایت ارفع و اعلیٰ قدر اور ایک معظم ترین عقیدے کی تحقیر ہو گی۔ ایسی حنفیت سے الحذر جو ہر شخصیت اور اس کے اعلیٰ اوصاف کو اپنے ہی گروہی فیتے سے ناپنا چاہے۔

"ابن تیمیہؒ کے متعلق بھی آپ نے نرمی سے کام لیا ہے۔"

اس طرز ترغیب سے بھی ہمیں اتفاق نہیں۔ ابن تیمیہؒ جیسے عبقری اساطین کے لئے نرمی ہی ہم اخلاف کے لئے موزوں تر ہے۔ ہمیں اپنے اکابر سے جو اندازِ نظر ابن تیمیہؒ کے بارے میں پہنچا ہے اس کے کیف و کم کا اندازہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے ایک جملے سے ہو گا۔ ایک بار فرمایا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ علم و فراست کا سمندر تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس سمندر کی طغیانیوں نے کبھی کبھی کناروں کو بھی کاٹ دیا ہے۔ ایک بار فرمایا کہ شیخ الاسلام بحرِ مواج تھے۔ بحر میں جب طوفان آتا ہے تو پھر خس و خاشاک کے ساتھ بعض قیمتی چیزیں بھی بہہ جاتی ہیں۔

یہ الفاظ تو بالکلیہ ممدوح کے نہ ہوں گے مگر معانی انھی کے ہیں۔ کیسا معقول اور پیارا ہے یہ اندازِ نقد۔ ویسے بھی ہم اپنے علم کی حد تک ابن تیمیہؒ کو ائمۂ کرام کے بارے میں عموماً اور ابو حنیفہؒ کے بارے میں خصوصاً نجیب الطبع اور مرتبہ شناس پاتے ہیں۔ انھوں نے خطیب بغدادیؒ جیسے محدثین کی واہی روایتیں کبھی قبول نہیں کیں اور امام بخاریؒ کے اندازِ نظر کو بھی نہیں اپنایا۔ ان کے بعض تفردات کسی کے نزدیک قابلِ تردید ہی ہوں تب بھی یہ غلط ہو گا کہ ان کے رد میں شدت اختیار کی جائے۔

"شاہ ولی اللہؒ کے متعلق بھی بہت کم لکھا گیا۔ حنفی مذہب پر جتنی ان کی کاری ضربیں ہیں کچھ کم نہیں۔"

یہ بھی کچھ جچا نہیں۔ شاہ ولی اللہؒ کے اپنے مخصوص طرزِ تفقہ میں اگر کہیں حنفی مسالک سے انحراف یا اختلاف پایا جاتا ہے تو اسے "ضربِ کاری" کا نام دینا شاید مبالغہ ہو۔ وہ ایک درجے میں مجتہد تھے، انھیں حق تھا کہ اپنی ایک رائے رکھیں اور اپنے علم و بصیرت کو اپنے ہی انداز میں استعمال کریں۔ پھر ہم ایک ایسا دردمند عالم پاتے ہیں جو مختلف مکاتبِ فکر کی شدتِ اختلاف کو کم کرنے اور اعتدال پر لانے میں دل و جان سے کوشاں ہو۔ انھوں نے غالباً کسی بھی جگہ ابوحنیفہؒ کی تخفیف نہیں کی۔ ان کے فقہی دراسات سے اختلاف ممکن ہے لیکن انھیں جارح قرار دینا غالباً انصاف سے بعید ہو گا۔

ہاں یہ ضرور ہم کہیں گے کہ کسی میں ہمت اور اہلیت ہو تو بعض ان روایات پر نقد و نظر کی یقیناً ضرورت ہے جنھیں شاہ صاحبؒ نے اپنی بعض کتابوں (مثلاً ازالۃ الخفاء) میں قبول کیا ہے۔ شاید ایک مریضِ اکابر پرستی کے جذبۂ نامسعود نے ہی ہمیں صبر جمیل پر قانع کر دیا ہے ورنہ یہ ماننے کو تو جی نہیں چاہتا کہ شاہ صاحب کے زمانے سے اب تک کوئی بھی دیدہ ور عالم خاکدانِ ہند میں ایسا نہیں ہوا جس نے ان کی بیان فرمودہ متعدد روایات کے ضعف کو محسوس نہ کیا ہو۔ ابھی کچھ روز ہوئے ہم نے اعلان کیا تھا کہ بعض مشہور روایات پر نقد کا سلسلہ ہم تجلی میں شروع کر رہے ہیں اس کا بڑا محرک دراصل شاہ صاحب کی ازالۃ الخفاء ہی تھی اور دوسرے درجے پر حافظ سیوطیؒ کی ستم ظریفیاں۔

حافظ سیوطیؒ کا رعب تو خیر تیسرے ہی درجے کے ذہن مان سکتے ہیں لیکن شاہ ولی اللہؒ کا رعب درجۂ اول تک کے ذہن قبول کر چکے ہیں۔ ہم نے سوچا لاؤ اپنی بدنامی میں اضافے کے لئے یہ جرأت بھی کر ہی ڈالیں مگر عزیز محترم مصروفیات نے اتنا وقت نہیں دیا جو اس ٹھوس اور عرق ریز کام کے لئے کافی ہوتا۔ بڑا دکھ ہوتا ہے جب یہ دیکھتے ہیں کہ خود سنیوں میں شیعی تصورات کا قبول دارتقاء بعض بہترین سنی علماء ہی کی غیر شعوری نقش کاریوں کا رہین منت ہے۔

اور ہاں خطوں کے ساتھ جو دو خط ایک بزرگ کے اور دو خوابوں پر مشتمل شائع کئے گئے ہیں وہ ہمارے نزدیک شائع کرنے کے نہیں تھے۔ خوابوں کی صداقت و معنویت کے ہم منکر نہیں لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ جن خواب دیکھنے والے بزرگ کی صداقت و نجابت پر آپ کو اعتماد ہے ان پر عام قارئین بھی ضرور ہی اعتماد کریں۔ شاید مؤلف احساس کمتری کا شکار ہیں ورنہ اپنے علمی شاہکار کی قدر افزائی کے لئے ایسے غیر علمی اور بے بنیاد سہاروں کو اہمیت نہ دیتے۔ مقدمے کی جلد دوم میں بھی ایک خواب کا ذکر ہوا تھا۔ آخر یہ کیا مزاج ہے۔ دیکھنے والوں کو خواب دیکھنے دیجئے اور آپ کو اگر ان کے "رویائے صادقہ" ہونے کا یقین ہے تو دل ہی دل میں خوش ہوتے رہئے۔ ضبط مشکل ہو تو دوست احباب کی صحبتوں میں ذکر اذکار کر لیجئے۔ مگر انوار الباری جیسی بلند علمی کتاب میں انھیں ٹانکنا چہ معنی دارد۔ خواب تو کوئی اہلحدیث بھی بلا ادنیٰ مشقت یہ بیان کر سکتا ہے کہ میرے سرہانے انوار الباری کا نسخہ رکھا ہوا تھا۔ درود پڑھتے پڑھتے سو گیا تو خواب دیکھا کہ حضرت علیؓ تشریف لاتے ہیں اور نہایت کراہت سے فرماتے ہیں کہ تیرے کمرے سے تعفن اٹھ رہا ہے۔ میں کہتا ہوں یا حضرت۔ یہاں تو کوئی بھی چیز متعفن نہیں کانس پہ عطر شمامۃ العنبر بھی رکھا ہوا ہے۔ وہ غضبناک ہو کر کہتے ہیں یہ تیرے سرہانے جو ناپاک کتاب رکھی ہوئی ہے اسے باہر پھینک۔ بدبو اسی سے اٹھ رہی ہے!

بتائیے اس خواب کا توڑ کیا ہوگا؟ آپ کس دلیل سے ثابت کر سکیں گے کہ خواب تو فقط مدراسی بزرگ ہی کا سچا ہے جس میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انوار الباری طلب کرنے کے لئے اس کے ملنے کا ایڈریس طلب فرمایا ہے۔

پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

آئندہ فاضل مؤلف کو ایسی کچی باتوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔ یہ مطلب نہیں کہ خدا نخواستہ مدراسی بزرگ کے خواب من گھڑت ہیں۔ یا ان کی صالحیت مشکوک ہے۔ وہ قطب وقت بھی ہوں اور خواب حرفاً حرفاً حقیقی بھی ہوں تو علمی کتابوں سے ان کا جوڑ نہیں ہے

خاتون پاکستان کا رسول ﷺ نمبر

پتہ:۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۱۹۶
صدر۔ کراچی۔
مدیر:۔ شفیق بریلوی۔
سالانہ قیمت:۔ چھ روپے۔
اس رسول ﷺ نمبر کی قیمت پانچ روپے
صفحات ۲۰۰

ماہنامہ "خاتون پاکستان" کے دیدار کا شرف اس سے قبل ہمیں میسر نہیں ہوا اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ اس کے عام شمارے کیسے ہوتے ہوں گے۔ پیش نظر "رسول ﷺ نمبر" تو یہی حسن ظن دیتا ہے کہ عام اشاعتیں بھی وقیع ہوتی ہوں گی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ادارت میں ایک بریلوی محترم کا نام دیکھ کر ہمیں ابتداءً خطرے کا احساس ہوا تھا لیکن فہرست مضامین پر نظر پڑتے ہی یہ احساس مسرت میں بدل گیا اور پھر اندر کے متعدد مضامین کے مطالعے نے مسرت ہی کے احساس کو اور بڑھایا۔ اتنے ضخیم نمبر کے سارے ہی مضامین پڑھ لینے کی توفیق تو ظاہر ہے ہر شخص کا نصیب

نہیں لیکن جتنے بھی ہم پڑھ سکے انھیں معیاری پایا۔ ادارہ مستحقِ مبارک باد ہے کہ اس نے اپنی سعیِ بلیغ سے بڑے بڑے لوگوں کے گہر ہائے آبدار اس نمبر میں جمع کر دیئے ہیں اور کسی ایک مکتبِ فکر تک محدود رہنے کے عوض تمام ہی معروف مکاتبِ فکر کے اربابِ علم و قلم سے استفادے نے اس نمبر میں نہ صرف تنوع پیدا کیا ہے بلکہ اس کی قبولیت اور افادیت کا دائرہ بھی وسیع کر دیا ہے۔ ذرا دیکھئے اس میں مولانا اشرف علیؒ بھی ہیں۔ مولانا حفظ الرحمنؒ اور مولانا دریابادی بھی۔ مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی بھی۔ مولانا تمنا عمادی اور مولانا ظفر احمد عثمانی بھی۔ حد ہے کہ چودھری غلام احمد پرویز اور مرزا غلام احمد قادیانی بھی! پرویز صاحب تو نثر کے قالب میں ہیں۔ یہ غالباً اُس زمانے کا مضمون ہے کہ جب ان کا ذہنی سانچہ تختِ ویز کے مراحل سے گذر رہا تھا اور اصلی اسلام کا سراغ انھیں نہیں لگ پایا تھا جس میں آخری رسولؐ کی سنت اور اس کے احکام و قضایا کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ رسولؐ تو خیر بشر ہی تھے ان کے دریافت کردہ جدید اسلام میں تو خدا کی مسند بھی "مرکزِ ملت" ہی کے تصرف میں ہے اور حدیث و فقہ کی ساری تاریخ دجل و سازش کا ایک قابلِ نفریں پلندہ قرار پا چکی ہے۔

اور مرزا غلام احمد قادیانی فارسی نظم کے لباس میں جلوہ گر ہیں۔ رواداری اور فیاضی زندہ باد۔ ہم تو اسے فیاضی ہی کہیں گے کہ فاضل مدیر نے ایک ایسے شخص کی نعت کو بھی سر آنکھوں پر لیا جس کی جرأت و بسالت نے ختمی مرتبت خاتم النبیین کے مرتبۂ خاتمیت پر کمند ڈالی تھی یعنی کیا اب بھی اس کے متبعین کا عقیدہ ہے کہ مرزا صاحب نبی ہی تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نبوت کو ظل و بروز کے نقاب پہنا کر جہلاء اور کم نصیبوں کے لئے گوارا بنانے کی سعی کی جاتی ہو۔ خیر تبصرے میں ان پٹی ہوئی بحثوں کی کیا گنجائش۔ ویسے ہمارے ایک فاضل دوست کو ہماری رائے سے اختلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ بھی رواداری اور فیاضی ہے تو بے حمیتی اور افلاسِ غیرت کس کا نام ہوگا۔ خدا ہی بہتر جانے ہم نے صحیح سمجھا یا انھوں نے۔

یہ فارسی نعت فن کے اعتبار سے ہے کیسی۔ اس کا فیصلہ کوئی فارسی کا ماہر ہی کر سکے گا۔ ہم تو اُن عقیدت مندوں میں ہیں جو سادگی کے ساتھ یہی کہہ سکتے ہیں کہ فارسی کی ہے تو واہ واہ! — ہاں ہمارے مذکورہ دوست نے اس کی فنی ثقاہت سے بھی اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ زبان و بیان کے اعتبار سے مبتذل یا نہ ہے اور فکر و خیال کے لحاظ سے سطحی۔ تمام اشعار پر ان کا تبصرہ نقل کرنا طولِ عمل ہوگا۔ محض نمونہ پیشِ خدمت ہے:-

عجب نوریست در جانِ محمدؐ
عجب لعلے است در کانِ محمدؐ

یہ پہلا ہی شعر آخر سوائے قافیہ پیمائی کے اور ہے کیا۔ کسی کے ذہن، قلب یا روح کی توصیف تو بجا ہو سکتی ہے لیکن "جان" کی توصیف بے معنی ہے۔ جان میں نور کا ہونا چہ معنی دارد۔؟ پھر "کانِ محمدؐ" کیا شے ہے اور اس میں "عجب لعل" کونسا ہے؟ — یہ کہنا تو بے شک معقول ہو سکتا تھا کہ تخلیق کے خزانے میں محمدؐ ایک "عجب لعل" ہیں لیکن خود محمدؐ کو "کان" قرار دینا اور پھر اس کے اندر کسی نامعلوم لعل کا ذکر کرنا ابہام نہیں تو پھر قدرت کا کوئی سرِ نہاں ہوگا!

اگر خواہی دلیلے عاشقش باش
محمدؐ ہست برہانِ محمدؐ

یہاں "باش" کا نہیں "شو" کا مقام تھا۔ رہنا تو بے شک ہمیشہ ہی سرکار کا گرویدہ چاہیئے لیکن یہاں دوسرے مصرعہ کا دعویٰ صرف "شو" کا طالب تھا "باش" کا نہیں۔ فافہم و تدبر۔

فدا شد در رہش ہر ذرّۂ من
کہ دیدم حسنِ پنہانِ محمدؐ

یہ "ذرّۂ من" شاید فارسی ادب میں پہلی اور آخری بار استعمال ہوا ہو۔ کہا یوں جاتا ہے کہ اس کی راہ میں میرا سب کچھ قربان۔ میرے لہو کا ایک ایک قطرہ، میرے جان و مال سب فدا۔ لیکن یوں کہنا کہ اس کی راہ میں میرا ہر ذرّہ

فدا، انا ڑی پن ہے۔

بدیگر دلبرے کارے ندارم
کہ ہستم کشتۂ آنِ محمدؐ

اس سے قطع نظر کہ شعر کا مضمون علوئے تخیل سے عاری ہے لفظ "آن" بھی غلط محل میں استعمال ہوا ہے۔ آدمی لیجئے نازو ادا، بانکپن، حسن وجمال پر فدا ہوتا ہے نہ کہ اسکی آن پر۔ آن کا لفظ محلِ استعمال کے فرق سے تمکنت، غرور، ضد، وضع، شان اور غیرت وحمیت کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی معنی دلبری سے جوڑ نہیں کھاتے ۔۔۔ یوں زبردستی جوڑ لگالو تو زبردستی کا نام شاعری نہیں ہے۔

سر دارم فدائے خاکِ احمدؐ
دلم ہر وقت قربانِ محمدؐ

"خاکِ احمدؐ" یعنی چہ؟ یا تو "خاکِ پائے احمدؐ" ہوتا یا پھر "پائے احمدؐ" ۔۔۔ اور دوسرا مصرعہ، مصرعہ ضرور ہے لیکن ٹھیک ایسا جیسا یہ شعر ہے:۔

یکے مرغ دیدم نہ بال نہ پر
قفس میں پریشاں تھا وہ سر بسر

ہمارے دوست نے بعض اشعار کو تو بے معنی ہی بتلایا مگر ہم ان کی تائید یا تردید کیسے کریں جب کہ فارسی پر عبور ہی نہیں۔

خیر ان دوست کا نقد جاندار ہو یا بے جان ایک نکتہ تو ہمارے نزدیک بھی قابلِ غور ہے۔ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف ومنقبت خواہ منظوم ہو یا منثور کیا ہر حال میں اس کی مستحق ہے کہ اس کی قدر کی جائے؟ کیا ہر وہ شخص سچا کہلائے گا جس کی زبان یا قلم سے کوئی سچی بات نکل رہی ہو؟ ۔۔۔ بظاہر تو جواب یہی ہے کہ ہاں حضورؐ کی منقبت ہر حال میں قدر ومنزلت کی مستحق ہے اور سچ بات جس کی بھی زبان یا قلم سے نکلے کم سے کم اس بات کی حد تک وہ سچا ہی کہلائے گا۔ لیکن قرآن کی سورۂ منافقون آپ کے سامنے جو اندازِ نظر پیش کرتی ہے اسے بھی دیکھ لیجئے۔

کیا اس بات سے بڑھ کر بھی کوئی بات سچی اور بے ریب ہوسکتی ہے کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ یہ تو اتنی مسلّم صداقت ہے کہ خود باری تعالیٰ نے فرمایا وَاللّٰہُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُہٗ اور اے محمدؐ اللہ خوب جانتا ہے کہ تم اس کے رسول ہو ۔۔۔ لیکن یہی صادق ترین، یقینی اور اٹل بات منافقین کی زبانوں پر آئی تو اللہ فرماتا ہے وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ۔ یعنی یہ جو منافقین آ کر تم سے (رسول سے) کہتے ہیں کہ تم اللہ کے رسول ہو تو اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں!

آیات لفظاً اور معناً بالکل صریح ہیں، محکم ہیں، واضح مشرح ہیں ۔۔۔ ان سے تو معلوم ہوا کہ کہنے والا اگر اذعان و ایمان کی باطنی کیفیت سے عاری ہے تو وہ سچ کہہ کر بھی سچا نہیں کہلائے گا ۔۔۔ پھر کیا خاتون پاکستان کے فاضل مدیر رسولؐ کے ان دونوں مدحت گذاروں کو اسلامی اصطلاح کے مطابق مومن ومسلم ہی مانتے ہیں جنھوں نے رسالتِ محمدیؐ کے خاص الخاص اوصاف، خاتمیت اور حاکمیت پر بیدریغ چھاپہ مارا؟ کیا وہ ان دونوں غلامانِ احمد کو واقعتہً احمدؐ کا غلام اور امتِ مسلمہ ہی کے افراد تسلیم کرتے ہیں جن کے خارج از ملت ہونے پر سوادِ اعظم کا اتفاق ہے؟

اگر تسلیم کرتے ہیں تو وہ جانیں۔ نہیں کرتے تو پھر ان کی بہتر سے بہتر منظوم یا منثور نعت میں اور سورۂ منافقون والے اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ میں آخر کیا جوہری فرق ہے؟

اس پر کچھ دیر سوچئے تب تک ہم تبصرے سے فارغ ہولیں۔

فاضل مدیر شفیق بریلوی کا نہ صرف خلوص، ذوقِ نظر اور اندازِ فکر قابلِ تعریف ہے بلکہ ان کے قلم میں بھی اتنی روانی، شگفتگی اور رچاؤ ہے کہ بریلوی اہلِ قلم میں اس کی مثالیں کم ملیں گی۔ ان کا دو صفحے کا اداریہ اسلوب کے اعتبار سے بڑا خوبصورت اور ان کے پاکیزہ جذبۂ نیاز کا آئینہ دار ہے۔ بس ذرا سی کھٹک ہمیں ان کے ان فقروں سے ہوئی جن میں انھوں نے پہلے بھی اور اب بھی جو کارنامہ "رسول نمبر" کی شکل میں انجام دیا اسے بجائے فضلِ الٰہی

اور توفیقِ ربانی کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کرمِ خاص کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ العیاذ باللہ وحدہٗ لاشریک لہ کیا ہمارے محترم بھائی کو یاد نہیں رہا کہ اللہ نے محمدؐ ہی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے:۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ — تیرا کچھ بھی اختیار نہیں

(اور) اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۤءُ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ — تو ہدایت نہیں دے سکتا جسے چاہے لیکن اللہ ہی ہدایت دیتا ہے جسے چاہے اور وہی خوب جانتا ہے ان کو جو ہدایت یاب ہوں گے۔

+ + + +

یہ تو فقط دو۲ آیتیں ہیں جو بے اختیار یاد آگئیں۔ پورا قرآن اور تمام احادیثِ صحیحہ اس بنیادی عقیدے کی تفہیم و تاکید سے لبریز ہیں کہ عطا تمامتر اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اکیلے اللہ کے ہاتھ میں۔ سیّدالابرارؐ فداہٗ اُمّی و ابی اپنی تمامتر عرش پیما عظمتوں کے باوجود اپنی زندگی ہی میں اس کے مختار نہیں تھے کہ اللہ کے فیصلے اور مرضی کے بغیر مادی ہی وسائل سے کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکیں۔ پھر بھلا وفات کے بعد یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ ہدایت اور توفیقِ خیر جیسی نعمتوں کی عطا کا انتساب براہِ راست ان سے کیا جائے۔ کہنا یوں چاہیئے کہ ان کے طفیل، ان کے صدقے ان کے وسیلے اور ان کی غلامی کے ناطے ہمیں اللہ نے فلاں نیک کام کی توفیق عطا کی۔ ہدایت سے نوازا۔ طاقت اور ہمت دی۔ دینا تو اصلاً اللہ ہی کا ہے حضورؐ فقط واسطہ، ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ ان سے ہمیں اسلام ملا ہے اور اسلام کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں لہٰذا ہر عملِ مقبول میں ان کا توسّط اور احسان کسی نہ کسی درجے میں ضرور شامل ہوگا۔ وہ ہمارے آقا ہیں، مطاع ہیں، سب کچھ ہیں، لیکن خدا نہیں — کوئی پیرایہ ان کی شکر گذاری کا ایسا نہیں اختیار کرنا چاہیئے جس میں اصل معطی و بخشندہ کی حیثیت ابہام و خفاء میں جا پڑے اور واسطے پر اصل کا شبہ ہونے لگے شفیق صاحب اپنی سعیدِ فطرت اور عدل پسند مزاج کے تحت خود ہی اپنے عقائد و تصورات کا تنقیدی جائزہ لیں تو امید ہے کہ شرک و بدعت کی دُردِ تہہِ جام ان کی نگاہِ رسا سے پوشیدہ نہیں رہیگی اور جو گہری محبت انھیں اللہ کے سچّے رسولؐ سے ہے اسمیں معنوی قدر و قیمت کے اعتبار سے چار چاند لگ جائینگے۔ وما التوفیق اِلّا باللہ۔

رسول نمبر کا حصۂ نظم بھی بڑا جاندار اور رنگارنگ ہے۔ عربی فارسی، ہندی، اُردو سب کے نمونے اس میں ملتے ہیں اور آرٹسٹ قسم کے کاتب صاحب نے ڈیزائن بھی خوب بنائے ہیں۔ حاصلِ تبصرہ یہ کہ یہ نمبر ایک کامیاب نمبر ہے لکھائی چھپائی بھی دلکش ہے ٹائٹل بھی شاندار اور قیمت پانچ روپے پاکستانی اعتبار سے بالکل مناسب ہے۔

تاریخ دعوت و عزیمت
(حصہ سوم)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہمارے زمانے کے ممتاز اور مقبول علماء میں سے ہیں۔ بعض اوصاف تو ان کے ایسے ہیں جو انھیں اپنی ہی صف کے ہم عصروں سے بھی خاصا امتیاز اور انفرادیت بخشتے ہیں۔ عربی زبان و ادب کے ماہر۔ علوم دینیہ میں وسیع المطالعہ، قلم کے شہسوار، روشن فکر، فرخندہ نظر — یہ ہیں مولانا ابوالحسن ندوی — تبصرہ نگار کو ان سے شرفِ ملاقات حاصل نہیں، لیکن ان کی تحریروں کے آئینے میں ہمیشہ ایک ایسی تصویر نظر آئی ہے جو اپنی تمامتر فکری بلاغتوں اور علمی اصابتوں کے باوجود بڑی معصوم ہے۔ معصومیت میں ایک خاص ادائے دلبری کے مفہوم میں بول رہا ہوں۔ وہ جو غالب نے کہا ہے:۔

سادگی و پُرکاری، بے خودی و ہشیاری
حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

تو واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی تحریریں پڑھکر ذہن روشن ہوتا ہے، دِل وجد کرتا ہے، روح پر انبساط کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ لیکن وجدان — کم سے کم میرا وجدان تو ایک ایسی عجیب کیفیت محسوس کرتا ہے جسے "پیار" کے سوا کسی لفظ سے تعبیر کرنا مشکل ہے۔

خیر میرے ذاتی تاثرات سے قارئین کا اتفاق کرنا ضروری نہیں۔

تاریخ دعوت وعزیمت کے پہلے دو حصے اس لئے زیر تبصرہ نہ آسکے کہ چھاپنے والوں کے نزدیک تبصرے کیلئے ایک نسخے سے زائد بھیجنا اسراف میں داخل تھا۔ ہوسکتا ہے ان کا خیال درست ہو لیکن خود ہم بھی ادارے کے وضع کردہ ایک قاعدے کی زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں، لہٰذا نہ ہمیں ان سے شکایت نہ انھیں ہم پر خفا ہونا چاہیئے۔

پہلے دونوں حصے بڑے معرکے کے تھے۔ تاہم یہ حصۂ ثالث بھی اپنی نوعیت میں لاجواب ہی ہے۔ اس میں تین ایسی معظم ہستیوں کے حالات و کمالات بیان ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک کو روحانیت و تقویٰ کے آسمان کا بدرِ منیر کہنا مبالغہ آمیز نہ ہوگا۔

(۱) حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ (۲) سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ (۳) حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ۔

کتاب کو لاجواب ہم نے اس لئے کہا کہ ان بزرگوں کی سوانح کے نام سے کتابیں تو بہت ہیں لیکن وہ اس لائق نہیں کہ ایک حقیقت پسند اور باشعور آدمی ان پر وقت ضائع کرے۔ گو ان میں بعض نسبتاً بہتر بھی ہیں لیکن بس نسبتاً۔ بجائے خود وہ درجۂ ثقاہت اور پایۂ استناد سے گری ہوئی ہیں۔ ان میں دس حقائق کے ساتھ پانچ افسانے ضرور ہیں۔ پانچ میں اگر مبالغہ ہو تو بہرحال ۲۵ فی صد کذب و وضع کی ملاوٹ میں تو شبہ ہی نہیں۔ دینی بصیرت اور زندہ شعور سے بے بہرہ عقیدتمندوں نے سوانح کے نام پر ان بزرگوں کے ایسے قلمی بُت تراشے ہیں جن میں کوئی عضو ملائکہ کا ہے تو کوئی نعوذ باللہ خدا کا۔ بشریت تو محض کھال تک نظر آتی ہے باقی سب ورا الوریٰ اور مافوق۔

یہ شاید پہلی کتاب ہے جس میں مؤلف نے ان مظلوم بزرگوں کو ان کے تحقیقی اوصاف و امتیازات کے ساتھ روشناس کرانے کی سعیٔ مشکور کی ہے۔ گو کہیں کہیں ہمیں اب بھی شبہ ہوتا ہے کہ فاضل مؤلف رعایت برت گئے — یا پھر شکار ہوگئے — لیکن ایک ایسی فضا کو جو سموم گرد وغبار سے لبریز ہو بالکلیہ صاف کرنا آسان نہیں ہے۔ اگر کسی نے نوّے اور پچانوے فیصدی گرد وغبار چھانٹ دیا ہے تو اسے مرد میدان ہی کہینگے

مؤلف کے قلم میں بڑا رچاؤ ہے۔ پختگی ہے۔ روانی اور تیکھاپن ہے۔ جب جذبۂ تحقیق اور شہپر فکر کو اچھا قلم نصیب ہو جائے تو الفاظ و معانی نور کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہی کیفیت مؤلف کی تقریباً تمام ہی تحریروں میں پائی جاتی ہے۔

شایانِ شان نقد و تبصرہ تو اس کتاب پر وہی لوگ کرسکتے ہیں جو سوانح اور تاریخ کے موضوع پر دسترس رکھتے ہوں۔ ہمارے پاس اس فن میں معذرت کے سوا کچھ نہیں ہم بس اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ متذکرہ بالا بزرگوں اور ان کے تلامذہ و منتسبین کا یہ تذکرہ اپنے دامن میں بڑی دلچسپیاں، بڑے آبدار موتی اور علم وخبر کا ذخیرہ سمیٹے ہوئے ہے۔

کتاب کی افادیت کے پیشِ نظر مکتبۂ تجلّی نے تینوں ہی حصوں کی فراہمی کا انتظام کیا ہے۔ اس حصۂ سوئم کے صفحات ۳۱۲ ہیں۔ سائز ۲۰×۲۶/۸ کتابت پاکیزہ اعلیٰ۔ طباعت نسبتاً ہلکی۔ کاغذ نفیس۔ قیمت مجلد چھ روپے۔ ناشر:۔ مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ۔

مقبول ربّانی کی مقبول نماز

مرتبہ:۔ عبدالرشید حنیف جھنگوی۔

ناشر:۔ محمد ادریس بھوجیانی۔ گوشۂ ادب۔ ریل بازار ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ ضلع لائل پور۔ مغربی پاکستان۔ صفحات ۹۶ لکھائی چھپائی گوارا۔ قیمت درج نہیں۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں اسلام کے سب سے اہم رکن نماز کی ناگزیر اہمیت، اس کی تفصیل اور متعلقات کو جمع کیا گیا ہے۔ متعلقات سے مراد ہے طہارت وضو، مسجد، دعا اور جماعت وغیرہ کے احکام۔ فاضل مرتب

ہر مسئلہ کے ساتھ احادیث کا بھی اہتمام کیا ہے۔

اہل حدیث بھائیوں کے لئے یہ کتاب مفید ہو گی کیونکہ یہ مسلک اہل حدیث پر ہی مرتب کی گئی ہے۔ وہی مدتِ قصر زیادہ سے زیادہ تین دن۔ وہی آمین بالجہر اور فاتحہ خلف الامام۔ دیگر اختلافی مسائل بھی اسی مسلک پر ہیں۔ احناف کے لئے ظاہر ہے یہ غیر مناسب ہو گی اہل حدیث حضرات فائدہ اٹھائیں۔

دیباچے میں مرتب نے نماز کو اسلام کا دوسرا رکن لکھا ہے معلوم نہیں پہلا کسے شمار کیا۔ ہمیں تو یہی معلوم ہے کہ اسلام کا پہلا ہی رکن نماز ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

چالیس بدعتیں | تالیف:- مولانا محمد مطیع الحق۔ ناشر:- مکتبہ ضیاء العلوم۔ جامع مسجد دیوبند۔ صفحات ۶۸ قیمت ۶۲ پیسے۔

یہ مختصر سی کتاب ایک لحاظ سے بعض مطوّلات سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ اس میں ایسی چالیس بدعتوں کا ذکر ہے جن میں بریلوی حضرات عموماً ملوّث ہیں اور جو مصلح انھیں بدعت کہے اسے اپنی معروف بے غیرتی کے ساتھ "وہابی" کہہ دیا جاتا ہے لیکن مرتب نے دکھلایا ہے کہ بریلویوں کے سب سے بڑے بزرگ "اعلیٰ حضرت" نے بھی ان سب کو بدعت و معصیت ہی قرار دیا ہے اور بریلوی حضرات کی معتبر اور مشہور کتاب مسائل "بہارِ شریعت" میں بھی جو "اعلیٰ حضرت" کی توثیق فرمودہ ہے ان کے بدعت و معصیت ہونے پر اتفاق کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے مخالف پر اس سے بڑی حجت اور کیا ہو گی کہ جن لغویات و خرافات پر لوٹنے والوں سے وہ لڑنے مرنے کو تیار رہے انھیں تو خود اسی کے مسلّمہ بزرگ اور امام گناہ و گمراہی کا طعنہ دے رہے ہیں۔ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ۔

ضرورت ہے کہ اس دلچسپ اور مفید کتاب کو اہلِ استطاعت بہت بہت سی منگا کر عوام میں تقسیم کریں گو مریضِ بدعت کے امراضِ باطنی پہنچ تو اس اسٹیج میں چکے ہیں جہاں اکسیر بھی اپنا اثر کھو دیتی ہے۔ پھر بھی مایوسی

تو کفر ہی ہے۔

کئے جاؤ کوشش مرے دوستو
دکاں بند کر کے رہا بیٹھ جو
تو دی اُس نے بالکل ہی لٹیا ڈبو

رہبرِ حجاج | اثر:- علامہ حبیب الرحمن الاعظمی۔ ناشر:- مکتبہ اعظمی۔ مئو ضلع اعظم گڑھ
صفحات ۹۳ قیمت ۷۵ پیسے۔ لکھائی چھپائی مناسب

اس مختصر رسالے میں حج و زیارت کے ضروری مسائل کو عام فہم انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ نیز بعض مسائل پر محققانہ گفتگو بھی ہے۔ علامہ اعظمی کا نام آ جانے کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ رسالہ معتبر اور مفید ہے۔ ضرورت مندوں کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

نور الدرایۃ من عین الہدایۃ | کون پڑھا لکھا مسلمان ہے جس نے فقہ حنفی کی مشہور کتاب ھدایہ کا نام نامی نہ سُنا ہو گا۔ یہ کتاب چھٹی صدی ہجری میں لکھی گئی تھی۔ اصلاً یہ مستقل بالذات تالیف نہیں بلکہ بدایۃ المبتدی کی ضخیم و مطوّل شرح کفایۃ المنتھی کا خلاصہ ہے۔ کفایۃ المنتہی بھی شیخ الاسلام برھان الدین ابو الحسن علی ہی کا ثمرۂ محنت تھی اور اس کا خلاصہ "ہدایہ" بھی انھی کا نقشِ جمیل ہے جیسا کہ سمجھا جا سکتا ہے کسی ضخیم کتاب کا جامع خلاصہ آسان نہیں ہے، شیخ الاسلام کی غیر معمولی صلاحیتوں ہی کا اثر کہئے کہ یہ خلاصہ نہ صرف جامعیت کے لحاظ سے خوب رہا بلکہ ایک خوشنما اسلوب اور ہنرمندانہ ایجاز کی انفرادیت بھی اس میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ہم تو عربی زبان و ادب کے ماہر نہیں۔ استادوں اور بزرگوں سے سُنا ہے کہ ہدایہ کا اسلوب زبان و بیان پر بڑے ہی عبور اور مہارتِ تامہ کا آئینہ دار ہے۔ ہونا بھی چاہئے۔ جو شخص چند ایامِ ممنوعہ کو چھوڑ کر پورے تیرہ سالوں تک روزہ دار رہ کر عرق ریزی کرے اس کی تالیف میں کچھ نہ کچھ خداداد خصوصیات اور خیر و برکت کی جھلکیاں ضرور ہوں گی۔ آج کیا کسی بڑے سے بڑے

عالم اور شیخ وقت میں دم ہے کہ دین کی تکریم اور شریعت کی
تقدیس کا اس سے جو تھائی بھی ثبوت پیش کر سکے۔ کمال یہ تھا کہ
خادم روز دوپہر کا کھانا لاتا تھا اور یہ کھانا مخفی طور پر کسی طالب علم
کو چلا جاتا تھا۔ صاحب ہدایہ نے اپنے عزیز و اقربا تک پر
یہ ظاہر کرنا پسند نہیں فرمایا کہ وہ تالیف کا کام مستقلاً روزے
رکھ کر رہے ہیں۔ نور اللہ مرقدہٗ وطاب سراہٗ۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ھدایۃ جملہ نقائص سے پاک
ہے۔ کون بشر ہے جس کی تالیف میں کوئی نہ کوئی فرو گذاشت،
بھول چوک اور جھول نہ ہو۔ اہلِ علم نے ہدایہ کی بعض فروگذاشتوں
کی نشاندہی کی بھی ہے لیکن اس سے اس کی قدر و قیمت اور
اُس محوری حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا جو اسے فقہ حنفی کی
نصابی اور متداول کتابوں میں حاصل ہے۔ ایک زمانہ تھا
جب بعض غیر حنفی علماء نے اس پر اعتراضات بھی کافی کئے
تھے۔ پس منظر یہ تھا کہ کچھ نے تو اس کے اختصار سے دھوکا کھایا
کچھ قلتِ علم و خبر کے باعث اس کے مصادر و مناہج تک نہ پہنچ
سکے اور کثیر مسائل کو بے بنیاد سمجھ لیا۔ کچھ تعصب کا شکار ہوگئے
اس کا دفاع حنفی علماء نے اس طرح کیا کہ دنیا کے سامنے وہ تمام
احادیث پیش کیں جو ان مسائل کا مبنیٰ تھیں۔ اس طریق کو اصطلاح
میں "تخریج" کہا جاتا ہے۔ امام زیلعی کی مشہور کتاب نصب الرایۃ
لاحادیث الھدایۃ اسی طریق کا ایک بیش قیمت نمونہ ہے

آج بھی بعض کم علم یا متعصب لوگ ہدایہ کے بعض مسائل
پر گھٹیا قسم کی چاند ماری کرتے ہیں۔ حد ہے کہ بڑے عامیانہ
پمفلٹ اور پوسٹر چھاپ کر بانٹے جاتے ہیں۔ ایسے پمفلٹ بھی
ہماری نظر سے گذرے ہیں جن میں "ستیارتھ پرکاش" کی طرح
عبارتوں کو سیاق و سباق سے کاٹ کر اور اپنے من مانے معنی
پہنا کر پیش کیا گیا ہے تاکہ ہدایہ کی خصوصاً اور فقہ حنفی کی عموماً
رسوائی ہو۔ یہ طرزِ عمل ٹھیک ایسا ہی ہے جیسا منکرین حدیث
احادیث کے باب میں اختیار کرتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ
حدیث دوستوں ہی کی حرکاتِ ناشائستہ کا ایک انتقامی نمونہ
مشیتِ ایزدی نے منکرینِ حدیث کے وطیروں کی شکل
میں دکھایا ہو۔

عربی میں ہدایہ کی شرح و توضیح کا حق خوب خوب ادا
کیا گیا ہے لیکن اردو میں یہ خانہ خالی تھا۔ اسے کچھ
زمانہ ہوا ایک عالم سید امیر علی صاحبؒ نے پُر کیا۔ ان کی
شرح کا نام عین الھدایہ تھا۔ لیکن اب وہ بازار
سے غائب ہے۔ اب دار العلوم دیوبند کے ایک منتسب حافظ
صاحب کو خیال ہوا کہ ایک نئی اردو شرح تیار کرائی جائے
جو اصلاً اسی عین الہدایہ سے ماخوذ و مستفاد ہو لیکن اسکی
زبان حال کے اسلوب سے قریب تر ہو۔ اس کیلئے انھوں نے
دار العلوم دیوبند کے استاذ تفسیر مولانا محمد نعیم صاحب کی
خدمات حاصل کیں اور حصہ وار اشاعت کا سلسلہ شروع
کر دیا۔ بیک وقت پوری شرح کی اشاعت کارے دارد
تھی۔ پھر اس کی قیمت بھی اتنی ہوتی کہ کم استطاعت لوگ
— جن کا اوسط ہندی مسلمانوں میں روز افزوں ہے —
— خرید نہیں سکتے تھے لہٰذا یہی طریق اختیار کیا جو دیوبند
کے متعدد ادارے کر رہے ہیں۔ ایک حصہ جو تقریباً سو
بڑے صفحات پر مشتمل ہوتا ہے ہر دوسرے مہینے چھاپا جاتا
ہے جس کی قیمت دو روپے ہوتی ہے۔ لیکن جو لوگ ایک
روپیہ بھیجکر ممبر بن جائیں انھیں فی حصہ بارہ آنے کی
رعایت مل جاتی ہے۔ پتہ یہ ہے :- مکتبہ نعمانیہ
دیوبند۔ کتابت طباعت اور کاغذ ہر چیز میں اچھے
معیار کا لحاظ رکھا جا رہا ہے۔

یہ تو تھا تعارف جس میں ایک حنفی کی حیثیت سے
قدرتاً تعریف کا غلبہ ہونا ہی تھا۔ اب ذرا سا تبصرہ بھی ہو جائے
تین اشاعتیں ہمارے سامنے ہیں۔ پہلی اشاعت میں مولانا نعیم صاحب
نے دو صفحات کا پیش لفظ بھی لکھا ہے۔ خطا معاف۔ یہ پیش
لفظ ایک ایسی شخصیت کے شایانِ شان نہیں ہے جس کے ساتھ
شیخ التفسیر جیسا بھاری بھرکم خطاب لگا ہوا ہو۔ بالکل
بے مغز، سطحی اور بے جان قسم کا پیش لفظ۔ ھدایہ جس
پائے اور شان کی کتاب ہے اس کا تو تقاضا تھا کہ پیش لفظ بجائے
خود ایک فکر انگیز مقالہ ہوتا۔ اس میں قارئین کو بتایا جاتا
کہ ھدایۃ کیا ہے۔ متاخرین احناف میں اسے مرکزی نوع

باقی ص۶۵ پر

انوارِ اسلام" سے آپ واقف ہی ہیں۔ حافظ صاحب کے عزم و ہمت ہی کی بات ہے کہ ناسازگار حالات کے باوجود کام کئے جا رہے ہیں اور کام بھی پائے کا۔ اب یہی خصوصی اشاعت ہے۔ اس میں انھوں نے سوامی دیانند جی آنجہانی کی نام نہاد کتاب " ستیارتھ پرکاش " کے اُس گمراہ کن باب کا جواب دینا شروع کیا ہے جس میں ان آنجہانی بزرگ نے قرآن، پیغمبر اور اسلام کے خلاف بدزبانی، دریدہ دہنی، اشتعال انگیزی اور ہرزہ سرائی کی حد کردی ہے۔ اس کتاب نے غیر مسلموں میں مسلمانوں کے خلاف کس درجہ نفرت، بیزاری اور غلط فہمی پیدا کی ہے اس افسوسناک صورتِ حال کا احساس کرانے کے لئے حافظ صاحب نے بڑا ہی پُرسوز اور حقیقت افروز اداریہ رقم فرمایا ہے اسی اداریئے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کتاب کی تقریباً آٹھ لاکھ جلدیں مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوکر پھیل چکی ہیں۔ اُردو ہی میں اس کی اشاعت ساٹھ ہزار سے کم نہیں رہی اور سلسلۂ اشاعت جاری و قائم ہے۔ اداریئے میں موصوف نے جو مسلمان عوام و خواص کی بے حسی، جمود اور لاپروائی کا ماتم کیا ہے اسے بھی غیر مناسب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر مسلمانوں کے قوائے فکر و عمل بیدار ہوتے تو ستیارتھ پرکاش کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کے تدارک کے لئے حافظ صاحب اپنی سن رسیدگی اور ناتوانی کے باوجود جو خونِ جگر پیش کر رہے ہیں اس کی واجبی قدر کی جاتی اور تعاون کا مضبوط ہاتھ ان کی طرف بڑھتا لیکن انھوں نے اداریئے میں نہایت رنج اور درد کے ساتھ بتایا ہے کہ کسی نے ان کی پکار پر توجہ نہیں دی، کسی نے حوصلہ افزائی نہیں کی۔ پھر بھی وہ ہمت نہیں ہارے ہیں۔ یہ ان کے جذبے کی صداقت اور خلوص کی گہرائی کا ثبوت ہے۔ ہم متعدد بار ان سے اختلاف کرتے رہے ہیں، لیکن اس میں نہ ہمیں پہلے شک ہوا نہ آج شک ہے کہ وہ جذبے اور شعور کے لحاظ سے ایک سچے اور پکے مسلمان ہونے کے علاوہ کئی قابلِ رشک صلاحیتوں کے بھی مالک ہیں انھیں دین سے بے پناہ محبت ہے۔ وہ خدمتِ حق اور ابلاغ و تبلیغ کا ایسا سدا بہار جوش اپنے دلِ دردمند میں سموئے ہوئے ہیں جو ہر لحظہ جوان ہے اور شاید موت کی آخری ہچکی تک جوان ہی رہے گا۔

انوارِ اسلام کا پیشِ نظر شمارہ ایک ہی نشست میں ہم نے شروع سے آخر تک پڑھا۔ طویل اداریہ بڑا اثر انگیز ہے اور ستیارتھ پرکاش کے زہریلے مواد پر تنقید تو خلاصے کی چیز ہے۔ حافظ صاحب نے کافی شرح و بسط سے کام لیا ہے اور لینا بھی چاہئے تھا۔ جو لوگ ستیارتھ پرکاش کے بازاری اور سطحی پروپیگنڈے سے متأثر ہو سکتے ہیں ان کی ذہنی سطح یقیناً ایسی ہی ہو سکتی ہے کہ بغیر شرح و بسط کے ان کے کچھ بھی پلّے نہ پڑے۔ حافظ صاحب کے جوابات عام فہم ہیں، دلنشیں ہیں۔ آئندہ اگر وہ آسان سے آسان الفاظ کے استعمال پر اور زیادہ توجہ فرمائیں تو افادیت اور بڑھ جائے گی۔ نیز کہیں کہیں تفصیل طول کے دائرے میں داخل ہوگئی ہے اس پر بھی آئندہ نظر رکھنی چاہئے۔

ستیارتھ پرکاش کے اسلام دشمن ہذیانات دو چار نہیں ڈھیر کا ڈھیر ہیں۔ بلا سے ہم انھیں ہذیانات کہیں لیکن یہی ہذیانات لاکھوں قلوب و اذہان میں حقائق بن کر جاگزیں ہو چکے ہیں لہٰذا ان سب کا جائزہ لینے اور جواب پیش کرنے کے عزم میں حافظ صاحب یقیناً اس کے مستحق ہیں کہ اہلِ استطاعت ان کا ہاتھ بٹائیں زیرِ تبصرہ اشاعت تو اعتراض و جواب کے بہت تھوڑے حصّہ پر محیط ہو سکی ہے۔ اعلان کیا گیا ہے کہ اگلی اشاعت بھی اسی سلسلۂ نقد کا دوسرا حصّہ ہوگی۔ ہم اپنے تمام قارئین سے پُر زور التماس کرتے ہیں کہ آج تک جو کچھ اختلافات ہمارے اور حافظ صاحب کے مابین ظاہر ہوتے رہے ہیں انھیں قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے "انوارِ اسلام" کی ہر ممکن اعانت فرمائیں۔ بعض اُمور میں متفق الرائے نہ ہونے کے باوجود ہماری اسلامی اخوت کے شیشے میں کوئی بال نہیں۔ نہ یہ کوئی معقولیت ہے کہ بعض علمی اختلافات کو ذاتی نزاع قرار دے لیا جائے۔ بھلائی

باقی صفحہ پر دیکھئے

کا مقام کیوں حاصل ہے۔ اس کے دراسات حنفی منہاج فکر سے کیسا قوی اور صحت مند رشتہ رکھتے ہیں کہ بڑے سے بڑا حنفی عالم اسکی عظمت و فقاہت کے آگے سر جھکا چکا ہے۔ یہ سب بتانے کی فرصت مولانا کو نہیں تھی (یہ ہم ہرگز نہیں کہتے کہ صلاحیت بھی نہیں تھی) تو کم سے کم یہ ضرور بتانا تھا کہ سید امیر علی کی عین الہدایہ سے انھوں نے کس نوع اور کتنی مقدار کا فائدہ اُٹھایا ہے۔ آیا عبارتوں ہی میں جزئی تبدیلیاں کی ہیں یا اس سے کچھ زائد بھی کام انجام دیا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جو عبارت لکھی ہے، وہ تو ہماری سمجھ سے بالا رہی۔

"مجھ جیسے بے بضاعت، کم مایہ، گمنام طالب علم کا
صبر آزما حالات میں ایسے لق ودق میدان میں قدم رکھنا
بظاہر نادانی سے کم نہیں لیکن جس کے بخشائشوں کے سمندروں
سے سب کو زندگی کے قطرات مل رہے ہیں اسی کے
افضال وعنایات کا سہارا لیکر جرأت بیجا کی جا
رہی ہے۔"

جرأت بیجا یعنی چہ؟ یہ رسمی نوع کی انکساری تو اس وقت بیجا تھی جب مولانا خود شرح کا ہفت خواں طے کرتے۔ کسی کرائی شرح کو الفاظ کی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ نقل کر دینا تو ایسا کارنامہ نہیں جس کے لئے یہ عبارت موزوں ہوسکے یا پھر بتایا ہوتا کہ نقل واقتباس سے بڑھ کر بھی آپ نے کیا کیا عرق ریزی کی ہے۔

اس دو صفحے کے پیش لفظ میں مولانا نے سات عربی شعر تو خود صاحب ہدایہ کے بلا ترجمہ نقل کیئے۔ مزید دس عربی شعر اپنے طور پر داخلِ عبارت فرمائے۔ اشعار سے نثر کو مزین کرنا بے شک ایک دل نشیں اسلوب ہے لیکن اس میں بے ساختگی اور برجستگی ہونی چاہیئے۔ اگر اشعار زبردستی دُم سے پکڑ کر لائے جائیں تو حسن کی بجائے عیب پیدا ہوتا ہے۔ یہ احساس بھی پیدا ہوتا ہے کہ لکھنے والا بہ تکلف اپنے ذوقِ شعری کی نمائش کر رہا ہے

معروضہ سخت سہی لیکن ہم چاہتے ہیں کہ جو حضرات دارالعلوم جیسی رفیع الشان درسگاہ کے استاد ہوں اور شیخ التفسیر جیسے رعب انگیز القاب کا بارِ گراں اپنے دوشِ مقدس پر سنبھالے ہوئے ہوں وہ سوچ سمجھ کر قلم اُٹھائیں اور اس بھرم کو قائم رکھیں جو کسی نہ کسی درجے میں دارالعلوم کا آج بھی موجود ہے۔ یہ بات تو معاف کی جاسکتی ہے کہ کسی استاد دارالعلوم کا قلم اُردو کی ارتقا پذیر تکنک اور اسلوب سے تہی دامن ہو، لیکن اسے کون معاف کریگا کہ معانی ومطالب اور علم وفکر کی سطح پر بھی یہ معیاری گل بوٹے نہ کھلا سکے۔ کاش ہدایہ کی پیش نظر شرح کا مقدمہ مولانا محمد نعیم خونِ جگر سے لکھتے۔ ایسا لکھتے کہ منھ سے بولتا۔

نفسِ شرح کی عبارتوں میں جو خوبیاں یا خامیاں ہیں انکا سہرا ہم کس کے سر باندھیں جب کہ معلوم ہی نہیں کہ سید امیر علیؒ اور مولانا نعیم صاحب میں کاوش ومحنت کی تقسیم کس تناسب سے ہے۔ بہرحال شرح عمدہ ہے۔ صاحب ہدایہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اسے پوری طرح سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے اور ذیلی نکات خاصی محنت سے منضبط کئے گئے ہیں۔ امام اعظمؒ کے ممتاز تلامذہ کی آراء اور مسالک نیز دیگر اساطین کے اقوال وافکار سے شرح کی علمی حیثیت بڑھ گئی ہے۔ کاش زبان وبیان میں سلاست اور شگفتگی کچھ اور ہوتی۔ تراجم جہاں جہاں سے دیکھے درست پائے لیکن انشاء کا نکھار ان میں بھی کم ہے۔ خدا جانے ہمارے دارالعلوم کے افاضل اُردو لکھنے کی مشق کیوں نہیں کرتے۔ یہ زمانہ اپنے مزاج کے اعتبار سے بہ الفاظِ اقبالؔ "خوگرِ پیکرِ محسوس" ہے۔ خوش نما پیکنگ کے بغیر اکسیر بھی کوئی نہیں لیتا۔ یہ ایک بُرائی سہی، لیکن اسی بُرائی سے لبریز فضا میں ہمیں اپنا کام کرنا ہے پھر کیوں نہ ہم ایسا لکھنا سیکھیں جو پڑھنے والوں کے حلقوں سے شربت کی طرح اترتا چلا جائے۔

لیکن یہ مطلب بھی نہیں کہ عبارتیں اظہارِ مطلب میں ناکام ہیں۔ شارح نے خاصے ایضاح اور بسط سے کام لیا ہے۔ کم استعداد کے لوگ بھی فائدہ اٹھالے جائیں گے۔ خشک علمی اور فنی مطالب کو عام فہم اُردو میں بیان کرنا ہنسی کھیل نہیں شارح اس باب میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ حنفی حضرات اس سلسلۂ زرّیں سے بیش از بیش فائدہ اٹھائیں۔

انوارِ اسلام دلائل القرآن نمبر | جناب حافظ امام الدین رام نگری کی ادارت میں نکلنے والے ماہنامے

باقی صفحہ ۶۹ پر دیکھو

کے کاموں میں لازماً تعاون دینا چاہیئے اور یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ جو خدمت حافظ صاحب نے اپنے ذمے لی ہے وہ دینی و ملی اعتبار سے بڑی ہی وقیع اور لائقِ قدر ہے قدر صرف باتیں بنانے سے نہیں ہوتی۔ ٹھوس مدد دیجئے۔ انوار اسلام کے خریدار بنائیے۔ دس بیس سو پچاس خریداروں کی اکھٹی رقم اپنی گرہ سے بھی بھیجدیں گے تو انشاء اللہ اجر آخرت کے مستحق قرار پائیں گے۔ امور خیر میں تعاون کے مجمل عنوان سے بھی پیسے بھیجے جا سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ انوار اسلام کی مدد کسی شخص واحد کی مدد نہیں بلکہ اس کا زاد اور مقصد کی مدد ہے جسے حافظ صاحب اپنے مانگی اور ناتوانی کے باوجود اللہ کی توفیق سے دل و جگر کا لہو دے رہے ہیں۔

باب الصحت مالیخولیا مراقی گھبراہٹ۔ وحشت اور ریاح (گیس) کی کثرت

روزمرہ ایسے مریضوں کے خطوط کافی تعداد میں آتے ہیں جن کو ریاح (گیس) کی کثرت گھبراہٹ اور وحشت کی شکایت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کثرت سے لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں۔ یہ تبخیری مرض ہے اسکو مالیخولیا مراقی بولتے ہیں۔ اس مرض میں مبتلا مریض کے دل کی دھڑکن عموماً غذا کھانے کے بعد زیادہ تیز ہوجاتی ہے۔ بعض دفعہ دل اس قدر دھڑکتا ہے کہ کھڑا ہونا دشوار ہوجاتا ہے۔ بے چینی، گھبراہٹ۔ وحشت اور فاسد خیالات پریشان کرتے رہتے ہیں۔ کسی کام کاج پر دل نہیں جمتا۔ طبیعت گری گری پژمردہ رہتی ہے۔ بلا وجہ طبیعت پر خوف و اندیشہ غالب ہوا کرتا ہے۔ مزاج چڑچڑا اور تنہائی پسند ہوجاتا ہے۔ نیند پورے طور پر نہیں آتی ہے۔ ریاح (گیس) کا غلبہ رہتا ہے۔ قبض کی شکایت ہوتی ہے۔ شام کے وقت طبیعت میں پستی ہوجاتی ہے۔ ہتھیلیاں اور تلوے جلا کرتے ہیں۔ آنکھوں میں سے آگ سی نکلتی محسوس ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس مرض کو اور زیادہ واضح طور پر سمجھنے کے لئے اور صحت و تندرستی کے متعلق زیادہ اور کارآمد معلومات حاصل کرنے کے لئے آپ "پاسبانِ صحت" مجھ سے منگوا کر پڑھیں۔ قیمت مع محصول دو روپے باسٹھ نئے پیسے ہے۔ اس مضمون میں میں اصول علاج اور غذا و پرہیز بتاؤں گی تاکہ جو مریض کسی سبب سے علاج نہ کرسکیں وہ اس مرض سے ایک حد تک امن سے رہیں۔ **اصول علاج**:۔ اس مرض میں وہی مخصوص دوائیں کام کرتی ہیں جو معدہ کی اصلاح کریں اور خصوصی طور پر تبخیر کو روکیں۔ اصول علاج یہ ہے کہ معدہ کی اصلاح کی جائے تاکہ بخارات (گیس) پیدا ہی نہ ہو۔ مریض کو نیند لانے اور خوش و خرم رکھنے کے سامان فراہم کئے جائیں۔ دل و دماغ کو مفرحات موافق مزاج سے تقویت پہنچائی جائے۔ **غذا**:۔ مالیخولیا مراقی جب حرارت کے ساتھ ہو تو اس غذا میں مونگ کی دھلی دال، تبیرہ مغز بادام مقشر شامل کر کے کھلوائیں۔ آش جو بہترین غذا ہے۔ ساگودانہ کی کھیر مفید ہے۔ لوکی۔ ٹنڈا۔ توری۔ بکری کے گوشت میں پکا کر کھلوائیں ۔۔۔ اگر حرارت نہ ہو تو غذا میں بکری کے گوشت کا سادہ شوربہ۔ چوزہ مرغ کا شوربہ۔ بیضۂ مرغ کی زردی۔ مچھلی۔ تیتر۔ بٹیر کا گوشت۔ شلغم۔ گاجر۔ مولی دیں۔ پھلوں میں سیب سنترہ۔ موسمی۔ انگور اور انار قندھاری کا رس مفید ہے۔ دالیں جہاں تک ہو کم ہی کھائیں۔ ارہر کی دال، مونگ ارہر کی دال کھا سکتے ہیں۔ **پرہیز**:۔ چاول۔ لوبیا۔ مسور۔ امرود۔ کھیرا۔ گوبھی۔ آلو۔ اروی۔ بینگن۔ مٹر۔ باقلا۔ ماش کی دال۔ ثابت ماش (اُڑد) مسور کی دال۔ مسور ثابت۔ دہی۔ تربوز اور دیگر بادی و ریاح پیدا کرنے والی اشیاء مضر ہیں ۔۔۔ اگر آپ اس مرض میں مبتلا ہیں یا کسی اور بیماری کا شکار ہیں مفصل حال لکھ کر مفت مشورہ لے سکتے ہیں۔ آپ کو ہر مرض میں خواہ وہ مردانہ ہو، صحیح مشورہ دیا جائے گا۔ البتہ جواب کے لئے ٹکٹ رکھنا نہ بھولئے۔ پتہ اپنا صاف لکھیئے

اسلام بھی عوام کی نظروں میں " نشانِ شوا " بن کر رہ جائے
آخر ان جماعتوں کو بھی ایک دن اسی طرح ختم ہونا ہے جس
طرح ماضی کی تمام جماعتیں ختم ہوگئیں جن کا آج نام ونشان
تک باقی نہیں ۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ کبھی جماعتوں
کو اسلام کی خاطر استعمال کیا جاتا تھا ۔ لیکن آج اسلام کو
جماعتوں کی خاطر استعمال کیا جا رہا ہے ۔

اب ہم اپنی بات پر آتے ہیں عرض یہ کر رہے تھے
کہ آج ماضی کی طرح پھر ایک بار نفاق و افتراق کا پرچم لہرا
رہا ہے اور مسلمان افراط وتفریط کے ہولناک گرداب
میں بڑی طرح گھر گئے ہیں قریب ہے کہ یہ گرداب انہیں
ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہضم کر جائے ۔ اب بھی وقت ہے کہ
ہم اپنی حالت بدلیں ۔ اگر ہم نے اب بھی اپنی حالت کو بدلنے کی
کوشش نہ کی تو ممکن ہے کہ قدرت بھی اپنا دست تعاون
کھینچ لے اور ہم اپنے انجام بد کو پہنچ جائیں ۔

آج وقت کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ ہم
دین اور متفرق جماعتوں کے باہمی ربط و تعلق کی نوعیت
نیز اسلام میں ان جماعتوں کے صحیح مقام کو سمجھیں اور اسی کے
مطابق عملی راہیں تجویز کریں ۔ اس کے بعد انشاء اللہ بات سلجھ
جائے گی اور ہر مسلمان اپنی جگہ خادم دین ثابت ہو سکے گا نیز
مسلمانوں میں اتحاد باہمی کا جذبۂ ملکوتی پھر سے جاگ اٹھے گا ۔
دین کے ساتھ ہماری ان متفرق جماعتوں کا ربط و تعلق بھی
وہی ہونا چاہئے جو جسم کے ساتھ اس کے مختلف اعضاء کا
ہوتا ہے اگرچہ کہ اعضاء اپنی وضع و ہیئت میں حرکات و
سکنات میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن باوجود
اس افتراق کے تمام اعضاء احساس دوئی سے بالاتر
ہیں ان کا دکھ درد ایک راحت و آرام ایک رنج والم ایک
حتیٰ کہ زندگی اور موت بھی ایک ہے ان اعضاء کے نزدیک
اس افتراق کی غرض و غایت محض اس نظم کی بحالی اور
ان مختلف انتظامی امور کی انجام دہی ہے جن پر جسم کی بقا
وسلامتی کا دارو مدار ہے ۔ مثلاً آنکھیں نہ ہوتیں تو امور
چوکیداری کون سنبھالتا کان نہ ہوتے تو کار سماعت کون انجام
دیتا ۔ ناک نہ ہوتی تو آکسیجن کیسے حاصل کی جاتی ذہن نہ
ہوتا تو حفاظتی تدابیر کون بتاتا ۔ پاؤں نہ ہوتے تو مسافت
کیسے طے کی جاتی اور بازو نہ ہوتے تو غذا کہاں سے مہیا
کی جاتی ۔ غرض بقاء جسم کی خاطر ان تمام امور کی انجام دہی
لازم ہے اور ان امور کی انجام دہی کے لئے مختلف اعضاء کا
مختلف اشکال میں ہونا بھی لازمی ہے جن کے بغیر جسم کی بقاء اور
سلامتی ممکن نہیں ۔

تمام اعضاء اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ان کا نفاق
واختلاف سارے جسم کے لئے پیغام ہلاکت ہے لہٰذا اسی
حقیقت شناسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے لئے اتحاد باہمی ناگزیر
ٹھہرا ۔ اگر کبھی جسم پر ناگاہ خارجی حملہ ہوجاتا ہے تو دیگر اعضاء
اس خیال خام کی بنیاد پر بے فکر نہیں ہو بیٹھتے کہ حملہ تو جسم پر
ہوا ہے انہیں کیا ، بلکہ حملے کے ساتھ ہی سارے جسم میں ایک لہر
سی دوڑ جاتی ہے اور آن کی آن میں غنیم کی نقل وحرکت سے
سارے جسم کو آگاہ کر دیتی ہے ۔ یہ غیر مرئی لہر جسم میں اسی لئے
تو رکھی گئی ہے کہ ہنگامی حالات میں تمام اعضاء کو فوری اطلاع
پہونچاتی رہے موصول اطلاع پر تمام اعضاء بیک وقت متاثر
ہو جاتے ہیں اور اپنے اپنے ہتھیار سنبھالے جسم کی مدافعت
پر غنیم کے خلاف محاذ قائم کر لیتے ہیں ذہن تدابیر بتائے گا
آنکھیں چوکیداری کی جگہ سنبھال لیں گی ۔ کان ہر قسم کی آہٹ پر
چوکنا اور ہاتھ پاؤں غنیم کی گھات میں نظر آئیں گے اگر جسم
کی بقاء و سلامتی کسی عضو سے قربانی کی درخواست بھی کر دے
تو جذبۂ رفاقت اور احساس یکتائی کے نشہ میں سرمست اور
عشق و مستی سے سرشار اعضاء قربانی کی بھینٹ چڑھنے میں
ایک دوسرے سے پہل کرتے نظر آئیں گے ۔ اس لئے کہ وہ اس
بات سے بخوبی واقف ہیں کہ جسم کی بقا ہی اپنی بقا ہے اور
جسم کی موت ہی اپنی موت

مثل المومنین فی توادھم وتراحمھم وتعاطفھم کمثل الجسد الواحد اذا اشتکی منہ عضو	آپس کی محبت اور رحمت و مہربانی میں مسلمانوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک جسم کا اگر اس کے ایک عضو کو تکلیف

تداعی له سائر الجسد بالسهر والحمی	پہنچے تو سارا جسم اس کے لئے بے خواب وبے آرام ہوجاتا ہے۔

دین کے ساتھ بھی ہمارے یہی روابط اور یہی تعلقات، یہی جذبات اور یہی احساسات ہونے چاہیں۔ عہد نبوی میں اگرچہ کہ اصحاب رسول بھی مختلف دینی شعبوں میں منقسم ہر شعبہ اپنی اپنی دینی خدمات پیش کر رہا تھا قیام دین کی خاطر مختلف سمتوں سے مختلف کوششیں جاری تھیں مگر نہ کہیں ٹکراؤ تھا نہ تضاد اور نہ کہیں تعصب تھا نہ عناد اس لئے کہ ایک اور واحد جماعت کا وہ اسلامی تصور جیسے قرآن اپنی اصطلاح میں حزب اللہ کہتا ہے ان کے قلب وذہن کی گہرائیوں میں اس طرح اُتر گیا تھا کہ جس کے بعد جماعتی وگروہی عصبیت کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی۔ ہر شعبہ اپنی جگہ یہی محسوس کر رہا تھا کہ "ہم تمام ایک ہی امر کے مختلف خادم ہیں اور ہماری ان متفرق خدمات پر ہی قیام دین کا انحصار ہے" لہذا تمام شعبے متحد ہوکر دین کی تعمیر میں مصروف کار تھے لیکن افسوس کہ مختلف دینی شعبوں کا وہی احساس آج ہمارے اندر جماعتی وگروہی عصبیت کا رنگ اختیار کرتا جارہا ہے جس کی وجہ سے دو قسم کے اثرات ہم پر مرتب ہو رہے ہیں۔ ایک طرف ہم نفاق واختلاف کے مہلک مرض میں تدریجًا مبتلا ہوتے جارہے ہیں اور دوسری طرف ہمارے قلب وذہن سے "ایک" اور واحد جماعت کا اسلامی تصور مٹا جارہا ہے، ہماری باہمی کشیدگی اور ٹکراؤ کا یہی واحد سبب ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ عہد نبوی کی متعدد جماعتوں میں تو مکمل سکون واتحاد لیکن آج ہماری صرف ان دو جماعتوں میں یہ انتشار واختلاف۔

حضور ؐ نے منتشر قوم کو یک جا مجتمع کرنے اور انکے اندر "ایک" اور واحد جماعت کا احساس پیدا کرنے کی خاطر مکمل تئیس سال انتھک کوشش فرمائی اور مسلمانوں کو اُن تمام امور سے سخت احتراز واجتناب کرنے کی ہدایت فرمائی جو باہمی نفاق اور انتشار کا موجب بن سکتے ہوں خدا کے سچے رسول نے اتحاد ملت کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کردیا حتٰی کہ عبادت گاہ جیسی مقدس شئے بھی قربانی کی بھینٹ چڑھانے میں دریغ نہیں فرمایا۔

رسول اکرم ؐ کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں سب سے زیادہ خطرہ جس بات کا تھا یہی افتراق وانتشار کا تھا کہ کہیں جاہلی عصبیت کی بنا پر اسلام کا قصر ملت پارہ پارہ نہ ہوجائے۔ اسی خطرے کے پیش نظر آپ بار بار فرمایا کرتے تھے۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے بعد تم پھر کفر کی طرف پلٹ کر آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو"

زندگی کے آخری حج "حجۃ الوداع" کے لئے تشریف لے گئے تو مقام عرفات میں تمام اُمت کو خطاب کرکے فرمایا۔

"سُن رکھو کہ اُمور جاہلیت میں سے ہر چیز آج میرے اِن دونوں قدموں کے نیچے ہے آج سے عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے اور سب مسلمان بھائی بھائی ہیں جاہلیت کے تمام دعوے باطل کردیئے گئے۔ اے تمہارے خون اور تمہاری عزتیں اور تمہارے اموال ایک دوسرے کے لئے ویسے ہی حرام ہیں جیسے آج حج کا دن تمہارے اس مہینہ، تمہارے اس شہر میں حرام ہے"

پھر مقام منیٰ پر تشریف لے گئے اور اپنی اُسی تقریر کو دُھرایا اور اس پر یہ اضافہ کیا۔

"دیکھو! میرے بعد پھر گمراہی کی طرف پلٹ کر ایک دوسرے کی گردنیں نہ مارنے لگنا۔ عنقریب تم اپنے رب سے ملنے والے ہو وہاں تمہارے اعمال کی تم سے بازپرس ہوگی سُنو! اگر کوئی نکٹا حبشی تمہارا امیر بنا دیا

جائے اور وہ تم کو کتاب اللہ کے مطابق چلائے تو اُس کی بات ماننا اور اطاعت کرنا "

یہ ارشاد فرما کر پوچھا کہ "کیا میں نے تم کو یہ پیغام پہنچا دیا ؟" لوگوں نے کہا "ہاں یا رسول اللہؐ " فرمایا " اے خدا تو گواہ رہیو " اور لوگوں سے کہا " جو موجود ہے وہ اس پیغام کو اُن لوگوں تک پہنچا دے جو موجود نہیں ہیں "

حج سے فارغ ہو کر شہدائے اُحد کے مقام پر تشریف لائے اور پھر تمام مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔

" مجھے اس کا خوف نہیں ہے کہ میرے بعد تم شرک کروگے مگر ڈرتا اس سے ہوں کہ کہیں تم دنیا میں مبتلا نہ ہو جاؤ اور آپس میں لڑنے نہ لگو۔ اگر ایسا کروگے تو ہلاک ہو جاؤگے۔ جس طرح پہلی اُمتیں ہلاک ہو چکی ہیں "

اِن تصریحات کے بعد ایک طرف اتحاد باہمی کی اہمیت وضرورت اور دوسری طرف باہمی رقابت وافتراق کی قباحت ومضرت مزید وضاحت کی متقاضی نہیں رہی۔

ہر مسلمان اپنی جگہ غور کر سکتا ہے کہ ہماری باہمی رزم آرائیاں خواہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، دین وملت کے لئے کس قدر مضرت رساں اور زہر قاتل ثابت ہو سکتی ہیں ہم [illegible] جماعتوں کی ذمہ دار شخصیتوں سے گذارش کریں گے کہ فریضۂ تبلیغ واشاعت دین کے پہلو بہ پہلو اس امر کی بھی کوشش کی جائے کہ ایک طرف مسلمانوں میں پھر سے "ایک" اور واحد جماعت کا اسلامی احساس جاگ اُٹھے اور دوسری طرف باہمی نفاق اور جماعتی عصبیت کا خاتمہ ہو جائے اسلئے کہ اتحاد ملت ہی وہ واحد بنیاد ہے جس پر قصر دین کی سربفلک دیواریں چنی جاتی ہیں، اتحاد ملت ہی وہ جوہر ہے جس سے دین کو استحکام اور حیات جاوید حاصل ہوتی ہے، اور اتحاد ملت ہی وہ وصف ہے جس سے ملت کی رنگت نکھرتی ہے اور ایک مثالی معاشرہ عالم وجود میں آتا ہے۔ اتحاد وجذب باہم کے بغیر نہ مذہب ہے نہ ملت۔

TAJALLI DEOBAND U.P. Regd. No. A

DURR-E-NAJAF

DARULFAIZ RAHMANI DEOBAND

ماہنامہ

تجلی

دیوبند

ڈاک نمبر

ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے

ایڈیٹر عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ تجلی دیوبند
ڈاک نمبر

شمارہ ۱۱-۱۲ — جلد ۱۵

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

سالانہ قیمت سات روپے
فی پرچہ ۶۲ پیسے

غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۱۸ شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر
پوسٹل آرڈر پر کچھ نہ لکھئے بالکل سادہ رکھئے

اگر اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس پرچہ پر آپکی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ اگر آئندہ خریداری جاری رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائیگا جسے وصول کرنا آپکا اخلاقی فرض ہوگا وی پی سات روپے بیشتر نئے پیسے کا ہوگا۔ منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائینگے۔ پاکستانی حضرات ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیجکر رسید منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتہ ہمیں بھیجدیں سالہ جاری ہو جائیگا۔

فہرست مضامین

مطابق ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۶۳ء

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
دفتر تجلی۔ دیوبند ضلع سہارنپور (یوپی)

پاکستانی حضرات
نیچے لکھے ہوئے پتہ پر منی آرڈر ... رسید ہمیں بھیجدیں منی آرڈر کی رسید ڈاکخانہ سے ملتی ہے۔

مکتبہ عثمانیہ ۲۲۸۰ مینا بازار
پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی (پاکستان)

مدیر
عامر عثمانی
فاضل دیوبند

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے ... پریس ... سے چھپوا کر دفتر تجلی دیوبند سے شائع کیا۔

آغازِ سخن

کوشش تو یہی تھی کہ ڈاک نمبر آپ کے ہاتھوں میں ٹھیک وقت پر پہنچ جائے لیکن یہ آٹھ دس دن لیٹ ہو گیا۔ غنیمت ہے کہ فقط اتنا ہی لیٹ ہوا ورنہ حالات تو ایسے ہی تھے کہ ایک مہینہ بھی لیٹ ہو سکتا تھا۔

ویسے حالات فقط ایک بہانہ ہی ہیں — یوں کہیئے باری تعالیٰ جس کام کو جس وقت کے لئے مقدر فرما دیں وہی اس کا ٹھیک وقت ہے۔ ہم نے سعی و جہد میں کمی نہیں کی۔ پھر بھی چند روز کی تاخیر کا منھ دیکھنا پڑا تو اس پر نہ ہمیں شرمندگی ہے نہ صدمہ۔ رنج و ندامت کا احساس آدمی کو اپنی سعی و عمل کی کوتاہی پر ہونا چاہیئے نہ کہ نتائج پر۔ وَاِلَی اللّٰہِ تصیرُ الامور اور وِلِلّٰہ عاقبۃُ الامور جیسی آیات مبینات کا یہی مطلب ہے کہ پایانِ کار اور مآل و انجام تو ہر حال میں اللہ رب العزت ہی کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ انسان اس کے لئے مسئول نہیں۔ وہ فقط کوششِ تامہ کا مکلف ہے اسی کے لئے جواب دہ ہے۔ الحمد للہ ہم نے ڈاک نمبر کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اپنی قوت و قدرت کی حد تک شمہ برابر کوتاہی نہیں کی اور چند روز کی تاخیر سے سہی یہ بہرحال آپ کے ہاتھوں ہی میں ہے۔

یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ جو خاکہ ہم نے سوچا تھا ٹھیک اسی کے مطابق نمبر ترتیب پا گیا ہے۔ ذہنی تجویز تو یہ تھی کہ الف سے یا تک سوال و جواب ہی دیں گے تاکہ جمع شدہ ڈاک کا بڑا حصہ ٹھکانے لگ جائے لیکن حالات ایسے پیش آتے چلے گئے کہ ہمیں کچھ اور بھی شاملِ اشاعت کرنا پڑا — پھر وہی حالات! آپ جھلا کر پوچھ سکتے ہیں کہ آخر کیا قیامت ٹوٹی تھی تم پر۔ ؟ کونسی دیواریں حائل ہو گئی تھیں تمہاری راہ میں جنھیں تم "حالات" کا مبہم و مجمل نام دے کر اپنی نارسائیوں پر پردہ ڈالنا چاہتے ہو ؟—

ہم گردن جھکا کر جواب دیں گے کہ جھلاہٹ سر آنکھوں پر لیکن :—

سفینہ جب کہ کنارے سے آلگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیئے

اچھا یہی ہے کہ "حالات" کے بہلانے کو مجمل ہی رکھا جائے اور دو ۲ مہینوں کی لمبی کہانی سُنا کر آپ کا وقت نہ برباد کیا جائے۔

مزا یہ ہے کہ ڈاک نمبر کا پیٹ بھرنے کے بعد بھی ڈاک کا انبار بس اتنا ہی گھٹا ہے جیسے پچاس من خرمن میں سے من دو من غلہ الگ کر لیا جائے۔ شاید قسمت کا فیصلہ ہی اس سلسلے میں یہ ہے کہ ہر پانچویں چھٹے مہینے ہم سوالات کا ایک پلندہ ردّی کر دینے پر مجبور رہیں اور پھر نئے سرے سے دانہ دانہ کرکے ڈھیر جمع ہوتا جائے۔

تبصروں کا معاملہ الگ ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ وقت اگر ربڑ ہوتا تو ہم کھینچ کر پچاس گھنٹے کا دن بنا لیتے اور آدھا دن تبصرہ طلب کتابوں کے مطالعہ میں صرف کیا کرتے، لیکن وقت سے زیادہ بے رحم اور بے مروت شاید ہی کوئی چیز ہو۔ ہر گذرنے والے دن کے ساتھ کتابیں اپنا پھیلاؤ بڑھاتی جا رہی ہیں اور ان کے بھیجنے والے ہماری جان کو رو رہے ہیں

انجام اس کے سوا کیا ہوگا کہ ہمیں بھی اپنی روش چھوڑ کر روشِ عام اختیار کرنی پڑے گی۔ روشِ عام آپ جانتے ہی ہیں۔ کتاب کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔ چند صفحے کہیں کہیں سے پڑھے اور تبصرہ صادر کر دیا۔ چند صفحے بھی سب تبصرہ نگار نہیں پڑھتے۔ ہماری نظر سے ایسے "مبصرین" بھی گذرے ہیں اور گذرتے رہتے ہیں جنھیں کتاب کی فقط لوح دیکھ کر تبصرہ کر ڈالنے کا شاندار فن آتا ہے۔

ہمیں اب تک ایسا خیال ہے کہ پڑھے بغیر تبصرہ کرنا شاید "بددیانتی" کے زمرے میں شامل ہو۔ لیکن ہم اگر "کھرے کھوٹے" کی پیشانی پر یہ فقرہ لکھوا دیں:۔

"تبصرہ نگار کتاب کو پڑھنے کا ذمہ دار نہیں"

تو آپ کی رائے میں کیسا رہیگا؟ — کیا پھر بھی "بددیانتی" کا الزام عائد ہو سکے گا؟

اور سنئیے۔ ڈاک نمبر تو فقط آٹھ دس روز لیٹ ہوا مگر جنوری کا شمارہ کم سے کم پندرہ دن مؤخر ہوتا نظر آرہا ہے۔ آخر کیسے مؤخر نہ ہوگا جب حالات نے — جی ہاں حالات نے ہمارے خلاف سازش کی ٹھان لی ہو۔ یہ حالات ہی ہیں کہ جناب وحیدالدین خاں صاحب کی کتاب "تعبیر کی غلطی" ہمیں اواخرِ اکتوبر میں ملی لیکن وسط نومبر سے قبل ہم اس کے مطالعے کا شرف حاصل نہ کر سکے۔ جب جوں توں کر کے یہ شرف حاصل ہی ہو گیا تو اب اس کا موقع نہیں مل رہا کہ اپنے تأثرات کو کاغذ پر الفاظ کی شکل میں بکھیر سکیں۔ تقاضے احباب کے پہلے ہی سے جاری ہیں اور خود ہمارا بھی جی چاہتا ہے کہ اظہارِ خیال ہو اور کھل کر ہو مگر پانچ سو بیس صفحات کی کتاب پر کھل کر اظہارِ خیال کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ تجلی کی کم سے کم ایک اشاعت تو اس پر جھونک ہی دیں۔ جھونک دینا محال نہیں تھا۔ ہم نے بعض مسائل پر کئی کئی مہینوں سر مارا ہے لیکن سر اور دیوار کا فاصلہ اگر زیادہ ہو تو سر مارنے کے لئے بھی کچھ نہ کچھ وقت ضرور درکار ہوگا۔ وقت بآسانی میسر آجاتا تو حالات کا "ماتم" کبھی نہ

کرتے — حالات، جنھوں نے ڈاک نمبر لیٹ کرایا ہے اب بھی گھیرا ڈالے کھڑے ہیں۔ توقع نہیں کہ یہ گھیرا دو ماہ سے قبل ٹوٹ سکے۔ مسئلہ اگر ہلکا پھلکا ہوتا تو ہم تبرّع میں بھی جاتے جاتے دس پانچ ورق تو سیاہ کر ہی جاتے مگر مسئلہ سنگین ہے۔ وحیدالدین خاں صاحب نے بڑی جانفشانی، بڑی لگن، بڑے طمطراق اور بڑے تحفظ کے ساتھ مولانا مودودی کے پورے تصورِ دین ہی کو "اُلٹا درخت" ثابت کرنا چاہا ہے اور پھر اپنے دلائل و شواہد پر انھیں اتنا اصرار، اتنا وثوق ہے کہ وہ ہر اس شخص کا رد کرنے کے لئے قلم اُٹھائے ہوئے ہیں جو ان کے افکارِ عالیہ کی طرف انگلی بھی اُٹھانے کی جرأت کرے۔ ان "سنگین" حالات میں ہم ہرگز پسند نہیں کرتے کہ مختصراً کچھ لکھ کر انھیں شکایت کا موقع دیں اور قارئین کو بھی تشنگی باقی رہ جائے۔ ہم کتاب کا جائزہ لیں گے تو پوری طرح لیں گے۔ گفتگو ہوگی تو مفصّل ہوگی۔

ویسے ہماری شوریدہ سری سے بعید یہ بھی نہیں تھا کہ — حالات — کی پرواکئے بغیر اگلے ہی شمارے کو "جائزہ نمبر" بنا دینے کا اعلان کر ڈالتے مگر خانصاحب کی کتاب کا کافی حصّہ بعض واقعات و شخصیات سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ واقعات ظاہر ہے علمی و نظری بحث کا موضوع نہیں۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ متعلقہ شخصیات خود ہی اپنے موقف اور پوزیشن پر روشنی ڈالیں۔ یہ کوشش کب تک بارآور ہوتی ہے اس کا مدار ان شخصیتوں پر ہے۔ جب بھی ہمیں ضروری معلومات بہم پہنچ گئیں انشاء اللہ فوراً ہی تجلی میں جائزہ نمبر کا اعلان آجائے گا اور پھر انشاء اللہ محترم خانصاحب کو یہ شکایت نہیں ہوگی کہ ناقد حضرات ان کی بات کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہے ہیں۔

جو لوگ اس کتاب کے بارے میں ہماری رائے معلوم کرنے کے لئے بہت بیتاب ہیں اُن سے آج کی صحبت میں تو بس اتنا ہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ مولانا مودودی کے دینی فکر کے بارے میں جو رائے ہم مدت سے رکھتے آئے ہیں اسمیں اس کتاب نے کوئی تبدیلی نہیں کی۔ رنج اس کا ہے کہ خاں صاحب کی

یہ کتاب ایک ایسے وقت میں منظرِ عام پر آئی ہے جب کہ مولانا مودودی اعداء کے نرغے میں ہیں۔ ان پر چاروں طرف سے الزام و افتراء کی یلغار ہے۔ ان کے گرد گھیرا ڈالا جا رہا ہے۔ ان کے حلقوم کی طرف وہی ہاتھ تیز رفتاری سے بڑھ رہے ہیں جو ہمیشہ ہر مصلح، ہر داعیِ حق کی طرف بڑھتے آئے ہیں ایسے نازک وقت میں یہ توقع بالکل نہیں کی جا سکتی کہ وہ میدانِ کارزار سے ہٹ کر "تعبیر کی غلطی" پڑھنے بیٹھیں گے اور پھر ایک ایسی بحث میں اُلجھیں گے جو پہاڑ کی چوٹی پر بنی ہوئی کسی خانقاہِ امن و عافیت ہی میں موزوں ہو سکتی ہے۔

لے بیچ لاہاں ان کو بھی تو دو چار تھپیڑے طوفان کے
جو لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارا کرتے ہیں

وحید الدین خاں صاحب بہت ذہین بڑے صالح اور عابد و زاہد آدمی ہیں۔ انھوں نے تو اپنی دانست میں "تعبیر کی غلطی" لکھ کر خدمتِ دین ہی کی ہے اور اس خدمت کو داد و تحسین کا خراج ادا کرنے والا حلقہ بھی انھیں ہاتھوں ہاتھ مل گیا ہے، لیکن وقت آرہا ہے جب بارگاہِ ربّ العزت میں ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کا نام دین کے خدمتگاروں کی فہرست میں درج ہے یا اس فہرست میں جا پڑا ہے جو دعوتِ حق کی راہ میں روڑے اٹکانے والوں کے ناموں کا احاطہ کرتی ہے۔

بہرحال یہ موقع زیادہ باتوں کا نہیں ہے۔ بسط و تفصیل کے لئے آنے والے دنوں کا انتظار کیجئے۔ وباللّٰہ التوفیق وھو المستعان۔

قاموس القرآن | قرآنی الفاظ کی ایک بے نظیر لغت۔ ضخیم کتابوں کا نچوڑ، الفاظ و اصطلاحات کے ذیلی مباحث سے مزین اور صرف و نحو کے متعلق نکات سے مالا مال۔ قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی خواہش رکھنے والوں کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ۔ مجلد آٹھ روپے۔

ردِّ بدعت | حضرت مجدد الف ثانیؒ کے فرمودات کی روشنی میں بعض ایسی بدعات کا رد جو عوام ہی میں نہیں خواص میں بھی مقبول و مروّج ہو گئی ہیں۔ سوا روپیہ

نور الدرایہ | فقہ حنفی کی مشہور کتاب "ھدایہ" کی مستند اردو شرح۔ یہ شرح ماہوار قسطوں میں چھاپی جا رہی ہے۔ اب تک تین جز چھپے ہیں۔ فی جز دو روپے۔ تین جز ایک ساتھ طلب کرنے والوں کو محصول ڈاک معاف

امام غزالیؒ کی چند کتابیں اُردو لباس میں

خُلقِ مسلم - - - - - - - - - - پانچ روپے
کیمیائے سعادت - - - - - - - بارہ روپے
الحکمۃ فی مخلوقات اللہ - - - - - - سوا تین روپے
تبلیغ دین - - - - - - - - ساڑھے چار روپے
تقاریر امام غزالیؒ - - - - - - - سوا دو روپے
منہاج العابدین - - - - - - - - آٹھ روپے

المنجد | دنیا کی مشہور ترین عربی ڈکشنری - اُردو داں حضرات کے لئے اس عظیم ڈکشنری کا اُردو ترجمہ کر دیا گیا ہے یعنی عربی الفاظ کی تشریح اُردو میں - بے شمار خاکوں اور اشیاء کی تصویروں سے مزین - مجلد اٹھائیس روپے۔

مکاتیبِ زنداں | جیل سے مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور میاں طفیل احمد کے خطوط۔ دو روپے

سنتِ خیر الانامؐ | فتنۂ انکار حدیث کے رد میں ایک نفیس کتاب۔ اس کے مطالعے سے عام قارئین کو حدیث کی اقسام اور مراتب و درجات وغیرہ کے بارے میں بڑی مفید معلومات حاصل ہوں گی۔ مجلد پانچ روپے۔

تزکیۂ نفس — مولانا امین احسن اصلاحی — پانچ روپے
امامت عظمیٰ — سید محمد رشید رضا مصری — دو روپے ... پیسے
فیوض الحرمین — شاہ ولی اللہؒ — ساڑھے چار روپے
خیر کثیر — — چھ روپے

مکتبہ تجلی - دیوبند (یو۔پی)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

جماعتِ اسلامی کی دعوت

ہماری یہ جماعت جس غرض کے لئے اٹھی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں اور آغاز کار کے طور پر اس ملک میں ایک ایسی سوسائٹی منظم کی جائے جو اسلام کے اصلی اصولوں پر شعور و اخلاص کے ساتھ خود عامل ہو۔ دنیا کے سامنے اپنے قول و عمل سے اس کی صحیح نمائندگی کرے اور بالآخر جہاں جہاں بھی اس کی طاقت جڑ پکڑ جائے وہاں کے افکار، اخلاق، تمدن، معاشرت، سیاست اور معیشت کے نظام کو موجودہ دہریت اور مادہ پرستی کی بنیادوں سے اکھاڑ کر پھر خدا پرستی یعنی توحید کی بنیاد پر قائم کرے۔

اس جماعت کو یہ یقین ہے کہ موجودہ تہذیب اور اس کا پورا نظامِ زندگی جن اصولوں پر قائم ہے وہ قطعاً فاسد ہیں اور اگر دنیا کا انتظام انہی اصولوں پر چلتا رہا تو وہ بڑے ہولناک نتائج سے دوچار ہوگی — اس کے جو نتائج اب تک نکل چکے ہیں وہ بھی کچھ کم ہولناک نہیں ہیں۔ مگر انہیں کوئی نسبت اس انجام کی ہولناکی سے نہیں ہے جس کی طرف یہ تہذیب دنیا کو لئے جا رہی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ہم اس دنیا سے کہیں باہر نہیں جی رہے ہیں بلکہ اس کے اندر ہی سانس لے رہے ہیں لہٰذا اگر ہم ان اصولوں کو فاسد اور بدانجام سمجھتے ہوئے بھی منفعلانہ طریقے سے اسی نظام کے تحت زندگی بسر کئے چلے جائیں اور تہذیب حاضر کے مغربی اماموں اور مشرقی مقلدوں کی پیشوائی و سربراہ کاری کے آگے سپر ڈالے رہیں تو جس تباہی کے گڑھے میں یہ دنیا گرے گی اسی میں اس کے ساتھ ساتھ ہم بھی جا گریں گے اور ہم اس انجام کے مستحق ہوں گے۔ ہم پوری بصیرت کے ساتھ یہ جانتے ہیں اور اپنے علم پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا نے انسان کی رہنمائی کے لئے اپنے پیغمبروں کے ذریعے جو ہدایت نازل کی ہے اسی کی پیروی میں ہماری اور سب انسانوں کی فلاح مضمر ہے اور انسانی زندگی کا پورا انتظام اسی وقت صحیح چل سکتا ہے جبکہ اسے ان اصولوں پر قائم کیا جائے جو انسانوں کے خالق کی دی ہوئی ہدایت میں ہم کو ملتے ہیں۔ ہمارے اس علم و یقین سے یہ فرض خود بخود ہم پر عائد ہو جاتا ہے اور یہی فرض خدا نے بھی اپنے مطیع فرمان بندوں پر عائد کیا ہے کہ ہم اس نظامِ زندگی کے خلاف جنگ کریں جو فاسد اصولوں پر چل رہا ہے اور وہ صالح نظام قائم کرنے کے لئے جدوجہد کریں جو خدائی ہدایت کے دیئے ہوئے اصولوں پر مبنی ہو۔

یہ کوشش ہمیں صرف اسی لئے نہیں کرنی چاہئے کہ دنیا کی خیرخواہی ہم سے اس کا مطالبہ کرتی ہے۔ نہیں ہم خود اپنے بھی سخت بدخواہ ہوں گے اگر اس سعی و جہد میں اپنی جان نہ لڑائیں کیونکہ جب اجتماعی زندگی کا سارا نظام فاسد اصولوں پر چل رہا ہو، جب باطل نظریات و افکار ساری دنیا پر چھائے ہوئے ہوں جب خیالات کو ڈھالنے اور اخلاق و سیرت کو بنانے کی عالمگیر طاقتوں پر فاسد نظامِ تعلیم، گمراہ کن ادبیات، فتنہ انگیز صحافت اور خباثت سے لبریز ریڈیو اور سینما کا تسلط ہو جب رزق کے تمام وسائل پر ایک ایسے معاشی نظام کا قبضہ ہو جو حرام و حلال کی قیود سے ناآشنا ہو جب تمدن کی صورت گری کرنے اور اس کو ایک خاص راہ پر لے چلنے کی ساری طاقت ایسے قوانین اور ایسی قانون سازی مشینری کے ہاتھ میں ہو جو اخلاق و تمدن کے سراسر مادہ پرستانہ تصورات پر مبنی ہیں اور جب قوموں کی امامت اور دنیا کی پوری زمامِ کار ان لیڈروں اور حکمرانوں کے ہاتھ

ہیں جو خدا کے خوف سے اور اس کی رضا سے بے نیاز ہیں اور اپنے کسی معاملے میں بھی یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ ان کے خالق کی ہدایت اس معاملے میں کیا ہے۔ تو ایسے نظام کی ہمہ گیر گرفت میں رہتے ہوئے ہم خود اپنے آپ کو بھی اس کے بُرے اثرات اور بدتر نتائج سے کب بچا سکتے ہیں۔ یہ نظام جس جہنم کی طرف جا رہا ہے اسی کی طرف وہ دنیا کے ساتھ ہمیں بھی تو گھسیٹے لئے جا رہا ہے اگر ہم اس کی مزاحمت نہ کریں اور اس کو بدلنے کی کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور نہ لگائیں تو یہ ہماری اور ہماری آئندہ نسلوں کی دنیا خراب اور عاقبت خراب تر کر کے چھوڑیگا۔

لہٰذا محض دنیا کی اصلاح ہی کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے بچاؤ کے لئے بھی یہ فرض ہم پر عائد ہوتا ہے اور یہ سب فرضوں سے بڑا فرض ہے کہ ہم جس نظامِ زندگی کو پوری بصیرت کے ساتھ فاسد و مہلک جانتے ہیں اسے بدلنے کی سعی کریں اور جس نظام کے برحق اور واحد ذریعۂ فلاح و نجات ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اسے عملاً قائم کرنے کی جد و جہد کریں۔

ہاتھوں کی نہیں بلکہ نظام کی تبدیلی

اس مختصر گزارش سے آپ یہ بات پا گئے ہوں گے کہ ہمارا اصل مدعا موجودہ نظام کے چلانے والے ہاتھوں کا بدلنا نہیں ہے، بلکہ خود نظام کا بدلنا ہے۔ ہماری کوششوں کا مقصود یہ نہیں ہے کہ نظام تو یہی رہے اور انھیں اصولوں پر چلتا رہے مگر اس کو مغربی نہ چلائے مشرقی چلائے یا انگریز نہ چلائے ہندوستانی چلائے یا ہندو نہ چلائے "مسلمان" چلائے۔ ہمارے نزدیک محض ہاتھوں کے بدل جانے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ شور تو بہرحال شور ہے ہی اور اپنی ذات میں ناپاک ہے، خواہ اسے کافر باورچی پکائے یا مسلمان باورچی بلکہ مسلمان باورچی کا شور پکانا اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے اور گمراہ کن بھی۔ بہت سے بزرگانِ خدا خشک اچھے خاصے پرہیزگار لوگ بھی اس ظالم کے ہاتھ کا پکا ہوا شور اس اطمینان کی بناء پر کھا جائیں گے کہ یہ مسلمان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا ہے اور اگر اس پخت و پز کے دوران میں وہ چمچے کی ہر گردش پر آوازِ بلند بسم اللہ پڑھتا رہے اور اس کے چُنے ہوئے دسترخوان پر مسلمانوں کو کافر کے دسترخوان کی بہ نسبت تنا دل ماحضر کی زیادہ آسانیاں اور آزادیاں میسر ہوں اور محفلِ طعام کے گرد و پیش کچھ ایسے لوازم بھی فراہم کر دیئے جائیں جو عام طور پر اسلامی لوازم سمجھے جاتے ہیں تو یہ اور بھی زیادہ سخت دھوکا دینے والی چیز ہو گی۔ اس قسم کی نمائشی اسلامیت اگر موجود ہو تو وہ اس حرام خوراک کو قبول کر لینے کے لئے کوئی سفارش نہیں ہے بلکہ ظاہر فریبیاں اس معاملے کو اور بھی زیادہ پُر خطر بنا دیتی ہیں۔

لہٰذا ہم کسی ایسی ظاہری تبدیلی پر نہ خود مطمئن ہو سکتے ہیں اور نہ کسی کو مطمئن ہوتے دیکھ سکتے ہیں جس میں یہ فاسد نظام تو جُوں کا تُوں قائم رہے اور صرف اسکے چلانے والے ہاتھ بدل جائیں۔ ہماری نظر ہاتھوں پر نہیں بلکہ ان اصولوں پر ہے جن پر زندگی کا نظام چلایا جاتا ہے۔ وہ اصول اگر فاسد ہیں تو ہم ان کے خلاف جنگ جاری رکھیں گے اور انھیں صالح اصولوں سے بدلنے کی کوشش کریں گے۔

ہم جو کچھ کریں گے جمہوری اور آئینی طریقوں سے کریں گے

اس سے پہلے میں ایک مختصر بیان میں اس الزام کی واضح تردید کر چکا ہوں جو پنجاب یونیورسٹی اور بعض ملحقہ کالجوں کے ہنگاموں کے سلسلے میں مجھ پر اور جماعت اسلامی پر تھوپا جا رہا ہے مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ اس معاملے میں حکومت کو گمراہ کرنے کی کوششوں کا سلسلہ برابر جاری ہے اور عوام میں بھی بدگمانی پھیلانے کے لئے ایک مہم چل رہی ہے۔ اسلئے میں تمام حقائق حکومت اور عوام کے سامنے رکھ دینا چاہتا ہوں

اس الزام کی پوری عمارت صرف دو بنیادوں پر کھڑی کی جا رہی ہے۔ ایک یہ کہ اسلامی جمعیت طلبہ کیساتھ میرے تعلقات ہیں۔ دوسرے یہ کہ لاہور کے بعض طلبہ جن میں یونیورسٹی سٹوڈنٹ یونین کے صدر نصر اللہ شیخ صاحب اور امیدوار صدارت بارک اللہ صاحب بھی شامل ہیں۔ ایک مدت سے میرے پاس آتے جاتے رہے ہیں۔ لیکن قطع نظر اس سے کہ حال کے ہنگاموں میں اسلامی جمعیت طلبہ اور لاہور کے ان طالبعلموں کی ذمہ داری کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا کسی جماعت یا چند اشخاص کے ساتھ کسی شخص کے تعلقات کا ہونا اس بات کے لئے کافی ہے کہ ایک خاص واقعہ کی ذمہ داری اس پر تھوپ دیجائے؟ اس کے لئے تو یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ اس واقعہ کا صدور اس شخص کے ایماء پر ہوا ہے۔ اس کا کوئی ثبوت اگر موجود نہ ہو تو کوئی ایماندار انسان خالی قیاسات اور بدگمانیوں پر فیصلہ صادر نہیں کر سکتا۔

جہانتک جمعیت طلبہ اور اس کے افراد کے ساتھ میرے روابط کا تعلق ہے، ان کی نوعیت صرف یہ ہے کہ یہ جمعیت پاکستان کے ان طلبہ کی جماعت ہے جو کالجوں میں جدید علوم کی تعلیم پانے کے ساتھ دینی رجحانات بھی رکھتے ہیں۔ ان کی اپنی ایک مستقل جماعت ہے جس کا مجھ سے یا جماعت اسلامی سے کوئی باضابطہ یا بے ضابطہ تعلق نہیں ہے البتہ ملک اور بیرون ملک کے ہزارہا دوسرے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی طرح یہ لوگ بھی شخصی حیثیت سے مجھ پر یہ اعتماد رکھتے ہیں کہ میں اسلام کی صحیح تشریح کرتا ہوں اور اسلامی تعلیمات کے مطابق موجودہ زمانے کے پیچیدہ مسائل کا حل انھیں بتا سکتا ہوں۔ اسی بناء پر دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح یہ لوگ بھی میری طرف رجوع کرتے ہیں۔ اپنے اجتماعات میں بھی درس یا تقریر کے لئے مجھے بلاتے رہے ہیں اور میری کتابیں بھی پڑھتے رہے ہیں۔ انکا تعلق جماعتِ اسلامی کے ساتھ نہیں بلکہ میری ذات کے ساتھ ہے اور میری ذات کے ساتھ بھی اس تعلق کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ ایک جماعت کی حیثیت سے ان کی پالیسی میں بتاتا ہوں اور ان کے جماعتی کاموں کے لئے ہدایات میں جاری کرتا ہوں۔ یہ نتیجہ اگر کوئی نکالتا ہے تو حقیقت سے بے خبری کی بناء پر محض قیاسی گھوڑے دوڑا کر نکالتا ہے۔

جہانتک حال کے افسوسناک واقعات کا تعلق ہے اس امر کا فیصلہ تو کسی غیر جانبدارانہ تحقیق ہی سے ہو سکے گا کہ صداقت اور انصاف کی بنیاد پر ان کی ذمہ داری میں کس کس کا کیا حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اپنی اور اپنی جماعت کی حد تک میں برملا صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفاء نہ کروں گا کہ اس میں بر بنائے واقعہ ہمارا قطعاً کوئی حصہ نہیں ہے، بلکہ یہ بھی کہوں گا کہ بر بنائے اصول ہمارا کوئی حصہ ہرگز نہیں ہو سکتا اور اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں:-

۱- جماعت اسلامی اپنے قواعد کی رو سے کسی طالب علم کو اپنا رکن یا متفق نہیں بناتی۔ کسی طالب علم کے متعلق اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ وہ جماعت اسلامی کا رکن یا متفق ہے تو وہ بالکل خلاف واقعہ اور قطعی بے ثبوت بات کہتا ہے۔

۲- جماعت اسلامی درسگاہوں میں یا طلبہ میں جاکر کام کرنے سے ہمیشہ اجتناب کرتی رہی ہے اور اس کی مستقل پالیسی یہ ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے۔ میں نے خود بارہا طلبہ کے جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے علانیہ کہا ہے کہ طلبہ اپنے ملک کے معاملات سے واقفیت ضرور پیدا کریں تاکہ کل موجودہ نسل کی جگہ لینے کے لئے تیار ہو سکیں۔ لیکن جب تک وہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں انھیں عملی سیاست سے الگ رہنا چاہیئے۔ یہ بات جماعت اسلامی کے طے شدہ اصولوں میں سے ہے اور ہم نے اپنے کسی کارکن کو بھی اس کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں دی ہے۔

۳- میں اصولاً قانون شکنی اور غیر آئینی طریق کار اور زیر زمین کام کا سخت مخالف ہوں۔ میری یہ رائے کسی سے خوف یا کسی وقتی مصلحت کی بناء پر نہیں ہے بلکہ میں سالہا سال کے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قانون کا احترام مہذب معاشرے کے وجود کے لئے ناگزیر ہے اور کوئی تحریک اگر اس احترام کو ایک دفعہ ضائع کر دے تو پھر خود اس کے لئے بھی لوگوں کو قانون کا پابند بنانا سخت دشوار بلکہ محال ہو جاتا ہے۔ اسی طرح زیر زمین کام اپنے اندر وہ قباحتیں رکھتا ہے جن کی وجہ سے

اس طریقے پر کام کرنے والے آخر کار خود ان لوگوں سے بھی بڑھ کر معاشرے کے لئے مصیبت بن جاتے ہیں جن کو ہٹانے کے لئے وہ یہ طریقے اختیار کرتے ہیں۔ انھی وجوہ سے میرا عقیدہ یہ ہے کہ قانون شکنی اور خفیہ کام قطعی غلط ہے۔ میں نے ہمیشہ جو کچھ کیا ہے علانیہ کیا ہے اور آئین و قانون کے حدود کے اندر رہ کر کیا ہے۔ حتیٰ کہ جن قوانین کا میں شدید مخالف ہوں ان کو بھی میں نے آئینی و جمہوری طریقوں سے بدلوانے کی کوشش کی ہے مگر کبھی ان کی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔

۴۔ یہی عقیدہ جماعت اسلامی کا بھی ہے۔ اس کے دستور کی دفعہ ۵ میں اس امر کی صراحت موجود ہے کہ ہم ایسے ذرائع اور طریقے کبھی استعمال نہیں کریں گے جو صداقت و دیانت کے خلاف ہوں یا جن سے فساد فی الارض رونما ہو۔ ہم جو کچھ کریں گے جمہوری اور آئینی طریقوں سے کریں گے اور خفیہ طریقوں نہیں بلکہ کھلم کھلا اور علانیہ کریں گے۔ جماعت اسلامی کا ہر فرد اس دستور کی پابندی کا حلف اُٹھا کر اس کا رکن بنتا ہے اور یہ جماعت ان لوگوں پر مشتمل نہیں ہے جو ایک چیز کا حلف اُٹھا کر اس کو توڑتے ہوں۔ جماعت کا کوئی آدمی اس حلف کی خلاف ورزی کرے تو دوسروں سے پہلے خود جماعت اسکی خبر لے گی۔

بعض حضرات نے ایک بیان پر بڑے اعتراضات کئے ہیں جو میری طرف منسوب کرکے ایک خبر رساں ایجنسی نے ۶ نومبر کو شائع کرایا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں نے سرے سے اس ایجنسی کو کوئی بیان ہی نہیں دیا بلکہ بیان دینے سے انکار کیا تھا۔ مگر اس نے اس انکار کو بیان قرار دیکر شائع کرا دیا۔ میرے بیان دینے سے انکار کی وجہ یہ تھی کہ جب اس قضیے میں مجھ کو ملوث کرنے کی علانیہ کوشش کی جا رہی ہو تو میں جو کچھ بھی کہوں گا اسے خواہ مخواہ توڑ مروڑ کر اپنے مطلب پر ڈھال لیا جائے گا۔

موجودہ شور و غل اور الزام و بہتان تراشی کی مہم کے ذریعہ مختلف عناصر جماعت اسلامی اور امیر جماعتِ اسلامی سے بے بنیاد باتیں منسوب کرنے کی جو کوشش کر رہے ہیں اسکی مثالیں مسلسل سامنے آ رہی ہیں۔ ذیل میں اس سلسلے کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمایئے (مسٹر محمود علی قصوری کی طرف سے یہ وضاحت ۸ نومبر کے اخبارات میں لے پی پی کے حوالے سے شائع ہوئی ہے)

"نیشنل عوامی پارٹی کے جنرل سیکریٹری مسٹر محمود علی قصوری نے بعض اخبارات میں شائع ہونے والی اس خبر کی تردید کی ہے کہ ان کی قیام گاہ پر گذشتہ پیر کوئی جلسہ ہوا جس میں مولانا مودودی، میاں ممتاز دولتانہ، مولانا عبدالستار نیازی اور چودھری فضل الٰہی شریک ہوئے اور اس جلسے میں غور و خوض کے بعد لاہور کے طلبہ کو مکمل تعاون کا یقین دلایا گیا۔ مسٹر محمود علی قصوری نے اپنے اس تردیدی بیان میں کہا کہ خبر میں جن لیڈروں کے نام لئے گئے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی آج یا کل یا گذشتہ پیر کو میرے گھر قدم نہیں رکھا نہ ہی اس اثناء میں یہ مذکورہ افراد اور جگہ ملے۔"

تجلّی کی ڈاک

جماعت اسلامی اور علمائے کرام

سوال ۱: از محمد اسعد اسرائیلی۔ سنبھل (مراد آباد)

مولانائے محترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مجھے آپ کی عدیم الفرصتی کا علم ہے۔ مدیر عام طور پر عدیم الفرصت ہی ہوتے ہیں تو تجلّی جیسے کثیر الاشاعت جریدے کے مدیر محترم کی مصروفیات جان لینا کچھ مشکل نہیں اس لئے میری یہ معروضات ضرور آپ کے قیمتی وقت میں خلل انداز ہوں گی، لیکن ہم جیسے کوتاہ نظر ذہنی خلجانوں میں آپ سے رہنمائی نہ لیں تو کس سے لیں؟

ستمبر کا تجلّی ملا۔ "تجلّی کی ڈاک" کے ذیل میں سب سے پہلے آپ نے ناچیز ہی کے ایک سوال کا جواب دیا ہے۔ اُسے پڑھ کر میرے ذہن میں فوراً آپ کو ایک معروضہ لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی تھی، لیکن نہ لکھ سکا۔ لیکن اب دیکھا تو ۲۵ ستمبر کے "دعوت" میں بھی اس کو نقل کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ کو کچھ معروضات لکھ رہا ہوں۔

اگر میرا سوال وہی فرض کر لیا جائے جس کا جواب آپ نے دیا ہے تو بے شک وہ جواب نہایت صحیح اور آپ کی فکر کی سلامتی کا آئینہ دار ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ میرا سوال وہ نہیں ہے جو آپ خیال فرما رہے ہیں۔ میں اپنی غلطی کا اعتراف کر دوں گا کہ میں نے اپنے سوال میں نہایت اختصار کر دیا ہے جس کی وجہ سے میرا مدعا زیادہ واضح نہیں ہے، لیکن یہ سب کچھ تجلّی کی تنگ دامانی کے پیش نظر کیا تھا۔ ہر حال میں میرا اصل سوال پیش خدمت ہے۔

میرا سوال یہ نہیں تھا کہ جماعت اسلامی اس بات کا رونا کیوں روتی ہے کہ مسلمان اور علماء بے عمل ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سوال کی لغویت کو میں خود محسوس کرتا ہوں میرا سوال یہ تھا کہ اگر جماعت اسلامی کے رہنماؤں اور کارکنوں سے یہ سوال کیا جائے کہ اسلام کے عمرانی اور سیاسی نظام سے تو تمام علمائے کرام واقف ہیں، بلکہ مدرسوں میں جو فقہ پڑھائی جاتی ہے۔ اس کا فائدہ ہی یہی ہے۔ اسکی وجہ سے وہ تمام اسلامی قوانین اور اس کے نظامِ معاشرت سے واقف ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد اپنے طور سے اس بات کی تقریر و تحریر دونوں طرح سے تبلیغ کرتے ہیں اور اس بات کو بھی مانتے ہیں کہ اسلام زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کرتا ہے پھر ان میں اور جماعت اسلامی میں کیا فرق ہے؟ جواب ملتا ہے کہ یہ سب کچھ سہی۔ علمائے کرام اسلام کے سیاسی و عمرانی نظام کا مطالعہ تو کرتے ہیں لیکن کوئی عملی جد و جہد نہیں کرتے اور ہم اس کے قیام کے لئے کوشش کرتے ہیں۔

بس یہیں سے میری الجھن شروع ہوتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ علماء بھی تو وہی جماعت اسلامی والا کام کر رہے ہیں۔ یعنی اسلام کو زندگی کے ہر شعبہ میں رہنما ثابت کرنا۔ رہنما سمجھنا۔ پھر آخر ان پر کیوں "عافیت کوش علماء" کا لفظ صادق آتا ہے۔ جماعت اسلامی والے اگر اقامتِ دین کی راہوں میں کتابوں کے ذریعے بڑھ رہے ہیں تو

آخر علماء کیوں اُن کے ہمراہی نہیں ؟

آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا سوال صرف ایک الزامی نوعیت کا تھا۔ آپ نے اسے دوسری نوعیت کا خیال فرمایا ہے۔ اسی لئے اس کو غیر مربوط محسوس کیا ہے اور اس کے کئی ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ حالانکہ در اصل وہ ایک ہی سوال ہے۔

دراصل آپ نے مجھے جماعت کا کوئی مخالف فرض کر لیا ہے۔ حالانکہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسا بالکل نہیں ہے۔ میں جماعت سے اُس حد تک متفق ہوں جس سے آگے شاید کوئی حد نہیں ہوتی۔ وہ سوال صرف ایک وقتی ذہنی خلجان تھا کوئی اعتراض نہیں تھا۔ میرے دل میں جماعت کی مساعی کا نہایت احترام ہے اور آپ کو بھی میں احترام ہی کی نظروں سے دیکھتا ہوں بلکہ وقتاً فوقتاً آپ پر کئے جانے والے اعتراضات کا دفعیہ کرتا رہتا ہوں اور جماعت کی حمایت کی وجہ سے تو میرا ہر وقت اپنے مخالف ماحول سے سابقہ ہے۔ خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے ثابت قدم رکھے۔ شاید میں نے حکومتِ الٰہیہ کی کوشش کو جو کوامے میں لکھا ہے تو اس کی وجہ سے آپ اُسے کوئی طنز سمجھے ہیں اور اسی وجہ سے حکومتِ الٰہیہ کے لفظ کی طرف سے مجھے مطمئن کرنا چاہ رہے ہیں۔ حالانکہ مجھے نہ جماعت کے نام پر اعتراض ہے نہ حکومت الٰہیہ کے لفظ پر۔ نہ جماعت کی کتابوں کے چھاپنے پر۔ آپ یقین رکھیں کہ میں اصطلاحات کے چکر میں بالکل اُلجھا ہوا نہیں، بلکہ اس کے کام کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا بہترین طریقہ سمجھتا ہوں۔ میں کتابوں کو بھی اقامتِ دین کی راہوں میں ممد و معاون سمجھتا ہوں۔ میرا اصل سوال وہی ہے جو عرض کیا۔ آپ ذرا غور کریں گے تو سمجھ لیں گے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ کتابیں تو دوسرے بھی چھاپ رہے ہیں۔ جیسے یہ دوسرے بھی کر رہے ہیں پھر اقامتِ دین کی کوشش کا سہرا صرف جماعتِ اسلامی کے سر پر کیوں بندھتا ہے ؟

میں نے یہ سوال نہیں کیا کہ جماعت اسلامی یہ کہتی ہے کہ علمائے کرام بے عمل ہیں، بلکہ یہ کہا ہے کہ وہ یہ کہتی ہے کہ علمائے کرام اقامتِ دین کے لئے کوئی کام نہیں کر رہے۔ جماعت اسلامی کر رہی ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ دونوں میں کونسا فرق ہے ؟ میں نے اچانک حکومتِ الٰہیہ کا ذکر نہیں کر دیا بلکہ پچھلی ہی سطروں سے اس کا ربط ہے اگرچہ اختصار کی وجہ سے تمہید نہیں آ سکی۔ حکومتِ الٰہیہ کا لفظ میں نے اعتراضاً نہیں بولا تھا بلکہ صرف سوال کی وضاحت کے لئے۔

اب سوچئے اگر میرا سوال وہ ہو جو عرض کیا تو مجھے ان جملوں میں اس کا جواب کس طرح مل سکتا ہے ؟

"جماعت اسلامی یا کوئی بھی فرد اگر مسلمانوں کی عام بے عملی اور ان کے تساہل و تعطّل پر آنسو بہاتا ہے تو اس کا مطلب آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ حکومت الٰہیہ کے فراق میں رو رہا ہے۔"

اسی طرح آپ کا جو دوسرا نمبر ہے۔ اس سے مجھے کیا تشفّی ہو سکتی ہے۔ تیسرا نمبر جو آپ نے ڈالا ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ علماء بھی تو یہی کام کر رہے ہیں پھر جماعت کی تشکیل کا اس کے علاوہ دوسرا نفع کیا ہے ؟

اس کے علاوہ چند باتیں اور بھی ہیں۔ میں نے اپنے سوال میں یہ عرض کیا تھا جہاں تک نظم و انضباط تعلق ہے۔ ہندوستان میں بہتیری جماعتیں ہیں پھر آج کل نئی جماعتیں کیوں بنائی جاتی ہیں۔ بہت زیادہ اختصار کی وجہ سے یہ بات زیادہ واضح نہیں ہو سکی۔ دوسری بات یہ کہی تھی کہ اس جماعت سے نظم کے علاوہ جو دوسرا فائدہ ہو رہا ہے وہ تو علماء بھی کر رہے ہیں پھر اسی کے سر سہرا کیوں بندھ رہا ہے ؟

"اسلامی اجتماعیت کی روح" کے الفاظ شاید میرے تھے قوسین میں جو رسائل و مسائل کا حوالہ لکھ دیا ہے وہ سوال کے آخر میں تھا۔ آپ کو شاید اس وجہ سے غلط فہمی ہوتی ہوگی کہ حوالہ میں نے سطر کے اوپر لکھا ہوگا آپ نے اسے دوسری سطر سے ملحق سمجھ لیا ہوگا یا پھر مجھ ہی سے فروگذاشت ہوئی ہوگی۔

آپ نے عہ ڈال کر جو جواب دیا ہے اس کے متعلق عرض ہے کہ وہ سوال میں نے مولانا مودودی کے الفاظ اور آپ کے طرزِ عمل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کیا تھا۔ سوچتا

ہوں کہ آپ نے کسی جماعت کو اختیار کیوں نہیں کیا۔ کیا آپ مولانا مودودی کے الفاظ میں "جاہلی زندگی" میں مبتلا ہیں؟ اگر آپ کے بقول جماعت میں شامل ہونا احساسِ اجتماعیت کا مظہر ہے تو مولانا مودودی مدظلہٗ انفرادی زندگی گذارنے والے کو جاہلی زندگی میں مبتلا کیوں کہہ رہے ہیں اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ خود جماعت میں شامل نہ ہونا ہی جاہلی زندگی میں رہنا ہے نہ کہ یہ کہ جماعت میں شامل ہونے سے احساسِ اجتماعیت کا ثبوت مل جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ کا قول نقل کرنے میں واقعی نقص ہوا در اصل میں نے اپنی یادداشت ہی سے لکھ دیا تھا۔ بہرحال آپ کی یاددہانی پر مشکور ہوں۔

اگر آپ میرے اس معروضہ کی تلخیص کر کے ایک بار پھر "تجلی کی ڈاک" میں جواب دینے کی زحمت گوارا فرمالیں تو ممنون و مشکور ہوں گا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ باتوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

وحیدالدین صاحب نے جو جماعت سے استعفا دینے کے بعد الفرقان لکھنؤ میں دو مضمون لکھے اجلاس کے بعد اب ان کی ضخیم کتاب تعبیر کی غلطی منظرِ عام پر آگئی ہے آپ نے اس کا نوٹس کیوں نہیں لیا؟ مجھے آپ کی ذہانت اور تفقہ پر پورا اطمینان ہے۔ اگر کبھی آپ نے اس پر کچھ لکھا تو شکوک و شبہات کی تمام گرہیں کھول دینے والا ہوگا۔ (انشاء اللہ) برہان کے اداریوں کا جو جواب آپ نے دیا تھا وہ یقیناً ایک یادگار کارنامہ رہے گا۔ بہرحال میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پر قلم اٹھائیں۔ در اصل جب تک تجلی میں کچھ نہیں آتا، اِدھر اُدھر کے مضامین سے نہ کما حقہٗ تشفی ہوتی ہے نہ جی بھرتا ہے۔ فی الواقع تجلی تاریکیوں میں ایک چراغ ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ یہ بجھ بھی اور دھاندلی کی آندھیوں میں سینہ تانے جلتا رہے۔

الجواب:

سوال کی جو شکل اب آپ نے پیش کی ہے وہ بھی ایسی

تو نہ تھی کہ دماغ پر تھوڑا سا زور ڈال کر آپ خود ہی اس کا جواب نہ پا سکتے۔ میرا خیال ہے آپ نے درسِ نظامی کے کسی مدرسے میں تعلیم نہیں پائی ہے ورنہ یہ تصور ہی آپ کے دماغ میں پیدا نہیں ہو سکتا تھا کہ اسلام کے سیاسی و عمرانی نظام کے مسئلہ میں جماعت اسلامی اور اس کے مخالف علماء ایک ہی پوزیشن میں ہیں۔ اللہ اللہ کیجئے۔ میں نے پورا درسِ نظامی پڑھا ہے اور اس شہرۂ آفاق مدرسے میں پڑھا ہے جسے دنیا "دار العلوم دیوبند" کے نامِ نامی سے یاد کرتی ہے۔ میرے اکثر اساتذہ بھی اپنے اپنے وقت کے خواص ہی تھے۔ ان کی دینداری، صالحیت اور علمی استعداد پر انگلی نہیں اُٹھائی جا سکتی، لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ علومِ اسلامیہ کے تمام شعبوں میں سیاسیات و عمرانیات کا شعبہ ہی وہ یتیم و بے سر شعبہ ہے جسے کوئی حقیقی اہمیت اس نصاب اور اس نصاب کے معلمین کی ذہنی بارگاہ میں حاصل نہیں ہے۔ یہاں ہر طرح کی فقہی اور فنی بحثیں زور و شور سے ہوتی ہیں۔ فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر، رفع یدین، مسح علی الخفین اور اسی نوع کے بے شمار مسائل پر فقاہت کے دریا بہا دیئے جاتے ہیں۔ وہ منطق اور فلسفہ بھی یہاں خاص توجہ سے پڑھایا جاتا ہے جس کی عمرِ طبعی ختم ہو چکی۔ علومِ حدیث، علوم صرف و نحو، علوم تفسیر سبھی یہاں خوب خوب موجود ہیں، لیکن اسلام کو ایک سیاسی و عمرانی نظام، ایک زندہ تحریک، ایک ہمہ گیر انقلابی پیغام کی حیثیت سے پیش کرنے، اس کے خد و خال نکھارنے، اس کی کوئی واضح تصویر طلباء کے دماغوں میں اتارنے اور اس کی خاطر عملی جد و جہد کا داعیہ پیدا کرنے کا ولولہ تو کیا ارادہ اور تصور بھی یہاں دور دور نہیں پایا جاتا۔ عمرانی و سیاسی نظام کی جزئیات کا تذکرہ اگر کبھی اسباق میں آئے گا بھی تو محض ذیلی و ضمنی طور پر اور ایک ایسی کہانی کی حیثیت سے جو صرف سننے اور سر دھننے کے لئے ہے عملی دنیا اور حال کے مسائل سے اس کا کوئی زندہ تعلق نہیں۔ زبان سے کچھ بھی کہا جائے، لیکن ذہن یہی بن گیا ہے کہ قرآن و حدیث میں وارد شدہ وہ تمام قوانین جو کسی اسلامی حکومت ہی میں کارآمد ہو سکتے ہیں۔ در اصل ایسے قوانین ہی

کہ اگر آسمان ہی سے اسلامی حکومت مسلمانوں کی جھولی میں آپڑے تو وہ ان سے کام لے لیں ورنہ اسلامی اقتدار کے لئے عملی جدوجہد اور اسلامی معاشرہ برپا کرنے کی کوشش دینی فریضہ ہرگز نہیں ہے — فریضہ تو درکنار اکثر و بیشتر علماء کے نزدیک تو ایسی کوشش ایک مکروہ قسم کا کام متصور ہوتی ہے جس سے کسی اللہ والے کو واسطہ نہیں رکھنا چاہئے۔ زبانیں گو کہ ابھی تک صاف صاف کہنے میں جھجک محسوس کر رہی ہیں کہ دین و سیاست دو الگ چیزیں ہیں لیکن جما ہوا اکثر علماء و اساتذہ کے قلوب و اذہان میں یہی تصور ہے کہ سیاست تو فقط دنیا داری ہے اور دین تمام کا تمام تسبیح و مصلّٰی اور کمیر غیر سیاسی معاملات ہی میں محدود ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ جذبے اور فکر و احساس کی تمام پہنائیوں پر گھنگھور گھٹاؤں کی طرح دین کا ایسا تصور مستولی ہو چکا ہے جس کے مزاج و طبیعت کے تعارف کے لئے شاید "خانقاہیت" سے بہتر کوئی لفظ نہیں۔ خدا کے فضل سے رسول ؐ کی محبت، صحابہؓ کی عقیدت نماز روزے کی لگن اور فضائل اعمال کا شغف علماء کے دائرے میں خاصی مقدار میں موجود ہے۔ اپنی دنیا اور آخرت سنوارنے کا فکر، اپنے اہل و عیال کے آرام و راحت کا داعیہ، اپنے ارد گرد کی عفونتوں سے استکراہ، اپنی مساجد، اپنے اوقاف، اپنی درگاہوں، اپنی درسگاہوں اور اپنے قومی و ملکی حقوق کا خیال و احساس بھی مردہ نہیں ہوا ہے۔ لیکن وہ انمول جوہر خال خال بھی نہیں ملتا جسے تاریخ کی چشم بصیرت پیغمبرؐ اور صحابہؓ کی زندگیوں میں ایک تپیدہ و بےتاب روح کی طرح جاری و ساری دیکھتی ہے۔ یہ جوہر کیا تھا — اسلام کا غم — صرف اسلام کا غم جان و مال، ماں باپ اور اہل و عیال کی محبت کو ثانوی درجے میں ڈال دینے والا وہ جنون جس کے سیل رواں میں ان بندگانِ اسلام کا ہر جذبہ، ہر احساس ہر خیال و تصور تنکے کی طرح بہہ گیا تھا۔ وہ دیوانے تھے تو اسلام کے۔ وہ جیتے اور مرتے تھے تو اسلام کے لئے۔ اسلام کے تنِ مقدس پر ہلکی سی خراش بھی پہنچے تو وہ اس طرح تڑپ اٹھتے تھے جیسے ایک شفیق باپ اکلوتے بیٹے کو مجروح دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے۔ انھیں سودا تھا تو یہ کہ اسلام کا کلمہ بلند ہو، اسلام غالب و معزز رہے۔ انھیں لگن تھی تو یہ کہ عزت و اقتدار کی ہر مسند اسلام ہی کے قدموں میں لا ڈالیں۔

بتاؤ آج بھی کیا کسی جنیدِ وقت اور علامۂ زماں کو تم اس درد سے تڑپتا دیکھتے ہو کہ اسلام مغلوب و مقہور ہے۔ کیا کسی آنکھ میں آنسو فقط اس لئے بھی تمھیں نظر آیا کہ اسلام کی مظلومیت سے کلیجہ منھ کو آگیا تھا۔ دوزخ کے ڈر اور جنت کی طلب میں پیشانیوں کو داغہائے سجود اور راتوں کو ذکر و تسبیح سے منور کر لینا اور بات ہے۔ لیکن نفسِ اسلام کی محبت کو رگ و پے میں اس طرح سمو لینا جس طرح اپنی جان اور مال اور اولاد کی محبت نس نس میں سمائی ہوتی ہے بالکل دوسری بات۔

حاشا و کلا اس داستاں سرائی کا مقصود کسی پر الزام تراشنا نہیں۔ طنز و تعریض سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو وہ حقائق ہیں جنھیں کوئی بھی ذہین اور ہوشمند طالب علم ہر عربی درسگاہ میں اور ہر صاحب الرائے علماء و صلحاء کی اکثر و بیشتر مجالس میں واشگاف دیکھ سکتا ہے۔ بعض اساتذہ و صلحاء تو ذہنی رہبانیت کے اس ارذل نقطے تک پہنچ چکے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات و سرایا اور سیاسی و عمرانی سرگرمیوں کا منصب نبوت سے کوئی داخلی اور مقصدی رشتہ تھا ہی نہیں وہ تو مدِ زائد ہیں جنھیں فقط حالات کی مجبوری کا ثمرہ سمجھنا چاہئے اور خلافتِ راشدہ بھی دین سے کوئی طبعی اور جوہری رابطہ نہیں رکھتی بلکہ عیاذاً باللہ حشو و زوائد میں سے ہے۔ اس زہریلے اور متعفن تصور کے لئے قرآن و سنت میں بلا سے کوئی بنیاد نہ ہو، لیکن جب آدمی اپنی خواہشات اور خود رائی کو قاضی بنانے پر تل جاتا ہے تو پھر بنیادیں تو ہزار وہ خود گھڑ لیتا ہے۔

بتائیے۔ اندازِ فکر اگر یہ یا اس سے ملتا جلتا ہو تو کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس میں اور جماعتِ اسلامی کے اندازِ فکر میں صریح تخالف نہیں ہے۔

جہاں تک صرف علم کا سوال ہے ہم نہیں کہتے کہ اسلامی نظامِ سیاست کے بارے میں جماعتِ اسلامی کو دوسروں سے کچھ زیادہ علم حاصل ہے۔ علم تو شاید مخالف علماء ہی کے پاس زیادہ ہو لیکن فقط علم سے کیا ہوتا ہے۔ آپ کو ہزار علم ہو کہ

ہوائی جہاز کن کن پرزوں سے ترتیب پاتا ہے لیکن جب تک آپ تمام پرزے مہیا کرکے انھیں صحیح طور پر جوڑیں نہیں کیا خالی علم سے ہوائی سفر طے ہو جائے گا۔ علماء کو خوب معلوم ہے کہ اسلامی حکومت کیا چیز ہے۔ اسلامی معاشرہ کسے کہتے ہیں۔ سیاستِ اسلامیہ کے اجزاء کیا ہیں۔ لیکن وہ اس کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے کہ اینٹ اور پتھر کی دنیا میں بھی اس علم کی آزمائش کریں۔ ارادہ تو درکنار وہ یہ وثوق ہی کھو چکے ہیں کہ ٹھوس معنوں میں غلبۂ اسلام کی کوشش کرنا کوئی دینی کام ہے۔ زبان سے جب وہ کہتے ہیں کہ "اسلام زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کرتا ہے" تو در اصل یہ ایک رٹا ہوا جملہ ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہوتا ہے جس کے لئے ان کے اعمال واطوار میں کوئی شہادت نہیں۔ خالی زبانی جمع خرچ ایک سوئی میں دھاگہ بھی نہیں ڈال سکتا۔ ہم رٹتے جائیں کہ اسلام یوں ہے اور اسلام ووں ہے لیکن دنیا، حالات، قسمت اور مشیت سب کے سب ہماری اس شیوہ بیانی پر قہقہے لگائے جائیں گے۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ جماعت اسلامی ہی نے اقامتِ دین اور غلبۂ اسلام کو نصب العین قرار دیکر کونسا تیر مارا ہے کیا پہاڑ ڈھائے ہیں۔ کس برائی کو ختم کیا ہے اور قوم و کے کس ضعف کو قوت میں بدلا ہے؟

ہم کہیں گے کہ اعتراض کرنے والے کو خدا سے ڈرنا چاہئے۔ انسان فقط اپنی طاقت کی حد تک مکلف ہے۔ حضرت اسماعیل شہیدؒ بظاہر اپنے مقصد میں ناکام رہکر اللہ کو پیارے ہوئے۔ طاغوت کا غلبہ جوں کا توں رہا، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان کی شہادت بیکار گئی اور ان کے جہاد کی کوئی قیمت نہیں۔

جماعت اسلامی کے نام پر چند مٹھی بھر آدمی عمل سے اس دعوے کی شہادت پیش کرنے اٹھتے ہیں کہ اسلام زندگی کے ہر شعبے میں نہ صرف راہنما ہے بلکہ تنہا وہی ہے جس کی رہنمائی فلاح وسربلندی کی طرف لے جاسکتی ہے۔ اب یہ زندگی، یہ دنیا، دو بالشت کی تو نہیں تھی کہ یہ مٹھی بھر آدمی اسے توڑ مروڑ کر اپنے مطلوبہ سانچے میں ڈھال لیتے ضرورت تھی کہ تمام بندگانِ اسلام اس جدوجہد میں ان کا ساتھ دیتے، ان کی ہمنوائی کرتے اور فکر وعمل میں کوئی خامی پاتے تو اس کی بھی اصلاح کرتے جاتے۔ پھر آویزش ہوتی، حق اور باطل ٹکراتے، آزمائشیں طوق وسلاسل کی جھنکار لئے اٹھ کھڑی ہوتیں، شدائد کے جھکڑ چلتے عزم وثبات آزمائے جاتے، ابتلاء کی بھٹی میں محبت کی متاع تپائی جاتی کہ دیکھیں کتنا اس میں تانبا ہے اور کتنا سونا۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ تب کہیں جاکر نتائج برآمد ہوتے۔ یہی ہمیشہ ہوتا آیا ہے یہی ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ خدا کا سب سے برگزیدہ رسول بھی زہرہ گداز آزمائشوں کی گھاٹیوں سے گذرے بغیر منازلِ کامرانی تک نہیں پہنچ سکا پھر بھلا کوئی اور ہنستے کھیلتے راہِ حق میں کیسے آگے بڑھ سکے گا۔ کتنے ہی انبیاء ایسے گذرے ہیں کہ زندگی بھر وہ شدائد جھیلتے رہے، زخم پر زخم کھاتے رہے، لیکن معدودے چند افراد کے سوا کسی نے ان کی دعوت پر لبیک نہیں کہا۔ لبیک کہنا تو کجا انھیں اذیتیں دیں، ان کا مذاق اڑایا، ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ کچھ ایسی ہی روش ہماری قوم کے اکثر وبیشتر افراد نے اس دعوت اور تحریک کے بارے میں اختیار کی ہے جسے جماعت اسلامی لے کر اٹھی ہے۔ یہ دعوت نئی نہیں۔ ازل سے آج تک انبیاء ورسل اور صلحاء ومجددین اسی دعوت کو لیکر اٹھتے رہے ہیں اور اس کا استقبال ہمیشہ عناد ومخاصمت اور اتہام وافتراء ہی سے کیا گیا ہے۔ پھر بھلا کیا کوئی دریدہ دہن یہ کہے گا کہ قصوروار وہ انبیاءؑ اور مصلحین تھے جن کی جدوجہد کوئی انقلاب نہ لاسکی یا یہ کہنا موزوں ہوگا کہ قصوروار وہ ہیں جنھوں نے دعوتِ حق کا ساتھ نہیں دیا، جنھوں نے حق کو تعاون دینے کے عوض اس کا راستہ روکا، جن کے دل ودماغ اور زبان وقلم الزام تراشیوں، دروغ بافیوں اور تفرقہ اندوزیوں

میں منہمک رہے۔

اسلام کو غالب و مقتدر کرنا معمولی کام تو کبھی نہیں تھا لیکن اب یہ مشکل سے مشکل تر بنتا جا رہا ہے۔ باطل اتنا قوی، اتنا چالاک اور اس درجہ غالب و حاوی ہو چکا ہے کہ اقامتِ دین کے رُخ پر ایک قدم چلنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ شاید اسی لئے بڑے بڑے علماء و صلحاء تک میں سوچنے کا خانقاہی ڈھنگ زیادہ سے زیادہ مقبول ہوتا جا رہا ہے اور یہ سرتاسر باطل خیال دل و دماغ میں خوب پنجے گڑو چکا ہے کہ سیاست و اقتدار محض بکواس ہے مسلمان کو زیادہ سے زیادہ اتنی ہی جد و جہد کرلینی چاہئے کہ حکومتِ وقت نظامِ عبادت میں خلل نہ ڈالے اور عزت سے دو روٹی ملتی رہیں۔

ہم سے پوچھئے تو جماعت اسلامی کے وجود کا یہی فائدہ کچھ کم نہیں ہے کہ اس نے ایک طرف مغربی افکار کی جاہلیت کے آگے عقل و استدلال کے بند باندھے ہیں، طلسمِ دہریت کی دیواریں ڈھائی ہیں، تہذیب نو کی جگمگاتی ہوئی ظلمتوں کا چیلنج قبول کیا ہے اور دوسری طرف رہبانیت نواز خانقاہیت اور یک رُخے تصوف کے اُس سیلاب کے آگے پشتے بنائے ہیں جسے شریعتِ قبوری کے حاملین اور رہبانیت کے مبلغین پوری اُمت پر پھیلا دینا چاہتے ہیں۔ مادی سطح پر جماعت اسلامی کچھ بھی نہ کر سکے مگر اس کے دم سے اسلام کا ایک جامع اور کامل تصور زندہ ہی باقی رہ جائے تو یہی اتنا بڑا کام ہے کہ سوائے خدا کے کسی میں اس کی مُزد ادا کرنے کی استطاعت نہیں۔

اس طول بیانی کا لبِّ لباب یہ نکلا کہ جماعت اسلامی اور مخاصمین کے مابین فرق علم و معلومات کا نہیں انداز نظر کا ہے، مقصد اور منتہائے نگاہ کا ہے، ذہنیت اور فکری رُخ کا ہے۔ جماعت اسلامی مقصد قرار دیتی ہے دین کے ہمہ جہتی غلبہ و نفاذ کو اور عبادت و اخلاق کا پورا نظام اس کے نزدیک اس مقصدِ عظمیٰ کے وسائل و مبانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے برخلاف علمائے عہدِ حاضر کی تقریباً پوری قوم (الا ماشاء اللہ) اس مقصدِ عظمیٰ کو کیا سرے سے مقصد ہی نہیں مانتی بلکہ حصولِ جنت کی انفرادی کوششوں اور حور و قصور کے حصول کی خاطر لگائی جانے والی روحانی جستوں ہی کو مقصد، نصب العین اور حاصلِ دین قرار دیتی ہے۔

کیا اب بھی آپ سوال کریں گے کہ علماء کو "عافیت کوش" کیوں کہا جاتا ہے اور جماعت اسلامی سے وہ کیوں جدا ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ جب بنیادی اسلوبِ فکر بدل جائے تو علم و معلومات کا ایک ہی خزانہ اور دلائل کا ایک ہی سلسلہ قطعی مختلف نتائج تک پہنچاتا ہے۔ شرعی احکام کے مآخذ و مصادر دونوں گروہوں کے یہاں ایک ہی ہیں، وہ ائمہ اور راہنما بھی ایک ہی ہیں جن کے تفقہ اور اجتہاد پر دونوں کو اعتماد ہے، لیکن گوناگوں داخلی اور خارجی عوامل کے باعث دونوں کے فکری زاویئے مختلف ہو گئے ہیں اور اسی لئے وہ ایک دوسرے سے قریب نہیں آتے تصور شاید کچھ جماعت اسلامی کا بھی ہو، لیکن جارح اور حملہ آور کی پوزیشن صریح طور پر فریق ثانی ہی نے اختیار کر رکھی ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ جلسے تو دوسرے بھی کر رہے ہیں کتابیں تو دوسرے بھی چھاپ رہے ہیں پھر ان میں اور جماعت میں کیا فرق رہا؟ —— پھر کیوں اقامتِ دین کی کوشش کا سہرا جماعت ہی کے سر باندھا جاتا ہے؟

اس سوال کا جواب اگرچہ اوپر کی تقریر میں آچکا لیکن چند مثالوں سے بھی اسے سمجھنے کی زحمت فرمائیں بیس پچیس آدمی بذریعہ ریل دہلی سے بمبئی جا رہے ہیں۔ چند کا مقصدِ سفر یہ ہے کہ ایک فلمی تقریب میں شرکت کریں گے اور اس کے بعد فلاں کلب میں فلاں ولایتی رقاصہ کا عریاں ڈانس دیکھیں گے۔ چند کی نیت یہ ہے کہ وہاں کے بعض تاجروں سے کاروباری معاملات طے کر کے اپنی تجارت کو فروغ دیں گے۔ چند اس لئے

چلے ہیں کہ وہاں کسی علاقے میں انھیں غریبوں کے لئے ہسپتال قائم کروانا ہے اور فلاں یتیم خانے کی گرتی ہوئی حالت کو سنبھالنا ہے۔ چندے کے پیش نظر ان مصیبت زدوں کی امداد ہے جنھیں ابھی کچھ روز ہوئے زلزلے نے تہہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔

اب ظاہر ہے سفر کرنے کے فعل و عمل میں تو یہ سب برابر ہیں۔ فاصلہ بھی یکساں اور ذریعۂ سفر بھی ایک ہی ہے۔ دورانِ سفر میں ان کے مشاغل بھی کوئی بنیادی فرق نہیں رکھتے۔ اسٹیشنوں سے ماکولات خرید کر کھانا، چائے اور شربت پینا، باتیں کر کے اور کتابیں پڑھ کر وقت کاٹنا۔ ان مشاغل میں ان کے مابین کوئی تخالف نہیں، لیکن کیا اس صوری ہم رنگی و یکسانی کے باوجود کوئی ذی ہوش کہہ سکتا ہے کہ ان سب کے سفر کی اخلاقی قدر و قیمت اور معنوی نوعیت یکساں ہے؟

دوسری مثال لیجئے۔ ایک مشہور واعظ پانچ سو میل کا سفر کر کے کسی عظیم الشان جلسۂ سیرت میں شریک ہوتا ہے اور اپنی مرصع خطابت سے دھوم مچا دیتا ہے۔ آیات و احادیث، لطائف و معارف اور طلاقتِ لسانی سے بھرپور وعظ پر لوگ جھوم جھوم اٹھتے ہیں۔ واہ واہ اور زندہ باد کی موسلا دھار بارش ہو جاتی ہے۔

دوسرا واعظ فقط سو میل سے آیا ہے۔ وہ زیادہ مشہور بھی نہیں اور اس کی خطابت میں اتنا زور، ایسی روانی، اس درجہ دل کشی اور اس آن بان کی جاذبیت بھی نہیں۔ مجمع سن ضرور لیتا ہے مگر پھڑک نہیں پاتا۔

اب فرمائیے کام تو دونوں واعظوں نے ایک ہی کیا ہے یعنی مجمع سے خطاب اور اپنے خیالات کا ابلاغ۔ مگر کیا آپ کہیں گے کہ حقدار بھی دونوں ایک ہی جیسے انعام کے ہیں؟ —— بدیہی بات ہے کہ ظاہر کے اعتبار سے تو آپ اول الذکر کو نمایاں فوقیت دیں گے اور حاضرینِ جلسہ بھی اول الذکر ہی کی شان میں بیش از بیش قصائد پڑھیں گے۔

لیکن ذرا اب ان دونوں کے اندرون میں بھی جھانک کر دیکھئے۔ پہلے بزرگ اس وقت عازمِ سفر ہوئے تھے جب جلسہ منعقد کرنے والوں کی طرف سے انھیں خاطر خواہ زادِ سفر مہیا کر دیا گیا تھا۔ پھر سکنڈ کلاس کی نرم و گداز کوچ پر استراحت فرماتے ہوئے ان کا ذہن بس اس تگ و دو میں سرگرداں رہا تھا کہ کن کن آیات و احادیث اور کن کراماتِ الصالحین اور لطائف و نکات کو کس پرواز اور اسلوب سے پیش کرنا ہے تاکہ مجمع مسحور و مسخر ہو کر رہ جائے اور دنیا یقین کر لے کہ مجھ سے بہتر خطیب و واعظ ملک بھر میں کوئی نہیں ہے۔ یہ خیال تو ان کے دل میں ایک بار بھی نہیں آیا کہ فی الاصل وہ امراض اور مفاسد کیا ہیں جنھوں نے قوم و ملت کو فسانۂ عبرت بنا کر رکھ دیا ہے اور ان کا معالجہ کس نوع کی تعلیم و تبلیغ سے ممکن ہے۔ وہ تو فقط اس تخیل میں گم رہے ہے کہ کس طرح گذشتہ سال سے بھی بڑھ چڑھ کر عقیدتوں کا رجوع اس سال حاصل ہو اور کیسی پچھے دار تقریر اس بار کی جائے کہ لوگ تمام دوسرے مقرروں کو بھول جائیں۔

دوسرے صاحب تھرڈ کلاس میں دھکے کھاتے آئے تھے اور اپنے دیہات سے ریلوے اسٹیشن تک انھیں پیدل بھی چلنا پڑا تھا۔ پھر راستے بھر صرف ایک ہی فکر و خیال ان کے قلب و ذہن پر مسلط رہا کہ قوم و ملت کے روز افزوں امراض اور غفلت و انحطاط کا درماں کیا ہو۔ کیسے اسے سلامتی کی راہ پر لایا جائے اور کن تعلیمات پر زور دیا جائے کہ عامۃ المسلمین کی ناگفتہ اخلاقی حالت بدلے۔ اسی ذہنی تب و تاب اور جگر سوزی میں تمام راستہ کٹ گیا اور انھیں یہ تک احساس کرنے کی ذہنی مہلت نہ مل سکی کہ کھردری اور سخت سیٹ نے ان کے بدن کو چسکا دیا ہے۔ پھر وہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو عظیم الشان پنڈال کی نظر افروز سجاوٹ اور سلیقے سے فٹ کئے ہوئے بے شمار برقی قمقموں کی جگمگاہٹ ان کے اندر انبساط و کیف کی لہریں پیدا کرنے کے عوض اس درد انگیز احساس کو بیدار کر گئی کہ ٹیپ ٹاپ اور آرائش پر یہ بے شمار اسراف وہ قوم کر رہی ہے جس کے بے شمار ضروری ترین کام سرمائے کی قلت کے باعث رکے پڑے ہیں۔ جس کے بچوں کے لئے پورے ملک میں اپنی مادری زبان کی ایک یونیورسٹی بھی نہیں جس کی نئی پود یا تو جاہلوں کی تعداد میں اضافہ کر رہی ہے یا پھر اس کے دماغوں میں علم کے نام سے وہ متعفن تاریکیاں

آشکار ہی جا رہی ہیں جو دین و اخلاق کی ایک ایک کرن کو اژدر کی طرح نگل جائیں گی تقریر کے دوران انھوں نے وجد انگیز لطائف اور نشہ آمیز کرامتیں بھی نہیں دہرائیں بلکہ دردمندی کے سوز میں ڈوبی ہوئی چند سادہ باتیں سادہ انداز میں کہیں اور فقط اس پر زور دیا کہ باتیں بنانے اور محفلیں سجانے کے عوض اُن سیدھی سادی صداقتوں اور اوصاف وسادہ بھلائیوں پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرو جن کا تمھیں علم ہے اور جن پر عمل پیرا ہوئے بغیر یہ جلسے، یہ مرصّع وعظ، یہ درود و نعت کے غلغلے، یہ حبِ رسول ؐ کے نعرے، یہ اولیاء و صالحین کے تذکرے اور یہ ساری ہاؤ ہو وقت اور قوت کی بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

فرمائیے کیا کوئی بھی حقیقت شناس انسان کہہ سکتا ہے کہ ان دونوں واعظین میں ظاہر کے اعتبار سے مقام و مرتبے کی جو ترتیب سمجھ میں آرہی تھی وہی عند اللہ بھی مقبول ہو گی؟ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ پہلے واعظ کی تمام طمطراقیاں اور شہرت و مقبولیت بارگاہِ ایزدی میں ایک مٹھی جو کی قیمت بھی نہیں رکھتیں جب کہ دوسرے واعظ کا ہر سانس میزانِ آخرت میں انشاء اللہ لعل و جواہر کے باٹوں سے تلنے والا ہے۔

یہی معاملہ تحریر و تصنیف کا ہے۔ دو کتابیں علمی و لٹریری اعتبار سے چاہے یکساں ہوں لیکن عند اللہ ان کی قدر و قیمت اس جذبۂ و احساس کی بنیاد پر معین ہو گی جو قلم پکڑنے کا محرک بنا ہے۔ ایک تصنیف خواہ علم و فن کے میزان میں کتنی ہی بھاری بھرکم ہو، دنیا اسے چاہے کتنا ہی سراہے —— یہاں تک کہ خواہ وہ سیرتِ نبوی ؐ یا صحابہؓ و اتقیاء کے تذکار ہی پر مشتمل کیوں نہ ہو، لیکن وہ بارگاہِ ایزدی میں کوئی معتدبہ قیمت نہیں رکھتی اگر اس کو تصنیف کرتے ہوئے مصنف کے ذہن میں صرف شہرت، صرف مالی منفعت یا صرف داد و تحسین کی حرص اور خود کو بہترین مصنف ثابت کرنے کا داعیہ کارفرما رہا ہو۔ اس کے برخلاف وہ تصنیف عند اللہ بڑے انعام کی مستحق ٹھیرے گی جو اس لئے وجود میں آئی ہو کہ مصنف نے دین و ملّت کے لئے اسے مفید خیال کیا تھا اور اس کے ذریعہ کسی اہم اسلامی قدر کا تحفظ کیا گیا ہے، فوجی تعلیم و تربیت اس لشکر کے سپاہی بھی حاصل کرتے ہیں جسے اس مقصد سے ترتیب دیا گیا ہو کہ پڑوسی ملک پر قبضہ کر کے اس کی دولت پر ہاتھ صاف کیا جائے اور یہی فوجی تعلیم و تربیت اس فوج کے سپاہی بھی حاصل کرتے ہیں جو اس لئے بنائی گئی ہو کہ ٹھیک سنتِ نبوی کی روشنی میں ملک و ملّت کی پاسبانی کرے اور بد طینت دشمنوں کو ایک قدم آگے نہ بڑھنے دے —— کیا کوئی کہہ سکتا ہے ہے کہ ان دونوں طرح کے سپاہیوں کی حیثیت آخرت میں ایک ہی جیسی ہو گی ؟

بات لمبی ضرور ہو گئی لیکن مجھے اُمید ہے کہ آپ کی اور دوسرے بہت سے حضرات کی الجھن رفع ہو گئی ہو گی۔

اب جماعت میں میری عدم شرکت کے بارے میں بھی سن لیجئے الحمد للہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو جماعتِ اسلامی کا رکن بننے سے اس لئے گھبراتے ہوں کہ حکومت اور ابنائے وطن کی نگاہ میں یہ جماعت مبغوض و مردود ہے اور جب چاہے اس کے شرکاء کو مقدمہ چلائے بغیر بھی جیل میں ڈالا جا سکتا ہے۔ جسمانی اعتبار سے میں ایک نہایت کمزور انسان ہوں لیکن جس خدا پر مجھے بھروسہ ہے وہ توانا و قوی اور مقتدر ہے کہ اس کی نصرت و عنایت کے وثوق کامل نے مجھے مستقبل کے خطرات اور زندان و سلاسل کی صعوبتوں پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

بس سچی اور لاگ لپیٹ سے معرّیٰ بات یہ ہے کہ جماعت کا رکن بننے کے لئے جن اوصاف کی ضرورت ہے مجھ کم نصیب کو وہ کما حقہٗ حاصل نہیں ہیں۔ ہر شخص اپنی حالت کو خود بہتر سمجھ سکتا ہے۔ میں اپنے کو اُن اعلیٰ ذہنی و عملی صلاحیتوں میں کوتاہ پاتا ہوں جن کے بغیر جماعت میں شامل ہونا اس کے اونچے معیار کو داغدار بنانا ہے۔

لیکن یہ آپ نے غلط سمجھا کہ شامل نہ ہو سکنے کے باعث مجھ پر اُس "جاہلی زندگی" کا اطلاق ہو جائے گا جس کی مضرتوں سے مولانا مودودی نے بار ہا آگاہ کیا ہے۔

آپ متعلقہ مقامات کو غور سے دیکھیں، مولانا کا منشا یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہر اُس شخص کی زندگی "جاہلی زندگی" ہے جو باقاعدہ کسی جماعت کا رکن نہیں بنا ہے۔ مولانا کا منشاء یہ ہے کہ انفرادیت میں گم مت ہو جاؤ بلکہ اس حیثیت کا احساس کرو جو ایک مقصدی جماعت اور ایک مامور امت کا فرد ہونے کے ناطے تمھیں حاصل ہے۔ یہ احساس لازماً یہ تقاضا کرتا ہے کہ ذاتی و انفرادی معاملات میں شریعت کی پوری پیروی کرنے کے علاوہ اسلام کے اجتماعی و عمرانی پہلوؤں پر بھی توجہ دو اور طاغوت کی زبردستی پر صبر و قناعت کرنے کے عوض یہ سعی و جہد جاری رکھو کہ اسلام کو بالادستی حاصل ہو۔ بالادستی سے مراد فقط سیاسی غلبہ نہیں بلکہ عہد سے لیکر تک انفرادی اور اجتماعی دائروں میں جو بھی مراحل آتے ہیں سب میں اسلام ہی کو حاکم، قاضی، مقتدا اور تخت نشین بنادینا حقیقی بالادستی ہے۔ یہ سعی و جہد منظم ہونی چاہیئے، کیونکہ تنظیم کے بغیر محنت کا بڑا حصّہ ضائع ہو جاتا ہے اور تنظیم ہی کا دوسرا نام جماعت ہے پس یا کوئی بھی شخص اگر جماعت کی باقاعدہ شرکت سے گریزاں رہتا ہے تو یہ یقیناً بُری بات، لیکن اسے "جاہلیت" سے تعبیر نہ کر سکیں گے اگر یہ شخص اپنے طور پر غلبۂ اسلام کے کاز کو تقویت دے رہا ہو اور انفرادیت میں گم ہونے کی بجائے اسلام کے جامع تصور کی خدمت کر رہا ہو۔

یوں بھی سوچیئے کہ ہر جوان تو فوج میں بھرتی کر لیئے جانے کا اہل نہیں ہوتا۔ حالیہ فوجی بھرتی میں بمشکل چند فی صد جوان ایسے نکل رہے ہیں جنھیں میدانِ جنگ میں لیجایا جا سکتا ہے باقی کا حال یہ ہے کہ اگر انھیں ہتھیار دیکر میدانِ وغا میں بھیجدیا جائے تو جسمانی نااہلیتوں کے باعث اپنا ہی بیڑا غرق کر کے رکھدیں ـــــ پھر کیا انھیں آپ محبانِ وطن کی فہرست سے خارج کر دیں گے؟

ہرگز نہیں۔ وطن کے فدائی یہ بھی ہیں لیکن لڑنے کا اہل ہونا نہ ہونا اور بات ہے۔ ٹھیک ایسی ہی مثال مجھ نااہل کی بھی سمجھیئے۔ جذبہ و خواہش کے اعتبار سے میں بھی انھی لوگوں میں ہوں جو لا اسلام اِلاّ بالجماعۃ پر اذعان رکھتے ہوئے بلا ابہام یہ اعلان کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے کہ اسلام کو زندگی کے ہر شعبے میں سرافراز دیکھنا اور دنیا بھر سے ایک قوتِ نافذہ کی حیثیت سے پھیلا دینا ہماری زندگی کا سب سے بڑا ارمان ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مطلوبہ صلاحیتوں کی کمی کے باعث میں اس ارمان کی خاطر جدوجہد کرنے والے میدانی دستوں کا شریک نہ بن سکوں، لیکن جس طرح کھیت میں محنت کرنے والا کسان اور کارخانوں میں پسینہ بہانے والا مزدور بھی بالواسطہ فوجی پیش قدمیوں کو تقویت عطا کرتا ہے اسی طرح میری زندگی بھی ان قلمی کوششوں کے لئے وقف ہے جو جماعتِ اسلامی کی ـــــ بلکہ یوں کہیئے اسلام کی دعوت کو کسی نہ کسی قسم کی مدد پہنچاتی ہیں۔ وہ باورچی بھی تو آخر خادمِ قوم و وطن ہی ہے جو فوجیوں کے لئے کھانا پکا رہا ہے۔ میں اپنے کو اس کا مستحق تو نہیں پاتا کہ آخرت کی فہرست میں میرے نام کو مجاہدینِ اسلام کے ساتھ لکھے جانے کی سعادت نصیب ہو سکے گی لیکن یہ توقع ضرور رکھتا ہوں کہ میرا رحیم و کریم رب مجھے اُن بھنگیوں اور خاکروبوں کی فہرست میں شامل فرمائے گا جو معاوضے کی پروا کئے بغیر مجاہدین کا فضلہ اُٹھانے اور ان کی راہوں کے جھاڑ جھنکاڑ صاف کرنے کی خدمات انجام دیتے ہیں۔

جناب وحید الدین خاں صاحب کی کتاب کا کچھ حصّہ بعض رسائل میں چھپ چکا ہے۔ بے شمار حضرات اس کے منتظر ہیں کہ میں اس پر اظہارِ خیال کروں۔ اظہارِ خیال تو انشاء اللہ ضرور ہوگا، لیکن کتاب دیکھنے کے بعد۔ خود موصوف نے مجھے اپنے خط میں رقم فرمایا تھا کہ کتاب پریس سے آتے ہی برائے تبصرہ ارسال کی جائے گی۔ تادمِ تحریر یہ مجھے نہیں ملی ہے۔ امید ہے کہ مل جائے گی۔ کسی وجہ سے فاضل مصنف نے کا ارادہ ترک ہی کر دیا ہو تو پھر اپنے طور پر کہیں سے حاصل کرنی ہوگی[1]۔ میں ابھی تک کوئی موافق یا مخالف رائے قائم نہیں کر سکا ہوں۔ کتاب ضخیم ہے اگر مطالعہ کے بعد تفصیلی اظہارِ خیال ضرور ہو

[1] [illegible] میں یہ کتاب مجھے مل گئی۔ عامر

معلوم ہوا تو تجلی کی ایک پوری اشاعت بھی اس پر وقف کر دینے میں مجھے تامل نہ ہوگا۔ وما التوفیق الا باللہ و ہو المستعان۔

بدعات و توہمات

سوال۲:- از میر سردار علی۔ محبوب نگر۔ آندھرا پردیش دکن

اس طرف اکثر مسلمان شیخ عبد القادر جیلانی رحؒ کے نام سے فاتحہ کر کے کھانے کھلاتے ہیں۔ یہ تقریب گیارھویں شریف کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ اگر عقیدے کی درستی کے ساتھ محض ایصال ثواب کی نیت سے کسی بزرگ یا ولی اللہ کے نام پر فاتحہ کی جا کر کھانا کھلایا جائے اور اس دعوت میں عزیز و اقارب، دوست احباب کے ساتھ غرباء کو بھی شامل کیا جائے تو ایسی دعوت میں شرکت جائز ہوگی یا کیا؟

دوسری شکل ایسی تقریب کی یہ ہے جس میں مسلمانوں کی اکثریت شریک ہے وہ یہ کہ اس تقریب کو نہایت اہتمام سے ہر سال اسی ماہ (ربیع الثانی) میں انجام دیتے ہیں کسی سال ناغہ کرنا نہیں چاہتے۔ تصور یہ ہوتا ہے کہ اگر گیارھویں شریف کی فاتحہ نہ کی جائے تو نقصان ہوگا اور کوئی مصیبت آجائے گی اور اگر کی جائے تو ثواب کے ساتھ شرکت ہوگی اور نقصان سے بچ جائیں گے۔ معاشی تنگی کی صورت میں بھی قرض وغیرہ لیکر یہ فاتحہ کی جاتی ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ اس خیال و عقیدے کے ساتھ جو صاحب گیارھویں کر کے دعوتِ طعام دے تو اس میں شرکت کی جائے یا نہیں؟

ان ہر دو مندرجۂ صدر صورتوں میں یہ خیال بھی سخت پریشان کئے ہوئے ہے کہ داعی اگر قریبی رشتہ دار ہوں اور شرکت نہ کریں تو قسم قسم کے طعنے دیئے جاتے ہیں اگر مسلسل یہ عمل رہا تو رشتہ سے کٹ جانے کا بھی اندیشہ ہے۔ بعض دین پسند احباب کا اس باب میں یہ خیال ہے کہ اگر ہم اس طرح سے عزیز و رشتہ داروں سے کٹتے رہے تو پھر اصلاحِ حال کا کوئی موقع ہاتھ نہ آئے گا۔ بہتر یہ ہے کہ ایسی دعوتوں میں شریک تو ہوا کریں ساتھ ہی ساتھ موقع و محل سے ایسے لوگوں کے عقائد کی اصلاح کی بھی کوشش کرتے رہیں۔ آپ سے اس معاملہ میں تفصیلی وضاحتی جواب کی درخواست ہے۔

الجواب۲:-

تجلی میں اس طرح کے اُمور کی دینی حیثیت پر بارہا تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا جا چکا ہے لہذا اس وقت تو بحث و نظر کا دروازہ کھولے بغیر ہم اتنا ہی کہیں گے کہ بزرگوں کے نام پر سالانہ ہنگامہ آرائیاں اور فاتحہ خوانیاں سراسر بدعت ہیں اور ان کی نسبت سے نفع و نقصان کے تمام تصورات جاہلانہ نوع کی توہّم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کے زہریلے ثمرات ہیں۔

ایسی تقریبات میں شامل ہونا کسی کے لئے جائز نہیں نہ اس سلسلے کے کھانوں کو حلق میں اُتارنا درست ہے۔ اگر عزیز و اقربا طعنے دیتے ہیں تو دیا کریں۔ جو شخص دیانت کے ساتھ یہ سمجھ لے کہ فلاں کام میں شرکت گناہ ہے اور پھر اس سے دامن کش رہنے کے سلسلے میں اسے طنز و طعن کی اذیت برداشت کرنی پڑے تو یہ اذیت اس کے حق میں سرمایۂ آخرت بن جائے گی اور ہر طعنۂ دلخراش انشاء اللہ کفّارۂ سیّئات کا کام دے گا۔

لیکن اگر وہ طنز و طعن سے ڈر کر اپنے ضمیر پر سیاہی پھیر دیتا ہے تو عزیز و اقرباء چاہے کتنے ہی خوش ہو جائیں لیکن اس حرکت کے لئے اُس دن اسے اللہ کی بارگاہ میں جوابدہ ہونا ہوگا جس دن کے لئے پہلے ہی اللہ نے اطلاع دیدی ہے کہ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ۔ (جس دن آدمی اپنے بھائی، اپنے ماں باپ، اپنی بیوی بچوں سب سے گریزاں ہوگا۔ ہر شخص خود اپنے ہی حال میں ایسا گرفتار ہوگا کہ کسی اور طرف توجہ دینے کی تاب و مہلت ہی نہ ہوگی)۔ ہاں جس دن کے لئے اللہ نے تنبیہ کی ہے کہ فَأَمَّا مَنْ طَغَىٰ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ (جس شخص نے نافرمانی کی اور دنیا کے پیچھے دوڑتا رہا تو اس کا ٹھکانا اس دن جہنم ہی ہوگا)

تو بتایئے جن سے رشتہ کٹ جانے کا ڈر آج آپ کو آمادہ

کررہا ہے کہ ایسی تقریبات میں شرکت کریں جن کے گناہ ہونے پر آپ آگاہ ہو چکے ہیں کیا یہ لوگ آخرت کے سخت محاسبے میں آپ کی کوئی مدد کر سکیں گے؟ یہ تو کیا خود شیخ عبد القادر جیلانیؒ بھی — جن کے نام پر بدعت پھیلائی جا رہی ہے وہاں کام نہ آسکیں گے بلکہ وہی صورت حال پیدا ہوگی جس کا حال اس آیت میں بیان ہوا ہے اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ (جب بزرگ حضرات اُن لوگوں سے بری الذمہ اور بیزار ہونے کا اعلان کریں گے جنھوں نے ان کی پیروی اور عقیدتمندی کے نام پر غلط افکار و اعمال تراش لئے تھے اور یہ خوش فہمی میں مبتلا لوگ اس دن عذاب سے دوچار ہونگے اور وہ سارے وسائل کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ چکے ہوں گے جنھیں انھوں نے اپنی جہالت سے قوی ذریعۂ نجات تصور کر رکھا تھا)

بعض دین پسند حضرات کی یہ رائے کہ اصلاح کی خاطر شرکت کرتے رہنا چاہئے، نظری اعتبار سے تو خوشنما ہے لیکن عمل اور تجربے کی کسوٹی پر یہ نہ پہلے کبھی کھری اُتری ہے نہ آئندہ کبھی کھری اُترے گی۔ آپ کا جی چاہے تو تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ شرکت کرنے کی صورت میں دوسروں کی اصلاح تو کیا ہوتی خود آپ کے دل سے ان بدعات کی کراہت کم ہوتی چلی جائے گی اور آپ کا ضمیر خواہی نخواہی مفاہمت کے رُخ پر ہولے گا۔ کیا اسوۂ رسولؐ یا تعامل صحابہؓ میں ایک بھی ایسی مثال ہے کہ خود گناہ میں ملوّث ہو کر اس گناہ کو مٹانے کی کوشش کی گئی ہو۔ ہمارے علم میں تو نہیں۔ اگر متذکرہ دین پسندوں کے علم میں ہو تو ہمیں ضرور مطلع کیا جائے۔

رہا یہ کہ عدم شرکت کے باعث اصلاح کا موقع ہاتھ سے جاتا رہے گا تو یہ محض فریبِ نفس ہے۔ اصلاح کے لئے اور بھی صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں، لیکن ایسی صورتیں نہ بھی سمجھ میں آئیں تو بہر حال آپ یا میں ٹھیکیدار تو بنا کر نہیں بھیجے گئے ہیں۔ انبیاء تک کا فریضہ صرف یہ تھا کہ شریعت کے دائرے میں رہ کر ہی اصلاح کی جدوجہد کریں کیا آپ کو نہیں معلوم کہ کفارِ عرب نے عاجز آکر یہ تجویز بھی اللہ کے رسولؐ کو پیش کر دی تھی کہ اچھا ہم آپ کے خدا کو معبود مانے لیتے ہیں ذرا آپ بھی ہمارے بعض دیوی دیوتاؤں کو تھوڑی سی عزّت بخش دیں — تجویز بڑی دلچسپ اور آج کل کی اصطلاح میں روادارانہ — فراخدلانہ تھی۔ حضورؐ سوچ سکتے تھے کہ اگر میں نے کورا جواب دیدیا تو یہ خیرہ سر بالکل ہی نفور ہو جائیں گے اور ان کے عناد و بیزاری کا اشتعال ابلاغ و تبلیغ کے رہے سہے امکان بھی ختم کر دے گا۔ لہٰذا کیا حرج ہے اگر اصلاح کے موقع کا تحفظ کرنے کے لئے دل سے نہیں فقط ظاہر داری کے طور پر ہی نرمی اور لچک کا مظاہرہ کر دیا جائے۔ مگر ایسا نہیں سوچا بلکہ اللہ کی ہدایت پر جو صاف اور دو ٹوک جواب دیا گیا اسے سورۂ الکافرون میں پڑھ لیجئے۔

خوب سمجھ لیجئے۔ یہ شیخ جیلانیؒ یا دیگر اولیاء کے نام سالانہ تقریبات، یہ شریعتِ قبوری کی تہہ در تہہ اور دور رس رسمیں اگرچہ بدعات ہی ہیں یعنی نو ایجاد چیزیں اور قرونِ اولیٰ میں ان کا سایہ تک نہیں ملتا، لیکن اتنی مدت ان پر بہر حال گزر چکی ہے کہ اب یہ رواج مستقل بن گئی اور رسم و رواج کی جڑیں دل و دماغ میں اس طرح جمتی ہیں کہ انھیں معمولی قسم کی کوششوں سے اُکھیڑنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ فقط دنیا دارانہ رسم و رواج ہی کی یہ کیفیت ہے کہ بڑی سے بڑی عقلی دلیل اس کے سامنے حباب کی طرح ہیچ جاتی ہے پھر بھلا اس رسم و رواج کی سخت جانی کا کیا ہوگا جسے کج فکر، متوہم طبع اور ضعیف الاعتقاد علماء مذہب نے دین کے رنگ میں رنگ دیا ہو۔ ناممکن ہے کہ کوئی شخص گیارھویں یا محفلِ قوالی یا کسی بھی مبتدعانہ تقریب میں شرکت کر کے اصلاحِ عقائد کے نام کا ایک تنکا بھی توڑ سکے — ہاں ضرور ہوگا کہ خود اس کے دل و دماغ پر رفتہ رفتہ ان رسوم کا سایہ پھیلتا جائے گا اور پھر ایک دن اس کا ضمیر ان سے سمجھوتہ کر چکا ہوگا۔

ایک بات آپ نے یہ بھی پوچھی ہے کہ اگر عقیقے کی دعوت کے ساتھ کسی بزرگ کے نام کی فاتحہ کی جائے تو اس کے کھانے میں شرکت جائز ہے یا نہیں؟ ہم جواب دیں گے کہ عقیقہ

کی درستی رہی کہاں جب غیر اللہ کے نام کا کھانا پکا یا گیا۔ صحیح طریقہ تو یہ ہے کہ خدا واسطے کا کھانا تقسیم کیا جائے اور پھر جسے چاہے دعا کے ذریعہ اس کا ثواب بخش دیا جائے ایسے موقع پر اگر زائد کھانا عزیز و اقربا کے لئے بھی پکا لیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن یہ جو رائج ہو گیا ہے کہ "فلاں بزرگ کی فاتحہ کا کھانا" یہی شرک و بدعت کی جڑ ہے۔ خیر خیرات صرف اللہ کے نام پر درست ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کچھ کھانا اپنے مرحوم باپ یا استاد یا شیخ یا کسی بھی بزرگ کی طرف سے پکا کر خیرات کر دیں مگر خیرات ہونی چاہئے اللہ ہی کے نام پر فاتحہ کا مقدس نام جب بھی غیر اللہ سے منسوب کیا جائے گا بات گناہ کے دائرے میں جا پہنچے گی۔ واللہ اعلم عند اللہ

دین میں سیاست کا مقام

سوال ۳:۔ از محمد عرفان۔ کراچی (ایک طویل خط کی تلخیص)

عقیدے کی حیثیت میں یہ بات بہت مشہور رہے کہ اسلام دین و سیاست کی تفریق کا روادار نہیں لیکن اس کا ٹھیک ٹھیک مطلب اور کوئی واضح مفہوم میں شاید اپنے علم و فہم کی کوتاہی کے باعث نہیں سمجھ پایا ہوں۔ کئی طرح کی الجھنیں ذہن میں پیدا ہوتی ہیں مثلاً یہ کہ جن اعمال پر اصطلاحاً عبادت کا اطلاق ہوتا ہے وہ ـــ اور جن سرگرمیوں کو سیاسی سرگرمیاں کہا جاتا ہے وہ ـــ ایک دوسرے سے صریحاً جدا اور الگ الگ ہیں۔ تو کیا دین و سیاست کے ایک ہونے کا مطلب یہ ہو گا کہ کوئی بھی عبادت کامل نہیں جب تک عبادت کرنے والا سیاست میں بھی حصہ نہ لے؟

یا مثلاً یہ کہ اکثر و بیشتر علماء زبان سے چاہے اس عقیدے کی صریح تردید نہ کریں لیکن نیم صریح الفاظ میں وہ سیاست کو دین سے جدا ہی قرار دیتے ہیں اور ان کا عمل زبانِ حال سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ تمام دین فقط عبادات یا زیادہ سے زیادہ چند معاشرتی اصلاحات تک محدود ہے۔ سیاست کو نہ صرف یہ کہ دین میں کوئی اہم مقام حاصل نہیں بلکہ وہ دنیا داری کا شغل ہے اہل اللہ اور اہل تقویٰ کو اس کے سائے تک سے دور رہنا چاہئے۔

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ جن زمانوں میں سیاست اور اقتدار کی باگ ڈور اسلام کے ہاتھوں میں نہیں رہی بلکہ طاغوتی قوانین کا سکہ جاری رہا ان زمانوں میں بھی بڑے بڑے صلحاء و شیوخ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے اور ان میں سے اکثر ایسے تھے جنھوں نے سیاست سے کوئی واسطہ نہیں رکھا۔ تو کیا ان کی ذاتی عظمت کو اس لئے ناقص اور داغدار قرار دیا جائے گا کہ وہ سیاست سے کنارہ کش رہے۔ یا ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوئے جب اسلام سیاسی رخ سے مردہ یا نیم مردہ تھا؟

براہِ کرم آپ قدرے تفصیل سے واضح فرمائیے کہ سیاست کا مقام دین میں آخر ہے کیا اور اس موضوع پر غور و فکر کا کونسا رخ اسلام کی روح سے مطابقت رکھتا ہے؟ ـــ ایک میں ہی نہیں بے شمار اور لوگ بھی ـــ جو عقیدۃً دین اور سیاست کو ایک ہی خانے میں رکھتے ہیں واضح طور پر یہ ادراک نہیں رکھتے کہ دین اور سیاست کے باہمی روابط کس قسم کے ہیں۔

الجواب ۳:۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ دین اور سیاست کے ربط کو تسبیح کی مثال سے سمجھنا چاہئے۔ تسبیح دو چیزوں سے بنتی ہے۔ دانے اور دھاگہ۔ دانے خواہ لکڑی کے ہوں یا شیشے یا کسی بھی شے کے وہ بہر حال دھاگے سے جدا وجود رکھتے ہیں۔ ان کی ساخت، ان کے اجزائے ترکیبی، ان کی شکل و ہیئت، ان کا سب کچھ دھاگے سے بالکل الگ ہے پھر بھی یہ دھاگہ ان کے نظم و انضباط اور شیرازہ بندی کے لئے اتنی ناگزیر اہمیت رکھتا ہے کہ یہ نہ ہو تو دانے اپنے مقصدِ وجود سے عاری ہو جائیں اور تسبیح نام کی کوئی چیز وجود ہی میں نہ آئے۔

اسی طرح اصطلاحی عبادات اپنا مستقل وجود ایک

جداگانہ حیثیت، ایک انفرادی ہیولیٰ اور تشخص رکھتی ہیں۔ وہ اپنی ذاتی حیثیت میں کسی اور شے کی محتاج نہیں لیکن ان کے مطلوبہ نظم و انضباط، شیرازہ بندی اور اثر آفرینی کیلئے اسلامی سیاست کا رشتہ مستقیم قطعی طور پر ضروری ہے۔ ایک مربوط و منظم ملت کا وجود ہی متصور نہیں اگر سیاست کی ڈور نے اس کے افراد کو ایک دوسرے سے مربوط و منسلک نہیں کیا ہے۔ تسبیح کا ڈورا اگر ٹوٹ جائے اور دانے بکھر جائیں یا ڈورا سرے سے پرویا ہی نہ جائے تو مادّی سطح پر ہم یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ دانوں کی ذاتی حیثیت میں کوئی نقص آ گیا۔ دانے تو وہی دانے رہیں گے جو وہ ہیں اور ان کی ساخت یا اجزاء ترکیبی یا صورت و ہیئت میں شمہ برابر فرق واقع نہ ہوگا، لیکن یہ ضرور کہا جائے گا کہ وہ اپنے مقصدِ وجود کو پورا کرنے سے عاری رہے۔ ان میں وہ انضباط پیدا نہ ہو سکا جو اپنی ہیئت کے تعلق سے "تسبیح" کہلاتا ہے۔ ان سراسر غیر منظم اور تتر بتر دانوں کو ہوا کا ایک جھونکا اور ہلکا سا ایک دھچکہ بھی جس رخ چاہے الٹ پلٹ دے گا۔

اسی طرح سیاسی اثر و قوت سے محروم ہونے کی صورت میں کسی بھی مصطلحہ عبادت، مثلاً نماز، روزہ اور زکوٰۃ وغیرہ کے بارے میں یہ تو ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں بالذات کوئی نقص پیدا ہو گیا۔ لیکن یہ ضرور کہا جائے گا کہ ان کی مثال بے دھاگے کے دانوں جیسی ہے جو بنائے تو اس لئے گئے تھے کہ انھیں ایک رشتے میں پرو کر تسبیح کی شکل دی جائے لیکن رشتے سے محروم ہونے کے باعث ان کا مصرف کچھ بھی نہ رہا۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کر سکتے ہیں کہ چنے کے دانوں یا کھجور کی گٹھلیوں کی طرح انھیں وظیفہ خوانی میں استعمال کر لیں لیکن اس سے ان کا مقصدِ وجود تو پورا نہ ہوا اور صنعت گری تو ضائع ہو ہی گئی۔

اب غور اس پر کیجئے کہ خود ملّتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود آخر ہے کیا ـــ ہم نے تو علم و فہم کی ساری صلاحیتیں صرف کر کے مقصدِ وجود یہ سمجھا ہے کہ وہ خدائے کائنات کے ایک منظم لشکر کی حیثیت سے طاغوتی قوتوں کے ساتھ مسلسل جنگ پر مامور ہے۔ وہ اعلائے کلمۃ الحق کی ایک مجسم تحریک ہے، اسکا بنیادی وظیفۂ حیات یہ ہے کہ انسانی معاشرے کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی غیر منقطع جد و جہد جاری رکھے۔ وہ یہ سمجھ کر جیئے کہ اسے دنیا میں ایک مزدور کی حیثیت سے بھیجا گیا ہے جسے اپنا تمام وقت اور قوت و صلاحیت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں صرف کر دینی ہے۔ اس کے اوقاتِ کار دن میں صرف آٹھ یا دس گھنٹے نہیں ہیں بلکہ یہ پوری زندگی ہی اس کے لئے کام کا وقت ہے اور وہ کسی بھی سانس اپنی ڈیوٹی سے بری الذمہ نہیں۔

کہنے کو ایک پُرامن وعظ، ایک پچھے دار خطبے اور ارشاد و تبلیغ کے ایک رسمی پروگرام سے بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سطحی تقاضے پورے ہو جاتے ہیں لیکن جو لوگ أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى[۱] جیسی قرآنی تنبیہات اور أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ[۲] جیسی آیاتِ بلیغہ کو بھلا نہیں چکے ہیں وہ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ ہم اپنی ڈیوٹی، اپنے فرائض سے غفلت برت کر بھی آرام سے اُخروی نعمتوں کے مستحق قرار پا جائیں گے اور اسلام کو غالب و نافذ کرنے کی جد و جہد سے جان چرا کر بھی ہمیں جنت ہاتھوں ہاتھ لے گی۔

سیاست آج کل کے مفہوم میں تو ایک بازی گری، ایک حرص و ہوا کا کھیل، ایک گھناؤنا شغل اور ایک آلۂ ظلم و استبداد بن کر رہ گئی ہے لیکن اسلامی سیاست حقیقت میں ایک زبردست مجاہدہ، ایک سخت ترین آزمائش اور ایک انتہائی صبر آزما فریضہ ہے جو دعوۂ ایمان کو زہرہ گداز عملِ جراحی سے گذارتا ہے۔ اس کی بھٹی میں مومن کا پورا وجود

---

[۱] کیا آدمی یہ گمان کرتا ہے کہ وہ شترِ بے مہار کی طرح آزاد چھوڑ دیا جائے گا۔ [۲] کیا تم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ بس یونہی آسانی سے جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی یہ امتحان تو تم نے دیا ہی نہیں کہ کون تم میں مجاہد ہے اور کس حد تک سختیوں اور مصیبتوں میں ثابت قدم رہ سکتا ہے۔

پگھلتا ہے اور کھوٹ کے چھوٹے سے چھوٹے خورد بینی ذرات بھی ایمان کے کندن سے الگ نظر آتے ہیں۔ حبِ جاہ۔ خدا کی پناہ! یہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز پل صراط بڑی دشوار گذار ہے، لیکن ذرا تاریخ کے غرفے سے جھانک کر دیکھو قلوبِ انسانی کا سب سے بڑا فاتح محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے بے مثال ساتھی رض کس بے جگری اور کمال ایمان کے ساتھ اس پل صراط کو طے کر گئے ہیں۔ اسلام ہم سے یہی تقاضا کرتا ہے کہ امتِ مسلمہ کو اگر تسبیح کی شکل دینی ہے، اس کے مقصدِ وجود کو پورا کرنا ہے تو فقط مسجد و خانقاہ کے نہاں خانوں میں سکڑے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ حقیقی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کٹھن راہ آدمی کو ترشِ پیہم کی خاردار جھاڑیوں اور جراحتوں کی بے آب و گیاہ چٹانوں سے ہو کر گذرتی ہے۔ اس راہ کے شدائد سے گھبرا کر تو انبیاء علیہم السلام اور ان کے ساتھی رضوان اللہ علیہم تک پکار اٹھتے ہیں کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللَّهِ۔

کیا تم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ آرام سے داخل جنت ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تم پر وہ ابتلا نہیں گذریں جو تم سے پہلوں پر گذر چکی ہیں کہ سختی اور تکلیف نے انھیں دبا لیا اور وہ جھڑجھڑا ڈالے گئے۔ یہاں تک کہ اپنے وقت کا رسول اور اسکے صاحبِ ایمان ساتھی پکار اٹھے کہ کب آئیگی اللہ کی مدد۔

+ + + +

+ + + +

خدا کی راہ میں حرب و قتال کا جو بلند ترین مقام دین میں ہے وہ محتاج بیان نہیں لیکن حرب و قتال کا مرحلہ سیاست کی گھاٹیوں سے گذرے بغیر نہیں آیا کرتا ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی حربی و عسکری سرگرمیاں العظمۃ للہ! یہاں تک کہ اس خلاصۂ کائنات سید الانس والجن نے خود بھی ہتھیار سجائے اور زخم کھائے ہیں، مگر یہ مراحل آغاز ہی میں نہیں آ گئے۔ عرصے تک آپ سیاست کی زلفیں سنوارتے رہے ہیں تب کہیں جا کر حرب و ضرب کی نوبت آئی ہے۔ حرب و ضرب خدا کی راہ میں اگر مقبول ترین عمل ہے تو سیاستِ اسلامیہ سے عملی تعلق اور شغف کیونکر مقبول نہ ہوگا جب کہ حرب و ضرب کی منزل ہی سیاست کے راستے سے آتی ہے۔

اسلام سے شکست کھانے والی اقوام کی سب سے بڑی کوشش یہی رہی ہے کہ مسلمانوں میں دین و سیاست کے جدا جدا ہونے کا تصور عام کر دیں۔ انھیں یقین دلادیں کہ مسجد و خانقاہ کے مقدس ماحول سے نکل کر سیاست کی متعفن فضا میں آنا دنیاداری کی بات ہے جو اہل اللہ کو زیب نہیں دیتی۔ یہ قومیں کامیاب ہوئیں اور آج اچھے اچھے ذی فہم، بیدار مغز اور فرشتہ سیرت علماء و صلحاء کو آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اصولاً تو وہ دین و سیاست کی تفریق کا قول نہیں کرتے لیکن سیاست سے انھیں چڑھ ہے۔ اس لفظ ہی کو انھوں نے دین کے حق میں گالی بنا لیا ہے۔ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں گویا کذب دغا، دجل و فریب، فسق و نفسانیت اور ظلم و طغیان کے جو رذائل سیاستِ مروجہ میں گھس آئے ہیں وہ سیاست سے الگ کوئی چیز نہیں بلکہ سیاست نام ہی انھی اوصاف خبیثہ کا ہے۔ جب سوچنے کا ڈھنگ یہ ہو تو سیاست آپ سے آپ ایک ناپاک ترین شے بن جائے گی، حالانکہ سیاست بجائے خود ایک ورقِ سادہ ہے جس پر آپ اچھی اور بری ہر طرح کی مہریں لگا سکتے ہیں۔ سیاست کے رذائل کی ذمہ داری خود سیاست پر نہیں ہے سیاست چلانے والوں پر ہے۔ سیاست چلانے والے اگر نفسِ امارہ کے غلام اور خواہشات کے بندے ہیں تو ان کی سیاست اخلاقی ظلمتوں کا مجموعہ ہونی ہی چاہیئے اسمیں سیاست بیچاری کا کیا قصور۔ سیاست تو وہ بھی تھی جسے آقائے دو جہاں اور ان کے خلفائے راشدین نے

برتا تھا۔ پھر کیا اس سے بھی بیزاری و نفرت کا اظہار کیا جائے گا۔

افسوس دماغوں کے سانچے بگڑ گئے، فکر کے زاویے تبدیل ہو گئے یہی وجہ ہے کہ ہم اسلام کی مغلوبیت پر نہ صرف غمگین نہیں بلکہ اس مغلوبیت کا احساس ہی معدوم ہے اور جو لوگ اس بے حسی کی نشاندہی کر کے جہاد و عمل کی دعوت دیتے ہیں انھیں مرحبا کہنے کے عوض کیچ اچھالنے کا جذبہ ہر طرف عام ہے۔ فیا حسرتا۔

طاغوتی اقتدار والے زمانوں کے جن بزرگوں کا آپ نے ذکر کیا ان کا مسئلہ بھی تسبیح کی مثال سے حل ہو گیا۔ سیاست سے کنارہ کش رہنے یا غلبۂ باطل پر صبر و قناعت اختیار کئے رکھنے کے باعث ان کی ذاتی عظمت اور انکی عبادات میں تو بالذات کوئی نقص واقع نہیں ہوا جیسا کہ تسبیح کے دانے اگر لعل و یاقوت کے ہیں تو ڈورا ٹوٹ جانے کے بعد بھی ان کی قیمت بازار میں لعل و یاقوت ہی کی اٹھے گی۔ وہ صندل کے ہیں تو صندل ہی کے رہے جائیں گے۔ لیکن معنوی اعتبار سے ان بزرگوں کے اعمالِ صالحہ میں وہ وزن نہیں پایا جا سکتا جو اقامتِ دین اور اعلائے کلمۃ الحق کی راہ میں شدائد جھیلنے والوں کے اعمال میں پایا جاتا رہا ہے۔ یہ ہم نہیں کہتے قرآن و سنت کہتے ہیں۔ کیا قرآن و سنت ہی نے نہیں بتایا ہے کہ قرنِ اول کے جن مجاہدین نے اسلام کو سیاست و حکومت کے دائروں میں جاری و ساری کرنے کی خاطر اپنے مال و منال، اپنا عیش و آرام، اپنی جانیں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا ان کا ایک سجدۂ والہانہ ہماری زندگی بھر کی عبادتوں سے اور ان کا خدا کی راہ میں خرچ کیا ہوا جَو برابر سونا ہمارے پہاڑ برابر سونے کے ڈھیر سے معنوی قدر و قیمت میں بڑھ چڑھ کر تھا۔ خدا کے یہاں ان کے ایک ایک قطرۂ لہو کی قیمت رحمت و انعام کے بیش بہا خزانے طے پائے اور ان کی سیاسی و حربی سرگرمیوں کو اعلیٰ ترین عبادت کا درجہ عطا کیا گیا۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔ ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّہٗ۔

بات صرف صحابہؓ تک محدود نہیں۔ بعد میں جن بزرگانِ حق نے اقامتِ دین کی راہ میں سر دھڑ کی بازی لگائی ہے ان کے بارے میں بھی اللہ اور رسول کے ارشادات یہی تصور دیتے ہیں کہ آخرت کی میزان میں ان کے اعمال کا بڑا وزن ہے۔ اقامتِ دین کی کوئی راہ سیاست سے یکسر دامن کش رہ کر نہیں گذر سکتی۔ وعظ، تبلیغی اسفار، رشد و ہدایت کے پاکیزہ مشاغل یہ سب سیاستِ اسلامیہ ہی کے اجزائے مقومہ ہیں۔ البتہ جس نے انھی اجزاء کو مقصد قرار دے لیا اور اسلام کے غلبہ و نفاذ کے مقصودِ اعلیٰ سے اپنا ذہنی رشتہ منقطع رکھا اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو پرزے تو بناتا ہے مگر ان پرزوں کو جوڑ کر مشین بنانے کا قصد نہیں رکھتا ظاہر ہے ایسا شخص کتنے ہی خوشنما اور عمدہ پرزے بنا لے لیکن وہ ثمرات ہرگز حاصل نہ ہو سکیں گے جو ایک مکمل مشین سے حاصل ہوتے ہیں۔ خدا کے یہاں اعمال کی قدر و قیمت قصد و نیت کے اعتبار سے ہے۔ خدا کے دین کو غالب و نافذ کرنے کی نیت ہی نہیں نہ مغلوبیت اسلام سے دل و جگر میں کوئی کسک ہے تو پھر رشد و ہدایت کے سارے ہنگامے، وعظ و تبلیغ کے سارے غلغلے اور عبادت و ریاضت کے تمام مقدس مظاہر اس دودھ جیسے ہیں جس میں سے مکھن نکال لیا گیا ہو۔ مکھن نکلے ہوئے دودھ سے ہم اور آپ تو دھوکا کھا سکتے ہیں لیکن وہ علیم و خبیر آقا دھوکا نہیں کھا سکتا جو ہر شئے کو اس کی آخری تہہ تک جانتا ہے۔

تسبیح کی مثال اگرچہ تفہیم مراد میں کوتاہ نہیں ہی لیکن ایک اور مثال سے اس حقیقت کو سمجھئے کہ سیاست کی باگ ڈور اگر اسلام کے ہاتھ میں نہ رہے تو ہمارے

عبادتوں میں معنوی اعتبار سے کس قسم کا ضعف پیدا ہوجاتا ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کا اپنا بدن ایک بہترین مثال ہے۔ فرض کیجئے آپ نارمل حالات میں اپنے ہاتھوں سے ایک انچہ موٹی سلاخ دوہری کردیتے ہیں۔ ایک گھنٹہ پھاوڑا چلا سکتے ہیں بیس سیر گیہوں ایک نشست میں پیس ڈالنے کی سکت رکھتے ہیں۔ اب ایک دن آپ کا پیر کسی دھاردار چیز سے اس بری طرح کٹا کہ لہو کی تلو بن دھ گئی اور آپ نڈھال ہوکر بستر پر گر گئے۔ — کیا اس حالت میں بھی آپ کے ہاتھوں کی قوتِ کارکردگی وہی رہے گی جو معمولاً تھی؟ — بظاہر تو دونوں ہاتھ جوں کے توں ہیں ان کی ساخت، ان کی وضع، ان کے طول و عرض اور قطر و ضخامت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ وہ زخمی بھی نہیں ہوئے وہ ٹھیک ویسے ہی ہیں جیسے کل تھے مگر جواب آپ یہی دیں گے کہ بحالتِ موجودہ وہ بھرپور کارکردگی کی اہلیت سے عاری ہوگئے ہیں۔

بس اسی طرح عبادتوں کے معنوی ضعف و قوت کا معاملہ ہے۔ معاشرت و سیاست پر غلبہ طاغوت ہی کا ہو تب بھی ہماری عبادتیں اوصافِ ظاہری اور ہیئت و ہیولیٰ کے اعتبار سے تو ٹھیک ویسی ہی رہتی ہیں جیسی وہ اسلامی غلبہ و اقتدار کے ماحول میں ہوسکتی ہیں۔ مگر ان کی تاثیر اور قوتِ عاملہ میں ویسا ہی ضعف پیدا ہوجاتا ہے گا جیسا آپ کے ہاتھوں میں پیدا ہوا ہے۔ اسلامی سیاست روح تو نہیں ہے کہ اس کے بغیر ایمان زندہ ہی نہ رہ سکے۔ لیکن لہو ضرور ہے جو جسم سے خارج ہوجائے تو آدمی ڈھانچ اور پنجر کہلاتا ہے۔

رمضان کا ایک مسئلہ

سوال ۱۲ :— از بشیر حبیب صاحب۔ شری وردھن (مہاراشٹر)

یہاں بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ رمضان میں آذانِ مغرب کے بعد افطار کے لئے کچھ دیر ٹھیرنا امام شافعیؒ کے نزدیک درست نہیں ہے، بلکہ اور دنوں کی طرح رمضان میں بھی اذان کے متصل بعد ہی جماعت شروع ہوجانی چاہئے۔ اس پر انھیں خاصا اصرار بھی ہے۔

لیکن ہم نے تو عموماً جگہ جگہ یہی دیکھا ہے کہ کچھ دیر ٹھیرا جاتا ہے یہی بات عامۃ المسلمین کی آسانی کے نقطۂ نظر سے درست بھی معلوم ہوتی ہے۔ براہِ کرم آپ شرعی نقطۂ نظر واضح فرمائیں تاکہ آنے والے رمضان میں یہ اختلاف کوئی شدید صورت اختیار نہ کرلے۔

الجواب :—

ہمیں نہیں معلوم کہ اس جزئیے میں امام شافعیؒ کا قول کیا ہے، لیکن امام شافعیؒ کا مسلک جو کچھ بھی ہو اس کی پیروی انھی کا اتباع کرنے والوں پر ضروری ہے احناف اس کے مکلف نہیں ہیں۔

ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ آذانِ مغرب کے بالکل متصل جماعت شروع کرنا نہ فرض ہے نہ واجب۔ چند ساعتیں اگر اذان و جماعت کے درمیان حائل بھی ہوجائیں تو کسی فرض یا واجب کے ترک کا گناہ لازم نہ آئے گا، لہٰذا افطار کے سلسلے میں چند لمحوں کی تاخیر کردینا ایسا مسئلہ نہیں کہ اس پر بحث و تکرار کا دروازہ کھول دیا جائے۔

مساجد میں متعدد لوگ اذان سے قبل آجاتے ہیں اور تھوڑی بہت افطاری بھی پہنچ جاتی ہے۔ جملہ حاضرین اگر دورانِ اذان میں افطار سے فارغ بھی ہوجائیں تو بہرحال خود موذن کے لئے چند ساعتیں ضرور درکار ہیں۔ کیا حرج ہے اگر اذان اور جماعت میں دو تین منٹ کا فصل ہی ہوجائے۔ ہاں اس فصل کو ربر کی طرح پھیلانا نہیں چاہئے۔ پیٹ تو بھرنا نماز کے بعد ہی انسب ہے۔

حضورؐ کے نام پر انگوٹھے چومنا

سوال ۱۳ :— از اللہ دتا۔ سیالکوٹ۔

اکثر اجتماعات جمعہ اور دینی قسم کے اجتماعات میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام گرامی زبان پر آتا ہے تو لوگ دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے چوم کر آنکھوں پر رکھتے ہیں اور بعض اپنی زبان سے اس کے ساتھ ہی یہ کلمہ بھی ادا کرتے ہیں "قرۃ عینی بک یا رسول اللہ" پڑھے

بڑے علماء تک یہ خود کرتے ہیں اور اپنے عمل کی خاموش زبان سے اس کی تلقین فرماتے ہیں۔ جب ان کے اس فعل کا اصل مصدر و ماخذ دریافت کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اظہار کے طور پر کرتے ہیں فلاں بزرگ نے ایسا کیا فلاں نے ایسا کیا کے حوالجات کے دفتر کھول دیتے ہیں۔ کتاب و سنت کی روشنی میں اس مسئلے کے متعلق رہنمائی فرمائیں۔

الجواب :-

اسی ایک بدعت کی بات نہیں صاحب! بدعتیں اسی زاویۂ نظر کا تو ثمرہ ہیں کہ فلاں بزرگ نے یوں کیا اور فلاں بزرگ نے یوں کیا۔ بے شک بزرگوں کے اعمال و اقوال گنجینۂ ہدایت ہوا کرتے ہیں اور سعادت اسی میں ہے کہ اولیاء و صالحین کی پیروی کی جائے، لیکن ولایت و صالحیت کے سب سے بڑے امام اور بعد از خدا تمام خوبیوں کے محیط و ملجا آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماں برداری سب پر مقدم ہے اور ہرگز کوئی کام برکت و ثواب کا موجب نہیں ہو سکتا اگر حضورؐ فداہ امّی وابی نے اسے اثم و گناہ قرار دیا ہو۔

محبت و عقیدت ظاہر کرنے کے لئے اگر انگوٹھا چوم کر آنکھوں سے ملنا ہمارے معاشرے میں ایک معلوم و معروف رسم کے طور پر موجود ہوتا تو بے شک ہم مستور طریق کو بدعت نہ کہتے کیونکہ بدعت کا اطلاق دینی امور میں ہوتا ہے نہ کہ دنیاوی آداب و رسوم میں۔ بھلا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بڑھ کر کون تعظیم و تکریم کا مستحق ہو سکتا ہے۔ یہی سمجھا جاتا کہ انگوٹھا چوم کر آنکھوں سے لگانا چونکہ محبت و عقیدت کی علامت کے طور پر رائج ہے اور رواج اگر کسی حکم شرعی سے ٹکراتا نہ ہو تو اسے اسلام نے مباح قرار دیا ہے۔ لہٰذا حضورؐ کے ذکر پر تو یہ علامت شد و مد کے ساتھ ظاہر ہونی ہی چاہیئے۔

لیکن ہم کہتے ہیں ـــــ اور خود یہ انگوٹھے چومنے والے بھی جانتے ہیں کہ ایسے کسی رواج اور طور طریق کا معاشرے میں سایہ تک موجود نہیں کسی بھی بزرگ ہستی کا نام سننے یا لینے پر ـــ حتیٰ کہ خدائے عزّ و جل کا نام لینے اور سننے پر کوئی مسلمان انگوٹھے نہیں چومتا حالانکہ اس سے بڑھ کر تعظیم و تکریم کا مستحق کون ہوگا تو آپ سے آپ معلوم ہو گیا کہ یہ طبع زاد طریق بدعت و ایجاد ہے۔ ایجاد کی حد تک کوئی حرج نہ تھا، لیکن بدعت ہونا سراپا حرج ہی حرج ہے۔ بدعت اس لئے کہ اس کا نہ صرف التزام کیا جاتا ہے بلکہ جو اس پر عامل نہ ہو اسے بدعقیدہ اور قابلِ ملامت خیال کیا جاتا ہے۔

خدا جانے وہ کون بزرگ ہوں گے جن کا حوالہ یہ بدعت پسند حضرات دیتے ہیں ہمیں تو سلف کے مشاہیر علماء و صلحاء میں کسی کی سند ملی نہیں۔ یوں علاقائی سطح کے علماء کا حوالہ اگر ان لوگوں نے کافی سمجھ لیا ہے تو علاقائی سطح کے بعض "بزرگ" اور "درویش" تو بھنگ اور چرس سے بھی شغل فرماتے رہے ہیں۔

المختصر انگوٹھے چومنا ایجادِ بندہ ہے۔ کل کو یہ لوگ حضورؐ کا نامِ مقدس لینے والوں کے ہونٹ چومنے کا بھی سلسلہ شروع کر دیں تو ہمیں یا آپ کیا کر سکتے ہیں۔ علم و فہم کی بات تو یہ ہے کہ حضورؐ کا نام سُن کر درود پڑھیے (صلی اللہ علیہ وسلم) اور جہل و ایجاد کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

فضائل ذکر

سوال :- از ابن وکیل۔ اعظم گڑھ۔

آج کل مولانا ذکریا صاحب شیخ الحدیث دامت برکاتہم کی کتاب "فضائل ذکر" زیر مطالعہ ہے تبلیغی جماعت کے تبلیغی نصاب میں اس کتاب کو خاص مقام حاصل ہے اس کتاب کے ذریعہ خود تبلیغی جماعت نیز تمام مسلمانوں کی دینی تعلیم و تربیت کا کام لیا جاتا ہے اس کتاب کو پڑھنے سے عام طور پر تاثر یہ بنتا ہے کہ غالباً دین اسلام کی صحیح ترجمانی اس کتاب کے ذریعہ نہیں ہو رہی ہے لیکن شبہے کی بناء پر میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ میں ایک کم علم آدمی

ہوں اس لئے کسی صاحبِ علم کی طرف رجوع کرنا ضروری معلوم ہوا۔ اس کتاب میں عجائبات تو بہت ہیں، میں کیا کیا چیزیں نقل کروں۔ بس چند مثالیں درج کرتا ہوں (اس کے بعد سائل نے متعدد اقتباسات نقل کئے ہیں۔ جنھیں بخوف طوالت حذف کیا جاتا ہے)

الجواب :-

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ذکریا صاحب کی بعض کتابیں ہم نے بھی دیکھی ہیں۔ ان کے علم و فضل، زہد و ورع اور تعلق باللہ کے کیا کہنے۔ وہ سلف صالحین کی یادگار اور اپنے خاص رنگ کے امام زمانہ ہیں۔ ہم جیسے بے بضاعتوں کا منصب نہیں کہ ان کے بارے میں زبانِ نقد دراز کریں۔

لیکن اُس فریضۂ جواب دہی کی خاطر جسے ہم نے اپنے ذمے لے رکھا ہے بس اتنا ہی عرض کر سکیں گے کہ ممدوح محترم تبلیغی جماعت سے وابستہ ہیں اور اس جماعت کا طرزِ فکر، طریق کار اور نصب العین جس نوع کا مزاج و ذہن تیار کرتا ہے اس کے لئے ممدوح کی کتابیں کارآمد اور مؤثر ثابت ہو رہی ہیں۔

آپ نے سُنا ہو گا محدثین نے ہزاروں نہیں لاکھوں روایات میں سے فقط چند ہزار روایتیں اپنے مصنّفات میں جمع کیں اور باقی کو اس لئے چھوڑ دیا کہ وہ قابلِ اعتبار نہیں تھیں۔ اب اتنا بڑا فالتو ذخیرہ ہوا میں تو تحلیل نہیں ہو سکتا تھا۔ لامحالہ دوسرے لوگوں نے اپنے اپنے ظرف اور ضرورت کے مطابق اسے استعمال کیا اور مسلمانوں میں صحیح و ثقہ روایات کے ساتھ کمزور اور موضوع روایتیں بھی حدیث کے نام سے خراجِ قبول حاصل کرتی رہیں۔ سوچنے کا ڈھنگ بعض اچھے اچھے بزرگوں تک کا یہ بن گیا کہ جس طرح وعظ و پند کے لئے طبعزاد قصّے کہانیاں سنانا کوئی بری بات نہیں اسی طرح ایسی حدیثیں بھی نشر کرنا کچھ بُری بات نہیں جو علم و فن کی کسوٹی پر چاہے رانگ ہی ہوں لیکن سُننے والا انھیں سنکر نیکی کی طرف مائل ہو جائے۔ چنانچہ بے شمار ناقابلِ اعتماد روایتیں ایسے ہی بزرگوں کی پھیلائی ہوئی ہیں جن کے اخلاص و تقویٰ کی قسم کھائی جا سکتی ہے اور جو واقعۃً اخلاق و عبادات کے زندہ پیکر تھے۔

شیخ الحدیث مدظلّہٗ، علم الحدیث کے بھی شناور ہیں۔ انھیں رجال کے فن اور جرح و تعدیل کی نزاکتوں پر استادانہ عبور حاصل ہے اس کے باوجود ان کی تحریروں میں اگر ضعیف، موضوع اور بے بنیاد روایتیں فراوانی کے ساتھ ملتی ہیں تو اس کی وجہ وہی طرزِ فکر ہے جس کا ہم نے ذکر کیا۔ وہ دینداری، صالحیت اور خدا پرستی کا جو تصور رکھتے ہیں اس کے لئے ایسی تمام روایات اکسیر سے کم نہیں جن میں کشف و کرامت کے چرچے ہوں، خواب اور کرشمے جلوہ طراز ہوں اور ذکر و شغل کی پُرامن راہ سے فردوس کی منزل تک پہنچایا گیا ہو۔

حاصلِ جواب یہ سمجھئے کہ اسلام کا جو تصور خود آپ کی نگاہ میں صحیح تر ہے آپ اسی کے مطابق جہد و عمل کئے جائیں۔ دوسرے لوگ اپنے تصور کے مطابق کام کرتے رہیں گے ٹکرانے سے کچھ حاصل نہیں۔ دلوں میں اگر اخلاص پیدا ہو جائے تو گوناگوں اختلافات کے باوجود ایک مقصدِ اعلیٰ کے لئے ہم سب کچھ نہ کچھ ضرور کر سکتے ہیں۔ واللہ الموفق۔

ایک آیت پر شبہ

سوال :- از عبدالرحیم بھساولی۔ احمد آباد۔

قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کی صداقت پر ہم سب مسلمانوں کا ایمان ہے۔ عام اس سے کہ ہم اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھیں یا نہ سمجھیں قرآن نے مومنین کی صفت ہی یہی بتائی ہے کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ لیکن جیساکہ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ فرمانا کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی (سورہ بقرہ رکوع ۳۵) ایمان و اسلام کے منافی نہیں ہے بلکہ مزید اطمینانِ قلب حاصل ہونے لِیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ کے لئے تھا۔ اس طرح قرآنِ حکیم کی سورہ لقمان کے آخر کی آیتوں میں جن پانچ باتوں کے متعلق علم کی غیر اللہ

سے نفی کی گئی ہے، لیکن ہماری آنکھوں میں خاک پڑے ہم کو تو دو باتیں بظاہر اس کے برعکس نظر آتی ہیں۔ جیسا کہ بارش کے متعلق اخبارات میں پیشین گوئیاں شائع ہوتی ہیں وہ صحیح ہوتی ہیں (اگرچہ شاذ و نادر ہی) اور دوسرے یہ کہ بعض لوگ قیاس اور چند مخصوص وجوہات سے بتادیتے ہیں کہ حاملہ کے شکم میں لڑکا ہے یا لڑکی حالانکہ یہ بھی بہت کم صحیح ثابت ہوتا ہے۔ اس میں بظاہر جو تضاد نظر آرہا ہے اُسے دُور فرمایئے۔ مجھے قرآن کی صداقت پر ایمان ہے یہ ضروری نہیں کہ فاطر السمٰوات والارض کا ہر ارشاد ہمارے محدود عقل و ادراک سمجھ سکیں۔

الجواب :-

جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے آپ تجلّی کے دیرینہ قاری ہیں۔ پھر بھی اگر اس طرح کی معمولی الجھنوں کو خود ہی تھوڑے سے غور و فکر سے رفع کرنے کی اہلیت آپ میں پیدا نہیں ہوتی تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ تجلّی کم سے کم آپ کی حد تک اپنے کاز میں ناکام رہا۔ ہم نے تجلّی کو شروع ہی سے منقول و معقول کا ایسا مجموعہ بنانے کی سعی کی ہے جو قارئین کے اندر فکر و تدبّر کی روشن صلاحیتوں کو نشو و نما دے اور وہ رفتہ رفتہ خود ہی اس کے اہل ہوجائیں کہ پیش آمدہ مسائل میں عاقلانہ انداز نظر اختیار کرسکیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ہماری سعی کلیۃً تو ناکام نہیں رہی۔ بیشمار لوگ ایسے ہیں جو اگرچہ دینی تعلیم کے کسی باضابطہ نصاب سے بہرہ ور نہیں، لیکن تجلّی کے مستقل مطالعے نے انکے ذہن کا ایک ایسا سانچہ تیار کردیا ہے جو صحیح کو غلط سے اور حق کو باطل سے ممیّز کرلینے میں بڑا حساس ہے۔ وہ بیشتر مسائل میں اپنی ہی بصیرت سے مستقیم نتائج تک پہنچ جاتے ہیں اور باطل وساوس و تصورات کو قبول نہ کرنے میں ان کے قلب و دماغ کی وہی حالت ہوگئی ہے جو کبھی ہضم نہ کرنے کے معاملے میں صحت مند معدے کی ہوتی ہے۔

پھر بھی انسان کی مساعی تو بہرحال ناقص و ناتمام رہتی ہی ہیں۔ اگر بعض دیرینہ قارئین بھی تجلّی سے مطلوبہ حد تک اثر پذیر نہیں ہوسکے ہیں تو ایسے ہم اپنے ہی خلوص کی کمی اور اپنے ہی طریق عمل کا نقص تسلیم کرکے اللہ سے مزید اثر و اصابت کی دعا کریں گے۔

اس تمہید کے بعد اپنے شبہ کا جواب سنیئے :-

سورۃ لقمان کے اختتام پر جو کچھ کہا گیا ہے وہ یہ ہے :-

اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ	یقیناً اللہ ہی کو علم ہے کہ قیامت کب آئیگی اور وہی نازل کرتا ہے بارش اور وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے بطن میں کیا ہے اور کسی متنفس کو نہیں معلوم کہ وہ آنے والے کل میں کیا کرے گا اور کسی متنفس کو خبر نہیں کہ وہ کہاں مریگا بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا خبر رکھنے والا ہے۔

+ + + +

ہمارا خیال یہ ہے کہ جو غیر منطقی اندازِ نظر آپ نے اختیار کیا ہے اس کی رو سے تو فقط دو باتوں ہی پر نہیں آپ کو چار باتوں پر یکساں الجھن پیدا ہونی چاہئے تھی۔ ایک علم قیامت کے علاوہ چاروں ہی چیزیں آیت میں ایسی مذکور ہوئی ہیں کہ ان کے بارے میں ویسی ہی تشکیک ظاہر کی جاسکتی ہے جیسی آپ نے دو کے بارے میں کی ہے۔ آخر کیا ہم میں سے ہر شخص آنے والے کل اور پرسوں کے لئے کچھ ارادے کچھ پروگرام نہیں رکھتا۔ ہم میں سے بعض تو مستقبل کے لئے ایک لمبا چوڑا خاکہ بنا کر رکھتے ہیں۔ حکومتیں پلان بناتی ہیں۔ ادارے منصوبے ترتیب دیتے ہیں۔ پھر یہ سب روبکار بھی آتا ہے۔ کبھی عین مین پروگرام کے مطابق کبھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ۔ تو بارش اور ما فی الارحام کی طرح آپ کو ما تدری نفسٌ مّاذا تکسب غداً پر بھی شبہ وارد کرنا چاہئے تھا۔

اور چوتھی بات ـــــ یعنی کون کہاں مرے گا ـــــ یہ بھی متعدد صورتوں میں تشکیک کا مورد قرار پاسکتی ہے۔

مثلاً دق یا سرطان یا کسی بھی مہلک مرض کے ایک مریض کو اپنے یہاں کے کسی خیراتی ہسپتال میں ایڑیاں رگڑتے دیکھ کر آپ پیش گوئی کر سکتے ہیں کہ یہ ہمارے شہر بھساول ہی میں انتقال کرے گا۔ یا ایک ایسے شخص کے بارے میں جس نے قسم کھائی ہو کہ میں اپنے شہر سے باہر قدم نہیں نکالوں گا آپ فیصلہ دے سکتے ہیں کہ یہ یہیں مر کھپ جائے گا۔ پھر یہ فیصلہ اور اول الذکر پیش گوئی اکثر حالات میں درست بھی ثابت ہو گی تو کیا چاروں ہی امور۔ آپ کے انداز نظر سے اعتراض کا ہدف نہیں ہو گئے؟

محترم! پہلے آیت کو سمجھئے۔ اس آیت کی شانِ نزول حدیث میں یہ مذکور ہوئی ہے کہ ایک سائل نے انھی پانچ باتوں کے بارے میں سوال کیا تھا جن کا تذکرہ اس آیت میں ہوا۔ لہٰذا یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ بس یہ پانچ ہی چیزیں ایسی ہیں جن کا علم انسان کی گرفت سے باہر ہے باقی تمام چیزیں اس کے دائرۂ علم میں ہیں۔ نہیں۔ ان کے علاوہ بھی بے شمار مغیبات ہیں جن تک انسان کی رسائی ممکن نہیں۔ البتہ ان پانچ کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ حدیث میں انھیں مفاتیح الغیب کا نام دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے علم کو اپنے ساتھ مخصوص فرماتا ہے تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ انسان اسباب و آثار کا مشاہدہ کئے بغیر ان کے بارے میں کوئی یقینی پیش گوئی نہیں کر سکتا۔

آپ کے سامنے ہے کہ کائنات کے تمام حوادثات و واقعات اسباب و علل کی ڈور میں بندھے ہوئے ہیں۔ موت مرض، بارش، آندھی، طوفان، زلزلہ، گرمی سردی، کون سی چیز ہے جس کے لئے قدرت نے اسباب و علل کے سلسلے پیدا نہیں فرمائے۔ حتیٰ کہ جن حوادث کو ہم اتفاق پر محمول کرتے ہیں وہ بھی اصلاً سبب و علت ہی کے ایک متحرک سلسلے کا طبعی و فطری نتیجہ ہوا کرتے ہیں جن کی تہہ تک نہ پہنچ پانے کے باعث ہم انھیں "اتفاق" کا نام دیتے ہیں

اب آپ کو معلوم ہے کہ کسی سبب و علت کا مشاہدہ کر لینے کے بعد اس کے نتیجے کا ادراک کر لینا علم غیب نہیں کہلاتا بلکہ اسے بفرقِ مراتب مشاہدہ، تخمینہ، قیاس، تجربہ اور سائنس کہتے ہیں۔

مثلاً ایک چولہے پر پانی کی کیتلی چڑھتے دیکھ کر آپ کہہ سکتے ہیں کہ چند منٹ بعد کیتلی میں سے بھاپ اٹھے گی۔ کسان کو زمین پر ہل چلاتے دیکھ کر فرما سکتے ہیں کہ دو ماہ بعد یہاں کھیت لہرائے گا۔ قمری دو تاریخ کو آپ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ چودہ کی رات کو خوب چاندنی ہو گی۔ جنوری میں آپ اطلاع دے سکتے ہیں کہ مئی جون کی چھٹیوں میں آپ کا بھائی گھر آئے گا۔ مہینوں قبل آپ بتا سکتے ہیں کہ اگلے فلاں فلاں مہینوں میں جاڑا پڑے گا۔

ان سب صورتوں میں یقیناً آپ ایسی باتیں بتا رہے ہیں جو حال کی نسبت سے "غیب" ہیں اور اکثر و بیشتر ان میں آپ سچے ہی ثابت ہوں گے، لیکن کیا انھیں "پیش گوئی" کہا جائے گا؟ کیا ان پر علم غیب کا اطلاق ہو سکتا ہے؟

ظاہر ہے کہ نہیں اور ہرگز نہیں۔ اللہ نے عقل و فہم، حواس، وجدان اور شعور دیئے ہی اسی لئے ہیں کہ انسان علت سے معلول، سبب سے مسبب اور مؤثر سے اثر کا علم حاصل کرے۔ ایسے علم پر غیب دانی کا اطلاق نہیں ہوتا، اور سورۂ لقمان یا کسی بھی سورت و آیت میں ایسے علم کی نفی نہیں کی گئی ہے۔

اب بارش اور دیگر موسمی پیش گوئیوں کی بابت غور کیجئے۔ یہ "پیش گوئیاں" دراصل اس لئے کہلاتی ہیں کہ اسباب و علل کے سلسلوں کو ہماری ننگی آنکھ اتنے فاصلے سے نہیں دیکھ پاتی جتنے فاصلے سے بعض آلات کی آنکھ دیکھ لیتی ہے۔ "راڈر کی آنکھ" کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ یہ بہت دور سے طوفان کے آثار و علائم دیکھ لیتی ہے اور اسی کی جنس سے ایک ایسا آلہ بھی ایجاد ہو چکا ہے جو ہوائی جہازوں کو بے شمار فاصلے سے دیکھ لیتا ہے۔

نیز دوسری وجہ ان کا نام "پیش گوئی" رکھنے کی یہ ہے کہ ہم عام لوگ طبعی قوانین اور عناصر کے فعل و انفعال کی منطق سے واقف نہیں ہیں - لہٰذا جب اہل فن آلات کی مدد سے آثار و اسباب کا مشاہدہ فرماکر حکمتہ اور متوقع نتائج کا اعلان کرتے ہیں تو ہمیں یہ "پیش گوئی" ہی نظر آتی ہے - ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ پیش گوئی بس ایسی ہی ہے جیسے آپ چولھے میں آگ روشن ہوتے دیکھکر "پیش گوئی" فرمادیں کہ چولھے پر چڑھا ہوا پانی کچھ دیر بعد بھاپ بن کر اُڑے گا۔

دوسری تمام چیزوں کی طرح بارش بھی اسباب و علل کے ایک سلسلے سے مربوط ہے - ہم عام لوگ بھی جو طبعیات کے قوانین اور عناصر کے فعل و عمل کی سائنس سے باخبر نہیں - اتنا تو جانتے ہی ہیں کہ بارش یکایک آسمان سے نہیں پھٹ پڑتی، بلکہ بادل آتے ہیں اور بادل بھی دفعتاً فضا میں پیدا نہیں ہو جاتے بلکہ ہوائیں انھیں دور سے اُڑا کر لاتی ہیں اور ہوائیں بھی بعض اور قوانین طبعی کے تابع ہیں - اب جو لوگ باقاعدہ طبعیات کا علم حاصل کرتے ہیں انھیں تو کہیں زیادہ گہرے آثار و علل کا علم ہونا ہی چاہئے - وہ تجربات اور آلات کی مدد سے آثار و علل کا پتہ لگاتے ہیں اور پھر انھی کے مطابق متوقع نتائج کا اعلان کر دیتے ہیں - ان میں اور ہم میں بس ایسا ہی فرق ہے جیسے زید اپنے گھر میں بیٹھا ہوا ہو اور آسمان صاف نظر آئے تو وہ نہیں کہہ سکتا کہ عنقریب بارش ہو گی لیکن بکر جو ایک کھلے میدان میں ہے اور دیکھ رہا ہے کہ افق پر کالے بادل منڈلا رہے ہیں اور بھیگی ہوئی ہوا تیزی سے چل رہی ہے کہہ سکتا ہے کہ کچھ دیر بعد بارش ہو جائے گی یہ ٹھیٹ لغوی معنوں میں تو پیش گوئی ہے، لیکن قرآن اس کی نفی نہیں کرتا کیونکہ اصلاً یہ پیش گوئی نہیں ہے بلکہ سبب سے مسبب اور علت سے معلول کا قیاس ہے - آپ تسلیم کرتے ہیں کہ بارش سے متعلق اخباروں کی پیش گوئیاں ہمیشہ درست ثابت نہیں ہوتیں پھر تو ان کی حیثیت بس ایسی ہی رہ جاتی ہے جیسے ہم اور آپ ہوا میں نمی محسوس کرکے "غیبی" اطلاع دیدیتے ہیں کہ کہیں بارش ہوئی ہے یا کالے کالے بادل دیکھکر کہہ دیتے ہیں کہ بارش آنے والی ہے - لیکن اگر یہ اخباری پیش گوئیاں صد فی صد درست بھی ثابت ہوا کرتیں تب بھی آیتِ قرآنی کے لئے ان میں کوئی چیلنج نہ ہوتا کیونکہ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا کہ بارش ہونے کے قطعی اسباب و علل کا مشاہدہ کرنے والے آلات بہتر ہو گئے ہیں - قرآن یہ نہیں کہہ رہا کہ انسان کسی بھی اسٹیج میں بارش ہونے نہ ہونے کا یقینی فیصلہ نہیں دے سکتا - اس نے تو سورۃ لقمان میں صرف اتنا کہا ہے کہ اللہ ہی بارش نازل فرماتا ہے - تفسیر کا سہارا لے کر مفہوم یہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ بارش کب کہاں کتنی ہو گی یہ اللہ ہی کے علم میں ہے - یہ تو اس نے نہیں کہا کہ جب اللہ کسی قطعہ ارض پر بارش برسانے کا فیصلہ کرنے کے بعد سلسلۂ اسباب کو حرکت میں لے آئے اس وقت بھی کوئی انسان ان اسباب کا مشاہدہ کرکے اور آثار و علائم دیکھ کر یہ نہیں بتا سکتا کہ بارش ہو گی یا نہیں ہو گی اور ہو گی تو زیادہ یا کم -

کائنات میں بعض قوانین طبعی ایسے ہیں جو واضح بھی ہیں اور اٹل بھی - مثلاً چاند اور سورج کا نظام حرکت - موسموں کا انقلاب - آگ، پانی، ہوا وغیرہ کے بعض خواص - ایک شخص پورے سال کے لئے پیش گوئی کر سکتا ہے کہ کس کس دن کے بجکر کے منٹ پر سورج طلوع اور غروب ہو گا - یا وہ ہزار بار دعویٰ کر سکتا ہے کہ پانی کو آگ پر چڑھا دیجئے لازماً بھاپ اڑیگی -

لیکن بعض قوانین غیر واضح اور پیچیدہ بھی ہیں - ان کا علم و ادراک ہر ایک کے بس کا روگ نہیں - اب اگر بعض لوگ محنت کرکے ان میں سے بعض کا علم حاصل کر لیں اور اس کی بنیاد پر ان نتائج کا پیشگی اعلان کر دیں جو قدرت نے ان قوانین سے وابستہ کئے ہیں تو عوامی بے خبری کے تعلق سے تو بے شک یہ اعلان "پیشین گوئی" قرار پائیگا

لیکن اصلاً اس کی حیثیت وہی ہوگی جو آپ کے اس قول کی ہو سکتی ہے کہ فلاں مہینے میں دن گھٹنا شروع ہو جائے گا اور فلاں تاریخ کو چاند پوری آب و تاب سے چمکے گا۔

حاصل یہ کہ موسمی پیش گوئیاں تو قدرت کے پیدا کردہ آثار و اسباب دیکھ کر ہی کی جاتی ہیں اور یہ ہمیشہ درست ہی ثابت ہوں تب بھی ان کا ادنیٰ تر تعلق اس علم سے نہیں جسکی نفی قرآن نے کی ہے بلکہ اس فکر و تدبر اور عقل و استدلال سے ہے جس کی دعوت خود قرآن بار بار دیتا ہے۔ مگر جس صورت میں یہ ہمیشہ درست بھی ثابت نہیں ہوتیں تو کہنا یوں چاہیے کہ انسان باوجود زعمِ ترقی کے ابھی تک اس منزل میں بھی نہیں پہنچا کہ موٹے موٹے قوانین فطرت اور اسباب و علل کے سلسلوں کا ٹھیک ٹھیک ادراک کر سکے۔ وہ آثار و علائم سے بھی ہمیشہ یقینی نتائج نہیں حاصل کر سکتا تو آثار و علائم کے بغیر کیونکر جان سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کب کہاں کس مقدار میں بارش برسائے گا اور کب کہاں بادلوں کی ریل پیل کے باوجود پیاسی زمین ایک ایک قطرۂ آب کو ترسے گی۔ سبحانہٗ ما اعظم شانہٗ۔

شکم مادر کے مسئلہ پر اب کچھ کہنا شاید تحصیل حاصل ہی ہو۔ تخمینے اور قیاس کو اللہ نے منع نہیں کیا نہ یہ فرمایا کہ تمھارا قیاس ہمیشہ غلط نکلے گا۔ زید کہہ دے کہ فلاں عورت کے بطن میں لڑکا ہے اور بکر کہہ دے کہ لڑکی ہے تو لازماً ایک نہ ایک کا قیاس درست ہی نکلے گا۔ پھر ایک تیسرا آدمی یوں کہہ دے کہ نہ لڑکا ہے نہ لڑکی بلکہ سانپ یا چھپکلی کی شکل کا مضغۂ گوشت ہے تو یہ قیاس بھی درست نکل سکتا ہے۔ آخر ان قیاس آرائیوں کا قرآنی بیان سے کیا تعلق۔ قرآن علمِ یقین کا تذکرہ کر رہا ہے آپ خود مانتے ہیں کہ مافی البطن کے بارے میں پیش گوئی بہت کم درست ثابت ہوتی ہے پھر بھلا علم —— اور وہ بھی علمِ یقین کا سوال ہی کہاں پیدا ہوا۔ ہمیں تو اتنا ہی معلوم ہے کہ سائنس اپنی تمام تر ترقیوں کے باوجود آج تک ایسا آلہ نہیں بنا سکی جو پیٹ کا حال بتا دے کہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ لیکن اگر آثار و علائم کے بل پر کوئی بتا ہی دے اور اس کا کہنا درست نکلے تو ہم یہی کہیں گے جو پہلے کہہ چکے۔ یعنی جو علم آدمی کو حواس خمسہ اور قوائے ذہنی کے ذریعے آثار و علائم کے توسط سے حاصل ہو وہ نہ علم غیب کہلاتا ہے نہ قرآن اس کی نفی کرتا ہے۔ قرآن غیر اللہ کے لئے نفی کرتا ہے علمِ غیب کی اور علم غیب کہتے ہیں قوائے ذہنی اور سلسلۂ اسباب کے بغیر کسی شے کے علم و ادراک کو۔ بعض ایسے علوم جنھیں کشف و الہام سے منسوب کیا جاتا ہے وہ بھی بعض قوائے جسمانی ہی کا توسط لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان پر اسرار اور مخفی تر قوا کا ہمیں علم نہ ہو، کرامتیں، الہام و کشف، جادو، مسمریزم یہ سب انسان کی مخفی صلاحیتوں ہی کے مظہر ہیں بس فرق یہ ہے کہ ان صلاحیتوں کو ترقی دینے کے بعض ذرائع شریعت میں مباح ہیں اور بعض حرام۔

گھڑی کی چین

سوال ۴:- (ایضاً)

گھڑی کی چین اگر لوہے، پیتل یا سونے کے علاوہ کسی دھات کی ہو تو وہ پہننا مرد کے لئے کیسا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ "تجلی" کے قیمتی صفحات کو ایسے سطحی قسم کے سوالات میں ضائع کرنا ٹھیک نہیں ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ یہ مسئلہ بڑی اہمیت پا گیا ہے۔ اس سلسلے میں دار العلوم دیوبند سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سونے کے علاوہ جائز ہے۔ لیکن احمد آباد کے دار العلوم شاہِ عالم کا فتویٰ ہے کہ "شرعاً ممنوع ہے" اور اسی دار العلوم کا دوسرا فتویٰ یہ ہے کہ "احکامِ شریعت حصہ دوم صفحہ ۳۶ کی عبارت یہ ہے کہ گھڑی کی زنجیر سونے چاندی کی مرد کو حرام اور دھاتوں کی ممنوع ہے اور جو چیزیں منع کی گئی ہیں انکو پہنکر نماز اور امامت مکروہ تحریمی ہے"۔ اس سلسلے میں اپنی تحقیق سے مشرف کیجئے اگر مناسب سمجھیں تو فقہ کی مشہور کتاب شامی جلد پنجم فصل اللبس بھی دیکھ لیجئے؟

الجواب:-

حدیث میں صرف انگوٹھی کے بارے میں تو آیا ہے کہ عورت کو سونے چاندی کی اور مرد کو چاندی کے سوا کسی دھات

کی نہیں پہننی چاہیئے، لیکن انگوٹھی پر گھڑی کی چین کو قیاس کرنا ہمارے نزدیک درست نہیں ہے۔ انگوٹھی ایک زیور ہے اس کا استعمال صرف زینت کے لئے ہوتا ہے۔ اگر دواءً سونے چاندی کے سوا کسی دھات کی انگوٹھی۔ خواہ وہ لوہا یا رانگ ہو یا متعدد دھاتیں ملی ہوئی ہوں ـــــ استعمال کی جائے تو اس میں حرمت نہیں۔ اسی طرح گھڑی کی چین فقط زیور کی حیثیت سے نہیں بلکہ بطور ضرورت استعمال ہوتی ہے اسے اُس چیز پر قیاس نہیں کرنا چاہیئے جس کی حیثیت فقط زیور کی ہو۔

ہم اُمورِ فقہیہ میں اس کے قائل ہیں کہ عامۃ المسلمین کو عمل تو کرنا چاہیئے ان فقہاء ہی کی آراء پر جن کا دامنِ تقلید ہم نے پکڑ رکھا ہے، لیکن دوسروں کے لئے کسی شے کی حرمت کا فتویٰ صادر کرنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیئے۔ کراہتِ تنزیہی تو نسبتاً معمولی دلائل سے بھی ثابت ہو سکتی ہے، لیکن کراہتِ تحریمی ـــــ جو حرمت ہی کی جنس سے ہے اقوای دلیل کی طالب ہوتی ہے۔ قرآن کی آیت یا حضورؐ کا ارشاد اگر صراحتہً حرمت ظاہر کر رہا ہے تب تو کسی ریب و تامل کا سوال ہی نہیں۔ کسی قسم کا ابہام ہو، لیکن اونچے درجے کے فقہاء ایک واضح اور قطعی مفہوم پر متفق ہو چکے ہوں تب بھی یہ دلیل قوی کہلائے گی۔ آیت یا حدیث کے اشارے یا کنائے سے حرمت ثابت ہوتی ہو اور معتبر اہل علم نے اس پر اتفاق کیا ہو تب بھی اس پر فتویٰ صادر کرنا درست ہوگا۔ یا پھر قرآن و سنت نے کوئی اصولِ کلی بیان کر دیا ہو تو اس کے تحت آنے والی واضح جزئیات پر فتویٰ دینے میں کوئی قباحت نہ ہوگی۔

لیکن زیرِ بحث جزئیہ ـــ یعنی گھڑی کی چین کا معاملہ ان میں سے کسی بھی قاعدے کے تحت نہیں آتا سونے چاندی کی بات ہو تو یہ طے ہے کہ مرد کے لئے کسی بھی ایسی شے کا استعمال درست نہیں ہے جس میں سونا چاندی مقابلتہً غالب ہو۔ لیکن سونے چاندی کے ماسوا دوسری دھاتوں کے لئے قرآن وسنت میں کوئی سونے چاندی جیسا اصولِ کلی نہیں ملتا۔ فقط انگوٹھی کا مسئلہ تو ایک جزئی مسئلہ ہے اسے بطور ضابطہ دوسری تمام ہی اشیاء پر منطبق کرنا دلیل کا طالب ہے اور دلیل ہمارے علم میں نہ آسکی لہٰذا ہم تو یہی کہیں گے کہ بازار میں رائج تمام ہی چینیں جائز ہیں۔

رہا کتاب "احکام شریعت" کا حوالہ تو یہ کتاب ہماری نظر سے نہیں گذری۔ اس میں اگر ممانعت کی کوئی شرعی دلیل دی گئی ہے تو اس سے آگاہی بخشی جائے اور اگر دلیل نہیں دی گئی تو گفتگو بیکار ہے۔

شامی ہو یا عالمگیری، ان کی طرف مراجعت کی نوبت آئے دن آتی رہتی ہے اور ان کی رہنمائی کے بغیر تو ہم دو قدم نہیں چل سکتے، لیکن جن اُمور میں توسع کی گنجائش ہے اور ان کا تعلق مختلف زمانوں کے مختلف احوال، عرف و عادت اور رواج سے ہے ان میں لکیر کا فقیر نہیں بننا چاہیئے

خلاصۂ جواب یہ ہے کہ دھاتوں کی مروّجہ چینوں پر اکّا دکّا علماء کا حکمِ حرمت لگانا درست نہیں۔ یہ اس قسم کا معاملہ ہے کہ مستند علمائے وقت کا اتفاق ہی اسے اطمینان بخش طریقے پر طے کر سکتا ہے۔

کرامتوں کی کہانیاں

سوال ۹: ـــ از حافظ شمس الدین۔ بنارس۔

بنارس میں ماہ ربیع الثانی میں گیارھویں شریف کی مجلسیں بکثرت منعقد کی جاتی ہیں۔ جس میں میلاد خوان و واعظ حضرات شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے فضائل و کرامات کا ذکر بہت شد و مد سے کرتے ہیں۔ خصوصاً ایک کرامت کا بہت چرچا ہے کہ حضرت شیخ کی دعا سے بارہ ۱۲ سال کی ڈوبی ہوئی کشتی جس پر باراتی سوار تھے مع بارات کے نکل آئی اور بارہ برس کے فوت شدہ آدمی زندہ و سلامت خوشی خوشی اپنے گھروں پر پہنچ گئے۔

پورے مہینے بڑے اہتمام سے بڑے پیر صاحب کی

گیارھویں منائی جاتی ہے۔ گھر گھر قرآن خوانی ہوتی ہے دعوتیں منعقد ہوتی ہیں۔ مٹھائیاں وغیرہ تقسیم کرتے ہیں اور اور اس ذریعے حصول فیض و برکت کی توقع کرتے ہیں اور حضرت شیخ کی کرامات ذوق و شوق سے سنتے ہیں اور ان افعال سے انکار کرنے والوں کو وہابی، دیوبندی وغیرہ القاب سے یاد کرتے ہیں اور ان کو اولیاء کرام کا دشمن تصور کرتے ہیں ایک مولوی صاحب نے اپنی تقریر میں مندرجہ بالا کشتی کی کرامات کا شدت سے انکار کیا اور اس قصہ کو جھوٹ اور من گھڑت بتایا اور حضرات اولیاء کرام کے سچے وقائع وحالات کو سننے سنانے اور ان کی ہدایات پر عمل پیرا ہونے کی طرف توجہ دلائی۔ حضرت مولانا کی یہ باتیں بہت لوگوں کو ناگوار گذریں۔

(۱) سوال یہ ہے کہ کیا یہ روایت واقعتًہ غلط ہے؟

(۲) کیا ایک مرتبہ مرنے کے بعد آدمی دوبارہ دنیا میں زندہ ہو کر باقاعدہ زندوں کی طرح رہ سکتا ہے اور پھر اس پر دوبارہ موت طاری ہو سکتی ہے۔

(۳) واعظین اس کرامت کے لئے بھجۃ الاسرار کا حوالہ دیتے ہیں۔

(۴) بھجۃ الاسرار میں یہ کرامت منقول ہے یا نہیں۔

(۵) سند کے ساتھ ہے یا بغیر سند کے اور سند معتبر ہے یا نہیں۔

(۶) خود بھجۃ الاسرار کے متعلق محدثین و مورخین کی کیا رائے ہے مہربانی فرما کر اپنے قلم حقیقت رقم سے اس پر مفصل روشنی ڈالیں۔

الجواب:-

جہاں تک علم و متانت اور اصلاحی اندازِ نظر کا تعلق ہے وہ تمام سالانہ تقریبات[1] جن کی کوئی تعلیم قرآن و سنت سے نہیں ملتی بدعت و ضلالت ہیں اور کرامتوں کے اکثر افسانوں کا من گھڑت ہونا اتنا ہی ظاہر و باہر ہے جتنا دن کا روشن اور رات کا تاریک ہونا۔

لیکن اصل مجرم اس باب میں وہ بیچارے عام مسلمان نہیں ہیں جن کے دم سے اس طرح کی گمراہیوں کو رونق حاصل ہو رہی ہے بلکہ بڑے مجرم وہ واعظ، وہ پیر، وہ استاد اور وہ مصنف ہیں جنھیں دین و مذہب کا سچا عالم اور راہنما سمجھ کر عامۃ المسلمین ان کے پیچھے چلتے ہیں۔ ان کے دماغوں میں شیطان نے اپنا دماغ اُتارا اور انھوں نے اپنے کالے دماغ عوام کی کھوپڑیوں میں اُتار دیئے۔

سیدنا شاہ عبدالقادر جیلانیؒ ہوں یا وہ دیگر اولیاء اللہ جن کے ناموں کی آڑ میں طرح طرح کی بدعتیں گھڑلی گئی ہیں، نوع بہ نوع جھوٹ پھیلا دیئے گئے ہیں اور گوناگوں خرافات وبفوات کو دین سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ یہ سب بزرگ واقعتًہ بزرگ تھے، انھوں نے دنیا کو اپنے اپنے انداز میں صرف ایسی ہی تعلیمات دیں جو تقاضائے توحید کے مطابق اور قرآن و سنت کی ہدایات کے موافق تھیں لیکن جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نصرانیوں کی ضعیف الاعتقادی اور ذہنی کجی نے نعوذ باللہ خدا کا بیٹا بنا لیا اسی طرح بہت سے کج فہم اور توہم پرست مسلمانوں نے ان بزرگوں کو کچھ سے کچھ بنا ڈالا۔ شیطان بے حد چالاک ہے۔ وہ ایسا دامِ ہمرنگِ زمین بچھاتا ہے کہ اچھے اچھے ہوشمند اس میں پھنس جاتے ہیں۔ جن لوگوں کو وہ دیکھتا ہے کہ کھلی معصیت کو وہ اختیار نہیں کر سکتے اور ان کا دینی مزاج فسق و فجور کی طرف مائل نہیں ہو سکتا ان کے لئے وہ دین ہی کی راہ سے بڑی مقدس شکل کی گمراہیوں کا جال بچھاتا ہے اور اکثر کو پھانس لیتا ہے۔ اولیاء اللہ کی غلو آمیز عقیدت، رسول اللہ صلعم کی شرک آلود محبت اور مقدس شکل و ہیئت کے گمراہ کن مشاغل و افکار اسی لئے تو عامۃ المسلمین میں قبولِ عام حاصل کر گئے کہ انھیں بدقسمتی سے بعض زہاد و صالحین کی پشت پناہی حاصل ہو گئی۔ اب اگر اہلِ نظر اس پر روک ٹوک کرتے ہیں تو انھیں خواندہ و نیم خواندہ عوام تو اس لئے وہابیت اور دیوبندیت کی گالی دیتے ہیں کہ ان کے نزدیک تو غلط اعمال و افکار کا یہ سارا پلندہ عین دین ہی ہے اور بہت سے خواص اس لئے آنکھیں نکالتے ہیں کہ یہی من گھڑت دین ان کے لئے دولت و جاہ کا شاہ دروازہ ہے اسی کی حقیقت کھل گئی تو دکانوں کی ساری رونق ختم ہو جائے گی۔

بھجۃ الاسرار ہماری نظر سے نہیں گذری لیکن گذرنے کی وجہ یہی ہے کہ وہ اہلِ علم حلقوں میں نہ پہلے کبھی کسی خاص اہمیت

[1] بشرطیکہ مروجہ نوعیت کی ہوں۔

اصطلاح میں گناہ کہا جاتا ہے چیز ہی ایسی ہے کہ اس کا وبال اس کے کچھ نہ کچھ اثرات ناکردہ گناہوں تک بھی ضرور ہی پہنچتے ہیں پھر بھلا اسلامی قانون یا دنیا کا کوئی بھی قانون اس بات کے لئے کیسے مستحق مذمت قرار پاسکتا ہے کہ جو سزائیں اس نے مجرموں کو دی ہیں ان کی وجہ سے مجرموں کے بیگناہ لواحقین کو بھی بالواسطہ نقصان پہنچ گیا ہے۔

اس تقریر کو خوب ذہن نشین کرنے کے بعد سنئیے کہ اسلام نے ولد الزنا کے لئے ہرگز کوئی سزا مقرر نہیں کی۔ وہ شرعی قانون کے دائرے میں ویسا ہی ایک فرد ہے جیسے دوسرے حلال زادے۔ نکاح و طلاق، تحفظ جان و مال، لین دین اور دیگر جملہ مسائل میں اس کی آئینی پوزیشن میں سرمو کوئی فرق نہیں۔ میں اگر اس سے اپنی لڑکی بیاہ دوں گا تو نکاح اسی طرح درست ہوگا جس طرح کسی حلال زادے سے۔ میں اگر اس سے قرض لوں گا تو اس کی ادائگی اتنی ہی ضروری ہوگی جتنی کسی حلال زادے کے قرض کی۔ اس کے لئے جدوجہد، ترقی اور روزگار کے تمام دروازے آئینی طور پر یکساں کھلے ہوئے ہیں، کسی بھی معاملے میں اسلامی عدالت اسے اس بنیاد پر انصاف سے محروم نہیں کرسکتی کہ وہ ولد الزنا ہے۔ نیز آخرت کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے کہ اس کے تمام اعمالِ نیک و بد کے ساتھ حق تعالیٰ وہی سلوک فرمائیں گے جو اوروں کے ساتھ فرماتے ہیں۔ اس کے کسی عملِ نیک کا وزن اس لئے کم نہیں کیا جائے گا کہ وہ زنا کا ثمرہ ہے اور اس کے کسی گناہ کی سزا میں شدت اس دلیل سے نہیں برتی جائے گی کہ اس کے والدین زانی تھے۔ اس طرح وہ اعتراض تو ختم ہوا کہ اسلام ایک ناکردہ گناہ کو سزا دے رہا ہے۔ اب رہیں وہ ہدایات جو فقہاء اس سلسلے میں پیش فرماتے ہیں تو ان کی حیثیت سزا کی نہیں ہے بلکہ وہ ان قدرتی اور طبعی اثرات سے متعلق ہیں جو ایک اسلامی معاشرہ میں زنا جیسے ہولناک جرم سے ظہور میں آنے ہی چاہئیں۔ آپ نے دیکھا کہ زید کی مثال میں مرتکب جرم صرف زید ہی تھا لیکن اس کی پھانسی جو ایک منصفانہ سزا تھی بے قصور لواحقین کے لئے بھی موجب نقصان بن گئی۔ اسی طرح ایک حقیقی اسلامی معاشرے میں زنا انتہائی سخت جرم ہے۔ اس کا ارتکاب اگر ہو جائے تو پیدا ہونے والا ولد الزنا اگرچہ اسی طرح بے قصور ہوگا جس طرح قاتل زید کے لواحقین بے قصور تھے، لیکن نقصان و خسران کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ اسے اسی طرح ملے گا جس طرح زید کے لواحقین کو ملا ہے۔

فرض کیجئے آپ ایک شریف اور نیک نام آدمی ہیں۔ نسباً سید یا شیخ ہیں۔ آپ کی ہونہار اور خوب رو لڑکی کیلئے ایک ایسے لڑکے کی منگنی آتی ہے جو خود تو شریف ہے، کسی عیب جرم کا داغ رسوائی اس کے دامن کردار پر نہیں، لیکن اس کا باپ جیب تراشی کی سزا میں جیل کاٹ چکا ہے اور نسب کے اعتبار سے وہ پٹھان ہے۔ اب آپ انکار کر دیتے ہیں کہ میں ایک جیب کترے پٹھان کے گھر اپنی لڑکی کیوں بیاہوں۔ میں اس پر کہتا ہوں کہ اس منگنی کو ٹھکرا کر آپ نے اسلامی تعلیم کے خلاف کیا تو ایمان سے کہئے آپ پر کیا گذرے گی؟ آپ شاید جھلا کر کہیں گے کہ تم بکواس کرتے ہو، میں کیوں دیدۂ و دانستہ اپنی لڑکی کو جہنم میں جھونکوں اور رسوائی الگ مول لوں۔

بجا فرمایا۔ لیکن ذرا واضح تو فرمائیے جن دو عیبوں کی وجہ سے آپ اس شادی کے خواہشمند لڑکے کو کورے جواب کی سزا دے رہے ہیں ان میں سے کسی ایک کے لئے بھی وہ غریب کس حد تک ذمہ دار ہے؟ جہاں تک نسب کا تعلق ہے تو وہ بیچارہ ایک پٹھان باپ کے صلب سے سید یا شیخ بن کر پیدا ہونے کی قدرت تو نہیں رکھتا تھا اور جہاں تک باپ کی جیب تراشی کا تعلق ہے، اس میں بھی اس کی کوئی شرکت نہیں تھی۔ پھر کیوں آپ انکار کر کے اس کا دل توڑ رہے ہیں؟

آپ کا جواب ہوگا کہ اسلام نے مجھے بہتر سے بہتر داماد ڈھونڈنے کا حق دیا ہے اور اس کا بھی مجھے حق ہے کہ اپنی سماجی عزت برقرار رکھنے کے لئے کسی کمتر اور رسوا گھرانے میں اپنی لڑکی نہ بیاہوں۔

تو بس ولد الزنا کی بات بھی اسی پر قیاس کر لیجئے۔ اسلام نے یہ قانون نہیں بنایا ہے کہ کوئی مسلمان اگر ولد الزنا سے اپنی لڑکی بیاہ دے گا تو نکاح نہیں مانا جائے گا۔

قانون بنا لیجئے کہ ولد الزنا کے ساتھ غیر انسانی اور شقاوت آمیز برتاؤ کیا جائے۔ اس نے تو یہ تک اجازت نہیں دی ہے کہ ولد الزنا پر طنز و طعن کی بوچھار کی جائے اور معاشرہ میں اس کے چرچے ہوا کریں، لیکن جس طرح ایک جیب تراش یا شرابی یا آوارہ و رسوا آدمی کے گھرانے سے ربط و ضبط رکھنا شرفاء کے لئے باعثِ عار ہوتا ہے اسی طرح اسلامی معاشرے میں ایک ولد الزنا سے ربط و ضبط رکھنا قدرتاً باعثِ ننگ ہونا ہی چاہیئے۔ یہاں سوال قانون کا نہیں فطری اثرات و نتائج کا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ جرم و گناہ کی فقط سزائیں ہی تجویز کر کے نہ بیٹھ رہے بلکہ جرم و گناہ کی نفرت قلب و دماغ میں اتار دے۔ سزائیں تو اسوقت کام دیتی ہیں جب جرم واقع ہو چکا ہو۔ اسلام چاہتا ہے جرم واقع ہی نہ ہو اور اس کے لئے وہ سب سے زیادہ زور انسان کے قوائے باطنی پر دیتا ہے کہ وہی ہر فعل و عمل کا اصلی سرچشمہ ہیں وہ تعلیم و تربیت اور نفسیاتی ذرائع سے ذہنوں کا ایک ایسا سانچا بنانے کا متمنی ہے جس میں جرم و گناہ کا داعیہ ہی پیدا نہ ہو اور اگر ہو ہی جائے تو اس کے عملی جامہ پہننے میں طرح طرح کے روڑے حائل رہیں۔ پھر وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ معاشرے میں عزت و ذلت اور فخر و عار کا معیار فقط دینی قدریں ہوں تاکہ بد نہاد لوگ اگر قانونی سزا کے خوف کو بالائے طاق رکھ کر گناہ کر ہی گذریں تو معاشرے میں وہ ذلیل و رسوا ہو کر رہ جائیں اور جس دنیا کی خاطر انھوں نے دین کو نظر انداز کیا ہے وہی دنیا انھیں نفرت و بیزاری کے جگر دوز تیروں سے چھلنی کر دے کون نہیں جانتا کہ کسی جرم سے رک جانے کیلئے قانونی سزا کے خوف سے بھی بڑھ کر یہ خوف ہوا کرتا ہے کہ سماجی عزّت خاک میں مل جائے گی اور ہم چشموں کی نظر میں ہم ذلیل و رسوا ہو جائیں گے۔ اسلام اسی لئے ضروری سمجھتا ہے کہ افرادِ معاشرہ جرم و گناہ سے نہ صرف نفرت کریں بلکہ یہ نفرت ایک زندہ اور نمایاں احساس بنکر ان کے کردار و گفتار میں بھی جلوہ گر ہو۔ ولد الزنا

بے شک اپنے بدکردار والدین کے گناہ میں کوئی شرکت نہیں رکھتا، لیکن جن قلوب و اذہان میں فعلِ زنا کی فی الواقعی نفرت و کراہت جاگزیں ہوگی انکا اس ولد الزنا سے سماجی روابط استوار کرنے میں احتیاط برتنا اتنا ہی قدرتی اور طبعی ہوگا جتنی یہ بات کہ آپ نے ایک جیب کترے پٹھان کے لڑکے سے اپنی لڑکی کا نکاح منظور نہیں کیا۔ پھر فقہاء جو اسی امرِ طبعی کے سلسلے میں کچھ ہدایات و ضوابط پیش فرماتے ہیں تو ان کا نفع بھی ظاہر و باہر ہی ہے۔ جب لوگ یہ دیکھیں گے کہ جرم زنا کی سزا صرف زانیوں ہی کے جسم و جان تک محدود نہیں رہی بلکہ اس کا اثر ولد الزنا پر بھی یہ پڑا کہ معاشرے میں اسے کوئی مقام عزت نصیب نہیں تو یہ درسِ عبرت بجائے خود ایک مستقل رکاوٹ بنے گا ارتکابِ زنا کی راہ میں۔ آخر کون والدین یہ پسند کریں گے کہ ان کی اولاد ذلت و نفرت کی ٹھوکروں میں زندگی گذارے اور سارا سماج اسے حقارت و استکراہ کے سوا کچھ نہ دے اسلام جرائم کی راہ میں ہر ممکن رکاوٹ ڈالنا چاہتا ہے وہ چاہتا ہے کہ گناہ مسلمان کی نظر میں واقعۃً ایک غلاظت بن کر رہ جائے۔ ایسی چیز بن کر رہ جائے جس کی طرف اس کا میلان ہی نہ ہو اور اگر شاذ و نادر ہو ہی جائے تو معاشرے کی ترچھی نظریں ہی اس کے لئے بھرپور سزا بن جائیں۔ زمانۂ دراز سے ہم اسلامی یا سراسر غیر اسلامی معاشروں میں سانس لیتے رہنے کے باعث اسلامی معاشرے کا صحیح تصور ہمارے دل و دماغ میں باقی ہی نہیں رہا ہے۔ اس تصور کو زندہ کرنا ہو تو تیرہ سو سال پیچھے پلٹ جائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ زنا، سود اور قمار جیسے کبیرہ گناہ تو دور کی بات ہیں فقط اتنی سی بات بھی ایک مسلمان کو معاشرے کی نفرت و بیزاری کا ہدف بنا دینے کے لئے کافی تھی کہ وہ نماز کے لئے مسجد میں نہیں آتا یا اس نے داڑھی مونڈ ڈالی ہے یا وہ شراب شاہد کے پڑوس میں پھٹکا ہے۔ آپ نے سُنا ہوگا حضور صلی اللہ

کی حامل سمجھی گئی ہے نہ اب سمجھی جاتی ہے۔ کتابیں تو دنیا میں سب طرح کی ہیں۔ جب بعض ایسی کتابوں میں بھی غلط اور ناقابل اعتبار چیزیں کثرت سے موجود ہیں جنھیں "کتب حدیث" کا نام دیا جاتا ہے تو کسی بہجۃ الاسرار یا کشف الاوتار کی کیا حقیقت ہے۔ ان کتابوں میں اول تو اسناد کا اہتمام ہوتا نہیں لیکن ہو بھی تو اس سے اکثر حالتوں میں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ دس افراد پر مشتمل اسناد کے بارے میں کوئی معتبر اور ٹھوس فیصلہ اسی وقت دیا جا سکتا ہے جب ان دسوں کے بارے میں فرداً فرداً یہ تحقیق کیا جا سکے کہ یہ کس پائے کے لوگ تھے۔ ان پر کس حد تک اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ احادیث کا معاملہ تو یہ ہے کہ ان میں جو سندیں مذکور ہوتی ہیں ان کے تمام افراد کا حال اونچے درجے کے ارباب فن نے کتابوں میں محفوظ کیا ہے اور ہر وقت دیکھا جا سکتا ہے کہ کس راوی کو کس درجے میں اعتماد کے قابل مانا گیا ہے، لیکن کراماتوں اور بوالعجبیوں کے افسانے جن راویوں کے سہارے چلتے ہیں ان کے کردار و مقام کا حال کہاں سے معلوم ہو۔

سوچئے ہندوؤں کی دیومالا اور مسلمانوں کے ذخیرۂ روایت میں آخر کیا فرق ہے؟ ——— یہی نا کہ اول الذکر کے حق میں کوئی علمی و منطقی بنیاد موجود نہیں اور ثانی الذکر کی جانچ پرکھ کے لئے ایک علمی و فنی کسوٹی موجود ہے۔ اب اگر اس کسوٹی پر جانچے بغیر ہی ہم عجائب و غرائب کے افسانے قبول کرتے رہیں تو انھیں دیومالا سے زیادہ کیا حیثیت حاصل ہو سکتی ہے۔ شیطان کامیاب ہے کہ صرف جہلاء ہی کو نہیں بیشمار پڑھے لکھے صالح مسلمانوں کو بے شمار ایسی کہانیوں پر مطمئن کر دیا جن کا سرچشمہ خود اسی کے تاریک دماغ کے سوا اور کہیں بھی نہیں تھا۔

خوب سمجھ لیجئے اولیاء اللہ کی کرامتیں اسی طرح حق ہیں جس طرح سچا خواب دیکھنا، یعنی بزرگ لوگوں سے بہت سی ایسی باتیں ظہور میں آجاتی ہیں جو مادی اعتبار سے مافوق ہوتی ہیں۔ لیکن کسی بات کا حق اور ممکن ہونا اور بات ہے اور اس کا کسی خاص شخصیت سے منسوب ہونا اور۔ آپ کا امریکہ جانا ممکن ہے لیکن فقط ممکن ہونے کی بنیاد پر تو یہ دعویٰ درست نہیں ہو سکتا کہ آپ امریکہ ہو بھی آئے۔ یہ دعویٰ بھی درست ہوگا جب واقعۃً آپ امکان کو عملی جامہ پہنا دیں۔ اسی طرح کرامتوں کا حق اور ممکن ہونا اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ جو بھی کرامت کسی بزرگ کی طرف منسوب کر دی گئی بس اسے ضرور ہی مان لیا جائے اس کے لئے مضبوط شہادت چاہئیے

دوسری بات یہ ہے کہ کرامتوں کو قصہ کہانی کے طور پر سننا سنانا ایسا ہی ہے جیسے آپ طلسم ہوشربا یا کسی تحیر خیز ناول کا مطالعہ فرمانے لگیں۔ کرامتیں اللہ نے اولیاء کو صرف اس لئے دی ہیں کہ انھیں دیکھ کر لوگ نیک عملی پر مائل ہوں اور اپنا کردار سنوار یں لیکن جو لوگ ان کرامتوں سے عملِ نیک کی تحریک اور عزم حاصل کرنے کی بجائے صرف لطف و لذت اور ایک مجہول قسم کا گداز حاصل کرتے ہیں ان کی مثال نشہ بازوں کی سی ہے جو افیم یا شراب کی چسکیاں لیکر سرور میں گم ہو جاتے ہیں۔ خدا بچائے، یہ گیارھویں شریف اور میلاد خوانیاں، یہ لایعنی کرامتوں کی داستان سرائیاں، یہ اولیاء اللہ کی شان میں زبانی جمع خرچ کے انبار، یہ رسمی قرآن خوانیاں اور اکل و شرب کے جشن یہ سب دینِ قبوری کے اجزاء و عناصر ہیں اور دین قبوری کی حیثیت مارفیا کے انجکشن کی سی ہے جس کے بعد آدمی حقیقی اسلام اور اس کے مقدم ترین تقاضوں سے غافل ہو جاتا ہے۔ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیات اعمالنا

ولد الزنا کا مسئلہ

سوال ۱۲: - از افتخار احمد - کلکتہ -

کیا یہ صحیح ہے کہ ولد الزنا کے لئے اسلامی معاشرے میں کوئی جگہ نہیں، سماجی تعلقات مثلاً بیاہ شادی منع ہیں؟ اگر صحیح ہے تو ولد الزنا ہونے میں خود اس کا کیا قصور ہے جو اس کو معاشرے سے الگ کر دینے کا حکم صادر کیا گیا؟

اسلام کی تعلیم ہے کہ خود گناہ ہگار سزا پائے گا۔ بدلے میں کسی
دوسرے کو سزا نہیں دی جائے گی۔ زنا کی مرتکب ماں ہوگی
ولد الزنا کو سزا کیوں ملے؟ از راہ مہربانی اسلامی قانون
کی روشنی میں تجلی کے اگلے شمارے میں تشریح فرما کر مشکور
فرمائیے۔ میں معمولی لکھا پڑھا آدمی ہوں عربی سے نابلد۔
بعض مولوی صاحبان سے مذکورہ بالا بات معلوم ہوکر خلش
پیدا ہوئی کہ اسلام کسی ناکردہ گناہ کو سزا دلانے کے حق میں
نہیں اور نہ کسی بے قصور کو بطور کفارہ سزا دلوا کر گناہگار
کے گناہ کو ہلکا یا معاف کر دینے کا حامی ہے تو ولد الزنا کو جبکہ
پیدا ہونے میں خود اس کی اپنی مرضی اور خواہش کا کوئی
دخل نہیں کیوں سوسائٹی سے خارج کر دیا۔ دوسروں کو
اس سے کسی طرح کا بھی تعلق قائم کرنے سے منع کر دیا گیا؟

الجواب :-

اسلام کا بنیادی قانون بلاشبہ یہی ہے کہ ایک کے جرم
کی سزا دوسرے ناکردہ گناہ کو نہیں دی جائیگی اور فقہاء
کی مجال نہیں ہے کہ وہ اس قانون میں کوئی تبدیلی کر
سکیں لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (کوئی متنفس
کسی دوسرے کا بارِ گناہ نہیں اٹھائے گا) قرآن کی صریح
محکم آیت ہے اور دیگر متعدد نصوص سے بھی یہی ثابت ہے
کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے پھر بھلا کیسے ممکن
ہے کہ وہ علماء و فقہاء جو قرآن و سنت کے غلام ہیں اور
اسلام کی صحیح ترجمانی ہی ان کی زندگی کا مشن رہا ہے
ایسا کلمہ زبان سے نکال سکیں جو واقعتہً اسلامی تعلیمات
کے خلاف ہو۔

لیکن ولد الزنا کے مسئلہ پر غور کرتے ہوئے فقہاء
کے خلاف اعتراض اس لئے پیدا ہوا ہے کہ غور کرنے
والے لفظِ سزا کا ٹھیک ٹھیک مفہوم و مصداق ہی نہیں
سمجھ پائے ہیں۔ سزا کہتے ہیں کسی مجرم کے بارے میں ایسا
قانونی فیصلہ دینے کو جس سے اس کی ذات کو صدمہ اور
نقصان پہنچے۔ اب اگر اس مجرم کے صدمے اور نقصان سے
بالواسطہ کچھ اور لوگوں کو بھی کسی نوع کا صدمہ اور نقصان
پہنچتا ہے تو اسے اثر و ثمرہ کہا جائے گا سزا نہیں کہا جائیگا
مثال سے سمجھئے :-

زید کی ایک بوڑھی ماں ہے۔ ایک بیوی ہے۔ چند
چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ زید ہی کی کمائی پر ان سب کا
گذارا ہے۔ اب فرض کیجئے زید نے کسی شخص کو قتل کر دیا اور
اس جرم کی پاداش میں اسے پھانسی دیدی گئی تو کیا اس سے
اس کی ماں اور بچوں کو شدید نقصان نہیں پہنچے گا؟ ہو سکتا
ہے ـــ اور بارہا ہوتا ہے کہ ماں فرطِ الم سے مر جائے
اور بیوی اپنے جگر گوشوں کی فاقہ کشی کا تحمل نہ کرتے ہوئے
عصمت فروشی کو ذریعۂ معاش بنا لے۔ یہ سب بدیہی طور
پر ثمرہ ہے اس بات کا کہ عدالت نے زید کو پھانسی دیدی
لیکن اسے آپ سزا نہیں کہیں گے۔ سزا تو صرف وہ پھانسی
ہے جو قتل کے بدلے زید کے حصے میں آتی ہے۔ زید کی موت
سے اس کے اہل و عیال کو جو کھلا نقصان پہنچا وہ اثر و ثمرہ
ہے اس سزا کا لہٰذا اس کے لئے آپ عدالت کو ظالم
قرار نہیں دیں گے اور یہ نہیں کہیں گے کہ زید کو پھانسی
نہیں دینی چاہئے تھی کیونکہ اس کی موت سے ایسی متعدد
ہستیوں کو صریح نقصان پہنچا ہے جو زید کے جرم میں کسی بھی
درجے کے شریک نہیں تھیں۔

اس مثال کے علاوہ آپ کسی بھی مجرم کا معاملہ لیجئے
لاکھوں میں چند ہی مجرم ایسے نکل سکتے ہیں جن کی سزا کسی
چڑیا کے بچے کے لئے بھی موجب رنج و نقصان نہ ہو ورنہ
کم و بیش ہر مجرم کے بعض لواحقین اس کی سزا یابی سے
متاثر ہوتے ہیں اور کسی نہ کسی نوع کی ذہنی یا مادی پریشانی
ضرور کچھ ناکردہ گناہوں کو پیش آتی ہے۔ پھر کیا یہ نصیحت
کی جائے گی کہ مجرموں کو سزا نہ دی جائے تاکہ بیٹھے بٹھائے
اُن ہستیوں کو نقصان نہ پہنچے جو سراسر ناکردہ گناہ ہیں؟

اسلام جب کہتا ہے کہ ایک کے گناہ کی سزا دوسرے
کو نہیں دی جائے گی تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ کسی
گناہ اور اس کی سزا کے طبعی و قدرتی اثرات بھی کسی
دوسرے تک نہیں پہنچیں گے۔ جرم ـــ جیسے اسلامی

اثر انداز ہو۔ اسی لئے ہم نہ صرف تحقیق مزید کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتے، بلکہ جو کچھ تحقیق ہو چکا ہے اسے بھی سپرد قلم کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ آپ اگر کسی وجہ سے جناب خضر کے بارے میں کافی معلومات حاصل کرنا ضروری ہی خیال فرمائیں تو پھر کسی وسیع معلومات والے عالم سے رجوع کریں ہم اس باب میں جاہل ہیں۔

تصوف

سوال ۱۳:۔ (ایضاً)

مروجہ تصوف کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟ ہندو پاک کے علاوہ کیا دیگر مسلمان ممالک میں بھی اس قسم کے صوفیانہ مشاغل جاری ہیں؟ جدید تصوف کی تعلیم میں "غوث، قطب، سالک، مجذوب اور ابدال" کس قسم کی اعجازی ڈگریاں ہیں؟ میں تو اسی تصوف کو جانتا ہوں جو معرکۂ بدر و حنین سے شروع ہو کر حج وداع پر جاکر مکمل ہوتی ہے۔ مگر اس قسم کے تصوف سے بالکل ہی ناآشنا ہوں جو معرکۂ بدر و حنین تو کجا بلکہ ہجرت سے پہلے ہی مکمل ہو جاتا ہے۔ مشائخ اور پیرانِ طریقت کے یہاں یہ تصوف اور یہ علم باطن کا سینہ بہ سینہ منتقل ہونا آخر یہ کیا چیز؟ کیا شریعت میں اس قسم کی باطنی علم کا کوئی جواز ہے؟ اگر ہے تو یہ سوال از خود پیدا ہوتا ہے کہ صحابۂ کرامؓ، بزرگانِ دین، ائمہ اور مجددین کی زندگیوں میں اس باطنی علم کی جھلک نظر کیوں نہیں آتی؟

الجواب ۱۳:۔

تصوف کے موضوع پر گفتگو کرنا بڑا طول طلب ہوگا۔ صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ تصوف کے نام پر مدت سے جو کچھ سامنے آتا رہا ہے اس کا کچھ حصہ یکسر باطل ہے، کچھ حصہ نیم باطل اور کچھ محمود۔ محمود وہ حصہ ہے جو شریعت کے کسی حکم سے ٹکراتا نہیں اور اسلام کی کھینچی ہوئی حدوں سے تجاوز کئے بغیر اصلاحِ نفس کی خدمت انجام دیتا ہے۔ یکسر باطل وہ حصہ ہے جو صریح طور پر احکامِ شریعت کے خلاف ہے اور دین میں حذف و اضافے کی جسارت کرتا ہے۔

ان دو انتہاؤں کے درمیان ایک حصہ وہ ہے جو نہ صریحاً باطل ہے نہ پوری طرح مطابقِ شرع۔ یہ گویا مجموعہ ہے صحیح و فاسد کا۔ اس پر حکم "باطل" ہی کا صادق آئے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ حنفیت اور احسان کے طالب ہیں یعنی یکسو ہو کر کامل طور پر سرِ اطاعت جھکا دینا۔ بعض کی تسلیم اور بعض کے انکار کو وہ کفر ہی کے خانے میں رکھتے ہیں لہٰذا ایسے بغیر چارہ نہیں کہ ــــ تصوف کا صرف وہ حصہ محمود و مقدس ہے جو کسی بھی درجے میں خلافِ شرع نہ ہو۔ باقی تمام حصص فاسد و باطل ہیں۔

ویسے علم باطن کی طرف سے آپ کی بدگمانی درست نہیں معلوم ہوتی۔ زبان و ادب اور علوم و فنون میں تو آئے دن نئی اصطلاحیں شامل ہوتی ہی رہتی ہیں۔ فقط یہ بات کہ صوفیاء کی فلاں فلاں اصطلاحیں قرونِ اولیٰ میں موجود نہیں تھیں۔ ان اصطلاحوں کے باطل ہونے کی کافی دلیل نہیں۔ دیکھنا اُن حقائق کا ہے جن کے لئے یہ اصطلاحیں وضع کی گئی ہیں۔ باطن کا تزکیہ اور روح کی بالیدگی ہی تو وہ شے ہے جو پہلے دن سے اسلام کا بنیادی مطلوب رہی ہے وہ اصل خطاب قلب و روح ہی سے کرتا ہے اور قوائے باطنی کو سنوارنا ہی اس کا مقدم کام ہے کیونکہ انسانی افعال و کردار کی جڑیں تو باطن ہی میں ہوتی ہیں۔ آدمی وہی کرتا ہے جس پر اس کے دل و دماغ اسے اُبھارتے ہیں۔ لہٰذا علمِ باطنی کا مطلق انکار تو خلافِ واقعہ ہوگا۔ رویائے صادقہ، کشف و الہام اور تصرفاتِ روحانی بالیقین ایسے حقائق ہیں جن کا انکار واقعات کا انکار ہے۔ گوناگوں کرامتیں صحابہؓ سے بھی ظاہر ہوتی رہی ہیں۔ صحابہؓ میں بھی ایسے بہت سے شیوخ گذرے ہیں جن کی زندگی میں علم باطنی کی نہ صرف جھلک نظر آتی تھی بلکہ وہ یہ بھی دیکھ سکتے تھے کہ کس شخص کے باطن میں کس نوع کے فاسد میلانات سر اُبھار رہے ہیں اور ذکر الٰہی کا کونسا طریق ان میلانات کو دبانے میں کارگر رہے گا۔

مجددین میں ایک مجدد الف ثانیؒ ہی کی مثال لے لیجئے۔ ان کے مجدد ہونے پر اہلِ سنت والجماعت کا سوادِ اعظم اتفاق رکھتا ہے لیکن وہ مرید بھی کرتے تھے اور خود بھی مرید تھے اوراد و وظائف بھی بتلاتے تھے۔ ایسی متعدد اصلاحیں بھی استعمال فرماتے تھے جو قرونِ اولیٰ کے بعد وضع ہوئی ہیں۔ علم باطنی کے کتنے ہی نشانات آپ ان کے سوانح اور ان کے مکتوبات میں صاف دیکھ سکتے ہیں۔ پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے

صحابہ اور مجاہدین کی زندگیوں میں علوم باطنی کی جھلکیاں نظر نہیں آتیں۔

ہاں یار لوگوں نے بڑھا چڑھا کر علوم باطنی اور علم سینہ بہ سینہ کے ناموں سے شیطانی افکار و اعمال کے جو اہرام تعمیر کرلئے ہیں اور تصوف کے نام سے خرافات و بدعات کا جو طومار باندھا ہے وہ بے شک اسی لائق ہے کہ مذمت کا نشانہ بنایا جائے۔ صرف یہی نہیں ہوا کہ دنیا پرست اور نفس کے غلام متصوفین نے غلط نظریات و اعمال گھڑ لئے ہوں معصومیت اور حسن نیت کے ساتھ بھی بعض سچے اور معیاری صوفیوں سے ایسی غلط چیزیں چلی ہیں جو اپنی روح کے اعتبار سے غیر اسلامی تھیں اور اپنی ابتدائی شکل و ہیئت میں اگرچہ ان کی جاہلی حیثیت دبی ہی رہی لیکن برگ و بار نکالنے کے بعد یہ حیثیت اسی طرح اُبھر آئی جیسے تخم سے درخت اُبھر آتا ہے۔

غوث، قطب اور سالک و ابدال وغیرہ اس نوع کی اصطلاحیں ہیں کہ شریعت کے دائرے میں رہنے والے صوفیا نے تو ان کے مفہوم و معنی کو دائرۂ شریعت سے خارج نہیں ہونے دیا۔ لہٰذا ان پر اعتراض روا نہیں، لیکن جن صوفیاء نے اسلامی تصورات کی دیوار پھلانگ کر وہم و غلو کی فضا میں اُڑان کی اور ان اصطلاحوں سے وہ مفاہیم اخذ کئے جن کی کوئی گنجائش اسلامی فکر میں نہیں تھی وہ بیشک مذمت کے مستحق ہیں۔

بدر و حنین اور حجۃ الوداع کے حوالے سے جس تصوف کا آپ نے نام لیا اصلاً وہی تصوف اولیاء اللہ کا بھی مقصود رہا ہے۔ فرق صرف وسائل کی اشکال ظاہرہ کا ہے ورنہ رضائے حق کے حصول اور کلمۃ الحق کے اعلاء کا جو جذبہ بدر و حنین کے مجاہدوں کی مساعی جمیلہ کا محور رہا ہے وہی سچے اور اونچے اولیاء اللہ کی تگ و تاز کا بھی محور رہا ہے۔ خرابی اُن مُریدوں نے پیدا کی جو وسائل کو مقصود بنا بیٹھے اور نصب العین کو دماغوں کے تاریک گوشوں میں دفن کر دیا۔

یہ بحث لمبی ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ بدر و حنین کے معرکے معنوی شکل میں آج بھی ملک بہ ملک اور قریہ بہ قریہ برپا ہیں۔ اسلام اور جاہلیت میں آج بھی گام گام لڑائی جاری ہے۔ تلواریں صرف سر کاٹتی ہیں مگر افکار کی ملمع کاریاں تو سینوں سے ایمان کی متاع اُچکے لئے جا رہی ہیں۔ آج سچا صوفی وہ ہے جو گوشۂ عزلت سے نکل کر افکار کے محاذ پر جنگ کرے اور اسلام کو اس ہولناک انجام سے بچانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دے جس کی طرف شیطانی عساکر اسے کھینچے لئے جا رہے ہیں۔

جماعت اسلامی کی شرکت

سوال ۱۴۷:۔ (ایضاً)

آپ کی تحریر اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ ہندو پاک میں مسلمانوں میں جتنی تنظیمیں وجود میں آئی ہیں ان میں سے آپ صرف جماعت اسلامی ہی کو برحق تصور کرتے ہیں۔ جماعت اسلامی پر جب بھی کسی جانب سے بہتان اور الزام کی یلغار کی گئی تو غیر جانب دار پرچوں میں تجلی ہی کو یہ فخر ہمیشہ سے حاصل رہا ہے کہ جماعت اسلامی پر کئے گئے تمام اعتراضات کا معقول اور دنداں شکن جواب دیا گیا۔ حتیٰ کہ اس بیباک حق گوئی کی خاطر آپ نے اپنے اساتذہ پر بھی تنقیدیں کی ہیں اور اپنے بعض احباب و بزرگوں پر بھی تبصرہ فرمایا ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ذہنی حیثیت سے آپ جس طرح امام ابن تیمیہؒ سے متأثر ہیں اسی طرح ماضی قریب کے علماء میں مولانا اشرف علیؒ سے بھی متأثر ہیں اور اسی طرح دورِ جدید کے علماء میں مولانا مودودی سے بھی متأثر ہیں — ان تمام باتوں کے باوجود میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ کاغذ و قلم کی سطح پر تو آپ کا ذہنی میلان تقریباً سو فیصدی جماعت اسلامی کی جانب ضرور ہے مگر جہاں تک جماعت کے پروگرام میں عملی اشتراک کا سوال ہے اس معاملے میں آپ بھی اتنے ہی بیگانہ ہیں جتنے کہ وہ حضرات جنھیں جماعت اسلامی سے کچھ بھی دلچسپی نہیں ہے۔ آپ جیسے بیدار مغز، بالغ نظر اور صاحب صلاحیت انسان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ کاغذ و قلم کی سطح پر جس تحریک کی تائید آپ سو فی صدی کریں

علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میرا جی چاہتا ہے ان لوگوں کے گھروں میں آگ لگا دوں جو باجماعت نماز پڑھنے مسجد میں نہیں آتے ـــــ یہ کوئی قانونی بات نہیں تھی، بلکہ دین سے گہری وابستگی کے جذبے نے الفاظ کا جامہ پہن لیا تھا۔ ایک حقیقی اسلامی معاشرے میں عزت و ذلت اور فخر و عار کا معیار دینی ہی قدریں ہوا کرتی ہیں وہاں یہ نہیں ہوگا کہ جس کے پاس پیسہ ہو وہ معزز سمجھا جاتے چاہے اس کا کردار کیسا ہی ہو اور نہ یہ ہوگا کہ جو مفلس ہو اسے حقیر ہی سمجھا جائے چاہے وہ کتنا ہی صالح ہو ـــ وَاَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ (اور زیادہ لائق عزت تم میں سے وہ ہے جو زیادہ متقی ہو) یہ ہے اسلامی معاشرے کا مرکزی نقطہ۔ اب ظاہر ہے کہ جو فعل و عمل جتنا زیادہ تقویٰ سے دور ہوگا اتنا ہی وہ مدارِ ذلت و رسوائی قرار پائے گا۔ زنا کی قباحت کا کیا ٹھکانا۔ اس سے شدید نفرت کا عین فطری تقاضا اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ اس گناہ کے زندہ ثمرے سے بھی اس حد تک بیزاری ضرور اختیار کی جائے جس حد تک اسلام کے قوانینِ اخلاق اجازت دیتے ہیں۔ ہاں اگر ولد الزنا اپنے بہترین کردار اور صالحیت سے دلوں کو مسخر کر لے اور ایک قدرتی رفتار کے ساتھ اس کی نفرت قلب سے کم ہوتی چلی جائے تو پھر اسلام اس پر بھی اصرار نہیں کرتا کہ اس سے سماجی روابط منقطع ہی رکھے جائیں۔ یہ در اصل قانون کا معاملہ ہے ہی نہیں۔ آپ ایک اندھے نوجوان سے اپنی لڑکی بیاہنا پسند نہیں کرتے، حالانکہ اندھا ہونے میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ قانون بھی آپ کو اس رشتے سے نہیں روکتا، لیکن صرف مصالح ہیں جن کی وجہ سے آپ یہ گوارا نہیں کر رہے ہیں۔ بس مصالح ہی کی وجہ سے فقہاء بھی کہتے ہیں کہ ولد الزنا سے کنی کاٹو، اسے اپنی لڑکی مت دو، اس سے ایسا امتیازی سلوک کرو جو فعلِ زنا کی دور رس تباہ کاری اور ناپاکی کے احساس کو زندہ و تابندہ رکھے۔ اس کا الزام اسی طرح آپ اسلامی قانون کو نہیں دے سکتے جس طرح ایک اندھے یا لنگڑے یا جاہل یا مریض نوجوان سے رشتہ نامنظور کر دینے کا الزام قانون کے سر نہیں جاتا۔

امید ہے ہماری یہ مغز پاشی بیکار نہیں جائے گی اور محترم قارئین مسئلہ کی نوعیت کو سمجھ گئے ہوں گے۔

تنبیہ ولد الزنا سے معاشرتی روابط منقطع رکھنے کی جو ہدایات فقہاء کے یہاں ملتی ہیں ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ تمام ہی نوع کے روابط کاٹ لینے کی ہدایت دے رہے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ اخلاق، مروّت اور حسنِ سلوک کی جن جزئیات کو اسلام نے واجب و لازم قرار دیا ہے انھیں ولد الزنا کیلئے بھی لازماً ملحوظ رکھا جائے گا۔ مثلاً خاص خاص حقوقِ ہمسائگی، ظالموں کے مقابلے میں اس کی حمایت، گنجائش ہونے پر بوقت ضرورت قرض دینا۔ سلام کا جواب۔ عیادت۔ تعزیت۔ نمازہ وغیرہ۔

ہاں جن اُمور میں شریعت نے مصالح کے مطابق عمل کرنے کا اختیار دیا ہے یا جس نوع کے تعلقات دلی مؤدت و محبت پر دلالت کرتے ہیں یا جو رشتے خاندان اور گھرانہ بناتے ہیں انہیں بے شک ترک و انقطاع کی راہ اختیار کی جائے گی تاکہ اُس گناہِ کبیرہ سے بیزاری کا احساس زندہ رہے جو اس کے والدین کر گئے ہیں۔ یہی مطلب ہے معاشرے میں جگہ نہ ہونے کا۔

فطورِ عقل

سوال ۱۱:۔ از رحمت اللہ طارق۔ ملتان شہر

ہمارے یہاں ایک بریلوی دوست نے ایک موقع پر فرمایا کہ شیعہ کی جو بات انصاف اور دلیل کی رو سے متوازن، وقیع اور حق ہو اسے بلاچون وچرا تسلیم کرنا ضروری ہے مثلاً ان کا یہ اعتراض کہ حضرت عائشہؓ کو امیر معاویہؓ نے گڑھے میں گرا کر اوپر سے مٹی ڈال کر زمین ہموار کر دی تھی۔ چنانچہ آج تک کسی بھی مؤرخ یا مستند حدیث کی کتاب میں آپ کی وفات، تدفین اور قبر کا سراغ نہیں مل سکا وغیرہ وغیرہ۔ من الخرافات۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ بات قابلِ تسلیم اور صحیح

کی آمد جاری ہے۔ سوال یہ ہے کہ سب سے پہلے یا یہ کہ شیعہ کی کس کتاب میں یہ شوشہ چھوڑا گیا ہے جس سے ہمارے سنی حضرات فریب کھا گئے۔ میں نے تو مسلمانوں کے تمام اسماء الرجال میں اس واقعہ کا سراغ لگایا مگر معاملہ خفا ہی میں رہا اور کسی نے بطور حکایت بھی اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ ازراہ نوازش اس کے بارے میں وضاحت فرمائیں۔

الجواب:۔

جہاں تک اصول کا تعلق ہے بریلوی بھائی نے بجا فرمایا۔ لیکن اس میں شیعوں کی کوئی خصوصیت نہیں حق بات کھلا کافر بھی کہے تو وہ حق ہی ہوتی ہے چاہے قرینۂ نفاق کی موجودگی میں خود اس کافر کو حق گو نہ کہا جا سکے۔

لیکن اصول کے ذیل میں مثالاً جو روایت پیش کی گئی ہے اسے "حق" کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی فاطر العقل گوبر کو گاجر کا حلوہ قرار دینے لگے۔ یہ روایت نہ صرف من گھڑت ہے بلکہ شر انگیزی کا شاہکار ہے۔ اسے باطل، کاذب اور واہی کہدینے سے بھی اس کی ناپاکی اور تعفن کے اظہار کا حق ادا نہیں ہوتا۔ جو شخص خود کو اہلِ سنت والجماعت کہنے کے باوجود اس روایت کو "حق" کے زمرے میں شامل سمجھتا ہے، اس سے بچ کر رہنا چاہئے کیونکہ اندیشہ ہے وہ کسی بھی وقت آپ کو پتھر مارنے لگے گا۔

متذکرہ روایت کے بارے میں آپ کو خود ان بریلوی بھائی سے دریافت کرنا چاہئے تھا کہ یہ ایسے کس صحیفے میں درج ہے جس پر آمنا وصدقنا کہے بغیر چارہ ہی نہیں۔ ہمیں تو نہیں معلوم کہ اس کا ماخذ مبنیٰ کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حضرت خضرؑ

سوال[۱۲]:۔ از نعیم۔ پورنیہ (بہار)

خضرؑ کے بارے میں جو بہت سی افواہیں ہیں اس کی کیا حقیقت ہے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ تاقیامت خضرؑ بقید حیات رہیں گے؟ اگر صحیح ہے تو ازراہ کرم قرآن کی روشنی میں اُن مضمرات کو بھی تحریر فرمایا جائے جن کے تحت خالقِ کائنات نے اپنے فطری قوانین کے برخلاف خضر کو اتنی درازیِ حیات عطا کی ہے۔ خضرؑ کے بارے میں عام خیال یہی ہے کہ اس کرۂ ارضی کے بحری حصے ان ہی کے زیرِ نگیں ہیں (نعوذ باللہ گویا خدا کی خدائی میں شریک ہوئے) بعض لوگ تو خضرؑ کو پیغمبر تصور کرتے ہیں اور اسی غلط مفروضہ کی بنیاد پر بعض بعض کتابوں میں جب بھی خضرؑ کا ذکر آیا تو اس کے ساتھ ساتھ لفظ "علیہ السلام" بھی ضرور آیا۔ خضر کے بارے میں میری معلومات بس اسی حد تک محدود ہے کہ اپنے وقت کے وہ ایک بزرگ صفت انسان تھے۔ براہِ کرم اس سلسلے میں تفصیلی نوٹ تحریر فرمایا جائے۔

الجواب[۱۲]:۔

جناب خضر کے بارے میں ہماری معلومات کا دائرہ کچھ زیادہ وسیع نہیں ہے۔ پھر جتنا ہے وہ بھی قابلِ اعتماد نہیں۔ کچھ دن پہلے تک ہمارا معمول یہ رہا ہے کہ ہر طرح کے ضروری اور غیر ضروری مسائل پر خاصی تفصیل سے گفتگو کرتے رہے ہیں، لیکن پھر اس نتیجے پر پہنچنا پڑا کہ ضروری اور غیر ضروری کا امتیاز کئے بغیر ہی موضوع پردازِ تحقیق دینا شوقِ فضول ہی کی ایک شاخ ہے جس سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ شیطان اس سے بہت خوش ہوتا ہے۔ بلکہ وہ اس کے لئے جد وجہد بھی کرتا رہتا ہے کہ لوگ کام کی باتیں چھوڑ کر دور از کار اور لاحاصل بحثوں میں کھپیں۔ پھر کیوں نہ ہم ایسے ہی مسائل تک محدود ہیں جو واقعۃً کوئی قابلِ لحاظ اہمیت رکھتے ہوں اور ان پر وقت اور قوت کا خرچ کرنا دینی عقائد وافکار اور کردار وعمل کی اصلاح کے سلسلے میں سچ مچ مفید ہو سکتا ہو۔

حضرت خضر کون تھے اور انھیں کتنی زندگی اور کس نوع کے اختیارات عطا کئے گئے" یہ سوالات ہمارے خیال میں ایسے نہیں ہیں کہ ان کے جوابات سے بے خبر رہنا ہمارے کسی دینی یا دنیاوی مفاد پر ادنیٰ درجے میں بھی

اُسی تحریک کی تائید عملی پروگرام کی سطح پر آپ کچھ بھی نہ کریں۔ آپ کے چچا بزرگوار (مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم) نے جس نظریہ کو صحیح سمجھا اس کی خاطر اُنھوں نے جن عملی مشکلات کا سامنا کرکے جو قولی اور عملی جد و جہد کی اس کے نقوش ہند و پاک کی تاریخ کے صفحات سے کبھی نہیں مٹ سکتے۔ مگر اسکے برعکس جماعت اسلامی کے سلسلے میں آپ نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے وہ محض علمی جد و جہد ہی تک محدود ہے اور عملی جد و جہد کچھ بھی نہیں ــــ ڈاکٹر اقبال کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، انھوں نے بھی کاغذ و قلم ہی کی سطح پر کفر و الحاد کا مقابلہ کیا۔ کفر و الحاد اور باطل افکار و نظریات کے سیلِ رواں کو روکنے کے لئے کاغذ و قلم کی سطح مفید تو ضرور ہو سکتی ہے مگر غالب آنے کے لئے بہرحال میدانِ عمل ہی کی سطح ناگزیر ہے کاغذ و قلم کے سہارے مدافعت تو کی جا سکتی ہے مگر پیش قدمی کے لئے میدانِ عمل ہی کی سطح درپیش ہے۔ بند کمرے میں کسی پہلوان سے محض زور آزمائی تو کی جا سکتی ہے مگر غالب و مغلوب کا فیصلہ بہرحال کسی اکھاڑے ہی میں ہو سکتا ہے ــــ سوال یہ ہے کہ کیا محض کاغذ و قلم ہی کے سہارے فریضۂ اقامت دین کی راہ ہموار ہو سکتی ہے؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو ایسی صورت میں بدر و اُحد کی تاریخ بے مقصد ہو کر رہ جاتی ہے ــــ میں مسلسل پانچ سال سے تجلی کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں چند بار رسائل نے آپ سے سوال بھی کیا کہ جب آپ جماعت اسلامی کو برحق تصور کرتے ہیں تو پھر اُس کے عملی پروگرام میں آپ شریک کیوں نہیں ہوتے؟ آپ نے ہر بار تقریباً یہی جواب دیا کہ جماعت اسلامی کی شرکت کے لئے جس اعلیٰ کردار اور بلند عزائم کی ضرورت ہے میں اپنے اندر اس کی خامی پاتا ہوں۔ ایک بار آپ نے یہ بھی جواب دیا کہ فطری طور پر آزاد طبیعت کا انسان ہوں جس کے باعث کسی مقررہ ضابطے کی پابندیوں کو نبھانا میرے لئے امرِ محال ہے اور ایک بار آپ نے یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ جماعت سے باہر رہ کر آزاد طور پر میں جو کام کر سکتا ہوں وہ جماعت کے اندر رہ کر پابندیوں کے تحت نہیں کر سکتا ــــ اس سلسلے میں مجھے ایک تاریخی لطیفہ یاد آ گیا۔ مشہور مغربی مفکر جارج برنارڈ شا اسلام کا بہت ہی مداح تھا۔ ایک بار کسی نے سوال کیا کہ جب آپ اس حد تک اسلام کے مداح ہیں تو پھر آپ اسلام قبول کیوں نہیں کرتے؟ اس کا جواب برنارڈ شا نے یہی دیا کہ اسلام سے اگر تمہاری مراد وہ اسلام ہے جو آج کل کے مسلمانوں کی زندگی میں پایا جاتا ہے تو اس اسلام سے میں پناہ مانگتا ہوں اور اگر اسلام سے تمہاری مراد وہ اسلام ہے جو قرآن و حدیث میں ہے تو اس اسلام کو برداشت کرنے کی سکت میں اپنے اندر نہیں پاتا ہوں۔"

ذرا غور فرمائیے اس مغربی مفکر کے ذہنی پس منظر کا، جب میں آپ کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرتا ہوں تو یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ کا ذہنی پس منظر بھی اس مغربی مفکر کے ذہنی پس منظر سے بہت حد تک مماثلت رکھتا ہے۔ بریلویوں کی دھما چوکڑی، دیوبندیوں کی سرکاری جی حضوری، پیرانِ طریقت کی قنوطیت، قبوری شریعت والوں کا شرک اور تبلیغی جماعت والوں کی سطح بینی اور ظاہری نمود و نمائش سے آپ پناہ مانگتے ہیں اور جماعت اسلامی کی کٹھن منزل برداشت کرنے کی سکت آپ اپنے اندر نہیں پاتے ہیں۔ ان حالات کے تحت جارج برنارڈ شا اور عامر عثمانی کی تاویل میں بالآخر فرق ہی کیا رہ جاتا ہے؟

محترم مولانا! خیر خواہی اور ہمدردی اس کا نام نہیں ہے کہ ایک دوسرے کی بیجا تعریفیں کیا کرے۔ یہ خیر خواہی نہیں بلکہ چاپلوسی ہے اور چاپلوسی میں ہمیشہ عیاری اور مکاری کی کیفیت پوشیدہ رہتی ہے۔ خیر خواہی اور دلسوزی کا تقاضا ہی یہ ہے کہ جب بھی کوئی معقول بات کہی جائے تو اُسے دل کی گہرائی سے قبول کیا جائے اور جب غیر معقول بات کہی جائے تو اُسے برملا ٹوک دیا جائے۔ لہٰذا اسی جذبۂ خیر خواہی سے مجبور ہو کر یہ چند معروضات آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ ورنہ میں نہ تو عالم ہوں نہ ادیب ہوں نہ مضمون نگار ہوں نہ فلسفی ہوں اور نہ ہی شاعر ہوں کہ عامر عثمانی جیسے باصلاحیت اور مضبوط اہلِ قلم سے علمی مجادلہ کی جرأت کر سکوں، بلکہ ایک ایسا عامی مسلمان ہوں

کہ عربی زبان سے بھی ناواقف ہوں۔ ایک طرف تو اردو تراجم و تفاسیر اور دوسری طرف مولانا مودودی اور آپ جیسے عالم دین کی تحریریں ہی میری معلومات کی بنیاد ہے

الجواب :-

جماعت اسلامی میں اپنے باقاعدہ نہ شامل ہونے کی کچھ توجیہ ہم اسی اشاعت کے کسی جواب میں پیش کر چکے ہیں۔ آپ کے خط میں چونکہ چند دلچسپ اجزاء ہیں اسلئے تھوڑی سی گفتگو اور کریں گے۔

یہ بات کہ جماعت اسلامی ہمارے نزدیک حمایت کی مستحق ہے یوں کہنے کی نہیں کہ مسلمانوں کی تمام تنظیموں میں صرف جماعت اسلامی ہی ہمارے نزدیک برحق ہے۔ برحق کے بالمقابل "خلاف حق" ہوا کرتا ہے مگر ہم نے ہر دوسری تنظیم کو خلاف حق کبھی نہیں کہا۔ کہنا یوں چاہیئے کہ مسلم تنظیمیں سبھی اپنی اپنی جگہ بعض اچھے مقاصد کے لئے قائم ہوتی ہیں لیکن ایک وسیع، جامع اور اعلےٰ مقصد جماعت اسلامی ہی لیکر اٹھی ہے جو ارفع و اعلیٰ بھی ہے اور ملت مسلمہ کے شایان شان بھی۔ اگر دوسری مسلم جماعتیں اپنے محدود اور جزوی مقاصد کے لئے خلوص کے ساتھ جدوجہد کرتی رہیں اور خواہ مخواہ جماعت اسلامی کے خلاف واویلا مچانا اپنے معمولات میں شامل نہ فرمالیں تو باہمی ٹکراؤ کچھ نہیں بلکہ مختلف محاذوں پر جزوی مقاصد کے لئے کی ہوئی جدوجہد اُس ہمہ گیر اور کلی مقصد کے حصول میں معاون ہی ثابت ہوگی جسے جماعت اسلامی نے اپنایا ہے۔ مثال کے طور پر تبلیغی جماعت اگر اپنے پروگرام کو خالص ایجابی اور تعمیری انداز میں چلاتی رہے اور اس کے اکابر کسی بھی مسلمان تنظیم کے خلاف جارحانہ ذہنیت اور جذبۂ حقارت کی پرورش نہ فرمائیں تو جماعت اسلامی سے اس کی کوئی ٹکر نہیں بلکہ اس کے اصلاحی پروگرام کی جوئے رواں کسی مرحلے میں جماعت اسلامی کے دریائے مطالب سے مل کر اسی طرح ایک ساتھ بھی بہہ سکتی ہے جس طرح دو ندیاں سنگم سے گذر کر ایک ہی دریا کی شکل میں بہتی ہیں۔

یا مثلاً جمعیۃ العلماء ہے۔ وہ اپنے دائرۂ کار میں سرگرم عمل رہے اور جماعت اسلامی کی مخالفت کو حرزِ جان نہ بنائے تو اسے بھی ہم یکسر باطل اور بے کار نہیں سمجھتے

رہا ہماری عملی شرکت کا سوال۔ تو نہ جانے آپ نے "عملی" کا مفہوم کیا متعین کر رکھا ہے۔ یہ بجا ہے کہ ضابطے میں ہم جماعت اسلامی کے رکن نہیں بنے لیکن کیا ذہنوں کو اُس فکر کے لئے ہموار کرنا جس پر جماعت اسلامی کی ذہنی عمارت اٹھی ہے اور ایسے ہر نظریاتی حملے کو پسپا کرنے کی جدوجہد کرنا جو جماعت کی فکری بنیادوں کو تہس نہس کر دینا چاہتا ہو آپکے نزدیک عملی خدمت نہیں ہے؟ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ جماعت اسلامی ایک پُرامن، آئین پسند اور اور اصولی نوع کی جماعت ہے جو تشدّد، توڑ پھوڑ، سازش اور عیّاری کے ذریعے کسی انقلاب لانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی اس کے عین خمیر میں یہ اذعان و ایمان سمایا ہوا ہے کہ اقامتِ دین کا مقصد حاصل کرنے کے لئے سب سے مقدم اور سب سے بنیادی کام یہی ہے کہ فکر و نظر کے زاویئے بدلے جائیں، دماغوں کو مسخر کیا جائے اور باطل و فاسد افکار و نظریات کے جس طوفان نے اسلام کو خود مسلمانوں میں اجنبی بنا دیا ہے اس کا زور توڑا جائے۔ اسی لئے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس جماعت کے افراد نے ایک عظیم الشان لٹریچر پیدا کیا ہے۔ اس کے یہاں تصنیف و تالیف کا مستقل شعبہ ہے جس میں اہل حضرات شب و روز قرطاس و قلم ہی کے شغل میں منہمک ہیں اور اس کے متعدد افراد نہ صرف اردو اخبار کی مصروفیات میں کھپے ہوئے ہیں بلکہ ایک انگریزی اخبار "ریڈیئنس" بھی اسی کی تحریک اور کوششوں سے نکلا ہے۔ بدر و احد کے میدانی معرکوں کا ابھی کیا سوال۔ بدر و احد تو دور کی بات ہے ابھی سرے سے کوئی میدان ہی ایسا موجود نہیں جہاں مادّی طاقت کی زور آزمائی اور تیغ و تفنگ کے ٹکراؤ کا سوال پیدا ہو۔

ابھی تو صرف ایک ہی اکھاڑہ ہے ۔۔۔ فکر و نظر کا اکھاڑہ ۔۔
۔۔ اور اس اکھاڑے میں بھی فریق اور مدِ مقابل کوئی غیر نہیں
ہے اپنے ہی ہیں۔ اپنے ہی دست و بازو، اپنے ہی دینی بھائی
لنگر لنگوٹ کس کر بالمقابل آ ڈٹے ہیں۔ نعرے لگا رہے ہیں اور
اعتراض و مخالفت کے فکری بم برسا رہے ہیں۔ طاغوتی
لشکروں سے بدر و اُحد جیسی ٹکر لینے کا تو امکان بھی اس وقت
تک پیدا نہیں ہوتا جب تک ہم ان اپنے ہی بھائیوں کے
اندازِ فکر کو اس حد تک نہ بدل دیں کہ یہ فریقِ مخالف بننے کے
عوض ہمارے ساتھی بن جائیں اور پھر ہم ایک معتد بہ جماعت
کی شکل میں اقامتِ دین کی راہوں کے پہاڑ کاٹنے کا کارِ
دشوار انجام دیں۔

آپ خدا جانے کس دنیا میں پہنچ کر میدانی جنگوں اور
اکھاڑوں کی باتیں لے بیٹھے ہیں۔ اگر واقعتہً ایسا ہوتا کہ
جماعت اسلامی کے ارکین قرطاس و قلم کو بالائے طاق رکھ کر
کسی میدانی معرکے میں کود پڑے ہوتے تب تو آپ کے اس استفسار
کا کچھ مطلب ہو سکتا تھا کہ عامر عثمانی آج بھی ممبر بنے کمرے میں
بیٹھا فقط قلم چلا رہا ہے لیکن ایک ایسے مرحلے میں جبکہ زبان و قلم
کی تمام صلاحیتوں سے کام لیکر ذہنوں کو ہموار کرنا اور متقابل
نظریات کو توڑنا ہی خود جماعت اسلامی کے نزدیک بھی
اولین اہمیت کا کام ہے نہ جانے آپ فقط ضابطے کی رکنیت
ہی کو کیوں سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔ رکن بننے کے بعد ہمیں اس سے
زیادہ کیا کرنا ہوتا کہ جماعت کے اجتماعات میں شرکت کیا کریں
اور جماعت اگر ہمارے لئے کوئی سفر یا کہیں تقریر طے کردے تو
اس کی تعمیل کردیں۔ کیا بس اتنے ہی سے فرق کو آپ یہ معنی دے
لیں گے کہ ہم بدر و اُحد کا مجاہد بن جاتے؟

مہربان! آدمی کو حقائق کی دنیا میں رہنا چاہئے۔
اس وقت نہ تو اپنے دیس میں ایسا کوئی معرکۂ قتال برپا ہے
جس میں عامر عثمانی کود پڑے نہ اور ہی کوئی ایسا ہمہ گیر کام جماعت
کے پاس ہے جس میں عامر عثمانی کا کاغذ قلم چھوڑ کر شرکت کرنا
دین و ملت کے حق میں انفع ہو۔ پھر یوں بھی سوچئے کہ معرکہ
بپا ہو ہی جائے تو ہر شخص ہتھیار سجا کر صفِ اول میں لڑنے
کا اہل تو نہیں ہوا کرتا۔ باورچی کا روٹی پکانا اور درزی کا کپڑے
سینا بھی مجاہدین کی خدمت ہے۔ کسان اور صنعت کار
سب فوجی وردی پہن لیں گے تو اگلے ہی دن سب کا بیڑا
غرق ہو جائے گا۔ عامر عثمانی اپنی صلاحیتوں اور کمزوریوں
کو خوب سمجھتا ہے۔ وہ دیانت داری کے ساتھ جانتا ہے کہ
جماعت کی باضابطہ رکنیت اختیار کر کے وہ جماعت کو
نقصان زیادہ اور فائدہ کم پہنچائے گا۔ وہ شاید اس کے
لئے ایک مسئلہ بن جائے۔

الحاصل خواب و خیال اور تمناؤں کی سطح سے اُتر کر
حقیقت پسندی کے رُخ سے غور کیجئے تو یہ بدر و احد، پیش قدمی
اور میدانِ عمل کی باتیں ایک خوبصورت شعر سے زیادہ کچھ
بھی ثابت نہیں ہوں گی۔ عمل سب سے بڑا اس وقت یہی ہے
کہ جماعت کی دعوت کے لئے فکری میدان ہموار کیا جائے
اور یہی کام ہم حسبِ توفیق رکنِ جماعت بنے بغیر بھی کر رہے
ہیں۔ رکن بننے کے بعد اس سے زیادہ کچھ کرنا ہمارے لئے
پیشِ نظر ہو تو اس سے ضرور آگاہ فرمائیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی بات آپ نے کافی مزیدار
فرمائی۔ وہ ہمارے چچا تھے ان کی توصیف سے ہمیں جتنی
بھی خوشی ہو کم ہے لیکن یہ ہمیں آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ
انھوں نے اپنے پسندیدہ نظریئے ۔۔ یعنی مسلم لیگ کی
حمایت میں کون سی مشکلات کا سامنا کیا تھا اور کس قسم
کی عملی جدوجہد کے ہفت خواں طے کئے تھے۔ اگر آپ کا
اشارہ اُن ہنگامہ خیز تقریروں کی طرف ہے جن کا پیہم
صدور ان کی زبان سے جنرل الیکشن سے کچھ مدت قبل ہوا
یا ان بحثوں کی طرف ہے جو انھیں علمائے جمعیۃ سے کرنی
پڑیں تو ان کا علم آپ سے بھی زیادہ خود ہمیں ہے۔ مگر آپ
تو زبان اور قلم چلانے کو عملی کام مانتے ہی نہیں پھر کیسے
علامہ مرحوم کی فقط تقریروں کا نام عملی جدوجہد رکھ رہے
ہیں۔ متعدد کانفرنسوں میں تقریریں کرنا اور ضرورت
پڑنے پر ایک دو بار علمائے جمعیۃ سے علمی و منطقی ٹکر لینا ۔۔
یہ تھا علامہ محترم کا کام۔ اس کے بعد پاکستان بن گیا تو وہ

معہ اہل وعیال پاکستان تشریف لے گئے اور ان کا تمام مال واسباب حتیٰ کہ ذاتی کتب خانہ بھی سرکاری تحویل میں وہیں پہنچ گیا۔ فرمایا جائے کہ ان کے عمل میں اور ہماری قلمی جدوجہد میں جوہری و اصولی اعتبار سے کیا فرق ہے؟ وہ لیگ کے ساتھ ایک ایسے ہنگامہ خیز دور میں شریک ہوئے تھے جب سیاست کی فضا میں بھونچال آیا ہوا تھا کانفرنسوں کی گرما گرمی تھی اور علمائے جمعیۃ کے مقابلے پر مسلم لیگ کو کسی ٹکر ہی کے عالم کی ضرورت بھی تھی۔ مرحوم لیگ کی حمایت پر مائل ہوئے تو انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ان کے ملکۂ تقریر نے دھوم مچادی۔

ہمارے حالات اس سے بالکل مختلف ہیں۔ حالات وہ چیز ہیں کہ سازگار ہوں تو آدمی ایک دن میں ہیرو بن جاتا ہے اور ناسازگار ہوں تو زندگی بھر گھس گھس کر کے بھی گمنامی ہی کی موت مرتا ہے۔ حالات ہی تھے جن میں علامہ مرحوم کے ایک ایک لفظ کی قیمت ہیرے اور موتیوں سے لگی اور حالات ہی ہیں جن میں ہمارے گاڑھے لہو کو پسینے کی بہا بھی نصیب نہیں۔

آپ کے لئے یہ اطلاع شاید چونکا دینے والی ہوگی کہ مرحوم کی جن سرگرمیوں کو آپ مثالی جدوجہد کے طور پر پیش کر رہے ہیں ان کے دور میں وہ اسی طرح مسلم لیگ سے باہر تھے جس طرح ہم جماعت اسلامی سے باہر ہیں۔ حالانکہ مسلم لیگ کی ممبری چند پیسوں کا ٹکٹ کٹانے سے زیادہ کسی کھڑاک کی طالب نہیں تھی!

مقصود گڑے مردے اکھاڑنا نہیں۔ بتانا ہم یہ چاہتے ہیں کہ بندوق یا تلوار نہ مرحوم نے اٹھائی نہ ہم اٹھا رہے ہیں۔ جس نظریہ کو انھوں نے درست سمجھا اس کے لئے فقط زبان استعمال کی اور اس کی بھی پروا نہیں کی کہ اس نظریہ کی حامل جماعت میں باضابطہ شریک ہوں اسی طرح ہم جس نظریہ کو درست سمجھتے ہیں اس کے لئے قلم گھس رہے ہیں اور اس کی پروا نہیں کرتے کہ باضابطہ رکن جماعت بھی بنیں۔ نتائج اور اثرات اور ظاہری تفصیلات کا فرق یہ معنی نہیں رکھتا کہ ان کی جدوجہد تو عملی تھی اور ہماری فقط ہوائی ہے۔ ضرورتیں اور حالات متقاضی ہوں تو ہم بھی قلم کاغذ رکھ کر کانفرنسوں کو خطاب کر سکتے ہیں مگر حالات ہی دگرگوں ہوں تو سوائے قلم چلانے کے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

برنارڈ شا کی مثال آپ نے بڑی بے دردی سے دی ہے ـــــ عامر عثمانی کے لئے ایک نصرانی کی تمثیل پیش کرتے ہوئے آپ نے اس منطقی تضاد اور سخن سازی کو محسوس نہیں فرمایا جو اس نصرانی کے منقولہ ارشاد میں صریحاً پائی جاتی ہے ـــــ وہ جب کہتا ہے کہ قرآن و حدیث والے اسلام کو برداشت کرنے کی سکت میں اپنے اندر نہیں پاتا تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا سمجھا جائے کہ وہ اسلامی احکام کی عملی پابندی کو اپنے بس سے باہر خیال کرتا ہے ـــــ چلئے مان لیا، لیکن کیا نظریاتی اور اعتقادی اعتبار سے بھی اسلام کو قبول کر لینا اس کے بس سے باہر تھا؟ کیا خود اسی اسلام میں جس کے مطالعے کا اسے دعویٰ تھا یہ بات صریح طور پر موجود نہیں تھی کہ نجات کے لئے فقط ایمان لانا کافی ہے۔ نہ سہی پابندیٔ احکام۔ صرف ایمان لے آنے سے نجات کی راہ تو ہموار ہو ہی جائیگی مگر نظری اور اعتقادی سطح پر بھی اسلام کو قبول نہ کرنا اور اپنے دینِ سابق پر جمے رہنا آخر اس کے سوا کیا معنی رکھتا ہے کہ منقولہ ارشاد میں معنوی تضاد ہے اور قرآن و حدیث والے اسلام کی بے حد تعریف کا جو پیرایہ اس شخص نے اختیار کیا ہے وہ سخن سازی سے زیادہ کوئی شعوری گہرائی نہیں رکھتا۔

تمثیل اس وقت درست ہو سکتی تھی جب برنارڈ شا نے اسلام تو قبول کر لیا ہوتا بس عمل میں کوتاہ رہتا۔ ہم پر آپ عملی کوتاہی کا ہی الزام تو عائد کر رہے ہیں مگر یہ الزام عائد نہیں کر رہے اور نہیں کر سکتے کہ جماعت اسلامی کی دعوت کو ہم نے نظری اعتبار سے بھی قبول نہیں کیا۔ قبول کرنا چہ معنی دارد ہم تو اس کی حمایت و تبلیغ میں سرگرم ہیں

اور آپ کو اس کا اعتراف بھی ہے۔ پھر بھلا ہمارے اور برنارڈ شا کے ذہنی پس منظر میں مطابقت کے کیا معنی؟

در اصل آپ جماعت اسلامی کے بارے میں خواب و خیال کی بڑی اونچی فضا میں اڑ رہے ہیں۔ آپ نہ جانے کیوں یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ جماعت اسلامی کا باقاعدہ رکن بننا کوئی ایسی ہی کٹھن منزل ہے جیسی فوج میں بھرتی ہو کر سنگلاخ پہاڑیوں اور برفانی علاقوں میں لڑنے جانا۔ اسی لئے عامر عثمانی اس سے کتی کاٹتا ہے۔ اے محترم! کبھی عامر کے کلبۂ احزان میں آ کر اس کا ساز و سامان دیکھئے اور پھر جماعت کے مرکزی دفتر میں دہلی پہنچئے۔ آپ کو ماننا پڑے گا کہ عامر جس پلنگ پر بیٹھ کر قلم گھستا ہے اس کے بان اُن کرسیوں سے زیادہ کھرے ہیں جن پر بیٹھ کر اراکین جماعت قلم چلا رہے ہیں اور عامر عثمانی کی ذاتی آسائش کا سارا سامان بھی نیلام کر دیا جائے تو وہ اُس ایک کمرے کی قیمت نہیں چکا سکے گا جس کی چھت سے نکلے ہوئے برقی پنکھے کی ہوا میں ایک رکنِ جماعت قرطاس و قلم کی خدمت کر رہا ہے۔

تفنن بالکل نہیں۔ ہم واقعۃً نہیں سمجھ سکے کہ جماعت اسلامی کا رکن بن جانا ہی بجائے خود ایسا کونسا کٹھن مرحلہ ہوگا جس کے مقابلہ میں آپ کو ہماری موجودہ زندگی تن آسانی اور فرار کی زندگی محسوس ہو رہی ہے۔ اگر مستقبل کے خطرات پیش نظر ہیں تو بے فکر رہئے اوپر والوں کی نظر میں ہم جماعت سے الگ نہیں اور اگر کچھ اور مقصود ہے تو اس سے آگاہ فرمائیں۔

متفرقات

سوال ۱۴:۔ از شبیر احمد۔ پورنیہ۔

۱۔ انسان جب مر جاتا ہے تو اس کے عمل کے مطابق اس کی روح کو علیین یا سجین میں پہنچا دی جاتی ہے۔ کیا کچھ ارواح ایسی بھی ہیں جن کو عالم دنیا کی سیر کرنے کی آزادی ہوتی ہے؟

۲۔ کچھ چھوٹی بڑی کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد اس کا نامۂ اعمال بند کر دیا جاتا ہے اور کراماً کاتبین اعمال کے دفتر کو لے کر چلے جاتے ہیں۔ کیا کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے اعمال کا دفتر بند نہیں کیا جاتا اور مرنے کے بعد بھی لوگوں کو نفع و نقصان پہنچانے کی اُن کو قدرت ہوتی ہے؟

۳۔ جہاں بھی کہیں میلاد و وعظ وغیرہ ہوتا ہے اکثر میں شریک ہونے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ اللہ و رسول کی باتیں سنوں اور اُس سے کچھ نصیحت پکڑ دں۔ ابھی دو چار روز کا واقعہ ہے ۱۲ ربیع الاول کے موقع پر سیرت النبی کا جلسہ تھا۔ میں بھی شریک ہوا۔ ختم پر لوگ قیام کے لئے کھڑے ہوئے اور میں اپنی جگہ پر بیٹھا ہی رہ گیا۔ بعد میں کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ آپ نے قیام کیوں نہیں کیا۔ اگر آپ کو قیام نہیں کرنا تھا تو مجلس میں آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ اگر آپ کو شک ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس مجلس میں تشریف نہیں لاتے تو کم از کم مجلس کے احترام میں تو کھڑے ہو جانا چاہئے۔ اب نہیں سمجھ میں آتا کہ میں کیا کروں۔ اُمید کرتا ہوں کہ آپ تفصیل کے ساتھ قرآن و حدیث کے حوالہ سے اور بزرگانِ دین کے طریقہ سے آگاہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر دے گا۔

الجواب ۱۴:۔

(۱) ہمیں اس کے بارے میں مستند ذرائع سے کچھ نہیں معلوم ہوا۔ جب ہمیں معلوم ہوا تو وہی لوگ ہمیں مستند ذریعہ بتائیں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ کچھ روحیں برابر دنیا کا سیر سپاٹا کرتی رہتی ہیں۔ اس معاملہ میں کسی بزرگ کا کشف و الہام تو ہمارے لئے حجت نہیں نہ خواب و خیال سے کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے۔ نظر نہ آنے والی دنیا کے بارے میں واجب القبول اور لائقِ اعتماد فیصلہ وحی کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔ اگر قرآن یا احادیثِ معتبرہ میں ایسی کوئی اطلاع دی گئی ہو تو ہمیں آگاہ کیا جائے۔

(۲) ہمیں نہیں معلوم مرنے کے بعد کسی کا مدد کرنا کیا معنی رکھتا ہے اور اس مدد کی نوعیت کیا ہوگی۔ کم سے کم ہمیں تو

ابھی تک کسی مرحوم نے مدد نہیں دی۔ یا دی ہو تو ہمیں اس کا شعور و ادراک نہیں۔

(۳) کسی حکیم نے آپ کو لکھ کر دیا ہے کہ مجلس میلاد میں تشریف ہی لے جائیں۔ میلادِ مروجہ تو یوں بھی بدعت ہے اور اس میں قیام "کریلا اور نیم چڑھا" کی مانند ہے۔ نام چاہے محفلِ وعظ رکھیے یا جلسہ سیرت النبیؐ۔ اگر وہاں وہی لفاظی اور رسم بازی ہوتی ہے جو آج کل مروّج ہے تو آپ وہاں جانے کی زحمت نہ اٹھائیں۔ جائیں گے تو لازماً یہی چکر پیش آئے گا جو آیا۔ یہ سیدھا مشورہ آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو جو جی میں آئے کیجئے۔ ویسے شریک ہو کر قیام میں بھی ساتھ دیں گے تو چاہے دل میں کچھ بھی ہو مگر عملِ شرک کے مرتکب ضرور ٹھیریں گے۔

عالمِ مثال

سوال ۱۵:۔ میر محمود علی۔ ضلع محبوب نگر

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قیامت میں ہر ایک کے حساب کتاب کے بعد ان کے اعمال کے مطابق جنت و دوزخ عطا کی جائیں گی اور اس سے قبل حسب اعمال قبر میں عذاب و راحت عطا کیا جائے گا۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ معراج میں ان کو جنت و دوزخ کی سیر کروائی گئی۔ جہاں انھوں نے انسانوں وغیرہ کو جنت میں آرام و آسائش کے ساتھ اور دوزخ میں عذاب میں مبتلا دیکھا۔

اب سوال یہ ہے کہ جب قیامت ہوئی ہی نہیں حساب و کتاب ہوا ہی نہیں کیونکہ اس سے قبل ہی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں وغیرہ کو جنت و دوزخ میں مختلف مرحلات میں دیکھا؟

الجواب ۱۵:۔

اللہ جل شانہ کے ذات و صفات اور عالم نہاں کے اسرار و رموز ایسے تو نہیں ہیں کہ انھیں منطق اور تجربے کی روشنی میں قابلِ فہم بنایا جا سکے لیکن اس کے باوجود اللہ نے خود اپنے کلام میں تمثیلات کے ذریعہ اپنی ذات و صفات کا ادراک کرایا ہے اس لئے ہم بھی تمثیل ہی سے کام لیکر آپ کا جواب دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

دیکھئے یہ تو طے ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ماضی اور مستقبل سب پر محیط ہے۔ جو کچھ ہو چکا اور آگے جو کچھ ہونا ہے سب اللہ کو معلوم ہے۔ معلوم کیسے نہ ہو جب کہ ہونا اور نہ ہونا اسی کے قصد فرمانے اور نہ فرمانے کا دوسرا نام ہے۔ تقدیر پر آپ کا ایمان ضرور ہوگا۔ تقدیر اسی کو تو کہتے ہیں کہ آنے والے زمانے میں جو کچھ ہونا ہے وہ آج بھی اللہ کے علم میں ہے اور علم بھی محض مجمل یا مبہم نہیں مفصل اور مکمل علم جس کے دائرے سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل باہر نہیں۔

فلموں کے فیتے آپ نے دیکھے ہوں گے۔ سینما ہال میں بیٹھ کر جو کھیل تماشا آپ دیکھ رہے ہیں وہ بظاہر تو آپ کے سامنے ایک زمانی ترتیب کے ساتھ رفتہ رفتہ آ رہا ہے اور پہلی بار فلم دیکھتے ہوئے آپ نہیں جانتے کہ فلاں سین کے بعد کونسا سین آئیگا اور فلاں واقعے کا نتیجہ آگے کو کیا نکلے گا۔ لیکن حقیقت اور امر واقعہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ پورا کھیل پہلے ہی سے ایک لمبے فیتے میں مرتب ہو کر مشین پر چڑھ چکا ہے۔ جو واقعات آپ تین گھنٹے بیٹھ کر ترتیب وار دیکھیں گے وہ اپنی تمام جزئیات و تفصیلات سمیت مسالے کے فیتے پر اس طرح ثبت ہو چکے کہ اب ان میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں اور جس نے آپ سے پہلے یہ کھیل دیکھ لیا ہے وہ مکمل طور پر ساری داستان سے باخبر ہے۔

کچھ ایسا ہی عالم (بلا تشبیہ) اللہ جل شانہ کے علم کا ہے ابد الآباد تک جو ہونا ہے وہ سب علم الٰہی میں مرتب ہے اور اسی حقیقت معنوی کو تقدیر اور لوح محفوظ جیسے ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب اگر حقیر انسان کے لئے یہ بات کچھ دشوار نہیں کہ اداکاروں کی جو اداکاری ایک محدود مدت کے بعد اپنا خارجی وجود ختم کر چکی مسالے کے فیتے پر اس طرح ثبت کر لی گئی کہ جب جس کا جی چاہے اسے فلم کے پردے پر دیکھ لے تو اللہ کے لئے یہ بات کیا دشوار ہو سکتی ہے کہ جو مناظر و واقعات اس کے دامنِ علم میں پہلے ہی سے موجود ہیں ان کا کوئی حصہ اپنے کسی بندے کو دکھلا دے۔ قیامت اور آخری

جزا و سزا کا ہنگامہ ہمارے لئے تو بے شک مستقبل کی چیز ہے لیکن اللہ کے لئے اس کی حیثیت مستقبل کی نہیں بلکہ ہر شے حال ہی حال ہے

کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ایک کہانی نویس یا ڈائرکٹر اگر چاہے تو فلمی کہانی کا وہ واقعہ جو واقعات کی ترتیب کے لحاظ سے بہت بعد میں پیش آتا ہے شروع ہی میں دکھلا سکتا ہے یا خود آپ ہی فلم کے فیتے کو کاٹ چھانٹ کر آگے پیچھے جوڑ دیں تو بعد میں پیش آنے والے مناظر پہلے آجائیں گے اور پہلے والے بعد میں۔ تو جس ہستی کے دستِ اختیار میں ابداً تا ابد تک پیش آنے والے جملہ واقعات و حوادث کی ساری کہانی مرتب طور پر موجود ہو اس کے لئے کیا دشوار ہے کہ جسے چاہے جب چاہے کہانی کا کوئی سا بھی حصہ دکھا دے۔ دکھانے کے لئے انسان مسالے کے فیتے بنا سکتا ہے تو کیا انسان کا خالق آسمان و زمین کی کسی بھی شے کو اپنے بے نہایت علم کے ایک قلیل سے حصے کا آئینہ بنا دینے پر قادر نہیں ہونا چاہیے۔

اصطلاح میں "عالم مثال" ایسی ہی دنیا کو کہتے ہیں جہاں عالم ظاہر کی ہر شے کا ایک معنوی وجود تخلیق کیا گیا ہے حضورؐ کو شب معراج میں جو کچھ دکھایا گیا وہ ہماری نسبت سے عالم مثال ہی کا واقعہ تھا، لیکن یہ عالم مثال وہم وگمان جیسی کوئی شے نہیں بلکہ ایک ایسی ہی حقیقت ہے جیسے زمین کی کشش اور ستاروں کا باہمی ربط و نظم کشش اور کیفیتِ ربط کو ہم آنکھوں سے دیکھ یا ہاتھوں سے چھو نہیں سکتے، لیکن انکو محض وہم کہنا بھی ممکن نہیں اسی طرح کائنات میں نہ جانے کہاں ایک عالم مثال ہے اور شبِ معراج میں مستقبل کے جو مناظر حضورؐ کو دکھائے گئے وہ اسی عالم مثال کی چیز تھے۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ احکم۔

نکاح کیلئے لڑکی کا دیدار

سوال ۱۶/۱:۔ (ایضاً)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ شادی سے قبل مرد کو اس لڑکی کو دیکھ لینا چاہیے جس سے بات طے ہو گئی ہے تاکہ بعد میں اعتراض کا سوال نہ ہو لیکن سوال یہ ہے کہ اس طرح پردہ کی خلاف ورزی ہوگی۔ ایسی صورت میں والدین کو لڑکی دکھانا چاہیئے یا نہیں؟ براہ کرم اختصار سے لکھیں۔

الجواب ۱۶/۱:۔

جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ شادی سے قبل لڑکی کو ایک بار دیکھ لینے کی اجازت خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے تو پھر این و آں اور چون و چرا کا کیا مطلب۔ پردہ بجائے خود مقصود نہیں بلکہ وہ جنسی بے راہ روی کو روکنے کے ایک ذریعے کے طور پر مقصود ہے۔ اگر لڑکی کے والدین اپنی لڑکی کو ایک نظر دیکھ لینے کا موقع کسی ایسے شخص کو دیتے ہیں جو نکاح کی نیت رکھتا ہو تو اسمیں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ حسن و جمال بہرحال ایک قابلِ لحاظ شے ہے۔ شادی سے قبل ایک شخص اگر اس اندیشے کا سدِ باب کرنا چاہتا ہے کہ اس کی زوجیت میں کوئی ایسی لڑکی نہ آجائے جو جسمانی حیثیت سے عیب دار یا بدشکل ہو تو اس خواہش کو اسلام نے گناہ قرار نہیں دیا بلکہ جو لوگ حسنِ صورت کے معاملے میں ذکی الحس ہوں اور دیانت کے ساتھ یہ سمجھتے ہوں کہ کسی کریہہ المنظر عورت کے ساتھ وہ اطمینان اور خوشی کی زندگی نہیں گزار سکیں گے انھیں لازماً یہ اہتمام کرنا چاہیئے کہ کسی لڑکی کے لئے پیغامِ نکاح بھیجنے سے قبل معتبر ذرائع سے اس کی شکل وصورت کا حال معلوم کر لیں اور اگر معتبر ذرائع موجود نہ ہوں تو بطور خود ایک نظر دیکھنے کی کوشش کریں۔ یہ کوشش اگر چوری چھپے بھی ہوگی تو عند اللہ معصیت نہ ہوگی بشرطیکہ نیت ان کی درست ہو اور خود لڑکی کے سرپرستوں سے فرمائش کر کے بھی ایک نظر دیکھا جا سکتا ہے۔

ویسے عرف عام کے لحاظ سے یہ بات عار میں داخل ہے کہ والدین متوقع داماد کو اپنی لڑکی دکھانے کا انتظام کریں۔ داماد کی طرف سے ایسی فرمائش ہی اکثر حالتوں میں ہنگامہ و نزاع کا باعث بن سکتی ہے لہذا جس شخص کو بھی لڑکی دیکھنے کی ضرورت کا مرحلہ درپیش ہو اسے کھٹ سے

فرمائش پیش نہیں کردینی چاہئیے کیونکہ معاشرے میں رائج فخروعار اور عزت وذلت کی قدروں کو خود شریعت بھی مناسب حدوں میں ملحوظ رکھتی ہے اور ہرگز نہیں پسند کرتی کہ کسی شرعی حق کے استعمال میں بھونڈا پن برتا جائے براہِ راست والدین سے فرمائش کرنے کے علاوہ بھی متعدد صورتیں ہوسکتی ہیں کہ ایک نظر دیکھنے کی ضرورت پوری ہوجائے۔

ریاکاری

سوال ۱۲۰ :- از عبدالعزیز۔ ضلع میدک۔

ہمارے حیدرآباد دکن میں یہ بات عام ہوتی جارہی ہے کہ لوگ جیسے ہی حج کرکے لوٹتے ہیں بس اپنے نام کے شروع میں حاجی کا لفظ چسپاں کرلیتے ہیں اگر تاجر ہوں تو اشتہارات وغیرہ میں حاجی کا لفظ بھی نام کے ساتھ طبع کروالیتے ہیں غرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ محض حاجی کہلانے کے شوق میں حج کرتے ہیں اور حیدرآباد شہر میں تو کوئی عالم یا مولوی ایسا نہیں ملے گا جو ان کی اس ریاکارانہ حرکت پر ٹوکے سمجھائے کیونکہ ہمارے حیدرآباد کے عام علماء وغیرہ کی تعلیم ہی میں خود پسندی پائی جاتی ہے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ از خود اپنے نام سے پہلے حاجی کا لقب اختیار کرلینا کیسا ہے۔ آیا ریاء میں داخل ہے یا نہیں؟

الجواب ۱۲۰ :-

سوال کی عبارت بتا رہی ہے کہ خود آنجناب بھی جواب سے واقف ہی ہیں۔ میرا کام صرف اتنا رہ گیا ہے کہ آپ کے خیال کی توثیق و تصدیق کردوں۔

ہر نیک کام کی اللہ کی یہاں قبولیت اور قدر وقیمت کا مدار بڑی حد تک خلوص اور حسنِ نیت ہی پر ہے۔ ریا کو ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح الفاظ میں شرک قرار دیا ہے۔ شرک سے بڑا گناہ کوئی نہیں۔ یہاں بطور تذکیر و موعظت ہم چند احادیث نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں

مشکوٰۃ باب الریاء والسمعۃ میں آیا ہے:۔

عن شداد بن اوس قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من صلی یرائی فقد اشرک ومن صام یرائی فقد اشرک ومن تصدق یرائی فقد اشرک	شداد بن اوسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ جس شخص نے نمود ونمائش کے لئے نماز پڑھی اس نے شرک کیا اور جس نے دکھانے کیلئے روزہ رکھا اس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوے کے لئے خیرخیرات کی اس نے شرک کیا

یہی شداد بن اوسؓ ایک مرتبہ عالمِ رقت میں آنسو بہا رہے تھے، ان سے پوچھا گیا کیوں رو رہے ہو؟ گلوگیر آواز میں جواب دیا کہ مجھے اپنے آقا سید الابرار صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشادِ گرامی یاد آکر رُلا رہا ہے۔ سوال کیا گیا وہ کیا ارشاد تھا۔ فرمایا، سید الابرار صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے:۔

"میں اپنی امت کے بارے میں شرک اور شہوتِ خفیہ سے ڈرتا ہوں۔"

شداد بن اوسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ ارشاد سن کر میں نے عرض کیا:۔

"یارسول اللہ! کیا آپ کی امت آپ کے بعد شرک بھی کرے گی؟"

فرمایا —— "ہاں ابن اوس۔ یہ المناک واقعہ بھی پیش آنا ہی ہے —— لیکن یہ مت سمجھو کہ وہ چاند سورج یا پتھر کے بت پوجیں گے —— نہیں یہ تو نہیں ہوگا، لیکن وہ نمود ونمائش کے لئے نیک عمل کریں گے۔"

شہوتِ خفیہ کے الفاظ اس حدیث میں بڑے دور رس اور ذومعنی ہیں۔ ویسے تو لفظ "شہوت" کا استعمال عموماً جنسی خواہش پر ہوتا ہے لیکن حدیث کے سیاق میں اس کا اطلاق ہر خواہشِ نفسانی پر ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اس کی مثال اسی حدیث کے متن میں یہ دی گئی ہے کہ مثلاً ایک شخص روزہ رکھ کر سوئے، لیکن صبح اٹھ کر خواہشاتِ نفسانی میں سے کسی بھی

خواہش کی تحریک پر روزہ توڑ ڈالے۔

یہ بھی ایک خواہشِ نفس ہی ہے کہ ہم دنیا والوں کی داد و تحسین کی خاطر نیک عمل کریں اور اس خواہشِ نفس کو اس حد تک قابلِ نفریں قرار دیا گیا ہے کہ اس کے ڈانڈے شرک سے مل گئے ہیں۔ خَفِیّہ سے مراد یہاں وہ کیفیت بھی ہو سکتی ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں "تحت الشعور" کہا جاتا ہے۔ یعنی آدمی کو اس کیفیت کا واضح ادراک نہ ہو۔ یا کسی ایسی شکل میں ادراک ہو جو امرِ واقعہ کے خلاف ہو۔

بہت سے لوگ حج کو جاتے ہوئے کوئی واضح اور نمایاں قصد تو اپنے دل و دماغ میں نمود و نمائش کا نہیں رکھتے لیکن دبی دبی خواہش ان کے اندر یہ ضرور ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسا کام کرنے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے لوگ ان کی عزت کریں گے۔ انھیں حاجی کے معزز لقب سے یاد کیا جائے گا اور ان کی دینداری مستند ہو جائے گی۔ یہ دبی دبی تحت الشعوری خواہش اگرچہ نمایاں طور پر ریا کے زمرے میں نہیں آتی لیکن شہوتِ خَفِیّہ کا مصداق ضرور ہے اور شہوتِ خفیہ کو بھی حضورؐ نے ریا ہی کی طرح ڈرنے اور پناہ مانگنے کی چیز قرار دیا ہے۔

لیکن جن حاجیوں کا تذکرہ آپ نے کیا — اور بالعموم آج کل ایسے ہی حاجی شہر بہ شہر ملتے ہیں — یہ تو بداہتہً مرضِ ریا ہی میں مبتلا ہیں اور اکثر حالتوں میں ان کا مقصدِ حج سوائے نمود و نمائش کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔

ہمارے معاشرے میں حج کرنے والوں کو حاجی کے لقب سے یاد کرنے کا آغاز تو غالباً اس نیک نیتی کے ساتھ ہوا ہوگا کہ اس سے لوگوں کو حج کی ترغیب ملے گی لیکن رفتہ رفتہ یہ لقب خود نمائی اور تفاخر کا مظہر بن گیا ہے لہٰذا جو لوگ خود اپنے قلم سے اپنے کو حاجی لکھیں سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے اندر کسی نہ کسی مقدار میں ریا کے جراثیم پرورش پا رہے ہیں۔ اب یہ خدا کو معلوم ہے کہ یہ مقدار ٹھیک ٹھیک کتنی ہے۔

ایک مرتبہ کچھ صحابہؓ فتنۂ دجال کا ذکر کر رہے تھے (اطلاع حضورؐ نے دی تھی)۔ اتفاق سے سرکارؐ بھی ادھر سے گذرے اور ان کی باتیں سن لیں۔ آپ ٹھیر گئے اور فرمایا۔

"کیا میں تم لوگوں کو ایک ایسی چیز کی خبر نہ دوں جو میری نظر میں تم پر مسیحِ دجال کے نزاع و آویزش سے بھی زیادہ سخت ہوگی؟"

صحابہؓ نے عرض کیا — "یا رسول اللہ ضرور خبر دیجئے۔"

سرکارؐ نے فرمایا — "الشِّرکُ الخفیّ" — ایسا شرک جو چھپکے نقاب پہن کر گھات لگاتا ہے۔ پھر حضورؐ نے تمثیل پیش فرمائی — "شرکِ خفی یہ ہے کہ مثلاً ایک آدمی نماز پڑھنے کھڑا ہو اور یہ محسوس کر کے کہ کچھ لوگ اسے دیکھ بھی رہے ہیں نماز میں اضافہ کر لے۔"

نماز میں اضافے سے مراد یہ ہے کہ یا تو رکوع و سجود اور قیام و قعود کا طول بڑھا دے یا نوافل میں اضافہ کر لے یہ ریا ہے، شرکِ خفی ہے۔ اسے ہمارے آقاؐ فتنۂ دجال سے بھی زیادہ خطرناک اور بدتر قرار دے رہے ہیں۔

اور اشتہاروں میں خود کو "حاجی" چھاپنے والے بزرگ اس روایت کو خصوصیت سے ملاحظہ فرمائیں۔

من سَمَّعَ النّاسَ بعملِہٖ سَمَّعَ اللّٰہُ بِہٖ اسامعَ خَلقِہٖ وحقّرہٗ وصغّرہٗ (مشکوٰۃ بحوالہ شعب الایمان)	جو شخص اپنے نیک اعمال کا ڈھنڈورہ کرے گا اللہ تعالیٰ خلق کے کانوں میں ڈال دے گا کہ یہ شخص ریاکار ہے اور پھر اسے حقیر و ذلیل کرے گا۔

یہ اللہ کے سب سے بڑے رسولؐ کا فرمودہ ہے۔ ضروری نہیں کہ ریاکاری کا بھانڈا دنیا ہی میں پھوٹے۔ اگر کسی شخص کی ریاکاری دنیا کی چند روزہ زندگی میں شہرت، جاہ اور منافع کا وسیلہ بنی رہے تب بھی یہ یقینی ہے کہ آخرت میں اسے یہی کچھ پیش آنا ہے جس کی خبر اللہ کے سچے رسولؐ نے دی۔ اصل عزت و ذلت تو آخرت کی ہے۔

ریا ہلکی سے ہلکی مقدار میں بھی شرک ہی ہے چنانچہ حضورؐ فداہ امی وابی کے یہ الفاظ حدیث میں منقول ہیں:-

یسیرُ الرِّیاءِ شِرکٌ	تھوڑی سی ریا بھی شرک ہے۔

ایک حدیث قدسی میں ریاکاروں کے بارے میں اللہ کا یہ ارشاد مروی ہے۔ قیامت کے دن اللہ فرمائے گا۔

اذھبوا الی الذین	جاؤ تم انھیں لوگوں کے پاس
کنتم تراؤن فی الدنیا	جاؤ جنھیں دکھانے کیلئے دنیا
فانظروا ھل تجدون	میں تم نے نیک عمل کئے تھے پھر
عندھم جزاءً وخیراً	دیکھو کہ کیا ان کے پاس تمھیں کوئی
(مشکوٰۃ)	بدلہ یا بھلائی میسر آتی ہے۔

غرض ریا۔ جو نمود و نمائش اور عزت و جاہ کی طلب کا جامع نام ہے اسلام کی نظر میں بدترین شے ہے جو زہر ہلاہل کی طرح اعمالِ نیک کے نفیس سے نفیس تریاق کو مہلک بنا دیتی ہے۔ لیکن آپ ہی کی طرف نہیں ہندو پاک میں جگہ جگہ ایسے ہی حاجی زیادہ ملتے ہیں جنھیں حاجی کہنا اگر آپ بھول گئے تو وہ اس درجہ خفا ہو جائیں گے کہ جیسے ابھی ازالۂ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ قائم کر دیں گے۔ اب بتلائیے غریب مفتیِ تجلی اس سلسلے میں کیا کرے؟

ایک مہلک ذہنیت

سوال[1]:۔ (نام حذف کر دیا گیا)

ماہ جون کے تجلی میں ایک سوال کے جواب میں آپنے بلا دلیل "انشیورنس" کو ناجائز قرار دے دیا حالانکہ اس ہمہ گیر معاشی ادارے پر تنقیدِ تفصیل کا مستحق ہے۔ مجھے اس ضمن میں حسب ذیل چند باتیں عرض کرنی ہیں:۔

"چند افراد مل کر یہ طے کرتے ہیں کہ فی کس ایک مقررہ رقم ہر ماہ ایک متعین مدت تک جمع کریں اور اُس مدّت کے اختتام پر ہر فرد کو وہ مقررہ رقم واپس کر دی جائے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی متعین مدت سے قبل ہی فوت کر گیا تب بھی زندہ افراد کے مطابق متعیّن رقم فوت شدہ افراد کو بھی واپس کر دی جائے۔"

یہی سیدھا سا معاہدہ اگر آپ کے سامنے پیش کیا جائے تو کس معیار کے مطابق آپ اس کو خلافِ شرع قرار دیں گے معاشی پریشانیوں سے محفوظ رہنے کے لئے انسان کوئی سبیل کرے تو اس کو غلط کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔

اب بیمہ کی اس بنیادی اصول کی تفصیلات ملاحظہ فرمائیں ایک کمپنی یہ طے کرتی ہے کہ مختلف عمر کے افراد سے (بہ لحاظ عمر) ہر ماہ ایک مقررہ رقم متعیّن مدت تک اس کے عوض وصول کیا جائے کہ اس مدت کی تکمیل پر یا اس کے قبل موت واقع ہونے پر وہ اُن افراد کو معاہدہ شدہ رقم ادا کر دے گی تو یہ کون سا بے جا کام ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پریمیم کے تخمینہ کا اصول کیا ہے؟ پریمیم کا فیصلہ "تخمینہ اموات" Mortality Table پر کیا جاتا ہے۔

ہر ملک کے آب و ہوا اور جغرافیائی حالات کے مدِ نظر پچاسوں سال کے حاصل شدہ اعداد و شمار سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عام طور پر کس عمر میں کتنے فی صد افراد لقمۂ اجل ہو جاتے ہیں اور اسی طرح متعین مدّت کے اندر بہ لحاظ عمر زندہ اشخاص کے پریمیم ہی کی رقوم سے فوت شدہ افراد کے معاہدہ شدہ رقوم کو بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً ۱۰۰ افراد نے دس سال کے لئے بارہ سو روپیہ فی کس کا معاہدہ کیا اور کمپنی "تخمینہ اموات" کے مطابق یہ جانتی ہے کہ ان دس سالوں میں ۵ افراد بغیر اپنی پوری رقم ادا کئے ہوئے انتقال کر جائیں گے اس طرح اگر کُل افراد ۱۰ سال تک زندہ رہ جاتے تو ۱۲۰۰ کی معاہدہ شدہ رقم کو ادا کرنے کے لئے اُن حضرات سے دس روپے ماہانہ لینا کافی تھا۔ لیکن اب ۵ انتقال ہونے والے افراد کی معاہدہ شدہ رقم کو بھی ان ہی ۹۵ زندہ رہنے والوں کو ادا کرنا ہے اس لئے دس روپیہ کے بجائے ۱۲ روپیہ ماہانہ پریمیم سب کو ادا کرنا پڑیگا۔ اور اسی اصول پر بیمہ کا سارا کاروبار چلتا رہتا ہے۔

آپنے اپنی مختصر سی تنقید میں حسب ذیل باتوں کی نشاندہی کی ہے۔

(۱) بیمہ قمار کی ایک ایسی قسم ہے جس میں انسانی سوجھ بوجھ

---

[1] اس خط کو ہم نے قصداً زبان و انشاء کی اصلاح کئے بغیر نقل کیا ہے تاکہ سائل کی صحیح حیثیت سامنے رہے اس میں الفاظ کے غلط استعمالات کو کتابت کی غلطی نہ سمجھا جائے۔ صاحب مکتوب کا نام اس لئے حذف کر دیا گیا ہے کہ مقصود ذاتی تنقیص نہیں۔ باوجود زبان و بیان کے نقائص کے جواب اس لئے

[illegible]

کو دخل نہیں (۲) اس میں اتفاق اور تقدیر پر داؤ لگایا جاتا ہے (۳) اس میں نفع و نقصان کا تعلق ذاتی جد و جہد کے بجائے نامعلوم حوادث پر ہے۔

(۱) میرے خیال میں بیمہ کو قمار قرار دینا مناسب نہیں بلکہ قمار سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ قمار میں کامیابی بالکل غیر یقینی ہے۔ داؤ پر لگایا ہوا رقم ہارا بھی جا سکتا ہے اور اس کے عوض کئی گنا زیادہ رقم بھی جیتا جا سکتا ہے، لیکن بیمہ میں اگر پریمیم کی رقم معقول طور پر ادا کی جاتی رہی تو بیمہ شدہ رقم ہر حال میں مل کر رہے گا۔ اس میں "داؤ یا بازی" کا کوئی عنصر شامل نہیں ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اس میں انسانی سمجھ بوجھ کا دخل نہیں ہے۔ یہ صرف انفرادی حد تک صحیح ہے لیکن اجتماعی سطح پر پریمیم کی شرح مقرر کرنے کیلئے سالوں کے تجربہ و اعداد و شمار اور بہت دقیق حساب دانی کی ضرورت ہے جس کو بغیر فنی استعداد کے حاصل نہیں کیا جا سکتا چنانچہ اس کام کے لئے ماہرین (محاسب) کا ایک مخصوص طبقہ (جن کو Actuaries کہا جاتا ہے) کا تعاون حاصل کرنا پڑتا ہے۔

(۲) بیمہ کا تعلق اتفاق اور تقدیر سے اتنا ہی ہے جتنا کہ دنیا کا دیگر جائز کاروبار۔ اس کا کلیۃً انحصار ان دونوں باتوں پر اسی صورت میں ممکن تھا جب کہ موت واقع ہونے پر بیمہ شدہ رقم کے ڈوب جانے کا خطرہ لاحق رہتا یہاں تو دونوں حالتوں میں پیسہ ملنا ہی ہے انسان زندہ رہے جب بھی اور موت واقع ہو تب بھی۔

(۳) بیمہ میں "نقصان" اور "نامعلوم حوادث" کا کوئی عنصر شامل نہیں۔ اس لئے کہ بیمہ شدہ رقم تو ہر حال میں ملنا ہی ہے۔ اس کے علاوہ موت (بحیثیت واقعہ کے) ایک نامعلوم حادثہ نہیں بلکہ اس کو آنا ہی ہے۔ یہ بیمہ شدہ مدت کے درمیان آئے یا بعد اور بیمہ کی مدت بھی نامعلوم نہیں بلکہ مقرر ہی ہوتی ہے۔ ان دونوں میں سے آخر کس کا تعلق نامعلوم حوادث پر ہے؟ نامعلوم حوادث تو میرے خیال میں یہی ہے جنکا واقع پذیر ہونا غیر یقینی ہو ــــ یعنی ایسا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔

بیمہ میں ذاتی جد و جہد کا عنصر بھی مفقود نہیں ہے، اس لئے کہ پریمیم ادا کئے بغیر بیمے کا فائدہ حاصل نہیں کیا جا سکتا اور پریمیم کا پیسہ حاصل کرنے کے لئے ظاہر ہے کہ انسانی جد و جہد درکار ہے۔ اگر بیمہ کے بارے میں آپ کا خیال درست ہے تو زمینداری نظام کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جس میں ہر سال زمیندار کو مالگزاری کا پیسہ (ظاہراً بغیر کسی جد و جہد کے) مل جایا کرتا ہے۔

بیمہ پر ایک تنقید یہ بھی کی جاتی ہے کہ پریمیم کی شرح "تخمینہ اموات" کا مرہونِ منت ہے اور موت کا تخمینہ لگانا شرعاً اور اسلامی مزاج کے خلاف ہے، لیکن یہ سطحی تنقید ہے۔ قرآن اور حدیث کے علاوہ دنیا کے معلومات کے سارے ذخائر تجربہ اور صرف تجربہ پر مبنی ہیں اس لئے یہ کہنا کہ موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے اس لئے اس بارے میں کسی قسم کا شمار و تخمینہ غیر اسلامی ہے ٹھیک ایسا ہی جیسا کہ مریض کے علاج کو خدائی میں دخل اندازی پر مبنی قرار دیا جائے اس لئے کہ مرض کا شفا پانا اللہ کی مرضی پر ہے جس طرح ڈاکٹر کا یہ دعویٰ غیر اسلامی ہوگا کہ وہ لازمی طور پر مرض کو اچھا کر دے گا، لیکن مریض کو اچھا کرنے کی کوشش اس کا ایک احسن فعل ہے۔ اسی طرح موت کے بارے میں تخمینہ و شمار کے اٹل ہونے کا قطعی دعویٰ تو کوئی بھی ہوش گوش کا آدمی نہیں کر سکتا لیکن اس اندازہ کی بنیاد پر کوئی مفید کام کرنا میرے خیال میں اعتراض کا موجب نہیں قرار پا سکتا۔

مجھے امید ہے کہ بیمہ کے معاملہ میں آپ ازسرِ نو غور کرنے کی کوشش کریں گے اس لئے کہ موجودہ معاشی نظام کے اس اہم عنصر پر اتنا لکھ دینا کافی نہیں ہے کہ ان سب پر علماء نقد کر چکے ہیں۔ خط تو بہت لمبا ہو گیا لیکن ایک اہم بات کی نشاندہی انتہائی ضروری سمجھتا ہوں میں تجلی کا پرانا قاری ہوں اور آپکی علمی صلاحیت

کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھتا ہوں لیکن اب مجھے آپ کے زورِ قلم
کا رنگ بدلتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے
تو میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ آپ کے "قلم" میں علمی غرور
کی جھلک نظر آ رہی ہے۔ آپ نے عروج قادری اور پیرزادہ
صاحبان پر تنقیدیں کیں۔ تنقید بجائے خود غلط نہیں تھی لیکن
جس "خوش اسلوبی" سے آپ نے اُن حضرات کی ذات پر
لے دے کیا یہ کم از کم آپ کے لئے مناسب نہیں تھا۔ امید
ہے کہ علمی غرور کے شیطانی فتنہ سے آپ بچنے کی کوشش
کریں گے۔

الجواب[۱۵] :-

اس سے قبل کہ ہم آپ کے جملہ فرمودات کا براہِ راست
جائزہ لیں ایک سوال آپ سے ضرور پوچھیں گے۔ سوال
اس لئے پوچھیں گے کہ ہمارے نزدیک آپ کے اختلافی دلائل
کا رد اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنی اہمیت اُس فاسد و
کاسد زاویۂ نظر کے سدھار کی ہے جو آپ کے فرمودات کی
تہہ میں کام کر رہا ہے۔ اسی لئے ہم گفتگو کافی شرح و بسط
سے کریں گے تاکہ آپ ہی نہیں ہر وہ شخص متنبہ ہو جو اس
زاویۂ نظر کو اختیار کئے ہوئے ہے اور اسی لئے ہم نے
سوال کا عنوان نفسِ موضوع سے ہٹ کر قائم کیا ہے۔

فرض کیجئے کچھ لوگ ایک ایسے فعل کے مرتکب ہوئے
ہیں جس کے بارے میں چند معروف وکلاء اور بیرسٹر صاحبان
فیصلہ دیتے ہیں کہ یہ قانونِ تعزیرات کی فلاں دفعہ کے
تحت کھلا جرم ہے اور اس کے مرتکبین کو سزا ملنی چاہئے
تو بتائیے وکلاء اور بیرسٹروں کے اس فیصلے کو چیلنج کرنے
کا اور ان کی رائے کو غلط قرار دینے کا حق آپ کے نزدیک
کن لوگوں کو ہو سکتا ہے؟

کیا آپ یا دنیا کا کوئی بھی معقول آدمی کسی ایسے
شخص کو اس کا حق دے گا جو نہ تو اصطلاحی معنوں میں
وکیل اور بیرسٹر ہو نہ اس نے قانون پڑھا ہو نہ اسے یہ
معلوم ہو کہ حوادث و واقعات پر قانونی دفعات کے
اطلاق و انطباق کا فنی اسلوب کیا ہے، نہ اس کی نظر میں
قانون کی وہ گوناگوں دفعات ہوں جن کا غائر مطالعہ
کئے بغیر قانون کی روح، اس کے مقصد اور اس کے رُخ
کو سمجھنا ممکن ہی نہیں ہے، نہ اس کی نظر میں وہ فنی بحثیں
ہوں جو وقتاً فوقتاً ماہرینِ قانون بروئے کار لاتے
رہے ہیں اور نہ اس کی پہنچ معروف و مستند ججوں کے اُن
فیصلوں تک ہو جنھیں قانون کی تعبیر میں نظائر کی حیثیت
دی گئی ہے؟

حد ہے کہ یہ شخص اُس زبان تک سے واقف نہ ہو جو
اس زیرِ گفتگو قانون کی اصل زبان ہو اور جس میں یہ پورا
مجموعۂ قانون مرتب کیا گیا ہو — کیا پھر بھی آپ کہہ سکیں گے
کہ معروف و مستند بیرسٹروں کے واضح اور دو ٹوک فیصلے
کے خلاف اس شخص کا زبان کھولنا معقول تو کیا قابلِ اعتنا
بھی ہو سکتا ہے؟

یہ سوال تو بعد کا ہے کہ اختلاف و تردید کے سلسلہ میں
یہ شخص اپنی مجرد عقل اور اٹکل سے جو باتیں کہہ رہا ہے وہ بجائے
خود کس حد تک معقول اور متین ہیں۔ پہلا سوال تو یہی اُٹھیگا
کہ قانون دانوں کی گفتگو میں دخل دینے اور ان کے فیصلوں پر
رائے زنی کرنے کا استحقاق ہی اسے آخر کہاں سے حاصل
ہو گیا جب کہ قانون کے علم و فن میں رائے زنی کرنے کی ابتدائی
اور کم سے کم شرائط پر بھی یہ پورا نہیں اُترتا۔ آپ دیکھ سکتے
ہیں کہ عدالتوں میں الزامات پہ بحث اور قانون کے اطلاق و
انطباق کی گفتگو صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کم سے کم وکیل
ضرور ہوں — کم سے کم کا مطلب یہ ہے کہ "وکالت" محض
ایک ڈگری کا نام ہے جو اس بات کی ضامن نہیں کہ اس
ڈگری کو حاصل کرنے والا واقعتہً قانون کا ماہر بھی ہو گیا ہے
یہ تو بس اس بات کی ضمانت ہوتی ہے کہ قانون پر گفتگو کرنے کے
لئے جو ادنیٰ سے ادنیٰ اور کم سے کم شرائط ضروری ہیں انھیں
اس ڈگری کو حاصل کرنے والے نے پورا کر دیا ہے — ہو سکتا
ہے کہ اس نے محض طوطے کی طرح رٹ کر امتحان پاس کر لیا
ہو اور ذہنی صلاحیتوں کی کمی کے باعث قانونی نکات کی
پیچیدگیوں پر اسے کوئی عبور حاصل نہ ہوا ہو — تاہم قانون کے

اطلاق وانطباق کے بارے میں گفتگو کرنے کا مجاز اور ملزموں
کی حمایت یا مخالفت میں زبان کھولنے کا حقدار گردانے سے
گئے درجے میں وہی شخص مانا جائے گا جس نے وکالت کی ڈگری
تو لے ہی لی ہو۔ بغیر ڈگری کے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ
قانون کے سلسلے میں کسی کی موشگافیوں کو کسی بھی درجے میں
لائق توجہ ہی سمجھا جائے۔

اب اصل معاملے کی طرف آیئے۔ دین ایک مکمل دستور
ہے اور فقہ ان قوانین کے مجموعے کو کہتے ہیں جو اس دستور کی
بنیاد پر ماہر قانون دانوں نے مرتب کئے ہیں۔ آج ہماری
دنیا میں اگرچہ اسلامی دستور نافذ نہیں اور کسی بھی فعل وعمل کے
جرم ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ ہمارا وہ ملکی دستور کرتا ہے
جس کی بارگاہ میں اسلامی قوانین کی کوئی بھی حیثیت نہیں
لیکن ہم مسلمان چونکہ یہ ایمان رکھتے ہیں کہ سزا و جزا کا سلسلہ
صرف دنیا ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ حساب کتاب اور اجر و
سزا کا اصل مقام تو وہ زندگی ہے جو مرنے کے بعد ملنے والی
ہے لہذا ہمارے لئے یہ جاننے کی ضرورت ہر حال میں باقی
رہتی ہے کہ اسلامی قانون کن افعال واعمال کو جرم وگناہ
قرار دیتا ہے اور کن امور و واقعات کے بارے میں اس کا فیصلہ
کیا ہے۔

جب ضرورت باقی رہی تو فکر و نظر کا وہی زاویہ
استعمال کیجئے جسے دنیا نے متفقہ طور پر معقول قرار دیا ہے۔
یعنی یہ کہ کسی بھی فعل وعمل کی قانونی حیثیت متعین کرنے کا حق صرف
ایسے ہی لوگوں کو حاصل ہو جو قانون و دستور کے مسائل پر گفتگو
کرنے کی کم سے کم ابتدائی اور ضروری شرائط تو پوری کرتے
ہی کرتے ہوں۔ چونکہ اسلامی عدالتیں قائم نہیں ہیں اسلئے
یہ تو سوال اٹھتا ہی نہیں کہ اسلامی قانون پر گفتگو کرنے کیلئے
اسی طرح کوئی ڈگری حکومت کی طرف سے ضروری قرار دی
گئی ہو جس طرح وکلاء کے لئے قرار دی گئی ہے لیکن یہ تو بہرحال
ایک صاف اور سیدھی سی بات ہے کہ جس طرح وکیل بننے کے
لئے کچھ سالوں تک متعلقہ اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں
قانون کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا ناگزیر ہوا کرتا ہے اور کسی
وکیل کو قانونی مباحث میں حصہ لینے کا اہل ہی اسی بنیاد پر
سمجھا جاتا ہے کہ اس نے قانون کو ایک باضابطہ علم کی حیثیت
سے پڑھا اور سمجھا ہے اسی طرح اسلامی قانون میں گفتگو کرنے
اور اس کے اطلاق وتعبیر میں حصہ لینے کے لئے بھی کم سے
کم یہ شرط وقید تو ضروری ہی ہونی چاہئے کہ ایک شخص کچھ
عرصہ باقاعدہ اس کی تعلیم حاصل کرے اور ضابطے کی سند کا
مستحق قرار پائے جو اس بات کا ثبوت ہوا کرتی ہے کہ سند
حاصل کرنے والے نے ان اصول وضوابط اور مبادی ومبانی
کا علم حاصل کر لیا ہے جنہیں جانے اور سمجھے بغیر متعلقہ علم وفن
میں گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کافی علم اور اہلیت کا
ثبوت اگر باضابطہ سند کے بغیر بھی مل جائے تو بے شک سند
کو نظر انداز کرنا ممکن ہے۔ مثلاً ایک شخص سائنسی مسائل پر
عبور رکھنے کی باقاعدہ سند تو نہ پیش کر سکے لیکن عملاً اس کا
حال یہ ہو کہ علوم سائنس جس زبان میں محفوظ ومرتب ہیں
اس پر اسے کامل دسترس حاصل ہو اور اس کی تحریر و
تقریر یا علمی کارناموں سے غیر مبہم طور پر ثابت ہو رہا ہو کہ
اس نے سائنس کے اصول ومبادی، اسالیب، اصطلاحات
اور نکات کا علم حاصل کیا ہے، سائنس دانوں کے افکار و
آراء اس کی نظر میں ہیں اور جس علمی حیثیت کا ثبوت سند
سے ملتا ہے وہ حیثیت اس نے ذاتی مطالعے اور محنت شاقہ
سے حاصل کر ہی لی ہے تو بے شک اسے سائنسی امور ومسائل
میں زبان کھولنے اور اظہار خیال کرنے کا حقدار قرار دیا
جا سکے گا۔

اسی طرح اسلامی قانون کا معاملہ ہے۔ یا تو کوئی شخص
ایک ایسی سند رکھتا ہو جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ اس نے
اس قانون کے اصول ومبادی اور قواعد وضوابط کا
باقاعدہ علم حاصل کیا ہے یا پھر وہ تحریر یا تقریر کا کوئی ایسا
سرمایہ سامنے لا سکے جس سے ثابت ہو جائے کہ وہ اس
قانون کی اصل زبان سے پوری طرح واقف ہے اور اسکے
بارے میں اظہار خیال کرنے کے جملہ شرائط پر پورا اترتا ہے

تب بے شک اس کی بات لائقِ اعتناء ہوگی اور غور کیا
جائے گا کہ اگر کچھ مسائل میں وہ بعض ماہرین قانون کے خلاف
رائے رکھتا ہے تو اس کے دلائل کیا اور کیسے ہیں۔

یہ لمبی تمہید ہم نے اس لئے پیش کی کہ ہماری بد قسمتی
سے آج کل عام طور پر یہی ہو رہا ہے کہ لوگ فاسد نظریات
اور باطل نظامِ حیات کی غالب و مسلط قدروں کے اثر
سے پہلے تو بعض تصورات و عقائد کو دل و دماغ میں جاگزیں
کر لیتے ہیں پھر اسلامی قانون کا کوئی وکیل اگر انھیں متنبہ
کرتا ہے کہ فلاں عقیدہ و تصور اسلامی آئین کی رو سے
جرم و گناہ کے دائرے میں آتا ہے تو وہ ادنیٰ تامل کئے
بغیر کھٹ سے بول اٹھتے ہیں کہ واہ جناب واہ۔ یہ کیا
کہا۔ یہ عقیدہ و تصور تو عینِ ثواب ہے آپ کہاں کی
پرانی منطق لے بیٹھے۔ عصری تقاضوں سے آنکھ بند
کر لینا رجعت پسندی ہے۔ ترقی یافتہ اقدار و نظریات
کو پرانے پیمانوں سے ناپنا خام جہالت ہے وغیرہ۔

یہ اللہ کے بندے اسلامی قانون کے ترجمانوں
پر بے رحمانہ طنز و طعن کرتے ہوئے بالکل نہیں سوچتے کہ
جس طرح کسی سائنس داں یا انجینیر یا بیرسٹر کے فیصلوں
پر ایک راہ چلتے دیہاتی اور ایک بے علم مزدور کا ہنگامہ
اختلاف اٹھانا پرلے سرے کی نامعقولیت کے سوا کچھ
نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اسلامی قانون کے ماہرین کے فیصلوں
پر کسی ایسے شخص کا اختلاف کرنا جس نے اس فن کی ابجد
بھی نہ پڑھی ہو صریح بیہودگی کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔
حال یہ ہوتا ہے کہ اسلامی قانون کے وکلاء سے برملا اختلاف
کرنے والے یہ لوگ شعور کی آنکھیں کھولتے ہوں انگریزی
اسکولوں میں جہاں اسلامی قوانین و احکام کا اگر کچھ
تذکرہ آسکتا ہے تو صرف اس طور پر کہ ان کے بعض
اجزاء کو توڑ مروڑ کر من مانی شکل دی جائے اور دل و
دماغ میں یہ جاگزیں کر دیا جائے کہ تہذیب، ترقی اور
شائستگی نام ہے صرف ان افکار و اعمال کا جن پر دورِ
حاضر کی بنیاد اٹھی ہے۔ اسلام بھی اسی کا مؤید ہے اور
مولوی لوگ جس چیز کو اسلام کہتے ہیں وہ تو ہفوات و توہمات
کا مجموعہ ہے!

تربیت ہوتی ہے ان کی اس ماحول میں جہاں
اسلام دشمن قدریں ہی زندگی کی اصل قدریں تسلیم کی جاتی
ہیں اور اسلامی آئیڈیالوجی کے لئے دل و دماغ کے کسی
خانے میں کوئی جگہ باقی نہیں رہنے دی جاتی۔

گویا اسلامی قانون کی ضروری واقفیت اور اس کے
علمی و فنی معانی کا علم تو کجا یہاں سرے سے جہل ہی جہل
کی کارفرمائی ہوتی ہے اور اس جہل پر ملمع چڑھا ہوتا ہے
اسلامی افکار و نظریات سے عناد اور نفرت کا یہی وجہ
ہے کہ یہ لوگ اسلامی قانون کی اتنی بھی اہمیت اور حیثیت
نہیں سمجھتے جتنی کمھار اور بڑھئی اور جفت ساز کے فن کی
ہوتی ہے۔ مٹی کے برتن اور چمڑے کے جوتے بنانے کی
صنعتوں میں بھی وہی لوگ رائے زنی کے اہل سمجھے جاتے
ہیں جنھیں ان صنعتوں میں کم سے کم ابتدائی واقفیت تو
ضرور ہی حاصل ہو، لیکن اکیلا قانونِ اسلامی ہی ان حضرات
کی نظر میں وہ بے وقعت شے بن کر رہ گیا ہے کہ جس پر رائے
زنی کرنے اور جس کے ماہرین و ائمہ کو للکارنے کے لئے نہ
کسی علم و خبر کی ضرورت ہوتی ہے نہ کسی اصول اور ضابطے
کی۔ جس کا جی چاہے اسلامی قانون کے بڑے سے بڑے
ماہر اور وکیل کے فیصلے کو ـــ بلکہ وکلاء کے متفقہ فیصلے کو
غلط قرار دیدے چاہے خود اس کی اپنی قابلیت قانونِ
اسلامی کے باب میں صفر ہی کے درجے میں کیوں نہ ہو۔

آنجناب برا نہ مانیں۔ یہ دل کا بخار آپ پر نہیں نکالا۔
آپ تو فقط غیر شعوری طور پر فسادِ نظر کا شکار ہوئے ہیں۔
بڑی تعداد تو اب عرب و عجم میں ایسے ہی فتنہ طرازوں کی ہے
جو پورے عزم اور شعور کے ساتھ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ اسلامی
احکام و ہدایات کی ترجمانی اور نمائندگی کا حق ان لوگوں سے
چھین لیا جائے جو عالم بھی ہیں اور اسلام کے وفادار بھی۔

اور ان لوگوں کو دیدیا جائے جو قرآن و سنت کی حقیقی تعلیمات سے نہ صرف جاہل ہیں بلکہ مخالف اور شر انگیز تعلیم نے انکے اندر اسلامی اقدار و نظریات اور افکار و اعمال سے شدید بیزاری پیدا کر دی ہے۔ افسوس شیطان کی ذریت کے انہدام اسلام کی اس ناپاک کوشش میں خاصی کامیابی ہوئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بے شمار وہ مسلمان بھی جو اسلام سے بغاوت کی کوئی نیت نہیں رکھتے بے شعوری کے عالم میں اپنی حیثیت اور علماء و فقہاء کے مقام کو بھول محض عقل نفسانی کے سہارے فقہ میں موشگافیاں کرتے ہیں حالاں کہ دنیا کے ہر قانون سے زیادہ اللہ کا قانون اس کا مستحق تھا کہ اس پر زبان کھولنے سے پہلے اپنی اہلیت، اپنے علم و فہم اور اپنے مقام و منصب کا اچھی طرح جائزہ لے لیا جائے۔

آپ اگر اپنے شبہات و اعتراضات ایک طالب علم اور ایک متلاشی حق سائل کی طرح پیش کرتے تو یہ تمہید کبھی ہمارے قلم سے نہ نکلتی لیکن آپ سوال اور تحقیق نہیں کر رہے ہیں بلکہ شد و مد کے ساتھ دو ٹوک فیصلہ دے رہے ہیں آپ کا انداز ایسا ہے جیسے اسلام کے فلسفۂ قانون، اس کے حرکت و عمل کے طریق، اس کے اصول و فروع اور مناہج و مدارک سے آپ اچھی طرح بہرہ ور ہوں اور جس مسئلے پر آپ اسلامی قانون کو استعمال کر رہے ہیں۔ یعنی زندگی کا بیمہ اس کی حقیقت اور جملہ تفصیلات سے بھی کما حقہ باخبر ہوں لیکن گستاخی معاف ہمارا خیال یہ ہے کہ آپ ان دونوں میں سے کسی ایک سے بھی کامل واقفیت نہیں رکھتے۔ یہ خیال بے دلیل قائم نہیں کر لیا گیا۔ آپ کے مکتوب کی انشاء زبان کے علمی معیار، اسلوبِ اظہار اور طریق استدلال سے بلا ریب و شک عیاں ہے کہ اسلامی قانون کی فنی اور معیاری بصیرت تو کجا مبتدیانہ اور مقلدانہ واقفیت بھی آپ کو حاصل نہیں اور بیمے سے متعلق جن جزئیات تک آپ کا مکتوب محدود ہے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ معتد بہ طور پر آپ بیمے کو بھی نہیں جانتے کہ وہ اپنی جملہ شرائط و اوصاف سمیت ہے کیا چیز۔

رنج زیادہ اس پر ہوا کہ ہم نے جو علماء کے نقد کا حوالہ دیا تھا اس پر آپ نے ایسا ریمارک دیا ہے گویا علماء کے نقد و نظر کو اسلامی قانون کے باب میں کوئی مقام ہی حاصل نہیں حالانکہ کسی بھی قانون کی بحث میں اس کے مستند ماہروں اور استادوں کا حوالہ بڑی ہی اہمیت رکھتا ہے اور سوائے بجائے اسلام کے دنیا کے ہر مسئلے اور قانون میں آپ جیسے معقول حضرات اس اہمیت کو تسلیم بھی کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمیں کوئی شکایت نہ ہوتی اگر ہمارے کسی فیصلے یا رائے کو کوئی ایسا شخص چیلنج کرتا جس نے عمرِ عزیز کا کچھ حصہ متعلقہ موضوع کو سمجھنے اور اس کے اصول و مبادی تک پہنچنے میں صرف کیا ہوتا۔ لیکن جب کہ آپ کی تحریر اس نتیجے پر پہنچاتی ہے جس کا ہم نے اظہار کیا تو پھر اس کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ ایک متلاشیِ حق طالب علم کی بجائے ایک امامِ فن اور قائد کے انداز کی گفتگو کرنے کا حق ہم آپ کے لئے مان لیں۔

اب اپنے فرمودات کا راست جواب بھی سن لیجئے۔

قارئین اگر جواب کے ہر نمبر کے ساتھ مکتوب کا یہی نمبر دوبارہ پڑھتے جائیں گے تو بات سمجھنے میں آسانی رہے گی۔

آپ کی مجموعی بحث کا واضح نقص یہ ہے کہ آپ نے بیمے کی پوری حقیقت کو ایک غیر جامع اور ادھورے اختصار کیساتھ بایں طور بیان فرمایا ہے کہ اس کے قابل اعتراض پہلو دب کر رہ گئے ہیں۔ بیمہ آج ایک منظم اور مربوط کاروبار ہے۔ اس کے مفصل قواعد و ضوابط ہیں اور اس کا پورا سسٹم کچھ فکری بنیادیں رکھتا ہے۔ اس کے چند موٹے موٹے اجزا کو لیکر حلال و حرام کے دو ٹوک فیصلے دینا اس حد تک بچکانہ ہے کہ علم و متانت کے لحاظ سے اسے قابلِ التفات تک نہیں سمجھا جا سکتا۔

یہ دعویٰ تو ہم بھی نہیں کر سکتے کہ بیمے اور اس کی تمام اقسام کے بارے میں خود ہمیں بھی جامع معلومات حاصل ہیں۔ بیمے کی اپنی ذیلی تفصیلات کے اعتبار سے متعدد قسمیں ہیں اور مختلف بیمہ کمپنیوں کے قواعد و شرائط میں ایک ہی قسم [illegible] قواعد بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ ہمیں اچھی طرح

قانون کے دیانت دار ماہرین جس چیز پر "قمار" کا اطلاق کرتے ہیں وہ بیمے کی ہر قسم میں یکساں طور پر موجود ہے اور صرف قمار ہی نہیں سود کے عنصر سے بھی بیمے کا کوئی سسٹم مبرّا نہیں ہے تفصیلات میں جانے سے پہلے ایک بنیادی نکتے پر نظر ڈالتے چلئے۔ کون نہیں جانتا کہ بیمہ سسٹم ایک نیا سسٹم ہے جس کا کوئی وجود اب سے چند سو سال قبل نہیں تھا۔ بہت تجسس کیجئے تو اسکے آغاز کو آپ سولھویں صدی عیسوی تک کھینچ لے جا سکتے ہیں حالانکہ صحیح تر یہ ہے کہ سترھویں صدی عیسوی سے قبل یہ اپنی کسی ابتدائی شکل میں بھی موجود نہیں تھا۔ تاہم یہ مان بھی لیا جائے کہ اس کی عمر تین سو سال سے کچھ سوا ہی ہے اور یہ بھی مان لیا جائے کہ اس کی بنیاد کاروباری کم اور اخلاقی زیادہ ہے تب بھی یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اسے فنی خطوط پر منظم کرکے ایک مستقل سسٹم اور باضابطہ کاروبار کی شکل دینے کا سہرا انھی لوگوں کے سر ہے جنھوں نے آج کے پورے معاشی نظام کی عمارت کھڑی کی ہے۔ اس عمارت کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ اس کی ایک ایک اینٹ جس مسالے سے جڑی ہوتی ہے اس کی تیاری میں سود ایک ناگزیر جز کی حیثیت رکھتا ہے اور معماروں کے جو وارث آج اس عمارت پر مکمل طور سے قابض ہیں اور اس میں ترمیم و تعمیر، توسیع اور آرائش کا پورا اختیار رکھتے ہیں وہ وہی ہیں جن کے یہاں سود کا درجہ شیرِ مادر سے کم نہیں اور جن کے نزدیک قمار یا زنا یا شراب خوری کی اگر کچھ قسمیں جرم و عیب بھی ہیں تو ان وجوہ سے نہیں . . . . جن وجوہ سے اسلامی قانون ان چیزوں کی تمام ہی اقسام کو جرم و گناہ قرار دیتا ہے لہٰذا ذہنیت کے اس کھلے فرق اور طرزِ فکر کے اس بدیہی تفاوت کی بناء پر کسی بھی خدا ترس مسلمان کے لئے اس طرزِ عمل کا کوئی جواز نہیں ہے کہ وہ ان لوگوں کے رائج کردہ کسی کاروباری سسٹم کے صرف چند ظاہر فریب اجزا پر یہ جھ کر یہ فیصلہ کر دے کہ اس پورے سسٹم میں کوئی چیز اسلامی قانون سے ٹکرانے والی نہیں ہے۔ اس کا تو قدرتی فریضہ یہ ہونا چاہئے کہ اس کے بارے میں اسلامی قوانین کے مستند ماہرین سے استصواب کرے اور اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ ماہرین اس جدید سسٹم کی حقیقت سے کامل طور پر واقف نہیں ہیں لہٰذا اس پر اسلامی قانون کا ٹھیک ٹھیک انطباق بھی نہیں کر سکیں گے تو خود اسی کا فریضہ یہ بھی ہے کہ پوری حقیقت کو کھول کر ان کے سامنے رکھے تاکہ وہ جچا تلا فیصلہ دے سکیں۔

اور اگر کسی کے پاس تحقیقِ حق کا یہ مرحلہ طے کرنے کے لئے وقت یا دماغ نہیں ہے تو پھر سلامتی کا راستہ یہ ہے کہ تامّل سے کام لے اور برضا و رغبت اس سسٹم سے رابطہ نہ جوڑے کیونکہ جو لوگ سود کو اپنے معاشی نظام کی شہ رگ بنا چکے ہیں اور قمار یا بیع فاسد کی کوئی بھی بد سے بدتر قسم ان کے لئے کوئی اخلاقی قباحت نہیں رکھتی ان کے کسی بھی کاروباری سسٹم کا کسی نہ کسی مرحلے میں سود اور قمار سے ملوث ہونا اتنا ہی قرینِ قیاس ہے جتنا مرد و زن کے اختلاط کے نتیجے میں اولاد کا پیدا ہونا۔

سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ نفع چاہے بعض حالتوں میں بیمہ داروں کو رہے یا بعض حالتوں میں بیمہ کمپنیوں کو لیکن آخر یہ نفع کمایا کس چیز سے گیا ہے؟ کیا کوئی چیز فروخت ہوئی؟ کیا کوئی صنعتی اشتراک ہوا؟ کیا کسی جائداد نے کرایہ پیدا کیا؟

کچھ بھی نہیں صرف پیسے کا لین دین۔ جس طرح دو جواری باہمی معاہدے کے تحت پیسہ اچھال کر چت اور پٹ پر بازی لگاتے ہیں اور درمیان میں کوئی بھی کاروباری معاملہ موجود نہیں ہوتا اسی طرح بیمۂ زندگی کا کاروبار ایک ایسا کاروبار ہے جس میں حقیقی کاروباری عنصر کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ فرق ہے تو صرف اجمال اور تفصیل کا۔ یا یوں کہئے کہ پیسہ تو غیر مہذب جواری اچھالتے ہیں لیکن بیمے کا کاروبار چلانے والے مہذب ہیں، تعلیم یافتہ ہیں، ہر غلاظت کو خوشنما اور ہر برائی کو شائستہ بنانے کا فن انھوں نے بڑی محنت سے سیکھا ہے۔

بظاہر یہ بڑی اچھی بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک بیمہ دار

مدتِ معینہ سے قبل مرجائے تو اس کے پس ماندگان کو بیمہ کمپنی سے اچھی خاصی رقم مل جاتے۔ کچھ لوگ اس "مدد" کو اخلاقی رنگ بھی دیتے ہیں لیکن یہ فقط ایک مغالطہ ہے۔ کسی بھی مالی امداد کو اخلاقیات سے جوڑنے کا انحصار اُن افراد کی احتیاج پر ہے جنھیں امداد دی جارہی ہے۔ ایک بھوکے کو آپ روٹی دیں گے تو یہ یقیناً ایک اخلاقی فعل ہوگا لیکن اگر آپ مجبور کردیئے جائیں کہ ہر آوازلگانے والے کو روٹی دیں خواہ وہ سیٹھ ہی کیوں نہ ہو تو آپ کی مجبوری کا حسن اخلاق سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ حتیٰ کہ جس وقت آپ ایک حقیقی محتاج اور فاقہ کش کے ہاتھ پر روٹی رکھ رہے ہوں گے اس وقت بھی اس فعل کا رشتہ اخلاق سے نہ ہوگا۔ کیونکہ آپ تو پابند ہیں کہ ہر سائل کو روٹی دیں۔ یہ فعل اُس جذبے کا مظہر نہیں جو اخلاق کی بنیاد ہے۔

بس اسی طرح بیمہ کمپنیاں معاہدے کی رو سے پابند ہوجاتی ہیں کہ بیمہ دار کی قبل از وقت موت پر اس کے پسماندگان کو طے شدہ رقم ادا کریں خواہ یہ پس ماندگان مفلس ہوں یا کروڑپتی۔ محتاج ہوں یا غنی۔ جس وقت وہ کسی ضرورتمند وارث کو معاہدے کی رقم ادا کر رہے ہوتے ہیں اس وقت بھی ان کا ذہن ـــــ اور احساسات بعینہٖ وہی ہوتے ہیں جو کسی انتہائی دولت مند وارث کو ادائگی کرتے ہوئے ہوسکتے ہیں ـــ پھر بھلا اخلاقیات کا سوال بیچ میں کہاں سے آگیا۔ تاہم "اخلاقی" حیثیت کو کسی درجے میں تسلیم ہی کرلیں تب بھی یہ سوال جوں کا توں رہتا ہے کہ مرنے والے کے پس ماندگان کے حصے میں اُس سے کہیں زائد رقم کیونکر آگئی جتنی بیمہ کرانیوالا پریمیم کی شکل میں بیمہ کمپنی کے پاس جمع کرگیا تھا۔ جواب صرف ایک ہے اور اسی پر آپ زور دے رہے ہیں کہ اس نفع کا ذریعہ وہ باہمی معاہدہ ہے جو بیمہ کمپنی اور مرنے والے کے درمیان برضا و رغبت ہوا تھا۔ مگر جناب یہ تو سوچیں کہ فقط معاہدہ ـــ خواہ وہ کتنی ہی خوشی اور رغبت کے ساتھ کیوں نہ ہو حلّت و حرمت کا مدار نہیں ہوا کرتا۔ چوری بالکل رضا و رغبت اور مکمل آمادگی کے ساتھ حبیت ہار کی شرطوں اور قاعدوں پر اتفاق کرتے ہیں۔ زنا بھی بارہا کامل تراضی اور فریقین کی رضا و رغبت سے ہوتے ہیں۔ رشوت ستانیوں میں بھی بسا اوقات فریقین کی رضا موجود ہوتی ہے سودی لین دین آج کل اکثر و بیشتر اسی رضا و رغبت کی اسپرٹ میں ہو رہا ہے۔ تو کیا یہ سب چیزیں جائز ٹھیرنی چاہئیں؟

پھر ایک واضح قباحت یہ بھی ہے کہ معاہدے کی رقم کے حقدار ہر حالت میں صرف ورثاء ہی نہیں ہوتے بلکہ بیمہ دار نے اپنی زندگی میں جسے بھی نامزد کردیا ہے وہی اس رقم کا مالک بنے گا۔ چاہے اسے اسلامی قانون کی رو سے کوئی وراثت نہ پہنچتی ہو۔ یہ اسلام کے محکم قانون وراثت پر ایک ضرب ہے۔ کچھ پُرجوش لوگ اسے "وصیت" کا نام دیکر اعتراض دفع کرنیکی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ کوشش مشکور نہیں کیونکہ وصیت زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال میں نافذ ہوسکتی ہے۔ اسلامی قانون کے معتبر ماہرین اس پر متفق ہیں کہ ایک تہائی مال سے زیادہ پر وصیت کا اثر قبول نہیں ہوگا مگر بیمے کا قاعدہ یہ ہے کہ بیمہ دار اگر اپنے ورثاء کے بجائے کسی بالکل غیر فرد یا افراد کو نامزد کرجاتا ہے تو معاہدے کی تمام رقم نامزدوں ہی کی ملکیت ہوگی چاہے حقیقی ورثاء کیلئے مرنے والے کا مالِ متروکہ پھوٹی کوڑی کے سوا کچھ نہ ہو۔

اعداد و شمار کے ذریعے تخمینہ نکالنے کی جس منطق کا آپنے حوالہ دیا ہے اس کے بارے میں غور فرمائیے کہ اولاً تو وہ ایک فریب نظر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مجموعی اعداد و شمار کے ذریعے تخمینے نکال کر جو بے رحم مذاق آج کے مدعیانِ علم و فہم مخلوقِ خدا کے ساتھ کر رہے ہیں وہ لطیفے کی نوع کا ہے۔

دس آدمیوں کے گھر میں سو روپے آئے۔ اب چاہیے ایک آدمی نے نوّے رکھ لئے اور دو نے پانچ پانچ بانٹ لئے

باقی ساہت منہ تکتے رہ گئے مگر اعداد و شمار کی رائج منطق کہتی ہے کہ اس گھر کی آمدنی فی کس دس روپے ہے۔ اسی طرح ایک آدمی نوّے برس کی عمر میں مرا اور دوسرا آدمی تیسویں سال مرگیا۔ اب اعداد و شمار کا نوزائیدہ فن فیصلہ دیتا ہے کہ ان دونوں مرحوموں کے درمیان اوسطِ عمر ساٹھ سال رہا! — فرضی اعتبار سے یہ حساب بےشک ٹھیک ہے لیکن حقیقت کی بارگاہ میں اس کا آخر کیا مقام ہے؟

کسی بھی ملک کا اوسطِ عمر اسی طرح نکال لیا جائے تو کیا زید یا عمر یا کسی بھی متعین فرد کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ یہ اسی اوسط کو پورا کر کے مرے گا۔ علاوہ ازیں کیا مہلک حادثے دن رات پیش نہیں آتے؟ اس دورِ ترقی میں تو خاص طور پر آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ صرف موٹروں، بسوں، ٹرکوں، ریلوں اور جہازوں ہی کے دم قدم سے روزانہ کتنے ہی ایسے لوگ راہیِ عدم ہو جاتے ہیں جن کا "اوسطِ عمر" ابھی کوسوں دور پڑا تھا۔ پھر اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ ایک قطعاً ناقابلِ اعتبار اندازے اور سراسر مبہم شے پر بیمے کا سارا کاروبار استوار کرلیا گیا۔ یہ ابہام ہی قمار کی بنیاد ہے۔ قمار اسی کا تو نام ہے کہ نفع اور نقصان کا مدار کسی مبہم اور غیر معین شے پر ہو۔

پھر چلیے تخمینے کی کوئی حیثیت ہی مان لی جائے تو کیا آپ اس سے انکار کریں گے کہ تخمینے تو اکثر جووں میں بھی لگائے جاتے ہیں۔ کارنوال کے نشانہ بازی والے جوے میں ایک اچھے نشانہ باز کا جیت والے مقام پر نشانہ مار دینا اس سے زیادہ متوقع اور قرینِ قیاس ہے جتنا کسی شخص کے بارے میں یہ امید لگانا کہ وہ اتنے سال سے پہلے نہیں مریگا اسی طرح تاش اور ریس اور دوسرے جووں میں کار دگر قسم کے جواری عموماً بڑے چچے تلے اندازے لگا لیتے ہیں تو کیا فقط اتنی سی بات کسی جوے کو حلال قرار دیدے گی کہ بعض لوگ اپنی مہارت اور کاریگری کے ذریعہ نسبتاً بہتر اور درست تخمینے لگانے کے اہل ہوگئے ہیں؟

آپ نے خود واضح فرمایا کہ زندہ اشخاص کی بیمہ کی رقم سے فوت شدہ افراد کی رقوم معاہدہ بھی ادا کی جاتی ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ بعض زندہ حضرات کے جمع کردہ پیسے کا ان مُردہ حضرات کے نامزدوں یا وارثوں کو منتقل کرنا جن کا کوئی بھی رشتہ ان زندوں سے نہیں تھا اسلامی قانون کی کس دفعہ کے تحت "دیانت" قرار پاتا ہے سوائے اس کے کہ باہمی معاہدے کو دلیلِ دیانت مان لیا جائے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا فقط معاہدہ اور فریقین کی رضامندی ہی اسلامی قانون میں دلیلِ انصاف نہیں مانی گئی جب تک کہ معاہدے کی بنیاد اور حدود بھی قانون سے ہم آہنگ نہ ہوں۔

آگے آپ نے نمبر دیکر کچھ نکات پیش فرمائے ہیں ہم بھی نمبر لگاکر اسی ترتیب سے اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

(۱) آپ کہتے ہیں قمار میں کامیابی بالکل غیر یقینی ہے ہم کہتے ہیں بےشک غیر یقینی ہے لیکن اس سے زیادہ غیر یقینی نہیں جتنی خود بیمے میں غیر یقینی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ پریمیم کی رقم معقول طور پر ادا کی جاتی رہے تو بیمہ شدہ رقم ہر حال میں مل کر رہے گی۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ تاش پر قمار بازی کرنے والا جواری اگر پتے لگانے کے فن میں ماہر ہے یا پتوں کی پشت پر مخفی علامات بنانے میں اس نے دستگاہ حاصل کی ہے۔ یا نشانہ بازی والے جوے میں ایک شخص نشانے بازی کی بہترین مہارت کو کام میں لانے کا اہل ہے۔ یا شطرنج کا کھلاڑی اپنے فن میں طاق ہوچکا ہے تو اس کا ہمیشہ یا اکثر حالتوں میں جیتنا ایسا ہی یقینی ہے جیسی یہ بات کہ آج ہم نے پریمیم کی جو رقم قسط وار ادا کرتے رہنے کا معاہدہ کیا ہے اس کی ادائیگی پر ہم مدتِ معاہدہ کے اختتام تک برابر قادر رہے جائیں گے۔ مستقبل پر کسی کا بس نہیں بےشک آدمی اپنی اوقات، اپنے وسائل اور اپنی آمدنی کا اندازہ کر کے ہی پریمیم کی رقم کا تعین کرتا ہے اور اکثر حالتوں میں یہ اندازہ غلط بھی نہیں ہوتا لیکن بعض حالتوں میں یہ یقینی غلط بھی ہو جاتا ہے اور مستقبل کے اندھیروں میں چھپے ہوئے

حوادث بہر حال اس انداز سے کے لئے ایک مستقل خطرہ ہیں جو بارہا آدمی کو ایسے حالات سے دوچار کر دیتے ہیں جنکا بعید ترین تصور بھی وہ بحالت موجودہ نہیں کر سکتا۔ اس کا مطلب صاف طور پر یہی ہوا کہ باقاعدہ ادائگی کرتے رہنے کی جس قید پر نفع کا انحصار ہے وہی انسانی علم و اختیار سے باہر کی شے ہے اور جتنا وثوق مذکورہ فنکار قمار بازوں کی جیت پر کیا جا سکتا ہے اس سے کم ہی وثوق اس پر ہو سکتا ہے۔ پھر جس صورت میں کہ پریمیم کی رقم حسب معاہدہ باقاعدگی سے ادا نہ ہو سکے تو اس صورت میں جو نقصان بیمہ دار کو پہنچے گا اس میں اور جوے کی ہار یا سودی قرضے کے نقصان میں کیا جوہری فرق رہا؟ سودی قرضے میں یہی تو ہوتا ہے کہ آپ معینہ وقت پر ادا نہ کر سکیں تو نقصان بڑھ جائے گا اور دیر کریں گے تو اور بڑھ جائے گا۔

ہم نے کہا تھا کہ بیمۂ زندگی کے معاملے میں سوجھ بوجھ اور فکر و تدبر کا کوئی دخل نہیں۔ اس کا تعلق قدرتاً اس شے سے تھا جس پر اس کاروبار کے نفع اور نقصان کا مدار ہے۔ یعنی انسانی زندگی۔ کون شخص اب سے دس سال بعد تو کجا۔۔۔ صرف ایک سال بعد تک زندہ رہ سکے گا اس کا فیصلہ فکر و تدبر اور علم الحساب کی کوئی قسم بھی نہیں کر سکتی۔ اور اسلام کی آئیڈیالوجی تو قطعی طور پر ایسی فیصلہ آرائیوں کی متحمل ہی نہیں۔ مگر آنجناب نے ہماری بات کو اسکے صحیح رُخ سے ہٹا کر اس فکر و تدبر اور جہد و کاوش کی طرف منتقل کر دیا جو پریمیم کی شرح معین کرنے میں برتی جاتی ہے۔ مہربان یوں تو دنیا کی کونسی برائی ایسی ہے جس میں سوجھ بوجھ اور فنکاری کی ضرورت نہ ہو۔ سود کا ہمہ گیر کاروبار کیا دنیا میں اعلیٰ درجے کی فنی صلاحیتوں کے ساتھ نہیں چل رہا؟ سود در سود کے حساب میں تو اور بھی محنت شاقہ اور حساب دانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ چوری، رشوت ستانی، قتل، عیاشی آخر کونسی برائی ہے جس کے سلسلے میں بعض اوقات بڑی بڑی فکری صلاحیتیں اور فنی استعداد صرف نہیں کی جاتیں۔ پھر کیا یہ سب حلال مان لی جائیں؟

خوب سمجھ لیجئے۔ زندگی کے بیمے میں نفع اور نقصان کا تمام تر دار و مدار دو چیزوں پر ہے۔ اولاً اس پر کہ بیمہ دار کب تک زندہ رہتا ہے ثانیاً اس پر کہ وہ پریمیم کے پیسے کہاں تک باقاعدگی سے جمع کرا سکتا ہے۔ یہ دونوں ہی چیزیں مستقبل سے متعلق ہیں۔ بہت کہہ لیجئے تو یہ کہہ لیجئے کہ دوسری بات میں شک اور بے یقینی کا عنصر کم ہے، لیکن پہلی بات میں تو کوئی بھی جانب راجح اور غالب نہیں۔ ہم کتنا ہی زور لگالیں لیکن ہمارے اس دعوے میں کہ زید اگلے ایک سال تک زندہ رہے گا کسی منطق سے بھی یقین کا اثبات نہیں کیا جا سکتا۔ اگر زندہ رہ گیا تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے ایک جواری پیسہ اُچھالنے کے کھیل میں چت طلب کرتا ہے اور اتفاق سے پیسہ چت ہی گر جاتا ہے۔ حالانکہ اس کا پٹ گرنا بھی اتنا ہی ممکن تھا جتنا زید کا کل مر جانا۔ پھر بھلا وہ معاملہ اسلامی قانون کی نظر میں قمار کے سوا کیا ٹھیرے گا جس کا مدار متذکرہ دونوں چیزوں پر ہو۔ اب اس قمار کو اپنے حق میں زیادہ مفید بنانے یا اس میں عوام کے لئے جاذبیت پیدا کرنے کی خاطر بیمہ کمپنیاں جتنا چاہے فکر و فن، علم و ذہانت اور جہد و کاوش صرف کریں اس کی حیثیت وہی ہوگی جو کسی جوے خانے کو زیادہ سے زیادہ نفع بخش اور مقبول بنانے کی خاطر استعمال کئے ہوئے فکر و فن کی ہو سکتی ہے۔

(۲) یہ کم و بیش ویسا ہی اندازِ فکر ہے جس نے کفارِ عرب سے یہ کہلوایا تھا کہ اِنَّمَا الۡبَیۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا (بیع بھی تو سود ہی جیسی ہے) آگے اس پہلو پر ہم تفصیلاً گفتگو کریں گے۔ یہاں تو فقط اتنا ہی سُن لیجئے کہ بیمے کے معاملے میں یقینی طور پر نفع ملنے کا دعویٰ اولاً تو غلط ہے۔ آپ کو شاید یہ علم نہیں کہ جو لوگ مدتِ مقررہ سے قبل مر جاتے ہیں۔۔۔ اور کچھ لوگ ضرور مرتے ہیں ان کے ورثاء کو ادا کئے جانے والے تاوان کی رقمیں بیمہ کمپنیاں اپنی گرہ سے ادا نہیں کرتیں بلکہ دو طرح سے انھیں بیمہ داروں ہی سے وصول کرنے کا ڈھنگ نکالا گیا ہے یا تو اس طرح کہ بیمہ داروں کی

مجموعی رقم میں سے اسے وضع کرلیا جائے یا اس طرح کہ نقصان کا اوسط لگا کر پہلے ہی سے ان تمام بیمہ داروں پر کچھ فیصد زائد ادائگی لازم قرار دیدی جائے۔ عام رواج موخرالذکر کا ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں نقصان ظاہر ہے اور نفع موہوم۔ نفع تو بس اس اتفاق پر معلق ہے کہ بیمہ دار مدتِ معاہدہ سے قبل مرجائے۔

لیکن یہ دعویٰ درست ہی فرض کرلیا جائے کہ نفع ملتا ہی ملتا ہے تو یہ حلت سے زیادہ حرمت پر دلالت کریگا کیونکہ نفع لازماً ملنا اور نقصان میں شرکت نہ ہونا سودی کاروبار کی خاصیت ہے نہ کہ مباح تجارت کی۔ پھر یہ بھی سوچئے کہ بیمے دار کے قبل از وقت مرجانے کی صورت میں اس کی جمع کردہ رقم سے کہیں زیادہ رقم جو ورثاء کو ملتی ہے وہ بس اسی کا نتیجہ تو ہے کہ ایک بازی لگائی گئی تھی جسمیں مرنے والے کو جیت ہوئی۔ جیسے کوئی شخص لاٹری کا ٹکٹ خرید کر مرجائے اور اسی ٹکٹ کا انعام ورثاء حاصل کرلیں۔

(۳) موت بحیثیت واقعے کے تو بے شک یقینی ہے لیکن وہ کب آئے گی اس سے زیادہ غیر یقینی اور نامعلوم شے کوئی نہیں۔ اگر قرآن کی یہ تعلیم ذہن سے اوجھل ہو جائے کہ کوئی بھی متنفس اپنی موت کا وقت اور مقام نہیں جانتا تو یہ تو بہر حال آپ دن رات دیکھ رہے ہیں کہ ایک اچھا خاصا آدمی یکلخت ہارٹ فیلیور کا شکار ہو جاتا ہے یا پچاس آدمی اچانک ہوائی جہاز کے حادثے میں ختم ہو جاتے ہیں حالانکہ کچھ دیر قبل وہ اتنے صحت مند تھے کہ مادی تخمینوں کے اعتبار سے انھیں ابھی بیس سال تک زندہ رہنا چاہئے تھا

آپ پیسہ اچھالتے رہئے۔ قطعی طور پر یقینی ہے کہ وہ ہمیشہ ایک رخ نہیں کرے گا بلکہ چت اور پٹ دونوں آئینگے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کس مرتبہ چت کرے گا اور کس مرتبہ پٹ۔ اسی طرح موت تو ایک نہ ایک دن ضرور ہی آنی ہے مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کل نہیں آئے گی یا پرسوں ضرور آئے گی۔ آپ جو یہ فرما رہے ہیں کہ موت نامعلوم حادثہ نہیں اسے تو بہر حال آنا ہی ہے اس کا کچھ فائدہ اس وقت تو تھا

جب بیمے کا معاہدہ مجرد اس بات پر استوار ہوتا کہ موت آئیگی یا نہیں آئے گی۔ مگر یہ معاملہ مدت اور وقت پر منحصر ہے۔ لین دین اور نفع و نقصان کا سارا چکر اس تخمینے پر گھومتا ہے کہ فلاں وقت تک موت آئے گی یا نہیں آئے گی۔ ذرا بتایئے تو اس سے زیادہ غیر یقینی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ نامعلوم حوادث کا مفہوم یہ ہے کہ "ایسا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی" — تو کیا موت کا معاملہ بھی ٹھیک یہی نہیں کہ ہم اور آپ کل مر بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی؟

ذاتی جدوجہد کا جو اثبات آپ نے کیا ہے وہ لطیفے کی نوع کا ہے۔ سوال تو یہ تھا کہ قبل از وقت مرجانے پر جو مالی نفع مرنے والے کو پہنچتا ہے اس کے حصول میں اس نے سوائے بازی لگانے کے اور کیا کیا۔ آپ ثابت یہ فرما رہے ہیں کہ بازی لگانے کے لئے جو روپیہ وہ لاتا رہا ہے وہ تو بہر حال جدوجہد سے حاصل ہوا ہے۔ تو بھائی کیا جواری لوگ بازی لگانے کے لئے روپیہ ہمیشہ بلا محنت لے آتے ہیں۔ کیا جیت ہار کے ایسے کھیل کو آپ جوا نہیں کہیں گے جس میں کوئی فریق اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی لگا رہا ہو۔ ہر شخص جانتا ہے کہ داؤ پر لگائے جانے والا پیسہ چاہے کتنی ہی جدوجہد سے کمایا جائے لیکن داؤ کے نتیجے میں جیت ہار فقط چانس اور بخت و اتفاق ہی کہلائے گی اور اس جدوجہد کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جائے گا کہ خود جوے کی کمائی محنت کی کمائی ہے۔

زمیندار کی مالگذاری کے بارے میں ہم بہت سیدھا سا جواب یہ دیں گے کہ ہم مسلمان ہیں اور ہمارے لئے حلال و حرام کا فیصلہ اللہ کا قانون کرتا ہے۔ اللہ نے یہ بتایا ہے کہ زمین کی خرید و فروخت اور انفرادی ملکیت درست ہے اور مالک کیلئے اپنی زمین کو بیچنا یا کرایہ پر دینا بھی درست ہے۔ کرایہ نقد ہو یا جنس کی شکل میں ہر دو نوں باتیں حلال ہیں بشرطیکہ شریعت کی متعلقہ قیود و حدود کو ملحوظ رکھا جائے۔

آپ کو شاید یہ غلط فہمی ہوگئی کہ ہم کسی بھی قسم کے نفع کو بغیر جدوجہد کے جائز نہیں سمجھتے۔ یہ درست نہیں۔ بہت سے منافع ایسے ہیں جو بغیر ذاتی جدوجہد کے انسان کو حاصل ہوتے ہیں

ورثہ اللہ کے قانون میں حلال ہیں جیسے مالِ وراثت یا جائداد کے کرائے۔ لیکن جن معاملات میں نفع اور نقصان کا سارا کھیل صرف پیسے کے لین دین پر ہو اور کوئی شے نہ بیچی جارہی ہو نہ کرائے پر دی جارہی ہو وہاں انسانی جدوجہد ہی ایک ایسا عنصر ہو سکتی ہے جو حاصل ہونے والے نفع کو "جواز" کا پہلو عطا کر سکے۔ لیکن جدوجہد کا سرے سے وجود ہی نہ ہو تو پھر آخر نفع اور نقصان کو قمار کے سوا کس چیز سے منسوب کر سکیں گے کیا آپ نہیں دیکھتے کہ قرآن میں ہے لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (یعنی انسان کے نصیب میں صرف وہی ہے جس کے لئے اس نے کوشش کی) اور اسی قرآن میں وراثت کا بھی مفصّل قانون موجود ہے جس میں کچھ لوگ بلا کسی سعی و کوشش کے دولت حاصل کر لیتے ہیں تو بظاہر متضاد ہونے کے باوجود ان دونوں باتوں میں اپنے اپنے دائروں اور حدود کے اعتبار سے کوئی تضاد نہیں۔ اسی طرح ہماری اس بات میں کوئی تضاد نہیں کہ بعض معاملات میں جواز کا مدار جدوجہد پر نہیں ہوتا اور بعض میں ہوتا ہے۔

بیمہ کمپنی والے کیا کوئی ادنیٰ سی بھی جدوجہد اور تدبیر اس بارے میں کرتے ہیں کہ جن لوگوں کی زندگیوں کا بیمہ کیا ہے وہ معیّنہ مدت تک زندہ رہے جائیں؟

اگر وہ کسی نوع کی تدابیر اور حفاظتی انتظامات پر اپنا وقت اور پیسہ صرف کرتے تو اگرچہ معاملہ حرمت کے دائرے سے پھر بھی خارج نہ ہوتا کیونکہ ہر ممکن تدبیر کے باوجود کسی کا آنے والے کل میں زندہ رہنا یا مر جانا اتنا ہی غیر یقینی ہے جتنا اُچھالے ہوئے پیسے کا چت یا پٹ گرنا۔ تاہم جواز کا شبہ اور تاویل کا ایک سطحی رُخ ضرور پیدا ہو جاتا' لیکن معلوم ہے کہ زندہ رہنے نہ رہنے کے سلسلے میں بیمہ کمپنیاں شمّہ برابر سعی نہیں کرتیں' بلکہ نفع اور نقصان کا کھیل خالص بخت و اتفاق پر کھیلا جاتا ہے اسی لئے ہم نے کہا تھا کہ بیمے کے معاملے میں نفع اور نقصان کا تعلق انسان کی ذاتی جدوجہد اور فکر و تعمق سے نہ ہونا حرمت کے لئے کافی شافی بنیاد ہے۔ خود بیمہ کرانے والا بھی اپنی موت اور حیات کے بارے میں اس سے زیادہ تدابیر اختیار نہیں کرتا جتنی ہر انسان بیمہ کرائے بغیر بھی فطرتاً اختیار کرتا ہے تو جس

شے کو نفع اور نقصان کا مدار ٹھیرایا گیا ہو' اس کے بارے میں معاہدے کے ہر دو فریق کا شمّہ برابر سعی نہ کرنا اور فقط پیسے کے لین دین کو انتفاع کا ذریعہ بنانا سوائے جوے کے اور کیا معنی رکھتا ہے۔

مدت کے محض تخمینہ لگانے کو تو اسلامی مزاج کیخلاف کسی عالم نے نہیں کہا۔ تخمینے آپ شوق سے لگائیے۔ علماء فقط یہ کہتے ہیں کہ ان تخمینوں پر مالی نفع اور نقصان کے داؤ لگانا اسلامی قانون میں حرام ہے۔ یہ ایسا ہی جیسے آپ بادل دیکھے بغیر اندازہ لگائیں کہ دو گھنٹے بعد بارش ہوگی۔ علماء نہیں کہتے کہ ایسا اندازہ لگانا حرام ہے لیکن اس اندازے کو آپ جیت ہار کا ذریعہ بنالیں اور زید کے ساتھ یہ شرط بدلیں کہ دو گھنٹے کے اندر اندر بارش نہ ہوئی تو میں اتنے روپے ہارا اور اگر ہوگئی تو تم اتنے روپے ہارے اسے وہ حرام قرار دیتے ہیں۔ کیا آپ کے خیال میں یہ بھی حرام نہیں؟

ٹھیک ہے کہ تجربات اور قرائن کی مدد سے بہت سے اُمور و واقعات کا اندازہ اور تخمینہ کچھ پہلے سے بھی لگایا جا سکتا ہے اور اس کا درست ثابت ہونا بھی کچھ بعید نہیں۔ محکمۂ موسمیات آلات و تجربات کی بناء پر بہت پہلے سے آنے والے موسم کی متعدد کیفیات کا اعلان کرتا رہتا ہے اور بارہا یہ اعلان درست بھی ثابت ہوتا ہے مگر کیا اس پر بازی لگا کر جیت ہار کرنا بھی آپ جائز قرار دیں گے ــــ کسی شخص کے زندہ رہنے کی مدّت کا اندازہ فی الحقیقت کوئی علمی اور تجرباتی حیثیت ہی نہیں رکھتا جبکہ یکلخت کسی مہلک مرض کا اُٹھ کھڑا ہونا یا قلب کی حرکت دفعتاً بند ہو جانا یا کسی ٹرک اور اسکوٹر کا آدمی کو اچانک کچل ڈالنا علم اور تجربے کے دائرے سے یکسر خارج حوادث ہیں تاہم اس پہلو سے صرفِ نظر ہی کر لیجئے تب بھی کیا آپ کو نہیں معلوم کہ ریس کے بعض کھلاڑی جیتنے والے گھوڑے کا اندازہ اس سے زیادہ صحت کے ساتھ کر لیتے ہیں جتنی صحت کے ساتھ کسی شخص کی مدتِ عمر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور دوسرے جووں میں بھی پیشگی اندازے لگا لینے والے ماہر جواریوں کی

تعب ادکم نہیں ہے کیا اندازہ لگانے کی نیت اور تجربہ باتی اہمیت داؤ لگانے کو جائز بنا دے گی؟

ڈاکٹر مریض کو اچھا کرنے کی سعی کرتا ہے اس کا بیمے والی جیت ہار سے آخر کیا تعلق ہوا؟ سعی کو اسلام نے کب منع کیا ہے۔ ڈاکٹر اگر اپنے علم و فن کی بنیاد پر یہ فیصلہ دے کہ فلاں مریض فلاں وقت تک اچھا ہو جائے گا اور فلاں مریض فلاں وقت تک راہی ملکِ عدم ہو گا تو اس پر بھی علماء نے کبھی اعتراض نہیں کیا لیکن ڈاکٹر کے انھی قبل از وقت فیصلوں پر آپ ڈاکٹر کے ساتھ یا کسی اور کے ساتھ جیت ہار کی شرط بدلیں تو کیا یہ جوا نہ ہوگا؟ گفتگو اس پر نہیں ہے کہ کچھ لوگ اوسطِ عمر کیوں نکالتے ہیں، تجربے اور حساب کی روشنی میں تخمینے کیوں لگاتے ہیں۔ تجربات، علم الحساب، تخمین و قیاس اور فکری صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا، مستقبل کے لئے اچھے منصوبے بنانا اور آگے کی بات سوچنا تو اسلام کی معروف تعلیم ہے لیکن حلال و حرام اور گناہ و ثواب کے حدود اس نے تمام ہی معاملات میں معین کئے ہیں۔ آپ شوق سے حساب لگائیے کہ سورج کس دن گرہن ہوگا، برسات کس ساعت سے شروع ہوگی، آندھی کب چلے گی، کونسا مرض کس تدبیر سے دور ہوگا، کن مساعی کا ثمرہ مستقبل میں کیا حاصل ہوگا۔ لیکن اس حساب پر اگر آپ جیت ہار کی بازی لگائیں گے تو اسلام اسے حرام قرار دے گا۔ جیت ہار یہی نہیں ہے کہ ایک فریق داؤ پر لگی ہوئی ساری رقم ہارے اور دوسرا فریق جیتے۔ جیت ہار یہ بھی ہے کہ بعض حالتوں میں داؤ پر لگی ہوئی رقم کا قلیل سا حصہ اِدھر اُدھر ہو جیسے سود کا معاملہ ہے کہ سو روپے پر دس روپے بھی سود ہیں اور ایک آنہ بھی سود ہے۔ بیمۂ زندگی میں جیت ہار کی ساری ہی شکلیں ممکن ہیں اور پیش آتی رہتی ہیں۔ آج آپ دس سال کے لئے بیس ہزار کا بیمہ کرا آئے۔ ابھی صرف ایک پریمیم کی قلیل سی رقم جمع کرائی تھی کہ اللہ کو پیارے ہو گئے اب بیمہ کمپنی وہ ساری رقم ہار گئی جو اس نے معین کی تھی۔

اسی طرح آپ نے نو سال مسلسل رقمیں جمع کیں لیکن دسویں سال ایسی افتاد پڑی کہ پریمیم کی ادائگی ممکن نہ رہی تو سارا کھیل بگڑ گیا جو نو سال تک جمع کرایا تھا وہ خطرے میں پڑ گیا اور بعض حالتوں میں تو غارت ہی ہو گیا۔ پورا کا پورا نہ سہی جزوی نقصان اس میں یقینی ہے اگر پریمیم کی رقم جمع کرنے کی طاقت قواعد کی رو سے مقررشدہ موت میں میسر نہ آسکے۔

القصہ زندگی کے بیمے کا نہ صرف ذہنی محرک کے اعتبار سے بلکہ عملی تفصیلات کے لحاظ سے بھی قمار ہونا خاصا واضح مسئلہ ہے اور کوئی ایسا فقیہ جو اس باب میں کسی خارجی دباؤ یا ذہنی جانبداری کا شکار نہ ہو آسانی سے اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ اس سسٹم کا محور ہی جواریوں والی ذہنیت ہے خواہ اصلاً اس محور کو اخلاقی حس نے تخلیق کیا ہو۔

جوے کے علاوہ سود کے پہلو پر نظر ڈالئے بیمہ کمپنیوں کی جمع کردہ رقم کا بہت بڑا حصہ قانون کے زور سے حکومت کے پاس چلا جاتا ہے اور حکومت اس پر نفع دیتی ہے۔ نفع اگر مضاربت[1] کے طریقے پر دیا جاتا تو اعتراض کی گنجائش نہ تھی لیکن وہ شخص کم سے کم اسلامی اعتبار سے جاہل ہی قرار پائے گا جو اس نفع کو مضاربت سے جوڑنے کی کوشش کرے۔ مضاربت میں اسلامی قانون کی رو سے سرمائے اور محنت کے درمیان کسی طے شدہ نسبت سے نفع اور نقصان کا اشتراک ضروری ہے۔ یہ اشتراک ہی اسے جائز کرتا ہے۔ اگر سرمایہ دار صرف نفع میں شریک ہو اور نقصان سے کوئی واسطہ نہ رکھے تو معاملہ مضاربت کا نہیں سود کا ہوگا۔ اس پر اسلامی قانون کے تمام معتبر ائمہ و اساتذہ متفق ہیں۔ بیمہ کمپنیوں کی رقموں پر حکومت ایک طے شدہ تناسب سے سود دیتی ہے۔ نقصان تو در کنار بیمہ کمپنیاں حقیقتاً نفع کی بھی شریک نہیں کیونکہ یہ روپیہ حکومت الگ سے کسی کاروبار میں نہیں لگاتی بلکہ یہ اس کی دوسرے مدوں کی رقم میں خلط ملط ہو جاتا ہے اور اس کا کوئی حساب نہیں لگایا

[1] ایک کا سرمایہ اور دوسرے کی محنت۔ اس معاملے کو مضاربت کہتے ہیں۔

جاتا کہ خود اس روپے نے کتنا نفع پیدا کیا۔ جب ایسا کوئی حساب نہیں تو سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے کہ یہ لازماً نفع بھی دے اور دے تو اس میں کسی کی شرکت بھی ہو۔ کمپنیوں کو نفع کے نام پر صرف سود ملتا ہے اور سود کا نام کوئی کچھ بھی رکھ لے وہ بہرحال حرام ہے اگر حقیقتِ ربوا پائی گئی۔

کمپنیوں کے اپنے پاس بیمہ داروں کی ادا کردہ رقم کا جو حصہ رہتا ہے وہ بھی عموماً سودی کاروبار میں ہی لگتا ہے۔ کچھ خالص مہاجنی نوع کے سودی قرضوں میں جاتا ہے اور کچھ ایسے کاموں میں کھپتا ہے جو اگرچہ اپنی ظاہری ہیئت کے لحاظ سے زراعت یا صنعت و حرفت یا تجارت کے دائرے میں آتے ہیں، لیکن ان کی رگ و پے میں سود کا لہو دوڑ رہا ہے۔ آپ دس بوری گیہوں بینک کی معرفت خرید لیجئے شاذ ہی ایسا ہوگا کہ ربوا کا کوئی جز اس میں شامل نہ ہونے پائے پھر بھلا وہ کاروبار سود کی آمیزش سے کیسے خالی رہ سکتا ہے جو بیمہ کمپنیاں بڑی بڑی رقموں سے بالواسطہ بینکوں کے ذریعے یا براہ راست بینکنگ ہی کے اصولوں پر کرتی ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مغربی قدردوں کے مسلمان وکیل ایسے اکثر منافع کو دائرۂ ربوا سے خارج کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں جنھیں علماءِ اسلام نے ربوا کا مصداق گردانا ہے لیکن ان کے مغربی مؤکل بلا ادنیٰ ابہام کے اس نفع کو ٹھیک وہی حیثیت دیتے ہیں جو اسلامی قانون میں ربوا کی ہے۔ اسی کا نام ہے مدعی سست گواہ چست!

ذاتی اور داخلی قباحتوں کے علاوہ بیمۂ زندگی کے کاروبار کی یہ اضافی قباحت بھی قابلِ نظر اندازی نہیں ہے کہ وہ ایک ایسے معاشی نظام کا جز ہے جو یکسر مادہ پرستانہ بنیادوں پر استوار کیا گیا ہے۔ اس نظام میں حلال و حرام کوئی شے نہیں۔ یہ متعدد مرحلوں میں اسلام کے معاشی نظریات سے ٹکراتا اور ان کی نفی کرتا ہے۔ اس کے ایک ایک جز میں اس کے اساسی نظریات اور مجموعی فکر کی روح اسی طرح جاری و ساری ہے جس طرح آدمی کے ایک ایک عضو میں لہو جاری و ساری ہوتا ہے۔ پھر کیونکر یہ معقول ہو سکتا ہے کہ اس کے کسی جز کو مسلمان صرف سطحی مشاہدے پر مطمئن ہو کر اختیار کر لے اور قوانینِ اسلامی کے ماہرین سے استصواب کرنے کے عوض خود ماہرین کو سبق دے کہ یہ جز ہر قباحت سے پاک ہے۔ ماہرین میں ہم خود کو شمار نہیں کرتے لیکن آپ نے چونکہ ماہرین کے نقد کو صریحاً بے اہمیت ٹھیرایا ہے اس لئے جو لوگ بھی ماہرین کہلائے جا سکیں ان سے آپ کی بے نیازی عاقلانہ نہیں۔

اور ان ساری بحثوں کو طاق ہی میں رکھ دیا جائے تب بھی آپ کے جملہ دلائل کی بنیاد صرف ایک ہی آیت قرآنی سے اُکھڑ جاتی ہے۔ بنیاد یہی تو ہے کہ بیمۂ زندگی کو آپ جائز معاملات کے مشابہ پاتے ہیں۔ اس مشابہت کی وجہ سے آپکا دعویٰ ہے کہ بیمے کا کاروبار حلال ہے، لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ فقط ظاہری مشابہتیں حرام و حلال کے قیاس میں کافی نہیں کفارِ عرب نے دعویٰ کیا تھا انما البیع مثل الربوا۔ بیع بھی تو سود ہی جیسی ہے پھر کیوں ربوا کو حرام قرار دیتے ہو۔ اس کا جواب اللہ نے یہ نہیں دیا کہ بیع اور ربوا میں مشابہت کا دعویٰ کیوں ہے بلکہ یہ دیا کہ اے محمدؐ ان سے کہہ دو اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربوا کو حرام۔ اس جواب کے بین السطور میں یہ تنبیہ صاف موجود ہے کہ دو چیزوں میں مشابہت و مماثلت کے متعدد پہلو موجود ہونے کے باوجود کچھ اصولی اور جوہری فروق ایسے ہو سکتے ہیں جن کی بنا پر ان کے حکم میں فرق کر دیا جائے۔ اتنا فرق کہ ایک یکسر غلیظ و حرام ٹھیرے اور دوسری سراسر طاہر و حلال قرار پائے۔

پھر بھلا آپ کی وہ بنیاد کہاں سلامت رہی جس پر دلائل کی عمارت تعمیر کی ہے۔ آپ کو سوچنا چاہئے تھا کہ جب بیع اور معاملاتِ ربوا کی گوناگوں مشابہتیں حکم کی یکسانی کے لئے کافی نہیں تو کچھ اور معاملات و مسائل بھی ایسے ضرور ہو سکتے ہیں جن میں باہمی مشابہتیں موجود ہوں مگر کسی دقیق و خفی اور لطیف و نازک فرق کی بنا پر ان کے احکام بدلے ہوئے ہوں۔

آپ اگر یہ کہیں کہ بیع و ربوا کے سلسلے میں تو کفار کی غلط فہمی کا جواب وحی کی زبان سے مل گیا، لیکن اب وحی کہاں۔ اب تو دین مکمل ہو چکا ہے لہذا علماء خدا نہیں ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ دیں اس کے سامنے ہماری اپنی عقل و فہم کے فیصلے غلط قرار پا جائیں

ہم کہیں گے کہ بے شک علماء خدا تو کیا رسول بھی نہیں ہیں۔ ان کا اپنا کوئی قول یا فیصلہ حجت نہیں۔ ان سے بحث کی جا سکتی ہے۔ ان کا رد بھی کیا جا سکتا ہے، لیکن دینی احکام کے باب میں وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کی حیثیت ان کے ذاتی فیصلوں کی نہیں ہوتی بلکہ وہ اللہ اور رسولؐ ہی کے دیئے ہوئے قوانین کی بعض اصولی یا فروعی دفعات لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص کسی فیصلے کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا چاہے کہ اسے اللہ اور رسولؐ کا حکم قرار دینے میں غلطی کی گئی ہے تو یقیناً وہ ایسا کرنے کا مجاز ہے لیکن مجاز ہونے کی یہ شرط بہرحال دنیا کے مسلّمات میں سے ہے کہ دعویٰ کرنے والے کو اس علم و فن میں درک ہونا چاہیئے جس سے متعلق فیصلے پر وہ خطا کا حکم لگا رہا ہے یہ تو معقول نہیں ہو سکتا کہ بعض بیرسٹر اگر کسی معاملے کے خلافِ قانون ہونے کا فیصلہ صادر کر رہے ہوں تو ایک ایسا آدمی جس نے قانون کا قاعدہ بغدادی بھی نہ پڑھا ہو کوری عقل و منطق کی بنیاد پر یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ یہ معاملہ خلافِ قانون ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ خوب جانتے ہیں قانون کا معاملہ ایک پیچیدہ اور دقیق معاملہ ہے۔ دیوانی یا فوجداری کے کسی ایک ہی شعبے کے قوانین ملاحظہ فرما لیجئے آپ کو متعدد ایسی دفعات ملیں گی جن کی کوئی افادیت آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی بلکہ عقلاً تو انھیں آپ مہمل یا مضرت رساں ہی قرار دیں گے، لیکن فی الحقیقت یہ قصور قانون کا نہیں ہوگا خود آپ کا ہوگا کہ آپ قانون کی معتد بہ تعلیم حاصل کئے بغیر معز باتیں کر رہے ہیں۔ علماء جس وجہ سے "علماء" کہلاتے ہیں وہ آخر یہی تو ہے کہ انھوں نے باقاعدہ ایک خاص معیار تک ان علوم و فنون کو حاصل کیا جن سے شرعی قوانین کے اصول و فروع پر عبور میسر آتا ہے۔ سرکاری قانون کا فراغت یافتہ وکیل کہلایا اور اسلامی قانون کا سند یافتہ عالم۔ عالم کا کوئی فقہی حکم بیان کرنا ایسا ہی ہے جیسے وکیل کا کوئی سرکاری قانون بیان کرنا۔ ہو سکتا ہے ایک وکیل کسی فعل و عمل کا آئینی مقام متعین کرنے میں غلطی کر جائے اسی طرح عین ممکن ہے کہ قانون شرعی کے اطلاق و انطباق میں کسی عالم سے چوک ہو جائے لیکن اس چوک کی گرفت اور قانونِ شرعی کی صحیح طور پر نشاندہی ہر کہ و مہ کا منصب نہیں بلکہ ان ہی مخصوص افراد کا منصب ہے جنھوں نے قانونِ شرعی کو ایک مبسوط و مرتب علم کی حیثیت سے باقاعدہ پڑھا ہو اور اس کے اصول، مبانی روح اور مناہج و مدارک کو سمجھا ہو۔ آپ ایمانداری سے خود ہی اپنے بارے میں سوچیں کہ کیا اسلام کے ایک قانونی مسئلے پر قائدانہ انداز میں کلام کرنے اور علماء کی رائے کے برعکس رائے پر جم جانے کا استحقاق معقولیت، انصاف اور مسلّمہ قاعدے کی رو سے آپ کو حاصل ہے یا فقط چند تو سنِ معز کے بل پر آپ ایسا کر رہے ہیں۔ یہ خود تنقیدی کی مخلصانہ دعوت تنہا آپ ہی کو نہیں ہر شخص کو ہے اور یہ اسی ایک بحث مسئلہ تک محدود نہیں بلکہ تمام مسائل اس کے دائرے میں آتے ہیں۔

مکتوب کے اختتام پر آپ نے ہمارے "قلم" میں علمی غرور کی جھلک پائے جانے کا جو تذکرہ فرمایا ہے اس کے بارے میں عرض ہے کہ تشخیص آپ کی درست نہیں "غرور" جس خباثتِ عظمیٰ کا نام ہے الحمد للہ اس کا سایہ تک ہمارے نفس پر نہیں پڑا۔ البتہ ہماری تحریروں میں اگر واقعی کچھ ناموزوں اور قابلِ اعتراض عناصر شامل ہو گئے ہیں تو اسے ہماری نااہلی کا ثمرہ سمجھ لیجئے۔ ہم بلا ادنیٰ تصنع ایک بے بضاعت انسان ہیں جو ہر طرح کے سہو و خطا کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ محترم عروج قادری صاحب یا مکرم میرزا شفیع صاحب کے باب میں اگر واقعی ہماری گفتگو بے ڈھنگی رہی ہے تو اس کے لئے ہم شرمسار بھی ہیں اور ان حضرات سے معافی بھی چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری لغزشوں کو معاف فرمائے اور ہمیں بات کہنے کا بہتر سلیقہ دے۔

مسجدوں میں حلقے

سوال[۱۵]:— از حمید الدین۔ حیدرآباد دکن۔

نماز جمعہ اور دوسری مقررہ نمازوں کے بعد بعض مساجد میں پابندی سے حلقے بنا کر درود شریف یا دوسرے اذکار و وظائف پڑھے جاتے ہیں۔ ان کا باقاعدہ اہتمام، انتظام اور ترغیب ہوتی ہے نہایت عقیدت مندی اور پابندی کے ساتھ کئی ہزار مرتبہ اجتماعی طور پر ختم اور فاتحہ ہوتی ہے اور اس کو برکت و ثواب کا موجب سمجھا جاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ بدعت ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو زحمت فرما کر اس پر حدیث و فقہ کے ذریعہ مکمل طور پر تحقیقی روشنی ڈالیں۔

الجواب[۱۵]:—

تجلی کے دیرینہ قارئین جانتے ہیں کہ اس نوع کے مسائل پر ہم نے وقتاً فوقتاً بہت کچھ نہایت شرح و بسط اور دلائل کے ساتھ لکھا ہے اب یہ مناسب نہیں کہ ہر نئے سائل کے لئے پچھلی بحثیں دہرائی جائیں۔ ارادہ یہ ہو رہا ہے کہ "تجلی کی ڈاک" کتابی شکل میں لے آئی جائے تاکہ نئے حضرات جب چاہیں اس میں مطلوبہ مباحث دیکھ لیں۔ بدعات کی مخصوص بحثوں کے بارے میں تو یہ خیال ہے کہ انھیں چھانٹ کر الگ سے کتاب چھاپی جائے اور اسے "بدعت کیا ہے" نامی کتاب کا دوسرا حصّہ قرار دیا جائے۔ جب تک ارادہ پورا نہیں ہو جاتا ہم نئے سائلین کو مشورہ دیں گے کہ یا تو وہ کہیں سے تجلی کا فائل دیکھیں یا پھر کم سے کم "بدعت کیا ہے" نامی کتاب ضرور ملاحظہ فرمالیں اس میں بدعت و سنت کے موضوع پر مستقیم انداز نظر اختیار کرنے کے لئے کافی مواد مل جائیگا۔

بالکل ظاہر ہے کہ نماز جمعہ ہو یا کسی اور وقت کی نماز۔ مساجد میں عبادت کی مجموعی ہیئت وہی ہونی چاہئے جو قرآن و سنت، تعامل صحابہؓ اور ارشادات ائمہ سے معلوم ہو چکی ہے۔ اس ہیئت پر کوئی اضافہ بدعت ہوگا چاہے وہ بظاہر کتنا ہی مقدس اور خوشنما ہو۔ اجتماعی طور پر ختم فاتحہ تو ایک بالکل ہی نو ایجاد عمل ہے اور مسجد کے اندر اجتماعی شکل میں وظائف پڑھنے کی کراہت صحابیِ جلیل حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے براہ راست معلوم ہو چکی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کچھ لوگوں کو ایک بار عبداللہؓ بن مسعود نے مسجد میں جمع ہو کر کچھ وظائف پڑھتے دیکھا تھا تو سختی سے ممانعت فرمادی تھی اور پھر یہ سلسلہ معدوم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کیا گنجائش ہے کہ اسے پھر سے زندہ کر لیا جائے۔

اصل بات یہ ہے کہ دین کا خالص خانقاہی تصور اپنے خمیر ہی میں یہ داعیہ رکھتا ہے کہ تذکیۂ نفس اور حصولِ ثواب کے سہل اور پُر امن طریقوں میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جائے، اور دل و دماغ کو یہ سوچنے کی فرصت ہی نہ دی جائے کہ انفرادی اصلاح و تربیت کے ساتھ اجتماعی دائرے میں بھی مسلمان پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں اور اقامتِ دین کی خاطر بھی کچھ پاپڑ بیلنا اس کی دین داری کا لازمی تقاضا ہے۔

ہم بدعات و محدثات کے رد میں دلائل کے فلک بوس انبار بھی لگا دیں تو یہ آسان سا نسخہ اربابِ بدعت کے ہاتھ آگیا ہے کہ ہمیں "وہابی" یا "مودودی" کہہ کر اپنے کام میں جُٹے رہیں گے۔ پھر بتائیے بات بنے تو کیسے بنے؟

ظہر کے بعد کی رکعتیں

سوال[۱۶]:— (ایضاً)

ایک مسجد کے امام صاحب نماز ظہر میں فرض کے بعد متصلاً بالالتزام بجائے دو رکعت سنت موکدہ کے چار رکعات پڑھتے ہیں۔ اس خلاف سنت عمل کے متعلق دریافت کیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ خود تو واقف نہیں البتہ ایک مشہور مفتی صاحب اور ایک بڑے عالم صاحب نے ترمذی اور قدوری کے حوالے سے ان کو بتلایا ہے کہ اس طرح انضمام سے دو سنت موکدہ ساقط ہو کر چار رکعات کا ثواب ملتا ہے اور یہ عمل نماز مغرب و عشا کے فرض کے بعد بھی کیا جا سکتا ہے۔ کیا یہ عمل صحیح و درست ہو سکتا ہے۔ ازراہِ کرم اس پر مفصل و مدلل تنقیح فرمائیں۔

الجواب:-

جہاں تک متذکرہ امام صاحب کا تعلق ہے ان سے تو بس اتنا ہی کہنا ہے کہ عبادت کی جو شکل مسلمانوں میں عام طور پر پائی جا رہی ہو اس سے مختلف راہ اختیار کرنے کیلئے یہ بات کافی نہیں کہ کسی بھی مفتی اور عالم نے مشورہ دیا اور آپ نے بلا ادنیٰ تحقیق اسے قبول کر لیا۔ نماز دین کا ستون ہے اسکے باب میں تو اور بھی احتیاط برتنی چاہیئے۔ کم سے کم اتنا تو کرنا ہی تھا کہ دار العلوم جیسے کسی ادارے کے دار الافتاء سے رجوع کرتے اور اس سوال کا جواب حاصل فرماتے کہ جب بقول ایک مفتی کے ترمذی اور قدوری میں ظہر کے بعد ایک ہی سلام سے چار رکعتوں کو افضل قرار دیا گیا ہے تو کیا بات ہے کہ عوام و خواص عام طور پر اس کے خلاف عمل کرتے ہیں اور یا تو صرف دو رکعت پڑھتے ہیں یا پھر دو سلاموں سے چار رکعت۔

ظہر کے بعد ایک ہی سلام سے چار رکعت پڑھنا تو خیر ایسا فعل نہیں جسے قابلِ نکیر یا بدعت کہا جا سکے۔ وہ اپنی جگہ درست ہے لیکن بے احتیاطی اور سہل انگاری کے باعث آدمی بسا اوقات ناقص علماء اور غیر ذمہ دار مفتیوں کے پھیر میں بدعت و معصیت تک سے آلودہ ہو جاتا ہے لہٰذا ہمیشہ یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ حل طلب مسائل معتبر علماء ہی سے پوچھے جائیں۔

اور جہاں تک نفس مسئلہ کا تعلق ہے متذکرہ مفتی اور عالم صاحبان نے کچی تلی بات نہیں کہی۔ ترمذی اور قدوری دونوں میں ایسا ایک بھی لفظ موجود نہیں ہے جو اس پر دلالت کرتا ہو کہ ظہر کے بعد ایک ہی سلام سے چار رکعات پڑھنے میں فضیلت ہے۔

قدوری باب النوافل میں پہلے تمام اوقاتِ صلوٰۃ کی رکعاتِ مسنونہ بیان کی گئی ہیں اور ظہر کے بعد بطور نوافل دو ہی رکعت کا تعین کیا گیا ہے۔ پھر فرمایا گیا ہے:-

وَالنَّوافلُ النَّهارِ اِنْ شَاءَ صلّٰی رَکعتَینِ بتسلیمۃٍ واحدۃٍ وَاِنْ شَاءَ اَربعًا۔	اور دن کی نفلوں کا معاملہ ہے کہ چاہے ایک سلام سے دو رکعتیں پڑھے چاہے ایک ہی سلام سے چار۔

اس میں اشارہ تک نہیں کہ ایک رکعت سے چار پڑھنے میں کوئی فضیلت ہے بلکہ دونوں صورتوں کو یکساں بتایا گیا ہے۔

ترمذی میں اس سلسلے میں سب سے پہلی روایت تو حضرت علیؓ کی یہ مذکور ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے قبل چار اور ظہر کے بعد دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ فقیہہ الامۃ حضرت عائشہؓ اور ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ بنت ابوسفیانؓ سے بھی ایسی ہی روایت ہے اور اکثر علماء کا عمل اسی پر ہے حضرت علیؓ کی اس روایت کو ترمذی نے "حسن" قرار دیا ہے۔

دوسری روایت حضرت عبد اللہؓ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ظہر سے قبل چار اور ظہر کے بعد دو رکعتیں پڑھیں۔ اس روایت کو ترمذی نے حسن و صحیح کہا ہے۔

تیسری روایت حضرت عائشہؓ سے منقول ہے کہ جب کبھی حضورؐ ظہر سے قبل چار رکعات نہیں پڑھتے تھے تو ظہر کے بعد چار پڑھ لیا کرتے تھے۔ ترمذی فرماتے ہیں کہ حضرت عبد الرحمٰنؓ ابن ابی لیلیٰ سے بھی ایسا ہی مروی ہے

ان تینوں روایتوں سے ظہر کے بعد دو ہی رکعات کا پڑھنا ثابت ہوا۔ اس کے بعد دو روایتیں البتہ ایسی آئی ہیں جن سے یہ گمان پیدا ہو سکتا ہے کہ چار رکعات زیادہ بہتر ہیں۔ یہ دونوں ہی حضرت ام حبیبہ سے مروی ہیں۔ پہلی یہ ہے کہ حضور نے فرمایا:-

"جس نے قبلِ ظہر چار اور بعد ظہر چار رکعات پڑھیں اس پر اللہ نے دوزخ کی آگ حرام کی۔"

دوسری یہ ہے کہ:-

"جو آدمی ظہر سے پہلے چار اور ظہر کے بعد چار رکعات کا تحفظ کرے گا اللہ تعالیٰ اس پر نارِ جہنم حرام کردے گا۔"

لیکن ان دونوں روایتوں میں اس کی کوئی تصریح نہیں کہ بعد کی چار رکعتیں ایک ہی سلام سے ہونی چاہئیں یا دو دو کرکے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ جہاں تصریح کے بغیر رکعات کی تعداد بتائی جاتی ہے وہاں یہ منشاء نہیں ہوتا کہ یہ پوری تعداد ایک ہی سلام سے پوری کی جائے گی۔ مثلاً حضرت عائشہؓ سے حضورؐ کی نمازِ شب کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؓ نے گیارہ یا تیرہ رکعات بتائیں۔ یہ تصریح نہیں کی کہ کتنے سلاموں کے ساتھ۔ تو کسی نے بھی اس کا مطلب یہ نہیں سمجھا کہ یہ ساری رکعتیں آپ ایک ہی سلام سے پڑھتے ہوں گے۔ یا مثلاً آپ کہتے کہ تراویح کی نماز بیس رکعت ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بیسوں رکعت فقط ایک سلام سے پڑھی جائیں گی۔

اسی طرح حضرت ام حبیبہؓ کی ان دونوں روایتوں سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں کہ ظہر کے بعد والی چار رکعتوں کی ترغیب ایک ہی سلام کے ساتھ دی گئی ہے نہ کہ دو سلاموں کے ساتھ۔ دو سنتوں کے بعد دو نفلیں مزید پڑھنا بہت اچھی بات ہے اور اسی کی ترغیب ان روایتوں سے ملتی ہے گویا حضورؐ نے مجموعی تعداد بتائی نہ کہ ایک ہی سلام سے چار پڑھنا افضل قرار دیا۔ یہ دونوں روایتیں اس معاملے میں ساکت ہیں کہ یہ ظہر کے بعد والی چار ایک ہی سلام سے ہونی چاہئیں یا دو سلاموں سے۔ اب اس سکوت سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ایک ہی سلام سے پڑھنا افضل ہوگا بے دلیل ہے جب کہ دو سلاموں سے پڑھنے کو بہتر سمجھنا متذکرہ بالا پہلی تین روایتوں سے ثابت ہے۔ دو سلام ہی اس حقیقی صورتِ حال کو بہتر طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ پہلی دو رکعتیں نوافل مسنونہ ہیں اور دوسری دو رکعتیں نوافل مندوبہ۔

سوائے مالکیہ کے تینوں مذاہب فقہی اس پر متفق ہیں کہ ظہر کے بعد دو ہی رکعتیں راتبہ یعنی سنتِ مؤکدہ ہیں مالکیہ البتہ یہ کہتے ہیں کہ نوافلِ راتبہ میں کسی خاص عدد کی حد بندی نہیں بلکہ جو بھی عدد کسی وقت کے لئے احادیث سے معلوم ہو وہی افضل ہے۔ پھر ظہر کے بعد یہ چار کے عدد کو معلوم بالحدیث قرار دیتے ہیں لیکن اس قید کے ساتھ نہیں کہ ایک ہی سلام سے ہوں۔ لہٰذا حقیقۃً کوئی اختلاف نہیں ہوا کیونکہ دو سنن پڑھ کر مزید دو نفلیں پڑھنا تو ظہر کے بعد سبھی کے یہاں افضل ہے۔ بس فرق حیثیت کا ہے کہ پہلی دو رکعات تو نوافلِ راتبہ ہیں اور اگلی دو نوافل مندوبہ و مستحبہ۔ تعداد وہی رہی جس کی ترغیب حضرت ام حبیبہؓ والی دو روایتوں میں دی گئی۔ سلام کی تعداد بڑھ گئی یعنی بجائے ایک کے دو سلاموں سے چار رکعتیں۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ایک ہی سلام سے چار پڑھنا بہتر ہونا چاہئے یا دو سلاموں سے۔ تو نہ صرف ترمذی کی متذکرہ پہلی تین روایتوں سے دو سلام بہتر معلوم ہوتے ہیں بلکہ حیثیتوں کا فرق قائم رکھنا بھی دو ہی سلاموں کا طالب ہے جب اس پر اتفاق ہے کہ مسنون و مؤکد صرف دو ہی ہیں اور مزید دو غیر مؤکد ہیں تو اس معنوی فرق کا باقی رہنا اور عامۃ الناس کا اسے محسوس کرتے رہنا اسی پر منحصر ہے کہ دونوں کے درمیان سلام کی حدِ فاصل قائم رکھی جائے۔ اگر علماء غیر قوی دلائل سے ایک ساتھ چار پڑھنے کو افضل سمجھتے ہوئے اسی پر عمل پیرا ہو جائیں گے تو عامۃ الناس کا غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا عین قرین قیاس ہوگا۔ وہ عبادات میں قدرتاً علماء ہی کی پیروی کرتے ہیں اور فقہی معلومات کی بجائے ان کا عمل علماء کے عمل کے تابع ہوا کرتا ہے لہٰذا عام طور پر یہ سمجھا جانے لگے گا کہ ظہر کے بعد چار رکعتیں ضروری ہیں۔ یہ ایک غلط خیال ہوگا۔ دین میں جو چیز جس درجے میں رکھی گئی اسی درجے میں رہنی چاہئے مؤکد دو رکعات ہوں تو چار کا مؤکد قرار پانا جسارت اور غلو کے ہم معنی ہوگا۔ یہ صرف رکعاتِ ظہر ہی کا معاملہ نہیں تمام مسائل دینیہ میں اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ کوئی شے اپنی جگہ سے ہٹنے نہ پائے۔

ویسے ہمیں معلوم ہے کہ مراقی الفلاح میں یہ بات کہی گئی ہے

ویندب ان یضم الیھما رکعتین فتصیرا اربعاً۔	اور یہ بات بہتر ہے کہ ظہر کی دو رکعتوں میں مزید دو رکعتیں ملالی جائیں پس وہ چار ہو جائیں۔

اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کی طرف بھی یہ بات منسوب ہے کہ ان کے نزدیک نوافل میں چار ہی رکعات فقط ایک سلام سے افضل ہیں، لیکن جس صورت میں کہ تمام فقہائے احناف ظہر کے بعد صرف دو ہی رکعات کو رواتبۃ و مؤکدہ ماننے پر متفق ہیں اور کسی نے یہ قول نہیں کیا کہ بعض احادیث میں حضورؐ نے جن چار رکعات کی ترغیب دی ہے وہ چاروں مؤکدہ ہوگئیں تو قولِ ابی حنیفہؒ سے زیرِ بحث دو رکعتوں کو مستثنا کرنا ہی اولیٰ ہوگا۔ یعنی ان دو کے سوا جتنی بھی نوافل پڑھی جائیں انھیں چار چار کرکے پڑھنا افضل ہوگا۔

مگر ایک استثنار اور بھی فقہا نے کیا ہے۔ امام صاحبؒ کے شاگردِ رشید قاضی ابویوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما کہتے ہیں کہ رات کی نفلوں میں ایک سلام سے بس دو ہی رکعات بہتر ہیں دو سے زائد نہیں اور انھی کا قول مفتی بہ بھی مانا گیا ہے لہٰذا آپ دیکھتے ہی ہیں کہ عشار کے فرض پڑھ کر صرف دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں اور جو لوگ ان دو کے بعد مزید دو نفلیں متصلاً پڑھتے ہیں وہ بھی چاروں کو جوڑتے نہیں بلکہ پہلی دو کا سلام پھیر کر دوسری دو پڑھتے ہیں۔

حاصلِ جواب یہ نکلا کہ ظہر کے بعد چار رکعات جسے پڑھنی ہوں وہ دو ہی سلاموں سے پڑھے۔ خصوصاً علما اور ائمۂ مساجد کے لئے تو اور بھی ضروری ہے کہ کوئی ایسا عمل نہ کریں جو عوام پر دین کے کسی واضح اور متفق علیہ مسئلہ کو مبہم اور غبار آلود بنا دے۔ مراقی الفلاح کی تصریح کے بموجب اگر دو سننِ مؤکدہ میں مزید دو نوافل ملانا مندوب ہی مان لیں تب بھی ایسا امرِ مندوب کم سے کم منظرِ عام پر اختیار کرنے کے لائق نہیں جس سے عوام غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔ واللہ اعلم

رکعاتِ تراویح کا قضیہ

سوال ۱۷:۔ از ناظر اقبال لائل پور (پاک)

تجلّی میں آپ کے عالمانہ مضامین پڑھ کر عرصے سے فیض یاب ہو رہا ہوں۔ بڑے ہی شوق سے تجلّی کا انتظار کرتا ہوں اور جب مل جاتا ہے تو سراپا شوق بنکر پڑھتا ہوں، لیکن اس بار اکتوبر کے شمارے میں انوار الباری اور رکعاتِ تراویح پر آپ کے تبصرے پڑھ کر دلی رنج ہوا۔ تعجب ہے آپ جیسا وسیع علم و مطالعے کا آدمی بھی اس غلط پروپیگنڈے سے متأثر ہو گیا کہ اہلِ حدیث حضرات امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی عزت نہیں کرتے اور انھیں ان کے شایانِ شان مقام و مرتبہ نہیں دیتے۔

اے محترم! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ میں خود اہلِ حدیث ہوں اور میرے خیالات یہ ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ ہمارے محسن تھے۔ انھوں نے قرآن و حدیث کے سمجھنے سمجھانے میں ہماری قیمتی رہنمائی کی ہے اور انکی ذات تمام امتِ مسلمہ کا قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ کہنا کہ اہلِ حدیث امام صاحب کی توہین کرتے ہیں بریلوی کے اس کہنے جیسا ہے کہ دیوبندی لوگ اولیار اللہ کو نہیں مانتے اور نہ صرف اولیار کی بلکہ رسول اللہؐ کی بھی توہین کرتے ہیں۔ آنجناب اگر صرف اس لئے اہلِ حدیث کو امام صاحب کی توہین کرنے والا باور کرتے ہیں کہ وہ ان کے مقلد نہیں بلکہ وہ سرے سے تقلید ہی کے قائل نہیں تو پھر آپ مقلد حضرات بھی تو اپنے امام کے سوا باقی تینوں فقہی اماموں کی تقلید سے دامن کش ہیں کیا آپ پر بھی ان تینوں اماموں کی توہین و تنقیص کا الزام چسپاں نہ ہوگا؟

مزید تعجب ہے کہ آپ ایک طرف تو نقد و نظر کے قائل اور بڑے سے بڑے عالم کے قول کو قرآن و سنت کی ترازو میں تولنے کا مشورہ دینے والے ہیں مگر دوسری طرف فقط اتنی سی بات کو امام صاحب کی توہین سمجھتے ہیں کہ کوئی شخص پوری نیک نیتی کے ساتھ یہ رائے قائم کرلے کہ غالباً فلاں حدیث امام صاحب کو نہ ملی ہوگی۔ آپ فرماتے ہیں کہ جارحیت کا آغاز و اقدام اہلِ حدیث کی طرف سے ہے مگر میں عرض کرتا ہوں کہ ایسی غیر واقعی بات آپ جیسے حق پسند کو نہیں کہنی چاہئے جارحیت کا ارتکاب موقع بہ موقع دونوں ہی فریق کرتے آئے ہیں اور مجموعی جائزہ لینے پر زیادہ الزام شاید مقلدین ہی پر آئے۔

آپ کا یہ دعویٰ ممکن ہے درست ہی ہو کہ ابو حنیفہؒ صحابہؓ کے بعد پوری دنیا سے زیادہ علم رکھنے والے ہیں۔ اس کی صحت اور خطا کو اہل علم ہی جانچ سکتے ہیں، لیکن یہ تو آنجناب کو ضرور معلوم ہوگا کہ اپنے اپنے متبوع بزرگوں کے بارے میں تمام ہی گروہ اسی انداز کا حسن ظن ظاہر فرماتے ہیں اور شیعوں کو تو میں نے اپنے کانوں سے کہتے سنا ہے کہ جولاہے امام نہیں ہوا کرتے، ہمارے امام اشرف النسل تھے وہ معصوم ہیں اور سب سے بڑے عالم بھی۔

بہت ڈرتے ہوئے لرزیدہ قلم سے یہ عریضہ لکھا ہے، کہیں آپ خفا نہ ہوجائیں لیکن تجلی کا مطالعہ آپ کی جس فراخدلی اور حقیقت پسندی کا احساس دلاتا ہے اسکے سہارے یہ بھی توقع ہے کہ آپ اس عریضے کو "تجلی کی ڈاک" کے تحت پیش کرکے منصفانہ اظہار خیال فرمائیں گے۔ میں بہت ممنون ہوں گا اگر اسے "ڈاک نمبر" ہی میں لے لیا جائے۔

الجواب:—

علمی مباحث میں خفگی کا سوال ہی نہیں۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہم جب جو لکھ دیں پتھر کی لکیر ہو۔ آپ ہی کی طرح بعض اور بھائیوں کو ہمارے متذکرہ تبصرے ناگوار گذرے ہیں اور اپنے عنایت ناموں میں انھوں نے خلوص، غصے اور صدمے کے ملے جلے احساسات کے ساتھ جو کچھ لکھا ہے اس میں یہ شکایت تقریباً مشترک ہی ہے کہ ہم نے اہلحدیث پر امام ابو حنیفہؒ کی توہین کرنے کا الزام خلافِ واقعہ لگایا ہے۔ اس طرح کے شکایت ناموں سے ہمیں خوشی بھی ہوئی اور رنج بھی۔ خوشی یوں کہ شکایت تعلق کی علامت ہے۔ اللہ کا احسان ہے کہ تجلی سے — اور اس کے ناطے ہم سے کتنے ہی اہلحدیث بھائیوں اور بزرگوں کو اس کے باوجود قلبی وذہنی تعلق ہے کہ ہم مقلد ہیں۔ ایسے مقلد جو اپنے مسلک تقلید کا دا شگاف اقرار کرتا ہے تعلق نہ ہوتا تو انھیں تجلی پڑھنے اور ہم سے شکوہ کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔

اور رنج یوں کہ شکوے کی بنیاد فقط جذبات پر نظر آئی — علمی تقاضے اور حقیقت پسندی کا کوئی پہلو اسمیں محسوس نہ ہوسکا۔ حالانکہ امام ابو حنیفہؒ کی محبت وعقیدت کا معاملہ دنیاوی محبوبوں جیسا نہیں کہ مخالفتوں اور دفاعوں کا مدار فقط جذبات پر ہو۔ یہ ایک علمی، تاریخی اور دینی مسئلہ ہے جس میں کسی بھی جذبے کے لئے ایک قوی بنیاد چاہئے۔ واقعیت چاہئے منطقی توازن چاہئے۔

خیر۔ آپ سب بھائیوں کا شکریہ۔ قصور فقط ہمارا ہو یا آپ کا یا دونوں ہی تھوڑے تھوڑے قصوروار ہوں ہر صورت میں ہمارے آپس کے اُس برادرانہ تعلق اور اُس روحانی رابطے کا خاتمہ نہیں ہونا چاہئے جو سید الابرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی غلامی کے رشتے نے ہمیں سب کو بخشا ہے۔ درگذر، نرمی، رواداری اور محبت مومن کے امتیازی اوصاف ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایک دوسرے کو معاف نہ کرسکیں۔

ویسے اس تمہید کا منشاء جواب سے فرار نہیں۔ جواب ہمارا یہ ہے کہ جس طرح کچھ عرصے قبل ہم بھی اہل حدیث دوستوں کی جارحانہ روش سے تفصیلاً واقف نہ تھے اسی طرح آنجناب بھی باوجود اہل حدیث ہونے کے کافی اطلاع نہیں رکھتے اور جس حسن ظن اور مرتبہ شناسی کا اظہار آپ نے امام صاحب کے لئے کیا ہے وہ آپ کے ذاتی خیالات ہیں ان کی تائید اہل حدیث اسکول کا بنیادی فکر کبھی نہیں کرتا۔ تائید تو کجا وہ بڑی شدومد سے ان کا استرداد، ان کی نفی، ان کا ابطال کرتا ہے۔ بڑے سے بڑا اہل حدیث عالم یہ ماننے پر تیار نہیں کہ قرآن و حدیث سے جزوی وذیلی احکام اخذ کرنے کے لئے معلومات کے ذخیرے کے علاوہ بھی ایک چیز ہے جو اخذ کرنے والے مجتہد کے لئے اتنی ہی ضروری ہوتی ہے جتنی زندہ رہنے کے لئے روٹی اور سونگھنے کے لئے قوتِ شامّہ۔ اس چیز کو قوتِ آخذہ کہئے یا صلاحیتِ قانون سازی۔ یا جو چاہے نام دیجئے یہ بہرحال ایک فیصلہ کن استعداد ہے جو کمائی نہیں جاتی مبدءِ فیض سے عطا ہوتی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا طرۂ امتیاز اور عظمت بہت کا بڑا اسی بھی استعداد ہے۔ اس سے قطع نظر کرلو تو ان کی ہر توصیف بے وزن ہوکر رہجاتی ہے۔ عباد وزہاد امت میں ایک سے ایک گذرے ہیں۔ کثیر العلم لوگوں کی بھی کمی نہیں رہی

منطق اور علم کلام کے ائمہ بھی وقتاً فوقتاً اپنی رفعتوں کا پرچم اُڑاتے رہے ہیں۔ پھر کیا خصوصیت ہوئی اگر کوئی یہ اقرار کرلے کہ ابوحنیفہ رض بڑے متقی تھے، پرہیزگار تھے، عالم تھے، علم کلام کے امام تھے۔ یہ اوصاف نادر نہیں، فیصلہ کن بھی نہیں۔ ابوحنیفہ رح جس ہستی کا نام ہے اس کی معنوی عظمت کا ایوان ان میں سے کسی ایک بھی وصف پر قائم نہیں — یہ اوصاف اس ایوان میں فقط ستونوں، دیواروں اور چھتوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ بنیاد اس ایوان کی اُسی خداداد صلاحیت پر ہے جس نے امت کے بڑے بڑے اساطین اور شیوخ کو اس پر مجبور کردیا کہ فقہی اُمور میں ابوحنیفہ رح کی تقلید کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈالیں اور اجتہاد و تفقہ میں ان کی قیادت قبول کریں۔ اس صلاحیت سے صرفِ نظر کرکے ابوحنیفہ رح کی کسی خوبی کا اعتراف کرنا حقیقتاً ان کے مرتبہ و مقام کا اعتراف نہیں ہے۔ اہل حدیث مکتب کا اساسی فکر یہی یہ ہے کہ اجتہاد، استنباط اور قانون سازی کا سارا مدار معلومات کے ذخیرے پر ہے نہ کہ خاص معیار کی ذہنی صلاحیتوں پر۔ اور ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ معلومات صرف خام مواد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان سے ٹھیک ٹھیک استفادے اور انتفاع کا انحصار اُس جوہرِ فطرت پر ہے جو عام نہیں خاص ہے۔ جو بازار میں بکتا نہیں۔ جو ماں کے پیٹ سے برآمد ہونے والے مضغۂ گوشت کے ساتھ ساتھ باہر آتا ہے۔ جو زندگی بھر کی عبادات، طلبِ علم، جد و جہد اور کنج کاوی سے حاصل نہیں ہوسکتا اگر اس کا تخم رحمِ مادر ہی میں قدرت نے مولود کے اندر نہ رکھ دیا ہو۔

دنیا بھر کے عطریات سامنے رکھ لو اور ناک کے نتھنوں پر سیمنٹ چڑھا دو۔ ان عطریات اور غلاظت کے ڈھیر میں بو باس کے رُخ سے کوئی فرق نہ ہوگا۔ ہزار نقاروں پر چوٹ مارو لیکن قوتِ سامعہ کو ختم کردو مکمل سناٹے کے سوا کوئی بھی احساس جنم نہیں لے گا۔ ٹھیک ایسا ہی رشتہ علم اور تفقہ میں ہے۔ تفقہ صلاحیتِ اخذ و اجتہاد ہی کا دوسرا نام ہے۔ اہل حدیث حضرات کے ثقہ تر اور محتاط ترین حضرات بھی ابوحنیفہ رح کی توصیف کرتے ہیں تو فقط ان اوصاف کی حد تک جن میں امت کے بے شمار اکابر ان کے شریک ہیں بلکہ بعض ان سے بڑھ بھی گئے ہیں۔ زہد و تقوی، خلوص، محنت، خشیت، علمی شغف، کثرتِ مطالعہ، یہ سب اوصاف ابوحنیفہ رح سے مخصوص نہیں۔ ان تک بس کرنا اور اُس انمول وصف کو نظر انداز دینا جس نے ابوحنیفہ رح کو ابوحنیفہ بنایا حقیقتاً تعریف نہیں شایانِ شان اعترافِ عظمت نہیں۔ انبیاء کی تقدیس پر ہزار صفحے سیاہ کردو مگر وصفِ نبوت کو دبا جاؤ یہ توصیف نہیں سخن سازی ہوگی اسی طرح ابوحنیفہ رح کو بہت بڑا عابد و زاہد، عالم اور پیکرِ اخلاص لکھتے رہو مگر اُس جوہرِ خداداد کا ذکر مت کرو جو نبوت ہی کی طرح وہبی ہے کسبی نہیں تو اسے مدح نہیں ذم کہیں گے۔ ذم نہ سہی ناقدری اور مرتبہ ناشناسی تو ضرور ہی کہیں گے۔

یہ ذرا گہری بات تھی۔ صاف و سادہ بات یہ ہے کہ اہلِ حدیث علماء تقلید کی مختلف انواع کا فرق نظر انداز کرکے مطلق تقلید ہی کو ٹھیک اُس تقلید کا مصداق قرار دیتے رہے ہیں جس کی مذمت کفار کے سلسلے میں قرآن نے صراحتہً اور حتمی طور پر کی ہے۔ ابنِ حزم جیسے بڑے لوگوں نے تو تقلید کی انواع اور مقلدین کی اقسام کا تھوڑا بہت لحاظ بھی کیا لیکن ان سے چھوٹے درجے اور تنگ ظرف والے علماء نے — جو باوجود دعوۂ بے تقلیدی کے خود بھی مرضِ تقلید ہی میں گرفتار تھے — اس تھوڑے بہت لحاظ کو بھی اُٹھا دیا اور بڑے شد و مد سے ایسی باتیں کہیں جن کی رو سے کوئی بھی مقلد جہنم رسید ہونے سے نہیں بچا۔ حد ہے کہ اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ — اور بَلْ نَتَّبِعُ مَا اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا جیسی آیات کو جو متفق علیہ طور پر کفارِ عرب کی تقلید بالکفر کے لئے وارد ہوئی تھیں بلا استثناء نفسِ تقلید کے لئے استعمال کرلیا گیا حالانکہ تقلید کی بعض انواع جہاں حرام ہیں وہیں بعض انواع واجب و لازم بھی ہیں۔

یہاں موضوعِ گفتگو "تقلید" نہیں اس لئے ہم اجمال

ہی پر اکتفا کرتے ہوئے آگے چلیں گے۔ اس اجمال سے یہ بہرحال سمجھا جا سکتا ہے کہ تقلید کے بارے میں اہل حدیث اساتذہ کا یہ طرزِ فکر ان کے شاگردوں کو تمام ہی علمائے مقلدین کے بارے میں کس طرح کے خیالات عطا کرتا ہوگا۔

موضوع یہ ہے کہ اہل حدیث حضرات امام ابوحنیفہؒ کی بے عزتی کرتے ہیں یا نہیں۔ آپ کا خیال ہے ہرگز نہیں کرتے ہمارا بھی یہی خیال تھا کہ یہ رکیک حرکت صرف اطفالِ مکتب ہی کر سکتے ہیں ثقہ علمائے اہل حدیث اس سے ملوّث نہیں ہو سکتے مگر یہ خیال درست ثابت نہیں ہوا۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

جناب نواب صدیق حسن صاحب طاب اللہ ثراہ موجودہ اہل حدیث کی صفِ اول کے علماء میں شمار ہوتے ہیں اور واقعتہً وہ بڑے عالم تھے۔ نہ صرف عالم بالکل پیکرِ اخلاص اور خادمِ دین۔ لیکن ابوحنیفہؒ کے لئے ان کے دل کے دروازے بھی بند ہی رہے۔ انھوں نے شاید تحصیلِ علم کا کوئی ایسا دائرہ بنا لیا تھا جس سے باہر جانے کی انھیں فرصت ہی نہیں تھی، ورنہ جن خیالات کا اظہار انھوں نے ابوحنیفہؒ کے لئے بڑی صفائی اور بے فکری سے کیا ہے ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ ڈالنے والا لٹریچر ناپید نہیں تھا۔

حدیث الغاشیۃ میں وہ رقمطراز ہیں:۔

"جو شرائط واسطے اجتہاد کے حنفیہ نے ذکر کئے ہیں ہم خیال کرتے ہیں تو وہ ان کے امام میں ہرگز موجود نہ تھے اول درجہ لغت عرب کے جاننے کا ہے' امام صاحب کی عربیت میں جو کچھ قصور و فتور تھا وہ کتب تاریخ و طبقات سے بخوبی ثابت ہے۔" ص۳۵

مزید یہ کہ:۔

"بہرحال علم حدیث میں ان کو کچھ دخل نہ تھا۔"

یہ ایک ہی اقتباس ہماری اس گذارش کا کافی ثبوت ہے کہ آنجناب نے جو ابوحنیفہؒ کو قرآن و سنت میں رہنما مانا اور تکریم کی وہ آپ کا ذاتی فعل ہے اہل حدیث اسکول اس کو تسلیم نہیں کرتا جس شخص کو بقول مرحوم علم حدیث میں کچھ بھی دخل نہ ہو وہ سنت تو سنت قرآن ہی کو کیا سمجھے گا۔

یہی مضمون ایک اور اہل حدیث بزرگ نے ان الفاظ میں الاپا:۔

"چونکہ اُس زمانے میں احادیث کے تراجم تو ہوتے ہی نہ تھے اس لئے امام صاحب کی قلتِ عربیت حصولِ احادیث سے سدِّ راہ ہوئی۔" (حقیقۃ الفقہ ص۱۲)

دیکھا آپ نے۔ کس بھولے پن سے دودھ کا سارا مکھن کھینچ لیا گیا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان حضرات نے جان بوجھ کر ابوحنیفہؒ کو اُس سطح پر دکھلایا جو اتنے بڑے امام کی تو کیا اوسط درجے کے فقیہ اور دوسرے درجے کے عالم کی بھی نہیں ہو سکتی عربی ہی میں اناڑی رہا تو آدمی مجتہد کیا یوں کہئے عامی بن گیا۔ لیکن ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ ابوحنیفہ کے بارے میں ایسے نازیبا خیال کی بنیاد جہل پر تھی — غلط مطالعے کو بھی جہل ہی کہتے ہیں — بلکہ وہ جہل در جہل کہلانے کا مستحق ہے کیونکہ بعد اقوال اور حقیقتوں سے بے خبری کے ساتھ ساتھ وہ بے خبری اور غفلت پر جمے رہنے کے لئے دلائل بھی مہیا کرتا ہے جیسے مغرب نواز درسگاہوں میں اسلامیات کی تعلیم حاصل کرنے والوں کی حالت ہے کہ وہ حقیقی اسلام سے محض جاہل ہی نہیں بلکہ حقیقی اسلام کے خلاف انھیں منطق بھی مہیا کی گئی ہے۔

یہی حقیقۃ الفقہ کے فاضل مصنف ایک نہایت شائستہ اور شریفانہ شعر بھی پیش فرماتے ہیں۔ اس کا ترجمہ خود انھی کے قلم سے ملاحظہ ہو:۔

"کتنی ایک پاکدامن عورتوں کی شرم گاہیں جو حرام تھیں ابوحنیفہؒ کی بدولت حلال ہو گئیں۔" (ص۱۲۶ حصہ اول)

ایک صاحب مولوی ابو عمران عنایت اللہ وزیر آبادی تھے۔ شد و مد کے اہل حدیث۔ انھوں نے ایک کتاب اربع رسائل الصحیفۃ تصنیف کی تھی۔ اس میں چن چن کر انھوں نے ابوحنیفہؒ کی برائیاں، خامیاں اور نارسائیاں پیش فرمانے کے بعد حاشیہ دیا تھا:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سیدھا خط کھینچ کر سمجھایا۔"

پھر مولوی صاحب نے اپنے دست مبارک سے یہ خط اس طرح کھینچ کر دکھلایا تھا۔

حنبلیہ — مالکیہ
شافعیہ — حنفیہ

لیکن کمال یہ کیا تھا کہ اسے حضور کے ایک ارشاد کے بیچ میں رکھا۔

ارشاد یہ تھا وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوا (یہ میرا سیدھا راستہ ہے پس اسی پر چلو) انھوں نے اس خط کو مستقیما اور فاتبعوا کے بیچ میں رکھا۔ یہ کوئی نازیبا حرکت نہیں تھی مگر نازیبا یوں ہوگئی کہ چاروں مذاہب فقہیہ کے نام انھوں نے اپنی طرف سے لکھدیئے اور پہلی دفعہ یہ کرشمہ دکھلایا کہ کسی عالم کی اپنی وضع کی ہوئی تعبیر و تشریح بھی حدیثِ رسول کا ٹھیک جزو ہی نظر آئی۔ بے علم عوام بیچارے اس شاندار حرکت سے اس کے سوا کیا سمجھیں گے کہ واقعی یہ چاروں مذاہب تو حدیث ہی سے باطل ثابت ہوگئے۔ اور یہی موصوف کا مقصود بھی تھا۔ چنانچہ صاف فرماتے ہیں:۔

"یہ اسلامی سڑک ہے جو افراط و تفریط سے مبرا اور موصل الی المطلوب اور موجب نجات اُخروی ہے اور یہ جو اس کے ارد گرد منقطع خطوط نظر آتے ہیں وہ سب شیطانی سڑکیں اور تباہ کن مذاہب ہیں۔" (ص۳)

حقیقۃ الفقہ کے اہل حدیث مصنف کا ایک کارنامہ اور دیکھتے چلیے۔ صفحہ ۱۸۱ پر پہلے دُرِّ مختار سے یہ نقل کیا:۔

"جو شخص قرآن کو مخلوق کہے وہ کافر ہے۔"

اور اس کے بعد مع حوالہ لکھدیا:۔

"امام ابو حنیفہ سے دریافت کیا گیا تو بولے قرآن مخلوق ہے۔"

حوالہ دیکھ کر ایک عام آدمی کو یہ سمجھنا ہی چاہیئے کہ ابو حنیفہ خود فقہ حنفی ہی کی ایک کتاب سے کافر ثابت ہوگئے چلو چھٹی ہوئی۔

۱۳۲۵ھ کی ایک کتاب "تحقیق و تقلید کا مناظرہ" دیدنی ہے۔ اس میں اہل حدیث مرتب مولوی حمید اللہ نے نہ صرف ابو حنیفہ بلکہ ان کے استادوں اور شاگردوں کے بارے میں بھی جو شاندار گل افشانیاں کی ہیں بس دیکھا کیجئے۔

مولوی سعد بنارسی کا رسالہ "الجرح علی ابی حنیفۃ" بھی کچھ کم نہیں (مطبوعہ سعید المطابع۔ محلہ دارانگر۔ بنارس)

فرماتے ہیں:۔

"امام صاحب نے قرآن و حدیث و صرف و نحو و منطق و فلسفہ وغیرہ سیکھا ہی نہیں صرف فقہ کو سیکھا۔ باقی علوم سے کورے رہے۔" (ص۷)

مزید فرمایا:۔

"ابی ابن خلدون نے تو بڑی مہربانی کی کہ کہدیا امام ابو حنیفہ کو سترہ حدیث پہنچی تھیں۔ ہم کہتے ہیں ایک بھی نہیں پہنچی تھی بلکہ امام صاحب حدیث سے ایسے کورے تھے جیسے جہاتما گاندھی کے گوشت سے بلکہ اسکے بھائی سے۔" (ص۱۱)

اسی پر بس نہیں اور لیجئے:۔

"امام صاحب کا حافظہ اور ان کا ضعیف ہونا اور مرجیہ ہونا اور جہمیہ ہونا اور زندیق ہونا اور ان کے استاد و شاگرد اور اولاد وغیرہ کل کے کل کا ایک ہونے کا ثبوت۔" (ص۱۱)

مگر اس میں "زندیق" کہنے کے باوجود صاف کافر نہیں کہا جاسکا۔ دل نے کہا یہ تو بہت برا ہوا عام لوگ شاید نہ سمجھ سکیں کہ زندیقی بھی کفر ہی کے خاندان سے ہے۔ پھر تو ذرا عام فہم الفاظ استعمال کرنے چاہئیں۔ چل مرے خامے بسم اللہ

"امام صاحب سوائے اس کے کہ ضعیف تھے مرجیہ بھی تھے اور مرجیہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ اسلام سے خارج ہیں (مطلب کہ مسلمان نہیں) .... اب تمام حنفیوں کی نسبت یہ کہنا بے جا نہ ہوگا لیس لھم للاسلام نصیب" (ص۵)

سیر نہ ہوئے ہوں تو ذرا سا اور:۔

"لو صاحبو آؤ تم کو ہم اور بھی سناتے ہیں۔ امام صاحب زندیق بھی تھے (ص۲۷) امام ابو حنیفہ باغی بھی تھے (ص۳۴) امام صاحب کی پیدائش کی تاریخ کسی نے یوں کہا ہے سگ شد اور انتقال کی تاریخ یہ ہے "بوکم جہاں پاک۔" (ص۸)

آپ کہہ سکتے ہیں کہ دیوانے کی بڑ ہے کسی پر حجت تو

کرنا ہوشمندی نہیں۔ بات معقول ہے لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ دیوانے فرطِ جنون میں اور نشے باز نشے کی ترنگ میں جو کچھ کہتے ہیں کیا وہ اس کے علاوہ بھی کچھ ہوتا ہے جو ان کے تحت الشعور میں ثبت ہے۔ یہ ثبت آخر کہاں سے ہوا۔ اگر ان چاند پر دھول اڑانے والوں کو استادوں ہی نے ابوحنیفہؒ کے بارے میں یہ شاندار معلومات نہ بہم پہنچائی ہوتیں اور کدورت کا بیج ان کے کچے ذہنوں میں نہ بو دیا گیا ہوتا تو دیوانگی کا بڑے سے بڑا دورہ بھی ان کی زبان کی سے یہ ہفوات و ہذیانات نہ نکلوا سکتا۔ ان غریبوں کو پڑھایا ہی یہ جاتا ہے کہ ابوحنیفہؒ عربی نہیں جانتے تھے، حدیث میں بھی صفر تھے، حافظہ بھی کُند تھا وغیر ذلک۔

استثناء ہر کلیے میں ہے۔ ہم نہیں کہتے کہ تمام علمائے اہلِ حدیث ابوحنیفہؒ کے بارے میں دریدہ دہن اور ناشائستہ ہی ہیں۔ العیاذ باللہ۔ اہل حدیث میں بڑے بڑے نیک دل، شائستہ، متین اور صاف ذہن اکابر بھی ہیں لیکن امام ابوحنیفہ کے متعلق ان کے علم و خبر کا مواد عموماً ایسا ہی ہے کہ وہ شاگردوں کے دماغوں میں اس یکتائے روزگار شخصیت کی بڑی غلط تصویر اُتارتا ہے اور پھر ہر شاگرد اپنے گروہی تعصب کی سیاہی اسکے چہرے پر لیپتا ہے۔ اِلّا وہ شاگرد جن کے نصیب میں سعادت کا وافر حصہ آیا ہو۔

کسی صاحبِ علم کا یہ گمان کر لینا کہ فلاں حدیث ابوحنیفہؒ علم میں نہ آئی ہوگی بجائے خود توہین کے مرادف نہیں۔ لیکن اس معصوم سے گمان میں اور نمونے کے ان چند اقتباسات میں جو فرق ہے وہ آپ خود دیکھ لیں۔ بریلویوں نے چند اُلوہی اوصاف رسولؐ کے لئے وضع کیے ہیں اور اولیاء کے لئے بھی طرح طرح کے مناقب گھڑتے ہیں۔ اب اگر دیوبندی ان کا انکار کرتے ہیں تو بریلوی انھیں اہانت کا مجرم قرار دیتے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے عیسائی حضرات مسلمانوں پر اہانتِ عیسیٰؑ کا الزام دھرتے ہیں کیونکہ وہ انھیں ابن اللہ نہیں مانتے۔

مگر کیا محولہ بالا اقتباسات کی روشنی میں ہمارا بھی معاملہ ایسا ہی ہے؟ انصاف کیجئے الفاظ سے لیکر معانی تک اور مفہوم سے لیکر لب و لہجے تک کون سی چیز ایسی ہے جس پر افتراء اور گالی کا اطلاق نہ ہو سکے۔ ہم مقلدین بے شک اپنے امام کے سوا باقی ائمہ کی تقلید نہیں کرتے، لیکن ان کی قرار واقعی عظمتوں کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں انھیں برحق مانتے ہیں، ان کی عزت کرتے ہیں مگر اہلحدیث حضرات اس پوزیشن میں نہیں۔ وہ جہاں ہیں اس کا اندازہ آپ متذکرہ اقتباسات سے لگالیں۔

رہا ہر گروہ کا اپنے بزرگوں کی شان میں قصیدہ پڑھنا تو بے شک یہ واقعہ واقعہ ہی ہے لیکن کیا صدق و کذب اور یقین و وہم کے امتیاز کے لئے علم و عقل نے ہمیں کوئی کسوٹی نہیں دی؟ کیا محمدِ عربیؐ کا سید الانبیاء ہونا بھی ایسا ہی ایک دعویٰ ہے جیسا عیسٰی ابن مریمؑ کا ابن اللہ ہونا؟ — شیعوں کی مثال آپ نے خوب دی۔ وہ ابوحنیفہؒ کو تو کیا ابوبکرؓ و عمرؓ کو بھی چٹکیوں میں اُڑاتے ہیں۔ ان کے کسی قول و فعل سے استدلال صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے عقل و ہوش کو کالے سانپ نے ڈس لیا ہو۔

الحاصل خفا ہونے کی بات نہیں۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب تو مقلدین اور غیر مقلدین سب کو دیکھنا چاہیئے کہ کفر و زندقہ اور بدعت و شرک کے جو توپخانے مسلسل آگ برسا رہے ہیں ان کا مقابلہ کیونکر ہو۔ آپس میں لڑ لڑ کر مرجانا کتے کی موت ہے۔ کتا بھی زیادہ اشرف ہے اگر وہ اپنے مالک کی وفاداری میں جان دیدے، مگر ہم تو فقط نفسِ امارہ کی راہ میں جان دے رہے ہیں ۔ جان بھی کہاں دے رہے ہیں خود اپنے ہاتھوں سے اپنی قبریں کھود کھود کر زندہ در گور ہو رہے ہیں۔ ہم خدا کی قسم کتوں سے بھی ارذل سطح پر پہنچ چکے ہیں۔ دین کی کھیتی کو گدھے چر رہے ہوں اور رکھوالے آپس ہی کی جنگ سے فرصت نہ پائیں تو ان سے بڑھ کر زیاں کار اور ذلیل کون ہوگا۔ جلادو ان کتابوں کو جو اہلِ توحید کو ایکدوسرے سے دست و گریباں ہونا سکھاتی ہیں۔ ہونٹ سی دو ان خطیبوں کے جو حربِ عقائد کی آگ کو چرب زبانی کا تیل دیتے ہیں، توڑ دو

قلم جو تفرقے اور نزاع کی آبیاری کرتے ہیں۔ آج وہ وقت چکا ہے کہ یا تو بکھری ہوئی بھیڑیں متحد ہوکر بھیڑیوں سے آمادہ بہ جنگ ہوں یا پھر بھیڑیے ایک ایک بھیڑ کو چیر پھاڑ کر برابر کردیں۔ پناہ بخدا۔

قدرتِ خداوندی

سوال ۱۷:- از فرحت بیگ عباسی۔ مظفر پور

براہِ کرم تجلی کے ڈاک نمبر میں ذیل کے سوال و جواب سے متعلق اپنی رائے ظاہر فرماکر ممنون فرمائیں:-

خدا کو طاقت ہے کہ حضور محمدؐ جیسے اور لاکھوں محمدؐ بنا سکے۔

جواب:- ہرگز نہیں۔ قرآنِ عظیم میں ہے ماکان محمد ابا احد الخ

(ماخوذ رسالہ "نوری کرن" بریلی۔ مئی ۶۳ء صـ ۲۸)

الجواب ۱۷:-

تفصیلی گفتگو تو اُسی وقت ہوسکتی تھی جب پورے طور پر معلوم ہوتا کہ جس عبارت کے بارے میں سوال کیا گیا ہے وہ کس نے کیا ثابت کرنے کی غرض سے سپردِ قلم کی ہے۔ بصورتِ موجودہ صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ عبارت اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل درست ہے اور جس شخص نے "ہرگز نہیں" کے الفاظ میں جواب دیا ہے وہ یا تو کُند ذہن اور جاہل ہے یا متعصب اور معاند۔ اس کی قرآنی آیت سے استدلال کرنے کی جسارت یہ بھی واضح کرتی ہے کہ قرآن کی اس کے قلب میں کوئی عظمت نہیں ورنہ قرآن ایسی کتاب نہیں کہ ایک سچا مسلمان اس کی آیات سے اٹکل پچو اور بے سروپا استدلال کرے۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ والی آیت میں مضمون یہ بیان ہورہا ہے کہ محمدؐ تم میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں اس کا اس بات سے کیا تعلق ہے کہ خدا کو محمدؐ جیسے اور لاکھوں محمدؐ پیدا کرنے کی طاقت نہیں۔

کچھ مسلمان ایسے ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذہنی طور پر ایسا ہی درجہ دے رکھا ہے جیسا عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو دیا۔ وہ صاف تو نہیں کہہ پاتے کہ محمدؐ خدا ہیں لیکن اسی عقیدے کو وہ الفاظ کے ہیر پھیر سے بایں طور بیان کرتے رہتے ہیں کہ سرکارؐ حاضر و ناظر ہیں۔ عالم الغیب ہیں۔ جنت دوزخ کے مالک ہیں۔ فریاد رس ہیں وغیر ذلک۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جن صاحب نے "ہرگز نہیں" کا فیصلہ صادر فرمایا ان کے دماغ میں بھی حضورؐ کے لئے اُلوہیت ہی کا شیطانی عقیدہ پنجے گاڑے ہوئے ہے اسی لئے وہ آگا پیچھا دیکھے بغیر لپک اٹھے کہ خدا بھلا دوسرا "خدا" کیسے پیدا کرسکتا ہے۔ ورنہ اللہ کی صفات اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام و حیثیت کا ٹھیک ٹھیک ادراک احساس انھیں ہوتا تو آخر اس صاف و سادہ اور بدیہی حقیقت کے تسلیم کرنے میں کیا رکاوٹ پیش آسکتی تھی کہ جس نے ایک محمدؐ کو خلعتِ وجود سے نوازا وہ ہزار اور لاکھ محمدؐ بھی تخلیق فرمانے پر یقیناً قادر ہوگا۔ محمدؐ فداہ امی و ابی اپنی تمام تر عظمتوں اور صفاتِ کمالیہ کے باوجود ایک بندے ہی تو ہیں، ایک مخلوق، ایک بشر۔ پھر کیا استحالہ کونسا مانع یہ مان لینے میں حائل ہے کہ اللہ چاہے تو ایسے ہی ایک ہزار یا لاکھ انسان پھر پیدا فرما سکتا ہے۔

خوب سمجھ لیجئے نقل فرمودہ عبارت میں صرف قدرتِ خداوندی کا بیان ہے۔ ذرّہ برابر شک نہیں کہ اللہ دس کروڑ محمدؐ پیدا کرنے پر قادر تھا قادر ہے اور ہمیشہ قادر رہیگا۔ رہا یہ خلجان کہ خاتم النبیینؐ کے بعد کسی نبی کے یا خود محمدؐ کے پیدا ہوسکنے کا امکان ہی کیا ہے تو یہ مسئلے کا واقعاتی پہلو ہے نہ کہ امکانی۔ بیشک محمدؐ کے بعد کوئی نبی پیدا نہیں کیا جائے گا اور نہ محمدؐ جیسی کوئی اور ہستی جنم لے گی، لیکن یہ ایسا ہی ہے جیسے کفر کی موت مرنے والے جنت میں نہیں جائیں گے اور انبیاء علیہم السلام کو دوزخ میں نہیں ڈالا جائے گا۔ یہ اللہ کے فیصلے ہیں۔ ان سے یہ نتیجہ نہیں اخذ کیا جاسکتا کہ خدا کسی کافر کو جنت میں اور کسی نبی کو دوزخ میں بھیجنے پر قادر ہی نہیں۔ خدا تو اس پر بھی قادر ہے کہ چاند سورج سے زیادہ روشنی دے اور سمندر اپنی روانی

چھوڑ دیں - بغیر بادل کے بارش ہو جائے اور بغیر کھائے
پیئے آدمی سو سال زندہ رہے۔ مگر ایسا ہوتا نہیں ہے کیونکہ
خدا نے اپنی مرضی سے کچھ اٹل قوانین بنا دیتے ہیں - اسیطرح
محمدؐ جیسی کوئی اور ہستی پیدا ہونی نہیں ہے مگر یہ تو نہیں کہہ
سکتے کہ خدا میں اس کے پیدا کرنے کی قدرت بھی نہیں ہے۔
جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ خدا کو اب محمدؐ جیسا کوئی
وجود تخلیق کرنے کی طاقت ہی نہیں رہی وہ ایمان اور عقل
دونوں سے فارغ ہوا - إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ
جیسی آیات کا مطلب سمجھنے کے لئے عربی دانی کی ضرورت
نہیں - قرآن کا کونسا پارہ ہے جس میں یہ مضمون صاف لفظوں
میں نہیں آیا کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے - قادر ہونے کا
مطلب یہی تو ہے کہ وہ چاہے تو اس موجودہ کائنات جیسے
ہزار عالم دم کے دم میں پیدا کر دے - وہ چاہے تو پتھر فصیح و
بلیغ تقریریں کریں اور سمندر کا پانی آسمان کے تارے چھو لے
وہ چاہے تو ہزار آدم، لاکھ عیسیٰ اور کروڑ محمدؐ آن کی آن میں
خلعت وجود پہن لیں - اسے بس کُن کہنے کی دیر ہے پھر کیا
مجال ہے کہ جو کچھ اس نے ارادہ کیا ہو وہ پورا نہ ہو - ہاں
ارادہ کرنا نہ کرنا اس کی مرضی پر ہے - اس نے ارادہ کیا
ہے کہ آمنہ کے بطن سے پیدا ہونے والے محمدؐ بن عبد اللہ
کا کوئی ہمسر اور مثیل پیدا نہیں کرے گا لہذا ہو گا یہی کہ محمدؐ
فداہ امی وابی بے مثال رہیں گے اس نے ارادہ کیا ہے
کہ جو لوگ کھلم کھلا اس کے باغی ہیں انھیں بھی رزق سے
محروم نہیں کرے گا لہذا ملحدوں اور دہریوں کو روٹی کھاتے
آپ بھی دیکھ سکتے ہیں مگر یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اللہ ان سے
رزق سلب کر لینے پر قادر بھی نہیں!

جاہل اور غبی مفتی

سوال ۱۵ :- (ایضاً)

کیا فٹ بال، کرکٹ اور والی بال کا کھیلنا جائز
ہے؟ ہمارے یہاں ایک مولوی صاحب ہیں جن کا کہنا ہے
کہ مذکورہ بالا کھیل کھیلنا جائز نہیں کیونکہ اس میں کوئی کارِ خیر
مقصود نہیں ہوتا - علاوہ ازیں حدیث شریف میں صرف تین
کھیل کا ذکر ہے - (تیر اندازی، سواری اور بیوی کے ساتھ
ملاعبت) اور بقیہ حرام ہیں - لہذا کرکٹ وغیرہ بھی ناجائز
کیونکہ قرآن و حدیث سے اس کا جواز ثابت نہیں۔

الجواب ۱۵ :-

مولوی صاحب سے پوچھئے کہ یہ جو آپ چائے پیتے ہیں،
پان کھاتے ہیں، ٹہلنے تشریف لیجاتے ہیں، صبح کا ناشتہ
کرتے ہیں یہ سب بھی جائز کیسے ہو گیا جب کہ ان میں کوئی بھی
کارِ خیر نہیں - کارِ خیر تو کجا انھیں اسراف کے خانے میں رکھنا
ہوگا اور اسراف حرام ہے - پھر حرمت کی تان کھانوں کی اقسام
پر بھی ٹوٹے گی --- آخر انڈا، مٹھائی، پلاؤ کیوں جائز ہو
جب کہ سانس کا رشتہ صرف روٹی اور چٹنی سے بھی قائم رہ سکتا
ہے۔

اصل یہ ہے کہ کچھ لوگ خود کو دین و شریعت کا تابع بنانے
کے عوض دین و شریعت کو اپنا تابع بنانے کے درپے رہتے
ہیں - اصولِ شریعت اور احکامِ فقہ کا لحاظ کئے بغیر وہ اپنے
خاص مزاج و میلان کو قاضی بنا کر زبان کھولتے ہیں اور ایسی
لغو باتیں کہہ جاتے ہیں جن سے اسلام کے بارے میں غلط تصورات
کو غذا ملتی ہے۔

تمام فقہا اور فہیم علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ فٹ بال
ہو یا ہاکی، کرکٹ ہو یا والی بال ان سب کے جواز میں کوئی شبہ
نہیں اگر ان کے کھیلنے والے کسی حکم شرعی سے انحراف کے مرتکب نہ
ہوں - مثلاً نمازیں غائب نہ کی جائیں، دو طرفہ شرط نہ بدی جائے
اپنے دینی و دنیاوی فرائض منصبی سے غفلت نہ برتی جائے۔
پھر یہ کھیل شرعاً مباح ہیں - اس طرح کے اُمور میں اصل شے
اباحت ہے - یعنی فقہاء کہتے ہیں کہ انھیں حلال قرار دینے کیلئے
کسی مثبت دلیل کی ضرورت نہیں - البتہ حرام یا مکروہ قرار دینے
کے لئے دلیل کی ضرورت پڑے گی - محض یہ بات کہ ان سے
کوئی کارِ خیر مقصود نہیں حکم امتناع کے لئے کافی نہیں - آپ
تاج محل یا قطب مینار یا بھاکڑا ننگل دیکھنے جائیں آپ وقت
چائے کے ساتھ توس مکھن کھائیں، آپ دو آنے کی دو قلفی لیں

کے عوض نہیں ہوتے کا تنزیبی صافہ باندھیں، نفیس ململ کا کرتہ اور بڑھیا لٹھے کا پاجامہ پہنیں، مونگ اور مسور کی دال کے بجائے قورمے اور بریانی پر ہاتھ ماریں تو یہ سارے ہی مشاغل نہ کار خیر کہلائیں گے نہ اسراف اور فضول خرچی کی سخت گیر تعریف سے خارج کئے جاسکیں گے پھر بھی یہ بالاتفاق جائز ہیں تو آخر گینڈی کے کھیلوں سے ایسا بیر کیوں کہ جب تک ان پر کار خیر کا اطلاق نہ ہو جواز کا فتویٰ ہی نہ ملے۔

نادان دوست سے دانا دشمن کے بہتر ہونے والی ضرب المثل ایسے ہی لوگوں پر صادق آتی ہے جو علم اور تفقہ سے تہی دامن ہونے کے باوجود شریعت میں ٹانگ اڑانے لگتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ان کے اس مسخرے پن کا اثر اُس اسلام پر کیا پڑے گا جس کی حمایت ومحبت کا وہ دم بھر رہے ہیں۔

کھیل تماشے

سوال ۱۹؎ — از محمد علی - ضلع شاہ آباد (بہار)

یہاں جلسۂ سیرت میں مولانا ابوالقاسم قتیل دانا پوری (عالم توریت وانجیل وغیرہ) نے دورانِ تقریر میں فرمایا کہ اللہ عزوجل نے جب اپنا جمال دیکھنے کی خواہش کی تو محمدؐ کو پیدا کیا اور محمد صلعم کے سینۂ جسم میں اپنا عکس دیکھ کر اپنے جمال وکمال، قدرت وکبریائی پر بہت خوش ہوا اور مولانا محترم نے توریت، زبور، انجیل، قرآن، حدیث سے دلیلیں پیش کیں جو بخوف طوالت حذف کرتا ہوں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ مولانا محترم کا نظریۂ عقیدہ قدیم یونانی فلسفۂ توحید سے کیا الگ ہوا۔ قدیم یونانی فلسفۂ توحید بھی تو یہی کہتا ہے کہ خدا قادرِ مطلق ہے لیکن وہ اپنے خاص بندوں میں حلول کر کے اُسے بھی کافی اور کئی قسم کے اختیارات دے دیا کرتا ہے اور اپنا عکس اپنے خاص بندوں کے ذریعہ اپنی مخلوق کو دکھاتا ہے۔ اسی لئے بیک وقت کئی خدا ہوتے ہیں جو بعض اوقات جزو کل تک کے اختیارات رکھتے ہیں۔ مولانا ابوالقاسم صاحب نے صحیفۂ آسمانی واحادیث سے دلائل پیش کئے کہ حضور اختیارات کلی زندگی وبعد وصال کے بعد بھی رکھتے ہیں۔ فرمایا کہ حضورؐ نے کہا ہے اللہ مُعطی اَنَا قَاسِمٌ لہٰذا اللہ نے حضور کو معجزہ اور اختیارات کلی دے کر دنیا پر مبعوث کیا۔ واضح رہے کہ قدیم یونانی فلسفۂ توحید کا ایک جزیہ بھی ہے کہ بعض چیزوں مثلاً آگ، پانی، زمین، آسمان کو اختیارات کلی دے کر دنیا میں بھیجا گیا ہے تو کیا مولانا موصوف کے نظریۂ توحید سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اُس بڑے اللہ نے حضورؐ کو اختیارات جزئی یا کلی دیکر بھیجا کہ میری جگہ پر کام کرو نیز دوسری شکل حلول کی مدِّ نظر رہے۔ صاف ظاہر ہوا کہ اللہ بڑا خدا ہے اور حضورؐ چھوٹے خدا۔ بڑا خدا انھیں دیتا ہے تو چھوٹا خدا مخلوق کو تقسیم کرتا ہے۔ پھر یزدان واہرمن میں بھی کوئی خاص فرق نہیں رہا۔ براہِ کرم آپ اس مسئلے پر اظہار رائے فرمائیں۔

الجواب ۱۹؎ :—

دنیا میں کوئی لغو سے لغو اور اندھی سے اندھی بات ایسی نہیں جس کے حق میں بطور دلیل خوبصورت الفاظ کا انبار نہ لگایا جاسکتا ہو۔ عیسائی تین خدا مانتے ہیں اور اس کبیر باطل عقیدے کے لئے انھوں نے اپنی دانست میں دلائل کے قطب مینار کھڑے کر دیتے ہیں۔ خدا کا انکار کرنے والے دہریوں کا لٹریچر بھی کچھ کم نہیں۔ ہر مذہب کفر اور ہر باطل ازم اپنی پشت پر منطقی چرب زبانیوں اور فلسفیانہ نکتہ سنجیوں کی چھاؤنی رکھتا ہے — پھر کیا ان سب کو برحق ہی مان لیا جائے؟

خدا ان تاریک دماغ اور بوالفضول واعظوں سے پناہ میں رکھے جو اپنی طلاقتِ لسانی اور چٹخارے دار لطیفہ سنجیوں سے بچارے سیدھے سادے عوام اور موٹی عقل والے خواص کی کھوپڑیوں میں اپنا اوندھا دماغ اُتارتے اور ان کے صاف و سادہ خیالات کے مائِ صافی میں زہر گھولتے ہیں — مولانا ابوالقاسم صاحب اگر توریت وانجیل کو گھول کر بھی پی گئے ہوں تب بھی خدا اور رسولؐ کے بارے میں ان کی شاعری کوری شاعری سے زیادہ کسی التفات کی مستحق نہیں قرار پائے گی۔ توریت وانجیل کا مطالعہ صرف اسی شخص کیلئے جائز ہے جو ان کی تحریفات کا پول کھولنے اور ان کے بالمقابل

قرآنی صداقتوں کو نمایاں کرنے کی نیت رکھتا ہو لیکن جو شخص انھیں پڑھ کر انھی جیسی بولی بولنے لگے اور قرآن کے عطا کردہ طرزِ فکر کو ماند پڑ جانے دے اس کیلئے یہ مطالعہ احرم الحرام ہے۔

محمدؐ کے سینے میں خدا کا عکس اور پھر اسکے نظارے سے خدا کا جھوم اٹھنا ایسی ہی لطیفہ سنجی ہے جو قرآن کے عطا فرمودہ اندازِ فکر اور تصورات سے کوئی ربط نہیں رکھتی۔ پورا قرآن دیکھ جائیے ایسے خیال و تصور کا سایہ تک نہیں ملے گا۔ وہاں تو محمدؐ بس ایک بندے ہیں۔ ایک بشر۔ ایک ابن آدم۔ جن کی خصوصیت صرف اتنی ہی ہے کہ اللہ نے انھیں اپنا آخری نبی بنایا، ان کے ذریعے آخری دین بھیجا اور ان کی فطرت میں صالحیت کا وہ مستقیم جوہر تخلیق فرمایا جس کے اثر سے ان کی پوری زندگی اخلاقِ حسنہ کے سانچے میں ڈھل گئی۔ بس۔ اس سے آگے کوئی ایسی بات نہیں ملتی جو حسن و جمال اور آئینہ و عکس کے لطائف کے لئے بنیاد فراہم کر سکے۔

یہی حال احادیث کا ہے ــــ احادیث سے مراد روایاتِ صحیحہ معتبرہ ہیں نہ کہ وہ کہانیاں جو لوگوں نے احادیث کے نام سے گھڑ لی ہیں۔ ان میں بھی ایسی کوئی چیز نہیں ملتی جو اللہ اور رسولؐ کے بارے میں ایسے طرفہ خیالات اور ایسے بے تہہ لطائف کے لئے جواز دے سکے۔ حضورؐ اللہ کے بالمقابل اپنے کمالِ عجز و احتیاج اور شانِ عبدیتؐ و بشریت کا اسی شدت، بے ساختگی اور بیتابی کیساتھ اعتراف و اقرار کرتے ہیں جس کا تصور کسی عاجز ترین بندے کے لئے کیا جا سکتا ہے۔ وہ نہیں بتاتے کہ ان کے اور خدا کے مابین آئینہ و عکس کی بھی کوئی کہانی ہے۔ آئینہ و عکس کے بارے میں ہم آپ سے مولانا ابو القاسم کے دلائل ضرور دریافت کرتے تاکہ ان کا جائزہ لے سکیں لیکن انما انا قاسم و اللہ یعطی والی آیت سے کسی استفسار کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ یہ تو وہی حدیث ہے جسے شیطان مدت سے اپنے مشن کے حق میں استعمال کر رہا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا تھا کہ میں تو فقط تقسیم کرنے والا ہوں عطا کرنے والا تو اللہ ہی ہے۔ بالکل صاف و سادہ بات۔ تمام صحابہؓ، تابعینؒ اور ائمہؒ و فقہاء نے بلا تامل اس کا مطلب یہی لیا اور یہی لینا ہی چاہئے تھا کہ احکامِ شریعت کے جو لعل و جواہر اور اخلاقِ حسنہ کی جو گراں قدر تعلیمات حضورؐ دنیا کو دے رہے ہیں وہ انکے اپنے دل و دماغ کا خزانہ نہیں ہیں بلکہ وہ تو آپ پر اللہ نے نازل فرمائی ہیں اور آپ کا کام بس اتنا ہے کہ اس عطائے ربانی کو بندوں میں تقسیم فرما دیں۔ نیز جو فتوحات آپکی غلامی کر کے صحابہؓ کو ملیں، جن نعمتوں سے وہ حضورؐ کی قیادتؐ و رہنمائی میں سرفراز ہوئے وہ سب بھی اللہ ہی کی عنایت کردہ تھیں حضورؐ تو اس گنجینۂ عنایات کے لئے صرف وسیلہ بنائے گئے تھے۔

لیکن جس شیطان نے یہود کے دماغ میں حضرت عزیرؑ کے لئے اور نصرانیوں کے سروں میں حضرت عیسیٰؑ کے لئے مشرکانہ عقیدتوں کی تخم ریزی کی اور صراطِ حق سے بہکا لے گیا اسی نے بہت سے مسلمانوں کی کھوپڑیوں میں یہ سراسر لغو و باطل خیال داخل کیا کہ محمدؐ تو ذیلی خدا ہیں۔ انھیں جملہ اختیارات تفویض کر دیئے گئے ہیں۔ وہ خدا ہی کی طرح ہر جگہ موجود، ہر غیب کے عالم، ہر جلی و خفی کے شاہد اور کائنات میں ہر ترمیم و تغیر کے مجاز ہیں۔ العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ سیرت کے جلسوں میں عموماً مبالغہ آرائیاں ہی ہوتی ہیں کہاں تک آپ سوال کریں گے اور کہاں تک ہم تردید میں سر کھپائیں گے۔ یہ سیرت کے جلسے بھی دراصل کھیل کے میدان بن گئے ہیں۔ یہاں ہاکی اور فٹ بال تو نہیں کھیلے جاتے لیکن شیوہ بیانی اور خطابت، لطیفہ سنجی اور سماں بندی کے مقابلے ضرور ہوتے ہیں۔ یہاں قلب و روح کے زخموں کا علاج مرہم سے نہیں مارفیا کے انجکشنوں سے کیا جاتا ہے تاکہ کچھ دیر کے لئے ٹیس اور کرب کا احساس ہی ختم ہو جائے۔ یہاں شاعری اور مصوری ہوتی ہے، یہاں حسین الفاظ موتیوں کی طرح برستے ہیں اور سامعین کے قلوب

روح کی سطح پر سے اس طرح پھسلتے چلے جاتے ہیں جس طرح گنبد سے اخروٹ۔

خلاصۂ جواب یہ ہے کہ دَورِ حاضر بڑے فتنوں کا دَور ہے۔ جوں جوں انسان سائنس میں ترقی کر رہا ہے ووں ووں شیطان اپنی فنکاریوں میں ترقی کر رہا ہے۔ اسلام کو ایک انقلاب انگیز اور اقدامی دین کے مقام سے ہٹا کر دنیا کے رسمی مذاہب کی شکل دے دینا اور اس شکل پر عوام ہی کو نہیں اچھے اچھے دانا خواص کو مطمئن کرتے چلے جانا ایسی شاندار فنکاری ہے کہ سائنس کی بڑی سے بڑی ایجاد اس کے مقابلے میں پستہ قد نظر آتی ہے۔ رسمی مجالسِ سیرت اور فصلی میلاد، خانقاہی تصوف کے ہنگامے اور موسمی عید بقر کشف و کرامت کے بازار اور نعت و منقبت کے غلو آمیز ترانے سب اس جال کے پھندے ہیں جو شیطان کی پنہاں قیادت میں ملّتِ مسلمہ خود اپنے گرد کس رہی ہے۔ جس طرح سنیما کے پردے پر کہانیاں حقیقت کا جامہ پہنکر آتی ہیں لیکن کرداروں کی ذاتی زندگی، حقیقی جذبات اور اصلی حیثیت کا ان سے واقعتہً کوئی بھی تعلق نہیں ہوتا اسی طرح ہمارے اکثر واعظ، خطیب، صوفی، پیر، نعت خواں، عالم اور شیخ شاندار ایکٹر بن گئے ہیں (اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہ)

غسل و حیض

سوال ۲۰:۔ از محمد عبدالسلام ۔ موسیٰ سیٹھ

قرآنِ مجید میں عورت کو حالتِ حیض میں زن و شوہر کے تعلق سے روکا گیا ہے۔ جب حیض سے پاک ہو جائیں تو مقاربت کی اجازت عام ہے۔ اب شک اس بات کا ہے کہ مقاربت کے لئے حیض کے بند ہو جانے کے بعد غسل شرط ہے جیسا کہ نماز کیلئے ہے یا نہیں۔ اگر غسل مقاربت کی خاطر شرط ہے تو دلیل کیا ہے؟ جواب مدلل مع تفصیل کے ہو۔ نیز اس مسئلے میں کسی مسلک کا اختلاف رہا ہے؟ یہ بھی درج فرمائیں۔

الجواب ۲۰:۔

بعض فقہاء کہتے ہیں کہ حیض بند ہو جانے کے بعد غسل بھی جوازِ معاشرت کی شرط ہے اور بعض اسے شرط نہیں مانتے صحیح تر بات دوسری ہی ہے۔ مباشرت صرف دورانِ حیض میں حرام ہے۔ حیض بند ہو گیا تو حرمت ختم ہوئی۔ ہاں نظافت اور شائستگی اسی میں ہے کہ غسل سے پہلے مباشرت نہ کیجائے اس پہلو سے قبل از غسل مباشرت میں کراہت بہرحال مسلّم ہے۔ اس سے زیادہ اس مسئلے پر گفتگو ہمیں ضروری نہیں معلوم ہوتی۔

شفاعت کی حقیقت

سوال ۲۱:۔

قُلْ لِّلّٰہِ الشَّفَاعَۃُ جَمِیْعًا اس فرمان کے تحت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا کیا درجہ ہے۔ ہم مسلمانوں کا ایمان ہے کہ نبی اکرم صلعم شافعِ محشر ہیں۔ نیز چھوٹی چھوٹی شفاعتیں بھی ہوں گی جیسا کہ علماء نے کتب احادیث کے حوالے سے میدانِ حشر کا نقشہ پیش کرتے ہوئے غیر نبی کی شفاعتیں بھی گنوائی ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی کیا حیثیت ہوگی و نیز فرمانِ الٰہی قُلْ لِّلّٰہِ الشَّفَاعَۃُ جَمِیْعًا کی تفہیم بھی ہو جائے شفاعت کا مختصر مضمون جس کا مفہوم شک و شبہ سے بالکل بالا ہو، بالتصریح واضح کریں۔

الجواب ۲۱:۔

آپ نے آیت درست نقل نہیں کی۔ سورہ زمر میں یہ الفاظ آئے ہیں قُلْ لِّلّٰہِ الشَّفَاعَۃُ جَمِیْعًا۔ مسئلۂ شفاعت کا خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے دن سفارش کا سلسلہ تو ضرور چلے گا، لیکن دنیا جیسا معاملہ نہیں کہ جس حاکم سے سفارش کرنی ہے اس سے اجازت حاصل کئے بغیر ہی جس کا جی چاہے جس کی چاہے سفارش کرنے پہنچ جائے۔ اس دن خدا کے حضور صرف ایسے ہی لوگوں کی سفارش کی جا سکے گی جن کی سفارش کا اذن اللہ تبارک و تعالیٰ دے گا اور وہی ہستیاں سفارش کر سکیں گی جنھیں اذن دیا جائے گا۔

سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تو معلوم ہے کہ وہ اللہ کی اجازت سے کچھ لوگوں کی سفارش

ضرور فرمائیں گے لیکن اور بھی کچھ ہستیاں یہ اجازت پاسکینگی یہ بحث طلب ہے - یہاں ہم بس اتنا ہی کہیں گے کہ چاہے واقعہ یونہی پیش آئے کہ اللہ تعالیٰ حضورؐ کے علاوہ بھی کچھ بزرگوں کو شفاعت کی اجازت دیدے لیکن جو بے قید اور کامل یقین بعض حلقوں میں بزرگوں کی شفاعت کے بارے میں پایا جاتا ہے وہ نہایت مہلک اور گمراہ کن ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ کسے سفارش کی اجازت مل سکے گی اور کسے نہیں اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ کن لوگوں کی سفارش ہوسکے گی اور کن کی نہیں - حضورؐ کو شفاعت کی اجازت مرحمت ہوگی یقینی ہے، لیکن کن کن کے حق میں ہوگی یہ معلوم نہیں - احمق اور کج فہم لوگ اس خیال میں مگن ہیں کہ ہماری سفارش حضورؐ تو بہر حال ضرور ہی کریں گے، لیکن وہ نہیں جانتے کہ اس کی کوئی گارنٹی نہیں ہے - حضورؐ بھی فقط انھی لوگوں کی سفارش کرسکینگے جن کی شفاعت کی اجازت بارگاہ ربانی سے انھیں ملجائیگی جن کے لئے اجازت نہ ملے ان کی شفاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لہذا ہر مسلمان کو امیدِ شفاعت کے ساتھ ساتھ خود کو اس لائق بنانے کی بھی کوشش کرنی چاہیئے کہ اس کی شفاعت کا اذن اللہ تعالیٰ عطا فرمادیں - یہ نہیں کہ شفاعت کے زعم میں طاعت و تقویٰ سے لاپرواہ ہوجایا جائے - قُلْ لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا (کہدو اے محمد اللہ ہی کے اختیار میں ہے تمام سفارش) اس کا مطلب یہی تو ہوا کہ کافروں نے بتوں اور دیوی دیوتاؤں کو یا مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر بزرگانِ امت کو قیامت کے دن جو اپنا شفیع سمجھ رکھا ہے تو ضروری نہیں کہ ہر شخص کی توقعات پوری ہی ہوں، وہاں صرف وہی ہستیاں شفاعت کرسکینگی جن کو اجازت عطا کی گئی اور جن مجرموں کی سفارش ہونی ہے وہ بھی اللہ ہی کی جانب سے نامزد کئے جائیں گے - اس طرح بلا ابہام معلوم ہوگیا کہ ہر طرح کی شفاعت شفیع اور مشفوع دونوں کے اعتبار سے اللہ ہی کے دستِ رضا میں ہے - ایسا نہیں کہ جس کا جی چاہا سفارشی بن بیٹھا اور جس کی چاہی سفارش کردی - بس اس سے زیادہ اس مسئلہ میں دماغ کھپانے کی ضرورت نہیں -

ایصال ثواب

سوال ۲۲ :- (ایضاً)

(۱) تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲) وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ

یہ فرمان الٰہی عام ہے تو پھر کیا بات ہے کہ اکثر علماء ایصال ثواب کے قائل تو قائل بڑے شد و مد سے عامل ہیں - کیا دین میں امپورٹ اکسپورٹ ہے اگر کوئی وسیع المشرب عمداً ایصال ثواب کی نیت سے مروّجہ دعوت نہ کرے یا کوئی خیر خیرات (سوائے دعا کے) بھی نہ کرے تو عند اللہ ماخوذ ہوگا صحیح مسلک کیا ہے ایصال ثواب کی نوعیت کیا ہے کتاب و سنت کی روشنی میں واضح کریں - مولنا مودودی کی کتاب رسائل و مسائل میں اس مسئلے سے اطمینان و سکون نہ ہوا اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے راشدین نے ایصال ثواب کی نیت سے کوئی دعوت نہیں کی - مجھے اپنے قصور علم کا اعتراف ہے، اس بارے میں مجھے کوئی صحیح اور پکی قابل حجت دلیل نہیں ملی - ایک بات ذہن میں ہمیشہ کھٹکتی ہے کہ اگر ایصال ثواب سے میت کو فائدہ ہوتا ہے تو ظالم، خائن، مشرک، بدعتی اور آپکی اصطلاح میں قبوری مسلمان کے حق میں ایصال ثواب کی حیثیت و وقعت کیا ہوگی - آئے دن ہم مسلمانوں میں اکثر ان مسئلوں پر بحث ہوا کرتی ہے - براہ کرم صحیح مسلک با لتحقیق واضح کیا جائے -

الجواب ۲۲ :-

مولانا مودودی کی تصریحات اس وقت ہمارے سامنے نہیں لیکن ان کی تحریر نے بھی آپ کو مطمئن نہ کیا تو ہم بیچارے کیا مطمئن کرسکیں گے - ویسے اس مسئلے میں پہلے بھی ہم اظہار رائے کرچکے ہیں - اب بھی بقدر کفایت کچھ کہتے ہیں -

ایصالِ ثواب کے مسئلے کو سمجھنے میں کوئی دِقت نہیں رہے گی اگر آپ لینے اور دینے کا فرق اچھی طرح سمجھ لیں۔ زید کتنا ہی ضرورت مند ہو اسے یہ اختیار نہیں کہ بالجبر کسی سے کچھ پیسے وصول کر لے لیکن وہ اگر دولت مند ہے تو اپنی خوشی سے لاکھوں روپے ضرورتمندوں میں تقسیم کر سکتا ہے۔

اسی طرح ایک مقروض یہ اختیار نہیں رکھتا کہ قرض لی ہوئی رقم کا کوئی جزوی حصّہ بھی اپنے ذمّے سے معاف کر لے مگر جس نے قرض دیا ہے وہ مختار ہے کہ چاہے ساری رقم معاف کر دے۔

اور اسی طرح آپ اگر کسی کو ناحق تکلیف پہنچائیں گے تو ظالم کہلائیں گے، سزا کے مستحق ٹھیریں گے، لیکن آرام پہنچانے میں ایثار کریں گے تو کوئی آپ کو مطعون نہیں کرے گا۔

گویا اصول یہ بنا کہ حق دینے اور لینے کا معاملہ یکساں نہیں ہے۔ لینے کے لئے تو ضروری ہے کہ آپ اپنے حقدار ہونے کی شہادت رکھتے ہوں لیکن دینے کے لئے ایسی کوئی شرط نہیں۔ آپ شوق سے اپنے تمام حقوق یہاں تک کہ اپنے تن کے کپڑے بھی دوسروں کو بخش دیں تو کوئی آپ کا ہاتھ نہیں پکڑے گا، لیکن دوسروں کا کوئی معمولی سا حق آپ مارنا چاہیں یا تکلیف پہنچانے کا ارادہ فرمائیں تو دنیا اور دین دونوں کا قانون آپ کی گردن دبائے گا۔

یہی صاف و سادہ حقیقت ہے جس کی طرف آیت لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی رہنمائی کرتی ہے کوئی بوجھ ڈھونے والا کسی اور کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔ وِزر (بوجھ) کا اطلاق ظاہر ہے خوشگوار چیزوں پر نہیں ہوتا اس سے مراد تکلیف اور سزا ہی ہو سکتی ہے۔ بات یہ بنی کہ زید نے اگر کوئی جرم کیا ہے تو اسی کو اس کی سزا بھگتنی چاہئے۔ وہ چاہے بھی تو اس کی سزا کا کوئی حصہ ایسے کسی فرد کو نہیں دیا جا سکتا جو اس جرم سے بری الذمہ ہے۔

لیکن یہ بات اس آیت سے ثابت نہیں ہوتی کہ زید اگر کسی کارِ خدمت کے نتیجے میں انعام کا مستحق قرار پائے تو انعام کا بھی کچھ حصّہ یا کُل انعام کسی دوسرے کو نہیں دے سکتا۔ وہی لینے اور دینے کا فرق۔ انعام اس کا حق ہے وہ چاہے تو راہ چلتے کو عطا کر دے مگر سزا ایسی چیز نہیں جس پر "حق" کا اطلاق ہو سکے۔

ایصالِ ثواب کا نام آپ نے سنا مگر ایصالِ گناہ کا نام کبھی نہ سنا ہوگا۔ ثواب آپ کے اعمالِ حسنہ کا انعام ہے۔ آپ کی دولت ہے۔ آپ اس میں کسی اور کو حصّے دار بنانا چاہیں تو عقلِ سلیم اور قانونِ عدل اس پر انگلی نہیں اُٹھاتا۔ لیکن گناہوں کی سزا رنج داذیت سے عبارت ہے اسے آپ کسی اور کے سر ڈالنا چاہیں گے تو عقل و عدل دونوں آپ کی راہ میں حائل ہو جائیں گے۔

البتہ ثواب چونکہ مادی دولت نہیں ہے اس لئے اس پر آپ کا قبضہ بھی نہیں ہے۔ آپ جیب کے پیسے کی طرح اسے صدقہ نہیں کر سکتے۔ آپ بس اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ جس بااختیار ہستی کا اس پر قبضہ ہے اس سے التماس و التجا کریں۔ درخواست دیں کہ میرے ثواب کا اتنا حصّہ فلاں شخص کو بخشدیا جائے۔ اب یہ اس ہستی کے اختیار میں ہے کہ آپ کی درخواست قبول کرے یا رد کر دے۔

یہیں سے ظالم، خائن، مشرک اور بدعتی وغیرہ کا مسئلہ حل ہو گیا۔ آپ اگر پورے طور پر جانتے ہیں کہ فلاں شخص حالتِ شرک میں مرا ہے تو اس کو ثواب پہنچانے کی درخواست نہ صرف رائیگاں جائے گی بلکہ اُلٹا آپ کے حصّے میں عذاب کا اندراج کر دے گی کیونکہ مشرک کو معاف نہ کرنے کا آسمانی فیصلہ آپ کو پہنچ چکا پھر بھی آپ اسے بخشوانا چاہیں تو یہ اللہ کے بالمقابل جسارت اور ڈھٹائی ہو گی۔

اور اگر آپ کو ایک شخص کے مشرک ہونے کا علم نہیں لیکن وہ تھا عنداللہ مشرک ہی تو ایصالِ ثواب کا فعل آپ کے حق میں عتابِ الٰہی کا مستوجب تو نہیں ہوگا مگر رائیگاں ضرور جائے گا۔ ہاں ظلم و خیانت اور بدعت و معصیت کا معاملہ شرک سے مختلف ہے۔ یہ سارے مجرم ایسے ہیں جن کی معافی ممکن ہے لہذا آپ کا ایصالِ ثواب ضروری نہیں کہ اکارت ہی

ایک کہانی ایک حقیقت

دریا میں طوفان آیا ہوا تھا۔ ایسا لرزہ خیز اور غارتگر طوفان جس کی قہر سامانیوں کو دیکھکر بوڑھا آسمان بھی حیرت سے دم بخود تھا۔ خروش اتنا کہ بڑے بڑے کوہ پیکر ایوان غضبناک موجوں کی ٹھوکروں میں تنکوں کی طرح بہے چلے جا رہے تھے۔ عظیم الجثّہ جہازوں کے لنگر ٹوٹ چکے تھے۔ بپھری ہوئی لہریں پہاڑوں تک کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کے انداز میں سر پٹک رہی تھیں۔

پھیلاؤ اتنا کہ دور دور تک کوئی پناہ گاہ باقی نہیں رہی تھی۔ موت چیل کوؤں کی طرح منڈلا رہی تھی۔ مرنے والوں کا شمار ہی نہیں تھا۔ گلی گلی، قدم قدم لاشے پر لاشے۔ کون کسے کہاں دفن کرتا۔

اور یہ طوفان عارضی نہیں مستقل تھا۔ برسوں پہلے نہ جانے کب اس کا آغاز ہوا تھا اور اسی دریا میں اس نے بچپن سے لے کر جوانی تک کے مراحل طے کئے تھے۔ کون جانے یہ کبھی ختم بھی ہوگا یا نہیں۔ قدرتی طوفان اُٹھتے ہیں اور قلیل سی مدت میں ختم ہو جاتے ہیں لیکن جو طوفان خود انسان ہی کا اُٹھایا ہوا ہو اس کے بارے میں پیش گوئی کون کرسکتا ہے۔

چونکیے نہیں۔ یہ سچ مچ ایک مصنوعی طوفان تھا۔ بہت دور جہاں سے اس دریا کا آغاز ہوا تھا انسانوں کے ایک گروہ نے بڑی بڑی پمپنگ مشینیں نصب کی تھیں۔ یہ مشینیں بھاپ اور بجلی کی قوت سے کروڑوں گیلن پانی کو اندر ہی اندر گردش دیکر ایسے ہولناک خروش کے ساتھ باہر پھینکتی تھیں جیسے توپ کا دہانہ گولے اُگلتا ہے۔ پھر یہ پانی دور دور تک قیامت صغریٰ اُٹھاتا چلا جاتا تھا۔

مگر طاقت کی بہرحال کچھ حدیں ہوتی ہیں۔ ایک طویل مسافت طے کرنے کے بعد پانی کا زور گھٹ جاتا تھا۔ اس کے لئے طوفان سازوں نے یہ انتظام کیا کہ تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر پمپنگ کے ذیلی اسٹیشن قائم کئے۔ مشینیں لگائیں۔ یہ دیوپیکر مشینیں پھر سے پانی کو بلوتیں اور نیا خروش عطا کر دیتیں۔ اسی طرح طوفان کا تسلسل دور دور تک قائم رہتا۔

جس بستی میں ہم تھے وہاں کا ذکر ہے کہ بہت سے عقیل و فہیم لوگوں کی ایک جماعت اونچی پہاڑی پر بنے ہوئے ایک محفوظ قلعے میں جمع ہوئی اور بہت دیر تک طوفان اور اس کے مہلک اثرات پر گرما گرم گفتگو ہوتی رہی۔

آخرکار کثرت رائے سے اس نتیجے پر پہنچا گیا کہ جب تک فلاں مقام پر ایک اونچا اور مضبوط بند نہیں باندھا جائے گا بستی طوفان کی مسلسل تاخت سے امن نہیں ہوسکتی۔ یہ نتیجہ اتنا ظاہر و باہر تھا کہ قدرتاً سبھی کو بالاتفاق اسی پر پہنچنا چاہئے تھا لیکن چند افراد ایسے بھی نکلے جن کی رائے تھی کہ بند کے جھنجھٹ میں نہ پڑا جائے بلکہ بستی بھر میں گھر گھر پہنچکر لوگوں کو تلقین کی جائے کہ وہ اپنے اپنے طور پر طوفان سے بچنے کی کوشش کریں۔ گھروں کے گرد مضبوط احاطے بنائیں۔ اکثر وقت آگ روشن رکھیں تاکہ طوفانی ہواؤں کی رطوبت صحت کو برباد نہ کرسکے۔ اونچی اونچی پہاڑیاں تلاش کر کے ان پر ڈیرے ڈالیں وغیر ذالک۔

اس رائے کو صائب نہیں سمجھا گیا۔ بند ہی بنانے کی تجویز پر بحث تمام ہوگئی۔

"مگر ساز و سامان کہاں سے آئے گا؟" کسی نے پوچھا۔

"ہم بستی والوں سے چندہ کریں گے" جواب دیا گیا۔

پھر ارباب کار نکل کھڑے ہوئے۔ چندہ ملا۔ اچھا خاصا ملا مگر اتنا نہیں ملا کہ مطلوبہ بند کی صرف بنیادیں ہی بھر سکیں

جا سکتیں۔ مجبوریہ تھا کہ لوگ طوفان کے خوگر ہوگئے تھے اور خوگر اس لئے ہوگئے تھے کہ یہ طوفان ہڈی اور گوشت کو نہیں ڈبوتا تھا۔ ڈبونا تو درکنار اس کی موجیں ہڈی اور گوشت کے مجموعے ـــــ جسم کو پہلے سے کچھ زیادہ ہی خوشنما بناتی ہوئی گزرتی تھیں۔ بس اتنا ہوتا تھا کہ ان موجوں کے قطرے قطرے میں سمایا ہوا زہر مسامات کی راہ سے گذر کر بڑی خاموشی کے ساتھ اُس حقیقی انسان کو موت کی نیند سلا دیتا تھا جو ہمیشہ دل و دماغ ہی کی دنیا میں جنم لیتا آیا ہے۔ اِسی طرح یہ طوفان لوہے اور پتھر کی بنی ہوئی عمارتوں کو تباہ نہیں کرتا تھا بلکہ ان قلعوں اور حصاروں کو ڈھاتا تھا جو روح کے تحفظ کیلئے انسان کے دل و دماغ میں تعمیر ہوا کرتے ہیں۔

بستی والوں نے ابتداءً تو کچھ محسوس کیا تھا کہ ان کے اندر ہی اندر شکست و ریخت کا ایک مسلسل ہنگامہ برپا ہے مگر پھر وہ عادی ہو گئے تھے اور اسی لئے بہت سے لوگوں نے یہ کہہ کر چندہ دینے سے انکار کر دیا کہ اس طوفان سے ہمیں کیا لینا ہے اسے دنادنانے دو ہم بند کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

کام بہرحال شروع کیا گیا۔ جو لوگ بظاہر انجینیرنگ کے اہل معلوم ہوتے تھے ان کی رہنمائی میں مرمار کے کچھ ستون کھڑے ہی کر لئے گئے مگر یہ فولاد کے نہیں تھے۔ سرمائے اور وسائل کی کمی نے مجبور کیا تھا کہ جو ناگارا جو بھی ہاتھ لگے اسے تھوپ تھاپ کر ستون بنائے جائیں اور بنیادوں میں سیسہ پگھلانے کے عوض کوڑا کرکٹ جو کچھ میسر آئے بھر دیا جائے۔

مآل اس کے سوا کیا ہوتا کہ طوفان کی چند ہی موجوں نے اس گھروندے کو توڑ پھوڑ کے برابر کر دیا۔ پہاڑی والے قلعہ میں اجتماع پھر ہوا۔ اب زیادہ زور شور سے وسائل مہیا کرنے کی اسکیم بنائی گئی اور طے کیا گیا کہ بند کا جو بھی حصہ بنے مضبوط بنے۔

طویل جدوجہد کے بعد آخرکار ایک دو ستون ایسے بھی کھڑے نظر آئے جن کو موجوں کا خروش بہ آسانی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا تھا۔ بنانے والوں کے چہرے کھل گئے۔ بہت دنوں بعد طمانیت کی ہنسی ان کے خشک ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ مگر یہ بس رقصِ شرر ہی تھی۔ جلد ہی انھوں نے دیکھ لیا کہ اتنی محنت اور سرمائے سے بنائے ہوئے ستونوں نے فقط اتنا فائدہ دیا ہے کہ چند گلیوں میں پانی کی سطح کچھ کم ہو گئی ہے۔ مگر جو مدت ان ستونوں کی تعمیر میں صرف ہوئی تھی اس میں طوفان کی شدت کئی درجہ بڑھ گئی تھی۔

یہ ہمت نہیں ہارے۔ سرمایہ اور وسائل مہیا کرنے پر شب و روز محنت کر کے انہوں نے بند کا تھوڑا سا حصہ اور تیار کر لیا۔ مگر افسوس جب وہ تیار کر چکے تو انہوں نے دیکھا کہ پہلے بنے ہوئے ستونوں کی کمر خمیدہ ہو گئی ہے اور کفِ در دہن موجیں ان کی بنیادوں میں برمے کی طرح پیوست ہوتی جا رہی ہیں۔

" اب کیا ہو ؟ " نئے اجتماع میں سوال کھڑا ہوا
" ہم بستی کے ایک ایک فرد سے اس کی ساری فاضل دولت حاصل کر لیں تب بھی اتنے بڑے بند کی تعمیر ممکن نہیں۔ "

" دوستو! صرف دولت اور وسائل ہی کا رونا کیوں " ایک دبلے پتلے بدحال سے شخص نے زبان کھولی ـــ " یہ بھی تو سوچو کہیں طوفان میں بھی بند تعمیر ہوتے ہیں ـــ "

" پھر ؟ " کئی ناخوشگوار سی آوازیں ابھریں۔

" طوفان میں بند تعمیر کرنے کا خواب دیکھنے کے عوض ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ کیا ہم میں کوئی فرد ایسا بھی ہے جو پرسکون ہی دریا میں اتنا بڑا بند وجود میں لانے کی صلاحیت رکھتا ہو ـــ "

" چپ رہو " کئی خشمگیں غراہٹیں بلند ہوئیں " ہم تم سے زیادہ معاملات کو سمجھتے ہیں "

پھر محفل برخواست ہو گئی۔ یہ لوگ بزدل نہیں تھے بے حس بھی نہیں تھے۔ ان کے دلوں میں پوری بستی کیلئے درد تھا۔ اُس انسان کیلئے درد تھا جو زہریلی موجوں کی ضرب سے ہڈی اور لہو کے ڈھانچوں کے اندر دم توڑ رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ یہ چلتے پھرتے انسان خود اپنی قبریں ہیں۔

ان کی کوشش جاری رہی۔ بار بار چندوں کے ڈھیر لگے۔ تعمیری سامان زیادہ سے زیادہ اکٹھا کیا گیا۔ بند بنانے کی جانگسل جد و جہد میں کتنے ہی کارکن جان بھی ہار بیٹھے مگر طوفان طوفان تھا۔ ہر دن بڑھتا چڑھتا طوفان۔ اس کا ایک ایک دھارا مہینوں کی محنت کو خاک میں ملاتا ہوا گذر جاتا اور دو اینٹیں جمتی تو چار جمی جمائی اُکھڑ جاتیں۔ دو محلوں میں پانی کا زور گھٹتا تو چار محلوں میں غضبناک موجیں اپنی کسر نکال لیتیں۔ معمار ہانپ رہے تھے۔ خون پسینہ بنکر پانی میں گم ہو رہا تھا اور دیوپیکر لہروں کی زد پر بند باندھنے کی یہ ساری جد و جہد ایسی ہی لگ رہی تھی جیسے چند بالشتئے پہاڑ کو کاندھوں پر اُٹھانے کی مضحکہ خیز کوشش کر رہے ہوں۔

"سنا تم نے — زید کیا کرنے جا رہا ہے؟" ایک ہنگامی اجلاس میں آوازہ اُٹھا۔ یہ اجلاس اسی پہاڑی قلعہ میں فوری طور پر طلب کیا گیا تھا۔

ہاں سُنا۔ وہ احمق ہے۔ خود سر ہے —"

"کیا کرنے جا رہا ہے؟" کسی نے پوچھا

"خودکشی — وہ کہہ رہا ہے ہم قریب والے پمپنگ اسٹیشن پر قبضہ کریں گے —" مذاق اُڑانے والے لہجے میں کہا گیا۔

"یا وحشت! — کیا اسے نہیں معلوم کہ وہاں کتنا زبردست فوجی پہرہ ہے۔"

"کہا نا وہ احمق ہے — وہ کہتا ہے ہم ہتھیاروں کی جنگ نہیں کریں گے۔ ہم پُر امن لیکن فولادی قوت سے کام لیں گے جس کے ذریعہ طوفان سازوں کا گروہ پمپنگ اسٹیشنوں کا جال بچھانے میں کامیاب ہوا ہے۔"

"سائنس؟" حیرت سے سوال کیا گیا۔

"نہیں — رائے عامہ کی قوت — وہ کہتا ہے ہم بستی والوں کو سمجھائیں گے کہ طوفان میں بند باندھنے کی لاحاصل کوششوں میں اپنی قوت دولت اور وقت برباد کرنے کے عوض پاس والے پمپنگ اسٹیشن کو بدنہاد طوفان سازوں کے اقتدار سے نکالنے کے لئے متحد ہو جاؤ۔ یہ اسٹیشن اگر ایسے افراد کے قبضے میں آجائے جو بستی کے بدخواہ نہ ہوں تو مشینوں کا رخ دوسری سمت بھی مڑ سکتا ہے اور رخ مڑنے پر بستی کا سارا نقشہ بدل سکتا ہے۔ پُرسکون دریا میں جہاں چاہے بند باندھنا اور وہ سارے وسائل اطمینان سے استعمال کرنا جو آج طوفان سازوں کے قبضے میں ہیں۔"

"بکواس ہے" — شور بلند ہوا۔

"کیا ہم ایک احمق کے کہنے پر بند کا ارادہ ترک کر دیں؟"

"نہیں —" دبلا پتلا آدمی زور سے چیخا — "زید یہ نہیں کہتا کہ اپنی موجودہ کوششوں کو قطعًا بند کر دو — وہ کہتا ہے کہ کوششیں سب طرح کی جاری رہنی چاہئیں لیکن یہ بنیادی کام ہر حال میں پیش نظر رہے کہ پاس والے پمپنگ اسٹیشن سے دشمن کا اقتدار ختم کرنا ہے۔ جب تک یہ اقتدار باقی ہے طوفان ختم نہ ہوگا بلکہ اور بڑھے گا اور بڑھے گا۔ ایک سے ایک بڑھ کر طاقت ور مشینیں نصب کی جاتی رہیں گی اور اندر والے انسان کو بچانے کی ساری کوششیں ضائع ہوتی رہیں گی —"

"چونچ بند کرو —" ایک بلند پایہ بزرگ دہاڑے۔ یہ اس گروہ کے نمائندے تھے جو فقط اس کا قائل تھا کہ علت و معلول اور سبب و مسبب کی ساری منطق نظر انداز کر کے بس اہل بستی کو سمجھاتے رہنا چاہیئے کہ وہ فرداً فرداً اپنے بچاؤ کی تدبیریں کریں۔ کچھ عرصے سے ان بزرگ نے اجتماعی دعاؤں کا بھی انتظام کیا تھا۔

مجلس اکھڑ گئی —

پھر کئی سالوں بعد جب گوشت اور ہڈی کی متحرک قبروں کے لاشے اس بُری طرح سڑ گئے کہ ان کا دماغ سوز تعفن گلی گلی کوچے کوچے گونجنے لگا۔ ہر شاہ راہ ہر محلے میں بدبو کے فوارے ابل پڑے تو دو عقلمند ترین آدمی پھر اسی پہاڑی قلعے میں جمع ہوئے۔ ان کے چہروں پر گہری سوچ کے آثار تھے۔

"سب بیکار ہے — سب فضول ہے" ایک نے دوسرے سے کہا "جب تک یہ طوفان نہیں تھمتا ہماری کوئی کوشش کارگر نہیں ہو سکتی۔"

"یقیناً نہیں ہوسکتی۔ ہرگز نہیں ہوسکتی"
"کچھ بھی ہو لیکن اس طوفان کو رُکنا ہوگا۔"
"کون روکے گا۔ کس کے بس کی بات ہے۔ ہماری بستی کی ساری جماعتیں، سارے ادارے، سب مل کر بھی کیا اتنی سکت رکھتے یا رکھ سکتے ہیں؟۔ ساری جماعتوں میں لے دے کر ایک۔ فقط ایک گروہ ایسا تھا جو اس مشکل ترین کام کو کرنے کا حوصلہ کرسکتا تھا مگر اس کا تمام تر رخ پمپنگ اسٹیشن والوں سے ٹکر لینے کی طرف مڑ گیا ہے......"

اور دفعتاً زمین سے آسمان تک ایک برق سی لہرائی، طوفان کے جوف سے ایک زلزلہ افگن قہقہہ بلند ہوا اور۔۔۔۔ اور کہانی ختم ہوگئی!

اس کہانی میں بستی سے مراد خدا کی وہ زمین ہے جو آج ہند اور پاک دو ملکوں میں بٹ چکی ہے۔ طوفان باطل افکار و نظریات کے اُس تیز و تند دھارے کو کہا گیا ہے جو اپنے تمام اجزا و عناصر سمیت ان دونوں ملکوں کی پیشانیوں پر چھاتا چلا جا رہا ہے۔ پمپنگ مشینیں وہ فرماں روا گروہ ہیں جو تصور زندگی اور اقدار و افکار کے رخ پر محض کٹھ پتلیاں ہیں جن کی ڈور استادِ مغرب کے ہاتھ میں ہے اور انہی کے ذریعہ ان ملکوں میں وہ نظام تعلیم وہ کلچر اور ثقافت، وہ نظریۂ حیات ارتقائی مراحل طے کر رہا ہے جو آدمی کے دل و دماغ میں اخلاق اور روحانیت کے سارے قدیم سانچے توڑ پھوڑ کر رکھ دینے میں توپوں اور بموں سے زیادہ قوی الاثر ہے۔

اب دیکھئے ۸ر نومبر ۶۳ء کے صدق جدید میں شیخ محترم مولٰنا عبد الماجد دریابادی نے "ہزار سوالوں کا ایک سوال" عنوان دیکر کیا لکھا۔ ان کا پورا صدق پارہ دعوتِ غور و فکر کے ساتھ پیش خدمت ہے۔ پھر جو کچھ ہم عرض کریں اسے بھی آپ فہم کے میزان پر تولیں اور مولٰنا عبد الماجد دریابادی بھی اس پر نگاہ غور ڈالیں تو ان کی شانِ حق پرستی کے عین مطابق ہوگا۔

....

ہزار سوالوں کا ایک سوال

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جو بہ قول ایک دوست کے اپنے وقت کے گویا جمال الدین افغانی ہیں۔ اُن کی ایک بڑی قابل قدر و فکر انگیز زیرِ طبع تصنیف سے:۔

"درخت اگر اپنے طبیعی نظام سے نشو و نما پائے تو وہ اپنے برگ و بار ضرور پیدا کرے گا۔ اور وقت پر پھل لائے گا۔ انسانوں کو اس کا اختیار ہے کہ درخت نہ لگائیں یا اس کو پانی نہ دیں یا جب تیار ہو تو اسکی ہستی کو ختم کر دیں۔ مگر اس کا اختیار نہیں کہ ایک توانا و تندرست اور سرسبز و شاداب درخت کو اپنے نوعی وجود و شخصیت کے اظہار اور وقت پر پھل پھول لانے سے روک سکیں۔

یہی معاملہ مغربی نظام تعلیم کا ہے کہ وہ اپنی ایک روح اور اپنا ایک منفرد ضمیر رکھتا ہے۔ جو اپنے مصنفین و مرتبین کے عقیدہ و ذہنیت کا عکس ہزاروں سال کے طبعی ارتقاء کا نتیجہ۔ اہل مغرب کے مسلمہ افکار و اقدار کا مجموعہ اور ان کی تعبیر ہے۔ یہ نظام تعلیم جب کسی اسلامی ملک یا مسلمان سوسائٹی میں نافذ کیا جائے گا۔ تو اس سے

ابتداءً ذہنی کشمکش

پھر اعتقادی تزلزل

پھر ذہنی اور بعد میں (الا ماشاء اللہ) دینی ارتداد۔

قدرتی ہے...... اس بنا پر آج عالم اسلام میں دو ذہنوں دو فلسفوں دو معیاروں اور دو رخوں کے درمیان جو کشمکش برپا ہے اور جو عام طور پر منتج ہوتی ہے زیادہ طاقتور، مسلح، صاحب اختیار و اقتدار گروہ کی کامیابی پر وہ بالکل قدرتی ہے۔ وہ اگر ہے تو خواہ کتنے ہی تاسف کی بات ہو پر تعجب کی بات نہیں تعجب اس وقت ہوتا جب یہ کشمکش اور یہ تجدد و مغربیت کا رجحان نہ پایا جاتا" (الفرقان۔ اکتوبر ۶۲ء ص ۴۳)

تشخیص کے صحیح اور سو فیصدی صحیح ہونے میں شک نہیں۔ یہ کوئی فلسفہ نہیں دقیق نظریہ نہیں۔ سامنے کا

صاف و صریح واقعہ ہے۔ مشکل سوال اس صحیح تشخیص کے بعد صحیح علاج کا ہے یہاں پہنچ کر مولانا فرماتے ہیں۔

"اس کا علاج (خواہ وہ کتنا ہی مشکل اور کتنا ہی دیر طلب ہو) اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظامِ تعلیم کو از سرِ نو ڈھالا جائے۔ اس کو مسلمان اقوام کے عقائد و مسلمات اور مقاصد و ضروریات کے مطابق بنایا جائے۔ اس کے تمام علوم و مضامین سے مادہ پرستی۔ خدا بیزاری اخلاقی و روحانی اقدار سے بغاوت اور جسم پرستی کی روح نکال کر اس میں خدا پرستی، خدا طلبی، آخرت کوشی، تقویٰ شعاری اور انسانیت کی روح پیدا کی جائے۔ زبان و ادب سے لیکر فلسفہ و نفسیات تک اور علوم عمرانیہ سے لیکر معاشیات و سیاسیات تک سب کو ایک نئے سانچہ میں ڈھالا جائے۔ مغرب کے ذہنی تسلط کو دور کیا جائے اس کی معصومیت و امامت کا انکار کیا جائے۔ اس کے علوم و نظریات کو آزادانہ تنقید اور جراحانہ تشریح (پوسٹ مارٹم) کا موضوع قرار دیا جائے۔ مغرب کی سیادت و بالاسری سے عالم انسانی کو جو عظیم الشان نقصانات پہنچے ان کی نشاندہی کی جائے۔ غرض مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے علوم و فنون کو پڑھا جائے اس کے علوم و تجارب کو خام مواد فرض کر کے اپنی ضرورت اور اپنے قد و قامت اور اپنے عقیدہ و معاشرت کے مطابق اس سے سامان تیار کیا جائے"۔ (ص ۳۵)

لیکن ؎

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات!

یہی تو اصل سوال ہے، کہ یہ سارا کام پیمبرانہ ہمت و عزم و استقامت والا آخر کرے کون؟ یہ کسی کے بس کی بات ہے؟ ہماری انجمنیں اور ہمارے ادارے سب مل کر بھی اتنی سکت رکھتے یا رکھ سکتے ہیں؟ بھلا پورا کوہستان ہمالیہ کیا ہلائے آپ کے دو چار مقالوں اور دس بیس تقریروں سے۔ اپنی جگہ سے ٹل جائے گا؟ —— ساری جماعتوں میں سے دیکھا ایک جماعت اسلامی ایسی ہو سکتی تھی، جو اتنا بڑا اقدام کرنے کا حوصلہ کر سکتی تھی۔ لیکن پاکستان میں اس کا رخ تمام تر حکومت سے ٹکر لینے کی طرف مڑ گیا ہے مصر و انڈونیشیا وغیرہ میں جو اس کے مماثل جماعتیں تھیں۔ اُن کی بھی کسی کارگزاری کی خبر عرصہ دراز سے سننے میں نہیں آئی۔ اور کسی غیر مسلم ملک (مثلاً ہندوستان) میں تو اس عظیم الشان پیمانہ پر فکری جہاد کرنے کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا —— گاڑی یہیں پر آکر اٹک جاتی ہے۔ خدا کرے مولانا نے اس کا کوئی قابل عمل حل کتاب کے کسی حصہ میں پیش کیا ہو۔ یہ ایک مسئلہ تو ام المسائل ہے اور یہی ایک ہزاروں سوالوں کا ایک سوال۔

(صدق جدید ۸ نومبر ۶۳ء)

تجلی

دونوں ہی شیوخِ محترم کو اس پر کلی اتفاق ہے کہ آج عالم اسلام میں ذہنی کشمکش سے لیکر فکری ارتداد تک جو کچھ ہو رہا ہے وہ مغربی نظامِ تعلیم کا لازمی اور ناگزیر ثمرہ ہے یہ نظام ہر حال میں اپنے برگ و بار پیدا کر کے رہے گا۔ اس کے زیر سایہ اعتقادات متزلزل ہو کر رہیں گے۔ دین بیزاری کی فصلِ بہار لہلہا کر رہے گی۔ الحاد و ارتداد سر اٹھا کر رہے گا۔ اس نظام کو بدلے بغیر اور اسے از سرِ نو دوسری ہی قدروں اور اصولوں پر استوار کئے بدون ممکن ہی نہیں ہے کہ مذہب سے انحراف اور دین و اخلاق سے بغاوت کے جذبے دب جائیں۔ خدا پرستی اور آخرت کوشی کی فضا پیدا ہی نہیں ہو سکتی جب تک مغربی نظامِ تعلیم کا پھیلتا امنڈتا سیلاب ہماری بستیوں میں دندناتا پھر رہا ہے۔

یہ ہے وہ نقطہ جس پر دونوں شیوخ متفق ہیں۔ نہ صرف متفق ہیں بلکہ بقول مولانا دریا بادی یہ محوری مسئلہ ام المسائل ہے۔ اس سے بڑھ کر کسی بھی اور شے کی اہمیت نہیں۔ اور ممدوح اس کا بھی پورا احساس رکھتے ہیں کہ اس نامسعود نظامِ تعلیم کو توڑ پھوڑ کر اس کی جگہ مطلوبہ نظامِ تعلیم

لانا اتنا دشوار اور مہتم بالشان کام ہے کہ ہماری ساری انجمنیں اور ادارے مل کر بھی اس کو انجام دینے کی سکت نہیں رکھتے ـــــ نہیں رکھ سکتے۔ ہاں تنہا جماعت اسلامی کو انہوں نے اس کا اہل سمجھا ـــــ مگر اسی آن وہ ایک ایسا موڑ بھی لے گئے جس کی معنویت خود وہی بتائیں تو بتائیں ہماری چھوٹی سی عقل اس کا ادراک نہیں کر سکی ہے۔

کسی بھی ملک میں کوئی بھی نظام تعلیم آسمان سے نہیں برستا۔ اسے وہاں کی حکمران ٹیم ہی تیار کرتی ہے۔ یا اگر وہ پہلے سے تیار شدہ ہے تو اس کے نفاذ یا رد اور اس میں ترمیم یا اضافے کا اختیار بھی اسی ٹیم کو ہوتا ہے۔ ملک کے باشندے تو بس اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ ان میں سے جن افراد کو اس نظام تعلیم سے اختلاف ہو وہ اپنے بچوں کو ان پڑھ رہنے دیں۔ یا پھر اپنی الگ درسگاہیں بنائیں۔ الگ درسگاہیں بنانا ناممکن تو نہیں ہے لیکن حکومت کے نافذ کردہ ملک گیر نظام تعلیم کے مقابلے میں اس کی حیثیت وہی ہوگی جو توپ کے آگے چوبی ڈھال کی ہو سکتی ہے۔ خصوصاً ایسے دور میں جب کہ سائنس کی ترقی نے حکمران پارٹی کے نافذ کردہ فاسد و مہلک نظام کے زہریلے اثرات کو کوچہ کوچہ اور گھر گھر عام کر دینے کے لئے نئے نئے آلات و وسائل مہیا کر دیئے ہیں کوئی بھی معتد بہ نتیجہ چند یتیم و یسیر درسگاہوں سے نہیں نکل سکتا چاہے ان میں فرشتوں ہی کا بنایا ہوا نظام تعلیم کیوں نہ جاری کر دیا جائے۔

پھر آخر نافذ و مسلط مغربی نظام تعلیم کو از سر نو مطلوبہ سانچے میں ڈھالنے اور سارے ملک میں نافذ کرنے کی واحد سبیل اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ اس مقصد عظمیٰ کو حاصل کرنے کے لئے عزم و حکمت کے ساتھ آگے بڑھا جائے اور اُس حکمران ٹیم کو مسند اقتدار سے اتارنے کی جدوجہد کی جائے جو مقصد کی راہ میں کوہ گراں کی طرح حائل ہے۔

احساس مولانا دریابادی کو بھی ہے کہ معاشرے کی روز افزوں بے دینی اور خدا فراموشی کا جو علاج مولانا علی میاں نے واحد علاج قرار دیا ہے وہ ان عظیم وسائل و ذرائع کے بغیر مہیا نہیں ہو سکتا جن پر آجکل حکومتوں ہی کا مکمل قبضہ ایک امر مسلم بن چکا ہے۔ اسی لئے وہ صاف صاف یہ بھی کہتے ہیں کہ ہماری ساری انجمنیں اور ادارے مل کر بھی اس علاج کو مہیا کرنے کی سکت نہیں رکھتے ـــــ نہ صرف نہیں رکھتے بلکہ رکھ ہی نہیں سکتے اور اسی کے ساتھ دفعتاً ان کا ذہن جماعت اسلامی کے لئے اس "سکت" کا امکان تسلیم کر لیتا ہے۔ کیوں؟ کیا جماعت اسلامی بڑی دولتمند جماعت ہے کہ روپے کے زور سے ملک بھر میں نئی درسگاہیں اور نیا نظام تعلیم پھیلا دے گی۔ یا اس کے پاس کوئی جادو کا ڈنڈا ہے جس سے کام لیکر وہ مغربی نظام تعلیم کو مسلط رکھنے والوں کی فولادی مزاحمتوں کو پھونکوں سے اڑاتے ہوئے ایسے تمام ہفت خواں طے کرے گی جن کی لفظی تصویر مولانا علی میاں نے کھینچی ہے۔

ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بھی بات نہیں۔ بات ہے تو صرف یہ ہے کہ مولنا دریابادی کا نارمل ذہن دوسری تمام جماعتوں اور اداروں کے بالمقابل تنہا جماعت اسلامی ہی کے فکر، انداز نظر اور سمت سفر کو منزل مطلوب تک پہنچنے کا وسیلہ تسلیم کر چکا ہے مگر سیاست سے چڑھ اور وضعداری کے تقاضے انھیں اگر مگر کی راہ پر کھینچ لے جاتے ہیں یہ بات نہ ہوتی تو آخر کیسے ایک ہی سانس میں وہ جماعت اسلامی کو دوسری ہر جماعت پر کھلی برتری بھی عطا کر دیتے اور ساتھ ہی "لیکن" کہہ کر اس بنیاد کو بھی ڈھا دیتے جس پر یہ برتری کی دیوار اُٹھی تھی۔ ہم بڑے ادب اور عاجزی سے دونوں ہی بزرگوں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ جو مقتدر گروہ مغربی افکار و اقدار کے ایک ایجنٹ یا ایک ذہنی تابع کی حیثیت سے مغربی نظام تعلیم کو اس کے مقتضیات و مطالبات سمیت کسی ملک میں نافذ و رائج کئے ہوئے ہے اسے بدلنے کی کوشش کرنا اور اس کی جگہ ایسے گروہ کو لانے کی تدابیر ڈھونڈنا جو مطلوبہ نظام تعلیم کے لئے اپنا بھرپور تعاون دے سکے

اگر غلط ہے تو پھر صحیح کیا ہے ؟ ہمیں بتائیے نظام تعلیم میں جس بنیادی اور عظیم الشان انقلاب کے آپ اس درجہ طالب ہیں کہ اسے ہی سب سے اہم مسئلہ بلکہ راس المسائل قرار دیتے ہیں وہ آخر گئے گذرے درجے میں بھی کیسے ظہور میں آسکتا ہے اگر طاقت، سرمایہ اور جملہ وسائل مغربی نظام تعلیم کے عشاق دبائے بیٹھے ہوں

خیال و خواب کی دنیا الگ ہے۔ کہانی کے کردار طوفان میں بند باندھنے کے خواب دیکھتے رہے اور قسمت ہنستی رہی۔ ہم بھی خوابوں سے کھیل رہے ہیں اور تقدیر ہنس رہی ہے۔ فکری جہاد جب تک بدر و احد کے میدانوں میں لوہے اور خون کی چولی نہ بدلے بیت اللہ سے تین سو ساٹھ بت نہیں اٹھ سکتے تھے۔ لطف یہ ہے کہ مولٰنا دریابادی کوئی حل بھی پیش نہیں کرتے ــــ معترف ہیں کہ میری قوت فیصلہ کی گاڑی اٹک گئی لیکن پاکستانی جماعت اسلامی کی یہ کوشش بہرحال ان کی نظر میں معیوب ہے کہ وہ پمپنگ اسٹیشن سے طوفان سازوں کو ہٹانا چاہتی ہے اور چاہتی ہے کہ مغربی افکار و اقدار کو سیلابی انداز میں درآمد کرنے والی مشینوں کے منھ پھیر دے۔

طنز کے نشتر کو مخملین الفاظ کے غلاف میں لپیٹ کر جو سوال مولٰنا نے محترم علی میاں سے کیا ہے اس میں ہم بھی ان کے شریک ہیں مگر ہمیں ان جیسی سخن طرازی کا سلیقہ نہیں ہم تو دیہاتیوں کی طرح یہی پوچھ سکتے ہیں کہ مولٰنا! بلی کے گلے میں گھنٹی کون ڈالے ؟

واحد علاج کے طور پر مولٰنا علی میاں نے اپنی رواں دواں عبارت میں جو مہتم بالشان کام پیش کیا ہے اس کی دشواری کا احساس مولٰنا دریابادی نے بڑی عمدگی سے کیا۔ ان کے یہ الفاظ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں کہ۔

پورا کوہستان ہمالیہ کیا ہمارے آپ کے دو چار مقالوں اور دس بیس تقریروں سے اپنی جگہ سے ٹل جائے گا ؟

لیکن جب پاکستان کی جماعت اسلامی اس کوہستان کو ہلانے اور اس کی جگہ مطلوبہ کوہ طور نصب کرنے کی خاطر تقریر و تحریر سے گذر کر تیشہ و تبر تک پہنچتی ہے تو وہی چلا اٹھتے ہیں کہ مودودی صاحب تو عالم سے لیڈر بن گئے اور تسبیح پڑھتے پڑھتے ووٹ مانگنے لگے، پھر کیا پھوکوں سے یا جادو کے زور سے یہ کوہستان سرکے گا ؟

کتنی مقدس تمنا ہے کہ۔

"خدا کرے مولٰنا نے اس کا کوئی قابل عمل حل کتاب کے کسی حصہ میں پیش کیا ہو"

لیکن تمناؤں سے تقدیریں نہیں پلٹا کرتیں۔ اگر دنیا کے سب سے بڑے انسان اور خدا کے سب سے بڑے پیغمبرؐ کا مشن بھی سیاست و حکومت کی راہوں سے گذرے بغیر تکمیل کو نہیں پہنچا تو نوٹ کیجئے کہ ہزار شیوہ بیاں ادیب، دو ہزار خطیب و واعظ دس ہزار مفکر و مدبر بھی سیاست و حکومت کی وادیوں سے گذرے بغیر الحاد و زندقہ اور خدا بیزاری و اخلاق دشمنی کے اس سیل تند و تیز پر بند نہیں باندھ سکتے جو آچکا ہے۔ جو بڑھ رہا ہے۔ جو اور بڑھے گا۔ پیغمبرؐ کا دور تو پھر ایسا دور تھا کہ طاقت کے خزانے اور وسائل کے ڈھیر چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ہر بستی ایک مستقل دنیا تھی۔ ایک سیر علم سے ہزار من بدی پیدا کرنے کی سائنس لوگوں کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔ فقط چار انگل چوڑی تلوار سے جنگوں کے فیصلے ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن آج پورے ملک کے تمام وسائل اور خزانے ایک ہی گروہ کے ہاتھ میں سمٹ آئے ہیں۔ آج ریڈیو۔ سنیما اور ٹیلی ویژن جیسی ایجادوں کے ذریعے عوام کے دل و دماغ تک پر مقتدر گروہوں کا قبضہ ہے۔ آج دس ایمان افروز خطبوں اور وعظوں کے اثرات کو دل و دماغ سے اچک لے جانے کے لئے ایک فلم، ایک رسالہ، ایک کلچرل شو ایک ریڈیو بہت کافی ہے۔

لیکن ہمارے بزرگوں کو پھر بھی یہی ضد ہے کہ اللہ والوں کو سیاست سے واسطہ نہیں رکھنا چاہئے!

جائے۔ میت کو فائدہ پہنچا نہ پہنچا لطے خود مسئلہ نہیں ہم صرف دعا کر سکتے ہیں قبول ورد اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

ائمہ کے مابین اس بارے میں اختلاف ہے کہ کون سے اعمالِ حسنہ کا ثواب دوسروں کو پہنچایا جا سکتا ہے اور کونسوں کا نہیں۔ بعض کے نزدیک بدنی عبادتوں کا ثواب بھی پہنچایا جا سکتا ہے مگر بعض کہتے ہیں کہ صرف مالی عبادات کا۔ حقیقت جو بھی ہو۔ ایصالِ ثواب در اصل جذبۂ ایثار کی نمود ہے اور یہ اگر صرف رسم بن کر نہ رہ جائے تو اس سے ایثار و قربانی کے جذبات فروغ پاتے ہیں۔

ویسے آج کل جو ایصال ثواب چل گیا ہے اسکی منطق ہماری سمجھ میں نہیں آسکی۔ جسے دیکھو بڑے بڑے بزرگوں اور ولیوں کو ایصال ثواب کر رہا ہے۔ فلاں قطب کی فاتحہ فلاں پیر کی دیگ۔ فلاں شہید کا حلیم۔ یعنی بھرتوں ہی کو بھرا جا رہا ہے اللہ کے بندو بھوکوں کو روٹی کھلاؤ ضرورتمندوں کو ہدیہ دو۔ یہ کیا کہ جہاں تمہاری دانست میں ثواب و اجر کی کھاتیاں بھری ہوئی ہیں وہیں تم بھی اپنے تھلیاں روانہ کر رہے ہو اور جہاں مخلوق دانے دانے کو ترس رہی ہے وہاں ایک بوری بھی بھیجنے کے روادار نہیں۔ ثواب بزرگوں کو بھیجنا بھی شرافت ہی کی دلیل ہے کیونکہ وہ ہمارے محسن ہیں۔ محسن کی قدرشناسی اور سپاس گزاری ایک اعلیٰ وصف ہے لیکن گناہگاروں کو ثواب بھیجنا بہرحال ایک ضرورت ہے۔ ضرورت پوری ہو جائے تو فاضل چیزیں بھی اچھی لگتی ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مستقل عنوان

از: مُلّا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

میرے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی۔ نسیمہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہ اگر واقعی مذاق نہیں تھا تو پھر یقیناً میری موت ہی کا پیغام تھا۔ موت صرف سانس بند ہو جانے کا نام نہیں۔ موت یہ بھی ہے کہ آدمی بڑے شوق سے ایک پروگرام بنائے اور آپ عین وقت پر اُس کی دُم میں نمدہ باندھ دیں۔ دُم میں نمدہ بہت بُرا محاورہ ہے مگر اس سے بُرا کوئی محاورہ آپ بتائیں تو میری اس وقت کی حالت پر وہ ضرور صادق آئے گا۔ طیش اور خوف کے ملے جُلے عالم میں میں نے اسے گھورا۔ اس کے چہرے پر شرارت کی کوئی علامت نہیں تھی۔ — ویسے وہ سدا بہار تبسم کی سکون بخش چاندنی ضرور اس کے لب و عارض پر پھیلی ہوئی تھی جو شاید قبر میں بھی اس کے ساتھ ہی جائے گی۔

"میں اس وقت مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں بیگم صاحبہ! — سمجھیں" میں نے کھرے پن سے کہا "لاؤ کھانا لاؤ گاڑی تین بجے چھوٹ جاتی ہے اور اب بارہ بج چکے ہیں۔"

"آپ مذاق سمجھ رہے ہیں — حالانکہ میں ابھی آپ کو بھیا کا دیا ہوا لفافہ دوں گی — وہ اندر میز پر رکھا ہے۔" اس نے دُھلے ہوئے قمیص کو اطمینان سے نچوڑتے ہوئے کہا۔

"کیا ضروری تھا کہ وہ تمھیں یاد ہی رہا؟" میں جھلا کر بولا "شام کو اپنے بھیا سے کہہ سکتی تھیں کہ میں دینا بھول گئی اور وہ تین بجے چلا گیا۔"

"وہ چلتے چلتے کہہ گئے تھے کہ خبردار بھولنا مت — میں نے کوشش کی تھی کہ بات پھر پر ٹل جائے لیکن وہ کہاں ماننے والے ہیں۔ کہہ گئے کہ مضمون کل شام تک کاتب کو پہنچ جائے ورنہ ۔ ۔ ۔" وہ کہتے کہتے جھجک گئی۔

"ورنہ کیا — پھانسی پر چڑھا دیں گے — بس بس اب اتنا بھی گیا گذرا نہ سمجھو کہ سارے ہی معاملات میں ان کی لاٹ صاحبی مان لوں گا۔ ہُنہہ ۔ ۔ ۔"

"مجھے کیا سُناتے ہیں۔ میں کب کہتی ہوں اُنکی لاٹ صاحبی مانیئے۔" اس کا لہجہ قطعاً پُر سکون تھا۔

"بس اُڑو مت — میرا پروگرام اٹل ہے۔ تم ان سے کہہ سکتی ہو کہ میں ذکر ہی کرنا بھول گئی تھی۔"

"نہیں جناب — وہ مان ہی نہیں سکتے کہ ان کی تاکید کے باوجود میں بھول سکتی ہوں۔"

"تو کہہ دینا وہ دوپہر میں گھر آیا ہی نہیں — باہر ہی باہر اللہ کو پیارا ہو گیا —"

"کیسے تسلیم کریں گے۔ آپ کا بندھا بندھایا بستر تو دیکھ ہی گئے ہیں — کہہ رہے تھے اسے کھولڈ الو —"

"مر گئے کھولنے والے — ارے میں خوب سمجھتا ہوں یہ تمھاری ہی سازش ہو گی — ورنہ کل تک تو یہ بالکل طے تھا کہ اس مرتبہ میری چھٹی رہے گی۔"

"مجھے بھی معلوم ہے طے تھا — مگر شاید تقاضوں کے خطوط زیادہ آ گئے ہوں۔"

"بہت آئے خطوط — پندرہ دن سے ڈاک میں خود لا رہا ہوں۔ اپنے کسی دشمن کا خط — کم سے کم اس پندھرواڑے میں تو میں نے ان تک پہنچنے نہیں دیا۔"

"پھر میں کیا جانوں فیصلہ کیوں بدل گیا — وہ غالباً کلکتے کے اخبار "آزاد ہند" کا تراشہ ہے جس پر لکھنے کو کہہ گئے ہیں۔"

"وہ آزاد امریکہ کا بھی تراشہ کیوں نہ ہو میرے حصّے کی آزادی تو تم نے اور تمہارے بھیا نے ایڑیوں میں رگڑ کر رکھدی ہے۔"

"مجھ غریب پر برسنے سے بھلا کیا نتیجہ ہوگا؟" وہ اتنے پُرسکون لہجے میں بول رہی تھی جیسے ہم چشم بددور پیار کی میٹھی میٹھی باتیں کر رہے ہوں۔

"نتیجہ تو میری موت سے بھی کچھ نہیں ہوگا — مگر میں جانتا ہوں تم نہیں چاہتیں کہ ملّا سوختہ قسمت کو تفریح کی چند ساعتیں میسر آسکیں — ذرا سوچو تو آٹھ روز سے پروگرام سیٹ ہے۔ مولوی منقار اور میر لطافت نے بڑے شاندار مرغے اور ہرن کے کباب راستے کے لئے بنوائے ہیں۔ مرزا افضل حسین نے گاؤں سے خالص دودھ منگا کر فیرنی تیار کرائی ہے ...."

"ہائے اللہ تو آپ رات تک دو چار صفحے گھسیٹ ہی جو دیجئے صبح چلے جائیے گا۔"

"بات کرتی ہو۔ اے آج ہی رات کو تو دہلی کے ایک صوفی صاحب کے یہاں بڑی ٹکر کی قوالی ہے۔ پونا اور اجمیر کی جوڑیاں آئی ہوئی ہیں۔ ساڑھے آٹھ تک ٹرین دہلی پہنچ جائے گی اور اسٹیشن پر خواجہ بقاء اللہ کی نئی کار ہمیں ریسیو کرے گی — پھر اسی کار سے اگلی صبح ہم لوگوں کو آگرہ جانا ہے۔"

"آپ بھول رہے ہیں ....." اس نے ہونٹوں پر طنز کا تبسم چھلکاتے ہوئے کہا "آپ کا خیال تھا کہ آپ کو کسی آل انڈیا اُردو کانفرنس میں جانا ہے۔"

"آں ... ہاں — جانا تھا — اب بھی جانا ہے۔ ہزار باغ جاؤں گا — دیکھو نیک بخت تم سے پہلے سے اسلئے پردہ رکھا تھا کہ خواہ مخواہ تمہیں ندھن لگ جائے گی — بیویاں کبھی نہیں پسند کرتیں کہ ان کے شوہر کسی ایسی تفریح میں حصّہ لیں جو ان کی ذات سے غیر متعلق ہو .... نہیں تم تردید نہیں کرسکتیں یہ نفسیاتی نکتہ ہے۔"

"اچھا تو آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے اُردو کانفرنس کی کہانی پر یقین ہی آگیا تھا —"

"نہ آیا ہوگا — میں جہنم میں جا رہا ہوں مگر جاؤں گا ضرور۔ تمہارے بھیّا خدا نہیں ہیں جو میرا رزق بند کردیں گے۔"

"اونٹیے مت — چلے جائیے میں کہدوں گی مجھے لفافہ دینا یاد نہیں رہا۔"

"کہدو گی — اللہ قسم؟"

"پھر کیا کروں گی — آپ کی وجہ سے مجھے کسی نہ کسی دن بھیّا کی مار کھانی ہی پڑے گی۔"

"کوئی پروا نہیں — وہ صرف لفظوں کی ماردیں گے۔ گولی تو مارنے سے رہے — ویسے گولی بھی ماردیں تو شوہروں پر جان قربان کرنے والی بیویاں امر شہید کہلاتی ہیں۔"

"بس اب جلدی سے کھانا کھاکر رخصت ہو جائیے۔ مجھے ڈر ہے بھیّا اِدھر پھر نہ آنکلیں۔"

"لاؤ جلدی اُتار لاؤ — تم اللہ قسم وِنڈرفل زوجہ ہو — اکرم شاندار — لکھ لو بے دریغ جنت میں جاؤ گی۔"

"زوجہ" کے لفظ سے وہ کبھی کبھی چڑھ بھی جاتی ہے مگر اس وقت نہیں چڑھی تھی۔ مجھے احساس بھی ہوا تھا کہ یہ لفظ بول کر میں نے اس کے ایثارِ عظیم کی قدرشناسی کا حق ادا نہیں کیا لیکن نازک مواقع پر زبان بے قابو ہو ہی جاتی ہے۔ خلائی طیارے کی رفتار سے پانچ سات لقمے حلق سے اُتار کر میں بھاگ نکلا۔ رکشا محلے ہی میں مل گئی تھی۔ ہولڈال اور سوٹ کیس پہلے ہی سے تیار تھے۔

پل صراط وہ بیس گز کا راستہ تھا جو دفتر تجلی کے نیچے سے گذرتا ہے۔ اس سے نہ گذریں تو پھر مولوی منقار کے گھر پہنچنے کے لئے تقریباً چار گنا مسافت طے کرنی پڑتی ہے۔ گاڑی میں ابھی دیر تھی۔ عافیت اسی میں معلوم ہوئی کہ چوگنی مسافت گوارا کرلی جائے۔

لیکن موت جب مقدر ہو جاتی ہے تو آدمی خود چلکر شہادت گاہ میں پہنچنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ایک پتلی سی گلی کو پار کرتے ہوئے دفعتاً میرے ستارے گردش میں آگئے۔

"مر گئے —!"

سامنے سے سالے صاحب چلے آرہے تھے اور کمال یہ تھا کہ

ان کے ہمراہ مولوی منقار بھی تھے۔
"ارے — آپ چل بھی دیئے" مولوی منقار نے قریب پہنچ کر کہا۔ سالے صاحب نے فقط ایک غلط انداز سی نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر قریب والے مکان کی اونچی دیوار کو اس طرح دیکھنے لگے جیسے اوپر چڑھنے کے امکانات کا جائزہ لے رہے ہوں۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس وقت ان کا اور مولوی منقار کا ساتھ کیا معنی رکھتا ہے — وہ کہاں سے آرہے ہیں کدھر جا رہے ہیں۔ پھر مولوی منقار کا سوال بھی بیچ دار تھا — کیا جواب دوں۔

"میں سمجھتا ہوں آپ میری ہی طرف جا رہے ہونگے" انھوں نے فرمایا۔

"جی نہیں میں چاند کے سفر پر جا رہا ہوں —" میں جھلایا اور پھر آنکھوں کے اشارے سے پوچھا۔

"یہ آخر معاملہ کیا ہے؟"

"افسوس ہے آج کا پروگرام مؤخر کرنا پڑا۔ پرسوں چلیں گے —"

"کیا؟" میں حلق کے بل چیخا — پھر یہ چیخ مذبوحی غرغراہٹ میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔

"اچھا مولانا میں چل رہا ہوں —" یہ سالے صاحب کے الفاظ تھے اور پھر وہ مولوی منقار کے جواب کا انتظار کئے بغیر اُدھر ہی کو لوٹ گئے جدھر سے آئے تھے۔

"کیا چکر ہے مولانا —؟" میں نے بیتابانہ سوال کیا۔

"بس کچھ بھی نہیں — ابھی ڈاکخانے سے تار دے کر آرہے ہیں —"

"تار؟"

"جی ہاں — خواجہ بقاء اللہ کو — تاکہ وہ پریشان نہ ہوں اب پرسوں چلنا ہوگا —"

"آخر مصیبت کیا آئی — کیا یہ صاحب آپ کے بھی آشنا ہیں؟"

"کون صاحب؟ — ایڈیٹر تجلی! — ارے نہیں بھئی وہ تو دوست آدمی ہیں —"

"بس تو ہوا بیڑا پار۔ آپ نے وہ شعر نہیں سنا — ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو —"

"چھوڑو بھی یار — دراصل وہ بڑا اصرار کر رہے تھے —"

"وجہ؟"

"کوئی مضمون تم سے لکھوانا ہے۔ کہہ رہے تھے وقت تنگ ہے۔"

"اور آپ نے کسی شوہر پرست بیوی کی طرح ناک رگڑ دی؟"

"بھئی کیا کرتا — بھول گئے؟ اپنے مجوزہ پرچے کیلئے ان سے تعاون لینا ہے"

"جہنم میں گیا تعاون اور پرچہ — یہاں تو جان پر کھیل کر گھر سے نکلے تھے۔"

"کوئی ہرج نہیں پیارے دوست۔ پرسوں جانے میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ ابھی دس بجے صابر سلمہ دہلی سے آئے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ چوتھے روز یاسمین والی ٹولی بھی بمبئی سے آرہی ہے —" انھوں نے جائزہ لینے والی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر آواز دبا کے بولے "یاد ہے نا وہی اجمیر والی یاسمین؟"

ان کی آنکھوں میں بڑی جاندار چمک اُبھر آئی تھی۔

"مجھے اس کے سوا کچھ یاد نہیں کہ یمن کے ایک سوداگر نے مجھے بچپن ہی میں غلام کی حیثیت سے آپ لوگوں کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا — مولانا یہ کوئی شرافت ہے کہ بندھا بندھایا بستر"

"بگڑو مت پیارے دوست ..."

"پیارے دوست پر ہزار بار لعنت — آپ نہیں سمجھتے یہ حادثہ مجھے پھیپھڑے کی دق میں مبتلا کر دے گا۔ اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ بہنوئی سالے کے ہاتھ میں کٹ پتلی ہے۔ وہی ہو کر رہیگا جو سالا چاہتا ہے — کوئی پرواہ نہیں آپ پرسوں جائیں میں آج ہی جاؤں گا۔ نہ سہی دہلی۔ میرٹھ، مظفر نگر کہیں بھی دھکے کھانے کے لئے سڑکوں کی کمی نہیں — اور کیا میری لطافت بھی مان گئے؟"

"بھلا کیسے نہ مانتے۔ یاسمین کے لئے تو وہ ایک دیکھی

ٹیک ہو آئے ہیں ——"

"ہوں —— اور مجھ سے کہہ رہے تھے ایک تسبیح درود کی روز پڑھ لیا کرو ۔۔۔"

"صاحب ۔۔۔۔ اب کدھر چلنا ہے" رکشا والے نے سوال کیا۔ وہ چند منٹ پہلے پیشاب کرنے برابر کی گلی میں چلا گیا تھا۔

"پھر گھر چلو ——" میں ہنسنا کے بولا۔

"شام کو ملیئے گا ——" مولوی منقار نے رخصت ہوتے ہوئے فرمایا۔

"اگر زندہ رہا تو مل جاؤں گا۔ ویسے امید کم ہی ہے کہ ۔۔۔ کہ ۔۔۔ ارے ہاں وہ پراٹھے اور کباب ؟"

"شام کو کھائیں گے —— آئیے گا ضرور۔ رسالے کے بارے میں چند باتیں اور بھی مشورہ طلب رہ گئی ہیں ——"

"جہنم میں گیا رسالہ —— اور وہ مرزا تفضل کی فیرنی ——"

—— یعنی وہ بھی تو کھانے پر آئیں گے نا ؟"

"کیوں نہیں آئیں گے ——"

●

واپسی پر گو کہ نسیمہ نے ایک لفظ ایسا نہیں کہا جسے تضحیک سے تعبیر کیا جا سکتا مگر خود میرے ہی دل کی ہر نامراد دھڑکن "خیر سے بدھو گھر کو آئے" کا وظیفہ گردان رہی تھی۔ میں نے سوٹ کیس کو اتنی زور سے تخت پر پٹکا کہ پاس رکھا ہوا شیشے کا گلاس چھنچھنا کے دلِ صد پارہ کا نمونہ بن گیا۔ وہ اس پر بھی کچھ نہیں بولی بلکہ جب میں ٹوٹے ہوئے ٹکڑے ایک طرف کرنے لگا تو بڑی نرمی سے گویا ہوئی :۔

"آپ رہنے بھی دیجئے۔ میں سمیٹ دوں گی ——"

"کیوں —— کیا میرے ہاتھ ٹوٹ گئے ؟" میں کٹکھنی آواز میں بولا —— "تم یہ کیوں نہیں پوچھتیں کہ میرا جنازہ کیوں واپس آگیا ——"

"آپ کی خوشی —— آپ کسی کے پابند تو نہیں ہیں"۔

"نحوست —— میں یہ پوزیشن برداشت نہیں کر سکتا کہ عورتیں بھی مجھ پر ترس کھانے لگیں ——"

"اللہ توبہ۔ اس درجے میں ہنچیں آپ کے دشمن۔ آخر کیا مضائقہ ہوا اگر لوٹ ہی آئے ——"

"مضائقہ یہ ہوا کہ اس وقت میری کھوپڑی میں طوفان اٹھ رہا ہے۔ بگولے ناچ رہے ہیں۔ میں لڑنا چاہتا ہوں"۔

"لڑ لیجئے —— میں جنگ سے پہلے ہی آپ کو فاتح قرار دیتی ہوں ——"

"فاتح تو تمہارے بھیا ہیں۔ بنتے ہیں بڑے لاٹ صاحب!"

"ان کی لاٹ صاحبی انھی کو مبارک —— آپ کب کسی سے کم ہیں ——"

کافی کوشش —— بلکہ یوں کہئے سعی بلیغ کی کہ نسیمہ گرما جائے اور سرد جنگ کے شعلے گریٹ وار میں تبدیل ہو جائیں مگر توبہ —— وہ شاید آئس کریم کھا کر بیٹھی تھی۔ حاصل یہ کہ آپ ہی آپ خونِ جگر پیتا رہا۔

"لاؤ وہ لفافہ لاؤ ——" ایک گھنٹے بعد میں نے کہا۔ اب سارا خونِ جگر معدے میں تحلیل ہو چکا تھا۔ وہ لفافہ لے آئی یہ ایڈیٹر تجلّی ہی کے نام تھا۔ اس میں سے تراشے علاوہ ایک مختصر سا خط بھی نکلا جس میں فرمائش کی گئی تھی کہ اخبار کے منسلکہ تراشے پر تبصرہ فرمایا جائے۔

تراشہ ۸ نومبر ۶۳ء کے "آزاد ہند" کا تھا۔ تہہ کھولتے ہوئے یہ تو ضرور نظر آیا کہ اداریئے کا عنوان ہے —— "جماعت اسلامی پر عتاب"۔ لیکن پھر اداریہ پڑھنے کی نوبت فوراً نہیں آ سکی کیونکہ نظروں کو تو کسی اور ہی چیز نے الجھا لیا تھا الاماں۔ کیا تصویریں تھیں۔ زہد شکن۔ کافر گر —— ویسے تصویریں تو تین تھیں۔ ایک فلم "میرے محبوب" کی۔ اس کے نیچے لکھا گیا تھا

"سادھنا کا ٹیلیفون دل والوں کے نام"

دوسری فلم —— "گنگا میا تو ہے پیری چڑھیبو" —— کی اور تیسری "فولاد" کی۔ یہ تیسری ہی نظروں کیلئے کمند بنی تھی۔ ایک تندرست قسم کی حسینہ کروٹ سے لیٹی ہوئی ہے اور چہرا ناظرین کی طرف ہے۔ پیٹ ننگا ہے۔ اس ننگے حصے اور چہرے کے درمیان ایک ایسا لباس ہے جس کا کوئی صحیح نام کم سے کم دیوبند کے محققین سے تو معلوم نہیں ہو سکا۔ میں

…ہی دیر نظریں گاڑے غور کرتا رہا کہ فولاد نامی کھیل کے
…ہار میں آخر اس تصویر کا کیا جوڑ ہے۔ کئی تاویلیں ذہن
…آئیں مگر ہوا کے جھونکے کی طرح گذری چلی گئیں۔ پھر
…بعت جمی تو بس اس تاویل پر جمی کہ تصویر نہ ہوتی تو ناظرین
…ید اسے شربت فولاد کا اشتہار سمجھ کر گذر جاتے۔

"آپ تو تصویریں دیکھ رہے ہیں۔" نسیمہ نے ناخوشگوار
…میں کہا۔

"سادھنا تم سے زیادہ دلکش ہے — دیکھو فون
ریسیور اُٹھائے کس ادا سے مسکرا رہی ہے —"

"یہ کٹنگ اشتہاروں پر تنقید کے لئے نہیں آیا ہے۔
…پ پلٹ کر اداریہ پڑھیئے۔"

"اداریئے میں سوائے خشک باتوں کے اور کیا ہوگا۔
…ن — اخلاق — کیریکٹر — تہذیب —"

"نہ پڑھیئے۔ کل تک تبصرہ نہ لکھا جا سکا تو آپ
…سوں بھی شاید ہی جا سکیں —"

دفعتاً میرے کان کھڑے ہو گئے۔ نسیمہ بھی چونکی۔
…رل پر سے کھنکارنے کی آواز آتی تھی۔ وہی جانی
…نی آواز — پھر کھنکار لفظوں میں تبدیل ہو گئی۔

"میں آجاؤں" — کسی نے دروازے سے سوال
…اتھا اور یہ "کسی" اس کے بھیا کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا
ان کے چہرے پر کسی بھی قسم کے غیر معمولی آثار نہیں تھے
…ی طمانیت۔ وہی ٹھیراؤ — رفتار بھی نارمل ہی تھی۔
…کی نظر سب سے پہلے اس کٹنگ ہی پر پڑی تھی جو میری
…یوں میں جھول رہا تھا۔ تبسم کی ایک لہر سی ان کے چہرے
…ندی اور داڑھی کے عقب میں گم ہو گئی۔

"چائے بناؤں بھیا" نسیمہ نے پوچھا۔ یہ فقط ایک
…ہی سا سوال تھا ورنہ جواب پہلے ہی سے معلوم تھا کہ
…ھے پر ڈھائی شکنیں ڈال کر فرمائیں گے "نہیں!"۔
…لچھ ایسا ہی ہوگا جیسے کسی بچے کو کتاب پھاڑنے پر ڈانٹ
…ہے ہوں۔

مگر اس وقت موڈ بدلا ہوا ثابت ہوا۔ کہنے لگے۔

"بنالاؤ" — اور پاس والے پلنگ پر بیٹھ گئے۔

"تم نے اسے پڑھ لیا؟" انھوں نے بلا تمہید سوال
کیا۔ اشارہ تراشے کی طرف تھا۔

"جی… بس — ابھی پڑھ ہی رہا تھا… م مگر
میں نے تو ان تینوں میں سے ایک بھی فلم نہیں دیکھی پھر کیا
فقط تصویروں پر تبصرہ ہوگا؟"

"بکو مت — مجھے بتاؤ تبصرے میں زور کن پہلوؤں
دوگے؟"

"میرا خیال ہے فولاد کی ہیروئن کا ننگا پیٹ اور سادھنا
کا غرارہ کافی اہم پہلو…"

"بکواس بند کرو — مجھے کل شام تک تمھاری بکواس
مل جانی چاہیئے ورنہ قیامت تک اسٹیشن کا منہ نہ دیکھ سکوگے۔"

"بکواس بند کرو۔ تمھاری بکواس کل شام تک مل
جانی چاہیئے — عجیب مصیبت ہے —" میں بچوں کی طرح
ٹھنکا — "آخر بتایئے نا کون سے پہلو زیادہ اہم ہیں۔ آنکھیں
ہونٹ، چاہِ ذقن — ان سب کی تعریف تو شاعر لوگ
اتنی لکھ چکے ہیں کہ ٹکے سیر بھی اب کوئی نہیں پوچھے گا۔ ننگا
پیٹ البتہ…"

"البتہ کے بچے — تم آدمیت کے جامے میں نہیں
آؤ گے —" وہ دہاڑے مگر اس دہاڑ میں تبسم کا دبا دبا سا
کھنکا بھی تھا۔

"پھر آخر میں کیا کروں۔ آپ ہی نشان لگا دیجئے
کہ کون سے پہلو زیادہ اہم ہیں —"

"گدھے۔ تم نے پڑھ بھی لیا یا فقط تصویریں دیکھ
دیکھ کر عاقبت برباد کر رہے ہو۔"

"پڑھ ہی رہا تھا۔ ناچ اور تصادم رنگین — یہ
جملہ نہایت بلیغ ہے۔"

"میں چانٹا مار دوں گا" — انھوں نے پیر پٹخ کر
کہا اور تراشا جھپٹ کر اسے اُلٹا کر دیا۔ میں اُلٹا ہی کہونگا
کیونکہ جس صفحے پر تین ماہ وش ایکٹرسوں کی تصویریں ہوں وہ
لازماً سیدھا ہی کہلائے گا۔

"تبصرے میں اشتعال نہیں ہونا چاہیئے —— تم بڑی بھونڈی باتیں لکھ جاتے ہو ——"

"میں کہتا ہوں جناب یہ ادارہ یہ جماعت اسلامی سے متعلق ہے۔ جماعت کا اپنا پرچہ "دعوت" نکلتا ہے۔ وہی کیوں نہ اس پر جھک مارے۔ آخر تجلی ہی کیوں؟"

"یہی جواب میں نے تراشہ بھیجنے والے صاحب کو لکھ دیا تھا۔ مگر خط سپرد ڈاک نہیں ہونے پایا تھا کہ اسی روز کے دعوت میں اس اداریئے پر تبصرہ نظر آیا۔ خط میں اس کا کہنا چاہا تھا مگر نہیں، آپ تجلی سے تبصرے کے طالب تھے، کاش نا ڈبتا رہا تھا کہ ذہن [illegible] لکھ دیا ہے۔"

"بعد میں تبصرہ پڑھا تو رائے تبدیل کرنی پڑی۔ وہ تبصرہ نہیں تھا تبصرے کا مذاق تھا۔"

"پھر تو خود آپ لکھیئے۔"

"نہیں۔ مجھے لکھنے —— تمھیں بکواس کا موقع کیوں [illegible] نہیں آئیں گے [illegible] کچھ ایسی ہی ہے کہ تم [illegible] سامنے ہے۔"

واپسی پر گو کہ نسیمہ [illegible] نے ان کی بہن سے احتجاج [illegible] کیا جو ترے میں چائے کا تام جھام سجائے قریب آگئی تھی۔

—— "میں ہی بوالفضول بھی ہوں۔ میں ہی بکواس بھی کرتا ہوں اور مجھے ہی آرڈر بھی مل رہا ہے کہ تبصرہ لکھو۔"

"بھیا۔ ان پر تو سفر سوار ہے..... اگر حرج نہ ہو تو....."

"کیوں فضول زبان چلاتی ہو —— میرا تو ارادہ ہی نہیں تھا کہ اس کی خرافات ڈاک نمبر میں شامل کروں —— یہ حضرت اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ تجلی پڑھنے والے انکا نام نہ پاکر خودکشی کرلیں گے —— حالانکہ ابتداءً تو سو دو سو سخروں نے خطوں میں اصرار کیا تھا کہ انھیں ڈاک نمبر میں بھی رکھا جائے لیکن اب تقریباً دو ہفتے سے ایک خط بھی ایسا نہیں آیا ہے جس میں کسی ہوشمند نے ان کا نام تک لینا گوارا کیا ہو ——"

یہ کہتے ہوئے انھوں نے فاتحانہ نظروں سے مجھے گھورا اور اسی آن نسیمہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھیلی۔

"کیا بدتمیزی ہے —— ہنسنے کی اس میں کونسی بات تھی۔"

بہن کی مسکراہٹ انھیں کھل گئی۔

"جی... ویسے ہی... پھر تو بھیا ان کا مضمون بھی رکھیئے ہی مت ——"

"میں تم سے مشورہ لینے نہیں آیا ہوں ——" ان کا لہجہ بڑا سرد تھا "کان کھول کر سن لو عزیزم ——" انھوں نے میرے کان کی لو پکڑ کر کہا "شائستگی ہونی چاہئے۔ کاٹ کھانے کا انداز نہیں —— دیکھنے میں آرہا ہے کہ تمھارے طنز کا نشتر قصاب کی کھنڈی چھری بنتا جارہا ہے۔"

چائے کے دوران ایک بار پھر میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

"دیکھئے۔ آزاد ہند ایک سنجیدہ اخبار ہے۔ اسکے کسی ایڈیٹوریل پر آپ ہی جیسے کسی باوقار اور متین عالم کو....."

"میں چائدانی تمھارے سر پر توڑ دوں گا —— دیکھ رہی ہو اس نالائق کو ——" انھوں نے بہن سے خطاب کیا "یہ میرے بھی مسکہ لگاتا ہے ——"

"ارے نہیں بھیا —— واقعی ایک سنجیدہ اخبار پر ان کا تبصرہ....."

"تمھارا بھی دماغ خراب ہوا۔ ارے یہ سنجیدہ اخبار ہے۔ ایک ہی صفحے پر ایکٹرسوں کی تین تین تصویریں۔"

"یہ تو بزنس ہے جناب" میں نے لقمہ دیا۔

"بزنس تو یہ بھی ہے کہ تم حجامتی کا پیشہ اختیار کرلو —— جن عصمت فروش عورتوں کو یہ اخبار معاشرے کے چہرے پر کلنگ کا ٹیکہ قرار دیتے ہیں وہ بھی تو بزنس ہی کرتی ہیں۔ بلیک مارکیٹنگ، اسمگلنگ، بردہ فروشی یہ سب بزنس ہی تو ہیں۔"

"اب دنیا آپ کے انداز فکر کا ساتھ نہیں دے سکتی ——" میں نے ہمت کرکے بات بڑھائی "عورت کی تصویر اشتہارات کی جان ہے۔ اب کسی فلم کے ایڈ میں مولوی برہان الدین کی تصویر تو آنے سے رہی ——"

"کیا بات ہوئی؟" وہ جھنجھلا کے بولے۔

"تصویروں کا فلسفہ آپ شاید نہ سمجھ سکیں — فرائڈ نے کہا تھا آدمی ایک جنسی جانور ہے —"

"آگے کہو ....."

"فرائڈ کے سوا مجھے کسی عالم کا نام یاد نہیں - بہرحال تصویروں کی موجودگی آج کل کسی اخبار کے غیر سنجیدہ ہونے کی دلیل نہیں مانی جاسکتی -"

"ٹھیک ہے — مغربی اسٹائل کے کسی اخبار یا رسالے میں اگر ننگی تصویریں بھی ہوں تو دعوےٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ہر پہلو سے غیر سنجیدہ ہی ہوگا — مگر ایسا اخبار جسمیں فلم ایکٹرسوں کی تصویروں کی عین پشت پر نعت بھی چھاپی گئی ہو — اسے کیا کہو گے ؟"

"نعت ؟" میں اور نسیمہ دونوں چکرائے -

"ہاں تم دونوں نے تو بینائی بیچ کر کھالی — کیا یہ "نعت شریف" لاطینی میں چھپی ہوئی ہے -" انھوں نے تراشہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا - واقعی یہ تو نعت ہی تھی -

"حیرت ہوتی ہے نسیمہ -" انھوں نے بڑے پرسوز لہجے میں بہن کو مخاطب کیا "خدا بھی کتنا رؤف و رحیم ہے — وہ دیکھتا رہتا ہے کہ اس کے سب سے بڑے پیغمبرؐ کیساتھ وہی لوگ تمسخر اور ٹھٹول کر رہے ہیں جو اس کی غلامی کا دم بھرتے ہیں مگر پتھر نہیں برساتا - زمین نہیں شق کرتا -"

ان کی آواز یکلخت بھرّا سی گئی تھی - آنکھیں جو بظاہر نسیمہ کی سمت اٹھی ہوئی تھیں کہیں دور دیکھتی محسوس ہونے لگی تھیں - اسی عالم میں کہتے گئے -

"پستی اور ذلالت کی کوئی سطح کیا اس سے بھی ارذل ہوسکتی ہے کہ مسلمان ایک ہی ورق پر نعت رسول بھی چھاپے اور ایکٹرسوں کی تصاویر بھی - یہ تو صریح طور پر خدا اور رسولؐ کو — العیاذ باللہ منھ چڑانا ہوا"

"مگر ..... وہ دیکھئے تصویر کا مسئلہ تو اختلافی مسئلہ ہے - ہوسکتا ہے "آزاد ہند" کے فاضل مدیر جواز کے حق میں ہوں -"

"تم بھی کمال کرتے ہو — بحث تصویر کے جواز اور عدم

نہیں - سوال یہ ہے کہ جس ورق پر نعت چھپی ہے اس پر فلموں کے اشتہارات اور ان کے ساتھ فحش ترغیب انگیز اور حیاسوز تصویریں چھاپنا ....."

"کچھ بھی کہئے - ہند و پاک — بلکہ شاید تمام دنیائے اسلام میں یہی ہو رہا ہے — اس سے غالباً توازن پیدا ہوتا ہے -"

"یا وہ گو آدمی - زبان کو لگام دو — تمھیں رونا نہیں آتا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے — فحش و عریاں تصاویر کیساتھ نعتِ رسول ....."

نے حق میں ہی جاتا ہے"

"فحش و عریاں تو آپ کہہ رہے -" میں بولا "فقط ایک بالشت پیٹ کھلی دیکھ سکتے ہیں تو اسے کیا کہیں گے جس نے سامنے ہی کپڑے اتار پھینکے ہوں -"

اس وقت نسیمہ چائے کے برتن سمیٹ کر باورچی خانے چلی گئی تھی -

"یہ موضوع مذاق ان سب کی تعریف تو شاعر لوگ ہو سکے تو خون کے چند قطرے بھی اب کوئی نہیں پوچھے گا - ننگا شور مچاتے ہیں کہ فلاں غیر — فلاں غیر ملکی رسالے نے اسلام کا مذاق اڑادیا — مگر یہ دن دہاڑے خود مسلمان کیا کر رہے ہیں -"

"آپ تو تقویٰ کی لائن پر نکل گئے — بات یہ ہے اب ذرا آزادی اور وسیع النظری کا زمانہ ہے - یہ زمانہ عریانی و فحاشی کے اپنے مخصوص معیار رکھتا ہے - عورت کے بدن پر جب تک دو دھجیاں باقی ہیں یہ اسے ننگا نہیں مانے گا -"

"چپ ہو جاؤ بیہودے انسان — چپ ہو جاؤ —"

ان کی آواز میں اچانک دیوانگی کے آثار ابھر آئے تھے — "کاش یہ گستاخ اور بے حس لوگ سمجھ سکتے کہ عورتوں کی فحش تصویروں کے ساتھ نعت چھاپنا خدا اور رسولؐ کے ساتھ ایسا ہی استہزاء ہے جیسے بسم اللہ کہہ کر سود لینا اور شراب پی کر تلاوت کرنا - آخر کیا فرق ہے ان میں — باللہ العظیم !

سُرخ کائنات لرز جاتی ہے جب اسلام کے دعویدار ہی اسلامی تعلیمات کو سر بازار منہ چڑاتے ہیں۔"

اب ان کا موڈ کچھ ایسا ہی تھا کہ میں نے گول ہو جانا ضروری سمجھا۔ نسیمہ بھی باورچی خانے سے آتے آتے دالان والے ستون سے لگ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ آنکھیں بھیا پر جمی تھیں اور خواہ مخواہ آنسوؤں کے چند قطرے اس کی پلکوں پر لرز رہے تھے۔

پھر وہ چلے گئے ۔۔ جاتے جاتے انھوں نے مڑ کر کچھ کہنا چاہا تھا مگر نہیں کہہ سکے تھے۔ ہونٹوں کی لرزش اور چہرے کا تناؤ بتا رہا تھا کہ ذہن اور زبان کا رابطہ قائم کرنے میں سرگرداں ہیں۔ نسیمہ تو اب باقاعدہ رو ہی پڑی دُشکلی ۔۔ پتا نہیں یہ بھائی بہن کیا ہیں۔

●

"آزاد ہند" کا سبق آموز اداریہ آخر پڑھنا ہی پڑا۔ یہ اور بات ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے انگلیاں خود بخود ورق پلٹ دیتی ہوں اور ننگے پیٹ والی تصویر آنکھوں سے دل میں اور دل سے معدے میں اُتر کر ایک ایک آنت میں برقی رو دوڑاتی رہتی ہو۔

"خدا کے لئے پڑھ چکیے ۔۔ آپ کو تبصرہ بھی کرنا ہے۔" نسیمہ اُکتا کر بولی۔

"مگر اس پر تبصرہ نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"بہت سی چیزیں تبصرے سے بے نیاز ہوتی ہیں اور یہ بھی انھی میں سے ہے ۔۔ تم ہی بتاؤ کیا تبصرہ ہو۔"

"میں کیا بتاؤں ۔۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آزاد ہند کے فاضل مدیر کو کسی نے کوکا کولا کے دھوکے میں شراب پلا دی ہے۔"

"پی ہو گی خود تم نے ۔۔ میرا تو خیال ہے اس اداریے کا لفظ لفظ برحق ہے۔ ذرا پہلی ہی لائن دیکھو ۔۔"

"میں کیا دیکھوں آپ دیکھیے۔"

"میں تو دیکھ ہی رہا ہوں۔ لو بتاؤ تمھیں کیا اعتراض ہے آغاز ہی میں فرماتے ہیں:۔

"تین سال پہلے جماعت اسلامی ہند پر وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے الزام لگایا تھا کہ وہ قوم دشمن جماعت ہے اور ملک دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہے۔"

اب کہو کیا پنڈت نہرو جیسے ملہم صادق کے قول میں بھی نفی نکالنے کی جرأت کرو گی؟"

"پنڈت جی نے ایسا کہا ہو مجھے یقین نہیں۔" وہ پھٹ سے بولی۔ "لیکن کہا بھی ہو تو کیا خود پنڈت جی کو یہیں کی بعض پارٹیاں اس سے زیادہ بُرا بھلا نہیں کہتیں؟"

"پارٹیوں کی ایسی تیسی۔ ارے کیا چاند پر دھول اُڑانے سے چاندنی دھواں بن سکتی ہے۔ پنڈت نہرو اس دیش کے سب سے بڑے آدمی ہیں۔ جماعت اسلامی بکواس کرتی ہے کہ خدا اور رسولؐ کے سوا کوئی معیار حق نہیں۔ میں کہتا ہوں پنڈت نہرو بھی معیار حق ہیں۔"

"اب میں بات نہیں کروں گی ۔۔" وہ بگڑ کر بولی۔

"نہ کرو ۔۔ تمھارے بات نہ کرنے سے اس اداریے کی شان نہیں گھٹ سکتی جس کا آغاز ہی ایک عظیم الشان وزیر اعظم کے نام سے کیا گیا ہو ۔۔"

"اچھا چلیے پنڈت جی نے ٹھیک ہی کہا تھا ۔۔ لیکن آپ اُس جج کو کیا کہیں گے جو قاتلوں اور ڈاکوؤں کو سزا دیئے بغیر چھوڑ دے۔"

"رحمدل کہیں گے ۔۔ قاتلوں اور ڈاکوؤں کے بال بچے اسے دعا دیں گے۔"

"پھر تو ساری عدالتوں میں قفل ڈال دینے چاہئیں ۔۔"

"وہ بھی ڈل جائیں گے ۔۔ مگر تم اپنی کہو کیا کہنے جا رہی تھیں ۔۔"

"جو وزیر اعظم ملک کی سب سے طاقت ور ہستی ہے وہ اگر ملک و قوم کے دشمنوں کو آزاد چھوڑے رکھتا ہے تو خود اس کی وطن دوستی مشکوک سمجھی جائے گی۔"

"زبان سنبھال کے ..... ذرا دیکھتی جاؤ وقت آنے پر جماعت اسلامی کے ایک ایک فرد کی کھال کھینچی جائیگی۔ زن بچے کولھو میں پلوا دیا جائے گا۔"

"آپ کو تبصرہ نہیں کرنا ہے۔ نہ کیجئے۔ میرا کیا بگڑتا ہے۔"

"تو بتاؤ نا تبصرہ کس چیز پر کروں — وحی والہام کے درجے کی چیزیں تبصرے کی متحمل نہیں ہوا کرتیں — کان کھول کر سنو۔ آگے فاضل مدیر نے لکھا ہے :۔

"اب یہی الزام پاکستان کی جماعت اسلامی پر وزیر داخلہ پاکستان حبیب اللہ خاں نے لگایا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق جماعت اسلامی پاکستان ملک کے خلاف تخریبی سرگرمیاں کر رہی ہے وہ پاکستانی عوام میں مایوسی اور بددلی پھیلا رہی ہے اور پاکستان نے اپنے مفاد کے لحاظ سے جو خارجہ پالیسی اختیار کی ہے اس کی مخالفت کر رہی ہے۔"

دیکھ لو۔ یہاں بھی کسی ایسے ویسے کا ذکر نہیں۔ وزیر داخلہ کی بات ہو رہی ہے۔ اب کیا تم کہو گی کہ وزیر داخلہ بھی جھوٹ بول سکتا ہے۔"

"دنیا کی تاریخ یہی ہے جب بھی دین و اخلاق کے داعیوں نے حجروں سے نکل کر دنیا پرست اقتدار کو میدان میں للکارا ہے ان پر اسی طرح گھڑے گھڑائے الزامات کی بوچھار ہوتی رہی ہے — پاکستانی وزیر داخلہ محض چلتے ہوئے فقروں میں جو کھوکھلے الزامات جماعت اسلامی پر لگا رہے ہیں اس سے سخت الزامات تو کفار مکہ نے ہمارے حضورؐ پر لگائے تھے — وہ چیخ چیخ کر کہتے تھے — عبداللہ کا بیٹا محمدؐ قوم میں افتراق پیدا کر رہا ہے۔ اپنوں کو اپنوں سے کاٹ رہا ہے۔ ایک خدا کے نام کی آڑ لیکر بادشاہت کے خواب دیکھ رہا ہے۔"

"تم تو گڑے مُردے اُکھاڑنے لگیں تیرہ چودہ سو سال کی فرسودہ باتوں کا حوالہ دینا رجعت پسندی ہے۔ وزیروں کی بات چٹکیوں میں نہیں اُڑائی جا سکتی۔"

"آپ نے پاکستانی جریدوں میں وہ ٹھوس دلائل بھی ملاحظہ فرمائے ہیں جو جماعت اسلامی نے الزام تراشیوں کی اس بے بنیاد مہم کے جواب میں پیش کئے ہیں؟"

"پڑھے ہیں ...... مگر مولانا مودودی تو کسی قصبے کے تحصیلدار بھی نہیں پھر بھلا ان کی یا ان کے چیلوں چانٹوں کی ذلیل بازیوں کا وزن کیسے مانا جا سکتا ہے۔"

"اچھا ایک تماشہ دیکھئے" نسیمہ نے تراشے پر جھک کر کہا "اخبار کے فاضل مدیر نے پورا اداریہ تو لکھا ہے جماعت اسلامی کو تختۂ دار پر لٹکوا نے کے لئے، لیکن ذکر کر رہے ہیں پاکستانی ارباب اقتدار کے اس الزام کا کہ جماعت اسلامی پاکستان اور چین کے گٹھ جوڑ کے خلاف ہے۔ اگر کوکا کولا میں سچ مچ کسی اور چیز کی ملاوٹ نہ ہوتی تو ایک موٹی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا تھا کہ یہ الزام تو ہندوستان کی حد تک جماعت اسلامی کے حق میں ہی جاتا ہے۔"

"اب تم سیاست پر بور کرو گی۔"

"نہیں ذرا سمجھئے۔ ہمیں بطور ہندوستانی بجا طور پر شکایت ہے کہ پاکستان نے عین اُس وقت چین سے پینگیں بڑھائیں جب چین ہمارا کھلا دشمن بن چکا تھا۔ ہم اسے ہندوستان دشمنی ہی کا ایک روپ سمجھتے ہیں — پھر بھلا پاکستانی جماعت اسلامی کا اس گٹھ جوڑ کے خلاف ہونا ہمارے ہی نقطۂ نظر کی ہمنوائی نہیں تو اور کیا ہے۔"

"ہونے دو — ہمیں پاکستان سے کیا لینا دینا۔"

"یہ تو ثابت ہوا کہ اداریہ نویس کا ذہنی توازن ڈانوا ڈول ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا لکھ رہا ہے — حد ہے کہ وہ کشمیر کے سلسلے میں بھی جماعت اسلامی کا ایک ایسا موقف بیان کرتا ہے جو پورے طور پر ہندوستانی زاویۂ نظر کی تائید ہی میں ہے۔"

"یہ تو حق گوئی ہوئی — وہ جماعت اسلامی کے عیوب کے ساتھ محاسن بھی بیان کرتا ہے۔"

"محاسن نہیں — لکھنے والے کی مجہولیت — اسے ہوش ہی نہیں کہ وہ کیا لکھ رہا ہے۔"

"خیر آگے چلو — وہ پاکستانی حکمرانوں کے اس الزام کا ذکر کرتا ہے کہ جماعت اسلامی مذہب کے نام پر اپنے سیاسی نظریات پھیلاتی ہے — کیا اس کی بھی صحت سے انکار کرو گی۔"

"انکار کی کیا آفت ہے — اگر کوئی یوں کہنے لگے کہ آپ بھوک کے نام پر روٹی کھا رہے ہیں تو کیا آپ انکار کریں گے —"

"میں اس کے دو چپ رسید کروں گا — بھوک کے نام پر روٹی نہیں کھائی جائیگی تو کیا پتھر چبائے جائیں گے ؟"

"یہ وہی بات ہوئی جو جماعت اسلامی پر بطور الزام دُہرائی جارہی ہے آخر جس مذہب میں دین و سیاست کی تفریق نہ ہو اس کے سچے پیرو سیاسی نظریات کو مذہب کے نام پر نہیں تو کیا دہریت کے نام پر پیش کریں گے — "اپنے" کا لفظ خالص افترا پردازی ہے —"

"اپنے ....؟"

"ہاں یہ جو کہا نا کہ جماعت اپنے سیاسی نظریات مذہب کے نام پر پھیلاتی ہے تو یہ "اپنے" ہی کا لفظ بس کی گانٹھ ہے — کیا جماعت کے اپنے سیاسی نظریات مذہب سے الگ کوئی چیز ہیں ؟"

"میری کھوپڑی میں اتنا بھس نہیں ہے کہ ایسی باریک باتوں پر دماغ سوزی کرتا پھروں — سیدھی سی بات ہے کہ بڑے بڑے لوگوں نے الزام عائد کیا تو ضرور وہ درست ہی ہوگا — خبر بھی ہے وزیر داخلہ کی کیا تنخواہ ہوتی ہے ؟"

"آپ تو دفع الوقتی پر اُتر آئے — ذرا آگے تو دیکھئے اس اللہ کے بندے نے کیا کیا گل افشانیاں کی ہیں"

"دیکھ ہی رہا ہوں — اچھا دیکھو وہ کہتا ہے — ہندوستان میں جماعت اسلامی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ یہاں حکومتِ الٰہیہ قائم کرنا چاہتی ہے — بتاؤ کیا یہ غلط ہے ؟"

"کیوں غلط ہوتا — وہ تو پوری دنیا میں حکومتِ الٰہیہ کی تمنا رکھتی ہے پھر ؟ — کیا آزاد ہند کے مدیر صاحب خود بھی بحیثیت مسلمان یہ نہیں مانتے کہ اللہ کے احکام و قوانین دوسرے تمام قوانین سے افضل ہیں اور وہی قوانین پوری دنیا میں نافذ ہو جائیں تو انسانیت اوجِ کمال پر پہنچ جائے گی ....."

"تمھیں کیا معلوم وہ ایسا مانتے ہیں ؟"

"مسلمان نام ہی اس کا ہے جو خدا اور رسول کے احکام کو سب سے فائق جانے —"

"پہلے ہوتا تھا — بھاگوان اب نیا زمانہ ہے۔ آج تصویریں چھاپے بغیر اخبار نہیں چلتے —"

"غیر متعلق باتیں مت کیجئے۔ اگر ایک جماعت یہ آرزو رکھتی ہے کہ اس کے ملک میں اسلامی قوانین جاری ہوں اور اسلامی اخلاق کا گلزار پھلے پھولے تو اس میں کم سے کم ان لوگوں کے بگڑنے کی تو کوئی بات نہیں جو بظاہر مسلمان ہی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں —"

"ذرا آگے بھی تو دیکھو — اس آرزو کو پورا کرنے کے لئے جماعتِ اسلامی حرکتیں کتنی خوفناک کر رہی ہے —"

"کونسی حرکتیں ؟"

"سنو — فاضل مدیر نے لکھا ہے :—

"جماعت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہندوستان میں حکومتِ الٰہیہ اسی وقت قائم ہو سکتی ہے جب ملک میں اسلامی معاشرہ پیدا ہو اور اسلامی معاشرہ پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ غیر مسلموں کو مسلمان بنایا جائے اور پھر تمام مسلمانوں کو جماعتِ اسلامی کے نظریے اور عقیدے کے مطابق "صالح" بنایا جائے۔ جماعت اسلامی کے ان خطرناک اور تباہ کن نظریات کے بارے میں ہم پہلے کئی بار تفصیل سے بات چیت کر چکے ہیں —"

دیکھا تم نے۔ کتنے خطرناک اور تباہ کن نظریات ؟"

"نظریات کو "حرکتیں" نہیں کہتے۔ فاضل مدیر سے یہ پوچھئے حرکتیں وہ کون سی کر رہی ہے —"

"نہ سہی فی الحال حرکتیں — مگر نظریات تو حرکتوں کو ضرور جنم دیں گے —"

"کاش آپ محسوس کر سکتے — یہ خالص کافر ذہن بول رہا ہے۔ اس گز بھر کی زبان والے سے کوئی پوچھے کیا اسے اپنی تاریخ کا پہلا باب بھی یاد نہیں رہا — کیا وہ یہ بھی بھول گیا کہ اپنے دور کے واحد مسلمان — محمد صلی اللہ علیہ وسلم

نے کتنے غیر مسلموں کو مسلم بنایا تھا؟"

"ارے وا... " میں نے ٹوکا " وہ تو رسول تھے۔ جماعت اسلامی کیا رسولوں کی جماعت ہے؟"

"سوال یہ ہے کہ غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کی خواہش رکھنا اور اس خواہش کے تحت علم و شائستگی اور امن و آئین کے دائرے میں رہ کر اسلام کی حقانیت کو دلائل کے ساتھ پیش کرنا کیا اُن لوگوں کے سوا کسی کو خطرناک اور تباہ کن محسوس ہو سکتا ہے جو اسلام سے تہہ دل سے نفرت رکھتے ہوں ــــ یہ کام تو سب سے بڑھ کر لگن اور تندہی کے ساتھ اللہ کے اُس رسولؐ نے زندگی بھر کیا تھا جس کی رسالت پر فاضل مدیر۔ کم سے کم ظاہر میں تو ایمان رکھتے ہی ہیں۔"

"ارے بابا ہندوستان میں کروڑہا کروڑ غیر مسلم بستے ہیں۔ ان سب کو کون مسلمان بنالے گا ــــ"

"جب مکے میں خدا کے آخری رسولؐ نے دعوتِ اسلام کا آغاز کیا تو وہ اکیلا ہی تھا۔ پورا ملک، پوری دنیا غیر مسلموں ہی سے آباد تھی ــــ"

"تم تو ہر بات میں خدا اور رسول لے دوڑتی ہو ــــ یہی تو زہر ہے جسے جماعت اسلامی دماغوں میں اُتارتی ہے۔"

"پھر کیا لینن اور مارکس کے حوالے دینے چاہئیں ــــ آپ ذرا دیکھئے تو ان صاحب نے "صالح" کے لفظ پر کانٹے لگائے ہیں۔ یعنی جماعت اسلامی اگر بدکرداریوں کا دروازہ بند کرنا چاہتی ہے تو یہ صاحب ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کے فلمی اشتہار ہی بند نہ ہو جائیں ــــ"

"تم سمجھی نہیں ــــ یہ تو آخر بری ہی بات ہے نا کہ، غیر مسلموں کو زبردستی مسلمان بنایا جائے۔"

"جماعت اسلامی تو اتنی دیوانی نہیں ہے کہ تبدیلیِ مذہب کے معاملے میں جبر و تشدد کا تصور بھی کر سکے مگر ہاں فاضل مدیر نے ضرور ایسا ہی پوز کرنا چاہا ہے۔"

"مگر مجھے تو ایک بہت بڑے آدمی کے اردلی نے بتایا تھا کہ جماعت اسلامی غیر مسلموں کو باندھ باندھ کر کلمے پڑھوانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اچھا اگر نہیں رکھتی تو حکومت الٰہیہ کیسے بنے گی؟"

"نہ بنے ــــ یہ کس دیوانے نے کہا ہے کہ جماعت نے حکومت الٰہیہ بنا کر ہی چھوڑنا اپنے ذمے لیا ہے ــــ وہ فقط اتنا ہی کہتی ہے کہ ہم اسلامی تعلیمات کو پھیلانے کے سلسلے میں بس اپنی استطاعت کی حد تک ذمے دار ہیں ــــ ہم قانون کے دائرے میں رہ کر کامل دیانت اور معقولیت کے ساتھ اسلام کو مقبول و مقتدر بنانے کی جد و جہد کئے جائیں گے نتائج اللہ کے ہاتھ ہیں۔"

"تم نے تو تقریر شروع کر دی ــــ ذرا آگے تو دیکھو کیسے بھیانک نتائج نکلتے ہیں جماعت کی اس معصوم سی منطق کے جس کی تم وکالت کر رہی ہو۔"

"بس دیکھ لیا۔ آپ سے پہلے پڑھ چکی ہوں۔ آدمی جب سر کے بل کھڑے ہو کر سوچنے لگے تو ــــ اس کی بہترین مثال یہ اداریہ ہے۔ اللہ اکبر۔ ذرا دیکھئے آگے کیا گل افشانی ہوتی ہے :-

"ہم نے جماعت اسلامی کو کتنی ہی بار سمجھایا کہ وہ اس تباہ کن نظریے سے باز آجائے اور پورے ہندوستان کو مسلمان بنانے کے خوابِ پریشاں کے بجائے حقیقت بینی سے کام لیتے ہوئے موجودہ مسلمانوں کے مسائل کو اپنے ہاتھ میں لے۔"

کوئی پوچھے آپ کس کھیت کا بتھوا ہیں کہ "جماعت اسلامی" کو الف، ب پڑھانے چلے۔"

"اب یہ تو تم گھٹیا باتیں کر رہی ہو ــــ ایک اخبار کا ایڈیٹر معمولی دماغ کا مالک نہیں ہوتا ــــ"

"ایسا اخبار جس میں نعت اور فلموں کے تصویری اشتہارات ایک ہی ورق پر چھپتے ہوں! ــــ ہُنھ!"

"یہ تو تم نے اپنے بھیا کی نقل اتار دی ــــ نعت سے چڑنے والے کافر ہوتے ہیں۔"

"میں کہتی ہوں آپ تبصرے میں ذرا یہ تو پوچھئے ان فاضل مدیر سے انھوں نے خود مسلمانوں کے کتنے مسائل حل کئے ــــ کیا یہی کہ فلمی اشتہار چھاپ کر ہزار پانچسو مسلمانوں کو سنیما بھیجا ــــ"

"صرف مسلمان ہی کیوں؟ غیر مسلم بھی تو جاتے ہیں ــــ"

"جانتے ہیں مگر وہ اُردو اخبار نہیں دیکھتے — اُردو اخباروں کے اشتہارات فقط مسلمانوں ہی کو راہِ نجات دکھلانے کا کارنامہ انجام دیتے ہیں۔"

"میں نے خود ایک ہندو بھائی کے ہاتھ میں اُردو اخبار دیکھا تھا —"

"وہ حلوائی ہوگا — مگر کہاں غیر مسلم حلوائی بھی اُردو ردّی مشکل ہی سے خریدتے ہیں — غالباً خونچے والا ہوگا۔"

"اچھا اب معاف کرو — میری کھوپڑی انڈے کی طرح اُبل رہی ہے۔"

"تو آپ تبصرہ کب لکھ رہے ہیں؟"

"پھر وہی تبصرہ — نہیں لکھوں گا۔ نہیں لکھوں گا۔"

●

مگر صبح جب آنکھ کھلی تو نسیمہ پھر وہی تراشہ لئے بیٹھی تھی۔

"اسے پھاڑ کر پھینکو —" میں جھلّایا "اسی کی وجہ سے رات بھر مجھے ننگے پیٹ والی عورتوں کے خواب آتے رہے ہیں — چائے نہیں بناؤ گی؟"

"وہ بنی رکھی ہے — آپ نماز تو پڑھ لیجئے۔"

"مرا دل تو ہے صنم آشنا مجھے کیا ملے گا نماز میں — سنا ہے "میرے محبوب" بڑی شاندار فلم ہے —"

"صبح ہی صبح اللہ رسول کا نام لیجئے — پھر آپکو تبصرہ بھی لکھنا ہے۔"

"اپنا سر لکھنا ہے — تبصرے پر میں ایک ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں۔"

"خیر اُٹھ جائیے۔"

نماز تو ضرور پڑھی۔ نہ پڑھتا تو دلہن بیوی چائے بھی نہ دیتی۔ مگر نماز میں "میرے محبوب" کی ہیروئن سادھنا کا تصور بھیجے کے گودے سے چپکا رہا اور "فولاد" کی ننگے پیٹ والی پہلوان حسینہ تو عین کھوپڑی کی چوٹی پر دھما چوکڑی مچاتی رہی۔ کب سے فلم دیکھنے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی۔ مگر اس نامراد تراشے نے آتشِ شوق کو بھڑکا کے رکھ دیا تھا

چائے کے دوران نسیمہ نے پھر چرخا چلایا۔ تراشہ اس کے ہاتھ ہی میں تھا۔

"سُنا آپ نے — وہ جو مدیر صاحب فرما رہے تھے کہ ہم نے بارہا جماعت اسلامی کو سمجھایا — تو کیا کیا سمجھایا — سُننے کے قابل ہے — انھوں نے سمجھایا کہ وہ مسلمانوں کی نیکی اور پرہیزگاری کی طرف رہنمائی کرے۔ ان کے مذہبی اور سماجی مسئلوں کو سلجھانے کی جدوجہد کرے۔ انھیں اچھا مسلمان بنانے کے لئے دین کی تعلیم و تربیت عام کرے...."

"ارے تو ماتھے پر بل ڈال کر کیوں پڑھ رہی ہو — یہ کیا بُری باتیں ہیں؟"

"ذرا تماشہ تو دیکھئے — جماعت اسلامی کے ناصح مشفق وہ صاحب بننے چلے ہیں جو خود روزانہ فلموں کے بالتصویر اشتہار چھاپ کر پرہیزگاری کے ریکارڈ توڑے دے رہے ہیں — ہے نا آٹھواں عجوبہ!"

"یہ تو اپنا اپنا ظرف ہے — اب کیا تم یہ کہو گی کہ جو روزہ نہ رکھے وہ افطاری بھی نہ کھائے — میں پوچھتا ہوں جو مشورہ فاضل مدیر نے جماعت کو دیا ہے وہ بجائے خود کیا بُرا ہے؟"

"میں پوچھتی ہوں جماعت اس کے سوا اور کر بھی کیا رہی ہے — اس کا لٹریچر کیا نیکی اور پرہیزگاری کی مسلسل دعوت کے سوا فلمی اشتہاروں اور فحش تصویروں سے مزیّن ہے۔ اس نے مسلمان بچوں اور بڑوں کے لئے جو نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کی ہیں کیا وہ مسلمانوں کے اس عظیم مذہبی و سماجی مسئلے سے براہ راست تعلق نہیں رکھتیں کہ اس سیکولر دیس کے اسکولوں میں صریحاً غیر سیکولر تعلیم دی جا رہی ہے۔ کیا وہ اچھا مسلمان بنانے کے لئے شب و روز تعلیم و تربیت میں کوشاں نہیں ہے — پھر آخر ناصح مشفق کیا راگ الاپ رہے ہیں؟"

"ہو سکتا ہے یہ سارے کام جماعت نے ان کے سمجھانے کے بعد ہی کئے ہوں —"

"جی نہیں — کئے کہاں — وہ تو فرما رہے ہیں کہ —

— "مگر جماعت اسلامی اپنی روش پر قائم ہے۔" —— یعنی فاضل مدیر کا عجیب و غریب مشاہدہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی نہ پرہیزگاری کی دعوت دے رہی ہے نہ دینی تعلیم و تربیت سے اسے کوئی واسطہ ہے بلکہ دفتر میں بیٹھی حکومتِ الٰہیہ کا قطب مینار بنا رہی ہے۔"

"نیک بخت یہ تو اپنے اپنے نظریات ہیں۔ تم نے نہیں سُنا جدید ترین تحقیق یہ ہے کہ دین و اخلاق کا موجودہ تصور در اصل عجمی سازش ہے۔ نماز، روزہ، دیانت، ضمیر یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ مسجد یا کوئی بھی عبادت گاہ بنانا ہی سرے سے قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے —— مان لو فاضل مدیر کے نزدیک پرہیزگاری کی بسم اللہ عورت کے ننگے پیٹ سے شروع ہوتی ہو —— مان لو وہ فلم بینی کو دینی تعلیم و تربیت کا پہلا زینہ تصور کرتے ہوں۔ بات نہ کاٹو۔۔۔ قرینہ سامنے موجود ہے — سادھنا کا ٹیلیفون دل والوں کے نام —— اس فقرے کا کیا مطلب ہوا —— یہی ناکہ اہلِ دل یعنی اونچے درجے کے روحانی لوگ وہی ہو سکتے ہیں جو سادھنا یا اسی جیسی کسی اور فلمی حسینہ کا ٹیلیفون سننے کی توفیق رکھتے ہوں ——"

"آپ پر سنیما سوار ہے ——"

"وہ تو ہوگا —— میں دکھا دوں گا تمھارے بھیا بھی "فولاد" دیکھنے تو ضرور ہی جائیں گے —— وہ ننگے پیٹ کی ہیروئن۔"

"خدا آپ سے سمجھے ——"

"وہ تو تم سے بھی سمجھے گا —— اچھا یہ بتاؤ جماعت اسلامی سیکولرازم کی مخالفت جو کرتی ہے تو کیا اس سے وہی بھیانک نتائج پیدا نہیں ہوتے جن کی طرف اداریے میں توجہ دلائی گئی ہے ؟"

"کون کہتا ہے جماعت اسلامی سیکولرازم کی مخالفت کرتی ہے — مگر سیکولرازم ہے کہاں ؟ کیا سیکولرازم یہی ہے کہ۔۔۔"

"بس بس اب تم نصابِ تعلیم اور وغیرہ وغیرہ کی باتیں لے بیٹھو گی خدا کے لئے دماغ نہ چاٹو۔"

"ضرور چاٹوں گی —— ورنہ آپ تبصرہ لکھیے ——"

"تبصرہ تو اب کی تمھارے بھیا کے فرشتے بھی مجھ سے نہیں لکھوا سکتے — میری رگوں میں بھی گرم لہو دوڑ رہا ہے —"

"اچھا آپ نے اختتامیہ فقرہ بھی دیکھا ؟"

"اختتامیہ ؟ — الحمدللہ۔ اختتامیہ ضرور سُناؤ ——"

"فرماتے ہیں —— "ہندوستان جمہوری ملک ہے یہاں خیالات و رائے کے اختلاف کو برداشت کیا جاتا ہے اسی لئے پنڈت نہرو کی طرف سے جماعت اسلامی پر سنگین الزامات کے باوجود نہ اس پر پابندی لگائی گئی اور نہ اس طرح پریشان کیا گیا جیسے ان دنوں پاکستان میں کیا جا رہا ہے۔"

"ٹھیک ہی تو ہے۔ اسمیں کیا دکھلانا چاہتی ہو ؟"

"یہ دکھلانا چاہتی ہوں کہ کبھی کبھی بڑے سمجھدار لوگ بھی گو بلند حلوے میں فرق نہیں کر پاتے —— سنگین الزامات کے باوجود جماعت اسلامی کا عدالت کے احاطے سے باہر رہنا صریحاً اس بات کی دلیل تھی کہ الزامات کی کوئی بنیاد نہیں ورنہ کیا جمہوریت کی یہ بھی تعریف ہے کہ اس میں سنگین جرائم کے مرتکبین سے کوئی آئینی باز پرس نہ کی جایا کرے ؟"

"پنڈت نہرو نرم دل ہیں۔"

"نرم دلی بے انصافی کا نام نہیں —— اگر سنگین الزامات کی الزام لگانے والوں کے دماغوں سے باہر بھی کوئی حقیقت ہے تو ان کا پہلا فرض ہونا چاہیئے کہ مجرموں کو گردن سے پکڑ کر عدالت میں لائیں ——"

"لائیں گے —— سنبھلی رہو پہلا نمبر تمھارے بھیا ہی کا ہوگا۔"

"کسی کا بھی ہو —— مجرم کو سزا ملنا عینِ انصاف ہے اور کسی پُر امن شہری پر ہولناک الزامات عائد کر کے گول ہو جانا صریح ناانصافی —— واقعی جب آدمی سر کی بجائے معدے سے سوچتا ہے تو اس کی دنیا ہی نرالی ہوتی ہے۔"

(ملّا زندہ صحبت باقی)

قرآن ـــــــــــ مترجمہ شیخ الہندؒ

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی شہرۂ آفاق تفسیر کے ساتھ

انگریزی زبان میں

پڑھے لکھے حلقوں میں کون ہوگا جس نے شیخ الہندؒ کے محققانہ ترجمے اور علامہ عثمانی کی جامع تفسیر کی شہرت کا حال نہ سنا ہوگا۔ یہ تفسیر اپنی خصوصیات کے باعث یگانہ سمجھی گئی ہے۔ اختصار میں جامعیت، گویا کوزے میں دریا۔

لیکن انگریزی لٹریچر سے شغف رکھنے والوں کے لئے اس کے انگریزی ترجمے کی بھی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ اسی بنیاد پر اس ضرورت کو پورا کرنے کا انتظام کیا جارہا ہے۔ پورا ترجمہ و تفسیر ایک ساتھ چھاپنا تو دو وجہ سے ذرا دشوار محسوس ہوا۔ اول یوں کہ پورے کو انگریزی کے قالب میں ڈھالنا کافی وقت چاہتا ہے اس طرح شائقین کو طویل انتظار کرنا ہوگا۔ دوئم یوں کہ اس کی قیمت بھی کافی ہوگی جس کے باعث کم استطاعت شائقین اسے حاصل نہ کرسکتے۔ لہٰذا طے یہ کیا گیا ہے کہ ہر ماہ ایک پارہ شائع کیا جائے اور ہدیہ صرف تین روپے رکھا جائے۔

خصوصیات :۔ کاغذ اعلیٰ سفید۔ لکھائی چھپائی عکسی۔ بذریعہ بلاکس۔

قواعد :۔ جو لوگ پانچ پاروں کا ہدیہ پندرہ روپے پیشگی ارسال فرمائیں گے انھیں ہر پارہ ہم اپنے خرچ سے بھیجیں گے ورنہ عام حالات میں خریداروں کو ڈاک خرچ کا بار خود اٹھانا پڑے گا۔

جو حضرات پورے تیس پاروں کا ہدیہ نوّے روپے ایک ساتھ ارسال فرمائیں گے انھیں ڈاک خرچ چھوڑنے کے علاوہ ہم اپنی وہ مطبوعات بھی مفت پیش کریں گے جن کی اشاعت کا پروگرام سامنے ہے۔

منی آرڈر بھیجکر اپنے آرڈر بک کرائیے تاکہ پہلے آپ ہی کے آرڈروں کی تعمیل ہوسکے

مکتبۂ مطلوب نمبر ۵۹ شرف آباد، بہار ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

(ہندستان میں پیسے اس پتے پر بھیجے ..... مکتبہ تجلی دیوبند یو۔پی)

چند بیش قیمت کتابیں

جو روز روز نہیں ملتیں

حیات ابو حنیفہ رح امام اعظم رح کے علم و فضل، مدارکِ فکر، کمالات اور خصوصیات پر مصر کے جلیل القدر محقق استاذ ابو زہرہ کی لاجواب تالیف جس کا اُردو ترجمہ رواں اور سلیس ہے۔ قیمت مجلد بیس روپے

حیات ابن تیمیہ رح یہ کارنامہ بھی استاذ ابو زہرہ ہی کا ہے۔ اعلیٰ تحقیق، نفیس تنقیح فاضلانہ تجزیئے، مبصرانہ تنقید، مبسوط و مفصل۔ قیمت مجلد اکیس ۲۱ روپے۔

حیات امام احمد ابن حنبل رح اور اس کا سہرا بھی ابو زہرہ ہی کے سر ہے۔ وہ علم و تحقیق کا دریا اور بصیرت و فراست کا بدرِ منیر ہیں۔ ائمہ کے تذکرے لکھنے کا حق یہ ہے کہ انھوں نے حق ادا کر دیا ہے۔ قیمت نو روپے۔

اسلامی معاشیات مولانا مناظر احسن گیلانی رح کی وہ مشہور کتاب جو اُردو میں اپنے موضوع کی خاص الخاص تالیف سمجھی گئی ہے۔ قیمت مجلد بارہ روپے۔

زاد المعاد چار حصوں میں۔ مصنفہ: حافظ ابن قیم۔ سیرت آنحضرت صلعم پر دنیا کی مشہور اور مستند اور عظیم الشان کتاب۔ یہ تاریخ کا وہ مآخذ ہے کہ جن کو نظر انداز کر کے سیرت کے موضوع پر لکھا ہی نہیں جا سکتا۔ قیمت مکمل چار حصہ چوالیس روپے پچھتر نئے پیسے۔ حصہ اول گیارہ روپے۔ حصہ دوم نو روپے پچھتر نئے پیسے۔ حصہ سوم بارہ روپے۔ حصہ چہارم بارہ روپے۔ الگ الگ حصے

حیات امام ابن القیم مصنفہ: عبد العظیم عبد السلام شرف الدین استاد جامعۃ القاہرہ۔ مترجمہ: حافظ سید رشید احمد ارشد۔ ایم اے۔ آٹھویں صدی کے مشہور عالم امام ابن تیمیہ رح کے شاگرد رشید اور رفیق حافظ ابن القیم الجوزیہ کی سوانح عمری اور فقہ، عقائد، اور تصوف پر ان کے بیش بہا افکار کا مجموعہ وہ گراں قدر کتاب جس کی تصنیف پر جامعۃ القاہرہ مصر نے مصنف کو اسلامیات کی اعلیٰ ترین سند عطا کی۔ بارہ روپے

حضرت عمرو ابن العاص رض مصنفہ: محقق محمد فرج مصری۔ مترجمہ: محمد احمد پانی پتی۔ آنحضرت صلعم کے صحابی صفِ اوّل کے سپہ سالار، عظیم دانشور، فاتح مصر اسلام کی اس انقلابی شخصیت کے حیرت انگیز مگر بے لاگ حالات و واقعات کا مجموعہ، یہ بے نظیر علمی کارنامہ ہے۔ بڑا سائز صفحات ۴۵۰۔ سفید کاغذ۔ مجلد قیمت پونے گیارہ روپے

تاریخ اسلام مکمل تین حصے۔ مصنفہ: مورخ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔ پہلا حصہ: عہدِ رسالت آب سے لیکر خلافتِ راشدہ تک۔ دوسرا حصہ: عہد بنی امیہ سے لے کر خلافت بنی عباس مصر تک۔ تیسرا حصہ: بنو امیہ اندلس سلجوقیہ، عثمانیہ اور مغولان چنگیزی کی تمام مسلمان حکومتوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ مکمل ہر سہ حصہ چھبیس روپے۔

تاریخ غرناطہ مکمل اندلس کے مشہور شہر غرناطہ کے مشاہیر علم و سیاست کا مکمل تذکرہ اور مکمل جغرافیہ۔ ہر دو حصص مجلد بائیس روپے۔

مولنا ابوالکلام آزاد کی کتابیں

صدائے رفعت .... تین روپے
غبار خاطر .... پانچ روپے
انسانیت موت کے دروازے پر .... ساڑھے تین روپے
انسان کی حیات صالحہ .... ساڑھے تین روپے
تبرکات آزاد .... ساڑھے چھ روپے
صدائے حق .... سوا دو روپے

ضروری نوٹ ان چھ کتابوں کی مجموعی قیمت پونے چوبیس روپے ہوتی ہے۔ لیکن ایک ساتھ طلب کرنے پر رسیٹ صرف بیس روپے میں پیش کر دیا جائے گا۔

اُردو فارسی ڈکشنری

اُردو سے فارسی بنانے کے لئے ایک مختصر لیکن اہم اور مفید ڈکشنری۔ قیمت بارہ آنے۔

اسعد گیلانی کی چند کتابیں

تلاش راہ حق .... ایک روپیہ پچھتر پیسے
انتظار .... ایک روپیہ
ذرات درخشاں .... ایک روپیہ
حکایات جنوں .... دو روپے
مولنا مودودی سے ملئے .... ساڑھے چھ روپے
آدم کے تین بیٹے .... ایک روپیہ پچھتر پیسے
تصویریں .... سوا تین روپے
اونچی دوکانیں مصنفہ صدیق الحسن گیلانی مرتبہ اسعد گیلانی ایک روپیہ

ضروری نوٹ ان آٹھ کتابوں کی مجموعی قیمت سوا اٹھارہ روپے ہوتی ہے۔ لیکن ایک ساتھ منگانے پر صرف پندرہ روپے ہوگی۔

مکتبہ تجلّی۔ دیوبند (یو۔پی)

فوری آرام اور تسکین کے لئے

جوشینا

طب یونانی کے مشہور نسخہ جوشاندہ کا ایکسٹریکٹ
جوشینا زکام کا مکمل علاج ہے۔ یہ سانس کی نالیوں کو کھولتا ہے۔ کھانسی۔ چھینکوں اور حرارت کو روکتا ہے۔ اور تسکین بخشتا ہے۔
ہمیشہ ایک شیشی اپنے پاس رکھیں۔

ہمدرد دواخانہ (وقف)
دہلی - کانپور - پٹنہ

نفیس کتابیں

نام کتاب	نام مصنف	پیسے	روپے	نام کتاب	نام مصنف	پیسے	روپے
فلسفہ و دعا	پروفیسر فضل احمد عارف	-	۴	علوم عرب غیر مسلموں کی نظر میں	مولانا عبدالباطن	۵۰	۱
النبی الخاتم	سید مناظر احسن گیلانی	۲۵	۳	حیات انور رح	سید محمد ازہر شاہ قیصر	-	۴
قرآن میں نظام زکوٰۃ	مولانا مفتی محمد شفیع	۵۰	۱	وصایا حصہ اول	مفتی عزیز الرحمٰن	۲۵	۲
ضبط ولادت	محمد تقی عثمانی	۵۰	۱	حضرت عمرو بن العاص	سلام اللہ صدیقی جونپوری	۲۵	۲
جمہوریت اور مغربی تحریکیں	مترجم عبدالوہاب ظہوری	۵۰	۳	ہندوستانی مسلمان	سید ابوالحسن ندوی	۵۰	۳
اسلامی نظم و نسق	بدرالدین ابن جماعہ رح	۵۰	۳	تاریخ دعوت و عزیمت	"	-	۶
کتاب الصلوٰۃ	امام احمد بن حنبل رح	۵۰	۱	حصہ دوم	"	۵۰	۶
انسانیت کے تقاضے	ہلال عثمانی	-	۲	" سوم	"	-	۵
عورت اور اسلام	مفتی سید احمد سعید	۶۲	۲	نیا طوفان اور اس کا مقابلہ	مولانا علی میاں ندوی	۳۷	-
درویشی کیا ہے؟	مقبول احمد سیوہاروی	۲۵	۲	نشان راہ	"	۳۷	-
قرآن کیا سکھاتا ہے	سلیم عبداللہ	۷۵	۱	مسلمان اور ہندوستانی یورپ	"	۱۰	-
سلاطین ہند کی علم پروری	محمد حفیظ اللہ	۵۰	۱	پکار	اسعد گیلانی	۵۰	۱
موتی سے گہر پیدا	بدنام زیدی	-	۳	طوفان سے ساحل تک	محمد اسد (سابق لیوپولڈ ویس)	-	۵
ہمارے عائلی مسائل	مولانا محمد تقی	۷۵	۳	محمد بن عبدالوہاب رح	مسعود عالم ندوی رح	۷۵	۲
آئینہ حیرت	حیرت شملوی	-	۲	اشرف الجواب	مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رح	۵۰	۳
معجزہ کیا ہے؟	مولانا محمد طیب	۵۰	۱	تبلیغ دین	حجۃ الاسلام امام غزالی رح	۵۰	۴
ہمارے پیغمبر	مولانا محمد صادق	۲۵	۱	تحکمات	علامہ عبداللہ العمادی	۷۵	۲
فلسفۂ عجم	علامہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال رح	-	۴	تصریحات	محمد مظہر الدین صدیقی بی اے	۲۵	۲
مولانا مودودی اور تصوف	شیخ احمد	۵۰	۱	قرآن میں نظام زکوٰۃ	مولانا مفتی شفیع صاحب	۵۰	۱
تذکرہ اولیاء ہند و پاک	مفتی ولی حسن	-	۳	ہمارے عائلی مسائل	مولانا محمد تقی عثمانی	۷۵	۳
سچی باتیں	مولانا عبدالماجد دریابادی	۸۸	۳	قرآن اور اقبال	ابو محمد مصلح	-	۴
خصائل مسلمین	مولانا محمد اسحاق دہلوی رح	-	۲	حکایات صحابہ رض	مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث	۲۵	۴
تحکمات	علامہ عبداللہ العمادی	۷۵	۲	عمر بن عبدالعزیز رح	مولانا عبدالسلام ندوی	-	۳
حقوق الاسلام	قاضی ثناء اللہ پانی پتی	-	۲	المصالح العقلیہ	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی	۵۰	۴
تقاریر امام غزالی رح	(اردو ترجمہ)	۲۵	۲				
تذکرہ حضرت امام غزالی	مولانا اسلام الحق	-	۲				

پتہ: مکتبہ تجلی دیوبند یوپی

نام کتاب	پیسے	روپے
اسلام کیا ہے؟	-	۲
دین و شریعت	-	۳
تذکرہ مجدد الف ثانیؒ	-	۴
مکتوبات خواجہ معصوم سرہندیؒ	-	۴
ملفوظات مولانا محمد الیاسؒ	۵۰	۱
مولانا الیاس کی دینی دعوت	۵۰	۲
قرآن آپ سے کیا کہتا ہے	-	۴
برکات رمضان	۷۵	-
نماز کی حقیقت	-	۱
شاہ اسمٰعیل شہید پر اہل بدعت کے الزامات	۷۵	-
مسئلہ قومیت	۷۰	۱
تعلیمات	۱۲	۱
انسان اور اس کے مسائل	-	۱
اخلاقی کہانیاں مکمل چار حصے	۱۷	۱
عام معلومات پانچ حصے	۲۰	۴
فن تعلیم و تربیت	-	۵
خطبات مکمل پانچ حصے	۳۴	۲
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۵۰	۱
تنقیحات	-	۳
فریضۂ اقامت دین	۷۰	۱
حقیقت نفاق	۵۰	۱
حقیقت توحید	۱۳	۱
دعوت دین	-	۳
مسلمانان ہند کا لائحہ عمل	۵۰	۳
اساس دین کی تعمیر	۵۰	۳
اخلاقی مسائل میں اعتدال کی راہ	۷۵	۱
نور قرآن	۵۰	۲
حقیقت شرک	-	۲
اسلام ایک نظر میں	۵۰	۲
قرآن کا تعارف	۸۰	۱

نام کتاب	پیسے	روپے
اسلام اور اجتماعیت	۳۰	۱
آؤ عربی پڑھیں (چار حصے)	۱۲	۳
اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی	۷۵	۳
رسائل و مسائل حصہ اول	-	۵
رسالہ دینیات	۵۰	۱
تفہیمات اول و دوم	-	۱۲
پردہ	۵۰	۳
تجدید و احیائے دین	۵۰	۱
اسلام کا نظام عدل	-	۶
علماء اور اسلام	-	۱
تفہیم القرآن جلد اول مجلد	-	۱۲
تفہیم القرآن جلد سوم مجلد	-	۱۷
اسلامی ڈائری	۱۰	۱
اسلامی نوٹ بک	۳۰	—
مناسک حج (امام ابن تیمیہؒ)	-	۳
حضرت یوسفؑ (مولانا آزادؒ)	۲۵	۲
المامون (مولانا شبلی نعمانیؒ)	۲۵	۲
تاریخ سلطانان عالم	۲۵	۵
خیر کثیر	-	۶
فیوض الحرمین	۵۰	۴
پاک بیبیاں	۷۵	۱
حیات سرور کائنات دو حصے مکمل	۲۵	۱۱
مصباح اللغات (مجلد)	-	۱۲
فتاویٰ رشیدیہ (مکمل مبوب)	-	۸
صدیق اکبرؓ (مجلد)	-	۹
بلاغ المبین	-	۴
وہ جنھیں کوئی نہیں جانتا	-	۵
تعارف حضرت امام غزالیؒ	۲۵	۲
ضبط ولادت	۵۰	۱

نام کتاب	پیسے	روپے
جمہوریت اور مغربی تحریکیں	۵۰	۳
حقوق الاسلام	-	۲
چالیس سبق	۲۵	—
لطائف علمیہ	-	۵
اچھا خاوند	۲۵	۱
اچھی بیوی	۲۵	۱
رسول اکرم کی سیاسی زندگی	-	۸
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات اور معاہدات	۲۵	۲
قرآن کی فضیلت	۵۰	—
نماز کی فضیلت	۵۰	—
نماز اور احادیث	۳۷	-
سیرت خاتم الانبیاءؐ	۲۵	۱
دعوت حق منظوم	۲۵	۳
رقعات عنایت علی	-	۱
رعنائیاں	-	۳
تجدید دین کامل	۷۵	۹
تجدید معاشیات	۷۵	۹
تجدید تصوف و سلوک	۲۵	۸
تجدید تعلیم و تبلیغ	-	۶
تاریخ فیروز شاہی	۲۵	۸
تاریخ الخلفاء	-	۱۲
حضرت عمرو بن العاص رضؓ	۷۵	۱۰
فتوح البلدان	-	۱۵
الانسان الکامل	۷۵	۱۰
سفر نامہ ابن بطوطہ	-	۱۵
مآثر عالمگیری	۷۵	۹
آئینہ حقیقت نما	-	۱۲
البرامکہ	-	۱۲

پتہ: مکتبہ تجلی — دیوبند یوپی

اچھی کتابیں

کیا ہم مسلمان ہیں؟ شمس نوید کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شہ پاروں کا مجموعہ۔ سوز و گداز، للہیت اخلاص درد اور دل کشی کا گنجینہ قیمت مجلد سوا دو روپے ۲/۲۵

تفسیر سورۂ نور از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ سیرت و اخلاق کو سنوارنے والی آسمانی ہدایات پر مشتمل سورۂ نور کی بہترین تفسیر، بلیغ، نفیس اور محققانہ مجلد چار روپے -/۴

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ پر قاضی سلیمان منصور پوریؒ کی شہرہ آفاق کتاب کا مختصر تعارف یہ ہے کہ اہل علم اسے علمی اعتبار سے مستند مانتے ہیں اور انداز بیان دلکشی، رچاؤ اور دردلبست کے لحاظ سے یہ اپنا جواب آپ ہے۔ سوز و گداز میں ڈوبا ہوا اسلوب ستھرا اور نکھرا ہوا فکر، عبارتیں رواں، شگفتہ اور دلنشیں۔ مدت سے یہ قیمتی کتاب نایاب تھی اب خاصے اہتمام کے ساتھ تین جلدوں میں شائع کی گئی ہے۔ قیمت مکمل غیر مجلد بیس روپے -/۲۰

(مجلد تین جلدوں میں پچیس روپے)

محمد رسول اللہ ﷺ مشہور مصری مصنف توفیق الحکیم کی کتاب کا عمدہ ترجمہ، مکالمہ کے انداز میں لکھی ہوئی حضورؐ کی سیرت مقدسہ بیحد دلچسپ اور پرکیف۔ قیمت پانچ روپے -/۵

ابوبکر صدیق رضؓ مصنفہ: محمد حسین ہیکل مصری ترجمہ: شیخ احمد پانی پتی۔ پانچ روپے

عمر فاروق اعظم رضؓ مصنفہ: محمد حسین ہیکل مصری ترجمہ: حبیب اشعر۔ نو روپے -/۹

منہاج العابدین (اردو) امام غزالیؒ کی سب سے آخری تصنیف جو آپ کی پوری زندگی کی تعلیمات کا خلاصہ اور تصوف کا نچوڑ ہے۔ مجلد آٹھ روپے

باندیوں کا مسئلہ (الثُّ ثَّا الثمین) جہاد میں ہاتھ آئی ہوئی عورتوں کو باندی بنا کر رکھنے کی دینی و علمی حیثیت۔ کتاب کے مصنف کا ایک خط اور مولٰنا ابوالکلام آزاد کا جواب بھی شامل ہے۔ ڈیڑھ روپیہ

خلاصہ اشرف السوانح مولانا اشرف علیؒ کے حالات و سوانح۔ دو روپے۔

خصائل رسلین شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے پوتے شاہ محمد اسحٰقؒ کی مشہور کتاب "مسائل اربعین" کا اردو ترجمہ۔ چالیس مروجہ بدعتوں کا رد مستند کتب فقہ کے حوالوں سے۔ مجلد دو روپے -/۲

الوسیلہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کی مشہور کتاب جس میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ قرآن میں وَابْتَغُوا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ کہہ کر اللہ نے جس وسیلے کی طرف توجہ دلائی ہے وہ آخر کیا ہے؟ مجلد نو روپے۔

سوانح خواجہ معین الدین چشتی رحؒ محبوب العارفین حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اثر انگیز سوانح حیات۔ جو اجمیر کی خاک میں استراحت فرما رہے ہیں۔ ساڑھے چار روپے ۴/۵۰

الفرقان شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کے ایک روح نواز رسالے کا اردو ترجمہ جس میں کرامت و بزرگی کی علامات اور ولایت کی حقیقت پر لاجواب گفتگو کی گئی ہے مجلد مع حسین کور چار روپے -/۴

فارابی معلم ثانی حکیم ابوالنصر فارابی کے علم و فضل ان کی سوانح کمالات، تجدید فلسفہ و منطق کے مفصل مکمل حالات پونے دو روپے ۱/۷۵

اشرف الجواب مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طرف سے بعض سوالوں کے اہم جواب مکمل دو حصے ساڑھے چار روپے ۴/۵۰

مکتبہ تجلی۔ دیوبند۔ یوپی

غنیۃ الطالبین شاہ عبدالقادر جیلانی رحؒ کے شہرۂ آفاق، مضامین عالیہ عربی اور اس کا سلیس ترجمہ ساتھ ساتھ۔ لاجواب تحفہ۔ دو ضخیم جلدوں میں قیمت مکمل ۲۴ روپے

مسلم شریف اردو مع عربی لیجئے حدیث کی مشہور و مستند کتاب مسلم شریف کا بھی اردو ترجمہ لیجئے۔ بلکہ اس کی جو شرح' شرح نوویؒ کے نام سے مشہور ہے اور تمام مدارس میں چل رہی ہے اس کا بھی ترجمہ ساتھ ہی شامل ہے نعمت غیر مترقبہ۔ ترجمے کے ساتھ اصل متن بھی۔ مکمل چھ جلدوں میں۔ ہدیہ اڑتالیس روپے -/۴۸

ابن ماجہ اردو کامل حدیث کی جو چھ کتابیں صحاح ستہ کے نام سے مشہور ہیں ان میں کی ایک ابن ماجہ بھی ہے۔ اس کا عام فہم اردو ترجمہ صرف بارہ روپے میں

رکعات تراویح رکعات تراویح کی تعداد پر محدث شہیر مولانا حبیب الرحمان الاعظمی کی سیر حاصل کتاب دلائل قویہ سے مزین اور تحقیق سے مالامال قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ 1/50

معرکۂ دین و سیاست نعیم صدیقی کی مشہور تصنیف۔ کتاب کا نام موضوع کے لئے اور مصنف کا نام حسن کلام کے لئے کافی تعارف ہے قیمت ساڑھے تین روپے

مولانا مودودی ایک تعارف نعیم صدیقی کے قلم سے مولانا مودودی کی شخصیت کے جلی و خفی نقوش — تین روپے

امام مظلوم سیدنا عثمان رضؓ خلیفۂ ثالث' داماد رسولؐ شہید مظلوم کی محققانہ داستان حیات آپ کے اوصاف' مناقب' امتیازات' گمراہ کن روایتوں کی تردید اور مستند روایتوں کی تفصیل — اردو میں اس موضوع پر واحد مفصل کتاب دو حصوں میں۔ قیمت دس روپے۔ -/10

اخبار الاخیار حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مشہور کتاب کا اردو ترجمہ جس میں تقریباً تین سو اولیاء و صوفیاء کے دل آویز تذکرے۔ زینت قرطاس ہیں
قیمت مجلد بارہ روپے -/12

الادب المفرد امام بخاری کی اس نفیس کتاب کا اردو ترجمہ جس میں روزمرہ کام آنے والی حدیثیں جمع کی گئی ہیں۔ اخلاق۔ معاملات۔ معاشرت' تجارت۔ سب کے لئے مشعل راہ۔ قیمت مجلد بارہ روپے۔ -/۱۲

اسلام کا نظام عدل استاد سید قطب کی اس فکر انگیز کتاب کا ترجمہ جو اسلام کے نظام عدل پر علم و تحقیق کی روشنی ڈالتی ہے۔ مجلد چھ روپے۔

فتوح الغیب شیخ عبدالقادر جیلانی کے مقالات کا اردو ترجمہ۔ ڈھائی روپے۔ 2/50

"فاران" کا توحید نمبر سیکڑوں صفحات کا یہ نمبر ماضی قریب میں بڑی شہرت پا چکا ہے اب پھر شائع کیا گیا ہے بدعت و زندقہ کے رد اور سنت کے اثبات میں بے نظیر چیز ہے چوٹی کے علماء کے مضامین سے مزین ساڑھے چار روپے (مجلد ساڑھے پانچ روپے) شائقین فوراً طلب کریں ورنہ پھر پہلے کی طرح ختم ہو جائیگا اور فرمائشیں بیکار کرنی پڑیں گی۔

رد بدعت حضرت مجدد الف ثانی رحؒ کے فرمودات کی روشنی میں بعض ایسی بدعات کا رد جو عوام ہی میں نہیں خواص میں بھی مقبول و مروج ہوئی ہیں قیمت سوا روپیہ 1/25

نور الدرایہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب "ہدایہ" کی مستند اردو شرح۔ یہ شرح ماہوار قسطوں میں چھاپی جا رہی ہے۔ اب تک تین جز چھپے ہیں۔ فی جز دو روپیہ۔ تین جز ایک ساتھ طلب کرنے والوں کو محصول ڈاک معاف۔

قاموس القرآن قرآنی الفاظ کی ایک بے نظیر لغت ضخیم کتابوں کا نچوڑ۔ الفاظ و اصطلاحات کے ذیلی مباحث سے مزین اور صرف و نحو کے متعلقہ نکات سے مالامال۔ قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی خواہش رکھنے والوں کیلئے نعمت غیر مترقبہ۔ مجلد آٹھ روپے۔ -/8

مشارق الانوار اردو مع عربی

۲۲۷۲ قولی احادیث کا مجموعہ۔ مجلد مع کور۔ ہدیہ چھ روپے

اصح السیر

از مولانا ابوالبرکات داناپوری۔ قیمت مجلد دس روپے

پتہ:- مکتبہ تجلی۔ دیوبند۔ یو پی

حیاتِ انور فخر المحدثین مولانا انور شاہ صاحبؒ کا مفصل تذکرہ۔ آپ کے علمی کمالات کا نقش جمیل

قیمت چار روپے -/۴

آئینۂ نماز صرف نماز ہی کے نہیں بلکہ پانچوں ارکانِ اسلام کی تفصیل مع مسائل ضروریہ

قیمت ڈیڑھ روپیہ ۱/۵۰

حکیم الامتؒ کی مجلسیں مولانا اشرف علی رحؒ کی روح نواز مجالس کا پرکیف تذکرہ۔

قیمت دو روپے -/۲

تحقیق مزید "خلافت معاویہؓ و یزید" کے مصنف جناب محمود احمد عباسی کا نقشِ ثانی جو بہت سا منتخب مواد آپ کے غور و فکر کے لئے پیش کرتا ہے صحابہؓ کے سلسلے میں کسی اطمینان بخش نتیجے تک پہنچنے کے لئے یہ کتاب فکری بنیادیں مہیا کرتی ہے۔ قیمت مجلد آٹھ روپے -/۸

بہشتی زیور مکمل و مدلل کون پڑھا لکھا آدمی ہے جس نے مولانا اشرف علیؒ کی اس بیش بہا اور مقبول ترین کتاب کا نام نہ سنا ہوگا۔ ہر مسلمان گھر کے لئے ایک مفتی، عورتوں کا مشیر، مردوں کے لئے مستقل رہنما۔ اس کا عمدہ اور صاف ستھرا ایڈیشن ہم سے طلب فرمائیے۔ دو جلدوں میں مکمل بارہ روپے -/۱۲ مجلد پندرہ روپے -/۱۵

حقوق الاسلام اپنے وقت کے زبردست عالم قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی مفید ترین تصنیف جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کی رو سے کس پر کس کا کیا حق ہے اللہ، رسولؐ، صحابہ، علماء، والدین، اقرباء، حاکم، شوہر، بیوی، اولاد، پڑوسی، غرض ہر ایک کے حقوق کی تفصیل رسالہ سماع و مزامیر بھی شامل کتاب ہے۔ اردو ترجمہ عام فہم مجلد دو روپے

بدعت کیا ہے؟ بدعتوں کے رد اور سنتوں کے اثبات میں ایک مشہور و مقبول کتاب، عرس قوالی، تیجہ، چہلم الا بلا سب کے لئے چیلنج۔ مجلد تین روپے -/۳

اسلام تلوار سے نہیں پھیلا غیر مسلموں کی شہادتیں اور اعترافات۔ ۷۵ نئے پیسے۔

عمرو بن العاصؓ اس صحابی رسولؐ فاتح مصر تلوار کے دھنی اور بلند پایہ مدبر کی داستان حیات جسے خود اللہ کے رسولؐ نے "مدبر اسلام" کے خطاب سے نوازا بیحد دلچسپ اثر انگیز اور مستند۔ مجلد سوا دو روپے ۲/۲۵

صحیفہ ہمام ابن منبہؒ حضرت ابو ہریرہؓ کا مرتب کیا ہوا قدیم ترین مجموعۂ حدیث مع تشریح مکتوبات نبویؐ کے فوٹو بھی شامل کتاب ہیں۔ ساڑھے تین روپے۔

سچے رسولؐ کی سچی تعلیم زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق تعلیمات رسالت کا ایمان افروز مجموعہ۔ قیمت مجلد ڈیڑھ روپیہ ۱/۵۰

مقالات شیخ الہندؒ وحی کی حقیقت اور ایمان و دیانت کے باہمی ربط پر ایمان افروز گفتگو مشہور مفسر قرآن مولانا محمود الحسن شیخ الہندؒ کے قلم سے۔ قیمت ایک روپیہ

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک از مولانا مسعود عالم ندوی۔ ڈھائی روپے

درویشی کیا ہے؟ مشائخ و صوفیاء کے ایمان افروز ارشادات قرآن و سنت سے ہم آہنگ بلیغ و نفیس توضیح سوا دو روپے ۲/۲۵

محمد بن عبد الوہابؒ ایک مظلوم اور بدنام مصلح کی مستند سوانح۔ مولانا مسعود عالم ندویؒ کے قلم سے قیمت پونے تین روپے۔ ۲/۷۵

کرامات صحابہؓ از :- مولانا اشرف علی تھانویؒ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ۱/۵۰

محاسن اسلام اسلام کی خوبیوں پر مولانا اشرف علیؒ کی ایمان افروز تقریر ڈیڑھ روپیہ ۱/۵۰

عبقات اختلافی موضوعات اور علوم تصوف پر شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی مشہور کتاب۔ ترجمہ۔ از مولانا مناظر احسن گیلانی ساڑھے دس روپے -/۱۰/۵۰

زبدۃ المناسک حج اور احکام حج پر مفصل و مدلل کتاب مصنفہ استاذ الاساتذہ مولانا رشید احمد گنگوہی۔ ہدیہ مجلد آٹھ روپے -/۸

نہایت نفیس عکسی قرآن اور حمائلیں

آرڈر میں صرف وہ نمبر لکھ دینا کافی ہے جو ہر ایک کے ساتھ درج ہے

قرآن • ترجمہ:- شیخ الہندؒ • تفسیر:- علامہ شبیر احمد عثمانی رحؒ
یہ مقبول ترین مترجم قرآن مجید کچھ دنوں سے نایاب تھا۔ الحمدللہ اب کچھ نسخے مہیا ہوئے ہیں۔ نفیس ایڈیشن۔
ہدیہ مجلد ۲۰ روپے (کاغذ کے فرق سے مجلد ۱۸ روپے)

قرآن دو ترجمے والا ع۶۸ • (۱) مولانا شاہ رفیع الدین رحؒ • (۲) مولانا اشرف علی رحؒ
حاشیے پر مستند تفاسیر کا خلاصہ۔ آغاز میں انبیاءؑ و صحابہ رضؓ کے احوال مقدسہ، سورتوں کے خواص، غزوات کے تذکرے اور اسی نوع کی دیگر مفید چیزیں اردو میں دی گئی ہیں۔ لکھائی چھپائی نفیس۔ کاغذ اعلیٰ آرٹ پیپر۔ دبیز۔ زمین سبز۔
ہدیہ مجلد ریگزین چودہ روپے۔ مجلد چرمی ساڑھے سترہ روپے
یہی قرآن نسبتاً ہلکے کاغذ پر (اس کا نمبر ۶۶ ہے) ہدیہ مجلد ریگزین تیرہ روپے۔ مجلد چرمی ساڑھے سولہ روپے۔ یہی قرآن کچھ اور ہلکے کاغذ پر (اس کا نمبر ۶۷ ہے) زمین حنائی مجلد ریگزین بارہ روپے مجلد چرمی ساڑھے پندرہ روپے۔

قرآن ایک ترجمہ والا ع۶۴ • ترجمہ:- مولانا اشرف علیؒ • حاشیہ پر مختصر بیان القرآن
تجلی سے کچھ بڑا۔ کاغذ ولایتی سفید۔ آغازِ قرآن میں بہت سی چیزیں ہیں۔ مثلاً سورتوں کے خواص، ان ناموں کی تفصیل جو قرآن میں ہیں ان مقامات کا نقشہ جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے
مجلد ریگزین کا ہدیہ بارہ روپے۔ -/۱۲
مجلد چرمی ساڑھے پندرہ روپے۔ ۱۵/۵۰

قرآن بلا ترجمہ ع۲/۵ کاغذ گلیز پیپر ولایتی۔ کتابت طباعت بے نظیر۔ ہر سطر کے بعد لائن حروف شادہ تجلی سائز کمزور نگاہ والوں کے لئے بہت عمدہ
مجلد ریگزین ہدیہ آٹھ روپے۔ -/۸
مجلد چرمی ساڑھے گیارہ روپے۔ ۱۱/۵۰

حمائل مترجم ع۳۵ • ترجمہ:- مولانا فتح محمد صاحب • حاشئے پر مختصر تفسیر۔ زمین سبز
کاغذ ولایتی۔ سائز تجلی سے نصف۔ مجلد پلاسٹک کور
ہدیہ گیارہ روپے۔ -/۱۱

حمائل مترجم • ترجمہ:- شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحؒ • تفسیر:- مولانا شبیر احمد عثمانی رحؒ
زمین حنائی۔ سائز $\frac{20\times30}{16}$ سے کچھ بڑا۔ غیر مجلد بارہ روپے -/۱۲
مجلد ریگزین ساڑھے تیرہ روپے (اس کا نمونہ نہیں بھیج سکیں گے)

حمائل بلا ترجمہ ع۲۳ کاغذ سفید مضبوط۔ سائز تجلی سے نصف حروف کافی روشن۔ ہر سطر کے بعد لائن۔ مجلد کرمچ ہدیہ پانچ روپے۔ -/۵

حمائل ع۱۳ بالکل ۲۳ جیسی بس فرق یہ ہے کہ ہر سطر کے بعد لائن نہیں ہے۔ مجلد پلاسٹک ہدیہ پانچ روپے -/۵

حمائل ع۲۶ بلا ترجمہ پاکٹ سائز۔ کاغذ باریک اور چکنا (بائیبل پیپر) سفر کے لئے خاص تحفہ۔ جلد پلاسٹک کور۔ ہدیہ مجلد چار روپے -/۴

حمائل ع۲۴ بلا ترجمہ بہت ہی مختصر سائز [illegible] کے مطلب کی۔ کاغذ عمدہ جلد پلاسٹک کور۔ ہدیہ دو روپے۔ -/۲

حمائل مترجم ع۸۰

ترجمہ:- شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ۔ کاغذ آرٹ طباعت عکسی۔ کتابت عمدہ۔ زمین سبز۔ سائز $\frac{20\times30}{16}$ (تجلی سے نصف) مجلد کرمچ ہدیہ دس روپے۔ مجلد پلاسٹک کور گیارہ روپے۔ مجلد چرمی ساڑھے بارہ روپے۔ ۱۲/۵۰

مکتبہ تجلی۔ دیوبند۔ یوپی